دوسرا ایڈیشن

حصہ اول

تاریخِ اُمّتِ مسلمہ

ابتدائے کائنات تا خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

- مبادیات تاریخ
- انبیائے سابقین علیہم السلام اور ان کی معاصر سلطنتیں
- ماقبل از اسلام دنیا کی حالت
- سیرت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم
- عہد خلافتِ راشدہ، دورِ فتوحات (خلافتِ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تا خلافتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ)
- امہات المومنین، عشرہ مبشرہ اور اکابر صحابہ کا تعارف
- اسباق تاریخ
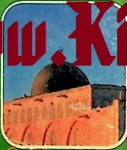
تقریظ

شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب

کاوش

مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

استاذ تاریخ اسلام جامعۃ الرشید کراچی

تاریخ اُمتِ مسلمہ
جلد اوّل

تاریخ اُمتِ مسلمہ

علم تاریخ کے تعارف اور مبادیات پر مشتمل مقدمہ

آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک انبیائے سابقین کے

مختصر مگر مستند حالات سیرتِ نبویہ (اصولِ محدثین کے مطابق)

حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہم

کی سیرت اور کارنامے

جلدِ اوّل

تحقیق

مؤرخ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

بلاک A-1، گلستانِ جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی
0321-3135009|0321-2000870
www.almanhalpublisher.com
almanhalpublisher@gmail.com

جِلدِ اوّل

تحقیق

مؤرخ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

بلاک 1-A، گلستان جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی
0321-3135009|0321-2000870
www.almanhalpublisher.com
almanhalpublisher@gmail.com

پاکستان بھر میں ملنے کے پتے

شہر	مکتبہ	فون
لاہور	مکتبہ رحمانیہ	042-37221395 042-37224228 0343-9697395
	مکتبۃ العلم	042-37211788
	الفلاح پبلشرز	0333-4101085
	مکتبہ عائشہ	0321-9233714
ملتان	مکتبہ حقانیہ	061-4541093 0300-6345306
	مکتبہ امدادیہ	061-4544965
	مکتبہ اشاعت الخیر	061-4514929
فیصل آباد	اسلامی کتاب گھر	041-37223506 041-37230718 0323-2000921
اسلام آباد	مکتبہ فریدیہ	051-2653178
راولپنڈی	اسلامی کتب گھر	051-4830451
	الخلیل پبلشنگ	051-5553248
حیدرآباد	محمد احسن	0321-8727384
کوئٹہ	مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ	0333-7825484 0333-7434142
	مکتبہ اشرفیہ، کانسی روڈ، کوئٹہ	0345-8305233
چمن	دارالعلم	0315-4105987
پشاور	مکتبہ عمر فاروق	0311-8845717 091-2580103
	ممتاز کتب خانہ	091-2580331
	دارالاخلاص	091-2567539 0300-5831992
کوہاٹ	مکتبہ حسین بن علی	0334-8299027

اسٹاکسٹ
ادارۃ النور
دکان نمبر 3-2، انور مینشن، بنوری ٹاؤن، گرومندر، کراچی
021-34914596, 0324-2855000
idaratunnoor@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Jamia-Uloom-Islamiyyah
(University of Islamic Sciences)
Allama Muhammad Yousuf Banuri Town
Karachi - Pakistan.

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
کراچی ۔ ۷۴۸۰۰ ۔ پاکستان

Ref. No. ____________ Date. ____________

الحمد للہ رب العالمین' والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین.

اما بعد:

روایتی علوم میں سے علم التاریخ ایک ایسا موضوع ہے جس کی ضرورت کا انکار بھی مشکل ہے اور اس پر کلی اعتماد کی گنجائش بھی کم ہے جس کی دو بنیادی وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ تاریخی روایات کی سند حزم و احتیاط کے اس اعزاز سے عموماً محروم رہتی ہیں جو حزم و احتیاط حدیثی روایات کو حاصل ہے۔ دوسرا یہ کہ تاریخی روایات میں مؤرخ ذاتی تاثرات اور ماحولیاتی اثرات سے بہت کم محفوظ رہ پاتا ہے، اس لئے بلا امتیاز تاریخی روایات کو اعتماد و استناد کے درجے پر رکھ کر نظریہ و فکر قائم کرنا عموماً فکری انحراف کی طرف دھکیل دیتا ہے، اس لئے تاریخ کے طالب علم کو تاریخ کا مطالعہ کرنے سے قبل کم از کم تین امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

۱...... مطالعہ تاریخ سے پہلے ایسے مبادی تاریخ کا استحضار درکار ہے جن میں امت مسلمہ کے مسلمہ افکار اور فکری بنیادوں کا بیان ہو، جسے آپ مطالعۂ تاریخ کے بنیادی اصول اور ضروری آداب سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

۲...... مطالعۂ تاریخ کے لئے مستند اور غیر مستند مآخذ، مصنف مزاج اور غیر محتاط مؤرخین کے بارے میں آگاہی بھی ہونی چاہئے۔

۳...... بسا اوقات نامور مؤرخین کے ہاں مشہور مآخذ میں بھی علی سبیل التذکرہ بہتیری غیر ثقہ روایات در آئی ہیں، اس لئے تاریخی مآخذ کے محاسن اور مساوی ہر دو کے بارے میں معتمد معیارات اور واضح اشارات کا ادراک بھی ضروری ہے۔

مطالعۂ تاریخ کے لئے یہ قابل لحاظ بنیادی امور، کتب تاریخ یا ان کے متعلقات میں یکجا، مربوط و مرتب انداز میں بہت کم ہی دستیاب ہوتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ باتوفیق اہل علم سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہتا، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ''تاریخ امت مسلمہ'' کے نام سے ایک مجموعہ ہمارے سامنے آیا ہے جس میں درج بالا تینوں بنیادی امور کا لحاظ پایا جاتا ہے۔

مزید یہ کہ (جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں) یہ مجموعہ، روایات میں احتیاط، فکر و میلان میں اعتدال، حسنِ ترتیب اور جودتِ تعبیر کے لحاظ سے منفرد اور معیاری کاوش ہے۔ امید ہے یہ مجموعہ عوام و خواص سب کے لئے یکساں مفید ہوگا۔ ان شاء اللہ!

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کاوش کو قبولیتِ تامہ اور مقبولیت عامہ سے ہم کنار فرمائے، آمین! وما ذلك على الله بعزيز

وصلى الله وسلم على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه اجمعين.

فقط والسلام

عبدالرزاق اسکندر

(مولانا ڈاکٹر) عبدالرزاق اسکندر

مہتمم جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

P.O. Box: 3465 Karachi Code No. 74800, Phone: (0092-21) - 34913570 - 34912683 - 34915966 - 34123366 - 34121152
Fax: (0092-21) - 34919531, Karachi Pakistan. URL: www.banuri.edu.pk , E-mail: info@banuri.edu.pk

حضرت مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینگل صاحب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لولیہ والصلوۃ علی نبیہ

اما بعد!

یقیناً آج امت مسلمہ خارجی یلغار و داخلی خلفشار کی وجہ سے انتہائی بھیانک قسم کے بحران سے دوچار ہو چکی ہے اور آئے دن راہ نجات دارتقاء سے دن بدن دور بھٹکتے ہوئے تنزلی کے دلدل میں دھنستی جا رہی ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ جہاں قرآن سنت سے درساً و عملاً دوری ہے وہیں اپنے اکابر و اسلاف کی تاریخ عزیمت سے لاعلمی بھی ہے جو کہ کسی بھی عظیم سانحہ ولاعلاج موذی روحانی مرض سے کم نہیں۔

فضلاً علی ھذا اگر کوئی ایک آدھ شخص علم تاریخ سے شغف رکھتا بھی ہے تو اس کا واسطہ ایسی تاریخ کے ساتھ پڑتا ہے جو اس کے ذہن میں اسلاف کے خلاف زہریلا بیج بن کر اُگتا ہے اور یہ نام نہاد تاریخ اسلامی دین اسلام کے دفاع کے بجائے اسلام کے قلعے میں نقب زنی کا کام دیتی ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر العیاذ باللہ تاریخ اسلامی میں ایسی من گھڑت اسرائیلی روایات ہیں جو قرآن وسنت کے ساتھ تصادم کے زمرے میں آتی ہیں ایسی روایات سے انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام جیسی معصوم عن الخطاء ہستیاں بھی محفوظ نہ رہیں۔

ایسے میں بلاشک تاریخ اسلام سے آشنائی حد درجہ ضروری ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ امت پر حالات کی سختی وپستی، خارجی یلغار، داخلی خلفشار، سیاسی عدم استحکام، باہم نااتفاقی و ناچاقی اور دشمنان اسلام کی رکیک چالیں اور ان سے آگاہی کے ساتھ ان تمام چیزوں کا سدباب و تدارک کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے اور اس بارے میں ہمارے اکابر واسلاف کا عمل کیا تھا یہ سب ہمیں اسلام کی تاریخ سے ہی ممکن ہے جس کے لیے صحیح و مستند واہیات سے پاک قرآن وسنت سے غیر مزاحم تاریخ اسلامی کا علم ہونا ضروری تھا۔

جس کے لیے ہمارے برادر مکرم مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ استاذ تاریخ اسلام جامعۃ الرشید کراچی جو کہ کئی کتب کے مصنف بھی ہیں جناب موصوف نے ماشاء اللہ کافی بڑھیا جدوجہد کی ہے جو کہ بندہ کی طرف سے بالخصوص اور امت مسلمہ کی طرف سے بالعموم لائق تحسین و آفرین ہیں۔

اللہ تعالیٰ جناب موصوف کی اس کاوش کو دارین میں باعث نجات و ترقی کا سبب بنائے اور قارئین کے لیے استفادہ عامہ کا سبب بنائے۔

منظوم تقریظ برائے

"تاریخ امت مسلمہ"

منجانب: شاعرِ اسلام، حضرت اثر جونپوری مدظلہ العالی

باب جہد و عزم و استقلال جب وا ہو گیا
مہرباں اک بندۂ مخلص پہ مولیٰ ہو گیا
اک مورخ پھر کمربستہ ہوا جی جان سے
کاوشیں برسوں کی آخر رنگ لائیں شان سے
امتِ سرکار ﷺ کو انمول تحفہ دے گیا
وہ جواں ایسا ضعیفوں سے جو بازی لے گیا
رہ گئے حیران خود قرطاس و خامہ کیا کہوں
پا گیا انجام ایسا کارنامہ کیا کہوں
فکر کی پرواز پہنچی رفعتِ مریخ پر
جب قلم اس نے اٹھایا طائرِ تاریخ پر
ہار کر ہتھیار ڈالے خارِ قال و قیل نے
یوں بکھیرے علم کے ریحان اسماعیل نے
شہرِ یادِ رفتگاں ایسا سجا کر رکھ دیا
آئینہ پیشِ مسلماں گویا لا کر رکھ دیا

عکس اپنا جس میں سارے اہلِ ایماں دیکھ لیں
کس طرح سے مشکلیں ہوتی ہیں آساں دیکھ لیں
کس طرح جھیلی مشقت سیدِ ابرار صلی اللہ علیہ وسلم نے
پرچم دیں کیسے لہرایا مرے سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے
کس اندھیرے میں ہوئے روشن ہدایت کے چراغ
کس طرح سینچا صحابہؓ نے لہو سے دیں کا باغ
اک طرف اوجِ ثریا کا نظارہ پرحلل
اک طرف تحت الثریٰ کا خارزارِ جاں گسل
ایک طرف ایثار، تقویٰ اور اخوت بے مثال
دوسری جانب تعصب، حرصِ مسند، حبِ مال
پہلا طبقہ مستحق نعمتِ دنیا و دیں
دوسرے طبقے کا کوئی مرکز و محور نہیں
اے خدا آہِ اثر پر کھول دے بابِ اثر
جیتے جی تعبیر پائے جلد ہی خوابِ اثر
پھر سے دکھلا عہدِ زریں شوکتِ اسلام کا
پھر سے نقارہ بجے دنیا میں تیرے نام کا
کاوش اسماعیل ریحاں کی خدا مقبول کر
غنچۂ اخلاص کو اک خلدِ بریں کا پھول کر

فہرست مضامین

خلافتِ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

❀❀❀

''تاریخِ اُمّتِ مُسلِمہ'' کی خصوصیات ایک نگاہ میں

☆ سیرتِ نبویہ اور سیرتِ صحابہ کے بارے میں ناقابلِ اعتماد مواد سے پاک
☆ حضرت آدم علیہ السلام سے دورِ حاضر تک اوّلین مفصل اردو تاریخ
☆ حصہ اوّل میں علم تاریخ کے تعارف و مبادیات پر مشتمل مقدمہ
☆ حصہ دوئم میں تاریخ کی تحقیق و تنقیح کے قواعد وضوابط پر مشتمل رسالہ
☆ تاریخی روایات کی اصولِ محدثین کے مطابق تحقیق و تنقیح
☆ مغازی اور مشاجرات کی روایات پر اساتذہ وطلبہ حدیث کے لیے نہایت مفید تشریحی مباحث
☆ علم رجال کی روشنی میں روایات کی اسناد کا جائزہ اور رجال کی ابحاث
☆ اہل سنت والجماعت کے اجماعی عقائد ونظریات کی تائید میں موقع بموقع مضبوط عقلی ونقلی دلائل
☆ مختلف فرقوں کے ظہور پر تحقیق اور ان کے غلط عقائد ونظریات پر اصولی تنقید
☆ مشکوک واقعات کا سنداً ومتناً، روایتاً ودرایتاً تجزیہ
☆ دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے واقعات تفصیل کے ساتھ
☆ اسلامی تاریخ کی تمام بڑی جنگوں اور معرکوں کا مفصل تذکرہ
☆ واقعات خصوصاً سیرت اور مغازی کی صحیح توقیت اور عیسوی تقویم سے اس کی مطابقت کی حتی الوسع کوشش
☆ اصل، قدیم ترین اور مستند آخذ سے مواد لینے کا حتی الامکان اہتمام
☆ ہر بات مکمل حوالہ جات کے ساتھ
☆ قابلِ فخر مسلم خلفاء، سلاطین اور مشاہیر کے خلاف باطل فرقوں، سیکولر مؤرخین اور مستشرقین کے پروپیگنڈے کی مدلّل تردید
☆ تاریخ سے حاصل شدہ عبرتوں، نصیحتوں اور اسباق کا موقع بموقع ذکر
☆ مختلف ادوار میں علمی، اصلاحی اور قومی خدمات انجام دینے والی عظیم شخصیات کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ
☆ مشکل الفاظ سے احتراز، رواں ودواں سلیس اردو عبارت
☆ قارئین کو اپنی گرفت میں رکھنے والا دلچسپ اندازِ تحریر
☆ حواشی میں علماء وطلبہ کے لیے نہایت مفید علمی ابحاث

☆ ☆ ☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ ان اوراق کے بارے میں

اپنی تاریخ کا مطالعہ کرنا زندہ قوموں کی نشانی ہے۔ تاریخ ہی وہ زنجیر ہے جو ہمیں اپنے ماضی سے جوڑتی ہے۔ اس وقت دنیا میں حق و باطل کی کش مکش عروج پر ہے۔ دنیا خدا پرستوں اور مادہ پرستوں کے دو بڑے گروہوں میں بٹ چکی ہے۔ مادہ پرست جو درحقیقت شیطان کے پیروکار ہیں، بندگانِ خدا کو اس سچی، اصلی اور سبق آموز تاریخ سے غافل کرنے کی تگ و دو میں ہیں جو اسلام کی بدولت دنیا کے سامنے آئی۔ اس کی جگہ عیش و عشرت کے جویاں بادشاہوں، زر پرست لیڈروں اور ظاہر پسند قوموں کے حالات و واقعات کو کارناموں کی شکل میں بڑھا چڑھا کر اس طرح پیش کیا جارہا ہے کہ تاریخ اور ماضی سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کی آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں اور وہ بھی اللہ، رسول، شریعت اور آخرت کو فراموش کر کے اندھادھند دنیا پرستی اور مال گیری کے راستے پر دوڑ پڑتا ہے۔

تاریخ کو مسخ کرنے کی یہ سازشیں مستشرقین، دانش ورانِ فرنگ اور ان کے مشرقی تلامذہ کے توسط سے تقریباً دو صدیوں سے پورے زور و شور سے جاری ہیں۔ ادھر مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ان کی اکثریت اپنی تاریخ سے مطلقاً غافل ہے۔ ناخواندہ افراد کا تو کہنا ہی کیا، اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگ بھی تاریخ سے واقف نہیں۔

پس ایسے حالات میں اللہ کے بندوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کی اصل تاریخ کو سامنے لائیں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ سچائی کو دنیا تک پہنچائیں اور حقائق کو مسخ کرنے کی کوششیں ناکام بنانے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لے آئیں۔

گزشتہ سترہ اٹھارہ سالوں سے میں ''روزنامہ اسلام'' اور ہفت روزہ ''ضربِ مؤمن'' سمیت مختلف اخبار و جرائد میں تاریخ کے موضوعات پر لکھتا رہا ہوں۔ ملک کے مختلف تعلیمی اداروں اور علمی و فکری پروگراموں میں اسلامی تاریخ کے متنوع پہلوؤں پر گفتگو کا موقع بھی ملا ہے۔ اس دوران مجھ سے براہِ راست، بذریعہ فون اور ڈاک یا ای میلز کے ذریعے جو سوال سب سے زیادہ پوچھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ: ''اسلامی تاریخ کا مطالعہ کس کتاب سے کیا جائے؟''

یا...... ''کوئی ایک کتاب بتائیے جس میں آج تک کی مکمل اسلامی تاریخ مل جائے۔''

اس سوال کا جواب دینے میں مجھے ہمیشہ بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس وقت مارکیٹ میں ایسی کوئی

کتاب دستیاب نہیں ہے جس میں دورِ حاضر تک کے مسلمانوں کی تاریخ کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہو۔ نیز جو کتب موجود ہیں ان میں ایک باب تاریخی اغلاط سے ملوث ہے۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ مگر یہ کمزوری ہے ضرور۔ یہ کمزوری سیرتِ طیبہ اور صحابہ کرام کی تاریخ سے متعلق ہے۔ سیرت کے بارے میں ایسے متعدد مشہور واقعات جو تحقیقی معیار سے ساقط ہیں، ان تواریخ میں شامل ہیں۔ اسی طرح حضرات خلفائے راشدین، حضرت معاویہ، حضرت حسنین کریمین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے حالات کو بھی بعض ضعیف و مشکوک روایات میں بہت بگاڑ بیان کیا گیا ہے۔ کماحقہٗ تحقیق نہ کیے جانے کے باعث ایسی غلط روایات کا خاصا حصہ تاریخ میں شامل چلا آرہا ہے۔

اس الیے کی ایک بڑی وجہ وہ عربی و فارسی تواریخ ہیں جو اسلامی خلافت کے زوال اور اہلِ علم میں تحقیقی مادہ کم ہونے کے بعد منظر عام پر آئیں جن میں اسناد حذف کر دی گئی ہیں جبکہ انداز دلچسپ ہے۔ اس بناء پر وہ زیادہ مقبول ہو گئیں۔ استعمار کے غلبے کے دوران یورپی زبانوں میں مسلم دنیا کی تواریخ کا سلسلہ شروع ہوا تو اسی مواد کو من وعن لے لیا گیا۔ اکثر اردو اور انگریزی تاریخیں اسی قسم کی ہیں، یعنی ترجمہ ہے، تحقیق نہیں۔ بلکہ بعض مؤرخین نے ترجمے کے ساتھ ایسے متعصبانہ تبصروں سے بھی گریز نہیں کیا جو اسلامی تاریخ کے روشن اَدوار کو داغ دار بنا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلم خلفاء اور سلاطین میں سے بہت سی قابلِ فخر شخصیات کو مروجہ تاریخوں میں بے رحم، حریص اور ظالم حکمران کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے جو حقائق کے بالکل خلاف ہے۔

مجموعی طور پر تاریخِ اسلام کی مروجہ کتب میں چار بڑی کمزوریاں ہیں:

❶ اکثر کتب سیرتِ نبوی سے دورِ بنوعباس تک کے حالات پر مشتمل ہیں۔ اس سے آگے نہیں بڑھ پاتیں۔ بعض کتب ترک عثمانی خلافت کے خاتمے تک ہیں۔ مگر اس زمانے کو بھی اب لگ بھگ ایک صدی ہو گئی ہے۔ اردو میں دورِ حاضر تک یکجا تاریخ ڈھونڈے نہیں ملتی۔ ضرورت ہے کہ موجودہ دور تک ساتھ دینے والی تاریخ مرتب کی جائے۔

❷ یہ کتابیں مشکوک مواد سے آلودہ ہیں۔ اگرچہ اردو میں دو کتب معیار کے لحاظ سے نسبتاً بہتر ہیں: ایک تاریخِ اسلام شاہ معین الدین ندوی۔ دوسری تاریخِ ملت۔ ان کتب میں معلومات کا جو قابل قدر سرمایہ ملتا ہے وہ اپنی جگہ نہایت قیمتی ہے۔ مگر ان میں یہ کمزوری بہرحال موجود ہے کہ سیرت اور دورِ صحابہ کی تاریخی روایات کو اہتمام سے نہیں دیکھا گیا اور مشکوک روایتوں کی اسناد کو جانچنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیرت مطہرہ اور کردارِ صحابہ کے متعلق کئی بے سروپا روایات ان کا حصہ بن گئیں۔ اسی طرح بنواُمیّہ، بنوعباس اور بعد کے مسلم سلاطین کے بارے میں بھی کچھ مشکوک مواد ان کتب کا حصہ ہے۔ پس اپنی افادیت کے باوجود ان کتب کے بعض مقامات تحقیق کے لحاظ سے غیر معیاری ہیں۔ اکبر شاہ نجیب آبادی کی ''تاریخِ اسلام'' بھی بہت مشہور ہے مگر یہ تمام کمزوریاں اس میں بھی ہیں۔ پھر اس میں کوئی حوالہ سرے سے نہیں دیا گیا جو بہت بڑی خامی ہے۔

❸ ان کتب کی زبان پرانی اور عام قاری کے لیے بوجھل ہو گئی ہے۔ نیز ان میں بعض ایسی تفصیلات ہیں جو دورِ حاضر

کے لحاظ سے غیر ضروری ہیں۔

❹ یہ کتب دورِ جدید کے آدمی کی تسلی کے لیے کافی نہیں۔ان کے مطالعے سے ان بیشتر شکوک کا ازالہ نہیں ہوتا جونسلِ نو کے ذہن میں پیدا ہو چکے ہیں بلکہ اس کا امکان ہے کہ یہ تواریخ پڑھ کر ایسے شبہات میں اضافہ ہو جائے۔اسی طرح بہت سی وہ تفاصیل ان تاریخی کتب میں مذکور نہیں جن کی ایک عام انسان اور عام مسلمان کو ضرورت ہے اور جنھیں پڑھ کر وہ عبرت و نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔

اس صورت حال میں بہت مشکل ہے کہ کسی کو یہ کہا جائے کہ:

''آپ فلاں تاریخ کا بلاتردد مطالعہ کر لیں کہ وہ مکمل اور ہر لحاظ سے مستند ہے۔''

دوسری طرف دورِ حاضر میں جیسے جیسے اسلامی تحریکوں، تنظیموں اور دینی مدارس و مکاتب کی محنت سے نوجوان طبقہ بڑی تعداد میں دین کی طرف راغب ہو رہا ہے وہاں ان میں اپنی تاریخ سے دلچسپی بھی بڑھ رہی ہے۔ان نوجوانوں میں دینی مدارس کے طلبہ کے علاوہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ و طالبات بھی شامل ہوتے ہیں جو اس سلسلے میں کسی صحیح رہنمائی سے محروم ہونے کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں۔یہ سب پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی تاریخ کا مطالعہ کہاں سے اور کیسے کریں؟

علمائے کرام یا عربی دان طلبہ کو میرا مشورہ یہ ہوتا تھا کہ وہ تاریخ ابن خَلدون یا البدایہ والنہایہ کا مطالعہ کر لیں کیوں کہ یہ ایسے خرخشوں سے بڑی حد تک پاک ہیں تاہم بعض کمزوریاں ان میں بھی ہیں۔اردو دان نوجوانوں کو میں یہ مشورہ دیتا تھا کہ آپ تاریخِ ملت یا تاریخِ اسلام شاہ معین الدین ندوی کا مطالعہ کریں مگر سیرتِ نبوی یا دورِ صحابہ سے متعلق جو بات مشکوک یا عجیب لگے اسے نوٹ کر کے علمائے کرام سے اس کی حقیقت پوچھ لیں یا ہمارے اکابر نے سیرت النبی اور صحابہ کی سیرت پر الگ الگ جو کتب لکھی ہیں، ان کا مطالعہ کر لیں۔

تاہم میرے نزدیک یہ ضرورت اہمیت اختیار کرتی چلی گئی کہ ہمارا کوئی ادارہ ازسرِ نو اپنی تاریخ کو مرتب کرنے کے عظیم کام کا بیڑا اٹھائے۔ایسی تاریخ پیش کرے جو خلافِ تحقیق مواد سے پاک، باحوالہ اور معتبر ہو، جسے ہر کوئی پڑھ سکے اور فائدہ اٹھا سکے اور جو دورِ حاضر کے حالات تک مکمل بھی ہو۔

سالہا سال اس انتظار میں گزر گئے کہ کوئی ادارہ یہ کام شروع کرے۔میں خود اس دوران سلطان جلال الدین اور سلطان صلاح الدین ایوبی پر کام کر رہا تھا، اس لیے اس موضوع پر الگ سے کام کرنے کا وقت نہیں نکال سکتا تھا۔پھر صحافتی اور تدریسی ذمہ داریاں بھی سر پر تھیں جب کہ یہ محاذ ایسا تھا کہ اس کے لیے تمام کاموں سے فارغ ہو کر دن میں کم از کم آٹھ دس گھنٹے کتب کے سمندر میں ڈوبنا اور کئی سال تک بلا ناغہ کام کرنا ضروری تھا۔

کئی برس گزر گئے۔اس دوران اہل علم سے اس کام کی ضرورت پر گفتگو ہوتی رہی۔سبھی بھرپور تائید کرتے تھے کہ یہ کام ہونا چاہیے مگر اس کام کو شروع کرنے کی راہیں کھل نہ پائیں۔دراصل مالکِ حقیقی نے ہر کام کے آغاز و انتہاء کا ایک

وقت مقرر کر دیا ہے۔ انسان لاکھ چاہے مگر جب تک اس کا حکم نہ ہو، ہمارے ارادوں میں جان نہیں پڑتی اور خوابوں کو تعبیر نہیں ملتی۔

جب میں ''شیرِ خوارزم'' کی تصحیح اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے مسودے پر کام سے فارغ ہوا تو سوچ بچار اور مشوروں کے بعد اللہ پر توکل کر کے خود اس کام کے لیے کمر کس لی۔ کیوں کہ:

- میرے دل میں اس کام کا تقاضا اتنا شدید تھا کہ دیگر کام میری نظر میں ثانوی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔
- مجھے یہ کام نہ کرنے کی صورت میں اخروی باز پرس کا خدشہ تھا۔ اپنے معاشرے خصوصاً تعلیم یافتہ طبقے کو سینکڑوں تاریخی ابحاث میں غلط فہمی میں مبتلا دیکھنے کے بعد مجھ پر یقیناً لازم تھا کہ صحیح تاریخ سامنے لانے کی کوشش کروں۔ یہ قومی ہمدردی اور دینی ذمہ داری کا تقاضا تھا جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔
- موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ خدشہ تھا کہ جلد کام شروع نہ کیا گیا تو شاید کہیں مہلتِ عمر تمام نہ ہو جائے۔
- اپنے بزرگوں، اساتذہ اور اکابر سے اس عزم کا اظہار کیا تو سب نے حوصلہ افزائی کی اور دعائیں دیں۔
- اس کام کے لیے جس فراغت کی ضرورت تھی، اللہ کی طرف سے اس کے سامان پیدا ہوتے جا رہے تھے۔

رب العزت کی طرف سے اس کام کے آغاز کا وقت آیا تو اس نے میرے مخلص اور قدیم دوست مولانا محمد الطاف میمن کو میرا ہم فکر کر دیا۔ جامعہ معہد الخلیل الاسلامی میں دورِ طالب علمی سے ان سے تعلق چلا آ رہا ہے۔ جامعۃ الرشید کراچی میں تدریسی خدمات کے دوران بھی ہم ساتھ ساتھ رہے۔ اس تعلق کو جو بیس برس سے زیادہ پرانا ہے، اللہ نے اس اہم دینی خدمت کے آغاز کا ذریعہ بنا لیا۔ ایسے احباب کی معاونت اور اساتذہ واکابر کی دعاؤں کے ساتھ ۱۴۳۲ھ (۲۰۱۱ء) میں راقم نے اللہ کا نام لے کر اس موضوع پر قلم اٹھا لیا۔ میرے سامنے اب ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ تھی جس میں مجھے غوطہ زن ہونا تھا۔ سینکڑوں کتب اور لاکھوں صفحات پر مشتمل مواد سے عبارتیں چننا تھیں، اور انہیں اردو میں ڈھال کر بہترین ترتیب سے قارئین کے لیے پیش کرنا تھا۔

جب تک میں کراچی میں تھا، اس کام کے ساتھ ''روزنامہ اسلام'' میں ''خواتین کا اسلام'' کے مدیرِ مسئول کی ذمہ داریاں بھی ادا کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ''جامعۃ الرشید، احسن آباد، کراچی'' میں تدریسی خدمات بھی جاری تھیں۔ اس کے باوجود میں اس کام کے لیے یومیہ چار تا پانچ گھنٹے نکالتا تھا۔ تاہم کراچی کی ناسازگار آب وہوا میں میری صحت مسلسل گرتی جارہی تھی، مجھے خدشہ تھا کہ کہیں یہ کام مکمل ہونے سے پہلے ہی اعصاب جواب دے جائیں۔

آخر فروری ۲۰۱۳ء میں صحت کی خرابی، شہر کے ہنگامہ خیز ماحول اور کچھ دیگر عوارض کی وجہ سے میں نے پنجاب منتقل ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ یہاں آ کر پرسکون ماحول میں صحت بہتر ہوئی اور کام پوری یکسوئی سے ہوا۔ روزانہ آٹھ سے بارہ گھنٹے کام کا معمول بن گیا۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ اس کی تکمیل کی توفیق دے دے۔

بعض اہلِ علم کے مشورے سے اس کاوش کو ''تاریخِ اُمتِ مسلمہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ ''اُمتِ مسلمہ'' ہی کی

تاریخ ہے۔ آج تک ''تاریخِ اسلام'' کے نام پر جو بھی مواد پیش کیا گیا ہے وہ اصل میں اسلام کی نہیں، مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ مذہب کی نہیں، مذہب کے پیروکاروں کی تاریخ ہے۔ بہتر تھا کہ ''تاریخِ اسلام'' کو ''تاریخِ مسلمین'' کہا جاتا، تاکہ کسی کو بعض مسلمانوں کے غلط کردار سے اسلام کے بارے میں کوئی غلط رائے پیدا ہونے کا خدشہ نہ رہے۔ مگر اب یہ اصطلاح ایسی رائج ہوگئی ہے کہ اسے ترک یا تبدیل کرنا غالباً بہت مشکل ہے۔

بہرحال ہم نے اسی نکتے کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ''تاریخِ اُمتِ مُسلمہ'' کا نام دیا ہے۔

''تاریخِ اُمتِ مُسلمہ'' چھ حصوں پر محیط ہوگی جن کی ترتیب یہ ہے:

❶ پہلا حصہ ''علمِ تاریخ کے تعارف اور مبادیات'' پر مشتمل ایک رسالے اور پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

پہلا باب: انبیائے سابقین علیہم السلام، قدیم اقوام اور ماقبل از اسلام دنیا کے حالات سے متعلق ہے۔

دوسرا باب: سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے۔

تیسرا باب: خلافتِ راشدہ کی فتوحات اور عروج کے احوال پر مشتمل ہے۔

چوتھا باب: خلافتِ راشدہ کی خصوصیات اور اسلامی طرزِ حکومت کے قواعد وضوابط کی وضاحت کرتا ہے۔

پانچواں باب: عہدِ رسالت اور دورِ خلافت راشدہ کی بعض اہم شخصیات اور اہلِ بیت کے احوال پر مشتمل ہے۔

❷ دوسرے حصے میں شہادتِ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، خلافت علی رضی اللہ عنہ، جنگ جمل وصفین، تحکیم دُومۃ الجندل، ظہورِ خوارج، سبائی فتنے اور شہادت علی رضی اللہ عنہ جیسے موضوعات پر تحقیقی کام کیا گیا ہے۔ نیز اس میں عروج اور فتوحات کے اس دوسرے دور کا احاطہ بھی کیا گیا ہے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیس سالوں میں اُمتِ مسلمہ کو نصیب ہوا۔

اسی حصے میں دورِ یزید بن مُعاویہ سے خلافتِ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تک کے حالات کی تحقیق کی گئی ہے اور اس دوران پیش آنے والے حوادث وآلام، سیاسی مناقشات اور خانہ جنگیوں کا پوری احتیاط اور روایات کی مکمل چھان بین کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ آخری باب میں عہدِ صحابہ سے متعلق شکوک وشبہات کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔

❸ تیسرے حصے کے پہلے باب میں عبدالملک بن مروان سے لے کر بنوامیہ کی خلافت کے اختتام تک کے حالات ہیں۔ دوسرا باب خلافتِ بنوعباس کے دورِ عروج اور زوال سے متعلق ہے۔

تیسرے باب میں خلافتِ اسلامیہ کے مقابل مختلف فرقوں کی حکومتوں کا ذکر ہے۔

❹ چوتھے حصے میں سلجوقی، ایوبی، خوارزم شاہی، غزنوی، غوری، خلجی اور تغلق سلاطین اور مسلم ہسپانیہ کے حالات ہیں۔

❺ پانچویں حصے میں خلافتِ عثمانیہ، سلطنتِ مغلیہ ہندوستان اور استعماری طاقتوں کے تسلط کی سرگزشت ہے۔

❻ چھٹا حصہ تحریکاتِ آزادی اور جدید دنیائے اسلام سے متعلق ہوگا۔

جہاں تک مآخذ کا تعلق ہے تو انبیائے سابقین، سیرتِ نبویہ اور صحابہ کی فتوحات کے حالات جو اس حصے میں پیشِ خدمت ہیں، زیادہ تر، ذخیرۂ حدیث، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، سیرِ صحابہ اور تاریخ کی متداول کتب سے لیے گئے ہیں۔

انبیائے سابقین کے حالات میں ہماری تاریخ اسرائیلی روایات سے بری طرح آلودہ ہے۔ اگرچہ اہلِ اصول کے نزدیک ہر اسرائیلی روایت قابلِ ترک نہیں ہے بلکہ کتاب وسنت سے عدم تصادم کی شرط کے تحت انہیں قبول کیا جاسکتا ہے تاہم بہت سی اسرائیلی روایتیں اس شرط کو نظر انداز کر کے ہماری تواریخ میں شامل کر لی گئی ہیں۔ راقم نے پوری کوشش کی ہے کہ ایسی روایات سے اجتناب کیا جائے اور حتی الامکان حضرات انبیائے کرام کے حالات کا زیادہ سے زیادہ حصہ قرآن مجید اور کتبِ حدیث سے پیش کیا جائے۔

سیرت کے باب میں بھی یہ پیش نظر رہا ہے کہ زیادہ تر مواد کتبِ حدیث اور صحیح روایات سے لیا جائے تاہم بخاری، مسلم اور صحاحِ ستہ کی دیگر کتب کے علاوہ دلائل النبوۃ بیہقی، تفسیر ابن کثیر، صحیح سیرت نبویہ ابنِ کثیر، سیرت محمد بن اسحٰق، سیرت ابنِ ہشام، سیرت ابنِ حبان، سیرت حلبیہ، زاد المعاد، الاصابہ، اسد الغابہ، طبقات ابن سعد، الاستیعاب، تاریخ طبری، فتوح البلدان، فتوح الشام اَزْ دی، البدایہ والنہایہ، الکامل فی التاریخ، تاریخ ابن خلدون، تاریخ اسلام ذہبی، تاریخ خلیفہ بن خیاط، المنتظم لابن جوزی، تاریخ الخلفاء اور المختصر فی اخبار البشر بھی پیش نظر رہی ہیں۔

برصغیر کے محققین میں سے علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی سیرت النبی ﷺ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کی سیرت مصطفیٰ ﷺ، حضرت قاضی سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ کی رحمۃ للعالمین ﷺ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی نبی رحمت ﷺ اور رئیس التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمہ اللہ کی حیاۃ الصحابہ سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔ دورِ حاضر اور عہدِ قریب کے عرب دانشوروں: ڈاکٹر علی محمد الصلابی اور ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری کی کتب بھی سامنے رہی ہیں۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی مختصر سیرت الرسول ﷺ بھی بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔

خلفائے راشدین کے دور کی فتوحات کے لیے راقم نے روایات میں قدرے توسّع سے کام لیا ہے کہ ان واقعات میں چند مقامات کے سوا کسی کا کوئی اختلاف نہیں رہا۔ ویسے بھی اس ضمن میں جعل سازی کا امکان کم ہے، کیوں کہ یہ فتوحات ایک ایسی زمینی حقیقت ہیں کہ اگر کوئی صحیح روایت نہ ہو تو بھی کوئی ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ تاہم ایسا بھی نہیں کہ ہر گری پڑی روایت کو لے لیا گیا ہو بلکہ محدثین اور سیرت نگاروں کے اصول وضوابط کو ملحوظ رکھ کر حتی الامکان چھان بین اور احتیاط کی گئی ہے۔ اپنے بعض اساتذہ، بزرگوں اور احباب سے کتاب کے اہم مندرجات پر مشورے بھی ہوتے رہے۔ ان حضرات کی رہنمائی اور ہمت افزائی سے اس کام کو بہتر بنانے میں غیر معمولی مدد ملی۔

قارئین کو اس کاوش میں بعض چیزیں ایک نئی ترتیب یا کسی مختلف شکل میں دکھائی دیں گی۔ میری درخواست ہے کہ ایسے مقامات پر کسی ذہنی انتشار کا شکار ہوئے بغیر حوالہ جاتی کتب کے مندرجات کو سامنے رکھ کر غیر جانب داری سے دلائل پر غور فرمالیں۔ ان شاء اللہ مطمئن ہو جائیں گے۔

یہاں میں بطورِ خاص یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ اوراق محض ایک تاریخ اور ایک تحقیق نہیں، ایک دینی دعوت بھی ہیں۔ لہٰذا پوری کوشش کی گئی ہے کہ صحیح اور تنقیح شدہ تاریخ کے ضمن میں قارئین کو اسلام کے سیاسی و دعوتی مزاج سے

بخوبی آشنا کرایا جائے۔ اسلام سخت ترین حالات میں کس طرح ہمت وجرأت اور تدبیر و مصلحت کے امتزاج کی تعلیم دیتا ہے؟ اسلام کس طرح دعوت و جہاد کی ترغیب دیتا ہے؟ اسلاف کی زندگیاں کس طرح اسلام کی اشاعت وحفاظت اور جہاد کے لیے وقف رہتی تھیں؟ اسلام کس طرح داخلی خلفشار، سیاسی انتشار اور خانہ جنگی سے روکتا ہے؟ اسلامی اصول سیاست کیا ہیں؟ ان کی خلاف ورزی سے اُمتِ مُسلمہ کو کن کن بحرانوں کا شکار ہونا پڑا ہے؟ ان سوالات کے جوابات تاریخ کے ضمن میں پوری اہمیت کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ یوں مقدور بھر کوشش کی گئی ہے کہ قارئین میں ایسی روح پیدا کی جائے کہ وہ اسلاف کی طرح اسلام پر چلنے اور اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ ہوں۔ اسی لیے قارئین کو سیرتِ نبوی اور دورِ خلافتِ راشدہ میں دعوت و جہاد کے حالات نسبتاً زیادہ تفصیل سے ملیں گے۔

حصہ دوئم میں قارئین کو اُمتِ مُسلمہ کی اندرونی کش مکش کے مستند حالات ملیں گے۔ چونکہ ان قضایا میں تاریخی اختلافات بکثرت ہیں، لہٰذا واقعات کو پوری چھان بین کے ساتھ نقل کیا گیا ہے اور غلط روایات پر جرح کی گئی ہے۔

جیسا کہ مؤرخین کا طریقہ ہے کہ قوموں کے حالات کو حکمرانوں کے حالات کے ضمن میں بیان کیا جاتا ہے، راقم نے بھی حکمرانوں اور حکومتوں کے تحت ابواب قائم کیے ہیں تاہم یہ بھی ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے کہ اُمت کے تحفظ و تربیت اور اس کی ترقی ونشو ونما میں ان بزرگوں کا کردار حکمرانوں سے کم نہیں، جو چشمۂ علوم وفنون کے ساقی، قافلۂ تزکیہ وسلوک کے حدی خواں اور میدانِ دعوت وعزیمت کے رہنما تھے اور ان حوالوں سے اُمت کبھی ان کے احسانات کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ لہٰذا ایسی بلند پایہ محسن شخصیات کے حالات کو بطورِ خاص ہر زمانے میں اس انداز سے ذکر کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے ان کی سیرت سے تربیتِ کردار کا کام لے سکیں۔ یہ ہماری اس کاوش کا ایک اہم مقصد ہے۔

قارئین سے دست بستہ گزارش ہے کہ اس تاریخ کو محض حصولِ معلومات کے لیے نہ پڑھیں بلکہ اس سے اپنی زندگی کے لیے راہِ عمل چننے کا کام لیں اور اپنے مزاج وکردار میں تبدیلی لانے کا ذریعہ بنائیں۔

سیرتِ نبویہ کو پیش کرتے وقت راقم نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ واقعات کی ''توقیت'' کی زیادہ سے زیادہ تحقیق اور صحیح ترین وقت کی تخریج کی جائے۔ راقم کو ماہرِ تقویم یا ماہرِ فلکیات ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں۔ البتہ اس فن کے ماہرین کی کتب پیشِ نظر رہی ہیں۔ اس بارے میں راقم نے درجِ ذیل کتب سے بطورِ خاص استفادہ کیا ہے:

1. سیرت نبوی توقیت کی روشنی میں (مولانا اسحٰق النبی علوی مرحوم)
2. تقویم تاریخی (مولانا عبدالقدوس ہاشمی مرحوم)
3. تقویم عہد نبوی (جناب علی محمد خان مرحوم)

مولانا اسحٰق النبی علوی، رام پور (ہندوستان) کے ایک محقق عالم تھے۔ میرے علم کے مطابق وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے سیرت کی توقیت میں ''شمسی قمری تقویم'' اور ''خالص قمری تقویم'' کے فرق کو پہلی بار دلائل سے اس طرح واضح کیا کہ انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ حدیث وسیرت کی توقیت کی بہت سی مشکلات اس نظریے کے مطابق حل ہو جاتی ہیں۔

مولانا اسحاق النبی علوی نے یہ کام ۱۹۶۰ء کے عشرے میں کیا تھا۔ گزشتہ عشرے میں علی محمد خان مرحوم نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے بھی ''تقویم تاریخی'' کے نام سے بہترین کام کیا ہے جس کا مقدمہ بھی نہایت معلومات افزا ہے۔ ہجری اور عیسوی تاریخوں کی تخریج کے لیے راقم نے متعدد مواقع پر چند سوفٹ ویئرز بھی استعمال کیے ہیں۔ اس کے باوجود ''توقیت'' کی تخریجات میں غلطی کا امکان ہمیشہ رہتا ہے اور یہاں بھی ہے۔

راقم نے تاریخ کے تعارف پر اپنا ایک رسالہ بطور مقدمہ شامل کر دیا ہے تاکہ تاریخ کی اہم مبادیات اور ضروری اصول ذہن نشین ہو جائیں۔ اس طرح تاریخ کو پڑھنے اور سمجھنے میں خاصی مدد ملے گی۔ تاریخ کے مختلف مراحل کے اختتام پر ''اسباق تاریخ'' بھی پیش کیے گئے ہیں جو قدر دان قارئین کے لیے پوری کتاب کا نچوڑ ثابت ہوں گے۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے دوست، ''المنہل'' کے ڈائریکٹر مولانا محمد الطاف میمن، کمپیوٹر مفتی بھائی حامد علی کھوکھر اور ''ادارۃ النور'' کے منیجر مولانا محمد علی کا شکریہ ادا نہ کروں کہ ان کے تعاون، دلچسپی اور حوصلہ افزائی سے میں اس کام کے لیے خود کو یکسو کر سکا۔

اتنے بڑے کام کے لیے مطلوب کتب ایک جگہ جمع ہو جانا کوئی آسان بات نہ تھی مگر متعدد مشفق بزرگوں اور دردمند احباب نے اس سلسلے میں غیر معمولی تعاون فرمایا اور مطلوبہ کتب فراہم کرتے رہے۔ اگر ان سب کا اس قدر بھرپور تعاون نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ مجھے اتنی کتابیں میسر آسکتیں۔ مسودے کی اصلاح اور تحقیق و تصحیح میں مفتی عبدالخالق صاحب حفظہ اللہ نے غیر معمولی لگن سے کام کیا۔ اللہ ان سب حضرات کو اپنے لطف و کرم کے شایانِ شان جزائے خیر نصیب فرمائے۔ ''تاریخِ اُمتِ مسلمہ'' کے زیر نظر حصے پر کام کا آغاز ۲۰۱۱ء میں ہوا تھا اور ایک سال میں کام پورا ہو گیا تھا مگر اعادۂ نظر، اصلاحات، اضافوں، حواشی پر کام اور پروف ریڈنگ کا سلسلہ ۲۰۱۷ء کے اختتام تک جاری رہا۔

ادارہ المنہل جو اس کاوش کو شائع کر رہا ہے یہ عزم کیے ہوئے ہے کہ اسلامی تاریخ کو خلافِ تحقیق باتوں سے پاک کر کے آسان اور دلچسپ شکل میں قوم کے ہر طبقے کے لیے پیش کرتا رہے گا۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اس ادارے کی ترقی، اس کے کام کی عنداللہ قبولیت، اس کے مالکان، کارکنان اور معاونین کی صحت و عافیت اور اس کام کی تکمیل کے لیے خصوصی دعائیں فرمائیں۔ اہل علم سے گزارش ہے کہ کسی فروگزاشت، غلطی یا تحقیقی کمزوری سے آگاہ کرنا یا کوئی مشورہ دینا چاہیں تو بذریعہ ای میل مطلع فرمائیں۔ بندہ تہہِ دل سے شکر گزار ہوگا۔

واللہ المستعان

محمد اسماعیل ریحان

(rehanbhai@gmail.com)

۷ر جمادی الاولیٰ ر ۱۴۳۹ھ

25 جنوری 2018ء

علامات و رموز اورحوالوں کی مراجعت کے لیے اِشارات

☆ م ...... متوفی/متوفی (تاریخ وفات بیان کرنا مقصود ہے۔)[1]

☆ تر ...... ترجمہ (حالاتِ زندگی)

☆ ۱۲۲/۳ ...... جلد نمبر تین، صفحہ نمبر ۱۲۲ (نشان/ کے دائیں طرف جلد نمبر، بائیں طرف صفحہ نمبر)

☆ ۲ص ۳۳۳ ...... جلد نمبر دو، صفحہ ۳۳۳ (ص کے دائیں طرف جلد نمبر، بائیں طرف صفحہ نمبر)

☆ ص ...... صفحہ نمبر

☆ ج ...... جلد نمبر

☆ ح ...... حدیث نمبر، روایت نمبر

☆ ط ...... مطبع/ناشر

☆ تخ ...... تخریج

☆ ت ...... تحقیق

تنبیہات:

❶ بہت سے مقامات پر ایک ساتھ دو یا زائد کتب کے حوالے نقل کر دیے گئے ہیں۔ ایسا عموماً اس بناء پر کیا گیا ہے کہ قارئین کو ان میں سے جو مأخذ دستیاب ہو، اس میں دیکھ لیں۔ مگر بعض اوقات اس ضرورت کی بناء پر بھی متعدد مآخذ کا حوالہ ایک ساتھ دے دیا گیا ہے کہ واقعے کے اجزاء منتشر شکل میں کچھ ایک مأخذ میں ہیں اور کچھ دوسرے میں۔ اس لیے اگر مراجعت کے وقت قارئین کو ایک مأخذ میں پورا واقعہ متن میں پیش کردہ شکل کے مطابق نہ ملے تو باقی مآخذ کو بھی دیکھ لیا جائے۔ ان شاءاللہ تھوڑی سی محنت سے پورا واقعہ اسی شکل میں سامنے آجائے گا۔

❷ کوشش کی گئی ہے کہ حوالوں کے لیے کتب کے نئے، تحقیق شدہ اور زیادہ مروج نسخوں کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ آخر میں ''کتابیات'' سے معلوم ہو جائے گا کہ کس مطبع کا نسخہ استعمال کیا گیا ہے۔ قارئین اسی مطبع کے نسخے کو دیکھیں گے تو ان شاءاللہ فوراً اپنی مطلوبہ چیز پالیں گے۔ ہاں بعض اوقات ایک ہی مطبع کی کسی کتاب کے نئے ایڈیشن میں دو چار صفحات کی کمی بیشی ہو جاتی ہے، اس لیے قارئین کو محولہ صفحے پر مطلوبہ مواد نہ ملے تو دو چار صفحے آگے پیچھے بھی دیکھ لیں۔

❸ اگر نسخوں کے فرق کی وجہ سے کوئی واقعہ محولہ جلد اور صفحے میں نہ ملے تو اکثر کتب تاریخ میں اسے سن ہجری کے تحت تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یا حکومتوں اور حکمرانوں کے تحت تلاش کر لیں۔ ان شاءاللہ ناکامی نہیں ہوگی۔

---

[1] اس لفظ کو مُتَوفِّي اور مُتَوَفّٰی (فا کے کسرہ یا فتحہ کے ساتھ) دونوں طرح پڑھنا درست ہے جیسا کہ علامہ سخاویؒ نے اس کی وضاحت کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے: (الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ للسخاوی، ص ۸۵، ط دار الکتب العلمیۃ بیروت)

علم تاریخ کی مبادیات پر ایک مختصر و منضبط رسالہ

مولانا محمد اسماعیل ریحان

استاذ تاریخ اسلام، جامعۃ الرشید کراچی

علم تاریخ کا تعارف

تاریخ وہ علم ہے جس میں زمانے کے حوادث وواقعات پر وقت کی ترتیب ملحوظ رکھ کر بحث کی جاتی ہے اور قوموں، ملکوں، بادشاہوں اور مشہور شخصیات کے احوال بیان کیے جاتے ہیں۔

تاریخ کا بنیادی مقصد گزشتہ واقعات سے عبرت حاصل کرنا اور دوسروں کے تجربات سے سبق سیکھنا ہے۔ تاریخ ماضی کے تجربات کی روشنی میں حال و مستقبل کے لیے بہتر لائحہ عمل طے کرنے میں مدد دیتی ہے۔ جو قوم بھی دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی خواہاں ہوتی ہے وہ اپنی تاریخ سے رابطہ استوار رکھتی ہے۔ جو قوم اپنا ماضی بھلا دیتی ہے وہ دنیا میں کوئی مقام پانا تو درکنار اپنا تشخص تک باقی نہیں رکھ سکتی۔

مبادیاتِ تاریخ

تاریخ، لغت میں:

عربی زبان میں تاریخ کا لغوی مطلب ہے: ''وقت بتانا'' (الاعلام بالوقت)

اہل عرب کہا کرتے ہیں: "اَرَخَ الکتابَ یأرُخہ اَرْخاً." (نیز ایراخاً و تأریخاً)

یعنی خط پر وقت لکھا (تاریخ درج کی) یہ بنوقیس کی زبان ہے۔ لغتِ بنوتمیم میں ہمزہ کی جگہ واؤ آتا ہے۔ ①

تاریخ اصطلاح میں:

تاریخ کی اصطلاحی تعریف میں کئی اقوال ہیں: علامہ ابنِ خلدون رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"اِخْبَارٌ عَنِ الْاَیَّامِ وَ الدُّوَلِ وَالسَّوَابِقِ مِنَ الْقُرُوْنِ الْاُوَلِ."

''گزشتہ ایام، گزشتہ حکومتوں اور گزرے ہوئے اَدوار کے لوگوں کی خبر۔'' ②

علمِ تاریخ کی تعریف:

"هُوَ عِلْمٌ يُبْحَثُ فِيْهِ عَنِ الزَّمَانِ وَ اَحْوَالِهٖ وَعَنْ اَحْوَالِ مَا يَتَعَلَّقُ بِهٖ مِنْ حَيْثُ تَعْيِيْنِ ذٰلِكَ وَ تَوْقِيْتِهٖ."

''ایسا علم جس میں وقت کے تعین کے ساتھ زمانے، اس کے حالات اور متعلقات کے احوال پر بحث کی جائے۔'' ③

---

① الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ: ص ۱۴؛ الصحاح تاج اللغة لابی نصر الجوهری، ماده: ارخ: ۱/۴۱۸، ط دار العلم

② تاریخ ابن خلدون: ۱/ ۶، مقدمه، ط دار الفکر

③ المختصر فی علم التاریخ للکافیجی: ص ۵۵

علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے یہ تعریف نقل کی ہے: "اَلْبَحْثُ عَنْ وَقَائِعِ الزَّمَانِ بِالتَّوْقِيتِ"
"وقت کی ترتیب و تعیین کے ساتھ زمانے کے واقعات کی جستجو کرنا۔" ①

☆☆☆

تاریخ اور دوسرے فنون میں فرق:

آپ جانتے ہیں کہ واقعات تو ادب کی کتب میں بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ احادیث میں بھی بہت سے واقعات آتے ہیں مگران کو تاریخ کی کتاب نہیں کہا جاتا؛ کیوں کہ حدیث یا ادب میں واقعات زمانے کی ترتیب سے نہیں ہوتے۔ اکثر جگہ واقعے کا مہینہ یا سال بھی بیان نہیں کیا جاتا۔ ادب میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک واقعہ سامنے آجائے اور اس سے پڑھنے والا کوئی سبق حاصل کرے۔ حدیث میں واقعات کو فقہی احکام و نکات، سند کی حیثیت یا رواۃ کے ناموں کے لحاظ سے جمع کیا جاتا ہے جیسا کہ کتب حدیث کے ہر مدون کے سامنے اپنے اپنے اہداف ہوتے ہیں۔

تاریخ ایک الگ فن ہے۔ اس میں واقعات کو اس طرح ترتیب سے جمع کر کے پیش کرنے پر توجہ دی جاتی ہے کہ جو واقعہ پہلے ہوا ہے وہ پہلے سامنے آئے جو بعد میں ہوا ہے وہ بعد میں آئے۔ اکثر تواریخ کا انداز یہی ہے کہ پہلے محرم سن ۱ ہجری کے واقعات بیان ہوں گے، پھر صفر اور ربیع الاول کے۔ پورے سال کے واقعات بیان کر کے پھر سن ۲ ہجری کے واقعات شروع کیے جائیں گے۔ اسی ترتیب سے مؤرخ اپنے دور تک حالات بیان کرتا چلا جائے گا۔

☆☆☆

موضوع:

تاریخ کا اصل موضوع یعنی وہ مواد جس پر ایک مؤرخ کی نگاہ ہمیشہ مرکوز رہتی ہے، قوموں، ملکوں اور مشہور شخصیات کے حالات ہیں۔ علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے اسی کو اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا ہے:

"مَوْضُوْعُهُ الْإِنْسَانُ وَالزَّمَانُ."

تاریخ کا موضوع "انسان اور زمانہ" ہے۔ ②

یعنی کس کس دور میں انسان کو کیا کیا واقعات و حالات پیش آئے۔ ایک مؤرخ ہمیشہ اسی کی تلاش میں رہتا ہے، سو یہی اس علم کا اصل موضوع ہے۔ ساری ابحاث کا بنیادی نکتہ یہی ہوتا ہے۔

مگر یہ بات ظاہر ہے کہ تاریخ میں ہر انسان کے حالات بیان نہیں کیے جاسکتے۔ لامحالہ خاص انسانوں کو منتخب کیا جاتا ہے۔ یہ انتخاب بھی قدرتی طور پر انہی لوگوں کا ہوسکتا ہے جو کسی نہ کسی اعتبار سے غیر معمولی ہوں، جو حالات پر اثر انداز ہوئے ہوں یا جن کی زندگی میں کوئی عجیب کارنامہ یا کوئی مفید سبق ہو۔ ایسے غیر معمولی لوگ عموماً کسی بڑے

① الاعلان بالتوبیخ، ص ۱۷
② الاعلان بالتوبیخ، ص ۱۷

مرتبے کے ہوتے ہیں یا بعد میں کوئی بڑا منصب حاصل کر لیتے ہیں اس لیے تاریخ میں اکثر بادشاہوں، وزیروں، امرائے سلطنت، فوجی سرداروں، عالموں، دانشوروں اور حکیموں کا ذکر ہوتا ہے۔ معمولی لوگ اس میں جگہ نہیں پا سکتے۔ اگر ان کا ذکر اتفاقاً آتا بھی ہے تو کسی بڑی شخصیت کے حالات کے ضمن میں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے:

''تاریخ مشاہیر (مشہور شخصیات) کے احوال کا علم ہے۔'' اور یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے۔

تاریخ کا مقصد اور غرض وغایت:

ہر علم کے کچھ فوائد ہوتے ہیں مگر ان فوائد سے زیادہ اہم اس علم کا مقصد ہوتا ہے۔ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر انسان کسی علم میں دماغ کھپاتا ہے۔ تاریخ پڑھنے پڑھانے کے بنیادی مقاصد دو ہیں:

1. انسانوں اور زمانے کے حالات سے عبرت ونصیحت حاصل کرنا
2. قومی روایات، خصوصیات اور صفات سے آگاہ رہنا اور انہیں برقرار رکھنا[1]

یہ دو مقاصد اتنے اہم ہیں کہ ان کو دیکھتے ہوئے کسی بھی مسلمان کو اپنی تاریخ سے غافل رہنا زیب نہیں دیتا۔ خصوصاً دوسرے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے تاریخ کی اہمیت بے حد بڑھ جاتی ہے۔[2]

☆☆☆

تاریخ کی تاریخ

تاریخ نویسی کی ابتدائی شکلیں قدیم رومی، یونانی، چینی، شامی، مصری اور ہندی تہذیبوں میں نظر آتی ہیں۔ قدیم دور کا انسان جب تک لکھنے پڑھنے سے واقف نہ تھا تب بھی وہ گزرے ہوئے لوگوں خصوصاً اپنے آباؤ اجداد کے قصے سننے کا شوقین تھا۔ قبیلوں کی مائیں اپنے بچوں کو گزشتہ دور کے بہادروں اور نامور لوگوں کے واقعات سنا کر ان کی تربیت کیا کرتی تھیں۔ قوم یا قبیلے کی تاریخ کو محفوظ رکھنے کا ایک مشہور طریقہ شعر وشاعری تھا۔ شاعر اور گویے عام محفلوں میں پرانے قصوں کو منظوم انداز میں پیش کیا کرتے تھے اور قوی الحافظہ لوگ ان اشعار کو یاد کر لیتے تھے۔ یہ اشعار نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے تھے۔ عموماً یہ شاعری رزمیہ ہوا کرتی تھی یعنی اس میں قوم کے بہادر لوگوں کے کارنامے بیان کیے جاتے تھے۔ تاریخ کے قدیم ترین چینی، آریائی اور عربی مآخذ نظموں ہی کی صورت میں ملتے ہیں۔ آج بھی خانہ بدوش قبائل اور غیر متمدن علاقوں میں یہ طریقہ رائج ہے۔

---

[1] قومی خصوصیات میں اخلاق وآداب، معاشرتی اقدار، سماجی رویے، بین الاقوامی تعلقات، مستقبل کی سوچ اور ماضی سے رشتہ بھی شامل ہیں۔

[2] الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ، ص ۵۰ تا ۸۰

علامہ سخاویؒ نے یہاں علم تاریخ کی اہمیت پر پچیس تیس صفحات میں بہت مفصل کلام کیا ہے۔ اہل ذوق کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہم نے اس ساری بحث کے نچوڑ کے طور پر دو بنیادی نکتے پیش کر دیے ہیں۔

لکھنے پڑھنے کے فن کو کچھ ترقی ہوئی تو مہذب و متمدن بادشاہتوں میں تاریخ کے بعض واقعات کو حکمرانوں کے ایماء پر قلم بند کیا جانے لگا۔ مذہبی کتب اور آسمانی صحائف میں بھی بعض اقوام کے حالات کا کچھ حصہ محفوظ ہو گیا۔

اشعار کے علاوہ اس دور کے تاریخی مآخذ میں بائبل یعنی عہد نامہ عتیق و جدید، بھگوت گیتا، مہابھارت اور رامائن وغیرہ مشہور ہیں۔ یہ مآخذ اپنی تحریفات کے باوجود قدیم دور کے حالات کے بنیادی مآخذ سمجھے جاتے ہیں۔

اس دور کو ہم باقاعدہ تاریخ نگاری کا دور نہیں کہہ سکتے مگر اس دور کے مآخذ کی اہمیت بعد کے دور میں بہت بڑھ گئی کیوں کہ قدیم دور کے انسان کے حالات کو جاننے کا ذریعہ ان کے سوا کچھ اور نہیں رہا تھا۔

روم اور یونان کی تاریخ میں پانچ سو سال قبل از مسیح اور اس کے بعد کے حالات و واقعات کو محفوظ مانا جاتا ہے کیوں کہ یہ حکمائے یونان یعنی سُقراط، اَفلاطون اور اَرِسطو کا دور تھا جس میں اہلِ یورپ کے ہاں پڑھنا لکھنا رائج ہو چکا تھا، اسی لیے سکندرِ اعظم اور ہنی بال جیسے بادشاہوں کے حالات کا بڑا حصہ ان کے ہاں محفوظ ہو گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ تاریخ سلسلۂ اسناد سے محروم ہے۔ یورپ میں تاریخ نویسی کی اس ترقی کے باوجود مشرق میں دیر تک اندھیرا چھایا رہا، تاریخ ہندوستان پانچ سو سال قبل از مسیح میں بھی تاریک نظر آتی ہے۔ اشوکا، گوتم بدھ اور کنشک اعظم کے متعلق منظوم و بے سر و پا داستانوں کے سوا یہاں کچھ نہیں ملتا۔

تاریخ نویسی نے ایک قدم مزید آگے تب بڑھایا جب دنیا کی مختلف قوموں میں لکھنے پڑھنے کا رجحان بڑھ جانے کی وجہ سے وقائع نگاری کا آغاز ہوا۔ وقائع نگار وہ مخبر یا منشی ہوتے تھے جو ملک کے مختلف حصوں کی اہم خبریں قلم بند کر کے حکمران کو بھیجا کرتے تھے۔ ان کے روزنامچوں کا ریکارڈ مؤرخین کو ماضی کے حالات جمع کرنے میں بڑی مدد دیتا تھا۔

☆☆☆

تقویم

کسی واقعے یا حادثے کا وقت یاد رکھنے کا سادہ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اسے کسی ایسے بڑے واقعے کے ساتھ منسوب کر دیا جائے جو سب کو معلوم ہو۔ مثلاً کسی اَن پڑھ شخص کی تاریخ ولادت نومبر ۱۹۷۱ء ہے، چونکہ وہ سو سے زیادہ گنتی نہیں جانتا اس لیے اپنی تاریخ ولادت یاد نہیں رکھ سکتا مگر وہ اپنی تاریخ پیدائش یوں بتا سکتا ہے کہ میں مشرقی پاکستان کے الگ ہونے سے ایک ماہ پہلے پیدا ہوا تھا۔ قدیم دور میں عوام و خواص سب کے ہاں یہی طریقہ رائج تھا؛ کیوں کہ تقویم (کیلنڈر) کا کوئی رواج نہیں تھا۔ لوگ مشہور واقعات سے تاریخ کا اندازہ لگاتے تھے۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شروع میں لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے دنیا میں اتارے جانے سے تاریخ کا حساب لگاتے تھے، جب طوفانِ نوح میں مخلوق ہلاک ہو گئی تو باقی ماندہ لوگوں نے طوفانِ نوح سے تاریخ کا آغاز کیا۔

حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد دنیا میں پھیل گئی اور ہر ایک نے اپنے اپنے طرز پر تاریخ یاد رکھنا شروع کی۔ عربوں نے ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے سے حساب رکھا۔ پھر اولادِ اسحاق (یہود) سالوں کا تخمینہ لگانے کے لیے یوسف علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام تک، پھر موسیٰ علیہ السلام سے سلیمان علیہ السلام تک اور بعد میں سلیمان علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک کے زمانوں کا حساب لگاتے رہے۔ اولادِ اسماعیل نے کعبۃ اللہ کی تعمیر سے تاریخ شروع کی۔ بعد والوں نے کعب بن لؤی کی وفات سے نیا حساب رکھا۔ حضور اکرم ﷺ کے معاصر قریش نے عام الفیل سے سالوں کو شمار کرنا شروع کیا۔ بعد میں مسلمانوں نے ہجرت نبویہ سے ہجری سن کا حساب شروع کیا۔

دوسری طرف اہل روم سکندر اعظم کے دور سے تاریخ شمار کرتے تھے۔ اہل فارس اپنے ہر بادشاہ کی تخت نشینی سے سالوں کا تخمینہ لگاتے تھے۔ [1]

تقویم یا کیلنڈر کا آغاز تاریخ نگاری کے لیے اہم سنگ میل تھا۔ مختلف اقوام اور حکومتوں نے مختلف اوقات میں اپنے اپنے کیلنڈر جاری کیے مگر عالم گیر شہرت دو ہی تقویمات کو ملی: ایک عیسوی تقویم کو جسے عیسائی پادریوں اور حکومتوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سال ولادت سے شروع کیا۔ یہ شمسی تقویم ہے۔ دوسری ہجری تقویم کو جسے مسلمانوں نے ہجرتِ مدینہ سے شروع کیا، یہ چاند کے حساب سے ہے۔

عربوں نے اپنی سہولت کے لیے قمری مہینے: محرم، صفر، ربیع الاول وغیرہ اختیار کیے تھے مگر ان کے لیے سالوں کا شمار نہیں رکھا جاتا تھا بلکہ سالوں کو کسی اہم واقعے کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مثلاً فلاں جنگ کے بعد والا محرم اور فلاں معاہدے سے پہلے والا رمضان۔ اس سے ان کے سادہ تمدن کی ضرورت پوری ہو جاتی تھی۔ اکثر معاملات زبانی طے ہوتے تھے۔ دستاویزات، رقعوں اور خطوط کا استعمال تو ہوتا تھا مگر انہیں عرصہ دراز تک محفوظ رکھنے کا رواج نہ تھا، اس لیے ان پر الگ الگ سالوں کے اندراج کی نوبت نہیں آتی تھی، پس اس حوالے سے کبھی کوئی الجھن پیش نہ آئی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں جب عرب پہلی بار دنیا کے مشرق و مغرب کے مالک بنے اور سرکاری دفاتر میں مراسلوں، رسیدوں اور دوسری دستاویزات کا ایک تانتا بندھنے لگا تو یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا کہ کون سی تحریر کس سال کی ہے۔

ایسے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اس طرف توجہ دلائی اور پیغام بھیجا کہ ہمارے پاس آپ کے ایسے خطوط آتے ہیں جن پر تاریخ کا اندراج نہیں ہوتا۔ آپ کوئی تاریخ مقرر فرمائیے۔

یہ بھی روایت ہے کہ یمن سے آئے ہوئے ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ اہل یمن اپنے خطوط پر تاریخ لکھتے ہیں، آپ بھی ایسا کوئی انتظام کیجیے۔ [2]

ایک روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک خط آیا جس پر صرف شعبان لکھا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”یہ کیسے معلوم ہوگا کہ یہ کونسے سال کا شعبان ہے؟“

---

① الشماریخ فی علم التاریخ للسیوطی: ص ۷ تا ۱۰، ط مکتبۃ الآداب ② الشماریخ: ص ۱۴، ۱۵

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام سے فرمایا: لوگوں کے لیے کوئی وقت مقرر کر دو، جس سے وہ تاریخ شمار کیا کریں۔
بعض نے کہا: اہل روم کی تاریخ اختیار کر لی جائے۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رومیوں کی تاریخ کا شمار بہت طویل ہے، وہ سکندر کے دور سے شمار کرتے ہیں۔
کسی نے کہا: اہل فارس کی تاریخ اختیار کر لیں۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان کے ہاں ہر بادشاہ کی تخت نشینی پر تاریخ نئے سرے سے شروع ہوتی ہے۔ ①
آخر یہ طے پایا کہ اپنی الگ تقویم رکھی جائے۔ اب سوال اُٹھا کہ کب سے؟ تین آراء سامنے آئیں:
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے۔ ہجرت سے۔ وفات سے۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ سناتے ہوئے فرمایا:
''ہجرت سے تقویم کا آغاز کیا جائے؛ کیوں کہ اسی سے حق و باطل کے درمیان فرق ہوا۔'' ②
اس موقع پر علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ابن شہاب زہری کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ ہجرت فرمانے کے بعد سالوں کا شمار ہجرت ہی سے رکھنے کا حکم دیا تھا۔ ③
علامہ سیوطی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مراسلے کا ذکر بھی کرتے ہیں جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے سن پانچ ہجری لکھوانا ثابت ہے۔ ④
علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا ہجری سن کے اصل بانی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی سنت کی پیروی کی تھی۔ ⑤
جب صحابہ کرام کی مشاورت میں یہ فیصلہ ہو گیا کہ اسلامی تاریخ کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے شروع کیا جائے گا تو اگلا سوال یہ پیدا ہوا کہ کس ماہ سے؟ چونکہ ہجرت ربیع الاوّل میں ہوئی تھی اس لیے بعض حضرات کی رائے اسی مہینے کو ہجری سال کا آغاز قرار دینے کی تھی۔ بعض نے ماہ رمضان کی فضیلت کی بناء پر اس کا مشورہ دیا مگر فیصلہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے پر ہوا جنہوں نے محرم کے فضائل بیان کرتے ہوئے کہا: ''محرم سے تقویم شروع کی جائے کہ یہ حرمت والا مہینہ ہے۔ یہی سال کا پہلا مہینہ ہے۔ اس میں لوگ حج سے لوٹتے ہیں۔''
اس طرح یہ طے ہو گیا کہ سال ہجری محرم سے شروع ہوگا۔ یہ واقعہ سن ۱۷ یا ۱۸ ہجری کا ہے۔ ⑥
یہ ہجری تقویم کا آغاز تھا جو اسلامی تاریخ نگاری کا بنیادی پیمانہ ہے۔

---

① الشماریخ، ص ۱۷ ② دیکھیے الشماریخ، ص ۱۱
③ الشماریخ، ص ۱۴ ④ الشماریخ، ص ۱۲ ؛ تاریخ الطبری: ۲/۳۸۸
⑤ الشماریخ، ص ۱۲ ⑥ الشماریخ، ص ۱۵

عربوں کی تاریخ میں ماہ وسال کا اختلاف کیوں؟

اسلامی تاریخ کے ماہ وسنین کے تعین میں بعض اوقات دِقت پیش آتی ہے۔جس کی اہم وجوہ درج ذیل ہیں:

❶ راویوں نے اس دور کے بہت سے احوال کی تاریخیں متعین طور پر بیان نہیں کیں۔

❷ بعض مقامات پر ایک ہی واقعے کی تاریخ میں کئی کئی اقوال ہیں جن میں ترجیح دینا مشکل ہو جاتا ہے، یہ اختلاف مہینوں اور سالوں میں متضاد اقوال تک پہنچ جاتا ہے۔

❸ بعض تاریخیں جو قدیم مؤرخین کے ہاں مشہور ہیں (مثلاً میلاد النبی کی تاریخ بارہ ربیع الاوّل) وہ کسی بھی طرح تقویمی حسابات پر پوری نہیں اترتیں۔

❹ ایک بڑی وجہ مشرکین کا قمری تقویم میں وہ گڑبڑ کرنا ہے جسے قرآن مجید نے "النسئی" سے تعبیر کر کے اس کی مذمت کی ہے اور جس کے باعث خالص قمری تقویم کے مقابلے میں تحریف شدہ "قمری شمسی تقویم" وجود میں آئی۔[1]

خالص قمری تقویم اور تحریف شدہ "قمری شمسی تقویم":

مشرکین نے قمری تقویم کو شمسی حساب کے مطابق کرنے کے لیے تحریف کر رکھی تھی جسے "النسئی" کہا جاتا تھا۔ہم جانتے ہیں کہ قمری تقویم کے مہینے ہمیشہ یکساں موسم میں نہیں آتے۔ہر قمری مہینہ رفتہ رفتہ (۳۳ قمری سالوں میں) سردی، گرمی، خزاں اور بہار سے گزرتا ہے۔اس کے برخلاف شمسی مہینے ہمیشہ ایک ہی جیسے موسموں میں آتے ہیں، یعنی جنوری ہمیشہ سردی میں، مارچ ہمیشہ بہار میں، جون ہمیشہ گرمی میں اور اکتوبر ہمیشہ خزاں میں آتا ہے۔

اگر قمری مہینوں کو بھی ایک ہی جیسے موسموں میں ہمیشہ رکھنا ہو، تو اس کے لیے بعض قمری سالوں کو تیرہ ماہ کا کرنا پڑے گا؛ کیوں کہ قمری سال، شمسی سال سے تقریباً گیارہ دن کم ہوتا ہے، اس لیے دونوں کو برابر رکھنے کے لیے اکثر تین سالوں بعد اور کبھی کبھار دو سال بعد تیرہویں مہینے کا اضافہ کر کے، دونوں تقویموں کو برابر لایا جاسکتا ہے۔مگر ظاہر ہے جب تیرہواں مہینہ بڑھایا جائے گا تو خالص قمری تقویم کے مہینے اپنی اصل جگہ پر برقرار نہیں رہیں گے۔

مشرکین نے ہجرتِ نبویہ سے کوئی ۲۲۰ برس قبل خالص قمری تقویم میں یہ تحریف کر دی تھی۔وجہ یہ تھی کہ حج ان کے لیے ایک زبردست تجارتی موسم بھی تھا جس کے دوران بڑے بڑے تجارتی میلے لگا کرتے تھے مگر انہوں نے دیکھا کہ حج کبھی گرمی میں آتا ہے کبھی سردی میں۔جس کی وجہ سے کھجوروں اور بھیڑ بکریوں کی تجارت سے وابستہ ان کے مفادات متاثر ہوتے ہیں۔ابھی نہ فصلیں پکتی ہیں، نہ جانوروں کے بچے بکنے کے لیے تیار ہوتے ہیں کہ حج آ جاتا ہے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حج کی تیاری میں لگنا پڑ جاتا ہے۔مشرکین نے اپنا تجارتی مفاد اسی میں سمجھا کہ حج ہمیشہ موسم گرما میں آئے۔چنانچہ بنو کنانہ کے ایک سردار قَلَمَّس نے حج کے مہینے کو ایک خاص موسم یعنی موسمِ گرما میں متعین کرنے کے

---

[1] سورۃ التوبۃ، آیت: ۳۶، ۳۷

لیے "النسئی" (کبیسہ) کا طریقہ ایجاد کیا۔[1] جس کے باعث قمری مہینے مصنوعی طور پر شمسی مہینوں کے برابر ہوگئے۔ ہر سال محرم کا مہینہ ستمبر کے اواخر یا اکتوبر کے اوائل میں آنے لگا۔ رمضان ہر سال مئی جون میں اور حج ہر سال گرمیوں کے آخری مہینے اگست میں ہونے لگا جب فصلی پیداوار کٹ کر فروخت کے لیے بکثرت موجود ہوتی تھی۔[2]

غالباً بعض قمری مہینوں کے نام اسی نئی توقیت کے زمانے میں رکھے گئے تھے۔ ہر سال جمادی الاولیٰ اور جمادی الآخرہ سردیوں میں آتے تھے۔ ان کے ناموں میں "جمد" کا مادّہ اشارہ کرتا ہے کہ موسم کے اعتبار سے ان کا یہ نام رکھ دیا گیا تھا۔ رمضان "رمض" سے مشتق ہے، اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ یہ مہینہ گرمیوں میں آتا تھا۔[3]

قبیلہ کنانہ کے سرداروں کو یہ منصب سونپا گیا کہ وہ حسبِ ضرورت تیرھواں مہینہ بڑھا دیا کریں۔ اس قبیلے کا سردار ہر سال حج کے موقع پر وضاحت کر دیتا کہ اگلا حج بارہ مہینے بعد ہوگا، یا تیرہ مہینے بعد، اور یہ کہ اضافی مہینہ کون سے مہینے کے ساتھ بڑھایا جائے گا۔[4]

اہلِ عرب "اشہرِ حرم" کے بڑے قائل تھے۔ یعنی چار مہینوں: رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجّہ اور محرم کو حرمت کے مہینے قرار دیتے تھے۔ حج کے مہینے بدل جانے کے باعث ناگزیر طور پر حرمت کے یہ چار مہینے بھی اپنی اصل جگہ سے ہٹ

---

[1] تفسیر الرازی: ۱۶/۴۰، ۴۱ ط داراحیاء التراث العربی ؛ التحریر والتنویر للشیخ محمد بن طاهر العاشور: ۱۰/۱۹۱، ط تیونس
بعض احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ (المعجم الاوسط للطبرانی، ح: ۲۹۰۹، ط دارالحرمین) بعض سیرت نگاروں نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔
علامہ برہان الدین حلبی لکھتے ہیں: "لان اهل الجاهلية كانوا يؤخرون الحج في كل عام احد عشر يوماً حتىٰ يدور الدور الىٰ ثلاث وثلثين سنة فيعود الىٰ وقته. (السيرة الحلبية: ۳/۲۶۰، ط العلمية)
علامہ سہیلی لکھتے ہیں: فكانوا يؤخرونه في كل عام احد عشر يوماً او اكثر قليلاً حتىٰ يدور الدور الىٰ ثلاث وثلثين سنة فيعود الىٰ وقته. (الروض الانف: ۱/ ۱۳۹، دارالاحياء التراث العربي، بيروت، ت عمر عبدالسلام سلامي)
متعدد مفسرین نے بھی اسے بیان کیا ہے۔ (تفسير عبدالرزاق، التوبة: ۲/۱۴۹، ط العلمية ؛ تفسير الطبرى: ۱۱/۴۵۴، ط دارهجر ؛ تفسير ثعلبى: ۵/۴۴ ط داراحياء التراث العربى)
یورپ میں اسے "لیپ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیپ میں ہر چار سال بعد اپریل کے آخر میں ایک دن یعنی ۲۹ اپریل کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی بکری تقویم میں بھی یہی گر آزمایا جاتا ہے اور اسے "لوند" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حسبِ ضرورت باری باری ہر مہینے کے ساتھ اضافہ کیا جاتا ہے، مثلاً ایک بار ساڑھ کے ساتھ ایک ماہ بڑھا کر اسے دوساڑھ کہا جاتا ہے۔ اگلی بار بیساکھ کے ساتھ ایک ماہ بڑھا کر اسے دوساکھ کا نام دے دیا جاتا ہے۔ (**تقویم تاریخی، ہاشمی، ص ۱۸**)

[2] ملاحظہ ہو: مولانا اسحاق النبی علوی مرحوم کا مقالہ: "سیرت النبی توقیت کی روشنی میں" (**نقوش: رسول نمبر، جلد دوم "دسمبر ۱۹۸۲ء"**) راقم نے مرحوم کی تحقیق کو بغور دیکھا ہے اور بساط بھر جانچ پڑتال کے بعد اسے درست پایا ہے جبکہ بعض سیرت نگاروں کا یہ خیال کہ مکی تقویم موسم بہار سے شروع ہوتی تھی، علی الاطلاق درست نہیں۔ البتہ عرب میں ایک تقویم شمسی قمری ربیعی ضرور تھی جو ربیع الاوّل سے شروع ہوتی تھی مگر اس کا رواج کم تھا۔ مکی تقویم خریف ہی سے شروع ہوتی تھی۔

[3] لما نقلوا أسماء الشهور عن اللغة القديمة سمّوها بالازمنة التي وقعت فيها ، فوافقت هذا الشهر ايام رمض الحر، فسمّي بذالك. (الصحاح تاج اللغة للجوهري: ۳/۱۰۸۱) وجُمادىٰ من اسماء الشهور سميت بذالك لجمود الماء فيها عند تسمية الشهور. (لسان العرب: ۳/۱۳۰)
اس سے از خود سمجھ آتا ہے کہ قمری مہینوں کے قدیم عربی نام کچھ اور تھے۔ امام ابو منصور الہروی (م ۳۷۰ھ) نے اس کی کچھ وضاحت کی ہے، لکھتے ہیں:
"كانت العرب تسمي جمادى الآخرة: رُنّى ، وذالقعدة: وَرْنة ، وذالحجة: بُرَك. (تهذيب اللغة: ۱۵/۱۷۱)

[4] سيرة ابن هشام: ۱/۴۴ ... قَلَمَّس کے بعد یہ ذمہ داری انجام دینے والا ہر سردار "قَلَمَّس" کہلانے لگا، یوں یہ ایک عہدہ بن گیا جس کی جمع تاریخی روایات میں "قلامسہ" کے نام سے ملتی ہے۔ (الروض الانف: ۱/۱۳۹)
نوٹ: "النسئی" کی رسم کے بارے میں اہلِ ذوق دکتور جواد علی کی "**المفصل في تاريخ العرب قبل الاسلام**" (۱۶/۱۲۸ تا ۱۴۰) کا مطالعہ ضرور کریں۔

گئے۔ چنانچہ حج کے موقع پر یہ اعلان بھی کر دیا جاتا تھا کہ اگلے سال فلاں فلاں مہینے "اشہر حرم" ہوں گے۔ یوں "النسئی" میں یہ دونوں باتیں شامل ہوگئیں یعنی: ❶ حج کے وقت میں تحریف ❷ اشہر حرم میں تحریف۔ ①

اس تحریف کے نتیجے میں مکہ اور اس کے نواح میں جو تقویم رائج ہوئی وہ خالص قمری نہ رہی بلکہ "قمری شمسی" تقویم بن گئی۔ دوسری طرف مدینہ اور اس کے نواح میں آباد عرب قبائل نے خالص قمری تقویم کو کسی حد تک برقرار رکھا۔ یوں عربوں میں بیک وقت "قمری شمسی تقویم" (مکی تقویم) اور "خالص قمری تقویم" (مدنی تقویم) دونوں کا رواج رہا۔ ②

ان دونوں کے علاوہ عربوں میں ایک اور "قمری تقویم" بھی رائج تھی جو موسم بہار سے شروع ہوتی تھی، مگر غالباً اس کا رواج بہت کم تھا۔ اسے ہم "قمری شمسی ربیعی" کہہ سکتے ہیں۔ ③

اگرچہ "قمری شمسی تقویم" (مکی تقویم) ۳۳ سال بعد ایک چکر پورا کر کے، دوبارہ "خالص قمری تقویم" (مدنی تقویم) کے برابر آجاتی تھی، مگر اس دوران ایک خالص قمری سال بالکل گم ہو جاتا تھا۔ اس لیے جب اسلام غالب آگیا تو حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے "النسئی" کی رسم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دینے کا اعلان فرمایا ④ جس کے بعد عربوں میں دوبارہ خالص قمری تقویم رائج ہوگئی اور آج تک وہی چلی آرہی ہے۔

بہر کیف درمیانی مدت (جس میں "النسئی" کی تحریف جاری رہی) میں تاریخ کا تعین اس لیے مشکل ہوگیا کہ قدیم راویوں نے سیرت کے واقعات کہیں مکی تقویم کے مطابق بیان کیے ہیں اور کہیں مدنی تقویم کے مطابق۔ اس لیے عموماً صحیح تاریخ کے تعین میں مشکل پیش آتی ہے۔ سیرتِ نبوی کی تاریخوں میں اختلافِ اقوال کی ایک اہم وجہ یہی ہے۔

☆☆☆

① فكان على ضربين: احدهما تاخير شهر المحرم الى صفر لحاجتهم الى شن الغارات وطلب الثارات، والثاني تاخيرهم الحج عن وقته. (الروض الانف: ۱/ ۱۳۹)

نوٹ: عام طور پر مفسرین نے "النسئی" کا مصداق "اشہر حرم" میں تحریف کو قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ عربوں کے ہاں ان مہینوں میں لڑائی حرام تھی مگر چونکہ وہ لڑنے سے باز بھی نہیں رہ سکتے تھے، تو وہ حرمت والے مہینے کو آگے پیچھے تصور کر لیتے تھے، مثلاً اگر انہیں محرم میں لڑنا پڑتا تو وہ کہتے کہ محرم اس سال ربیع الاوّل میں ہے اور لڑائی شروع کر دیتے۔ یہ تفسیر ابن اسحٰق سے مروی ہے۔ (سیرۃ ابن ھشام: ۱/ ۴۴ ط البابی الحلبی)

بہت سے مفسرین نے اسی کو اختیار کیا ہے حالانکہ ابن اسحٰق کی وجہ سے اس کی اسنادی حیثیت ضعیف ہے اور درج ذیل صحیح روایت اس کے برخلاف ہے:

"عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده قال كانت العرب يجعلون عاما شهراً و عاما شهرين، ولا يصيبون الحج الا فى ستة وعشرين سنة مرة، وهو النسىء الذى ذكر الله عز وجل فى كتابه" (المعجم الاوسط للطبرانى، ح: ۹۰۹ ۲، ط دار الحرمين)

پس قرآن مجید کے الفاظ "يحلونه عاماً ويحرمونه عاما" کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین کی تحریف کے باعث حرمت والا مہینہ کسی سال حلال مہینوں میں اور کسی سال اشہر حرم میں آجاتا۔ اب جب بعض قبائل کو لڑنا ہوتا اور وہ مہینہ درحقیقت اشہر حرم میں ہوتا تو بھی وہ لڑ پڑتے اور اعتراض کرنے والوں کے سامنے تاویل یہ کرتے کہ جسے تم حرام ماہ تصور کر رہے ہو، وہ خالص قمری تقویم کے لحاظ سے چاہے حرام ہو، مگر مکی تقویم میں تو وہ حلال ہے۔ اس لیے ہمیں کوئی پروا نہیں۔

② تقویم تاریخی، مولانا عبدالقدوس ہاشمی، ص ۱۸، ط ادارۂ تحقیقات اسلامیہ اسلام آباد، ۱۹۸۷ء

③ تقویم عہد نبوی، علی محمد خان، ص ۱۲

④ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: ان الزمان قد استدار كهيئته يوم خلق السموات والأرض. "زمانہ گھوم کر پھر اسی حال پر آگیا ہے جس پر اللہ نے اسے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے وقت بنایا تھا۔" (صحيح البخارى، كتاب التفسير: باب قوله: ان عدة الشهور، ح: ۴۶۶۲، ط طوق النجاة)

اس حدیث سے متعدد شارحینِ حدیث نے یہ سمجھا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر خالص قمری تقویم اور شمسی قمری تقویم.............

(بقیہ اگلے صفحے پر)

تاریخ نگاری کے چار مراحل

کسی بھی عمارت کی تکمیل کئی مراحل میں ہوتی ہے: پہلے نقشے کے مطابق اس کی بنیاد کھودی جاتی ہے۔ پھر دیواریں اٹھائی جاتی ہیں اور چھت ڈالی جاتی ہے۔ اس کے بعد پلستر کیا جاتا ہے، بکھری ہوئی سیمنٹ اور بجری کی صفائی کی جاتی ہے۔ آخر میں رنگ وروغن ہوتا ہے، پنکھے، بلب اور دوسری چیزیں لگا کر اسے پوری طرح رہائش کے قابل بنا دیا جاتا ہے۔

کوئی بھی علم وفن اسی طرح چار مراحل سے گزر کر حدِ کمال کو پہنچتا ہے:

1. **تاسیس:** بنیاد رکھنا
2. **تدوین:** مواد کو جمع کرنا
3. **تنقیح وتہذیب:** کمزور مواد کا ازالہ اور مستند مواد کو اچھی طرح ترتیب دینا
4. **تکمیل:** فن کو بہتر سے بہتر اور آسان سے آسان تر بنانا

پہلا دور تاسیس کا دور کہلاتا ہے، یہ عمارت کی بنیاد رکھنے کی مانند ہے، اس دور میں کچھ لوگ اس علم کی ضرورت محسوس کر کے اس کا ایک نقشہ مرتب کرتے ہیں، ایسی حد بندی کرتے ہیں جس کے ذریعے وہ دوسرے علوم سے ممتاز ہو سکے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)......دونوں یکجا ہو گئے تھے اور یہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ حسابی قاعدوں کے علاوہ متعدد شواہد موجود ہیں کہ حجۃ الوداع مکی تقویم کے مطابق "جمادی الآخرہ" میں ہوا تھا؛ کیوں کہ عیسوی تقویم کے لحاظ سے یہ مارچ کا مہینہ تھا۔ مکی تقویم میں قمری سال مصنوعی طور پر شمسی سال کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اس کا محرم عموماً ستمبر کے اواخر یا اکتوبر کے اوائل میں اور ذوالحجہ اگست کے اواخر میں آتا تھا۔ چونکہ حجۃ الوداع خالص قمری تقویم کے ذوالحجہ میں ہوا تھا، اور یہ بالاتفاق عیسوی تقویم میں مارچ کا مہینہ تھا، لہٰذا اواخر ستمبر سے شروع ہونے والی مکی تقویم کے چھ ماہ گزر چکے تھے اور یہ اس کا چھٹا مہینہ یعنی جمادی الآخرہ تھا، جیسا کہ مکی تقویم میں یہ مہینہ عموماً مارچ ہی میں آیا کرتا تھا۔ پس اس ارشادِ پاک کا صحیح مطلب وہ ہے جو حافظ ابن حجر نے بیان کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

والمراد باستدارته وقوع تاسع ذی الحجة فی الوقت الذی حلّت فیه الشمس برج الحمل حیث یستوی اللیل والنهار. "زمانے کے گھوم کر آنے سے مراد یہ ہے کہ نو ذوالحجہ ایسے وقت میں واقع ہوا تھا جس میں سورج بُرجِ حمل میں تھا جس میں دن اور رات برابر ہوتے ہیں۔" **(فتح الباری: ۸/۳۲۴)**

حافظ ابن حجر کے اس تشریحی نوٹ کی مزید وضاحت کے لیے ہم مولانا اسحاق النبی علوی کی عبارت پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "نقشۂ تقویم کو سامنے رکھ کر قمری محرم کو ملاحظہ فرمایئے جو اس سال ۲۹ مارچ یعنی اعتدالِ ربیعی کے عین متصل شروع ہو رہا تھا۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ قدیم اہلِ بابل، اہلِ ایران، اور شاید جنوبی عرب کے باشندے اور تمام باشندگانِ ہند اعتدالِ ربیعی سے سال کا آغاز کرتے ہیں جس کا رواج ہندوستان میں آج تک چلا آ رہا ہے۔ یہودیوں کے مذہبی سنِ تقویم کا پہلا مہینہ "نیسان" بھی اسی نقطے سے شروع ہوتا تھا اور گمانِ غالب یہ ہے کہ قدیم عربوں میں بھی ایک سنہ کا آغاز اعتدالِ ربیعی سے کیا جاتا تھا جبکہ سورج بُرجِ حمل میں ہوتا؛ کیوں کہ عربوں کا یہی خیال تھا کہ آفرینشِ عالم اعتدالِ ربیعی میں ہوئی تھی۔ ابن قتیبہ کا بیان ہے: "اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو اس وقت پیدا کیا جب سورج بُرجِ حمل میں تھا اور زمانہ اعتدال تھا اور دن رات مساوی تھے۔" **(سیرت النبی توقیت کی روشنی میں، نقوش، رسول نمبر، شمارہ دسمبر ۱۹۸۲ء: ۲/۲۰۰)**

مذکورہ حدیثِ نبوی کا ایک اور معنیٰ جو زیادہ آسان فہم ہے اور پہلے معنیٰ کے منافی بھی نہیں، یہ ہے:

"ان الزمان قد استدار، یعنی امر اللّٰه تعالیٰ ان یکون ذو الحجة فی هذا الوقت، فاحفظوه واجعلوا الحج فی هذا الوقت ولا تبدلوا شهراً بشهر کعادة اهل الجاهلیة. "زمانہ گھوم گیا ہے، یعنی اللہ نے حکم دیا ہے کہ ذوالحجہ اسی وقت میں ہوا کرے گا، اسے یاد رکھو اور حج کو اسی وقت کیا کرو اور اہلِ جاہلیت کی عادت کی طرح ایک مہینے کو دوسرے مہینے سے نہ بدلو۔ **(عون المعبود شرح سنن ابی داؤد مع حاشیۃ ابن القیم: ۵/۲۹۴)**

اس حدیث کی تشریح اس طرح بھی کی جا سکتی ہے کہ یہاں خالص قمری تقویم، عربوں کی "تقویم ربیعی" کے ساتھ جمع ہو گئی تھی جو موسمِ بہار سے شروع ہوتی تھی۔ علی محمد خان کی تحقیق یہ ہے کہ حجۃ الوداع میں خالص قمری تقویم عربوں کی "تقویم ربیعی" کے ساتھ جمع ہو گئی تھی۔ **(تقویم عہدِ نبوی، ص ۱۴)** اور غور کیا جائے تو یہ بات درست لگتی ہے؛ کیوں کہ حجۃ الوداع موسمِ بہار میں ادا کیا گیا تھا۔ اس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو جمہور شارحینِ حدیث کا قول بھی اپنی جگہ درست بیٹھتا ہے۔

دوسرا دور جسے تدوین کا دور کہتے ہیں، عمارت کی دیواریں اٹھانے اور چھت ڈالنے کے مترادف ہے۔اس میں علم کے بنیادی قواعد و ضوابط متعین کیے جاتے ہیں۔ نیز اس علم سے متعلقہ مواد کو ابتدائی اور خام شکل میں جمع کیا جاتا ہے۔

تیسرا دور تنقیح اور تہذیب کا کہلاتا ہے۔ یہ عمارت کے پلستر اور صفائی کی مانند ہے۔ اس میں علم کے ذخیرے کو مضبوط کیا جاتا ہے اور گزشتہ کام کے دوران شامل ہو جانے والے کمزور مواد اور ناقص تصورات و نظریات کو نکال کر اسے صاف ستھرا بنایا جاتا ہے۔

چوتھا دور تکمیل کا ہوتا ہے، جو عمارت میں بلب اور پنکھے لگانے کی مانند ہے۔ اس میں علم کا بناؤ سنگھار کیا جاتا ہے، نئی نئی ابحاث اٹھائی جاتی ہیں، اس کی اشاعت کی جاتی ہے۔

چونکہ اس کے بعد اس میں مزید کچھ کرنے کا کام نہیں رہ جاتا اس لیے اس ورثے کی حفاظت اور اشاعت ہی اصل مقصود قرار پاتا ہے۔ اگر اس ذمہ داری سے غفلت اختیار کی جائے تو یہ ایک کھنڈر کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے چور اُچکے فائدہ اٹھاتے ہیں یا بھوت پریت آ کر وہاں ڈیرہ ڈال لیتے ہیں۔

تاریخ نگاری بھی اسی طرح کئی مراحل سے گزری ہے۔ اس کی تاسیس اسلامی دور سے قبل ہو چکی تھی۔ مسلم مؤرخین کے میدان میں آنے کے بعد اس کی تدوین کا دور شروع ہوا۔ دوسری تیسری اور چوتھی صدی ہجری تاریخ کی تدوین کا دور ہے۔ساتویں صدی ہجری میں اس کی تنقیح و تہذیب کا زمانہ شروع ہوا جس کا آغاز حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ''تاریخ الاسلام'' اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''البدایہ والنہایہ'' کے ذریعے کیا۔ مگر تنقیح کی تکمیل نہ ہو سکی یعنی تاریخ کو کمزور مواد سے پاک کرنے اور تاریخ کے توقیتی مباحث میں خلط ملط کو دور کرنے جیسے بعض اہم اہداف پورے نہیں ہو سکے۔ بعد والوں نے تنقیح کی جگہ تہذیب پر توجہ مرکوز کر دی۔

آٹھویں صدی ہجری کو تاریخ کی ''تہذیب'' کا دورِ عروج کہہ سکتے ہیں؛ کیوں کہ اسی دور میں تاریخ ابن خلدون مرتب ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ علم اپنوں کی بے اعتنائی کا نشانہ بننے کی وجہ سے روبہ زوال ہوتا چلا گیا۔ ضرورت ہے کہ اس صورتحال کو تبدیل کیا جائے اور ایک بار پھر اسلاف کی طرح تاریخ نگاری کو اپنی توجہات میں سے وافر حصہ دیا جائے۔

توجہ سے مراد یہ ہے کہ قدیم سیرت نگار، مؤرخین اور علمائے اصول روایت و درایت کے جو ضوابط طے کر گئے ہیں، ان کے مطابق نہایت احتیاط اور متانت کے ساتھ واقعات اور روایات کو علمی کسوٹی پر پرکھا جائے۔

یہ مطلب نہیں کہ سیرت و تاریخ کو ''خرافات'' باور کرایا جائے، لٹھ لے کر قدیم راویوں، محدثین، سیرت نگاروں اور مؤرخین کا تعاقب کیا جائے، جن لوگوں کو علم تاریخ اور علم اسماء الرجال نے بالاتفاق ظالم اور فاسق و فاجر قرار دیا ہے، انہیں ''حضرت''، ''رحمہ اللہ'' بلکہ ''رضی اللہ عنہ'' کی سند پکڑا دی جائے اور جنہیں اسلاف و اکابر نے امام اور حجت مانا ہے، انہیں منافق اور بے دین ثابت کر کے خود کو چودہ صدیوں کا سب سے بڑا محقق باور کرایا جائے۔

تاریخ کا اسلامی دور

اسلام سے قبل ہر قوم کی تاریخ شاعرانہ تصورات اور مبالغہ آمیز وخود ساختہ حکایات سے بھری ہوئی تھی۔ تاریخ کو جانچنے کا کوئی اصول نہ تھا۔ انسان جو چاہتا تاریخ کے نام پر مشہور کر سکتا تھا۔ مسلمانوں نے اس فن کے اصول وقواعد مقرر کر کے اسے ایک باقاعدہ علم کی شکل دی۔ موجودہ دور میں کسی بھی قوم کے ہاں تاریخ نگاری میں کسی امانت ودیانت کا وجود ہے تو وہ ان قواعد وضوابط کی بدولت ہے جن کی ابجد مسلم مؤرخین نے سکھائی۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تاریخ نگاری کا اصل دور مسلمانوں سے شروع ہوا ہے۔

اسلامی تاریخ نگاری کی دو بنیادیں:

اسلامی تاریخ نگاری کی بنیاد دو علوم ہیں: ❶ سیرت نگاری ❷ فن رجال۔

یہ دونوں فنون علمِ حدیث سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ سیرت نگاری فن حدیث کا ایک ضمنی شعبہ تھا جسے سیر ومغازی کہا جاتا تھا۔ سیرت نگاروں نے وسعت دے کر اسے مستقل علم وفن بنا دیا۔ فنِ رجال کی ضرورت حدیث اور تاریخ کو محفوظ بنانے کے لیے پڑی جس سے راویوں کے حالات مدوّن ہوگئے۔ ہم ان دونوں علوم کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں۔

سیرت نگاری:

اسلامی تاریخ نگاری کی بنیاد سیرت نگاری ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے جناب رسول اللہ ﷺ کے احوال و اقوال کو بڑی محبت، عظمت اور احتیاط سے جمع کیا جس سے ذخیرۂ حدیث وجود میں آیا۔ حدیث کے اسی ذخیرے میں ایک حصہ سیر ومغازی کے عنوان سے رکھا گیا جس میں نبی ﷺ کے غزوات وسرایا اور جنگی، دعوتی اور سیاسی اسفار کا ذکر تھا۔ اسے ضمنی حیثیت اس لیے دی گئی کہ محدثین کا اصل مقصد اُن احادیث کو جمع اور مرتب کرنا تھا جن سے اعتقادی وعملی مسائل حل ہوں۔ مگر کچھ عشاق ایسے تھے جو نبی ﷺ کے حالات کو سوانحی ترتیب سے جاننا، بتانا اور محفوظ کرنا چاہتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ذخیرۂ حدیث میں حضور نبی ﷺ کے حالات کے متعلق بڑی تفاصیل موجود ہیں مگر ان میں تاریخی ترتیب ملحوظ نہیں۔ اس لیے علماء کو سیرت کے شعبے پر مستقل توجہ دینے کی ضرورت محسوس ہوئی اور کچھ حضرات نے نبی ﷺ کے حالاتِ زندگی کو ولادت سے وفات تک تاریخی ترتیب کے لحاظ سے مدون کرنا شروع کیا۔ یہ حضرات اصحاب سیر کہلائے، یہ سیرت نگاری کے بانی تھے۔ کچھ اور بزرگوں نے صحابہ کرام اور دوسرے معاصر لوگوں کے حالات کو جمع کرنے میں دلچسپی لی۔ انہیں اصحابِ خبر یا اَخباری کہا جانے لگا۔ خلفائے اسلام نے دیگر علوم کی طرح اس فن کی بھی حوصلہ افزائی کی اور یوں اسلامی تاریخ نگاری کی داغ بیل پڑ گئی۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی کوشش حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے ہوئی جنہیں تاریخ سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ عشاء کے بعد اہلِ سیر اور اَخباری حضرات کو جمع کر کے ان سے مَاضی کے واقعات سنا کرتے تھے۔ انہوں نے مشہور

اخباری عبید بن شریہ کو یمن سے بلا کر سینہ بسینہ نقل ہونے والی عربی تاریخ کا ایک مجموعہ مرتب کرایا جو "الملوک واخبار الماضیین" کہلایا۔ اسی طرح ایک اور مجموعہ "الامثال" کے نام سے مرتب کرایا۔ یہ کتب اب نایاب ہیں۔[1]

ان کے بعد عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے مغازی اور سیر کے درس کے لیے حلقے قائم کرائے۔ عاصم بن قتادہ انصاری (م ۱۲۱ھ) کو تاکید کی کہ وہ جامع دمشق میں سیرت، مغازی اور مناقب کا درس دیں۔ اسی زمانے میں نامور محدث ابن شہاب الزہری (م ۱۲۴ھ) نے جو پہلے ہی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے احادیث کے ذخائر کو جمع کر رہے تھے، مغازی پر بھی ایک کتاب لکھی جسے مغازی کی پہلی تصنیف کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب بھی اب نایاب ہے۔

زہری کے شاگردوں میں سے موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۱ھ) اور محمد بن اسحٰق (م ۱۵۱ھ) نے اس فن کو اور ترقی دی۔ موسیٰ بن عقبہ روایتِ سیرت میں احتیاط سے کام لیتے تھے اس لیے ان کی روایات کا مجموعہ مختصر ہے۔ سیرت کی کتب میں اس کے حوالے کثرت سے آتے ہیں مگر یہ کتاب بھی نایاب ہے۔

ابن اسحٰق نے روایت میں سند کی صحت کا خیال نہیں کیا اور ہر طرح کی روایات جمع کیں لہٰذا ان کی روایات بکثرت ہیں۔ مغازی پر ان کی کتاب ضخیم ہے۔ عالم اسلام پر استعماری غلبے کے دوران یہ نایاب ہو گئی۔ ابھی چند عشروں پہلے بعض محققین کی کوششوں سے تصحیح و تحقیق کے ساتھ یہ دوبارہ منظر عام پر آئی ہے۔

ابن اسحٰق کے بعد یمنی مؤرخ اور سیرت نگار عبدالملک ابن ہشام (م ۲۱۳ھ) نے اس فن کو آگے بڑھایا، انہوں نے سلاطین حمیر کی تاریخ بھی مرتب کی اور ابن اسحٰق کی تالیف کی مقبولیت کی وجہ سے اس کو مزید خوبیوں سے آراستہ کیا، اس کے مشکل الفاظ کی تشریح بھی کی۔ اس طرح سیرت ابن ہشام وجود میں آئی جو سیرت کا سب سے مقبول مأخذ ہے۔

جنوبی افغانستان کے قصبہ "بست" کے محدثِ جلیل امام ابنِ حبان (۳۵۴ھ) کی "السیرۃ النبویۃ واخبار الخلفاء" بھی سیرت کا بنیادی مأخذ ہے۔ اس کے بعد سیرت نگاری علماء کا محبوب مشغلہ بن گئی۔ سیرت نگاروں نے اس بارے میں علوم کے دریا بہا دیے، بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں تصنیف ہوئیں جن کی فہرست کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔

فن اسماء الرجال:

ذخیرۂ حدیث اور تاریخ کو محفوظ اور مستند بنانے کے لیے دوسری اور تیسری صدی ہجری میں فن رجال پر کام کیا گیا۔ ایک پختہ کار محدث کے لیے اسماء الرجال پر گہری نظر لازمی قرار پائی۔ رجال کی چھان بین پر تصانیف کا سلسلہ جو تیسری صدی ہجری سے شروع ہوا تو آٹھویں صدی ہجری تک اس میں برابر محققانہ کام ہوتا چلا گیا۔ احمد العجلی (م ۲۶۱ھ) کی اسماء الرجال پر تصنیف "الثقات" اس فن کی ابتدائی کتب میں سے ہے۔ پھر عقیلی، ابن حبان، امام دارقطنی اور ابن عدی رحمہم اللہ جیسے اصحاب نے اس فن کو مزید ترقی دی، آخر میں علامہ مزی رحمہ اللہ کی "تہذیب الکمال"، حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی "میزان الاعتدال" اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی "تہذیب التہذیب" جیسی عظیم الشان کتب منظرِ عام پر آئیں۔

[1] المسلمون و کتابة التاریخ: ص ۹۰ ؛ الفهرست لابن ندیم، ص ۱۱۸

تاریخ نگاری کا آغاز:

یہ وہ دور تھا کہ مسلم تاریخ نویس سیرت کی حدود سے بڑھ کر مسلمانوں کی ایک باقاعدہ تاریخ مدوّن کرنے کے لیے کمر کس رہے تھے۔ چنانچہ اسی دور میں محمد بن عمر الواقدی (م۲۰۷ھ) کا نام تاریخ نگار کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ انہوں نے کتاب السیرۃ، کتاب التاریخ المغازی، فتوح الشام اور اخبار مکہ جیسی شہرہ آفاق کتب چھوڑیں۔ مگر واقدی نے روایات کو جمع کرنے میں کسی معیار کو سامنے نہیں رکھا اور رطب ویابس بلکہ من گھڑت چیزیں بھی جمع کر دیں۔ ان کی تصانیف ثقاہت کے لحاظ سے کسی پایے کی نہیں تاہم زبان وبیان کی سلاست اور واقعے کی جزئیات کی غیر معمولی وضاحت کی وجہ سے وہ عوام وخواص میں مقبول ہوگئیں۔

واقدی کے شاگردوں میں محمد بن سعد (م۲۳۰ھ) نے بڑا نام پایا۔ اپنے استاذ کے برخلاف وہ روایت میں چھان بین سے کام لیتے تھے، انہوں نے ''الطبقات الکبریٰ'' جیسی مایہ ناز کتاب تصنیف کی۔ یہ بارہ جلدوں میں ہے اور سیرتِ نبوی اور حالاتِ صحابہ کا بہت بڑا ماخذ ہے۔

اسی دور میں فنِ حدیث کے تاجدار، امام محمد بن اسماعیل البخاری نے بھی تاریخ کے عنوان سے دو کتب لکھیں: ایک ''التاریخ الاوسط''، دوسری ''التاریخ الکبیر''۔ اصل میں یہ احوالِ رجال کی کتب ہیں۔ ان میں تاریخی واقعات کسی ترتیب کے بغیر مذکور ہیں۔ اسی طرح ان کی ''الادب المفرد'' میں بھی تاریخی واقعات موجود ہیں۔

جعل ساز راوی:

اس سے قبل خوارج اور روافض جیسے فرقے وجود میں آچکے تھے جو صحابہ کرام سے بغض رکھتے تھے اور ان کی عدالت و ثقاہت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان فرقوں کے افراد میں عالم و جاہل بھی شامل تھے۔ جاہلوں نے اپنے انداز میں خونریزیاں کر کے تباہی پھیلائی اور عالموں نے علمی ونظریاتی کج روی پھیلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ان عالموں میں حدیث سے شغف رکھنے والے بھی تھے اور تاریخ کے شوقین بھی۔ ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں کام کیا۔ جس طرح اپنے مذہب کی حمایت کے لیے خانہ ساز احادیث کی اشاعت کی گئی اسی طرح تاریخ کو اپنے حق میں ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کی تاریخی روایات بھی وضع کی گئیں۔[2] احادیث میں جعل سازی کی قلعی کھولنے کے لیے ائمہ حدیث بہت جلد میدان میں اتر آئے اور اس فتنے کا راستہ روک لیا مگر تاریخ نگاری میں جعل سازی کی روک تھام اس سطح پر نہ ہوسکی۔ تاہم محققین نے اپنے اپنے طور پر کوششیں ضرور کیں جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔

مربوط تاریخ نگاری کا دور:

انہی علوم کے تموج کے درمیان مربوط اسلامی تاریخ نگاری کا دور شروع ہوجاتا ہے جو درحقیقت دنیا میں تاریخ نویسی کے ارتقاء کی طرف سب سے بڑا قدم تھا۔ یہ دور تیسری صدی ہجری کے وسط سے شروع ہوتا ہے، اسی دور میں ''تاریخ'' کا لفظ سیر ومغازی کی کتب کا عنوان بننے لگا، اس کی ایک ابتدائی مثال عمر بن شَبّہ البصری (م۲۶۲ھ) کی

''تاریخ مدینۃ المنورۃ'' ہے۔اسی دور میں ابن قتیبہ الدِینَوری (م ۲۷۰ھ) نے ''المعارف'' تصنیف کی جو اختصار کے باوجود پیدائش آدم علیہ السلام سے لے کر اس دور تک کے حالات پر مشتمل تھی۔ابوحنیفہ الدِینَوری (م ۲۸۲ھ) نے ''الاخبار الطوال'' لکھ کر عالمی تاریخ نگاری کا پہلا تجربہ کیا۔تاہم ان کتب میں ضعیف مواد بکثرت ہے۔

اس دور کی اہم ترین تاریخی کتب احمد بن یحییٰ البلاذری (م ۲۸۹ھ) کی ''فتوح البلدان'' اور ''انساب الاشراف'' ہیں جنہیں اسلامی تاریخ کے ابتدائی مآخذ میں شمار کیا جاتا ہے۔ان سب سے بڑھ کر جامع کاوش امام محمد بن جریر الطبری (م ۳۱۰ھ) کی شہرہ آفاق تاریخ ''تاریخ الامم والملوک'' ہے جسے اسلامی تاریخ کا سب سے پہلا جامع مأخذ مانا گیا ہے۔اسے عموماً ''تاریخ طبری'' کہا جاتا ہے۔بعد کی اکثر اسلامی تواریخ کا بڑا مأخذ یہی ''تاریخ طبری'' ہے۔ ''تاریخ طبری'' اور ''انساب الاشراف'' سمیت ابتدائی دور کی تقریباً سبھی کتب میں خلافِ تحقیق روایات شامل ہیں۔

تاریخ نویسی پر بدعقیدہ حکمرانوں کے اثرات:

ان ابتدائی دو تین صدیوں کی تاریخ میں ملاوٹ تو کی گئی مگر چھان بین کا کام بالکل نہ ہو سکا۔اس ملاوٹ میں شیعہ حکومتوں نے سب سے زیادہ کردار ادا کیا۔بنوعباس میں سے مامون سمیت بعض خلفاء تشیع واعتزال کی طرف مائل رہے اور شیعہ علماء کی سرپرستی کرتے رہے۔اہل تشیع کی دولتِ بنوعبید نے ۲۹۷ھ سے ۵۶۷ھ تک شمالی افریقہ اور مصر پر حکومت کی۔دولتِ بنی بویہ اثنا عشری تھی جس نے خراسان اور ایران میں ۳۲۰ھ سے ۴۷۷ھ تک حکومت کی۔ اسماعیلی شیعوں کا فرقہ باطنیہ پانچویں صدی ہجری کے ربع آخر سے ساتویں صدی ہجری کے نصف تک شمالی ایران، کردستان اور شمالی شام کے ساحلوں پر مسلط رہا۔ان حکومتوں کے زیرِ سایہ درجنوں مؤرخین ایسے تھے جو حقائق کو شیعہ حکمرانوں کی منشأ کے مطابق مسخ کرتے رہے۔انہی شیعہ مؤرخین میں سے بعض کی کتب کو شہرتِ دوام نصیب ہوئی۔ احمد بن ابو یعقوب (۲۸۴ھ) نے ''تاریخ یعقوبی'' تصنیف کی اور یونان، روم، فارس اور ہندوستان کی تاریخوں کو سمیٹ کر اسلامی تاریخ سے ملا دیا۔المسعودی (م ۳۴۶ھ) کی ''مُرُوجُ الذھب'' کو بھی بڑی شہرت ملی۔ایسی کتب میں دورِ صحابہ کا حصہ خاص طور پر من گھڑت روایات سے آلودہ ہے۔

اسلامی تاریخ نگاری کا سنہرا دور:

اگلی صدیوں کے علماء نے اسلامی تاریخ پر بے شمار کتب لکھیں جن میں خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) کی ''تاریخ بغداد''، ابن عساکر (م ۵۷۱ھ) کی ''تاریخ دمشق''، ابوالفرج ابن جوزی رحمہ اللہ (م ۵۹۷ھ) کی ''المنتظم فی تاریخ الملوک والامم'' اور علامہ ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ (م ۶۳۰ھ) کی ''الکامل فی التاریخ'' نہایت مشہور ہیں۔اسی زمانے میں صحابہ کرام کے حالات پر جامع تالیفات کا ذوق پیدا ہوا۔چنانچہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی ''الاستیعاب''، ابن اثیر جزری رحمہ اللہ کی ''اُسد الغابۃ'' اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی ''الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ'' جیسی وقیع کتب منظر عام پر آئیں۔

تاتاریوں کے حملے کے بعد عالم اسلام کی نشأۃ ثانیہ ہوئی تو مستند کتب تواریخ کی ضرورت کا احساس کر کے کئی جید

علماء پوری تندہی کے ساتھ اسلامی تاریخ کو محفوظ بنانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اوران کے قلم سے اسلامی تاریخ کی جامع کتب وجود میں آئیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ (م ۷۴۸ھ) کی ''تاریخ الاسلام''، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (م ۷۷۴ھ) کی ''البدایۃ والنہایۃ''، علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ (م ۸۰۸ھ) کی ''دیوان المبتدو الخبر'' اور ابن عماد حنبلی (م ۱۰۸۹ھ) کی ''شذرات الذھب'' ایسی ہی بے مثال کتب ہیں۔ الغرض ساتویں صدی ہجری سے نویں صدی ہجری تک تاریخ نویسی کے عروج کا دور رہا جس میں یہ میدان نہایت وسیع ہو گیا۔

علم البلدان اور سفر نامے:

شہروں اور ملکوں کے جغرافیے، ان کی تاریخ، وہاں کے مشاہیر اور تہذیب وتمدن پر مستقل کتب لکھی گئیں۔ ابنِ شبّہ (م ۲۶۲ھ) نے ''تاریخ المدینۃ'' لکھی۔ امام فاکہی (م ۲۷۲ھ) اور امام ازرقی (م ۲۵۰ھ) نے ایک ہی نام ''اَخبارُ مَکّۃ'' سے دو الگ الگ کتب تصنیف کیں۔ ان کے بعد ابن خُرداذبہ (م ۲۸۰ھ) کی ''المسالک والممالک''، ابن الحائک ہمدانی (م ۳۳۴ھ) کی ''صفۃ جزیرۃ العرب''، البیرونی (م ۴۴۰ھ) کی ''کتاب الہند''، ابن الفرضی (م ۴۰۳ھ) کی ''تاریخ علماء الاندلس''، ابونُعیم اصفہانی (م ۴۰۵ھ) کی ''تاریخ نیسابور'' حمزہ جُرجانی (م ۴۲۷ھ) کی ''تاریخ جُرجان''، الادریسی (م ۵۶۰ھ) کی ''نُزہۃ المشتاق''، ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) کی ''تاریخ بیت المقدس'' اور یاقوت حموی (م ۶۲۶ھ) کی ''معجم البلدان'' اس میدان کی کچھ مثالیں ہیں۔

اس شعبے کو چار چاند ان لوگوں نے لگائے جنہوں نے ملکوں ملکوں گھوم پھر کر سفرنامے تحریر کیے، چنانچہ ابن جُبیر اَندلسی (م ۶۱۴ھ) اور ابن بطوطہ (م ۷۷۹ھ) کے سفرنامے آج بھی دنیا سے خراجِ تحسین وصول کر رہے ہیں۔

علمِ طبقات:

تاریخ اور رجال پر اس کام کے ضمن میں دیگر مسلم مشاہیر اور بزرگوں کے حالات کو محفوظ کرنے کا مشغلہ بھی عروج پر پہنچ گیا۔ چنانچہ خلیفہ بن خیاط کی ''الطبقات''، الازدی کی ''طبقات الصوفیۃ''، ابن جوزی رحمہ اللہ کی ''صفوۃ الصفوہ''، حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی ''سیر اعلام النبلاء''، امام سیوطی رحمہ اللہ کی ''طبقات الحفاظ''، ابواسحٰق شیرازی کی ''طبقات الفقہاء''، یاقوت حموی کی ''معجم الادباء'' اور ابن المعتز کی ''طبقات الشعراء'' جیسی بے مثال تالیفات اسلامی کتب خانوں کی زینت بنیں۔ یوں فنِ رجال اور تاریخ کے ساتھ علم طبقات بھی عام ہو گیا۔ اس علم میں کسی خاص دور یا کسی خاص فن سے تعلق رکھنے والے مشاہیر کے احوال کو اس طرح جمع کیا جاتا ہے کہ پہلے ایک نسل یا ایک دور میں گزرنے والے لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگلی نسل یا دور کے لوگوں کا ذکر ہوتا ہے۔ ایک طبقے کے تذکرے میں کبھی ان کے مراتب، کبھی علاقے، کبھی پیشے اور کبھی حروفِ تہجی کی ترتیب ملحوظ رہتی ہے۔

علمِ طبقات علمِ تاریخ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تاریخ میں اصل اہمیت حوادث اور انقلابات کو دی جاتی ہے، قوموں کے عروج وزوال، حکومتوں کی تبدیلیوں اور سیاسی رہنماؤں کے عروج وزوال کے

''تاریخ ... المنورة'' ... اسی دور ... اصل اہمیت شخصیات کی ہوتی ہے، سیاسی

باوجود پیدائش آدم ...

''الاخبار ...

... (تاریخ نگاری) کے فن کو بھی نئی زندگی دی اور امت کے ... تصنیف کر کے ان کی تابندہ زندگیوں کا ایک ایک گوشہ ہمارے ...) کی ''سیرۃ عمر بن عبدالعزیز''، ابوالفضل صالح (۲۶۰ھ) کی ... ابی حنیفہ'' اور بہاؤ الدین ابن شداد کی ''النوادر السلطانیہ'' سیرت وسوانح ... مختصر یہ کہ اسلامی تاریخ نگاری کے دورِ عروج میں ملکوں، شہروں، قوموں، قبیلوں، ... پیشہ وروں تک کی الگ الگ سینکڑوں تاریخیں مرتب کر دی گئیں۔ فقہاء اور محدثین ... ''طبقات الاحناف''، ''طبقات الشافعیۃ'' اور ''طبقاتِ الحنابلۃ'' جیسی کتب تصنیف کی ... ''حلیۃ الاولیاء'' اور مشاہیر کے احوال ''وفیات الاعیان'' جیسی کتب میں محفوظ ہو گئے۔ ... نحویوں، صرفیوں، شاعروں اور ادیبوں کے حالات پر ''معجم الادباء''، ''طبقات الشعراء''، ... ''جیسی مستقل کتب تصانیف کی گئیں۔

... اور سوانح نگاروں نے عالم اسلام کی تاریخ، تہذیب وتمدن اور جغرافیے سمیت ایک ایک چیز کو ... محفوظ کر دیا جس کا ثمرہ یہ ہے کہ آج اپنے دورِ زوال میں بھی امت اپنے دورِ عروج کے تاب ... طرح دیکھ سکتی ہے گویا وہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہوں۔

☆☆☆

اسلامی تاریخ اور دیگر تواریخ کا فرق

اسلامی تاریخ ایک باقاعدہ فن کے انداز میں مدوّن ہوئی جس کے اصول وضوابط طے ہیں۔ دوسری تاریخوں کی روایات ثقاہت اور ثبوت کے لحاظ سے کسی درجے کو نہیں پہنچتیں۔

- اسلامی تاریخ میں اسناد کو اہم حیثیت حاصل ہے۔ دوسری تاریخوں میں اسناد کا کوئی حصہ نہیں۔ روایات کو ماننے یا مسترد کرنے کا کوئی اصول نہیں۔ بعض شخصیات سے اندھی عقیدت اور بعض سے بے جا نفرت کارفرما نظر آتی ہے۔
- اسلامی تاریخی روایات کے معیار کی جانچ پڑتال کی جا سکتی ہے؛ کیوں کہ فنِ رجال کی کتب میں تاریخی راویوں کے حالات بھی محفوظ ہیں، اس لیے راویوں کے حالات کی چھان بین ممکن ہے اور اسی سے روایت کا معیار معلوم کیا جا سکتا ہے۔ دوسری اقوام کی تاریخوں میں روایات کی جانچ کا کوئی اصول نہیں۔ اہل یورپ کی جدید تاریخ نویسی

میں بھی قیاس کے سوا، روایات کو قبول یا مسترد کرنے کا کوئی پیمانہ موجود نہیں۔

۔ اسلامی تاریخ میں روایت کے ساتھ ساتھ درایت کا اصول بھی مدنظر رہتا ہے۔دوسری قدیم تواریخ میں درایت سرے سے نظرانداز کردی گئی۔یہی وجہ ہے کہ ہندو آج بھی رامائن اور بھگوت گیتا کے مافوق الفطرت قصوں کو اور یونانی ہرکولیس کی ناقابل فہم داستانوں کو مانتے چلے آرہے ہیں۔

۔ اسلامی اور غیراسلامی تاریخ کے مابین معیار کے فرق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یورپی مؤرخین عہد نامۂ عتیق کو آج بھی اپنی تاریخ کا سب سے مستند ماٰخذ مانتے ہیں اور ہنود ''رامائن'' کو اپنا تاریخی ورثہ کہہ کر فخر کرتے ہیں حالانکہ ان کے مندرجات خلافِ فطرت باتوں سے بھرے پڑے ہیں اور اسنادی لحاظ سے ان کی کوئی حیثیت نہیں بنتی۔دوسری طرف مسلم مؤرخین ابن قُتیبہ کی ''المعارف'' جیسی تصنیف کو بھی معتبر کتب کی فہرست سے خارج کردیتے ہیں۔مسلم محققین، واقدی پر بھی جو بغداد کے قاضی رہے، آنکھیں بند کرکے اعتماد نہیں کرتے۔

☆☆☆

مسلمانوں کے ہاں علمِ تاریخ کے زوال کے اسباب

مسلمانوں کا زوال اور علم تاریخ کا انحطاط تقریباً ساتھ ساتھ ہی ہوا۔اس طرح یہ بات سچ ثابت ہوئی کہ جو قوم اپنی تاریخ کو فراموش کردیتی ہے، وہ اپنی شناخت کھودیتی ہے۔گزشتہ تین چار صدیوں سے ہم دیگر علوم کی طرح تاریخ میں بھی زوال کا شکار ہیں۔اگرچہ عرب دنیا میں اس حوالے سے بیداری کی ایک لہر آئی ہے اور وہاں تاریخ کے موضوع کو علمی حلقوں میں خاص اہمیت دی جارہی ہے مگر مسلمانان برصغیر کی تاریخ سے ناآشنائی میں کوئی کمی نہیں آرہی۔

تاریخ سے ہماری ناواقفیت کے دیسے تو بہت سے اسباب ہیں مگر ان میں سے کچھ اہم اسباب کا ذکر کیا جارہا ہے:

1. تاریخ کے اصل محافظ علمائے کرام تھے، آٹھ نو صدیوں تک محدثین، مفسرین اور فقہاء نے اس فن میں خاص دلچسپی لی اور اسے زیادہ سے زیادہ ترقی دی۔مگر رفتہ رفتہ تاریخ پر اسلامی ذہن رکھنے والے طبقے کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔یہ درباری منشیوں اور شعراء و ادباء کا مشغلہ بن گیا۔پھر مزید انحطاط ہوتے ہوتے اس پر اغیار نے قبضہ جمالیا۔مستشرقین نے اسلامی تاریخ کو بازیچۂ اطفال بنا کر رکھ دیا۔پھر ان کے تلامذہ میدان میں آئے جو سیکولر ذہن کے حامل تھے، ان کے ہاتھوں اسلامی تاریخ اس بری طرح پامال ہوئی کہ گزشتہ صدیوں میں اس کی مثال ناپید ہے۔اب تاریخ پر اسی سیکولر لابی کی اجارہ داری ہے جو خود کو غیرجانبدار کہتے ہوئے درحقیقت اسلام سے بدترین دشمنی کا ثبوت دے رہی ہے۔یہ لوگ تاریخ کو بگاڑنے، مشاجرات صحابہ کی غلط توجیہات کرنے، اسلاف کو بدنام کرنے اور مسلم فاتحین کو رہزن و غارت گر قرار دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔اس طرح صحیح تاریخ سے غفلت عام ہوتی جارہی ہے۔اس کی جگہ ایک متبادل اور غلط تاریخ وجود پا رہی ہے۔

❷ عام مسلمانوں میں علم کا ذوق کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ دنیا پرستی، فکر آخرت سے غفلت اور اس کے ساتھ ساتھ غربت، مہنگائی، معاشی بدحالی اور دوسرے مسائل نے مسلمانوں کی اکثریت کی تمام تر صلاحیتوں کو روٹی، کپڑے اور مکان کے لیے وقف کر دیا ہے۔ ایسے میں کس کے پاس وقت ہے کہ اپنی تاریخ کو پڑھنے کے لیے وقت نکالے اور اس سے سبق حاصل کرنے کی فکر کرے۔

❸ عالم اسلام میں دیگر علوم کی طرح تاریخ کی تعلیم کے مواقع بھی کم ہیں خصوصاً برصغیر پاک و ہند میں اس کی سہولتیں تقریباً ناپید ہیں۔ دینی مدارس میں بھی اس سلسلے میں کوئی کام نہیں ہوا۔ تاریخ میں تخصص کی درسگاہیں یا شعبے ڈھونڈے نہیں ملتے۔ تاریخ کو بطور مضمون شامل کرنے کا خیال بھی ہمیں بہت دیر بعد آیا ہے۔

❹ عصری تعلیم گاہوں میں تاریخ اسلام بطور مضمون داخل ہے مگر یہ مضمون برائے نام پڑھایا جا رہا ہے۔

❺ عصری تعلیم گاہوں میں تاریخ کے بہت سے اساتذہ سیکولر ہیں۔ اس لیے سلطان محمود غزنوی اور عالمگیر جیسے حکمرانوں کے حالات پڑھاتے ہوئے وہ انہیں بہر صورت ظالم، بے رحم اور عوام کا دشمن ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں، انہیں ڈاکو اور لٹیرا قرار دیتے ہیں؛ کیوں کہ انہوں نے ہندو مؤرخین کی بے سروپا تحقیقات، تاریخی ناولوں اور فلموں میں یہی کچھ دیکھا، سنا اور پڑھا ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ مشاجرات صحابہ کی نہایت گھناؤنی تصویر پیش کر کے ان پاک باز ہستیوں کو خود غرض، دنیادار اور ہوسِ اقتدار میں مبتلا قرار دیتے ہیں؛ کیوں کہ ان کے بارے میں مغربی مؤرخین گولڈزیہر، پادری زویمر، جوزف شاخت اور ولیم میور نے اپنی کتابوں میں یہی تاثر دیا ہے۔

❻ علم کی جگہ اعلیٰ اسناد بجائے خود مقصد بن گئی ہیں۔ معیاری کام کی طرف توجہ بہت کم ہے۔ کاپی پیسٹ قسم کے مقالات پر بھی پی ایچ ڈی کی سند مل جاتی ہے۔ دوسروں سے مقالات لکھوا کر ''ڈاکٹریٹ'' کی سند لینا بھی عام ہے۔

❼ ہمارا تعلیمی نظام ایسا ہے کہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کی اسناد لینے میں ہی زندگی کا بہترین حصہ بیت جاتا ہے اور کوئی بڑا علمی کام کرنے کے لیے کم وقت رہ جاتا ہے۔

❽ علمی و تحقیقی کام کی عموماً قدر نہیں ہوتی۔ تاریخ پر تحقیق کرنے والے سے زیادہ اہمیت تاریخی ناول نگار کی ہوتی ہے۔

❾ تاریخ اسلام میں پی ایچ ڈی کرنے والے حضرات بھی عموماً اسلامی تاریخ کی بنیادی زبانیں یعنی عربی و فارسی نہیں جانتے۔ وہ تاریخ کا مطالعہ مستشرقین کی انگریزی کتب یا ان کے اردو تراجم سے کر کے کج فکری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ یہی تحریف شدہ تاریخ آگے منتقل کرتے ہیں اور علم کی جگہ جہالت پھیلانے کا باعث بنتے ہیں۔

یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے علم تاریخ ہمارے ہاں روبہ زوال ہے۔ جب تک ان اسباب کو دور نہیں کیا جاتا، جہالت کے یہ اندھیرے ہم پر مسلط رہیں گے۔

علمِ تاریخ کی اہمیت اور فوائد

تاریخ کی اہمیت قرآن مجید کی نظر میں:

تاریخ کی اہمیت قرآن مجید سے ثابت ہے۔ اللہ کے کلام نے گزشتہ پیغمبروں کی تاریخ کو بڑے موجز، بلیغ اور پر اثر انداز میں بیان کیا ہے تاکہ حق کے ماننے والوں کو حوصلہ ملے اور منکرین انجام سے خبردار ہو جائیں۔ فرمایا:

﴿وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَانُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ ①

''اور پیغمبروں کے وہ سب حالات جو ہم تم سے بیان کرتے ہیں، ان سے ہم تمہارے دل کو مضبوط رکھتے ہیں۔''

قرآن مجید کی درجنوں سورتیں امم ماضیہ کے قصوں کو بیان کرتی ہیں تاکہ ان کے انجام بد سے عبرت پکڑی جائے۔

﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ ②

''بے شک ان لوگوں کے قصوں میں عقل والوں کے لیے عبرت کا سامان ہے۔''

قرآن مجید تاریخ کی کتاب نہیں، نوشتہ ہدایت ہے۔ قرآن پاک تاریخ سے اسی انداز میں بحث کرتا ہے جس سے لوگوں کو ہدایت ملے اور ان کا تعلق اپنے خالق سے جڑ جائے۔

تاریخ کی اہمیت احادیث میں:

احادیث سے بھی تاریخ کی اہمیت کا پتا چلتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے گزشتہ قوموں اور انبیائے سابقین کے کئی واقعات بیان کیے ہیں جو ذخیرۂ احادیث میں موجود ہیں۔ ان کو بیان کرنے کا مقصد وہی ہے جو قرآن مجید کا ہے۔ یعنی عبرت و نصیحت۔ صحابہ کرام نے حضور اکرم ﷺ کے اقوال و افعال کے علاوہ اس مبارک دور کے تاریخی واقعات، غزوات اور دیگر حالات کو اسی لیے روایت کیا تاکہ قیامت تک آنے والے لوگ ان سے نورِ ہدایت حاصل کریں۔ حضرات تابعین اور حدیث شریف کے رواۃ نے بھی سیرت النبی اور سیرتِ صحابہ کو اسی نیت سے محفوظ رکھا۔

سیرت اور صحابہ کرام کے دور کے حالات کا ایک بڑا ذخیرہ ہمیں حدیث کی کتب سے ملتا ہے۔ حدیث اگرچہ تاریخ کا مجموعہ نہیں ہے مگر اس میں ضمناً تاریخ کے بہت سے واقعات کو لیا گیا ہے۔ اسلامی تاریخ کا یہ حصہ جو کتب حدیث میں ہے، صحت وثقاہت کے لحاظ سے تمام مآخذ تاریخ پر فوقیت رکھتا ہے۔ حدیث کے ذخیرے میں تاریخی واقعات کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ علم تاریخ کی اہمیت حضور نبی اکرم ﷺ، صحابہ کرام اور خیر القرون کے اصحاب علم ودانش کے نزدیک مسلم تھی۔

---

① سورۃ ہود، آیت: ۱۲۰

② سورۃ یوسف، آیت: ۱۱۱

تاریخ کا حکم فقہاء کے نزدیک:

ہر فن اور علم کی طرح تاریخ کے بھی دو پہلو ہیں: ایک مفید، دوسرا مضر۔ پھر مفید پہلوؤں میں سے بعض بہت اہم اور بعض کم اہم ہیں۔ اسی طرح مضر پہلوؤں میں سے بعض کم مضر اور بعض زیادہ مضر بلکہ مہلک ہیں۔

اللہ تعالیٰ فقہائے اسلام کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے جس طرح زندگی کے ہر ہر پہلو کا شرعی حکم قرآن وحدیث سے مستنبط قواعد کی رو سے واضح کیا ہے، اسی طرح علوم کے بارے میں بھی انہوں نے جائز و ناجائز کی تشریح کر دی۔ علم تاریخ کے بارے میں فقہائے اسلام کی رائے یہ ہے:

❶ تاریخ کے بعض ابواب کا علم حاصل کرنا فرض عین ہے، بعض کا فرض کفایہ ہے،، بعض کا واجب ہے، بعض کا مندوب (بہتر) ہے، بعض کا مباح (جائز) ہے، بعض کا مکروہ ہے۔ بعض کا حرام ہے۔

❷ سیرت نبویہ کا اس قدر علم کہ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر ﷺ کا تعارف ہو جائے، فرض عین ہے۔

❸ ایسے واقعات کا جاننا جن پر اعتقادی و فقہی مسائل اور مسلمانوں کے مصالح موقوف ہوں، واجب ہے۔ اس لیے اُمت کے ایک طبقے پر اس قدر علم تاریخ سیکھنا فرض کفایہ ہے۔

اعتقادی اور عملی مسائل کا علم تاریخ پر منحصر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے اعتقادی و عملی مسائل احادیث سے ماخوذ ہیں جن کے رواۃ اور ناقلین کے احوال کا پتا اس وقت تک نہیں چل سکتا جب تک تاریخ سے واقفیت نہ ہو۔ اسی طرح کسی حدیث کا متصل السند ہونا، ناسخ و منسوخ کا علم ہونا، نیز نسب اور وراثت کے بہت سے مسئلے تاریخ پر موقوف ہیں۔ اس لیے تاریخ کے ایسے حصے کا علم فرض کفایہ ہوا۔

❹ علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے ابو الحسین فارس کا قول نقل کیا ہے کہ سیرت نبویہ کو یاد رکھنا علماء اور عارفین کے لیے واجب ہے۔

❺ صحابہ کرام، اولیاء اور اچھے لوگوں کے حالات کا علم حاصل کرنا جس سے نیکی کی طرف رغبت ہو، مندوب ہے۔

❻ بادشاہوں، وزیروں، شہزادوں، شاعروں، ادیبوں اور دوسرے لوگوں کے حالات و واقعات کا جاننا (جن سے دین میں کوئی نقصان نہ ہو، دنیوی لحاظ سے فائدہ ہو) مباح ہے۔

❼ ایسے فضول واقعات کو پڑھنا جن میں کوئی دینی یا دنیوی نفع نہیں ہے، مکروہ ہے۔

❽ عاشق و معشوق کے قصے، اخلاق سے گری ہوئی حکایات اور فاسق و فاجر لوگوں کے ایسے واقعات پڑھنا جن سے اعتقادی یا عملی خرابیوں میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہو، یا جن سے برائیوں کو تحریک ملتی ہو، حرام ہے۔[1]

❾ کسی خاص ضرورت کے بغیر صحابہ کرام کے مشاجرات کا مطالعہ یا مذاکرہ مکروہ ہے؛[2] کیوں کہ اس میں کوئی دنیوی فائدہ ہے نہ اخروی بلکہ ان حضرات کے ادب و احترام میں کمی آنے کا امکان ہے۔ اگر عقیدے میں خلل کا خطرہ

---

[1] ملخص از الاعلان بالتوبیخ، ص ۸۶ تا ۹۰

[2] الاعلان بالتوبیخ، ص ۸۸

ہوتو یہ حرام ہے۔[1] البتہ صحابہ کے خلاف اہلِ باطل کے پروپیگنڈے کا جواب جاننے اور دوسروں کو حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے اس موضوع کا مطالعہ اور اس پر مباحثہ جائز بلکہ ضرورت کے وقت واجب ہو جاتا ہے۔[2]

اہلِ علم کے نزدیک تاریخ کی اہمیت:

علمِ تاریخ کا اہلِ علم کے ہاں کیا مقام رہا ہے؟ اور اس علم کے کیا کیا فوائد ہیں؟ ذیل میں ہم اس کی ایک جھلک پیش کرتے ہیں:

- امام علی بن مَدِینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حدیث کا مطلب سمجھنا نصف علم ہے اور شخصیات کی پہچان نصف علم ہے۔[3]
- حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمہ اللہ نے تحریر کیا ہے کہ دنیوی ترقی کے لیے چار امور نہایت ضروری ہیں:

ماضی سے ارتباط، وحدتِ فکر و عمل، فراہمی اسبابِ قوت، جہدِ مسلسل۔[4]

اگر آپ غور کریں تو ترقی کے لیے بنیاد بننے والے ان چاروں امور کے لیے تاریخ کا مطالعہ نہایت اہم ہے۔ یہ چاروں امور بالترتیب ایک دوسرے پر موقوف ہیں۔ تاریخ ان کی پہلی کڑی ہے، اس لیے اپنی تاریخ سے لاعلم رہ کر ان چاروں امور کو وجود میں لانا کسی طرح ممکن نہیں۔

تاریخ کے فوائد:

مطالعۂ تاریخ کے اس کے علاوہ بے شمار فوائد ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

- تاریخ ہمیں حالات کی بصیرت عطا کرتی ہے۔ کسی درپیش واقعے کا صحیح تجزیہ کرنے اور کسی تازہ صورتحال میں درست فیصلہ کرنے کے قابل بناتی ہے؛ کیوں کہ تاریخ پڑھنے والا ماضی میں بیتنے والے ایسے بہت سے حالات سے واقف ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی صورتحال کو کبھی ناممکن یا عجیب نہیں سمجھتا بلکہ ماضی میں اس کی کوئی مثال فوراً اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر ایک تاریخ دان یہ کہاوت دہرا کر اپنا حوصلہ برقرار رکھتا ہے کہ: مَا أَشْبَهَ اللَّيْلُ الْبَارِحَة. "یہ رات بھی گزشتہ شب جیسی ہے۔" اہلِ یورپ ایسے مواقع پر کہتے ہیں: "تاریخ خود کو دہراتی ہے۔"
- تاریخ انسان کو تجربہ کار بناتی ہے۔ ایک سالار ایک عام سپاہی سے اس لیے اعلیٰ نہیں کہ اس میں طاقت اور پھرتی زیادہ ہے۔ طاقت میں بہت سے عام سپاہی سالار سے فائق ہوتے ہیں۔ بنیادی فرق تجربے اور قوتِ فیصلہ کا ہوتا ہے۔ تاریخ ماضی کے تجربات سے آگاہ کر کے انسان کو چند گھنٹوں میں صدیوں کے تجربات سے روشناس کراتی

---

① الابانة عن شريعة الفرقة الناجية لابن بطة، ص ۲۳۵، ط دار الرأية

② تنویر الایمان، ترجمہ تطهير الجنان لابن حجر الهيثمي، ص ۷۵

③ فتنہ استشراق، ص ۴، ط صدیقی ٹرسٹ کراچی

④ علامہ ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ نے اپنی تصانیف میں مشاجرات کی متعدد روایات نقل کیں۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں: "ہمارے ائمہ نے اصول میں تصریح کی ہے کہ صحابہ میں باہم جو لڑائیاں ہوئی ہیں، ان کا ذکر نہ کرنا چاہیے مگر کوئی ہم پر یہ اعتراض نہ کرے کہ تم نے ان واقعات کو کیوں بیان کیا! کیوں کہ ہمارا مقصد صحیح واقعات بیان کرنا اور ان سے صحیح نتائج نکالنا ہے۔"۔ پھر فرماتے ہیں: "جو کچھ میں نے ذکر کیا، اظہارِ حق کے لیے حقیقت کے مطابق نقل کیا ہے۔ ایسا ذکر کرنا اہم واجبات اور اشد ضروریات میں سے ہے؛ کیوں کہ اس سے صحابہ کی پاکیزگی اور صفائی ظاہر ہوتی ہے۔" (تنویر الایمان ترجمہ تطهير الجنان، ص ۷۴، ۷۵)

اور قوتِ فیصلہ، فیصلہ بخشتی ہے۔ایک عمر رسیدہ قائد بھی زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر سال کا تجربہ رکھتا ہے مگر تاریخ صدیوں کے تجربات کا نچوڑ پیش کرتی ہے۔قوم کی قیادت کرنے والوں کے لیے، تاریخ کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

- ہم کتابوں سے سیاسی، معاشرتی اور معاشی اصول، حکماء کے اقوال اور حکمت کی باتیں سیکھتے ہیں مگر جیتی جاگتی زندگی میں ان قواعد اور اقوال کی عملی تطبیق کا ملکہ حاصل کرنا آسان نہیں، تاریخ پڑھنے والا عملی زندگی میں جزئیات پر اصول کی تطبیق آسانی سے کرسکتا ہے؛ کیوں کہ اس کے سامنے گزشتہ لوگوں اور صالح قائدین کی بے شمار مثالیں موجود ہوتی ہیں۔وہ جانتا ہے کہ ایسے معاملات کو انہوں نے کس طرح سنبھالا تھا۔
- تاریخ انسان کو چوکنا رکھتی ہے۔حزم واحتیاط کا درس دیتی ہے۔دور اندیشی پیدا کرتی ہے۔سیاسی داؤ پیچ سمجھاتی ہے۔دشمن کے حربوں سے بچنے کے گر بتلاتی ہے۔

علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے بعض بزرگوں کا قول نقل کیا ہے کہ عقل و دانش سکھانے کے دو ذرائع ہیں: ایک لکھی ہوئی باتیں، دوسرے سنی ہوئی باتیں۔اور سنی ہوئی باتیں بھی جب تک لکھی نہ گئی ہوں، مفید نہیں ہوتیں؛ کیوں کہ بھول جاتی ہیں۔[1] پس عقل ودانش کے حصول کے لیے تاریخ پڑھنا ناگزیر ہے۔

- مطالعہ تاریخ سے سیاسی وعسکری امور میں وسعتِ نظر پیدا ہوتی ہے۔مشکل اوقات میں گزشتہ قائدین، حکمرانوں، فاتحین اور سالاروں کا طرزِ عمل نگاہ کے سامنے رہتا ہے۔
- تاریخ اپنے اسلاف سے رشتہ جوڑ کر قومی غیرت وحمیت پیدا کرتی ہے جو تمام شریفانہ خصائل کی روح ہے، اس کے برخلاف بے حیائی اور بے غیرتی تمام رذائل کی جڑ ہے، فرمانِ نبوی ہے:

"إِذَا لَمْ تَسْتَحِي فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ." "جب تجھ میں حیا نہیں تو جو چاہے کر۔"[2]

اگر یہ غیرت وحمیت نہ ہو تو انسان برے سے برا کام کرتے ہوئے بھی نہیں شرماتا۔اگر ایک سیدزادے کو پتا ہی نہ ہو کہ سید کون ہوتے ہیں اور وہ کس خانوادے کا بیٹا ہے تو ممکن ہے کہ وہ کوئی بھی گھٹیا حرکت کر گزرے۔لیکن اگر وہ اپنی شرافتِ نسبی سے آگاہ ہو تو مر کر بھی اپنی خاندانی عزت وتوقیر کو بٹا نہیں لگنے دے گا۔

یہی حال قوم کے اجتماعی ضمیر کا ہوتا ہے۔اگر قوم کو معلوم ہو کہ وہ کن اسلاف کی وارث ہے تو سخت سے سخت آزمائش میں ڈٹ جائے گی اور بڑی سے بڑی طاقت کے آگے سر نہیں جھکائے گی۔لیکن اگر یہ احساس مر چکا ہو تو پھر ایسی قوم کے ہر گھر میں غدار اور کم ظرف لوگ جنم لینے لگتے ہیں اور اس قوم کی نیا ڈوب کر رہتی ہے۔

- تاریخ گزشتہ زمانوں کے حوادث، آلام، مصائب، تباہیوں اور قتل وغارت کے مناظر دکھا کر انسان میں مشکل سے مشکل حالات کو جھیلنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔انسان سمجھ جاتا ہے کہ دنیا امتحان کی جگہ ہے، مؤمن کا قید خانہ ہے،

---

[1] الاعلان بالتوبیخ، ص ۳۲

[2] سنن ابن ماجة، ح: ۴۱۸۳

یہاں کے مصائب سے کسی کو چھٹکارا نہیں۔

- تاریخ کا مطالعہ کیے بغیر ہم یہود و نصاریٰ اور دوسری اسلام دشمن طاقتوں کی سازشوں، مکاریوں اور نفسیات سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔
- تاریخ کا گہرا مطالعہ کر کے ہی ہم گمراہ فرقوں، سیکولر مؤرخوں اور مستشرقین کی ان نام نہاد تحقیقات کے تار و پود بکھیر سکتے ہیں جو وہ تاریخ کے نام پر پیش کر رہے ہیں۔
- تاریخ اسلاف کے واقعات یاد دلا کر عمل صالح اور سعی مسلسل کا جوش و جذبہ بیدار کرتی ہے۔
- اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے اچھی صحبت اور بڑے لوگوں کی مجالست سے زیادہ مفید چیز کوئی اور نہیں۔ تاریخ ہمیں کسی وقت کے بغیر کبھی دورِ نبوت میں لے جاتی ہے، کبھی عہدِ صحابہ کی بہاریں دکھلاتی ہے، کبھی شبلی اور جنید بغدادی کی مجالس میں بٹھا دیتی ہے، کبھی صلاح الدین ایوبی اور سلطان محمد فاتح کے دربار میں پہنچا دیتی ہے۔

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو ... دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

- تاریخ اپنی دلچسپی کی وجہ سے جائز اور عمدہ تفریح مہیا کرتی ہے، لذت و سرور بخشتی ہے۔
- تاریخ انسان کو مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتی ہے۔ علامہ سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انسانوں کی حیثیت باتوں کی سی ہے۔ کہاوت ہے کہ مرنے والا مر جاتا ہے مگر اس کا ذکر اسے زندہ رکھتا ہے۔ بادشاہ اور رؤساء، یہ عمارات، محلات اور قلعے اسی لیے تعمیر کرتے ہیں کہ ان کا ذکر باقی رہے۔ ① یہ فائدہ تاریخ کے ذریعے زیادہ مکمل طور پر حاصل ہوتا ہے۔
- علامہ سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تاریخ کے ضمن میں انسان کئی دوسرے علوم سے بھی فیض یاب ہوتا ہے، مثلاً سیاسیات ایک مستقل علم ہے مگر تاریخ کے مطالعے سے انسان سیاسیات، ریاست اور اجتماعی اداروں کی قسمیں، ضروریات اور متعلقہ بہت سی چیزیں جان لیتا ہے، اسی طرح علم اخلاق ایک مستقل علم ہے مگر تاریخ کے مطالعے سے عمدہ اخلاق اور ان کے حصول کے طریقے سے آگاہی ہوتی ہے۔ اسی طرح بری عادات اور ان سے اجتناب کا سلیقہ بھی سمجھ آ جاتا ہے۔ ②

تاریخِ اسلامی کے اہم فوائد:

بہت سے فوائد ایسے ہیں جو عام تاریخ سے حاصل نہیں ہو سکتے، صرف اسلامی تاریخ کی وساطت سے مل سکتے ہیں مثلاً اسلامی تاریخ توحید کی دلیل ہے؛ کیوں کہ یہ قرآن و حدیث سے واقعات اخذ کر کے بتاتی ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر نوح علیہ السلام تک تمام انسان توحید کا عقیدہ رکھتے تھے، اس کے بعد شیطان نے شرک پھیلایا۔ ③

---

① الاعلان بالتوبیخ، ص ۳۶ تا ۳۸ ② الاعلان بالتوبیخ، ص ۸۴

③ سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۱۳،۱۳۶ ؛ سورۃ آل عمران، آیت: ۸۱،۱۹ ؛ سورۃ المائدۃ، آیت: ۴۸

اس سے پتا چلا کہ اصل فطرت میں انسان توحید کا قائل ہے جبکہ شرک بعد میں لاحق ہونے والی ایک قلبی واعتقادی بیماری ہے۔ دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کی تاریخ بھی درست شکل میں صرف اسلامی تاریخ میں ملتی ہے، یہ درست تاریخ بتاتی ہے کہ سب انبیاء نے توحید کی دعوت دی۔

اسلامی تاریخ رسالت پر ایمان کی پختگی کا ذریعہ بھی ہے؛ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت بار بار راہ سے بھٹکتی رہی، اس لیے فطری طور پر اسے تھوڑی تھوڑی مدت بعد کسی نہ کسی روحانی راہبر کی ضرورت پڑتی رہی۔ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کے ذریعے یہ ضرورت پوری فرمائی۔ یہ حالات تاریخ اسلامی ہی میں صحیح شکل میں محفوظ ہیں۔

اسلامی تاریخ ہمیں راہِ حق میں صبر واستقامت کا سبق دیتی ہے؛ کیوں کہ یہ بتاتی ہے کہ کس طرح گزشتہ انبیائے کرام اور ان کے امتیوں کو تکالیف اور اذیتوں سے گزرنا پڑا، پس ہمیں تو آخری اُمّت ہوتے ہوئے مزید صبر وتحمل کا ثبوت دینا چاہیے۔ حضور اکرم ﷺ سے جب کفارِ مکہ کے مظالم کی شکایت کی گئی تو نبی ﷺ نے فرمایا: تم سے قبل گزرنے والی امتوں کو لوہے کی کنگھیوں سے اس طرح چھیلا گیا کہ گوشت اور ہڈیاں الگ ہوگئیں، ان کو آروں سے چیرا گیا، مگر وہ دین سے نہ ہٹے۔ ①

اسلامی تاریخ، سیرت انبیاء اور سیرت خاتم النبیین کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اللہ کی محبت، اس کی خشیت، قوم کی فکر، دین کے لیے قربانی، مخلوق پر شفقت اور انسانوں کی خیرخواہی سمیت بے شمار بہترین اسباق حاصل ہوتے ہیں جو تاریخ کے کسی اور باب سے حاصل نہیں کیے جاسکتے۔

علماء وفقہاء کو تاریخ کی ضرورت:

علماء وفقہاء کے لیے تاریخ کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے، اس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

ا یہ حضرات قوم کے قائد ہیں۔ قائد کو جس تجربے، فہم ودانش اور فکری تربیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ تاریخ کے مطالعے کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی۔

ا بہت سے دینی مسائل کا فہم بھی تاریخ پر موقوف ہے۔ خصوصاً تفسیر، حدیث، سیرت اور مناقب صحابہ کے ابواب میں ایسے بہت سے مواقع آتے ہیں جہاں تاریخ سے ناواقفیت کی بناء پر بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔

مثلاً ایک آیت کا ناسخ اور دوسری کا منسوخ ہونا تبھی پتا چل سکتا ہے کہ ان میں سے ایک کے پہلے اور دوسری کے بعد میں نازل ہونے کا علم ہو۔ ظاہر ہے اس کے لیے تاریخ کا جاننا ضروری ہوگا۔

اسی طرح دو متعارض احادیث میں تطبیق کے لیے بھی بسا اوقات تاریخ کا علم فائدہ دیتا ہے۔ جیسا کہ آگ پر پکی ہوئی چیزوں سے وضو ٹوٹ جانے کا مسئلہ مختلف فیہ رہا مگر ایک روایت نے بتادیا کہ نبی اکرم ﷺ کا آخری عمل آگ پر پکی ہوئی چیزوں کی وجہ سے وضو نہ فرمانا تھا۔ اس طرح تعارض دور ہوگیا۔

① صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ، ح: ۳۶۱۲

سند کی جانچ پڑتال علم تاریخ کے بغیر ناممکن ہے، تاریخ ہی بتاتی ہے کہ راوی نے جس محدث سے روایت لی ہے وہ اس کے دور میں حیات تھے بھی یا نہیں۔ اگر دونوں معاصر تھے تو دونوں کسی جگہ ملے تھے یا نہیں۔ دور دراز بسنے والے دو راویوں کی باہمی ملاقات یا اجازتِ حدیث کس طرح ممکن ہوئی۔ تاریخ پر گہری نظر ہو تو یہ تمام الجھنیں دور ہو جاتی ہیں۔ [1]

تاریخ کے ذریعے جھوٹے راویوں کی پکڑ:

تاریخ کے ذریعے جھوٹے راویوں کی روایات کی قلعی بھی فوراً کھل جاتی ہے۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ کا مشہور مقولہ ہے:

" لَمَّا اسْتَعْمَلَ الرُّوَاةُ الْكَذِبَ اِسْتَعْمَلْنَاهُمُ التَّارِيْخَ."

''جب راوی جھوٹی روایات گھڑنے لگے تو ہم نے ان کی جانچ کے لیے تاریخ سے کام لیا۔''

حفص بن غیاث فرماتے ہیں:

اِذَا اتَّهَمْتُمْ فَحَاسِبُوْهُ بِالسِّنِيْنَ.

''جب تمھیں کسی راوی پر شک ہو تو تاریخ کے ذریعے اس کی جانچ کیا کرو۔''

حماد بن زید رحمہ اللہ کا قول ہے:

لَمْ يُسْتَعَنْ عَلَى الْكَذَّابِيْنَ بِمِثْلِ التَّارِيْخِ.

''جھوٹی روایات گھڑنے والوں کے خلاف تاریخ سے بہتر معاون کوئی نہیں۔'' [2]

تاریخ کے ذریعے جعلی روایات کا پردہ چاک:

تاریخ جعلی روایات کا پردہ کس طرح چاک کرتی ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

بعض راویوں نے امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا تھا کہ ایک بار مامون الرشید نے آزمانے کے لیے انہیں اتنی نبیذ پلائی جس سے ایک عام شخص کو نشہ چڑھ جاتا مگر امام صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''لسان المیزان'' میں تاریخی شواہد سے ثابت کیا کہ یہ روایت جعلی ہے؛ کیوں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مامون الرشید سے ملنا ثابت نہیں۔ نیز انہوں نے درایت سے کام لیتے ہوئے بتایا کہ امام شافعی رحمہ اللہ وہ شخصیت ہیں جو فرمایا کرتے تھے کہ: اگر مجھے خدشہ ہو کہ ٹھنڈا پانی میری سمجھ بوجھ اور وقار میں خلل ڈالے گا تو میں عمر بھر گرم پانی پینے پر اکتفا کروں گا۔ تو ایسی ہستی کے بارے میں نبیذ نوشی کی مذکورہ روایت پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے!! [3]

تاریخ میں مہارت کے ذریعے یہودیوں کی سازش ناکام:

مناسب ہوگا کہ یہاں تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے ایک جلیل القدر عالم کا ایک قصہ نقل کر دیا جائے جس سے اندازہ ہوگا کہ جو عالم تاریخ کا ماہر ہو وہ دینی معاملات میں بھی امتِ مسلمہ کو زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

---

[1] الاعلان بالتوبیخ، ص ۱۸، ۱۹

[2] الشماریخ، ص ۱۸ [3] الاعلان بالتوبیخ، ص ۲٦، بحواله لسان الميزان: ٦/ ٦٧

پانچویں صدی ہجری میں بغداد کے یہود نے حکومت کو ایک قدیم دستاویز پیش کی جس کے مطابق نبیٔ اکرم ﷺ نے فتح خیبر کے بعد یہودیوں کو جزیہ معاف کر دیا تھا۔ اس دستاویز پر حضرت علی، حضرت سعد بن مُعاذ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہم کے دستخط تھے۔ دستاویز دیکھنے میں بھی بہت پرانی تھی۔ اسے دیکھ کر مسلمانوں نے یہ طے کر لیا کہ یہود کو جزیے سے آزاد کر دیا جائے۔ مگر اس فیصلے سے پہلے یہ دستاویز امام ابوبکر الخطیب بغدادی رحمہ اللہ کو دکھائی گئی۔ انہوں نے ایک نظر دیکھ کر اسے جعلی قرار دے دیا اور اس کی درجِ ذیل دو دلیلیں پیش کیں:

❶ اس دستاویز میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دستخط بھی ہیں حالانکہ وہ فتحِ مکّہ کے بعد اسلام لائے تھے۔[1]

❷ اس پر سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ کے دستخط ہیں حالانکہ وہ فتح خیبر سے بہت پہلے غزوہ خندق میں شہید ہو چکے تھے۔[2]

اس طرح ایک عالم کی تاریخ دانی نے یہود کے مکر و فریب کا پردہ چاک کر دیا۔

☆☆☆

خلافِ اصول تاریخ پڑھنے کے نقصانات

کوئی اچھی چیز بھی اگر اصول کے خلاف استعمال کی جائے تو وہ مضر بن جاتی ہے۔ شہد جیسا شفا بخش مواد بھی ایک حد سے زیادہ لیا جائے تو نقصان دہ ہوتا ہے۔ علم تاریخ میں بھی کچھ مضر پہلو ہیں۔ ان کا خیال نہ کرنے کے باعث بہت سے تاریخ پڑھنے پڑھانے والے اپنے ماضی سے بے زار اور اسلاف سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجوہ یہ ہیں:

❶ تاریخی مآخذ میں گمراہ فرقوں کے راویوں نے جگہ جگہ اپنی خانہ ساز روایات شامل کی ہوئی ہیں جن کی تطہیر کا کام پوری طرح نہیں ہو سکا۔ ایسے مواد کا اندازہ ماہر علماء ہی لگا سکتے ہیں۔ خام علم یا معمولی شدبد رکھنے والے ان روایات پر یقین کر لیتے ہیں اور کسی نہ کسی فکری مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

❷ تاریخ کی خطرناک گھاٹیوں میں پھسل جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تاریخ واقعہ تو بیان کرتی ہے مگر اس واقعے کی علّت، پس منظر اور توجیہ پر کبھی روشنی ڈالتی ہے، جس کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں جنم لے سکتی ہیں، اگر

---

① اس بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ وہ خفیہ طور پر ۶ ھ میں مسلمان ہو چکے تھے، البتہ مکّہ سے ہجرت نہ کر سکے۔ (طبقات ابن سعد: ۷/۴۰۶) یہ دوسرا قول اختیار کیا جائے تب بھی بات جوں کی توں رہے گی؛ کیوں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بالاتفاق غزوۂ خیبر میں شریک نہ تھے بلکہ وہ اس زمانے میں مکہ ہی میں تھے۔

② خطیب بغدادی کی دقتِ نگاہ کا یہ پورا واقعہ امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: المنتظم لابن جوزی: ۱۶/۱۲۹)

اس سے بہت ملتا جلتا واقعہ آٹھویں صدی ہجری کے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ہے جو ان کے تلمیذِ خاص امام ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے جس کے مطابق یہود نے صحابہ کے دستخطوں پر مشتمل ایک دستاویز پیش کی جس میں خیبر کے یہود سے جزیہ معاف کرنے کی توثیق تھی۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس دستاویز کے جعلی ہونے کے دس دلائل دیے جن میں سے ایک دلیل یہ تھی کہ اس دستاویز میں جزیہ معاف کرنے کا ذکر ہے حالانکہ جزیہ ۹ ھ میں غزوہ تبوک کے موقع پر مشروع ہوا تھا۔ ایک دلیل یہ بھی تھی کہ اس دستاویز میں یہود سے بیگار نہ لینے کا عہد کیا گیا ہے حالانکہ مسلمانوں میں یہودی اور غیر یہودی کسی سے بھی بیگار لینے کا رواج نہیں رہا۔ حضور نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام اس ظلم و جور سے بالکل پاک تھے۔ بیگار کا رواج بعد کے ظالم بادشاہوں کے دور میں شروع ہوا ہے۔ (زاد المعاد: ۳/۱۳۸)

احتیاط، باریک بینی اور انصاف کا دامن نہ تھاما جائے تو خلافِ حقیقت افسانے وجود میں آسکتے ہیں۔ اپنے قیاس سے بات کا بتنگڑ بنایا جاسکتا ہے۔ اس قسم کی گڑبڑ عموماً دو وجوہ سے ہوتی ہے:

(الف) کسی شخصیت کے مقام سے ناواقفیت کی وجہ سے

(ب) بغض وعناد کی وجہ سے

مثلاً کوئی شریف صورت انسان روزانہ ایک بجے بس اسٹاپ پر کھڑا نظر آتا ہے، ایک شخص یہ دیکھ کر اندازہ لگاتا ہے کہ یہ خفیہ پولیس کا کارکن ہے جو کسی کی نگرانی کر رہا ہے۔ دوسرے صاحب کا تبصرہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی عام سا آدمی ہے جو چہل قدمی کرنے نکلتا ہے۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک ذہنی مریض ہے جو اس وقت خواہ مخواہ یہاں آ دھمکتا ہے۔ کوئی شخص دشمنی کی بناء پر یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ کوئی دہشت گرد ہے اور تخریب کاری کا موقع ڈھونڈ رہا ہے۔ جب کہ عین ممکن ہے یہ سب غلط ہو۔ وہ ایک ملازم ہو، اس وقت دفتر جانے کے لیے بس کے انتظار میں وہاں کھڑا ہوتا ہو۔

معلوم ہوا کہ ایک واقعے سے کئی اندازے لگائے جاسکتے ہیں اور کئی افسانے بھی بن سکتے ہیں۔ تاریخ نام ہی واقعات کے مجموعے کا ہے۔ کسی واقعے سے کیا نتیجہ نکالنا چاہیے اور صحیح ترین تبصرہ کیا ہوسکتا ہے؟ اس کا فیصلہ گہرے مطالعے اور متعلقہ شخص کی زندگی سے حتی الامکان پوری واقفیت کے بعد ہی لگانا چاہیے۔ تبصرے کا یہ مرحلہ مؤرخ ہی کو سر کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ محتاط اور انصاف پسند نہ ہو تو ایسے موقع پر گمراہ کن تاثر دینے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

❸ لوگ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ (جس کا خاصا حصہ یورپ سے درآمدہ ہوتا ہے) پڑھتے پڑھاتے ہیں مگر ان اصولِ تاریخ سے عموماً ناواقف رہتے ہیں جو مسلم مؤرخین نے وضع کیے۔ کسی بھی علم وفن کو اس کے اصول کی خلاف ورزی کے ساتھ اخذ کیا جائے تو لازماً گمراہی اور کج فکری ہی جنم لے گی۔

❹ تاریخ اور اصولِ تاریخ سے بھی پہلے ایک مسلمان کو عقائد، شرعی احکام، سیرت رسول، اصول حدیث اور فنِ رجال کا ضروری علم ہونا چاہیے مگر یہاں حال یہ ہے کہ لوگ صحیح عقائد سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ حالانکہ کسی بھی اسلامی موضوع پر کام کرنے والے کے لیے مذکورہ علوم ضروری ہیں۔ جب یہ اصول ترک کر دیے جاتے ہیں تو پھر تاریخ کی پر پیچ گھاٹیوں میں بھٹکتے پھرنا اور فکری گمراہیوں کا شکار ہونا بالکل قرین قیاس ہے۔

❺ ہمارے اکثر تاریخ دان عربی وفارسی نہ جاننے کی وجہ سے تاریخ کے اصل مآخذ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے اور اردو یا انگریزی تراجم پر گزارا کرتے ہیں۔ اس طرح علم کی گہرائی حاصل نہیں ہو پاتی۔

❻ انگریزی خوانی کی عادت کے باعث تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اکثر وبیشتر لوگ، مستشرقین کی کتب سے استفادہ شروع کر دیتے ہیں جو علمی تحقیقات کی آڑ میں نظریاتی وفکری زہر سے بھری ہوتی ہیں۔ اس کے بعد دین وایمان کا اللہ ہی حافظ ہوتا ہے۔

❼ بعض حضرات علم اسماء الرجال سے ناواقفیت کی بناء پر کذاب راویوں کی روایات کو بھی وحی کا درجہ دینے لگتے ہیں۔

⑧ بعض لوگ فنِ روایت سے جہالت کے باعث کسی روایت میں باعثِ تشویش مواد دیکھ کر راوی کے بارے میں متشددانہ آراء قائم کر لیتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو سیرت اور تاریخ کے بنیادی ماخذ ہی کو منافقین اور مجوسیوں کے افسانے قرار دے دیتے ہیں اور بعض اس قسم کا مواد ذخیرۂ حدیث میں پا کر انکارِ حدیث تک جا پہنچتے ہیں۔

اسلامی مؤرخ کے اوصاف شیخ علی طنطاوی رحمہ اللہ کی نگاہ میں:

تاریخ کے انہی مہالک سے خبردار کرتے ہوئے نامور مصری عالم شیخ علی طنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مؤرخین کی روایت عامیانہ قسم کی ہوتی ہے، علمی کسوٹی پر پوری اترنے والی روایت محدثین حضرات کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کا پہلا ماخذ وہ ہے جو محدثین نے روایت کیا ہے۔ جو شخص محدثین کی اصطلاحات اور علم سے ناواقف ہو، اسے مؤرخ شمار نہیں کیا جا سکتا۔''

نیز وہ لکھتے ہیں:

''ہر وہ تجزیہ نگار جو کسی بحث کے آخر میں طبری کے صفحات کا حوالہ دینا کافی سمجھتا ہے وہ اس بات کا اظہار کر رہا ہے کہ وہ اندھیری رات میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کا عادی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ کیا لیا جائے اور کونسی چیز ترک کی جائے۔ اسلامی مؤرخ یا تاریخ اسلام کا استاذ وہی شخص بن سکتا ہے جو فنِ رجال سے واقف ہو، ان کے احوال سے باخبر ہو، علم حدیث اور اس کے اصول جانتا ہو، عربی کا ماہر ہو، کلام عرب کے ظاہری معنیٰ اور باطنی مفہوم کا فرق کر سکتا ہو، اس کے اشارے اور کنایے سمجھ سکتا ہو، تعصب اور خودغرضی سے پاک ہو، سچائی اور اللہ کی رضا کا طلب گار ہو۔

اگر وہ ان صفات سے عاری ہے تو پھر وہ تاریخ سے جاہل بلکہ دھوکہ باز شمار ہوگا چاہے وہ کسی یونیورسٹی میں استاذِ تاریخ ہو یا بڑی بڑی ڈگریوں کا حامل ہو۔ اس لیے کہ سرکاری ادارے تو کسی بھی شخص کو ڈگری دیکھ کر استاذ مقرر کر دیتے ہیں اور ایسی ڈگریاں جعل سازی سے بھی حاصل کر لی جاتی ہیں۔ مگر کوئی حکومت یہ نہیں کر سکتی کہ جاہل کو عالم بنا دے، متعصب کو پاک باز کر دے یا دروغ گو کو سچا انسان بنا دے۔''①

☆☆☆

تاریخ کی اقسام

تاریخ کی بنیادی طور پر دو اقسام ہیں: تاریخ عام اور تاریخ خاص۔ تاریخ عام میں ساری دنیا کی تاریخ سے بحث کی جاتی ہے، جیسا کہ تاریخ یعقوبی کو ہم تاریخ عام میں شمار کر سکتے ہیں۔ تاریخِ خاص کسی خاص قوم، بادشاہت یا ملک کی تاریخ ہوتی ہے۔ جیسے: تاریخِ اسلام، تاریخِ یورپ، تاریخِ ہند، تاریخِ چین، تاریخِ ترکی وغیرہ۔

① قصص من التاریخ للطنطاوی، مقدمة، ص ۱۳، ۱۴، ط دار المنارة السعودیه

تاریخ اسلام یا تاریخ مسلمین:

تاریخِ خاص میں ہمارا موضوع ''تاریخِ اسلام'' ہے۔ ''تاریخ اسلام'' حقیقت میں ''تاریخِ مسلمین'' ہے؛ کیوں کہ یہ خالص مذہب کی تاریخ نہیں جیسا کہ ''تاریخِ اسلام'' کے ظاہری لفظ سے محسوس ہوتا ہے۔

مذہب کی تاریخ وہ ہوتی ہے جس میں کسی مذہب کے آغاز، اس کے فروغ، اس کے بانی کے حالاتِ زندگی اور اس کے ان اہم پیروکاروں کا ذکر ہو جنہوں نے مذہب کو پھیلانے میں حصہ لیا۔ اس کے علاوہ کسی مذہب سے لوگوں کے برگشتہ ہونے، اس کے مقبول یا غیر مقبول ہونے اور اس کی فرقہ بندیوں کا بھی زمانے کی ترتیب کے ساتھ جائزہ لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ علامہ شہرستانی کی ''الملل والنحل'' مختلف مذہبی فرقوں کی تاریخ ہے۔ دورِ حاضر میں حضرت مفتی تقی عثمانی مدظلہٗ کی تصنیف ''عیسائیت کیا ہے؟'' عیسائی مذہب کی مختصر تاریخ ہے۔

''مذہب کی تاریخ'' کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد غور کریں تو سیرۃ النبی اور سیرِ صحابہ کو بلاشبہ مذہب کی تاریخ قرار دیا جا سکتا ہے مگر بعد کے دور میں مسلمانوں کے حالات کو مذہب کی تاریخ پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

مانا کہ بعد کے ادوار میں بھی بہت سے کام مذہب کی حیثیت سے ہوتے رہے ہیں جیسے اسلام کی ترقی کی کوششیں، غیر مسلموں کو تبلیغ، مدارس، مساجد اور خانقاہوں کا قیام، علمی کوششیں۔ مگر سلطنت وسیاست کے باقی امور صرف دینوی حیثیت رکھتے تھے اور ہمیں بھی تاریخ میں ان کو اسی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ پس ہم مسلمانوں کی باہمی جنگوں، سیاسی انقلابوں، خاندانی مناقشوں اور فاسق وجابر بادشاہوں کے حالات کو ہم مذہب کی تاریخ میں شامل نہیں کر سکتے۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ یہ اسلام کے ماننے والوں کی تاریخ ہے جس میں عروج بھی ہے اور زوال بھی۔ مذہب سے وابستگی بھی ہے اور کہیں مذہب سے دوری بھی۔

چودہ صدیوں میں جو بھی غیر معمولی اچھے برے حالات پیش آئے ہیں اور خیر یا شر کے جو بھی کام مسلمانوں نے انجام دیے ہیں، جب اسلامی تاریخ کی کسی کتاب میں ان سب کا ذکر آتا ہے تو وہ تاریخِ مسلمین کی حیثیت سے آتا ہے۔ اس لیے تاریخ اسلام کی عام کتب مثلاً: ''تاریخ طبری''، ''البدایہ والنہایہ'' اور ''الکامل فی التاریخ'' وغیرہ کو قوم کی تاریخ کی حیثیت سے پڑھنا چاہیے نہ کہ مذہب کی تاریخ کی حیثیت سے۔

☆☆☆

تاریخ کی دیگر اقسام:

تاریخ کی ضمنی اقسام بہت سی ہیں، مثلاً: تاریخ صحابہ، تاریخ خلفاء، تاریخ الملوک، تاریخ الدول، تاریخ مُدن۔

فرقوں کے لحاظ سے بھی تقسیم ہے: تاریخ السنۃ، تاریخ الشیعۃ، تاریخ خوارج، تاریخ قرامطہ، تاریخ معتزلہ۔

طبقات کے لحاظ سے بھی کئی قسمیں ہیں: طبقات احناف، طبقات شوافع، طبقات مالکیہ، طبقات حنابلہ۔

مناصب اور مشاغل کے لحاظ سے بھی کئی شاخیں ہیں: تاریخ وزراء، تاریخ فقہاء، تاریخ قضاۃ، تاریخ نحاۃ، تاریخ

اولیاء، تاریخ شعراء، تاریخ ادباء۔

تاریخ کے چند جدید موضوعات یہ ہیں: احوال العالم الاسلامی، تحریکاتِ اسلامیہ، اسلامی جامعات، اسلامی میڈیا، تاریخ استشراق، تاریخ الغزو الفکری۔

☆☆☆

تاریخ نگاری کے مآخذ

تاریخی مواد ہمیشہ چار قسم کے مآخذ سے حاصل کیا جاتا ہے:

① مؤرخ کا اپنا ذاتی مشاہدہ ② آثارِ منقولہ یعنی سینہ بسینہ روایات

③ آثارِ مضبوطہ یعنی تحریری مواد ④ آثارِ قدیمہ

❶ مؤرخ کا اپنا ذاتی مشاہدہ:

مؤرخ اپنی زندگی یا اپنے دور کے چشم دید حالات قلم بند کرتا ہے تو وہ ذاتی مشاہدہ کہلاتا ہے جیسے مغل سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر کی ''تزکِ بابری'' اور والیٔ افغانستان امیر عبدالرحمٰن کی ''تاج التواریخ'' ان کے اپنے مشاہدات پر مبنی ہیں۔ مؤرخ کے اس بیان کو جو ذاتی مشاہدے پر مبنی ہو، بہت معتبر تسلیم کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ دیگر ہم عصر مؤرخین کے متفقہ بیانات اور دوسرے واضح قرائن وشواہد سے نہ ٹکراتا ہو۔

❷ آثارِ منقولہ (سینہ بسینہ روایات):

تاریخی مآخذ کی دوسری قسم آثارِ منقولہ کہلاتی ہے۔ اس سے مراد وہ مواد ہے جو مؤرخ اپنے ہم عصر لوگوں سے سنتا ہے۔ ان میں امرائے دربار، حکام، سفیر، علماء، افسرانِ فوج، سپاہی، تاجر، سیاح، بڑے بوڑھے اور وہ عام لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جو حالات حاضرہ یا ماضی قریب سے براہِ راست واقف ہوتے ہیں اور ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

❸ آثارِ مضبوطہ یعنی تحریری مواد:

ظاہر ہے مؤرخ ہر شے کا مشاہدہ خود نہیں کر سکتا، نہ ہی ہر بات کسی راوی سے سن سکتا ہے۔ اسے تفاصیل جاننے کے لیے دوسرے ذرائع پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے، خاص کر اپنے سے پہلے زمانے کی تاریخ تو وہ دوسرے ذرائع ہی سے لیتا ہے۔ یہ ذرائع تحریری شکل میں ہوں تو انہیں آثارِ مضبوطہ کہا جاتا ہے۔ ان میں خطوط، فرامین، رسیدیں، مراسلے، معاہدے، سرکاری ریکارڈ اور ہر قسم کا تحریری مواد شامل ہوتا ہے۔ مؤرخین کے لیے گزشتہ زمانے کی کتب سے استفادہ ناگزیر ہے؛ کیوں کہ اکثر طویل زمانی فاصلوں کے باعث گزشتہ ادوار کے حالات سے آگاہی کا کوئی اور ذریعہ نہیں رہتا۔ ایسے میں گزشتہ دور کی تاریخی کتب ہی سے استفادہ کیا جاتا ہے، جیسا کہ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے مؤرخین: علامہ ابن جوزی، علامہ ابن اثیر اور حافظ ذہبی رحمہم اللہ نے چوتھی صدی ہجری تک

کے حالات کی زیادہ تر روایات ''تاریخ طبری'' سے لی ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''البدایہ والنہایہ'' میں ساتویں صدی کے فتنۂ تاتار کی تفاصیل کا خاصا حصہ علامہ ابنِ اثیر رحمہ اللہ کی ''الکامل فی التاریخ'' سے لیا ہے۔

ایک اچھا مؤرخ ہر قسم کے تحریری مواد کو اہمیت دیتا ہے، صرف کتب خانے میں دستیاب کتب سے مواد نقل کرنے پر اکتفا نہیں کرتا۔ نیز وہ ہر اس تحریر یا کتاب کا حوالہ ضرور دیتا ہے جس سے مواد لیا گیا ہے۔

❹ آثارِ قدیمہ:

تاریخی مآخذ کا چوتھا ذریعہ آثارِ قدیمہ ہیں جن میں قدیم محلات، پرانے قلعے، کھنڈرات، کتبے، کھدائی سے برآمد ہونے والے تہذیبی وتمدنی آثار شامل کیے جاسکتے ہیں۔ آثار قدیمہ سے کسی واقعے کے قرائن اخذ کیے جاسکتے ہیں یا کئی احتمالات میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کا کام لیا جاسکتا ہے مگر ان سے کوئی مربوط واقعہ تشکیل دینا ناممکن ہوتا ہے۔

☆☆☆

تاریخ نویسی کے انداز

تاریخ نویسی تین انداز کی ہوتی ہے:

❶ تاریخ بالروایۃ:

اس میں روایات کو من وعن نقل کردیا جاتا ہے۔ مؤرخ اپنی طرف سے کوئی تشریح یا تبصرہ نہیں کرتا۔

تاریخ بالراویۃ اس لحاظ سے مفید ہوتی ہے کہ اس میں مؤرخ کی جانب سے کسی کمی بیشی یا خیانت کا امکان کم ہوتا ہے، مؤرخ کی حیثیت صرف ناقل کی ہوتی ہے۔ واقعے سے نتیجہ نکالنا قارئین کا کام ہوتا ہے۔ اس طرح ماضی کی علمی تُراث من وعن بعد والوں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ قدیم کتب تاریخ مثلاً ''طبقات ابن سعد''، ''تاریخ طبری''، ''انساب الاشراف'' اور ''فتوح البلدان'' وغیرہ اسی انداز کی ہیں۔ ان میں صرف روایات کو سند کے ساتھ نقل کردیا گیا ہے۔ سند اور واقعے کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

تاریخ بالروایۃ کا کمزور پہلو یہ ہوتا ہے کہ اس میں بسا اوقات خلافِ عقل اور بعید از قیاس باتیں بھی شامل ہوجاتی ہیں۔ اگر قارئین فہم سلیم کے مالک نہ ہوں، اصولِ روایت ودرایت پر ان کی نظر نہ ہو اور وہ صحیح وسقیم کی تمیز نہ کرسکتے ہوں تو ان کے گمراہ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ تاریخ طبری، انساب الاشراف اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں درجنوں ضعیف روایات ایسی ہیں جنہیں دیگر روایات سے موازنہ کیے بغیر دیکھا جائے تو شدید غلط فہمیاں جنم لے سکتی ہیں۔ اسی لیے علمائے کرام عام لوگوں کو ایسی بڑی تاریخی کتابیں پڑھنے سے منع کرتے ہیں؛ کیوں کہ وہ اہلِ فن کے لیے ہیں نہ کہ عوام کے لیے۔ جس طرح عام آدمی صحیح بخاری یا صحیح مسلم کا ترجمہ پڑھ کر خود ہر حدیث سے حسبِ مرضی نتائج نکالنے لگے تو اسے جگہ جگہ ٹھوکر لگنے کا خطرہ ہے، اسی طرح تاریخ طبری اور طبقات ابن سعد جیسی کتب کا ترجمہ

پڑھ کر بھی عام انسان سخت لغزشوں کا شکار ہوسکتا ہے۔

❷ تاریخ بالدرایۃ:

اس میں مؤرخ چند روایات یا قرائن کو لے کر کسی واقعے کی کڑیاں ملاتا چلا جاتا ہے۔ آثار قدیمہ اور دوسرے شواہد اور کچھ قیاسات سے ایک تاریخ مرتب کر دیتا ہے۔

تاریخ بالدرایۃ کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس میں بعید از قیاس باتوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ منفی پہلو یہ ہے کہ بعض اوقات اس طرح مرتب کی گئی تاریخ کی کوئی پختہ بنیاد نہیں ہوتی۔ سارا کمال مؤرخ کے اپنے اندازے اور تخمینے کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے اندازے سے جس روایت کو چاہے لیتا ہے اور جسے چاہے چھوڑ دیتا ہے۔ یورپی مؤرخین نے آثار قدیمہ کی کھدائی کر کے مصر، بابل، ہڑپہ، ٹیکسلا، موئن جوڈرو اور زمانہ قبل از تہذیب کی جو تاریخیں مرتب کی ہیں جن میں انسان کو لاکھوں سال قبل کی مخلوق قرار دیا گیا ہے، وہ تاریخ بالدرایہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی کوئی پختہ بنیاد ہرگز نہیں۔ چونکہ انسان تعصب اور جانب داری سے بہت کم خالی ہوتا ہے، اس لیے ''درایت'' کا استعمال انصاف کے ساتھ بہت کم ہوتا ہے۔ عموماً درایت کے نام پر اپنے ذوق، رجحان اور جذبات کے مطابق پہلوؤں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ قیاس اور درایت کو روایت پر علی الاطلاق ترجیح نہ دی جائے۔ درایت کو شرائط اور ضوابط کا پابند بنایا جائے۔ مثلاً یہ کہ متواتر یا صحیح روایات کو درایت کی بناء پر ترک نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح ضعیف روایات کو بھی درایت کی بناء پر فقط اس صورت میں مسترد کیا جائے گا جب ان میں کسی ناممکن یا بہت ہی غیر معقول بات کا ذکر ہو۔ کسی شے کا عجیب، بُرا، خلافِ عادت یا خلافِ معمول ہونا کسی روایت کو مسترد کرنے کی وجہ نہیں بن سکتا؛ کیوں کہ تاریخ میں عموماً خلافِ معمول واقعات ہی لکھے جاتے ہیں۔

اگر روایات کو درایت کی بناء پر مسترد کرنے کی علی الاطلاق آزادی دے دی جائے تو تاریخ کا اچھا خاصا حصہ چھوڑ کر قیاس پر اکتفا کرنا پڑے گا جو ہر شخص کا مختلف ہوسکتا ہے۔ ایسی قیاسی تاریخ میں اس قدر اختلافات پیدا ہو جائیں گے کہ کسی بھی واقعے کو کسی ایک شکل میں ثابت کرنا، مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جائے گا۔

❸ تاریخ بالروایۃ والدرایۃ:

تاریخ بالروایہ والدرایہ یہ ہے کہ روایات اور عقلی امکانات دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلیں۔ اصل مدار تاریخی روایات پر رکھا جائے مگر گری پڑی باتوں کو جمع نہ کیا جائے۔ جہاں کوئی مشکوک روایت نقل کرنی ہو وہاں قارئین کو متنبہ کر دیا جائے۔ ہر روایت کو عقل کے ترازو میں تولا جائے۔ واقعات کی حقیقت سے قریب تر اور غیر جانبدارانہ تشریح کی جائے۔ یہ تاریخ نویسی کا بہترین انداز ہے۔ حافظ ابن کثیر کی ''البدایہ والنہایہ'' حافظ ذہبی کی ''تاریخ الاسلام'' اور علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون کی ''تاریخ ابن خلدون'' بڑی حد تک اسی طرز پر لکھی گئی ہیں۔

تاریخ نویسی کے چند اہم اُصول

تاریخ نگاری ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے اس لیے علمائے تاریخ نے مؤرخ کی صفات اور شرائط کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے تا کہ مؤرخ اپنے فرض سے انصاف کر سکے۔

مؤرخ کی صفات:

علمائے تاریخ کا کہنا ہے کہ مؤرخ کو آداب تحریر وتقریر سے واقف ہونا چاہیے۔ زبان وبیان کے اسالیب پر عبور ہونا چاہیے۔ تعصب، جھوٹ، فریب، مبالغہ آمیزی سے پاک ہونا چاہیے۔ شعر سے اس قدر مناسبت ہونا ضروری ہے کہ اشعار کے اصل مفہوم تک پہنچ سکے؛ کیوں کہ بہت سے تاریخی واقعات منظوم شکل میں ملتے ہیں۔ مؤرخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ بولنے اور لکھنے میں صاف ستھری اور شائستہ گفتگو کا عادی ہو، بے ہودہ گوئی سے احتراز کرنے والا ہو۔ محنتی اور جفاکش ہو۔ روایات کی تحقیق وتفتیش کے لیے جانفشانی کرنے کی ہمت رکھتا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ مؤرخ کو جغرافیہ، تمدن، عمرانیات، سیاسیات، عسکری امور اور فوجی اصطلاحات سے واقف ہونا چاہیے۔

مؤرخ کو مختلف زبانوں کا ماہر ہونا چاہیے۔ خصوصاً اُس قوم کی زبان جاننا لازمی ہے جس کی وہ تاریخ مرتب کرنا چاہتا ہو۔ مثلاً مسلمانوں کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے عربی دان ہونا ضروری ہے، مغل سلطنتِ ہند کی تاریخ لکھنے کے لیے فارسی جاننا ضروری ہے، ورنہ اصل مآخذ کو پڑھنا ممکن نہیں ہوگا۔

تاریخی روایات نقل کرنے کی شرائط:

(۱) مؤرخ راوی کے اصل الفاظ نقل کر رہا ہو، اپنے الفاظ میں مفہوم بیان نہ کر رہا ہو۔

(۲) مؤرخ راوی کا نام وضاحت کے ساتھ بیان کر رہا ہو۔ (اگر کوئی کتاب ہے تو اس کا واضح حوالہ ہو۔)

(۲) واقعے کو جن الفاظ میں نقل کیا جا رہا ہو، وقائع نگار پر ان کا مفہوم اچھی طرح واضح ہو۔

(۳) واقعے کی تعبیر میں اعتدال اور غیر جانبدارانہ انداز اپنایا گیا ہو۔

(۵) اگر تاریخی واقعات میں سے کوئی شے قرآن وسنت سے متصادم ہو تو قرآن وسنت پر یقین کیا جائے گا اور اس روایت کو چھوڑ دیا جائے گا؛ کیوں کہ جو تحقیق اور عرق ریزی قرآن وحدیث میں ہو چکی ہے، وہ تاریخ میں نہیں ہو سکتی۔

(۵) جہاں اسلاف کے معتبر افراد پر کوئی طعن وتشنیع، الزام تراشی یا طنز جھلکتا ہو اسے قبول کرنے میں رک جائیں اور وہاں غور وفکر اور تحقیق کے ساتھ فیصلہ کریں؛ کیوں کہ ایسے لوگ جن کا نیک اور معتبر ہونا ثابت ہو چکا ہو، انہیں کسی ایک شخص کی الزام تراشی کی وجہ سے مطعون نہیں سمجھا جا سکتا۔[1]

---

[1] قاعدة في المؤرخين للعلامة تاج الدين السبكي، ص ۳۰، ط دار البشائر بيروت

سوانح نگاری کے لیے شرائط:

(۱) جس کا ذکر کیا جا رہا ہے، اس کی علمی، دینی، نظریاتی حالت اور دیگر صفات سے واقفیت ہو۔

(۲) اس کے بارے میں تعریفی یا مذمتی الفاظ اور القاب و آداب کے استعمال میں اعتدال سے کام لیا جائے۔

(۴) سوانح نگار کا معتدل مزاج ہونا ضروری ہے، یعنی وہ کسی کی محبت کی وجہ سے اس کی تعریف یا کسی سے نفرت کے باعث اس کی مذمت کرنے میں جذبات سے مغلوب ہونے والا نہ ہو۔ مؤرخ کی نہ تو اس سے ایسی دوستی ہو جس کے سبب وہ اس کے لیے جانب داری سے کام لے، نہ ایسی مخالفت ہو جس کے باعث وہ اس کی قدر گھٹا دے۔

(۵) سوانح نگار کا حافظہ اچھا ہونا ضروری ہے۔ [1]

روایتِ تاریخ اور روایتِ حدیث میں فرق:

روایتِ حدیث اور روایتِ تاریخ میں کچھ شرائط تو مشترک ہیں۔ یعنی راوی کا عاقل ہونا، حافظہ صحیح ہونا، دیانت دار ہونا۔ مگر بعض چیزوں میں روایتِ تاریخ، روایتِ حدیث سے الگ ہے۔

مثلاً روایتِ حدیث میں سند کی تحقیق کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ مگر روایتِ تاریخ میں چند خاص مواقع پر ہی سند کی تحقیق ضروری ہے۔ ان کے علاوہ نہیں۔ جن مواقع پر سند کی تحقیق لازمی ہے وہ درج ذیل ہیں:

❶ ایسی روایات میں جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے کردار اور ان کی صفات سے متعلق ہوں۔

❷ ایسی روایات میں جن سے اسلامی شخصیات، سلف صالحین اور مشاہیر اسلام پر اعتراض کا پہلو نکل سکتا ہو۔

❸ ایسی روایات میں جن کی وجہ سے عقیدے اور حلال و حرام کے مسائل پر زد پڑ سکتی ہو۔

مندرجہ بالا تین مواقع کے سوا تاریخی روایات جمع کرنے میں وسعت سے کام لیا جا سکتا ہے اور ضعیف روایات بھی قبول کی جا سکتی ہیں تا کہ واقعات کی زیادہ سے زیادہ جزئیات محفوظ رہ سکیں۔ مؤرخ لوگوں کو خیر کی طرف راغب کرنے اور شر سے خبردار کرنے کے لیے بھی کمزور روایات نقل کر سکتا ہے، ہاں اسے چاہیے کہ ایسی روایات کے ضعف کی وضاحت کر دے۔ [2] اسی لیے محققین علماء واقدی اور محمد ابن اسحٰق جیسے تاریخی راویوں کی روایتوں کو شرعی اُمور کی بحث میں قبول نہیں کرتے البتہ سیر و مغازی کی جزئیات میں ان کی روایات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ [3]

تاریخی جزئیات (معلوماتِ عامہ) میں غیر مسلموں سے بھی روایت لی جا سکتی ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

''تم بنی اسرائیل سے روایت نقل کر لیا کرو۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔'' [4]

---

① الاعلان بالتوبیخ، ص ۱۳۰ ؛ قاعدة فی المؤرخین للعلامة تاج الدین السبکی، ص ٦ ، ۷ ، ط دار البشائر بیروت

② المختصر فی علم التاریخ ، علامہ کافیجی، ص ۷۱ ؛ دراسات تاریخیة لدکتور اکرم ضیاء العمری، ص ۲۷

③ اسی لیے امام بخاری جیسے محتاط ترین محدث نے صحیح البخاری میں محمد بن اسحاق سے ۲۴ مقامات پر تعلیقاً روایت لی ہے اور ان کے تاریخی اقوال سے استشہاد کیا ہے۔

④ عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ان النبی ﷺ قال: حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج. (صحیح البخاری، ح: ۳۴٦۱، کتاب احادیث الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل)

تاریخ کی اہم کتب اور نامور مؤرخین

رسائلِ واقدی:

محمد بن عمر الواقدی تاریخ کے بڑے حافظوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی درج ذیل کتب مشہور ہیں: ''**المغازی، السیرۃ، ازواج النبی، الردۃ، اخبار مکۃ، الطبقات، فتوح العراق، فتوح الشام، مقتل الحسین، الجمل، صفین**۔''

واقدی کی ولادت ۱۳۰ھ میں مدینہ میں ہوئی۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ کے شاگرد تھے، ایک عرصہ حدیث اور تاریخی روایات جمع کرنے میں گزارا۔ ۱۷۰ھ میں بغداد چلے گئے۔ تاریخ سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ روایات سے متعلقہ تاریخی مقامات کا جائزہ لینے کے لیے وہاں جایا کرتے تھے۔ ہارون الرشید کو کسی ایسے عالم کی تلاش تھی جو سیرت اور زمانہ نبوی کے آثار سے اچھی طرح واقف ہو۔ وزیر خالد بن یحییٰ برمکی نے واقدی سے ملوا دیا۔ اس طرح واقدی کو عباسی دربار میں آنے کا موقع ملا۔ مامون کے دور میں واقدی کا رتبہ مزید بڑھ گیا اور قاضی بغداد کا عہدہ ملا۔ ۲۰۷ھ میں وفات پائی۔

واقدی کی کتب اچھی بری روایات سے پُر ہیں۔ ''المغازی'' واقعاتِ سیرت بالخصوص جہادی مہمات کا ایسا مرقع ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ مگر دوسری طرف مقتل الحسین، جمل اور کتاب الصفین میں ناقابلِ اعتماد راویوں سے بکثرت مواد لیا گیا ہے۔ اسی لیے واقدی کو ضعیف راوی مانا جاتا ہے بلکہ ابن ندیم نے (جو خود شیعہ تھے) انہیں شیعہ قرار دیا ہے۔ اگرچہ ابن ندیم کا یہ بیان درست نہیں اور محققین نے اس کی تردید کی ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ واقدی کی متعدد روایات صحابہ کے کردار کی نامناسب تصویر پیش کرتی ہیں۔ اسی لیے محدثین عموماً واقدی سے حدیث نقل کرنے میں احتیاط کرتے تھے، البتہ وہ واقدی کی ان تاریخی روایات پر اعتماد کرتے تھے جو صحابہ پر طعن سے خالی ہوں۔ علامہ خیر الدین زِرِکلی کی رائے کے مطابق اکثر رسائل غلط طور پر واقدی کی طرف منسوب کر دیے گئے ہیں۔ البتہ وہ روایات بلاشبہ واقدی کی ہیں جو ان کے تلمیذِ خاص محمد بن سعد نے طبقات ابن سعد میں نقل کی ہیں۔[1]

المعارف:

اس کے مؤلف ابن قتیبہ الدِینَوَری ہیں۔ ۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۰ھ میں وفات پائی۔ بعض حضرات نے انہیں کرامیہ فرقے کا کہا ہے مگر خطیب بغدادی کے بقول وہ فاضل اور ثقہ تھے۔ المعارف میں انہوں نے آدم علیہ السلام کی پیدائش سے اپنے دور تک کی تاریخ بیان کی ہے۔ عالمی تاریخ اور تاریخِ عرب کو اختصار کے ساتھ یکجا کیا ہے۔

الامامۃ والسیاسۃ:

اس کی نسبت بھی ابن قتیبہ کی طرف کی جاتی ہے۔ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے سلسلۂ واقعات کو شروع کیا گیا ہے اور ہر دور کے خلیفہ سے متعلق روایات کو اختصاراً جمع کیا گیا ہے۔ المعارف کی طرح اس میں بھی

[1] الاعلام للزرکلی: ۶/۳۱۱

ضعیف روایات کی کثرت ہے۔ ابن قتیبہ کی ایک اوراد بی وتاریخی تصنیف ''عیون الاخبار'' بھی مشہور ہے۔

تاریخ خلیفہ بن خیاط:

یہ امام خلیفہ بن خیاط'' (م ۲۴۰ھ) کی تالیف ہے، اس میں حضور اکرم ﷺ کی ولادت سے خلیفہ متوکل عباسی کے دور تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ سالوں کی ترتیب کا پورا لحاظ اور اسلوب میں اختصار اس کتاب کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اکثر روایات ثقہ راویوں سے لی گئی ہیں۔ اسے مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ تاریخ سمجھا جاسکتا ہے۔

الطبقات الکبریٰ:

یہ محمد بن سعدؒ (م ۲۳۰ھ) کی تالیف ہے، وہ بَصرہ میں پیدا ہوئے اور بغداد میں واقدی کے کاتب رہے۔ ان کی عظیم الشان تالیف ''طبقات ابن سعد'' کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ وار تاریخ نہیں، بلکہ اس میں قبائل اور طبقات کے حساب سے شخصیات کے احوال جمع کیے گئے ہیں۔ اس میں پہلی اور دوسری صدی ہجری کی تاریخی روایات کا بہت بڑا ذخیرہ اسناد کے ساتھ جمع ہوگیا ہے۔ اس لیے کوئی مؤرخ اس کتاب سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

فتوح البلدان۔ أنساب الاشراف:

یہ دونوں ابوجعفر یحییٰ البلاذُری کی تصانیف ہیں جو دوسری صدی ہجری کے اواخر میں پیدا ہوئے اور ۲۷۹ھ میں فوت ہوئے۔ عربی کے ساتھ ساتھ فارسی پر بھی عبور رکھتے تھے اس لیے عجم کی تواریخ سے بھی استفادہ کیا۔ ''فتوح البلدان'' میں انہوں نے بڑی احتیاط اور اختصار کے ساتھ حضور نبی اکرم ﷺ کے بعد سے اپنے دور تک ایک ایک شہر کی فتح کا حال بیان کیا ہے اور وہاں کے تہذیب وتمدن، جغرافیے اور سیاسی وانتظامی امور کا بھی جائزہ لیا ہے۔

''انساب الاشراف'' طبقات ابنِ سعد کے طرز پر ہے۔ یہ بھی تاریخی روایات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔

الاخبار الطّوال:

یہ ابوحنیفہ الدِ ینَوری کی تالیف ہے جو فارسی نژاد تھے، ۲۸۲ھ میں وفات پائی۔ اپنی تالیف کے پہلے حصے میں انہوں نے آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم ﷺ تک انبیائے کرام کی تاریخ بیان کی ہے۔ دوسرے حصے میں ایران اور روم کی بادشاہتوں کا حال لکھا ہے۔ تیسرے حصے میں مسلمانوں اور ایرانیوں کی جنگوں کا تذکرہ کیا ہے، نیز کربلا، جمل اور صفین کی جنگوں کا حال بھی لکھا ہے جو زیادہ تر شیعی راویوں سے منقول ہے۔ اس کا کچھ حصہ قطعاً ناقابلِ اعتبار ہے۔

تاریخ یعقوبی:

احمد بن ابی یعقوب (م ۲۹۵ھ) کی اس تالیف میں اختصار کے ساتھ ساری دنیا کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ روم، فارس، ترکستان، چین، یونان، ہندوستان، بابل، مصر، عرب، حبشہ اور افریقہ تک کے حالات میں جو بھی روایات ملیں انہیں نقل کردیا۔ احمد بن ابی یعقوب شیعہ مؤرخ تھے۔ ان کی بعض روایات مشکوک اور بعض من گھڑت بھی ہیں۔

☆☆☆

موسوعات التاریخ

تاریخ میں بعض کتب کی حیثیت ''موسوعات'' کی ہے۔یعنی ان کے مؤلفین نے دستیاب تاریخی کتب ورسائل کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کرلیا ہے۔ان میں پانچ کتب سرفہرست ہیں:

❶ تاریخ طبری ❷ الکامل فی التاریخ ❸ تاریخ الاسلام ❹ البدایہ والنہایہ ❺ تاریخ ابن خلدون

ذیل میں ان کتب اوران کے مؤلفین کے تعارف کے ساتھ ان کے تالیفی منہج پر مختصر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

① تاریخ طَبَری

اس کا اصل نام تاریخ الامم والملوک ہے،اسے ''تاریخ الرسل والملوک'' بھی کہا جاتا ہے۔اس کے مؤلف ابوجعفر محمد بن جَرِیر بن یزید الطبری رحمہ اللہ ہیں،یہ علمائے اہل سنت میں سے ہیں۔انہی کے ہم نام ایک شیعہ مؤرخ،ابوجعفر محمد بن جَرِیر بن رُستم الطبری ہیں۔نام کی مشابہت کی وجہ سے کئی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔سنی طبری کو شیعہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ پہچان کے لیے آپ یہ یاد رکھیے کہ جو طبری، یزید نامی عربی شخص کے پوتے ہیں وہ سنی ہیں،اور وہ طبری جو ایک فارسی شخص رُستم کی اولاد ہیں،وہ اہل تشیع سے ہیں۔

محمد بن جَرِیر بن یزید الطبری رحمہ اللہ ۲۲۵ھ میں طبرستان میں پیدا ہوئے۔مصر،شام اور دوسرے شہروں کے مشائخ سے حدیث،قرأت اورفقہ کی تعلیم حاصل کی۔آخر میں بغداد آ گئے،یہاں درسِ حدیث،فتویٰ نویسی اور تصنیف کا مشغلہ اختیار کیا۔بعد میں ہمہ تن تصنیف وتالیف میں مصروف ہوگئے اور بہت سی نہایت مفید تصانیف پیش کیں۔اس کام میں اس قدر انہماک تھا کہ عمر بھر شادی نہ کی۔۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

ابن جَرِیر طبریؒ نہایت متقی،عابد زاہد بزرگ تھے۔عمر بھر سرکاری عہدوں اور حکام سے دور رہ کر ایک گوشے میں علمی کام کرتے رہے۔اصحابِ جرح وتعدیل کے بقول وہ علامۂ وقت اور فقیہِ زمانہ تھے۔تفسیر،حدیث،علم رجال،فقہ اور تاریخ میں بے مثل مہارت رکھتے تھے۔تفسیر میں ان کی مہارت کی دلیل تفسیرِ طبری ہے،فقہ،حدیث اورعلم رجال میں ان کا شاہکار''تہذیب الآثار'' ہے جبکہ تاریخ پر عبور کا ثبوت ''تاریخ الامم والملوک'' سے ملتا ہے۔①

امام طبریؒ نے اس تاریخ کو انبیائے کرام علیہم السلام سے شروع کر کے ۳۰۲ھ کے احوال پر ختم کیا ہے۔اس میں دورِ رسالت، دورِ خلافتِ راشدہ اور خلافتِ بنواُمیَّہ کے علاوہ عہدِ بنوعباس کے ابتدائی آٹھ عشروں کی تفصیلات موجود ہیں۔چونکہ یہ تاریخ بعد میں آنے والی اکثر وبیشتر اسلامی تواریخ میں دوسری ہجری تک کے حالات کا بنیادی ماخذ ہے اس لیے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ طبری کے مصادر کیا ہیں۔

① سیر اعلام النبلاء: ۲۶۷/۱۴، ط الرسالۃ ..... نوٹ: ابن جَرِیر طبری کے مفصل حالات ''تاریخ امت مسلمہ'' حصہ سوئم میں آئیں گے۔

یہ کتاب آٹھ حصوں پر مشتمل ہے جن کے مصادر یہ ہیں:

❶ **انبیائے کرام کی سیرت:** اس کے لیے کتب تفسیر و حدیث اور اسرائیلی روایات سے مواد لیا گیا ہے۔

❷ **ایران و فارس کی تاریخ:** اس کے مصادر اہل فارس کی کتب، ابن مُقَفَّع اور ہشام کلبی کی روایات ہیں۔

❸ **اہل روم کی تاریخ:** اہل یورپ کی تالیفات کے عربی تراجم سے لی گئی ہے۔

❹ **تاریخ عرب ما قبل از اسلام:** عبید بن شَرِیَّہ، وہب بن مُنَبِّہ، محمد بن کعب قرظی اور ہشام کلبی کی روایات ہیں۔

❺ **سیرت النبی:** اَبان بن عثمان، عروہ بن زبیر، ابن شہاب، عاصم بن عمر، موسیٰ بن عُقبہ اور ابن اسحٰق کی روایات ہیں۔

❻ **مرتدین سے جنگیں اور دورِ خلافت راشدہ کی فتوحات:** زیادہ تر سیف بن عمر اور المدائنی کی روایات ہیں۔

❼ **جنگ جمل و صفین:** ابو مخنف، سیف بن عمر اور المدائنی کی روایات جمع کر دی گئی ہیں۔

❽ **اُمویوں کی تاریخ:** عُوانہ بن حکم، المدائنی، واقدی اور ہشام کلبی کی روایات ہیں۔

❾ **عباسیوں کی تاریخ:** احمد بن ابی خیثمہ، احمد بن زُہَیر، مدائنی اور ہَیثم بن زہیر کی روایات ہیں۔

تاریخ طبری کی چند خصوصیات:

❶ مشہور اور معتمد تواریخ میں سے اس کا زمانۂ تالیف دورِ نبوت اور دورِ صحابہ کرام سے قریب تر ہے۔

❷ اس میں ہر روایت کی سند بیان کر دی گئی ہے تاکہ قارئین اس کی حیثیت کا اندازہ کر لیں۔

❸ مؤرخ خود بہت بڑے فقیہ، محدث اور مفسر ہیں، اس لیے کسی اور مؤرخ کی بہ نسبت ان پر زیادہ اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

❹ طبری نے مصادر سے روایات کو من و عن لیا ہے، کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس لیے طبری کا مطالعہ کرنے والا گویا سابقہ زمانے کی تواریخ کا لفظ بلفظ مطالعہ کرتا ہے۔

کمزوریاں:

طبری نے روایات کو کسی قسم کے تبصرے کے بغیر پیش کیا ہے، رواۃ پر کوئی بحث کی ہے نہ کسی روایت کی وضاحت۔ اس لیے بعض اوقات یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ طبری ہر قسم کی روایات سے متفق ہیں۔ پھر چونکہ ابن جَرِیر طبری رحمہ اللہ شیعہ مؤرخ ابن جَرِیر طبری کے ہم نام ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخ میں صحابہ کرام پر طعن سے آلودہ بہت سی روایات بھی شامل ہیں اس لیے ان کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ وہ شیعہ ہیں۔ اسی وجہ سے ان پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ وہ شیعوں کے لیے روایت سازی کرتے تھے مگر یہ الزام درست نہیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس الزام کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ھٰذا رجم بالظن الكاذب بل ابن جرير من كبار أئمة الاسلام المعتمدين."

''یہ ایک قیاسِ محض اور جھوٹا گمان ہے، ابن جَرِیر تو اسلام کے بڑے قابلِ اعتماد ائمہ میں سے تھے۔''[1]

[1] ميزان الاعتدال: ۴۹۹/۳ ط دار المعرفة بيروت

البتہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ اتنا مانتے ہیں کہ ان میں فی الجملہ تشیع تھا جو مضر نہ تھا۔ مراد یہ ہے کہ سیاسی حمایت کے لحاظ سے امام طبری رحمہ اللہ کا جھکاؤ علویوں کی طرف تھا ورنہ ان پر اہل سنت سے ہٹ کر کوئی عقیدہ اختیار کرنا ثابت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام طبری رحمہ اللہ کو ایک جلیل القدر عالم اور ان کی تاریخ کو ہر دور میں اسلامی تاریخ کا بنیادی مأخذ مانا گیا ہے۔

تاریخِ طبری کے متعلق بعض شبہات کا جواب:

رہی یہ بات کہ اس میں ایسی نامناسب روایات موجود ہیں جن سے گمراہ فرقے استدلال کر کے اعتراضات اُٹھاتے ہیں تو اس کا جواب خود امام طبریؒ نے کتاب کے مقدمے میں دے دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''میری اس کتاب میں جو بھی روایت ایسی ہو جسے پڑھنے والا عجیب سمجھے یا سننے والا ناپسند کرے کہ اس کے صحیح ہونے کی کوئی منطق سمجھ میں نہ آرہی ہو تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی روایات ہماری اختراع نہیں، بلکہ وہ ناقلین سے ہمیں اسی طرح پہنچی ہیں۔ ہم نے اسی طرح پیش کر دی ہیں جیسے ہمیں پہنچی تھیں۔''①

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مصنف نے روایات کے صحیح یا غلط ہونے کی ذمہ داری نہیں اٹھائی۔ انہوں نے ہر طرح کی روایات جمع کر کے جانچ پڑتال کا کام قارئین اور بعد کے علماء کے حوالے کر دیا ہے۔ یہ ذمہ داری ان پر ڈال دی ہے کہ وہ اس میں سے صحیح و سقیم کی پہچان کر لیں۔ دوسرے لفظوں میں امام طبری نے ''تاریخ بالروایۃ'' پیش کی ہے۔ اس زمانے کے اکثر مؤرخین و محدثین کا طریقہ یہی تھا کہ وہ روایات نقل کر دیتے تھے، استدلال نہیں کرتے تھے۔

رہی یہ بات کہ کسی روایت کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا فیصلہ بعد والے کیسے کریں گے؟ اس کے لیے طبری نے ہر روایت کی سند بیان کر دی ہے۔ رواۃ کے احوال کو جانچ کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کونسی روایت کس قدر معتبر ہے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ کمزور روایات کی آمیزش سے بہتر تھا کہ طبری یہ کتاب لکھتے ہی نہیں۔ مگر ہمیں اس دور پر بھی نظر ڈالنی چاہیے جب امام طبری نے تاریخ کا یہ مجموعہ مرتب کیا۔ اس وقت درج ذیل وجوہ سے یہ کام اس انداز میں کیا گیا:

❶ یہ زمانہ حدیث اور تاریخ کی تدوین کا تھا یعنی مؤرخین اور محدثین سبھی اپنی کچھ شرائط مقرر کر کے ان کے تحت زیادہ سے زیادہ روایات سننے، جمع کرنے اور لکھنے میں مصروف تھے۔ فقط صحیح روایات جمع کرنے کا اہتمام اکثر محدثین نے بھی نہیں کیا۔ ایسے میں امام طبریؒ نے بھی روایات کو بالکل ضائع ہونے سے بچانے کے لیے یہ مجموعہ مرتب کر دیا۔

❷ اس زمانے میں فن رجال کے ماہرین کی کثرت کی وجہ سے صحیح، ضعیف اور ناقابل قبول کا فیصلہ آسان تھا۔ امام طبریؒ کے سامنے ہمارے زمانے کا علمی انحطاط نہیں تھا جس میں راویوں کی پہچان تو دور کی بات روایات کا علم بھی کسی کسی کو ہے اور اگر کوئی روایات کی طرف توجہ کرتا بھی ہے تو چند صفحات پڑھ کر ہی تاریخ کا علامہ بن جاتا ہے اور پوری بے باکی سے کبھی صحابہ اور اسلاف پر اور کبھی مؤرخین اور سیرت نگاروں پر کیچڑ اچھالنے لگتا ہے۔

① ''فما فی کتابی ھذا من خبر یستنکرہ قاریہ او یستشنعہ سامعہ من اجل انہ لم یعرف لہ وجھا فی الصحۃ للیعلم انہ لم یؤت فی ذالک من قبلنا، انما اتی من قبل ناقلیہ الینا، انا انما أدّینا ذالک علی نحو ما أدّی الینا.''(تاریخ الطبری: ۱/۷،۸)

❸ اس دور میں شیعہ مؤرخین اور گمراہ راویوں کی ایسی تصانیف شائع ہو چکی تھیں جن میں کمزور روایات تو تھیں مگر تصویر کا دوسرا رخ دکھانے والی صحیح روایات مفقود تھیں۔ امام طبری نے دونوں قسم کی روایات جمع کر کے دونوں پہلو سامنے رکھ دیے کہ اہلِ تحقیق صحیح چیز کو لے لیں اور غلط بات کو ترک کر دیں۔ درحقیقت آج ہمارے پاس صحیح اور ضعیف روایات کے تقابل کا کوئی ذریعہ ہے تو وہ یہی تصنیف ہے۔ اگر امام طبری یہ کتاب نہ لکھتے تو ہمیں دورِ صحابہ اور تابعین کے حالات جاننے کے لیے زیادہ تر اہلِ تشیع کی کتب ہی پر انحصار کرنا پڑتا؛ کیوں کہ اہلِ سنت نے اس زمانے تک جو دوسری تواریخ لکھی تھیں وہ وسعت اور تفصیل میں طبری کا چوتھائی بھی نہیں تھیں۔

رہی یہ بات کہ شیعہ راویوں کی روایات لینے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ تو دراصل بعض اوقات کوئی روایت یہ دکھانے کے لیے بھی نقل کر دی جاتی ہے کہ فلاں طبقے کے لوگ کیا کہتے ہیں۔ بعض اوقات صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ مخالف طبقے کے لوگ اس حد تک بیان بازی بھی کر سکتے ہیں۔ بعض اوقات روایت کے رکیک حصے سے ہرگز اتفاق نہیں ہوتا مگر روایت میں کچھ اجزاء مفید ہوتے ہیں، مثلاً بعض ایسی جزئیات ہوتی ہیں جن سے کسی واقعے کی کڑیاں جوڑنے میں مدد ملتی ہے۔ اصل مقصد انہی جزئیات کو سامنے لانا ہوتا ہے مگر نقل میں احتیاط کا ثبوت دینے اور کتربیونت کے الزام سے بچنے کے لیے پوری روایت من وعن نقل کر دی جاتی ہے اور قارئین پر اعتماد کرتے ہوئے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ مطلب کی بات خود اخذ کر لیں گے اور ہفوات پر کان نہیں دھریں گے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں۔ چند سال قبل ممبئی کے تاج ہوٹل پر حملہ ہوا۔ اخبارات میں کئی ہفتوں تک اس کی خبروں اور رپورٹوں کا تانتا بندھا رہا۔ اس دوران پاکستان کے کئی اخبارات میں بھارتی صحافیوں کے مضامین اور کالم بھی شائع ہوئے جن میں صاف صاف یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ یہ آئی ایس آئی کی کارستانی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان میں مختلف تفصیلات بھی سامنے لائی جاتی تھیں کہ حملہ آور کشتی میں کس طرح آئے، ان کے فون سے کون سی باتیں ریکارڈ کی گئیں، حملے کی منصوبہ بندی کس طرح ہوئی، وغیرہ۔ ظاہر ہے ایسے مضامین شائع کرنے کا یہ مطلب نہ تھا کہ پاکستانی اخبارات کے مدیران بھی یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ یہ حملہ آئی ایس آئی نے کروایا ہے۔ بلکہ وہ فقط یہ دکھانے کے لیے کہ بھارتی میڈیا تصویر کے دوسرے رُخ کے عنوان سے کیا بتا رہا ہے، ایسے مضامین کو شائع کر رہے تھے۔

کبھی ایسی مشکوک یا جھوٹی چیزیں سامنے لانے کا مثبت پہلو یہ ہوتا ہے کہ جھوٹ کے اس پلندے میں دو چار سچی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ قارئین کو ان سے بعض ایسی اصل جزئیات بھی معلوم ہو جاتی ہیں جو پہلے پوشیدہ تھیں۔ بسا اوقات ایسی جزئیات کو خود مخالف فریق کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض ذہین صحافی ایسی رپورٹوں اور مضامین کے مندرجات سے ملنے والی جزئیات پر غور کر کے مخالفین کے مسلمہ حقائق کو انہی کے دعوے کے خلاف دلیل بنا لیتے ہیں جس سے فریق مخالف بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ ایسی رپورٹوں کے شروع میں عموماً مدیر الگ سے وضاحتی نوٹ لگا دیتا ہے کہ ادارے کا ان مندرجات سے متفق ہونا ضروری نہیں، اس کے بعد کسی کو مدیر پر

انگشت نمائی کا حق نہیں رہتا۔ یہی وضاحت ابو جعفر طبری اور دیگر اسلامی مؤرخین اپنی تواریخ میں درج کمزور اور غیر معتبر روایات کے بارے میں کر چکے ہیں۔

❹ آخری بات یہ ہے کہ ہر شخص کی اپنی اپنی مصروفیات اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ وہ ان کے دائرے میں رہ کر ہی کام کرتا ہے۔ ہم ایک چار منزلہ عمارت بنانا چاہتے ہیں مگر وقت یا سرمایہ ہمیں دو منزلوں سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا۔ باقی کام اگلی نسل پورا کرتی ہے۔ یوں بہت سے کام بعد والوں کے ذمے رہ جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ امام طبری رحمہ اللہ کو اتنا وقت نہ ملا ہو کہ وہ رواۃ کے احوال پر بھی بحث کرتے یا ہر روایت کا درجۂ صحت وضعف بیان کرتے۔

لہٰذا ان سب پہلوؤں کو سامنے رکھنے کے بعد امام طبری یا دیگر جلیل القدر علماء کی مرتب کردہ تواریخ میں ایسی ضعیف یا ناقابلِ قبول روایات کے آ جانے کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ یہ حضرات ان روایات سے صحابہ کی عدالت کے خلاف استدلال کر رہے تھے، یا ان کا مقصد لوگوں کو کسی غلط استدلال پر آمادہ کرنا تھا۔

☆☆☆

❷ الکامل فی التاریخ

''الکامل فی التاریخ'' علامہ محمد بن محمد بن اثیر الجزری رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔ وہ ۵۵۵ھ میں موصل کے قریب، تین سمتوں سے دریائے دجلہ میں گھرے ہوئے جزیرہ ابن عمر میں پیدا ہوئے تھے۔

ابن اثیر رحمہ اللہ نے علم کے لیے موصل، شام اور القدس کے اسفار کیے۔ جوانی کے ایام میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے ساتھ فرنگیوں کے خلاف جہاد میں بھی شریک رہے۔ حلب گئے تو علامہ ابن خلکان رحمہ اللہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ آخر میں موصل آ گئے اور وفات تک وہیں تصنیف و تالیف کا مشغلہ اپنائے رہے۔ ۶۳۰ھ میں دارِ فانی سے کوچ کیا۔[1]

الکامل فی التاریخ ان کی شہرہ آفاق تالیف ہے جس نے ہر دور میں اہل علم سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ دورِ آدم سے لے کر عالم اسلام پر چنگیز خان کے حملے کے حالات پوری شرح و بسط سے بیان کیے ہیں اور گزشتہ صدیوں میں مرتب کیے گئے عربی و فارسی مآخذ سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔

الکامل فی التاریخ کی خصوصیات:

❶ واقعات میں ترتیبِ زمانی پر اصل مدار رکھا گیا ہے۔ یعنی ایک سال کے واقعات چاہے وہ عرب کے ہوں یا فارس و ہندوستان کے، ایک ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ پھر اگلے سال کے واقعات ذکر کیے گئے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کوئی واقعہ پڑھتے ہوئے ہم پورے اعتماد کے ساتھ اس کے سنِ وقوع سے آگاہ رہتے ہیں۔

① ان کے بڑے بھائی مبارک بن محمد بھی ''ابن اثیر الجزری'' کے نام سے مشہور ہیں جنہوں نے معذوری کی حالت میں گوشہ نشین رہ کر حدیث میں ''جامع الاصول'' جیسا ضخیم اور عظیم حدیثی مجموعہ مرتب کیا۔ جزیرہ ابن عمر کی ایک اور شخصیت بھی علامہ الجزری کے نام سے مشہور ہے، یہ مقدمۃ الجزری اور حصن حصین کے مصنف محمد بن محمد بن محمد الجزری ہیں جو آٹھویں صدی ہجری کی شخصیت ہیں۔ قارئین ''الجزری'' نام کے تینوں مصنفین کا فرق ملحوظ رکھیں۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر ہمیں کسی واقعے کا سن معلوم ہو اور ہم ''الکامل فی التاریخ'' میں اس کی تفصیل دیکھنا چاہیں تو چند لمحوں میں مطلوب کو تلاش کر سکتے ہیں۔

❷ زیادہ تر مواد آثارِ مضبوطہ (تحریری ذخیرے) سے لیا گیا ہے۔ ہارون الرشید کے دور تک زیادہ تر روایات طبری سے لی گئی ہیں۔ بعد کے ادوار میں مختلف کتب سے مواد لیا گیا ہے۔ اپنے دور کے حالات میں زبانی منقولہ روایات کثرت سے لی ہیں۔

❸ گزشتہ تاریخی کتب میں روایات کو من وعن درج کرنے کا طرز عام تھا جس سے ضخامت بڑھ جاتی تھی اور قارئین اکتا جاتے تھے۔ ابن اثیر نے اسے ترک کر کے روایات کا اصل مغز لیا ہے اور ان واقعات کا انتخاب کیا ہے جو حال اور مستقبل پر اثر انداز ہوئے ہوں۔

❹ ہر سال وفات پانے والے مشاہیر کا ذکر پورے اہتمام سے کیا ہے۔

❺ سال کے آخر میں نادر اور عجیب واقعات بھی نقل کیے ہیں۔

❻ تصنیف کو دلچسپ بنانے کا خاص خیال رکھا ہے۔ جا بجا علماء، فاتحین اور بادشاہوں کے سبق آموز واقعات اور پر لطف قصے بیان کیے ہیں۔

❼ حکمرانوں کے غلط فیصلوں پر تنقید بھی ہے اور موقع بموقع تاریخ سے عبرت دلائی ہے۔

کمزوریاں:

❶ ''الکامل فی التاریخ'' میں سالوں کی ترتیب سے واقعات بیان کرنے کی پابندی کی گئی ہے جس کی وجہ سے عرب، فارس، ہندوستان، شام اور مصر کی مختلف بادشاہتوں کے واقعات ٹکڑوں میں بیان ہوئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایک تسلسل سے صرف ایک بادشاہت کے حالات دیکھنا چاہے تو اسے خاصی دِقت ہوگی۔

❷ ابن اثیر رحمہ اللہ روایت لینے کے معاملے میں اتنے کھلے دل کے ہیں کہ ضعیف بلکہ من گھڑت روایات بھی بلا تردد لے لیتے ہیں۔ کسی تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

❸ روایات کی سند کہیں بیان نہیں کی گئی اس لیے تحقیق کرنا بہت مشکل ہے کہ مواد کس حد تک معتبر ہے۔

❹ ابن اثیر رحمہ اللہ معاصر بادشاہوں پر تنقید کرنے میں متشدد ہیں حتیٰ کہ صلاح الدین ایوبی جیسے حضرات بھی ان کی تنقید کی زد میں آ جاتے ہیں، بعض مقامات پر یہ تنقید بجا اور بعض جگہ بالکل بے جا ہے۔ اس سے مدح و مذمت میں ان کے غیر معتدل ہونے کا احساس ہوتا ہے، تاہم اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ ایک بے باک انسان تھے، جس بات کو سچ سمجھتے تھے اسے بیان کرنے میں کسی حکومت یا سلطنت کا خوف روا نہیں رکھتے تھے۔

مجموعی طور پر یہ ایک مفید تالیف ہے۔ اگر اس میں روایات کا معیار کچھ بلند رکھا جاتا تو بہت بہتر ہوتا۔

☆☆☆

④ تاریخ الاسلام

اس کے مؤلف حافظ شمس الدین محمد بن احمد الذہبی رحمہ اللہ ہیں جو ۶۷۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ترکمان قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ آخر میں دِمَشق میں رہائش اختیار کی اور تصنیف و تالیف اور تدریس میں زندگی گزار دی۔ سو کے قریب معرکۃ الآراء تصانیف ان کا علمی و قلمی شاہکار ہیں۔ انہیں خاتمۃ الحفاظ کہا جاتا ہے۔ علامہ سخاوی رحمہ اللہ کے بقول لوگ حدیث اور رجال کے فنون میں چار شخصیات کی اولاد ہیں: ''مِزّی رحمہ اللہ، ذہبی رحمہ اللہ، عراقی رحمہ اللہ اور ابن حجر رحمہ اللہ۔''

رجال پر ناقدانہ نظر رکھنے والے حافظ ذہبیؒ نے جب تاریخ پر قلم اٹھایا تو ''تاریخ الاسلام''، ''دول الاسلام''، ''سیر اعلام النبلاء'' اور ''العبر'' جیسی تصانیف لکھ کر دنیا کو ششدر کر دیا۔ ان کی تاریخ الاسلام کا پورا نام ''تاریخ السلام ووفیات المشاہیر والاعلام'' ہے۔ یہ ''تاریخ دِمَشق'' کے بعد اسلامی تاریخ کا دوسرا سب سے ضخیم ماٰخذ ہے۔ ①

خوبیاں:

❶ تاریخ الاسلام میں زمانے اور شخصیات کو طبقات میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

❷ ہر طبقے کو ایک زمانے میں محدود کیا گیا ہے۔ پہلے اس زمانے کے حالات کو ''حوادث'' کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے، پھر اس زمانے کے مشاہیر کے حالات ''وفیات'' کے عنوان سے پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح اس میں تین علوم: تاریخ، رجال اور طبقات کو جمع کر دیا گیا ہے۔

❸ تاریخی روایات پر بقدرِ ضرورت تبصرہ بھی ہے اور مؤرخین و رواۃ پر جرح بھی۔

❹ حافظ ذہبیؒ معتدل المزاج اور وسیع النظر ہیں، اس لیے روایات اور شخصیات کے متعلق نہایت محتاط اور نپی تلی رائے دیتے ہیں جو اکثر و بیشتر نہایت وزنی ہوتی ہے۔

❺ حافظ ذہبیؒ نے روایات کے انتخاب میں بھی گزشتہ تمام مؤرخین سے بہتر اور محتاط منہج اپنایا ہے، اس لیے ان کی تاریخ رطب و یابس اور من گھڑت باتوں سے تقریباً پاک ہے۔ محققین کے لیے یہ نہایت قیمتی ماٰخذ ہے۔

کمزوریاں:

❶ اس کی ضخامت غیر معمولی ہے، جس کے باعث اسے خریدنا اور اس سے استفادہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

❷ اس میں ''وفیات'' کا حصہ اصل تاریخ کی بہ نسبت بہت بڑھ گیا ہے، جس کے باعث واقعات کی رفتار میں بہت طویل وقفے آجاتے ہیں۔

☆☆☆

① تاریخ دِمَشق کا متداول نسخہ جو دارالفکر نے شایع کیا ہے، ۸۰ جلدوں میں ہے، اس میں ۷۶ جلدیں متن ہے اور چار جلدیں فہارس اور انڈکس پر مشتمل ہیں۔ حافظ ذہبی کی تاریخ الاسلام کا مشہور نسخہ جو ڈکتور عبدالسلام تدمری کی تحقیق کے ساتھ شایع ہوا ہے، ۵۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔

④ البدایۃ والنہایۃ

یہ حافظ اسماعیل بن عمر بن کثیر الدمشقی رحمہ اللہ کی تصنیف ہے جو بیک وقت محدث، ناقد، مفسر اور فقیہ تھے۔ ۷۰۱ھ میں شام کے شہر بُصریٰ میں پیدا ہوئے اور ۷۷۴ھ میں دِمشق میں وفات پائی۔

خوبیاں:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے "البدایہ والنہایۃ" میں جو خصوصیات مدنظر رکھی ہیں وہ یہ ہیں:

❶ سیرت نبویہ میں بہت تفصیل کے ساتھ روایات جمع کی ہیں اور ان میں اسناد کے ساتھ نقد ونظر کا اہتمام کیا ہے۔ دوسروں سے نقل پر اکتفا نہیں کیا۔

❷ دورِ صحابہ اور زمانہ فتن کی اکثر روایات طبری یا الکامل فی التاریخ سے لی ہیں اور حسبِ ضرورت جرح بھی کی ہے۔

❸ طبری یا "الکامل فی التاریخ" سے لیے گئے اموی وعباسی خلفاء کے حالات کو جو تقریباً چھ صدیوں پر محیط ہیں، مختصر مختصر بیان کیا ہے تاکہ قارئین اکتانہ جائیں اور کوئی چاہے تو تفصیل کے لیے انہی محولہ کتب سے رجوع کرلے۔

❹ اپنے دور کے واقعات کو جو بغداد پر ہلاکو خان کے حملے سے لے کر مصر وشام کے مملوک سلاطین کی فتوحات تک ہیں، بہت تفصیل سے بیان کیا ہے؛ کیوں کہ یہ احوال کسی اور مفصل تاریخ میں اس طرح مدوّن نہیں تھے۔

کمزوریاں:

❶ احوالِ صحابہ میں بعض ناقابلِ اعتبار روایات بلاتبصرہ لے لی گئی ہیں جو ایک کمزور پہلو ہے۔

❷ واقعات اور احوال کو الگ الگ سالوں میں ذکر کرنے کے باعث واقعات کا تسلسل بار بار منقطع ہوجاتا ہے۔

❸ احوال کا تناسب یکساں نہیں۔ کہیں بہت تفصیل ہے اور کہیں بہت اختصار۔ انبیائے سابقین، سیرتِ نبویہ اور فتوحاتِ اسلامیہ کے حالات (۱۵ھ تک) غیر معمولی تفصیل اور تحقیق کے ساتھ کئی جلدوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے ہیں، واقعات میں اختصار کا تناسب بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ آخری پانچ صدیوں کے حالات تین جلدوں میں سمو دیے گئے ہیں۔ البتہ بالکل آخر میں پھر کچھ تفصیلی انداز ہے یعنی ۷۰۱ھ سے ۷۶۸ھ تک کے حالات قدرے تفصیل کے ساتھ ایک جلد میں بیان کیے گئے ہیں۔

دراصل حافظ ابنِ کثیر نے احوالِ انبیائے کرام، سیرتِ نبویہ اور سیرتِ صحابہ کو زیادہ اہمیت دیتے ہوئے وہاں تحقیق اور تفصیل سے کام لیا ہے، تاکہ اس بارے میں قابلِ قبول روایات جمع ہوجائیں۔ سلاطین اور خلفاء بنواُمیہ اور بنوعباس کے حالات انہوں نے اس لیے مختصراً بیان کیے کہ یہ چیزیں دیگر مآخذ (الکامل، طبری) میں تفصیل سے آچکی تھیں۔

☆☆☆

⑤ تاریخ ابنِ خَلدون

اس کتاب کا اصل نام "تاریخ العبرو دیوان المبتدأ والخبرفی ایام العرب والعجم والبربر" ہے۔ اس کے مصنف علامہ عبدالرحمٰن ابن خَلدون رحمہ اللہ ہیں۔ ۷۳۲ھ میں ولادت اور ۸۰۸ھ میں وفات ہوئی۔ اسلامی سلطنتوں میں ریاست وقضا کے عہدوں پر فائز رہے لہٰذا سیاسی اتار چڑھاؤ دیکھنے اور رموزِ حکمرانی سمجھنے کا خوب موقع ملا۔

خوبیاں:

تاریخ ابن خلدون گزشتہ تمام تاریخی کتب سے الگ ہے۔ اس کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

❶ اس کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں جغرافیہ، تاریخ، معاشرے کی تشکیل، ترقی، عروج وزوال کے اسباب اور تمدنی حقائق پر ایسی روشنی ڈالی گئی ہے جس کی پہلے کوئی مثال موجود نہ تھی۔ تاریخ ابن خلدون اسی مقدمے کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوئی۔ اسے "مقدمۂ ابن خلدون" کہا جاتا ہے جس کی گہری علمیت کے پیش نظر ابن خلدون کو عمرانیات کا بانی شمار کیا گیا ہے۔

❷ تاریخی واقعات کی ترتیب میں زمانے پر مدار نہیں رکھا گیا بلکہ الگ الگ بادشاہتوں اور خاندانوں کو لے کر ان کے آغاز سے انتہاء تک تمام واقعات کو ایک تسلسل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح قارئین کا ذہن منتشر ہونے سے بچ جاتا ہے۔

❸ انداز بالکل غیر جانبدارانہ ہے۔ زبان سادہ اور مدلل ہے۔ کسی پر تنقید ہے نہ اعتراض۔ ذاتی پسند یا ناپسند اور اپنے طبعی رجحان کا کہیں کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا۔

❹ واقعات کو اس طرح جوڑا گیا ہے کہ خود بخود سمجھ آجاتا ہے کہ ہر واقعہ گزشتہ واقعے کا ردعمل ہے اور اگلے واقعے کا سبب بن رہا ہے۔

❺ روایت میں درایت (عقل وقیاس کے مطابق ہونے) کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ایسی بکثرت روایات کو ترک کیا گیا ہے جنہیں گزشتہ مؤرخین قبول کرتے آرہے تھے۔

❻ روایات کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے اور اصل مفہوم نقل کرنے میں احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔

❼ نیک نام شخصیات کے معایب اور کمزوریاں بیان کرنے سے حتی الامکان احتراز کیا گیا ہے؛ کیوں کہ ایسی روایات دشمنی یا تعصب پر مبنی ہوسکتی تھیں۔

❽ بڑے بڑے واقعات کے اتار چڑھاؤ کو مختصر الفاظ میں اس طرح سمودیا گیا ہے کہ کوئی اہم جزو حذف نہیں ہونے پاتا اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ تاریخ کا علم حاصل ہوتا ہے۔ آپ تاریخ ابن خلدون کے دس اوراق پڑھ کر کسی بھی دوسری تاریخ کے پچاس صفحات سے زیادہ مواد پر حاوی ہوسکتے ہیں۔

❾ یہ ایک ایسی تاریخ ہے کہ جس کے مطالعے کا مشورہ ہر کسی کو دیا جا سکتا ہے، اس میں ایسی ضعیف روایات بہت کم ہیں جن سے اسلاف خصوصاً قرونِ اولیٰ کے حضرات کے بارے میں کج فکری پیدا ہوتی ہو۔

کمزوریاں:

❶ بعض جگہ ابنِ خلدون کے تبصرے جمہور علماء کے نظریے سے الگ اور کمزور ہیں، جن پر گرفت کی گئی ہے۔

❷ اندازِ بیان خشک اور روکھا ہے۔ اس لیے ''الکامل فی التاریخ'' یا ''البدایۃ والنہایۃ'' کی طرح دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ مگر اہلِ نظر سمجھ سکتے ہیں کہ یہی تاریخ نگاری کی معراج ہے کہ ذاتی کیفیات، جذبات اور رجحانات سے بالکل الگ ہو کر واقعات کو عبارت میں ڈھالا جائے۔

مجموعی طور پر تاریخ ابن خلدون کو اسلامی تاریخ کا سب سے فخریہ شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ ①

☆☆☆

دو اہم مآخذ جنہیں عام طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے؟

مذکورہ پانچ کتب کے علاوہ دو اور کتابیں بھی ہیں جو ''موسوعات'' کے طرز پر مرتب کی گئی ہیں۔ اگرچہ انہیں عام طور پر نظر انداز کیا گیا مگر درحقیقت وہ نہایت مفید اور محققین کے لیے انتہائی اہم ہیں۔

① المنتظم فی تاریخ الملوک والامم

② مرآۃ الزمان فی تواریخ الاعیان

''المنتظم'' علامہ عبدالرحمٰن ابن الجوزیؒ (م ۵۹۷ھ) کی تالیف ہے جو ''۱۹'' جلدوں میں ہے۔ جبکہ ''مرآۃ الزمان'' انہی کی اولاد میں سے علامہ سبط ابن الجوزیؒ (م ۶۵۴ھ) نے مرتب کی ہے۔

''المنتظم'' معیار کے لحاظ سے تاریخ الطبری سے بہتر ہے اسی طرح ''مرآۃ الزمان'' فنِ تاریخ کے اعتبار سے ''الکامل فی التاریخ'' پر فائق ہے۔ تاہم اللہ کی شان کہ ان دونوں کتب کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو ''تاریخ طبری'' اور ''الکامل فی التاریخ'' کو نصیب ہوئی۔ ہاں جوہریوں نے ان جواہر کی قدر ضرور کی۔ حافظ ذہبیؒ نے ''تاریخ الاسلام'' اور حافظ ابن کثیرؒ نے ''البدایۃ والنہایۃ'' میں ان دونوں کتب سے بکثرت استفادہ کیا ہے۔ علماء کو یہ دونوں کتب اپنے کتب خانوں میں ضرور رکھنی چاہییں۔ ''مرآۃ الزمان'' کئی صدیوں سے نایاب تھی۔ گزشتہ صدی میں اس کے بعض اجزاء حیدر آباد دکن سے شائع ہوئے تھے۔ باقی کتاب لاپتا تھی۔ آخر عرب محققین کی ایک جماعت نے دنیا بھر کے کتب خانوں میں اس کے بکھرے ہوئے اجزاء تلاش کیے اور انہیں جمع کر کے تحقیقی حواشی کے ساتھ اس کا ایک مکمل نسخہ تیار کیا جو الحمدللہ ۲۰۱۳ء میں ''الرسالۃ العالمیۃ دمشق'' سے ۲۵ ضخیم جلدوں شائع ہو چکا ہے۔

پہلا باب

تاریخ اُمّتِ مُسلِمہ (حصہ اوّل)

تاریخ ماقبل از اسلام

از تخلیق آدم علیہ السلام تا رفعِ عیسیٰ علیہ السلام

☆☆☆

اے ہمالہ ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا

مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا

☆☆☆

کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا

داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

☆☆☆

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

☆☆☆

(علامہ اقبال مرحوم)

یہ دُنیا

یہ دنیا اتنی ہی عجیب ہے جتنی ہماری یہ زندگی اور جسم وجان۔ ہم گوشت پوست کا ایک جسم ہیں جو سوچتا، بولتا اور حرکت کرتا ہے، جس میں اک چھوٹا سا دل ہماری پیدائش سے لے کر آج تک کسی وقفے کے بغیر دھڑکتا چلا آرہا ہے، جس میں ہزاروں میل لمبی بال جیسی باریک شریانیں ایک ایک خلیے کو خون فراہم کرنے کا کام کر رہی ہیں۔ ہمارے یہ وجود سو برس پہلے یقیناً نہیں تھے اور سو برس بعد یقیناً نہیں ہوں گے۔ پس جس طرح ہم فانی ہیں، اسی طرح یہ دنیا بھی ایک عارضی مقام ہے جو ہمیشہ تھا، نہ رہے گا، مگر اس عارضی مقام کو بھی کس قدر بالغ حکمتوں، عجیب نزاکتوں اور بھرپور انتظامات کے ساتھ بنایا گیا ہے، جتنا سوچیے اور تحقیق کیجیے عقل دنگ ہوتی چلی جاتی ہے اور یہ سوال پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ اُبھرتا رہتا ہے کہ آخر یہ دنیا کس نے بنائی اور اس کا مقصد کیا ہے؟ جو لوگ ان سوالات کے جوابات کے لیے وحی کی رہنمائی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور ''غیب'' پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں، وہ ہمیشہ اس بارے میں شکوک وشبہات ہی کا شکار رہے ہیں اور کوئی بھی تحقیق انہیں یہ معمہ حل کر کے نہیں دے سکتی۔

ہاں جو بندے خالق کے وجود پر یقین رکھتے ہیں، رسولوں کی حیثیت تسلیم کرتے ہیں اور آسمانی تعلیم کی ضرورت کو مانتے ہیں، ان کے لیے یہ سوالات کبھی معما نہیں رہے؛ کیوں کہ ہر نبی کی ابتدائی تعلیمات اِن سوالات کے جوابات دیتی ہیں۔ یہ دنیا ایک اللہ نے بنائی ہے، وہی خالق کائنات ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس کو کسی نے نہیں بنایا، اس کی کوئی اولاد نہیں۔ وہ سب کچھ جانتا ہے، ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، اس نے انسانوں کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے، اس دنیا کو آزمائش کی جگہ بنایا ہے، کامیاب لوگوں کے لیے انعام کے طور پر جنت تیار کی ہے اور ناکام لوگوں کو سزا دینے کے لیے جہنم کو شعلہ زن کیا۔

یہ ہیں موت وحیات کے اسرار کے متعلق وہ حقائق جو گزشتہ کتب آسمانی میں بھی موجود تھے اور اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآنِ مجید میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

چونکہ یہ چیزیں عقائد سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کو جانے بغیر انسان کی بے چین روح کبھی مطمئن نہیں ہوسکتی، اس لئے انہیں وحی الٰہی نے خود کھول کھول کر بیان کیا ہے۔

کچھ ایسے سوالات بھی ہیں جن کا محرک معلومات کا شوق اور آگہی کا ولولہ ہے۔ انسان کا ذوقِ تجسس اسے آمادہ کرتا ہے کہ وہ ان باتوں کا پتا چلائے کہ ان کے آباؤ اجداد کون تھے، کیسے تھے؟ ان سے پہلے کون لوگ آباد تھے، دنیا کب سے آباد چلی آرہی ہے، اس پر کون کون سی قومیں آئیں؟ ان کی تہذیبیں کیا تھیں؟ رہن سہن کیسا تھا؟

یہ سوالات تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں جن میں سے بعض کے جوابات اللہ کی کتابوں اور رسولوں کے کلام میں مختصراً

مل جاتے ہیں۔ ماضی کا شعور انسان کی نظریاتی، روحانی، علمی اور عملی تربیت کے لیے بہت مفید ہے، اس لیے وحی اور رسولوں کے کلام میں ہمیں ماضی کے متعلق بہت سے حقائق مل جاتے ہیں، مگر وحی اور رسالت کا اصل مقصد انسانوں کی ہدایت ہے نہ کہ گزشتہ لوگوں کے حالات جمع کرنا۔ اس لیے ماضی کے تفصیلی حالات جاننے کے لیے ہمیں اس علم کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس میں ہر دور کے اہم حالات کو مرتب کیا جاتا ہے، یہی علم، علمِ تاریخ کہلاتا ہے۔

علمائے تاریخ کے مطابق: ''تاریخ وہ علم ہے جس میں گزشتہ قوموں، حکومتوں، ملکوں اور غیر معمولی شخصیتوں کے حالات کو زمانے کے لحاظ سے ترتیب وار جمع کیا جاتا ہے۔''

دُنیا کب بنی؟

یہ قضیہ شروع سے متنازعہ چلا آرہا ہے کہ دنیا کب بنی اور نسل انسانی کا وجود کب سے ہوا؟۔ دورِ حاضر کے ماہرین ارضیات تو زمین کے وجود کو کروڑوں سال اور انسانی وجود کو لاکھوں سال پہلے قرار دیتے ہیں مگر یہ صرف ایک قیاس ہے جس کی کوئی تاریخی روایت تائید نہیں کرتی۔ برصغیر کے نامور مؤرخ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ نے دنیا کی ابتدا کے متعلق اہل علم کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کو راجح قرار دیا ہے کہ ابتدائے آفرینش چھ ہزار سال پہلے ہوئی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس مسئلے کا آخری فیصلہ مشکل ہے، اس لیے کہ ہمارے پاس علم کے وسائل بہت کم ہیں اور اس حقیقت کے آخری فیصلے کے لیے ناکافی۔ نیز آثارِ قدیمہ سے بھی اس کا کوئی یقینی فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اقوامِ عالم میں چینی، ہندی اور مصری سب سے قدیم قومیں ہیں اور مؤرخین فرنگی کا یہ دعویٰ ہے کہ سطح زمین پر ان اقوام کا وجود تقریباً چھ اور دس ہزار سال کے درمیان ثابت ہے۔ نیز یہ امر بھی مُسلّم (تسلیم شدہ) ہے کہ باوجود زبردست تحقیقات کے کسی قوم کے حالات وواقعات کی تاریخ کا پتا سات ہزار سال سے پہلے نہیں ملتا۔''[1]

حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے اس بارے میں متعدد اقوال نقل کیے ہیں۔ انہوں نے محمد بن اسحٰق سے نقل کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک ایک ہزار دو سو برس، حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک ایک ہزار بیالیس برس، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پانچ سو پینسٹھ برس، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت داؤد علیہ السلام تک پانچ سو بہتر برس، حضرت داؤد علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تیرہ سو چھپن برس اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک چھ سو برس گزرے ہیں۔ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کی وفات سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پانچ ہزار بیس سال بنتے ہیں۔ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام نے دنیا میں نو سو ساٹھ سال گزارے ہیں، انہیں شمار کیا جائے تو حضرت آدم علیہ السلام کی دنیا میں آمد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت تک چھ ہزار دو سو پچانوے سال بنتے ہیں۔[2]

---

[1] مقدمہ نور البصر فی سیرۃ خیر البشر: ص ۱۸ [2] تاریخ دمشق لابن عساکر: ۱/ ۳۱، ط دار الفکر

حضرت آدم علیہ السلام:

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا۔ یہ ''پہلے انسان'' کی تخلیق تھی، اس کی بناوٹ میں خالق کائنات نے ان جدتوں اور صناعیوں سے کام لیا جو اس سے پہلے کسی مخلوق کی پیدائش میں استعمال نہیں کی گئی تھیں۔ اس نئے وجود میں سوچنے، سمجھنے، جذبات کا اظہار کرنے، مسائل کو سمجھنے اور گردوپیش کے وسائل کو کام میں لانے کی صلاحیتیں باقی تمام مخلوقات سے زیادہ تھیں۔ یہ تعمیر اور تخریب دونوں میں غیر معمولی نتائج اور اثرات دکھا سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے نہ فرشتوں کی طرح اطاعت پر مجبور بنایا تھا، نہ جنات کی طرح شر سے مغلوب، بلکہ اسے خیر اور شر دونوں کی قوت دی تھی۔ فرشتوں نے انسان کی ساخت سے اس کی کارکردگی کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا، انہیں یہ بھی یاد تھا کہ اس سے قبل زمین پر آباد جنات کتنا فساد مچا چکے ہیں، اس لیے انہوں نے اللہ کی بارگاہ میں نیازمندانہ عرض کیا کہ اس کی جگہ حمد وثنا اور عبادت کے لیے ہم حاضر ہیں۔ اللہ نے فرمایا:

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ.

''میں جو جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔''[1]

انسان کو نیکی اور بدی دونوں کی قوتیں اس لیے دی جا رہی تھیں کہ اللہ دنیا کی تجربہ گاہ میں اسے آزمانا چاہتا تھا۔ اگر وہ بدی کی طاقت رکھتے ہوئے اللہ سے ڈر کے بدی سے باز رہے گا اور نیکی کی صلاحیت کو استعمال کرے گا تو کامیاب رہے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ کو بھلا کر بدی کی صلاحیت استعمال کرے گا، نیکی کی قوت کو ترک کرے گا تو ناکام رہے گا۔ یہ راز اس وقت فرشتوں کو سمجھ نہیں آ سکتا تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے انہیں تعظیمی سجدہ کرایا تاکہ ساری دنیا پر انسان کی عظمت کا سکہ بیٹھ جائے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی رفاقت کے لیے انسان کی صنفِ نازک کو بھی پیدا کیا گیا، اس کی ابتدا حضرت حوا رضی اللہ عنہا سے ہوئی۔ دونوں کو مہمانی کے لیے جنت میں بھیج دیا گیا۔ دنیا کے پہلے مرد اور عورت نے جنت میں تھوڑا ہی عرصہ گزارا مگر اس مختصر سی زندگی کا آرام وسکون انسانی روح کی گہرائیوں میں ایسا جذب ہوا کہ بعد میں آنے والا ہر انسان اپنے اندر جنت جیسی کسی جگہ میں جا بسنے کی زبردست خواہش محسوس کرتا رہا ہے، جہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں، رنج وغم اور تکلیف کا نام ونشان نہ ہو، جہاں ہر خواہش پوری ہو اور ہر نعمت میسر ہو۔ اللہ پر ایمان رکھنے والوں نے رسولوں کی معرفت یہ جان لیا کہ اُن کی اصل منزل جنت ہے، اس لیے وہ نیک اعمال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے تاکہ اپنی منزل کی طرف لوٹ سکیں۔ اللہ اور رسولوں پر ایمان نہ رکھنے والوں نے جنت کو ایک خیالی چیز سمجھ کر اس کا انکار کیا مگر وہ اپنی فطرت میں موجود جنت کی خواہش سے خود کو آزاد نہ کر سکے۔ اس لیے دنیا کے محدود وسائل کی چھین جھپٹ میں منہمک ہو گئے تاکہ اس فانی زندگی میں جنت کے مزے لے سکیں۔ اس کش مکش سے دنیا فتنہ وفساد کی آماجگاہ بن گئی۔

[1] سورۃ البقرۃ، آیت: ۳۰

تخلیق آدم علیہ السلام سے اب تک انسانوں کو گمراہ کرنے میں سب سے بڑا دخل شیطان کا رہا ہے۔ شیطانوں کا سردار ابلیس جنات کی نسل سے ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے یہ فرشتوں کا ہم نشین اور بارگاہِ الٰہی کا مقرب رکن تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا مرتبہ اپنے سے بلند ہوتے دیکھ کر وہ نفرت اور حسد کی آگ میں بُری طرح جلنے لگا۔ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا؛ کیوں کہ وہ خود کو حضرت آدم علیہ السلام سے بہتر سمجھتا تھا، وہ بھی صرف اس لیے کہ وہ آگ سے پیدا ہوا تھا اور حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے۔ اس گستاخی پر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی بارگاہ سے دھتکار دیا۔ شیطان ڈھیٹ تھا، معافی بھی نہ مانگی۔ ہاں اللہ تعالیٰ سے مہلت طلب کر لی کہ میں قیامت تک آدم اور اس کی اولاد کو گمراہ کر سکوں۔ اللہ نے اجازت دے دی۔ حضرت آدم علیہ السلام اور اُن کی اولاد کی آزمائش صحیح معنوں میں تو تب ہی ہو سکتی تھی جب وہ شیطان کے اثرات سے بچ کر دکھائیں اور خود کو اپنے خالق و مالک سے وابستہ کیے رہیں، اس لیے شیطان کو انسان کے بہکاوے کی مہلت بھی دے دی گئی اور صلاحیت بھی۔

شیطان کی حضرت آدم علیہ السلام سے دشمنی پختہ تر ہو گئی۔ اب اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو بھی اللہ کے ہاں مجرم بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسی صلاحیت دی تھی کہ وہ دوسروں کے ذہن اور خیالات میں دخل اندازی کر سکتا تھا۔ اس نے اس صلاحیت سے کام لے کر پہلے حضرت حوا اور پھر حضرت آدم علیہ السلام کو ایک ایسے درخت کا پھل کھانے پر آمادہ کر لیا جس کا استعمال حضرت آدم علیہ السلام کے لیے ممنوع تھا۔ جب آدم و حوا نے پھل استعمال کیا تو اللہ کی طرف سے جنت سے اخراج کا حکم آ گیا۔ جنت کا لباس چھین لیا گیا۔ دونوں نے جنت کے درختوں کے پتوں سے ستر چھپا کر اپنی فطری شرم و حیا کی لاج رکھی۔ جلد ہی دونوں کو زمین پر اُتار دیا گیا۔ اس موقع پر انسان اور شیطان کا فرق ظاہر ہوا۔ حضرت آدم و حوا نے گڑگڑا کر اللہ سے اپنی لغزش کی معافی مانگی، جبکہ شیطان اپنی سرکشی پر ڈٹا رہا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم و حوا کی توبہ قبول فرمائی اور انہیں متنبہ فرمایا کہ اب شیطان ہمیشہ تمہاری اولاد کا دشمن رہے گا، اس سے ہوشیار رہنا۔ یہ بھی بتایا کہ نسلِ انسانی کی رہنمائی اور اسے شیطان کے اثرات سے بچانے کے لیے آسمانی ہدایت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ جو اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ آخرت میں بے خوف و خطر ہو گا۔ جو اسے ٹھکرائے گا وہ سخت عذاب کا حق دار ٹھہرے گا۔

چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اور دنیا میں اُن کی آمد کا قصہ انسان کو اس کی اصل منزل، مقصد اور حیثیت سے آگاہ کرتا ہے، اس لیے قرآنِ مجید اور احادیث نبویہ میں اس واقعے کو بہت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ دنیا میں انسان کی آمد کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی معرفت کے حصول، اس کی توحید تک رسائی، اس کے در پر جھکنے، اس کے احکام ماننے اور شیطان کے جال سے بچنے کی آزمائشیں مقصود تھیں۔ یہی راز تھا جس کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا، دنیا میں بھیجا گیا اور اُن کی نسل کو چلایا گیا۔

[1] ملاحظہ کریں: سورۃ البقرۃ، آیت: ۳۰ تا ۳۹ ، سورۃ الاعراف، آیت: ۱۱ تا ۲۵ ؛ سورۃ الحجر، آیت: ۲۶ تا ۴۲

حضرت آدم علیہ السلام کی وفات تک ان کی نسل کے افراد کی تعداد چالیس ہزار کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ ①

یہاں ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ پیدائشِ آدم علیہ السلام کا یہ قصہ جو قرآنِ مجید و احادیث مبارکہ میں بیان ہوا (اور اس کی تائید تورات اور انجیل اپنی موجودہ تحریف شدہ حالت میں بھی کرتی ہیں) اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، سب ایک باپ کے بیٹے اور انسان ہونے کے ناطے بھائی بھائی ہیں۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ڈارون کا نظریہ ارتقاء اور انسان کے بندر کی نسل سے ہونے کا مفروضہ نری گپ ہے جو تمام آسمانی مذاہب کے برعکس اور تاریخ سے متصادم ہونے کے ساتھ ساتھ عقل کے بھی بالکل خلاف ہے۔ اگر قدیم زمانے کے بندر ارتقاء کرتے کرتے انسان بن سکتے تھے تو دورِ حاضر کے بندر، بندر ہی کیوں رہے، انسان کیوں نہیں بنے؟ انسان ہزاروں برس میں کوئی اور مخلوق کیوں نہیں بن گیا؟ بلی شیر کیوں نہ بن پائی اور گدھا آج تک گھوڑے میں کیوں تبدیل نہ ہوا؟

حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں آئے تو یہاں جنت جیسی نعمتیں اور آسائشیں نہ تھیں، پھر بھی یہ دنیا انسان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی تھی۔ کھانے پینے، ستر پوشی اور رہنے سہنے کے وسائل یہاں میسر تھے۔ خالق کائنات نے اِس پہلے انسان کو اُن وسائل کے استعمال کی تربیت بھی دے دی۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام گندم کے دانے لے کر آئے اور حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں زمین میں کاشت کر کے اناج حاصل کیا، اسے پیس اور گوندھ کر روٹی تیار کی۔ ②

جنت سے نکالے جاتے وقت حضرت آدم و حوا نے درخت کے پتوں سے ستر پوشی کی تھی۔ دنیا میں اس کا مستقل انتظام اس طرح کیا کہ دنبے کے بالوں سے اونی کپڑا بُنا گیا، اس سے حضرت آدم علیہ السلام کا جبہ اور حضرت حوا کا کرتا اور اوڑھنی تیار ہوئے۔ ③

حضرت آدم علیہ السلام و حوا کی اولاد ہوئی تو ان میں نکاح کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں اولادِ آدم کی افزائش ہوئی۔ ④

دورِ حاضر میں مغربی محققین نے جہاں انسانی تہذیب و تمدن کو لاکھوں سال قدیم بتایا ہے اور وہاں یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ شروع میں انسان جانوروں کی طرح برہنہ پھرتا تھا، کچا گوشت چباتا تھا، نکاح کا کوئی تصور نہ تھا، مرد و زن کسی رسم اور قید کے بغیر شہوت پوری کیا کرتے تھے۔ ہزاروں برس بعد وہ کھانے پکانے، پہننے اور نکاح کا عادی بنا۔ یہ دعوے محض قیاس کی پیداوار ہیں، تاریخ ان کی تردید کرتی ہے۔

دنیا میں آنے کے چند سو برس بعد اولادِ آدم نے خالق کے بنیادی سبق کو بھلا دیا اور بداعتقادی کی کھائیوں میں گرنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو راہِ راست پر لانے کے لیے انبیاء و رسل کا سلسلہ شروع فرما دیا۔

① المختصر فی اخبار البشر لابی الفداء : ۱/۹، ط الحسینیة المصریة
② تاریخ الطبری: ۱/۹۰، بروایت ابن عباس ؛ المنتظم: ۱/۲۱۱، ۲۱۲
③ البدایة والنهایة: ۱/۱۰۳
④ البدایة والنهایة: ۱/۱۰۳

حضرت نوح علیہ السلام:

گم گشتہ انسانیت کو توحید کی دعوت دینے والے پہلے نبی حضرت نوح علیہ السلام تھے، جو حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے ایک ہزار سال بعد مبعوث ہوئے۔[1] ایک ہزار برس تک لوگ اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کے دین و مذہب پر تھے مگر پھر شیطان کے ورغلانے سے انہوں نے چند مرحوم بزرگوں کے مجسمے بنا کر انہیں پوجنا شروع کر دیا۔

یہ بزرگ وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق اور نَسر تھے۔ قوم نے اندھی عقیدت کا شکار ہو کر انہیں حاجت روا اور مشکل کشا مانا اور ان کے بتوں کی پرستش شروع کر دی۔ یوں پہلی بار بندوں کا اپنے رب سے رشتہ منقطع ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلام اس رشتے کو جوڑنے آئے، اس مقصد کے لیے انہوں نے بے پناہ اذیتیں برداشت کیں، آخر ساڑھے نو سو برس کی مسلسل تبلیغ کے بعد بھی جب قوم کی اکثریت اپنی ضد، سرکشی اور گمراہی پر اڑی رہی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا طوفان آیا جو سب کچھ بہا کر لے گیا۔ صرف حضرت نوح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کو اللہ تعالیٰ نے کشتی میں سوار کرا کے محفوظ رکھا۔[2]

طوفان سے بچ جانے والے اہل ایمان صرف اسّی مرد و زن تھے۔ انہی سے دنیا کی آبادی کا از سر نو آغاز ہوا۔ ان کے بیٹوں: سام، حام اور یافث کی اولاد ساری دنیا میں پھیل گئی۔ سام کی نسل سے عرب، فارس اور روم (یورپ) آباد ہوئے۔ یافث کی اولاد سے ترکوں، (چینیوں) اور یاجوج ماجوج نے جنم لیا۔ حام کی نسل نے افریقہ کو آباد کیا، حبشی، سوڈانی، قبطی اور بربر، اسی کی اولاد سے ہیں۔[3]

حضرت نوح علیہ السلام اپنی اولاد کو اسی عقیدے پر چھوڑ کر گئے تھے جو حضرت آدم علیہ السلام کی میراث تھا، جس سے انسان اپنی روح اور دل کی گہرائیوں سے ابھرنے والے ان بنیادی سوالات کے جوابات پالیتا ہے کہ اس کائنات میں میری حیثیت کیا ہے۔ کائنات کیسے بنی، کس نے بنائی، میں کیسے پیدا ہوا اور کیوں؟ پیدا کرنے والا کون ہے، اتنا بڑا نظامِ عالم پیدا کرنے سے اس کا مقصد کیا ہے؟ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اچھے اور برے کاموں کا بدلہ ملتا ہے یا نہیں؟ ملتا ہے تو کہاں اور کیسے؟ صحیح عقیدہ ان تمام سوالات کے جواب دیتا ہے اور اسے دل کی گہرائیوں سے مان کر نسلِ انسانی بنیادی سوچ کے لحاظ سے ایک کنبہ بن جاتی ہے، پھر لسانی، علاقائی اور اقتصادی و ثقافتی اختلافات ان کے درمیان اجنبیت کی دیوار کھڑی نہیں کر سکتے۔

عاد و ثمود:

مگر حضرت نوح علیہ السلام کے چند سو برس بعد انسانیت پھر گمراہی کے راستے پر چل پڑی تھی۔ چنانچہ ایک بار پھر انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ شروع ہوا، پے در پے رسول بھیجے گئے۔ جزیرۃ العرب کی وادی میں آباد

---

[1] البداية والنهاية: ۱/۱۱۳

[2] البداية والنهاية: ۱/۱۱۸، ۱۲۵

[3] البداية والنهاية: ۱/۱۲۹

بت پرست قوم ''عاد'' کی طرف حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ یہ قوم طاقت، قد و قامت اور جنگجوئی میں بے مثال تھی اور اسی گھمنڈ میں اس نے حضرت ہود علیہ السلام کی تکذیب کی، تب اللہ کی طرف سے تیز آندھی کا عذاب آیا، جس نے ان کا استیصال کر دیا۔

حجاز سے شام جانے والی شاہراہ پر وادی حجر میں آباد قوم ''ثمود'' فن تعمیر میں اپنی نظیر آپ تھی۔ پہاڑوں کو تراش کر مضبوط مکانات بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کمال تھا۔ ان کی اصلاح کے لیے حضرت صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ قوم نے انہیں جھٹلایا اور اپنی بدعقیدگی ترک نہ کی۔ آخر ایک زوردار کڑک اور زلزلے نے انہیں ہلاک کر دیا۔[1]

قوم عاد اور ثمود سمیت عرب کی کئی قومیں ایسی تھیں جن کا نام و نشان بالکل مٹ گیا۔ انہیں عرب بائدہ کہا جاتا ہے، ان کا ذکر صرف آسمانی کتب، لوک داستانوں اور قدیم شاعری میں باقی رہ گیا۔

دعوتِ ابراہیم علیہ السلام:

مختلف قوموں کی طرف انبیائے کرام کی آمد ہوتی رہی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تک دنیا میں آبادی کی کثرت ہو چکی تھی۔ مشرق و مغرب میں درجنوں سلطنتیں اور سینکڑوں شہر وجود میں آ چکے تھے۔ اس لیے انبیاء کا سلسلہ بھی وسیع ہو گیا تھا۔ ایک ہی وقت میں مختلف علاقوں، قوموں اور ملکوں کے لیے کئی انبیاء کرام بھیجے جاتے تھے۔ ہر نبی کو بڑی بڑی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانیاں خود فراموشی، خدا شناسی اور جاں نثاری کا ایک جداگانہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے شہر بابل کے نواحی قصبے ''کوثی'' میں پیدا ہوئے تھے، طوفانِ نوح کو اس وقت ایک ہزار اکیاسی برس گزر چکے تھے، اس زمانے میں عراق اور اس کے گرد و نواح میں نمرود نامی ظالم و جابر بادشاہ کی حکومت تھی جو خدائی کا دعوے دار تھا۔ ''بابل'' اس کا پایۂ تخت تھا۔ عراق کے لوگ ایک طرف اسے خدا مانتے تھے تو دوسری طرف وہ سورج، چاند، ستاروں اور مظاہر قدرت کی خدائی کے بھی قائل تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بت پرست بھی تھے، خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ آزر بت تراش تھا۔ گویا شرک اور بداعتقادی کے سارے روگ اس قوم میں جمع ہو گئے تھے۔[2]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حقیقت آشنا بنایا اور نبوت کا منصب دے کر قوم کی اصلاح کا حکم دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان لوگوں کو سمجھایا اور ان کے سامنے ستاروں، چاند اور سورج کی بے ثباتی ظاہر کی کہ یہ اپنی مرضی سے طلوع ہوتے ہیں نہ غروب۔ یہ رب کیسے ہو سکتے ہیں۔ جب لوگ نہ مانے تو ایک دن ان کے بت خانے میں جا کر بتوں کو توڑ ڈالا اور ان کے پوچھ گچھ کرنے پر فرمایا: ''اگر یہ بول سکتے ہیں تو انہی سے پوچھ لو۔''

قوم ششدر رہ گئی اور کوئی جواب نہ پا کر ندامت سے گویا ہوئی: ''ابراہیم! تم تو جانتے ہو، یہ بول نہیں سکتے۔''

---

① سورۂ ہود، آیت: ۲۵ تا ۶۸؛ سورۃ الصّٰفّٰت، آیت: ۷۵ تا ۷۸؛ المختصر فی اخبار البشر: ۱/ ۱۰ تا ۱۳؛ الکامل فی التاریخ: ۱/ ۸۲ تا ۸۵

② الکامل فی التاریخ: ۱/ ۸۶؛ المختصر فی اخبار البشر: ۱/ ۱۴، ۱۵۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ''پھر تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کیوں کر رہے ہو جو نفع دے سکتی ہے نہ نقصان، افسوس ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر۔''

قوم ان دلائل کا جواب نہ دے سکی۔ غل مچادیا کہ اپنے معبودوں کا بھرم رکھنے کے لیے اس شخص کو پکڑ کر جلا دو۔ [1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود کے پاس لے جایا گیا، اس نے رعب ڈالنے کے لیے سوال و جواب کیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بے خوفی سے اپنے رب کی توحید بیان کی اور کہا: ''میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا اور موت دیتا ہے۔''

نمرود نے کہا: ''میں بھی زندہ کرسکتا اور مار سکتا ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے سزائے موت کے ایک قیدی کو آزاد کر دیا اور ایک بے قصور آدمی کو بلوا کر قتل کرا دیا، حالانکہ کسی کو معاف کر دینا اُسے پیدا کر دینا شمار نہیں ہوتا۔ اسی طرح کسی کو قتل کرنے سے کوئی انسان، بندوں کی زندگی اور موت کا مالک نہیں بن جاتا، کیوں کہ اس طرح تو ہر ایسا انسان جو کسی کا قاتل ہو، زندگی و موت پر قادر شمار کیا جانا چاہیے اور اسے خود کبھی موت نہیں آنی چاہیے، مگر یہ دلائل نمرود جیسے عقل کے اندھے کو بتانا بے کار تھے، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک بہت واضح پیش کش کر دی کہ میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، اگر تو رب ہے تو مغرب سے نکال کر دکھا۔ نمرود مبہوت رہ گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔ [2]

آخر وہ بھی اپنی قوم کی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مارنے پر آمادہ ہو گیا، انہیں آگ میں جلا کر نشانۂ عبرت بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ ایک بہت بڑا الاؤ دہکایا گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق کے ذریعے اس میں پھینک دیا گیا۔ اس وقت بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر یہی ندا تھی:

''اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْوَاحِدُ فِي السَّمَآءِ، وَاَنْتَ الْوَاحِدُ فِي الْاَرْضِ، حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ''

''اے اللہ! آسمان میں بھی تو ہی تو ہے، زمین میں بھی تو ہی تو ہے، اللہ میرے لیے کافی ہے، وہ بہتر کارساز ہے۔''

اِسی اثناء میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نمودار ہوئے اور پوچھا: ''کوئی حاجت درکار ہو تو حکم فرمایئے۔''

فرمایا: ''حاجت تمہارے سامنے رکھنے کے لائق نہیں۔''

اس آگ میں تپش ایسی تھی کہ بلندی پر اُڑنے والے پرندے بھی جل کر کباب ہو جاتے تھے مگر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میں گرے تو فوراً اللہ تعالیٰ کا حکم آیا:

﴿يَا نَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰۤى اِبْرَاهِيْمَ﴾ [3]

''اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم کے لیے سلامتی والی بن جا!''

اسی لمحے وہ آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ایک گلستان بن گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چالیس دن تک اس جگہ

---

① سورۃ الأنبياء، آیت: ۵۱ تا ۶۸

② تفسیر ابن کثیر، سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۵۸ ③ سورۃ الأنبياء، آیت: ۶۹

رہے۔ فرماتے تھے: ''یہ دن میری زندگی کے بہترین اور سب سے پرسکون دن تھے۔''[1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو بھی توحید کی دعوت دی تھی اور کہا تھا: ''آپ ایسی چیزوں کی کیوں عبادت کرتے ہیں جو سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں، نہ آپ کے کسی کام آسکتی ہیں۔'' باپ نے جواب دیا تھا:

''ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں کے منکر ہو، اگر تم باز نہ آئے تو میں تمھیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دوں گا۔''[2]

آخر کار قوم اور خاندان کو گمراہی پر ڈٹا دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وطن چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس دوران حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چچا زاد ''سارہ'' ایمان لے آئی تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے نکاح کر لیا اور انہیں ساتھ لے کر شام روانہ ہو گئے۔ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ان کے بھتیجے لوط بھی تھے، وہ بھی ایمان لے آئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے نصیب میں بھی نبوت کا شرف لکھ دیا تھا۔[3]

اللہ نے یہ طے کر لیا تھا کہ بھٹکے ہوئے انسانوں اور بکھرے ہوئے گروہوں کو ایک وحدت کی لڑی میں پرو کر ایک اُمت بنایا جائے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید کی بانگ دُہل دعوت دے کر اللہ کی رضا کی خاطر آگ میں کود ے اور اپنے مقصد کے لیے باپ، خاندان، قبیلے اور ملک کو چھوڑ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اس اعزاز کے اہل ہیں کہ اُن کو اللہ کی منتخب آخری اُمّت کا جدِ امجد بنایا جائے مگر ابھی جانچ کے کچھ مراحل باقی تھے، عشق ووفا کی ابھی کچھ اور داستانیں رقم ہونا تھیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام دعوتِ توحید کے بیج کاشت کرنے کے لیے مناسب زمین کی تلاش میں سفر کرتے رہے۔ وہ کچھ مدت شام میں رہنے کے بعد اپنی بیوی سارہ کے ساتھ مصر چلے گئے، جہاں کے حکمران طولیس (سِنان بن علوان) نے ان کی بزرگی کے اعتراف میں ایک دوشیزہ اُن کے نکاح میں دے دی۔[4]

سِنان بن عِلوان کا تعلق ہائیکوس (چرواہے حکمران) خاندان سے تھا جو نسلاً عرب تھا۔ جو دوشیزہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نکاح میں آئی، پردیس میں آکر ''ھا غار'' یعنی اجنبی عورت کہلائی، یہ ھاغار عربی میں ''ھَاجَر'' بن گیا۔[5]

حضرت ہاجرہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں ایک لڑکا اسماعیل پیدا ہوا۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اللہ نے انہیں حکم دیا کہ اپنی بیوی ہاجرہ اور شیر خوار بچے اسماعیل کو مکّہ کی ایک وادی میں چھوڑ آؤ۔ یہ دوسرا بڑا امتحان تھا، جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اکیلے نہیں تھے، ان کی بیوی بھی اس آزمائش میں برابر کی شریک تھیں، کیوں کہ آخری اُمت کے تاجدار کی ماں بننے کے لیے کڑے امتحانوں میں ثابت قدم رہنا شرط تھا۔

[1] الکامل فی التاریخ: ۱/۸۵ تا ۸۷

[2] سورۂ مریم، آیت: ۴۲ تا ۴۸ [3] البدایۃ النھایۃ: ۱/۱۶۸، ۱۶۹

[4] صحیح البخاری، ح: ۳۳۵۸، کتاب احادیث الانبیاء ؛ الکامل فی التاریخ: ۱/۸۸؛ المختصر فی اخبار البشر: ۱/۱۳
صحیح بخاری کی اس روایت میں فاخدمھا ھاجر کے لفظ سے مؤرخین عموماً ظاہری مطلب لیتے ہوئے سیدہ ہاجرہ کو باندی قرار دیتے ہیں مگر قاضی سلیمان منصور پوری نے بڑی تفصیل سے دلائل جمع کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ باندی نہیں بلکہ شاہِ مصر کی صاحبزادی تھیں۔ (رحمۃ للعالمین: ۲/۳۰۹ تا ۳۱۱، ط مرکز الحرمین الاسلامی)

[5] ان کا عبرانی نام ''ہاغار'' ہے۔ جب فرعونِ مصر نے سیدہ سارہ کی کرامت کو دیکھ کر حضرت ہاجرہ کو ساتھ کر دیا، تب ان کا نام آجرہ ٹھہرا، یعنی یہ اس مصیبت کا اجر ہیں جو بادشاہ کے ظلم سے اٹھانی پڑی۔ پھر جب ہجرت کی اور مکّہ میں آباد ہوئیں تو ان کا نام ہاجرہ ٹھہرا۔ (رحمۃ للعالمین: ۲/ ۳۰۸)

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک طویل سفر کر کے شام سے جزیرۃ العرب پہنچے اور بیوی بچے کو مکہ کے تپتے ہوئے چٹیل میدان میں اللہ کے سہارے پر چھوڑ کر واپس ہونے لگے۔ بیوی کے پاس صرف ایک پانی کا مشکیزہ اور کھجوروں کی ایک تھیلی توشے کے طور پر رہنے دی۔ حیران و پریشان حضرت ہاجرہ اُن کے پیچھے چلیں اور مضطربانہ لہجے میں پوچھنے لگیں:

''ابراہیم! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ ہمیں اس بے آب و گیاہ وادی میں کس کے سہارے چھوڑے جا رہے ہیں؟''

حضرت ابراہیم علیہ السلام جانتے تھے کہ آزمائش میری ہی نہیں، میری بیوی کی بھی ہے۔ اسے خود ہی سمجھنا چاہیے کہ مجھ جیسا شوہر اس جیسی بیوی اور شیر خوار بچے کو بھلا کیوں اس ویرانے میں چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ جب حضرت ہاجرہ نے بار بار یہی سوال کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام چپ چاپ اپنے راستے پر چلتے رہے تب بیوی نے معاملے کی نوعیت کا اندازہ لگا لیا اور پکار کر پوچھا: ''کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟'' خلیل اللہ علیہ السلام نے فرمایا: ''ہاں یہی بات ہے۔''

حضرت ہاجرہ کا دل مطمئن ہو گیا کیوں کہ اللہ پر انہیں ویسا ہی بھروسہ تھا جیسا ایک پختہ مومن بندی کو ہونا چاہیے۔

''میں اس کی رضا پر راضی ہوں'' یہ کہہ کر ہاجرہ واپس مڑ گئیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کی گھاٹی کو عبور کیا تو رفیقۂ حیات اور بچہ نظروں سے اوجھل ہو گئے، تب انہوں نے مڑ کر اس وادی کی طرف منہ کیا جہاں انہوں نے بیوی اور بچے کو چھوڑا تھا۔[1] وہ اللہ کے پیغمبر تھے، جانتے تھے کہ پہاڑیوں سے گھری مکہ کی وادی کائنات کا مقدس ترین مقام ہے جہاں آج بھی اللہ کے سب سے پہلے گھر کے آثار ریت کے تہہ میں چھپے ہوئے ہیں اور صدیوں سے انبیاء و رسل اس کی زیارت کرنے اور اس کی برکات حاصل کرنے یہاں آتے رہے تھے۔

تب ایک وفا شعار مومن اور ایک شفیق باپ کی طرح انہوں نے ہاتھ بلند کر کے بارگاہِ الٰہی میں یہ بے تابانہ درخواست پیش کی:

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ○

(اے ہمارے رب! میں اپنی اولاد کو آپ کے باعظمت گھر کے قریب ایک میدان میں جو زراعت کے قابل نہیں، آباد کرتا ہوں، اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں، تو آپ، کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دیجیے اور ان کو پھل کھانے کو دیجیے تاکہ یہ شکر کریں۔)[2]

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ دونوں نے اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنے، اس کی رضا پر راضی رہنے، اس کی رضا کے آگے سر جھکانے اور اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دے ڈالنے کا لازوال نمونہ پیش کر دیا۔ یہ یقین کی وہ دولت تھی جس کی بنیاد پر آخری اُمّت کو وجود میں لانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور اس کے اجزائے ترکیبی ہزاروں برس پہلے جمع کیے جا رہے تھے۔

---

[1] صحیح البخاری: ح: ۳۳۶۴، ۳۳۶۵، کتاب احادیث الانبیاء، باب واتخذ اللہ ابراہیم خلیلاً [2] سورۃ ابراہیم، آیت: ۳۷

اللہ نے حضرت ہاجرہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کو بارآور کیا، جیسا کہ حضرت ہاجرہ نے کہا تھا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو ضائع نہیں کیا بلکہ ان کا نام قیامت تک تابندہ کر دیا۔

زم زم:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جانے کے بعد حضرت ہاجرہ اپنے بچے کو دودھ پلاتی رہیں اور خود اس مشکیزے سے پانی پیتی رہیں جو اُن کے پاس تھا، مگر تپتے ہوئے صحرا میں یہ تھوڑا سا پانی کہاں تک ساتھ دیتا، جلد ہی ختم ہو گیا، ماں کا دودھ سوکھ گیا، ننھا بچہ بھوک اور پیاس سے بلبلانے لگا۔ حضرت ہاجرہ اس کی حالت کو دیکھ کر تڑپ اُٹھیں اور کسی مدد کی تلاش میں بار بار وادی کی دونوں پہاڑیوں صفا اور مروہ پر چڑھ کر نہایت بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ اِدھر بچے کا دم لبوں پر تھا۔ تب اچانک ایک آواز ابھری جیسے کوئی آ رہا ہو۔ حضرت ہاجرہ نے آنے والے کو دیکھنے سے پہلے ہی پکار کر کہا: ”مدد کرو، اگر تمہارے اندر کوئی خیر ہے۔“

اگلے ہی لمحے فرشتوں کے سردار حضرت جبریل علیہ السلام نمودار ہوئے۔ انہوں نے فوراً وادی کے ایک گوشے پر اپنا پَر مارا اور دیکھتے ہی دیکھتے بھوک اور پیاس سے ایڑیاں رگڑتے شیر خوار اسماعیل کے لیے زم زم کا وہ چشمہ جاری ہو گیا جس کے پانی کی مٹھاس، غذائیت، شفائی خواص اور غیر معمولی مقدار آج بھی ساری دنیا کو انگشت بدنداں کیے ہوئے ہے۔[1]

اس معجزے کے اثر اور زم زم کے اس چشمے کی برکت سے صحرا میں زندگی کے سوتے پھوٹ نکلے۔ یمن کا ایک خانہ بدوش قبیلہ بنو جُرہُم یہاں سے گزرا جو پانی اور چارے کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ قبیلے کے لوگوں نے دور سے فضا میں پرندوں کو اُڑتے دیکھا تو سمجھ گئے کہ قریبی علاقے میں پانی میسر ہے، تب ان کے تجربہ کار افراد حیران ہو کر کہنے لگے ”ہم پہلے بھی یہاں سے گزرتے رہے ہیں مگر کہیں پانی کا نام و نشان تک نہیں دیکھا۔“ وہ قریب پہنچے تو زم زم کا چشمہ اور اس کے پاس حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو دیکھا۔ کہنے لگے: ”ہمیں یہاں قیام کی اجازت دے دیں۔“ حضرت ہاجرہ نے اجازت دے دی۔ اس طرح بنو جُرہُم یہاں آباد ہو گئے۔ ان کا نسلی تعلق بنو قحطان سے تھا جنہیں ”عرب عاربہ“ کہا جاتا ہے۔ یہ اصل اور خالص عرب تھے، جن کا وطن یمن تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زبان سُریانی تھی مگر بنو جُرہُم میں پل بڑھ کر انہوں نے بھی عربی زبان سیکھ لی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے جو نسل چلی اسے ”عرب مُستَعرِبہ“ کہا جاتا ہے، یعنی یہ دوسری نسل کے ساتھ مخلوط عرب تھے۔[2]

بیٹے کی قربانی:

ابھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک امتحان باقی تھا جو پچھلے دونوں امتحانات سے زیادہ کڑا تھا؛ کیوں کہ اس بار اس میں خود بچے کی رضامندی کا شامل ہونا ضروری تھا۔ خواب میں اللہ کا حکم آیا ”اے ابراہیم! اپنے بیٹے کو قربان کر دو۔“ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت ہاجرہ اور کمسن اسماعیل تینوں امتحان کی بھٹی میں ڈال دیے گئے۔

[1] صحیح البخاری، ح: ۳۳۶۴، کتاب احادیث الأنبیاء
[2] الکامل فی التاریخ: ۱/۹۰

توفیق ازلی اُن کے شامل ہوئی اور تینوں نے اللہ کے حکم پر سر تسلیم خم کر دیا۔ شیطان نے اس موقع پر پوری کوشش کی کہ کسی طرح کائنات کے ان پاکیزہ ترین بندوں کے عزائم میں رخنہ ڈال دے۔ انہیں اللہ کی محبت سے ہٹا کر دنیا کی طرف مائل کر دے مگر ماں، باپ اور بیٹا تینوں اپنی اپنی جگہ اللہ کے شیدائی تھے۔ انہوں نے شیطان کو کنکریاں مار کر بھگا دیا۔ اور پھر آخر منیٰ کی وادی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کے لیے اُن کی گردن پر چھری چلا دی۔ تب اللہ کی طرف سے ندا آئی "ابراہیم! تم سچائی کے امتحان میں کامیاب رہے۔" دیکھا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ ایک دنبہ ذبح ہو چکا تھا۔[1]

وقت کی نبضیں تھم گئی تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے تین بڑے امتحانات پورے ہو چکے تھے۔ اب اس برگزیدہ نبی اور اس کے کنبے کو انعامات سے نوازنے کا مرحلہ آ گیا تھا۔

کعبۃ اللہ کی تعمیر:

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہ اعزاز دینے کا فیصلہ کر لیا تھا، جس کے حق دار کے لیے تاریخ کب سے چشم براہ تھی۔ یہ اعزاز اس گھر کی تعمیر کا تھا جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلا عبادت خانہ تھا۔ جب اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا تھا تبھی انہیں اس گھر کی تعمیر کا حکم دیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتوں کی رہنمائی میں بیت اللہ کی بنیاد رکھی تھی۔ انہوں نے اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اس کا طواف کیا تھا اور میدانِ عرفات جا کر حج کے دوسرے مناسک ادا کیے تھے۔ ان کے بعد ایک مدت تک یہ عبادت خانہ اللہ کی توحید کے زمزموں سے آباد رہا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں طوفان آیا تو بیت اللہ کی عمارت اُٹھا لی گئی، صرف بنیادیں باقی رہ گئیں۔[2] زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان بنیادوں پر بھی ریت کے تودے کھڑے ہو گئے اور کعبہ بالکل اوجھل ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بخشا کہ بیت اللہ کو ان کے اور ان کے بیٹے کے ہاتھوں ایک بار پھر اس طرح تعمیر کرایا کہ قیامت تک اس کی عظمت و توقیر کا شہرہ رہے۔ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی حدود سے آگاہ فرما دیا اور حکم دیا کہ اسے از سرِ نو تعمیر کریں۔ قرآنِ مجید میں ہے:

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرٰهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَالْقَآئِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۝

"اور جب کہ ہم نے آباد کیا ابراہیم علیہ السلام کے لیے اس گھر کی جگہ کو (خانہ کعبہ کے پاس) اور ہم نے انہیں یہ ہدایت دی کہ دیکھو تم میرے ساتھ شریک نہ کرنا کسی کو بھی، اور تم پاکیزہ رکھنا میرے گھر کو طواف کرنے والوں کیلئے اور قیام کرنے والوں کے لئے اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے۔"[3]

① تفسير ابن كثير، سورة الصافات، آيت: ۱۰۳ تا ۱۰۷

② الكامل في التاريخ: ۱/۵۰، ۵۱

③ سورة الحج، آيت: ۲۶

پس اب بیت اللہ دوبارہ توحید کی اشاعت اور اللہ کی خالص عبادت کا مرکز بننے والا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اس عظیم مقصد کے لیے ایک بار پھر فلسطین سے ہو کر مکہ معظمہ پہنچے۔ ان کے جواں سال بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام جو تیراندازی اور تیر سازی کے ماہر تھے، اس وقت زم زم کے چشمے کے پاس بیٹھے تیر بنا رہے تھے۔ باپ کو آتے دیکھا تو محبت اور گرم جوشی سے اُن کا استقبال کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آمد کا مقصد بتاتے ہوئے کہا: ''بیٹا! اللہ نے مجھے ایک خاص کام کا حکم دیا ہے۔''

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عرض کیا ''اللہ نے جو حکم دیا ہے آپ کر گزریے۔''

فرمایا ''اس میں تم میری مدد کرو گے؟'' عرض کیا ''جی ہاں! میں آپ کی مدد کروں گا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سامنے ایک ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''اللہ کا حکم ہے کہ میں یہاں اُس کا ایک گھر تعمیر کروں۔'' اب باپ اور بیٹے نے مل کر اللہ کی بتائی ہوئی حدود اور پیمائش کے مطابق مکان کی بنیادیں اٹھائیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر لا لا کر دیتے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بنیاد کی چنائی کرتے جاتے۔ جب بنیاد کچھ بلند ہو گئی تو ایک کونے میں حجر اسود نصب کر دیا گیا۔ باپ اور بیٹے دونوں کو یقین تھا کہ وہ ایسے مرکز کی بنیاد رکھ رہے ہیں جہاں سے اللہ وحدہ لاشریک کی توحید کا پیغام ساری دنیا میں عام ہوگا، جو ٹوٹے ہوئے دلوں، باہم متنفر گروہوں، بھٹکے ہوئے لوگوں اور بکھری ہوئی قوموں کو ایک نقطۂ توحید پر جمع کرے گا، جو سینکڑوں ملتوں اور ہزاروں فرقوں کو مجتمع کر کے ''اُمّتِ واحدہ'' کا مقام عطا کرے گا۔

مقصد کی اس بلندی کے پیش نظر باپ اور بیٹا دونوں کعبے کے گرد گھومتے اور اللہ کی بارگاہ میں یہ دعا کرتے تھے:

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّکَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○

(اے ہمارے رب ہم سے قبول فرما! بے شک تو خوب سننے والا جاننے والا ہے۔)[1]

جب تعمیر کعبہ مکمل ہو گئی تو انسانی تاریخ کے ان دو عظیم پیغمبروں نے یہ دعا کی جو اپنے ضمن میں دنیا کے آخری رسول اور آخری اُمّت کے ساتھ خاص نسبت عطا ہونے کی التجا لیے ہوئے تھی:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِکَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّکَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○

(اے ہمارے پروردگار! بھیج ان میں ایک رسول جو انہی میں سے ہو، جو تلاوت کرے ان کے سامنے تیری آیتیں اور انہیں تعلیم دے کتاب و حکمت کی اور انہیں پاکیزہ کرے، بے شک تو زبردست ہے، حکمت والا۔)[2]

دعا قبول ہوئی۔ آخری نبی کا اولادِ اسماعیل سے ہونا طے ہو گیا، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ ہو گیا کہ نسل اسماعیل

---

[1] سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۲۷؛ صحیح البخاری، ح: ۳۳۶۵، کتاب احادیث الأنبیاء

[2] سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۲۹

میں وہی ایک نبی آئے گا جو ایک ہو کر بھی سب سے فائق ہوگا۔ جس کے ہاتھ پر دنیا کی تاریخ کے سب سے بڑے انقلاب کا ظہور ہوگا۔

حضرت اسحاق و یعقوب علیہما السلام:

شام میں سکونت پذیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری بیوی حضرت سارہ سے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ عراق، شام اور مصر کے وسیع وعریض ممالک میں انسانیت کی اصلاح کا کام ان کی اولاد کے سپرد کیا۔ ان میں بڑے بڑے جلیل القدر رسول پیدا ہوئے۔ حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت یوشع، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت عزیر، حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم السلام۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد کے تمام پیغمبر و انبیائے کرام بنی اسرائیل کہلاتے تھے؛ کیوں کہ ان کی بعثت حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی نسل سے پیدا ہونے والے قبائل میں ہوتی رہی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام ''اسرائیل'' (اللہ کا بندہ) تھا، اس لیے ان کی اولاد کے نبی ''انبیائے بنی اسرائیل'' کہلائے۔

حضرت لوط علیہ السلام:

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ابتدا ہی میں ایمان لانے والوں میں اُن کے بھتیجے لوط پیش پیش تھے۔ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہی ہجرت کی تھی اور اُردن میں قوم سدوم کے علاقے میں آباد ہوئے تھے۔ [①]

اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی نبوت سے سرفراز کیا اور اس بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کا کام ان کے ذمے لگایا جو جنسی تسکین کے غیر فطری طریقوں کی عادی ہو چکی تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام مدتِ دراز تک اُن کو سمجھاتے رہے، مگر یہ بے حیا لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عبرتناک عذاب نازل ہوا۔ قوم سدوم کی بستیاں الٹ دی گئیں، آسمان سے ان پر پتھروں کی بارش ہوئی۔ حضرت لوط علیہ السلام اور چند اہل ایمان کے سوا جو اللہ کے حکم کے مطابق عذاب آنے سے پہلے بستی سے نکل گئے تھے، کوئی ذی روح زندہ نہ بچا۔ [②]

قوم سدوم کی بستیاں اس طرح بے نام و نشان ہوئیں کہ آج بھی وہاں ایک نہایت کڑوے سمندر کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا جسے ''بحیرہ مردار'' (Dead sea) کہا جاتا ہے۔ اس سمندر میں کوئی جانور پیدا ہوا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے اسحٰق علیہ السلام شام میں اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پوری کوشش رہی کہ ان کی اولاد ملت ابراہیمی پر قائم رہے اور یہ سلسلۂ رُشد و ہدایت تاقیامت انسانیت کو فیض یاب کرتا رہے۔ ان کی اولاد میں سے اسرائیل اور عیص بہت نامور ہوئے۔ عیص کی اولاد میں سے حضرت ایوب کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے نوازا۔ وہ بڑے مالدار تھے، باغ، مویشی، حویلی سب کچھ ان کے پاس تھا۔

① الکامل فی التاریخ: ۱/۱۰۵ تا ۱۰۹ ② سورۂ ہود، آیت: ۷۰ تا ۸۳؛ المختصر فی اخبار البشر: ۱/۱۵

حضرت ایوب علیہ السلام ایک مدت تک چین و اطمینان سے زندگی بسر کرتے رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں پے در پے آزمائشوں میں ڈالا۔ وہ ایک اذیت ناک مرض میں مبتلا ہو کر بالکل لاچار ہو گئے۔ اہل و عیال بھی حوادث کا شکار ہوئے۔ کوئی پُرسانِ حال نہ رہا مگر ان کی بیوی نہایت وفا شعاری سے خدمت کرتی رہیں۔ آخر کار اللہ نے فضل فرمایا اور ۱۸ سال کی بیماری کے بعد وہ شفایاب ہو گئے۔ اُن کی زندگی راحت میں شکر اور مصیبت میں صبر کی بہترین مثال رہی ہے۔[1]

حضرت یوسف علیہ السلام:

حضرت اسحٰق علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت یعقوب کو بھی اللہ نے نبوت سے نوازا اور ان کی نسل سے جلیل القدر پیغمبروں کا ایک سلسلہ جاری فرمایا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، جن میں سے حضرت یوسف سب سے چہیتے اور باصلاحیت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے مثال حسن بھی عطا فرمایا تھا۔ دوسرے بھائیوں نے حسد کی وجہ سے انہیں قتل کر دینا چاہا اور ایک کنویں میں پھینک دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت فرمائی۔ قریب سے گزرنے والے ایک قافلے نے انہیں کنویں سے نکال لیا اور مصر کے بازار میں غلام بنا کر فروخت کر دیا۔ مصر کے وزیر نے جسے ''عزیز'' کہا جاتا تھا، انہیں خرید کر گھر کا منتظم بنا دیا۔ عزیز کی بیوی ان پر فریفتہ ہوئی اور انہیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام اس کے جال میں نہ آئے تو اس نے ساز باز کر کے انہیں جیل جانے پر مجبور کر دیا، جہاں چودہ سال گزارنے کے بعد آخر وہ اس وقت رہا ہوئے جب بادشاہِ مصر ریّان بن ولید ایک عجیب خواب کی تعبیر جاننے سے عاجز آ گیا۔ یہ تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام نے بتائی اور بادشاہ نے ان کے علم سے متاثر ہو کر انہیں نہ صرف رہا کرنے کا حکم دیا بلکہ اپنا وزیر خزانہ بنا دیا۔ اقتدار ملنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں اور والد کو بھی اپنے پاس مصر بلا لیا۔[2] حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال ایک سو دس سال کی عمر میں ہوا۔ اس کے چونسٹھ سال بعد بنی اسرائیل کے سب سے بڑے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔[3]

مصر اور فراعنہ مصر:

مصری تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کا پوتا بیصر بن حام طوفانِ نوح کے بعد اپنے کنبے کے تیس افراد کے ساتھ وادیٔ نیل میں اترا اور موجودہ قاہرہ سے بارہ میل (۱۹ کلومیٹر) دور ''منف'' کو آباد کیا۔ بیصر کے بیٹے ''مِصر'' نے طویل عمر پائی اور قبیلے کو منظم کیا۔ اس کے کارناموں کی وجہ سے یہ علاقہ اس کے نام سے موسوم ہو گیا۔ مصر میں آباد ہونے والے زیادہ تر لوگ غیر ملکی تھے، ان میں قبطی بھی تھے، عمالقہ بھی اور یونانی بھی۔ مگر قبطی اکثریت میں تھے۔

---

① البدایة والنهایة: ۱/۲۲۵ تا ۲۲۹
② الکامل فی التاریخ: ۱/۱۲۳ تا ۱۳۷
③ المختصر فی اخبار البشر: ۱/۱۷، ۱۸

یہ علاقہ پردیسیوں کے لیے عمدہ جائے پناہ ثابت ہوتا رہا۔ مستقل امن اور وادیٔ نیل کی زراعت نے خوشحالی کو جنم دیا، اہلِ مصر فنِ کیمیاء، تعمیرات اور دوسری صنعتوں میں ماہر ہوگئے۔ عقیدے کے لحاظ سے یہ بے راہ روی کا شکار تھے اور سورج کی پرستش کرتے تھے۔ شیطانی علوم بہت ان میں مروّج ہو گئے تھے۔ مصر کا جادو دنیا بھر میں مشہور تھا۔

مصر کی حکومت اولادِ مصر میں منتقل ہوتی رہی۔ ان میں سِنان بن عِلوان (طولیس) وہ حکمران تھا جس کے دور میں حضرت ابراہیم علیہ السلام مصر آئے تھے اور یہاں ہاغار (ہاجر) ان کی زوجیت میں آئیں۔

سِنان کے بعد اس خاندان کا زوال شروع ہوگیا۔ یکے بعد دیگرے دو عورتیں برسرِ اقتدار آئیں، جن کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر شام کے عمالِقہ نے مصر پر قبضہ کرلیا۔

مصر میں عمالِقہ کا پہلا بادشاہ ولید بن دومغ تھا، جو گائے کا پجاری تھا۔ اس نے سب سے پہلے ''فرعون'' کا لقب اختیار کیا۔ بعد میں نہ صرف مصر کے ہر آنے والے بادشاہ کو فرعون کہا جانے لگا بلکہ بعض مؤرخین سابقہ شاہانِ مصر کو بھی فرعون کہہ کر یاد کرنے لگے، حالانکہ انہوں نے یہ لقب اختیار نہیں کیا تھا۔ ولید کے بیٹے رَیّان کے زمانے میں مصر کی سرزمین کو حضرت یوسف علیہ السلام جیسا وزیر نصیب ہوا۔[1] غالباً مصر کے یہ فرعون مؤمن نہ ہونے کے باوجود خدائی کے دعویدار نہ تھے اور عوام کے حق میں یہ سب ظالم و جابر نہ تھے ورنہ حضرت یوسف علیہ السلام ان کی ملازمت اختیار نہ کرتے۔

رَیّان کے بیٹے داروم کے دورِ حکومت میں حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال ہوگیا۔ مصر کے مقامی لوگوں نے اس عظیم پیغمبر سے اقتصادی بحران سے نجات اور معاشی ترقی کا تو فائدہ حاصل کیا مگر ان کی روحانی تعلیمات کی طرف کوئی توجہ نہ دی بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے انتقال پر انہوں نے یہ سمجھ کر کہ ایمانی فیض کا یہ چشمہ بند ہوگیا ہے، کہا:

''ان کے بعد اللہ کوئی اور پیغمبر نہیں بھیجے گا۔''[2]

اس کے ساتھ ساتھ اہلِ مصر کو دنیوی معیشت و تعمیرات میں مزید انہماک ہوگیا اور وہ راہِ خدا سے بہت دور چلے گئے۔

ولید بن مُصعَب، خدائی کا دعوے دار پہلا فرعونِ مصر:

بداعمالیوں اور بدعقیدگی کے نتیجے میں مصر سیاسی بحران کا شکار ہوگیا۔ قِبطیوں کے ایک فرد ولید بن مُصعَب نے جو سرکاری پولیس افسر تھا، عمالِقہ کی حکومت کا چراغ گل کردیا۔ مصر میں قِبطی چونکہ اکثریت میں ہو چکے تھے اس لیے وہ ولید بن مُصعَب کی قیادت پر بڑے خوش ہوئے۔ وہ جانتے نہیں تھے کہ یہ شخص اُن کی مکمل تباہی کا سبب بنے گا۔ بادشاہت قِبطیوں میں منتقل ہونے سے بظاہر مصر کو استحکام حاصل ہوا۔ ولید بن مُصعَب مصر کا سب سے زور آور فرعون بن گیا۔ اس نے تعمیراتی کام کرائے، فوج کو بے حد مضبوط کیا اور آخر میں اپنی طاقت اور عوامی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے خدائی کا دعویٰ کردیا۔[3]

اِدھر حضرت یوسف علیہ السلام اور اُن کے بھائیوں کی اولاد بڑھتے بڑھتے بارہ قبیلوں میں تبدیل ہوگئی تھی، جنہیں ''بنی اسرائیل'' کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔ یہ لوگ یعقوب علیہ السلام کے دین پر قائم اور مصر کی مشرکانہ تہذیب وثقافت سے

① المختصر فی اخبار البشر: ۹۸،۵۸،۵۷/۱ ② سورۃ المؤمن، آیت: ۳۴ ③ المختصر فی اخبار البشر: ۵۷/۱

محفوظ تھے۔ اگرچہ سابقہ فرعون بھی انہیں صحیح عقیدے سے ہٹانے کے لیے طرح طرح سے ستاتے تھے اور انہیں مملکت میں دوسرے درجے کے شہریوں کی حیثیت دیتے ہوئے ان سے جبراً محنت مزدوری کراتے، مگر جب ولید بن مُصعب نے سرکشی اور تکبر کی انتہا کرتے ہوئے خدائی کا دعویٰ کیا اور قوم پر اپنے تسلط کو بڑھا دیا تو بنی اسرائیل بالکل غلاموں کی حیثیت اختیار کر گئے۔[1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام:

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے نجات دلانے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا۔ وہ بنی اسرائیل کے ایک گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، ان کی ولادت سے قبل فرعون نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر نجومیوں نے یہ دی کہ بنی اسرائیل کی نسل کا ایک بچہ فرعونی سلطنت کو ختم کر دے گا۔ فرعون نے اس بچے کے خاتمے کے لیے بہت انتظامات کیے اور بنی اسرائیل میں ان گنت نومولود بچوں کو قتل کرتا چلا گیا مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت کا عجیب انتظام کیا، ان کی والدہ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ انہیں صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں ڈال دیں۔ یہ صندوق بہتے بہتے دریائے نیل کی اس نہر میں چلا گیا جو فرعون کے محل میں جاتی تھی۔ فرعون کی بیوی آسیہ نے صندوق کھولا اور اس بچے کو گود لے لیا۔ اس طرح فرعونی سلطنت کے خاتمے کی علامت بن کر آنے والا یہ عظیم پیغمبر فرعون ہی کے محل میں پلا بڑھا۔ جوانی کے ایام میں ان سے ایک مقامی شخص کا نادانستہ قتل ہو گیا جس کی بناء پر انہیں ملک چھوڑ کر مدین جانا پڑا، وہاں حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت اور تربیت میں رہے اور آخر ان کے داماد بنے۔ آخر وہ وقت آیا جب اللہ تعالیٰ نے انہیں کوہ طور پر ہم کلامی کا شرف بخشا اور نبوت عطا کر کے فرعون کے ہاں جانے کا حکم دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے فرمان کے مطابق فرعون کے دربار میں توحید کا پیغام سنایا اور مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کیا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو کھلے معجزات بھی دکھائے مگر وہ اپنی ضد اور عناد پر ڈٹا رہا۔ آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے شام کی طرف روانہ ہوئے۔ مصر اور وادیٔ سینا کے درمیان واقع بحیرۂ قلزم کی چند میل چوڑی پٹی سے موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے ساتھ ایک معجزے کے طور پر سمندر کو عبور کیا۔ فرعون ان کا تعاقب کرتے ہوئے اسی سمندر میں غرق ہو گیا۔

فرعون سے نجات پاتے ہی بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانیاں شروع کر دیں۔ چونکہ وہ مجسمہ سازی اور نقاشی کے دلدادہ قبطیوں کے ساتھ صدیوں سے رہتے بستے آئے تھے، قبطیوں کے رہن سہن نے ان کی طبیعت میں ظاہر پرستی اور مادی رجحان کو اس حد تک بڑھا دیا تھا کہ وہ بار بار کسی ایسے خدا کو تلاش کرتے تھے جو نظر آ سکے۔

بحیرۂ قلزم کے پار آ کر انہوں نے ایک قوم کو دیکھا جو بتوں کو پوجتی تھی، فوراً موسیٰ علیہ السلام سے تقاضا کیا کہ ہمارے لیے بھی ایک ایسا خُدا بنا دیں، جو نظر آئے، ہم اُس کے سامنے سر جھکائیں۔

[1] المختصر فی اخبار البشر: ۱/۵۷ ، تفسیر ابن کثیر، سورۃ البقرۃ، آیت: ۴۹

موسیٰ علیہ السلام نے غضبناک ہوکر فرمایا: ''تم بہت جاہل لوگ ہو۔''①

موسیٰ علیہ السلام تورات لینے کوہِ طور پر گئے تو ان کی عدم موجودگی میں ان کی قوم کے ایک عیار شخص سامری نے بنی اسرائیل کو بچھڑے کے طلائی مجسمے کی عبادت کی طرف راغب کرنا شروع کیا۔ ظاہر پرستی کے مارے ہزاروں بنی اسرائیلی اس فریب میں آکر مرتد ہوگئے اور پھر اس جرم کی پاداش میں قتل ہوئے۔

جب موسیٰ علیہ السلام تورات لے کر آئے تو بنی اسرائیل کے عمائد نے ایک بار پھر شک کیا کہ اَن دیکھے خدا کے نوشتے پر کیوں کر ایمان لائیں۔ چنانچہ ایک بار پھر مطالبہ کیا کہ ہمیں اللہ کی کھلم کھلا زیارت کرائی جائے۔ اس پر آسمانی بجلی کڑکی اور وہ ہلاک ہوگئے۔ موسیٰ علیہ السلام کی بے تابانہ دعا پر اللہ نے انہیں دوبارہ زندہ کیا مگر بنی اسرائیل کی حالت نہ سُدھری۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بقیہ زندگی بنی اسرائیل کی نظریاتی واخلاقی تربیت میں گزری۔ اس کام میں ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام ان کے معاون تھے۔ دونوں کو قوم کی طرف سے بار بار ناقدری اور کج فہمی کا سامنا کرنا پڑا۔ بنی اسرائیل نے تورات کے بہت سے احکام کو سخت تصور کر کے ان کا انکار بھی کیا۔ ایسی حرکات کی وجہ سے بنی اسرائیل کو کئی بار آسمانی تنبیہات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔②

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو ان کے آبائی وطن فلسطین لے جا کر آباد کرنا چاہتے تھے، مگر وہاں ایک مشرک قوم عمالِقہ قابض ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان مشرکوں سے جہاد کا حکم دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ حکم سنایا تو بنی اسرائیلی بولے ''آپ اور آپ کا خدا جا کر جہاد کریں، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔''③

اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مدتِ دراز تک وطن کی نعمت سے محروم رکھا اور وہ مصر اور شام کے درمیان ''تیہ'' کے بیابانوں کی خاک چھانتے رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی اصلاح میں مسلسل مصروف رہے۔ ابھی قوم کی تربیت کا کام باقی تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وفات پاگئے۔④

انبیائے بنی اسرائیل: عہدِ قُضاۃ، عہدِ ملوک:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام نے نسل نو کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ بنی اسرائیلی اپنی ماضی کی کوتاہیوں کی تلافی کرنے کے لیے ان کے پرچم تلے جمع ہوئے اور قوم عمالِقہ سے جہاد کر کے ان کا مرکزی شہر ''اَریحا'' فتح کر لیا۔ عمالِقہ شکست کھا کر بکھر گئے۔ ان کے بہت سے افراد افریقہ میں جا بسے اور ''بربر'' کہلائے۔⑤

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی وفات کے بعد چار سو برس تک بنی اسرائیل کی سیاست ان کے علماء کے ہاتھوں میں رہی۔ یہ دور ''عہدِ قضاۃ'' کہلاتا ہے۔ اس کے بعد کی تاریخ کا دور ''عہدِ ملوک'' کہلاتا ہے جس میں حضرت شَمْوِیل، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام جیسے برگزیدہ پیغمبر ان کے بادشاہ بنے۔ طالوت کی قیادت میں بنی اسرائیل

---

① سورۃ الاعراف، آیت: ۱۰۳ تا ۱۳۸ مع تفسیر ابن کثیر ② تفسیر ابن کثیر سورۃ البقرۃ، آیت: ۴۹ تا ۶۰ ③ سورۃ المائدۃ، آیت: ۲۴
④ سورۃ طٰہٰ، سورۃ القصص، سورۃ الشعراء ؛ الکامل فی التاریخ: ۱/۱۶۹ تا ۱۷۲ ⑤ الکامل فی التاریخ: ۱/۱۷۴ تا ۱۷۶

نے جالوت جیسے دشمن کو شکست دے کر دریائے اُردن کے پار کا علاقہ بھی فتح کر لیا۔

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا دورِ حکومت بنی اسرائیل کی تاریخ کا سنہرا دور تھا جس میں اسرائیلی دنیا کی سب سے طاقتور قوم شمار ہوتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت جنات، پرندوں اور ہوا پر بھی تھی۔ تختِ سلیمانی جس پر حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے درباریوں سمیت تشریف فرما ہوا کرتے تھے، آن کی آن میں سینکڑوں میل طے کر جاتا تھا۔ آخری عمر میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس میں ایک عبادت گاہ کی تعمیر شروع کرائی جس میں جنات بھی مزدوروں کے طور پر کام کر رہے تھے، اس تعمیر کے دوران حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہو گیا۔[1]

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل ایک بار پھر نظریاتی و اخلاقی کج روی کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے زبور کے مندرجات میں تحریف کر دی۔ ان کے بدطینت افراد شیطانی علوم، جادو اور کہانت کو بڑے فخر سے سیکھنے لگے اور یہ دعوے کرنے لگے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی جادو کے ذریعے جنات کو قابو کر رکھا تھا۔ (نعوذ باللہ)[2]

عقائد و نظریات میں آمیزش نے قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ان کی نظریاتی یکجائی کے خاتمے کے ساتھ ہی سیاسی وحدت بھی بکھر کر رہ گئی۔

شاہانِ عجم:

اس دوران مشرق میں عجم کے بادشاہوں نے بے پناہ شان و شوکت حاصل کر لی تھی اور ایرانیوں کی حکومت بہت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ عجم کے بادشاہوں کو چار طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے:

پہلا طبقہ "فِیشْدَادِیَّہ" کہلاتا ہے، ان کے ہر بادشاہ کا لقب "فِیشْدَاذ" تھا جس کا معنیٰ 'عادِل' ہے۔ ان میں سب سے پہلا بادشاہ "اُوشَھَنج" تھا۔ بقیہ بادشاہوں میں سے طَھْمُورُث، جَمْشِید، بِیُوَراسپ (ضحاک) اَفرِیدُون، مُنُوچِہر اور اَفراسِیاب مشہور ہیں۔ مُنُوچِہر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاصر تھا۔

دوسرا طبقہ "کَیانی" کہلاتا ہے، ان میں سے ہر بادشاہ کے نام کے شروع میں "کَے" آتا ہے، جس کا مطلب ہے "مقدّس"۔ کیانیوں میں کَے قُباذ (کیقباد)، کَے کاؤس، کَے خسرو، لُہراسِپ اور دارا بڑے نامور تھے۔ کیقباد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔ دارا وہ ہے جو سکندرِ اعظم سے شکست کھا کر قتل ہوا۔

تیسرا طبقہ "ملوک الطّوائف" کہلاتا ہے۔ یہ درجنوں بادشاہ تھے جو کیانی سلطنت کے خاتمے کے بعد یونانیوں کے ماتحت چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر حکومت کرتے رہے۔ ملوک الطوائف کا سب سے نامور خاندان اشغانی تھا، اس کا بانی "اَشغاء" (اَشک) تھا جس نے سکندرِ اعظم کے دو سو چھیالیس سال بعد تخت سنبھالا۔ دوسرا اَشغانی بادشاہ شاپُور تھا جس کی حکومت کا خاتمہ سکندرِ اعظم کے ۳۱۶ برس کے بعد ہوا تھا اور اس کے کچھ عرصے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تھی۔ اَشغانیوں نے تقریباً تین سو سال تک حکومت کی۔ آخر کار ساسانی جنگجو سردار اَرْدَ شِیر بن بابَک

[1] الکامل فی التاریخ: ۱/ ۲۰۰ تا ۲۱۰
[2] سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۰۲

نے ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

یہاں سے چوتھے طبقے ''ساسانی'' کا دور شروع ہوا جس کا ہر بادشاہ خُسرو (کسریٰ) کہلاتا تھا۔ ساسانیوں کا پہلا حکمران اَرْدَشیر بن بابک اور آخری یَزْدَگِرْد تھا جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں تاج و تخت سے محروم ہوا۔[1]

بنی اسرائیل کا دورِ زوال اور جلا وطنی:

ہم بنی اسرائیل کے اُس دور پر نگاہ ڈالتے ہیں جب عقائد کے اختلاف کی وجہ سے نہ صرف ان میں مستقل فرقے بن گئے بلکہ وہ دو مستقل حکومتوں میں تقسیم ہو گئے: ایک فرقہ بیت المقدس کو قبلہ مانتا تھا، اس نے فلسطین کے جنوب میں ''یہودا'' کے نام سے حکومت بنالی۔ دوسرا فرقہ ''کوہِ سامرا'' کو قبلہ کہتا تھا۔ اس نے فلسطین کے شمال میں ''اسرائیل'' کے نام سے الگ ریاست قائم کر لی۔ یہ زمانہ جسے ''عہدِ انقسام'' کہا جاتا ہے، بنی اسرائیل کے لیے اغیار کی غلامی کی تمہید تھا۔ اس دور میں حضرت اِرْمیا علیہ السلام بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے متحرک رہے اور انہیں آنے والی تباہی سے خبردار کرتے رہے، مگر یہ لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر ان کے انتشار سے موقع پا کر فارس کے بادشاہ ''لُہْرَاسپ'' کے نائب بُخْتُ نَصَّر نے جو عراق کا حاکم تھا، شام کی طرف پیش قدمی کر دی۔ جزیرۃ العرب کی سرحدوں سے گزرتے ہوئے بُخْتُ نَصَّر کو عرب قبائل کے سرداروں کا تعاون حاصل رہا جن میں قریش کے جدامجد مَعَدّ بن عدنان بھی شامل تھے۔ بُخْتُ نَصَّر نے فلسطین پر حملہ آور ہو کر بیت المقدس کو اُجاڑ دیا، تورات کے نسخے جلا دیے، معبد سلیمانی کو مسمار کر دیا، ہزاروں بنی اسرائیلیوں کو قتل کر دیا اور ستر ہزار کے لگ بھگ کو گرفتار کر کے بابل لے گیا، عرب قبائل کے تعاون کے صلے میں اُس نے کئی قبائل کو عراق کی سرحدوں میں لا بسایا۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے نوسو ننانوے سال بعد کا واقعہ ہے۔[2] جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا زمانہ ابھی پانچ سو پچاسی سال دور تھا۔

ستر برس تک بیت المقدس ویران رہا۔ آخر فارس میں جب بَہْمَن (کورش) نے حکومت سنبھالی تو اس نے جلاوطن بنی اسرائیلیوں کو فلسطین واپس جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے بیت المقدس کو بھی از سرِ نو تعمیر کرا دیا۔ بابل سے واپس آنے والے لوگوں میں حضرت عُزَیر علیہ السلام بھی تھے، جنھوں نے اپنے حافظے کی مدد سے تورات کو دوبارہ لکھوا دیا۔ اس طرح یہودیوں کو ایک مدت بعد شریعت کا مأخذ دوبارہ میسر آیا۔

یہودی طویل مدت تک فارس کے بادشاہوں کے ماتحتی میں زندگی بسر کرتے رہے یہاں تک کہ یونانی فاتح سکندرِ اعظم نے ایشیا کا رخ کیا اور بُخْتُ نَصَّر کے حملے کے چار سو پینتیس سال بعد شام، عراق اور ایران پر قابض ہو کر کَیانی سلطنت کا خاتمہ کیا۔

اس طرح یہودی یونانی بادشاہوں کے نائبین کی غلامی میں چلے گئے جن کو فلسطین میں ''ہیرودوس'' کہا جاتا تھا۔ اس پستی اور ذلت کے دور میں بھی بنی اسرائیل میں انبیاء کرام کا سلسلہ جاری تھا مگر ان کی کوششیں بار آور نہیں

[1] المختصر فی اخبار البشر: ۱/ ۴۷ تا ۵۶
[2] المختصر فی اخبار البشر: ۱/ ۳۱، ۳۲

ہورہی تھیں۔علمائے یہود نے تورات کو اپنی خواہشات کے مطابق مُحَرَّف کر کے انبیاء کی اصلاحی وتجدیدی کوششوں کی سختی سے مخالفت شروع کردی تھی، اس کے علاوہ ان انبیائے کرام کو یورپی حکام کی روک ٹوک اور سختیوں کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے چونسٹھ سال قبل رومی حاکم پومپئی نے یونانیوں کو شکست دے کر فلسطین پر قبضہ کرلیا۔اس طرح یہودی یونانیوں سے رومیوں کی غلامی میں آگئے۔رومیوں کے دور میں حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام جیسے مشفق پیغمبروں نے قوم کی اصلاح کے لیے تمام توانائیاں صرف کردیں مگر حضرت زکریا علیہ السلام کو یہودیوں نے جھوٹی تہمتیں لگا کر آرے سے چیر ڈالا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کو رومی حاکم ہیرڈوس نے اس وجہ سے قتل کردیا کہ وہ اپنی بھتیجی سے نکاح کرنا چاہتا تھا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اسے اس گناہ سے منع کیا تھا۔[1]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کے چھ ماہ بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے۔اللہ تعالیٰ نے انہیں کنواری حضرت مریم سے بغیر باپ کے پیدا کیا۔انہیں تیس سال کی عمر میں نبوت ملی۔وہ فلسطین کے شہروں میں گھوم پھر کر بنی اسرائیل کو دین کی دعوت دینے لگے۔اللہ نے انہیں ''انجیل'' عطا کی تھی جو حکمت ونصائح سے بھرپور آسمانی کتاب تھی مگر یہود کی اکثریت نے نہ صرف یہ کہ انجیل کا انکار کردیا بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی جادوگر قرار دیا اور مقامی رومی حاکم کے ساتھ مل کر بنی اسرائیل کے اس آخری نبی کو قتل کرنے کی سازش تیار کرلی۔اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عین وقت پر اُن کے نرغے سے بچا کر آسمان پر اٹھالیا اور یہودیوں نے اپنے مخبر ''یہوذا'' کو، جس کی شکل اللہ کے حکم سے اسی وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ کردی گئی تھی، گرفتار کرلیا۔عدالت میں باقاعدہ مقدمہ چلا کر اس شخص کو سولی دے دی گئی۔[2]

یہود تب سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کردیا ہے، حالانکہ قرآنِ مجید واضح طور پر اعلان کرتا ہے: ''نہ انہوں نے عیسیٰ کو قتل کیا، نہ ہی سولی دی۔''[3]

یہود کی یثرب آمد:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد یہود کی سرکشی اور ڈھٹائی میں مزید اضافہ ہوگیا۔وہ دوسری اقوام کے تسلط سے نکلنے اور انہیں زیر کرنے کے لیے طرح طرح کی سازشوں میں مصروف ہوگئے۔ان کی حرکات سے تنگ آکر ۷۰ عیسوی میں رومی حاکم طیطوس (Titus) نے ان کا قتل عام کیا اور معبدِ سلیمانی کو منہدم کرادیا۔۵۱۳ عیسوی میں ایک اور حکمران اڈریان نے مزید ستم ڈھائے اور انہیں بیت المقدس سے نکال دیا۔یہود منتشر ہوکر مختلف خطوں میں جابسے۔ان میں سے کچھ جزیرۃ العرب آکر حجاز کے شہر ''یثرب'' میں آباد ہوگئے۔

---

① المختصر فی اخبار البشر: ۱/ ۳۳، ۳۴

② الکامل فی التاریخ: ۱/ ۲۷۴ تا ۲۸۶ ③ سورۃ المائدۃ، آیت: ۱۵۷

عیسائیت میں نقب:

اس دوران حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زیادہ تر پیروکار جو پہلے ہی مٹھی بھر تھے، دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ جو باقی رہ گئے تھے، وہ رومی حکام کی داروگیر کی وجہ سے دینِ عیسوی کی زیادہ اشاعت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے بہت سے معتقدین اپنے مذہب کو چھپا کر جنگلوں میں بس گئے تھے اور راہب کہلانے لگے تھے، تاہم ایک شخص تھا جو دینِ عیسوی کی بھرپور تبلیغ کرتا رہا۔ اس کا اصل نام ساؤل تھا مگر وہ پولس کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ کٹر یہودی تھا۔ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ان کی بھرپور مخالفت کی تھی، مگر ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کے کچھ عرصے بعد وہ ان پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے مسیحی مذہب کے ایسے اصول وقواعد وضع کیے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے بالکل جدا تھے۔ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت جبریل علیہ السلام اور خدا پر مشتمل تین خداؤں کا نظریہ پیش کیا، خدا کو باپ اور عیسیٰ کو بیٹا قرار دیا۔ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سُولی چڑھنے کا عقیدہ پھیلایا جیسا کہ یہود کا خیال تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصل ساتھی اس پر یقین نہیں کرتے تھے کیوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی نگاہوں کے سامنے آسمان پر اٹھایا گیا تھا، مگر پولس نے نہ صرف یہ عقیدہ مشہور کیا بلکہ اس بات کا بھی پرچار کیا کہ خدا کا بیٹا سولی چڑھ کر اپنے ماننے والوں کے سابقہ گناہوں کا کفارہ ادا کر گیا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کے سچے حواریوں نے پولس کے نظریات کی سخت مخالفت کی۔ اس طرح عیسائیوں میں کئی فرقے بن گئے۔ پولس کے مذہب کو سب سے زیادہ شہرت ملی۔ اس نے خود یورپ جا کر اپنے عقائد کی تبلیغ کی۔ اس کے نظریات چونکہ رومی اور یونانی دیومالائی تصورات کے قریب تر تھے، اس لیے لوگ خفیہ طور پر اس کا مذہب قبول کرتے چلے گئے۔ پولس کے بعد اس کے مریدوں نے تبلیغ کا کام جاری رکھا اور یوں رفتہ رفتہ اصل دین عیسوی کی جگہ پولس کے نظریات نے لے لی۔ یہ دین ''عیسائیت'' کے نام سے شام، مصر، ایشیائے کوچک، قُسطَنطِینیّہ اور روم میں پھیل گیا۔

چوتھی صدی عیسوی کے آغاز میں اس بدلی ہوئی مسیحیت کو روم کے بادشاہ قُسطَنطِین بن قُسطَنس کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ یہ بادشاہ بوڑھا ہو گیا تھا اور عمائد سلطنت اس سے بے زار ہو کر متبادل حکمران لانے کی تیاریاں کرنے لگے تھے۔ بادشاہ نے سیاسی چال چلتے ہوئے عیسائی مذہب قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح وہ لاکھوں لوگ جو خفیہ طور پر عیسائی بن چکے تھے، اس کی حمایت میں کھڑے ہو گئے جن کو ساتھ لے کر اس نے اپنے سیاسی مخالفین کا جو قدیم یونانی دیومالائی مذہب پر قائم تھے، مقابلہ کیا اور انہیں شکست دے کر اپنے نئے مذہب کا پلہ بھاری کر دیا۔[1]

۳۲۵ء میں ''نِیقِیہ'' (موجودہ ترکی کے ایک شہر) میں اس نئے مذہب کے علماء کی کانفرنس ہوئی، جس میں تثلیث، عقیدۂ کفارہ اور خدا کے باپ اور عیسیٰ کے بیٹے ہونے کے عقائد کو عیسائیت کا لازمی اصول مان لیا گیا، اس طرح انجیل کے ان تحریف شدہ نسخوں کو آسمانی نوشتہ قرار دے دیا گیا جس کے اصل ہونے کی کوئی سند موجود نہیں تھی۔

① الكامل في التاريخ: ۲۹۸/۱، ۲۹۹

اس طرح عیسائیت اللہ کی توحید سے ہٹ کر مشرکانہ عقائد کا مجموعہ بن گئی۔ صرف ناصریہ (Nazarenes) ایک چھوٹا سا گروہ ایسا رہ گیا تھا جو رومی حکومت کے جبر، پادریوں کی ضلالت اور یہودیوں کی ملمع سازیوں کے باوجود توحید پر جارہا۔ ان کے علاوہ کچھ راہب اور بزرگ ایسے تھے جو صحیح العقیدہ تھے مگر اپنے افکار کو یہودیوں کے خوف کے باعث دنیا سے مخفی رکھتے تھے۔ انہی میں سے ایک صاحب، نجران کے وہ بزرگ تھے جو عبداللہ بن تامر نامی نوجوان کی ہدایت کا ذریعہ بنے۔ عبداللہ بن تامر کی کوششوں سے پوری قوم نے کلمہ توحید پڑھ لیا، مگر مقامی یہودی حاکم یوسف ذونُو اس نے ان تمام مؤمنوں کو آگ کی خندقوں میں گرا کر شہید کر دیا۔ یہ بعثتِ نبوی سے ستر سال قبل کا واقعہ ہے۔ ①

اس کے بعد صحیح عیسائیت تقریباً ناپید ہوگئی۔ ہاں مکّہ کے عیسائی عالم وَرَقہ بن نوفل کی طرح اِکا دُکا اصحاب تھے جو اپنے دل میں ہدایت کی شمع روشن کیے کسی اچھے وقت کے بے چینی سے منتظر تھے۔ جہاں تک عمومی منظر کا تعلق ہے تو دنیائے عیسائیت میں ہر طرف کفر و شرک کا دور دورہ تھا۔

☆☆☆

”زمانہ فترۃ میں جزیرۃ العرب“

جزیرۃ العرب اس تمام مدت میں باقی مہذب دنیا سے الگ نظر آتا ہے۔ یہاں مختلف مذاہب کی کش مکش تھی نہ بیرونی طاقتوں کی اجارہ داری۔ عرب کے بادیہ نشین اپنی قدیم تہذیب کے مطابق نہایت سادہ زندگی گزارتے آرہے تھے۔ انہیں کسی غیر ملکی طاقت کا تسلط قبول تھا نہ کسی اور تہذیب اور نظریے کو قبول کرنے سے انہیں کوئی دلچسپی تھی۔ اس جزیرہ نما کا محلِ وقوع بھی ایسا تھا کہ بیرونی حالات اس پر کم ہی اثر انداز ہو سکتے تھے۔ اس کے مشرق میں خلیج فارس کی پٹی ہے، جس نے اسے ایران سے جدا کر رکھا ہے۔ مغرب میں بحیرۂ احمر ہے جو اسے افریقہ سے ہم آغوش نہیں ہونے دیتا۔ جنوب میں بحرِ ہند کی بے کراں وسعتیں ہیں، جنہیں پار کر کے ہندوستان کے ساحلوں پر اترنا جان جوکھم کا کام ہے۔ صرف شمال میں یہ خشکی سے ملا ہوا ہے، یہاں شام کا علاقہ اس کے اور بحیرۂ روم کے درمیان حائل ہے۔ اس طرح کوئی یورپی جہاز راں براہِ راست عرب کے ساحل پر نہیں اتر سکتا تھا۔

اس جزیرہ نما میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد نبی آخر الزماں ﷺ تک کسی نبی کے مبعوث ہونے کی خبر نہیں ملی۔ ہاں اس کے اطراف و اکناف میں انبیاء و رسل کی بعثت جاری رہی۔ اس دوران عرب کے بادیہ نشین حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے دین کی باقیات کو (جن میں تغیر و تبدل کے سبب اَن گنت شرکیہ باتیں داخل ہو چکی تھیں) سینے سے لگائے یمن سے شام کے درمیان صحرا پیمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ عرب حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کی نسل سے تھے۔ ان کا قدیم ترین طبقہ ”عرب بائدہ“ تھا جو ہزاروں برس قبل مٹ گیا تھا۔ ان میں سے عاد، ثمود،

① تفسیر ابن کثیر، سورۃ البروج

طَسم اور جَدِیس جیسی دو چار قوموں کے سوا کسی کی تاریخ محفوظ نہیں رہی۔

ان کا دوسرا طبقہ "عرب عارِبہ" تھا، جو قَحطان بن عابر کی اولاد تھے۔ زبان میں مہارت اور فصاحت و بلاغت کی وجہ سے انہیں "عارِبہ" (واضح بات کرنے والے) کہا جانے لگا۔ ان کا اصل وطن یمن اور اس کے گرد و نواح کے علاقے تھے۔ جزیرۃ العرب کے اصل قدیم باشندے یہی لوگ تھے اور عرب ہونے کی حیثیت سے ان کی نسل سب سے خالص تھی۔ انہوں نے بڑی بڑی حکومتیں قائم کی تھیں اور شہر آباد کیے تھے جن کی آن بان کے قصے قدیم تاریخ عرب میں محفوظ رہے۔ عربوں کا تیسرا طبقہ "مُستَعرِبہ" (مُتعَرِّبہ) تھا۔ یہ لوگ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔[1]

اولادِ اسماعیل علیہ السلام:

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے قحطانیوں کے قبیلے بنوجُرہُم کے سردار مُضاض کی بیٹی سے شادی کی تھی، جس سے بارہ لڑکے پیدا ہوئے تھے۔ ان میں سے نابت اور قیدار غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ نابت نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد اُن کی جگہ خانہ کعبہ اور زم زم کے چشمے کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سنبھالی۔ اللہ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں بہت برکت دی، جلد ہی ان کی تعداد اتنی ہوگئی کہ انہیں معاش کے لیے مکّہ سے باہر نکلنا پڑا۔ آخر کار نسلِ اسماعیل میں عدنان کا ظہور ہوا جو قابلیت اور شہرت کے لحاظ سے تاریخ عرب کے ممتاز ترین فرد رہے۔ ان کا سلسلۂ نسب سب سے زیادہ محفوظ مانا جاتا ہے۔ عدنان کے بعد ہی عربوں میں بنوقحطان اور بنوعدنان کی تقسیم نمایاں ہوئی، جو زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ پختہ تر ہوتی چلی گئی، حتیٰ کہ کھلی دشمنی میں تبدیل ہوگئی۔ ان کی جنگی علامات بھی الگ الگ تھیں۔ قحطانی زرد پرچم اور زرد عمامے استعمال کرتے تھے۔ عدنانی سرخ پرچموں اور سرخ عماموں سے پہچانے جاتے تھے۔[2]

عدنان کی اولاد میں مَعَدّ بن عدنان نے بڑا نام پایا۔ مَعَدّ ہی کے دور میں شام پر بُختُ نَصَّر کا حملہ ہوا تھا، جس میں عرب بھی باولِ نخواستہ معاون بنے تھے۔ مَعَدّ کے بیٹوں میں مُضَر کا نام اوراقِ تاریخ میں خوب چمکا۔ ان کی نسل میں فِہر بن مالک وہ شخص ہیں جن کی اولاد "قریش" کے نام سے مشہور ہوئی۔[3]

جزیرۃ العرب کے وسط میں آباد عربوں کی سیاسی تشکیلات زیادہ تر قبائل کی حد تک ہی تھیں۔ بعض اوقات دو یا زیادہ قبیلے کسی خاص مقصد کے لیے متحد بھی ہو جاتے تھے۔ باقاعدہ حکومتیں صرف جزیرۃ العرب کے اطراف میں تھیں، جیسے جنوبی عرب میں سلطنت یمن، شمال مشرق میں مملکت حیرہ اور شمال مغرب میں مملکت غَسّان۔ یہ مملکتیں چند مخصوص خاندانوں کے ماتحت چل رہی تھیں، جیسے یمن میں مملکتِ سبا آلِ قحطان کے پاس تھی۔ قبائل کی سیادت میں بھی بعض خاص خاندان نامور تھے، جیسے بنوعدنان کی قیادت قریش کے ہاتھ میں تھی۔[4]

---

① نہایۃ الارب فی معرفۃ انساب العرب للقلقشندی، ص ۱۱ تا ۱۳، ط دار الکتاب اللبانیین

② فجر الاسلام لاحمد امین، ص ۲، ط دار الکتاب العربی

③ سیرۃ ابن ھشام: ۱/۹۰ تا ۹۵، ط البابی الحلبی، التاریخ الاسلامی العام لعلی ابراھیم حسن، ص ۲۵، ط مطبعۃ النھضۃ المصریۃ

④ المختصر فی اخبار البشر، لابی الفداء: ۱/۶۶، ۶۷

قومِ سَبا، ملوکِ حمیر اور تبابعہ:

جزیرۃ العرب کے جنوب میں مملکت سبا آٹھ صدیوں (۹۵۰ ق م سے ۱۱۵ ق م) تک قائم رہی۔ اس کا بانی قحطان بن عابر، اولادِ نوح میں سے وہ پہلا شخص تھا جو یمن آ کر آباد ہوا اور اپنی ریاست قائم کی جسے اس کے پڑپوتے ''سبا'' نے مسلسل فتوحات کے ذریعے ایک بڑی سلطنت میں تبدیل کر دیا۔ اسی نے مآرب کے مقام پر ایک عجوبۂ روزگار بند بنوا کر اس سے ستر نہریں نکالیں اور یوں یمن کا ایک وسیع و عریض رقبہ سیراب ہو کر مملکت سبا کی خوشحالی اور ترقی کا ذریعہ بن گیا۔

سَبا کا بیٹا حِـمْیَرُ اس کا جانشین ہوا اور آئندہ سبا کے کئی نامور بادشاہ اس کی نسل سے ہوئے۔ سبا کی چوتھی پشت سے تُبّع اوّل حارث نے بہت شہرت پائی۔ پھر اس کے بیٹے ''صَعْب'' نے مشرق و مغرب میں بڑے بڑے ملک فتح کیے اور ذوالقرنین کے لقب سے مشہور ہوا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بقول قرآنِ مجید میں اسی ذوالقرنین کا ذکر ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ قوم سبا کا عروج بڑھتا گیا۔ زراعت کے ساتھ ساتھ تجارت میں بھی یہ قوم ہر طرف چھا گئی۔ بحر و بر میں یمن سے شام تک اس کے تجارتی قافلوں کی ریل پیل ہو گئی۔ ہندوستان اور مشرق کا مال یمن کے ساحل پر اُترتا اور مقامی لوگ اسے شام لے جا کر خوب نفع کماتے۔ ①

سبا کی اولاد میں سے نویں پشت پر بِلْقِیس بنت شُرَحْبِیل نے مملکت سبا کا اقتدار سنبھالا اور پورے بیس سال بڑی آن بان سے حکومت کی۔ قوم سبا سورج کی پرستش کرتی تھی مگر بلقیس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا، جس کا ذکر قرآنِ مجید میں ہے۔ ②

مگر عمومی طور پر قوم سبا اپنی بدعقیدگی پر جمی رہی۔ ثروت اور خوشحالی اس کی بے فکری اور ناشکری کا سبب بھی بن گئی تھی۔ قوم کو سفر و حضر میں عیش و آرام کے اس قدر سامان میسر تھے کہ لوگ ناشکری کر کے مشقت اور تکلیف کی تمنا کرنے لگے تھے۔ آخر اس ناشکری کا وبال آیا۔ اُن کا مشہورِ زمانہ بند، سدِ مآرب ٹوٹ گیا۔ مملکت کا دارالحکومت ''مآرب'' پانی کے دھارے میں غرق ہو کر بے نام و نشان ہو گیا۔ سیلاب نے مملکت سبا کی آبادی اور معیشت کو اس طرح تہس نہس کر دیا کہ لوگ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح مملکت سبا کا خاتمہ ہو گیا۔ ③

مملکت سبا کے خاتمے کے بعد یمن میں آلِ سبا کے مختلف رئیسوں نے چھوٹے چھوٹے قلعوں اور بستیوں میں الگ الگ حکومتیں قائم کر لیں۔ ان میں ملوکِ حمیر کی ''سلطنتِ تبابعہ'' آہستہ آہستہ طاقتور ہو گئی، جو ایک سو پندرہ سال قبل از مسیح قائم ہوئی تھی اور اس کا ہر بادشاہ ''تُبّع'' کہلاتا تھا۔ بحیرۂ احمر کے ساحل سے ''حَضْرَ مَوت'' تک اُن کی حکومت تھی جو بعد میں نہ صرف یمامہ اور حجاز بلکہ ایک دور میں ایران، خراسان اور وسط ایشیا تک پھیل گئی تھی۔ ملوکِ سبا کے برخلاف تبابعہ کا رجحان زراعت و تجارت کی طرف نہیں بلکہ فتوحات اور لشکر کشی کی طرف تھا۔ تبابعہ میں شمر، ابوکرب، تُبّع اوسط،

① المختصر فی اخبار البشر: ۱/۶۶، ۶۷

② تفسیر ابن کثیر، سورۃ النمل، آیت: ۲۰ تا ۴۴ ③ تفسیر ابن کثیر، سورۃ سبا، آیت: ۱۵ تا ۱۹

تُبّع بن حسان (تبّع اصغر) اور حارث بن عَمرو بہت مشہور ہیں۔ حارث بن عَمرو نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا جس کی وجہ سے یمن میں سرکاری مذہب "یہودیت" قرار پایا۔ اسی وجہ سے اس نسل کے اگلے بادشاہ یوسف ذونُواس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے مطابق خالص توحید کا عقیدہ رکھنے والے نجران کے ہزاروں شہریوں کو آگ کی خندقوں میں گرا کر قتل کرا دیا تھا۔ یہ بھیانک ظلم شاہانِ حمیر کے مکمل زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور یوں ذونُواس کی حکومت اہل حبشہ کی یلغار کے سامنے دم توڑ گئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بقول یہ واقعہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے تقریباً ستر سال پہلے کا ہے۔ [1]

اس طرح بنوحمیر کی حکومت کا دورانیہ ۱۱۵ق م سے ۵۰۰ء تک کل چھ سو پندرہ سال بنتا ہے۔ اس عرصے میں کل چھبیس بادشاہوں نے حکومت کی۔ [2]

یمن پر حبشیوں کا تسلط اور سیف بن ذی یزن کی تحریکِ آزادی:

بنوحمیر کے بعد یمن میں اہل حبشہ کی حکومت ۷۲ سال تک رہی جس میں چار حکمران گزرے: پہلا حکمران اَرْیاط تھا۔ دوسرا اَبرَہہ، جس نے مکہ پر حملہ کیا تھا۔ ان دونوں کی حکومت طویل رہی۔

اَبرَہہ کے بعد اس کا بیٹا یَکْسُوم اور پھر دوسرا بیٹا مَسرُوق حکمران بنے۔ دونوں کو تھوڑے دن ہی ملے۔ یاد رہے کہ یمن کے یہ حبشی حکمران خود مختار نہیں تھے بلکہ ان کی حیثیت حبشہ کے بادشاہ کے گورنر کی تھی۔ خود حبشہ کا بادشاہ عیسائی ہونے کے ناطے قیصر کا باج گزار تھا۔

آخر یمن کے ایک سردار سیف بن ذی یزن نے حبشیوں کے خلاف آزادی کی تحریک چلائی۔ عرب اس کے ساتھ ہو گئے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے دو سال بعد سیف بن ذی یزن کے ہاتھوں حبشیوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ [3]

☆☆☆

---

① الکامل فی التاریخ: ۳۸۸/۱ تا ۳۹۲

② المختصر فی اخبار البشر: ۶۸/۱

③ الکامل فی التاریخ: ۳۹۴/۱؛ تاریخ ابن خلدون: ۷۳/۲

زمانہ جاہلیت کی دیگر عرب حکومتیں

امارتِ حیرۃ:

قدیم کوفہ کے جنوب میں تین میل (پونے پانچ کلومیٹر) دور جہاں اب 'نجف' آباد ہے، ''حیرۃ'' نامی ایک شہر تھا۔ یہاں ''تنوخی'' عربوں نے سکندرِ اعظم کے حملے کے کچھ عرصے بعد اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ ''تنوخی'' عرب وہ تھے جو یمن سے ہجرت کر کے بحرین میں آبسے تھے۔ یہیں انہوں نے ''تنوخی'' کے نام سے ایک الگ قبیلے کے طور پر شہرت پائی۔ سکندرِ اعظم کے حملے کے بعد جب عراق وفارس میں طوائف الملو کی کا دور شروع ہوا تو ان عربوں نے موقع پا کر جزیرۃ العرب کی سرحدوں پر واقع عراقی شہروں پر قبضے کی کوشش کر دی۔ اس طرح نہ صرف حیرہ بلکہ اَنبار سے لے کر دریائے فُرات تک ان کا تسلط ہو گیا۔ حیرہ کے عرب چونکہ فارس اور روم دونوں کی سرحدوں سے متصل تھے اس لیے دونوں بڑی طاقتوں کے نظریاتی اثرات ان پر مرتب ہوتے رہے جس کی وجہ سے بہت سے تنوخی عرب عیسائی ہو گئے۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے ناموں کے ساتھ ''عبد'' آتا تھا، جیسے عبدالمسیح، عبد یالیل اور عبداللہ، اس لیے ان کو ''عُبّاد'' بھی کہا جاتا تھا۔ ①

اس حکومت کا بانی قبیلۂ دَوس کا ایک بلند ہمت شخص مالک بن فہم تھا، اس نے حیرۃ میں محل بنوایا اور باغ لگائے مگر وہاں کی بجائے اپنا مرکز ''انبار'' کو بنایا۔ ②

اس کا بیٹا جَذِیمہ الا برش بہادری، دانائی اور ذہانت کی وجہ سے عربوں کی کہانیوں کا حصہ بن گیا۔ اس نے ساٹھ سال تک حیرہ پر حکومت کی۔ مؤرخین کے بقول وہ شاہانِ عرب میں سب سے عقل مند، سب سے سخت گیر اور سب سے زیادہ محتاط تھا۔ ③

الجزیرہ کے عرب حاکم عَمرو بن ظَرِب سے اس کی جنگ مشہور ہے، جس میں عَمرو مارا گیا تھا۔ اس کی بیٹی زَبّا نے باپ کا انتقام لینے کے لیے یہ چال چلی کہ جَذِیمہ کو صلح اور شادی کی پیشکش کر کے اپنے ہاں مدعو کیا اور پھر قتل کر ڈالا۔ ④

جَذِیمہ کے بعد اس کا بھتیجا ''عَمرو بن عدی'' عراقی عربوں کا حکمران بنا، وہ پہلا شخص ہے جس نے حیرہ کو پایہ تخت بنایا۔ اس نے جَذِیمہ کے دوست قُصَیر کو انتقام لینے ''زَبّا'' کے پاس بھیجا۔ قُصَیر نے ناک کٹوا کر زَبّا کے ہاں حاضری دی اور ظاہر کیا کہ عَمرو بن عدی نے اس پر یہ ظلم ڈھایا ہے۔ اس نے اپنی مظلومیت جتا کر زَبّا کا اعتماد حاصل کیا مگر پھر موقع ملتے ہی زَبّا کے شہر میں اپنی فوج داخل کر دی، جس نے زَبّا کو قتل کر کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ⑤

---

① التاریخ الاسلامی العام، ص ٦١ ② معجم البلدان: ٣٢٨/٢، حیرة، ط دار صادر

③ تاریخ الطبری: ٦١٣/١ ④ الکامل فی التاریخ: ٣١٤/١ تا ٣١٧ ⑤ الکامل فی التاریخ: ٣١٨/١ تا ٣٢٠

عَمرو بن عدی کے بعد اس کے جانشین امرؤالقیس اوّل کے دور میں ملوکِ حیرہ کا اثر و رسوخ اور بڑھ گیا۔ امرؤالقیس نے ساسانی بادشاہوں سے دوستانہ روابط استوار کر کے اپنی حکومت محفوظ بنالی۔ یہ چوتھی صدی عیسوی کے آغاز کا قصہ ہے۔ امرؤالقیس کے پوتے نعمان اوّل نے ملوکِ حیرہ کا نام مزید چمکایا۔ اس کے دور میں اماراتِ حیرہ کے پاس عرب اور فارسی سپاہیوں کی دو الگ الگ فوجیں ہوا کرتی تھیں جن کے ذریعے اس نے بڑے بڑے عرب قبائل کو تابع کر لیا تھا۔

نعمان کے بعد اس کا بیٹا مُنذِر بن نعمان مسند نشین ہوا، جس پر شاہانِ فارس کو اتنا اعتماد تھا کہ خسرو یزدگرد اثیم نے اپنے بیٹے بہرام گور کو تربیت کے لیے اس کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ بعد میں منذر بن نعمان نے بہرام کو باپ کا تخت و تاج دلوانے میں بھی مرکزی کردار ادا کیا۔[1]

مَزْدَکیت اور امارتِ حیرہ:

پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایران میں ایک نیا مذہب ''مَزْدَکیت'' جنم لے چکا تھا جس کا بانی مَزْدَک لوگوں کو زر، زمین اور زن میں مکمل اشتراک کی دعوت دیتا تھا۔ نفس پرستی پر مشتمل یہ نیا فلسفہ ایرانی کسریٰ قُباذ کو پسند آیا اور اس نے اسے اختیار کر کے نہ صرف اس کی سرکاری سرپرستی شروع کردی بلکہ اسے اختیار نہ کرنے والوں سے کھلی عداوت پر اتر آیا۔ حیرہ کا حاکم منذر بن ماء السماء مزدکیت قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا تو کسریٰ نے بزورِ قوت اس سے تاج و تخت چھین کر ایک دوسرے عرب شہزادے حارث بن عَمرو کو دے دیا، جس نے مزدکیت قبول کر لی تھی، تاہم کسریٰ قباذ کے مرنے کے بعد نوشیروان کو اقتدار ملا تو اس نے مزدکیت کی مخالفت کی اور حیرہ کی حکومت بھی منذر بن ماء السماء کو لوٹا دی۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی ولادت کے وقت ''حیرہ'' پر منذر کے بیٹے عَمرو کی حکومت تھی جسے سیاسی اُمور پر سخت گرفت کی وجہ سے ''مُضَرِّطُ الحجارۃ'' کہا جاتا تھا۔[2]

بنوغسان:

جس طرح عرب کی مشرقی سرحدوں پر ''ملوکِ حیرہ'' شاہانِ فارس کی ماتحتی میں عرب کی سیادت کے فرائض انجام دیتے تھے اسی طرح سلطنت روما کی سرپرستی میں جزیرۃ العرب کی اُن سرحدوں پر جو شام سے متصل تھیں، ''بنوغسان'' اقتدار کے مزے لوٹ رہے تھے۔

بنوغسان، بنوکہلان کی شاخ اَزْد سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ بندِ مآرب کے سیلاب سے متاثر ہو کر یمن سے شام کی سرحدوں پر ''غسان'' نامی ایک چشمے پر آبسے تھے، اس لیے ان کا نام ''بنوغسان'' پڑ گیا۔ اُن کا پہلا قائد جَفْنَہ بن عَمرو تھا جو حضور اکرم ﷺ سے چار سو سال پہلے گزرا ہے۔ آلِ جفنہ نے شام کی سرحد پر طویل عرصہ حکومت کی اور ان کے درجنوں حکمران گزرے۔ ان کا نامور رئیس حارث بن جَبَلہ یعقوبی فرقے کا عیسائی تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کو خدائے بزرگ و برتر قرار دیتا ہے۔ حارث نے ۵۲۹ء میں سلطنت روما کی باقاعدہ باج گزاری اختیار کر لی تھی تاکہ حیرہ

[1] الکامل فی التاریخ: ۳۶۵/۱ تا ۳۷۰
[2] المختصر فی اخبار البشر: ۷۰/۱، ۷۱

کے عرب حاکم منذر بن ماء السماء کا مقابلہ کر سکے۔ پھر اس نے ۵۴۱ء میں روم کی حمایت سے دریائے دجلہ عبور کر کے عراق پر حملہ کیا اور فتوحات حاصل کیں۔ اس طرح ''غسان'' کی حکومت مضبوط تر ہوگئی۔ رومیوں کی ماتحتی کی وجہ سے غسانی عرب عیسائی مذہب اختیار کرتے گئے اور رفتہ رفتہ ان کی اکثریت عیسائی ہوگئی۔ غسانیوں کا آخری حکمران جبلہ بن اَیہَم تھا جس نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلام قبول کیا تھا مگر کچھ دنوں بعد مرتد ہو گیا تھا۔[1]

عرب بیرونی حملوں کی زد میں:

جزیرۃ العرب خلیج فارس اور بحیرۂ احمر جیسی اہم ترین آبی گزرگاہوں سے اتصال کی وجہ سے دنیا کے نقشے میں غیر معمولی حیثیت رکھتا چلا آیا ہے، ہمسایہ ممالک اس بے آب وگیاہ سرزمین پر قبضے کے فوائد سے بے خبر نہ تھے، مگر عربوں کی طبیعت میں حُرّیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی اپنی مُعاصر عالمی طاقتوں سے مغلوب نہ ہوئے۔ نہ صرف مصر کے فرعون اور عراق وفارس کے کسریٰ سرزمین عرب کو اپنے زیرتسلط رکھنا چاہتے تھے بلکہ یورپی طاقتیں بھی اس کی خواہش مند رہیں مگر ان کی یہ تمنا کبھی پوری نہ ہو سکی۔ یونانی فاتح سکندرِ اعظم نے ایران و ہندوستان پر قبضے کے بعد واپسی میں جزیرۃ العرب کی طرف پیش قدمی کا ارادہ کر لیا تھا مگر اس کی ناگہانی موت نے عربوں کو ایک بڑی جنگ سے بچالیا۔ اس وقت سکندر کی عمر صرف چھتیس سال تھی، اس نے تیرہ سال حکومت کی تھی۔[2]

سکندر کے بعد یونانی حکومت کمزور پڑ گئی، دوسری طرف ایران کی اجتماعیت کیانی خانوادے کے آخری حاکم دارا کے بعد (جسے سکندر نے قتل کرایا تھا) ریزہ ریزہ ہوگئی تھی۔ ایسے میں مشرقی کلیسا کی نمائندہ قُسطنطینیہ کی رومی سلطنت تیزی سے ابھرنے لگی۔ رومی بادشاہ آگسٹس نے چوبیس سال قبل از مسیح میں ایک بہت بڑی فوج بھیج کر جزیرۃ العرب پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر صحرا کی تمازت اور پانی کی کمیابی کی وجہ سے رومی افواج نے راستے ہی میں ہمت ہار دی اور یہ مہم ناکام ہوگئی۔

تقریباً تین سو سال بعد جب روم سرکاری طور پر عیسائی مذہب قبول کر چکا تھا، عربوں کو زیرِدام لانے کی ایک اور کوشش کی گئی جس کے لیے تبلیغِ مذہب کا راستہ اپنایا گیا۔ رومی کلیسا نے اپنے پادری اور راہب تبلیغ کی غرض سے جنوبی عرب میں بھیجے۔ اس سے قبل بحیرۂ احمر کے پار حبشہ رومیوں کے قبضے میں آچکا تھا اور وہاں مسیحیت کی تبلیغ زور و شور سے ہو رہی تھی۔

مگر جزیرۃ العرب میں اہلِ روم کی تبلیغ زیادہ کامیاب نہ ہوسکی، یمن کے حِمیَری بادشاہوں نے عیسائیت کی آڑ میں روم کے بڑھتے ہوئے قدموں کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور سیاسی ضد یا ردِّعمل کے طور پر یہودیت اختیار کر لی۔ تاہم یمن میں چند لوگوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ نجران میں ایک بزرگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صحیح تعلیمات پر قائم تھے۔ ایک لڑکا عبداللہ بن تامِر ان کا پیروکار بن گیا۔ ان کی برکات وکرامات دیکھ کر نجران کی تمام آبادی نے جام توحید

[1] التاریخ الاسلامی العام: ص ۸۳ تا ۸۸ [2] المختصر فی اخبار البشر: ۴۵/۱ ؛ التاریخ الاسلامی العام: ص ۴۴

پی لیا۔حمیری بادشاہ یوسف ذونُو اس نے اس سے برافروختہ ہو کر نجران کے لوگوں کو آگ کی خندقوں میں پھینکوا دیا۔ [1]

اس کا نتیجہ نہ صرف حِمیَر ی بادشاہت بلکہ جزیرۃ العرب کی سیاسی وحدت کے لیے بہت مضر نکلا۔ رومی بادشاہ جسٹینس (Justinus) نے اس سانحے کی خبر پاتے ہی حبشہ میں اپنے نائب کو جسے نجاشی کہا جاتا تھا، حکم دیا کہ وہ یمن پر حملہ کرکے بنوحِمیَر سے نجران کے مقتولین کا انتقام لے، چنانچہ نجاشی نے اپنے جرنیل ''اریاط'' کو ستر ہزار حبشیوں کی فوج کے ساتھ یمن پر لشکرکشی کے لیے بھیجا جس کے نتیجے میں یمن سے ''حِمیَر'' کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور وہاں روم کی ماتحتی میں ایک مسیحی حکومت قائم ہوگئی، جس کا مقامی سربراہ ''اَریاط'' تھا۔ یہ واقعہ حضور نبی اکرم ﷺ کی ولادت سے ستر برس پہلے کا ہے۔

اریاط سے یمن کی حکومت دوسرے حبشی سردار ''ابرھۃ الاشرم'' نے چھین لی، یہ بڑا متعصب عیسائی تھا۔ اسے کعبۃ اللہ سے عربوں کی غیر معمولی محبت اور وابستگی ایک آنکھ نہ بھائی، اس لیے اس نے پہلے یمن میں ایک شاندار گرجا تعمیر کرکے عربوں کو اس کا حج کرنے کی دعوت دی مگر جب عربوں نے اسے گھاس نہ ڈالی تو اس نے کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کے ناپاک ارادے سے مکہ پر چڑھائی کی اور انجام کار اپنی پوری فوج کے ساتھ تباہ و برباد ہوا۔ [2]

وادیٔ مکہ:

شام اور یمن کی تجارتی شاہراہ پر واقع ''مکہ'' حجازِ مقدس کے وسط میں ایک نشیبی سرزمین ہے جسے پہاڑیوں اور ٹیلوں نے گھیر رکھا ہے۔ وادیٔ مکہ شمال سے جنوب کی طرف تقریباً دو میل (سوا تین کلومیٹر) طویل اور نصف میل (۸۰۰ میٹر) چوڑی ہے۔ نشیب کی وجہ سے بارشوں کا پانی ٹیلوں سے بہہ کر سیدھا وادی میں اتر آتا ہے۔ اسی وجہ سے شہری آبادی کو بارہا سیلاب کے نقصانات برداشت کرنا پڑے۔ گرم آب و ہوا کا حامل یہ شہر حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کی یادگار ہونے کی وجہ سے عربوں میں غیر معمولی حیثیت رکھتا تھا۔ یہیں موسمِ حج میں عرب کے تمام قبائل جمع ہوتے اور مناسکِ حج ادا کرتے تھے۔

مکہ کی سیادت بنوجُرہُم کے ہاتھ میں تھی، جبکہ کعبۃ اللہ کی چابیاں اور اس کی خدمات بنواسماعیل کے سپرد تھیں۔ یہ منصب حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بڑے بیٹے نابت نے سنبھالا ہوا تھا مگر نابت کے بعد بنو جُرہُم کے کچھ حریص لوگوں نے اولادِ اسماعیل کو اس منصب سے محروم کر دیا۔

ایک طویل زمانے تک بنوجُرہُم مکہ اور کعبہ کے جملہ اُمور کے مالک رہے مگر انہوں نے کعبہ کی حرمت کا حق ادا نہ کیا اور بہت سی خیانتوں کے مرتکب ہوتے رہے۔

جب یمن میں بند مآرب کے ٹوٹنے سے سیلاب آیا اور مختلف قحطانی قبائل نے شمال کی طرف ہجرت کی تو اُن کا ایک قافلہ اپنے بوڑھے سردار عمرو بن عامر کی قیادت میں مکہ آیا مگر بنوجُرہُم نے انہیں جگہ دینے سے انکار کر دیا، جس کے بعد

[1] تفسیر ابن کثیر، سورۃ البروج

[2] البدایۃ والنھایۃ: ۵۶۴/۱؛ سیرۃ ابن ھشام: ۴۱/۱ تا ۴۶

عَمرو بن عامر کے دو پوتے: اَوس اور خزرج اپنے اپنے خاندان سمیت یثرب (مدینہ منورہ) چلے گئے، البتہ تیسرا پوتا رَبیعہ بن حارثہ مکہ ہی میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوگیا اور اس کی اولاد بنوخزاعہ کہلائی۔ ①

بنوجرہم کی بے دخلی اور بنوخزاعہ کا قبضہ:

بنوخزاعہ کی طاقت بڑھتی گئی اور آخر کار انہوں نے بنوجرہم کو مکہ سے باہر نکال کر مسجد الحرام کی تولیت اپنے قبضے میں لے لی۔ یہ واقعہ 207ء کا بتایا جاتا ہے۔ ②

بنوجرہم اپنی کمزوریوں کے باوجود خانہ کعبہ سے وارفتگی کی حد تک محبت کرتے تھے، جب وہ مکہ سے بے دخل ہوکر اپنے آبائی وطن یمن جانے لگے تو کعبہ کے لیے جمع شدہ اموال زم زم کے کنویں میں ڈال کر اسے مٹی سے پاٹ دیا۔ اس موقع پر ان کے شاعر عَمرو بن حارث نے یہ ناقابلِ فراموش اشعار پڑھے:

كَأَنْ لَمْ يَكُنْ بَيْنَ الْحَجُوْنِ إِلَى صَفَا
أَنِيْسٌ وَلَمْ يَسْمُرْ بِمَكَّةَ سَامِرُ

”یوں لگتا ہے جیسے حجون سے کوہِ صفا تک کوئی دوست نہ رہا ہو اور نہ ہی مکہ میں کسی داستان گو نے کبھی کوئی داستان سنائی ہو۔“

بَلْ نَحْنُ كُنَّا أَهْلَهَا فَأَزَالَنَا
صُرُوْفُ اللَّيَالِيْ وَالْجُدُوْدُ الْعَوَاثِرُ

”ہم ہی تو اس شہر کے باشندے تھے مگر ہمیں راتوں کی گردشوں اور ناگہانی مصائب نے یہاں سے بے دخل کردیا۔“

وَكُنَّا وُلَاةَ الْبَيْتِ مِنْ بَعْدِ نَابِتٍ
نَطُوْفُ فَمَا تَحْظَى لَدَيْنَا الْمَكَاثِرُ

”نابت (بن اسماعیل علیہ السلام) کے بعد ہم ہی بیت اللہ کے رکھوالے تھے، جب ہم اس کا طواف کرتے تھے تو ہمارے نزدیک مال و دولت کے ذخیروں کی کوئی حیثیت نہ رہتی۔“ ③

بنوجرہم کی مکہ سے بے دخلی اور بنوخزاعہ کا بیت اللہ پر قبضہ مکہ کے لیے مزید ضرر رساں ثابت ہوا۔ بنوخزاعہ نے اس گھر کی نگرانی سنبھال کر توحید کے اس مرکز کو شرک کا گڑھ بنا ڈالا۔ شرک کی لعنت کا آغاز بنوخزاعہ کے سردار عَمرو بن لُحَیّ کے ہاتھوں ہوا۔ یہ شخص عربوں کے درمیان بہت بلند مرتبہ قائد تصور کیا جاتا تھا، اس کی بادشاہوں جیسی تعظیم کی جاتی تھی کیوں کہ وہ دولت و ثروت میں اپنے معاصر سرداروں سے کہیں آگے تھا۔ اس کے اونٹوں کی تعداد بیس ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ اس شان و شوکت اور رعب داب کی وجہ سے اس کی ہر بات آنکھیں بند کر کے مان لی جاتی تھی۔ ④

① اخبار مکة وماجاء فیها من الآثار لابی الولید الازرقی: ۱/ ۸۰ تا ۹۰، ط دارالاندلس
② التاریخ الاسلامی العام، ص ۹۲؛ تاریخ مکة المشرفة لابن ضیاء، ص ۵۶، ۵۷
③ ابن خلدون: ۲/ ۳۹۷، دارالفکر
④ البدایة والنهایة لابن کثیر الدمشقی: ۱/ ۵۸۴، دارهجر

بت پرستی کا آغاز:

عَمرو بن لُحَیّ نے شام کے سفر کے دوران وہاں کے مقامی لوگوں کو بت پرستی کرتے دیکھا۔ بت پرستوں نے اُسے باور کرایا کہ یہ مجسمے روزی دیتے اور بارش برساتے ہیں، ان سے جو حاجت مانگی جائے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ شیطان نے بھی یہ شرکیہ دھندے اسے پرکشش کر کے دکھائے، آخر عَمرو بن لُحَیّ ایک مجسمہ جسے ''ہُبَل'' کا نام دیا گیا، اپنے ساتھ مکّہ لے آیا اور اسے کعبہ میں نصب کر کے قوم کو اس کی عبادت کی دعوت دی۔ اکثریت نے اس کی اندھی تقلید کی۔ اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے خانہ کعبہ کا صحن طرح طرح کے بتوں سے آلودہ ہو گیا اور عرب بت پرستی کے نشے میں ایسے مست ہوئے کہ وہ دینِ ابراہیمی جو ان کے بزرگوں کو جان سے زیادہ عزیز تھا، رفتہ رفتہ بالکل مٹ گیا۔[1] ہاں کچھ لوگ ایسے تھے جو شروع سے بت پرستی کی اس مہلک لہر کے آگے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، مثلاً بنوجُرہُم کے ایک شاعر شُحنہ بن خَلَف نے عَمرو بن لُحَیّ کے فعل پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا:

یَا عَمْرُو إِنَّکَ قَدْ أَحْدَثْتَ آلِهَةً
شَتّٰی بِمَکَّةَ حَوْلَ الْبَیْتِ أَنْصَابَا

''اے عَمرو! تو نے مختلف معبود بنا کر انہیں مکّہ میں بیت اللہ کے گرد نصب کر دیا؟''

وَکَانَ لِلْبَیْتِ رَبٌّ وَاحِدٌ أَبَدًا
فَقَدْ جَعَلْتَ لَهُ فِي النَّاسِ أَرْبَابَا

''اس گھر کا رب تو ہمیشہ سے ایک ہے، مگر تو نے اس کی جگہ لوگوں میں بہت سے معبود متعارف کرا دیے۔''

لَتَعْرِفَنَّ بِأَنَّ اللّٰهَ فِي مَهَلٍ
سَیَصْطَفِي دُوْنَکُمْ لِلْبَیْتِ حُجَّابَا

''تو جان لے گا کہ اللہ تجھے مہلت دے رہا ہے۔ وہ تیرے سوا اپنے گھر کے لیے دوسرے محافظ منتخب کر لے گا۔''[2]

قریش کا ظہور:

کعبہ پر بنوخُزاعہ کی تولیت کا دور تقریباً تین سو برس تک رہا۔ اس دوران آلِ اسماعیل کے نامور فرد عدنان کی اولاد میں سے رَبیعہ اور مُضَر دو مستقل بڑے قبیلے بن کر کئی ذیلی قبائل میں بٹ چکے تھے۔ پھر مُضَر کی اولاد میں سے اس کے پڑپوتے خُزیمہ کا بیٹا کِنانہ، بہت مشہور ہوا۔ کِنانہ کی نسل اس کے بیٹے ''نَضر'' سے چلی اور بہت پھلی پھولی۔ کِنانہ کے پڑپوتے فِہر بن مالک کے زمانے میں یہ لوگ ایک الگ قبیلے کی شکل اختیار کر گئے، جسے ''بنوکِنانہ'' کہا جاتا تھا مگر بنوکِنانہ میں کئی نسلوں تک یہ ہمت پیدا نہ ہو سکی کہ وہ کعبۃ اللہ کی تولیت بنوخزاعہ سے واپس لے سکیں۔ آخرکار فِہر کی پانچویں پشت میں ''قُصَیّ بن کِلاب'' نامی وہ نامور سردار پیدا ہوا جس نے اپنے جدِّ امجد کی وراثت واپس لینے کے لیے کمر باندھی۔

① البدایة والنهایة: ۵۸۴/۱ ② المفصل فی تاریخ العرب لدکتور جواد علی: ۸۰/۱۱

قُصَیّ کا بچپن یتیمی کی حالت میں گزر رہا تھا۔ اس کی ماں نے قبیلہ بنی عذرہ میں دوسری شادی کر لی تھی، اس لیے اس کا بچپن بنوعذرہ میں گزرا۔ جوان ہونے پر اُسے اپنے اصل خاندان کی عظمت و بزرگی کا علم ہوا تو اس نے حجاز کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ یہاں آ کر دیکھا تو اس کے قبیلے کے لوگ بڑی بدنظمی کی حالت میں حجاز کے مختلف گوشوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی کوئی امتیازی شکل نہ تھی بلکہ وہ نضر بن کنانہ کی اولاد کہلاتے تھے اور چند منتشر خاندانوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ قُصَیّ نے ان سب کو متحد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ بنوخزاعہ کے رئیس خلیل خزاعی نے اُس کی قابلیت اور صلاحیت دیکھ کر اُسے اپنا داماد بنا لیا اور مرنے سے پہلے خانہ کعبہ کی چابیاں بھی اس کے حوالے کر دیں۔ اس طرح صدیوں بعد بیت اللہ کی تولیت کا منصب اولادِ اسماعیل کو واپس مل گیا۔[1]

قُصَیّ کو اب مکہ میں ایک بڑے سردار کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس نے مکہ کا انتظام سنبھال کر اپنے قبیلے بنو کنانہ کو ساتھ ملا لیا اور ان کی مدد سے بنوخزاعہ کو حدودِ حرم سے بے دخل کر دیا۔ پھر اس نے اپنے قبیلے کو مکہ کے مضافات اور حجاز کے مختلف مقامات سے جمع کر کے مکہ میں آباد کر دیا اور انہیں متحد کر کے ایک منظم قبیلے کی حیثیت دی جس کا نام ''قریش'' پڑ گیا۔ یہ نام پڑنے کی کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ''قریش'' کا لفظ ''تَقَرُّش'' سے نکلا ہے جس کا معنی ہے انتشار کے بعد متحد ہو جانا، چونکہ نضر بن کنانہ کی منتشر اولاد کو قُصَیّ نے متحد کر دیا اس لیے اس نئی اجتماعیت کا نام ''قریش'' پڑ گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''نضر'' کو قریش کہا جاتا تھا، اس لیے اس کی اولاد بھی اسی نام سے مشہور ہو گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ فہر بن مالک کا لقب ''قریش'' تھا جو اصل میں ایک طاقتور سمندری جانور کا نام ہے۔ اس کے بعد اولادِ کنانہ کو بھی ان کی طاقت اور شوکت کے باعث ''قریش'' کہا جانے لگا۔[2]

قُصَیّ کی قیادت میں مکہ قریش کی چھوٹی سی ریاست بن گیا۔ قُصَیّ ایک بڑے سیاست دان کا ذہن لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس نے مکہ کے انتظامی امور کو مذہبی، عدالتی اور عسکری امور میں تقسیم کر دیا، خانہ کعبہ، مسجد الحرام اور حاجیوں کی خدمت کے علاوہ شہری انتظامات اور خدمات کو بہتر بنایا۔ یہ خدمات چھ شعبوں میں تقسیم تھیں:

1. حجابہ یا سِدانہ، یعنی خانہ کعبہ کی کلید برداری: اس کے نگران کے پاس بیت اللہ کی چابی ہوا کرتی تھی۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی اندر نہیں جا سکتا تھا۔
2. سِقایہ: یعنی حج کے دنوں میں حاجیوں کو میٹھا پانی پلانا۔
3. رِفادہ: یعنی حاجیوں کو کھانا کھلانا۔
4. لِواء: یعنی پرچم نصب کرنا جس کے تحت فوج اکٹھی ہوتی تھی۔
5. قیادۃ: یعنی میدانِ جنگ میں لشکر کی کمان سنبھالنا۔

---

[1] سیرۃ ابن ھشام: ۱۱۷/۱، ۱۱۸
[2] سیرۃ ابن ھشام: ۱۲۳/۱، البدایۃ والنھایۃ: ۲۰۱/۲

❻ ندوہ: یعنی مجلس مشاورت: مسجد الحرام سے متصل ایک کشادہ مکان میں یہ مجلس آراستہ ہوتی تھی۔ اس مکان کو ''دار الندوۃ'' کہا جاتا تھا۔ قریشی سردار یہاں جمع ہو کر اہم اُمور کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ جنگ کے لیے لشکروں اور تجارتی قافلوں کی روانگی بھی یہیں سے ہوتی تھی۔ نکاح کی رسم بھی یہاں انجام پاتی تھی۔ لڑکی یا لڑکے کے بالغ ہونے کی تصدیق بھی یہیں کی جاتی تھی تاکہ قبیلے کے جوان مرد وزن کی مردم شماری محفوظ رہے۔

یہ چھ شعبے گویا قریش کی حکومت کی چھ وزارتیں تھیں جن کا حصول نہایت ہی عزت اور شرافت کی بات سمجھی جاتی تھی۔ قُصَیّ کی زندگی میں ہی اس کے دولڑکے عبدالدار اور عبدمَناف ان عہدوں پر مقرر ہو گئے تھے۔

قُصَیّ نے حاجیوں کو پانی پلانے، کھانا کھلانے اور جنگوں کی قیادت کے شعبے عبدمَناف کے سپرد کر دیے تھے اور بیت اللہ کی کلید برداری، دارالندوہ کی تولیت اور پرچم اٹھانے کی خدمات عبدالدار کے حوالے کر دی تھیں۔ ①

بیت اللہ کی کلید برداری کا اعزاز بنوعبدالدار کے پاس آج تک باقی ہے۔ فتح مکّہ کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے بھی اس خاندان کے فرد حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو نہ صرف اس عہدے پر باقی رکھا بلکہ خوش خبری دی کہ یہ خدمت انہی کی اولاد میں ہمیشہ باقی رہے گی اور جو اُن سے یہ حق چھینے گا، وہ ظالم ہوگا۔ ②

ہاشم:

عبدمَناف کے دو بیٹے اس کے جانشین ہوئے۔ ہاشم اور عبدِشمس۔ عبدِشمس تنگ دست مگر متحرک اور دلیر آدمی تھا، اس کے لڑکے بھی کئی تھے، اس لیے اس نے قریشی فوج کی کمان سنبھال لی۔ عبدِشمس کے بعد اس کا لڑکا اُمیّہ قریش کا سپہ سالار بنا اور پھر یہ عہدہ اُمیہ کی اولاد میں جو ''بنواُمیّہ'' کے نام سے مشہور ہوئی، مدتِ دراز تک باقی رہا۔

ہاشم نے مال داری اور فارغ البالی کی نعمت کا حق ادا کرتے ہوئے حاجیوں کو کھلانے پلانے کی خدمات غیر معمولی لگن سے انجام دیں۔ ان کا نام ''ہاشم'' اسی لیے پڑا کہ وہ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے انہیں شوربے میں بھگو کر ضرورت مندوں کو کھلایا کرتے تھے۔ ③

قریش تجارت پیشہ لوگ تھے مگر ان کی تجارت اردگرد کے علاقوں میں ہی ہوا کرتی تھی۔ ہاشم نے اس تجارت کا دائرہ دوسرے ملکوں تک پھیلانے کا جرأت مندانہ کارنامہ بھی انجام دیا۔ وہ خود شام کے شہر ''قیصریہ'' گئے، جہاں قیصر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں ہاشم نے یہ معمول بنا لیا کہ روزانہ ایک بکری ذبح کر کے آس پاس کے لوگوں کی ضیافت کرتے۔ قیصر کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہیں اپنے پاس بلوا لیا۔ انہوں نے حاضر ہو کر کہا:

''بادشاہ سلامت! ہم عرب کے تجارت پیشہ لوگ ہیں، اگر آپ کو منظور ہو تو ہمیں ایک امان نامہ لکھ دیں تاکہ ہماری قوم کے لوگ حجاز کا سامان خود لا کر آپ کو فروخت کریں۔ اس طرح یہ چیزیں آپ کو سستی ملیں گی۔''

① سیرۃ ابن ھشام: ۱/۱۲۵، ۱۲۹، ۱۳۰؛ الروض الانف: ۲/۳۳، ۳۴، ط دار احیاء التراث العربی
② اخبار مکۃ لابی الولید الازرقی: ۱/۲۶۵ ③ سیرۃ ابن ھشام: ۱/۱۳۶

قیصر نے فوراً امان نامہ لکھوا دیا۔اس کے بعد قریش کے قافلے بے خوف وخطر شام تک آنے جانے لگے اور ان کے ہاں خوشحالی کی شرح بڑھتی چلی گئی۔ ①

قریش کا عروج:

یہ قریش کے عروج کے دن تھے۔شام اور یمن کی تجارتی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے مکہ کے بازار پورا سال آباد رہتے تھے۔قریش کے تجارتی قافلے گرمیوں میں شام اور سردیوں میں یمن کی طرف نکلتے تھے کیوں کہ موسم سرما میں یمن کے ساحلی میدانوں اور گرما میں شام کے پہاڑی علاقوں کا موسم معتدل رہتا ہے۔اس طرح تجارتی سرگرمیاں پورے سال جاری رہتی تھیں۔بیت اللہ کے پڑوسی اور رکھوالے ہونے کی حیثیت سے کوئی قبیلہ قریش کے قافلوں کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھتا تھا۔ان قافلوں کا ساز وسامان بعض اوقات اڑھائی، اڑھائی ہزار اونٹوں پر لدا ہوتا تھا، جن کے ساتھ سو، دوسو افراد ضرور ہوتے۔ ②

دینی مرکز ہونے کی وجہ سے دور دراز سے لوگ مکہ کا رخ کیا کرتے خصوصاً حج کے مہینوں میں مکہ حجاج سے کھچا کھچ بھرا رہتا تھا، قریش حجاج کی خدمت بھی دل وجان سے کرتے تھے اور اس موقع پر خاصا تجارتی نفع بھی حاصل کیا کرتے۔

اپنی مذہبی پیشوائی اور تاجرانہ کمائی کے ساتھ ساتھ قریش عسکری اُمور اور سیاسی جوڑ توڑ میں بھی طاق تھے۔انہیں سب سے زیادہ خطرہ بنوغفار سے رہتا تھا جو حرم کے نزدیک شام کے راستے میں آباد تھے۔یہ عقیدے کے لحاظ سے بھی الگ تھے۔قریش کے بتوں، کعبے اور حرم کے تصورات کو نہیں مانتے تھے، اس لیے تاجروں ہی کو نہیں بلکہ حاجیوں کو بھی لوٹا کرتے تھے۔یہاں تک کہ ان کا لقب ہی "سُرَّاقُ الْحَجِیج" پڑ گیا تھا۔ ③

قریش ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑی سیاسی ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے رہے۔انہوں نے اپنی عددی کمک کو پورا کرنے کے لیے مکہ کے نواح میں آباد بنو کِنانہ اور بنو مُدرکہ کے ان قبائل کو اپنا حلیف بنالیا تھا جنہیں ''اَحابیش'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ④

ان کے علاوہ غلاموں کی ایک الگ فوج تشکیل دی گئی تھی جسے ''عُبدان'' کہا جاتا تھا۔ ⑤

یثرب میں یہود کی آمد:

مکہ کے بعد جزیرۃ العرب کا دوسرا بڑا شہر ''یثرب'' تھا۔یہ ایک زرعی علاقہ تھا جہاں باغ اور کنویں کثرت سے تھے۔کھجور اور انگور یہاں کی خاص پیداوار تھی۔مکہ میں گرمی اور سردی شدید تر ہوتی تھی مگر ''یثرب'' کی آب وہوا نسبتاً بہتر اور معتدل تھی۔لوگوں کا زیادہ تر پیشہ کھیتی باڑی اور باغبانی تھا۔کچھ لوگ تجارت بھی کرتے۔اس میدان میں

---

① الاوائل، ابو ھلال عسکری، ص ٢٦ ؛ التاریخ الاسلامی العام، ص ١٠١

② التاریخ الاسلامی العام، ص ١٠١ ③ التاریخ الاسلامی العام، ص ١٠٦ ؛ السیرة النبویة لدکتور علی محمد الصلابی: ٥٧/١

④ التاریخ الاسلامی العام، ص ١٠٨ ⑤ سیرة ابن هشام: ٦٧/٢، ذکر معرکة أحد

یہودیوں کا پلہ بھاری تھا جو صنعت وحرفت میں مشہور اور اسلحہ سازی اور زیورات کی ڈھلائی کے ماہر تھے۔ یہودیوں کا ایک محلہ "بَــنـو قَيْـنُـقَـاع" ڈھلائی کے کام کا مرکز تھا[1] مگران یہودیوں میں بہت کم خاندان ایسے تھے جو نسلاً بنی اسرائیلی تھے۔ ان کی اکثریت عرب تھی، جن کا تعلق "جُذام" قبیلے سے تھا۔ یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور پھر قوم عمالقہ (جو یہود کی دشمن اور بت پرست تھی) کی زیادتیوں سے تنگ آکر شام کو خیرباد کہہ کے حجاز چلے آئے۔[2]

یثرب بنو اسرائیل کی آمد سے قبل بھی آباد تھا، اس وقت یہاں کے مقامی باشندے بنوسعد، بنوازرق اور بنومطروف تھے جو "قوم عمالقہ" سے تعلق رکھتے تھے۔ عمالقہ اس زمانے میں مکہ سمیت حجاز کے دوسرے مختلف علاقوں میں بھی آباد تھے۔ جُذام کے عربی النسل یہودی جب یثرب آئے تو یہاں کے عمالقہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنی اجارہ داری قائم کرلی۔ ان عرب یہودیوں کے یثرب آنے کی ایک بڑی وجہ اور بھی تھی۔ ان کے علماء نے تورات میں پڑھا تھا کہ آخری نبی ہجرت کرکے ایسے نخلستان میں آئیں گے جس کے دونوں طرف جھلسی ہوئی سطح مرتفع ہوگی۔ یثرب ان نشانیوں پر پورا اترتا تھا، اس لیے بہت سے یہودی یہاں آباد ہوگئے۔ یہ "یثرب" میں یہود کا پہلا قدم تھا۔[3]

ایک مدت تک "یثرب" پر یہود کی بالادستی قائم رہی۔ صدیوں بعد جب یمن میں مآرب کا مشہور زمانہ بند ٹوٹا اور سبا کی عظیم الشان سلطنت پارہ پارہ ہوئی تو وہاں کے قحطانی عربوں کے دو قبیلے نقل مکانی کرکے یثرب آگئے۔ یہ قبائل اَوس اور خَزرج تھے۔ اَوس کے لوگ یثرب کے زرعی علاقوں میں یہودی آبادیوں کے قریب سکونت پذیر ہوئے۔ خزرج نے یثرب کے وسط میں گھر بنالیے، رفتہ رفتہ اَوس اور خزرج کی آبادی بڑھ گئی اور وہ یثرب کی ایک بڑی طاقت بن گئے، تاہم یہودیوں نے تعداد کی کمی کے باوجود اپنا سیاسی واقتصادی وزن باقی رکھا۔ تجارتی اور صنعتی لحاظ سے وہ بہرحال فائق تھے، مختلف ہتھکنڈوں اور مکروفریب کے ذریعے انہوں نے کبھی اَوس اور خزرج کو اپنے اوپر غالب نہ آنے دیا۔ ان دونوں طاقتوں کے درمیان جنگوں، معاہدوں، مذاکرات اور سیاسی چپقلش کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔

۷۰ء میں جب رومیوں نے شام میں یہودیوں پر زندگی تنگ کرکے انہیں بھاگنے پر مجبور کیا تو ایک بار پھر یہودیوں کے بہت سے خاندان "یثرب" میں آکر آباد ہوگئے، جن میں زیادہ تر بنونضیر اور بنوقُرَیظہ کے لوگ تھے۔ یہ دونوں قبیلے بھی عرب النسل یہودی تھے اور "جُذام" کی شاخ تھے۔[4]

یہ "عرب قومیت" ہی کا اثر تھا کہ یہ لوگ یہودی ہونے کے باوجود آثارِ ابراہیمی کا پورا پورا احترام کرتے تھے، مکہ اور خانہ کعبہ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ اسرائیلی نسل کے یہودی عموماً فریب کار اور بزدل تھے مگر یہ عرب

---

① المفصل فی تاریخ العرب: ۲۹۲/۷، عربی میں لوہار کو "قین" کہتے ہیں جبکہ قاع کا مطلب ہے جگہ، پس قینقاع کا ترجمہ "کوچہ لوہاراں" ہوسکتا ہے۔

② التنبیہ والاشراف للمسعودی، ص ۲۱۳ ؛ تاریخ ابن خلدون : ۳۴۳/۲

تاہم ان میں صحیح النسب بنی اسرائیلی بھی تھے جیسا کہ اُمّ المؤمنین صَفیّہ رضی اللہ عنہا کے والدین۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا تھا: "تم نبی کی بیٹی ہو، تمہارا چچا پیغمبر ہے۔" (یعنی حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام) ﴿سنن الترمذی، ح: باب فضل ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم﴾

③ معجم البلدان: ۸۲/۵، مدینۃ یثرب ④ تاریخ یعقوبی، ص ۷۹، ۸۰ باب ملوک الشام ؛ ص ۱۲۲، ۱۲۳، باب بنو نضیر، بنوقریظہ

یہودی چالاک ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے جنگ آزما بھی تھے۔ ان کے نام بھی عربوں ہی جیسے تھے۔ بعد میں اَوس اور خزرج کے بعض لوگ بھی ان کے ہم مذہب ہو گئے۔[1]

ان جنگجو یہودیوں نے ''یثرب'' میں فصیل بند بستیاں اور قلعے بنا کر یہودی آبادی کو عسکری طور پر مضبوط کر دیا۔[2]

یثرب کو شمال کے بعد جنوبی حملہ آوروں کا سامنا بھی ہوا۔ جب یمن کے تُبَّـــع بادشاہوں کو عروج حاصل ہوا تو آخری تُبّع اسعد ابوکرِب نے جسے ''حسان تبّع'' بھی کہا جاتا ہے، یثرب پر چڑھائی کی۔ یثرب کے لوگوں نے اس کا بڑی پامردی سے سامنا کیا، خصوصاً خزرج کے بنونجّار نے بھرپور مقابلہ کیا۔ حسان تُبّع نے یثرِب کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا تہیہ کیا ہوا تھا مگر شہر کے دفاع کے لیے یہودی اور عرب یکجا تھے، چنانچہ اس موقع پر دو یہودی عالموں نے حسّان کو خبردار کرتے ہوئے کہا: ''ایسا مت کرنا کیوں کہ یہ جگہ نبی آخرالزماں کی ہجرت گاہ بنے گی۔''

یہ سن کر حسان تُبّع نہ صرف اپنے ارادے سے باز آ گیا بلکہ واپسی میں اس نے مکّہ میں قیام کیا اور انہی یہودی علماء کی ہدایت کے مطابق کعبہ کا طواف کیا اور اسے نیا غلاف پہنایا۔[3] اس نے بنوجُرہُم کو جو اس دور میں کعبہ کے والی تھے، تنبیہ کی کہ وہ بیت اللہ اور مسجد الحرام کو ہر قسم کی نجاست سے پاک رکھنے کا اہتمام کریں۔[4]

یثرِب میں اَوس وخزرج اور یہود کی کش مکش:

آنے والے دور میں یثرب کے یہودیوں اور عربوں کے تعلقات جو شروع میں دوستی اور تعاون پر مبنی تھے، کشیدہ ہوتے چلے گئے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اَوس اور خزرج اپنی عددی کثرت کی وجہ سے اب یثرب کی اصل غالب طاقت کی حیثیت اختیار کر گئے تھے، یہودی اپنی بستیوں اور قلعوں میں خودمختار ہونے کے باوجود ان سے خطرہ محسوس کرتے تھے، اس لیے وہ ان سے عداوت پر اتر آئے اور ان میں پھوٹ ڈلوانے کے لیے متحرک رہے۔ اس کا موقع انہیں آسانی سے مل گیا؛ کیوں کہ اَوس اور خزرج میں سے ہر ایک مکمل غلبے کا خواہش مند تھا۔ عروج کی طرف مائل ان دونوں عرب قبیلوں میں سے ہر ایک جب اپنی طاقت بڑھانے میں مصروف ہوا تو اتحاد واتفاق کی کڑیاں ٹوٹ گئیں، پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذرا ذرا کے بہانے پر دونوں میں تلواریں چلنے لگتیں۔ دوسرے عرب قبائل بھی حلیف بن کر اس آگ میں کودتے رہے۔

ان نسل در نسل جاری لڑائیوں میں سے پہلی جنگ ''صفینہ'' تھی اس کے بعد یوم حاطب، یوم البقیع اور یوم الدار جیسے معرکے ہوئے۔ ان جنگوں کی آگ بھڑکانے میں یہود کا کردار کسی سے مخفی نہ تھا۔ ان کے بعض قبائل ایک فریق کا ساتھ دیتے اور بعض دوسرے کا۔

---

① نبی رحمت ﷺ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ص ۲۳۳

② تاریخ ابن خلدون ۲/ ۲۱،۳۴۳ ؛ نبی رحمت ﷺ، ص ۲۲۲ بحوالہ تاریخ الیهود فی بلاد العرب، اسرائیل ولفنسن، ص ۹.

③ تاریخ ابن خلدون: ۲/ ۶۱

④ البدایة والنهایة: ۲/ ۱۲۶

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اَوس اور خزرج (مدینہ کے عرب باشندے) اور یہود کے تعلقات ذاتی نفع اور استحصال پر مبنی تھے۔ یہود اُن دونوں قبیلوں کو لڑانے پر بھی اپنے فائدے کی صورت میں بہت خرچ کرتے تھے، جیسا کہ اَوس و خزرج کی متعدد لڑائیوں میں انہوں نے کیا تھا جن کے نتیجے میں یہ دونوں قبیلے تباہ ہو رہے تھے۔ اُن کے پیش نظر صرف یہی رہتا تھا کہ مدینہ پر ان کا مالی تسلط برقرار رہے۔''[1]

طائف:

مکّہ اور یثرب کے بعد جزیرۃ العرب کا تیسرا بڑا شہر ''طائف'' مکّہ کے جنوب مشرق میں تقریباً ۷۵ میل (۱۲۰ کلومیٹر) دور واقع تھا جہاں بنوثقیف کے لوگ آباد تھے۔ سطح سمندر سے ساڑھے پانچ ہزار فٹ بلند یہ شہر اپنی خوش گوار آب و ہوا، سرسبزی و شادابی اور پھلوں کی کثرت کی وجہ سے مشہور تھا۔ مکہ کے رؤسا نے یہاں بہت سے باغ خرید رکھے تھے اور موسم گرما یہیں گزارتے تھے۔ اپنی خوبصورتی اور خوشحالی کے باعث یہ شہر مکّہ کے ہم پلہ مانا جاتا تھا۔[2]

عربوں کے ہاں شہروں کے گرد فصیلیں بنانے کا رواج نہ تھا۔ مکہ اور یثرب جیسے شہر فصیلوں اور قلعوں سے محروم تھے، مگر طائف کے گرد بلند فصیل سر اُٹھائے کھڑی تھی۔[3] اس طرح دفاعی لحاظ سے یہ عرب کے تمام شہروں سے زیادہ مستحکم تھا۔

☆☆☆

دُنیا تباہی کے دہانے پر

چھٹی صدی عیسوی کا نصف بیت چکا تھا۔ دنیا اپنی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں کے باوجود ہدایت سے خالی تھی۔ آسمانی رہنمائی کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں ملتا تھا۔ ہندومت ہو یا بدھ مت، عیسائیت ہو یا یہودیت، ہر مذہب چند مخصوص افراد کی محدود سوچ کا مرقع نظر آتا تھا۔ دینی پیشوا ہدایت کی طلب، خدا خوفی اور آخرت میں جوابدہی سے غافل تھے۔ جو مذاہب کبھی سابقہ انبیائے کرام کی تعلیمات کے نقیب تھے، اب تحریف در تحریف کا شکار ہو کر متاعِ بازار ہو چکے تھے۔ انبیائے کرام کی کتب اور صحیفے اپنی اصل شکل میں محفوظ نہ تھے۔

ہندومت:

اس دور میں رائج مذاہب میں سے سب سے قدیم شاید ہندومت تھا جو مشرق میں تقریباً پورے جنوبی ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ یہ ایک ایسا گورکھ دھندا تھا جسے اس مذہب کے پیشوا بھی سمجھنے اور سمجھانے سے قاصر تھے۔

---

① نبی رحمت ﷺ، سید ابوالحسن علی ندوی، ص ۲۳۱

② معجم البلدان: ۳/ ۹،۸، طائف

③ الکامل فی التاریخ: ۱/ ۶۰۶

ہمالیہ سے لے کر بحر ہند کے ساحل تک ۳۳ کروڑ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی جارہی تھی، گائے، بندر اور سانپ سے لے کر چوہے تک کی عبادت ہو رہی تھی۔ ہر محلے بلکہ ہر گلی کوچے میں الگ الگ معبود تھے۔

ایک ہندو مؤرخ کے بقول خداؤں کی تعداد ہندوستان کی آبادی سے بھی بڑھ گئی تھی۔ ایک دیوی کا پجاری دوسرے کے معبودوں کو ماننا اپنی توہین سمجھتا تھا، چنانچہ ہندو مذہب کی وضاحت ہی تقریباً ناممکن ہوگئی تھی، اگر کوئی پوچھتا کہ ہندو کسے کہتے ہیں؟ تو شاید جواب میں یہ کہا جاتا کہ ہر بت پرست ہندو ہے مگر یہ جواب بھی اس وقت غلط محسوس ہوتا جب لوگ دیکھتے تھے کہ ہندو رہنماؤں نے خدا کے وجود کا انکار کرنے والوں کو بھی 'ناستک' کا نام دے کر ہندو دھرم میں شامل رکھا ہے اور شودروں کو بھی ہندو شمار کیا ہے، حالانکہ انہیں مندروں میں آنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔

بدترین اعتقادی گمراہیوں کے بعد ذات پات کی تفریق ہندو سماج کا دوسرا روح فرسا المیہ تھا۔ ہندوؤں کے ہاں برہمن خدا کی اولاد، ہر گناہ سے پاک اور ہر چیز کے مالک سمجھے جاتے تھے، کیوں کہ وہ مذہبی پیشوا تھے۔ کھتری سیاسی و عسکری امور کے مالک تھے۔ انہوں نے برہمنوں کو فکرِ معاش سے آزاد کر دیا تھا اور باقی قوم کو ظلم واستحصال کی چکی میں پیسنا اپنا مشغلہ بنالیا تھا۔ ویش جو تیسرے درجے کی ذات تھے، تجارت، زراعت اور صنعت وحرفت کے ذریعے دونوں بالادست طبقوں کے لیے سرمایہ پیدا کرنے میں جتے رہتے تھے جبکہ چوتھے درجے میں آنے والی ذات شودروں کا حال جانوروں سے بھی بدتر تھا۔ وہ اونچی ذات والے کے ساتھ بیٹھنا تو درکنار اُن کی کسی چیز کو چھو بھی نہیں سکتے تھے۔ انہیں پیدائشی گناہ گار، ازلی مجرم اور دیوتاؤں کا دھتکارا ہوا قرار دے دیا گیا تھا۔ ان کا ہر فرد پیدا ہوتے ہی اونچی ذات والوں کا غلام تھا۔ ان پر ہر ظلم وستم ڈھانا روا تھا اور ان کا صدائے احتجاج بلند کرنا بدترین جرم۔ ①

شاہ معین الدین ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”برہمن کے لیے کسی بھی حالت میں کوئی بھی سزا نہ تھی، اگر اچھوت اونچی ذات والے کو چھو لیتے تو ان کی سزا موت تھی۔ نیچے طبقے مذہبی تعلیم سے قانوناً محروم کر دیے گئے تھے۔ اخلاقی حالت انتہائی شرمناک تھی۔ ایک ایک عورت کئی کئی شوہر کر سکتی تھی، شراب گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، بدمستی میں ہر گناہ ثواب بن جاتا تھا...... مندر کے پجاری بداخلاقیوں کا پیکر تھے۔ دیوداسیوں کی اخلاقی حالت شرمناک حد تک گری ہوئی تھی۔ عورتوں کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی...... بعض طبقوں میں لڑکیاں قتل کر دی جاتی تھیں...... عورت شوہر کی موت کے بعد تمام دنیاوی فوائد سے محروم کر دی جاتی تھی، اس لیے وہ شوہر کے ساتھ جل کر مر جانے کو زندگی پر ترجیح دیتی تھی۔“ ②

بُدھ مت:

جنوبی ایشیا کا دوسرا بڑا مذہب ”بُدھ مت“ تھا جس کا بانی شہزادہ سدارتھ تھا جسے گوتم بدھ کے نام سے یاد کیا جاتا

① ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین لابی الحسن علی الندوی، ص ۴۸ تا ۵۳

② تاریخ اسلام، شاہ معین الدین ندوی: ۱/ ۲۴، ط دارالاشاعت

ہے۔ ہندو مذہب میں ذات پات کی انسانیت سوز حد بندیوں سے تنگ آ کر اُس نے تنہائی میں مراقبے اور ذاتی غور و فکر کے بعد ایک نیا اخلاقی نظام پیش کیا جس میں سب انسان برابر تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب کے ردِ عمل میں اس نے کروڑوں دیوی، دیوتاؤں کا اس طرح انکار کیا کہ ایک خدا کا قائل ہونا بھی ضروری نہ سمجھا۔ بدھ نے ذات پات کی قید سے آزادی دلانے کا نعرہ لگا کر کروڑوں انسانوں کو چونکا دیا مگر خدا کے تصور کا خانہ خالی ہونے کی وجہ سے یہ مذہب ایک زمانے تک لوگوں کو متاثر نہ کر سکا۔ گوتم بدھ کے بعد بدھ مت کے پیشواؤں نے اشاعتِ مذہب کی کوشش کی تو ایک محسوس خدا کو پوجنے کی عوامی خواہش کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے گوتم بدھ ہی کو خدا قرار دے دیا اور اس کی مورتی کی پوجا کو اتنا رواج دیا کہ ہندوؤں کی بت سازی اور صنم پرستی بھی پیچھے رہ گئی۔ بدھ کے مجسمے وسطِ ایشیا سے مشرقِ بعید اور بحرالکاہل کے جزائر تک نصب ہو گئے۔ یوں وحی کی رہنمائی سے محروم ہونے کے سبب ایک نئی اصلاحی تحریک مستقل گمراہی کا جال بن گئی۔[1]

ایران کی مذہبی اُفتاد:

مشرق کی سب سے بڑی طاقت ایران و خراسان اور وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی ساسانی سلطنت تھی۔ شاہانِ ایران مجوسی تھے اور صدیوں سے آتش پرستی کو فروغ دے رہے تھے۔ مجوسی مذہب کا بانی زَرتُشت (زردشت) تھا جو ساتویں صدی قبل از مسیح میں نمودار ہوا۔ اسی نے روشنی اور اندھیرے، نیکی اور برائی اور خدائے خیر و خدائے شر کے درمیان جنگ کا تصور پیش کر کے لوگوں کو آتش پرستی کا خوگر بنایا۔ مجوسی سورج اور چاند کو بھی پوجتے تھے۔ اس کے علاوہ خود ایرانی بادشاہ کسریٰ بھی اپنے آپ کو خدا کہلواتا تھا۔ خسرو پرویز کے نام کے ساتھ یہ القاب لگائے جاتے تھے ''خداؤں میں انسان غیر فانی اور انسانوں میں خدائے لاثانی۔''[2]

ان سب خداؤں کے اوپر وہ نیکی اور بدی کے دو الگ الگ خداؤں کو سب سے بالاتر مانتے تھے، نیکی کو فروغ دینے والا خدا ''یَزداں'' اور برائی کا مالک خدا 'اَہرمَن' کہلاتا تھا جو شیطان کا بگڑا ہوا تصور تھا۔ ان کے خیال میں روزِ ازل سے یزداں اور اہرمن میں کش مکش جاری چلی آ رہی تھی اور اسی وجہ سے کائنات میں خیر و شر، تعمیر و تخریب اور فتح و شکست کی مختلف شکلیں سامنے آتی رہتی تھیں۔ یہ ایرانیوں کے عقیدے کی بنیاد تھی جس پر عجیب و غریب اعتقادات قائم تھے جو گاہے گاہے رنگ بدلتے رہتے تھے۔

مجوسیت چند مخصوص عبادتوں کا نام تھا جو خاص اوقات میں آتش کدے میں ادا کی جاتی تھیں۔ آتش کدے سے باہر ہر مجوسی شرعی و اخلاقی حدود سے بالکل آزاد تھا۔ سود خوری، شراب نوشی اور زنا کاری جیسے گناہ جو اکثر معاشروں میں برے سمجھے جاتے تھے، ان کے نزدیک بالکل جائز تھے، یہاں تک کہ محارم سے جنسی تعلقات قائم کرنا بھی ان کے ہاں درست تھا۔

چونکہ یہ مذہب اخلاقی تعلیمات سے یکسر خالی تھا، اس لیے اس کے ایک ہزار سال بعد (تیسری صدی عیسوی میں) ''مانی'' نے ''مجوسیت'' میں اصلاحات کا بیڑا اُٹھایا اور دنیا سے برائیوں کے خاتمے کے لیے لوگوں کو دنیا ترک کرنے،

---

[1] ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین لابی الحسن علی الندوی: ص ۳۶ تا ۳۸

[2] نبی رحمت ﷺ: ص ۴۷

جنگلوں میں جا بسنے اور نکاح واولاد کی ذمہ داریوں سے دور بھاگنے کی ترغیب دی۔ یہ ایک دوسری انتہا تھی جو انسانی معاشرت کے تقاضوں کے بالکل خلاف تھی، اس لیے پانچویں صدی عیسوی میں جبکہ آلِ ساسان کی حکومت کا سورج نصف النہار پر تھا، ''مزدک'' نے نئی اصلاحات پیش کیں، جن کے تحت انسان کو ہر طرح کی عیاشی کی اجازت دے دی گئی، نہ صرف کھانے پینے، جائیداد اور مال ودولت میں بلکہ عورتوں سے جنسی تعلقات میں بھی تمام مردوں کو برابر کا حق دے دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ایک دوسرے کے گھروں کو لوٹنے لگے، کھیتوں اور املاک پر قابض ہونے لگے، جو شخص جہاں چاہتا، جس عورت کو چاہتا اپنی جنسی تسکین کے لیے پکڑ لیتا۔

غرض ایرانی سلطنت اور معاشرت جو بلوچستان سے سمرقند وبخارا تک اور خراسان سے ایشیائے کوچک کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی، کبھی اس توازن اور اعتدال سے ہم آہنگ نہ ہوسکی جو ایک کامیاب اور پرامن معاشرے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے برعکس وہاں بدامنی، تشدد، ظلم اور استحصال کا دور دورہ تھا، عوام انتہائی غربت اور بدحالی کی تصویر تھے، جبکہ حکمران اس کے برعکس دنیا کو جنت بنانے میں مصروف تھے۔ ایرانی شہنشاہیت کے زیرنگین دودرجن کے لگ بھگ سلطنتوں کی آمدن کا اکثر حصہ بادشاہ اور شاہی اعیان کی تفریحات اور عیاشیوں میں خرچ ہورہا تھا۔ پایۂ تخت مدائن میں کسریٰ کے شاہی باورچیوں کی تعداد ایک ہزار سے زائد تھی، جبکہ گلوکاراؤں، رقاصاؤں، سازندوں، موسیقاروں، شکاری چیتوں، کتوں اور ان کو سدھانے والوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ تھی۔ موسم گرما کو موسم بہار بنانے کے لیے کسریٰ نے مشہورِ زمانہ ''قالینِ بہار'' تیار کرایا تھا جس کے ایک ایک مربع فٹ پر ہزاروں اشرفیاں خرچ ہوئی تھیں۔[1]

چین کی اعتقادی حالت:

مشرق کا آخری بڑا ملک چین اپنی تمام تر سرحدی وسعتوں، معدنی دولتوں، غیرمعمولی ذہنی صلاحیتوں اور تہذیب و تمدن کی نفاستوں کے باوجود ''کنفیوشس'' کے فلسفے سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پانچ سو پچپن سال پہلے چین کے علاقے شانتونگ میں پیدا ہوا تھا اور پھر ایک فلسفی کی حیثیت سے متعارف ہوکر تین ہزار سے زائد شاگرد پیدا کرگیا تھا۔ اس مشرقی مفکر نے چند اخلاقی تعلیمات کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کرکے انسانی ذہن کو ایک محدود دائرے میں سوچ بچار کی راہ پر ضرور لگایا تھا مگر انسانی روح اور انسانی معاشرے کو درپیش ان عالمگیر مسائل کا حل پیش کرنے سے وہ بالکل قاصر رہا جو انسانیت کے اجتماعی ضمیر کے لیے المیہ بن چکے تھے۔[2]

یورپ کی اخلاقی وروحانی ابتری:

مشرق میں تہذیب وتمدن کی ایک گہما گہمی ضرور تھی مگر مغرب کا حال اس سے کہیں زیادہ برا تھا۔ مشرقی یورپ سے لے کر وسطی اور مغربی یورپ تک سوائے جہالت، افلاس، آلودگی اور جمود کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یورپی باشندے

---

[1] السیرۃ النبویۃ لأبي الحسن علي الندوي، ص ۳۳ تا ۳۶

[2] ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین، ص ۴۶

علوم وفنون سے بالکل بے بہرہ تھے۔ باقی دنیا سے انہیں کچھ سروکار نہیں تھا۔ سیاست ہو یا معاشرت، تعلیم ہو یا صنعت و تجارت ہر چیز پر بدعقیدہ اور متعصب پادریوں کی اجارہ داری تھی جن کی انتہا پسندی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ایک طرف تو جدید علوم وفنون کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے کائنات میں غور وفکر اور تحقیق وایجادات کی ہر کوشش کو ممنوع قرار دے دیا تھا جس کی وجہ سے ذہین لوگوں کی فکری ونظری صلاحیتیں معطل ہو کر رہ گئی تھیں۔ دوسری طرف انہوں نے رومی سلطنت کی تقسیم کے ساتھ ساتھ کلیسا کو بھی دو حصوں، مشرقی کلیسا اور مغربی کلیسا میں بانٹ لیا تھا۔

مشرقی کلیسا کا مرکز قُسطَنطِینیّہ تھا، جسے آرتھوڈکس چرچ کہا جاتا تھا، اس کا سربراہ ''بطریق'' (Patrick) کہلاتا تھا۔ مغربی کلیسا کیتھولک چرچ کے نام سے موسوم ہو چکا تھا، جس کا پیشوا پوپ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ قُسطَنطِینیّہ اور روم کی سیاسی عداوت کے ساتھ دونوں چرچوں میں بھی دشمنی بڑھتی جاتی تھی۔ دونوں اپنے اپنے عقائد ایک دوسرے پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ مشرقی کلیسا کہتا تھا کہ باپ (خدا) کا رتبہ بیٹے (یسوع مسیح) سے بڑا ہے، جبکہ مغربی کلیسا دونوں کو بہر حال برابر قرار دیتا تھا۔ ایسے کئی تنازعے تھے جن کی وجہ سے باہم لعنت اور تکفیر کی نوبت بھی آجایا کرتی تھی۔ اس صورتِ حال سے متنفر ہو کر ہزاروں لوگ اپنا دین وایمان بچانے کے لیے جنگلوں میں جا بسے اور راہب کہلائے مگر کسی نوشتۂ ہدایت سے محرومی کی وجہ سے وہ خود نت نئی گمراہیوں کا شکار بن گئے۔[1]

ان مذہبی لوگوں کو عام زندگی کے مسائل پر غور کرنے کی قطعاً فرصت نہیں تھی۔ پادریوں اور راہبوں کی بڑی تعداد تشدد پسند، مردم بیزار اور قنوطی تھی۔ وہ خود کو اذیت پہنچا کر خدا کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انسانی معاشرے سے وہ بالکل کٹے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں اب تک یہ طے نہیں ہوا تھا کہ عورت کو کسی چیز کے خریدنے بیچنے یا اس کا مالک بننے کا حق حاصل ہے۔ وہ اس پر بھی پورا یقین نہیں رکھتے تھے کہ عورت انسان ہے۔ ان کے بعض حلقوں میں صنفِ نازک کو کتے، بلی جیسا حیوان مانا جاتا تھا۔ انہیں اس میں بھی شک تھا کہ عورت میں روح ہے یا نہیں۔ بعض لوگ اسے ایک بے جان مشین ہی تصور کرتے تھے۔[2] رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے:

''اس دور کی وحشت وبہیمیت قدیم زمانے کی وحشت اور درندگی سے کئی گنا زیادہ تھی کیوں کہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش جیسی تھی جو گل سڑ گئی ہو۔''[3]

یورپ میں یہ دور افراتفری اور انتشار کا تھا، اٹلی اور فرانس سے مشرقی یورپ اور قُسطَنطِینیّہ تک سیاسی رسہ کشیوں اور طوائف الملوکی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی مصلح یا مجدد نہیں تھا جو جہالت کی ان تاریکیوں میں راہِ راست کی طرف ہلکا سا اشارہ دیتا۔ ان کے پاس اصل انجیل کا کوئی مستند نسخہ باقی نہیں بچا تھا بلکہ وہ مدتِ دراز بعد دریافت ہونے

---

① تفسیر ابن کثیر، سورۃ الحدید، آیت: ۲۷ ؛ التحفة المَقْدَسية فی مختصر تاریخ النصرانية للعاصم المَقْدسی، ص ۹۶ تا ۱۱۱

② السیرة النبویة لابی الحسن علی الندوی: ص ۴۰ تا ۴۲

③ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین لابی الحسن علی الندوی: ص ۳۸، نقلاً عن (The Making of humanity. P:164)

والے ان نسخوں کو انجیل کا متبادل مان چکے تھے جو حواریوں کی یادداشتیں تھیں اور ان میں بھی بے پناہ تحریف ہو چکی تھی۔

دینِ عیسوی کے اصل داعی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ﴾ ”بے شک اللہ ہی میرا اور تمہارا رب ہے، پس تم اس کی عبادت کرو۔“[1]

مگر مسیحی پیشوا کا روپ دھارنے والے عیار یہودی ”پولس“ نے مسیحیت کی توحید کو تثلیث سے بدل ڈالا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا صلیب کے پیروکار بن گئے تھے۔ یونانی فلسفے کے اثرات میں بہہ کر انہوں نے سیدھی سادی توحید کی دعوت کو چھوڑ دیا تھا اور رومی بت پرستوں کو جلد متاثر کرنے کی غرض سے باپ، بیٹے اور روح القدس کا عجیب وغریب فلسفہ مان لیا، جس نے باقاعدہ عقیدۂ تثلیث (تین خداؤں پر یقین) کی شکل اختیار کر لی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں انہوں نے یہودیوں کی باتوں پر یقین کر لیا تھا جو کہتے تھے کہ ہم نے عیسیٰ کو قتل کر دیا ہے، حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا تھا۔[2]

اس میں شک نہیں کہ چھٹی صدی ہجری کے آخر میں بھی کہیں کہیں ایسے عیسائی مل جاتے تھے جو توحید کے قائل اور مروجہ عیسائیت سے بے زار تھے، مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم تھی اور جو تھے وہ کسی اصلاحی کوشش کی کامیابی سے مایوس تھے اور گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔

فلاسفۂ یونان:

اس دور میں تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کا ایک قدیم مرکز یونان تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہاں بازارِ فلسفہ کی رونق ماند پڑ چکی تھی، مگر اب بھی اسے سُقراط، افلاطون اور اَرِسطو جیسے دانشوروں کی سرزمین کے حوالے سے جانا جاتا تھا۔ یہ سب کے سب اپنے دور کے نامور فلسفی تھے۔ سُقراط حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً چار سو سال پہلے گزرا تھا۔ اس کے نامور شاگرد اَفلاطُون کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ساڑھے تین سو سال پہلے کا ہے۔ پھر اَرِسطو آیا جو نامور یونانی فاتح سکندرِ اعظم کا استاد اور مشیر تھا۔ یونان کے شاہی خاندان کی سرپرستی میں ان فلسفیوں کی دکانیں خوب چمکیں۔ سکندرِ اعظم نے مشرق کو افکارِ فلاسفہ سے آشنا کرنے کی خاطر مصر میں اِسکندریہ کا شہر بسایا اور وہاں فلسطینیوں کو آباد کیا، اس طرح مشرق میں بھی فلسفیانہ علوم کی اشاعت شروع ہو گئی۔ یہ فلسفی ہر چیز اور ہر معاملے کو عقل کے ترازو میں تولنے کے عادی تھے، وہ کسی بھی مسئلے میں صحیح یا غلط کا فیصلہ کرنے کے لیے انسانی عقل کو کافی قرار دیتے تھے اور وحی کی ضرورت کا انکار کرتے تھے۔

ان فلسفیوں نے نہ صرف طب، فلکیات، ریاضی اور سیاست کے معاملات پر بحث کی بلکہ خدا، کائنات، خیر وشر اور مخلوق کے آغاز وانتہا کے مسائل کو بھی صرف اپنی سوچ سے حل کرنے کی کوشش کی۔ یہاں ان کا قدم ایسا پھسلا کہ وہ دور دراز کی گمراہیوں میں جا گرے۔ وہ عقل پر اکتفا کرنے کی وجہ سے خالق کی معرفت سے بالکل جاہل رہے۔ آخرت اور

[1] سورۂ آل عمران، آیت: 51 [2] التحفة المقدسية في مختصر تاريخ النصرانية للعاصم المقدسي: ص 70 تا 93

حشر ونشر کے بارے میں ان کا ذہن کبھی صاف نہ ہو سکا۔ اپنے علم کو حتمی اور کامل تصور کرنے کی وجہ سے انہوں نے کبھی رسولوں کی تعلیمات پر غور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس طرزِ فکر نے فلاسفہ اور ان کے پیروکاروں کو ایک طرح سے خدا اور آخرت کا منکر ہی بنا دیا۔ اس طرح شریعت اور وحی، حلال وحرام کے الفاظ ان کے لیے بے معنی ہو گئے۔

اس کے نتیجے میں یونان سمیت فلسفے سے متاثرہ ہر علاقے میں ایک مادر پدر آزاد تہذیب وجود میں آئی جس میں شکوک وشبہات میں سرگرداں رہنے کو ''علم'' کا نام دیا گیا، عریانی اور فحاشی کو تہذیب وثقافت مان لیا گیا۔ فلاسفہ کی دی ہوئی تہذیب نے یونان کا یہ حال کر دیا کہ ''ایتھنز'' کے چوکوں اور بازاروں میں فاحشہ عورتیں سرِعام دعوتِ گناہ دیا کرتی تھیں۔ فلسفیوں کے دورِ عروج میں برہنگی یونانی تہذیب کا ایسا لازمی حصہ بن گئی کہ فنونِ لطیفہ کی ہر صنف چاہے مصوری ہو یا مجسمہ سازی، اس کی عکاسی کرتی تھی۔ تھیٹروں میں عورتوں کا عریاں رقص کرنا عام بات تھی۔ کھیل کے میدانوں میں لوگ بالکل عریاں ہو کر کھیلتے اور تماشائی داد دیتے۔ بدکاری، فحاشی، کھیل کود، ناچ گانا اور عیش وتفریح ہی زندگی کا مقصد ٹھہری۔

نئے نئے نظاروں سے عیش اور تفریح کا ذوق اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ امراء اور شہزادے قیدیوں کو بھوکے درندوں سے لڑاتے اور اس تماشے سے محظوظ ہوتے، جنسی تسکین کے نت نئے طریقوں کی تلاش نے لوگوں کو فطری انداز سے اتنا منحرف کر دیا تھا کہ بڑے بڑے شرفاء ہم جنس پرستی کی لت میں پڑے ہوئے تھے۔ عام اوباشوں کا پوچھنا ہی کیا جنہیں بازاروں میں عصمت فروش عورتوں کے جوتے چاٹتے دیکھا جا سکتا تھا۔

چھٹی صدی عیسوی کے اس دور میں جس کی ہم بات کر رہے ہیں، یونان کی جگہ روم کا طوطی بول رہا تھا اور عروجِ فلاسفہ کے سنہرے ایام بیت چکے تھے، تاہم رومی تہذیب کے انگ انگ میں فلسفیانہ خیالات رچے بسے تھے اور تقریباً وہ تمام برائیاں موجود تھیں جن کا بیج فلسفے نے بویا تھا۔ [1]

لفاظی ہی لفاظی:

سب سے زیادہ مایوس کن بات یہ تھی کہ مشرق ومغرب کے ان فلسفیوں، انقلاب کے ان داعیوں اور انسانیت کے ان رہنماؤں کی تعلیمات صرف کتابی اور نظری تھیں۔ عملی طور پر ان تعلیمات کا کوئی نمونہ دیکھنے کی کوشش کرنے والے کو سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہ آتا۔

ان میں کسی فلسفی یا داعی کی عملی زندگی اس بارے میں کوئی رہنمائی فراہم نہیں کرتی کہ انسان کس طرح روح وجسم کی پاکیزگی حاصل کرے، اس کی جلوت اور خلوت کیسی ہو، گفتار وکردار میں کیا جوہر ہوں، اس کا خالق سے تعلق کیسا ہو اور مخلوق سے کیسا۔ وہ خوشی میں کن جذبات سے آراستہ ہو اور رنج وصدمے میں اس کا رویہ کیا ہو۔ فتح اور کامیابی کے موقع پر اس کا برتاؤ کیا ہو اور شکست، مصیبت اور ناکامی سے دوچار ہو کر اس کے تاثرات کیسے ہوں، وہ کیسے سوئے، کیسے

① السیرۃ النبویۃ لابی الحسن علی الندوی، ص ۴۰ تا ۴۲؛ قضایا المرأۃ فی المؤتمرات الدولیۃ لدکتور فؤاد بن عبدالکریم، ص ۴۴۲

جاگے، بڑوں اور بزرگوں سے اُس کا سلوک کیسا ہو اور چھوٹوں سے کس طرح پیش آئے، گھریلو زندگی کن خوبیوں کا مرقع ہو اور معاشرتی مصروفیات میں طور طریقے کیا ہوں؟ دنیا کو اِن سوالات کے عملی جوابات کی ضرورت تھی مگر لگتا تھا کہ عمل کی نعمتِ عظمیٰ انبیائے سابقین کے ساتھ ہی دنیا سے معدوم ہو چکی۔

یہود گمراہی میں غلطاں:

اگر سرسری نظر سے دیکھئے تو اس دور میں دوسروں کی بہ نسبت "یہودیوں" سے یہ توقع زیادہ کی جاسکتی تھی کہ ان میں کوئی نیا مصلح پیدا ہو جو انتہائی بگڑے ہوئے معاشرے میں کوئی تبدیلی لا سکے کیوں کہ ہزاروں برس سے بنی اسرائیل میں انبیائے کرام کا سلسلہ چلا آ رہا تھا، پھر ان کے پاس تورات کی شکل میں ایک ہدایت نامہ موجود تھا، جس میں جابجا تحریف کے باوجود ایک آخری پیغمبر کی نشانیاں بہر حال اب تک درج تھیں۔ خود یہود کو بھی یقین تھا کہ وہ آخری پیغمبر آنے والا ہے اور انہی میں سے ہوگا کیوں کہ صدیوں سے ان میں جلیل القدر انبیائے کرام کا ظہور ہوتا آ رہا تھا۔ یہود نے خود کو باقی معاشروں میں گھلنے ملنے سے بھی محفوظ رکھا تھا اور وہ اپنے آباء کے طور طریقوں کی حفاظت کرتے رہے تھے، ان کی علمی صلاحیتوں اور ذہانت کو دیکھتے ہوئے بھی ان میں کسی قائد اور مصلح کے ظہور کی اُمید کی جاسکتی تھی۔

مگر یہ صرف ظاہری جائزہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قوم جو صدیوں تک خدا کے انعامات و اعزازات کی مستحق رہی، اندرونی طور پر اتنی گر چکی تھی کہ اس سے کسی خیر کی توقع عبث تھی۔ یہودیوں کی ساری خرابیوں کی جڑ اُن کا غرور و تکبر تھا۔ ماضی میں بار بار اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے بہرہ ور ہونے کے بعد انہوں نے تصور کر لیا تھا کہ وہ خدا کے لاڈلے اور برگزیدہ ہیں۔ اس تصور نے انہیں مغرور کر دیا جس کے نتیجے میں وہ خود رائی اور من مانی کے مریض بن گئے، جب یہ مرض حد سے بڑھا تو انہوں نے آسمانی شریعت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش شروع کر دی۔ تورات میں جابجا لفظی تبدیلیاں کر دیں اور جو آیات اصل حالت میں باقی تھیں ان کے معانی و مطالب اپنی طرف سے ایسے طے کر دیے جو ان کی خواہشات کے خلاف نہ ہوں۔

یہ نئے معانی و مطالب یہود کے اس زعم کی عکاسی کرتے تھے کہ وہ کائنات کی بہترین مخلوق ہیں اور باقی سب انسان ان کے غلام ہیں۔ انہی من پسند تشریحات کو انہوں نے سینہ بسینہ ہدایات کا نام دیا تھا اور صدیوں سے انہی پر عمل کرتے آ رہے تھے۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار اور ان کی تعلیمات کی مخالفت بھی اس لیے کی تھی کہ ان کی تعلیمات سینہ بسینہ چلی آنے والی یہودی روایات کے خلاف تھیں اور یہودی ان روایات سے دستبردار ہونے پر تیار نہ تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اُٹھائے جانے کے ڈیڑھ سو سال بعد یہودی علماء نے تورات کی ان من پسند خفیہ تشریحات کو پہلی بار قلم بند کیا اور ان کی تشریح کا کام شروع کیا۔ اس مجموعے کو "مِشنا" کا نام دیا گیا اور یہودی علماء نے متفقہ طور پر فیصلہ سنا دیا کہ اب تورات کی بجائے "مِشنا" پر عمل ہوگا اور تورات پر عمل کرنے والے خدا کے غضب کا شکار ہوں گے۔ (بعد میں 'مِشنا' پر اضافے کر کے اسے "تلمود" کا نام دیا گیا۔ یہودیوں کے ہاں اسی پر عمل کیا جاتا ہے۔)

نفس کی خواہشات کی خاطر شریعت میں تحریف اور تاویل کے اس سلسلے نے یہود کو آسمانی ہدایت سے اس قدر دور کر دیا تھا کہ اب ان کے اندرونی حالات سے واقف کوئی بھی شخص ان سے کسی خیر کی اُمید نہیں کر سکتا تھا۔ یہودیوں کے علماء کی دین فروشی، حق فراموشی اور اغراض پسندی ضرب المثل بن چکی تھی۔ ان کے سرمایہ داروں کی حرص وہوس اور زر پرستی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ان میں ایسے لوگ بھی پیشوا اور رہنما تھے جو شیطانی طاقتوں سے کام لیتے تھے، جادو ٹونا کرتے تھے، ان کالے علوم کو وہ اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال کرتے تھے اور ذکرِ الٰہی کی بجائے جادوئی وشیطانی ریاضتوں کو اپنے مَن کی تسکین کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔ یہود کے بڑے بڑے احبار اور قائدان کی ہدایات بے چوں وچراں مان لیا کرتے تھے۔

ان سب باتوں سے بڑھ کر یہود کی بدکرداری یہ تھی کہ صدیوں کی ذلت وخواری اور احساس محرومی نے ان میں ساری دنیا کے خلاف نفرت، حسد اور انتقام کے جذبات بھر دیے تھے اور اب وہ تمام انسانیت کو اپنا غلام بنانا چاہتے تھے۔ کئی علاقوں میں انہوں نے اس قسم کے تجربات شروع کیے تھے اور ان کوششوں میں مصروف رہ کر وہ حد درجہ چالاک، مکار اور دغا باز بن چکے تھے۔ چنانچہ ان میں خفیہ تنظیمیں بنانے، جاسوسیاں کرنے، سازشیں کر کے حکومتوں کے تختے الٹنے، ایک ملک کو دوسرے کے خلاف بھڑکانے اور ایک قوم کو دوسری کے خلاف استعمال کر کے اپنے مفادات حاصل کرنے کی روش پختہ ہو چکی تھی۔ اس تنگ نظری، خود پسندی اور بے رحمی کے ہوتے ہوئے اُن سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ دنیا میں کسی مثبت تبدیلی کا ذریعہ بن پائیں گے۔ ①

اہل عرب کی دینی حالت:

چھ سو برس قبل از مسیح تک اہل عرب بت پرستی کی لعنت سے پاک اور دین ابراہیمی کے پیروکار تھے مگر رفتہ رفتہ جزیرۃ العرب سے متصل بت پرست اقوام کے اثرات ان میں سرایت کرنے لگے۔ وحی کی رہنمائی سے محرومی اور عَمرو بن لحی جیسے کج فکر لوگوں کی سربراہی نے نہ صرف قریش بلکہ جزیرۃ العرب کے تمام قبائل کو دین ابراہیمی سے بہت دور لا پھینکا اور دیکھتے ہی دیکھتے بتوں کی عبادت پورے عرب میں عام ہو گئی۔ پتھر کے مجسموں کو حاجت روا اور مشکل کشا مانا جانے لگا۔ لوگوں کا یہ عقیدہ بن گیا کہ ان مجسموں میں ایسی ارواح ہیں جو نفع وضرر کی مالک ہیں اور امورِ کائنات کے مختلف شعبوں پر قدرت رکھتی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ یہ معبود اللہ کے قرب کا وسیلہ اور اس کی بارگاہ میں سفارشی ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کے اختیارات عطا کر دیے ہیں۔ مشرکین کا خیال تھا کہ خالق کائنات تو اللہ ہے مگر اب وہ فارغ ہے اور اس کی نیابت میں دوسرے معبود تمام امور کو چلا رہے ہیں جن میں سے کوئی فتح وشکست کا مالک ہے، کوئی زندگی اور موت کا۔ کوئی روزی دیتا ہے اور کوئی صحت۔ کوئی بیماریاں دور کرتا ہے اور کوئی قحط سالی۔

حرم کے تبرکات کے ساتھ حد سے زیادہ عقیدت بھی بدعقیدگی کا سبب بنی۔ بعض عرب قبائل مکّہ سے واپسی پر

① الیهود فی العالم القدیم لدکتور مصطفیٰ کمال عبدالعلیم، ص ۱۱ تا ۲۰ ؛ ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین، ص ۳۸ تا ۴۰

یہاں کے پتھر اُٹھا کر لے جاتے، کعبہ کی طرح ان کا طواف کرتے، بعد میں ان پتھروں کی باقاعدہ پوجا ہونے لگتی۔ ①

عرب میں قسما قسم کے بت تھے۔ بعض بڑے بھاری بھرکم اور اپنی جگہ گڑے ہوئے تھے۔ مکہ کے اکثر مشہور بت ایسے ہی تھے، جبکہ ایسے ہلکے پھلکے مجسمے بھی تھے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیے جاسکتے تھے۔ عرب ان بتوں کو ''اَصنام'' کہتے تھے جو ''صنم'' کی جمع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی اصل صلم (Solm) ہے جو آرامی زبان کا لفظ ہے۔ عربی میں آکر یہ لفظ ''صنم'' بن گیا۔

بتوں کے پجاریوں کو ''کاہن'' کہا جاتا تھا اور انہیں اللہ کے تقرب اور اس سے تعلق کا واسطہ مانا جاتا تھا۔ قریش سمیت تمام عرب قبائل کاہنوں کے پیروکار تھے۔ وہ کاہنوں، پجاریوں اور بت خانے کے خصوصی خادموں کو ہمراہ لیے بغیر کبھی جنگ کے لیے نہیں نکلتے تھے۔ یہی کاہن لشکر کے لیے نیک فالی یا بدفالی کے اشارے اخذ کرتے تھے۔ اہم فیصلوں میں ان کی رائے معتبر مانی جاتی تھی۔ ان کاہنوں میں قبیلہ کلب کا زُہیر بن حباب اور قبیلہ بنوعبس کا زُہیر بن جَذِیمہ مشہور ہیں۔ ②

''مَناۃ'' وہ پہلا بت تھا جس کی عرب میں پرستش کی گئی، اسے قسمت کا مالک مانا جاتا تھا۔ اسے بنوخزاعہ کا رئیس عَمر و بن لُحَی شام سے لایا تھا۔ قریش کے علاوہ بنوہذیل اور یثرب میں آباد اَوس اور خزرج بھی اس کے خاص پجاری تھے۔ ③

ہُبَل قریش کا سب سے بڑا بت تھا جسے عَمر و بن لُحَی نے کعبہ میں نصب کیا تھا۔ یہ سرخ عقیق سے تراشا ہوا انسانی شکل کا مجسمہ تھا۔ اس پر سو اونٹوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ کعبہ کے طواف کے بعد لوگ اس کے پاس سر منڈواتے تھے، اس کے چڑھاووں کا مستقل خزانہ تھا، جس کے لیے ایک نگراں مقرر تھا۔ ④

دوسرا مشہور بت ''لات'' تھا جو طائف کے بت خانے میں نصب تھا۔ یہ ایک سفید چوکور مجسمہ تھا۔ عرب اس کے نام کی قسمیں کھایا کرتے۔ ⑤ اسے بنوثقیف (جو طائف اور اس کے گرد ونواح میں آباد تھے) کے ایک سخی انسان کے نام پر بنایا گیا تھا جو حاجیوں کو ستو گھی میں تر کر کے دیتا تھا۔ اس کی موت کے بعد عَمر و بن لُحَی کے بہکاوے میں آکر طائف کے لوگوں نے اس کا بُت بناڈالا۔ ⑥

اہل عرب درختوں کی عبادت بھی کرتے تھے، جیسے عُزّیٰ نامی مشہور مؤنث بُت بنوغطفان کے ایک ببول کے درخت کے نام پر بنایا گیا تھا، جسے دیوی کی حیثیت دی گئی تھی۔ قریش کے لوگ ''عبدالعُزّیٰ'' نام بڑے فخر سے رکھا کرتے تھے۔ عُزّیٰ کی الگ قربان گاہ تھی جہاں جانور قربان کیے جاتے تھے۔ ⑦

---

① سیرۃ ابن ہشام: ۱/ ۷۷

② التاریخ الاسلامی العام، ص ۱۲۸، ۱۲۹

③ التاریخ الاسلامی العام، ص ۱۴۳

④ اخبار مکۃ لابی الولیدالازرقی: ۱/۱۱۷ تا ۱۱۹ ط دارالاندلس ⑤ الاصنام، ابن کلبی، ص ۵، قلمی نسخہ

⑥ التاریخ الاسلامی العام، ص ۱۵۴، ۱۵۵ ⑦ اخبار مکۃ، الازرقی: ۱/ ۱۲۶

''ذاتِ اَنواط'' بھی قریش کا مشہور مقدس درخت تھا جس کی عبادت کے لیے ایک دن کا اعتکاف کیا جاتا تھا۔[1]
جنگ کے دوران ہُبَل، لات اور عُزّیٰ کے نعرے لگا کر قوم کا حوصلہ بڑھایا جاتا تھا۔ بت پرستی کی ریل پیل کا یہ عالم تھا کہ تین سو ساٹھ بت کعبہ کے صحن میں تھے، جن میں اِساف اور نائلہ نامی بت بڑے مشہور تھے، لوگ طواف کا آغاز اِساف سے کرتے اور اختتام نائلہ پر کرتے۔ ان میں سے پہلا بت مذکر تھا اور دوسرا مؤنث۔ ان کے علاوہ دُومۃ الجندل میں ''وَدّ'' کی پرستش ہوتی تھی جس کی نگرانی قریش کے پاس تھی۔ ''سُواع'' بنو ہذیل کا بت تھا۔ اہل جُرَش کے ہاں ''یَغُوث'' نامی بت کی پوجا ہوتی تھی جو شیر کی شکل کا تھا۔ اہل خیوان نے ''یَعُوق'' کی عبادت اختیار کر رکھی تھی جو گھوڑے کی صورت جیسا تھا، یمن کا قبیلہ حمیر ''نَسر'' کا پجاری تھا جو گِدھ کا مجسمہ تھا، یہ پانچوں نام (وَدّ، سُواع، یَغُوث، یَعُوق اور نَسر) اصل میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بتوں کے تھے جو ہزاروں سال قبل بابل (عراق) میں غرق ہو چکی تھی مگر ایک زمانے کے بعد بت پرستوں نے انہی ناموں کو نئی شکلوں میں زندہ کر لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب بعض جانوروں کے تقدس کے اس حد تک قائل تھے کہ اُن کے مجسمے بنا کر انہیں پوجتے تھے۔[2]

مؤرخ ابن کلبی کا کہنا ہے: ''مکہ کے ہر گھر میں ایک بت تھا جس کی لوگ عبادت کرتے تھے، جب کوئی سفر پر جاتا تو بت کو چھو کر نکلتا، واپس آتا تو سب سے پہلے بت کو چھوتا۔''[3]

کچھ لوگ بت پرستی کی جگہ ستاروں کو مقدس، نظامِ دنیا کا مختار اور دعا کے لیے قبلہ وکعبہ سمجھتے تھے۔ یہ صابئین کہلاتے تھے۔ مکہ والوں کی زبان میں ہر ایسے شخص کو بھی ''صابی'' کہا جاتا تھا جو بت پرستی کا منکر ہو۔[4]

عربوں کی اخلاقی حالت:

جہاں تک عربوں کی اخلاقی حالت کا تعلق ہے وہ بعض فطری اوصاف برقرار رہنے کے باوجود بہت بگڑ چکی تھی۔ بات بات پر لڑنا جھگڑنا اور تلواریں سونت کر ایک دوسرے پر پل پڑنا، ان کی عادت تھی۔ ذرا سے اختلاف پر بڑی بڑی جنگیں شروع ہو جاتیں، جو نسل در نسل چلتی رہتیں۔

شراب نوشی اتنی عام تھی کہ ہر گھر مے کدہ معلوم ہوتا تھا، جوے کی لت ایسی پڑی تھی کہ لوگ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتے اور اسے فخر کا باعث قرار دیتے۔ چوری، ڈاکا عام تھا۔ بعض قبیلوں کا مستقل پیشہ لوٹ مار تھا۔ شرم وحیا اس طرح رخصت ہوئی تھی کہ لوگ سرعام عورتوں سے آنکھیں لڑاتے، محفلوں میں اپنی محبوباؤں کا ذِکر کرتے اور اُن کی یاد میں اشعار سناتے پھرتے۔ ان کے ہاں نکاح کی اہمیت ضرور تھی مگر زنا بھی کوئی بری شے نہ تھی۔ پیشہ ور عصمت فروش عورتیں آبادیوں میں رہتیں اور ان کے گھر مخصوص جھنڈوں کی وجہ سے دور سے پہچانے جاتے تھے۔

① اخبار مکۃ، الازرقی: ۱/۱۲۹، ۱۳۰
② التاریخ الاسلامی العام، ص ۱۴۳، ۱۴۴
③ الاصنام، ابن کلبی، ص ۳۳
④ تاریخ الفکر الدینی الجاہلی، ابراہیم الفیومی، ص ۲۷۹

اس معاشرے میں عورت کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ایک ایک آدمی بھیڑ بکریوں کی طرح جتنی عورتیں چاہتا اپنے پاس رکھتا،عورتیں میراث میں تقسیم ہو کر ایک سے دوسرے کی ملکیت میں چلی جاتی تھیں۔لوگ اپنے ہاں لڑکا پیدا ہونے پر فخر کرتے اور لڑکیوں کی پیدائش پر منہ چھپاتے پھرتے۔بہت سے لوگ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے تا کہ قبیلے میں ان کی رسوائی نہ ہو۔

عربوں کی اس حالت کی جامع تصویر حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے دربار میں یوں کھینچی تھی:

''ہم ایک جاہلیت والی قوم تھے،بتوں کی عبادت کرتے تھے،مردار کھاتے تھے،ہر قسم کی بے حیائیوں اور گناہوں میں آلودہ تھے،ہم میں سے جو طاقتور ہوتا تھا وہ کمزور کو چیر پھاڑ دیتا تھا۔''[1]

عبدالمُطَّلِب:

قریش کے سردار ہاشم شام کی تجارت کے سفر میں ''یثرب'' سے گزرا کرتے تھے۔ایک بار یہاں بنو نجّار کے ایک رئیس عَمرو بن لَبید کے ہاں قیام ہوا۔دونوں میں تعلق خاطر اتنا بڑھا کہ ہاشم کی درخواست پر عَمرو نے اپنی بیٹی سلمیٰ ان کے نکاح میں دے دی۔ہاشم عین جوانی میں انتقال کر گئے۔اس وقت ان کی بیوی سلمیٰ اپنے میکے ''یثرب'' میں تھیں اور اُمید سے تھیں۔کچھ مدت بعد وہیں بچے کی ولادت ہوئی جس کا نام ''شَیبہ'' رکھا گیا۔یہ یتیم بچہ سات برس تک اپنے ننھیال میں پلتا رہا۔مکّہ میں ہاشم کے ورثاء کو کوئی پرواہ نہ تھی کہ ان کے خاندان کا ایک اَنمول جوہر کہاں گمنامی میں پڑا ہے۔سات برس بعد ہاشم کے بھائی مُطَّلِب کو یثرب سے آنے والے کسی شخص نے کہا: ''میں نے یثرب میں کچھ لڑکوں کو دیکھا ہے جن میں تمہارا بھتیجا بھی تھا۔ایسے قیمتی بچے سے محروم رہنا اچھا نہیں۔''

یہ سنتے ہی مُطَّلِب نے یثرب کا رخ کیا،ہاشم کی بیوہ سے ملے اور اُن کی اجازت سے ''شَیبہ'' کو مکّہ لے آئے۔مکّہ میں داخل ہوتے وقت ''شَیبہ'' سواری پر ان کے آگے بیٹھا تھا،لوگ سمجھے کہ مُطَّلِب نے کم سن غلام خریدا ہے۔اس دن سے وہ شَیبہ کو ''عبدالمُطَّلِب'' کہنے لگے،یعنی مُطَّلِب کا غلام۔جوان ہو کر یہی عبدالمُطَّلِب بن ہاشم،قریش کے سب سے نامور سردار بنے۔[2] مُطَّلِب نے عمر بھر اپنے بھائی ہاشم کی جانشینی کا حق ادا کرتے ہوئے حاجیوں کی خدمت کی۔جب مُطَّلِب نے ایک سفر کے دوران یمن کے دور دراز علاقے میں وفات پائی تو ان کے بھتیجے عبدالمُطَّلِب بن ہاشم ان خدمات پر مامور ہوئے۔عبدالمُطَّلِب نے حاجیوں کو پانی پلانے اور کھانا کھلانے کے ایسے عمدہ انتظامات کیے جو ان سے پہلے قریش میں سے کسی نے نہیں کیے تھے۔[3]

عبدالمُطَّلِب نے کئی نکاح کیے جن سے بکثرت اولاد ہوئی۔ایک نکاح اپنے ننھیال یعنی بنو نجّار کی لڑکی فاطمہ بنت عمرو بن عائذ سے کیا۔اس بیوی سے ان کے سب سے نامور بیٹے عبداللہ (حضور ﷺ کے والد) کی ولادت ہوئی۔[4]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام: ۱/ ۳۳۶
[2] الکامل فی التاریخ: ۱/ ۶۱۳،۶۱۲ ؛ تاریخ ابن خلدون: ۲/ ۴۰۲، مطبوعہ دارالفکر
[3] تاریخ ابن خلدون: ۲/ ۴۰۲
[4] لباب الانساب لابن فندمہ البیہقی: ۱/ ۵

اسی زمانے میں عبدالمطّلب نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص انہیں زم زم کا کنواں کھودنے کی ہدایت دے رہا ہے۔ زم زم کا کنواں ایک عرصے سے بند تھا۔ بنو جرہم جب مکّہ سے بھاگے تھے تو جاتے جاتے زم زم کے کنویں کو مٹی سے پُر کر کے زمین کے برابر کر گئے تھے۔ تب سے یہ کنواں بے نام ونشان تھا۔

عبدالمطّلب نیند سے جاگے اور سویرے سویرے اپنے بیٹے حارث کو لے کر زم زم کے مقام پر پہنچ گئے۔ دونوں نے مل کر کھدائی شروع کی تو پانی کی دھار نمودار ہوئی، جسے دیکھ کر عبدالمطّلب بے حد مسرور ہوئے۔ اس طرح صدیوں بعد زم زم کا پانی دوبارہ جاری ہوا۔[1] چونکہ زم زم کی ازسرِ نو دریافت عبدالمطّلب کا کارنامہ تھا اس لیے وہ اس کی خدمت میں کسی اور خاندان کو شریک نہیں کرنا چاہتے تھے، مگر قریش کے سردار اُن سے جھگڑنے لگے۔ ان کی کوشش تھی کہ زم زم کی تولیت میں بنو ہاشم انہیں بھی حصہ دیں۔ اس موقع پر عبدالمطّلب نے نذر مانی کہ اگر ان کے دس لڑکے ہوئے تو وہ ان میں سے ایک کو اللہ کے لیے قربان کر دیں گے۔ اللہ کی قدرت کہ حارث کے بعد عبدالمطّلب کے ہاں مزید نو لڑکے پیدا ہوئے، یعنی زبیر، حَجل، ضِرار، مقوّم، ابولہب، ابو طالب، عبداللہ، عباس اور حمزہ۔ جب دسویں لڑکے حمزہ کی ولادت ہوئی تو عبدالمطّلب پر اپنی نذر کو پورا کرنا ضروری ہو گیا۔[2]

عبداللہ:

انہوں نے بیٹوں کے ناموں کی قرعہ اندازی کی کہ کس کو ذبح کیا جائے۔ ہر بار قرعہ حضرت عبداللہ ہی کا نام نکلا۔

عبدالمطّلب کو اپنے اس بیٹے سے بے حد محبت تھی اس لیے وہ بہت رنجیدہ ہوئے، بہرحال دل پر پتھر رکھ کے عبداللہ کو لٹایا اور ذبح کرنے کے لیے چھری اُٹھائی، تب ان کے ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر عبداللہ کو پاؤں کے نیچے سے کھینچا۔ اِدھر قریش کے سردار بھی دوڑے آئے اور انہوں نے عبدالمطّلب کو زبردستی روک دیا اور کہا کہ اگر ایسا کرو گے تو انسانوں کی قربانی کی رسم چل پڑے گی۔ اس کے بعد قریش کے مشورے سے عبدالمطّلب طویل سفر کر کے ایک کاہنہ کے پاس گئے جو خیبر میں رہتی تھی۔ اس کو صورتِ حال بتا کر اس کی تجویز پر عمل کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عبداللہ کے بدلے سو اُونٹ قربان کیے گئے۔[3] کچھ دنوں بعد حضرت عبداللہ کا نکاح بنو زُہرہ کی ایک خاتون آمِنہ بنت وَہب سے ہو گیا جو قریش کی تمام عورتوں میں سب سے زیادہ شریف اور بہترین نسبت کی حامل تھیں۔ انہی عبداللہ اور آمِنہ کی قسمت میں حضور رحمتِ دو عالم حضرت محمد ﷺ کے والدین ہونے کی عظیم ترین سعادت لکھی تھی۔[4]

---

① سیرۃ ابن ھشام: ۱/۱۴۳ تا ۱۴۶ ② سیرۃ ابن ھشام: ۱/۱۵۱ تا ۱۵۳

③ سیرۃ ابن ھشام: ۱/۱۵۴..... حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ (جو عام الفیل سے ۱۳ برس قبل پیدا ہوئے تھے) کے مطابق یہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے پانچ سال قبل کا واقعہ ہے۔ (المستدرک للحاکم، ح: ۶۰۴۳)

④ سیرۃ ابن ھشام: ۱/۱۵۶۔ آمنہ بنت وہب والد کی طرف سے قریش کی شاخ بنو زہرہ سے تھیں، جبکہ ان کی والدہ بَرّہ بنت عبدالعزیٰ بنو عبدالدار بن قصی سے تھیں۔ یہی بَرّہ رسول اللہ ﷺ کی نانی محترمہ تھیں۔ (نسب قریش للزبیری، ص ۲۰، ۲۱) اس لیے یہ خیال غلط ہے کہ یثرب کا بنو نجار حضور ﷺ کا ننھیال تھا۔ حضور ﷺ کا ننھیال مکہ ہی میں تھا۔ بنو نجار حضور ﷺ کے والد کے ننھیالی تھے۔

حضرت عبداللہ پچیس برس کے تھے کہ قریش کے تجارتی قافلے کے ساتھ شام گئے۔ واپسی میں وہ اپنے والد کے حکم کے مطابق ''یثرب'' سے کھجوروں کا ذخیرہ لینا چاہتے تھے مگر اس سے پہلے ہی اتنے بیمار پڑ گئے کہ سفر کے قابل نہ رہے۔ عبدالمُطّلب کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے فوراً اپنے بڑے بیٹے حارث کو یثرب روانہ کیا تا کہ وہ عبداللہ کی خیر خبر لیں مگر جب حارث یثرب پہنچے تو اس سے ذرا پہلے حضرت عبداللہ ایک ماہ کی بیماری کے بعد وفات پا چکے تھے اور انہیں نابغہ جعدی کے احاطے میں دفن کر دیا گیا تھا۔[1]

عبدالمُطّلب کو اپنے جواں سال لاڈلے بیٹے کی ناگہانی موت کا شدید غم ہوا۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ اس بیٹے کی جگہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسا پوتا دینے والا ہے جو اُن کا نام تا قیامت زندہ رکھے گا۔

جزیرۃ العرب پر عنایتِ آسمانی کیوں؟

ساری دنیا پر چھائی ظلمت و گمراہی کی اس تاریک شب کا اگر کوئی سرانظر آتا تھا تو وہ اس آخری نبی کا ظہور تھا، جس کی پیش گوئیاں گزشتہ رسولوں اور ان کے سچے پیروکاروں کی زبانی دنیا کی مختلف قوموں اور خطوں میں پھیل چکی تھیں۔ تاہم کسی کو یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ اس آخری نجات دہندہ کا ظہور عرب کے بے آب و گیاہ صحرا سے ہوگا۔ خود عربوں کو بھی اپنے اندر ایسے کسی انقلاب کی اُمید نہیں تھی مگر ان کے تمام تر عیوب اور خرابیوں کے باوجود حق تعالیٰ نے آخری عالمگیر نبی کی بعثت اور اُن کی مدد و نصرت کے لیے اسی قوم کا انتخاب کیا۔ اس میں بے شمار حکمتیں تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ گمراہی اور تاریکی کے اس دور میں بھی عربوں میں اعلیٰ اوصاف اور شریفانہ خصوصیات کے بہت سے جوہر باقی تھے۔ ہندوؤں اور یہودیوں کے برعکس وہ دھوکے اور فریب کے عادی نہیں تھے۔ اپنی جاہلیت کے باوجود وہ سچے اور کھرے تھے، اس کے ساتھ ساتھ زیرک اور ہوشیار بھی تھے، دھوکا کھاتے تھے نہ دینا پسند کرتے تھے۔ وہ بڑے بڑے شہروں اور قدیم تہذیبوں کے اُن قدرتی اثرات سے پاک تھے جو انسان کو بزدل، آرام پسند اور سست بنا دیتے ہیں۔ ان کی رگوں میں گرم خون دوڑتا تھا اور طبیعتیں کسی بھی خطرے کا سامنا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھیں۔

یہودی صدیوں کی غلامی کی وجہ سے پست طبیعت ہو چکے تھے اور چوروں کی طرح خفیہ سازشوں میں مصروف تھے۔ اُدھر رومی اور فارسی طویل مدت سے بادشاہت کرتے کرتے انا پسند اور مغرور ہو گئے تھے۔ عرب نہ تو کسی کے غلام رہے تھے نہ حاکم۔ وہ اپنی مختصر سی دنیا کے آزاد پنچھی تھے۔ نہ تو کسی پر حملہ کرتے تھے نہ کسی کے دام میں آتے تھے۔ دنیا کی تمام قدیم تہذیبوں کے باسی اپنی گمراہی کو علوم و فنون کی ملمع سازیوں میں اس طرح چھپا چکے تھے کہ کسی بھی معاملے میں اپنی جہالت اور کم علمی کا یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کے برعکس عرب سادہ طبیعت اور حق شناس تھے، ان کے دل و دماغ کسی گمراہ کن فلسفے کی پیچیدگیوں میں نہیں الجھے تھے۔ انہیں بس یہ احساس دلانے کی ضرورت تھی

---

[1] البدایة والنهایة: ۳/ ۳۸۲، ط دار هجر. الکامل فی التاریخ: ۱/ ۶۱۲، ۶۱۳..... راقم نے بعض ذرائع سے سنا ہے کہ حضرت عبداللہ کی قبر کئی سال پہلے مسجد نبوی کی توسیع کے دوران کھدائی میں دریافت ہوئی تھی مگر عوام کے فتنے میں پڑ جانے کے خوف سے قبر کے مقام کو مخفی رکھا گیا۔ واللہ اعلم۔

کہ وہ صحیح راستے پر نہیں، پھر ان کی سمت بدلنے میں کوئی دیر نہ لگ سکتی تھی۔ جغرافیائی لحاظ سے بھی عالمگیر دین کے آغاز اور عالمگیر امت کے مرکز کے انتخاب میں سرزمین عرب کو فوقیت حاصل تھی، اس لیے کہ یہ آباد زمین کے عین درمیان خطِ اِستوا پر تینوں بڑے براعظموں: ایشیا، یورپ اور فریقہ کے سنگم کے قریب واقع ہے۔ اکثر مشرقی اور مغربی ممالک اس سے یکساں فاصلے پر ہیں۔ اس لیے یہاں سے جاری ہونے والے کسی پیغام، کسی دعوت یا کسی تحریک کے لیے پوری دنیا پر جلد اثر انداز ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔ اگر عرب کی جگہ ہندوستان یا یونان جیسے قدیم تہذیبی مراکز کو ایک نئے دین کا مرکز بنایا جاتا تو یہ اثرات دنیا کے مشرق یا مغرب تک ہی محدود رہ جاتے۔

ایک نئے دین کے لیے عرب کا انتخاب دفاعی لحاظ سے بھی بڑی حکمت پر مبنی تھا، کیوں کہ یہ خطہ تینوں اطراف سے سمندر کی لہروں میں اور شمال کی جانب صحرا کی وسعتوں سے گھرا ہوا تھا، اسی لیے اس علاقے میں فوج کشی کرنا نہایت دشوار ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ہزار ہا برس گزرنے کے باوجود عرب کبھی کسی کے غلام نہیں رہے تھے۔ یونان کے سکندرِ اعظم، بابل کے بُختِ نَصَّر اور ایران کے کورش جیسے فاتحین اس کے قریب سے گزر گئے مگر اس کی ریگستانی بھول بھلیوں میں داخل ہونے سے گریزاں رہے۔

آخری رسول کے لیے سادہ منش غریب اور جفاکش عربوں کے چناؤ میں یہ حکمت بھی کار فرما تھی کہ اس طرح خدا تعالیٰ دنیا کو اپنی قدرت، طاقت اور غلبے کا نظارہ کرانا چاہتا تھا۔ اگر آخری نبی روم یا فارس جیسی کسی بڑی مملکت سے تعلق رکھتے تو اس دین کی دعوت پھیلنے پر دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل سکتا تھا کہ ان بڑی قوموں کی دولت وثروت اور قوت کے بل بوتے پر یہ دین پھیل گیا ہے ورنہ بذاتِ خود اس دین میں کوئی انوکھی بات نہیں۔

خالق دو جہاں نے آخری پیغمبر کو ایک کمزور اور مفلس معاشرے میں پیدا فرما کر اس شبہے کا امکان ہی ختم کر دیا اور عملی طور پر یہ حقیقت ذہن نشین کرادی کہ وہ اپنے فیصلے کو نافذ کرنے، اپنے دین کو پھیلانے اور اپنے رسولِ آخرالزمان کا نام نامی دونوں جہاں میں بلند کرنے کے لیے مال ودولت اور بڑے بڑے لشکروں اور حکومتوں کا محتاج نہیں۔ وہ چاہے تو کمزوروں سے بھی کام لے سکتا ہے اور انہیں زمین کی خلافت جب چاہے عطا کر سکتا ہے۔

اس طرح آخری نبی اگر یونان، اسکندریہ یا قُسطَنطِینِیَّہ جیسے کسی قدیم علمی مرکز میں نمودار ہوتے تو لوگوں کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ اس نبی نے قدیم علوم اور فلسفوں سے استفادہ کر کے ایک دین ایجاد کر لیا ہے اور انہی فلسفوں کو نئے رنگ میں پیش کر دیا ہے۔ اللہ نے آخری نبی کے لیے عربوں کے جاہل معاشرے کا انتخاب کر کے یہ حقیقت واضح کر دی کہ یہ دین کسی سابقہ علم وفن یا فلسفے کا چربہ نہیں بلکہ یہ ایک سچے نبی پر نازل ہونے والا خالص آسمانی دین ہے جسے خود اللہ نے اپنی مخلوق کے لیے پسند کیا ہے۔

☆☆☆

اسباقِ تاریخ

- گزشتہ اقوام کے حالات میں ہمارے لیے بڑی عبرت ہے۔ اللہ کی نافرمانی پر مصر رہنے والی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اللہ کی اطاعت کرنے والے دنیا میں بھی کامیاب ہیں اور آخرت میں بھی۔
- گزشتہ قوموں کے مستند حالات زیادہ تر قرآن مجید یا احادیثِ نبویہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہیں کہ حضور اکرم ﷺ اللہ کے سچے نبی ہیں، تب ہی وہ کسی کتاب کو پڑھے اور کسی درسگاہ سے تعلیم حاصل کیے بغیر ان قوموں کی تاریخ اتنی وضاحت سے بیان کر گئے۔
- جب کوئی قوم غرور و تکبر میں مبتلا ہو کر پیغمبروں کی تعلیمات پر اپنی عقل کو ترجیح دیتی ہے تو بدترین گمراہی کا شکار ہو کر رہتی ہے۔ بنی اسرائیل کی مثال ہمارے سامنے ہے۔
- انبیائے کرام اور گزشتہ قوموں کے حالات میں مشکلات اور آزمائشوں کی ان تمام صورتوں اور احوال کے لیے رہنمائی مل جاتی ہے جن سے کسی داعی یا مصلح کو کبھی سابقہ پڑ سکتا ہے۔
- اگر داعی اپنی قوم میں تن تنہا ہو، پوری قوم جاہل، بت پرست اور مشرک ہو، طویل عرصے تک کوشش کر کے بھی کوئی ثمرہ برآمد نہ ہو رہا ہو تو اسے حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی میں رہنمائی ملے گی۔
- اگر قوم، قوت، توانائی، طاقت، صنعت و حرفت اور سائنسی ترقی پر غرور کی وجہ سے پیامِ حق کی طرف متوجہ نہیں ہوتی تو حضرت ہود علیہ السلام کے حالات سے حوصلہ ملے گا۔
- اگر لوگ زراعت، باغبانی اور عمارتوں کی تعمیر میں غیر معمولی مہارت پر نازاں ہوں تو ایسے معاشرے میں کام کے لیے حضرت صالح علیہ السلام کے حالات دیکھیے۔
- اگر لوگ مشرک، بت پرست، ستارہ پرست اور بدعقیدہ ہیں، اور انہیں سمجھانے کے لیے آپ اکیلے ہیں، دعوتِ حق دیتے ہوئے ظالم و جابر حکام سے پالا پڑنے کا بھی خطرہ ہے تو ایسے میں ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی پر نگاہ ڈالیے۔
- اگر آپ اہلِ حق کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں تو اپنے بزرگوں کے ورثے کو سینے سے لگانے اور ان کے کہنے پر راہِ خدا میں قربانی دینے کے لیے حضرت اسماعیل علیہ السلام جیسے جذبے کا ثبوت دیجیے۔
- اگر معاشرہ بدعنوانی، فریب دہی، بددامنی، لوٹ مار اور لاقانونیت کا شکار ہو تو ایسے لوگوں میں کام کرتے ہوئے حضرت شعیب علیہ السلام کے حالات پر غور کریں۔

- اگر اپنوں کے فریب اور اپنوں سے جدائی کا غم سہنا پڑے تو حضرت یعقوب علیہ السلام جیسے صبر اور امید کا ثبوت دیں۔ اقارب کی بے وفائی سے سابقہ پڑے، دوست نما دشمنوں کی سازشوں کے باعث جیل خانے کی سختیاں برداشت کرنا پڑیں تو حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں اپنے لیے نمونہ تلاش کریں۔ اگر اللہ تعالیٰ فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دے، آپ کے حاسدوں اور بدخواہوں کو سرنگوں کر دے تو حضرت یوسف علیہ السلام جیسی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت فراہم کرنا چاہیے۔
- اگر آپ ایسے معاشرے میں پیدا ہوئے ہیں جو کلمہ گو ہے مگر خود کو خدا کہلانے والے بادشاہوں کی غلامی میں جکڑا ہوا ہے تو پھر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام جیسے حوصلے کا مظاہرہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیے۔
- اگر اللہ نے کفار سے جہاد کرنے کا موقع دیا ہے تو حضرت داؤد علیہ السلام جیسی ہمت کا مظاہرہ کریں اور عدل وانصاف کی مثال بن جانے والی حکومت کے ذریعے اللہ کا دین پھیلائیے۔
- اگر اللہ نے موروثی حکومت و سیادت بخشی ہے تو آلِ داؤد کی طرح ہر گھڑی اس کے شکر گزار رہیے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح حکومتی طاقت کو اللہ کے دین کی اشاعت اور بندوں کی خدمت میں صرف کیجیے۔
- اگر کوئی خوش قسمت انسان، علم اور روحانیت سے بھرپور گھرانے میں پیدا ہوا ہے مگر معاشرہ کلمہ گو ہونے کے باوجود بداعمالیوں اور اعتقادی خرابیوں کی وجہ سے اقوامِ عالم کا غلام ہے تو پھر قوم کی اصلاح کے لیے حضرت زکریا، حضرت مریم، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی زندگیوں اور ان کے صبر واستقامت کا مطالعہ کیجیے۔
- اللہ کا دین کسی قوم کا محتاج نہیں۔ اللہ کسی سے بھی اپنے دین کی حفاظت، اشاعت اور سربلندی کا کام لے لیتا ہے۔
- اللہ کو غرور پسند نہیں۔ بنی اسرائیل نے خاندانی نخوت کا مظاہرہ کیا اور راہ حق سے سرتابی کی۔ ان کی بزرگی دھری کی دھری رہ گئی۔ اللہ نے ان کی جگہ بنی اسماعیل کو دنیا کی قیادت کے لیے چن لیا۔
- ظلم اور جہالت کی شب کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، ایک دن صبح ہوتی ہے اور ہدایت کا نور پھیل کر رہتا ہے۔

☆☆☆

دوسرا باب

تاریخ اُمّتِ مُسلِمہ (حصہ اوّل)

سیرتِ پیغمبر آخر الزمان

عام الفیل......تا......ربیع الاوّل ۱۱ھ

(مارچ 569ء......تا......جون 632ء)

☆☆☆

کمالِ علم و عمل کا پیکر، کرم مجسّم، تمام رحمت
جہاں میں ان خوبیوں کا انساں نہ آیا خیر البشر سے پہلے

☆☆☆

تاریخ عالم کا سب سے بڑا انقلاب

''وہ فطری عنصر جس کے سر انسانیت کے اکثر عجوبۂ روزگار اور حیرت انگیز کارناموں کا سہرہ ہے، جس کو لوگ ''محبت'' کے نام سے یاد کرتے ہیں، عرصۂ دراز سے مردہ پڑا تھا، صدیوں سے کوئی اس کو کام میں لگانے والا نہیں تھا۔ بس وہ ظاہری چمک دمک اور حسن و جمال کے فانی مظاہر کی نذر ہو کر رہ گیا تھا۔ عرصہ سے دنیا میں کوئی ایسا انسان پیدا نہیں ہوا تھا جو اپنے جمال و کمال اور اپنی اعلیٰ صفات سے ساری دنیا کی محبت کا مستحق ہو اور جو اپنی طاقت ور اور دل آویز شخصیت سے اس محبت سے کام لے۔ حضور ﷺ کی صورت میں انسانیت کو وہ گمشدہ دولت مل گئی۔ آپ ﷺ وہ انسان تھے جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجموعۂ خوبی بنایا تھا۔ دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ جو آپ ﷺ کو اچانک دیکھتا وہ آپ ﷺ کا گرویدہ ہو جاتا اور مرعوب ہو جاتا اور کہتا کہ نہ آپ ﷺ سے پہلے کوئی آپ جیسا دیکھا اور نہ آپ کے بعد۔ آپ ﷺ کے آنے سے سچی اور پاک محبت کا چشمہ ابل پڑا اور آپ ﷺ کی اُمّت کے تمام افراد آپ ﷺ سے ایسی محبت کرنے لگے جس کی مثال عشاق کی تاریخ میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ انہوں نے آپ ﷺ کی تابع داری میں اپنے آپ کو مٹا دیا۔''

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ، ص ۱۱۸، ۱۱۹)

درود وسلام

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِکَ وَرَحْمَتَکَ وَبَرَکَاتِکَ عَلٰی
سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَ اِمَامِ الْمُتَّقِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ
مُحَمَّدٍ عَبْدِکَ وَرَسُوْلِکَ اِمَامِ الْخَیْرِ
وَ قَائِدِ الْخَیْرِ وَرَسُوْلِ الرَّحْمَۃِ.
اَللّٰھُمَّ ابْعَثْہُ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا
، یَغْبِطُہٗ بِہِ الْاَوَّلُوْنَ
وَالْآخِرُوْنَ.

☆☆☆

اے اللہ!

اپنی خاص عنایات،
رحمتیں اور برکتیں نازل فرما
سید المرسلین، امام المتقین، خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ
پر جو تیرے خاص بندے اور رسول ہیں۔ نیکی اور بھلائی کے راستے
کے امام اور راہنما ہیں، رحمت والے پیغمبر ہیں۔ اے اللہ! ان کو اس ''مقام محمود'' پر
فائز فرما جو اولین و آخرین کے لئے قابلِ رشک ہو۔

(سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر:۹۰۶)

☆☆☆

آمدِ بہار کی علامات

حضرت آدم علیہ السلام کے دنیا میں آنے کے بعد انسانیت اپنی عمر کے کئی ہزار برس گزار چکی تھی۔ زمین پر اب سینکڑوں قومیں آباد تھیں۔ کوئی گوشہ ارضی ایسا نہ تھا جہاں انسانی تہذیب وتمدن کی ایک تاریخ نہ بن چکی ہو مگر اس تاریخ میں ایک بہت بڑی کمی تھی اور وہ تھی ایسی جامع راہ نمائی کی جس کے بعد کسی گمراہی کا خطرہ نہ رہے، ایسی مکمل تعلیم کی جس کے بعد جہالت کی گھاٹیوں میں بھٹکنے کے اندیشے نہ ہوں، ایسی تربیت اور تادیب کی جس سے انسان واقعی انسان بن سکیں۔

ہزاروں برسوں سے دنیا میں انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد کا سلسلہ جاری تھا مگر کسی نبی اور پیغمبر کی تعلیمات کے اثرات عالم گیر نہ ہوئے۔ ہر نبی اور رسول کی دعوت ایک مخصوص قوم، ایک خاص نسل اور ایک خاص علاقے تک محدود رہی، اب ضرورت تھی ایسے عالم گیر نبی کی جو بیک وقت پوری دنیا کی امامت کرے اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہِ راست دکھائے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی بے پناہ قدرت اور حکمت بالغہ کے تحت اس عظیم الشان منصب کے حامل کو دنیا میں لانے کا ارادہ کیا تو اس کے ساتھ ہی ایسے حالات پیدا فرما دیے جو عنقریب کسی غیر معمولی انقلاب کی خبر دے رہے تھے۔

حالات کے اس اُتار چڑھاؤ کا میدان سرزمین عرب تھی، جبکہ اس کے سرے ایک طرف رومی سلطنت اور دوسری جانب کسریٰ کی بادشاہت سے بھی جا ملتے تھے۔ کسریٰ مشرق کا تاجدار تھا اور قیصر ایشیا کے علاوہ یورپ اور افریقہ کے بھی کئی ملکوں کو زیرنگیں کیے بیٹھا تھا۔ اس طرح عرب میں نمودار ہونے والی تبدیلیاں دنیا کے ان دو بڑے درباروں کی وساطت سے دنیا کے تینوں آباد ترین براعظموں کو ایک نئے دور کے آغاز کی نوید سنا رہی تھیں۔

انقلاب کی طرف اشارہ کناں پہلا غیر معمولی منظر مکہ پر اَبْرَہَہ کی چڑھائی اور پھر اس کی عبرت انگیز پسپائی کا تھا۔

اَبْرَہَہ حبشہ کی اس فوج کا افسر تھا جو قیصر روم کے حکم پر ۵۰۰ء میں حبشہ کے گورنر نجاشی نے یمن کے عیسائیوں کی مدد کے لیے بھیجی تھی تاکہ وہ یہودی حاکم یوسف ذونواس کی سرکوبی کریں۔ ستر ہزار سپاہیوں پر مشتمل اس حبشی لشکر کے سپہ سالار ''ارباط'' نے یوسف ذونواس کو کیفر کردار تک پہنچا کر یمن کا انتظام سنبھال لیا۔ ایک طویل عرصے تک اَبْرَہَہ ارباط کی ماتحتی میں رہا مگر پھر دونوں کے اختلافات بڑھتے گئے یہاں تک کہ ایک دن دونوں ایک دوسرے پر پل پڑے، ارباط کی ضرب سے اَبْرَہَہ کی ناک اور ہونٹ کٹ گئے، اس وجہ سے وہ ''اَشرم'' (نکٹا) مشہور ہو گیا۔ اَبْرَہَہ کے غلام نے موقع پر ہی جوابی حملے میں ارباط کو مار ڈالا۔ ابرہہ ایک عیار اور انتہا پسند شخص تھا، اس نے خوشامدانہ نامہ وپیام کے ذریعے نجاشی کو اپنی طرف سے مطمئن کر دیا اور یمن میں نجاشی کی نیابت اور حبشی فوج کی قیادت سنبھال لی۔

کچھ مدت بعد اس نے اپنے کلیسا پرست آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے یمن کے پایۂ تخت ''صنعا'' میں ایک ایسا

شاندار گرجا تعمیر کرانا شروع کیا جس کی نظیر دور دور تک نہ تھی، یہ سحر انگیز عمارت برسوں میں جا کر تیار ہوئی، اس گرجے کی تعمیر کے لیے اس نے اہلِ یمن پر بے پناہ تشدد کیا، ہزاروں لوگوں کو پکڑ کر ان سے جبری مشقت لی گئی۔ حکم تھا کہ سورج نکلنے سے پہلے مزدور کام پر آ جائیں۔ جس سے ذرا دیر ہو جاتی اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا۔ تعمیراتی مواد کے لیے یمن کی قدیم نامور ملکہ بلقیس کے عظیم الشان محل کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، سونے چاندی کا سامان، سنگ مرمر اور لکڑی، سب کچھ اکھاڑ کر گرجے کی تعمیر میں لگا دیا گیا۔ اس ناروا سلوک کی وجہ سے خود یمن کے لوگ اس سے نالاں ہو چکے تھے مگر اس کا یہ حال تھا کہ وہ تمام عرب قبائل کو کعبہ سے برگشتہ کر کے اس گرجے کا حلقہ بگوش بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔

اس نے نجاشی کو اپنے مراسلے میں لکھا:

''میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک عرب حج کے لیے بھی اس گرجے کا رخ نہ کرنے لگیں۔''[1]

جب عربوں کو اَبرَہہ کے اس ناپاک ارادے کی خبر ملی تو وہ سخت برافروختہ ہوئے؛ کیوں کہ کعبہ کی محبت ان کی رگ رگ میں بسی تھی اور وہ اس کی جگہ کسی اور عبادت گاہ کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ ''النسئی'' کی رسم انجام دینے والے قبیلہ بنو فُقَیم (بن کِنانہ) کا ایک جوشیلا حاجی موقع پا کر گرجے میں گھس گیا اور اسے ناپاک کر کے بھاگ نکلا۔

اَبرَہہ کو پتا چلا کہ یہ کام عربوں کا ہے تو اس نے قسم کھائی کہ وہ کعبہ کو ڈھائے بغیر دم نہیں لے گا۔ ستمبر ۵۶۹ء میں وہ ایک بڑا لشکر لے کر مکہ کی طرف بڑھا جس میں تیرہ جنگی ہاتھی بھی تھے۔ عربوں میں اَبرَہہ سے مقابلے کی تاب نہیں تھی، اس کے باوجود ذونفر اور نفیل ابن حبیب نامی دو سرداروں نے اپنے اپنے علاقے میں اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر دونوں شکست کھا کر گرفتار ہوئے، جس سے اَبرَہہ کی ہیبت مزید بڑھ گئی اور وہ بلا روک ٹوک مکہ کے قریب پہنچ گیا۔ فوج کے ہراول دستے نے شہر کے مضافات میں لوٹ مار کی جس کی زد میں عبدالمُطَّلِب کے دو سو اونٹ بھی آ گئے۔

اس دوران اَبرَہہ نے سفیر بھیج کر قریش کے رؤسا کو یہ پیغام دیا: ''میں تم سے لڑنے نہیں آیا، میرا مقصد صرف کعبہ کو ڈھانا ہے، اگر تم مزاحمت نہیں کرو گے تو مجھے تم سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

یہ سن کر عبدالمُطَّلِب نے بڑی بے باکی سے جواب دیا: ''ہم بھی اس سے لڑنا نہیں چاہتے۔ یہ تو اللہ کا گھر ہے، اس کے خلیل ابراہیم کی تعمیر ہے، اگر اللہ اپنے گھر کی حفاظت کرنا چاہے گا تو خود کر لے گا۔''

سفیر نے یہ عجیب جواب سن کر عبدالمُطَّلِب کو ساتھ لیا اور اَبرَہہ کے پاس لے آیا۔ دونوں میں ترجمان کے ذریعے گفتگو شروع ہوئی۔ اَبرَہہ نے پوچھا: ''آپ کی کیا ضرورت ہے؟''

وہ بولے: ''میرے دو سو اونٹ جو تمہارے سپاہیوں نے پکڑے ہیں، واپس کر دو۔''

اَبرَہہ حیران ہو کر بولا: ''تم اپنے اونٹوں کی فکر کر رہے ہو، کعبہ کی پروا نہیں کرتے جو تمہارے دین اور بزرگوں کی نشانی ہے، جسے میں گرانے آیا ہوں۔''

---

[1] البدایة والنہایة: ۱۳۵/۳ تا ۱۴۱

عبدالمُطّلِب نے اعتماد سے جواب دیا:

''میں تو اونٹوں کا مالک ہوں۔ اس گھر کا مالک کوئی اور ہے، وہی اس کا بچاؤ کرے گا۔''

اَبْرَہَہ غرور بھرے لہجے میں بولا: ''وہ بھی مجھ سے نہیں بچا سکے گا۔''

اس نے ان کے اونٹ واپس کر دیے اور فوج کو چڑھائی کا حکم دیا۔

عبدالمُطّلِب نے مکّہ پہنچتے ہی لوگوں کو شہر خالی کرنے کی ہدایت کی۔ لوگ مکّہ سے باہر نکل کر پہاڑوں میں چھپ گئے اور دم بخود ہو کر اَبْرَہَہ کی یلغار کا نظارہ کرنے لگے۔ اِدھر عبدالمُطّلِب کعبہ کے دروازے کی کنڈی تھام کر اللہ سے فریاد کر رہے تھے کہ وہ اَبْرَہَہ کے لشکر کو انجام تک پہنچائے۔ ابھی اَبْرَہَہ کا لشکر مکّہ میں داخل نہیں ہوا تھا کہ اچانک اُن کا سب سے بڑا جنگی ہاتھی ''محمود'' راستے ہی میں بیٹھ گیا اور مار پیٹ کے باوجود نہ اُٹھا۔ جب اس کا رخ یمن کی طرف پھیرا گیا تو وہ چل پڑا، پھر شام اور خراسان کی طرف موڑا تب بھی وہ چلتا رہا۔ اب مکّہ کی طرف لایا گیا تو پھر بیٹھ گیا۔ لگتا تھا کوئی اَن دیکھی طاقت اسے مکّہ میں داخل ہونے سے روک رہی ہے۔

ابھی لوگ حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ یک دم ساحل سمندر کی طرف سے پرندوں کے جھنڈ نمودار ہوئے جو اپنی چونچ اور پنجوں میں چھوٹے چھوٹے کنکر اُٹھائے ہوئے تھے۔ ان پرندوں نے آتے ہی اَبْرَہَہ کے لشکر پر کنکر پھینکنے شروع کر دیے۔ جسے یہ کنکر لگتا وہ فوراً ہلاک ہو جاتا۔ لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اور سب سپاہی واپس بھاگے، اَبْرَہَہ بھی لہولہان ہو گیا، لوگ اسے اٹھا کر واپس یمن لے جانے لگے تو اس کے جسم کا ایک ایک عضو جھڑنے لگا یہاں تک کہ اپنے پایۂ تخت ''صَنعا'' پہنچ کر اس کا دم نکل گیا۔ اس وقت تک اس کا جسم اتنا گل چکا تھا کہ پسلیوں کے نیچے دل نظر آ رہا تھا۔ [1]

واقعۂ فیل، ایک غیبی اشارہ:

پرندوں جیسی معمولی مخلوق کے ذریعے حبشیوں کی خوفناک فوج کی تباہی نے یہ ظاہر کر دیا کہ کائنات کا مالک اپنے گھر کی حفاظت کر رہا ہے۔ حبشہ کی نصرانی فوج کا یہ انجام درحقیقت قیصر کے منہ پر طمانچہ تھا جو مشرق و مغرب میں صلیب کا سب سے بڑا سرپرست تھا۔ یہ کلیسا کی شکست اور عربوں کی فتح تھی۔ یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ عنقریب دنیا میں کوئی بڑی تبدیلی رونما ہونے کو ہے، جس کا مرکز عرب ہوگا۔ عربی میں ہاتھی کو ''فیل'' کہا جاتا ہے۔ اس لیے یہ واقعہ ''قصہ اصحاب الفیل'' کے نام سے مشہور ہوا۔ [2] عربوں کے ہاں اس واقعے کو اتنی اہمیت دی گئی کہ انہوں اس سال کو ''عام الفیل'' کا نام دیا اور آئندہ اپنی تاریخوں کا حساب اسی سال سے کرنے لگے۔

① البداية والنهاية: ۱۴۳/۳ تا ۱۴۸

② واقعہ فیل اور نبی اکرم ﷺ کی ولادت کے مابین کتنا وقت گزرا؟ اس بارے میں درج ذیل کئی اقوال ہیں مثلاً: چالیس دن، پچاس دن، ۵۵ دن۔ حافظ ابن کثیر نے پچاس دن کے قول کو اشہر کہا ہے۔ بعض اقوال ایسے بھی ہیں کہ یہ واقعہ ولادت نبوی سے دس سال یا ۲۳ سال پہلے کا ہے مگر حافظ ابن کثیر نے صحابہ سے مروی بعض روایات کی روشنی میں ان روایات کی مدلل تردید کی ہے۔ (البداية والنهاية: ۲۹۸۰/۳)

ابن حبیب (۲۴۵ھ) نے واقعہ فیل کی توقیت اتوار ۱۷ محرم کی ہے۔ (**المحبر**، ص۱۰) اگر اسے مان لیا جائے تو اس کے ٹھیک ۵۵ دن بعد پیر ۱۲ ربیع الاوّل ہوگا۔

اَبرَہہ کی ہلاکت کے بعد حبشیوں کی استحصال پسند حکومت زیادہ دن نہ چل سکی۔ اَبرَہہ کا بیٹا یکسوم کچھ دن حکومت کر کے مرگیا۔ دوسرے بیٹے مسروق نے حکومت سنبھالی مگر وہ بھی اِس انتقامی آگ کو نہ دبا سکا جو حبشیوں کے خلاف عربوں کے سینوں میں بھڑک رہی تھی۔

قبیلہ حِمیَر کے ایک عالی نسب شخص سیف بن ذی یزن نے اس ماحول سے فائدہ اٹھایا۔ وہ حبشیوں کے مظالم کی فریاد لے کر ایرانی بادشاہ نوشیروان کے دربار میں پہنچ گیا اور اس سے مدد طلب کی۔ نوشیروان نے اسے حبشیوں کی بے دخلی کا بہترین موقع تصور کیا اور اس کی مدد کے لیے تیار ہوگیا۔ آخر سیف بن ذی یزن ایرانیوں کے ایک بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ جزیرۃ العرب واپس آیا اور مسروق بن اَبرَہہ کو زور آزمائی کی دعوت دے ڈالی۔

اس کے نتیجے میں یمن میں ایک فیصلہ کن معرکہ ہوا جس میں حبشیوں کو شکست فاش ہوئی اور مسروق مارا گیا۔ اس طرح جزیرۃ العرب کے جنوب میں قائم نصرانی حبشیوں کی بہتر (۷۲) سالہ حکومت ایک بھولی بسری کہانی بن گئی۔ سیف بن ذی یزن عربوں کا مقبول قائد بن گیا، کیوں کہ اُس نے عرب کو غیر ملکیوں سے پاک کیا تھا۔[1]

☆☆☆

---

① البدایة والنهایة: ۱۵۸/۳ تا ۱۶۰؛ تاریخ ابن خلدون: ۷۴/۲

نوٹ (۱): حبشیوں کے ساتھ سیف کی کش مکش ولادتِ محمدیہ سے پہلے شروع ہو چکی تھی مگر اس کا اختتام ولادتِ محمدی کے دو سال بعد اس وقت ہوا جب پورے یمن پر سیف بن ذی یزن کا قبضہ مکمل ہوا۔ (دلائل النبوۃ للبیهقی: ۹/۲)

نوٹ (۲): اَبرَہہ کا مکہ پر حملہ جس محرم میں ہوا، غالب گمان یہ ہے کہ وہ خالص قمری تقویم کا محرم تھا جبکہ کی تقویم کے اعتبار سے وہ ماہِ رجب تھا۔ (عیسوی تاریخ مارچ ۵۶۹ بنتی ہے۔) ابرہہ کو طیش اس بات پر تھا کہ اس کے اعلان کے باوجود اہلِ عرب نے اس کے چرچ کا حج کیوں نہیں کیا اور بیت اللہ کا حسبِ معمول حج کیوں کیا۔ زمانہ جاہلیت میں حج خالص قمری تقویم میں نہ تھا بلکہ یہ کی تقویم تھی۔ جس سال ابرہہ نے حملہ کیا، اس سے قبل حج بھی کی تقویم میں کیا گیا تھا تاہم یہ قرین قیاس نہیں کہ ابرہہ نے حج کے فوراً بعد حملہ کر دیا ہوگا؛ کیوں کہ حج کے بعد ایک اور واقعہ بھی ہوا تھا جو اس کے انتہائی اشتعال کی وجہ بنا، وہ یہ تھا کہ بنوکنانہ کے ایک شخص نے صنعا جا کر ابرہہ کے چرچ کو نجس کر دیا۔ اس عربی شخص کو کعبہ سے غیر معمولی محبت ہوگی اس لیے یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کعبہ کا حج چھوڑ کر یمن چلا گیا ہو۔ اگر حج کے بعد اس کی روانگی مانی جائے جیسا کہ قرینِ قیاس ہے تو یمن پہنچنے میں اسے مہینہ ضرور لگا ہوگا یعنی وسطِ محرم میں جا کر اس نے چرچ کو ناپاک کیا ہوگا۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اسی محرم میں ابرہہ مکہ پہنچ جاتا۔ پس یہ گمان بعید ہے کہ حج کے بعد ایک ماہ کے اندر اندر حملہ ہوگیا ہو۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ ابرہہ نے اس حرکت کے بعد ایک بڑا لشکر تیار کرنے میں کچھ عرصہ لگایا ہوگا۔ لشکر کو پہنچنے میں بھی ڈیڑھ دو ماہ خرچ ہوئے ہوں گے۔ ابن اسحٰق کی روایت کے الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ غیر معمولی تیاری کے بعد پیش قدمی کی گئی تھی:

فغضب عند ذلک ابرهة وحلف لیسیرن الی البیت حتی یهدمه ثم امر الحبشة فتهیأت وتجهزت ثم سار. (سیرۃ ابن هشام: ۴۵/۱)

اس حساب سے ابرہہ کا حملہ چھ ماہ بعد آنے والے پہلے محرم میں ہی قرینِ قیاس ہے جو محرم مدنی (مطابق رجب کی) ہے۔

کائنات کی صبح صادق

آخر وہ جاں فزا گھڑی بالکل قریب آ گئی جس کا کائنات کے ذرّے ذرّے کو انتظار تھا۔ واقعہ فیل کے چالیس دن بعد پیر کے دن قریش کے سردار عبدالمطلب بن ہاشم کو صبح سویرے اطلاع ملی کہ اللہ نے انہیں ایک پوتے سے نوازا ہے۔[1] یہ ربیع الاوّل کا مہینہ تھا جبکہ خالص قمری تقویم کے لحاظ سے یہ ماہِ رمضان تھا۔ تاریخ کے بارے میں اختلاف ہے۔ ۸، ۹، ۱۰ اور ۱۲ کے اقوال مشہور ہیں۔[2]

---

① ولادتِ نبویہ کی تاریخ پر بحث:

حضور ﷺ کی ولادت کا دن بالاتفاق پیر تھا جیسا کہ صحیح حدیث میں آپ ﷺ نے خود فرمایا: ذاک یوم ولدت فیه. (صحیح مسلم، ح: ۲۸۰۴، کتاب الصیام، باب استحباب صوم ثلاثة ایام من کل شهر) اس پر بھی اتفاق ہے کہ وہ عام الفیل تھا جیسا کہ قیس بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ (سنن الترمذی، ح: ۳۶۱۹؛ مسند احمد، ح: ۱۷۸۹۱) اگرچہ اس کی سند ضعیف ہے مگر قباث بن اشیم رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کی متابع روایات موجود ہیں۔ (الآحاد والمثانی، ح: ۴۲۷، عن ابن عباس؛ مسند البزار، ح: ۴۷۶۲) جس کی بناء پر اسے حسن مانا جاتا ہے۔

نیز مسند احمد میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ولد النبی ﷺ یوم الاثنین، واستنبئ یوم الاثنین، وخرج مهاجرا من مکة الی المدینة یوم الاثنین، وقدم المدینة یوم الاثنین، وتوفی ﷺ یوم الاثنین، ورفع الحجر الاسود یوم الاثنین. (مسند احمد، ح: ۲۵۰۶)

یہ روایت سنداً ضعیف ہے؛ کیوں کہ سند میں ابن لہیعہ ہے۔ تاہم ذخیرۂ حدیث کی مذکورہ روایات سے اس قدر بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ولادت عام الفیل میں بروزِ پیر ہوئی تھی۔ ابن لہیعہ کی روایت کو مانا جائے تو ہجرت، بعثت اور وفات کی تاریخ بھی یہی طے ہو جاتی ہے۔ نیز امام زہری نے مدینہ میں آمد کی تاریخ بھی پیر، بارہ ربیع الاوّل بیان کی ہے۔ (تاریخ الطبری: ۲/۳۹۳) امام طبریؒ کے بقول ان امور میں اہلِ علم کے مابین کوئی اختلاف نہیں۔ (تاریخ الطبری: ۲/۲۹۳)

② اس بارے میں کہ ولادت کونسے مہینے میں اور کونسی تاریخ کو ہوئی؟ کتب حدیث میں کوئی ضعیف روایت بھی مروی نہیں۔ البتہ کتب تاریخ و سیرت میں کچھ ضعیف روایات ہیں، بعض منقطع الاسناد اور بعض بے سند ہیں۔ کوئی ایک روایت بھی صحیح یا حسن کے درجے کو نہیں پہنچتی جیسا کہ آگے ہم ان روایات کو اسنادی حیثیت سمیت لا رہے ہیں۔ تاہم اسنادی حیثیت ظاہر کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تاریخی حیثیت سے بھی یہ روایات ساقط الاعتبار ہیں۔ مقصد فقط یہ بتانا ہے کہ ان روایات سے کوئی شرعی مسئلہ ثابت نہیں کیا جا سکتا، چہ جائے کہ ان میں سے کوئی تاریخ متعین کر کے اسے ایک ''شرعی تہوار'' کی حیثیت دے دی جائے اور اس دن جشن نہ منانے والوں کو عشقِ نبوی سے خالی سمجھا جائے۔ جب یہ تاریخیں محض ظنی ہیں تو اگر کوئی ان تاریخوں کا انکار کرے تو اس کے دین و ایمان پر کوئی حرف کیوں آئے گا؟

اب ہم ولادتِ نبویہ کی تاریخ کے بارے میں قدیم مآخذ میں منقول اقوال نقل کرتے ہیں:

قولِ اوّل: بارہ ربیع الاوّل:

❶ ابنِ ہشام (م ۲۱۳ھ) نے محمد بن اسحٰق (م ۱۵۱ھ) سے نقل کیا ہے: قال ابن اسحاق: ولد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنین لاثنتی عشرة لیلة خلت من شهر ربیع الاوّل، عام الفیل. (سیرة ابن هشام: ۱/۱۵۸) مگر ابن اسحاق کی اپنی سیرۃ نبویہ میں مجھے تلاش کے باوجود یہ روایت نہیں ملی۔ ممکن ہے کہ ابن ہشام نے اس روایت کو ابن اسحاق کی کسی اور کتاب میں دیکھا ہو جو ہمارے سامنے نہیں یا یہ روایت ان سے بالواسطہ ملی ہو۔ بہرکیف ابن ہشام نے سند نقل نہیں کی بلکہ ''قال ابن اسحاق'' پر اکتفا کیا ہے۔ اسی روایت کو بیہقی، حاکم اور طبری نے بھی نقل کیا مگر سند ابن اسحٰق پر ختم ہو جاتی ہے۔ (دلائل النبوة: ۱/۷۴؛ المستدرک، ح: ۴۱۸۲؛ تاریخ الطبری: ۲/۱۵۶) ہر حال میں روایت ضعیف اور منقطع ٹھہرتی ہے اور تیسری صدی ہجری میں کثرتِ طرق سے اس میں کوئی قوت پیدا نہیں ہوتی؛ کیوں کہ قرنِ اول کے راوی بالکل مجہول ہیں۔

❷ حافظ ابن کثیرؒ نے ''مصنف ابن ابی شیبہ'' کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے: ''ولد رسول اللہ ﷺ عام الفیل یوم الاثنین، الثانی عشر من ربیع الاول، وفیه بعث، وفیه عرج به الی السماء، وفیه هاجر و مات.'' (البدایة والنهایة: ۳/۳۷۵) مگر ابن کثیرؒ نے اس کی سند کو منقطع کہا ہے۔ (مجھے تلاش کے باوجود ''مصنف ابن ابی شیبہ'' میں یہ روایت نہیں ملی اور کسی اور قدیم مآخذ میں بھی اس تک نہیں پہنچ سکا۔)

❸ ایک منقطع روایت معروف بن خربوذ مکی (م ۱۵۱ھ) کی ہے جس میں وہ بارہ ربیع الاوّل کو تاریخ ولادت بتاتے ہیں۔ (تاریخ دمشق: ۳/ ۷۰،۶۹)

وہ دوڑے ہوئے آئے۔ اپنی بہو آمِنہ بنت وَہب کے پہلو میں ایک چاند سا حسین بچہ دیکھا تو ان کا دل شفقت و محبت سے لبریز ہو گیا۔ چھ ماہ پہلے ان کے سب سے چہیتے بیٹے عبداللہ کا انتقال ہو گیا تھا، یہ بچہ اسی عبداللہ کی نشانی تھا۔ عبدالمُطّلِب بچے کو گود میں لے کر کعبہ میں داخل ہوئے۔ اللہ کی حمد و ثنا بیان کی، اس بچے کا نام سوچنے لگے تو ان کے ذہن میں ایک بالکل نیا نام ''محمد'' آیا جو اس سے پہلے عربوں میں کسی نے نہیں رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ منفرد نام اپنے آخری رسول کے لیے محفوظ کیا ہوا تھا جو عین وقت پر عبدالمُطّلِب کے دل میں ڈال دیا گیا۔

اس آخری نبی کا شجرۂ نسب یوں ہوا: ''محمد بن عبداللہ بن عبدالمُطّلِب بن ہاشم بن قُصَیّ بن کِلاب بن مُرّہ بن کعب بن لُؤَیّ بن غالب بن فِہر بن مالک بن نَضر بن کِنانہ بن خُزَیمہ بن مُدرِکہ بن الیاس بن مُضَر بن نِزار بن مَعَدّ بن عدنان''

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

قول ثانی: بارہ رمضان المبارک:

❶ حافظ ابن کثیرؒ نے زبیر بن بکار (م ۲۵۶ھ) کے حوالے سے ایک قول نقل کیا ہے جس کے مطابق حضرت آمنہ کے ایام حمل کی ابتدا ایام تشریق میں ہوئی تھی، نو ماہ کی مدتِ حمل رمضان میں مکمل ہوئی اور بارہ رمضان کو ولادت ہوئی۔

حملت به أمه في ايام التشريق ...... وولد بمكة في ثنتي عشرة ليلة خلت من شهر رمضان. ''(البداية والنهاية: ۳/۳۷۶)

اس قول کو علامہ عبدالعزیز الحموی اور علامہ مقریزی نے بھی نقل کیا ہے۔(المختصر الكبير في سيرة الرسول، ص ۲۲ ؛ امتاع الاسماع للمقريزي: ۶/۱) یاد رہے کہ زبیر بن بکار ثقہ راوی ہیں۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔ ابن اسحاق پر سخت جرح بھی ہے مگر زبیر بن بکار پر ایسی جرح نہیں، فقط علامہ سلیمانی نے جرح کی تھی جسے بالاتفاق مردود قرار دیا گیا ہے۔ باقی سب ان کی توثیق کرتے ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کا تعارف ''العلامه، الحافظ، قاضي مكة وعالمها'' کہہ کر کرایا ہے۔(سير اعلام النبلاء: ۱۲/۳۱۱ تا ۳۱۵) زبیر بن بکار کی ثقاہت بیان کرنے سے مذکورہ روایت کو صحیح یا حسن بنانا مقصود نہیں بلکہ وہ انقطاع کے باعث اسی طرح ضعیف رہے گی جیسا کہ ابنِ اسحاق کی روایت ہے۔ مقصد فقط یہ بتانا ہے کہ اس روایت کی حیثیت ابن اسحاق سے کم نہیں۔

❷ زبیر بن بکار کے قول کی تائید میں حافظ ابن عساکر نے ایک اور سند کے ساتھ شعیب بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے یہ نقل کیا ہے:

حمل رسول الله ﷺ في عاشوراء المحرم وولد يوم الاثنين لثنتي عشرة ليلة خلت من رمضان.

مگر اس سند میں دو افراد ضعیف ہیں: ایک محمد بن عثمان (بن ابی شیبہ) م ۲۹۷ھ بعض نے ان کی توثیق کی ہے اور اکثر نے ضعیف اور منکر روایات نقل کرنے کے باعث ان پر سخت جرح کی ہے۔(میزان الاعتدال: ۳/۶۴۲) دوسرے مسیب بن شریک (م ۱۸۱ھ) بھی ضعیف ہیں۔(میزان الاعتدال: ۴/۱۱۴)

قول ثالث: یکم ربیع الاوّل

امام فاکہی نے اپنی سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ولادت اور وفات دونوں ''اوّل شهر ربيع الاوّل'' میں ہوئی تھیں۔(اخبار مكة للفاكهي: ۳/ ۳۸۴) یہ روایت نہایت ضعیف ہے؛ کیوں کہ سند میں معلّی بن عبدالرحمٰن کو کذاب کہا گیا ہے۔(الضعفاء الكبير للعقيلي: ۴/۲۱۵)

قول رابع: دو ربیع الاوّل:

واقدی نے ابو معشر مدنی (م ۱۷۰ھ) سے دو ربیع الاوّل کا قول نقل کیا ہے: ''يوم الاثنين ليلتين خلتا من شهر ربيع الاوّل.'' (طبقات ابن سعد: ۱/۱۰۱) یہ بھی منقطع ہے۔ نیز ابو معشر مدنی ضعیف راوی ہیں۔(تقريب التهذيب، ترجمه نمبر: ۷۱۰۰)

قول خامس: آٹھ ربیع الاوّل:

ابن الجوزی نے اپنی سند سے محمد بن احمد البراء (م: ۲۹۱ھ) کا قول نقل کیا ہے کہ ولادت مبارکہ ۸ ربیع الاوّل کو ہوئی۔(المنتظم: ۲/۲۴۶) اس میں بھی انقطاع سنداً واضح ہے۔ ابن حبیب (م ۲۴۵ھ) نے یہ آخری دو قول یعنی: ۲ ربیع الاوّل اور ۸ ربیع الاوّل کسی سند کے بغیر نقل کیے ہیں۔(المحبر، ص ۹۰۸)

نامور فلکیات دان علامہ ابن قنفذ (م ۸۱۰ھ) نے آٹھ ربیع الاوّل کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے: ''والذي صححه كثير من الناس انه الثامن منه.'' (وسیلۃ الاسلام، ص ۴۴) اقوال اور بھی ہیں مثلاً ۱۷ ربیع الاوّل وغیرہ مگر وہ بالکل متروک ہیں۔ مشہور اقوال ہم نے ذکر کر دیے۔ بارہ ربیع الاوّل کا قول اکثر سیرت نگاروں نے ابن اسحاق اور ابن ہشام کے اتباع میں اختیار کیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے اسے جمہور کا قول قرار دیا ہے۔(البداية والنهاية: ۳/۳۷۵)

البتہ روایت سے زیادہ درایت پر اعتماد کرنے والے تقویم اور فلکیات کے ماہر مؤرخین کے نزدیک ۱۲ ربیع الاوّل کی جگہ ۲، ۸ یا ۹ ربیع الاوّل کے اقوال راجح ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ''ہجرت بالاتفاق ستمبر ۶۲۲ء میں ہوئی۔ اس حساب سے ۵۳ سال قبل الہجرۃ کی بارہ ربیع الاوّل کو...... (بقیہ اگلے صفحے کے حاشیے پر)

عدنان کے بعد کئی واسطوں سے حضور نبی کریم ﷺ کا سلسلہ نسب حضرت اسماعیل علیہ السلام سے جا ملتا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے اور برگزیدہ نبی تھے۔ ①

پاکیزہ بچپن:

رسول اللہ ﷺ کو شروع شروع میں چند دن ان کے چچا ابولہب کی باندی ثُوَیبَہ نے دودھ پلایا۔② اس دوران عبدالمطلب اپنے یتیم پوتے کے لیے کسی دودھ پلانے والی کو تلاش کر رہے تھے۔ عربوں میں یہ رواج تھا کہ شیر خوار بچوں کو پرورش کے لیے دیہات کی دایوں کے حوالے کر دیتے تھے تاکہ انہیں کھلی اور صاف آب و ہوا میسر آئے اور اُن کے جسم و جان کی اچھی نشو نما ہو۔ اس کے علاوہ دیہاتیوں کی زبان بھی فصیح اور خالص ہوتی تھی، جسے سیکھ کر بچے بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)...... کسی بھی طرح پیر کا دن نہیں بنتا۔ جبکہ ۲، ۸، یا ۹ کسی نہ کسی طرح اس کے مطابق ہو جاتے ہیں۔

رمضان میں ولادت کا قول بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں؛ کیوں کہ اس کی اسنادی حیثیت ابن اسحاق کی روایت کے برابر ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اس کی تائید میں یہ شہادت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ پر نزولِ وحی کا آغاز رمضان میں ہوا تھا اور اس وقت آپ ﷺ کی عمر چالیس سال تھی۔ (البدایة والنهایة: ۳/۳۷۶) پس ولادت اس سے ٹھیک چالیس سال قبل رمضان میں طے ہو جاتی ہے۔

ربیع الاوّل اور رمضان کے اقوال میں سے کونسا راجح ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ رمضان یا ربیع الاوّل میں سے کونسا قول راجح ہے؟ تو درحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ جب ہم مکی اور مدنی تقویم کا فرق سامنے رکھ کر ۵۵ سال قبل الہجرۃ کا حساب لگاتے ہیں تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ولادتِ مبارکہ کے سال دو مواقع پر الگ الگ تقویموں کے ربیع الاوّل اور رمضان جمع ہو جاتے ہیں۔ علی محمد خان کی تقویم کے مطابق پہلا موقع ۱۳ رمضان مدنی = ۱۳ ربیع الاوّل مکی = ۱۹ نومبر ۵۶۸ء ہے۔ اور دوسرا موقع ۱۰ رمضان مدنی = ۱۰ ربیع الاوّل مکی = ۱۳ مئی ۵۶۹ء ہے۔ (تقویم عہدِ نبوی، ص ۱۱۵) بعض حضرات نے ان میں سے پہلی صورت کو میلاد النبی قرار دیا ہے، بعض نے دوسری کو۔ وجہ اختلاف یہ ابہام ہے کہ ربیع الاوّل اور رمضان کے قائلین میں سے کس نے مکی اور کس نے مدنی تقویم کو نقل کیا ہے؟

تاریخِ ولادت تک رسائی میں ابنِ حبیب کی ایک عبارت مدد دیتی ہے جس کے مطابق سالِ ولادت کا محرم جمعہ کو شروع ہوا تھا۔ (المحبر، ص ۱۰) اسے مانا جائے تو ۵۶۸ء کے مدنی رمضان (مکی ربیع الاوّل) کی ۸ اور ۵۶۹ء کے مکی رمضان (مدنی ربیع الاوّل) کی ۱۲ تاریخ کو پیر پڑتا ہے۔

راقم کے خیال میں اس پر مزید تحقیق ہونی چاہیے۔ امکان ہے کہ منقولہ تاریخیں درست ثابت ہو۔ حسابات میں بعض چیزیں ٹھیک نہیں آتیں مگر ان میں بشری لغزش کا امکان ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ رویتِ ہلال میں غلطی کی وجہ سے تاریخ غلط نقل ہوئی ہو۔ حساب لگا کر ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ کسی خاص مقام پر اس دن چاند دکھائی دینا چاہیے مگر یہ نہیں بتا سکتے کہ کسی مقام پر کیا واقعی چاند نظر آیا تھا یا نہیں؛ کیوں کہ افق اور موسم کی مختلف کیفیات رویتِ ہلال پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔

بہرکیف یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رمضان اور ربیع الاوّل کا اختلاف خالص قمری تقویم اور شمسی قمری تقویم کا اختلاف ہے۔ قمری شمسی تقویم اور خالص قمری تقویم میں کیا فرق ہے؟ اس بارے میں ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ اس زمانے کی مکی تقویم خالص قمری نہیں تھی بلکہ وہ شمسی سالوں کے مطابق ۳۶۵ دن کی ہوا کرتی تھی۔ اس حساب سے ولادتِ نبوی اور ہجرت کے درمیان خالص قمری تقویم کے ۵۳ سال نہیں بلکہ ۵۴ سال اور چند ماہ گزر چکے تھے۔ جبکہ مکی تقویم یا شمسی سالوں کے پورے ۵۳ برس سے کچھ وقت اوپر گزر چکا تھا۔ پورے ۵۳ قمری سالوں کے مفروضے کے باعث ہی ولادتِ نبویہ کا عیسوی سن و ماہ بھی غلط نکالا جاتا ہے اور عموماً اسے "اپریل ۵۷۱ء" بتایا جاتا ہے جبکہ ولادت کا صحیح عیسوی ماہ، مئی ۵۶۹ ہے یا ماہ نومبر ۵۶۸ء۔ اس پر یہ اشکال نہ ہو کہ سیرت نگاروں نے ولادت موسمِ بہار میں بتائی ہے۔ قدیم راویوں سے موسمِ بہار کا کوئی قول منقول نہیں۔ کچھ کو ربیع الاوّل کے لفظ سے وہم ہوا ہے کہ یہ مہینہ بہار میں آتا ہوگا اور کچھ نے تقویمی حساب لگا کر "موسمِ بہار" کی بات بڑھا دی ہے جبکہ یہ حساب بنیادی طور پر غلط ہے۔

اہم تنبیہ: راقم نے سیرتِ نبویہ کی تقویم یہ فرض کرتے ہوئے کی ہے کہ مکی دور سے متعلق واقعات میں بیان کی گئی اکثر تاریخیں مکی تقویم کے مطابق ہیں؛ کیوں کہ اس وقت اکثر اسی کا رواج تھا۔ ہاں اگر کوئی تاریخ کسی دلیل یا قرینے سے اس دور کے واقعات میں بھی مدنی تقویم کے مطابق ثابت ہو تو الگ بات ہے۔

(حاشیہ صفحہ موجودہ)

① سیرة ابن هشام: ۱/۱، ۲، ۳

② جامع الاصول لابن الاثیر الجزری: ۱۲/۹۱، ط مکتبة الحلوانی

ابتدا ہی سے خوش گفتار بن جاتے تھے۔ طائف کے قریب آباد بنوسعد اپنی فصاحت و بلاغت کے باعث مشہور تھے۔ اس لیے مکّہ کے شرفاء ان کی دایوں کی خدمات حاصل کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ انہی دنوں اس قبیلے کی چند دایاں بچے گود لینے کے لیے مکّہ آئیں مگر کسی دائی نے رسول اللہ ﷺ کو گود نہ لیا تھا؛ کیوں کہ یہ خشک سالی کا زمانہ تھا اور ان لوگوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے ٹھیک ٹھاک معاوضہ چاہیے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو یتیم دیکھ کر کسی دائی کو اس گھر سے معقول معاوضہ ملنے کی توقع نہ ہوئی۔ دایوں کے اس قافلے میں حلیمہ سعدیہ نامی ایک نیک خاتون بھی تھیں۔ انہیں کسی گھر سے کوئی بچہ نہ ملا۔ آخر وہ حضرت آمِنہ کے گھر میں داخل ہوئیں، اُس یتیم بچے کو دیکھتے ہی اس کی محبت ان کے دل میں پیوست ہوگئی، وہ زیادہ اجرت کا خیال کیے بغیر نبی ﷺ کو سینے سے لگائے اپنے ساتھ لے آئیں۔ ان کو گود لیتے ہی حلیمہ سعدیہ کو ہر طرف برکت ہی برکت نظر آنے لگی۔ لاغر جانور توانا ہوگئے، بدحالی خوشحالی میں بدل گئی۔

نبی اکرم ﷺ کی نشوونما عام بچوں سے مختلف ہوئی، جب عمر مبارک دو برس ہوئی تو حلیمہ سعدیہ نے دودھ چھڑا دیا۔ نبی اکرم ﷺ اپنے رضاعی بہن بھائیوں کے ساتھ بکریاں چرانے جنگل میں جانے لگے۔ اس دوران ایک دن اچانک دو فرشتے نازل ہوئے جنھوں نے رحمتِ عالم ﷺ کا سینہ مبارک چیرا اور آپ کے دل سے سیاہ لوتھڑے جیسی کوئی چیز نکال کر پھینک دی اور دل کو ایمان و حکمت سے بھر کر واپس رکھ دیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ کے جسم مبارک پر سینہ چیرے جانے کا کوئی نشان تک نہ رہا۔[1] حضور ﷺ چار سال کی عمر تک بنوسعد میں رہے۔ اس کے بعد حلیمہ سعدیہ نے آپ کو والدہ کے سپرد کر دیا۔[2] قبیلہ بنوسعد میں گزرے ان دنوں کی سادہ و جفاکش زندگی نے نبی اکرم ﷺ کی صحت، نشوونما اور تربیت پر بہت عمدہ اثرات ڈالے۔ حضور ﷺ بعد میں کبھی کبھار صحابہ کرام سے فرماتے تھے:

"میں تم سب سے زیادہ خالص عرب ہوں اور میں نے بنوسعد کے قبیلے میں دودھ پیا ہے۔"[3]

والدہ کے ساتھ یثرب کا سفر:

مکّہ واپس آنے کے بعد جب نبی ﷺ کی عمر مبارک چھ سال ہوئی تو والدہ محترمہ آپ کو لے کر یثرب روانہ ہوئیں تاکہ اپنے شوہر کی قبر پر جائیں اور بچے کو اس کے والد کے ننھیالیوں سے ملائیں۔ ان کی حبشی باندی برکہ (ام ایمن) بھی اس سفر میں ہم راہ تھیں، جنھیں عبداللہ نے میراث میں چھوڑا تھا۔ یثرب میں حضرت آمِنہ نے اپنے شوہر کے ننھیال بنونجّار میں کچھ دن گزارے۔ یہاں بنوعدی بن نجّار کا تالاب بھی تھا جس میں نبی اکرم ﷺ نے تیراکی سیکھی۔[4]

حضرت آمِنہ کی وفات اور عبدالمُطّلب کی کفالت:

واپسی کے سفر میں حضرت آمِنہ "ابواء" کے مقام پر پہنچی تھیں کہ اچانک ان کا آخری وقت آگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے

---

① سیرۃ ابن ہشام: ۱/۱۶۲ تا ۱۶۴؛ شق صدر کا واقعہ، مسند ابی یعلی، ح:۷۱۶۳؛ صحیح ابن حبان، ح:۶۳۳۵ میں بھی ہے۔

② رضاعت کی تکمیل پر حضرت حلیمہ رسول اللہ ﷺ کو مکہ واپس لائیں تھیں مگر مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی اور بچے کی محبت بھی دامن گیر تھی اس لیے حضرت آمنہ کو منا کر وہ رسول اللہ ﷺ کو ساتھ واپس لے گئیں۔ (سیرۃ ابن ہشام: ۱/۱۶۴) پھر دو سال بعد واپس لائیں۔ (مرآۃ الزمان، سبط ابن الجوزی: ۳/۴۹)

③ سیرۃ ابن ہشام: ۲/۱۶۷　④ شرح الزرقانی علی المواهب اللدنیة: ۱/۳۰۹، ط العلمية

وہ دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ یہ ویران غیر آباد مقام مکّہ اور یثرب دونوں کے بیچوں بیچ تھا۔ چاروں طرف پہاڑ تھے جن کے درمیان ایک ٹیلے پر حضرت آمنہ کی تدفین کی گئی۔ عبداللہ کا یتیم، چھ سال کی عمر میں ماں کے سہارے سے بھی محروم ہوگیا اور وہ بھی اس کسمپرسی کے عالم میں کہ دور دور تک کوئی عزیز یا رشتہ دار نہ تھا جو سر پر ہاتھ رکھتا اور سینے سے لگا کر تسلی دیتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر معمولی شخصیات کی تربیت کے وہ مراحل ہوتے ہیں جو بھٹی کا کام کر کے استعداد کے سونے کو کندن بناتے ہیں۔ حضور ﷺ کی باندی بَرَکہ (اُمّ اَیمن جو غالباً اس وقت خود سولہ سترہ برس سے زیادہ کی نہ تھیں) بڑی مشکل سے آپ ﷺ کو ساتھ مکّہ لائیں۔ عبدالمُطّلِب نے اپنے دُرِّ یتیم کو پوری طرح اپنی آغوشِ شفقت میں لے لیا۔ وہ ایک آن پوتے کو اپنی نظروں سے دور نہ ہونے دیتے تھے۔ جب کعبے کے سایے میں اُن کے لیے وہ رئیسانہ قالین بچھایا جاتا جس پر کسی اور کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی تب بھی وہ اپنے ہونہار پوتے کو ساتھ بٹھاتے۔[1]

حضور ﷺ سات سال کے تھے جب عبدالمُطّلِب کچھ دنوں کے لیے آپ کو چھوڑ کر یمن گئے تاکہ وہاں کے نئے حاکم سیف بن ذی یَزَن کو مبارک باد دیں جس نے یمن سے حبشیوں کا اقتدار ختم کر کے عربوں کو دوبارہ عروج بخشا تھا۔[2] اس سفر کے سوا عبدالمُطّلِب نے ہمیشہ یتیم پوتے کو دل سے لگا کر رکھا۔

عبدالمُطّلِب کے بعد:

مگر والہانہ شفقت کے یہ دن بادِ صبا کی طرح گزر گئے اور ایک دن عبدالمُطّلِب بھی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اس وقت حضور ﷺ کی عمر ۸ سال دو ماہ دس دن تھی۔[3] جاتے جاتے عبدالمُطّلِب اپنے بیٹے ابوطالب کو حضور ﷺ کی دیکھ بھال کی وصیت کر گئے اور وہی آپ کے سرپرست بنے۔[4]

① سیرۃ ابن هشام: ۱/۱٦۸

② السیرۃ الحلبیة: ۱/۱٦٦، ۱٦۸، ط العلمیة ؛ المنمق فی اخبار قریش، ص۴۲۷ ؛ تاریخ ابن خلدون: ۲/۷۴

③ المحبر لابن حبیب، ص۱۰

④ سیرۃ ابن هشام: ۱/۱۷۹ ..... عبدالمُطّلِب کی وفات کے وقت ان کے دو بیٹے: حمزہ اور عباس خود کم سن تھے۔ البتہ زبیر اور ابوطالب جوان تھے۔ حضور ﷺ ان کے بعد کس کی سرپرستی میں رہے؟ اس بارے میں محمد بن اسحٰق سے مروی ہے: "حدثنا ابن حمید، حدثنا سلمة، قال حدثنی محمد بن اسحق، عن عبدالله بن ابی بکر، کان عبدالمُطّلِب یوصی برسول الله عمه اباطالب. (تاریخ الطبری: ۲/۲۷۷)

اس روایت کے مطابق عبدالمُطّلِب نے پوتے کی سرپرستی کی وصیت ابوطالب کو کی تھی۔ سیرتِ ابن اسحٰق، تاریخ طبری، سیرت ابن ہشام اور دلائل النبوۃ سمیت اکثر کتبِ سیرت میں ابنِ اسحٰق کی منقطع سند سے یہ روایت نقل کی گئی ہے۔ چونکہ اس روایت کی سند ضعیف ہے، اس لیے بعض حضرات اسے بالکل مسترد کر کے بڑے چچا حضرت زبیر کو سرپرست ثابت کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "عبدالمُطّلِب کے جانشین زبیر تھے، وہی بڑے چچا تھے، مال دار بھی تھے جبکہ ابوطالب تنگ دست تھے، اس لیے وہ بھلا سرپرستی کیسے کر سکتے تھے۔" مگر یہ دعویٰ محض قیاس ہے، سنداً اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ حضرت زبیر کی سرپرستی کی دلیل میں جن روایات کو پیش کیا جاتا ہے اول تو وہ بے سند ہیں، دوسرے ان میں حضور ﷺ کی کفالت کا سرے سے ذکر نہیں، بلکہ عبدالمُطّلِب کے بعد خاندان کی سرداری کا ذکر ہے۔ او صی عبدالمُطّلِب الیٰ ابنه الزبیر. (المنمق فی اخبار قریش، ص۱۲٦ ؛ المحبر، ص۱۳۲)

یہ ضروری نہیں کہ جو جانشین ہو، خاندان کے چھوٹے بڑے سارے کام براہِ راست اس کے ذمے ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابوطالب کو حضور ﷺ کی سرپرستی نصیب ہونے کی روایت فقط محمد بن اسحٰق سے نہیں بلکہ دیگر اسناد سے بھی منقول ہے۔ محمد بن سعد نے ایسی متعدد اسناد ذکر کی ہیں جو اگرچہ ضعیف ہیں مگر ان میں ایک سند معاذ بن محمد الانصاری (م: ۱٦۰ھ، ذکرہ ابن حبان فی الثقات: تہذیب الکمال: ۲۸/۱۳۱) عن عطاء (بن یسار، م ۹۴ھ بخاری و مسلم کے راوی) عن ابن عباس کی ہے، اس سند کے کم از کم حسن ہونے میں شبہ نہیں۔ اور دیگر روایات کو ملا کر اسے صحیح لغیرہ کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے ابوطالب کے رسول اللہ ﷺ...... (بقیہ اگلے صفحے پر)

اسی سال عرب کے مشہور سخی اور قبیلہ بنی طے کے سردار حاتم طائی کا انتقال ہوا تھا اور یہی سال فارس کے سب سے نامور بادشاہ نوشیروان کی وفات کا ہے۔[1]

اقبال مند لڑکپن:

عموماً لڑکپن کا زمانہ شوخی اور شرارت کے عروج کا ہوتا ہے مگر حضور ﷺ شروع سے نہایت شریف، باوقار اور حیادار تھے۔ حضور ﷺ عرب کی معاشرتی برائیوں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے۔ شرکیہ رسومات، شراب نوشی اور گانے بجانے سے کوسوں دور رہے۔ سچائی، امانت داری، ہمدردی، تواضع، مروت اور رحم دلی کی صفات حضور ﷺ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ بے حد ذہین، معاملہ فہم، بہادر اور چاق و چوبند بھی تھے۔[2]

شام کا سفر اور بحیرا راہب کی گواہی:

حضور ﷺ کی عمر بارہ سال تھی جب آپ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ شام کے تجارتی سفر پر نکلے۔ اس قافلے نے شام کے سرحدی شہر بُصریٰ میں شاہراہ کے کنارے پڑاؤ ڈالا جہاں بَحیرا نامی ایک راہب کی خانقاہ تھی۔[3]

بَحیرا کبھی اپنی خانقاہ سے باہر نہیں نکلتا تھا، مگر اس دن وہ باہر آیا اور مجمعے کو چیرتا ہوا رسول اللہ ﷺ کے پاس جا پہنچا۔ پھر ان کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا: ''یہ سید العالمین ہیں۔ یہ رب العالمین کے رسول ہیں۔ یہ رحمۃ للعالمین ہیں۔''

قریش کے کچھ بوڑھوں نے کہا: ''تمھیں کیسے معلوم؟''

کہنے لگا: ''جب تم گھاٹی سے نیچے اتر رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ کوئی درخت یا پتھر ایسا نہیں جو تعظیماً جھک نہ رہا ہو۔ ایسا فقط نبی کے لیے ہوتا ہے۔ میں اسے مہرِ نبوت کی وجہ سے پہچانتا ہوں جو اس کے کندھوں کے درمیان ہے۔''

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)...... کے سرپرست ہونے کی روایات یقیناً قابلِ قبول ہیں اور ان کی تردید محض متعصبانہ قیاس پر مبنی ہے۔ امام بلاذری اس قضیے میں چند اقوال ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "فاقترع الزبیر وابوطالب ایھما یکفل رسول اللہ ﷺ؟ فاصابت القرعۃ اباطالب، فاخذہ الیہ، ویقال بل اختارہ رسول اللہ ﷺ علی الزبیر، وکان الطف عمیہ بہ، ویقال بل اوصاہ عبدالمُطّلب بان یکفلہ بعدہ. (انساب الاشراف: ۸۵/۱)

اس عبارت کا حاصلِ مطلب یہ ہے کہ ایک روایت کے مطابق حضور ﷺ کی کفالت کے مسئلے پر ابوطالب اور زبیر کے مابین قرعہ اندازی ہوئی تھی اور ابوطالب جیت گئے تھے۔ ایک راویت یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو اختیار دیا گیا اور انہوں نے ابوطالب کو پسند کر لیا۔ ایک روایت میں عبدالمطلب کی وصیت یہی تھی۔

یاد رہے کہ علامہ حلبی نے ایک قول نقل کیا ہے جس سے متعارض اقوال میں تطبیق ہو جاتی ہے وہ یہ کہ عبدالمُطّلب کے بعد جناب زبیر اور حضرت ابوطالب دونوں نے کفالت کی، جب حضور ﷺ کی عمر چودہ برس ہوئی تو حضرت زبیر کی وفات ہوگئی اور کفالت فقط ابوطالب کے ذمے ہوگئی۔ (السیرۃ الحلبیۃ: ۱۲۵/۱)

مگر ابوطالب کی کفالت کی نفی اس قول میں بھی نہیں کی گئی۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ امام بلاذری نے حضرت زبیر کے کفالت کرنے اور حضور ﷺ کی عمر چودہ سال ہونے پر حضرت زبیر کے وفات پانے کی روایت کی مدلل تردید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: وروی بعضھم ان الزبیر کفل النبی ﷺ حتی مات، ثم کفلہ ابوطالب وذالک غلط؛ لان الزبیر شھد حلف الفضول ولرسول اللہ ﷺ یومئذ نیف وعشرون سنۃ، لااختلاف بین العلماء فی ان شخوص رسول اللہ ﷺ الی الشام مع ابی طالب بعد موت عبدالمُطّلب باقل من خمس سنین. (انساب الاشراف: ۸۵/۱)

غرض امام بلاذری نے ابوطالب کی سرپرستی کی روایت ہی کو ترجیح دی ہے۔ اب اگر کوئی صرف اس قیاس کے ذریعے کہ ابوطالب مفلس اور کمزور تھے اور زبیر مال دار اور سردار تھے، ان روایات کی نفی کرے تو یہ بالکل بے وزن بات ہوگی۔ کیا تنگ دست لوگ بچوں کو نہیں پالتے؟ اور کیا وہ یتیموں کی پرورش نہیں کرتے؟

حاشیہ صفحہ موجودہ:

[1] تاریخ الخمیس فی احوال انفس النفیس: ۲۵۵/۱، ط دار صادر؛ البدء والتاریخ: ۱۳۳/۴، ط مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ

[2] السیرۃ الحلبیۃ: ۱۷۸/۱ [3] طبقات ابن سعد: ۱۲۱/۱ ...... غالباً شام کا یہ سفر قریش کی عادت کے مطابق موسم گرما میں ہوا تھا۔ (سورۃ القریش، آیت ۲)

راہب نے قافلے کی ضیافت کی اور ابوطالب کو قسم دی کہ اس لڑکے کو شام نہ لے جائیں؛ کیوں کہ اگر رومیوں نے اسے صفاتِ نبوت کی وجہ سے پہچان لیا تو قتل کر دیں گے۔ [1]

آخر ابوطالب نے حضور ﷺ کو ایک آدمی کے ساتھ واپس مکہ بھیج دیا۔ [2]

حربِ فجار میں شرکت:

حضور ﷺ دس سال کے تھے جب مکہ کے مضافات میں لڑائیوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جنھیں "حروبِ فجار" کہا

---

① سنن الترمذی، ح: ۳۶۲۰، ابواب المناقب، باب ما جاء فی بدء نبوة النبی ﷺ، قال الالبانی: صحیح لکن ذکر بلال فیہ منکر

اس روایت میں کسی راوی کے وہم کی وجہ سے یہ اضافہ بھی ہے: وردہ ابو طالب و بعث معہ ابوبکر بلالا. (ابوطالب نے نبی ﷺ کو واپس کیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ واپس بھیجا۔)

اس حصے کو دیکھتے ہوئے حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس پوری روایت کو متناً ناقابلِ قبول قرار دیا ہے۔ (میزان الاعتدال: ۲/ ۵۸۱)

مگر اعتدال کی بات یہ ہے کہ روایت کے متن کا اتنا ہی حصہ متروک ہونا چاہیے، جو عقلاً ناقابلِ قبول ہے، چنانچہ امام ابن القیم رحمہ اللہ نے "زاد المعاد" میں جو نہایت احتیاط سے مرتب کردہ سیرتِ نبویہ ہے، اس واقعے کو نقل کیا ہے، اور اسی حصے کو غیر معتبر قرار دیا ہے جو بدیہی طور پر غلط ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"ووقع فی کتاب الترمذی وغیرہ انه بعث معه بلالاً وهو من الغلط الواضح، فان بلالاً اذ ذاک لعله لم یکن موجوداً، وان کان فلم یکن مع عمه ولا مع ابی بکر، وذکر البزار فی مسنده هذا الحدیث، ولم یقل: وارسل معه عمه بلالاً، ولکن قال: رجلاً. (زاد المعاد: ۱/ ۷۶، ۷۷)

دوسری طرف علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے اپنی شہرۂ آفاق "سیرت النبی" میں مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں اس روایت پر متناً ہی نہیں سنداً بھی سخت جرح کر کے قریب قریب اسے مسترد ہی کر دیا ہے۔ حالانکہ مستشرقین کا یہ اعتراض کہ نبی ﷺ نے بحیرا راہب سے اسی سفر میں علوم سیکھے ہوں گے، بذاتِ خود انتہائی کمزور ہے۔ علامہ شبلی نعمانی خود اس کا یہ معقول جواب دے چکے ہیں کہ اتنے مختصر وقت میں بھلا ایک کم عمر لڑکا ایسے دقیق علوم و معارف کیسے سیکھ سکتا ہے جو حضور ﷺ سے ظہور پذیر ہوئے۔ پس مستشرقین کے اعتراض میں ایسا کوئی وزن نہیں جس کی بناء پر ہم اپنی "تراث" کو چھوڑ دیں۔

اب ہم اس روایت کی سند پر غور کرتے ہیں۔ سنن ترمذی میں یہ بسند "حسن غریب" منقول ہے، سند یہ ہے:

فضل بن سهل، عبدالرحمن بن غزوان، یونس بن ابی اسحاق، ابوبکر بن ابی موسیٰ، ابو موسیٰ الاشعری

فضل بن سهل: بخاری و مسلم کے راوی ہیں۔ صدوق ہیں۔ (تقریب التهذیب، ترجمه نمبر: ۵۴۰۳)

عبدالرحمان بن غزوان: صحیح بخاری کے راوی ہیں، ثقہ ہیں۔ (تقریب التهذیب، ترجمه نمبر: ۳۹۷۷) حافظ ذہبی رحمہ اللہ انہیں حافظ، امام اور صدوق کہتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور یحییٰ بن معین رحمہ اللہ ان کے تلامذہ میں شامل تھے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۹/ ۵۱۸)

یونس بن ابی اسحق: ان سے امام مسلم نے روایت لی ہے۔ حافظ ابن حجر نے انہیں "صدوق یهم" کہا ہے۔ (تقریب التهذیب، ترجمه نمبر: ۷۸۹۹)

ابوبکر بن ابی موسیٰ: بخاری و مسلم کے راوی اور ثقہ ہیں۔ (تقریب التهذیب، ترجمه نمبر: ۷۹۹۰)

غرض ان میں سے ہر راوی بخاری یا مسلم یا دونوں کا راوی ہے، کوئی راوی ایسا نہیں جس پر کذب کی تہمت لگی ہو۔ آخر میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ رہ جاتے ہیں جنہیں لے کر علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے: "اس حدیث کے اخیر راوی ابوموسیٰ اشعریؓ ہیں، وہ شریکِ واقعہ نہ تھے اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے۔" (سیرت النبی: ۱/ ۱۱۴) مگر یہ اعتراض بے جا ہے۔ اصولِ حدیث میں طے ہے کہ مراسیلِ صحابہ بالاتفاق قابلِ قبول ہیں۔ امام زرکشی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " تقبل مراسیل الصحابة و ان احتملت روایتهم عن التابعین لان الغالب انهم لایروون الا عن النبی ﷺ لاسیما حالة الاطلاق فحمل علی الغالب." (النکت علی مقدمة ابن الصلاح للزرکشی: ۱/ ۴۷۵)

علامہ صلاح الدین علائی الدمشقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: " فان الجمهور علیٰ قبول مراسیل الصحابة. " (تحقیق منیف الرتبة، ص ۴۵)

امام عراقی رحمہ اللہ تحریر کرتے ہیں: " اما مراسیل الصحابة فحکمها حکم الموصول. " (شرح التبصرة والتذکرة الفیة العراقی: ۱/ ۲۱۳)

سننِ ترمذی کی یہ روایت قابلِ قبول ثابت ہو جانے کے بعد سیرتِ ابن ہشام اور طبقات ابن سعد کی وہ ضعیف الاسناد روایات بھی متروک نہیں رہتیں جن میں یہ واقعہ تقریب قریب اسی طرح بیان ہوا ہے۔ سیرت نگاروں نے اس واقعے کو پوری اہمیت کے ساتھ لیا ہے؛ کیوں کہ اس میں ایک غیر مسلم کی زبانی رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی شہادت مل رہی ہے۔

② زاد المعاد: ۱/ ۷۶، ۷۷ بحواله مسند البزار

جاتا ہے۔اس سلسلے کی پہلی لڑائی فجارِ اوّل بنو کنانہ اور ہَوازِن کے درمیان ہوئی۔دوسری جنگ قریش اور ہَوازِن کے مابین لڑی گئی۔تیسری میں ہوازن اور بنو نصر بن معاویہ آمنے سامنے آئے۔[1] چوتھی لڑائی جسے ''فجارِ رابع'' اور ''فجارِ بَرّاض'' کہا جاتا ہے،گزشتہ تمام جنگوں سے زیادہ سخت تھی جو قریش اور قبیلہ بنو قیس کے درمیان برپا ہوئی۔اس وقت حضور ﷺ کی عمر پندرہ سال کی تھی۔معرکے کے دن قریش کے تقریباً تمام ہوشیار مرد میدان میں صف بند تھے،لڑکوں کو بھی مددگار کے طور پر طلب کیا گیا تھا۔نبی اکرم ﷺ بھی اپنے چچاؤں کے ہمراہ میدانِ جنگ میں پہنچ گئے جو تیر اندازی پر مقرر تھے۔اس جنگ میں بنو ہاشم کے سردار زبیر بن عبدالمُطّلب تھے۔قریش کی قیادت بنواُمیہ کا سردار حرب بن اُمَیّہ کر رہا تھا۔

لڑائی شروع ہوئی تو دشمنوں نے قریش پر پورا دباؤ ڈال دیا۔نبی اکرم ﷺ کے چچا اپنی کمانوں سے تیر چلا رہے تھے اور آپ ﷺ انہیں دشمن کے چلائے ہوئے تیر لالا کر پکڑا رہے تھے تاکہ تیروں کی کمی نہ ہونے پائے۔دن کے ابتدائی حصے میں بنو قیس کا پلہ بھاری تھا مگر سورج ڈھلنے کے بعد قریش نے جنگ کا پانسا پلٹ دیا اور بنو قیس شکست کھا کر پسپا ہو گئے۔یہ حضور ﷺ کے لیے کسی جنگ میں شرکت کا پہلا تجربہ تھا۔[2]

سیف ذی یَزَن کی وفات اور جنوبی عرب پر فارس کا تسلط:

اسی سال جنوبی عرب میں ایک انقلاب آیا۔یمن کا محبِ وطن عرب حاکم سیف بن ذی یَزَن پندرہ سالہ حکومت کے بعد فوت ہو گیا،چونکہ یہ حکومت کسریٰ کی عسکری مدد کے طفیل تھی،اس لیے سیف کے مرتے ہی کسریٰ نے یمن کو براہِ راست اپنے قبضے میں لے لیا اور وہاں اپنے فارسی النسل گورنروں اور افسروں کا تقرر کر دیا۔اس طرح جزیرۃ العرب کا جنوب ایک بار پھر بری طرح غیر ملکی استبداد میں جکڑا گیا۔[3]

رزقِ حلال کے لیے محنت:

جوان ہوئے تو حضور ﷺ نے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لیے روزگار تلاش کرنے کی فکر کی۔بنو ہاشم تاجر پیشہ تھے مگر نبی اکرم ﷺ کے پاس سرمایہ نہیں تھا،اس لیے آپ نے اجرت کے بدلے لوگوں کی بکریاں چرانے کا کام شروع کیا۔بنو سعد میں بچپن گزارنے کی وجہ سے آپ ﷺ کو پہلے سے اس کام کا تجربہ تھا۔[4]

---

① مرآۃ الزمان ،سبط ابن الجوزی:۳/ ۷۲،۷۳

② سیرۃ ابن ھشام: ۱/۱۸۴ ؛ السیرۃ الحلبیۃ: ۱/۱۸۵ تا ۱۸۷،ط العلمیۃ

فائدہ (۱) : ایک قول کے مطابق اشہر حرم میں واقع ہونے کی وجہ سے انہیں حروب الفجار (باعثِ گناہ لڑائیاں) کہا گیا مگر یہ قول درست نہیں: کیوں کہ ان میں سے بعض جنگیں سال کے دوسرے مہینوں میں بھی ہوئیں۔جیسا کہ ''فجارِ بَرّاض'' شوال میں لڑی گئی تھی۔(عیون الاثر لابن سید الناس: ۱/ ۶۰ ؛ السیرۃ الحلبیۃ : ۱/ ۱۸۲) راجح یہ ہے کہ بکثرت ناجائز جانی و مالی اتلاف کی وجہ سے انہیں ''فِجار'' کہا گیا۔قیس بن مَخرمہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

سمو ہ فجارا لانھم فجروا واحلوا اشیاء کانو یحرمونھا.(مجمع الزوائد ،ح: ۱۳۹۳۹)

فائدہ(۲) لفظ ''فِجار'' کو ''فُجّار'' بھی پڑھا جاتا ہے۔''فُجّار'' فاجر (گنہگار) کی جمع ہے،اس لحاظ سے وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔

③ الکامل فی التاریخ: ۱/۴۱۰،ذکر ملک کسریٰ انوشروان بن قباذ ؛ تاریخ ابن خلدون: ۲/۷۴

④ صحیح البخاری، ح ۲۲۶۲،کتاب الاجارۃ ،باب رعی الغنم علیٰ قراریط۔

بعد میں حضور ﷺ نے اپنے چچا زبیر کے ساتھ تجارت کا تجربہ حاصل کیا اور ان کے ساتھ یمن کا ایک سفر بھی کیا۔ ①

حِلف الفُضول:

حضور اکرم ﷺ کی عمر بیس برس تھی جب مکّہ کے کئی شرفاء کی طرف سے مشہور زمانہ ''حِلف الفُضول'' کا معاہدہ ہوا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ جمود اور خوابیدگی کے اس دور میں بھی کچھ لوگوں کے ضمیر زندہ ہیں۔ ②

اس معاہدے کی اصل وجہ تو یہ تھی کہ قریش بلاوجہ کی خونریزیوں سے اُکتا گئے تھے اور ایک عادلانہ معاہدہ کر کے امن و امان قائم کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ اس کا فوری سبب یہ ہوا کہ ''بنوزُبَید'' کا ایک تاجر مکّہ میں سامانِ تجارت لے کر آیا۔ یہاں ایک قریشی سردار عاص بن وائل نے اس کا تمام سامان خرید لیا مگر اسے قیمت نہیں دی۔ زُبیدی تاجر نے تنگ آ کر مکّہ والوں سے فریاد کی تو کئی رئیسوں کو رحم آ گیا، نبی کریم ﷺ کے چچا زبیر بن عبدالمُطّلِب کی تجویز پر یہ لوگ عبداللہ بن جُدعان نامی سردار کے مکان پر جمع ہو گئے اور معاہدہ کیا کہ وہ سب ظالم سے مقابلے اور مظلوم کی مدد کے لیے یک جا رہیں گے۔ معاہدہ ذوالقعدہ میں ہوا تھا۔ اس میں شریک تین نمایاں افراد کے نام: فَضل، فَضالہ اور مُفَضَّل تھے، لہٰذا اسے ''حِلف الفُضول'' کہا گیا۔ حضور ﷺ بھی اس معاہدے میں شریک تھے اور اس منصفانہ قول و اقرار پر بہت خوش تھے۔ حضور ﷺ بعد میں فرمایا کرتے تھے: ''اس معاہدے کے بدلے مجھے سرخ اونٹ بھی دیے جاتے تو میں قبول نہ کرتا۔ آج بھی کوئی ایسے معاہدے کی دعوت دے تو میں تیار ہوں۔'' ③

قابلِ رشک جوانی، تجارت اور نکاح:

سرمایہ نہ ہونے کے باعث حضور ﷺ دوسروں کا سرمایہ تجارت میں لگا کر نفع میں شریک ہونے لگے۔ عمر مبارک پچیس سال کی تھی جب اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مال و دولت کے لحاظ سے غنی کر دینے کا انتظام فرمایا۔ قریش کی ایک مال دار اور شریف بیوہ خدیجہ بنت خویلد قابلِ اعتماد افراد کو سرمایہ دے کر تجارت میں لگواتیں اور حاصل ہونے والے نفع سے انہیں معقول معاوضہ دیتیں۔ انہیں حضور ﷺ کی شرافت، دیانت اور دوسری خوبیوں کا علم ہوا تو بڑے اصرار سے آپ کو اپنا سرمایہ دے کر تجارت کے لیے شام بھیج دیا۔

---

① قال ابن الجوزی فی "الوفاء": لما اتت لرسول اللہ ﷺ بضع عشرة سنة خرج فی سفر مع عمه الزبیر. (سبل الهدی والرشاد: ۲ / ۱۳۹) وقال الحلبی فی شرحه: "الی الیمن. (السیرة الحلبیة: ۱/ ۱۷۰) اس روایت سے عمر کا پورا تعین نہیں ہوتا؛ کیوں کہ بضع کا اطلاق تین سے ۹ تک ہوتا ہے۔ وهو ما بین الثلاث الی التسع. (الصحاح تاج اللغة: ۳/ ۱۱۸۶) مگر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ جنگِ فجار اور حلف الفضول کا درمیانی زمانہ تھا۔ حلف الفضول میں آپ ﷺ کی عمر بیس برس تھی اور جنگ فجار میں پندرہ برس، اس کے علاوہ آپ ﷺ نے کچھ عرصہ بکریاں بھی چرائی تھیں، نیز تجارتی تجربے کے لیے ذرا بالغ عمر کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے اندازاً اس سفر میں حضور ﷺ کی عمر ۱۸ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ غالباً یمن کا یہ سفر قریش کی عادت کے مطابق موسم سرما میں ہوا تھا۔ (سورة القریش، آیت: ۲ مع تفسیر ابن کثیر)

② طبقات ابن سعد: ۱/ ۱۲۸، اس روایت پر یہ اشکال بے بنیاد ہے کہ حضرت زبیر اس زمانے میں وفات پا چکے تھے۔ ان کی وفات رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے چند سال قبل ہوئی تھی، بلاذری جو انساب کے امام تھے، لکھتے ہیں: "ومات الزبیر ورسول اللہ ﷺ ابن بضع وثلاثین سنة." (انساب الاشراف: ۲/ ۲۰)

③ طبقات ابن سعد: ۱/ ۱۲۸؛ المستدرک للحاکم، ح: ۲۸۷۰؛ البدایة والنهایة: ۳/ ۳۵۵ تا ۳۵۹؛ مرآة الزمان، سبط ابن الجوزی: ۳/ ۷۹

حضور ﷺ کی دیانت داری اور خوش اسلوبی کی وجہ سے اس تجارت میں بے حد نفع ہوا۔ ساتھ ہی خدیجہ رضی اللہ عنہا کو آپ کی مزید خوبیوں کا علم بھی ہوا۔ وہ آپ کے کردار سے اتنی متاثر ہوئیں کہ آپ کو نکاح کا پیغام بھیج دیا، اس سے پہلے وہ بڑے بڑے شریف اور رئیس لوگوں کی طرف سے رشتے کے پیغام مسترد کر چکی تھیں۔ حضور ﷺ نے یہ رشتہ قبول کر لیا۔ آپ ﷺ کے چچا ابو طالب نے نکاح پڑھایا۔ اس وقت آپ کی عمر پچیس برس کی تھی، جبکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا چالیس سال کی تھیں۔ ①

ازدواجی زندگی:

اب حضور ﷺ تنگ دست نہیں تھے، اللہ تعالیٰ نے ازدواجی زندگی کی نعمت کے ساتھ ساتھ مالی وسعت بھی عطا فرما دی تھی۔ اِدھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو ایسا رفیقِ حیات مل گیا تھا جس پر وہ جتنا بھی فخر کرتیں کم تھا۔ انہوں نے اپنی دولت، جائیداد اور تجارت کا سرمایہ سب کچھ حضور ﷺ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ حضور ﷺ کی خوشی ہی میں اُن کی خوشی تھی۔ حضور ﷺ اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ انہی کے مکان میں رہنے لگے۔ یہ مکان دو رہائشی کمروں اور ایک مہمان خانے پر مشتمل تھا۔ اس بابرکت گھر میں حضور ﷺ نے اپنی جوانی کے اٹھائیس سال گزارے تھے۔ ②

اب تک آپ کی حبشی باندی برکہ آپ ﷺ کی خدمت کیا کرتی تھیں۔ حضور ﷺ فرماتے تھے: ''میری ماں کے بعد یہی میری امی ہیں۔'' اُم ایمن حضور ﷺ سے کوئی دس، گیارہ سال بڑی تھیں۔ آپ نے اپنی شادی کے موقع پر ان کی ڈھلتی ہوئی عمر اور سابقہ خدمات کا احساس کرتے ہوئے انہیں نہ صرف آزاد کر دیا بلکہ ایک شریف النفس آدمی حارث بن زید سے اُن کا نکاح بھی کرا دیا۔ اس طرح وہ بھی اپنے گھر میں بس گئیں۔ ان کے ایک لڑکا بھی ہوا جس کا نام اَیمن رکھا گیا۔ برکہ اس کے نام کی نسبت سے ''اُمِ ایمن'' کہلائیں۔ ③

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی کفالت:

اس گھر میں حضور ﷺ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ ایک فرد اور بھی تھا، یہ بنو کلب کا ایک گم شدہ لڑکا زید بن حارثہ تھا، اس بچے کو دشمن قبیلے کے حملہ آوروں نے اغواء کر کے غلام بنایا اور عُکاظ کے بازار میں بیچ دیا تھا، اس وقت یہ بچہ صرف آٹھ سال کا تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے حکیم بن حزام نے اسے خریدا اور لا کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو پیش کر دیا۔ جب حضور ﷺ کا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا تو انہوں نے زید کو آپ کی خدمت میں دے دیا۔ ④

ایک مدت بعد زید کے والد حارثہ کو اطلاع مل گئی کہ ان کا گم شدہ بچہ قریش کی غلامی میں ہے۔ وہ سیدھے مکہ پہنچے، حضور ﷺ سے ملے اور ماجرا سنا کر اپنے بیٹے کی واپسی کی درخواست کی اور ساتھ ہی آزادی کا فدیہ بھی پیش کیا۔

① سیرت ابن ھشام: ۱۸۷/۱ تا ۱۹۲ ...... یہ مشہور قول ہے جبکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر کے متعلق ایک قول ۳۵ برس کا ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے۔

② بعض ویب سائٹس کے مطابق ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی کوششوں سے یہ مکان کھدائی میں دریافت کر لیا گیا ہے۔ تاہم راقم اس خبر کی تصدیق نہیں کر سکا۔

③ الاصابة فی تمییز الصحابة لابن حجر العسقلانی: ۳۵۸/۸، ط العلمیة، ترجمة: ام ایمن رضی اللہ عنہا

④ اسد الغابة لابن الاثیر الجزری: ۳۵۰/۲، ترجمة: زید بن حارثة، ط دار الکتب العلمیة

حضور ﷺ نے فرمایا: ''زید کو بلا کر اس سے پوچھ لیں، اگر وہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو بغیر کسی فدیے کے آپ کے ساتھ جا سکتا ہے اور اگر نہ جانا چاہے تو میں اس کو زبردستی نہیں بھیجوں گا۔''

زید کو بلایا گیا تو انہوں نے اپنے والد کے ساتھ جانے سے معذرت کر دی اور کہا: ''میں حضور ﷺ کے سوا کسی اور کے ساتھ رہنا کیوں کر پسند کر سکتا ہوں۔''

والد نے حیران ہو کر کہا: ''بیٹا! آزادی کی جگہ غلام بن کر رہنا پسند ہے؟''

بولے: ''جی ہاں! میں نے حضور ﷺ میں جو خوبیاں دیکھی ہیں اُن کے مقابلے میں کسی چیز کو پسند نہیں کر سکتا۔''

حضور ﷺ زید کی یہ محبت دیکھ کر بہت متاثر ہوئے، اسی وقت مسجد الحرام میں جا کر اعلان کیا:

''میں نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔''

زید کے والد نے یہ منظر دیکھا تو مطمئن ہو کر لوٹ گئے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ پہلے بھی حضور ﷺ کے ساتھ رہتے تھے مگر اب تو اس گھرانے کا ایسا اٹوٹ حصہ بن گئے کہ لوگ انہیں ''زید بن محمد'' ہی کہنے لگے۔[1]

حضور ﷺ کی معاشرتی مصروفیات:

نکاح کے بعد سے چالیس سال کی عمر تک کا زمانہ حضور ﷺ کی زندگی میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اگرچہ سیرت کی کتب میں یہ باب سب سے مختصر ہے۔ ان پندرہ برسوں میں حضور ﷺ ایک مصروف کاروباری نوجوان اور معروف سماجی و معاشرتی شخصیت کی حیثیت سے سرگرم رہے۔ چونکہ آپ کا ذریعۂ معاش تجارت تھا اس لیے آپ کو لین دین اور دیگر معاملات میں دن بھر ہر قسم اور ہر علاقے کے لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا، کاروباری میدان میں آپ کی ساکھ اور معاشرتی سطح پر آپ کا مقام بہت بلند تھا، پورے مکہ میں آپ سے زیادہ شریف، عقل مند، محترم اور خوش اخلاق انسان کوئی نہیں تھا۔ لوگ آپ کی سچائی اور دیانت کے دل سے قائل تھے، اپنی قیمتی ترین امانتیں رکھوانے کے لیے ان کی نگاہ حضور ﷺ پر ہی پڑتی۔ وہ آپ کو صادق اور امین کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔

حضور اکرم ﷺ زبان کے پکے اور وعدے کے بے حد پابند تھے۔ مکہ کے ایک شہری عبداللہ بن ابی الحمساء سے حضور ﷺ کا کچھ لین دین ہوا، عبداللہ کے ذمے کچھ دینا باقی رہ گیا، وہ بولے: ''آپ کا بقایا یہیں لا کر دیتا ہوں۔''

یہ کہہ کر عبداللہ گھر چلے گئے، وہاں اپنا وعدہ بھول گئے، تیسرے دن یاد آیا تو فوراً اس جگہ آئے، دیکھا کہ آپ وہیں انتظار کر رہے ہیں، حضور ﷺ نے صرف اتنا فرمایا: ''جوان! تم نے مجھے تھکا دیا۔''[2]

حضور ﷺ تجارت میں شراکت بھی کرتے تھے۔ ابو سائب اور قیس بن سائب نامی دو شرفاء آپ کے شراکت دار

[1] اسد الغابة: ۳۵۰/۲

[2] اسد الغابة: ۲۱۸/۳، تر: عبداللہ بن ابی الحمساء

تھے۔ وہ آپ کی دیانت اور خوش معاملگی کا اعتراف کرتے تھے۔[1]

حضور ﷺ سامانِ تجارت لے کر مکّہ سے باہر بھی جایا کرتے تھے۔ مکّہ کے شمال مشرق میں طائف کے قریب ’’عکاظ‘‘ کا مشہور بازار لگا کرتا تھا جس میں تجارت کے علاوہ شاعری اور قصہ خوانی کی محفلیں بھی جمتیں اور قبائلی تنازعات کے فیصلے بھی ہوتے۔ حضور ﷺ تجارت کے لیے وہاں بھی تشریف لے جایا کرتے تھے۔[2] حضور ﷺ کے گہرے دوست ابوبکر بن ابی قُحافہ تھے جو مزاج، خیالات اور عادات میں بھی آپ سے بہت ہم آہنگ ہونے کے علاوہ ہم پیشہ بھی تھے۔ بت پرستی، شراب نوشی اور دوسری اخلاقی برائیوں سے وہ بھی پورا اجتناب کرتے تھے۔[3]

ان پندرہ برسوں میں حضور ﷺ کے معمولات کی زیادہ تفصیل نہیں ملتی مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آپ دن میں تجارت اور معاشرتی وخاندانی امور میں مصروف رہتے تھے اور تنہائی کے اوقات میں اللہ کی قدرت، دنیا کے آغاز وانجام اور اپنی قوم کی حالت پر غور فرماتے رہتے تھے۔

کعبہ کی از سرِ نو تعمیر:

نبی اکرم ﷺ کی عمر پینتیس برس پوری ہو چکی تھی[4] جب قریش نے کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ حضور اقدس ﷺ نے اپنے چچا عباس کے ساتھ تعمیری کام میں بھرپور حصہ لیا اور پہاڑوں سے پتھر ڈھوڈھو کر لاتے رہے۔[5]

تعمیر شروع ہونے کے بعد جب دیواروں کی چنائی حجرِ اسود کی بلندی تک پہنچی اور یہ مقدس پتھر نصب کرنے کا وقت آیا تو کام میں شریک تمام قبیلوں میں سخت جھگڑا ہونے لگا؛ کیوں کہ ہر قبیلہ اسے نصب کرنے کا اعزاز خود حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بنوعدی اور بنی عبدالدار کے غیظ وغضب کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے عرب کے جنگی معاہدوں کے دستور کے مطابق خون سے بھرے لگن میں اپنے اپنے ہاتھ ڈبوئے اور قسمیں کھائیں کہ اگر انہیں حجرِ اسود نصب کرنے کا موقع نہ دیا گیا تو وہ مل کر دوسروں پر ٹوٹ پڑیں گے اور لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔ اِدھر ان کے مخالفین کا غصہ بھی کم نہ تھا۔ قریب تھا کہ جنگ شروع ہو جاتی مگر بعض دور اندیش لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر اس تنازعے کا آخری حل یہ نکالا گیا کہ اب جو آدمی مسجد الحرام میں سب سے پہلے داخل ہوگا وہی اس مسئلے کو سلجھائے گا۔ تب لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو سب سے پہلے مسجد الحرام میں داخل ہوتے دیکھا اور پکار اُٹھے: ’’محمد الامین آ گئے، ہم ان کی بات پر راضی ہیں۔‘‘

حضور ﷺ نے اس قضیے کو یوں طے کیا کہ ایک چادر منگوا کر حجرِ اسود کو اس کے درمیان رکھا۔ پھر ہر قبیلے کے ایک ایک نمائندے کو چادر کا ایک ایک گوشہ پکڑایا۔ سب لوگ اس طرح حجرِ اسود کو اس کے مخصوص مقام تک لے گئے جہاں

---

① الاستیعاب لابن عبدالبر: ۱۲۸۸/۳ ② سبل الهدی والرشاد: ۱۸۶/۲ ③ السیرة الحلبیة: ۳۸۹/۱؛ تاریخ الخلفاء، ص ۲۹

④ طبقات ابن سعد کی دو روایات: قریش تبنی الکعبة قبل ان ینزل الوحی علیٰ رسول اللہ بخمس سنین. (۳۸۱/۳) اور "قریش لبنی الکعبة والنبی ﷺ ابن خمس وثلاثین سنة." (۱۶/۸) کو ملائیں تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ مسند احمد کی روایت: ’’ورفع الحجر الاسود یوم الاثنین.‘‘ (مسند احمد، ح: ۲۵۰۶) کا سیاق بتاتا ہے یہ ربیع الاوّل کا واقعہ ہے اور تاریخ بھی ۱۲ تھی جیسا کہ اس روایت کے باقی واقعات انہی تاریخوں میں آتے ہیں۔

⑤ صحیح البخاری، ح: ۳۸۲۹، کتاب المناقب، باب بنیان الکعبة

رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے اسے کعبہ کے کونے میں نصب کر دیا۔ اس طرح حضور ﷺ کی بے دار مغزی اور منصفانہ حکمت عملی سے ایک بڑی خون ریز جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ [1]

گھریلو ذمہ داریاں:

حضور ﷺ پر گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی کم نہیں تھا۔ آپ کی تین صاحبزادیاں: حضرت زینب، حضرت رُقیّہ اور حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہن اُس عمر کو پہنچ چکی تھیں جس میں رشتوں کی فکر کی جاتی ہے۔ عرب کے بگڑے ہوئے ماحول اور مکّہ کے آلودہ معاشرے میں یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ولادت حضور ﷺ کی شادی کے پانچویں سال اور حضرت رُقیّہ رضی اللہ عنہا کی آٹھویں سال ہوئی تھی۔ ان کے بعد حضرت اُمّ کلثوم تھیں اور پھر حضرت فاطمہ، جو سب سے کم سن تھیں جو حضور ﷺ کے نکاح کے دسویں سال پیدا ہوئی تھیں۔ [2] چار بیٹیوں کے باپ ہوتے ہوئے حضور ﷺ پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں ان کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو بیٹیوں والا ہو۔

اس دوران حضور ﷺ کی نرینہ اولاد بھی ہوئی تھی۔ دو لڑکے تھے: قاسم اور عبداللہ۔ حضرت قاسم کی نسبت سے حضور ﷺ کی کنیت "ابوالقاسم" ہوئی۔ حضرت عبداللہ "طیب" اور "طاہر" کے لقب سے مشہور تھے۔ [3]

اُمّ اَیمن کا زید بن حارثہ سے نکاح:

اِدھر حضرت اُمّ اَیمن رضی اللہ عنہا جنہیں حضور ﷺ ماں کا احترام اور مقام دیتے تھے، بیوہ ہوگئی تھیں۔ ان کی عمر اب پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ حضور ﷺ کو ان کے بے سہارا ہونے کا غم تھا اور یہ احساس بھی کہ انہیں خبر گیری کے لیے ایک فرد کی ضرورت ہے۔ وہ حبشیہ تھیں، عرب میں ان کا کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ اس عمر میں ان سے نکاح میں کسی کو رغبت بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ تاہم حضور ﷺ کے منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ ان سے نکاح پر راضی ہوگئے۔ اُمّ اَیمن رضی اللہ عنہا سے ان کا نکاح ہوگیا، اگرچہ زید رضی اللہ عنہ بالکل نوجوان تھے مگر ان کی اُمّ ایمن رضی اللہ عنہا سے خوب نبھی۔ حضرت اُمّ اَیمن رضی اللہ عنہا کے مرحوم شوہر کا بیٹا اَیمن بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ یہ گھرانہ حضور ﷺ کی کفالت میں اور خانوادۂ رسالت کا حصہ تھا۔ [4]

خدمتِ خلق، حضور ﷺ کا طرۂ امتیاز:

تجارتی، خاندانی اور معاشرتی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کا سب سے بڑا مشغلہ اور پسندیدہ کام مخلوقِ خدا کی خدمت تھا۔ آپ اللہ کی دی ہوئی دولت، عزت اور فکر و دانش کی نعمتوں کو اس کے بندوں کی خیر خواہی میں دل کھول کر خرچ کیا کرتے تھے۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا، بیواؤں کی مدد کرنا اور ضرورت مندوں سے ہر ممکن تعاون کرنا حضور ﷺ کی عادت تھی۔ مہمانوں کی خاطر مدارات میں حضور ﷺ کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ بنو ہاشم کے مستحق

[1] سیرت ابن ہشام: ۱/۱۹۰ تا ۱۹۹

[2] ولدتها وقريش تبني البيت وذالك قبل النبوة بخمس سنين. (طبقات ابن سعد: ۸/۱۹ تا ۳۸ صادر)

[3] طبقات ابن سعد: ۱/۱۳۳ ط صادر ..... بعض سیرت نگاروں کے نزدیک طیب اور طاہر الگ الگ دو لڑکے تھے، مگر یہ خلافِ تحقیق ہے۔

[4] اسد الغابۃ: ۸/۲۹۰، الاصابۃ: ۸/۳۵۸، ترجمہ: اُمّ ایمن رضی اللہ عنہا

گھرانوں سے حضور ﷺ خاص طور پر تعاون کرتے تھے۔ آپ کے چچا ابو طالب جنہوں نے آپ کی کفالت کی تھی، مالی لحاظ سے کمزور تھے۔ حضور ﷺ ان کے تینوں بیٹوں کا خاص خیال رکھتے، ان سے برادرانہ شفقت سے پیش آتے۔ ان میں سے حضرت عقیل حضور ﷺ سے دس سال، حضرت جعفر بیس سال اور حضرت علی، تیس سال چھوٹے تھے۔ پھر جب ایک بار قحط سالی ہوئی تو حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی پرورش ہی میں لے لیا اور یوں اب وہ آپ ﷺ کی گود میں کھیل کر بڑے ہو رہے تھے۔[1]

بنو ہاشم کا سورج:

گھریلو ذمہ داریوں اور تجارتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ اپنے خاندان بنو ہاشم کے ہر اہم معاملے میں شریک ہوتے تھے۔ بنو ہاشم کے ستون اس وقت حضور ﷺ کے چچا: ابو طالب، ابولہب، عباس اور حمزہ تھے۔

ابو طالب سن رسیدہ تھے اور آپ کے سرپرست بھی۔ ابولہب کی تیز مزاجی کے باوجود آپ کے اس سے اچھے تعلقات تھے۔ آپ ﷺ کی دو بیٹیوں: حضرت رُقَیَّہ اور حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہما کی نسبت ابولہب کے بیٹوں: عُتبہ اور عُتَیبہ سے طے تھی۔[2]

حضور ﷺ کے نامور چچا حضرت عباس آپ سے تین سال بڑے تھے اور آپ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ ایک دراز قد اور طاقتور انسان تھے۔ زمینداری ان کا پیشہ تھی۔ خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔ عبدالمُطَّلِب کے بعد کعبہ کی تعمیر و مرمت اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت انہی کے ذمے تھی۔[3]

حضور ﷺ سے ٹوٹ کر پیار کرنے والے چچا حمزہ آپ سے صرف دو سال بڑے تھے۔ انہوں نے بھی ابولہب کی باندی ثُوَیبہ کا دودھ پیا تھا، اس لیے وہ حضور ﷺ کے دودھ شریک بھائی بھی تھے۔ لوگوں سے حسنِ سلوک کرتے اور ضرورت مندوں کے کام آتے تھے۔ بلا کے تیر انداز اور بے مثال شمشیر زن تھے۔ سیر و شکار ان کا مشغلہ تھا۔[4]

حضور ﷺ کی پھوپھی صَفِیَّہ بھی بنو ہاشم کی خواتین میں ایک خاص ہستی تھیں۔ وہ حضور ﷺ کی ہم عمر ہی تھیں۔ جرأت اور شجاعت میں اپنی مثال آپ تھیں۔[5] بنو ہاشم کی اس کہکشاں میں حضور ﷺ کی حیثیت سورج کی سی تھی۔ اتنا تو سبھی جانتے تھے کہ آئندہ بنو ہاشم کی قیادت اور سیادت حضور ﷺ کا نصیب ہے۔ مگر یہ کسی کو اندازہ نہ تھا کہ اس دُرِّ یتیم کے نام دو جہانوں کی سیادت لکھ دی گئی ہے۔

☆☆☆

---

① سیرۃ ابن ہشام: ۱/۲۴۵، ۲۴۶؛ اسد الغابۃ: ۱/۵۴۱، ترجمہ: جعفر رضی اللہ عنہ؛ ۴/۶۱، ترجمہ: عقیل رضی اللہ عنہ

② الجوھرۃ فی نسب النبی ﷺ و اصحابہ العشرۃ للعلامۃ البری التلمسانی (م ۶۴۵ھ): ۲/۴۴، ط دار الرفاعی ریاض

③ الاستیعاب: ۲/۸۱۱، ط دار الجیل

④ طبقات ابن سعد: ۱/۹۵؛ ۳/۱۳، ط صادر؛ انساب الاشراف: ۴/۲۸۵، ط دار الفکر

⑤ الاصابۃ: ۸/۲۱۳، ط العلمیۃ

جب امانتِ نبوت سپرد ہوئی

عمر کے چالیسویں سال کو پہنچ کر حضور ﷺ کی سوچ اور فکر گہری ہوتی چلی گئی۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ تمام دنیا ہلاکت و بربادی کے راستے پر جارہی ہے اور اگر اس کی سمت درست کرنے کی کوئی مؤثر کوشش نہ کی گئی تو بنی نوع انسان کا انجام بہت ہی برا ہوگا۔ اس تشویش کے علاوہ آپ ﷺ ایک عجیب سی مبہم بے چینی محسوس کیا کرتے تھے۔ گزشتہ سات برس سے آپ کو گاہے گاہے فرشتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور غیبی انوارات کا مشاہدہ ہورہا تھا۔[1] اس وقت حضور ﷺ کو تصور تک نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آخری رسول کا منصب عطا کرنے والا ہے۔[2]

اس کیفیت نے آپ ﷺ کو تنہائی پسند بنادیا اور آپ مکہ کی گھاٹیوں اور بیابانوں میں وقت گزارنے لگے۔ اب حضور ﷺ کو اکثر سچے خواب دکھائی دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی وادیوں سے گزرتے ہوئے درختوں اور پتھروں سے آواز سنائی دیتی: ''السلام علیکم یارسول اللہ'' آپ پلٹ کر دیکھتے تو کوئی پکارنے والا نظر نہ آتا۔[3]

جنات کی سیرِ آسمانی پر پابندی:

اس سے پہلے کہ آپ پر وحی کا نزول شروع ہوتا، وحی کی حفاظت کے انتظامات مکمل کرلیے گئے۔ پہلے جنات اور شیاطین آسمان کے قریب جاکر فرشتوں کو ملنے والے احکام اور خبروں کی کچھ سن گن لے لیا کرتے تھے۔ یہ خبریں وہ آکر اپنے کاہنوں اور جادوگروں کو سناتے تھے اور وہ ایک سچ میں دس جھوٹ ملاکر لوگوں پر اپنی فرضی غیب دانی کی دھاک بٹھایا کرتے تھے۔ آخری کتابِ الٰہی کے نزول سے پہلے جنات کے آسمان کے قریب آنے اور سن گن لینے پر پہرے لگادیے گئے۔ اگر کوئی جن پہلے کی طرح اُدھر کا رخ کرتا تو شہابِ ثاقب اس کا تعاقب کرتے۔

اس صورتحال سے جنات کو بھی اندازہ ہوگیا کہ عن قریب کوئی بہت بڑا واقعہ ہونے والا ہے۔ ایک کاہن کا بیان ہے (جو بعد میں مشرف بہ اسلام ہوا) کہ میرے پاس ایک چڑیل آیا کرتی تھی۔ ایک دن وہ گھبرائی ہوئی نمودار ہوئی اور کہنے لگی: اَلَمْ تَرَ الْجِنَّ وَاِبْلَاسَهَا . وَيَاْسَهَا مِنْ بَعْدِ اِنْكَاسِهَا . وَلُحُوْقَهَا بِالْقِلَاصِ وَاَحْلَاسِهَا (کیا تو نے نہیں دیکھا جنات اور ان کی حیرانی کو، ان کی مایوسی اور افتادگی کو، ان کے اونٹنیوں کی پشت سے چمٹنے کو۔)[4]

گویا ان تکوینی تغیرات نے جنات کو بھی احساس دلادیا تھا کہ نبی آخر الزمان ﷺ کا ظہور قریب ہے۔ جس طرح بارانِ رحمت سے قبل ہوا تھم جاتی ہے، اسی طرح نزولِ وحی سے پہلے یوں لگتا تھا جیسے کائنات دم سادھے کھڑی ہو۔

① تفسیر ابن کثیر، سورۂ قصص، آیت: ۸۲ ② صحیح مسلم، ح: ۶۲۵۰، کتاب الفضائل

③ سیرۃ ابن ھشام: ۱/۲۳۴ ..... اس دور میں بعض پتھر حضور ﷺ کو سلام کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ ان کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ (صحیح مسلم، ح: ۶۰۷۸، کتاب الفضائل) ان علامات کو سیرت نگاروں کے ہاں ''ارہاصات'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

④ صحیح البخاری، ح: ۳۸۶۶، باب اسلام عمر رضی اللہ عنہ

پہلی وحی (سنہ ایک نبوی):

حضور ﷺ نے مکہ سے دور غارِ حرا کو اپنی گوشہ نشینی کے لیے پسند کر لیا۔ آپ کی عمر کا چالیسواں سال تھا جب ایک دن یکا یک ایک فرشتہ آپ ﷺ کے سامنے ظاہر ہوا۔[1]

یہ جبرئیل علیہ السلام تھے جو اللہ کے حکم سے آخری رسالت اور ساری دنیا کی راہ نمائی کا فریضہ حضور ﷺ کو سونپنے آئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی اپنا تعارف کرایا اور کہا: ''اے محمد! میں جبرئیل ہوں اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔''

---

[1] آغازِ نزولِ وحی کی توقیت کی روایات میں بھی اختلاف ہے اور اس باب کے تقویمی حسابات میں بھی اختلاف چلا آ رہا ہے۔ اس پر اتفاق ہے کہ نزولِ وحی پیر کے دن ہوا۔ صحیح حدیث میں ہے: سُئِل عن صوم الاثنین فقال: فیه وُلِدتُ وفیه أُنزِل عليّ. (صحیح مسلم، ح: ۲۸۰۷، کتاب الصوم، باب استحباب صوم ثلاثة ایام من کل شهر) اس پر بھی اتفاق ہے کہ بعثت عمر مبارک کے چالیس سال مکمل ہونے پر ہوئی۔ شمائلِ ترمذی کی ایک صحیح روایت ہے: ''بعثه الله تعالیٰ علیٰ رأس اربعین سنة.'' (دیگر متعدد محدثین نے بھی اسے روایت کیا ہے۔) یہ بھی طے ہے کہ بعثت کے تیرہ سال بعد ہجرت ہوئی۔

زیادہ اختلاف مہینے اور تاریخ میں ہے۔ مشہور قول ربیع الاول کا ہے، کیوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: نزل علی رسول اللہ ﷺ وهو ابن اربعین. (صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب مبعث النبی) چونکہ قولِ مشہور کے مطابق ولادت ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی ہے، اس لیے چالیس سال مکمل ہوتے ہی ۱۲ ربیع الاول کو بعثت کا دن طے ہو جاتا ہے۔ ۱۲ تاریخ پر ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول ایک وزنی دلیل ہے: ''ولد رسول اللہ ﷺ عام الفیل یوم الاثنین الثانی عشر من ربیع الاول، وفیه بعث، وفیه عرج به الی السماء، وفیه هاجر ومات.'' (البدایة والنهایة: ۳/۳۷۵، باسناد ابن ابی شیبة)

قاضی سلیمان منصور پوری کے مطابق بعثت کے سال ۱۲ ربیع الاوّل کو پیر نہیں پڑ سکتا، اس لیے انہوں نے بعثت کی تاریخ پیر ۹ ربیع الاوّل متعین کی ہے۔ ولادت اور وفات میں بھی اسی بناء پر انہوں نے ۹ ربیع الاوّل کو اختیار کیا ہے۔ (رحمۃ للعالمین، ۱/۴۹، ۷۵، ۲۴۲) کچھ دیگر اہلِ تقویم کے نزدیک پیر ۹ کو نہیں ۸ ربیع الاوّل کو پڑتا ہے اور وہی تاریخِ بعثت ہے۔ (تقویم عہدِ نبوی، علی محمد خان، ص ۸۰) ان دونوں حضرات نے بعثت کی عیسوی تاریخ ۹ فروری ۶۱۰ء قرار دی ہے۔

مگر ایک طبقے کے نزدیک بعثت ماہِ رمضان میں ہوئی تھی اور ولادت بھی رمضان میں ہوئی تھی۔ رمضان میں ولادت پر اس طبقے کے دلائل پیچھے ولادتِ شریفہ کے تحت حواشی میں گزر چکے ہیں۔ یہ حضرات صحیح بخاری کی اسی روایت کو دلیل بنا کر کہتے ہیں کہ قمری تقویم کے چالیس سال مکمل ہوتے ہی رمضان میں وحی کا نزول شروع ہو گیا۔ بعثت کے رمضان میں ہونے کے بارے میں ان کی دلیل یہ آیات ہیں: شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن. (سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۸۵) وما انزلنا علیٰ عبدنا یوم الفرقان یوم التقی الجمعان. (سورۃ الانفال، آیت: ۴۱) یوم التقی الجمعان سے مراد غزوہ بدر ہے جو ستره رمضان کو ہوا۔ وما انزلنا علیٰ عبدنا کے مطابق ''یوم الفرقان'' یوم نزولِ قرآن ہے، پس نزولِ قرآن کی تاریخ وہی ہے جو غزوہ بدر کی ہے، یعنی سترہ رمضان۔ (دلائل النبوۃ للبیهقی: ۲/۱۳۳) حافظ ابن کثیر نے رمضان میں بعثت کو قولِ مشہور قرار دیا ہے۔ (البدایة والنهایة: ۴/۱۹) یہی ابن اسحاق کے نزدیک راجح قول ہے۔ (سیرۃ ابن اسحاق: ۱/۱۳۰) واقدی نے امام باقرؒ سے ایک روایت میں بعثتِ محمدیہ سترہ رمضان کو ہونے کی تصریح ہے۔ (البدایة والنهایة: ۴/۱۶)

جہاں تک ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مذکورہ قول کا تعلق ہے، حافظ ابن کثیر نے اسے منقطع قرار دے کر اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مذکورہ روایات اور اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے علماء نے تقویمی حسابات کے ذریعے مزید امکانی صورتیں پیش کی ہیں جن میں سے مناسب ترین صورت کو چننا انتہائی دشوار ہے۔ بعض صورتوں کو لینے سے بعثت اور ہجرت کے درمیان تیرہ کی جگہ چودہ سال سے کچھ اوپر مدت بن جاتی ہے۔ فروری ۶۰۹ء والی صورت اختیار کرنے سے مدت تیرہ سال چھ ماہ بن جاتی ہے۔ جبکہ بالاتفاق یہ مدت تیرہ سال ہے۔ بعض صورتوں کو اختیار کرنے سے بخاری کے الفاظ ''ابن اربعین'' اور ترمذی کی روایت ''علیٰ رأس اربعین سنة'' سے مطابقت نہیں ہوتی۔ غرض کوئی بھی صورت ایسی نہیں ہے جو مذکورہ تمام شرائط کو من وعن پورا کر دے اور ہر قسم کے اشکالات کو ختم کر دے۔

راقم کے خیال میں اگر بعثت کے بارے میں ۱۹ مئی ۶۰۹ء کی رائے اختیار کی جائے تو نسبتاً کم اشکالات وارد ہوں گے (مئی ۶۰۹ء سے ماہ ہجرت ستمبر ۶۲۲ء کے درمیان ۱۳ سال چار ماہ بنتے ہیں۔ اسقاطِ کسور کے پیشِ نظر اتنا فرق نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔) اس رائے کو اختیار کرنا اس پر موقوف ہے کہ پہلے یہ مان لیا جائے کہ:

(۱) ولادتِ شریفہ مکی رمضان مطابق مدنی ربیع الاوّل مئی ۵۶۹ء میں ہوئی۔ (۲) چالیس سال کی عمر میں نبوت ملنے سے مراد مکی توقیت کے چالیس سال ہیں۔

اب دیکھئے تو ۱۹ مئی ۶۰۹ء کا دن مکی ماہِ رمضان کی ۹ تاریخ کو بروز پیر پڑتا ہے، اس لحاظ سے درج ذیل قسم کی روایات اس تاریخ پر منطبق ہو جاتی ہیں:

❶ جو پیر کے دن بعثت کی دلیل ہیں۔ ❷ جو رمضان میں بعثت کی مؤید ہیں۔ ❸ جن میں ''ابن اربعین'' یا ''علیٰ رأس اربعین سنة'' کا ذکر ہے۔ ❹ جن میں بعثت کے ۱۳ سال بعد ہجرت کا ذکر ہے۔ رہا ربیع الاوّل میں بعثت کی روایات کا مسئلہ تو علی محمد خان مرحوم کی تحقیق کے مطابق ۱۹ مئی ۶۰۹ء کا دن عربوں کے تیسرے کیلنڈر ''شمسی قمری ربیعی'' کے ۹ ربیع الاوّل کے عین مطابق ہے۔ اس طرح بحمد اللہ تمام اقوال اور روایات میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

پھر فرشتے نے آپ کے سامنے "سورۃ العلق" کی ابتدائی آیات تلاوت کیں:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ○

"پڑھیے اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے سب کچھ بنایا، جس نے انسان کو بنایا خون کے لوتھڑے سے، پڑھیے اور آپ کا پروردگار بڑا مہربان ہے، جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا، اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔"[①]

یہ پہلا آسمانی پیغام تھا جو نبی آخر الزماں ﷺ کے ذریعے آخری اُمت کو دیا جا رہا تھا، جو بتا رہا تھا کہ اس آخری رسول کی اُمت کے لیے پڑھنا لکھنا، رب کا ذکر کرنا، اس کی قوتِ تخلیق پر غور کرنا، اس کی رحمت پر یقین رکھنا علم کو اپنی صلاحیتوں کی اساس بنانا اور قلم کے ذریعے علم کو پروان چڑھانا دستورِ اساسی ہوگا۔

دنیا میں علم و قلم کا تصور:

یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا کی متمدن قوموں میں بھی قلم کی عظمت کا کوئی خاص تصور نہیں تھا۔ مشرق کو دیکھیے تو چین میں اس وقت تانگ خاندان کا بانی لی یوآن حکومت کر رہا تھا۔ اس کے بعد تائی شنگ آیا، جس نے ۶۲۷ء سے ۶۴۹ء تک حکومت کی۔ ہندوستان میں مہاراجا ہرش وردھن برسرِ اقتدار تھا جس کا دور ۶۰۶ء سے ۶۴۷ء تک ہے، مگر مشرقی تہذیب و تمدن کے ان دو سب سے بڑے مراکز میں بھی علم کا تصور بڑا پست تھا۔ سنگ تراشی، رقص و سرود اور مراقبہ و دم کشی کو قلم پر فوقیت حاصل تھی۔ افریقہ کے شمال اور مغرب میں اُجڈ بربر قبائل کا تسلط تھا جو بت پرستی کی لعنت میں گرفتار تھے۔ مغرب پر نظر ڈالیے تو اس زمانے میں برطانیہ اینگلوسیکسن قبائل کے بادشاہوں کے زیرِ نگین تھا جس کے فرمانروا کنگ ایڈرن نے ۶۰۱ء سے ۶۳۳ء تک حکومت کی مگر یہ دور برطانیہ میں تہذیب و تمدن کی انتہائی پس ماندگی اور علم سے یکسر محرومی کا تھا۔ اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ میں نیم جنگلی قبائل کا راج تھا جو آئے دن برطانیہ پر تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے۔ فرانس میں شاہ ڈیگورٹ اوّل (۶۲۸ء تا ۶۳۹ء) پوری کوشش کے باوجود اپنی زوال پذیر مملکت کی بنیادوں کو مضبوط نہیں کر سکا تھا۔ اٹلی پر گاتھ (Goth) خاندان کا حکمران سا ئبرٹ مسلط تھا جس کے دور میں یہودیوں کو خاص کر تختۂ مشق بنایا جا رہا تھا۔ ان تمام خطوں میں اوپر سے نیچے تک جہالت کا دور دورہ تھا۔ یورپ کے اکثر خطوں میں نارمن، سوئیڈش، سلافی اور کریشنس جیسے جاہل اور اُجڈ قبائل کی اجارہ داری تھی۔[②]

غرض وہ یورپ جو صدیوں بعد علوم اور تحقیق کی امامت کا دعوے دار بنا اس وقت علم، تحریر اور قلم سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ ایسے میں عرب جیسے تاریک گوشے میں نور کی پہلی کرن کا ﴿اِقْرَاْ﴾، ﴿عَلَّمَ﴾ اور ﴿بِالْقَلَمِ﴾ جیسے تصورات لے کر ابھرنا تاریخِ عالم کا ایک عجوبہ ہی تو تھا۔ بلاشبہ یہ ایک ایسے انقلاب کی تمہید تھا جو انسانی معاشرے

---

① صحیح البخاری، ح: ۳، باب کیف کان بدء الوحی ؛ سیرۃ ابن اسحاق: ۱/ ۱۲۱، ط دار الفکر

② رحمۃ للعالمین: ۱/ ۷۵ ؛ مجلۃ السیرۃ، رمضان ۱۴۲۴ھ، ص ۹۱ تا ۹۳. مقالہ پروفیسر نثار احمد

کی اصلاح کے لیے پڑھنے، تعلیم دینے اور قلم کی طاقت سے کام لینے کا پوری طرح قائل تھا۔

ذمہ داری کا بارِ گراں:

جب فرشتے سے یہ پیغام سن کر حضور اکرم ﷺ گھر پہنچے تو خوف و ہیبت اور ایک بے حد گراں ذمہ داری کے احساس سے حضور ﷺ کا جسم کانپ رہا تھا۔ آپ کو لگتا تھا کہ کہیں اس کام کی فکر اور بوجھ سے جان ہی نہ نکل جائے۔

آپ ﷺ نے گھر پہنچتے ہی اپنی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے کہا:

''مجھے کمبل اوڑھا دو، مجھے کمبل اوڑھا دو!! مجھے اپنی جان جاتی محسوس ہو رہی ہے۔''[1]

اہلیہ کے دریافت کرنے پر حضور ﷺ نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایک تجربہ کار اور دانش مند خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر نامدار کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے آپ کو تسلی دی اور کہا: ''اللہ آپ کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ آپ رشتہ داروں کا خیال رکھتے ہیں، ہمیشہ سچ بولتے ہیں، امانت دار ہیں، دوسروں کے کام آتے ہیں، مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے ہیں، سچائی کے راستے میں آنے والی مصیبتوں میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔''

پھر وہ حضور ﷺ کو اپنے چچازاد بھائی وَرَقَہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو گزشتہ آسمانی کتب کا مطالعہ کرتے رہتے تھے تاکہ ان سے اس سلسلے میں مشورہ اور راہ نمائی لی جائے۔

انہوں نے یہ واقعہ سنتے ہی کہا: ''اللہ کی قسم! تم اس اُمت کے نبی ہو۔ یہ وہی فرشتہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تھا۔ دیکھنا ایک وقت آئے گا کہ تمہاری قوم تمہیں جھٹلا کر تنگ کر کے اس شہر سے نکال دے گی۔''

حضور ﷺ یہ سن کر بڑے حیران ہوئے کہ قریش جو مجھے صادق وامین کہتے ہیں، میرے ساتھ یہ سلوک بھی کر سکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے تعجب سے پوچھا: ''یہ لوگ مجھے نکال لیں گے؟'' ورقہ نے کہا: ''ہاں جب بھی کوئی نبی ایسا پیغام لے کر آیا ہے، اس کی قوم نے اس سے دشمنی کی، اگر میری زندگی میں وہ وقت آیا تو میں آپ کی ضرور مدد کروں گا۔''[2]

وحی میں وقفہ اور رسول اللہ ﷺ کا اضطراب:

اس واقعے کے بعد ایک مدت تک فرشتہ دوبارہ وحی لے کر نہیں آیا۔ اس دوران حضور ﷺ پریشانی اور اضطراب کے عالم میں مکّہ کی وادیوں اور پہاڑیوں میں گھومتے رہتے، کسی پل چین نہ آتا۔ خدا آپ سے کیا چاہتا ہے؟ یہ عظیم ذمہ داری کس طرح نبھانی ہے؟ کچھ معلوم نہ تھا۔ اس حیرت وتشویش کی حالت میں کبھی کبھی ایک غیبی آواز آتی: ''بے شک آپ سچے رسول ہیں۔'' تب آپ کو کچھ تسلی ملتی۔ آخر کار یہ آیات نازل ہوئیں:

يَاۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُo قُمْ فَاَنْذِرْ o وَرَبَّكَ فَكَبِّرْo

''اے چادر اوڑھنے والے! اٹھو اور خبردار کرو اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو۔''[3]

---

[1] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعثت موسم گرما میں ہوئی تھی ورنہ سرما میں تو عادتاً گرم کپڑے ہی زیر استعمال ہوتے ہیں۔ یہ نکتہ مئی میں بعثت کی رائے کا مؤید ہے۔

[2] صحيح البخاری، ح: ۳، باب كيف كان بدء الوحی [3] سورة المدثر، آيت: ۱ تا ۳

خفیہ دعوت (سنہ ایک تا ۳ نبوی):

حضور ﷺ کو دین کی دعوت دینے کا واضح حکم تھا۔ اب آپ کو کام کا لائحہ عمل مل گیا تھا۔ حضور ﷺ نے بلا تاخیر دعوت کا عظیم فریضہ انجام دینے کا آغاز کر دیا اور ابتداء اپنے گھر اور اپنی اہلیہ سے کی۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے سب سے پہلے اس سچے دین کو قبول کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی جو اس وقت دس سال کے تھے، فوراً اسلام لے آئے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی بلا تردد مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

یہ تینوں تو گھر کے افراد تھے۔ باہر ملنے جلنے والوں میں حضور ﷺ کے دوست سیدنا ابوبکر بن ابو قحافہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہا۔ بالغ مردوں میں وہ پہلے مسلمان تھے۔ وہ خود بھی ایک معزز حیثیت کے مالک تھے، اس لیے انہوں نے اپنے واقف کاروں کو اسلام کی دعوت دینا شروع کر دی۔[1]

دعوتِ اسلام کیا تھی؟

اسلام کی یہ ابتدائی دعوت صرف ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کے اقرار پر مشتمل تھی۔ توحید و رسالت وہ بنیادی پیغام تھا جس سے اس عظیم دعوت کی ابتدا ہوئی۔ لا الٰہ الا اللہ کا مطلب تھا: '' کائنات کی تمام چیزوں کا خالق اللہ ہے، تمام اُمور کا مالک اللہ ہے، کامیابی اور ناکامی، بیماری اور شفاء، زندگی اور موت ہر چیز اس کے قبضے میں ہے۔ سب کچھ اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس کے حکم اور اجازت کے بغیر مخلوق کچھ نہیں کر سکتی۔ بتوں اور ان سے منسوب دیوی، دیوتاؤں کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ سب کچھ کرنے والی بااختیار ذات صرف اللہ کی ہے، اس لیے عبادت بھی اسی کی ہونی چاہیے۔''

''محمد رسول اللہ'' کا مطلب تھا: محمد اللہ کے آخری رسول ہیں، ان کی بتائی ہوئی تمام باتوں پر اعتماد کرنا ضروری ہے۔ انہی کی پیروی میں دنیا و آخرت کی کامیابی ہے اور ان کی تعلیمات کی مخالفت میں دونوں جہانوں کا خسارہ ہے۔''

چونکہ مکہ کے مشرکانہ ماحول میں یہ ایک نامانوس آواز تھی اور قریش کے سرداروں کی طرف سے شدید مزاحمت کا اندیشہ تھا، اس لیے ابتدا میں دعوت کا کام خفیہ طور پر کیا گیا۔ حق کی متلاشی روحوں نے یہ پیغام سنتے ہی محسوس کیا جیسے انہیں نجات کا راستہ نظر آ گیا ہو، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت سے عثمان بن عفان، زبیر بن العوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہم جیسے غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل افراد ایمان لائے۔[2] دعوت میں کسی قبیلے یا خاندان کی تخصیص نہیں تھی بلکہ ہر اس شخص کو دعوت دی جا رہی تھی جس میں حق کو قبول کرنے کے آثار نظر آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں ابوعبیدہ بن جرّاح، ارقم بن ابی الارقم، عبیدۃ بن الحارث، عثمان بن مظعون اور سعید بن زید رضی اللہ عنہم جیسے قریشی جوان اسلام لائے وہاں اس خفیہ پیغام کی آواز مکہ کے کمزور اور مفلس لوگوں اور غلاموں تک بھی جا پہنچی۔[3]

---

① سیرت ابن ہشام: ۱/ ۲۴۰ تا ۲۴۹
② سیرت ابن ہشام: ۱/ ۲۵۰ تا ۲۵۲
③ سیرت ابن ہشام: ۱/ ۲۵۲ تا ۲۵۴

اُمیّہ بن خَلَف کے حبشی غلام بلال بن رَباح رضی اللہ عنہ نے کلمہ پڑھ لیا۔ خَبّاب بن الاَرَت رضی اللہ عنہ جو ایک مال دار عورت کے غلام تھے اور لوہار کا کام کرتے تھے، اسلام لے آئے۔ صہیب رومی رضی اللہ عنہ جو غیر ملکی نوجوان تھے، حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ یاسر کا گھرانہ جو انتہائی تنگ دست تھا، شروع میں ہی مسلمان ہو گیا، اس میں حضرت یاسر، ان کی اہلیہ سُمَیّہ اور ان کے بیٹے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم شامل تھے۔[1] عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ لڑکے تھے اور عُقبہ بن ابی مُعَیط کی بکریاں چراتے تھے، ایک بار جنگل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آمنا سامنا ہو گیا اور دعوتِ توحید سنتے ہی کلمہ پڑھ لیا۔[2]

قرآنِ مجید کا نزول بھی اب مسلسل ہونے لگا۔ دعوتِ اسلام کے انہی ابتدائی دنوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز سکھائی گئی۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نمودار ہوئے۔ انہوں نے وضو کر کے اور نماز پڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ طہارت اور رب کی عبادت کا شرعی طریقہ کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر مسلمانوں کو اس طرح وضو اور نماز کی تعلیم دی۔[3]

دوسری طرف قریش کے سردار: ابوجہل، نَضر بن الحارث، عاص بن وائل، ولید بن مُغیرہ اور عُقبہ بن ابی مُعَیط ایک مدت تک اس خفیہ دعوت سے بالکل لاعلم رہے، حتیٰ کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سگے چچا ابولہب کو بھی کچھ پتا نہ لگ سکا۔

دعوتِ اسلام میں راز داری اور احتیاط:

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ متشدد اور متعصب لوگ چاہے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، انہیں دعوت کی سن گن بھی نہ ملنے پائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرف بہ اسلام ہونے والے تمام لوگ اس احتیاط کو پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے، چونکہ ابولہب چچا ہونے کے باوجود متعصب اور متشدد مزاج مشرک تھا، اس لیے اسے بھی لاعلم رکھا گیا۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تدبر، دانش اور منصوبہ بندی کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بنو ہاشم کے بڑوں میں سے صرف حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب، اس دعوت سے آگاہ تھے مگر انہیں بھی یہ علم یوں ہوا تھا کہ انہوں نے اتفاقیہ طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک گھاٹی میں چھپ کر نماز ادا کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایمان نہ لانے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حامی، راز دار اور سرپرست تھے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے پر کوئی اعتراض نہ کیا[4] بلکہ اپنے دوسرے بیٹے جعفر کو بھی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دس سال بڑے تھے،[5] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ یوں جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ''السابقون الاوّلون'' (ابتداء میں اسلام لانے والوں) میں شمار ہوئے۔[6]

---

① اسد الغابة، تراجم: بلال رضی اللہ عنہ، خباب رضی اللہ عنہ، یاسر رضی اللہ عنہ

② مسند احمد، ح: ۳۵۹۸ ؛ المعجم الصغیر للطبرانی: ۱/۳۱۰، ط دار عمار ؛ الاصابة، ترجمة: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

③ مسند احمد، ح: ۱۷۴۸۰، ط الرسالة ؛ صحیح البخاری، ح: ۵۲۱، کتاب مواقیت الصلوٰة

④ مسند احمد، ح: ۷۷۲، ط الرسالة

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۱/۲۰۶، ط الرسالة ⑥ تاریخ دمشق: ۵۴/۱۶۵

حضرت عباس کو بھی اس دعوت کا علم ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس دعوت پر لبیک تو نہ کہا مگر مخالفت بھی نہ کی بلکہ جہاں تک ممکن ہوا، وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کی پشت پناہی کرتے رہے۔ [1]

آہستہ آہستہ قریش کے کئی سرداروں کو توحید کے اس پیغام کا پتا چل گیا جو ان کے بتوں کی مخالفت پر مشتمل تھا۔ [2] مگر رسول اللہ ﷺ کی دعوت یوں چپکے چپکے جاری تھی کہ کوئی اشتعال کا موقع پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ مسلم اور مشرک کہیں بھی آمنے سامنے تن کر کھڑے نہ ہوتے تھے۔ سردارانِ قریش کے خاموش رہنے کا ایک سبب بنو ہاشم کا احترام بھی تھا۔ اس کے علاوہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے کے باوجود وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ پیغام چند کمزور لوگوں تک محدود رہے گا اور پھر خود بخود مٹ جائے گا۔ غالباً انہوں نے اس دعوت کو زمانۂ جاہلیت کے اُمیہ بن ابی صلت اور زید بن عَمرو بن نُفیل جیسے مشاہیر کی مذہبی سوچ پر محمول کیا تھا جو الٰہیات پر گفتگو کیا کرتے تھے اور ایک معبود کے قائل تھے۔ مگر اسلام کی دعوت ان سابقہ مصلحین کی خیال آرائیوں کی بہ نسبت بے پناہ طاقت رکھتی تھی۔

ابوذر غفاری مشرف بہ اسلام ہوئے:

مکہ کعبۃ اللہ کی وجہ سے مرجعِ خلائق تھا جہاں بیرونی زائرین کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ان مسافروں کو بھی حسبِ موقع دعوت دینے کا کام شروع کر دیا گیا۔ ان کے ذریعے اسلام کی خبر بہت جلد دور دراز کے علاقوں تک پہنچ گئی اور حق کی تلاش میں سرگرداں اِکا دُکا لوگ مکہ آ کر رسول اللہ ﷺ سے ملنے لگے۔ سردارانِ مکہ پہلی بار چونکے اور حضور ﷺ سے ملنے جلنے والوں پر نظر رکھنے لگے۔ حضور ﷺ بھی نئے لوگوں سے ملنے میں بہت احتیاط کرنے لگے۔

انہی دنوں ڈاکوؤں کے قبیلے غِفار کے ایک نوجوان ابوذرؓ غفاری نے جو بت پرستی سے بے زار تھے، اپنے بھائی سے ایک نئے نبی اور نئے دین کی خبر سنی۔ وہ سیدھا مکہ پہنچے۔ انہیں معلوم تھا کہ نبوت کا دعویٰ کرنے والے جوان سے ملاقات کرنا مصیبت مول لینے کے مترادف ہے، لہٰذا وہ مسجد الحرام میں ٹھہر کر منتظر رہے کہ کسی دن رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہو جائے۔ آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا حال احوال پوچھا اور انہیں حضور ﷺ سے ملایا۔

آپ ﷺ نے پوچھا: ''کہاں کے ہو؟''

بولے: ''غِفار کا۔''

رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر حیرت و مسرت سے اپنی پیشانی تھام لی۔

ابوذر غفاری اسلام لے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اسلام کو خفیہ رکھنے کی تاکید کی مگر واپس جانے سے پہلے انہوں نے مسجد الحرام کا رُخ کیا اور اہلِ مکہ کے بھرے میں مجمع میں کھل کر کلمۂ توحید بلند کیا۔

---

[1] حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا نومسلم حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو حرم میں قریش کے ہاتھوں مرنے سے بچانا صحیح حدیث میں مذکور ہے۔ امام مسلم نے یہ پورا واقعہ بڑی تفصیل سے نقل کیا ہے۔ (صحیح مسلم، ح: ٦٥١٣، ٦٥١٦) یہ اس کا ثبوت ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اسلام کی خفیہ دعوت سے آگاہ اور اسلام قبول کرنے والوں کے مددگار تھے۔

[2] سیرۃ ابن ہشام: ٢٦٢/١ ، دلائل النبوۃ: ١٧٥/٢

یہ حق کا پہلا والہانہ نعرہ تھا جسے قریش بالکل برداشت نہ کر سکے اور اس درویشِ بے نوا پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت عباس یہ دیکھ کر تیزی سے لپکے اور یہ کہہ کر لوگوں کو پیچھے ہٹایا:

''بدبختو! یہ شخص (ڈاکوؤں کے قبیلے) غِفار کا ہے۔ تمہارے شام کے قافلے انہی کے علاقے سے گزرتے ہیں۔''

لوگ یہ سوچ کر ہٹ گئے کہ ان کی تجارت ڈاکوؤں کی انتقامی کارروائیوں کی وجہ سے خطرے میں نہ پڑ جائے۔

اگلے دن اس مجاہد نے پھر اسی طرح مسجد الحرام میں کلمۂ توحید بلند کیا، مار کھائی اور حضرت عباس نے انہیں بچایا۔

ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنے قبیلے میں واپس جا کر پہلے اپنی والدہ اور بھائی کو دعوت دے کر مشرف بہ اسلام کیا۔ اس کے بعد پورے قبیلے کو اسلام کی دعوت دی اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکوؤں کا یہ پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ [1]

اسی طرح بنو بُجَیلہ کے عَمرو بن عَبَسہ بھی اپنے علاقے سے نکلے، عُکاظ کے میلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور اسلام قبول کر کے لوٹے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہدایت کی کہ جب ہمارے غالب آنے کی خبر سننا تب دوبارہ آنا۔ [2]

تین سال تک دعوت کا خفیہ سلسلہ جاری رہا۔ حضرت ارقم بن ابی الارقم رضی اللہ عنہ کا مکان جو صفا پہاڑی کے دامن میں واقع تھا، اس عظیم جدوجہد کا پہلا مرکز تھا۔ [3]

☆☆☆

---

① صحیح مسلم، ح: ۲۵۱۲،۲۵۱۳، کتاب فضائل الصحابۃ، باب فضائل ابی ذر غفاری رضی اللہ عنہ، ط دار الجیل؛ الاصابۃ، تر: ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

② الاصابۃ، تر: عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ؛ الکامل فی التاریخ: ۱/۶۵۷؛ سیر اعلام النبلاء: ۲/۴۵۶،۴۵۷

③ اسد الغابۃ، تر: ارقم بن ابی الارقم رضی اللہ عنہ

اعلانِ توحید اور اہلِ ایمان کی آزمائشیں

تین سال بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو حکم دیا گیا کہ اب اسلام کی دعوت اعلانیہ طور پر کی جائے۔ اس مقصد کے لیے پہلے مرحلے میں آپ ﷺ کو اللہ کی طرف سے حکم دیا گیا: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ یعنی اپنے قریبی رشتہ داروں کو (شرک کے انجام سے) ڈرایئے (اور انہیں توحید کا پیغام سنایئے)[1]

اقارب میں سب سے پہلے گھر کے لوگ تھے، رسول اللہ ﷺ نے سب کو دعوت دی، ایک ایک کو مخاطب کیا اور سمجھایا، حضور ﷺ نے فرمایا: ''اے میری پھوپھی صَفِیّہ! اے عبدالمُطّلِب کی اولاد! اپنی جانوں کو جہنم سے بچانے کی فکر کرو؛ کیوں کہ کل اللہ کے ہاں میں تمہارے معاملے میں کچھ کام نہیں آسکوں گا۔''[2]

یہ کام خاص لوگوں اور دوستوں کو دعوتِ اسلام دینے سے کہیں زیادہ مشکل تھا، اس لیے حضور ﷺ نے بہت گھبراتے ہوئے اپنے خاندان بنوہاشم کے تمام افراد کو مدعو کیا۔ ان میں آپ کے چچا ابوطالب، عباس، حمزہ اور ابولہب سمیت چالیس، پینتالیس آدمی جمع ہوگئے، حضور ﷺ نے تھوڑے سے گوشت، دودھ اور روٹی سے اُن کی ضیافت کی، معجزانہ طور پر سب کھا پی کر سیر ہوگئے، تب حضور ﷺ نے اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا:

> ''آدمی اپنے گھر والوں سے غلط بیانی نہیں کرتا۔ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں سب کے لیے اللہ کا رسول ہوں اور آپ لوگوں کے لیے بطورِ خاص۔ اے اولادِ عبدالمُطّلِب! بلا شبہ کوئی شخص اپنی قوم کے پاس اس سے بہتر بات لے کر نہیں آیا جو میں آپ کے پاس لایا ہوں۔ میں دنیا و آخرت کی کامیابی کا پیغام لایا ہوں۔ اللہ کی قسم! جس طرح آپ سوتے ہیں، اسی طرح ایک دن ضرور مریں گے اور جس طرح آپ بیدار ہوتے ہیں، اسی طرح ایک دن حساب وکتاب کے لیے زندہ کیے جائیں گے اور وہاں اپنے اعمال کا بدلہ ضرور پائیں گے۔ بے شک جنت کا ٹھکانہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے اور دوزخ میں رہنا بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہوگا۔''

یہ سن کر ابوطالب نے حوصلہ افزائی کے کلمات کہے مگر ضدی اور متکبر ابولہب نے بہت ناراضگی ظاہر کی اور اس پیغام کی بڑی شدت سے مخالفت کی۔[3]

---

[1] سورة الشعراء: آیت ۲۱۴

[2] البداية والنهاية: ۹۷/۴، ۹۸، دار هجر [3] البداية والنهاية: ۱۰۱/۴، دار هجر

اعلانیہ تبلیغ (۴ نبوی):

کچھ دنوں بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو کھلم کھلا تبلیغ کا حکم دیا گیا، وحی نازل ہوئی:

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ۝﴾

''آپ کو جس بات کا حکم کیا گیا ہے، وہ صاف صاف سنا دیں اور مشرکین کی ذرا بھی پرواہ نہ کریں۔''①

تب نبی اکرم ﷺ کوہِ صفا کی چوٹی پر چڑھے اور آواز لگائی: "يَاصَبَاحَاهُ!" عرب میں یہ نعرہ اُس وقت لگایا جاتا تھا جب دشمن کے حملے کا خطرہ سر پر آ جاتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے قریش کا پورا قبیلہ وہاں جمع ہو گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

''اے بنی عبدالمُطّلِب!، اے بنی فِہر!، اے بنی کعب! اگر میں تمہیں خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک فوج تم پر حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑی ہے تو کیا تم میری بات پر یقین کر لو گے؟''

لوگوں کو حضور ﷺ کی سچائی پر اتنا یقین تھا کہ سب نے بے ساختہ کہا: ''ہاں! ہم یقین کریں گے۔''

تب آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمہیں ایک سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمہارے بالکل سامنے ہے۔''

یہ سن کر قریش سناٹے میں آ گئے۔ ان میں سے ابولہب نے مشتعل ہو کر کہا:

"تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ، اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟"

''تیرے لیے ہلاکت ہو، کیا تو نے اس لیے ہمیں بلایا تھا۔'' (نعوذ باللہ)

اس کے بعد سب غضب ناک نگاہوں کے ساتھ واپس ہو لیے۔②

ابولہب کی گستاخی کا جواب۔ سورۂ لہب کا نزول:

ابولہب کی اس گستاخی کے جواب میں سورۂ لہب نازل ہوئی اور قرآنِ مجید نے اس کے جملے "تَبًّا لَكَ" کا جواب نہایت فصیح و بلیغ انداز میں یوں دیا:

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ۝ (ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ ہلاک ہو جائے۔)

اس معجزانہ اسلوب پر مبنی جواب نے ابولہب کو پورے مکّہ میں رسوا کر دیا۔ اس نے غصے میں آ کر اپنے بیٹوں: عُتبہ اور عُتَیبہ کو حکم دیا کہ وہ حضور ﷺ کی بیٹیوں: رُقَیّہ اور اُمِّ کلثوم کو طلاق دے دیں۔ یہ دونوں صاحبزادیاں ان سے بیاہی ہوئی تھیں، مگر ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ ابولہب کے لڑکوں نے باپ کے حکم پر حضور اکرم ﷺ کی بیٹیوں کو طلاق دے دی۔③

---

① سورة الحجر، آیت: ۹۴

روایات میں اس واقعہ کی کوئی توقیت نہیں، فقط اتنا معلوم ہوتا ہے کہ بعثت کو تین سال پورے ہو چکے تھے۔ جن حضرات کے نزدیک بعثت ربیع الاوّل میں ہوئی تھی ان کے لحاظ سے یہ واقعہ ٹھیک تین سال بعد ربیع الاوّل کا اور جن کے نزدیک رمضان میں ہوئی تھی، ان کے نزدیک یہ واقعہ عین رمضان کا ہونا چاہیے۔ چونکہ حافظ ابن کثیر نے رمضان میں بعثت کو راجح کہا ہے (اور ہم نے اسی کو اختیار کیا ہے) اس لیے اس قول کے مطابق یہ واقعہ مکی رمضان ۴ نبوی ہے۔

② صحیح البخاری، کتاب التفسیر، تفسیر آیت: تبت یدا ابی لهب

③ اسد الغابة، ترجمہ: رُقیّہ، اُم کُلثوم رضی اللہ عنہما

ابولہب اور اس کی بیوی کی ایذاءرسانی:

اس کے بعد سے ابولہب اور اس کی بیوی اُمِّ جمیل نبی اکرم ﷺ کو ہر طرح کی تکلیفیں دینے پر تل گئے۔ ابولہب کا گھر حضور ﷺ کے گھر کے قریب تھا، اس لیے آپ ہر وقت اس کی شرانگیزی کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ اُمِّ جمیل رات کو آپ ﷺ کے راستے پر کانٹے بکھیر دیا کرتی تھی۔ ابولہب اپنے گھر کا سارا کچرا ڈال دیتا۔ حضور ﷺ کے گھر کے دوسری جانب آپ کا دوسرا دشمن عُقبہ ابن ابی مُعَیط رہتا تھا۔ اس کا بھی معمول تھا کہ حضور ﷺ کو تکلیف دینے کے لیے اپنے گھر کی غلاظت آپ کے دروازے پر پھینک جاتا۔[1] حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے:

''میں دو بدترین پڑوسیوں کے درمیان رہتا تھا: ابولہب اور عُقبہ بن ابی مُعَیط۔''[2]

ابولہب ہر وقت حضور ﷺ کی تاک میں رہتا کہ آپ تبلیغ کے لیے کہاں کا رخ کر رہے ہیں۔ آپ کہیں قریب جاتے یا دور، یہ پیچھے پیچھے پہنچ جاتا اور آپ ﷺ پر آوازیں کستا۔[3]

ابوطالب پر قریش کا دباؤ اور حضور ﷺ کا جواب:

قریش کے دوسرے سردار بھی اب کھلم کھلا مخالفت پر اتر آئے تھے اور اس دعوتِ توحید کو روکنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرنے لگے تھے۔ یہ لوگ ایک وفد بنا کر ابوطالب کے پاس آئے اور بولے: ''ابوطالب! آپ اپنے بھتیجے کو منع کریں۔ ہم اپنے آباؤ اجداد کی مذمت اور اپنے معبودوں کی عیب جوئی مزید برداشت نہیں کر سکتے۔ آپ ان کو روکیں ورنہ ہم آپ سے اور ان سے نمٹ لیں گے۔''

ابوطالب گھبرا گئے اور حضور ﷺ کو علیحدگی میں بلوا کر قریش کے مطالبے کا ذکر کیا اور کہا:

''میری اور اپنی جان کا خیال کرو، مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ میں اٹھا نہ سکوں۔''

حضور ﷺ سمجھ گئے کہ چچا پر سخت دباؤ ہے اور وہ آپ کی مزید حمایت نہیں کر سکیں گے، مگر آپ ﷺ اس عظیم فریضے کو کیسے چھوڑ سکتے تھے، جس پر اس سسکتی ہوئی دنیا کی نجات کا دارومدار تھا اور جس سے آپ کو اپنی جان سے بڑھ کر جذباتی لگاؤ تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''چچا جان! اللہ کی قسم! اگر وہ میرے دائیں ہاتھ پر جلتا سورج اور بائیں پر چاند لا کر رکھ دیں تاکہ میں اس کام کو چھوڑ دوں، تب بھی میں رکنے والا نہیں، یہاں تک کہ اللہ اس دین کو غالب کر دے یا میں اس جدوجہد میں جان دے دوں۔'' اتنا کہہ کر نبی اکرم ﷺ کے آنسو بہہ نکلے اور آپ روتے ہوئے باہر چل دیے۔

ابوطالب نے یہ دیکھا تو وہ بھی تڑپ اٹھے، آپ کو واپس بلایا اور بولے:

''بھتیجے! جو تمہارا دل چاہے کہو، جیسے چاہو تبلیغ کرو۔ میں تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔''[4]

---

① تفسیر ابن کثیر، سورۃ اللھب ؛ اخبار مکۃ للفاکھی: ۳/۳۸۵، ط دار خضر
② السیرۃ الحلبیۃ: ۱/۴۴۷، العلمیۃ
③ البدایۃ والنھایۃ: ۴/۱۰۲، دار ھجر
④ سیرۃ ابن ھشام: ۱/۲۶۶ ؛ البدایۃ والنھایۃ: ۴/۱۰۲، دار ھجر

صحابہ کرام پر جبر وستم:

قریش کے سرداروں نے جب یہ دیکھا کہ حضورِ اقدس ﷺ تبلیغ سے رکتے ہیں، نہ ابو طالب ان کی سرپرستی چھوڑتے ہیں تو مزید طیش میں آ گئے۔ حضور ﷺ کی بنو ہاشم میں ذاتی وجاہت اور پھر ابو طالب جیسے ہر دل عزیز اور قابلِ احترام بزرگ کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، اس لیے نبی ﷺ پر ہاتھ اُٹھانا آسان نہ تھا مگر عام مسلمان جن میں زیادہ تر غریب لوگ تھے، اب ان کے طیش اور انتقام کا نشانہ بننے لگے۔ قریش کا ہر سردار اپنے اپنے قبیلے کے ان لوگوں کو تختۂ مشق بنانے لگا جو اسلام لے آئے تھے۔ جو لوگ غریب تھے اور بے یار و مددگار بھی انہوں نے سب سے زیادہ دکھ سہے۔ خبّاب بن الارت رضی اللہ عنہ کو انگاروں پر لٹایا گیا، جس سے اُن کی کمر بالکل جھلس گئی۔ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ اُمیّہ بن خلف کے غلام تھے، وہ انہیں صحرا کی تپتی دھوپ میں لٹا کر سینے پر بھاری پتھر رکھ دیتا۔ کہتا کہ محمد کا انکار کر دو اور لات وعزیٰ کی پرستش کرو، ورنہ اسی حالت میں تمہارا دم نکل جائے گا۔ کبھی لوہے کی زرہ پہنا کر تیز دھوپ میں بٹھا دیتا۔ وہ اس تکلیف میں بھی کہتے: "اَحَدٌ! اَحَدٌ!" (وہ ایک، وہ ایک ہے) کبھی ان کے گلے میں رسی ڈال کر شریر لڑکوں کو حکم دیتا کہ پورے شہر میں گھسیٹتے پھریں۔ ①

قحطانی النسل عمار بن یاسر، اُن کے والد یاسر اور والدہ سُمیّہ رضی اللہ عنہم کا مکّہ میں کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ قریش کے سرداران تینوں کو پکڑ کر صحرا میں لاتے اور بدترین تشدد کا نشانہ بناتے۔ حضور ﷺ انہیں اس حال میں دیکھتے تو فرماتے:

''یاسر کے گھرانے والو! صبر کرتے رہو۔ تمہارا ٹھکانہ جنت ہے۔''

حضرت یاسر رضی اللہ عنہ جو معمر اور کمزور تھے، اس مسلسل تشدد کی تاب نہ لا کر ایک دن فوت ہو گئے۔ پھر اُن کی اہلیہ حضرت سُمَیّہ رضی اللہ عنہا کو ابوجہل ملعون نے بدترین اذیت دیتے ہوئے برچھی کا وار کر کے شہید کر ڈالا۔ یہ اسلام کی پہلی شہید خاتون کہلائیں۔ ② اسی طرح حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ جو عبداللہ بن جرعان کے آزاد کردہ غلام اور نسلی لحاظ سے عجمی تھے، زد و کوب کا نشانہ بنتے رہے۔ انہیں اتنا مارا جاتا کہ بے ہوش ہو جاتے۔ ③

قریش کے مظالم اتنے بڑھے کہ شریف، مال دار اور معزز مسلمان بھی ان کی زیادتیوں سے نہ بچ سکے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو ان کے چچا حکم بن ابی العاص نے کس کر باندھ دیا کہ جب تک اسلام نہ چھوڑو گے آزاد نہیں کروں گا مگر وہ دینِ حق پر ڈٹے رہے۔ ④

حضرت مُصعَب بن عمیر رضی اللہ عنہ مکّہ کے بڑے مال دار، ہونہار اور ناز و نعمت میں پلے ہوئے نوجوان تھے۔ انہیں گھر والوں نے ایک کوٹھری میں بند کر دیا اور ایک طویل مدت تک وہ قید ہی میں رہے۔ ⑤

① سیرۃ ابن ھشام: ۳۱۸/۱ ؛ طبقات ابن سعد: ۲۶/۳ ؛ مستدرک حاکم، ح: ۵۲۳۸
② طبقات ابن سعد: ۱۳۶/۳، ۲۶۴/۸، ط صادر
③ طبقات ابن سعد: ۲۲۷/۳
④ المنتظم: ۳۳۵/۴
⑤ الاستیعاب: ۱۴۷۴/۴

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ پر مظالم:

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مکہ کے انتہائی معزز لوگوں میں سے تھے، اسی طرح حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ بھی شرفاء میں شامل تھے مگر جب دونوں اسلام لائے تو قریش کے سردار نوفل بن خویلد نے دونوں کو پکڑ کر ایک ہی رسی سے باندھ دیا اور بڑی ایذا رسانی کے بعد چھوڑا۔ تب سے یہ دونوں ''قرینین'' (دو پکے ساتھی) کہلانے لگے۔ ①

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جان سے زیادہ عزیز:

ایک دن سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سرِعام اسلام کی دعوت دینا شروع کی تو مشرکین آپے سے باہر ہو کر اُن پر جھپٹ پڑے اور مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ عُتبہ بن ربیعہ اپنے موٹے تلے والے پرانے جوتوں سے اُن کے چہرے پر ٹھوکریں مارتا رہا۔ چہرہ اتنا زخمی ہو گیا کہ پہچان مشکل ہو گئی۔ ان کے رشتے دار نیم مردہ حالت میں انہیں اُٹھا کر لے گئے، سب کو یقین تھا کہ وہ زندہ نہیں بچیں گے مگر اللہ نے ان کی زندگی باقی رکھی تھی۔ شام کے قریب انہیں ہوش آیا تو پہلا جملہ منہ سے یہ نکلا ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو خیریت سے ہیں ناں؟'' جب بتایا گیا کہ بخیریت ہیں تو کہنے لگے:

''میں جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود دیکھ نہیں لیتا، کچھ کھاؤں پیوں گا نہیں۔''

آخر کار اُن کی والدہ اُمّ الخیر اور ایک رشتہ دار خاتون اُمّ جمیل رات کا اندھیرا پھیلنے کے بعد انہیں سہارا دے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عزیز ترین دوست کی یہ حالت دیکھ کر اپنے آنسو نہ روک سکے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی روتے رہے۔ اُن کی والدہ ابھی تک اسلام نہیں لائی تھیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی درخواست پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ہدایت کے لیے دعا کی۔ دعا کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ اُمّ الخیر رضی اللہ عنہا اس وقت ایمان لے آئیں۔ یہ اس دن کی دعوت و تبلیغ اور ظلم و ستم پر صبر کرنے کا نقد صلہ تھا۔ ②

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت:

ظلم و ستم کی اِن تمام تر کارروائیوں کے باوجود اہلِ ایمان اپنے دین پر ثابت قدم رہے تو قریش کے سرداروں کا غصہ مزید بڑھ گیا۔ اب انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زبانی تکالیف کے ساتھ جسمانی طور پر اذیتیں دینے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا، انہوں نے شہر کے اوباشوں کے ذمے یہ کام لگا دیا کہ جہاں کہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیں، آپ کو تنگ کریں، آپ پر آوازیں کسیں، آپ کو شاعر، جادوگر اور مجنون کہیں اور تکلیفیں پہنچائیں، چنانچہ یہ سلسلہ پورے زور وشور سے شروع ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان حرکتوں سے بہت دل گیر ہوئے، درد دل حد سے بڑھ جاتا تو تسلی کے لیے وحی نازل ہو جاتی۔

ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلے تو دن بھر ایسی ہی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور تو اور مکّہ کے غلاموں نے بھی آپ کی کھلم کھلا توہین کی اور آپ کو جھٹلایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہایت رنجیدہ ہو کر گھر تشریف لائے اور چادر اوڑھ کر لیٹ

① "فشدهما في حبل واحد." (طبقات ابن سعد: ۳/۲۱۴، ترجمة: طلحه رضی اللہ عنہ ط صادر)

② الاصابة،ترجمة: ابو بكر رضی اللہ عنہ

گئے، تب وحی نازل ہوئی اور ﴿یَاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ کہہ کر حضور اقدس ﷺ کا حوصلہ بڑھایا گیا۔[1]

اکثر حضور ﷺ اہل مکہ کی طعن و تشنیع کے جواب میں خاموش ہی رہتے مگر کبھی کبھی صبر کا پیمانہ چھلک جاتا تو آپ انہیں بتادیتے کہ وہ اپنے لیے خود ہی ہلاکت کا سامان تیار کررہے ہیں۔

ایک دن حضور ﷺ کعبہ کا طواف کررہے تھے، اس وقت مکہ کے رؤسا کعبہ کے سائے میں بیٹھے تھے۔ آپ طواف کرتے کرتے جب بھی ان کے پاس سے گزرتے وہ آپ کا مذاق اڑاتے۔ آخر تیسرے چکر میں حضور ﷺ ان کے پاس رک گئے اور فرمایا: ''قریش کے لوگو! اللہ کی قسم! تم باز نہ آؤ گے جب تک کہ تم پر اللہ کا عذاب نازل نہ ہو۔ سن لو میں تمہارے لیے ہلاکت کی خبر لے کر آیا ہوں۔'' یہ سن کر سب کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور انہیں سانپ سونگھ گیا۔ حضور ﷺ اپنے صحابہ سے فرمارہے تھے: ''اللہ اپنے دین کو یقیناً غالب کرے گا۔''[2]

مگر اگلے دن جب حضور ﷺ طواف کرنے آئے تو اُن لوگوں نے آپ کو گھیر لیا اور آپ ﷺ پر ٹوٹ پڑے۔ عُقبہ بن ابی مُعَیط بدبخت نے آپ کی چادر آپ کے گلے میں ڈال کر اس طرح بل دیے کہ آپ ﷺ کا دم گھٹنے لگا اور آپ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ خوش قسمتی سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے عُقبہ بن ابی مُعَیط کو دھکا دے کر ہٹایا اور فرمایا: ''اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ؟''

(کیا تم ایک شخص کو صرف اتنی سی بات پر قتل کررہے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟)

یہ سن کر مشرکین نے حضور ﷺ کو چھوڑ دیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر پل پڑے، اتنا مارا کہ ان کا سر پھٹ گیا۔[3]

ابوجہل کی کارستانیاں:

قریش کے ابھرتے ہوئے سرداروں میں عَمرو بن ہشام جو ابوجَہل کے لقب سے مشہور ہوا، نبی اکرم ﷺ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ یہ انتہائی فصیح و بلیغ، چالاک اور مکار تھا۔ اکثر دوسروں کو آپ ﷺ کی توہین پر اُکساتا اور خود دور سے تماشا دیکھتا۔ بسا اوقات آپ ﷺ کی سرعام بے عزتی کرتا۔ ایک بار آپ ﷺ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ جب سجدے میں گئے تو یہ بدبخت آپ ﷺ کے سر مبارک پر ٹھوکر مارنے کی غرض سے تیزی سے آپ ﷺ کی طرف آیا۔ اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر اپنے نبی کی حفاظت فرمائی۔ اسے ایک بھیانک اونٹ منہ کھولے نظر آیا اور وہ واپس بھاگ نکلا۔[4]

مگر اس کے باوجود اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔ جب بھی قریش کے کسی شخص کو اسلام لاتا یا اسلام کی طرف مائل ہوتا

---

[1] صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب مالقی رسول اللہ ﷺ واصحابه من المشرکین بمکة
غالباً یہ ایک آیت کا دوبارہ نزول تھا جس کا مقصد حضور ﷺ کو تسلی دینا تھا ورنہ یہ آیت پہلے نازل ہوچکی تھی۔

[2] صحیح البخاری، باب مالقی رسول اللہ ﷺ واصحابه من المشرکین بمکة ؛ عیون الاثر: ۱/۱۴۰

[3] صحیح البخاری، باب مالقی رسول اللہ ﷺ واصحابه من المشرکین بمکة

[4] البدایة والنهایة: ۳/۱۱۶، دارِ هجر

دیکھتا تو اگر وہ رئیس یا سردار ہوتا تو یہ بڑے فنکارانہ انداز میں اس کو یوں تنبیہ کرتا: ''تم اپنے باپ کا دین چھوڑ رہے ہو حالانکہ تمہارا باپ تم سے کہیں بہتر تھا، اس لیے آئندہ سے ہم نہ تو تمہارے اخلاق کا بھروسہ کریں گے، نہ تمہاری رائے کا اعتبار کریں گے اور نہ ہی تمہاری کوئی قدر و منزلت ہو گی۔''

اگر کوئی تاجر ہوتا تو اسے یوں دھمکاتا: ''اگر تم مسلمان ہوئے تو ہم تمہاری تجارت کا نقصان کروائیں گے اور تمہارا مال ضائع کرا کے چھوڑیں گے۔'' اور اگر کوئی غریب اسلام لاتا تو پھر ابوجہل سید ھا مکوں، لاتوں اور ڈنڈے سے کام لیتا۔[1]

خانوادۂ نبوت آپ کے شانہ بشانہ:

حضور ﷺ اپنی دعوتی و روحانی جدوجہد میں انتہائی انہماک کے باوجود اپنی خانگی زندگی کے اہم فرائض سے بے پروا نہیں رہتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی بڑی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو ان کے خالہ زاد ابوالعاص بن ربیع سے بیاہ دیا تھا، وہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بہن ہالہ کے بیٹے تھے اور خاندان کے ایک تاجر پیشہ شریف نوجوان تھے، اگرچہ ابھی ایمان نہیں لائے تھے مگر اس وقت جبکہ ایمان لانے والے گنتی کے چند ہی افراد تھے، اس سے بہتر رشتہ کوئی اور نہ تھا۔ مشرکین سے نکاح کے بارے میں اب تک کوئی شرعی حکم نہیں آیا تھا۔

دوسری بیٹی حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہا کو جنہیں عُتَیبہ بن ابولہب نے طلاق دی تھی، آپ ﷺ نے مکہ کے سب سے حیادار نوجوان حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دے دیا جو بالکل ابتدا میں اسلام لانے والوں میں سے تھے اور مالی لحاظ سے بھی خوشحال تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور آپ ﷺ کی یہ بیٹیاں اللہ کی طرف دعوت دینے کی عظیم ذمہ داری میں آپ کی پوری پوری معاون اور غم گسار تھیں۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا چونکہ سب سے بڑی تھیں، اس لیے خاص طور پر اپنے والد کا خیال رکھتی تھیں کہ وہ کہاں گئے ہیں اور کس حال میں ہیں۔ حضور انور ﷺ بازاروں اور گلی کوچوں میں اللہ کی توحید کا پیغام سناتے سناتے اور کافروں کی ایذائیں سہتے سہتے بے حال ہو جاتے، اتنے میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا آپ کو تلاش کرتے ہوئے آن پہنچتیں اور آپ کو دشمنوں کی ایذا سے بچانے کی کوشش کرتیں۔

حارث بن حارث اپنے لڑکپن کا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ مکہ پہنچے تو دیکھا ایک جگہ رش لگا ہوا ہے۔ پوچھا: ''ابا! یہ کیا مجمع ہے؟'' باپ نے کہا: ''بیٹا! یہ لوگ ایک بے دین آدمی کو گھیرے ہوئے ہیں۔''

وہ باپ کے ساتھ سواری سے اتر کر مجمع میں گھس گئے۔ دیکھا تو نبی اکرم ﷺ لوگوں کو ایمان اور توحید کی دعوت دے رہے ہیں، لوگ آپ ﷺ کی بات کی تردید کر رہے ہیں اور طرح طرح کی تکالیف دے رہے ہیں۔ آدھا دن اسی طرح گزر گیا، اس کے بعد مجمع چھٹ گیا، تب ایک خاتون پانی کا برتن اور رومال لیے ہوئے اُدھر آئیں اور آپ ﷺ کو پانی پلایا پھر وضو کرایا۔ لوگوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ خاتون رسول اللہ ﷺ کی بیٹی زینب ہیں۔

[1] البداية والنهاية: ۳/۱۴۷، دار هجر

ایک اور گواہ مُنیب اَزدی ہیں جو بتاتے ہیں کہ حضورِ انور ﷺ لوگوں کے مجمعے میں فرما رہے تھے:

''لوگو! لا الٰہ الا اللہ کہہ دو، کامیاب ہو جاؤ گے۔''

مگر لوگ آپ کو گالیاں دینے لگے۔ کسی نے مٹی کا بڑا تھال بھر کر آپ ﷺ پر اس طرح پھینکا کہ سارا بدن خاک آلود ہو گیا۔ ایک بدبخت تو چہرۂ انور پر تھوکنے سے بھی باز نہ آیا۔ دو پہر ہوگئی تب ایک لڑکی پانی کا پیالہ لے کر آئی۔ حضورِ اکرم ﷺ نے اپنا چہرۂ مبارک دھویا اور لڑکی سے کہا: ''اپنے باپ کے بارے میں خدشہ مت کر کہ وہ اچانک مارا جائے گا یا رُسوا ہو جائے گا۔'' یہ لڑکی حضرت زینب بنت محمد رسول اللہ ﷺ تھیں۔ [1]

حضورِ انور ﷺ ایک دن مسجد الحرام میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ابوجہل نے کہا: ''کوئی ایسا نہیں جو اُونٹ کی اوجھڑی اُٹھا کر لائے اور جب محمد سجدے میں جائیں تو وہ اوجھڑی آپ کی پشت پر رکھ دے۔''

یہ سن کر عُقبہ بن ابی مُعیط جو حضورِ انور ﷺ سے دشمنی نکالنے میں بہت آگے تھا، گیا اور کسی اونٹ کی اوجھڑی لا کر آپ ﷺ کی پشت پر عین اس وقت رکھ دی جب آپ ﷺ سجدے میں تھے۔

مشرکین اپنی اس شرارت سے اتنے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ہنستے ہنستے ایک دوسرے پر گرے جاتے تھے۔ کسی نے جا کر حضور ﷺ کے گھر میں ان کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خبر دے دی جو کم عمر لڑکی تھیں۔ وہ فوراً آئیں، بڑی مشکل سے اوجھڑی کو حضور ﷺ کی پشتِ مبارک سے دھکیلا۔ پھر کافروں کی طرف متوجہ ہو کر انہیں بُرا بھلا کہنے لگیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے سجدے سے سر اُٹھایا تو کپڑے ناپاک ہو چکے تھے۔ مشرکین ابھی تک قہقہے لگا رہے تھے۔

حضور ﷺ نے لاچاری کی حالت میں اللہ کو پکارتے ہوئے ان کے لیے ایسی بددعا فرمائی جسے سن کر ان کے چہروں کے رنگ اُڑ ہو گئے اور انہیں ڈر لگا کہ یہ بددُعا کہیں قبول نہ ہو جائے۔ [2]

یہ واقعات بتاتے ہیں کہ اسلام کے لیے قربانیاں دینے میں حضورِ اکرم ﷺ اپنی جان، مال اور اہل و عیال سمیت شریک تھے اور یہی ایک سچے داعی اور کامل راہ نما کے شایانِ شان ہے۔

تقریباً یہی ایام تھے جب حضورِ انور ﷺ کی منہ بولی ماں حضرت اُمّ ایمن رضی اللہ عنہا اور آپ ﷺ کے لے پالک حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا، جو اپنی ماں کی طرح سیاہ فام تھا۔ بچے کا نام اُسامہ رکھا گیا۔ اس بچے سے آپ ﷺ کو غیر معمولی حد تک محبت تھی۔ [3]

---

① مجمع الزوائد ومنبع الفوائد لنور الدين الهيثمي، ح: ۹۸۲۷، ۹۸۲۸، ط مكتبة القدسي قاهره

② صحيح مسلم، ح: ۴۷۵۰، كتاب الجهاد، باب مالقي النبي ﷺ، ط دار الجيل ؛ سيرت ابن اسحق: ۱/ ۲۱۱
صحیح مسلم اور ابن اسحٰق کی اسی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے جن کے نام لے کر بددعا کی وہ سب غزوۂ بدر میں مارے گئے۔
حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی عمر مبارک اس وقت لگ بھگ نو دس سال تھی؛ کیوں کہ ان کی ولادت راجح قول کے مطابق قریش کے ہاتھوں تعمیرِ کعبہ کے ایام میں ہوئی جب نبی ﷺ پورے ۳۵ سال کے تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۸/ ۱۹؛ الاصابہ: ۸/ ۲۶۳) اس کے پانچ سال بعد نبی ﷺ کی بعثت ہوئی۔ مزید تین سال خفیہ تبلیغ کے گزرے۔ اس کے بعد تکالیف اور مصائب کا دور شروع ہوا۔ یہ واقعہ اسی دورِ ابتلاء کا ہے۔

③ الاصابة، ترجمة: اسامه بن زيد رضی اللہ عنہ

اولادِ نرینہ کی وفات اور مشرکین کے طعنے:

اس دوران حضور اکرم ﷺ پر ایک اور بہت بڑی آزمائش آئی۔ آپ ﷺ کے بڑے صاحبزادے قاسم جو آپ کی بعثت سے پہلے پیدا ہوئے تھے اور اب اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ گھوڑے پر سوار ہو جاتے تھے، اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد آپ کے دوسرے صاحبزادے عبداللہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس طرح آپ ﷺ کی نرینہ اولاد کوئی نہ رہی۔ اولاد کی جدائی کا غم ہی کچھ کم جگر سوز نہ تھا مگر مشرکین نے اسے حضور اکرم ﷺ کی مزید دل آزاری کا ذریعہ بنا لیا، اب وہ کہتے پھرتے تھے کہ محمد ''اَبتر'' ہو گئے ہیں، یعنی ان کی اولادِ نرینہ ختم ہو چکی ہے، آئندہ ان کی نسل ہوگی نہ کوئی نام لیوا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو تسلی کے لیے ''سورۃ الکوثر'' نازل فرمائی اور یہ اعلان فرمایا:

﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ﴾ '' یقیناً آپ کے دشمن ہی بے نام ونشان ہو جائیں گے۔''[1]

اولادِ نرینہ کی وفات میں حِکمتِ الٰہیہ:

اللہ تعالیٰ کے حضور اکرم ﷺ کی اولادِ نرینہ کو جلد اپنے پاس بلا لینے میں سب سے بڑی حکمت یہ تھی کہ آپ ﷺ کا آخری نبی ہونا طے ہو چکا تھا۔ اب اگر آپ کے لڑکے جوان ہو کر نبی نہ بنتے تو کسی کو یہ شک ہو سکتا تھا کہ شاید گزشتہ انبیائے کرام زیادہ قابل اور اپنی اولاد کے زیادہ اچھے مُربّی تھے کہ ان کی اولاد بھی پیغمبر ہوئی۔ اگر نبی ﷺ اتنے قابل ہوتے تو اِن کی اولاد بھی نبی ہوتی۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو لڑکوں کی نعمت عطا ضرور کی تاکہ آپ اس انعام سے محروم نہ رہیں مگر ان کو جلد واپس بلا لیا تاکہ کسی قسم کا شک پیدا نہ ہو سکے۔

اِک نئی اُمت کی تشکیل:

یہ آزمائش، صبر وتحمل، استقامت، حکمت عملی اور تربیت کے دن تھے۔ اسلام کی تاریخ میں یہ ایام سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں؛ کیوں کہ انہی دنوں میں وہ افراد تیار ہو رہے تھے، جن پر آگے ساری اُمت کی قیادت اور رہنمائی کا دارومدار تھا۔ کفار کی سختیوں، طعنہ زنیوں، جسمانی وذہنی ایذا رسانیوں، الزامات واعتراضات کے طوفانوں، کردار کشی کی نت نئی مہموں، خفیہ سازشوں اور علانیہ رکاوٹوں کے جواب میں نبی آخر الزماں ﷺ کی حکمت عملی صبر وتحمل، عدم تشدد، حزم واحتیاط اور ہر شخص کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے پر مشتمل تھی۔

حضور اکرم ﷺ کے صحابہ بھی لوگوں کو صبح وشام خفیہ اور علانیہ اللہ کی طرف بلا رہے تھے۔ دن میں آپ ﷺ زیادہ تر کوہِ صفا کے دامن میں واقع حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے مکان میں تشریف فرما ہوتے جو اسلام کا پہلا دعوتی مرکز اور پہلا مدرسہ تھا۔ حضور ﷺ روزانہ صبح وشام ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اُن کے گھر پر جا کر ملا کرتے تھے اور مشورے فرماتے۔ کفار کے مقابلے میں حضور ﷺ اور صحابہ کرام کے پاس حکومت، دولت اور افرادی قوت نہیں تھی۔ آپ کی طاقت اور ہتھیار اللہ پر مضبوط ایمان، اس کی مدد ونصرت پر یقین، اس سے ہر حال میں تعلق اور اسی سے بے تابانہ دعائیں کرنا تھا۔

[1] تفسیر ابن کثیر، سورۃ الکوثر

مسلمانوں کا سب سے بڑا ورد کلمہ طیبہ تھا، یہی اُن کی دعوت کا لُبِّ لُباب تھا اور یہی اُن کی روحانیت کا سرچشمہ۔ وہ اپنی محفلوں میں خوشی اور مسرت کے موقع پر "اللہ اکبر" کا نعرہ بھی لگاتے تھے، نماز فرض نہیں ہوئی تھی مگر اس کا طریقہ بتایا جا چکا تھا، وضو، غسل اور نماز کی تعلیم بھی مل چکی تھی۔ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام دو، دو رکعات نماز پڑھا کرتے تھے۔ عموماً یہ نمازیں اپنے اپنے گھروں میں یا پوشیدہ جگہوں پر ادا کی جاتی تھیں مگر حضور ﷺ حرم کعبہ میں بھی تشریف لے جا کر نماز پڑھا کرتے، بسا اوقات رات کا خاصا حصہ وہاں طویل رکعتوں میں گزارتے جن میں بڑی دل سوزی سے تلاوت فرماتے۔ تاہم اکثر صحابہ کرام قریش کے خوف سے حرم میں نماز نہیں پڑھتے تھے، خاص کر وہاں اجتماعی طور پر عبادت کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے لیے سب سے بڑی ڈھارس اور سب سے بڑی توانائی "وحی" تھی جو مسلسل نازل ہو رہی تھی۔ کفار بہت سوچ سوچ کر نت نئے اعتراضات کرتے مگر قرآنِ مجید کی دو تین آیات انہیں لاجواب کر دیتی۔ وہ ایذائیں دیتے تو وحی مسلمانوں کو حوصلہ دیتی اور فتح و کامرانی کا یقین دلاتی۔ کفار کے حربوں کے جواب میں کیا کرنا ہے؟ ہر ہر قدم پر اللہ کا قاصد زمین پر اُتر کر پیغمبر اسلام ﷺ کو تعلیم دے جاتا۔

قرآنِ مجید کی کتابت اور حفاظت اور اس کی تدریس کا کام بھی اس ابتدائی دور میں شروع ہو گیا تھا۔ نئی نازل ہونے والی آیات لکھ لی جاتیں۔ صحابہ انہیں سیکھ لیتے اور دوسروں کو سکھانا اور یاد کرانا شروع کر دیتے۔

حضور اقدس ﷺ اسلام لانے والے اپنے ساتھیوں کا بہت خیال رکھتے۔ ان کے خانگی حالات اور مسائل میں بھی دلچسپی لیتے۔ ان میں سے جو نادار اور مسکین ہوتے انہیں کسی بہتر آمدنی والے مسلمان کا ساتھی بنا دیتے تاکہ ان کی کفالت ہوتی رہے اور وہ رؤسائے قریش کے محتاج نہ رہیں، جیسا کہ تنگ دست صحابی حضرت خَبّاب رضی اللہ عنہ کو حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کا ساتھی بنایا۔ حضرت خَبّاب رضی اللہ عنہ انہیں قرآن بھی پڑھایا کرتے تھے۔ [1]

حضور اقدس ﷺ کی اس منشأ کے مطابق مال دار مسلمان خود بھی غریب اور مصیبت زدہ مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کو سعادت سمجھتے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال بن رَباح رضی اللہ عنہ کو اُمَیّہ بن خَلَف کی غلامی سے آزاد کرایا، اس طرح زِنّیرہ، نَہدیہ اور اُمِّ عُبَیس رضی اللہ عنہن بھی مشرکین کی باندیاں تھیں جو کلمہ پڑھنے کی پاداش میں سخت عذابوں کا سامنا کر رہی تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں بھی خرید کر آزاد کرا دیا۔ [2]

ایسا لگتا تھا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مال صرف اسلام کے لیے وقف ہے۔

☆☆☆

---

① معرفة الصحابة لابی نعیم، ح: ۲۲۹۱

② جوامع السیرة النبویة لابن حزم، ص ۴۴ ط دارالکتب العلمیة ؛ شعب الایمان للبیهقی، ح: ۱۵۱۴، ط مکتبة الرشد

دعوتی سرگرمیاں

موسم حج قریب آیا تو حضور ﷺ کی اُمیدیں بڑھ گئیں؛ کیوں کہ دور دراز کے لوگوں کو توحید کی دعوت دینے کا اِس سے بہتر موقع کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔ اِدھر قریش کے سردار بڑے فکرمند تھے، انہوں نے حضور ﷺ کو بدنام کرنے اور آپ کی دعوت کو لوگوں کے نزدیک غیر مؤثر بنانے کے لیے طرح طرح کی باتیں پھیلائی ہوئی تھیں۔ آپ کو (نعوذ باللہ) بے دین، مجنون اور شاعر مشہور کر رکھا تھا مگر ان تمام حربوں کے باوجود اِکا دُکا لوگ مسلمان ہوتے جا رہے تھے۔

یہ دیکھ کر قریش کے سردار باہم مل بیٹھے، اُن کے نامور سردار ولید بن مغیرہ نے کہا:

''حج کا زمانہ آرہا ہے۔ عرب کے مختلف قبائل یہاں آئیں گے جن کے کانوں میں یہ بات پڑ چکی ہے، لہٰذا اس شخص حضرت محمد ﷺ کے بارے میں ایک ہی بات طے کر کے کہو۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری باتیں آپس میں ٹکرائیں۔''

خاصے غور و خوض کے بعد جب حضور ﷺ کے خلاف کوئی مضبوط الزام سمجھ نہ آیا تو ولید نے کہا:

''سب سے زیادہ معقول بات یہ ہے کہ تم کہو وہ جادوگر ہے، اس نے جادو کے زور سے بھائی کو بھائی سے، شوہر کو بیوی سے اور خاندان والوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔''

چنانچہ لوگ یہ بات طے کر کے حاجیوں کے قافلوں کے مختلف راستوں میں بیٹھ گئے اور اس الزام کو مشہور کرنے لگے۔ یہ نبوت کا چوتھا سال تھا۔[1]

سوقِ عُکاظ میں دعوتِ اسلام (شوال ۴ نبوی):

عرب میں ماہِ شوال سے ذوالحجہ کے آخر تک بڑی چہل پہل، گرم جوشی اور ہل چل کے دن ہوتے تھے۔ قافلوں کے چلنے اور ٹھہرنے سے ہر طرف عید کا سماں ہوتا۔ انہی دنوں میں عربوں کے مشہور میلے اور بازار لگا کرتے تھے۔ سب سے بڑا بازار ''عُکاظ'' مکہ اور طائف کے درمیان ''نخلہ'' کے مقام پر لگتا تھا۔ یہ مکہ سے تین دن کی پیدل مسافت تھی۔ عازمینِ حج اور تاجروں کے قافلے پورا ماہِ شوال یہاں گزارتے۔ ذوالقعدہ میں انسانوں کا یہ سیلاب مکہ کا رخ کرتا اور ذی مَجَنَّہ میں ذوالقعدہ کے بیس دن اس طرح گزارتا کہ جنگل میں منگل ہو جاتا۔ یکم ذوالحجہ کو یہ رونقیں مکہ سے پانچ میل (۸ کلومیٹر) دور جبلِ کبکب کے دامن ''ذی المجاز'' میں منتقل ہو جاتیں جو عرفات سے تین میل (پونے پانچ کلومیٹر) دور ہے۔ آٹھ دن تک یہاں میلے کا سماں رہتا۔ ۹ ذوالحجہ کو لوگ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مناسکِ حج ادا کرنے عرفات روانہ ہو جاتے۔

---

[1] سیرۃ ابن ھشام: ۱/ ۲۷۰

حضور ﷺ نے انسانوں کے ان اجتماعات سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے اور ان کے ذریعے تھوڑے وقت میں دور دراز کے قبائل تک اپنی بات پہنچانے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ حضور ﷺ شوال سن ۴ نبوی میں تین دن کا سفر کر کے مکہ سے سوقِ عکاظ تشریف لے گئے اور مختلف قبائل کے سامنے دین کی دعوت رکھی۔ پھر آپ ذوالمجاز کے بازار میں آئے اور یہاں بھی اسی کوشش میں دن رات مصروف رہے۔ حضور ﷺ کی کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے ابولہب بھی آپ کے تعاقب میں رہا۔ حضور ﷺ ان بازاروں اور میلوں کے مختلف حلقوں میں تشریف لے جاتے اور لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے۔ حضور ﷺ فرماتے: ''لوگو! کہو لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) تم کامیاب ہو جاؤ گے۔''

حضور ﷺ کے پیچھے پیچھے آپ کا چچا ابولہب لپکتا آتا، اس کی بھینگی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں ہوتیں اور اس کے سرخ گال غصے سے تمتما رہے ہوتے۔ وہ حضور ﷺ پر مٹی پھینکتا اور چلاتا: ''ارے لوگو! دیکھنا کہیں یہ شخص تمہیں تمہارے دین سے نہ ہٹا دے۔ یہ چاہتا ہے کہ تم لات اور عزیٰ کی عبادت چھوڑ دو۔''

حضور ﷺ اس کی طرف توجہ دیے بغیر اپنا پیغام سناتے جاتے۔ [1]

ضِماد اَزدی کا قبولِ اسلام:

مکہ میں حضور کی دعوتی سرگرمیاں جاری تھیں اور قریش کی عداوت بھی۔ اسی زمانے میں قبیلہ اَزد کے ضِماد نامی ایک صاحب مکہ پہنچے۔ مشرکین نے اس خدشے سے کہ کہیں وہ حضور ﷺ کی دعوت سے متاثر نہ ہو جائیں، انہیں باور کرایا کہ حضور (نعوذ باللہ) مجنون ہیں۔ ضِماد کو جھاڑ پھونک کا بڑا تجربہ تھا۔ انہوں نے حضور ﷺ سے ملاقات کی اور کہا:

''میرے ہاتھ پر اللہ نے بہت سے لوگوں کو شفا دی ہے۔ آپ کہیں تو آپ پر بھی دَم کر دوں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا:

"اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهُ وَ نَسْتَعِينُهُ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلا هَادِيَ لَهُ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، وَاَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ اَمَّا بَعْدُ"

(بلاشبہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ ہم اس کی حمد بیان کرتے ہیں اور اسی سے مدد مانگتے ہیں۔ جسے اللہ گمراہ کر دے، اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ اور جسے وہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔)

ضِماد نے دم بخود ہو کر یہ کلمات سُنے، یقین نہ آیا کہ کوئی ایسے کلام بھی سنا سکتا ہے۔ بے ساختہ کہا: ''پھر سنایئے۔''

حضور ﷺ نے یہی کلمات دوبارہ سہ بارہ دُہرا دیے۔ ضِماد نے کہا: ''میں نے کاہنوں، جادوگروں اور شاعروں کا کلام سنا ہے مگر اس جیسے جملے کبھی نہیں سنے۔ یہ تو دریائے بلاغت کی تہ تک پہنچ گئے ہیں۔''

[1] البداية والنهاية: ۱۰۶/۴، دار هجر

ضماد رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرلیا اور اپنی قوم کی طرف سے بھی حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر کے واپس ہوئے۔ ①

مشرکین نے قرآن کی تاثیر کا اعتراف کیا:

ہر طرح کی مخالفت کے باوجود قرآن کی تاثیر کا مشرکین کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بلکہ اُلٹا ان کے بڑے بڑے سردار جو شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے، قرآن کے صوتی اثرات اور اس کی ادبی لطافت سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ابوجہل، ابوسفیان اور اَخنس بن شَرِیق رات کو اس وقت چھپ چھپ کر آتے جب رسول اللہ ﷺ قرآن کی تلاوت فرما رہے ہوتے۔

صبحِ صادق تک وہ گم صُم یہ آواز سنتے رہتے۔ پَو پھوٹتے ہی واپس ہوتے۔ اگر کسی موڑ پر باہم مل جاتے تو ایک دوسرے کو ملامت کرتے ہوئے کہتے: ''آئندہ ایسا مت کرنا۔ اگر قوم کے نادان لوگوں کو پتا چل گیا تو نا معلوم اس کا کیا اثر لیں گے۔'' مگر اگلی شب پھر ایسا ہوتا۔ جب کئی دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا تو ایک دن اَخنس بن شَرِیق لاٹھی اٹھا کر ابوجہل کے پاس پہنچ گیا اور کہنے لگا: ''بتاؤ ہی دو کہ محمد سے جو تلاوت سنی اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

ابوجہل کہنے لگا: ''ہم اور بنو ہاشم عزت و شرف کی ہر چیز میں مقابلہ کرتے آئے ہیں۔ جب ہم ہر چیز میں برابر نکلے تو وہ کہنے لگے ہیں کہ ہمارے پاس نبی بھی ہے جس پر وحی آتی ہے۔ اللہ کی قسم! ہم یہ بات کبھی نہیں مانیں گے۔'' ②

قریش کے سردار ولید بن مُغیرہ نے ایک بار رسول اللہ ﷺ سے کلام اللہ سنا تو اس پر رقّت طاری ہوگئی۔ واپس آیا تو ابوجہل نے اس کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر اسے طعنے دیے اور اصرار کیا کہ وہ کوئی ایسی بات کہے جس سے ظاہر ہو کہ وہ قرآن کا منکر ہے۔ ولید نے کہا: ''میں کیا کہوں؟ تم جانتے ہو کہ شعر، رزمیہ کلام اور قصائد کو مجھ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں۔ اللہ کی قسم! وہ کلام ان میں سے کسی سے بھی مشابہ نہیں۔ اس میں عجیب مٹھاس ہے۔ وہ ایسا کلام ہے جو سب پر غالب ہے، اس پر کوئی غالب نہیں۔ وہ دوسرے کلاموں کو زیر و زبر کر دیتا ہے۔''

ابوجہل نے کہا: ''تمہیں ایسا کچھ تو کہنا ہی پڑے گا جس سے تمہاری قوم خوش ہو جائے۔''

ولید نے سوچ بچار کر کے کہا: ''اسے جادو کہنا چاہیے۔'' ③

مگر نضر بن حارث نے جسے لوگ شیطان کہہ کر یاد کرتے تھے، اس حربے کو بھی فضول قرار دیا۔ وہ قرآن کی تاثیر کو عرب کے روایتی دین کے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا تھا۔ ایک دن اس نے برملا کہا:

''قریش کے لوگو! اللہ کی قسم! تمہیں ایسے مسئلے سے سابقہ پڑا ہے جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں۔ تم جانتے ہو کہ محمد تمہارے خاندان کا ایک لڑکا تھا جو پلا بڑھا۔ وہ تمہارا سب سے محبوب فرد اور سب سے زیادہ سچی

---

① صحیح مسلم، ح: ۲۰۰۵، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلوة والخطبة
② البداية والنهاية: ۳/ ۱۶۱؛ دلائل النبوة للبيهقي: ۲/ ۲۰۶
③ مستدرک للحاکم، ح: ۳۸۷۲

بات کرنے والا اور سب سے زیادہ امانت دار تھا۔ اب جب وہ ادھیڑ عمر ہو گیا اور یہ نیا پیغام لایا تو تم کہتے ہو کہ وہ جادوگر ہے۔ اللہ کی قسم! وہ جادوگر نہیں؛ کیوں کہ ہم جادوگروں اور ان کی جھاڑ پھونک کو جانتے ہیں۔ کبھی تم کہتے ہو کہ وہ کاہن ہیں۔ اللہ کی قسم! وہ کاہن نہیں، کاہنوں اور ان کی حالت کو بھی ہم خوب دیکھ چکے ہیں۔ کبھی تم کہتے ہو کہ وہ مجنون ہیں۔ اللہ کی قسم! وہ مجنون نہیں۔ ہم جنون، اس کی اقسام اور اس کے اثرات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ قریش کے لوگو! اپنا انجام اچھی طرح دیکھ لو۔ واقعی تم پر بہت بڑی آفت آپڑی ہے۔''①

عُتبہ بن ربیعہ سے گفتگو:

ایک دن عمائدِ قریش نے اپنے نہایت زیرک سردار عُتبہ بن رَبیعہ کو خوب سمجھا بجھا کر رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا۔ اس نے آتے ہی حضور ﷺ سے پوچھا کہ آپ بہتر ہیں یا آپ کے آباؤاجداد؟

رسول اللہ ﷺ کو خاموش دیکھ کر وہ کہنے لگا: ''اگر وہ بہتر ہیں تو سوچو کہ وہ انہی معبودوں کو پوجتے تھے جنھیں تم غلط کہتے ہو۔ اگر تم بہتر ہو، تو ٹھیک ہے، اپنا موقف سناؤ۔ ہم سنیں گے۔ ہمارے نزدیک تو تم سے زیادہ نقصان دہ آدمی ہماری قوم میں کوئی پیدا نہیں ہوا جس نے ہماری اجتماعیت کو منتشر کر دیا اور عربوں میں ہمیں بدنام کر دیا۔ مشہور ہو گیا ہے کہ قریش میں ایک جادوگر ہے۔ قریش میں ایک کاہن ہے۔ اب تو بس اتنی سی کسر رہ گی ہے کہ ہم تلواریں لے کر ایک دوسرے پر پل پڑیں اور فنا ہو جائیں۔ بھائی! اگر تمھیں کوئی عورت چاہیے تو ہم دس عورتوں سے تمھارا نکاح کرا دیتے ہیں۔ اگر دولت چاہیے تو ہم تمھارے لیے اتنا مال جمع کر دیں گے کہ سارے قریش سے زیادہ مال دار ہو جاؤ گے۔''

حضور ﷺ خاموشی سے یہ سب سنتے رہے۔ جب وہ چپ ہو گیا تو فرمایا: ''تم نے جو کہنا تھا، کہہ چکے؟''

اس نے کہا: ''ہاں۔'' تب حضور ﷺ نے یہ آیات تلاوت فرمائیں:

حٰمٓ ○ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ○

''یہ کلام رحمٰن ورحیم کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی جاتی ہیں، ایسا قرآن ہے جو عربی میں ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے ہے جو دانش مند ہیں۔ بشارت دینے والا، ڈرانے والا ہے۔ پھر بھی اکثر لوگوں نے روگردانی کی، پھر وہ سنتے ہی نہیں۔''②

نبی اکرم ﷺ تلاوت کرتے جا رہے تھے اور عتبہ ہاتھوں پر سہارا لگائے زمین پر بیٹھے سنتا جا رہا تھا۔ آخر رسول اللہ ﷺ اس آیت پر پہنچے: فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ③
''پھر بھی اگر یہ لوگ منہ موڑیں تو کہہ دو: میں نے تمھیں ایسی کڑک سے خبردار کر دیا ہے جیسی کڑک عاد و ثمود پر آئی تھی۔''

① دلائل النبوۃ للبیهقی: ۲/۲۰۱

② سورۃ حٰم السجدۃ، آیت: ۱ تا ۴ ③ سورۃ حٰم السجدۃ، آیت: ۱۳

عتبہ یہ آیت سن کر یک دم کھڑا ہو گیا، رسول اللہ ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھا اور رشتہ داری کا واسطہ دے کر مزید تلاوت سے روکا۔ کلام پاک کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ وہ گھر میں محبوس ہو کر بیٹھ گیا۔

آخر دوسرے مشرکین نے آکر خیریت پوچھی۔ اس نے سارا واقعہ سنایا اور رسول اللہ ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا: ''تم جانتے ہو محمد جو بھی کہتے ہیں وہ سچ ہی ثابت ہوتا ہے۔ مجھے تو اس وقت عاد اور ثمود جیسی کڑک کے سوا کچھ سمجھ نہیں آیا۔ مجھے لگا کہ کہیں تم پر واقعی عذاب نازل نہ ہو جائے۔''

پھر کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! محمد نے جو سنایا وہ نہ تو جادو تھا نہ شعر اور نہ ہی کوئی جنتر منتر۔ تم میری ایک بات مان لو۔ پھر چاہے میری کوئی بات نہ ماننا۔ اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ جو کہہ رہا ہے، اس کا چرچا ضرور ہوگا۔ اگر عربوں نے اس پر قابو پا لیا تو تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اور اگر وہ عربوں پر غالب آ گیا تو اس کی فتح تمہاری فتح شمار ہوگی۔ اس کی عزت میں تمہاری عزت ہوگی۔''

عمائدِ قریش یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ ''محمد کی زبان کا جادو تم پر بھی چل گیا ہے۔''[1]

طفیل بن عَمرو دَوسی کا قبولِ اسلام:

یہی دور تھا جب یمنی قبیلے دَوس کے ایک شریف اور عاقل شخص طفیل بن عَمرو کی مکہ آمد ہوئی۔ مشرکینِ مکہ نے اپنے معمول کے مطابق انہیں خبردار کیا کہ یہاں ایک شخص نیا دین لے کر اٹھا ہے جو باپ اور بیٹے، بھائی اور بھائی اور بیوی اور شوہر میں پھوٹ ڈال چکا ہے، ڈر ہے کہ کہیں تم بھی اس کے اسیر نہ ہو جاؤ، پس اس کی بات نہ سننا۔

طفیل بن عَمرو نے پریشان ہو کر کانوں میں روئی ٹھونس لی مگر ایک دن حضور ﷺ کو کعبہ کے قریب نماز ادا کرتے دیکھا تو قریب چلے گئے۔ تلاوت کی آواز کانوں میں پڑ ہی گئی۔ کلام اللہ کی حلاوت اور اعجاز نے انہیں دم بخود کر دیا۔ خود سے کہنے لگے: ''میں شاعر اور ذہین آدمی ہوں۔ بات کی اچھائی برائی کو جانچ سکتا ہوں۔ اس آدمی کی بات سننے میں کیا حرج ہے۔ اگر اچھی ہوئی تو ٹھیک ورنہ مسترد کر دوں گا۔'' حضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو طفیل بن عَمرو نے ملاقات کی۔ حضور ﷺ سے اسلام کا پیغام سنا اور وہیں مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ یمن واپس جا کر پہلے گھر والوں کو اسلام کی دعوت دی۔ والد اور بیوی نے فوراً اسلام قبول کر لیا پھر قوم میں تبلیغ شروع کی مگر قوم آمادہ نہ ہوئی۔[2]

آخر کچھ مدت بعد دوبارہ مکہ آئے اور حضور ﷺ سے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! قبیلہ دوس سرکش ہے، اس نے (اسلام لانے سے) انکار کر دیا ہے۔ آپ اس کے خلاف بددعا کیجیے۔''

رسول اللہ ﷺ نے دعا کی: ''یا اللہ! قبیلۂ دوس کو ہدایت دے اور انہیں لے آ۔''[3]

---

① مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۶۵۶۰؛ المستدرک للحاکم، ح: ۳۰۰۲؛ البدایۃ والنھایۃ: ۳/ ۱۵۵ تا ۱۶۰
حافظ ابن کثیر نے اسے متعدد طرق سے نقل کیا ہے۔ ہم نے تین چار طرق کا حاصلِ مطلب ایک ساتھ پیش کر دیا ہے۔

② سیرت ابن ھشام: ۱/ ۳۸۳، ۳۸۴ ③ صحیح البخاری، ح: ۶۳۹۷، کتاب الدعوات، باب الدعاء علی المشرکین
یہ دعا چند برس بعد مستجاب ہوئی۔ قبیلہ دوس نے اسلام قبول کیا اور اس کے ۸۰ گھرانے ۷ ہجری میں مدینہ حاضر ہوئے۔ (سیرت ابن ھشام: ۱/ ۳۸۵)

پناہ گاہ کی تلاش: ہجرتِ حبشہ

جب قریش کے مظالم حد سے بڑھ گئے اور مسلمانوں پر مکّہ کی زمین تنگ پڑ گئی تو حضور ﷺ بہت فکر مند رہنے لگے۔ قریش کی ہر حد سے متجاوز دشمنی آپ ﷺ کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی کہ مسلمانوں کے لیے کہیں کوئی جائے پناہ تلاش کرنی ہوگی۔ بعض صحابہ کرام خود بھی ان مصائب سے عاجز آ کر حضور ﷺ سے درخواست کر رہے تھے کہ انہیں کسی اور ملک جانے کی اجازت مل جائے، مگر کسی دوسرے ملک جانا کوئی آسان بات نہیں تھی۔

سرزمین عرب میں اس وقت قریب ترین بڑا شہر ''یثرب'' تھا جہاں بنو ہاشم کی رشتہ داری بھی تھی مگر یثرب کے عرب قبائل اَوس اور خزرج ایک تو خود مشرک اور بت پرست تھے، دوسرے وہ قریش مکّہ سے تعلقات بگاڑنا پسند نہیں کر سکتے تھے، خصوصاً ایسے وقت میں جبکہ ان کے اندرونی دشمن یہودی انہیں نیچا دکھانے کی سر توڑ کوششیں کر رہے تھے، وہ مکّہ کے مسلمانوں کو پناہ دے کر اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرنا پسند نہیں کر سکتے تھے۔

یثرب میں پناہ لینا اس لحاظ سے بھی غیر مناسب تھا کہ ان ایام میں حجاز کا یہ علاقہ انتہائی خونریز جنگوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ صرف قریش تھے جنہوں نے اپنا دامن بچا کر رکھا تھا ورنہ یثرب اور اس کے چاروں طرف معرکوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔ اَوس اور خزرج کے ذیلی قبائل بار بار آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے، بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع کے یہود بھی جنگوں کے اس سلسلے کو ہوا دے رہے تھے اور پوری طاقت سے اس میں شریک تھے۔ جنگوں کا یہ سلسلہ حربِ سُمَیْر سے شروع ہوا تھا اور پھر یکے بعد دیگرے یوم السَّرارۃ، حربِ فارِع، حربِ حاطِب، یوم الرَّبیع، یوم البقیع اور یوم فجار کے معرکے پیش آتے چلے گئے۔ اب ہر گھر مقتولوں کا وارث تھا اور ہر سینے میں انتقام کی آگ تھی، ایسے لوگ دوسروں کے معاملات حل کرنے میں کیا دلچسپی لے سکتے تھے۔ [1]

دوسرا قریبی ملک جنوب کی طرف یمن تھا مگر وہاں سبا اور حِمیَر کی سیادت کا زمانہ کب کا گزر چکا تھا اور اب تین عشروں سے وہاں اہل فارس کا سکہ چل رہا تھا جن کی نخوت، تعصب اور مفاد پرستی کو دیکھتے ہوئے کسی اچھے رویے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایسے میں مغرب کی سمت براعظم افریقہ کا ساحلی ملک حبشہ ایک ایسا گوشہ نظر آتا تھا جہاں تشدد زدہ اور مجبور مسلمان پناہ لے سکتے تھے۔ مسلمانوں کے لیے اگرچہ یہ سرزمین بالکل اجنبی تھی اور وہاں کی حکومت اور رعایا کے عیسائی ہونے کے پیش نظر یہ اُمید بھی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہاں اسلام کی حمایت و سرپرستی کی جائے گی مگر وہاں کے موجودہ بادشاہ کے بارے میں حضورِ اکرم ﷺ کو یہ معلومات مل چکی تھیں کہ وہ انصاف پسند آدمی ہے اور کسی پر ظلم نہیں ہونے دیتا۔ حبشہ بحیرۂ احمر کے پار ہونے کی وجہ سے عرب کے دیگر شہروں کی بہ نسبت قریش مکّہ کی دسترس سے بعید اور

---

[1] الکامل فی التاریخ: ۱/۵۸۳ تا ۶۰۱ ط دار الکتاب العربی

ان کی کسی عسکری کارروائی سے بالکل محفوظ تھا۔ تاہم وہاں جانے کا راستہ معروف تھا؛ کیوں کہ عرب تاجر ایک مدتِ دراز سے جدہ کے ساحل سے کشتیوں پر سامان لاد کر حبشہ جاتے رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ حبشہ اسلام کی تبلیغ اور نفاذ کا مرکز نہیں بن سکتا، اس کے باوجود وقت کی نزاکت اور حالات کے دباؤ کا تقاضا تھا کہ کوئی نہ کوئی ایسا ٹھکانہ ہونا چاہیے جہاں اسلام کے دشمنوں کو مسلمانوں پر قابو حاصل نہ ہو اور وہاں ضرورت کے وقت کوئی بھی مسلمان جا کر پناہ لے سکے۔

ہجرتِ حبشہ اُولیٰ (رجب ۵ نبوی):

ان پہلوؤں کے پیشِ نظر آخر کار نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو مشورہ دیا کہ وہ حبشہ کو ہجرت کر جائیں۔ اس ہدایت کے تحت نبوت کے پانچویں سال رجب کے مہینے میں مسلمانوں کے چند گھرانوں نے خفیہ طور پر مکہ سے حبشہ جانے کی کے لیے کمر باندھ لی۔ [1] مہاجرین میں گیارہ مرد تھے اور چار خواتین: ان میں ❶ حضرت عثمان بن عفان ❷ ان کی اہلیہ حضرت رُقَیّہ ❸ حضرت ابوسَلَمہ ❹ ان کی اہلیہ اُمِّ سَلَمہ ❺ حضرت عامر بن ربیعہ ❻ ان کی اہلیہ لیلیٰ بنت ابی حَثمہ (اُمِّ عبداللہ) ❼ حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ ❽ ان کی اہلیہ سہلہ بنت سُہیل ❾ حضرت زبیر بن عوام ❿ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ⓫ حضرت عثمان بن مَظعُون ⓬ حضرت مُصعَب بن عُمیر ⓭ ابوسَبرہ بن ابی رُہم ⓮ سُہیل بن بَیضاء اور ⓯ ابوحاطب بن عَمرو شامل تھے۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین [2]

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مہاجرینِ حبشہ میں فقط مسکین اور کمزور قسم کے مسلمان شامل تھے مگر دیکھا جائے تو ان میں ہر طبقے کے افراد نظر آئیں گے۔ ان میں عثمان بن عفان بھی تھے جو مکہ کے امراء اور شرفاء میں شمار ہوتے تھے۔ ان میں زبیر بن عوام بھی تھے جن کی جرأت ضرب المثل تھی۔ دوسری طرف حضرت بلال اور عمار بن یاسر جیسے مسلمان جو سب سے زیادہ مصائب کا شکار تھے، ان مہاجرین میں دکھائی نہیں دیتے۔ ممکن ہے، وہ اس قدر عاجز ہوں کہ ان کے لیے مکہ سے نکلنا ممکن نہ ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انھیں اللہ اور اس کے رسول کی خاطر تکالیف سہنے میں ہی خوشی ملتی ہو۔

ہجرت کے لیے یہ ترتیب طے کی گئی تھی کہ ایک وقت مقررہ پر سب لوگ ایک ایک، دو دو کی تعداد میں مکہ سے نکلیں گے اور کسی دُور دراز جگہ پر جمع ہوں گے تاکہ اہلِ مکہ عین وقت پر چوکنا نہ ہوسکیں۔ [3]

اُمِّ عبداللہ رضی اللہ عنہا اور عمر بن الخطاب کی گفتگو:

مہاجرین میں سے عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ اُمِّ عبداللہ رضی اللہ عنہا سامان باندھ کر اونٹ پر مکہ سے نکلنے ہی تھے کہ عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کو کوئی نہایت ضروری کام یاد آگیا۔ وہ اہلیہ کو وہیں چھوڑ کر شہر کی طرف چلے گئے۔

---

[1] البداية والنهاية: ۱۶۵/۳
[2] تاريخ الطبري: ۳۳۰/۲ ؛ البداية والنهاية: ۱۶۵/۳ ؛ سيرة ابن هشام: ۳۲۱/۱ ؛ سبل الهدى والرشاد: ۳۶۳/۲
[3] یہ ترتیب معجم کبیر طبرانی کی اس روایت سے سمجھ آرہی ہے جو اگلی سطور میں آرہی ہے۔

ان دِنوں مسلمان بنوعدی کے ایک دلیر نوجوان عمر بن خطاب سے سہمے رہتے تھے جسے اللہ نے سمجھ بوجھ اور غیرت و شرافت سے نوازا تھا مگر اسلام کی حقانیت ابھی تک اس پر واضح نہیں ہوئی تھی اس لیے اس کی پوری کوشش تھی کہ مسلمان ہم وطن اپنے قدیم دین پر واپس آ جائیں۔ قسمت کی بات کہ اس وقت غیر متوقع طور پر عمر بن خطاب کی اس سمت آمد ہوگئی اور جب اُمّ عبداللہ رضی اللہ عنہا کو سامان سمیت اونٹ پر سوار دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا: ''کہاں جا رہی ہو؟''

اُمّ عبداللہ رضی اللہ عنہا یہ واقعہ سناتے ہوئے کہتی تھیں: ''عمر بن خطاب مسلمانوں کے خلاف نہایت شدید تھے۔''

مگر اس موقع پر اس اللہ کی بندی نے گول مول بات کرنے کی بجائے بے خوف ہو کر کہا:

''تم لوگ ہمیں ہمارے دین کی وجہ سے ستاتے ہو، پس ہم اللہ کی زمین پر کسی اور جگہ جا رہے ہیں جہاں ہم اللہ کی عبادت کریں تو ہمیں تکلیفیں نہ دی جائیں۔''

نہ معلوم یہ الفاظ کس درد دل سے ادا کیے گئے تھے کہ انہیں سن کر عمر بن خطاب کا دل پسیج گیا، چہرے پر ندامت اور رقّت کے آثار واضح ہو گئے۔ منہ سے فقط اتنا نکلا: ''اللہ تمہارا ساتھی ہو۔''

یہ کہہ کر وہ بوجھل قدموں کے ساتھ واپس چل دیے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ مسلمانوں کا گھر بار چھوڑ جانا، عمر بن خطاب کے لیے حسرت ناک ہے۔ اُمّ عبداللہ رضی اللہ عنہا گم صم رہ گئیں۔ اتنے میں عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ آ گئے۔ اہلیہ نے فوراً کہا: ''ابھی ابھی عمر یہاں سے ہو کر گئے ہیں۔ کاش! آپ دیکھتے کہ ان کے چہرے پر کیسی حسرت تھی۔''

عامر رضی اللہ عنہ حیران ہو کر بولے: ''کیا تمہیں اس کے اسلام لانے کی اُمید ہو رہی ہے؟'' اہلیہ نے کہا: ''ہاں۔''

عامر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''جب تک خطاب کا گدھا اسلام نہ لے آئے، تب تک خطاب کا بیٹا بھی اسلام نہ لائے گا۔''[1]

حبشہ میں پناہ:

آخر مہاجرین کچھ پیدل اور کچھ سوار مکہ سے روانہ ہوئے اور بحیرۂ احمر کے ساحل پر جا پہنچے۔ خوش قسمتی سے دو تجارتی کشتیاں حبشہ جانے کے لیے تیار تھیں۔ انہوں نے نصف دینار کرایہ لے کر انہیں سوار کر لیا۔

قریش کو ذرا تاخیر سے مسلمانوں کے نکلنے کی خبر ہوگئی۔ وہ تعاقب کرتے ہوئے ساحل تک آئے مگر اس سے پہلے کشتیاں جا چکی تھیں۔ اس طرح مسلمان حبشہ پہنچے۔ نجاشی نے ان پردیسیوں کو بڑی عزت سے اپنے ہاں ٹھہرایا اور یہ لوگ افریقہ کے اس انتہائی گرم اور غیر متمدن علاقے میں مکہ کی بہ نسبت بہت آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔[2]

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان بے وطن مسلمانوں کی فکر ستاتی رہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی رُقیّہ رضی اللہ عنہا اور داماد عثمان رضی اللہ عنہ کے

---

① المعجم الكبير للطبراني: ٢٥/٢٩ ..... عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر کی اسلام کے خلاف سختی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے مقرب ترین ساتھی اور مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ بنیں گے۔ ہدایت بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور عزت بھی۔

② تاريخ الطبري: ٢/٣٢٩ ؛ البداية والنهاية: ٤/١٦٥ ؛ السيرة الحلبية: ١/٤٥٨. ط العلمية

بعض راویوں نے ان مہاجرین میں عبداللہ بن مسعود، جعفر بن ابی طالب اور ان کی اہلیہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہم کو بھی شمار کیا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ حضرات حبشہ کی دوسری ہجرت میں شامل تھے، پہلی میں نہیں۔ جیسا کہ آگے حوالوں کے ساتھ آ رہا ہے۔

لیے بھی پریشان تھے کہ ان کی کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ آپ ﷺ مکہ سے باہر راستوں پر نکل کر آنے جانے والوں سے ان کی خیر خبر پوچھا کرتے تھے۔ آخر افریقہ سے آنے والی کسی عورت نے ان کی خیریت سے آگاہ کیا اور کہا:

''میں نے آپ کی بیٹی کو سواری پر بیٹھے اور داماد کو سواری کی لگام پکڑے دیکھا تھا۔''

حضور ﷺ کو تسلی ہوئی کہ ان کی لختِ جگر اور داماد زندہ سلامت ہیں۔ آپ نے فرمایا:

''اللہ ان دونوں کے ساتھ ہو۔ بلاشبہ عثمان لوط علیہ السلام کے بعد مع اہل وعیال ہجرت کرنے والے پہلے فرد ہیں۔''[1]

صحابہ کو صبر واستقلال کا حکم:

اس دوران پیچھے رہ جانے والے صحابہ پر کفارِ مکہ کے مظالم کی شدت بڑھتی چلی گئی۔ مقابلے میں صحابہ کرام نے بھی صبر وتحمل کی حد کردی۔ وہ چاہتے تو بعض مواقع پر جواب میں ہاتھ اٹھا سکتے تھے، مگر اللہ کے حکم کے مطابق حضور ﷺ نے انہیں روک رکھا تھا۔ آخر عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جیسے عظیم صحابی ایک دن کہہ اٹھے:

''اللہ کے رسول! ہم مشرک تھے تو عزت دار تھے۔ ایمان لائے تو بے بس اور مسکین بن گئے!!''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''مجھے درگزر کرنے کا حکم ہے۔ اس لیے لڑائی مت کرنا۔''[2]

اس کے پیچھے حکمت یہی تھی کہ اس کم طاقت کے ساتھ دو چار وقتی کارروائیاں تو ہوسکتی تھیں مگر غلبہ ممکن نہ تھا۔ اس کا نتیجہ دشمن کے اشتعال اور اپنے مصائب میں اضافے کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا تھا۔

☆☆☆

---

① اتحاف الخیرۃ المھرۃ، ح: ۲۶۲۷؛ اسد الغابۃ، ترجمہ: رُقَیّہ بنت رسول اللہ رضی اللہ عنہا؛ الآحاد والمثانی لابن ابی عاصم، ح: ۱۲۳

② "یارسول اللہ! انا کنا فی عز ونحن مشرکون، فلما آمنا صرنا اذلۃ، فقال: انی امرت بالعفو، فلا تقاتلوا." (نسائی مجتبیٰ، ح: ۳۰۸۶)

اسلام کے نئے مددگار

اسلام کے نام لیوا کم تھے، ابھی تک یہ دین کسمپرسی کے عالم میں تھا مگر اللہ نے اپنے دین کے مددگار پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حضور اکرم ﷺ کے چچا حمزہ بن عبدالمطلب جو چوالیس، پینتالیس سال کے شہزور جوان اور زبردست سپاہیانہ اوصاف کے مالک تھے، نہ صرف رسول ﷺ کی حمایت کے لیے شمشیر بکف ہو گئے بلکہ اسلام بھی قبول کر لیا۔

ہوا یہ کہ ایک دن ابوجہل نے صفا پہاڑ پر سب شہریوں کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی بری طرح توہین کی اور گالیاں دیں۔ ایک انتہائی شریف آدمی کی سرعام بے عزتی کا یہ منظر اتنا کربناک تھا کہ خود دیکھنے والے بھی اپنے دلوں میں درد کی ٹیسیں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ حمزہ بن عبدالمطلب اس دن اپنے مشغلے کے مطابق شکار اور تیراندازی کر کے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں ایک عورت نے انہیں دیکھا تو کہہ اٹھی:

''ابوعمارہ! آج تو ابوجہل نے تمہارے بھتیجے کو بہت ہی تکلیف پہنچائی، گالیاں دیں اور بہت کچھ کہا۔''

یہ سنتے ہی حمزہ بن عبدالمطلب بے تاب ہو کر ابوجہل کی تلاش میں نکلے، دیکھا کہ وہ صفا و مروہ کے درمیان قریش کی محفل میں بیٹھا ہوا ہے۔ آپ نے جاتے ہی اپنی کمان کاندھے سے اُتاری اور اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سر سے بلند کرتے ہوئے پورے زور سے ابوجہل کی کھوپڑی پر دے مارا، ابوجہل کا سر لہولہان ہو گیا۔

قریش نے طنز کرتے ہوئے کہا: ''اے ابوعمارہ! تم تو ایسے نادان نہ تھے، کیا تم بھی ایمان لے آئے ہو؟''

یہ ایک فیصلہ کن لمحہ تھا، حق کی گواہی دے کر اس پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہونے کا یا گھٹ کر رہ جانے کا۔ حضرت حمزہ دل کی گہرائیوں سے جانتے تھے کہ ان کا بھتیجا سچا ہے، وہ ایک لمحہ توقف کیے بغیر بولے:

''ہاں! میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، وہ اللہ کے پاس سے سچا دین لائے ہیں۔''

ساتھ ہی انہوں نے قریش کو خبردار کرتے ہوئے کہا: ''یہ تو تھی کمان کی مار، آئندہ چلے گی تلوار۔''

سردارانِ قریش پر ایک ہیبت چھا گئی، انہیں خدشہ لاحق ہو گیا کہ ایسے دلیر لوگوں کے اسلام قبول کر لینے کے بعد مسلمانوں کو دبانا مشکل ہو جائے گا۔[1]

جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے (ذوالحجہ ۵ نبوی):

حضور ﷺ قریش کی اس قدر دشمنی اور ایذا رسانی کے باوجود ان کے ایسے افراد کی ہدایت کی خصوصیت سے آرزو رکھتے تھے جن میں حق شناسی، صداقت کے لیے قربانی اور قیادت کی غیر معمولی صلاحیتیں نظر آتی تھیں، چاہے وہ ابھی اسلام کے کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں اور ان سے رسول اللہ ﷺ کو ذاتی طور پر کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچ رہی ہو۔

[1] مستدرک حاکم، ح: ۴۸۷۸

یہ رسول اللہ ﷺ کی وسعتِ ظرفی اور کشادہ دلی تھی کہ آپ ایسے افراد کی ہدایت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیا کرتے تھے۔ قریش کے دو آدمیوں میں آپ کو غیر معمولی قائدانہ اوصاف نظر آتے تھے۔ ایک حد درجہ ضدی اور عیار شخص، عمرو بن ہشام (ابوجہل) تھا، جو آئے دن آپ ﷺ کے خلاف نت نئے منصوبے بناتا تھا۔ دوسری شخصیت انتہائی بہادر اور جرار تھی۔ یہ اٹھائیس سالہ جیالے نوجوان عمر بن خطاب تھے۔ دلیری و سپہ گری میں بے مثال اور ہمت و بے باکی میں یکتا تھے۔ ایک دو واقعات ایسے پیش آچکے تھے جن سے ان کا دل کسی نہ کسی حد تک اسلام کی سچائی کو محسوس کر چکا تھا۔

سُن کامیابی کی بات:

حضور ﷺ کے اعلانیہ تبلیغ شروع کرنے سے چند دن پہلے وہ حرم کے صحن میں سو رہے تھے کہ کسی شخص نے آکر ایک بُت کے سامنے جانور قربان کیا۔ اتنے میں ایک نہایت زوردار آواز سنائی دی، کوئی کہہ رہا تھا:

" یَا جَلِیْحُ! اَمْرٌ نَجِیْحٌ . رَجُلٌ فَصِیْحٌ . یَقُوْلُ: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ "

(اے جلیح! سن کامیابی کی بات۔ ایک فصیح و بلیغ آدمی کہتا ہے: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔)

حضرت عمر کی حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ آواز لگانے والے کو تلاش کرتے رہے مگر ناکام رہے۔ اس کے چند ہی دنوں بعد مکہ میں حضور ﷺ کی نبوت کا چرچا ہوا۔ [1]

حضرت عمر چھپ کر تلاوتِ نبوی سنتے ہیں:

ایک دن حضور ﷺ مسجد الحرام میں نماز ادا کرتے ہوئے "سورۃ الحاقہ" کی تلاوت فرما رہے تھے۔ حضرت عمر چھپ کر سننے لگے۔ قرآن مجید کے صوتی و معنوی حسن نے ان کے دل کو موہ لیا، دل میں کہنے لگے: "یہ تو واقعی شاعر ہیں۔"

اتنے میں حضور اکرم ﷺ نے آیت تلاوت کی:

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ. (یہ کسی شاعر کا کلام نہیں، تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔)

حضرت عمر حیران ہوئے کہ میرے دل کی بات انہیں کیسے پتا چل گئی۔ سوچنے لگے: "یہ تو جادوگر ہیں۔"

اتنے میں حضور اکرم ﷺ نے اگلی آیت تلاوت کی:

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ. (یہ کسی جادوگر کا کلام نہیں، تم بہت کم نصیحت پکڑتے ہو۔)

حضرت عمر کے دل میں اسلام کی صداقت کا بیج اسی دن پڑ گیا تھا۔ [2]

جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو قریش میں بڑی بے چینی پھیل گئی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح اسلام کو یک دم حرفِ غلط کی طرح مٹا دیں۔ اِدھر جمعرات کی شب رسول اللہ ﷺ اللہ سے یہ دعا کر رہے تھے:

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۳۸۶۶، کتاب المناقب، باب اسلام عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

[2] مسند احمد، ح: ۱۰۷؛ کنز العمال، ح: ۳۵۷۳۹

''یا اللہ! اسلام کو عَمرو بن ہشام یا عمر بن خطاب کے ذریعے قوت عطا فرما۔''

اُدھر قریش حضور ﷺ کو قتل کرنے پر آمادہ ہو رہے تھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو مسلمان ہوئے ابھی تین دن ہوئے تھے کہ ابوجہل کے بھڑکانے پر قریش کے جوشِ انتقام کو ٹھنڈا کرنے کا بیڑا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اٹھایا، انہوں نے تلوار سنبھالی اور نبی اکرم ﷺ کو قتل کرنے کے ارادے سے چل پڑے۔ راستے میں نُعیم بن عبداللہ النَّحام رضی اللہ عنہ مل گئے جو خفیہ طور پر مسلمان ہو چکے تھے، ان کے تیور دیکھ کر پوچھا: ''عمر! کہاں کا ارادہ ہے؟''

بولے: ''محمد کے پیچھے جا رہا ہوں جو قریش کے دانش مندوں کو بے وقوف قرار دیتا ہے، ہمارے معبودوں کو برا کہتا ہے اور ہماری جمعیت کی مخالفت کرتا ہے۔''

حضرت نُعیم رضی اللہ عنہ نے کہا: ''عمر! بہت غلط کام کرنے جا رہے ہو۔ اگر محمد ﷺ کو قتل کرو گے تو بنو ہاشم اور بنو زُہرہ کے لوگ تمہیں کہاں چھوڑیں گے!''

مگر حضرت عمر اپنے ارادے پر اڑے رہے۔ معاملہ زیادہ سنگین ہوتا دیکھ کر نُعیم رضی اللہ عنہ نے ذہن بدلنے کے لیے ان کی غیرت پر چوٹ کی اور کہا: ''عمر! پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید مسلمان ہو چکے ہیں۔''[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بہن کے دروازے پر پہنچے تو اندر سے قرآنِ مجید پڑھنے پڑھانے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ حضرت خبّاب رضی اللہ عنہ تھے جو گھر والوں کو قرآنِ مجید پڑھا رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زور سے دروازے پر دستک دی۔

بہن نے پوچھا: ''کون؟'' جواب دیا: ''عمر۔''

یہ سنتے ہی سب گھبرا گئے۔ حضرت خبّاب رضی اللہ عنہ کو جلدی سے ایک کوٹھری میں چھپا دیا۔ پھر فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا نے دروازہ کھولا۔ عمر نے اندر داخل ہوتے ہی بہن اور بہنوئی سے پوچھا: ''تم لوگ کیا پڑھ رہے تھے؟''

دونوں بولے: ''ہم تو آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔''

عمر نے گرج کر کہا: ''مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ بے دین ہو چکے ہو۔''

سعید بن زید رضی اللہ عنہ بولے: ''عمر! بتاؤ اگر حق تمہارے دین کی بجائے دوسرے دین میں ملے تو کیا کریں؟''

یہ سنتے ہی عمر حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ پر پل پڑے، انہیں نیچے گرا کر بری طرح مارا، ان کی بہن فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا نے انہیں اپنے شوہر سے ہٹانے کی کوشش کی تو انہیں اتنے زور کا طمانچہ مارا کہ ان کا منہ خون سے بھر گیا۔

---

[1] عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس سے پہلے بہن اور بہنوئی کے اسلام قبول کرنے کا علم نہیں تھا مگر یہ بات درست نہیں؛ کیوں کہ ان کے بہنوئی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ خود فرماتے تھے کہ عمر رضی اللہ عنہ اسلام قبول کرنے سے پہلے مجھے اور میری بہن کو اسلام لانے کی وجہ سے زنجیروں سے باندھ دیا کرتے تھے۔

(صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب اسلام سعید بن زید رضی اللہ عنہ؛ التاریخ الاوسط للبخاری: ۱/۱۱۲، ط دار الوعی)

پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے واقعے میں یہ مطلب لینا غلط ہے کہ انہیں بہن اور بہنوئی کے اسلام لانے کا علم اسی وقت ہوا تھا۔ درحقیقت انہیں یہ بات تو پہلے سے پتا تھی مگر اس وقت غصے کی حالت میں جب اس کا طعنہ سنا تو پہلے اسی مسئلے کو نمٹانے پر تل گئے اور وقتی طور پر وہ خیال ذہن سے نکل گیا جس کے لیے تلوار لے کر نکلے تھے۔

فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا روتے ہوئے بولیں: ''خطاب کے بیٹے! تم جو جی چاہے کرلو مگر میں تو اسلام لا چکی ہوں، گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں گواہی دیتی ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں۔''

بہن کے یہ جملے سن کر اور اسے لہولہان دیکھ کر حضرت عمر کا دل پسیجنے لگا۔ غصہ اُتر گیا اور وہ وہیں چارپائی پر ڈھے کر پوچھنے لگے: ''لاؤ، دکھاؤ تم کیا پڑھ رہے تھے؟''

بہن نے کہا: ''تم ناپاک ہو، جبکہ اس کتاب کو صرف پاک صاف لوگ ہاتھ لگا سکتے ہیں، پہلے غسل کرو۔''

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے غسل کیا تو جسم کی کثافت کے ساتھ دل کا میل کچیل بھی بہہ گیا۔ اب بہن نے وحی کے اوراق سامنے لا کر رکھے۔ یہ ''سورۂ طٰہٰ'' کی آیات تھیں جو انہی دنوں نازل ہوئی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آیات پڑھتے گئے اور دل میں ایمان کی روشنی اترتی گئی۔ آخر بے تاب ہو کر بولے: ''مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے چلو۔''[1]

اُن کی آواز سن کر حضرت خبّاب رضی اللہ عنہ جو اب تک کوٹھری میں چھپے تھے، باہر نکل آئے اور بولے:

---

[1] **حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کی توقیت کی بحث:**

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مشرف بہ اسلام ہونے کے فقط تین دن بعد اسلام قبول کیا تھا۔ (دلائل النبوۃ لابی نعیم، ص ۲۴۱)

اس پر بھی اتفاق ہے کہ اسلام کی تقویت کا یہ سامان ہجرتِ حبشہ اولیٰ اور قریش کے وفد کی حبشہ سے ناکام واپسی کے بعد ہوا تھا۔ درج ذیل عبارات دیکھیے:

کان اسلام عمر بعد خروج من خرج من اصحاب رسول اللہ ﷺ الی الحبشۃ. (سیرت ابن اسحٰق: ۱/ ۱۸۱؛ سیرت ابن ہشام: ۱/۳۴۲؛ سبل الھدیٰ والرشاد: ۲/ ۳۷۰)

اس وقت تک چالیس سے کچھ زیادہ لوگ مسلمان ہوئے تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۳/ ۲۶۹) جن میں سے گیارہ مرد اور چار خواتین ہجرت کر چکے تھے۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۳/ ۱۶۵) حاصلِ کلام یہ ہوا کہ یہ ہجرتِ حبشہ اولیٰ کے بعد کا واقعہ ہے۔ یہ بھی طے ہے کہ حبشہ کی ہجرتِ اولیٰ رجب ۵ نبوی میں ہوئی تھی۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۳/ ۱۶۵)

اس کے کتنے دنوں بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے؟ ابن الجوزی نے اسے ۶ نبوی کا واقعہ بتایا ہے۔ (المنتظم: ۲/ ۳۶۸) علامہ صالحی الشامی نے مزید وضاحت کی ہے کہ یہ ذوالحجہ ۶ نبوی کا واقعہ ہے، اور حبشہ کی ہجرتِ اولیٰ اور ہجرتِ ثانیہ کے درمیانی دور کا واقعہ ہے۔ (سبل الھدیٰ والرشاد: ۲/ ۳۷۰)

اگر اس توقیت کو اپنے ظاہری مطلب پر لیا جائے تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ حضرت عمر کے مسلمان ہونے کا واقعہ ہجرتِ حبشہ (رجب ۵ نبوی) سے ڈیڑھ سال بعد کا ہے۔ مگر واقعات کی رفتار کو دیکھا جائے تو ایسا نہیں لگتا کہ ہجرتِ حبشہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے مابین اتنا فاصلہ ہوگا؛ کیوں کہ خود ہجرتِ حبشہ اولیٰ اور ثانیہ کے مابین زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال کا فاصلہ ہے۔ دراصل ان حضرات نے یہ توقیت سنینِ نبوت کے حقیقی شمار کے اعتبار سے کی ہے جس میں ہر سال ماہ بعثت سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتا ہے، یعنی ایک قول کے مطابق ربیع الاول تا ربیع الاول۔ اور دوسرے قول کے مطابق رمضان تا رمضان۔ مگر مؤرخین نے عموماً سالہائے نبوت کو بھی محرم تا محرم ہی شمار کیا ہے۔ اگرچہ کسی نے کہیں کہیں اس کے خلاف اصل توقیت کا حساب بھی لگایا ہے جسے سالہائے نبوت کی عام تقویم سے جوڑا جائے تو حیرانی ہوتی ہے۔ یہاں راویوں نے جس ذوالحجہ کا ذکر کیا ہے وہ اصل توقیت کے یعنی رمضان تا رمضان کے حساب سے نبوت کے چھٹے سال کا چوتھا مہینہ تھا جبکہ عام توقیت کے اعتبار سے وہ ۵ نبوی کا ذوالحجہ ہے۔ پس رجب ۵ نبوی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے مابین فقط پانچ ماہ گزرے تھے۔

اب واقعات کی ترتیب یہ بنتی ہے کہ رجب ۵ نبوی میں ہجرتِ حبشہ اولیٰ ہوئی، جس پر حضرت عمر رنجیدہ ہوئے۔ انہی دنوں وہ چھپ چھپ کر تلاوتِ نبوی سننے لگے۔ آخر کار ذوالحجہ ۵ نبوی میں وہ مشرف بہ اسلام ہوگئے اور مسلمانوں پر فرداً فرداً مظالم کے سلسلے میں کمی آگئی۔ غالباً اس قسم کی اطلاعات متغیر شکل میں حبشہ پہنچیں اور وہ حضرات ۶ نبوی کے درمیان واپس آگئے۔ مشرکین تلملا کر بنوہاشم پر دباؤ اور باقی مسلمانوں پر اجتماعی مظالم کی طرف متوجہ ہوئے، جس کے باعث ایک بڑی تعداد ہجرتِ حبشہ ثانیہ میں شامل ہوگئی۔ اس کے بعد شعب ابی طالب کا محاصرہ ہوا جو ایک قول کے مطابق محرم ۷ نبوی میں اور دوسرے قول کے مطابق محرم ۸ نبوی میں شروع ہوا۔

اندازہ یہ ہے کہ ہجرتِ حبشہ ثانیہ شعب ابی طالب کی محصوری سے کچھ مدت پہلے ہوئی تھی اور اِکا دُکا لوگوں کے جانے کا سلسلہ شعب ابی طالب کے محاصرے کے بعد بھی جاری رہا۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہجرتِ حبشہ کی کوشش کو ابن ہشام نے شعب ابی طالب کے محاصرے کے دوران ذکر کیا ہے۔

''عمر! مبارک ہو، جمعرات کی شب رسول اللہ ﷺ نے دعا مانگی تھی کہ الٰہی! عمر بن خطاب یا عَمرو بن ہشام کے ذریعے اسلام کو عزت دے۔ لگتا ہے وہ دعا تمہارے حق میں قبول ہوگئی ہے۔''[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سیدھے صفا پہاڑ کے دامن میں حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے مکان پر پہنچے جہاں نبی اکرم ﷺ لگ بھگ ان چالیس صحابہ کرام کے ساتھ جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت نہیں کی تھی، ساری دنیا میں اللہ کے دین کو زندہ کرنے کی فکر میں مشغول تھے۔ ان میں حضرت ابوبکر، حضرت علی اور حضرت حمزہ نمایاں تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک صحابی نے جھانک کر دیکھا اور بتایا کہ عمر تلوار سمیت کھڑے ہیں۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آنے دو۔ اگر نیک ارادہ ہوا تو بہتر۔ ورنہ ہم اسے اسی کی تلوار سے قتل کردیں گے۔''

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر میں داخل ہوئے تو رسول اللہ ﷺ اُن کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کھڑے ہوگئے اور انہیں جھنجھوڑ کر کہا: ''اے عمر! کیا تم اللہ کی طرف سے ذلت اور عذاب آنے سے پہلے باز نہیں آؤ گے؟''

پھر رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی: ''اے اللہ! یہ عمر بن خطاب ہے۔ الٰہی! اس کے ذریعے دین کو عزت دے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اب رہا نہ گیا، بولے: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔''

یہ سن کر سب مسلمانوں نے اتنی زور سے تکبیر کا نعرہ بلند کیا کہ مکہ کی ہر گلی میں آواز گونج گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام لاتے ہی حضور ﷺ سے عرض کیا: ''یارسول اللہ! اب کھلم کھلا اسلام کی تبلیغ کیجیے۔''[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اگلی صبح مسجد الحرام میں جا کر کفار کے سامنے اپنے اسلام کا برملا اعلان کیا۔ کفار ان پر جھپٹ پڑے۔ یہ اکیلے ان سے لڑتے رہے۔ دیر تک جھگڑا ہوتا رہا۔ آخر کفار مایوس ہوکر پیچھے ہٹ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کی خبر سے پورے مکہ میں کھلبلی مچ گئی۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ''عمر بن خطاب کا اسلام لانا اسلام کی فتح تھی۔ ہم ان کے اسلام لانے سے پہلے کعبے کے پاس آزادانہ نماز تک نہیں پڑھ سکتے تھے۔ جب وہ اسلام لائے تو انہوں نے قریش سے لڑائی کی اور کعبہ کے پاس نماز ادا کی۔ ان کے ساتھ ہم نے بھی نماز ادا کی۔''[3]

ہجرتِ حبشہ اولیٰ سے واپسی (وسطِ ۶ نبوی):

انہی دنوں حبشہ کے مہاجرین کو خبر ملی کہ قریش نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کو ستانے سے باز آگئے ہیں۔ یہ بات اس طرح پھیلی کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے مسجد الحرام میں دورانِ نماز تلاوت کرتے ہوئے سورۃ النجم تلاوت فرمائی۔ یہ پہلی سورت تھی جس میں آیتِ سجدہ نازل ہوئی تھی۔ جب سورۂ مبارکہ کے آخر میں آیتِ سجدہ پر رسول اللہ ﷺ نے سجدہ کیا تو مسلمانوں کے علاوہ وہاں موجود مشرکین پر بھی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ سبھی سجدے میں گر گئے

---

① کنز العمال، ح: ۳۵۷۴۰ ؛ دلائل النبوۃ للبیہقی: ۲/۲۱۵ تا ۲۲۳ باب ذکر اسلام عمر رضی اللہ عنہ

② سیرۃ ابن ھشام، ص ۳۴۳ تا ۳۴۶ ؛ کنز العمال، ح: ۳۵۷۴۰ ؛ دلائل النبوۃ للبیہقی: ۲/۲۱۵ تا ۲۲۳ باب ذکر اسلام عمر رضی اللہ عنہ
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے قصے کی یہ روایت اگرچہ سنداً ضعیف ہے مگر تمام سیرت نگاروں نے اسے قبول کیا ہے، اسے مسترد کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

③ سیرۃ ابن ھشام: ۱/۳۴۲...... اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حبشہ کی پہلی ہجرت میں شامل نہ تھے۔

حتی کہ جنات نے بھی سجدہ کیا۔ واقعے کے راوی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فقط ایک مشرک اُمیّہ بن خَلف کھڑا رہا اور ایک مٹھی خاک اٹھا کر اپنی پیشانی اس پر رکھ دی۔ بعد میں وہ غزوۂ بدر میں قتل ہوا۔ ①

یہ خبر انتہائی مبالغے کے ساتھ اِدھر اُدھر پھیل گئی۔ چونکہ سورۂ نجم میں کفار کے معبودوں: لات، منات اور عُزّیٰ کا ذکر ہے، اس میں کچھ الفاظ بڑھا کر کفار نے افواہ اُڑا دی کہ نعوذ باللہ حضور ﷺ نے ان کے بتوں کی تعریف کی ہے۔ ②

اس کے برعکس کچھ لوگوں نے کفار کو سجدہ کرتے دیکھ کر یہ افواہ پھیلا دی کہ مکہ میں سب نے حضور ﷺ کے ساتھ سجدہ کیا ہے اور وہ سب مسلمان ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ سجدہ کرنے والوں نے بھی ایک خاص کیفیت میں سجدہ کر لیا تھا، جبکہ ابوجہل، نَضر بن الحارث، عُقبہ بن ابی مُعَیط اور عاص بن وائل جیسے بڑے اسلام دشمن (جو بعد میں حالتِ کفر ہی میں مرے) وہ ان سجدہ کرنے والوں میں شامل ہی نہ تھے۔ ③ اس لیے سب کے مسلمان ہونے کی بات بالکل غلط تھی۔ مگر یہ غلط خبر حبشہ جا پہنچی اور اسے سن کر مہاجرینِ حبشہ اپنے وطن واپس روانہ ہو گئے۔ ④

تاہم جب مکہ کے قریب پہنچے تو پتا چلا کہ قریش کی اسلام دشمنی برقرار ہے۔ اب مہاجرین متحیر رہ گئے۔ ان میں سے بعض تو وہیں سے حبشہ واپس ہو گئے۔ باقی کسی نہ کسی طرح وقتی طور پر قریش کے کسی آدمی کی پناہ اور ضمانت لے کر مکہ

---

① صحیح البخاری، ح: ۴۸۶۲، ۴۸۶۳، کتاب التفسیر ...... علامہ حلبی نے اس واقعہ کی تاریخ رمضان ۵ نبوی نقل کی ہے۔ (سیرت حلبیہ: ۱/۴۵۸) اندازاً یہ خبر ذوالقعدہ، ذوالحجہ تک حبشہ پہنچی ہوگی جس کے بعد قرینِ قیاس ہے کہ ۶ نبوی کے آغاز میں مہاجرینِ حبشہ کی واپسی ہوئی ہو۔

② بعض تفاسیر نیز تاریخ طبری اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں اس واقعے کی بعض روایات میں نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سورۃ النجم پڑھتے پڑھتے جب اس آیت پر پہنچے جس میں لات و منات کا ذکر ہے تو شیطان نے حضور ﷺ کی زبان پر یہ الفاظ جاری کر دیے: ''تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجیٰ (یہ بت قابلِ احترام ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے۔)'' اسے سن کر کفار بہت خوش ہوئے اور گمان کیا کہ حضور ﷺ ان کے ہم خیال ہو گئے ہیں، چنانچہ حضور ﷺ کے سجدہ تلاوت کے ساتھ انہوں نے بھی سجدہ کر لیا۔ (تاریخ الطبری: ۲/۳۴۰؛ طبقات ابن سعد: ۱/۲۰۵)

ایسی روایات سنداً اور متناً باطل ہیں۔ علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں:

''یہ کلام کسی شیطان جن یا شیطان انسان کا تھا جسے مشرکین نے سنا؛ کیونکہ ان کی عادت تھی کہ جب رسول اللہ ﷺ تلاوت کرتے تھے تو یہ واہی تباہی بکتے تھے جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ نے ان کی عادت بیان کی ہے: ''لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ'' (سورۂ حٰمٓ سجدہ: ۲۶) ''اس قرآن کو سنو ہی مت اور اس کے بیچ میں غل مچا دیا کرو۔'' یہ سورت سن کر بعض شیطانوں نے اس کے وزن پر یہ کلمات کہہ دیے، مشرکین سمجھے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ کہا ہے؛ کیونکہ یہ الفاظ آپ ﷺ کی تلاوت کے دوران کہے گئے تھے۔ رہا یہ امکان کہ رسولِ معصوم کی زبان پر یہ کلمات جاری ہوں تو ایسا ہونا محال ہے۔ پس تم بعض تفسیروں میں لکھی گئی اس بات سے دھوکا مت کھا جانا کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے۔ اگر بالفرض یہ صحیح مان لیا جائے تو حق و باطل مخلوط ہو جائے گا اور جائز ہوگا کہ صحیح نصوص کے بارے میں بھی شک کیا جانے لگے گا کہ شاید یہ بات کسی شیطان نے بڑھا دی ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو اس سے محفوظ رکھا ہے اور اللہ نے وحی کو شیاطین سے محفوظ رکھنے کی کیفیت کو یوں واضح فرمایا ہے: ''يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا'' (سورۃ الجن: ۲۷) (اللہ اس کے آگے پیچھے محافظ فرشتے بھیجتا ہے۔)'' (کشف المشکل من حدیث الصحیحین: ۱/۲۷۴، ۲۷۵)

متعدد محققین نے اس روایت کی سختی سے تردید کی ہے۔ (عمدۃ القاری: ۷/۱۰۰؛ مرقاۃ المفاتیح: ۲/۸۰۹) شیخ ناصر الدین البانی مرحوم نے اس پر ایک مستقل رسالہ ''نصب المناجیق لنسف قصۃ الغرانیق'' لکھا ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ اس روایت کی کوئی سند صحیح نہیں۔ رسالہ قابلِ مطالعہ ہے۔

③ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے موقع پر موجود مشرکین میں سے اُمیہ بن خلف کی سجدے سے ہچکچاہٹ اور اس کے بُرے انجام کو خاص طور پر بیان کیا ہے جس کا مطلب ہے کہ باقی مشرکین جنہوں نے سجدہ کیا تھا، انہیں بعد میں قبولِ اسلام اور حسنِ خاتمہ کی توفیق ہو گئی تھی۔ (فتح الباری: ۲/۵۵۴) اور ابوجہل، عقبہ بن ابی معیط اور عاص بن وائل جو کافر ہی مرے تھے، غالباً اس موقع پر موجود نہیں تھے۔

④ یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے مشرکین وقتی طور پر گھبرا گئے تھے اور مسلمانوں کی اذیتوں میں وقتی طور پر کمی کی آ گئی تھی۔ پس یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس قدرے سازگار صورتحال کی اطلاعات نے بھی مہاجرین کو واپسی پر آمادہ کیا ہوگا۔

میں داخل ہوگئے، مثلاً ابوسلمہ رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے جناب ابوطالب کی پناہ حاصل کر لی۔ عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے ولید بن مُغیرہ کی پناہ لے لی اور اس طرح عارضی طور پر قریش کی دارو گیر سے بچ گئے۔ ①

ایک بار پھر مظالم کا سامنا:

وہ مسلمان جنہیں کسی کی پناہ حاصل نہ تھی، ایک بار پھر ظلم و تشدد کا نشانہ بننے لگے۔ یہ دیکھ کر ایک دن حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی غیرت کو جوش آیا اور انہوں نے ولید کو کہہ دیا کہ اب مجھے تمہاری سرپرستی اور حفاظت کی ضرورت نہیں۔ مشرکین کو تو ایسے ہی وقت کا انتظار تھا، چنانچہ ایک موقع پر کسی مشرک نے انہیں ایسا مارا کہ اُن کی ایک آنکھ بری طرح دکھ گئی۔ ولید نے طعنے کے طور پر کہا: ''پہلے تمہاری آنکھ محفوظ تھی، تم ایک مضبوط پناہ میں تھے۔''

انہوں نے بے ساختہ کہا: ''اللہ کی قسم! میری دوسری آنکھ بھی ایسی آزمائش کے لیے تیار ہے۔'' ②

ہجرتِ حبشہ ثانیہ (اواخرِ ٦ نبوی):

مسلمانوں کے لیے اب زندگی پہلے سے زیادہ کٹھن تھی۔ خصوصاً نجاشی کے پاس امن و سکون کے دن گزارنے کے بعد قریش کا ظلم اور جبر و تشدد برداشت کرنا مشکل تھا۔ آخر مسلمانوں نے ایک بار پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حبشہ جانے کی اجازت چاہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشی سے اجازت عطا فرما دی۔

سابق مہاجرین کے ساتھ اور بھی بہت سے مسلمان اس قافلے میں شامل ہوگئے اور مہاجرین کی تعداد ٨٨ مرد اور ١٩ خواتین تک پہنچ گئی جن میں ابوعُبیدہ بن جرّاح، عبداللہ بن مسعود، جعفر بن ابی طالب، مِقداد بن اسود، شُرَحْبِیل بن عبداللہ (شُرَحْبِیل بن حَسَنَہ)، سکران بن عَمرو اور ان کی اہلیہ سَودَہ بنت زَمعہ رضی اللہ عنہم اجمعین نمایاں تھے۔ اُمّ حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا بھی اپنے شوہر عبیداللہ بن جحش سمیت قافلے میں تھیں۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر مقرر کیا گیا۔ ③

تاہم حبشہ کی ہجرتِ اولیٰ میں شامل چند ہستیاں مثلاً: حضرت رُقَیّہ رضی اللہ عنہا، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان بن مَظعُون رضی اللہ عنہ وغیرہ اس بار قافلے میں شامل نہ ہوئیں بلکہ مکہ میں کفار کے مظالم کا سامنا کرتے رہیں۔ ④

---

① سیرۃ ابن ھشام: ١/٣٦٩ ......

② سیرۃ ابن ھشام: ١/٣٧٠، ٣٧١ ③ البدایة والنھایة: ٣/١٦٩

ان مہاجرین میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کا نام نہیں لیا جاتا بلکہ انہیں ہجرتِ حبشہ اولیٰ کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اتنی بات صحیح سند سے منقول ہے کہ یہ سب اسی قافلے میں تھے جس میں ٨٠ کے لگ بھگ افراد تھے اور جس کے امیر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ تھے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

''بعثنا رسول اللّٰہ الی النجاشی ونحن نحوٌ من ثمانین رجلا، فیھم عبداللّٰہ بن مسعود، وجعفر..... الخ (مسند احمد، ح: ٤٤٠٠)

اس کے بعد حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی نجاشی کے دربار میں تقریر منقول ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت بھی قابلِ غور ہے جس میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر سے واقعہ شروع کیا گیا ہے اور قریشی وفد کی ناکامی کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے: ''فاقمنا عندہ بخیر جار بخیر دار۔'' اس کے بعد نجاشی کے دشمن کے خلاف مسلمانوں کی تیاری کا ذکر کرتے ہوئے ام سلمہ رضی اللہ عنہا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی جرأت کا واقعہ سناتی ہیں۔ (مسند احمد، ح: ٢٢٤٩٨، ط الرسالة باسناد حسن)

④ الاستیعاب، الاصابہ، اسد الغابہ اور معرفة الصحابہ میں ان حضرات کے حالات ملاحظہ کرنے، نیز ان کی روایاتِ حدیث پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ دوبارہ حبشہ نہ گئے اور چند سال بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر مکہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ جبکہ حبشہ کے مہاجرین ٧ ہجری میں وہیں سے مدینہ آگئے۔

قریش کی سفارت نجاشی کے دربار میں (اوائل ۷ نبوی):

جب قریشِ مکہ کو معلوم ہوا کہ حبشہ ہجرت کرنے والے مسلمان امن وامان سے رہنے لگے ہیں تو انہیں سخت غصہ آیا۔ انہوں نے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کو سفیر بنا کر شاہِ حبشہ نجاشی کے پاس یہ مطالبہ دے کر بھیج دیا کہ یہ لوگ بے دین اور فسادی ہیں، انہیں اپنے ملک میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دیں بلکہ ہمارے حوالے کر دیں۔

نجاشی ایک معاملہ فہم اور اعتدال پسند آدمی تھا، اس نے یک طرفہ شکایت سن کر کوئی فیصلہ نہ کیا بلکہ مسلمانوں کو اپنے دربار میں بلوا کر اس الزام کے بارے میں صفائی طلب کی۔ تب حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اس اجنبی دیس میں اسلام کا تعارف نہایت جامع اور مؤثر انداز میں کرایا اور فرمایا:

''اے بادشاہ! ہم پہلے جاہل تھے، بتوں کے پجاری تھے، مردار کھاتے تھے، فحاشی، بداخلاقی اور رشتہ داروں سے بدسلوکی کے عادی تھے، ہم میں سے جو طاقتور ہوتا وہ کمزور کو ہڑپ کر جاتا۔ تب اللہ نے ہمارے درمیان ایک رسول بھیجا جو ہمارے خاندان سے ہے، ہم ان کے نسب، سچائی، امانت، شرافت اور پاک دامنی سے خوب واقف ہیں۔ انہوں نے ہمیں دعوت دی کہ اللہ کو یکتا مانیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ عزیزوں، رشتہ داروں سے اچھا برتاؤ کریں، پڑوسیوں سے بہتر سلوک کریں۔ انہوں نے ہمیں حرام کاموں سے منع کیا، خون بہانے، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے سے ہمیں روکا۔ جب ہم نے یہ سنا تو ان پر ایمان لے آئے۔ ان باتوں پر عمل کرنے کی وجہ سے ہماری قوم ہمارے پیچھے پڑ گئی اور ہم پر ظلم کے پہاڑ توڑے۔ ہم مجبور ہو کر آپ کے ملک میں اس اُمید پر آئے کہ یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔''

نجاشی نے یہ سن کر کہا: ''جو کچھ وہ نبی لائے ہیں، اس میں سے تمہیں کچھ یاد ہے تو سناؤ''

تب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے ''سورۂ مریم'' کی ابتدائی آیات پڑھ کر سنائیں۔ نجاشی اور اس کے دربار میں موجود پادری یہ سن کر اتنا روئے کہ ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔

نجاشی بولا: ''یہ کلام اور موسیٰ علیہ السلام کا لایا ہوا کلام ایک ہی محراب سے نکلے ہیں۔''

پھر اس نے قریشی سفیروں سے کہا: ''تم چلے جاؤ، میں انہیں ہرگز تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔''

قریشی سفیر یہ سن کر بڑے جھلائے۔ اگلے دن انہوں نے دربار میں ایک نئی شکایت لگائی اور کہا:

''یہ لوگ عیسیٰ بن مریم کے بارے میں بڑی بے ادبی کی باتیں کرتے ہیں۔ انہیں بندہ مانتے ہیں۔''

قریشی سفیروں کا خیال تھا کہ نجاشی عیسائی ہونے کے ناتے یہ سن کر مشتعل ہو جائے گا اور مسلمانوں کو قتل کیے بغیر نہیں چھوڑے گا، مگر نجاشی نے اس بار بھی تحقیق کیے بغیر کوئی قدم نہ اُٹھایا اور مسلمانوں کو دوبارہ طلب کر کے پوچھا: ''تم لوگ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وہی جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے،

اس کی طرف سے بخشی ہوئی روح کے حامل تھے، وہ اللہ کا ایسا حکم تھے جسے اللہ نے کنواری حضرت مریم کے ذریعے وجود بخشا۔"
نجاشی نے یہ سن کر ایک تنکا اُٹھایا اور بولا: "حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے بارے میں اس سے زیادہ اس تنکے کے برابر بھی کچھ نہیں کہا۔" غرض یہ قریشی وفد ناکام لوٹ گیا اور مہاجرین حبشہ میں امن سے زندگی گزارتے رہے۔[1]

نجاشی کی مدد کے لیے مسلمانوں کی فکر مندی اور مستعدی:

کچھ دنوں بعد نجاشی کے خلاف ایک دشمن اٹھ کھڑا ہوا۔ نجاشی کو اس کی سرکوبی کے لیے دریائے نیل کے پار جانا پڑا۔ صحابہ نے ضروری سمجھا کہ اس موقع پر احسان مندی کا ثبوت پیش کیا جائے۔ انہوں نے طے کیا کہ ہم میں سے ایک شخص دریا کے پار جا کر جنگ کی صورتحال معلوم کرے اور ضرورت ہو تو سب جنگ میں شرکت کے لیے پہنچ جائیں۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے جو سب سے کم عمر تھے، اس خدمت کے لیے خود کو پیش کیا۔ وہ پانی سے بھری ہوئی مشک کے سہارے دریائے نیل عبور کر کے رزمگاہ میں پہنچ گئے۔ اِدھر صحابہ اور صحابیات نجاشی کی فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ جلد ہی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اطلاع بھیجی کہ اللہ نے فتح عنایت کی ہے۔ اس پر صحابہ بے حد مسرور ہوئے۔[2]

حبشہ کے مہاجرین کی واپسی کے اوقات:

حبشہ کے ان مہاجرین میں سے بہت سے حضرات مثلاً: زبیر بن عوام،[3] ابوعبیدہ بن الجراح،[4] ابوسلمہ، اُمّ سلمہ،[5] سکران بن عمرو اور سودہ بنت زمعہ[6] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرتِ مدینہ سے قبل مکہ واپس آ گئے تھے۔

---

① مسند احمد، ح: ۲۲۴۹۸ باسناد حسن، ط الرسالۃ ؛ سیرۃ ابن ہشام: ۱/۳۳۴ تا ۳۳۸ ② مسند احمد، ح: ۲۲۴۹۸

③ ھاجر الزبیر الیٰ ارض الحبشۃ الھجرتین جمیعا. (طبقات ابن سعد: ۳/۷۵) لما ھاجر الزبیر من مکۃ الی المدینۃ نزل علیٰ المنذر بن محمد. (طبقات ابن سعد: ۳/۷۵)

غالباً حضرت زبیر رضی اللہ عنہ مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے والی اس پہلی کھیپ میں تھے جو ۱۲ نبوی میں روانہ ہوئی تھی جس میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت تک حضرت زبیر رضی اللہ عنہ مدینہ میں کاروبار شروع کر چکے تھے اور شام کا تجارتی چکر لگا کر واپس آ رہے تھے کہ اسی دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شہر کے مضافات میں ملاقات ہوگئی۔ (صحیح البخاری، ح: ۳۹۰۶، کتاب المناقب، باب ھجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

④ ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ ہجرتِ حبشہ ثانیہ میں شامل تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۳/۴۰۹) دیگر صحابہ کے ساتھ ہجرتِ مدینہ بھی کی۔ (طبقات ابن سعد: ۳/۴۱۰) اور غزوہ بدر میں شرکت تو مشہور ہے ہی۔ (الاستیعاب: ۴/۱۷۱۰) اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کچھ مدت حبشہ میں رہ کر مکہ آ گئے تھے۔

⑤ ام سلمہ رضی اللہ عنہا اپنی واپسی کا واقعہ خود نقل کرتی ہیں: فکنا عندہ فی خیر منزل حتیٰ قلعنا علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو بمکۃ. (مسند احمد، ح: ۲۲۴۹۸) یعنی ہم نجاشی کے پاس آرام سے رہ رہے تھے یہاں تک کہ ہم مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آ گئے۔

⑥ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا اپنے شوہر سکران بن عمرو رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرتِ مدینہ سے پہلے واپس مکہ آ گئی تھیں۔ یہاں ان کے شوہر کی وفات ہوگئی۔ (الاستیعاب: ۲/۶۸۵، ۶۸۷) جس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان ۱۰ نبوی میں ان سے نکاح کر لیا۔

اہم تنبیہ: محمد ابن اسحٰق نے حبشہ سے مکہ لوٹنے والے مہاجرین کی تعداد ۳۳ بتائی ہے اور ان کی پوری فہرست دی ہے۔ سرسری نگاہ میں ایسا گمان ہوتا ہے کہ جیسے یہ حبشہ کی ہجرتِ اولیٰ سے لوٹنے والوں کی فہرست ہے مگر ایسا ممکن ہی نہیں؛ کیوں کہ ہجرتِ اولیٰ میں زیادہ سے زیادہ ۱۵، ۱۶ افراد شامل تھے۔ اس لیے درحقیقت یہ ہجرتِ اولیٰ اور ہجرتِ ثانیہ سے مکہ لوٹنے والوں کی مخلوط فہرست ہے۔ اس میں وہ حضرات بھی ہیں جو فقط پہلی ہجرت میں شامل تھے، وہ بھی ہیں جو فقط ہجرتِ ثانیہ میں شریک تھے جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (جنہیں بعض حضرات نے دونوں ہجرتوں میں اور بعض نے فقط پہلی ہجرت میں شریک سمجھنے کی غلطی کی ہے۔) اور وہ بھی ہیں جنہوں نے ہجرتِ اولیٰ اور ثانیہ دونوں میں شرکت کی جیسا کہ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور ابوسلمہ رضی اللہ عنہ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے ہی مہاجرین حبشہ کی بڑی تعداد مسلمانوں کی ہجرتِ مدینہ کی اطلاع ملنے پر حبشہ سے سیدھا مدینہ چلی گئی تھی۔ رجع عامۃ من کان ھاجر بارض الحبشۃ الی المدینۃ وتجھز ابوبکر الی المدینۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: علیٰ رسلک. (صحیح البخاری، ح: ۳۹۰۵)

بہت سے حضرات ہجرتِ مدینہ تک حبشہ میں رہے اور جب انہیں مدینہ میں ایک محفوظ مرکزِ اسلام بن جانے کی اطلاع ملی تو فوراً وہاں پہنچ گئے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔[1]

بہت سے حضرات کم و بیش دس سال وہیں رہے۔ وہاں ان کی اولاد بھی پلتی بڑھتی رہی۔ ان میں سے اِکا دُکا مدینہ آتے گئے جیسا کہ اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا ۶ھ میں شُرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ تشریف لے آئی تھیں۔[2] آخر میں عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ، ان کی اہلیہ اسماء بنت عُمیس رضی اللہ عنہا اور باقی مہاجرین غزوۂ خیبر کے موقع پر مدینہ منورہ آگئے۔[3]

ہجرتِ حبشہ کے اثرات:

اگرچہ حبشہ میں مسلمانوں کی آمد بظاہر چند پناہ گزینوں کی ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف اضطراری نقل مکانی نظر آتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس طرح اپنے ابتدائی دور میں ہی اسلام ایشیا سے نکل کر افریقہ پہنچ گیا تھا اور وہ بھی اس خاموشی سے کہ دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کے لیے اس نقل و حرکت کے دیرینہ اثرات کا اندازہ لگانا ممکن نہ ہو سکا۔

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور متعدد صحابہ کرام برسوں تک افریقہ کے اس غیر متمدن گوشے میں پڑے رہے۔ انہوں نے اتنا طویل عرصہ یہاں مکمل خاموشی سے گزار دیا۔ یہ مٹھی بھر مسلمان یقیناً حبشہ میں اسلام کی تبلیغ کے لیے نہیں بلکہ پناہ کے لیے آئے تھے۔ شاید اسی لیے ذخیرۂ حدیث و سیرت میں یہاں اُن کی کسی تبلیغی و دعوتی سرگرمی کا ذکر نہیں ملتا۔ ممکن ہے کہ انہوں نے خفیہ اور فرداً فرداً کام کیا ہو مگر حبشہ سے کبھی افریقی نو مسلموں کے قافلے مکہ یا مدینہ آتے نہیں دیکھے گئے، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے پیشِ نظر سرزمینِ عرب کے برخلاف یہاں کے خاص حالات میں حکمت کا تقاضا یہی تھا کہ یہاں مسلمانوں کو مہیا امن و امان کو خطرے میں نہ پڑنے دیا جائے اور مقامی حکمرانوں اور پادریوں کو کسی غلط فہمی یا اشتعال میں مبتلا نہ ہونے دیا جائے بلکہ جہاں تک ممکن ہو ایسی ہمدرد حکومت کو اپنی وفاداری کا عملی ثبوت بھی مہیا کیا جائے۔

حبشہ کے مہاجرین کی یہ امن پسندانہ پالیسی بے اثر نہیں رہی۔ اس کے اثرات وہاں ضرور پڑے؛ کیوں کہ آخر خود حاکمِ حبشہ اسلام کی تعلیمات اور مسلمانوں کے اخلاق و کردار میں اُن کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کا عکس دیکھ کر

---

[1] عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ۲ ہجری میں غزوہ بدر سے کچھ دنوں پہلے مدینہ پہنچے تھے جس کا ذکر کتب حدیث میں اس طرح ہے:
لم تعجل عبد اللہ بن مسعود حتی ادرک بدرا.“ (مسند احمد، ح: ۴۴۰۰؛ مجمع الزوائد، ح: ۹۸۴۱)
ایک اور روایت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حبشہ سے مدینہ اس وقت لوٹے تھے جب نماز میں بات چیت کی ممانعت ہو گئی تھی۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا اور سلام کیا مگر جواب نہ ملا تو پریشان ہو گئے۔ (سنن نسائی، ح: ۱۲۲۱، قال الالبانی: حسن صحیح)
راجح قول کے مطابق یہ ممانعت مدینہ میں ہوئی تھی؛ کیوں کہ نماز کی فرضیت ہجرت حبشہ اولیٰ اور ثانیہ کے تین چار سال بعد واقعہ معراج میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد نماز کے احکام کو تدریجاً ترقی ملتی گئی جس کی تکمیل مدینہ منورہ میں ہوئی۔ پس عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ واپسی ہجرت حبشہ ثانیہ سے تھی اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں نہیں مدینہ میں تھے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں: کنا نسلم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذ کنا بمکۃ قبل ان نأتی ارض الحبشۃ. (مسند احمد، ح: ۳۵۷۵)

[2] سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۲۰، ۲۲۱

[3] صحیح البخاری، ح: ۴۲۳۰، باب غزوۃ خیبر

نہایت متاثر ہوا اور اسلام کا حلقہ بگوش بنا۔ اگرچہ قرنِ اوّل میں افریقہ میں اسلام اس طرح نہیں پھیلا جیسے ایشیا میں۔ مگر اس براعظم کو اسلام کی گھٹی حضرت عثمان غنی، حضرت جعفر بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن مسعود، سیدہ رُقیہ، سیدہ اُمّ سلمہ اور سیدہ اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہم جیسی کامل الایمان ہستیوں نے دی تھی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ براعظم آخر کار دنیا میں ایک بڑا اسلامی خطہ ثابت ہوا۔ آج بھی سب سے زیادہ مسلم ممالک افریقہ میں ہیں، اس لیے اہلِ مغرب افریقہ کو ''مسلم براعظم'' کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

ہجرتِ حبشہ کے اسباق:

ہجرتِ حبشہ پر گہری نظر ڈالنے سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ جب مسلمان کسمپرسی کے عالم میں ہوں اور اسلام دشمن طاقتوں نے ان کا گھیراؤ کر رکھا ہو تو ایسے میں کسی مناسب پناہ گاہ کو تلاش کر لینا چاہیے تا کہ اپنی زندگی، صلاحیت اور قوت کو آئندہ اہم میدانوں، مؤثر مواقع اور نتیجہ خیز مہمات میں استعمال کیا جا سکے۔ اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اگر مسلمانوں کو کسی غیر مسلم معاشرے میں امن وامان کے ساتھ عدل وانصاف کے سائے میں زندگی گزارنے کا موقع مل رہا ہو تو انہیں وہاں ایسا ماحول پیدا کرنے سے احتراز کرنا چاہیے جس سے خواہ مخواہ اُن کے خلاف اشتعال پھیلے یا غلط فہمیاں فروغ پائیں۔ اپنے وسائل، ملکی حالات اور عالمی ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے پوری احتیاط، حکمت اور تدبیر کے ساتھ دعوت کا کام تدریجی انداز میں آگے بڑھانا چاہیے اور براہِ راست غیر مسلموں کو دعوتِ اسلام دینے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔

☆☆☆

سماجی مقاطعہ (محرم ۸ نبوی)

حبشہ میں مسلمانوں کو ایک محفوظ ٹھکانا میسر آنے، نیز حضرت حمزہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما جیسے بہادر افراد کے اسلام لانے سے قریش وقتی طور پر گھبرا گئے تھے، مگر جلد ہی اُن کے جذبۂ انتقام نے پھر انگڑائی لی اور انہوں نے فیصلہ کر لیا اب اسلام کو مٹا دیں۔ انہوں نے طے کیا کہ حضور ﷺ کو قتل کر کے ہی وہ اپنا ہدف حاصل کر سکتے ہیں۔

ابوطالب کو قریش کے ان ناپاک عزائم کی اطلاع ملی تو فوراً بنی ہاشم کے لوگوں کو جمع کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ جناب رسول اللہ ﷺ کو فوراً کسی محفوظ جگہ لے جائیں اور اردگرد پہرا دیں تا کہ کوئی شخص آپ ﷺ کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ قریش کو پہلے ہی یہ خطرہ تھا کہ ان کے ارادے کے راستے میں بنو ہاشم ہی سب سے بڑی رکاوٹ بن کر سامنے آئیں گے، چنانچہ اب انہوں نے طے کیا کہ بنو ہاشم سے سماجی ومعاشرتی تعلقات ختم کر دیے جائیں اور انہیں حضور اکرم ﷺ کی حمایت ترک کرنے میں مجبور کر دیا جائے۔ انہوں نے مل کر ایک معاہدہ تحریر کیا جس کا خلاصہ یہ تھا:

''بنو ہاشم سے نہ نکاح اور رشتوں کا کوئی معاملہ کیا جائے گا، نہ ہی ان سے خرید وفروخت کی جائے گی۔''

معاہدے کی توثیق کے لیے اسے کعبہ میں لٹکا دیا گیا۔① رسول اللہ ﷺ کی عمر کا یہ ۴۸واں سال تھا۔

شعب ابی طالب کی اذیت ناکیاں:

سن رسیدہ ابوطالب نے بنو ہاشم کے گھرانوں کے ساتھ مکہ کی اس پہاڑی گھاٹی میں ڈیرہ ڈال دیا جو ان کی خاندانی ملکیت تھی، اسے شعب بنی ہاشم کہا جاتا تھا۔② محصور ہونے والوں میں خواتین اور معصوم بچے بھی شامل تھے۔ ان میں سے جو اسلام لا چکے تھے، وہ دینی جذبے کے ساتھ اور جو ایمان نہیں لائے تھے وہ خاندانی غیرت کے تحت حضور ﷺ کا ساتھ دے رہے تھے۔ صرف ابولہب نے ساتھ نہ دے کر اپنی اسلام دشمنی کا ثبوت فراہم کیا اور بنو ہاشم سے الگ رہا۔ آپ ﷺ اپنی اہلیہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور بچوں کے ساتھ گھاٹی میں فروکش رہے۔ چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ یہاں آپ کے محافظ تھے۔③ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی یہیں تھے اور اسی گھاٹی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔④

بنو ہاشم کھانے پینے کا جتنا سامان لے جا سکتے تھے لے گئے مگر چند ہفتوں میں سب کچھ ختم ہو گیا اور فاقوں کی نوبت آگئی۔ معصوم بچے بھوک سے بلکتے تو ان کے رونے کی آوازیں دور دور تک سنائی دیتیں۔ قریش کا یہ سماجی مقاطعہ اتنا سخت تھا کہ بنو ہاشم کو مکہ کے بازاروں میں گزرنے تک سے منع کر دیا گیا تھا۔

اگر باہر سے کوئی سوداگر اناج لے کر آ رہا ہوتا تو قریش اس کی بھی تاک میں رہتے اور اس سے فوراً سب کچھ خرید کر اپنے گوداموں میں بھر لیتے تاکہ بنو ہاشم کو کچھ ملنے نہ پائے۔ اگر کوئی مسلمان یا بنو ہاشم کا کوئی ہمدرد گھاٹی کی طرف اناج یا غلہ لے کر جاتا ہوا نظر آتا تو قریش اسے بھی پکڑ کر سب کچھ چھین لیتے۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ کوئی شخص خفیہ طور پر کچھ خوراک پہنچا دینے میں کامیاب ہو جاتا جس سے محصور افراد کو زندگی کی رمق باقی رکھنے کے لیے کچھ لقمے میسر آ جاتے ورنہ اکثر جھاڑیوں کے پتے کھانے پڑتے۔ گرا پڑا خشک چمڑا چبانے کی نوبت بھی آتی رہتی تھی۔⑤

فاقہ کشی کا ایک منظر:

بنو ہاشم کے علاوہ دیگر بہت سے مسلمان بھی اس قید و بند میں شریک تھے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جو ہاشمی نہیں بلکہ بنو زہرہ (یعنی اولادِ عبد مناف) سے تھے، اسی گھاٹی میں بند ہو کر مصائب میں سب کے ساجھی رہے۔ خود فرماتے تھے:

''ایک دن پیشاب کرنے بیٹھا تو زمین میں سرسراہٹ محسوس ہوئی، دیکھا تو اونٹ کی خشک کھال کا ٹکڑا تھا۔ میں نے اسے دھویا، جلایا، پیسا اور پانی میں ملا کر پھانک لیا، اس طرح تین دن گزار لیے۔''⑥

① البدایة والنہایة: ۲۰۷/۴ تا ۲۱۶، ۲۳۶ تا ۲۳۹
محمد بن اسحٰق اور واقدی کی روایت کے مطابق یہ محرم ۷ نبوی کا واقعہ ہے۔ (طبقات ابن سعد: ۲۰۹/۱) جبکہ علامہ ابن الجوزیؒ نے اسے ۸ نبوی کے حالات کے تحت نقل کیا ہے۔ (المنتظم: ۳۸۸/۲)
② یہ اس کا قدیم نام تھا۔ بعد میں اسی کو شعبِ ابی طالب کہا جانے لگا۔ (سبل الهدیٰ والرشاد: ۳۸۲/۲)
③ سیرة ابن هشام: ۳۵۱/۱ تا ۳۵۴
④ قال الحاکم: ''وُلِد فی الشعب قبل الهجرة بثلاث سنین.'' (مستدرک حاکم، ح: ۶۲۷۷)
⑤ البدایة والنہایة: ۲۰۷/۴ تا ۲۱۶ ⑥ سیرة ابن اسحاق: ۱۹۳/۱، الروض الانف: ۲۱۶/۳، ۲۱۷

اس ایک واقعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ گھاٹی کے محصورین کی فاقہ کشی کا کیا عالم تھا!

فقط حج کے موسم میں جب کفار دشمنوں سے لڑنا حرام سمجھتے تھے، ان حضرات کو کچھ آزادی مل جاتی تھی۔ نبی اکرم ﷺ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر حاجیوں میں تبلیغ کے لیے نکل پڑتے مگر ابولہب پیچھے لگا رہتا اور آوازیں کستا۔ اس دوران بنو ہاشم کے سوا جو دیگر مسلمان خاندان تھے، وہ بھی اپنے گھروں میں ایک طرح سے محصور تھے۔ ①

روم و فارس کی جنگ اور قرآن کی پیش گوئی:

یہی زمانہ تھا جب (۸ نبوی میں) روم اور فارس کے مابین گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں فارس نے رومیوں کو فیصلہ کن شکست سے دوچار کیا۔ مشرکین جو مسلمانوں کو دبا کر پہلے ہی مغرور ہو رہے تھے، مزید اترانے لگے کیوں کہ عقیدے کے لحاظ سے وہ خود کو فارس کے مشرکین سے اور مسلمانوں کو رومی اہلِ کتاب سے قریب تر سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ تکبر میں آکر کہنے لگے کہ جس طرح ہمارے فارسی بھائیوں نے رومی اہلِ کتاب کو کچل ڈالا ہے، اسی طرح ہم تمہیں ختم کر دیں گے۔ مشرکین کی اس لن ترانی کے جواب میں سورۂ روم کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں خبر دی گئی کہ رومی شکست کھانے کے باوجود چند سالوں میں دوبارہ فتح یاب ہوں گے۔ ②

مشرکین نے مذاق اڑایا کہ ایسی زبردست شکست کے بعد رومی دوبارہ کیسے غالب آسکتے ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شرط لگالی کہ اگر پانچ سال کے اندر رومی فتح یاب نہ ہوئے تو تم جیتے ورنہ ہم۔ ہارنے والے پر جیتنے والے کو دینے کے لیے ہرجانہ بھی طے کر لیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس شرط کا پتا چلا تو قرآن مجید کے الفاظ ''بِضْعِ سِنِيْنَ'' کے پیشِ نظر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو شرط میں پانچ سال کی جگہ ''نو سال'' کی ترمیم کرانے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ سات سال بعد قرآن کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی اور رومیوں نے اہلِ فارس کو عبرت ناک شکست دے ڈالی۔ ③

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حبشہ کی طرف ہجرت اور راستے سے واپسی (۹ نبوی):

بنو ہاشم کے محصور ہونے کے بعد حالات سخت ترین ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ مسلمانوں کا اب دنیا میں کوئی سہارا نہیں ہے۔ ان حالات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے کوہِ استقامت بھی حبشہ کی طرف ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ ④

---

① رحمة للعالمین: ۱/ ۹۱ ② تفسیر ابن کثیر، سورة الروم، آیت: ۱ تا ۴

③ سنن الترمذی، ح: ۳۱۹۳، ابواب التفسیر ؛ دلائل النبوة للبیہقی: ۲/ ۳۳۲، ۳۳۳

فائدہ: اس قسم کی شرط لگانا جوے میں شمار ہوتا ہے مگر اس وقت جوے کی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ سات سال بعد غزوہ بدر کے موقع پر (۲ھ میں) روم نے فارس کو عبرت ناک شکست دی اور یوں قرآن کی پیش گوئی پوری ہوگئی۔ (شرح مشکل الآثار للطحاوی، ح: ۲۹۸۷، ۲۹۸۹)

فائدہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے حبشہ ہجرت کی اجازت شعب ابی طالب میں محصوری کے زمانے میں لی تھی اور انہی ایام میں کفار سے شرط لگائی اور پھر حضور ﷺ کے مشورے سے اس میں ترمیم کی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محصوری میں شریک نہ ہونے کے باوجود وہ حضور ﷺ سے برابر ملتے رہتے تھے۔

④ قال ابن اسحاق: وکان ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ حین ضاقت علیه مکة واصابه فیها الاذیٰ ورای من تظاهر قریش علیٰ رسول اللہ ﷺ واصحابه ما رأی استاذن رسول اللہ ﷺ فی الهجرة فاذن له فخرج ابوبکر رضی اللہ عنہ مهاجراً حتیٰ اذا سار من مکة یوماً او یومین لقیه ابن الدغنة. (سیرة ابن هشام: ۱/ ۳۷۲)

یہ واقعہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس طرح مروی ہے:

''جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے والدین کو دین پر عمل پیرا دیکھا۔ کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا کہ حضور ﷺ صبح وشام ہمارے ہاں تشریف نہ لاتے ہوں۔ جب مسلمان تکالیف میں مبتلا کیے گئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حبشہ ہجرت کا ارادہ کیا۔ وہ مکہ سے نکل کر حبشہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب برک غماد میں پہنچے (جو مکہ سے پانچ منازل سمندر کی سمت واقع ہے) تو انہیں قبیلہ قارہ کا سردار ابن دَغِنَہ ملا۔

ابن دَغِنَہ نے ان سے پوچھا: ''ابوبکر! کہاں کا ارادہ ہے؟''

انہوں نے فرمایا: ''مجھے میری قوم نے نکال دیا ہے۔ میں نے سوچا کہ زمین میں سفر کر کے اپنے رب کی عبادت کروں۔''

ابن دَغِنَہ نے کہا: ''ابوبکر! تم جیسا آدمی نہ نکل سکتا ہے، نہ نکالا جاسکتا ہے۔ تم مفلسوں کے لیے کماتے ہو، صلہ رحمی کرتے ہو، معاشرے کے نادار لوگوں کی کفالت کرتے ہو۔ مہمان کی خاطر مدارات کرتے ہو۔ سچائی کے کاموں میں مدد کرتے ہو۔ میں تمہیں پناہ دیتا ہوں۔ واپس چلو اور اپنے شہر میں اپنے رب کی عبادت کرو۔''

پس ابن دَغِنَہ روانہ ہوا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ (مکہ) آ گیا۔ وہاں ابن دَغِنَہ قریش کے سرداروں کے پاس گیا اور ان سے کہا: ''ابوبکر جیسا آدمی نہ نکل سکتا ہے، نہ نکالا جاسکتا ہے۔ کیا تم ایسے آدمی کو نکالتے ہو جو مفلسوں کے لیے کماتا ہے، صلہ رحمی کرتا ہے، معاشرے کے نادار لوگوں کی کفالت کرتا ہے۔ مہمان کی خاطر مدارات کرتا ہے۔ سچائی کے کاموں میں مدد کرتا ہے۔''[1]

قریش نے ابن دَغِنَہ کی پناہ کو مان لیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے امان قبول کی اور ابن دَغِنَہ سے کہا: ''ابوبکر سے کہو کہ اپنے رب کی عبادت گھر میں کریں۔ اسی میں نماز ادا کریں اور جو جی چاہے پڑھیں۔ لیکن اپنی تلاوت سے ہمیں تنگ نہ کریں۔ آواز بلند نہ کریں کیوں کہ ہمیں ڈر ہے کہ ہمارے بیوی بچے فتنے میں نہ پڑ جائیں۔''

ابن دَغِنَہ نے یہ باتیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہہ دیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کچھ عرصے تک ان شرائط پر قائم رہے۔ اپنے گھر ہی میں عبادت کرتے رہے۔ اپنی نماز میں بلند آواز سے قرأت نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی اپنے گھر کے سوا کہیں تلاوت کرتے تھے۔ پھر ایک دن ان کے جی میں آئی تو اپنے گھر کے باہر میدان میں ایک مسجد بنالی۔[2] اس میں نماز پڑھنے لگے۔ قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی۔

مشرکین کی عورتیں اور بچے ان کے پاس جمع ہو جاتے تھے۔ وہ ان کی قرأت کو پسند کرتے اور انہیں دیکھا

---

① غور فرمائیں کہ بالکل یہی الفاظ حضرتِ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پہلی وحی کے بعد رسول اللہ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمائے تھے۔ وہ احادیث نقل کرنے کا دور تو تھا نہیں کہ ابن دغنہ تک حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ پہنچ سکتے۔ یقیناً اس نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں عکسِ جمالِ مصطفیٰ ﷺ دیکھ کر ہی ایسا کہا تھا۔

② یہ اُمتِ محمدیہ میں تعمیر کی گئی پہلی مسجد تھی جو مسجدِ قبا اور مسجدِ نبوی سے بھی پانچ چھ سال قبل تعمیر ہوئی تھی۔

کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بہت رونے والے آدمی تھے۔ جب وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو اپنے آنسو نہ روک پاتے۔ قریشی زعماء اس سے گھبرائے اور ابن دغنہ کو بلوالیا۔ جب وہ ان کے پاس آیا تو بولے:

''ہم نے ابوبکر کو اس شرط پر پناہ دی تھی کہ وہ اپنے رب کی عبادت اپنے گھر میں کریں گے مگر وہ اس حد سے باہر نکل گئے۔ گھر کے باہر مسجد بنالی۔ نماز اور قراءت علانیہ شروع کردی۔ ہمیں ڈر ہے کہ اس طرح ہمارے بیوی بچے فتنے میں پڑ جائیں گے۔ تم ان کے پاس جاؤ، اگر وہ مان جائیں کہ اپنے رب کی عبادت اپنے گھر ہی میں کریں گے تو ٹھیک۔ اور اگر وہ اعلانیہ عبادت پر اصرار کریں تو انہیں کہو کہ وہ تمہاری پناہ لوٹا دیں۔ کیوں کہ ہمیں یہ پسند نہیں کہ تمہاری امان کی توہین کریں۔ ہم ابوبکر کی علانیہ عبادت کو باقی نہیں رہنے دیں گے۔''

ابن دغنہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا:

''تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کس شرط پر تم سے معاہدہ کیا تھا۔ اگر تم اس پر کاربند رہتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میری امان واپس کردو کہ میں نہیں چاہتا کہ عرب میں شہرت ہو کہ میں نے ایک شخص کو امان دی لیکن میری امان ضایع کردی گئی۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں تمہاری پناہ واپس کرتا ہوں اور اللہ کی امان پر راضی ہوں۔''[1]

شعب ابی طالب سے رہائی:

شعب ابی طالب میں محصوری کا یہ سلسلہ کم وبیش اڑھائی سال تک چلا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے بعض قریشی زعماء کے دلوں کو نرم کیا۔ ان میں ہشام بن عمرو، زُہیر بن ابی اُمیّہ اور مُطعم بن عدی نمایاں تھے۔ انہوں نے عمائدِ مکہ کو شرم دلا کر اس معاہدے سے دست بردار کرادیا۔ اس طرح یہ مقاطعہ ختم ہوا اور بنو ہاشم کو گھاٹی کی جاں سوز قید سے رہائی ملی۔[2]

---

① صحیح البخاری، کتاب الحوالات، باب جوار ابی بکر فی عہد النبی ﷺ وعقدہ ② البدایۃ والنہایۃ: ۴/ ۲۳۶ تا ۲۳۹

فائدہ (۱): واقدی اور ابن اسحاق کے مطابق محاصرہ محرم ۷ نبوی سے شروع ہوکر تین برس تک جاری رہا یعنی محرم ۱۰ نبوی تک۔ جبکہ عبیداللہ بن موسیٰ کے مطابق دو سال تک محاصرہ رہا۔ (طبقات ابن سعد: ۱/ ۲۰۹، ۲۱۰) (طبقات ابن سعد: ۱/ ۲۰۹، ۲۱۰) ابن الجوزی نے "المنتظم" میں محاصرے کے آغاز کو ۸ نبوی کے حالات میں درج کیا ہے۔ ابن جوزی کی رائے راجح محسوس ہوتی ہے جس کی دیگر اقوال کے ساتھ تطبیق یوں ممکن ہے کہ محاصرہ محرم ۸ نبوی سے ۱۰ نبوی کے درمیان تک رہا تھا۔ طبقات ابن سعد (۱/ ۲۱۰) کی عبارت: ''وکان خروجهم من الشعب في السنة العاشرة'' سے بھی اشارہ ملتا ہے کہ رہائی دسویں سال کے کسی مہینے میں ہوئی تھی۔ اس مہینے کا تعین اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوطالب کی وفات گھاٹی سے رہائی کے چھ ماہ بعد ہوئی تھی۔ (المحبر، ص ۱۱) اور اکثر مؤرخین کے نزدیک ان کی وفات ۱۵ شوال کا واقعہ تھا۔ اگر چھ ماہ سے پورے پورے چھ ماہ مراد لیے جائیں تو محاصرہ ۱۵ ربیع الآخر کو ختم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یوں مدت محاصرہ دو سال ساڑھے تین ماہ بنتی ہے جسے بعض مؤرخین نے تین سال سے تعبیر کیا اور بعض نے تیسرا سال نامکمل دیکھتے ہوئے دو سال سے۔ واللہ اعلم۔

فائدہ (۲): ۷ نبوی اور ۸ نبوی میں مکی اور مدنی تقویم ایک رہی، دونوں کے سال ایک ساتھ شروع اور ختم ہوئے۔ (تقویم عہدِ نبوی، علی محمد خان)

فائدہ (۳): بعض روایات میں معاہدے کے خاتمے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ عہد نامے پر دیمک لگ گیا اور اللہ کے نام کے سوا ساری تحریر مٹ گئی۔ (سیرت ابن ہشام: ۱/ ۳۷۷) اس سے قطع نظر کہ یہ روایات ضعیف ہیں، عرفاً و اخلاقاً اگر کسی عہد نامے کی تحریر ضایع ہوجائے تو معاہدہ کرنے والوں کو خلاف ورزی کا حق نہیں ملتا۔ قدیم معاشرے میں ویسے بھی اصل اعتبار زبان کا ہوتا تھا۔ پس یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ مسودے کو دیمک لگ جانا معاہدے کے خاتمے کو تقویت دینے کا ایک سبب بن گیا تھا، مگر اصل وجہ یہی تھی کہ معاہدہ کرنے والوں کو اپنے کیے پر نادم ہونا پڑا تھا اور بعض سمجھ دار لوگوں کی لعنت ملامت سے وہ سمجھ گئے تھے کہ وہ ایسے انسانیت سوز عمل پر اصرار کرکے پورے عرب معاشرے کی نظر سے گر جائیں گے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات:

شعب ابی طالب کی صعوبت نے ۸۵ سالہ ابو طالب کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا تھا اور وہ بستر سے لگ چکے تھے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو بھی جو پینسٹھ سال کی ہو چکی تھیں، اس طویل مشقت نے نیم جاں کر دیا تھا۔ چنانچہ گھاٹی کی قید سے رہائی کے کچھ عرصہ بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یہ سانحہ دس نبوی ۱۰ رمضان کو پیش آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حجون کے قبرستان میں دفن کیا۔ خود مرقد میں اترے۔ اس وقت نماز جنازہ مشروع نہیں ہوئی تھی۔[1] حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے پچیس سال گزارے تھے۔ وہ ہر موقع اور ہر قدم پر آپ کی مونس و غم خوار رہی تھیں۔ ایسی بے مثل رفیقۂ حیات سے جدائی کے باعث آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر رنج اور صدمے کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ آپ کی جان گھلنے لگی۔[2]

جناب ابو طالب کی رحلت:

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے پینتیس دن بعد ابو طالب بھی دار فانی سے کوچ کر گئے۔ یہ نبوت کا گیارہواں سال تھا۔[3] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ دن انتہائی غم و حزن کے تھے۔ اس لیے اس سال کو عام الحُزن (غم کا سال) کہا جاتا ہے۔ آپ کی زندگی کے پینتالیس سال ابو طالب کے سایۂ شفقت میں گزرے تھے جو ہر موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حامی اور سرپرست رہے تھے۔ اہلیہ اور چچا کی رحلت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود کو تنہا محسوس کرنے لگے۔[4]

---

① دلائل النبوة للبیهقی: ۳۵۳/۲، طبقات ابن سعد: ۱۸/۸

② لما توفیت خدیجة اشتد ذلک علیٰ رسول اللہ ﷺ حتیٰ خُشی علیه حتیٰ تزوج عائشة. رجاله رجال الصحیح (مجمع الزوائد، ح: ۱۵۲۸۸)

تحقیق توقیت وفات حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا:

یہ بات طے ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہجرت سے لگ بھگ تین سال قبل ہوئی۔ توفیت خدیجة رضی اللہ عنہا قبل مخرج النبی ﷺ الی المدینة بثلاث سنین. (صحیح البخاری، ح: ۳۸۹۶، باب هجرة النبی ﷺ)

البتہ وفات کے مہینے میں اختلاف ہے۔ اکثر مؤرخین کے نزدیک ابو طالب کی وفات پندرہ شوال ۱۰ نبوی کو ہوئی تھی۔ (المنتظم: ۷/۳) اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات اس سے ۳۵ دن قبل ہوئی۔ (دلائل النبوة للبیهقی: ۳۵۳/۲) اس حساب سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات ۱۰ رمضان کو طے ہے۔

ملحوظہ: سیرت نگار جب کہتے ہیں نبوت کا فلاں سال یا فلاں نبوی سال تو اس کا مصداق ہمیشہ ایک سا نہیں ہوتا۔ ایک طبقے کے نزدیک آغاز نبوت ربیع الاول میں ہوا، وہ ربیع الاول سے حساب لگا کر پہلا، دوسرا، پانچواں، دسواں سال گن رہے ہوتے ہیں۔ ایک طبقے کے نزدیک بعثت رمضان میں ہوئی، وہ رمضان سے حساب لگا کر فلاں سنہ نبوت شمار کر رہے ہوتے ہیں۔

تیسرا طبقہ ربیع الاول یا رمضان کے اختلاف سے بچنے کے لیے مکی تقویم کے محرم سے سال شمار کرتا ہے اور اکثر طرز یہی چلا آ رہا ہے تاکہ شمار میں آسانی رہے، غالباً اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہجرت مکی تقویم کے محرم میں ہوئی تھی، پس اس سے پورے تیرہ سال قبل کے محرم سے اول سال نبوت کو شمار کر لیا جاتا ہے تاکہ ہجرت تک تیرہ سال پورے پورے آ جائیں مگر اس طرز کا ایک نقصان یہ ہے کہ نبوی سال حقیقی نہیں رہتے؛ کیونکہ کسی کے نزدیک بھی آغاز نبوت محرم سے نہیں ہوا تھا۔ پس محرم سے سال نبوت شمار کرنے میں کچھ مہینے کم و بیش ہو جاتے ہیں، مثلاً اس طرز مشہور کے مطابق ابو طالب کی وفات اور طائف کے سفر کو نبوت کے دسویں سال شوال میں بتایا جاتا ہے، جبکہ رمضان میں آغاز نبوت کے حقیقی حساب کے مطابق اس وقت دسواں سال ختم ہو کر گیارہ سن نبوی شروع ہو چکا تھا۔ اگر ربیع الاول سے آغاز نبوت مانا جائے تو سفر طائف کے شوال میں دس سال بھی پورے نہیں ہوئے بلکہ یہ نویں سال کا شوال بنتا ہے۔ سالوں کے شمار کی اس غلطی سے حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ آغاز نبوت کے اصل مہینے سے سال نبوی کے آغاز و اختتام کو پیش نظر رکھا جائے۔

③ المنتظم: ۷/۳، دلائل النبوة للبیهقی: ۳۵۳/۲

④ البدایة والنهایة: ۳۰۴/۴ تا ۳۱۶

حضرت سَودہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی کی تنہائی میں کچھ کمی اس وقت آئی جب ایک صحابی سکران بن عمرو رضی اللہ عنہ کی بیوہ حضرت سَودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔ یہ رمضان ۱۱ نبوی کا واقعہ ہے۔ ①

اگلے سال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اور اپنی سعادت کے لیے اپنی بیٹی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بھی آپ کے نکاح میں دے دیا۔ اس وقت صرف عقدِ نکاح ہوا تھا، رخصتی تین سال بعد ہوئی۔ ②

معجزۂ شق القمر:

انھی ایام میں مشرکین نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے مطالبہ کیا کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو چاند پر اپنا اثر ڈال کر دکھائیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر یہ معجزہ بھی ظاہر فرما دیا، آپ کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہوگیا، چند لمحوں بعد دونوں ٹکڑے پھر جڑ گئے مگر مشرکین پھر بھی نہ باز آئے، انہوں نے اسے جادو قرار دیا، ان کی ضد اپنی جگہ باقی رہی۔ ③

☆☆☆

---

① طبقات ابن سعد: ۵۳/۸، ترجمہ: سودۃ رضی اللہ عنہا۔
اندازہ یہ ہے کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح رمضان کے اواخر میں ہوا تھا؛ کیوں کہ ۱۰ رمضان کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی تھی اور اس کے بعد کچھ ایام شدید حزن وغم کے عالم میں گزرے تھے۔ اس لیے اتنا وقفہ ضرور رہا ہوگا۔

② اس پر اتفاق ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی نکاح کے تین سال بعد شوال میں ہوئی تھی، اختلاف سال کے تعین میں ہے۔ ایک قول کے مطابق رخصتی شوال ۲ ہجری میں ہوئی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۳۵/۲) جبکہ ابن سعد کی روایت کے مطابق رخصتی ہجرت کے آٹھ ماہ بعد شوال میں ہوئی۔ (طبقات ابن سعد: ۵۸/۸، تر: عائشۃ رضی اللہ عنہا) اس حساب سے عقدِ نکاح حقیقی تقویم کے مطابق شوال ۱۲ نبوی میں ہوا تھا۔ (جسے محرم تا محرم کی سالانہ توقیت کے حساب سے شوال ۱۱ نبوی کہا جاتا ہے۔) اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ (الاصابۃ: ۳۳۲/۸)

③ البدایۃ والنہایۃ: ۲۹۳/۴ تا ۲۰۳؛ تفسیر ابن کثیر، سورۃ القمر، آیت: ۲،۱

ملحوظہ (۱): شق القمر کے واقعہ کے بارے میں قدیم کتبِ سیرت سے فقط اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ شعب ابی طالب سے رہائی کے بعد پیش آیا۔ تاہم اس کا یہ مطلب نکالنا غالباً درست نہ ہوگا کہ رہائی کے فوراً بعد یہ معجزہ رونما ہوا بلکہ واقعات کی رفتار کو سامنے رکھتے ہوئے غالب اندازہ یہ ہے کہ پہلے حضرت خدیجہ اور پھر حضرت ابوطالب کی وفات ہوئی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کفار کا دباؤ بڑھا اور استہزاء کے واقعات بڑھ گئے جس کی حد یہ ہوئی کہ انہوں نے شق القمر کا مطالبہ کر دیا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ واقعہ نبوت کے دسویں سال کے آخری مہینوں یعنی: ذوالقعدہ یا ذوالحجہ کا ہے۔ واللہ اعلم

ملحوظہ (۲): مشہور ہے کہ شق القمر کا معجزہ ہندوستان میں بھی دیکھا گیا۔ مالابار کے راجہ نے اپنے وطن میں یہ منظر دیکھ کر کچھ لوگ عرب بھیجے، حالات اور اسلام کی تحقیق کی اور ایمان لے آیا۔ (تفسیر عثمانی، سورۃ القمر)
مگر یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ راجح یہ ہے کہ راجا کے مشرف بہ اسلام ہونے کا یہ واقعہ تابعین کے دور کا ہے۔ وہ تابعینِ کرام سے یہ واقعہ سن کر متاثر ہوا تھا اور اسلام قبول کیا تھا۔ (اضواء علی الهند، عبدالمنعم النمر، ص ۲۲ تا ۲۴)

سفرِ طائف کا دردناک واقعہ

ابوطالب کے انتقال کے بعد کافروں کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہر طرح کی ایذاء رسانیوں کا کھلا موقع مل گیا، چنانچہ ان کی مخالفت، دشمنی اور سرکشی روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ انہوں نے شق القمر کا معجزہ دیکھا مگر اسے بھی جھٹلا دیا۔ ایسے میں حضورِ اکرم ﷺ قریش کے ہاں اسلام کی آبیاری کے آثار نہ پاکر یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اسلام کی حفاظت اور اشاعت کے لیے کسی اور شہر کو مرکز بنایا جائے، جہاں کے لوگ اسلام کے نام لیوا اور اللہ کے پرستار ہوں۔

مکّہ سے ۷۵ میل (۱۲۰ کلومیٹر) دور طائف میں قبیلۂ ثقیف افرادی لحاظ سے بہت مضبوط تھا، یہاں اکثر خوشحال اور فارغ البال لوگ آباد تھے۔ قریش کے مال دار لوگوں نے بھی یہاں جائیدادیں خرید رکھی تھیں۔ طائف کے باہر ان کے باغ تھے جہاں یہ لوگ گرمیوں میں آرام اور تفریح کے لیے ٹھہرتے تھے۔ طائف سے کچھ فاصلے پر قبیلہ بنوسعد آباد تھا، جہاں رسول اللہ ﷺ نے دائی حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کا دودھ پیا تھا اور بچپن گزارا تھا۔ اس لیے اُمید تھی کہ یہاں کے لوگ آپ کو رضائی رشتہ دار مانتے ہوئے اکرام کریں گے اور آپ ﷺ کی بات دھیان سے سنیں گے۔ اگر یہ لوگ مشرف بہ اسلام ہو جاتے تو مسلمانوں کو بہت سے مصائب سے نجات مل جاتی اور دین کے پھیلنے کے لیے ایک مرکز میسر آجاتا۔ آخر کار اواخرِ شوال ۱۰ نبوی میں رسول اللہ ﷺ بڑی امیدیں لے کر طائف کی طرف روانہ ہوئے، آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔[1]

حضورِ اکرم ﷺ نے طائف میں دس دن گزار کر لوگوں کو عمومی اور خصوصی دونوں طرح دعوت دی۔ آپ طائف کے بازار میں کھڑے ہو کر قرآن کی آیات سناتے اور لوگوں کو اپنی نصرت و حمایت کی طرف متوجہ کرتے رہے۔

عبدالرحمٰن بن خالد عدوانی اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ وہ بتاتے تھے:

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو بنوثقیف کے (شہر طائف کے) مشرقی گوشے میں اپنی لاٹھی یا کمان پر سہارا لگائے ہوئے دیکھا۔ آپ ان کے پاس اس لیے تشریف لائے تھے تاکہ ان سے مدد حاصل کریں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سورۂ طارق کی تلاوت کرتے سنا۔ میں اس وقت مشرک تھا مگر میں نے یہ سورت یاد کرلی۔ بنوثقیف (کے سرداروں) نے مجھے بلوایا اور پوچھا: تم نے اس شخص سے کیا سنا ہے؟ میں نے انہیں سورۂ طارق سنادی۔ بنوثقیف (کے سرداروں) کے پاس قریشی لوگ بھی تھے جنہوں نے کہا: ''ہم اپنے اس آدمی کو اچھی

[1] طبقات ابن سعد: ۱/ ۲۱۱

طرح جانتے ہیں۔ اگر ہم سمجھتے کہ وہ حق بات کہہ رہا ہے تو ہم اسے سب سے پہلے قبول کر لیتے۔“[1]

رسول اللہ ﷺ نے عمومی دعوت کے ساتھ خصوصی ملاقاتیں بھی کیں۔ طائف میں بنوثقیف کے بڑے سردار تین بھائی: عبد یالیل، مسعود اور حبیب تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے گفتگو کی اور انہیں اللہ کے دین کی طرف بلایا اور اسلام کی اشاعت کے لیے اپنی مدد و نصرت کی ترغیب دی، مگر ان لوگوں نے نہ صرف یہ کہ دین کی دعوت کو قبول نہ کیا بلکہ عرب کی رواجی مہمان نوازی کے تقاضے بھی پس پشت ڈال دیے اور بہت تلخ جواب دیے، ان میں سے ایک نے کہا: ”تو ایک بے دین آدمی ہے جو کعبے کا غلاف اوڑھ کر آیا ہے۔“

دوسرا بولا: ”اللہ کو تمہارے سوا اور کوئی نہ ملا جس کو رسول بنا کر بھیجتا۔“

تیسرے نے کہا: ”میں تم سے بات ہی کرنا نہیں چاہتا؛ کیوں کہ اگر تم واقعی نبی ہو تو انکار کر دینا مصیبت سے خالی نہیں اور اگر جھوٹے ہو تو میں جھوٹے شخص سے بات کرنا نہیں چاہتا۔“

ان سرداروں نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ آپ وہاں قیام فرما لیں۔ ناامید ہو کر حضور اکرم ﷺ نے دوسرے لوگوں سے بات چیت کرنے کا ارادہ فرمایا مگر کسی نے بھی آپ کی طرف دھیان نہ دیا بلکہ بڑی بدتمیزی سے کہا کہ ہمارے شہر سے فوراً نکلو اور جہاں مرضی ہو چلے جاؤ۔

رسول اللہ ﷺ جب جانے لگے تو ان بدبختوں نے شہر کے اوباش لڑکوں کو مذاق اُڑانے اور پتھر مارنے کے لیے آپ کے پیچھے دوڑا دیا۔ پتھروں کی بارش سے آپ ﷺ زخمی ہو گئے، تکلیف کی شدت سے آپ بار بار بیٹھ جاتے، لوگ آپ ﷺ کو بازوؤں سے پکڑ پکڑ کر اُٹھاتے اور آپ ﷺ جونہی چلنے کے لیے قدم اٹھاتے، وہ پھر سنگ باری کرتے۔ طائف کی سرزمین پر کائنات کے مقدس ترین انسان کا خون اتنا بہا کہ دونوں جوتے خون سے رنگین ہو گئے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جو آپ کے ساتھ تھے، انہیں اتنے پتھر لگے کہ ان کا سر پھٹ گیا۔

حضورِ اقدس ﷺ اس طرح مار کھاتے شہر کی حدود سے نکل آئے۔ ایک باغ نظر آیا تو آپ ﷺ اس میں داخل ہو گئے۔ تب ان لوگوں نے پیچھا چھوڑا۔ حضور ﷺ ایک کھجور کے سائے میں جا بیٹھے اور انتہائی بے بسی کے عالم میں دکھے ہوئے دل کے ساتھ اپنے مولا سے یہ دعا مانگی:

”الٰہی! تجھی سے اپنی کمزوری اور بے کسی اور لوگوں میں ذلت اور رسوائی کی فریاد کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو ہی کمزوروں کا رب ہے، تو ہی میرا پروردگار ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے، کسی اجنبی پرائے کے جو مجھے دیکھ کر منہ بناتا اور تیوری چڑھاتا ہے یا کسی دشمن کے حوالے کرتا ہے جس کو تو نے مجھ پر مسلط کر دیا۔ اے اللہ! اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی چیز کی پروا نہیں۔ مجھے بس تیری حفاظت کافی ہے، میں تیرے چہرے کے اس

---

[1] مسند احمد: ۳۱/۲۸۹، الآحاد والمثانی، ح: ۱۲۷۴، التاریخ الکبیر للبخاری: ۳/ ۱۳۸

اس روایت میں اگرچہ سنداً قدرے ضعف ہے مگر امام احمد اور امام بخاری دونوں کا اسے نقل کرنا کچھ معنی رکھتا ہے۔ اس لیے یہ روایت بلاشبہ قابل قبول ہے۔

نور کے طفیل جس سے تمام تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور جس سے دنیا اور آخرت کے سارے کام سنور جاتے ہیں، اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو یا تو مجھ سے ناراض ہو۔ تیری ناراضی اس وقت تک دور کرنا ضروری ہے جب تک تو راضی نہ ہو جائے۔ نہ تیرے سوا کوئی طاقت ہے نہ قوت۔''

ایسی مضطرب دُعا پر اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی کو جوش کیوں نہ آتا۔ فوراً حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا گیا۔ انہوں نے آکر عرض کیا: ''اللہ نے آپ کی قوم کی وہ گفتگو سنی ہے جو انہوں نے آپ سے کی۔ اب وہ فرشتہ جو پہاڑوں کے انتظامات پر مامور ہے، حاضر خدمت ہے، آپ اسے جو چاہیں حکم دیں۔''

اب پہاڑوں کے فرشتے نے سلام کر کے عرض کیا:

''ارشاد ہو تو دونوں جانب کے پہاڑوں کو ملا دوں؟ جس سے یہ قوم درمیان میں کچل جائے۔''

مگر رسول اللہ ﷺ رحم و کرم کا پیکر تھے، جواب میں فرمایا: ''میں توقع رکھتا ہوں کہ اگر یہ لوگ مسلمان نہ ہوئے تو ان کی اولاد میں سے ایسے انسان پیدا ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے۔''

یہ باغ جس میں رسول اللہ ﷺ ٹھہرے تھے، قریش کے دو رئیسوں: عتبہ اور شیبہ کا تھا اور اتفاق سے اس وقت دونوں وہیں موجود تھے اور دور سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی بے کسی کی حالت ایسی تھی کہ ان کا دل بھی پگھل گیا اور انہوں نے اپنے غلام عدّاس کو انگوروں کا خوشہ دے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیج دیا۔

عدّاس انگور لے کر حاضر ہوا، رسول اللہ ﷺ نے نوش فرمانے سے پہلے کہا: ''بسم اللہ''

عدّاس حیران ہو کر کہنے لگا: ''یہ لفظ یہاں کے لوگ نہیں کہا کرتے۔''

رسول اللہ ﷺ کو خیال ہوا کہ کوئی اور نہ سہی شاید اس بیگانے شہر میں یہی غلام اسلام کی دعوت قبول کر لے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنائیت سے پوچھا: ''عدّاس کہاں کے ہو اور کس مذہب کے؟''

بولا: ''نینویٰ کا عیسائی ہوں۔'' آپ نے فرمایا: ''مردِ صالح حضرت یونس بن متّیٰ کے شہر کے ہو۔''

وہ حیران ہو کر بولا: ''آپ کو ان کی کیا خبر؟'' فرمایا: ''وہ میرے بھائی ہیں، وہ بھی نبی تھے اور میں بھی۔''

عدّاس سمجھ گیا کہ آپ سچے نبی ہیں۔ وہ آپ کے ہاتھ چوم کر رخصت ہوا۔[1]

جنّات کا قبولِ اسلام:

رسول اللہ ﷺ طائف سے واپس ہوئے۔ راستے میں ''نخلہ'' میں قیام کیا۔ وہیں ایک شب نماز میں تلاوت فرما رہے تھے کہ ۷ یا ۹ جنات کا ایک مختصر گروہ وہاں سے گزرا۔ انہوں نے قرآنِ مجید کی تلاوت سن کر جان لیا کہ یہ سچا دین ہے۔ وہ مسلمان ہو گئے اور سیدھے اپنی قوم کے پاس جا کر انہیں اسلام کی خبر دی۔ ایک جانکاہ مہم کے بعد یہ بہترین ثمرہ

---

① البدایة والنهایة: ۲/۳۳۷ تا ۳۳۲

بعض روایات کے مطابق عدّاس نے اسلام قبول کر لیا تھا مگر اس کا اظہار بعد میں کیا تھا۔ (الاصابة: ۲/۳۸۶)

تھا جو رسول اللہ ﷺ کو ملا۔ بعد میں جنات کے بڑے گروہوں نے حاضر خدمت ہو کر اسلام قبول کیا۔[1]

مکہ میں دوبارہ داخلہ:

طائف کا سفر جس سے حضور ﷺ اسلام کے لیے ایک محفوظ مرکز دعوت حاصل کرنا چاہتے تھے، بظاہر لا حاصل رہا۔ آپ ﷺ نہایت شکستہ حالی میں مکہ واپس آنے پر مجبور تھے مگر اس میں بھی سخت خطرہ تھا؛ کیوں کہ آپ کی غیر حاضری میں قریش مکہ کا غیظ وغضب مزید بڑھ چکا تھا۔ اب آپ ﷺ کے سر پر ابو طالب جیسے قریشی بزرگ کا ہاتھ بھی نہ تھا جن کا سب کفار احترام کرتے تھے اس لیے آپ ﷺ کو اندیشہ تھا کہ مکہ میں داخل ہوتے وقت قریش آپ کی جان لینے کی کوشش کریں گے یا شدید اذیت دیں گے۔ اس خطرے کے پیش نظر آپ ﷺ نے چاہا کہ کسی کی پناہ لے کر شہر میں داخل ہوں۔ یہ عربوں کا دستور تھا کہ کوئی ان سے پناہ مانگتا تو عرب انکار کرنا اپنی غیرت کے خلاف سمجھتے اور اپنی جان و مال کی طرح پناہ گزین کی حفاظت کرتے۔

رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے ایک شریف سردار مُطعم بن عدی کو پیغام دیا کہ وہ آپ کو پناہ میں لے لے۔ مُطعم بن عدی نے اپنے مسلح بیٹوں کے ساتھ آپ ﷺ کو حفاظت میں لے لیا اور حرم میں اعلان کیا: ''محمد میری پناہ میں ہیں۔'' حضور ﷺ اور صحابہ کرام مُطعم بن عدی کی اس نیکی کو بعد میں یاد کیا کرتے تھے۔[2]

مُطعم بن عدی کی پناہ میں آنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی دعوتی سرگرمیاں محدود ہوگئی تھیں؛ کیوں کہ پناہ دہندہ کو اس بارے میں تحفظات تھے کہ آپ مکہ میں رہ کر اسلام کی کھلم کھلا تبلیغ کریں۔ تاہم آپ نے مکہ سے باہر خصوصاً حج کے موسم میں لگنے والے بازاروں اور منیٰ کے اجتماع میں اپنی دعوت جاری رکھی۔ اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ اسلام کے لیے کوئی دوسری پناہ گاہ تلاش کرنے کی فکر میں رہے۔

☆☆☆

---

[1] البدایة والنهایة: ۴/ ۳۴۲ ؛ تفسیر ابن کثیر، سورۃ الاحقاف، آیت: ۲۹ تا ۳۱
قال ابن اسحاق وابن سعد وغیرهما: ان رسول الله ﷺ لما انصرف من الطائف راجعا الی مکة حین یئس من خیر ثقیف حتی اذا کان بنخلة قام من جوف اللیل یصلّی فمر به النفر من الجن الذین ذکرهم الله تعالیٰ. (سبل الهدیٰ والرشاد: ۲/ ۴۴۳)

[2] البدایة والنهایة: ۴/ ۳۴۳ تا ۳۴۴
سفرِ طائف کی توقیت: ابن سعد کے مطابق سفرِ طائف اواخرِ شوال میں شروع ہوا۔ اس دوران دس دن طائف میں قیام رہا۔ (طبقات ابن سعد: ۱/ ۲۱۱)
بلاذری کے بقول طائف کے سفر کا (روانگی سے واپسی تک) کل دورانیہ ۲۷ شوال ۱۰ نبوی سے ۲۳ ذوالقعدہ تک تھا۔ (انساب الاشراف: ۱/ ۲۳۷)
چونکہ موسم حج کی وجہ سے مکہ اور اس کے قرب وجوار میں میں تبلیغ کے مواقع زیادہ ہوتے تھے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ اواخر ذوالقعدہ میں لوٹ آئے تاکہ حسب معمول عازمین حج کو تبلیغ کرسکیں۔ اس بار آپ کو حجاج میں تبلیغ کا نقد ثمرہ ملا اور چھ افراد مشرف بہ اسلام ہوئے جیسا کہ آگے تفصیل سے آ رہا ہے۔

دارِ ہجرت

مکّہ سے دوسو نو میل (۳۳۶ کلومیٹر) دور ''یثرب'' وہ مقام تھا جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کی ہجرت، مسلمانوں کی حفاظت ونصرت، اسلام کی قوت وشوکت اور توحید کی دعوت واشاعت کے لیے منتخب کرلیا تھا۔ یہ شہر جغرافیائی لحاظ سے اتنا محفوظ تھا کہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام یہاں کسی بھی دشمن سے بھرپور مزاحمت کرسکتے تھے۔ یہ جنوبی سمت سے گنجان آبادیوں اور کھجور کے گھنے باغوں میں اس طرح گھرا ہوا تھا کہ اگر کوئی گروہ حملہ کرتا تو اسے قطار بنا کر مختلف تنگ راستوں اور گلیوں میں گھسنا پڑتا اور یوں منتشر حالت میں اسے آسانی سے پھانسا جاسکتا تھا۔ شہر کا مشرقی حصہ جو ''حرۂ واقم'' اور مغربی حصہ جو ''حرۂ وبرہ'' کہلاتا تھا، آتش فشاں پہاڑوں کے لاوے سے بھرا ہوا تھا، جس میں کسی قافلے کا تو کجا تنہا آدمی کا چلنا بھی مشکل تھا۔

شہر کا صرف شمالی حصہ ہموار اور کھلا تھا۔ عام قافلوں کا راستہ بھی اسی طرف سے تھا اور کوئی دشمن حملہ کرسکتا تھا تو اسی جانب سے۔ مگر ''یثرب'' کے شہری اپنے شہر کی بھرپور مدافعت کرسکتے تھے، اس مقصد کے لیے انہوں نے جگہ جگہ مضبوط قلعہ نما حویلیاں بنائی ہوئی تھیں، جنہیں ''آطام'' کہا جاتا تھا۔ یثرب کا سیاسی ماحول بھی مکّہ سے مختلف تھا۔ یہاں کسی ایک قبیلے کی اجارہ داری نہیں تھی۔ یمن سے آئے ہوئے دو قحطانی قبیلے: اَوس اور خزرج اپنی الگ الگ شناخت اور حیثیت رکھتے تھے۔ یہ دونوں قبیلے سپہ گری اور شجاعت میں بے مثال تھے۔ پھر سوداگری، صنعت کاری اور کتابی علوم میں ممتاز یہود کی اپنی ایک پہچان تھی جو شہر کے مضافات میں قلعہ بند بستیوں میں رہتے تھے۔ [1]

یثرب کا پہلا مسلمان:

ان دنوں اَوس اور خزرج میں سخت دشمنی چل رہی تھی۔ آئے دن ان میں جھڑپیں ہوتیں جن میں متعدد آدمی مارے جاتے تھے۔ ۷ نبوی میں اَوس کے خاندان بنو عبدالاشہل کے کچھ لوگ مکّہ آئے تاکہ قریش کو خزرج کے خلاف اپنا اتحادی بنالیں۔ حضور ﷺ کو ان کی آمد کا پتا چلا تو ان سے ملے اور فرمایا: ''میں تمہیں اس سے بہتر بات نہ بتاؤں۔'' یہ کہہ کر آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی جسے سن کر بنو عبدالاشہل کے ایک کم عمر نوجوان ایاس بن مُعاذ نے کہا:

''بھائیو! اللہ کی قسم! اس بات کو قبول کرلو جو اس سے کہیں بہتر ہے جس کے لیے تم آئے ہو۔''

مگر باقی لوگوں نے اسے چپ کرادیا اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر دھیان نہ دیا۔ [2]

---

① السیرة النبویة لابی الحسن علی الندوی، ص ۲۰۶، ۲۰۷

② المنتظم: ۲/ ۳۸۶

فائدہ (۱): ابن جوزی نے اسے ۷ نبوی کے تحت نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محاصرہ شعب ابی طالب اس کے بعد (۸ نبوی میں) ہونے کا قول راجح ہے۔

فائدہ (۲): یہ ایاس بن مُعاذ ایمان لے آئے تھے مگر اپنے وطن واپسی پر انہیں بنو خزرج نے قتل کردیا تھا، اور انہوں نے کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے جان دی تھی۔ (معرفة الصحابة لابی نعیم: ۱/ ۲۹۳) ان کے قتل کے کچھ دنوں بعد جنگِ بعاث ہوئی تھی۔ (البدایة والنہایة: ۳/ ۳۶۶)

جنگِ بُعاث اور اس کے اثرات:

اَوس کے لوگ قریش کو اپنا اتحادی بنانے میں کامیاب نہ ہوئے مگر اس کے باوجود انہوں نے ۷ نبوی میں خزرج سے گھمسان کی جنگ لڑی جو" جنگ بُعاث" کہلاتی ہے۔ جنگ سے پہلے وہ اپنے ہمسایہ یہودی قبائل: بنونضیر اور بنوقُریظہ کو حلیف بنا کر اپنا پلہ بھاری کر چکے تھے چنانچہ بنوخزرج کو جان توڑ لڑائی کے بعد پسپا ہونا پڑا۔ ①

اس خونریز جنگ میں اَوس اور خزرج کے تقریباً سبھی عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ سردار قتل ہو گئے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی یہاں آمد سے قبل ایسے حالات بنا دیے کہ یہاں قیادت کے لیے جگہ خالی تھی۔ ②

یہود اس جنگ کے بعد فاتح گروہ کے حلیف کی حیثیت سے نمایاں ہو چکے تھے۔ اس سے اَوس اور خزرج دونوں کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ یہودی دوبارہ یہاں غالب قوت کی شکل اختیار کر لیں گے۔ اس خدشے نے فریقین کے سمجھدار لوگوں کو جو پہلے ہی لڑائیوں کے ان سلسلوں سے تنگ آ چکے تھے، مجبور کیا کہ وہ کسی طرح مستقل اور پائیدار امن کی صورت نکالیں۔ دونوں قبیلوں کی سیاست میں خزرج کے رئیس عبداللہ بن اُبَیّ بن سَلُول ایک اہم کردار تھا جو جنگِ بُعاث میں غیر جانب دار رہا تھا۔ وہ ہوشیاری، چرب زبانی اور موقع شناسی میں سب سے بڑھ کر تھا۔ اَوس اور خزرج کے سرداروں نے سوچ لیا تھا کہ آئندہ لڑائیوں سے بچنے اور مستقل امن قائم رکھنے کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ عبداللہ بن اُبَیّ کو یثرب کا حکمران مان لیا جائے اور شہر کو حکومت کے جدید ڈھنگ پر چلایا جائے۔ ③

اہلِ یثرب کا پہلا قافلہ مشرف بہ اسلام ہوا (۱۰ نبوی):

اَوس اور خزرج کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مشیتِ الٰہیہ عن قریب انہیں اُس سعادتِ عظمیٰ سے نوازنے والی ہے جس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہ ہو گا۔ طائف سے واپسی کے فوراً بعد، ۱۱ نبوی کے اجتماعِ حج میں حضور ﷺ حسبِ معمول قبائل کو اسلام کی دعوت دینے لگے۔ منیٰ میں سب سے بڑے جمرے کے قریب پہاڑ کی ایک گھاٹی میں آپ کو قبیلہ خزرج کے کچھ لوگ ملے جو یثرب سے حج کے لیے آئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں توحید کی دعوت دی اور قرآنِ مجید پڑھ کر سنایا۔

یثرب کے لوگ اپنے پڑوسی یہودیوں سے اکثر یہ سنتے رہتے تھے کہ عنقریب ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کی نورانی صورت، اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ دعوت نے انہیں بہت متاثر کیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ یہ وہی نبی ہیں جو انسانیت کے نجات دہندہ ہوں گے، پھر انہیں یہ بھی محسوس ہوا کہ اپنے وطن سے خانہ جنگی کے مستقل خاتمے اور وطن کی معیشت و زراعت پر مسلط یہودیوں سے نجات کی صورت بھی یہی ہو سکتی ہے کہ وہ سب اس نبی پر

---

① الکامل فی التاریخ: ۱/ ۲۰۱، ۲۰۲ ...... یہ لڑائی بنوقریظہ کے قلعے کی قریبی وادی" بُعاث" میں لڑی گئی تھی۔ (الکامل فی التاریخ: ۱/ ۲۰۲)

② صحیح البخاری، ح: ۳۹۳۰، کتاب المناقب، باب مقدم النبی واصحابه المدینة

③ صحیح البخاری، ح: ۴۵۶۶، کتاب التفسیر، باب وَ لَتَسمعن من الذین اوتوا الکتاب؛ السیرة النبویة لابی الحسن علی الندوی، ص ۲۰۰ تا ۲۰۲

ایمان لے آئیں۔ وہ کہنے لگے: ''ہم اپنی قوم کو اس حال میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ جتنا شر اور فساد ان میں ہے اتنا دنیا میں کہیں اور نہیں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعے ہمیں متحد کر دے۔''

یثرب کے یہ چھ افراد جو سب سے پہلے ایمان لائے: اُسعد بن زُرارہ، عوف بن عفراء، رافع بن مالک، جابر بن عبداللہ، قُطبہ بن عامر اور عُقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم تھے۔ انہوں نے وطن جا کر اسلام کی دعوت دینا شروع کی اور چند دنوں میں ہر طرف یہ نیا پیغام پھیل گیا، اسی وقت بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ [1] یثرب کے گھر گھر میں چرچا ہونے لگا کہ مکہ میں ایک سچے نبی کا ظہور ہوا ہے، جنہیں اپنی قوم کی طرف سے سخت تکالیف کا سامنا ہے، وہ قریشی اور ہاشمی ہیں، عبدالمطّلب کے پوتے اور عبداللہ کے بیٹے ہیں۔ اہلِ یثرب کے لیے یہ حسب و نسب اجنبی نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ایک مدت پہلے انہی کے ایک خاندان نبو نجّار کی لڑکی سلمٰی بنت عَمرو، قریشی سردار ہاشم کے نکاح میں آئی تھی۔ ان کے بڑے بوڑھوں کو معلوم تھا کہ عبدالمطّلب نے اپنا بچپن انہی گلیوں میں کھیلتے کودتے گزارا تھا اور یہاں کی ایک لڑکی فاطمہ بنت عمرو بن عائذ سے نکاح کیا تھا جس سے عبداللہ پیدا ہوئے تھے۔ بنو نجّار کی معمر خواتین کو وہ دن یاد تھے جب یہی عبداللہ بن عبدالمطّلب ان کے ہاں بیمار ہو کر وفات پا گئے تھے اور یہیں دفن ہوئے تھے۔ انہیں آمنہ بنت وَہب کا اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لیے آنا اور واپسی میں ابواء کے مقام پر اس طرح جان دینا بھی نہیں بھولا تھا کہ چھ سالہ ''محمد'' ان کے ساتھ تھا۔ آج اسی ''محمد'' کا ایک راہ نما اور ایک پیغمبر کے کردار میں سامنے آنا، انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف دعوت دینا اور آسمانی ہدایت کی طرف بلانا ان کے لیے جہاں خلافِ توقع تھا تو وہاں ایک اپنائیت کا احساس بھی لیے ہوئے تھا۔

بیعتِ عقبہ اُولیٰ (۱۲ نبوی):

اگلے سال سن ۱۲ نبوی میں اَوس اور خَزرج کے بارہ افراد حج کے موقع پر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ ایمان لا چکے تھے اور اب آپ ﷺ کی زیارت کے علاوہ مدد و نصرت کے وعدے کرنے اور دین کی تعلیمات لینے حاضر ہوئے تھے۔ ان بارہ افراد میں حضرت اُسعد بن زُرارہ، حضرت عُقبہ بن عامر، حضرت عُبادہ بن صامت اور حضرت مالک بن التَیِّہان جیسے حضرات شامل تھے جو بعد میں بڑے نامور ہوئے۔ حضور ﷺ نے ان سے باقاعدہ بیعت لی، جس میں شرک، چوری، بدکاری، اولاد کے قتل سے احتراز اور نیکی کے ہر کام میں اطاعت کرنے کا عہد و پیمان لیا گیا۔ اسے ''بیعتِ عقبہ اولیٰ'' کہا جاتا ہے۔ [2] حضور ﷺ نے ان کے ساتھ مُصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور نابینا قاری عبداللہ بن اُمِّ مکتوم رضی اللہ عنہ کو قرآنِ مجید کا معلم بنا کر روانہ کیا۔ [3] وہ حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کے مکان میں ٹھہرے اور اسلام کے نئے مرکز میں توحید کی دعوت، نمازوں کی امامت اور تدریس قرآنِ مجید کے فرائض انجام دینے لگے۔ [4]

① سیرۃ ابن ہشام: ۱/۴۲۹؛ البدایۃ والنہایۃ: ۳/۱۷۱-۱۷۲ ② بحوالہ بالا

③ طبقات ابن سعد: ۱/۲۳۳؛ صحیح البخاری، ح: ۳۹۲۴، باب ھجرۃ النبی ﷺ، کتاب المناقب

قرآن مجید کی تعلیم میں شروع سے نابینا قراء حضرات کا بڑا کردار ہے، یہ سب حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ کے ورثاء ہیں۔ جزاھم اللہ احسن الجزاء

④ سیرۃ ابن ہشام: ۱/۴۲۹؛ البدایۃ والنہایۃ: ۳/۱۷۱-۱۷۲

چار سال قبل برپا ہونے والی اَوس اور خزرج کی تاریخی لڑائی ''جنگِ بُعاث'' میں فریقین کے بڑے بڑے سردار کام آ گئے تھے جس کے بعد اَوس کی قیادت سعد بن مُعاذ اور خزرج کی سرداری سعد بن عُبادہ کے پاس تھی۔ جب مُصعَب بن عمیر اور اَسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہما نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تو اَوس کے سردار سعد بن مُعاذ نے فوراً کلمہ پڑھ لیا۔ ان کے چچازاد بھائی اُسید بن حُضیر بھی جو قبیلے کے نائب سردار اور امیرِ لشکر تھے، ایمان لے آئے۔

اس تازہ جوش و خروش نے نہ صرف اَوس اور خزرج کی سابقہ دشمنی کے داغ دھوڈالے بلکہ شہر میں ایک جدید متحدہ حکومت تشکیل دینے اور عبداللہ بن اُبَی بن سلول کو حکمران بنانے کا جو منصوبہ بنایا جا رہا تھا، اب اسے ترک کر دیا گیا کیوں کہ پائیدار امن اور مستقل اتحاد کا سب سے عمدہ لائحہ عمل ان کے ہاتھوں میں آ چکا تھا۔[1]

☆☆☆

---

① تاریخ ابن خلدون: ۳۱۹/۲ ؛ البدایة والنهایة: ۳۸۹،۳۸۸/۲

سفرِ معراج

گزشتہ کئی برس سے رسول اللہ ﷺ کو جن پے در پے مصائب سے پالا پڑا تھا ان کے زخم مندمل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو ایسا منفرد اعزاز عطا فرمایا جس سے کبھی کسی انسان کو نہیں نوازا گیا۔ یہ ''سفرِ معراج'' کا شرف تھا جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ پر انعامات و اکرامات کی بارش کر دی گئی۔

حضور ﷺ مسجد الحرام میں سو رہے تھے کہ فرشتوں کے سردار جبرئیل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے ساتھ گھوڑے سے ملتا جلتا ایک پردار جانور تھا جسے ''بُراق'' کہا جاتا تھا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو اس پر سوار کرایا اور ہم رکاب ہو کر آپ کو مسجد الحرام سے شام کی طرف لے چلے۔ براق کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ جہاں نگاہ پہنچتی وہیں قدم جا پڑتا۔ سفر کا یہ پہلا مرحلہ جسے ''اِسراء'' کہا جاتا ہے، بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ پر ختم ہوا جہاں حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام آپ ﷺ کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ان سب نے آپ ﷺ کے پیچھے نماز ادا کی اور یوں آپ ﷺ کے ''امام الانبیاء'' ہونے کا عملی مظاہرہ ہوا۔

یہاں سے حضور ﷺ کے سفر کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا، جسے ''معراج'' کہا جاتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ آسمان کی بلندیوں پر پہنچے۔ یکے بعد دیگرے آپ نے ساتوں آسمانوں کی سیر کی۔ ہر آسمان کے دروازے پر فرشتوں نے آپ کا خیر مقدم کیا۔ پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام، دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰ و حضرت یحییٰ علیہما السلام، تیسرے پر حضرت یوسف علیہ السلام، چوتھے پر حضرت ادریس علیہ السلام، پانچویں پر حضرت ہارون علیہ السلام، چھٹے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقاتیں ہوئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت المعمور کے دروازے کے سامنے بیٹھے تھے جو کعبۃ اللہ کے عین اوپر واقع ہے، روزانہ ستر ہزار نئے فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کو دوزخ اور اس میں نافرمانوں کو دیے جانے والے مختلف عذابوں کا مشاہدہ کرایا گیا، اسی طرح جنت اور اس کی نعمتیں بھی دکھائی گئیں۔ حضور ﷺ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے جو عرشِ الٰہی کے نیچے بیری کا ایک مقدس درخت ہے جس پر فرشتوں کا ہجوم رہتا ہے۔ آخر میں حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی خاص بارگاہ میں پہنچے اور اللہ تعالیٰ کا ویسا دیدار کیا جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اُمتِ مسلمہ کے لیے پچاس فرض نمازوں کا تحفہ دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورے پر آپ ﷺ نے کمی کی درخواست پیش کی، آخر کرم کرتے کرتے اللہ تعالیٰ نے فقط پانچ نمازیں فرض باقی رہنے دیں اور ثواب پوری پچاس نمازوں کے برابر عطا فرمانے کی خوش خبری دی۔

حضور ﷺ کو اس واقعے کے بعد پورے احترام کے ساتھ آپ کے بستر پر پہنچایا گیا۔ اس دنیا میں تب تک اتنا

تھوڑا سا وقت گزرا تھا کہ آپ ﷺ کا بستر ابھی تک گرم تھا۔ صبح حضور ﷺ نے اس واقعے کا ذکر کیا تو مشرکین نے حسب عادت مذاق اُڑانا شروع کر دیا۔ ابوجہل نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو طعنہ دیتے ہوئے کہا: ''تمہارا ساتھی کہتا ہے کہ وہ راتوں رات بیت المقدس اور آسمانوں کی سیر کر آیا ہے، کیا تم اسے بھی سچ مانتے ہو؟''

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بلا تامل کہا: ''ہاں! میں ان کی بات کو بہر حال سچ مانتا ہوں۔''

غرض مسلمانوں نے اس واقعے کی تصدیق کی اور اللہ پر اُن کا ایمان مزید مضبوط ہو گیا۔ پانچ نمازوں کے اہتمام نے اللہ سے ان کے تعلق اور قرب میں اضافہ کر دیا۔ معراج کا یہ واقعہ حالت بیداری اور ہوش کا ہے خواب نہیں۔ اگر خواب ہوتا تو اسے ایک معجزہ اور عجیب واقعے کے طور پر بیان نہ کیا جاتا، نہ مشرکین اس کا مذاق اڑاتے، کیوں کہ خواب میں تو آدمی کچھ بھی دیکھ سکتا ہے۔[1]

معراج کے واقعے نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ حضور اکرم ﷺ ساری دنیا کی قیادت اور امامت کے لیے آئے ہیں۔ آپ ﷺ کی نبوت ایک شہر یا ملک کے لیے نہیں، اس کا دائرہ پوری دنیا بلکہ پوری کائنات پر حاوی ہے۔ گزشتہ ساری اُمتیں اب آپ کی پیروی کیے بغیر نجات نہیں پا سکتیں، کیوں کہ ان کے پیغمبر اور رسول بھی آپ ﷺ کے مقتدیوں کی صف میں کھڑے ہیں۔ اس واقعے نے یہ بھی اشارہ دے دیا کہ مسلمانوں کی غربت، ضعف اور قلت کے باوجود اسلام عنقریب دنیا کے دور دراز گوشوں تک پھیلنے والا ہے اور حق کا اُجالا ہونے کے دن قریب ہیں۔

☆☆☆

---

[1] البداية والنهاية: ۲۷۶/۴ تا ۲۸۵، ط دار هجر ؛ الكامل في التاريخ: ۶۵۰/۱، ۶۵۱، ط دار الكتاب العربي

نوٹ: واقعہ معراج کے ماہ وسن کے بارے میں سخت اختلاف ہے۔ عام طور پر ۲۷ رجب ۱۰ نبوی مشہور ہے۔ علامہ عینی رحمہ اللہ نے ۱۲ نبوی کو راجح مانا ہے۔ (عمدة القاري: ۳۹/۴) حافظ عبدالغنی المقدسی رحمہ اللہ نے اپنی ''سیرت نبویہ'' میں ''پیر بارہ ربیع الاول'' کو راجح کہا ہے مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے مطابق انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی جس روایت کو دلیل بنایا ہے، وہ منقطع ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے البداية والنهاية (۲۷۰/۴) میں اس کے علاوہ درج ذیل اقوال نقل کیے ہیں:

❶ ابن عساکر رحمہ اللہ کے نزدیک نبوت کے ابتدائی سالوں میں (۵ سال قبل از ہجرت) ❷ ابن اسحاق رحمہ اللہ کے نزدیک ۱۰ نبوی میں (مہینہ نامعلوم)

❸ سُدی رحمہ اللہ کے بقول ہجرت سے سولہ ماہ قبل (ذوالقعدہ ۱۲ نبوی میں) ❹ زہری رحمہ اللہ کے مطابق ہجرت سے ایک سال قبل (ربیع الاوّل ۱۳ نبوی میں)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس قول کو دلائل کے ساتھ رد کیا ہے جس کے مطابق یہ ہجرت سے پانچ سال قبل کا واقعہ ہے، پھر انہوں نے معراج کی توقیت میں دس اقوال بتائے ہیں۔ سُدی سے انہوں نے یہ نقل کیا ہے کہ معراج ہجرت سے سترہ ماہ قبل ہوئی اور کہا ہے کہ اس حساب سے معراج رمضان یا شوال میں ہوگی۔ مگر باقی اقوال میں سے کسی کو ترجیح نہیں دی۔ (فتح الباري: ۲۰۳/۷)

درحقیقت اس اختلاف میں کسی ایک قول کو ترجیح دینا بہت دشوار ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہ تمام اقوال ضعیف روایات پر مبنی ہیں۔ ایسے میں بہتر صورت یہی ہے کہ واقعات کی رفتار کو دیکھتے ہوئے قرینِ قیاس صورت اختیار کی جائے۔ ہجرت سے پانچ سال قبل یا ایک سال قبل کا قول واقعات کی رفتار کا ساتھ نہیں دیتا۔ البتہ ہجرت سے ۱۷ ماہ قبل کا قول جسے حافظ ابن حجر نے سُدی کے حوالے سے نقل کیا ہے، قرینِ قیاس ہے۔ اس باب میں سب سے واضح قول ابن سعد کا ہے جو سُدی کی روایت کے قریب تر ہے: ''فلما كان ليلة السبت لسبع عشرة خلت من رمضان قبل الهجرة بثمانية عشر شهرا.'' (طبقات ابن سعد: ۲۱۳/۱) یعنی واقعہ معراج ہفتہ ۱۷ رمضان ۱۸ ماہ قبل الہجرۃ کو پیش آیا۔ یہ ۱۷ رمضان مدنی ہے جو کی تقویم کے ۱۷ رجب کے متوازی ہے۔ اور اگر مکی تقویم میں ۲۷ رجب کے قول مشہور کو لیا جائے تو مدنی تقویم یعنی خالص قمری کیلنڈر میں یہ ۲۷ رمضان ۱۲ نبوی کا واقعہ ہوگا جس کی عیسوی تاریخ ۲۶ اپریل ۶۲۱ء ہوگی۔ علی محمد خان نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ (تقويم عهدِ نبوي، ص ۸۰، ۱۱۶)

بیعتِ عقبہ ثانیہ (۱۲ نبوی):

۱۲ نبوی میں حضرت مُصعَب بن عمیر رضی اللہ عنہ یثرب سے حاجیوں کے ایک بڑے قافلے کے ساتھ مکّہ آئے۔ حج کے بعد ۱۲ ذوالحجہ کی شب وہ منیٰ کی اس گھاٹی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہوئے۔[1] یہ ۷۵ اَفراد تھے۔ ۷۳ مرد اور ۲ خواتین۔ یہ سب حضورِ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تن، من، دھن نچھاور کرنے کا وعدہ کرنے آئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن بلانا چاہتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کیا کرتے تھے، یثرب والوں کا اشتیاق دیکھ کر بولے: ''سوچ لو! تم جس بات کی پیش کش کر رہے ہو، اگر اسے واقعی پورا کر سکتے ہو اور محمد کو ان کے دشمنوں سے محفوظ رکھ سکتے ہو تو ٹھیک۔ ورنہ ابھی سے معذرت کرلو؛ کیوں کہ محمد ہماری حفاظت میں ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو تم انہیں لے جاؤ اور پھر دشمنوں کے سپرد کر دو۔''

انہوں نے کہا: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی عہد ہم سے لینا ہو، لے لیں۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بیعت کرو کہ میری ایسی حفاظت کرو گے جیسے اپنی عورتوں اور اولاد کی کرتے ہو۔''

حضرت براء بن مَعرُور رضی اللہ عنہ نے جذبات کی شدت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ تھام لیا اور بیعت کرتے ہوئے بولے: ''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا دین دے کر بھیجا ہے، ہم آپ کی ایسی ہی حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں۔ ہم جنگجو لوگ ہیں۔ معرکہ آزمائی ہمارا جدی پشتی وطیرہ ہے۔''

اب سب حاضرین نے بیعت کی۔ اس موقع پر مالک بن التَیِّہان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اللہ کے رسول! کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ جب اللہ آپ کو غالب کر دے تو آپ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم کے پاس چلے جائیں۔''

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیے اور فرمایا: ''نہیں۔ مطمئن رہو جس سے تم لڑو گے اس سے میں بھی لڑوں گا۔ جس سے تمہاری صلح ہوگی اس سے میری بھی صلح ہوگی۔ تمہارا ذمہ میرا ذمہ ہے اور تمہاری حرمت میری حرمت۔''

یہ وہ پختہ قول تھا جس پر دنیا کے لیے ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کا انحصار تھا۔ یہ بیعت ''بیعت عَقَبَہ ثانیہ'' کہلاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے لیے بارہ نقیب (ذمہ دار افراد) مقرر کر دیے، یہ اسعد بن زُرارہ، سعد بن رَبیع، سعد بن عُبادہ، اُسید بن حُضیر، عبداللہ بن رَواحہ، براء بن مَعرُور، عُبادہ بن صامت، رافع بن مالک، عبداللہ بن عَمرو، منذر بن عَمرو، سعد بن خیثمہ اور ابوالہیثم مالک بن التَیِّہان رضی اللہ عنہم تھے۔[2]

بیعت میں شامل دیگر نمایاں حضرات:

بیعت میں شامل دیگر نمایاں افراد میں عبداللہ بن جُبَیر (شہیدِ غزوۂ احد) ابوایوب انصاری (خالد بن زید)، اَوس بن ثابت، ابوطلحہ انصاری (زید بن سہل)، سعد بن رَبیع (شہیدِ غزوۂ احد)، عبداللہ بن زید (اذان کا خواب دیکھنے والے)،

---

[1] البدایة والنهایة: ۵۱۳/۴

[2] سیرة ابن هشام: ۴۴۸/۱

خلّاد بن سُوید (شہیدِ غزوۂ خندق)، معاذ بن جبل اور عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔[1] بنو مازن کے زید بن عاصم رضی اللہ عنہ اپنے پورے کنبے سمیت آئے تھے۔ان کی اہلیہ اُمّ عمارہ رضی اللہ عنہا (نُسَیبہ بنت کعب) اور دو بیٹے: حبیب بن زید رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ بھی اس میں شامل تھے۔[2]

بیعتِ عَقَبہ میں شریک مسلمانوں نے جو عہد کیا، اسے پورا کر کے دکھایا، اگلے سالوں میں یہ رسول اللہ پر جان و مال وارنے میں پیش پیش رہے اور بدر، اُحد اور خندق جیسی جنگوں میں ان کے بیشتر افراد شریک اور بہت سے شہید ہوئے۔

صحابہ کی ہجرت:

بیعتِ عقبہ ثانیہ کے کچھ عرصہ بعد سن ۱۳ نبوی میں رسول اللہ ﷺ نے مکّہ کے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر اپنے گھر بار اور وطن کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے اور یثرب چلے جانے کا حکم دیا۔رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو کہا: ''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مکہ سے ایک نخلستانی سرزمین کی طرف ہجرت کر رہا ہوں۔ مجھے گمان ہوا کہ وہ یمامہ یا ہَجَر کا علاقہ ہے۔مگر وہ تو مدینۂ یثرب ہے۔''[3] وطن چھوڑنے کا یہ عمل ''ہجرت'' کہلایا۔مسلمان آہستہ آہستہ یثرب جانے لگے۔حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سب سے پہلے ہجرت کرنے والوں میں سے تھے۔[4]

قریش کو اس بات کی اطلاع مل چکی تھی کہ اَوس اور خزرج نے حضور ﷺ اور مسلمانوں کو پناہ دینے کا عہد کر لیا ہے اس لیے وہ ہجرت کرنے والوں کی راہ میں ہر ممکنہ رکاوٹیں ڈالنے لگے۔کنبے سمیت سب سے پہلے ابوسَلَمہ رضی اللہ عنہ نکلے۔ وہ اپنی بیوی حضرت اُمّ سَلَمہ رضی اللہ عنہا اور ایک شیر خوار بچے کے ساتھ جا رہے تھے کہ انہیں راستے میں مشرکین نے گھیر لیا اور کہا: ''اگر جاتے ہو تو جاؤ مگر بیوی اور بچہ ہمارے حوالے کر کے جانا ہوگا۔'' ابوسَلَمہ رضی اللہ عنہ انہیں اللہ کے سپرد کر کے نکل گئے۔حضرت اُمّ سَلَمہ رضی اللہ عنہا ایک سال تک اپنے میکے میں محصور رہیں اور بچہ ددھیال میں ماں باپ سے دور بلکتا رہا۔ صُہیب رومی رضی اللہ عنہ ہجرت کرنے لگے تو قریش نے تعاقب کر کے انہیں روک لیا، آخر کار انہوں نے اپنے سارے مال اور خفیہ دولت کا پتا بتا کر خلاصی پائی۔صرف ایک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے باقاعدہ اعلان کر کے ہجرت کی اور ان کی ہیبت کی وجہ سے کوئی ان کو روکنے کی جرأت نہ کر سکا۔[5]

---

[1] سیرۃ ابن ھشام: ۱/۴۶۰ تا ۴۶۸

[2] یہ ازلی گھرانہ جانثاری کا عجیب نمونہ تھا۔زید بن عاصم رضی اللہ عنہ بدر میں شریک ہوئے۔احد میں اپنی اہلیہ اُمّ عُمارہ (نُسَیبہ بنت کعب) رضی اللہ عنہا اور دونوں بیٹوں: عبداللہ رضی اللہ عنہ اور حبیب رضی اللہ عنہ سمیت شامل ہوئے۔اُحد میں اُمّ عمارہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لیے جو سرفروشی دکھائی وہ اسلامی تاریخ کا تابناک باب ہے۔حبیب رضی اللہ عنہ بعد میں ختمِ نبوت کا پرچم اٹھائے ہوئے مُسَیلمہ کذاب کے ہاتھوں شہید ہوئے۔اُمّ عمارہ رضی اللہ عنہا مسیلمہ کے خلاف جنگ میں اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ سمیت شریک ہوئیں، بارہ زخم کھائے، ایک ہاتھ بھی کٹ گیا۔بیٹے نے مسیلمہ کذاب کو ٹھکانے لگا دیا۔یہی عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ حرہ میں یزیدی فوج کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ (الاصابہ، اسد الغابہ، الاستیعاب، تر: نُسَیبہ رضی اللہ عنہا، حبیب بن زید رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ)

[3] صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب ھجرۃ النبی ﷺ

[4] صحیح البخاری، ح: ۳۹۲۴، باب ھجرۃ النبی ﷺ، کتاب المناقب

[5] البدایۃ والنھایۃ: ۴/ ۴۲۰ تا ۴۳۷ ...... صحابہ کی ہجرت کے وقت تیرہ سال نبوت پورے ہو چکے تھے چودھویں سال نبوت کا تیسرا مہینہ تھا۔

حضور اکرم ﷺ کا سفرِ ہجرت (ربیع الاوّل ایک ہجری/ستمبر ۶۲۲ء)

نبی اکرم ﷺ کو اللہ کی طرف سے ابھی تک ہجرت کا حکم نہیں ملا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی حضور ﷺ کے اشارے پر رکے ہوئے تھے، ان کی یہی تمنا تھی کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ سفر کی معیت نصیب ہو جائے۔ انہوں نے سفر کے لیے دو اونٹنیاں لے لیں اور چار ماہ تک انہیں ببول کے پتے کھلا کر پالتے رہے۔ ①

صحابہ مکہ سے روانہ ہوتے رہے۔ عثمان بن عفان، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبیداللہ، زید بن خطاب، حمزہ بن عبدالمطلب اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم سمیت رفتہ رفتہ بھی ہجرت کر گئے۔ صرف چند ایسے بے کس مسلمان پیچھے رہ گئے جو کفار کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے اور ہجرت سے بالکل عاجز تھے۔ ②

حجاز کے دیگر علاقوں میں بعض صحابہ ایسے تھے جن کے پاس محفوظ پناہ گاہیں تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ انہیں شرفِ میزبانی بخشیں۔ ان میں یمنی قبیلے دوس کے ایک سرفروش طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ خود رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور اپنے مضبوط قلعے میں تشریف لانے کی درخواست کی مگر یہ شرف اللہ نے انصار کے نصیب میں رکھا تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کی درخواست قبول نہ کی۔ ③

قاتلانہ حملے کی سازش:

قریش کو مسلمانوں کی ہجرت سے یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ وہ ایک مرکز بنانے کے بعد مکہ کے لیے خطرہ بن جائیں گے، چنانچہ عمائدِ مکہ نے ''دارالندوہ'' میں مجلسِ مشاورت منعقد کی تاکہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کے بارے میں ایسا آخری اور قطعی فیصلہ کیا جائے کہ یہ نیا دین مزید پھیلنے نہ پائے۔ مجلس میں ہر خاندان کے رئیس مثلاً: اُمیّہ بن خلف، ابوسفیان، ابوجہل، نضر بن حارث وغیرہ موجود تھے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ حضور ﷺ کو قید کر دیا جائے۔ کسی نے کہا کہ جلا وطن کر دینا کافی ہے۔

---

① صحیح البخاری، ح: ۳۹۰۵، کتاب المناقب، باب ھجرۃ النبی ﷺ

فوائد: ❶ بیعتِ عقبہ ثانیہ ۱۲ نبوی ذوالحجہ میں ہوئی۔ ۱۳ نبوی میں ہجرت کا حکم نازل ہوا تھا اور صحابہ کی ہجرت شروع ہوئی اور انہی ایام میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے ہجرت کی اجازت مانگنا شروع کی اور دو اونٹنیاں خرید لیں۔ ''وعلف راحلتین کانتا عنده ورق السمر وھو الخبط اربعة اشھر.'' (صحیح البخاری، ح: ۳۹۰۵)

❷ سواری کے لیے ببول کے پتوں جیسی عمدہ غذا کے اہتمام کی وجہ یہ تھی کہ ہجرت کے سفر میں تعاقب کا خطرہ تھا۔ اونٹ صحت مند ہو اور کوہان میں خوب غذا جمع کر چکا ہو تو تیزی سے بلا تکان طویل سفر کر سکتا تھا۔ اونٹ کی جگہ اونٹنی لینے میں ممکن ہے یہ حکمت ملحوظ ہو کہ صحرا میں غذا نہ ملے تو اونٹنی کا دودھ میسر آ سکے گا۔

❸ یہ اونٹنیاں اعلیٰ نسل کی تھیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو آٹھ سو درہم (موجودہ ۲ ہزار ڈالر یا ۲ لاکھ روپے) میں خریدا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۱/۲۲۸) انہی میں سے ایک اونٹنی قَصواء آخر تک رسول اللہ ﷺ کی بہترین سواری رہی۔ اسی کا نام جدعاء اور عضباء بھی تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۱/۴۹۲)

② صحیح البخاری، ح: ۴۹۴۱؛ البدایة والنهایة: ۴/۲۲۰ تا ۲۲۷ ③ صحیح مسلم، ح: ۲۲۶، کتاب الایمان

ابوجہل کی رائے یہ تھی کہ قتل کر دیا جائے۔ اہلِ مجلس نے اسی کو ترجیح دی مگر مسئلہ یہ تھا کہ قبائل کی معاشرت میں ہر فرد کی جان پورے قبیلے کی امانت تصور کی جاتی تھی۔ خدشہ تھا کہ اس صورت میں بنو ہاشم اور بنو عبد مناف کی تمام شاخیں یکجا ہو کر بدلہ لینے پر اتر آئیں گی اور مکہ میں خانہ جنگی چھڑ جائے گی۔ آخر طویل بحث کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ہر خاندان کا ایک ایک فرد چن لیا جائے اور ان کی جمعیت آج رات بیتِ نبوی کا محاصرہ کرے اور مشترکہ طور پر قاتلانہ حملہ کرے۔[1]

ہجرت کا حکم۔ رسول اللہ ﷺ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر پر:

اسی دن حضور ﷺ کو اللہ کی طرف سے فی الفور ہجرت کا حکم مل گیا۔[2] قریش کے کئی لوگوں نے اس قدر دشمنی کے باوجود اپنی قیمتی امانتیں حضور ﷺ کے پاس رکھوانے کا معمول ترک نہیں کیا تھا۔ حضور ﷺ نے ان کی امانتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیں کہ ان کے مالکوں کو پہنچا کر بعد میں وہ بھی یثرب آ جائیں۔[3]

اب حضور ﷺ اپنے اس گھر سے جدا ہوئے جس میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے بعد آپ نے زندگی کے اٹھائیس برس گزارے تھے۔ آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہ صرف یہ گھر بلکہ یہ مقدس شہر بھی چھوڑے جا رہے تھے۔ آپ اپنی اہلیہ حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا اور دونوں چھوٹی بیٹیوں: حضرت اُمِّ کلثوم، اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بھی یہیں چھوڑ کر جا رہے تھے۔ بڑی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا بھی مکّہ میں اپنے شوہر ابوالعاص کے گھر میں تھیں جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔

حضور ﷺ اپنی روانگی کے بارے میں انتہائی رازداری برتتے رہے۔ جب آپ کو اللہ کی طرف سے حکم ملا تو اس دن صبح تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی علم نہ تھا کہ روانگی آج ہے۔ حضور ﷺ دوپہر کی شدید گرمی میں سر پر رومال اوڑھے گھر سے نکلے اور سیدھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاں گئے۔ انہیں بتایا کہ اللہ کی طرف سے ہجرت کا حکم آ گیا ہے۔ وہ بولے: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ کا ساتھ نصیب ہو؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم ساتھ ہو۔''[4]

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ تشکر اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے رو پڑے[5] اور عرض کیا:

''میری ان دو اونٹنیوں میں سے ایک لے لیجیے۔'' آپؐ نے فرمایا: ''ہاں مگر قیمت دے کر۔''[6]

حضرت عائشہ اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہما نے نہایت عجلت کے عالم میں سفر کے لیے کھانے پینے کا سامان تیار کیا مگر خوراک کے تھیلے اور پانی کی مَشک کا منہ بند کرنے کے لیے رسّی نہ ملی۔ اسماء رضی اللہ عنہا نے والدِ محترم سے کہا: ''باندھنے کے لیے نِطاق (کمر باندھنے کے دوپٹے) کے سوا کچھ نہیں۔'' والد نے فرمایا: ''اسی کو پھاڑ کر ایک سے تھیلے اور ایک سے مشک کا مُنہ باندھ دو۔'' انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اسی لیے انہیں ''ذاتُ النِطاقَین'' (دُہرے نِطاق والی) کہا جانے لگا۔[7]

---

[1] سورة الانفال، آيت: ۳۰ ؛ سيرة ابن هشام: ۱/ ۴۸۰ تا ۴۸۲

[2] "قد أذن لي في الخروج." (صحيح البخاري، ح: ۳۹۰۵) [3] سيرة ابن هشام: ۱/ ۴۸۵

[4] صحيح البخاري، ح: ۳۹۰۵ [5] سيرة ابن هشام: ۱/ ۴۸۵

[6] صحيح البخاري، ح: ۳۹۰۵ [7] صحيح البخاري، ح: ۲۹۷۹، كتاب الجهاد، باب حمل الزاد في الغزو

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی بیٹیوں: حضرت اسماء اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما اور بوڑھے نابینا باپ ابوقحافہ کو اللہ کے سہارے چھوڑے جا رہے تھے۔ انہوں نے گھر میں موجود ساری رقم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لیے ساتھ لے لی [1] اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر عقبی دروازے سے نکل گئے۔ [2]

حضرت ابوقحافہ کو ان کے نکلنے کے بعد شک ہوا تو اسماء رضی اللہ عنہا سے پوچھا:

''مجھے لگتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تمہیں تکلیف میں ڈال دیا کہ جاتے ہوئے ساری رقم ساتھ لے لی۔''

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے فرمایا: ''نہیں وہ تو بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔''

پھر اس طاق میں جہاں رقم رکھی جاتی تھی، کچھ چھوٹے چھوٹے پتھر رکھ کر اوپر کپڑا ڈال دیا اور نابینا دادا کا ہاتھ پکڑ کر اس پر پھیر دیا۔ انہیں تسلی ہوگئی اور بولے: ''چلو اگر وہ اتنا کچھ چھوڑ گئے ہیں تو اچھا کیا۔ تمہارا گزارا ہو جائے گا۔'' [3]

سفرِ ہجرت کی حکمتِ عملی:

چونکہ یثرب تک سیدھا جانے میں پورا خطرہ تھا کہ قریش تعاقب کر کے پکڑ لیتے اس لیے بہت سوچ سمجھ کر نکلنے کی تدبیر کی گئی، جس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت عبداللہ اور آزاد کردہ غلام عامر بن فُہیرہ رضی اللہ عنہما کو شریک کر لیا گیا۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر ابھی اسلام نہیں لائے تھے۔ انہیں بے خبر رکھا گیا۔ طے یہ ہوا کہ دونوں حضرات مکّہ کے باہر غارِ ثور میں چھپ جائیں گے، تین راتیں وہاں چھپ کر گزاریں گے۔ اس دوران اہلِ مکّہ کی خبریں لانے کا کام عبداللہ بن ابی بکر کریں گے، تیسرے دن جبکہ قریش تھک ہار کر بیٹھ چکے ہوں گے، اونٹنیوں پر سوار ہو کر ایک غیر معروف راستے سے منزلِ مقصود کا سفر کیا جائے گا۔ غیر معروف راستے میں بھٹکنے سے حفاظت کے لیے عبداللہ بن اُرَیقط نامی ایک پیشہ ور راہ نما کو اجرت پر ساتھ لینا بھی طے تھا جو مشرک ہونے کے باوجود پیشہ ورانہ راز داری میں پکا تھا۔ [4]

اگر میری قوم مجھے نہ نکالتی!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اونٹنیوں پر سوار ہو کر مکّہ سے نکلے، ایک ٹیلے پر چڑھ کر آپ نے اس مقدس شہر کو مخاطب کر کے کہا: ''اے مکہ! اللہ کی قسم! تو زمین کا بہترین شہر اور اللہ کو سب سے زیادہ پیارا ہے۔ اگر

---

[1] مسند احمد، ح: ۲۶۹۵۷ ؛ صحیح البخاری، ح: ۳۹۰۵، ۳۹۰۷، کتاب المناقب ؛ صحیح ابن حبان، ح: ۶۲۷۷

فائدہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوپہر کو نکلنے میں حکمت یہ تھی کہ قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کا دھڑکا لگا ہوا تھا مگر انہیں یقین تھا کہ روانگی رات کو ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی توقع کے برخلاف دوپہر کو ایسے وقت میں نکلے کہ لوگ عادتاً اس وقت آرام کرتے تھے۔ یہ روانگی مدنی ربیع الاول، (مکی محرم) مطابق ماہ ستمبر یعنی گرم موسم'' میں ہوئی تھی۔ مگر بعض حضرات نے ابن اسحاق کی اس روایت کو لے کر جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چادر اوڑھ کر صحن میں بستر نبوی پر لیٹنے کا ذکر ہے، اسے ''مکی ربیع الاول (مدنی جمادی الاولیٰ) مطابق نومبر'' قرار دیا ہے حالانکہ نومبر کی سردی میں کوئی صحن میں نہیں لیٹتا۔ البتہ اواخر ستمبر میں موسم ایسا ہوتا ہے کہ رات کو صحن میں آرام کیا جا سکتا ہے اور ایسے معتدل درجہ حرارت میں چادر اوڑھنا بھی کوئی عجیب بات نہیں۔ اس لیے بلاشبہ یہ ستمبر ہی کا مہینہ تھا۔ (دوبارہ دیکھنا ہے

[2] سیرۃ ابن ہشام: ۱/۴۸۵

[3] مسند احمد، ح: ۲۶۹۵۷

[4] یہ ترتیب صحیح روایات ہی سے مستفاد ہے یعنی صحیح البخاری، ح: ۳۹۰۵، باب ھجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ؛ صحیح ابن حبان، ح: ۶۲۷۷

مجھے نکالا نہ جاتا تو میں تجھ سے ہرگز نہ نکلتا۔''[1] یہ واقعہ جمعہ ۲۸ صفر (مدنی) کیم ہجری (۱۰ ستمبر ۶۲۲ء) کا ہے۔[2]

قریش کا یہ خیال تھا کہ رسول اللہ ﷺ رات کو ہجرت کریں گے۔ انہوں نے اسی شب بیتِ نبوی کا محاصرہ کرلیا۔ اس دوران حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ بیتِ نبوی کے صحن میں بسترِ نبوی پر چادرِ نبوی اوڑھ کر لیٹے رہے۔[3] قریش دھوکے کا شکار ہوگئے۔ ان کے ہاں رشتہ داروں کو گھروں میں گھس کر مارنا عار کی بات تھی، لہٰذا احاطہ کی دیواریں چھوٹی ہونے کے باوجود وہ باہر کھڑے رہے۔ صبح حقیقت معلوم ہوئی تو وہ ششدر رہ گئے۔[4]

ابوجہل سیدھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر جا پہنچا اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے پوچھ گچھ کی۔ انہوں نے لاعلمی ظاہر کی تو ابوجہل نے ایسا زور کا طمانچہ مارا کہ کان کی بالی تک ٹوٹ گئی۔ مگر اس اللہ کی بندی نے زبان نہ کھولی۔[5]

غارِ ثور میں روپوشی اور قریش کی بھاگ دوڑ:

حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سیدھے غارِ ثور پہنچے اور اونٹنیاں عبداللہ بن اُرَیقِط کے حوالے کردیں۔[6] اس سے طے کرلیا گیا تھا کہ تیسری شب وہ سواریاں غار کے پاس لے آئے گا۔ طے شدہ ترتیب کے مطابق اس دوران عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ جو نہایت چالاک لڑکے تھے، شام کو اہلِ مکہ کی بھاگ دوڑ اور مشوروں کی خبریں غار تک

① سنن الترمذی، ابواب المناقب باب فی فضل مکۃ

② خرج منها فی صفر وقدم المدینۃ فی شهر ربیع الاوّل. (طبقات ابن سعد: ۱/۲۲۴)
دیگر روایات میں ہجرت کا دن پیر اور مہینہ ربیع الاوّل متعین ہے۔ تطبیق کی صورت یہی ہے کہ اواخرِ صفر میں گھر سے غارِ ثور تک گئے، وہاں تین شب روپوشی کے بعد آغازِ ربیع الاوّل میں پیر کے روز مدینہ روانگی ہوئی۔ اس صورت میں غار میں روپوشی کا دن جمعہ ۲۷ صفر بنتا ہے۔

③ سیرۃ ابن هشام: ۱/۴۸۳

فائدہ (۱): ابن اسحاق کی یہ روایت ضعیف ہے۔ اصولاً ایسی روایت اس شرط کے ساتھ قابلِ قبول ہوتی ہے کہ وہ صحیح روایت کے منافی نہ ہو۔ ابن اسحاق کی اس روایت میں مذکور بعض باتیں قابلِ قبول ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت جبرئیل نے فرمایا کہ آج شب آپ ﷺ اپنے بستر پر نہ رہیں۔ اس میں کوئی اشکال نہیں؛ کیوں کہ عین ممکن ہے کہ یہ ہدایت صبح ہی کردی گئی ہو۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بسترِ نبوی پر لیٹنے میں بھی کوئی اشکال نہیں؛ کیوں کہ عین ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ دوپہر کو نکلتے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دے گئے ہوں۔ مگر ایک بات کو قبول کرنا مشکل ہے وہ یہ کہ حضور ﷺ مشرکین کے سروں پر خاک ڈالتے ہوئے رات کو گھر سے نکلے۔ علامہ شبلی نعمانی نے دونوں روایات کو اس طرح ملایا ہے کہ حضور ﷺ دوپہر کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر ہجرت کی تیاری کا حکم دینے گئے تھے۔ بیتِ نبوی سے ہجرت اس کے ایک دو دن بعد رات کو ہوئی تھی۔ مگر صحیح بخاری کی روایت میں صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر اس قدر عجلت کا عالم دکھائی دیتا ہے کہ کھانے کے تھیلے اور مشک کا منہ باندھنے کے لیے رسی تلاش کرنے کا بھی وقت نہیں تھا بلکہ پہنا ہوا کپڑا پھاڑ کر اسے باندھا جا رہا تھا۔ یہ ماحول مذکورہ توجیہ کا ساتھ نہیں دیتا۔

فائدہ (۲): حضرت علی رضی اللہ عنہ وہی چادر اوڑھ کر لیٹے تھے جو رسول اللہ ﷺ سوتے وقت اوڑھتے تھے۔ روایت میں ہے: ''فبات فیه علیّ وتغشّی بردًا احمر حضرمیا کان رسول اللّٰه ﷺ ینام فیه۔'' جو حضرات ہجرت کو سرما میں قرار دیتے ہیں وہ اپنے دعوے کو مؤکد کرنے کے لیے اس چادر کو 'اونی چادر' سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ روایت میں ایسا کوئی لفظ نہیں جس سے چادر کا ''اونی'' ہونا ثابت ہوسکے۔

④ سبل الهدیٰ والرشاد: ۳/۲۴۴

⑤ سیرۃ ابن هشام: ۱/۴۸۷..... ایک ضعیف روایت کے مطابق حضرت اسماء رضی اللہ عنہا رات کو غارِ ثور میں کھانا بھی لے جاتی رہیں۔ (البدایۃ والنهایۃ: ۴/۴۴۷)

⑥ بخاری اور ابن حبان کی ان صحیح روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رات کے وقت گھر سے روانگی کی روایات درست نہیں ہیں، ویسے بھی وہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں۔ اسی طرح پیدل غارِ ثور تک جانے کی بات بھی درست نہیں؛ کیوں کہ ابن حبان کی مذکورہ صحیح روایت میں صراحت ہے: ''فرکبا حتیٰ اتیا الغار۔'' ہاں ایک ضعیف روایت میں ہے کہ پہاڑ کے دشوار راستے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آقائے نامدار ﷺ کو کاندھوں پر اٹھا لیا تھا۔ (البدایه و النهایه: ۴/۴۵۰)
پس قرینِ قیاس یہ ہے کہ جبلِ ثور میں جہاں تک ممکن تھا، یہ حضرات سواریوں پر پہنچے۔ اس کے بعد مشکل راستہ پیدل طے کیا گیا۔ صحیح بخاری کی روایت سے غالباً اسی طرف اشارہ ہوتا ہے: فرکبا فانطلقا حتیٰ اتیا الغار۔ (صحیح البخاری، ح: ۴۰۹۳)

لاتے اور رات غار ہی میں گزارتے۔ عامر بن فُہیرہ رضی اللہ عنہ سارا دن بکریاں چراتے اور عشاء کے بعد غار میں آ کر بکریوں کا دودھ پیش کرتے۔[1] قریش نے حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو شہر میں نہ پا کر ہر راستے پر آپ کی تلاش شروع کر دی تھی۔ ان مقدس ہستیوں کو قتل یا گرفتار کرنے والے کے لیے سو سو اونٹوں کے انعام کا اعلان کر دیا گیا تھا۔[2] اس خطیر انعام کی حرص میں درجنوں لوگ اس مہم پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ایک موقع پر کھوج لگانے والے کچھ لوگ غارِ ثور کے دہانے تک آ گئے، تب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بے چینی ناقابلِ بیان تھی۔ آپ ﷺ کی جان کا خوف انہیں لرزائے دے رہا تھا۔ وہ سرگوشی میں بولے: ''یارسول اللہ! اگر یہ لوگ اپنے پیروں کی طرف جھانک کر دیکھ لیں تو ہم نظر آ جائیں گے۔'' حضور اقدس ﷺ پورے اطمینان سے بولے: ''اے ابوبکر! گھبراؤ نہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

قریش اتنے قریب پہنچ کر بھی ناکام واپس لوٹ گئے۔[3]

غارِ ثور سے دارِ ہجرت کی سمت:

تین راتوں کی روپوشی کے بعد رات کے آخری پہر حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غار سے نکلے۔[4] دونوں اونٹنیاں سواری کے لیے تیار تھیں۔ رہبر عبداللہ بن اُرَیقط بھی آ گیا تھا اور عامر بن فُہیرہ رضی اللہ عنہ بھی۔ اب چار افراد کا یہ قافلہ ایک پیچیدہ راستے سے جو معروف شاہراہ کی بہ نسبت ساحل سے قریب تھا، پیر یکم ربیع الاوّل (۱۳ ستمبر ۶۲۲ء) کو اپنی منزل کی سمت روانہ ہوا۔ رات اور اگلے دن دوپہر تک سفر تیزی سے جاری رہا۔ گرمی کی شدت تھی۔ دور دور تک آدم تھا نہ آدم زاد۔ گرمی اور تھکن کی وجہ سے ظہر کے وقت یہ حضرات سایہ تلاش کرنے لگے۔ آخر ایک اونچی چٹان نظر آئی جس کا کچھ سایہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ سے زمین کو ہموار کر کے اس پر اپنی چادر بچھائی اور نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا: ''یارسول اللہ! آپ آرام فرمائیے۔''

حضور ﷺ استراحت فرما ہوئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گشت کرنے لگے تاکہ کوئی تعاقب میں آ رہا ہو تو دیکھ لیں۔ کچھ دیر بعد ایک کم سن چرواہا اپنے ریوڑ سمیت سایہ تلاش کرتے ہوئے ادھر سے گزرا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

---

[1] ان صحیح روایات میں عامر بن فُہیرہ کا کردار بہت اہم معلوم ہوتا ہے۔ عامر بن فُہیرہ رضی اللہ عنہ کا پیچھے بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ نکلنا دودھ کے انتظام کے علاوہ اس لیے بھی تھا تاکہ قدموں کے نشانات مٹ جائیں؛ کیوں کہ مکہ والے نشانات دیکھ کر کھوج لگا سکتے تھے۔ (سیرة ابن هشام: ۱/۴۸۶)

[2] صحیح البخاري، ح: ۳۹۰۵، باب هجرة النبي ﷺ؛ صحیح ابن حبان، ح: ۶۲۷۷

[3] سورة التوبة، آیت: ۴۰؛ صحیح البخاري، ح: ۳۶۵۳، کتاب المناقب، باب مناقب المهاجرین؛ صحیح ابن حبان، ح: ۶۲۷۸

[4] شہر سے غارِ ثور تک جانا دوپہر کو ہوا تھا۔ (صحیح البخاري، ح: ۳۹۰۵، ۳۹۰۷) اور غار سے اصل سفر رات کو شروع کیا گیا تھا جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے الفاظ ''اسرینا لیلتنا ومن الغد.'' (ح: ۳۶۱۵) اور ''فخرجنا لیلاً فاحثثنا لیلتنا ویومنا.'' (ح: ۳۹۷۱) سے ثابت ہے۔ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے الفاظ ''صبح ثلاث.'' (صحیح البخاري، ح: ۲۲۶۴) سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سفر رات کے آخری پہر میں شروع ہوا تھا جسے تیسری شب کی صبح سے تعبیر کیا گیا۔ اس لحاظ سے غارِ ثور میں قیام مکمل تین دن (۷۲ گھنٹے) نہیں رہا بلکہ اس کا دورانیہ لگ بھگ ۶۰ گھنٹے تھا۔ یعنی جمعہ کی دوپہر کو گھر سے نکلے، اندازاً تین گھنٹے میں یعنی سہ پہر کو یہ حضرات غارِ ثور میں پہنچ گئے ہوں گے۔ جمعہ کی سہ پہر سے لے کر اتوار اور پیر کی درمیانی شب کے آخری پہر تک وہاں قیام رہا۔ اس طرح روپوشی کی مدت پورے تین دن اور تین راتیں نہیں بلکہ دو دن اور تین راتیں ہیں۔ بخاری کی روایت (ح: ۳۰۹۵) میں بھی ''ثلاث لیال.'' کا لفظ ہے جس سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے۔

نے اس سے پوچھا: ”تم کس کے چرواہے ہو؟“ اس نے ایک قریشی شخص کا نام لیا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ”تمہارے پاس دودھ والی بکریاں ہیں؟“ اس نے اثبات میں جواب دیا تو فرمایا: ”ہمیں دودھ نکال دو گے؟“ چرواہا حامی بھر کر ایک بکری کا دودھ نکالنے بیٹھ گیا مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پہلے بکری کا تھن گرد و غبار سے صاف کرو اور اپنے ہاتھ بھی۔ اس نے تھنوں کو صاف کیا، پھر اپنے ہاتھ جھاڑے اور دودھ نکال کر پیش کر دیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو جگانا نہیں چاہتے تھے مگر جب دودھ لے کر پلٹے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہو چکے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس موجود منہ بند چھاگل سے صاف پانی نکال کر دودھ میں ملایا اور یہ ٹھنڈا مشروب پیش کرتے ہوئے فرمایا: ”یارسول اللہ! یہ نوش فرما لیجیے!“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نوش فرما چکے تو خادم بارگاہِ رسالت نے کہا: ”یارسول اللہ! کیا روانگی کا وقت نہیں ہو گیا؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: ”ہاں بالکل!“ [1]

اب سورج ڈھل چکا تھا، چنانچہ آگے سفر شروع ہوا۔ ویران راستہ ختم ہو گیا اور کہیں کہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے شناسا قبائلی ملنے لگے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعارف نہ تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دیکھنے میں عمر رسیدہ لگتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بالکل سیاہ ریش اور جوان۔ لوگ پوچھتے: ”ابوبکر! یہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟“ وہ فرماتے:

”هٰذَا الرَّجُلُ يَهْدِيْنِي السَّبِيْلَ.“ (یہ صاحب ہمارے راہ نما ہیں۔)

لوگ سمجھتے کہ یہ راستے کے راہبر ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مراد تھی کہ یہ راہِ ہدایت دکھانے والے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورے اطمینان سے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ چوکنا انداز میں مسلسل ہر طرف نگاہ رکھے ہوئے تھے کیوں کہ تعاقب کا خطرہ موجود تھا۔ اور حقیقت یہ تھی کہ واقعی خطرہ سر پر تھا۔ بنومدلج کے ایک گھڑ سوار سُراقہ بن مالک نے قریش کی طرف سے سو اونٹ کے انعام کا شہرہ سنا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش شروع کر دی۔ آخر صحرا میں قافلۂ نبوت نظر آ گیا۔ سراقہ نے گھوڑے کو ایڑ لگا کر تیزی سے فاصلہ طے کیا یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کی آواز سنائی دینے لگی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک گھڑ سوار کو یوں تیزی سے آتے دیکھا تو کہا:

---

① صحيح البخاري، ح: ٣٦١٥، باب علامات النبوة ؛ ح: ٣٦٥٢، باب مناقب المهاجرين ، ح: ٣٩١٧، باب هجرة النبي ﷺ، كتاب المناقب ② صحيح البخاري، ح: ٣٩١١، باب هجرة النبي ﷺ، كتاب المناقب

فوائدِ نافعہ ❶: بخاری کے یہ مناظر بتاتے ہیں کہ ہجرت سردی میں نہیں، گرمی میں ہوئی تھی، ورنہ سردی میں تو دھوپ مرغوب ہوتی ہے اور ٹھنڈا مشروب ناگوار۔

❷ یہ مقام جہاں رسول اللہ ﷺ غار سے نکلنے کے بعد پہلی بار استراحت فرما ہوئے ”قُـدَيـد“ تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۱/۲۳۲) جو مکہ معظمہ سے ۱۰۰ میل دور ہے۔ اس سے معلوم ہوتا کہ پہلے دس گھنٹوں میں سفر کی رفتار بہت تیز رہی اور اوسطاً ہر ایک گھنٹے میں دس میل قطع کیے گئے۔

❸ ہجرت کا سفر جو طویل غیر معروف راستے سے ہوا تھا، ۴۴۹ کلومیٹر (۲۷۷ میل) یعنی ۱۷ منازل ہے، مگر اسے فقط سات دن میں طے کیا گیا تھا۔ یعنی سفر کی رفتار غیر معمولی رہی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے الفاظ ”فاحثثنا“ (صحیح البخاری، ح: ۳۹۱۷) بہت تیز رفتار سے سفر کرنے کی واضح دلیل ہیں۔ ظاہری اسباب کے لحاظ سے اس میں اونٹنیوں کی وہ چار ماہی پرورش بہت کام آئی جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خاص اہتمام سے کی تھی۔

❹ راویوں نے سفر کے پورے راستے کو محفوظ کیا ہے۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق سفر میں درج ذیل مقامات سے گزر ہوا:

قديد، خرّار، ثنية المرّة، لَقَف، مَدلَجة لَقَف، مَدلَجة مِجاج، مِرجَح مِجاج، بَطنُ مِرجَح، بطن ذات كَشد، الحدائد، الاذاخر، بطن ريغ، ذو سَلَم، مَدلَجة، عُثاية، بطن القاحة، العَرج، الجَدَوات، الغابر (عن يمينِ رَكوبة) بطن العقيق، جثجاثة، قُبا. (طبقات ابن سعد: ١/ ٢٣٢، ٢٣٣)

”یہ گھڑ سوار ہم تک پہنچنے کو ہے!“ حضور ﷺ نے فرمایا: گھبراؤ نہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

پھر دعا کی۔ ”یا اللہ! اسے گرادے۔“ اسی وقت سُراقہ بن مالک کا گھوڑا پیٹ تک زمین میں دھنس گیا۔ سُراقہ بن مالک کو آپ ﷺ کے سچے ہونے اور عن قریب غالب آنے کا یقین ہو گیا، لہٰذا فوراً معافی مانگی اور امان نامہ طلب کیا۔

حضور اکرم ﷺ کے حکم سے عامر بن فُہیرہ رضی اللہ عنہ نے انہیں چمڑے کے ایک ٹکڑے پر امان نامہ لکھ دیا۔

پھر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ”تم اس راستے میں رہو۔ کسی کو ہم تک نہ آنے دینا۔“ سُراقہ نے وعدہ کرلیا۔ [1]

سُراقہ بن مالک کو خوش خبری:

حضور ﷺ نے عین اس حالت میں جبکہ دین اسلام اپنی تاریخ کے نازک ترین گھڑی سے گزر رہا تھا اور خود اس دین کے بانی کی زندگی شدید خطرات میں گھری تھی، سُراقہ بن مالک کو ایک، ایسی خوشخبری دی جو اسلام کی حقانیت کی دلیل اور اس کے ماننے والوں کے روشن ترین مستقبل کی نوید تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

”سُراقہ! تمہاری کیا کیفیت ہوگی جب کسریٰ کے کنگن تمہارے ہاتھوں میں پہنائے جائیں گے۔“

واپس جاتے ہوئے سُراقہ بن مالک کو شدید حیرت بھی تھی اور حضور ﷺ کے کمالات کا اعتراف بھی۔ کون سوچ سکتا تھا کہ صرف پندرہ برس بعد نبی ﷺ کے دوسرے خلیفہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں کسریٰ کا خزانہ مسلمانوں کے قدموں میں اور نوشیروان کے کنگن سُراقہ کے ہاتھوں میں ہوں گے۔ [2]

سُراقہ بن مالک نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اس سمت آنے والے ہر مشرک کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں اس سمت کا جائزہ لے چکا ہوں۔ [3] بعد میں سُراقہ نے اسلام قبول کرلیا اور صحابہ کی صف میں شامل ہوئے رضی اللہ عنہ۔

آخر یہ مبارک قافلہ منزل کے قریب پہنچ کر معروف شاہراہ پر آ گیا۔ یہاں سب سے پہلے ان کی ملاقات شام سے مدینہ لوٹنے والے مسلمانوں کے ایک تجارتی قافلے سے ہوئی جس میں رسول اللہ ﷺ کے پھوپھی زاد اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے داماد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ مقدس ہستیوں کے کپڑے سفر سے گرد آلود ہو چکے تھے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے انہیں نئے سفید کپڑے پیش کیے۔ [4]

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۳۶۵۲، باب مناقب المهاجرین، ح: ۳۶۱۵؛ باب علامات النبوۃ، ح: ۳۹۰۶، ۳۹۱۷؛ باب هجرۃ النبی ﷺ، کتاب المناقب؛ صحیح مسلم، ح: ۷۷۰۶، الزهد والرقائق، باب فی حدیث الهجرۃ، ط دار الجیل

نوٹ: عجیب بات ہے کہ بے سروسامانی میں کیے جانے والے اس سفر میں بھی پیغمبر اسلام ﷺ نے لکھنے پڑھنے کا سامان ساتھ رکھا تھا، حالانکہ اس کا بہت کم امکان تھا کہ سفر میں ان چیزوں کی ضرورت پڑے۔ اسلام میں فنِ کتابت کی اہمیت اس سے اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔

[2] دلائل النبوۃ للبیهقی: ۳۲۵/۲ [3] صحیح مسلم، ح: ۷۷۰۲، الزهد والرقائق، باب فی حدیث الهجرۃ، ط دار الجیل

[4] صحیح البخاری، ح: ۳۹۰۵، کتاب المناقب، باب هجرۃ النبی ﷺ

[5] ہجرت کے سفر کی یہ روداد صحیح روایات کی روشنی میں ذرا تفصیل کے ساتھ اس لیے پیش کر دی گئی ہے کہ اول تو اسلام کی تاریخ میں اس واقعے کی بڑی اہمیت ہے اور اسی لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی اختصار پسندی کے باوجود صحیح بخاری میں یہ واقعہ بہت تفصیل سے نقل کیا ہے۔ دوسرے اس واقعے سے متعلق سیرت کی عام کتب میں بہت سی ضعیف بلکہ بعض موضوع روایات بھی شامل کر لی گئی ہیں جب کہ صحیح روایات پر مشتمل بعض تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس لیے ہم نے کوشش کی ہے کہ صحیح روایات سے واقعہ ہجرت اپنی اصل اور مکمل شکل میں سامنے لایا جائے۔ سوائے چند ٹکڑوں کے تقریباً سارا واقعہ ہم نے صحیح روایات اور اکثر بخاری سے لیا ہے۔

قارئین پر یہ واضح ہو چکا ہوگا کہ اس تاریخ ساز سفر میں شروع سے آخر تک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گھرانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم دم وہم ساز دکھائی دیتا ہے۔ ہجرت شروع بھی انہی کے گھر سے ہوئی۔ غار کے راز دار اور راستے کے خدمت گار بھی یہی حضرات رہے۔ آخری مرحلے پر بھی اسی گھرانے کو ہدایا پیش کرنے کی سعادت ملی۔ اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مابین گہرے رشتے اور حد درجہ اعتماد کے تعلق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام آیتِ غار کی روشنی میں:

ہجرت کے اس یادگار اور تاریخ ساز سفر کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے غارِ ثور کی تنہائیوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیت کو خاص طور پر بیان کیا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾

''اگر تم اس (رسول) کی مدد نہیں کرو گے تو (رسول کا کچھ نقصان نہیں؛ کیوں کہ) اس کی اللہ نے اس وقت بھی مدد کی جب اس کو نکالا تھا کافروں نے، اس حال میں کہ وہ دو میں سے دوسرا تھا، جب وہ دونوں تھے غار میں، جب کہہ رہا تھا وہ اپنے رفیق سے، تو غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے، پھر اللہ نے اتاری اپنی طرف سے اس پر تسکین اور اس کی مدد کو وہ فوجیں بھیجیں کہ تم نے نہیں دیکھیں۔''①

امام رازی رحمہ اللہ کی نکتہ دانی:

امام رازی رحمہ اللہ نے ''تفسیر کبیر'' میں اس آیت کے ذیل میں حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی کئی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے جن کا خلاصہ یہ ہے:

- ہجرت کا سفر قریش کی تکالیف اور دشمنی سے بچنے کی خاطر کیا گیا تھا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان واخلاص میں ذرا بھی شک ہوتا تو انہیں اپنے ہمراہ ہرگز نہ لے جاتے، کیوں کہ ایسے میں خدشہ ہوتا کہ کہیں وہ دشمنوں کو اطلاع نہ کر دیں۔ صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ لے جانا ان پر مکمل اعتماد کا یقینی ثبوت اور اس حقیقت کی پختہ دلیل ہے کہ وہ سچے دل سے بارگاہِ رسالت کے وفادار تھے۔
- ہجرت اللہ تعالیٰ کے امرِ خاص سے تھی۔ سینکڑوں صحابہ میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ داروں کو بھی چھوڑ کر معیتِ نبوی کے لیے فقط حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب ان کے تمام صحابہ سے افضل ہونے کا ثبوت ہے۔
- اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ''ثانی اثنین'' کہا ہے اور تاریخی حقیقت بھی یہ ہے کہ وہ اکثر مقامات اور مراتب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ثانی یعنی ''قریب ترین'' رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہی دوسرے مرد تھے جو سب سے پہلے عقیدۂ توحید سے مالا مال ہوئے۔ وہی اسلام کے دوسرے داعی تھے جن کی مساعی سے

① سورۃ التوبۃ، آیت: ۴۰

حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عثمان غنی اور کئی اوّلین جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم مشرف بہ اسلام ہوئے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے پہنچے تو معیت میں صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ انصار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جس دوسرے فرد کو دیکھا وہ صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہر غزوہ میں خدمتِ اقدس میں رہے اور ایک لحہ بھی الگ نہ ہوئے۔

- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرضِ وفات میں نماز پڑھانے میں بھی وہی ''ثانی اثنین'' بنے۔
- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں سب سے قریب مدفون ہو کر اس دنیا میں بھی ''ثانی اثنین'' قرار پائے۔
- جب غار میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے غم زدہ ہوئے تو اس نازک موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''مَا ظَنُّکَ بِاثْنَیْنِ اَللّٰهُ ثَالِثُهُمَا؟''

(ان دو کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہے؟)

یہ الفاظ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے ہمیشہ ہمیشہ معیتِ نبویہ اور معیتِ الٰہیہ کا تمغہ ہیں جس سے بڑا کوئی اور اعزاز نہیں ہو سکتا۔

- مفسرین کا اتفاق ہے کہ ''اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ'' سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ''لِصَاحِبِهٖ'' کہہ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی قرار دیا ہے لہٰذا علماء کا کہنا ہے کہ جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صحابی نہ مانے وہ اس آیت کا منکر ہونے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔[1]

☆☆☆

[1] تفسیر مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر)، فخر الدین الرازی: ۱۶/ ۵۰ تا ۵۴، ط دار احیاء التراث العربی

پہلی اسلامی ریاست

شہر کے لوگوں کو حضور ﷺ کی مکہ سے روانگی کی اطلاع مل چکی تھی۔ (غالباً انہیں یہ بھی علم تھا کہ آپ ﷺ رات سے صبح تک سفر اور دوپہر کو آرام کرتے ہوئے آ رہے ہیں۔) اس لیے وہ روزانہ فجر ادا کرتے ہی آپ ﷺ کے انتظار میں شہر کے باہر آتے اور دور دور تک نظریں دوڑاتے۔ جب گرمی زیادہ ہو جاتی تو واپس لوٹ جاتے۔ [1]

قُبا میں تشریف آوری:

آخر ایک دن جب کہ سورج خاصا بلند ہو چکا تھا، نبی اکرم ﷺ یثرب کی نواحی بستی ''قبا'' کے قریب پہنچ گئے۔ مدینہ کے لوگ اس وقت حسبِ معمول انتظار کے بعد گھروں کو واپس جا رہے تھے کہ اس دوران مدینہ کے ایک یہودی نے جو اپنے قلعے پر چڑھ کر صحرا کا نظارہ کر رہا تھا، دیکھا کہ بہت دور حضور اکرم ﷺ اور ان کے ساتھی سفید کپڑوں میں ملبوس چلے آ رہے ہیں، تپتی ریت پر سراب میں ان کا عکس جھلک رہا ہے۔ یہودی بے ساختہ پکار نے لگا:

''اہلِ عرب! تمہاری خوش بختی آ گئی جس کے تم منتظر تھے۔''

یہ سنتے ہی انصار نے عربوں کی استقبالیہ رسم کے مطابق ہتھیار سنبھالے اور دیوانہ وار آپ ﷺ کے استقبال کے لیے دوڑ پڑے۔ حضور اکرم ﷺ استقبالیہ جلوس کے درمیان چلتے رہے یہاں تک کہ قُبا میں بنوعمرو بن عوف کی بستی تک پہنچ کر (جہاں اکثر مہاجرین قیام کرتے تھے) کھلے میدان میں رُک گئے اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر (آپ ﷺ کو زحمت سے بچانے کے لیے) خود کھڑے ہو کر لوگوں سے ملنے لگے۔ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو پہلے نہیں دیکھا تھا، وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آ آ کر سلام کرنے لگے۔ اس دوران سورج عین سر پر آ گیا اور گرمی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر اٹھائی اور رسول اللہ ﷺ پر سایہ کر دیا۔ اب سب لوگوں کو پتا چل گیا کہ مخدوم کون ہے اور خادم کون۔ [2] یہ واقعہ پیر ۸ ربیع الاوّل (۲۰ ستمبر ۶۲۲ء) کا ہے۔ [3]

---

① صحيح البخاري، ح: ۳۹۰۶، باب هجرة النبي ﷺ ؛ سيرت ابن هشام: ۱/ ۴۹۲ ② صحيح البخاري، ح: ۳۹۰۶

فائدہ: اس حدیث سے رسول اللہ ﷺ کی انتہائی تواضع اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حد درجہ ادب کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسے تاریخی موقع پر بھی آپ ﷺ نے اپنی حیثیت نمایاں کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ جبکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب کسے کہتے ہیں۔ ادب ہاتھ چومنا اور جوتے اٹھانا نہیں بلکہ اصل ادب یہ ہے کہ مخدوم کو راحت پہنچائی جائے اور زحمت سے بچایا جائے۔ رسول اللہ ﷺ ایک طویل اور تیز رفتار سفر سے تھکے ہوئے تھے، آپ ﷺ کو فوری آرام کی ضرورت تھی۔ ایسے میں راحت رسانی اسی میں تھی کہ مجمع سے فرداً فرداً سلام اور مصافحے کا کام خادم انجام دے دیں۔ اس میں نعوذ باللہ اپنی بڑائی کا کوئی شائبہ تک نہ تھا؛ کیوں کہ وہی ابوبکر رضی اللہ عنہ چند منٹ بعد اسی مجلس میں اپنی چادر اٹھا کر حضور ﷺ پر سایہ کر رہے تھے۔ یہی اصل خدمت اور یہی اصل ادب ہے۔

③ صحیح بخاری میں ہے: ذالک یوم الاثنین من شهر ربيع الأوّل. (صحيح البخاري، ح: ۳۹۰۲، باب هجرة النبي ﷺ) ابن سعد نے قبا میں آمد کی تاریخ کے متعلق دو اقوال نقل کیے ہیں: پیر ۲ ربیع الاوّل، پیر ۱۲ ربیع الاوّل۔ (طبقات ابن سعد: ۱/ ۲۳۳) مگر نامور فلکیات دان اور مؤرخ علامہ ابن قنفذ نے ۸ ربیع الاوّل کی تاریخ کو اختیار کیا ہے۔ (وسیلۃ الاسلام، ص ۴۶) وجہ یہ ہے کہ تقویمی حسابات میں دیگر تاریخیں پیر کے ساتھ منطبق نہیں ہوتیں۔ تقویمی اعتبار سے اس سال ربیع الاوّل کی یکم کو اور پھر ۸ کو پیر تھا جبکہ ۱۲ ربیع الاوّل کو جمعہ تھا۔ راقم نے اس بارے میں ممکنہ شواہد اور تقاویم کو سامنے رکھا ہے جس کے بعد یہی راجح لگتا ہے کہ قُبا میں آمد ۸ ربیع الاوّل کو اور مدینہ میں تشریف آوری ۱۲ ربیع الاوّل کو ہوئی تھی۔ علی محمد خان کی ''تقویم عہدِ نبوی'' بھی یہی کہتی ہے۔

مسجدِ قُبا کی تاسیس:

آپ قُبا میں بنو عمرو بن عوف کے ہاں ٹھہرے، وہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی جو آج بھی "مسجدِ قُبا" کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں آپ نمازیں ادا فرماتے رہے۔[1] یہ دنیا میں رسول اللہ ﷺ کی تعمیر کردہ پہلی مسجد تھی۔

آپ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لوگوں کی رکھوائی ہوئی امانتیں واپس کرنے کی ذمہ داری سونپ کر آئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تین دن میں یہ کام انجام دے کر روانہ ہوئے اور یہیں قُبا میں رسول اللہ ﷺ سے آ ملے۔[2]

مدینہ منورہ میں والہانہ استقبال:

قُبا میں چار دن قیام کر کے جمعہ ۱۲ ربیع الاوّل (۲۴ ستمبر) کو آپ مدینہ کی سمت روانہ ہوئے۔ راستے میں جمعہ کی نماز بنی سالم بن عوف کے محلے کی مسجد میں ادا فرمائی۔ یہ اس سرزمین میں آپ ﷺ کی پہلی نمازِ جمعہ تھی۔[3]

اسی شام آپ ﷺ مدینہ میں داخل ہوئے تو لوگ راستوں، گلیوں اور مکانات کی چھتوں پر آپ ﷺ کا دیدار کرنے کے لیے جمع تھے۔ ہر طرف نعرے لگ رہے تھے:

"اَللّٰهُ اَكْبَر، جَآءَ مُحَمَّد، اَللّٰهُ اَكْبَر، جَآءَ رَسُولُ اللّٰه"[4]

معصوم بچیاں مسرت سے سرشار ہو کر یہ اشعار پڑھ رہی تھیں۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا ... مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاع

"قافلوں کو رخصت کرنے والی گھاٹی کی اوٹ سے چودھویں کا چاند نکلا۔"

وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا ... مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِي

"ہم پر شکر ادا کرنا لازم رہے گا جب تک اللہ کو پکارنے والا کوئی فرد باقی رہے۔"

أَيُّهَا الْمَبْعُوثُ فِينَا ... جِئْتَ بِالْأَمْرِ الْمُطَاع

"اے وہ رسول! جو ہماری طرف بھیجے گئے آپ ایسا دین لائے ہیں جس کی ہر حال میں پیروی کی جائے گی۔"[5]

مدینہ آمد کے باوجود حضور ﷺ نے اپنا قیام چودہ دن تک قُبا میں بنو عمرو بن عوف کے رئیس کلثوم بن ہدم کے ہاں رکھا۔ پیر ۲۲ ربیع الاوّل کو آپ ﷺ بنو نجار کے مسلح افراد کے بہت بڑے جلوس میں مدینہ کی قدیم آبادی میں قیام کے لیے تشریف لائے۔[6] اس دن شہر کے بچے بچیاں یہ کہتے ہوئے دوڑ رہے تھے: "یہ دیکھو رسول اللہ ﷺ آ گئے۔"[7] کچھ یوں پکار رہے تھے: "اللہ کے نبی آ گئے۔ اللہ کے نبی آ گئے۔"[8]

---

① صحیح البخاری، ح: ۳۹۰۶، باب هجرة النبی ﷺ ② سیرت ابن هشام: ۱/۴۹۳
③ سیرت ابن هشام: ۱/۴۹۴ ④ مسند احمد، ح: ۳، ط الرسالة ؛ مسند البزار، ح: ۵۰
⑤ سیرت ابن حبان: ۱/۱۳۹، ۱۴۰ ؛ السیرة الحلبية: ۲/۷۳، ط العلمية ؛ دلائل النبوة للبیهقی: ۲/۲۰۷، ط العلمية
⑥ صحیح البخاری، ح: ۳۹۳۲، کتاب المناقب، باب مقدم النبی ﷺ المدینة ؛ سیرة ابن هشام: ۱/۴۷۸
⑦ صحیح البخاری، ح: ۴۹۴۱، کتاب التفسیر، باب لتركبن طبقا عن طبق ⑧ صحیح البخاری، ح: ۳۹۱۱، باب هجرة النبی ﷺ

بنونجّار کی بچیوں کا نغمہ:

گنجان گلیوں میں لوگوں کی جماعتیں آگے بڑھ بڑھ کر حضور ﷺ کی اونٹنی کی مہار تھامے درخواست کرتیں کہ ہمارے ہاں قیام فرمایئے مگر آپ ﷺ فرماتے: "اونٹنی کو جانے دو۔ یہ اللہ کے حکم کی پابند ہے۔" جب حضور ﷺ اپنے والد کے ننھیال بنونجّار کی گلیوں میں پہنچے تو اونٹنی ایک جگہ از خود بیٹھ گئی۔ بنونجّار کی کم سن بچیاں خوشی سے گانے لگیں:

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِي النَّجَّارِ ۔۔۔ يَا حَبَّذَا مُحَمَّدٌ مِنْ جَارِ

"ہم بنونجّار کی لڑکیاں ہیں۔ کیا ہی خوشی کا مقام ہے کہ محمد ﷺ ہمارے پڑوسی بنے ہیں۔"

ساتھ ہی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا دومنزلہ مکان تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کی درخواست پر ان کے گھر کی نچلی منزل میں قیام فرمایا۔[1] یہودیوں کے عالم عبداللہ بن سلام اس دن اپنے باغ سے کھجوریں اتار رہے تھے، وہ حاضرِ خدمت ہوئے، علاماتِ نبوت کو بخوبی پہچانا اور اسلام لے آئے۔[2]

یثرب مدینۃ النبی ﷺ بن گیا:

یہ شہر اب رسول اللہ ﷺ کا شہر تھا۔ یہ آپ کا مسکن، آپ کے نام لیواؤں کا وطن اور دین اسلام کا پہلا مرکز تھا۔ آپ ﷺ کے تشریف لانے کے بعد ایسا لگتا تھا کہ اس شہر کی ہر چیز ایک نئے رنگ میں ڈھل گئی ہے۔ ایک روشنی تھی جو ہر شے کے اندر اتر گئی تھی۔ اسے ہم حضورِ اکرم ﷺ کی محبت کے سوا کوئی اور نام نہیں دے سکتے۔ یہ تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ تھا، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ صدیوں قدیم ایک شہر کسی کی محبت میں یوں ڈھل جائے کہ اپنا نام تک مٹا دے اور شہر میں آباد قبائل اپنے سابقہ حسب و نسب کو فراموش کر کے اس ایک شخص سے نسبت کے حوالے سے پہچانے جانے لگیں۔ مگر یہاں یہی ہوا۔ لوگ اپنے وطن کے نام "یثرب" کو بھول گئے۔ یہ اب نبی کا شہر تھا۔ اسے "مدینۃ النبی" کہا جانے لگا۔ پہلے لوگ اَوس، خزرج اور ان کی ذیلی شاخوں سے پہچانے جا رہے تھے۔ اب ہر تفریق ایک وحدت میں بدل گئی۔ حضور ﷺ نے انہیں "انصار" کا خوبصورت نام دیا جس میں دین کی مدد و نصرت کرنے کا حوالہ جھلکتا ہے۔ مکہ سے آئے ہوئے لوگوں کو آپ ﷺ نے 'مہاجرین' کا لقب دیا۔ اب شہر "مدینۃ النبی" تھا اور شہری مہاجرین و انصار۔ اب ہر چیز اسلام سے تعلق کا پتا دیتی تھی اور ہر رشتہ ناتا دین کے لیے قربانی اور جاں سپاری کی بنیاد پر قائم تھا۔

مسجدِ نبوی، اسلام کا نیا مرکز:

یہاں تشریف لاتے ہی حضور ﷺ نے سب سے پہلے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے سامنے زمین کے خالی قطعہ پر ایک مسجد تعمیر کرنے کی طرف توجہ دی۔ یہ زمین دو یتیم لڑکوں: سہل اور سہیل کی ملکیت تھی، انہوں نے مسجد کی

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۳۹۱۱، باب هجرة النبی ﷺ ؛ دلائل النبوة للبیهقی: ۲/۲۰۸، ۲۰۹، ط العلمیة

[2] صحیح البخاری، ح: ۳۹۱۱، باب هجرة النبی. اس روایت کے الفاظ: "وهو فی النخل لاهله يخترف لهم." سے بعض حضرات کا یہ استدلال بے جا ہے کہ ہجرت موسم سرما میں ہوئی؛ کیوں کہ کھجوریں موسم سرما میں نہیں اتاری جاتیں۔ اس سے تو بالعکس مزید تاکید ہوتی ہے کہ وہ خزاں کا آغاز یعنی ماہِ ستمبر تھا۔

تعمیر کا سن کر زمین ہدیے میں دینا چاہی مگر آپ ﷺ نے اصرار کر کے انہیں قیمت دلوائی اور مسجد کی تعمیر شروع کرا دی۔ مسجد کا قبلہ بیت المقدس کے رُخ پر تھا۔ اس کی دیواریں کچی اینٹوں سے، ستون کھجور کے تنوں سے اور چھت کھجور کی شاخوں سے بنائی گئی۔ لمبائی ۱۰۵ فٹ اور چوڑائی ۹۰ فٹ تھی۔ ①

حضور ﷺ نے مسجد کی تعمیر میں بذاتِ خود حصہ لیا۔ آپ اینٹیں اُٹھا اُٹھا کر لاتے اور مسلمان یہ دیکھ کر مزید جوش وجذبے سے کام کرتے۔ آپ ﷺ ان کی ہمت اور دلچسپی دیکھ کر فرماتے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّ الْاَجْـرَ اَجْـرُ الْاٰخِرَۃ فَـارْحَـمِ الْاَنْـصَارَ وَالْـمُـھَـاجِـرَۃ

''اے اللہ! اصل اُجرت تو آخرت کی اُجرت ہے۔ پس تو انصار اور مہاجرین پر رحم فرما۔'' ②

مواخاۃ، اسلامی بھائی چارہ:

حضور ﷺ کے سامنے ایک اہم ترین مسئلہ مہاجرین کی آبادکاری تھا جو اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں آ گئے تھے، چنانچہ آپ نے اس کے حل کے لیے ''مواخاۃ'' کا معاہدہ کرا کے ہر بے کس مہاجر کو کسی نہ کسی خوشحال انصار کا بھائی بنا دیا تاکہ اسے تکلیف اور پریشانی کے وقت یہاں رشتہ داروں کی کمی محسوس نہ ہو۔ انصار نے اس موقع پر بے مثال ایثار کا ثبوت دیا۔ اپنے مہاجر بھائیوں کو مکانات، باغات اور دولت میں سے نصف کی پیش کش کر دی۔ مہاجرین نے جواب میں قناعت اور شکر گزاری کا مظاہرہ کیا اور بقدرِ ضرورت مدد لینے پر ہی اکتفا کیا۔ ③

اہل وعیال کی مکّہ سے مدینہ منتقلی اور ان کی رہائش کا انتظام:

حضورِ اقدس ﷺ سات ماہ تک حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان میں رہائش پذیر رہے۔ اس دوران آپ نے اپنے خادموں: زید بن حارثہ اور ابورافع رضی اللہ عنہما کو خفیہ طور پر مکّہ بھیج کر پیچھے رہ جانے والے اہل وعیال: حضرت سَودہ، حضرت اُمِ کلثوم اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہن کو مدینہ بلوالیا۔ حضرت رُقیّہ رضی اللہ عنہا پہلے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ آ چکی تھیں۔ البتہ بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنے شوہر ابوالعاص کے ہاں مکہ میں تھیں۔ ④

اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹیوں: حضرت اسماء، حضرت عائشہ صدیقہ اور بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہم کو بلوالیا۔ جب مسجد نبوی اور پھر اس کے ساتھ حضور ﷺ کی رہائش گاہ کی تعمیر مکمل ہوگئی تو آپ اپنے مکان میں تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ کی اس رہائش گاہ میں حضرت سَودہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لئے الگ الگ حجرے تعمیر کیے گئے۔ اس موقع پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی نہایت ہی سادگی سے عمل میں آئی اور وہ حضور ﷺ کے گھر اپنے حجرے میں منتقل ہوگئیں۔ یہ شوال سن ۱ہجری کا واقعہ ہے۔ ⑤

---

① سبل الهدیٰ والرشاد: ۳۳۸/۳ ② صحیح البخاری، ح: ۳۹۳۲، باب مقدم النبی ﷺ واصحابه الی المدینة

③ صحیح البخاری، ح: ۲۷۸۰، ۲۷۸۱، ۲۷۸۲، کتاب المناقب، باب اخاء النبی ﷺ؛ سیرۃ ابن ہشام: ۱/۴۹۹، ۵۰۴، ۵۰۵

④ البداية والنهاية: ۴۹۹/۴ ⑤ الکامل فی التاریخ: ۶/۲، دار الکتاب العربی

اصحاب صفہ، پہلا اسلامی مدرسہ:

قرآنِ مجید کا نزول مسلسل جاری تھا اور مدینہ کی نئی اسلامی ریاست کے ماحول کے مناسب آیات نازل ہوتی جارہی تھیں جن میں احکام کا تناسب مکی سورتوں سے بہت زیادہ تھا۔ مہاجرین میں سے بہت سے افراد ایسے نادار تھے کہ اب تک ان کے گھر بار اور معاش کا کوئی انتظام نہیں ہوسکا تھا۔ ان کو مسجد نبوی کے جنوبی گوشے میں جو حضور ﷺ کے حجرے کے قریب تھا، ایک چبوترے پر جگہ دے دی گئی تھی جسے صفہ کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ جو اصحابِ صفہ کے نام سے مشہور ہوئے، دن بھر وہیں رہتے، قرآن کریم کی آیات اور حضور ﷺ کے ارشادات سنتے اور انہیں یاد کرتے۔ رات کے وقت نبی اکرم ﷺ انہیں کھانے کے لیے ان دیگر صحابہ کے ساتھ بھیج دیا کرتے تھے جو اپنی معاش کا انتظام کر چکے تھے۔ صفہ کے بعض فقراء کو نبی اکرم ﷺ خود اپنے ساتھ گھر لے جایا کرتے تھے۔

ظہر، عصر اور عشاء میں چار رکعات کی فرضیت۔ اذان کی مشروعیت:

اب تک ظہر، عصر اور عشاء کی فرض نمازیں دو، دو رکعت پڑھی جاتی تھیں۔ مدینہ میں آنے کے کچھ دنوں بعد دو، دو کی جگہ چار چار رکعات فرض کردی گئیں۔ [1]

مسلمان اس وقت تک اوقاتِ صلوٰۃ کا اندازہ کر کے مسجدوں میں جمع ہوجاتے تھے۔ نماز کے لیے بلانے کا کوئی طریقہ مقرر نہیں تھا۔ یہودیوں اور نصرانیوں کے طریقے مثلاً باجے یا گھنٹیاں بجانے کو حضور ﷺ نے پسند نہیں فرمایا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کو خواب میں اذان کا طریقہ تلقین فرمایا اور حضور ﷺ نے اس طریقے کو جاری فرمادیا۔ پہلی اذان کا اعزاز حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو ملا اور وہ مسجد نبوی کے مستقل مؤذن مقرر ہوئے۔ [2]

اب صدیوں بعد اللہ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کی زمین پر ایک پرامن ماحول میسر آیا تھا جہاں وہ آزادانہ طور پر اللہ کا نام بلند کرسکتے تھے، اس کی توحید کی دعوت دے سکتے تھے اور اس کے دین کو پھیلانے کی ممکنہ تدابیر کو آزما سکتے تھے۔ یہ وہ معاشرہ تھا جس کی صدیوں سے روحِ انسانی کو تلاش تھی چنانچہ یہودیوں کے عالم عبداللہ بن سلام جو حق کے متلاشی تھے، اسلام اور پیغمبر اسلام کی ان خوبیوں کو نظر انداز نہ کرسکے جن کا ذکر گزشتہ کتب میں بھی تھا۔ وہ اسلام لے آئے اور اس معاشرے کا ایک حصہ بن گئے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جو طویل زمانہ پہلے آتش پرستی سے توبہ کرکے ایران سے نکلے تھے اور حق کی تلاش میں کتنے ہی پادریوں اور راہبوں کی خدمت میں رہ چکے تھے، پیغمبر آخر الزماں ﷺ کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ دنیا کی نجات اس ہستی کی پیروی میں ہے۔ دل کی دھڑکنوں پر لبیک کہتے ہوئے وہ بھی مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ سچائی اور حق کی طلب گار روحوں کو مدینہ میں اپنی تشنگی دور کرنے کے لیے چشمہ شیریں مل گیا تھا۔ [3]

---

① مختصر سیرۃ الرسول، شیخ محمد بن عبدالوہاب، ص ۱۴۰، ۱۴۱، ط وزارۃ الشؤون الاسلامیہ سعودی عرب

② سیرۃ ابن ہشام: ۱/۵۰۸، ۵۰۹..... عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ایسا خواب دیکھا تھا۔ (فتح الباری: ۲/۸۰، ۸۱)

③ اسد الغابۃ، تر: عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

اسلامی ریاست کولاحق خطرات:

مدینہ منورہ میں امن وامان کا ماحول ملنے کے باوجود اسلامی ریاست خطرات کی زد سے باہر نہ تھی۔ مدینہ منورہ میں دو گروہ مسلمانوں کے سخت مخالف تھے: ❶ منافقین ❷ یہودی

منافقین وہ بدقسمت لوگ تھے جو اسلام کی روشنی کو اتنے قریب سے دیکھ کر بھی محروم تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو نفاق کے مریض تھے۔ نفاق یا دوغلا پن، ایک نفسیاتی کمزوری اور اخلاقی بیماری ہے جس کی ابتدا حسد، جلن اور نفرت سے ہوتی ہے۔ یہ ایسے ماحول میں پروان چڑھتی ہے جہاں دشمنی نکالنے کا کھلا موقع نہ ملے، جہاں کسی سے کھلم کھلا ٹکر لینا خطرناک ہو۔ اس مرض کا زیادہ تر وہ لوگ شکار ہوتے ہیں جو طبعی طور پر کینہ پرور، حاسد اور مغرور ہوں اس لیے حق بات انہیں ہضم نہ ہوتی ہو، اس کے ساتھ بزدل مگر مکار، چالاک اور چرب زبان ہوں۔ ایسے لوگ بزدلی کی وجہ سے حق کی کھلی دشمنی اختیار کرتے ہوئے ڈرتے ہیں اور چالاکی و چرب زبانی کی صلاحیت استعمال کرتے ہوئے اپنے منفی خیالات اور تخریبی عزائم پر وفاداری، خیرخواہی اور ہمدردی کا پردہ ڈال لیتے ہیں۔

مکہ میں دشمنوں کو اسلام کے خلاف سب کچھ کر گزرنے کی طاقت تھی، اس لیے وہاں نفاق کا سوال ہی نہیں تھا۔ مدینہ میں اسلام کو قوت حاصل ہوگئی تھی، اس لیے یہاں اسلام اور نبی کریم ﷺ کے مخالفین دب گئے اور ان کی مخالفت نے منافقت کا رنگ اختیار کرلیا۔ اکثر منافقین کا تعلق اوس اور خزرج ہی سے تھا جن کی اکثریت سچے مسلمانوں پر مشتمل تھی مگر انہی گھرانوں میں کہیں کہیں منافقین بھی چھپے ہوئے تھے۔

عبداللہ ابن اُبَی: رئیس المنافقین:

منافقانہ روش میں سب سے آگے خزرج کا سردار عبداللہ بن اُبَی بن سلول تھا جسے کچھ مدت پہلے اوس اور خزرج اپنا مشترکہ حکمران ماننے پر آمادہ تھے، اس کی رسم تاج پوشی باقی تھی کہ شمع رسالت کی روشنی نے اس کے عقیدت مندوں کو اپنا حلقہ بگوش بنالیا۔ اس دن سے وہ، حضور نبی کریم ﷺ سے سخت حسد اور نفرت کرنے لگا، وہ حضور ﷺ کو اپنی بنی بنائی بادشاہت کے خاک میں مل جانے کا ذمہ دار سمجھتا تھا، اس لیے اس نے مدینہ کے انقلاب سے ایک قسم کی لاتعلقی اختیار کرلی اور پس منظر میں چلا گیا۔ حضور ﷺ کی تشریف آوری کے بعد بھی وہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں ٹال مٹول کرتا رہا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکثر منافقین سن رسیدہ اور ادھیڑ عمر لوگ تھے۔ ان میں ایک دو کے سوا کوئی نوجوان نہ تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ نوجوانوں میں نئی سچائی قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے اور وہ حق کے لیے قربانی دینے پر جلد آمادہ ہوجاتے ہیں، جبکہ بڑے بوڑھے اپنے تجربے اور مرتبے کے زعم میں عموماً حق کے سامنے جھکنے سے انکار کردیتے ہیں۔ مکہ میں اسلام لانے والے بھی زیادہ تر نوجوان تھے۔ مدینہ میں یہ تجربہ پھر سامنے آیا۔ خود عبداللہ ابن اُبَی کے بیٹے عبداللہ اور بیٹی جمیلہ سچے دل سے اسلام لے آئے تھے مگر وہ اپنے نفاق پر بدستور جما رہا۔

ایک دن رسول اللہ ﷺ چند صحابہ کے ساتھ گدھے پر سوار محلہ بنو الحارث بن خزرج کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔ مدینہ میں کچھ لوگ ابھی تک اسلام سے محروم تھے اس لیے راستے میں ایک جگہ غیر مسلم عرب، یہودی اور مسلمان اکٹھے بیٹھے دکھائی دیے، عبداللہ بن اُبی ان میں نمایاں تھا۔ سواری کے گزرنے سے گرد اُڑی تو ابن اُبی نے کپڑے سے منہ ڈھانک لیا اور حقارت آمیز لہجے میں بولا: ''دھول مت اُڑاؤ۔''

نبی اکرم ﷺ دعوت کی نیت سے وہاں ٹھہر گئے، سب کو سلام کیا اور قرآنِ مجید کی چند آیات سنائیں۔ عبداللہ بن اُبی کہنے لگا: ''صاحب! اگر تمہاری بات سچ بھی ہو پھر بھی مجھے یہ انداز پسند نہیں، ہماری محفلوں میں آکر ہمیں تبلیغ مت کیا کرو۔ جو تمہارے پاس جائے اس کو سنایا کرو۔''

اس جسارت پر حضور اقدس ﷺ کے ہمراہی مشتعل ہو گئے، لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے، ایک ہنگامہ مچ گیا۔ آپ ﷺ نے بمشکل سمجھا بجھا کر سب کو ٹھنڈا کیا، بہر حال اس واقعے سے یہ پتا چل گیا کہ عبداللہ بن اُبی کے دل میں حسد کی آگ شدت سے بھڑک رہی ہے۔ [1]

مدینہ میں عبداللہ بن اُبی کے ہم خیال کچھ لوگ اور بھی تھے جن کے نزدیک وہ سچ مچ مدینہ کی بادشاہت کا حق دار تھا اور مہاجرین اس کی حق تلفی کا سبب بنے تھے، چنانچہ انہوں نے دلوں میں رسول اللہ ﷺ اور مہاجرین سے نفرت پال لی۔ ان سب نے اسلام کی سچائی کے روشن دلائل سے آنکھیں بند کر لی تھیں اور آپ ﷺ کی دعوت کو سیاسی مفادات کے حصول کا ایک ڈھونگ تصور کر لیا تھا۔ یہ لوگ سہل پسندی اور بزدلی کے مریض تھے۔ کسی بھی معاملے کو زمینی حقائق کے مطابق پرکھنے کی بجائے اسے اس پہلو سے دیکھتے تھے کہ اس میں اپنی جان و مال کا کتنا تحفظ ہے اور اس میں دولت، سرداری اور منصب کے حصول کے کتنے مواقع ہیں مگر دوسری طرف ان کے اکثر رشتے دار مسلمان ہو چکے تھے، ان سے کٹ کر رہنا بھی خود کو سخت آزمائش میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اس لیے عبداللہ ابن اُبی اور اس کے کئی منافق دوستوں نے کچھ عرصہ بعد ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا مگر اندر ہی اندر اس نئے مذہب کی جڑیں کاٹنے اور اپنی گم شدہ سرداری واپس لینے کے لیے بے چین رہے۔

یہودی:

منافقین سے بھی بڑا اندرونی مسئلہ یہود کے پڑوس کا تھا جو مسلح جنگجو بھی تھے اور اقتصاد و معیشت میں مسلمانوں پر غالب بھی۔ اگرچہ یہودی عقیدۂ توحید و رسالت اور آسمانی کتب پر ایمان کے ساتھ ساتھ کئی شرعی احکام میں بھی مشرکین کی بہ نسبت مسلمانوں سے قریب تھے اور حضور ﷺ کی ہجرت سے پہلے اُن کا کردار مسلمانوں اور قریشِ مکہ کے معاملے میں غیر جانب دارانہ رہا تھا مگر اب آپ ﷺ کی تشریف آوری سے ان کے مفادات کو سخت زک پہنچی تھی۔ اس سے پہلے وہ اپنی عددی کمی کے باوجود اوس اور خزرج کے مقابلے میں ایک مضبوط قوت مانے جاتے رہے

[1] صحیح البخاری، ح: ۶۲۵۴، کتاب الاستئذان، باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین

تھے؛ کیوں کہ یہ دونوں عرب قبیلے باہم دست وگریباں تھے۔ مگر اب حضور ﷺ کے پرچم تلے ان کے پائیدار اتحاد کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہود کو مدینہ میں دب کر رہنا پڑے گا۔

جہاں تک حضور ﷺ کی رسالت کا تعلق ہے، یہودیوں سے زیادہ آپ کی صفات اور علامات سے کوئی اور قوم واقف نہیں تھی مگر ان کا خاندانی گھمنڈ اور نسلی غرور انہیں اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ نسل اسرائیلی کے سوا کسی اور قوم کے نبی پر ایمان لائیں۔ ان وجوہ سے مدینہ تشریف لاتے ہی آپ ﷺ نے یہودیوں کی جانب سے کسی ممکنہ شرانگیزی سے بچاؤ کو ضروری سمجھا تھا۔

میثاقِ مدینہ:

حضور ﷺ ریاست کو مضبوط خطوط پر استوار کرنے اور اسے اندرونی و بیرونی خطرات سے محفوظ رکھنے کے حتی الامکان انتظامات فرمانا چاہتے تھے، چنانچہ آپ نے مدینہ، اس کے اطراف میں بسنے والے قبائل اور یہود سے ایک معاہدہ کرلیا جو قانون کی بالادستی، ظلم وزیادتی کے خلاف یکجہتی، بیرونی حملہ آوروں کے مقابلے میں اتحاد، مذہبی معاملات میں آزادی، ایک دوسرے کے احترام، باہم مکروفریب سے اجتناب، معاشرے کے کمزور اور نادار افراد کی امداد اور سابقہ اچھی روایات کی برقراری کی یقین دہانی پر مشتمل تھا۔ اس معاہدے کو ''میثاقِ مدینہ'' کہا جاتا ہے جو دنیا کی پہلی اسلامی ریاست کا شہری دستور تھا۔ اس معاہدے کے ذریعے حضور ﷺ نے مہاجرین وانصار کے علاوہ مدینہ میں آباد تمام قوتوں کو ایک صف میں متحد کردیا تھا۔ معاہدے کی اہم شقیں یہ تھیں:

1. ہم سب غیروں کے مقابلے میں متحد ہیں۔
2. خون بہا اور قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیے کا سابقہ رواج برقرار رہے گا۔
3. مجرم کو سب پکڑ کر سزا دیں گے، چاہے وہ ہم میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔
4. مسلمان، کافروں کے مقابلے میں باہم تعاون کریں گے۔
5. معاہدے میں شریک غیر مسلم قریش کے کسی شخص کو پناہ نہیں دیں گے۔
6. یہودی اپنے مذہبی معاملات میں آزاد ہوں گے۔ مسلمان اپنے دین پر اور یہود اپنے دین پر چلیں گے۔
7. یہودی اور مسلمان اپنے اپنے مصارف الگ الگ اٹھائیں گے۔ جنگوں میں یہودی مسلمانوں سے مالی تعاون کریں گے۔
8. مدینہ پر حملہ آور لشکر کے مقابلے میں، اس معاہدے میں شریک تمام فریق متحد ہو کر لڑیں گے۔
9. معاہدے میں شریک فریقوں کا ہر اختلاف اور تنازع رسول اللہ ﷺ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔[1]

ان انتظامات کے ذریعے رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی اس مختصر شہری ریاست کو ایسی مثالی مملکت کی اساس بنادیا

[1] سیرۃ ابن ہشام: ۱/۵۰۱ تا ۵۰۴

جہاں انسانوں کو دین وایمان، عزت وآبرو اور جان ومال کا مکمل تحفظ حاصل تھا۔ یہ انسانوں کو ان کے رب کی طرف سے دیے ہوئے حقوق فراہم کرنے کی پہلی کامیاب کوشش تھی۔ یہ ایک ایسے پرامن معاشرے کا قیام تھا جو بہت جلد مدینہ سے نکل کر نہ صرف پورے جزیرۃ العرب بلکہ پوری دنیا پر غیر معمولی اثرات مرتب کرنے والا تھا۔

قریش کی طرف سے مسلمانوں کو مدینہ سے نکلوانے کی کوششیں:

اسلام کا یہ نخلِ نوخیز آندھیوں سے محفوظ نہ تھا۔ قریش برابر مدینہ کی ٹوہ لے رہے تھے۔ وہ اسلام کو پھلتا پھولتا کہاں دیکھ سکتے تھے۔ عملی اقدام کے طور پر سب سے پہلے انہوں نے مدینہ کے رئیسوں کو ورغلانے کی کوشش کی اور انہیں دھمکایا کہ مسلمانوں کو پناہ دینے کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ انہوں نے خزرج کے سردار عبداللہ بن اُبَیّ کو خط لکھا:

''تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ اگر تم ان کو اپنے ہاں سے بے دخل نہیں کرو گے تو ہم اپنا لشکر لے کر تم پر چڑھ دوڑیں گے، تمہیں قتل کر کے تمہاری عورتوں کو باندیاں بنا لیں گے۔''[1]

قریش کو اس وقت تک قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ عبداللہ بن اُبَیّ خود مسلمانوں کی آمد سے کتنا بد دل ہے اور انہیں مدینہ سے نکال باہر کرنا چاہتا ہے، مگر چونکہ اس وقت تک خود عبداللہ بن اُبَیّ کا اکثر قبیلہ مسلمان ہو چکا تھا اس لیے وہ چاہتے ہوئے بھی قریش کے اس مطالبے کی تعمیل نہیں کر سکتا تھا۔

قریش کی طرف سے راستوں کی ناکہ بندی:

اس کے ساتھ ساتھ قریش نے مدینہ کی ناکہ بندی کرنے کی بھی پوری کوشش شروع کر دی۔ مکہ سے مدینہ تک آباد اکثر قبائل قریش کے حلیف تھے، قریش نے سب کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا دیا اور جنوب کی طرف سے بھی مسلمانوں کی راہ بند کر دی۔ یہی وجہ تھی کہ یمن اور اس کے گرد ونواح میں اسلام قبول کرنے والے لوگوں کا مدینہ آنا جانا ایک مدت تک بہت مشکل رہا؛ کیوں کہ انہیں قریش اور اس کے حلیف قبائل کے درمیاں سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔[2]

مدینہ پر قریش کے حملے کا خطرہ:

قریش کی ان سرگرمیوں سے مسلمانوں کو ہر لحظہ یہ خطرہ رہتا تھا کہ کسی وقت مدینہ پر حملہ نہ ہو جائے، اسی وجہ سے مدینہ میں مسلمانوں کو ہر گھڑی مدافعت کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا، ان کا معمول تھا کہ ہتھیار باندھ کر مسلح حالت میں سوتے تھے۔[3] آنحضرت ﷺ کو قریش کے ناپاک عزائم کی خبروں سے اس قدر تشویش تھی کہ راتوں کو چوکنا اور بیدار رہا کرتے تھے۔[4] اس دوران ایک بار مکہ کے ایک رئیس کُرز بن جابر فہری نے مدینہ کی چراگاہوں پر حملہ بھی کیا

---

[1] سنن ابی داوُد، ح: ٣٠٠٤، باب فی خبر النضیر، ط المکتبة العصریة، بیروت

[2] صحیح البخاری، ح: ٥٣، کتاب الایمان، باب اداء الخمس من الایمان ۔ صحیح مسلم، ح: ١٢٤، کتاب الایمان، باب الامر بالایمان باللہ ورسولہ،

[3] لباب النقول فی اسباب النزول للسیوطی، سورة النور، آیت: ٥٥ ﴿وعد اللہ الذین امنوا﴾

[4] کان رسول اللہ ﷺ اول ماقدم المدینة یسھر من اللیل. (السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ٨١٦٠، کتاب المناقب، باب سعد بن مالک رضی اللہ عنہ)

اور حضور ﷺ کے مویشی لوٹ لیے۔ یہ واقعہ ربیع الاوّل سن ۲ ہجری کا ہے۔[1]

جہاد کی اجازت:

قریش کے یہ تمام اقدامات خطرے کی گھنٹی تھے۔ اب مدینہ کی اسلامی ریاست کا خاموش بیٹھے رہنا اپنی بقا و سلامتی کو نظر انداز کرنے کے مترادف تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب قرآنِ مجید نے جہاد کی اجازت دی۔ سورۂ حج کی آیات نازل ہوئیں:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ○ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ○

''وہ لوگ جن سے لڑائی کی جا رہی ہے، انہیں (جہاد کی) اجازت ہے کیوں کہ ان پر ظلم ہوا ہے اور اللہ ان کی مدد پر بلاشبہ قدرت رکھتا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے گھروں سے ناحق نکالا گیا ہے، صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے۔''[2]

اس ابتدائی مرحلے میں جہاد کی اجازت دی گئی تھی، فرضیت کا حکم ابھی نہیں آیا تھا، شاید اس تدریجی انداز سے صحابہ کی ہمت اور ولولے کو جانچا جا رہا تھا۔ آیت کے ظاہری الفاظ سے اجازت جھلک رہی تھی مگر حالات کا دباؤ اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر بلا تاخیر لڑنے پر مجبور کر رہا تھا۔

مکہ میں جہاد کی اجازت کیوں نہ دی گئی؟

مکہ میں جہاد کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ وہاں حکم تھا: ﴿كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ﴾ (اپنے ہاتھ تھام کر رکھو۔) اگرچہ وہاں بھی حضرت عمر، حضرت حمزہ، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم جیسے بہادر اسلام لا چکے تھے۔ یہ اتنے طاقتور اور دلیر ضرور تھے کہ حضور ﷺ کے اشارے پر حسبِ ضرورت کفار کے مظالم کا جواب تلوار سے دے سکتے تھے، کسی ہنگامی موقع پر دو چار مشرکین کو مار سکتے تھے، ان کی حویلیوں اور تجارتی گوداموں کو نذرِ آتش کر سکتے تھے، مگر ان جذباتی کوششوں سے مزید اشتعال پھیلتا اور دعوت کی تھوڑی بہت گنجائش بھی مسدود ہو جاتی اور مسلمانوں کے مصائب ہی میں اضافہ ہوتا۔ اس لیے صبر اور برداشت کا حکم دیا گیا۔ اب حالات بدل گئے تھے، ایک ریاست مل گئی تھی۔ ریاستی امور کو سنبھالنے کا نام سیاست ہے اور سیاست کا ایک حصہ عسکری معاملات ہیں جو دین کی سربلندی کے لیے ہوں تو انہیں اسلام ''جہاد'' کا نام دے کر ایک عظیم عبادت قرار دیتا ہے۔

مکہ میں چونکہ اسلامی ریاست نہ تھی اس لیے سیاست ممکن تھی نہ جہاد۔ مدینہ میں ریاست مل گئی تھی اور ظاہر بات ہے کہ ریاست کی تشکیل کے ساتھ ہی اربابِ حکومت پر اس کی حفاظت اور دفاع کی ذمہ داری بھی عائد ہو جاتی ہے اسی

[1] الإصابة، ترجمة: كرز بن جابر رضی اللہ عنہ۔ کرز بن جابر رضی اللہ عنہ کچھ مدت بعد اسلام لے آئے اور غزوۂ فتح مکہ میں شہید ہوئے۔ (الاستیعاب: ۳/ ۱۳۱۰)
[2] سورة الحج، آیت: ۳۹، ۴۰

طرح ریاست کے دشمنوں سے نمٹنا اوران کی ہر وقت سرکوبی کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔اس لیے اس حقیقی ضرورت کے پیدا ہوتے ہی جہاد کو مشروع کر دیا گیا۔

جہاد کا مقصد:

جہاد کا مقصد یہ نہیں تھا کہ لوگوں کو زبردستی اسلام میں داخل کیا جائے۔اسلام تو دل سے ایک سچائی کو مان لینے کے بعد زبان سے اس کا اقرار کرنے کا نام ہے۔یہ حقیقت کہ دل کے فیصلے زبردستی نہیں ہوتے ،رسول اللہ ﷺ سے بہتر کون جان سکتا تھا،اسی لیے آپ کی سیرت میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس سے کسی کو جبراً مسلمان بنانا ثابت ہو سکے۔مکہ کے مہاجر ہوں، مدینہ کے انصار ہوں یا دیگر علاقوں کے مسلمان،سب نے دعوت سے متاثر ہو کر اپنی رضا اور خوشی سے اسلام قبول کیا،جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام ایک عقیدے کی حیثیت سے اپنی اشاعت میں تلوار چلانے کا نہیں،ترغیب دینے اور دلائل پیش کرنے کا قائل ہے۔تلوار کی ضرورت اسلام کو درپیش خطرات کی روک تھام اور اسلام مخالف قوتوں کی بالادستی کے خاتمے کے لیے پڑتی ہے؛ کیوں کہ کہ عموماً افراد جب ایک جمعیت یا حکومت کی شکل اختیار کرتے ہیں تو اس حیثیت میں وہ مخالف فریق کی دعوت سننے کے روادار نہیں ہوتے بلکہ قومی حمیت اور مذہبی تعصب میں دُھت ہو کر ریاستی طاقت کا مظاہرہ کرنے میں ذرا دیر نہیں لگاتے ،ایسے میں وہ صرف طاقت کی زبان مانتے ہیں،لہٰذا اسلام بھی ،مخالف قوتوں کو سرنگوں کرنے ،ریاستی حیثیت سے اپنی بالادستی قائم کرنے اور اسلامی نظام کو نافذ کر کے انسانیت کو دیگر باطل نظاموں کی زیادتیوں سے آزاد کرانے کے لیے جہاد کا راستہ اختیار کرتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو اس کا حکم دیتا ہے۔فرضیت جہاد کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ لوگوں کی گردنوں پر تلوار رکھ کر کہا جائے کہ مسلمان ہو جائیں،اسلام جہاد کے ساتھ ہی جزیہ کی صورت کھلی رکھتا ہے اور کفار کو اسلامی مملکت کا غیر مسلم شہری (ذمی) بنا کر ان کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے،جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام کبھی بھی غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔

پھر اسلام نے جہاد کے بھی اصول اور آداب مقرر کر دیے ہیں،عین جنگ کے دوران بھی اسلام صرف انہی لوگوں کو قتل کی اجازت دیتا ہے جو برسر میدان آتے یا اسلام کو مٹانے کے منصوبے بناتے ہیں۔عورتیں، بچے، بوڑھے اور مذہبی قائدین جو لڑائی میں حصہ نہیں لیتے مامون قرار دیے گئے ہیں۔وہ لوگ جو کسی دباؤ سے مجبور ہو کر مقابلے پر آ گئے ہوں انہیں بھی محفوظ رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔غزوۂ بدر میں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا:''بنی ہاشم میں سے کوئی سامنے آئے تو اس کو قتل نہ کرنا؛ کیوں کہ وہ اپنی خوشی سے جنگ میں شریک نہیں ہوئے بلکہ ان کو زبردستی لایا گیا ہے۔''[1]

اسلامی جہاد مغربی اقوام کی جنگوں کی طرح اندھا دھند لڑائی نہیں،جس میں مرد،عورتوں اور بچوں سمیت شہروں کے شہر انتہائی بے دردی سے ملیامیٹ کر دیے جاتے ہیں۔یہ امن کے دشمنوں کو مٹانے ،مظلوموں کو انصاف دلوانے ،ظالم کو

[1] تاریخ الاسلام للذھبی: ۵۸/۲، تدمری

جھانے، دعوتِ توحید کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے اور اسلام کو سربلند کرنے کی خاطر کی جانے والی جدوجہد ہے، جسے مسلمان اللہ کی رضا، اخروی ثواب اور جنت کے حصول کی نیت سے لڑتے ہیں۔

اندرونی اور بیرونی خطرات:

''جہاد'' اس ابتدائی مرحلے میں بھی حضور ﷺ کے سامنے اپنے وسیع تر مفہوم میں واضح تھا، یہ اسلامی ریاست کو چلانے اور اسلامی سیاست کو قائم رکھنے کا ایک اہم ستون تھا۔ جہاد صرف تلوار چلانے اور حملہ کرنے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک اسلامی ریاست کو محفوظ رکھنے، اس کے دشمنوں سے نمٹنے اور حق کو ریاستی طاقت کے ساتھ سربلند کرنے، دین کو پھیلانے اور کفار کی سازشوں کو ناکام بنانے کا نام ہے۔

حضور ﷺ اس سے قبل کسی فوج یا قبیلے کے سردار نہیں رہے تھے، نبوت کے بعد بھی آپ ﷺ کی زندگی کے شب و روز اب تک ایک داعی، روحانی پیشوا اور معلم کے طور پر گزرے تھے مگر مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد جب آپ پہلے سیاسی امور کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں اور پھر عسکری امور کی ذمہ داری بھی آپ پر آن پڑتی ہے تو آپ ﷺ ایک معجزانہ صلاحیت کے ساتھ یہاں سیاسی و عسکری معاملات میں سیادت کی چوٹی پر نظر آتے ہیں۔

مدینہ کی اسلامی ریاست کے لیے سب سے بڑا بیرونی خطرہ قریش تھے اور اندرونی خطرہ یہود۔ حضور ﷺ نے ''میثاقِ مدینہ'' کے ذریعے اندرونی خطرے پر ایک حد تک قابو پالیا تھا مگر بیرونی خطرہ بدستور موجود تھا۔ قریش نے اب تک مدینہ کی جدید ریاست کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس کی سالمیت کے خلاف ان کی سازشیں جاری تھیں، مکہ سے مدینہ کے نواح تک آباد اکثر قبائل قریش کے حلیف تھے جنھیں مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جاسکتا تھا۔ سب سے زیادہ اشتعال انگیز بات یہ تھی کہ مدینہ کے قرب و جوار کی شاہراہوں کو قریش پہلے کی طرح اب بھی شام کے تجارتی سفر کے لیے استعمال کر رہے تھے، جبکہ نئے حالات میں انہیں مدینہ کی حکومت سے اجازت لے کر یہ راستے استعمال کرنا چاہیے تھے؛ کیوں کہ یہ مدینہ کی حدود سے لگتے تھے، مگر قریش کا گھمنڈ اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ مسلمانوں سے سفارتی تعلقات رکھیں اور راہداری کی اجازت لیں۔ وہ زبردستی اس راستے پر آمد و رفت برقرار رکھ کر اپنی دھاک بٹھانا چاہتے تھے۔

ابتدائی مہمات:

نبی اکرم ﷺ نے قریش کو ان کی اوقات یاد دلانے اور اسلامی ریاست کو ان کی متوقع سازشوں اور خطرات سے بچانے کے لیے مختلف تدابیر اختیار فرمائیں۔ آپ ﷺ نے مدینہ کے مغرب میں ساحل تک بسنے والی آبادیوں اور قبائل سے معاہدے کیے اور انہیں ایک وفاق کے تحت لانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ نے ساٹھ مہاجرین کے ساتھ وہ سفر کیا جسے پہلا غزوہ ''ابواء'' کہا جاتا ہے، یہی وہ جگہ تھی جہاں آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ آپ کو تنہا چھوڑ کر فوت ہوئی تھیں اور یہیں اُن کی قبر تھی۔ یہاں آباد بنوضمرہ سے اتحاد و تعاون کا معاہدہ ہوا۔ یہ صفر ۲ ہجری کا واقعہ ہے۔[1]

[1] البدایة والنهایة: ۲۲/۵ ...... ابن حبیب کے بقول اوائل صفر ۲ ہجری میں روانگی اور یکم ربیع الاول کو واپسی ہوئی۔ (المحبر، ص ۱۱۰)

جمادی الاولیٰ میں حضور ﷺ "عُشَیرَہ" گئے اور بنو مُدلج سے عہد و پیمان کیا۔[1] اس طرح "جُہینہ" قبیلے کو جو مدینہ سے تیس میل (۴۹ کلومیٹر) دور پہاڑوں پر آباد تھا، کم از کم اس حد تک آمادہ کر لیا گیا کہ وہ لڑائی میں قریش کا ساتھ نہیں دیا کریں گے۔[2] اسی سال آپ ﷺ اوائلِ شعبان میں "یَنبع" گئے۔ پھر وسطِ شعبان میں "سفوان" تشریف لے گئے جہاں بنو غِفار اور بنو اَسلم سے اسی طرح کا حلیفانہ معاہدہ ہوا۔[3]

یہ تمام قبائل مدینہ اور بحیرۂ احمر کے ساحل کی درمیانی پٹی میں شام کی شاہراہ کے قرب و جوار میں آباد تھے، ان کا ریاستِ مدینہ کے زیرِ اثر آنا قریش کے لیے یقیناً پریشان کن تھا؛ کیوں کہ اس طرح ان تجارتی قافلوں کی آمد و رفت مزید خطرات سے دوچار ہو رہی تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے قریش کے تجارتی قافلوں پر ایسا کڑا پہرہ نہیں لگایا کہ ان کی آمد و رفت بالکل بند ہو جائے۔ غالباً ایک نوخیز ریاست کے لیے ایسا کرنا مشکل بھی تھا۔

قریش کا کمزور پہلو: تجارتی راستہ غیر محفوظ:

مکہ والے اَوس اور خزرج کی دشمنی مول نہیں لینا چاہتے تھے؛ کیوں کہ مدینہ ان کے تجارتی قافلوں کی شاہراہ پر واقع تھا۔ یہاں کے لوگوں سے دشمنی اہلِ مکہ کو مہنگی پڑ سکتی تھی۔ یہ قریش کا وہ کمزور پہلو تھا جسے انصار خوب جانتے تھے۔ وقت پڑنے پر انہوں نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے کچھ عرصے بعد اَوس کے سردار سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ عمرہ کرنے مکہ گئے۔ ان کی اُمَیّہ بن خلف سے پرانی دوستی تھی، اس لیے مکہ میں اس کے ہاں قیام کیا۔ ایک دن وہ اُمیہ کے ساتھ کعبہ کا طواف کرنے نکلے تو وہاں ابو جہل مل گیا۔ اس نے دھمکاتے ہوئے کہا: "تم لوگوں نے صابیوں اور بے دینوں کو پناہ دی ہے، مجھے یہ برداشت نہیں کہ تم لوگ کعبہ کی زیارت کو آسکو، اگر اُمیہ تمہارے ساتھ نہ ہوتا تو تم بچ کر نہ جاتے۔" سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا:

"اگر تم نے ہمیں کعبہ کی زیارت سے روکا تو ہم تمہارا شام کا تجارتی راستہ مسدود کر دیں گے۔"[3]

اگلے دنوں میں دونوں طرف سے یہ دھمکیاں حقیقت میں بدل گئیں۔ قریش کا رویہ اتنا مخاصمانہ نظر آ رہا تھا کہ مسلمان کعبہ کی زیارت تو کجا مکہ کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتے تھے۔ اِدھر قریش کے قافلے اب مسلمانوں کی تاخت و تاراج کی زد میں دکھائی دینے لگے۔

غزوات اور سرایا:

ریاست کے قیام اور جہاد کی مشروعیت کے ساتھ ہی حضور ﷺ سرحدوں کی حفاظت، دشمن کی جارحیت کے جواب اور اسلامی سرحدوں سے گزرنے والے ان کے قافلوں کے خلاف کارروائی کے لیے وقتاً فوقتاً صحابہ کی مسلح

---

[1] سیرۃ ابن ہشام: ۵۹۸/۱، ۵۹۹

[2] المحبر، ص ۱۱۱

[3] صحیح البخاری، ح: ۳۹۵۰، کتاب المغازی، باب ذکر النبی ﷺ من یقتل ببدر

ٹولیاں بھیجنے لگے جنہیں سیرت نگار ''سرایا'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

''غزوات'' اور ''سرایا'' کے مفہوم کو یہیں اچھی طرح سمجھ لینا بہت ضروری ہے تاکہ آگے چل کر کوئی الجھن پیش نہ آئے۔ مدینہ کی اسلامی ریاست کی حفاظت اور اس مرکز کے ذریعے اسلام کی سربلندی کی ان منظم کوششوں کو جن میں نقل وحرکت اور سفر کی ضرورت پیش آئی، ''غزوات'' اور ''سرایا'' کہا جاتا ہے۔ ''غزوات'' غزوہ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ سیاسی، عسکری یا تبلیغی اسفار ہیں جن میں رسول اللہ بنفسِ نفیس تشریف لے گئے۔

سرایا ''سَرِیّہ'' کی جمع ہے۔ یہ اس مہم کو کہا جاتا تھا جس کی ترتیب حضور ﷺ نے مقرر کی ہو مگر خود عملی طور پر اس میں شرکت نہ کی ہو۔ ''غزوہ'' یا ''سریّہ'' جنگ کے ہم معنٰی الفاظ نہیں، بلکہ ان کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔[1]

غزوات کی تعداد حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح روایت میں ۱۹ بتائی گئی ہے۔[2] جبکہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ تعداد ۲۱ بیان کی ہے۔ بعض روایات میں یہ تعداد ۲۷ تک بتائی گئی ہے۔[3] سرایا کی تعداد ۳۸، ۴۷، اور ۵۶ بتائی جاتی ہے۔[4] اس اختلاف کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بعض اوقات ایک ہی سفر یا ایک ہی زمانے میں متعدد مقامات پر مہم جوئی کی گئی، کسی نے ایک سفر یا ایک زمانے کی دو تین مہمات کو ایک مہم شمار کیا اور کسی نے ہر ایک کو الگ الگ گنا۔[5]

---

① درج ذیل قسم کے تمام اسفار پر ''غزوہ'' یا ''سریہ'' کا اطلاق ہوتا ہے
❶ اپنے دفاع یا دشمن کو مغلوب کرنے کے لیے کیا گیا سفر جس میں جنگ بھی ہوئی ہو، مثلاً غزوہ حنین، غزوہ خیبر
❷ اپنے دفاع یا دشمن کو مغلوب کرنے کے لیے سفر کیا گیا ہو، مگر جنگ نہ ہوئی ہو، مثلاً غزوہ تبوک۔
❸ سفر میں جنگ کی نیت نہ ہو مگر جنگ سے سابقہ پڑ گیا ہو مثلاً غزوہ بدر
❹ بغاوتوں کے استیصال کی مہمات مثلاً: غزوہ بنی قینقاع، غزوہ بنی قریظہ
❺ سرحدوں کی حفاظت کے لیے گشت کرنے والے دستے۔ اکثر سرایا اسی قسم کے تھے۔
❻ تبلیغی اور تعلیمی وفود جن کے ذمے دشمن کی خبر رسانی یا اپنے کسی حلیف کی مدد بھی ہو مثلاً سریہ رجیع
❼ تبلیغی اور تعلیمی سفر جس میں کوئی معاہدہ ہوا ہو، مثلاً: غزوہ ودان، غزوہ بواط
❽ وہ سفر جس میں دشمن سے خطرہ یا نقصان لاحق ہوا ہو، مثلاً: غزوہ ذات الرقاع
❾ دشمن کو مرعوب کرنے کے لیے کیا گیا سفر مثلاً: غزوہ بنی لحیان، غزوہ حمراء الاسد، غزوہ بدر الموعد
❿ کسی ڈاکہ زنی یا جارحیت کے ردعمل میں کی گئی کارروائی مثلاً: غزوہ ذوقرد، غزوہ سفوان
⓫ دشمن کی مخبری کے لیے کیے گئے اسفار، مثلاً سریہ عبداللہ بن جحش
⓬ دشمن کی ناکہ بندی کے لیے کیے گئے اسفار، مثلاً: سریہ ابوعبیدہ بن الجراح، سریۂ ذوقردہ
⓭ کسی قوم سے معاہدے کے لیے کیا گیا سفر، مثلاً: غزوہ ابواء، غزوہ بواط، غزوہ عشیرہ
⓮ عبادت کے لیے کیا گیا سفر جس میں کسی قوم سے معاہدہ ہوا ہو۔ (اسی لیے صلحِ حدیبیہ کو بھی غزوہ شمار کیا جاتا ہے۔)
⓯ دشمن کے کسی خاص آدمی کو قتل کرنے کے لیے خصوصی مہم مثلاً: سریہ محمد بن مسلمہ، سریۂ عبداللہ بن عتیک ...... (رحمۃ للعالمین: ۲/ ۳۵۴ تا ۳۵۶)

جن غزوات میں لڑائی ہوئی ان کی تعداد گیارہ ہے یعنی: ❶ غزوہ بدر ❷ غزوۂ احد ❸ غزوۂ بنی قینقاع ❹ غزوہ بنی نضیر ❺ غزوۂ بنی مصطلق ❻ غزوہ خندق ❼ غزوہ بنی قریظہ ❽ غزوہ خیبر ❾ غزوہ فتح مکہ ❿ غزوہ حنین اور ⓫ غزوہ طائف...... بعض حضرات اس فہرست میں غزوہ بنونضیر کو شمار نہیں کرتے؛ کیوں کہ اس میں فقط محاصرہ ہوا تھا۔ نیز وہ غزوۂ بنوقریظہ کو غزوۂ خندق ہی کا تتمہ تصور کرتے ہیں۔ اس طرح جنگ والے غزوات ۹ رہ جاتے ہیں۔

② صحیح البخاری، ح: ۳۹۴۹، کتاب المغازی
③ دلائل النبوۃ للبیہقی: ۵/ ۴۵۷ تا ۴۶۲
④ سبل الهدیٰ والرشاد: ۶/ ۳
⑤ شرف المصطفیٰ: ۳/ ۱۰

مستشرقین ان مہمات پر ڈاکے کا اطلاق کرتے ہیں؛ کیوں کہ ان میں قریش کے قافلے بھی لوٹے گئے تھے مگر یہ الزام بالکل غلط ہے۔ قریش کے قافلوں پر حملے کو ڈاکا اس وقت کہا جاسکتا ہے جب قریش خود بے قصور ہوتے، دوسرے یہ کہ جب ان پر حملہ کسی حکومت کی طرف سے نہیں، عام لوگوں کی جانب سے ہوتا۔ ظالم سے بدلہ لینا عین انصاف ہے۔ اور جب دو ریاستوں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہوں اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ بھی نہ ہو تو ایسے میں چوٹ کھایا ہوا فریق دوسرے کو جانی و مالی نقصان پہنچائے تو اسے دنیا کی کسی لغت میں ڈاکا نہیں کہا جاتا۔

خبر رسانی کا نظام:

عسکری و سیاسی معاملات مخبری اور جاسوسی کے بغیر کبھی نہیں چل سکتے، کیوں کہ ان انتظامات کے بغیر اندر کی اصل خبریں ملنا ممکن نہیں ہوتا۔ اگرچہ حضور ﷺ کو بعض خبریں وحی اور فرشتے کے ذریعے مل جاتی تھیں مگر زیادہ انحصار مخبروں پر تھا۔ ایک مثالی قائد کا کردار پیش کرتے ہوئے حضور ﷺ ہمیشہ صحیح خبریں حاصل کرنے کے لیے کڑے انتظامات کرتے رہے۔ مکہ سے قریش کے خاص مشوروں اور فیصلوں کی اطلاعات حضور ﷺ کو کبھی کبھار وہ لوگ دیا کرتے تھے جو اب تک اپنے اسلام کو قریش سے چھپائے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ ملنے والی خفیہ اطلاعات کا ”ذریعہ“ ظاہر نہیں کرتے تھے اس لیے اکثر مواقع پر پتا نہیں چلتا کہ آپ ﷺ کو وحی سے اطلاع ملی تھی یا مخبر سے۔

بہرکیف حضور ﷺ نے مخبر ضرور مقرر کر رکھے تھے مگر اس دور میں متحرک قافلوں کے بارے میں کسی مخبر کی خبر اتنی بروقت نہیں پہنچ سکتی تھی کہ قافلے کو روک لینے کا یقینی انتظام کرلیا جاتا۔ بسا اوقات قافلے اچانک اپنا راستہ بدل لیتے تھے اور مدینہ سے پچاس، ساٹھ میل (۸۰ تا ۹۵ کلومیٹر) جنوب کی طرف نکل کر اپنے حلیف قبائل کے درمیان پہنچ جاتے تھے، اس لیے قریش کے کئی قافلے صحابہ کی مسلح ٹولیوں کی زد سے صاف بچ نکلے۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ اس طرح قریش کو تنبیہ ہوگئی کہ اب وہ ایک اسلامی ریاست کی سرحدیں عبور کر کے شام آتے جاتے ہیں جس کی انہیں آزادانہ چھٹی نہیں مل سکتی۔

عموماً ان دستوں کو ضرورت پڑنے پر ہتھیار استعمال کرنے کی اجازت دی گئی تھی لیکن بعض کو صرف دشمن کی نگرانی کرنے کی تاکید کی جاتی تھی۔ اس طرح مدینہ کی اسلامی ریاست نے واضح لفظوں میں یہ اعلان کردیا کہ قریش کی تجارت اور ان کی اقتصادیات کی شہ رگ اب مسلمانوں کے رحم و کرم پر ہے، اگر وہ دشمنی سے باز نہ آئے تو انہیں سخت اقتصادی تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے حضور ﷺ نے ان مہمات میں صرف مہاجرین کو شامل کیا۔ غالباً قریش کو زیادہ مرعوب کرنا اسی طرح ممکن تھا کہ ان کے ہاتھوں تشدد برداشت کرنے والے مظلوموں کو ہی ان کے مقابلے میں سپاہی بنا کر کھڑا کردیا جائے۔ ایک وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ نے انصار سے اپنی حفاظت اور مدینہ پر ہونے والے حملوں میں مشترکہ دفاع کا عہد لیا تھا۔ مدینہ سے باہر کی مہمات اس معاہدے میں شامل نہ تھیں۔ اگرچہ انصار حضور ﷺ کے ایک اشارے پر کہیں بھی جانے کو تیار تھے مگر آپ ﷺ حتی الامکان معاہدے کے مطابق چلنا چاہتے تھے۔

جہاد کی پہلی مہم ہجرت کے سات مہینے بعد ماہِ رمضان میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں روانہ کی گئی، اس دستے

میں نمیں مہاجرین شامل تھے اور اس کا ہدف قریش کا ایک قافلہ تھا جو ابوجہل کی قیادت میں مدینہ کی شاہراہ سے کترا کر ساحلی سڑک سے شام جا رہا تھا۔ مسلمانوں نے سامنے آ کر اس قافلے کو متنبہ کرنے پر اکتفا کیا۔

دوسری مہم شوال میں حضرت عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بطن رابغ کی طرف بھیجی گئی، جہاں ابوسفیان کی قیادت میں ایک تجارتی قافلہ آ رہا تھا۔ اس مہم میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، جنہوں نے کفار پر ایک تیر چلایا، یہ پہلا تیر ہے جو اسلام کی تاریخ میں حریف پر چلایا گیا۔ اس بار بھی قافلے کو صرف ہراساں کرنا کافی سمجھا گیا۔[1]

سَرِیّہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ:

جمادی الآخرہ سن ۲ ہجری کے اواخر میں آنحضرت ﷺ نے قریش کی جنوبی تجارت کو جو یمن کی طرف تھی، غیر محفوظ کرنے کے لیے ایک غیر معمولی اقدام کیا۔ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو بارہ مہاجرین پر امیر بنا کر ایک خط دیا اور فرمایا: ''دو دن کے سفر کے بعد اسے کھولنا۔'' دو دن بعد انہوں نے خط کھول کر دیکھا تو لکھا تھا: ''مقام نخلہ میں جا کے ٹھہرو اور قریش کی نقل و حرکت دیکھو۔'' اتنی دور دراز کا سفر وہ بھی عین دشمن کے علاقے میں نہایت خطرناک تھا۔ اس لیے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے مکتوب پڑھنے کے بعد ساتھیوں کو کہا: ''فقط وہ میرے ساتھ چلے جسے شہادت کی تمنا ہو۔'' مگر اس کے باوجود کوئی پیچھے نہ رہا۔[2]

یہ جماعت وہاں پہنچ گئی، تب قریش کا ایک چھوٹا سا قافلہ چمڑا اور کشمش لیے سامنے سے گزرا۔ اس وقت رجب کا چاند نکل چکا تھا جو ان مہینوں میں سے ہے جن میں اہل عرب کے ہاں لڑنا بھڑنا حرام تھا اور اسلام میں بھی اس وقت یہی حکم تھا۔ مگر صحابہ سمجھے کہ آج جمادی الآخرہ کی آخری تاریخ ہے۔[3] چنانچہ انہوں نے حملہ کر دیا جس میں قافلے کا سردار عَمرو بن حضرمی مارا گیا، دو آدمی گرفتار ہوئے اور خاصا مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ مہم واپس آئی تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''میں نے رجب میں لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا۔'' آپ نے قیدیوں اور مالِ غنیمت کو جوں کا توں مکہ واپس بھیج دیا۔

عَمرو بن حضرمی جو اس واقعے میں قتل ہوا تھا، قریش کا نامور سردار تھا، اس کے مارے جانے پر قریش بہت طیش میں آئے، انہوں نے مشہور کر دیا کہ مسلمانوں نے حرمت والے مہینوں میں بھی جنگ کو جائز مان لیا ہے۔

اس پروپیگنڈے کے جواب میں آیت ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾[4] نازل ہوئی، جس میں بتا دیا گیا کہ مسلمانوں کی اس خطا کی بہ نسبت کفار کی بدعقیدگی، کفر و شرک اور ظلم و ستم کے جرائم کہیں زیادہ سخت ہیں۔ اپنی ان

---

[1] زاد المعاد: ۳/۱۶۳

[2] سیرۃ ابن ھشام: ۱/۶۰۲۔ یاد رہے کہ نخلہ مکہ کے جنوب مشرق میں طائف کے راستے میں ہے۔

[3] سیرۃ ابن ہشام (۱/۶۰۳) اور تاریخ المدینہ لابن شبہ (۲/۴۷۲) کی روایات کے مطابق یہ رجب کی آخری تاریخ تھی اور صحابہ کو اس کا علم تھا جبکہ امام طحاوی کی روایت (شرح مشکل الآثار، ح: ۴۸۸۰) بتاتی ہے کہ صحابہ کو معلوم نہ تھا کہ یہ جمادی الاولیٰ کی آخری تاریخ ہے یا رجب کی پہلی۔ سنداً و درایتاً یہی راجح ہے۔

[4] سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۱۷...... یاد رہے کہ سریہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ جس رجب میں بھیجا گیا تھا، وہ مکی رجب تھا، نہ کہ خالص قمری رجب۔ اس لیے درحقیقت مسلمانوں نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا، مگر چونکہ قریش نے اس مصنوعی رجب کو حرمت والا مان رکھا تھا، اسی لیے انہوں نے اتنا شور مچایا اور قرآن مجید نے انہی کے تسلیم کردہ مقدمے کے مطابق انہیں جواب دیا۔

بدترین حرکات کو بھول کر وہ مسلمانوں کو محض ایک غلطی پر مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ [1]

کعبہ قبلہ قرار پایا:

مسلمان اب تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے مگر حضور ﷺ کی دلی خواہش تھی کہ نماز کے لیے قبلہ کعبۃ اللہ کو بنایا جائے؛ کیوں کہ اسی مرکز سے ہزاروں برس پہلے توحید کا پیغام جاری ہوا تھا اور اللہ کا پہلا گھر یہی تھا جس کی عزت و حرمت تمام عبادت گاہوں سے بڑھ کر تھی۔ آخر ہجرت کے ایک سال چار ماہ بعد ۱۵ شعبان ۲ ہجری کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ اور تمام مسلمانوں کو کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ یہودیوں نے اس پر جو اعتراضات کیے سورۃ البقرہ میں ان کے دندان شکن جواب دے دیے گئے۔ [2]

صوم عاشوراء:

مکہ میں مشرکین بھی یوم عاشوراء (دس محرم) کا روزہ رکھتے تھے اور اس دن کعبہ کو نیا غلاف پہنایا جاتا تھا۔ اسلام میں دس محرم کا روزہ فرض قرار دیا گیا اور مسلمان اس کا پورا اہتمام کرتے رہے۔ [3]

حضور ﷺ جن دنوں مدینہ تشریف لائے تو یہاں یہود کو بھی دس محرم کا روزہ رکھتے دیکھا۔ وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا: ''یہ مبارک دن ہے جس میں اللہ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمن (فرعون) سے نجات دی پس موسیٰ علیہ السلام نے روزہ رکھا۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''میں تمہاری بہ نسبت موسیٰ علیہ السلام سے تعلق کا زیادہ حق دار ہوں۔''

آپ نے حسب معمول اس دن روزہ رکھا اور مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا۔ [4]

مستشرقین کا یہ اعتراض بالکل لغو ہے کہ حضور ﷺ نے یہود کی پیروی میں یہ روزہ رکھا۔ درحقیقت یہ روزہ مسلمان مکہ میں بھی رکھتے تھے۔ یہاں فقط یہ بتایا گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اصل پیروکار ہم ہیں نہ کہ تم۔ [5]

---

① سیرۃ ابن ھشام: ۱/۲۰۲ تا ۲۰۴

② تفسیر ابن کثیر، سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۴۰ تا ۱۵۰؛ البدایۃ والنھایۃ: ۵/۴۵

تحویل قبلہ کے بارے میں کئی اقوال ہیں: بعض کے نزدیک ہجرت کے ۱۷ ماہ بعد یعنی رجب میں اور بعض کے نزدیک ۱۸ ماہ بعد یعنی شعبان میں یہ حکم نازل ہوا۔ حافظ ابن کثیر نے شعبان کے قول کو راجح کہا ہے۔ (البدایۃ والنھایۃ: ۵/۴۵) اور بلاشبہ یہ مدنی شعبان ہے۔ صحیح بخاری کے مطابق حضور ﷺ ہجرت کے بعد ۱۶ یا ۱۷ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ (ح: ۴۰، باب الصلاۃ من الایمان، کتاب الایمان) اس سے مراد یہ ہے کہ ہجرت سے مدنی رجب ۲ھ تک مدنی تقویم کے ۱۷ اور مکی تقویم کے (بوجہ نسی) ۱۶ ماہ گزر رہے تھے۔ اس دوران حضور ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کرتے رہے۔ ۱۸ ویں ماہ یعنی شعبان میں آپ ﷺ کو بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم آ گیا۔

③ صحیح البخاری، ح: ۱۵۹۲، کتاب الحج؛ ح: ۱۸۹۳، کتاب الصوم، باب وجوب صوم رمضان؛ فتح الباری: ۴/ ۲۴۸

④ صحیح البخاری، ح: ۲۰۰۴، کتاب الصوم، باب صوم عاشوراء

⑤ رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری ۱۲ ربیع الاول مدنی مطابق ۲۴ ستمبر کو ہوئی تھی۔ مکی تقویم کے لحاظ سے محرم شروع ہو رہا تھا جبکہ یہودیوں کی ''خلقیہ تقویم'' کا بھی یہ پہلا مہینہ ''تشری'' تھا جو ہر سال اعتدال خریفی (یعنی اواخر ستمبر تا اوائل اکتوبر) میں شروع ہوتا تھا۔ یہود اسی مہینے کی دس تاریخ کو ''عاشوراء'' تصور کر کے روزہ رکھتے تھے۔ اگرچہ یہ دن خالص قمری تقویم کا دس محرم نہیں ہوتا تھا۔ چونکہ اسلام میں مکی تقویم کی تنسیخ سورۃ التوبہ کی آیات: ۳۶، ۳۷ کے نزول پر ہوئی تھی، اس لیے اس سے قبل مسلمان عاشوراء، بلکہ رمضان کے روزے بھی مکی تقویم کے مطابق رکھتے رہے تھے اور اس وقت اسلام میں یہ ایسا ہی مشروع تھا جیسے تحویل قبلہ سے پہلے کعبہ کی بجائے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھنا مشروع تھا۔

رمضان کے روزوں کی فرضیت:

ہجرت کے دوسرے سال ماہ شعبان میں ماہِ رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم نازل ہوا۔[1] عاشوراء کے روزے کی حیثیت اب نفل کی رہ گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو چاہے رکھے، جو چاہے نہ رکھے۔[2]
البتہ آپ نے رمضان کے روزوں کی سخت تاکید فرمائی اور اس کی اہمیت اور فضیلت اچھی طرح واضح فرمائی۔
آپ فرماتے تھے: ''جو شخص ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے گا اور اس میں تراویح کا اہتمام کرے گا، اس کے تمام گزشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''[3]
رمضان کے روزوں کی فرضیت اللہ کی محبت میں ہر محبوب چیز کو ترک کر دینے کی عملی مشق تھی۔ یہ روح کی پاکیزگی، دل کی صفائی اور اعضاء کو گناہوں سے بچانے کی تربیت تھی۔ رمضان اور اس کے روزوں کی جو فضیلتیں قرآنِ مجید اور حضور ﷺ کی احادیث سے معلوم ہوئیں ان کی وجہ سے روزہ، صحابہ کرام کا پسندیدہ مشغلہ بن گیا، آپ ﷺ اور صحابہ کرام رمضان کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً روزے رکھا کرتے تھے۔

☆☆☆

[1] طبقات ابن سعد: ۲۲۸/۱ ؛ البدایة والنهایة: ۳۱۲/۵ ؛ المنتظم لابن الجوزی: ۹۶/۳
[2] صحیح البخاری، ح: ۱۵۹۲، کتاب الحج، باب قول الله: جعل الله الکعبة ؛ ح: ۱۸۹۳، کتاب الصوم، باب وجوب صوم رمضان)
[3] سنن الترمذی، ح: ۶۸۳، ابواب الصوم

غزوۂ بدر (رمضان ۲ھ/مئی ۶۲۲ء)

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے سریّے میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ قریش کے خلاف تلوار چلی اور ان کا آدمی مارا گیا۔ اس سے قریش کے رؤسا کو اپنی قوم میں اشتعال پھیلانے کا جو موقع ملا انہوں نے اسے ضائع نہ کیا اور مسلمانوں کے خلاف بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاری شروع کر دی، جنگ کے لیے سب سے اہم چیز عسکری اخراجات تھے۔ قریش نے اپنا سارا سرمایہ دے کر ابوسفیان کی قیادت میں ایک بڑا تجارتی قافلہ شام کی طرف روانہ کیا تاکہ اس کے منافع سے سامانِ جنگ تیار کیا جائے۔[1]

یہ قافلہ جاتے ہوئے مسلمانوں کی دسترس سے بچ کر نکل گیا تھا۔ واپسی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخبر اس کی گھات میں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بروقت اطلاع مل گئی اور آپ ۸/ رمضان المبارک سن ۲ ہجری کو مہاجرین و انصار کے ان حضرات کو جو فوری طور پر میسر آسکے، ساتھ لے کر اس قافلے کو روکنے کے لیے بذاتِ خود روانہ ہو گئے۔[2]

بچوں کا شوقِ جہاد:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے نکلے تو مدینہ سے ایک میل (۱۶۰۰ کلومیٹر) دور ''بئرِ عِنَبَہ'' کے پاس پڑاؤ ڈالا، سب کو دیکھا بھالا۔ آپ کو ان میں کچھ کم عمر لڑکے نظر آئے جو جہاد کے ذوق و شوق میں ساتھ نکل آئے تھے۔ آپ نے انہیں واپس جانے کا حکم فرمایا۔ ان بچوں میں اُسامہ بن زید، رافع بن خَدِیج، بَراء بن عازب، زید بن ارقم اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ انہی میں سولہ سال کے عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی تھے جو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی تھے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہونے سے چھپتے پھر رہے تھے، ان کے بھائی سعد رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو پوچھا: ''کیا ہوا؟'' کہنے لگے: ''ڈرتا ہوں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دیکھ لیں تو چھوٹا سمجھ کر واپس نہ کر دیں، میں اللہ کے راستے میں نکلنا چاہتا ہوں، شاید اللہ تعالیٰ مجھے شہادت عطا فرما دے۔'' انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لایا گیا۔ آپ نے حسبِ معمول انہیں بھی واپس جانے کا حکم دیا جسے سن کر وہ رونے لگے۔ آخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا جذبہ دیکھ کر اس مہم میں شرکت کی اجازت دے دی۔[3] مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی، لشکر میں گھوڑے صرف دو اور اونٹ ستر تھے۔ ایک، ایک اونٹ پر تین، تین افراد باری باری سوار ہوتے۔[4]

---

① الكامل في التاريخ: ۱۲/۲ ② سيرة ابن هشام: ۶۱۲/۱

غزوۂ بدر گرم موسم میں ہوا تھا، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''وكان يوما حارًا.'' (صحيح البخاري، ح: ۳۹۶۰، كتاب المغازي) اس کے علاوہ صحابہ کا پڑاؤ میں پانی سے قرب کا خاص اہتمام کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چھپر بنوانا گرم موسم کے امکان کو قوی کرتے ہیں۔ اب دیکھیں تو ۲ھ کا مدنی رمضان مارچ میں آتا ہے جبکہ مکی رمضان مئی میں۔ یہ موسمی قرائن بتاتے ہیں کہ راویوں نے اس غزوے کی توقیت مکی تقویم کے ساتھ کی تھی۔

③ الاصابة، تر: عمير بن سعد رضی اللہ عنہ ④ سيرة ابن هشام: ۶۱۳/۱؛ البداية والنهاية: ۶۶/۵

قافلے کی جگہ مکہ کے لشکر سے سامنا:

اِدھر قریشی قافلے کے سردار ابوسفیان بن حرب کو مسلمانوں کی آمد کی خبر ہوگئی تھی، اس لئے وہ عام راستہ چھوڑ کر سمندر کے کنارے کنارے قافلے کو تیزی سے لے چلے اور ساتھ ہی ایک سوار کو مکہ کی طرف دوڑایا تاکہ قریش مدد کو پہنچیں اور اپنے تجارتی قافلے کی حفاظت کریں۔ قریش پہلے ہی مدینہ پر حملے کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے، اس خبر کا مکہ میں پہنچنا تھا کہ فوراً نو سو پچاس مسلح افراد کا ایک لشکر جن میں دو سو گھڑ سوار اور سات سو اونٹ سوار تھے، مقابلے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ لشکر میں قریش کے بڑے بڑے سردار شریک تھے۔ چھ سو افراد زرہ پوش تھے۔ ①

رسول اللہ ﷺ کو اطلاع پہنچی کہ تجارتی قافلہ بچ کر نکل گیا ہے اور قریش کا مسلح لشکر مقابلے کے لیے آیا چاہتا ہے تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے مہاجرین نے اپنی جان نچھاور کرنے کا عزم ظاہر کیا، مگر آپ انصار کا جذبہ دیکھنا چاہتے تھے۔ انصار آپ کو اس وعدے پر لائے تھے کہ وہ آپ ﷺ کی حفاظت کریں گے جس کا مفہوم مدینہ کی حدود میں تحفظ فراہم کرنا تھا۔ کھلے لفظوں میں یہ معاہدہ نہیں تھا کہ اگر مدینہ سے باہر قریش سے جنگ ہوئی تو انصار اس وقت بھی مدد کے پابند ہوں گے، اس لیے آپ انصار کی رائے کے منتظر رہے۔ قبیلہ اَوس کے سردار سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ آپ کی منشا سمجھ گئے اور اُٹھ کر کہنے لگے:

''آپ شاید ہماری رائے جاننا چاہتے ہیں۔ اللہ کے رسول! آپ جس سے چاہیں صلح کریں، جس سے چاہیں لڑیں۔ ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں۔ اللہ کی قسم! آپ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں۔''

ایک اور انصاری حضرت مِقداد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''یارسول اللہ! ہم بنی اسرائیل نہیں جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو کہہ دیا تھا کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا لڑو، نہیں، ہم تو آپ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے لڑیں گے۔'' ②

قریش کا لشکر بدر کی طرف بڑھ رہا تھا جو مدینہ سے ۷۰ میل (۱۲۰ کلومیٹر) جنوب میں ایک وادی ہے۔ مسلمان بھی اسی طرف روانہ ہوگئے۔ لشکرِ اسلام کا جنگی پرچم سفید رنگ کا تھا جو حضرت مُصعَب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے تھاما ہوا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے آگے آگے دو سیاہ رنگ کے جھنڈے تھے، ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ کے پاس۔ ③

یہاں قریش کے بعض غلام جو پانی کی تلاش میں نکلے تھے، صحابہ کے ہاتھ آگئے۔ وہ ان کو مار پیٹ کر قریش کی تعداد وغیرہ معلوم کرنے لگے تو نبی اکرم ﷺ نے منع فرمادیا۔ آپ نے خود ان سے تفتیش شروع کی اور پوچھا:

''قریش روزانہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں؟'' کہنے لگے: ''نو۔''

---

① سیرة ابن هشام: ۱/۶۰۷، البداية والنهاية: ۵/۲۳، ۶۴

② سيرة ابن هشام: ۱/۶۱۵ ③ البداية والنهاية: ۵/۶۴، ۶۵

رسول اللہ ﷺ نے انہیں چھوڑ دیا اور صحابہ سے فرمایا: ''دشمن کی تعداد نو سو سے ایک ہزار کے درمیان ہے۔''[1]

یہ رسول اللہ ﷺ کی فراست اور ذہانت تھی، عام طور پر ایک اونٹ نوے سے سو آدمیوں کو کافی ہو جاتا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے فوراً حساب لگا لیا کہ قریش کتنی تعداد میں ہو سکتے ہیں، جو بالکل درست تھا، وہ نو سو پچاس تھے۔

قریش کا لشکر پیش قدمی کرتا ہوا میدانِ بدر کے دوسرے سرے تک پہنچ گیا جہاں پانی قریب تھا۔ مسلمانوں نے پہلے میدان کے اِس کنارے ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا تھا جہاں سے پانی کئی میل دور تھا مگر پھر ایک صحابی حضرت حُباب بن مُنذِر رضی اللہ عنہ کے مشورے پر رسول اللہ ﷺ نے پانی کے چشمے کی طرف بڑھ کر اس کے قریب خیمے لگائے، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی جس سے مسلمان خوب سیراب ہوگئے یہاں کی ریتیلی زمین پختہ ہوگئی۔ یہی بارش قریش کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی؛ کیوں کہ ان کے پڑاؤ میں کیچڑ اور پھسلن پیدا ہوگئی۔

جمعہ ۱۷ رمضان ۲ ہجری (۲۵ مئی ۶۲۴ء) کا سورج طلوع ہوا تو قریش اپنی جنگی تیاری مکمل کر چکے تھے۔[2] اِدھر نبی اکرم ﷺ مسلمانوں کی صفیں درست کر رہے تھے، حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ کے مشورے سے آپ ﷺ کے لیے ایک ٹیلے پر کھجور کی شاخوں اور پتوں سے ایک سائبان بنا دیا گیا تا کہ آپ وہاں تشریف رکھیں اور پورے میدان جنگ کا معائنہ کر کے احکامات دیتے رہیں۔ پیچھے تیز رفتار سواریاں بھی رکھی گئیں کہ خدانخواستہ شکست ہو جائے تو مدینہ کی طرف بچ نکلنے کی صورت باقی رہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے محافظ مقرر ہوئے۔[3]

صبح سویرے قریش کا لشکر سامنے آ گیا اور کچھ فاصلہ چھوڑ کر صف آرا ہوا۔ یہ اسلام اور کفر کا پہلا اور فیصلہ کن معرکہ تھا، ایک طرف تین سو تیرہ مسلمان تھے جن کا سامانِ جنگ بھی کم تھا۔ دوسری طرف تین گنا کفار بہترین اسلحے کے ساتھ موجود تھے۔ اِس موقع پر نبی کریم ﷺ گڑگڑا کر اللہ سے دعائیں کر رہے تھے، آپ فرما رہے تھے: ''اے اللہ! اگر آج مومنوں کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر تا قیامت روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔''

آپ ﷺ اتنی بے تابی سے دعا فرما رہے تھے کہ آپ کی چادر شانۂ مبارک سے بار بار سرک جاتی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چادر درست کرتے اور تسلی دیتے: ''اللہ کے رسول! آپ اپنے رب سے خوب مانگ چکے، اس نے آپ سے جو وعدہ فرمایا ہے، وہ ضرور پورا ہوگا، اللہ آپ کی ضرور مدد کرے گا اور آپ کو فتح مند فرمائے گا۔''[4]

دو صحابی عین اسی وقت لڑائی میں شرکت کے لیے پہنچے، مسلمانوں کو بڑی مسرت ہوئی؛ کیوں کہ اس وقت مسلمانوں کو اپنی عددی کمی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا، ایسے میں اگر ایک شخص بھی مزید پہنچ جاتا تو غنیمت تھا، مگر آنے والوں نے

① دلائل النبوة للبيهقي: ۳/۴۳، ط دار الكتب العلمية

② جوامع السيرة النبوية، ص ۸۲، ط العلمية ؛ البداية والنهاية: ۵/۵۵، ط دار هجر.

نوٹ: غزوہ بدر کی تاریخ کے بارے میں ۱۹، اور ۲۰ رمضان کے اقوال بھی ہیں مگر حافظ ابن کثیر سمیت جمہور مؤرخین نے ۱۷ رمضان کو راجح سمجھا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: ''قلت وكانت ليلة بدر ليلة الجمعة السابعة عشر من شهر رمضان سنة اثنتين من الهجرة. (البداية والنهاية: ۵/۸۱)

③ سيرة ابن هشام: ۱/۶۲۰، ۶۲۶، ۶۲۷ ④ سيرة ابن هشام: ۱/۶۲۷

بتایا: ''راستے میں ہمیں کفار نے روک لیا تھا اور کہا تھا تم محمد ﷺ کی امداد کے لیے جا رہے ہو۔'' ہم نے بادلِ نخواستہ کہا کہ ہم لڑائی میں شرکت کے لیے نہیں جا رہے، انہوں نے ہم سے یہ وعدہ لے کر چھوڑا کہ ہم جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔'' رسول اللہ ﷺ نے سنا تو دونوں کو لڑائی میں حصہ لینے سے روک دیا اور فرمایا:

''ہم ہر حال میں وعدے کی پابندی کریں گے، ہمیں بس اللہ کی مدد کافی ہے۔'' ①

یہ وعدے کی پابندی کی ایسی مثال ہے جو پیغمبر ہی پیش کر سکتے ہیں۔

انفرادی مقابلے:

جنگ اس طرح شروع ہوئی کہ کفار کی صفوں سے عمر رسیدہ عُتبہ بن ربیعہ جو لشکر کا سردار تھا، اپنے بھائی شَیبہ اور بیٹے ولید کے ساتھ میدان میں نکلا، تینوں نامور سپاہی تھے۔ انہوں نے آتے ہی للکارا: ''اے مسلمانو! کوئی ہم سے مقابلہ کرنے والا ہے تو آ جائے۔'' یہ سنتے ہی تین انصاری نوجوان: مُعَوِّذ، عوف اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم آگے بڑھے۔ ②

عُتبہ نے پوچھا: ''تم کون ہو؟''

انہوں نے تعارف کرایا تو عُتبہ نے کہا: ''ہمیں تم سے کوئی غرض نہیں، ہماری ٹکر کے لوگ مقابلے پر بھیجو۔''

رسول اللہ ﷺ، خود ٹیلے سے جنگ کی کمان کر رہے تھے، آپ نے ان تینوں کو واپس آنے کا حکم دیا اور آواز لگائی:

''اے عُبیدہ بن حارث! اُٹھو، اے حمزہ! اُٹھو، اے علی! اُٹھو۔''

یہ تینوں قریشی تھے اور جنگجوئی میں نامور۔ عُبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ پینسٹھ سال کے تھے، حمزہ رضی اللہ عنہ ستاون برس کے اور علی رضی اللہ عنہ صرف پچیس سال کے۔ اب مقابلہ بالکل کانٹے کا تھا؛ کیوں کہ ادھر عُتبہ بوڑھا تھا، شَیبہ اس سے کچھ کم عمر اور ولید بالکل جوان۔ تینوں صحابی اپنی صف سے نکل کر ان کے سامنے پہنچے۔ انہوں نے چہرے اور سر ڈھانپے ہوئے تھے اس لیے عُتبہ نے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟'' انہوں نے اپنے نام بتائے، تو وہ بولا: ''ہاں تم لوگ ہمارے برابر کے ہو۔''

حضرت عُبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ عُتبہ بن ربیعہ سے نبرد آزما ہوئے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اپنے ہم عمر شَیبہ پر پل پڑے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے نوجوان مقابل ولید پر حملہ کیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے شَیبہ کو وار کرنے کا موقع بھی نہ دیا اور ایک ہی ضرب سے اس کو قتل کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ولید نہ ٹک سکا اور مارا گیا، مگر حضرت عُبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ اور عُتبہ دونوں بہت پرانے شمشیر زن تھے، اس لیے دیر تک لڑتے رہے۔ دونوں کی تلواریں دیر تک ٹکراتی رہیں، آخر حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ لڑتے لڑتے زخمی ہو کر گر گئے۔ حضرت حمزہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے انہیں گرتے دیکھا تو عُتبہ کی طرف لپکے اور اس کا کام تمام کر دیا۔ ③ پھر وہ عبیدہ رضی اللہ عنہ کو اٹھا کر آپ ﷺ کے پاس لائے۔

حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ نے آپ کے قدموں پر رخسار رکھتے ہوئے سوال کیا: ''یا رسول اللہ! کیا میں شہید ہوں؟''

① صحیح مسلم، ح: ۴۶۴۰، کتاب الجهاد والسیر، باب الوفاء بالعهد، ط دار الجیل ② الکامل فی التاریخ: ۲/۹۱۰۲۰
③ اپنے ساتھی کی مدد کرنا خلافِ قاعدہ نہ تھا، ورنہ مشرکین اس پر ضرور اعتراض کرتے، دراصل یہ اجتماعی مبارزت تھی جیسا کہ آج کل بھی ''ریسلنگ'' میں ہوتا ہے۔

رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: "میں گواہی دیتا ہوں کہ تم شہید ہو۔"

وہ کہنے لگے: "آج ابوطالب زندہ ہوتے تو مانتے کہ ان کے اشعار کا پورا مستحق میں ہوں:

وَنُسْلِمُهُ حَتّٰى نُصَرَّعَ حَوْلَهُ
وَنَذْهَلُ عَنْ اَبْنَائِنَا وَالْحَلَائِلِ

"ہم محمد ﷺ کو کسی کے حوالے نہیں کریں گے، چاہے ہمیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، ہم ان کے لیے اپنے بیٹوں اور بیویوں کو بھول جائیں گے۔"①

گھمسان کی جنگ۔ عمیر بن حُمام کا شوقِ شہادت:

عُتبہ، شَیبہ اور ولید کے مارے جانے کے بعد گھمسان کی جنگ شروع ہوئی۔ مسلمانوں میں سے سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام مِہجع رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور شہید ہو گئے۔ اِدھر نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو جوش دلاتے ہوئے فرمایا: "اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے جو شخص بھی آج ان مشرکوں کے مقابلے میں صبر اور حوصلے سے لڑے گا اور پیٹھ نہیں پھیرے گا، اسے اللہ تعالیٰ جنت میں جگہ عطا فرمائیں گے۔"

کچھ صحابہ محفوظ دستے کے طور پر پچھلی صف میں رسول اللہ ﷺ کے قریب موجود تھے، ان میں عمیر بن حُمام رضی اللہ عنہ بھی تھے جو ہاتھ میں کچھ کھجوریں لیے کھا رہے تھے۔ آپ ﷺ کے الفاظ سنتے ہی وہ بول اٹھے: "کیا میں اُن میں شامل ہو سکتا ہوں؟" فرمایا: "تم انہی میں سے ہو۔"

وہ بولے: "واہ واہ! تو میرے اور جنت کے درمیان اتنا سا فاصلہ ہے کہ کوئی مجھے قتل کر دے۔" یہ کہہ کر کھجوریں پھینک دیں اور تلوار سونت کر دشمنوں کی طرف دوڑے، لڑتے لڑتے کئی کو قتل کیا اور آخر خود بھی شہید ہو گئے۔②

انصاری نوجوانوں کا جذبۂ جہاد۔ ابوجہل واصلِ جہنم:

جنگ میں انصاری نوجوانوں کا جوش و خروش قابلِ دید تھا، دو انصاری بھائیوں: مُعاذ بن عفراء اور مُعَوِّذ بن عفراء نے جو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پاس کھڑے تھے، ان سے پوچھا: "چچا! کیا آپ ابوجہل کو پہچانتے ہیں؟"

انہوں نے جواب میں کہا: "ہاں! خوب پہچانتا ہوں، تمہیں اس سے کیا کام؟"

بولے: "سنا ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کو برا بھلا کہتا ہے، اللہ کی قسم! اگر وہ نظر آ گیا تو بچ کر نہیں جا سکتا۔"

اسی وقت ابوجہل گھوڑے پر سوار اپنے ساتھیوں کو جوش دلاتا اُدھر سے گزرا، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: "وہ دیکھو، وہ رہا ابوجہل۔"

یہ سنتے ہی دونوں لڑکے پیدل ابوجہل کی طرف لپکے۔ اس دوران ایک اور انصاری مُعاذ بن عَمرو رضی اللہ عنہ جو پہلے سے ابوجہل کی تاک میں تھے، اس پر جھپٹ پڑے اور اس کی پنڈلی پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ وہ کٹ کر گر گئی۔ ابوجہل کے

① الكامل في التاريخ: ٢/٢٠
② البداية والنهاية: ٥/١٠٦، ١١١، دار هجر

بیٹے عِکرمہ نے باپ کو زخمی ہوتے دیکھا تو مُعاذ بن عَمرو رضی اللہ عنہ کے کندھے پر تلوار کا وار کیا جس سے ان کا بازو کٹ گیا لیکن تھوڑی سی کھال اس سے جڑی رہ گئی جس سے بازو لٹکنے لگا۔ حضرت مُعاذ بن عَمرو رضی اللہ عنہ کو اس بازو کی وجہ سے لڑنے میں مشکل ہوئی تو اس پر اپنا پاؤں رکھ کر جھٹکا دیا جس سے وہ کھال بھی الگ ہوگئی اور انہوں نے بازو کو پھینک دیا، اِدھر مُعوّذ رضی اللہ عنہ نے ابوجہل پر دوسرا حملہ کر کے اسے شدید زخمی کر دیا اور خود بھی لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

ابوجہل خون میں لت پت ہو کر گھوڑے سے نیچے گر چکا تھا۔ مُعاذ بن عفراء اور مُعاذ بن عَمرو رضی اللہ عنہما نے خیال کیا کہ ابوجہل مر چکا۔ دونوں دوڑے دوڑے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور ماجرا سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: ''تم میں سے کس نے اسے مارا ہے؟'' دونوں میں سے ہر ایک نے بیک آواز کہا: ''میں نے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''کیا تم نے تلواریں صاف کر لیں۔'' جواب دیا: ''جی نہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی تلواروں پر لگا خون دیکھا تو مُعاذ بن عَمرو رضی اللہ عنہ کی تلوار پر لگا خون گواہی دے رہا تھا کہ مہلک وار انہوں نے کیا ہے۔ تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حوصلہ افزائی کے لیے فرمایا: ''تم دونوں نے اسے مارا ہے۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ دیا کہ ابوجہل کے جسم کے کپڑے اور ''زرہ بکتر'' مُعاذ بن عَمرو رضی اللہ عنہ کو دیے جائیں۔ [1]

---

[1] ابوجہل کے قتل کے اس واقعے کو مرتب کرنے میں مدار صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایات پر رکھا گیا ہے، ان میں تعارض دور کرنے اور واقعے کی جزئیات کی وضاحت کے لیے سیرت ابن ہشام کی روایات کو لیا گیا ہے۔ اس کے بعد شرح مسلم نووی، فتح الباری اور عمدۃ القاری میں پیش کردہ اس واقعے کی تشریحات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اصل میں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ قتل کرنے والے نوجوان کون کون تھے؟ اس بارے میں دو آراء مشہور ہیں:

❶ عفراء رضی اللہ عنہا کے دو بیٹوں: معاذ اور مُعوّذ رضی اللہ عنہما نے قتل کیا تھا۔ یہ زیادہ مشہور ہے۔ درج ذیل روایات اس کی تائید کرتی ہیں:

فشدا علیہ مثل الصقرین حتیٰ ضرباہ ، وھما ابنا عفراء. (صحیح البخاری، ح: ۳۹۸۸، کتاب المغازی، باب فضل من شھد بدرا)

فانطلق ابن مسعود، فوجدہ قد ضربہ ابنا عفراء. (صحیح مسلم، ح: ٤٧٦٣، باب قتل ابی جَھل)

❷ معاذ بن عفراء اور معاذ بن عمرو بن جموح رضی اللہ عنہما نے قتل کیا تھا۔ یہ صحیح مسلم سمیت متعدد کتب حدیث کی روایت ہے۔ کلاکما قتلہ. وقضیٰ بسلبہ لمعاذ بن عمرو بن الجموح، والرجلان معاذ بن عمرو بن الجموح ومعاذ بن عفراء. (صحیح مسلم، ح: ٤٦٦٨، کتاب الجھاد، باب استحقاق القاتل سلب القتیل ؛ شرح مشکل الآثار للطحاوی: ۲۷٦/۱۲ ؛ شرح معانی الآثار: ۲۲۷/۳)

سیرت ابن ہشام میں معاذ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے خود اس واقعے کا حال مروی ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے ابوجہل کی پنڈلی کاٹی اور کس طرح ابوجہل کے بیٹے نے ان کا بازو قطع کیا۔ (سیرت ابن ھشام: ۲۳۵/۱)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ معاذ بن عفراء اور مُعوّذ بن عفراء رضی اللہ عنہما نے ایک ساتھ حملہ کر کے ابوجہل کو شدید زخمی کیا تھا۔ پھر مُعوّذ رضی اللہ عنہ وہاں سے گزرے تو انہوں نے وار کر کے ڈھیر کر دیا، اس کے بعد عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا تو اسے سانس لیتا دیکھ کر اس کا سر قلم کر دیا۔ (فتح الباری: ۲۹۲/۷)

امام نووی رحمہ اللہ کے مطابق معاذ بن عفراء، معوذ بن عفرء اور معاذ بن عمرو رضی اللہ عنہم تینوں ابوجہل پر حملے میں شریک تھے، زیادہ مہلک وار معاذ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کیا تھا، اس لیے مقتول کی زرہ وغیرہ انہیں دی گئی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سر قلم کیا تھا، اس لیے تلوار انہیں دی گئی۔ (شرح مسلم للنووی: ٦۳/۱۲)

راقم عرض کرتا ہے کہ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ سب سے پہلے دونوں بھائیوں: معاذ اور مُعوّذ رضی اللہ عنہما ہی نے حملہ کیا جیسا کہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی روایت سے ظاہر ہے۔ مگر چونکہ ان کی بہ نسبت ابوجہل پُرانا جنگجو تھا اور اس کے ساتھ مددگار بھی تھے اس لیے وہ قابو میں نہ آسکا۔ اُدھر معاذ بن عمرو رضی اللہ عنہ بھی پہلے سے ابوجہل کی تاک میں تھے، اس لیے وہ بھی فوراً پہنچ گئے اور چونکہ وہ تجربہ کار تھے، اس لیے زیادہ کاری وار انہوں نے ہی کیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تلوار پر خون کی کیفیت سے یہی اندازہ لگایا تھا کہ مہلک وار انہی نے کیا ہے۔ (شرح مسلم للنووی: ٦۳/۱۲ ؛ عمدۃ القاری: ٦٦/۱۵)

لہٰذا انہی کو مقتول کا لباس دیا گیا، جیسا کہ متعدد محدثین نے اس کی صراحت کی ہے۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۷۷/۲۰ ؛ صحیح ابن حبان: ۱۱/۱۷۳؛ مستدرک حاکم، ح: ۵۷۹٦)

(بقیہ اگلے صفحے پر)

مشرکین کو شکستِ فاش:

جنگ کے انتہائی مرحلے میں نبی اکرم ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چھپر سے اُتر کر معرکے میں شریک ہوگئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جنگِ بدر کے شدید لمحات میں ہم نبی اکرم ﷺ کی اوٹ لے رہے تھے۔[1] جب جنگ کے شعلے اپنی انتہائی حدت کو پہنچے تب نبی اکرم ﷺ نے مٹھی میں کچھ مٹی اٹھائی اور دشمن کی طرف پھینکتے ہوئے کہا:

''یہ چہرے خوار ہو جائیں، اے اللہ! ان کے دلوں کو خوف سے بھر دے، ان کے قدم اُکھاڑ دے۔''

اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو فیصلہ کن حملے کا حکم دیا۔[2]

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَـٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ

''اور آپ نے (خاک کی جو مٹھی) پھینکی تھی، وہ آپ نے نہیں اللہ نے پھینکی تھی۔''[3]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

مُعوذ بن عفراء رضی اللہ عنہ ابوجہل کو ڈھیر کرنے کے بعد لڑتے لڑتے شہید ہوگئے تھے۔ ثم مر بابي جهل معوذ بن عفراء و هو عقير، فضربه حتى اثبته فترك وبه رمق وقاتل معوذ حتىٰ قتل. (سيرت ابن هشام : ١/٦٣٥)

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے مقتول کا اسلحہ دینے کے لیے فقط معاذ بن عفراء اور معاذ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو بلوایا جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے۔

فائدہ: معاذ بن عفراء، مُعوذ بن عفراء اور معاذ بن عمرو رضی اللہ عنہم بچے نہیں، نوجوان تھے؛ کیوں کہ حضور ﷺ نابالغ لڑکوں کو جہاد میں ساتھ نہیں لے جاتے تھے۔ بدر، اُحد اور خندق کی جنگوں سے پہلے مجاہدین کا معاینہ کیا گیا تھا اور نابالغوں کو واپس کر دیا گیا تھا۔ (صحيح ابن حبان، ح:٤٧٢٧؛ المعجم الاوسط، ح:٩٢٣٥)

پس عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی روایت میں ''غلامين'' اور ''حديثة الاسنان'' کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ دس گیارہ سال کے لڑکے ہوں گے۔ اس سے مراد کم عمر ہونا ہے نہ کہ نابالغ ہونا۔

معاذ بن عفراء اور مُعوذ بن عفراء رضی اللہ عنہما کی سن پیدائش کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ہاں یہ مذکور ہے کہ معاذ بن عفراء رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں فوت ہوئے۔ (تاريخ خليفه، ص ٢٠٢) اس لیے تعین سے نہیں بتایا جا سکتا کہ غزوۂ بدر میں ان کی عمریں کتنی ہوں گی۔ تاہم دیگر دلائل بھی واضح کرتے ہیں کہ وہ نوجوان تھے۔ معاذ بن عفراء رضی اللہ عنہ تو بیعتِ عقبہ میں بھی شامل تھے۔ (تاريخ الاسلام للذهبي: ١/ ٣٠٦، ت تدمری)

اسی طرح مُعوذ بن عفراء رضی اللہ عنہ (جو ابن ہشام کی روایت کے مطابق جنگ بدر ہی میں شہید ہوئے تھے) کی عمر کا اندازہ ان کی صاحبزادی رُبیع رضی اللہ عنہا کی عمر سے لگایا جا سکتا ہے جن کی شادی جنگِ بدر کے (غالباً چند سال) بعد ہوئی اور رسول اللہ ﷺ بھی اس میں شریک ہوئے۔ (صحيح البخاري، ح:٥١٤٧، كتاب النكاح) رُبیع رضی اللہ عنہا خود بھی غزوات میں شریک ہوتی تھیں۔ ان کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جاتے، زخمیوں کو پانی پلاتے، ان کی مرہم پٹی کرتے، ان کی خدمت کرتے، زخمیوں اور مقتولین کو مدینہ پہنچاتے۔ (صحيح البخاري، ح: ٢٨٨٢، ٢٨٨٣، كتاب الجهاد، باب مداواة النساء الجرحىٰ في الغزو)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ بالغ تھیں؛ کیوں کہ جب جنگوں میں نابالغ لڑکوں کو بھی نہیں لے جایا جاتا تھا تو نابالغ لڑکیوں کو کیسے لے جایا جا سکتا تھا!!

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جنگِ بدر کے وقت ان کے والد مُعوذ رضی اللہ عنہ جوان تھے۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ مُعوذ رضی اللہ عنہ کا نکاح کم عمری میں ہو گیا ہو اور رُبیع رضی اللہ عنہا کی ولادت جلد ہوگئی ہو۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ باپ بیٹی کی عمر میں شاید پندرہ سولہ سال کا فرق ہوگا۔ اگر غزوۂ بدر میں مُعوذ رضی اللہ عنہ ٢٥، ٢٦ کے ہوں تو رُبیع رضی اللہ عنہا دس گیارہ سال کی ہوں گی۔ غزوۂ اُحد میں ان کی عمر تقریباً بارہ سال ہوگی۔ پس اس اعتبار سے رُبیع رضی اللہ عنہا کا بھی ان خدمات میں شریک رہنا کوئی عجیب بات نہیں۔

اسی طرح معاذ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے غزوۂ بدر کے وقت جوان ہونے کے بھی دیگر دلائل موجود ہیں، مثلاً یہ کہ وہ بیعتِ عقبہ میں شامل تھے۔ (سيرت ابن هشام: ١/ ٤٥٢) اور یہ کہ مسجدِ نبوی کے لیے زمین دینے والے لڑکے سہل اور سہیل ان کی سرپرستی میں تھے۔ (سيرت ابن هشام: ١/ ٤٩٥)

حاشیہ صفحہ موجودہ

[1] مسند احمد، ح: ٦٥٤ باسناد صحيح، ط الرسالة.

[2] سيرت ابن هشام: ١/ ٦٢٨

[3] سورة الانفال، آیت: ١٧

معجزانہ طور پر کفار میں سے ہر ایک کی آنکھ میں یہ مٹی جا پڑی، ان میں کھلبلی مچ گئی۔ ادھر صحابہ کرام نے زوردار حملہ کر دیا، مشرکین شکست کھا کر بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے پیچھا کرتے ہوئے بھی بہت سوں کو قتل اور گرفتار کیا۔ ①

فرشتوں کے ذریعے امداد۔ صحابہ کی کرامات:

اس جنگ میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ سورۃ الانفال میں ارشاد ہے:

''اس وقت کو یاد کیجئے جب آپ اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے پھر اللہ نے آپ کی سن لی اور کہا کہ میں آپ کی ایک ہزار فرشتوں سے مدد کروں گا جو سلسلے وار چلے آئیں گے۔''②

فرشتوں کی آمد سے کفار کے دلوں پر ہیبت طاری ہوگئی اور وہ یہ سمجھ گئے کہ مسلمانوں کے ساتھ اللہ کی مدد ہے۔ فرشتوں نے ایک آدھ مشرک کو قتل بھی کیا مگر عمومی طور پر جنگ میں حصہ نہیں لیا ورنہ ایک ہی فرشتہ پوری دنیا کے کافروں کو ہلاک کر سکتا ہے۔ ان کا مقصد بس مسلمانوں کے حوصلے بڑھانا اور کفار کو مرعوب کرنا تھا۔ ③

بدر کے دن جب مشرکین فرار ہوئے تو ایسے میں ایک انصاری ایک مشرک کا پیچھا کر رہے تھے، تب انہوں نے کوڑا مارنے کی سنسناہٹ سنی، ساتھ ہی آواز آئی: ''اے حیزوم! آگے بڑھ۔''

صحابی نے دیکھا، وہ مشرک وہیں گر پڑا، اس کی ناک ٹوٹ گئی اور منہ پھٹ گیا، صحابی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ سنایا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم سچ کہتے ہو، یہ تیسرے آسمان سے اترنے والا مددگار فرشتہ تھا۔'' حیزوم اس فرشتے کے گھوڑے کا نام ہے۔ ④

بدر کے دن مشرکوں کی مدد کے لیے ابلیس خود آیا تھا؛ کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ یہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن معرکہ ہے۔ آج حق غالب آ گیا تو اسلام کو ابھرنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ عام حالات میں ابلیس سامنے آ کر برے سے برے آدمی کی بھی مدد نہیں کرتا مگر اس دن کفر کو پسپائی سے بچانے کے لیے ابلیس اتنا فکر مند تھا کہ خود ایک مشرک سردار سُراقہ بن مالک کِنانی کی شکل میں، شیطانوں کی ایک پوری فوج کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ ابلیس نے مشرکوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے جنگ کے آغاز میں کہا تھا: ''آج کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا، میں تمہارا حامی ہوں۔''

لیکن جب جبریل علیہ السلام دوسرے فرشتوں کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کے لیے نازل ہوئے تو ابلیس اپنے چیلوں سمیت بدحواس ہو کر بھاگ نکلا۔ مشرکینِ مکہ یہی سمجھے کہ سُراقہ بھاگا ہے، جنگ میں شکست کھا کر مکہ پہنچے تو انہوں نے سُراقہ کو خوب برا بھلا کہا اور بولے: ''تم سب سے پہلے صفیں توڑ کر بھاگ نکلے اور جنگ میں ہمیں مروایا۔''

سُراقہ حیران ہو کر بولا: ''مجھے کچھ بھی معلوم نہیں، میں تو میدان بدر میں گیا ہی نہیں۔''

مگر مشرکین سمجھے کہ سُراقہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ⑤

---

① سیرۃ ابن ہشام: ۱/۶۲۸ ② سورۃ الانفال، آیت: ۹
③ البدایۃ والنہایۃ: ۵/۱۰۱ ④ البدایۃ والنہایۃ: ۵/۱۱۳ ⑤ تفسیر ابن کثیر، سورۃ الانفال، آیت: ۴۸

اُمَیّہ بن خلف کا قتل:

کفار کی شکست اور پسپائی کے وقت، کچھ مسلمان دشمنوں کا چھوڑا ہوا سامان جمع کر رہے تھے، ان میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی تھے، انہوں نے زرہیں اٹھائی ہوئی تھیں، ایسے میں ان کی نظر قریش کے سردار اُمَیّہ بن خلف اور اس کے بیٹے پر پڑ گئی۔ دونوں افراتفری کی حالت میں اِدھراُدھر بھاگ رہے تھے۔ اُمیہ نے بھی انہیں دیکھ لیا، دونوں چونکہ ماضی کے زمانے میں دوست رہے تھے، اس لیے اُمَیّہ نے پکار کر کہا:

''ابن عوف! میں تمہارے لیے ان زرہوں سے بہتر رہوں گا۔''

مراد یہ تھی کہ ہمیں پکڑ لو، تاکہ میں اور میرا بیٹا مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ جائیں اور تمہیں ہماری رہائی کا فدیہ مل جائے جو زرہوں کی قیمت سے زیادہ ہوگا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فوراً زرہیں پھینک دیں اور اُمَیّہ اور اس کے بیٹے کا ہاتھ تھام کر ساتھ لے چلے۔ تب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی نظر اُمَیّہ پر پڑی، یہ وہی اُمَیّہ بن خلف تھا جو مکّہ میں ان کا آقا تھا اور ان پر درندوں کی طرح ظلم و تشدد کیا کرتا تھا۔ اُمَیّہ کو دیکھتے ہی بلال رضی اللہ عنہ کو وہ سب مظالم یاد آ گئے، ان کا خون کھول اٹھا اور وہ چلائے:

''مسلمانو! یہ رہا کافروں کا سردار اُمَیّہ بن خلف، یہ آج بھی بچ گیا تو سمجھو میں نہ بچا۔''

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ حیران ہو کر بولے: ''بلال! یہ میرے قیدی ہیں، کیا تم انہیں قتل کرو گے؟''

مگر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے توجہ نہ دی اور پکارتے رہے: ''انصاریو! اے اللہ کے دین کے مددگارو! یہ رہا کافروں کا سردار اُمَیّہ بن خلف۔ یہ آج بھی بچ جائے تو سمجھو میں نہ بچا۔''

انصار جو پہلے ہی بھاگتے کافروں کو مار رہے تھے، دوڑے اور اُمَیّہ اور اس کے بیٹے پر ٹوٹ پڑے، اِدھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بھی تلوار سونت کر اُمَیّہ پر وار کر دیا۔ تلوار اس کے بدن پر زخم لگا گئی اور وہ چیخ مار کر گر پڑا۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ قیدیوں کو بچانے کے لیے ان پر اوندھے جھک گئے مگر انصاریوں نے دائیں بائیں سے تلواریں چبھو کر باپ بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس طرح مکّہ کے ایک مظلوم غلام نے اپنی اذیت اور تشدد کا پورا پورا بدلہ بدر کے میدان میں لے لیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جو اُمَیّہ اور اس کے بیٹے کو بچاتے بچاتے خود بھی زخمی ہو گئے تھے بعد میں یہ واقعہ یاد کر کے کہا کرتے تھے:

''اللہ بلال پر رحم کرے، ان کی وجہ سے میری زرہیں بھی گئیں، قیدی بھی گئے اور زخم الگ کھایا۔''[1]

اس اُمت کا فرعون:

لڑائی کا ہنگامہ تھم گیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کی لاش تلاش کرنے کا حکم دیا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ دیکھا کہ ابھی اس میں کچھ رمق باقی ہے، انہوں نے اپنا پاؤں اس کی گردن پر رکھ کر کہا:

[1] صحیح البخاری، ح: ۲۳۰۱، کتاب الوکالۃ؛ البدایۃ والنھایۃ: ۵/ ۱۳۲ تا ۱۳۴

"او اللہ کے دشمن! دیکھا، آج اللہ نے تجھے رسوا کر کے چھوڑا۔"

یہ کہہ کر اس کا سر دھڑ سے الگ کر دیا اور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں لا کر بولے:

"اللہ کے رسول! یہ ہے اللہ کے دشمن ابوجہل کا سر۔"

آپ ﷺ نے فرمایا: "بڑائی ہے بس اسی ذات کے لیے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

آپ ﷺ نے ابوجہل کی تلوار حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو عطا فرما دی۔ ①

پھر ابوجہل کی لاش کے پاس چل کر گئے اور فرمایا: "یہ اس اُمت کا فرعون تھا۔" ②

نبی اکرم ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مشرکین کی لاشوں کے درمیان چلتے ہوئے رزمیہ اشعار پڑھ رہے تھے۔

حضور ﷺ ابتدائی مصرعے کا ایک ٹکڑا: "نُفَلِّقُ هَامًا......" پڑھتے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسے یوں پورا کر دیتے:

......مِنْ رِجَالٍ اَعِزَّةٍ......عَلَيْنَا وَهُمْ كَانُوْا اَعَقَّ وَاَظْلَمَا

(ہم سر پھاڑ دیتے ہیں......ان لوگوں کے جو ہم پر سختی کرتے تھے......اور وہ سرکش اور ظالم تھے۔) ③

جنگ کے دوران معجزاتِ نبوی:

غزوۂ بدر کے دوران صحابہ نے آپ ﷺ کے بعض معجزات بھی دیکھے۔ عین لڑائی کے دوران حضرت عُکاشہ بن مِحصن رضی اللہ عنہ کی تلوار ٹوٹ گئی۔ آپ ﷺ نے انہیں ایک لاٹھی دے کر فرمایا: "عُکاشہ! اس سے لڑو۔" انہوں نے جونہی آپ ﷺ سے وہ لاٹھی لی، وہ ایک تیز دھار تلوار بن گئی۔ حضرت عُکاشہ رضی اللہ عنہ اس سے لڑتے رہے۔ ④

حضرت رِفاعہ بن مالک رضی اللہ عنہ کی آنکھ میں ایک تیر لگا اور آنکھ پھوٹ گئی۔ آپ ﷺ نے ان کی آنکھ میں اپنا لعابِ دہن ڈال دیا، جس سے آنکھ فوراً ٹھیک ہو گئی اور پھر کبھی اس میں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ ⑤

خونی رشتے قربان:

غزوۂ بدر میں خون کے رشتوں کو ایمان کے سامنے قربان کرنے کے عجیب و غریب واقعات پیش آئے تھے، حضرت ابوعبیدہ بن جَرّاح رضی اللہ عنہ کے سامنے ان کا باپ آ گیا، ایک بار تو چھوڑ دیا مگر دوسری بار ایمانی غیرت نے للکارا، ہر رشتہ بھلا کر باپ کو مار ڈالا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تلوار اپنے ماموں کے خون سے رنگین ہوئی، مشرکوں کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بڑے بیٹے، عبدالکعبہ بھی تھے جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے، اسلام لانے کے بعد یہی عبدالرحمٰن بن ابی بکر کہلائے۔ جب یہ مسلمان ہوئے تو ایک دن اپنے والد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے:

---

① البداية والنهاية: ۵/۱۴۸، ۱۴۹

② مسند ابی داؤد طیالسی، ح: ۳۲۴

③ السيرة النبوية، ابن كثير: ۲/ ۴۴۹، سبل الهدى والرشاد: ۴/۵۴

④ البداية والنهاية: ۵/۱۴۴، ۱۴۵

⑤ البداية والنهاية: ۵/۱۴۸

''ابا جی! بدر کی لڑائی میں آپ کئی مرتبہ میری زد میں آئے مگر ہر بار میں نے آپ کو چھوڑ دیا۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے برجستہ جواب دیا: ''مگر بیٹا! اگر تم اس دن میری زد میں آ جاتے تو میں ہر گز لحاظ نہ کرتا۔''[1]

خوشی اور غم۔ حضرت رُقَیّہ کی وفات:

غزوۂ بدر خوشی کے ساتھ غم کے ملاپ کا ایک عجیب منظر دکھاتا ہے۔ ایک طرف قاصد فتح کی بشارت لے کر مدینہ میں داخل ہو رہا تھا اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رُقَیّہ رضی اللہ عنہا دنیا سے رخصت ہو رہی تھیں۔ وہ کئی دنوں سے شدید بیمار تھیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خاوند حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کی تیمارداری کے لیے مدینہ منورہ میں رہنے کا حکم دیا تھا ورنہ وہ خود جہاد میں جانے کے لیے تیار تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تکبیریں بلند کرتے صحابہ کے ساتھ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو آپ کی لاڈلی بیٹی کو بقیع کی ٹھنڈی خاک میں دفن کیا جا رہا تھا۔[2]

ایران کی روما سے شکست۔ قرآنی پیش گوئی کی تکمیل:

اس دوران جب مدینہ کے باشندے فاتح لشکر کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کر رہے تھے تو ایک اور خبر سنائی جا رہی تھی جو جزیرۃ العرب سے باہر کی دنیا میں بھی کسی کایا پلٹ سے کم نہیں تھی۔ بازنطینی رومی جو چند سال پہلے ایران سے شکست فاش کھا کر نہ صرف اپنے بیشتر ایشیائی مقبوضات بلکہ اپنی مقدس صلیب سے بھی محروم ہو گئے تھے، ایک بار پھر اپنے نئے نوجوان قائد ہرکولیس (ہرَقل) کی کمان میں شام اور عرب کی سرحدوں پر ایرانیوں سے جا ٹکرائے تھے۔ اس خبر سے مسلمانوں کی مسرت دوبالا ہو گئی؛ کیوں کہ اس واقعے کی پیش گوئی قرآنِ کریم چند سال پہلے عین اس وقت کر چکا تھا جب رومی شکست کھا کر ایشیا سے بھاگ نکلے تھے اور بظاہر ان کے دوبارہ جیتنے کی کوئی امید نہیں تھی۔[3]

شہدائے بدر اور کفار کے مقتولین کی تعداد:

غزوۂ بدر میں صرف چودہ مسلمان شہید ہوئے، ان میں سے چھ مہاجر اور آٹھ انصاری تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے کم سن بھائی عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی اسی لڑائی میں شہید ہوئے۔ عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ نے جو عُتبہ سے لڑتے ہوئے شدید زخمی ہوئے تھے، جنگ کے اختتام پر واپسی کے سفر میں جام شہادت نوش کیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارا۔[4]

قریش کے ستر افراد مارے گئے جن میں ان کے نامور سردار اور سپہ سالار شامل تھے۔ اتنے ہی کفار گرفتار ہوئے جنہیں قیدی بنا کر مدینہ لایا گیا۔ ان میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس، داماد ابو العاص، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی عَقیل بھی شامل تھے۔ یہ سب بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔[5]

① اسد الغابۃ، تر: عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما

② اسد الغابۃ، باب النساء، تر: رُقیّہ رضی اللہ عنہا ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۸۲/۵، ۱۸۳

③ الکامل فی التاریخ: ۳۳۲/۱، ۳۳۳

④ سیرت ابن ہشام: ۷۰۶/۱ تا ۷۰۸ ⑤ سیرت ابن ہشام: ۳/۲ تا ۸

قیدیوں سے معاملہ:

نبی اکرم ﷺ نے قیدیوں کے بارے میں مشورہ فرمایا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

"یارسول اللہ! یہ لوگ آپ کے خاندان اور قوم کے ہیں۔ میری رائے ہے کہ فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے، اس طرح ہم اپنی طاقت میں اضافہ کریں گے۔ یہ توقع بھی ہے کہ ہمارے حسن سلوک سے یہ لوگ ایمان لے آئیں۔"

نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: "تمہاری کیا رائے ہے؟"

وہ بولے: "اے اللہ کے رسول! ان لوگوں نے آپ کو جھٹلایا، وطن سے نکالا اور جنگ کی، اس لیے میری رائے یہ ہے کہ ان قیدیوں میں جو میرے رشتے دار ہیں، انہیں میرے حوالے فرما دیں، میں اپنے ہاتھوں سے انہیں قتل کروں گا، عقیل کو ان کے بھائی علی کے اور عباس کو ان کے بھائی حمزہ کے حوالے کر دیا جائے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ مشرکوں کے لیے ہمارے دلوں میں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

حضور اکرم ﷺ نے اس وقت خاموشی اختیار فرمائی اور کچھ دیر بعد حکم دیا کہ قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ آپ ﷺ نے سب قیدی دو دو، چار چار کر کے صحابہ میں بانٹ دیے اور تاکید فرمائی کہ ان کے آرام کا خیال رکھیں، چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ کسی صحابی کے گھر میں کھانا کم پڑ گیا تو کھانا اپنے قیدی کو کھلا دیا اور خود کھجوروں پر گزارا کر لیا۔ حضرت مُصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بھائی ابوعزیز بھی قیدیوں میں تھے، وہ کہتے ہیں: "مجھے جن انصاریوں کے سپرد کیا گیا تھا، جب وہ کھانا لاتے تو میرے سامنے روٹی رکھ دیتے اور خود صرف کھجوروں پر اکتفا کرتے تھے۔"

قیدیوں کے رشتے دار فدیے کی رقم لے کر آتے رہے اور انہیں آزاد کرا کے لے جاتے رہے۔ جو قیدی غریب تھے اور فدیہ ادا کرنے کے قابل نہیں تھے، ان سے بھی وسعت کا سلوک کیا گیا، ان میں سے کچھ لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، ان سے کہا گیا کہ مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔

یہ سب تو ہوا مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۃ الانفال کی آیات میں اس طرح فدیہ لے کر چھوڑنے پر تنبیہ آئی گویا وحی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق تھی۔ [1]

داماد کی گرفتاری:

حضور اکرم ﷺ کے داماد ابوالعاص بھی گرفتار ہوئے تھے۔ قانون سب کے لیے ایک تھا، ان سے بھی فدیہ مانگا گیا مگر ان کے گھر میں دینے کے لیے کچھ نہ تھا۔ مجبور ہو کر ان کی اہلیہ زینب رضی اللہ عنہا نے مکہ سے اپنا ہار آپ ﷺ کی خدمت میں بھیج دیا۔ بیٹی کا ہار دیکھ کر شفیق باپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے خصوصاً اس لیے کہ یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ہار تھا جو انہوں نے بیٹی کو رخصتی کے وقت ہدیہ کیا تھا۔ آپ ﷺ اپنی بیٹی کے ساتھ نرمی برتنا چاہتے تھے اور آپ کسی شش و پنج کے بغیر ایسا کر سکتے تھے مگر احتیاط کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اس بارے میں بھی صحابہ سے مشورہ کیا اور فرمایا:

[1] البدایة والنهایة: ۵/ ۱۶۱ تا ۱۶۳

''اگر مناسب سمجھو تو یہ ہار واپس کر دو، ابوالعاص کو چھوڑ دو۔''

صحابہ کرام آپ کی ایک مسکراہٹ کے لیے گھر بار لٹانے کو تیار تھے۔ انہوں نے بخوشی بات مان لی۔ حضور ﷺ نے ابوالعاص کو چھوڑ دیا مگر ان سے وعدہ لیا کہ وہ مکہ پہنچتے ہی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مدینہ بھیج دیں گے۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ نبی ﷺ کی بیٹی کا دیارِ کفر میں رہنا، اسلامی شان کے خلاف تھا اور شاید اس لیے بھی کہ حضور اکرم ﷺ کو رقیہ رضی اللہ عنہا کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی جن کی چند دن قبل وفات ہوئی تھی۔

ابوالعاص نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ مکہ جاتے ہی بیوی کو اپنے بھائی کنانہ بن ربیع کے ساتھ مدینہ بھیج دیا۔[1]

صدقۂ فطر کی مشروعیت:

غزوۂ بدر کے بعد ماہِ رمضان کے آخری ایام میں صدقۂ فطر واجب ہوا۔ حضور نے ۲۷ رمضان کو صحابہ سے خطاب کر کے حکم دیا کہ نمازِ عید سے پہلے پہلے کھجور، کشمش یا جو میں سے کسی ایک جنس کا ایک صاع یا گندم کے دو مُد (تقریباً پونے دو کلو) صدقۂ فطر میں ادا کیے جائیں تا کہ فقراء مستغنی ہو جائیں۔[2]

نمازِ عید کی مشروعیت:

عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے تہوار ایک ساتھ مشروع ہوئے۔ یکم شوال کو مدینہ منورہ میں پہلی بار نمازِ عید الفطر ادا کی گئی۔ اس کے بعد ذوالحجہ میں عید الاضحی منائی گئی اور ہر سال رسول اللہ ﷺ ذوالحجہ میں قربانی کرتے رہے۔[3]

مدینہ میں جاہلیت کے دو تہوار چلے آتے تھے۔ اسلام نے انہیں ختم کر دیا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بے شک اللہ نے تمہیں ان کی بہ نسبت دو بہتر تہوار عطا کر دیے ہیں: عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔''[4]

عید گاہ میں رسول اللہ ﷺ کے معمولات:

عید گاہ تشریف لے جاتے ہوئے حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے آگے آگے نوک دار لاٹھی ''عَــنَــزَہ'' لے کر چلتے جاتے تھے۔ یہ لاٹھی نجاشی اَصحمہ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو ہدیہ کی تھی اور انہوں نے حضور ﷺ کی نذر کر دی تھی۔ یہ عید گاہ میں رسول اللہ ﷺ کے آگے گاڑ دی جاتی تھی۔ نمازِ عید کے بعد حضور ﷺ دو خطبے دیتے۔[5]

خواتین سے خصوصی خطاب:

آخر میں حضور ﷺ خواتین سے خصوصی خطاب بھی فرماتے جس میں عموماً انہیں فکرِ آخرت، شوہروں کی اطاعت اور خیرات کی ترغیب دی جاتی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ خواتین کی صف کے سامنے کپڑا پھیلا کر گشت کرتے اور خواتین اپنی انگوٹھیاں، چوڑیاں اور کانوں کی بالیاں تک اتار کر دے دیا کرتی تھیں۔[6]

① طبقات ابن سعد، تراجم: زینب رضی اللہ عنہا بنت محمد ﷺ، ابو العاص بن ربیع رضی اللہ عنہ

② طبقات ابن سعد: ۲۴۸/۱؛ البدایہ والنھایۃ: ۳۱۲/۵ ③ بحوالہ بالا

④ سنن ابی داؤد، ح: ۱۱۳۴، باب صلاۃ العیدین ⑤ تاریخ الطبری: ۴۱۸/۲

⑥ صحیح البخاری، ح: ۷۳۲۵، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ؛ ح: ۱۴۶۲، باب الزکوۃ علی الاقارب ؛ صحیح مسلم، ح: ۲۰۸۱، ۲۰۸۵،

زکوٰۃ کی فرضیت:

اسی سال (۲ھ) کے اواخر میں صاحب نصاب افراد پر زکوٰۃ فرض کر دی گئی۔[1] زکوٰۃ ایسی عبادت ہے جس کے ذریعے بندہ عملی طور پر اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے، وہ اللہ کا دیا ہوا ہے اور اللہ کے حکم پر وہ اس کے دیے ہوئے مال کو اس کی رضا کے لیے بخوشی خرچ کرنے پر آمادہ ہے۔ مال کی محبت طبعی طور پر انسان میں موجود ہے مگر جب یہ بڑھ جائے تو زر پرستی بن جاتی ہے۔ زکوٰۃ اس زہریلے مادّے کے اخراج کا بہترین ذریعہ ہے۔ زکوٰۃ کے ذریعے معاشرے کے پریشان حال اور ضرورت مند لوگوں کی امداد ہوتی ہے محتاج اور بے کس افراد اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ زکوٰۃ معاشرے میں دولت کے ارتکاز کو روک کر اسے نچلے طبقات تک پھیلا دیتی ہے۔

غزوۂ بدر کے اثرات ۔ انتقام کی ناکام سازش:

بدر کی فتح نے پورے عرب میں مدینے والوں کی دھاک بٹھادی، اس فتح نے ثابت کر دیا تھا کہ دین اسلام اپنے قدم جما چکا ہے اور اس کے علم بردار نہ صرف اپنا دفاع کر سکتے ہیں بلکہ اپنے مخالفین کو منہ توڑ جواب بھی دے سکتے ہیں۔ مٹھی بھر مسلمانوں کا میدانِ بدر میں تین گنا دشمنوں پر غالب آنا اس بات کا ثبوت تھا کہ آسمانی مدد ان کے ساتھ ہے۔ اس واقعے نے عرب میں ایک بڑے انقلاب کا نقارہ بجا دیا تھا جس کی آواز دور دور تک سنی گئی۔

اِدھر مسلمان شاداں و فرحاں تھے اور اُدھر مکہ کے گھر گھر ماتم برپا تھا، ابولہب اس شکست کی خبر سننے کے نو دن بعد مر گیا۔ قریش نے بدر کے مقتولین کا انتقام لینے کی قسمیں کھائیں۔ اُمَیّہ بن خلف کا بیٹا صفوان اپنے باپ کے قتل پر اتنا غضب ناک تھا کہ اس نے اپنے دوست عمیر بن وَہْب کو زہر آلود خنجر دے کر نبی اکرم ﷺ کو قتل کرنے مدینہ روانہ کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اسے دیکھتے ہی بتا دیا کہ تم نے اور صفوان بن اُمَیّہ نے مل کر مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ عمیر نے یہ معجزہ دیکھنے کے بعد ایمان لانے میں ذرا پس و پیش نہ کی۔[2]

قریش کی سفارت حبشہ میں:

بدر کی شکست کے بعد قریش یہ سمجھ گئے تھے کہ مدینہ والوں سے ٹکر لینا آسان نہیں ہے، اس کے لیے غیر معمولی تیاری کرنا پڑے گی اس لیے انہوں نے شام سے آنے والے تجارتی قافلے کا سارا سرمایہ ایک بڑی جنگ کی تیاری میں جھونک دیا۔[3] اس کے ساتھ ساتھ قریش کی نظریں حبشہ میں پناہ گزین مسلمانوں پر مرکوز ہو گئیں جو کئی سال سے وہاں

---

[1] البدایة والنهایة: ۳۱۲/۵ ، البنایة شرح الهدایة: ۲۸۸/۳
یاد رہے کہ زکوٰۃ کا اجمالی حکم ہجرت مدینہ سے قبل نازل ہو چکا تھا جیسا کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے دربار میں حضور ﷺ کی تعلیمات کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا: وامرنا بالصلوة والزكوة ۔ (سیرۃ ابن ہشام: ۳۳۶/۱) ظاہر ہے یہ ہجرت مدینہ سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے۔ البتہ نظام زکوٰۃ کے تفصیلی مسائل ہجرت مدینہ کے بعد سن دو ہجری میں نازل ہوئے جبکہ حکومتی سطح پر اس کی تحصیل کا نظام فتح مکہ کے بعد ۹ ہجری میں قائم ہوا۔ (فتح الباری: ۲۶۶/۳)
[2] دلائل النبوة للبیهقی: ۱۴۸/۳۔
[3] سیرة ابن هشام: ۶۰/۲

امن وچین کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ قریش نے یہ دیکھ لیا تھا کہ مدینہ میں مسلمان مستحکم ہیں مگر حبشہ ایک عیسائی ملک تھا جہاں صرف بادشاہ کے عدل کی وجہ سے مسلمانوں کو پناہ ملی ہوئی تھی۔ قریش نے بدر کا انتقام لینے کے لیے سوچا کہ کیوں نہ حبشہ سے مسلمانوں کو بے دخل کرایا جائے۔[1] انہوں نے عَمرو بن العاص اور عُمارة بن الولید کو قاصد بنا کر نجاشی کے دربار میں بھیجا۔ ان دونوں نے نجاشی سے شکایت کی کہ یہ لوگ ہمارے مجرم ہیں، آپ انہیں پناہ نہ دیں بلکہ ہمارے سپرد کر دیں۔ مگر اس بار بھی یہ کوشش ناکام رہی اور نجاشی نے قریشی وفد کو بے نیلِ مرام واپس بھیج دیا۔[2]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح:

اسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے نکاح کی ذمہ داری بھی انجام دے دی۔ ان کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچازاد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پسند فرمایا۔ یہ نکاح غزوۂ بدر کے بعد ہوا، اور نہایت سادگی سے رخصتی ہوئی۔[3]

☆☆☆

---

① التاریخ الاوسط للبخاری: ۱/۳۰، ط دار الوعی

② مجمع الزوائد، ح:۹۸۳۵

اس سے پہلے بھی ایک سفارت گئی تھی جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اکثر سیرت نگاروں نے دونوں کو ایک سفارت قرار دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ آیا سفارت ہجرتِ حبشہ کے فوراً بعد گئی تھی یا غزوہ بدر کے بعد۔ یہ اختلاف بھی ہے کہ وفد میں عَمرو بن العاص کے ساتھی کا نام عبداللہ بن ابی ربیعہ ہے یا عمارۃ بن الولید۔ اگر سفارتوں کو الگ الگ مان لیا جائے تو اختلافات رفع ہو جاتے ہیں۔ ابن سید الناس رحمہ اللہ نے یہی رائے اختیار کی ہے کہ یہ واقعات الگ الگ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "وبعثت قریشا فی شانھم الی النجاشی مرتین: الاولیٰ عند ھجرتھم، والثانیة عند عقیب وقعة بدر وکان عَمرو بن العاص رسولا فی المرتین و معه فی احداھما عمارة بن الولید وفی الاخریٰ عبداللہ بن ابی ربیعة۔ (عیون الاثر: ۱/۳۵، ط دار القلم بیروت)

③ طبقات ابن سعد: ۸/۲۲ ط صادر

ایک روایت کے مطابق نکاح ہجرت کے پانچ ماہ بعد (رجب ایک ہجری میں) ہوا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۸/۲۲) مگر یہ درست نہیں۔ تحقیقی بات یہ ہے کہ نکاح اور رخصتی ۲ھ میں ہوئے۔ رخصتی کی تیاری کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ خود بتاتے تھے کہ میں نے اپنے ولیمے کے انتظام کے لیے دو اونٹنیوں پر گھاس لاد کر لانے اور بنو قینقاع کے ایک سنار کی مدد سے اسے فروخت کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ان میں سے ایک اونٹنی غزوہ بدر کے مالِ غنیمت میں ملی تھی اور دوسری حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ مگر کاروبار شروع ہونے سے پہلے ہی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے نشے کی حالت میں ان اونٹنیوں کو کاٹ ڈالا۔ (صحیح البخاری، کتاب المساقاۃ، باب بیع الحطب؛ صحیح مسلم، ح۵۲۴۲، کتاب الاشربة، باب تحریم الخمر) حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ غزوہ احد میں شہید ہو گئے تھے، پس بخاری و مسلم کی یہ متفقہ روایت شاہد ہے کہ رخصتی غزوۂ بدر اور اُحد کے درمیان کسی مہینے میں ہوئی تھی۔ وہ کون سا مہینہ تھا؟ اس کا اندازہ بھی اسی روایت سے ہو سکتا ہے؛ کیوں کہ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے "صائغ من بنی قینقاع" سے تجارتی اشتراک کا ذکر کیا ہے۔ یہ طے ہے کہ غزوۂ بدر کے فقط ۲۸ دن بعد ۱۵ شوال کو غزوۂ بنو قینقاع برپا ہوا تھا اور اس قبیلے کے تمام لوگ جلا وطن ہو گئے تھے جس کے بعد "صائغ بنی قینقاع" سے تجارتی اشتراک کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لیے رخصتی غزوۂ بدر اور غزوۂ قینقاع کے درمیان ہوئی تھی۔ یاد رہے کہ امام دولابی کی روایت کے مطابق صفر ۲ ہجری میں نکاح اور ذوالحجہ میں رخصتی ہوئی تھی۔ (الذریة الطاهرة، ص ۶۳، ونقله ابن الجوزی فی المنتظم: ۳/۸۴) اس ذوالحجہ سے مراد مکی ذوالحجہ نہیں ہو سکتا؛ کیوں کہ وہ غزوۂ بنی قینقاع کے دو ماہ بعد پڑتا ہے۔ پس راوی کی مراد مدنی ذوالحجہ ہی ہے۔ یہاں پر ایک قوی اشکال ہے، وہ یہ کہ مدنی ذوالحجہ اس سال مکی ماہِ رمضان کے متوازی چل رہا تھا جس میں پہلی بار روزے فرض ہوئے تھے۔ رمضان میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شرب خمر نہیں کر سکتے تھے۔ (رمضان کے بعد یہ عجیب نہ تھا؛ کیوں کہ اس وقت شراب ممنوع نہیں ہوئی تھی اور عربوں میں مے نوشی عام تھی) اس اشکال کی بناء پر ایک رائے یہ ہے کہ شوال کے آغاز میں عید کے موقع پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے نشے کی بے احتیاطی ہوئی تھی۔ (اسی سال یعنی ۲ ہجری میں پہلی عید الفطر مشروع ہوئی تھی۔ مرقاۃ المفاتیح: ۳/۱۰۶۰) اس کے فوراً بعد (غزوۂ بنی قینقاع سے قبل) رخصتی ہو گئی۔ یعنی رخصتی کا واقعہ مکی شوال کے پہلے عشرے کا ہے۔ یہ رائے اپنی جگہ قوی ہے لیکن اگر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے شرب خمر کو افطار کے بعد شام یا رات پر محمول کیا جائے تو پھر یہ اشکال رفع ہو جاتا ہے۔

یہود سے پہلا معرکہ: غزوۂ بنوقَینُقاع

بدر میں مسلمانوں کی فتح نے جہاں قریش کو مضطرب کر رکھا تھا وہاں مدینہ کے یہودی بھی جو رسول اللہ ﷺ سے اتحاد کا معاہدہ کر چکے تھے، اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت سے تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ خاص کر ''بنوقَینُقاع'' کے یہودیوں نے جو سنار اور صنعتکار ہونے کی وجہ سے بڑے دولت مند تھے، غزوۂ بدر کے بعد حضور ﷺ سے عہد شکنی کرتے ہوئے قریش مکہ سے ساز باز کرنے اور ان کا اتحادی بننے میں بھی کوئی باک محسوس نہ کیا۔[1]

حضور اکرم ﷺ کو ان کی غداری کا پتا چلا تو خود اُن کے محلے میں تشریف لے گئے جو مدینہ کے محلوں سے ملا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے انہیں جمع کر کے اسلام کے خلاف گٹھ جوڑ سے باز رہنے کی تلقین کی اور اسلام قبول کرنے کی دعوت بھی دی، جس کا انہوں نے یہ اہانت آمیز جواب دیا: ''آپ کا واسطہ مکہ کی اناڑی فوج سے پڑا ہے، ہم سے نہیں۔''

اُن کا رویہ اعلانِ جنگ کے مترادف تھا۔ تاہم رسول اللہ ﷺ نے صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا۔

چند دنوں بعد بنوقَینُقاع کے یہودیوں نے اپنے صرافہ بازار میں زیور بنوانے کے لیے آنے والی ایک مسلمان خاتون کو بے لباس کرنے کی کوشش کی، کسی مسلمان نے یہ منظر دیکھ لیا اور ایک بدمعاش یہودی کو موقع پر قتل کر دیا، باقی یہودی قلعہ بند ہو گئے۔ اس گھناؤنی حرکت کے بعد یہودی کسی رعایت کے مستحق نہ تھے۔ حضور ﷺ نے یہ خبر سنتے ہی فوج مرتب کی اور ان کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ یہ ۱۴ شوال سن ۲ ہجری کا واقعہ ہے۔[2] یہ اسلامی تاریخ کی پہلی جنگ تھی، جس میں قلعہ بند دشمن کا سامنا تھا۔ پندرہ دن تک محصور رہنے کے بعد بنوقَینُقاع نے ہار مان لی۔ انہیں سزا کے طور پر جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ لوگ مدینہ سے نکل کر شام کے سرحدی علاقے ''اَذرِعات'' میں جا بسے۔[3]

غزوۂ سَوِیق:

مسلمانوں اور یہودیوں میں کش مکش کا آغاز ہوتا دیکھ کر قریش یہود کو ساتھ ملانے کا سوچنے لگے۔ پہلے انہوں نے مدینہ میں بسنے والے یہودیوں سے خفیہ طور پر حلیفانہ تعلقات استوار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کام بنواُمَیَّہ کے رئیس

---

① التاریخ الاسلامی العام، للدکتور علی ابراهیم حسن: ص ۱۹۶

② یہ مکی تقویم ہے۔ (المغازی للواقدی: ۱/ ۱۷۶؛ السیرة النبویة لابن حبان، ص ۲۰۹) چونکہ مکی تقویم کا نیا سال شروع نہیں ہوا تھا، لہٰذا راوی نے اسے سن ۲ ہجری شمار کیا، جبکہ عام قمری ہجری تقویم میں یہاں نیا سال شروع ہو چکا تھا جس کے لحاظ سے یہ ۱۴ محرم ۳ھ کا واقعہ ہے۔

③ سیرة ابن هشام: ۲/ ۴۷ تا ۴۹؛ سبل الهدی والرشاد: ۴/ ۱۸۲

ابوسفیان بن حرب کے سپرد ہوا۔ ابوجہل، ابولہب اور عتبہ جیسے رئیسوں کی ہلاکت کے بعد ابوسفیان کو قریش کا قابل ترین فرد مانا جاتا تھا۔ ابوسفیان نے دو سو افراد کے ساتھ مدینہ کا رخ کیا اور یہودِ بنونضیر کے قلعوں میں قیام کیا، یہاں کے رئیس سلام بن مشکم سے اتحاد وتعاون کے عہد و پیمان ہوئے۔ واپسی میں ابوسفیان نے جاتے جاتے مدینہ کے ایک نخلستان کو نذر آتش اور ایک انصاری کو شہید کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے خبر ملتے ہی تعاقب کیا، مگر مکہ والے فرار ہو گئے۔ بھاگتے ہوئے وہ اپنا ستوؤں کا توشہ پھینکتے گئے۔ ستو کو عربی میں سَوِیق کہتے ہیں، لہٰذا یہ مہم غزوۂ سَوِیق کہلاتی ہے۔[1]

خصوصی خفیہ کارروائی۔ کعب بن اشرف یہودی کا قتل:

قریش کے مسلح افراد کو اپنے ہاں جگہ دینے اور انہیں مدینہ میں کارروائی کا موقع فراہم کر کے بنونضیر بھی اہل مدینہ سے معاہدے کی پاس داری کو مشکوک کر چکے تھے۔ بنونضیر کا ایک رئیس کعب بن اشرف اسلام دشمنی میں زیادہ سرگرم تھا، وہ شاعر بھی تھا اور اپنے اشعار سے مجمعے میں آگ لگا دیتا تھا۔ اب وہ اپنے اشعار میں مسلم خواتین کو ہوس ناک تخیل کا نشانہ بنانے لگا، اس کی یاوہ گوئی سے نبی اکرم ﷺ بھی محفوظ نہ تھے۔ اس وقت اس نے حد ہی کر دی جب وہ مکہ جا کر قریش کے سرداروں سے ملا اور بدر کے مقتول مشرکین کی یاد میں ایسے دردناک اشعار کہے کہ حاضرین سراپا انتقام بن گئے۔ میثاقِ مدینہ کے خلاف یہ سرگرمیاں اسلامی حکومت سے کھلی بغاوت اور بہر حال قابلِ سزا تھیں۔

حضور ﷺ فی الحال بنونضیر سے جنگ چھیڑنا نہیں چاہتے تھے مگر حد سے زیادہ فتنہ پھیلانے والوں کو مزید شر انگیزی کا موقع دینا بھی مناسب نہ تھا۔ اسی لیے آپ نے ایک دن فرمایا: ”کون ہے جو کعب بن اشرف کو ٹھکانے لگائے؟“

محمد بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ نے اس کام کا ذمہ لیا اور ساتھ ہی کعب بن اشرف سے کچھ باتیں کرنے کی اجازت مانگی جو آپ ﷺ نے عطا فرما دی۔ محمد بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ قرض لینے کے بہانے کعب بن اشرف کے قلعے میں پہنچے اور ملاقات کے دوران ایسی باتیں کہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اسلام کے لیے صدقہ خیرات دے دے کر وہ مالی بوجھ تلے دب گئے ہیں۔ کعب نے کہا: ”اللہ کی قسم! یہ پیغمبر تمہیں مزید تنگ کریں گے۔“

جب قرض کی بات آئی تو کعب نے بدلے میں گروی رکھنے کے لیے عورتوں یا بچوں کا مطالبہ کیا۔ محمد بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ”عورتوں کو تم جیسے عرب کے حسین ترین شخص کے پاس کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔ بچوں کو یرغمال رکھوایا تو انہیں قرض کے بدلے گروی رہنے والے کا طعنہ ملتا رہے گا۔ ہاں ہم اپنا اسلحہ تمہارے پاس رکھوا سکتے ہیں۔“

کعب بن اشرف اس پر راضی ہو گیا۔ محمد بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ رات کو دو تین ساتھیوں سمیت اسلحہ اٹھائے اس کے قلعے میں پہنچ گئے۔ محمد بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ ساتھیوں کو سمجھا چکے تھے کہ جب میں اشارہ کروں تو اس پر ٹوٹ پڑنا۔

[1] الکامل فی التاریخ: ۳۲/۲ ؛ سبل الھدیٰ والرشاد: ۱۷۲/۴

غزوۂ سویق ۵ ذوالحجہ کا واقعہ ہے جو ۵ ربیع الاول مدنی ۳ ہجری (۲۶ اگست ۶۲۴ء) کے مطابق ہے۔

آخر کعب سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت اس نے بہترین خوشبو لگائی ہوئی تھی۔ محمد بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے:

''ایسی خوشبو میں نے کبھی نہیں سونگھی۔''

وہ شیخی میں آکر کہنے لگا: ''ہاں! میرے پاس عرب کی سب سے زیادہ خوشبودار اور حسین ترین عورت ہے۔''

محمد بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا مجھے اجازت ہے کہ تمہارے سر کی خوشبو سونگھوں؟''

کعب نے ہاں کہہ کر جونہی سر آگے کیا، محمد بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ نے اسے دبوچ لیا اور ساتھیوں کو کہا: ''اسے نمٹا دو۔''

یوں اسلام کے اس دشمن کا کام تمام ہوگیا۔ یہ واقعہ ۱۴ ربیع الاول سن ۳ ھ کا ہے۔ ①

اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بیٹی اُمِ کلثوم اب تک کنواری تھیں۔ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی رُقیّہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد عثمان غنی رضی اللہ عنہ تنہا ہوگئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمِ کلثوم کے نکاح کے لیے مناسب رشتے پر غور کیا تو اب بھی عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے بہتر کوئی نہ تھا۔ چنانچہ جمادی الآخرۃ ۳ ہجری میں بیٹی کی انہی سے شادی کر دی۔ ②

عراق کی شاہراہ پر قریش سے مزاحمت۔ سَرِیّہ ذی قَرَدَہ (جمادی الآخرہ ۳ ھ):

قریش ایک طرف تو بدر کا انتقام لینے کے لیے جنگ کی تیاریاں کر رہے تھے، دوسری طرف اس سال انہوں نے موسم گرما کا تجارتی قافلہ شام کی بجائے عراق بھیجنے کا فیصلہ کیا؛ کیوں کہ مدینہ کے آس پاس سے گزرنا اب ان کے لیے بہت خطرناک ہو چکا تھا۔ صفوان بن اُمَیّہ اور ابوسفیان کی قیادت میں قافلہ مکہ سے عراق کی طرف روانہ ہوا جس کے سامان میں چاندی کا بڑا ذخیرہ شامل تھا مگر راستے میں نجد کی سنگلاخ زمین سے گزرتے ہوئے ''قَرَدَہ'' کے مقام پر انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے مسلح مجاہدین سے پالا پڑ گیا، جو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی کمان میں تھے۔ مکہ والوں کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس بھاگنا پڑا۔ ان کا مال و اسباب جو مسلمانوں کے ہاتھ آیا، ایک لاکھ درہم کا تھا۔ ③

☆☆☆

① صحیح البخاری، ح: ۴۰۳۷، باب قتل کعب بن اشرف ؛ المغازی للواقدی: ۱/۱۸۴ تا ۱۹۰

② الطبقات الکبریٰ لابن سعد: ۸/۳۸، ط صادر، تر: اُم کُلثوم رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

③ الکامل فی التاریخ: ۲/۳۶ ؛ سیرۃ ابن ھشام: ۲/۵۰۔ یہ واقعہ جمادی الآخرہ ۳ ھ (نومبر ۶۲۴ء) کا ہے۔ (طبقات ابن سعد: ۲/۳۶)

غزوۂ اُحد (شوال ۳ھ)

قریش کے لیے مدینہ پر چڑھائی کے کئی محرکات جمع ہو چکے تھے، تجارتی راستوں کی بندش تبھی کھولی جاسکتی تھی جب مسلمانوں کو نہتا کیا جاتا۔ بدر کے مقتولین کا انتقام بھی مدینہ پر حملہ کر کے ہی لیا جا سکتا تھا، عرب میں اپنی سابقہ آن بان بحال کرنے کا بھی اب ان کے خیال میں اور کوئی طریقہ نہ تھا لہٰذا ایک فیصلہ کن جنگ ناگزیر ہو چکی تھی۔

قریش نے اپنا سارا تجارتی نفع خرچ کر کے ایک زبردست لشکر تیار کیا، جس میں ان کے حلیف قبیلے اور ''احابیش'' کے جنگجو بھی شامل تھے۔[1] تین ہزار کے اس لشکر میں دو سو گھڑسوار اور سات سو زرہ پوش سپاہی تھے۔ پندرہ مرثیہ خواں عورتیں بھی تھیں جو بدر کے مقتولین کے نوحے پڑھ پڑھ کر فوج کو جوش دلاتی تھیں۔ اس لشکر کے پابہ رکاب ہوتے ہی حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس نے بنوغفار کے ایک تیز رفتار سوار کو اطلاعی رقعہ دے کر مدینہ بھیج دیا۔ چنانچہ لشکر کے پہنچنے سے کئی دن قبل رسول اللہ ﷺ کو یلغار کی اطلاع مل گئی۔[2]

چونکہ مدینہ کے جنوب میں لاوے کی کثرت ہے جہاں لڑنا دشوار ہے لہٰذا لشکرِ قریش مدینہ کے گرد چکر کاٹ کر شمال میں پہنچ گیا اور یہاں کوہِ اُحد کے مغرب میں ''زغابہ'' میں خیمہ زن ہوا۔ یہ شوال سن ۳ھ کے پہلے عشرے کا واقعہ ہے۔ قریش جنگ بدر کا پورا پورا بدلہ لینے چاہتے تھے، فتح کے بعد وہ اسی سمت سے مدینہ میں گھس سکتے تھے؛ کیوں کہ باقی اطراف سے مدینہ جھلسی ہوئی پہاڑیوں اور ایک جانب سے باغات کی دیواروں میں گھرا ہوا تھا۔

اُدھر نبی اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں صحابہ کرام سے جنگ کے بارے میں مشورہ کر رہے تھے، چونکہ اتنی بڑی فوج سے دوبدو مقابلے میں خاصے جانی نقصان کا اندیشہ تھا اس لیے رسول اللہ ﷺ کی رائے یہ تھی کہ شہر میں رہ کر محصورانہ جنگ کی جائے۔ عبداللہ بن اُبی بزدلی کی وجہ سے آمنے سامنے کی جنگ سے گھبرا رہا تھا، اس نے ہاں میں ہاں ملائی مگر نوجوان شمشیرزنی کے جوہر دکھانے کے لیے بے چین تھے۔ انہوں نے باہر نکل کر لڑنے پر اصرار کیا، ان میں سے بہت سوں کو جنگ بدر میں شرکت نہ کر سکنے کا رنج تھا اور شہادت کی اُمنگ ان کے دلوں میں مچل رہی تھی۔

ان کا جوش و خروش دیکھ کر نبی اکرم ﷺ خاموشی سے گھر تشریف لے گئے اور پھر زرہ پہن کر ہتھیار باندھے مجمع میں تشریف لائے۔[3] یہ کھلے میدان میں جا کر لڑنے کا عملی اشارہ تھا۔ صحابہ اب فکرمند ہوئے اور انہوں نے اپنی رائے سے دستبردار ہوتے ہوئے عرض کیا: ''آپ پسند فرمائیں تو اندر ہی رہ کر لڑائی کی جائے۔''

مگر آپ نے فرمایا: ''جب نبی ہتھیار پہن لے تو اسے زیب نہیں دیتا کہ لڑے بغیر انہیں اُتار دے۔''[4] یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ جب ایک حکمت عملی طے ہو جائے تو اس میں بار بار ردّ و بدل کرنا مناسب نہیں ہوتا۔

① مکہ کے نواح میں آباد بنوکنانہ اور بنومدرک کے بعض قبائل کو احابیش کہا جاتا تھا۔ (التاریخ الاسلامی العام، ص ۱۰۸)

② المغازی للواقدی: ۱/۲۰۳، ۲۰۴ ③ سیرۃ ابن ہشام ۲/۶۲، ۶۳ ④ مسند احمد، ح: ۱۴۷۸۷؛ سنن الدارمی، ح: ۲۲۰۵

کوہِ اُحد کی سمت پیش قدمی اور منافقوں کی اسلام دشمنی:

نبی اکرم ﷺ نے جمعہ کی نماز پڑھا کر لشکر مرتب کیا اور سہ پہر کے وقت شہر کے اندرونی محلوں اور کوچوں سے گزرتے ہوئے شمالی سمت کو روانہ ہوئے جدھر قریش پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ انہیں چوکنا کیے بغیر مناسب مقام تک پہنچا جاتا، اس لیے رسول اللہ ﷺ کسی نئے راستے سے نکلنا چاہتے تھے۔ شہر کے کنارے بنوحارثہ کے محلے میں پہنچ کر آپ نے فرمایا:

''کوئی ہے جو ہمیں ایسے راستے سے دشمن کے قریب پہنچا دے کہ ہمیں ان کے سامنے سے نہ گزرنا پڑے۔''

اس محلے کے ایک صحابی ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اللہ کے رسول! میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں۔''

وہ اسلامی فوج کو باغات کے اندرونی راستوں سے گزار کر آبادی سے باہر لے گئے۔ منافقوں نے اس موقع پر اپنی اسلام دشمنی کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔ لشکر کو ایک منافق مربع بن قیظی کے باغ سے گزرنا پڑا تو اس نے واویلا شروع کر دیا کہ میں اپنے باغ سے گزرنے کی اجازت نہیں دے سکتا، تاہم موقع ایسا نازک تھا کہ کسی کی حیلہ بازی کو خاطر میں لا کر ریاست کے دفاع کو خطرے میں نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مسلمان اس کا احتجاج نظرانداز کر کے وہیں سے گزرے۔

اس نازک ترین وقت میں عبداللہ بن اُبی منافق نے جنگ میں شرکت کرنے سے اچانک انکار کر دیا۔ اس نے بہانہ یہ بنایا کہ اس کی رائے شہر میں محصورانہ جنگ کی تھی، اس پر عمل کیوں نہیں کیا گیا۔ جب وہ یہ کہہ کر واپس ہوا کہ ''ہم کیوں بے فائدہ اپنی جانیں گنوائیں۔'' تو کم وبیش تین سو افراد اس کے ساتھ ہی لوٹ گئے۔ یہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت تھا کہ مدینہ میں منافقوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی جو اسلام کی جڑیں کاٹنے پر تلے تھے۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ ان غداروں کو روکنے کی کوشش کرنا، ایک نئی جنگ مول لینے کے مترادف تھا، اس لیے حضور ﷺ نے خاموشی اختیار کی۔

لشکر کا ایک تہائی حصہ کم ہو گیا تھا، اب لگ بھگ سات سو افراد رہ گئے تھے، اگر منافقین شروع سے لشکر کے ساتھ نہ چلتے تو اتنا حوصلہ شکنی نہ ہوتی مگر اب ان کے اچانک چلے جانے سے اسلامی فوج کو سخت دھچکا لگا۔ مگر اللہ کی رحمت اور حضور ﷺ جیسے بے مثال قائد کی رہنمائی شاملِ حال تھی، اس لیے مسلمان ہمت نہ ہارے۔[1]

دفاعی حکمتِ عملی:

درحقیقت مدینہ کو پہلے کبھی اتنی سنگین صورتحال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، جنگ بدر مدینہ سے ۷۰ میل (۱۱۲ کلومیٹر) دور ہوئی تھی لہٰذا شہر خطرے کی زد سے دور تھا مگر اب طبلِ جنگ مدینہ کے دروازے پر بج رہا تھا۔ عددی لحاظ سے بھی صورتحال غزوۂ بدر سے زیادہ نازک تھی، تب کفار تین گنا تھے اور اب چار گنا سے بھی زیادہ؛ کیوں کہ عبداللہ بن اُبی کے جانے کے بعد اسلامی فوج سات سو کے لگ بھگ رہ گئی تھی جبکہ قریش کے تین ہزار جوان شہر سے صرف تین میل دور پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ اگر انہیں ڈر نہ ہوتا کہ اندر مسلح مسلمان خاصی تعداد میں ہیں تو شاید وہ شہر میں گھسنے سے گریز نہ

① البداية والنهاية: ٣٥٥/٥، دار هجر

کرتے مگر اب ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ پہلے کھلے میدان میں لڑ کر مسلمانوں کی مسلح افرادی طاقت کا صفایا کر دیا جائے۔ لڑائی میں کامیابی کے امکانات بظاہر کم تھے مگر حضورِ اقدس ﷺ ایمان، عزیمت، توکل اور شجاعت کی انتہا پر تھے اور دفاع کی ہر ممکنہ تدبیر پر غور کر رہے تھے۔ دوسری طرف قریش مدینہ کے باہر پڑاؤ ڈال کر بے فکر ہو گئے تھے، انہوں نے مدینہ سے باہر نکلنے والے راستوں کی ناکہ بندی کی بالکل ضرورت محسوس نہیں کی تھی، اسی طرح انہوں نے کسی موزوں میدانِ جنگ کی تلاش بھی اہم نہیں سمجھی۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کی غفلت سے فائدہ اٹھایا اور قریش کے پڑاؤ کو اپنے بائیں ہاتھ پر چھوڑتے ہوئے شہر سے اتنا باہر نکل آئے کہ کوہِ اُحد کے دامن میں پہنچ گئے۔ بظاہر یہ ایک خطرناک اقدام بھی تھا؛ کیوں کہ اب قریش تھوڑی سی مستعدی دکھا کر لشکرِ اسلام اور مدینہ کے درمیان حائل ہو سکتے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ کو یقین تھا کہ جنگ کا فیصلہ ہونے سے پہلے قریش مدینہ میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کریں گے، کیوں کہ اس صورت میں لشکرِ اسلام انہیں پشت سے گھیر سکتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ اپنی عددی کمی کو پیش نظر رکھتے ہوئے محسوس کر رہے تھے کہ کسی عام میدان میں جنگ جیتنا مشکل ہے، اس لیے آپ کو ایسے خاص مقام کی تلاش تھی جہاں اپنی قوت کو محفوظ رکھتے ہوئے دشمن پر جارحانہ حملہ کیا جا سکے۔ یہ تب ہی ہو سکتا تھا جب پشت اور دائیں، بائیں سے گھرنے کا خطرہ نہ ہوتا اور ایسا اُحد پہاڑ کے دامن ہی میں ممکن تھا۔ یہ مدینہ کا سب سے بلند پہاڑ ہے جو شہر سے پونے پانچ کلومیٹر شمال میں واقع ہے، یہ جنوب مشرق سے شمال مشرق کو اس طرح پھیلا ہوا ہے کہ لمبائی پانچ میل (۸ کلومیٹر) اور چوڑائی دو میل (سوا تین کلومیٹر) تک چلی گئی ہے۔

اس موقع پر حضور ﷺ نے فوج کا ازسرنو جائزہ لیا۔ عبداللہ بن عمر، اسامہ بن زید، زید بن ارقم، براء بن عازب، زید بن ثابت اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم صرف چودہ چودہ سال کے تھے مگر جہاد کے شوق میں ساتھ ساتھ چلے آئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کو واپس فرما دیا۔ البتہ رافع بن خَدِیج رضی اللہ عنہ کو جو پندرہ سال کے تھے، اس لیے قبول کر لیا کہ وہ اچھے تیرانداز تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں تیرانداز دستے میں شامل فرما دیا۔ اسی طرح سَمُرَہ بن جُندُب رضی اللہ عنہ کو بھی جو پندرہ سال کے تھے، قبول فرما لیا، اس لیے کہ انہوں نے کشتی میں رافع بن خَدِیج رضی اللہ عنہ کو پچھاڑ کر دکھا دیا تھا۔ [1]

ہفتہ ۱۵ شوال ۳ ھ (۳۰ مارچ ۶۲۵ء) کو علی الصباح حضور ﷺ نے صف بندی اور مورچہ بندی اس طرح مکمل کر لی تھی کہ اُحد پہاڑ پشت پر تھا اور مدینہ منورہ بائیں ہاتھ پر۔ [2]

① البداية والنهاية: ۳۵۳/۵ ، تاريخ ابن خلدون: ۴۳۴/۲

② غزوۂ اُحد کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ ابن اسحٰق "نصف شوال" کہتے ہیں اور قتادہ "ہفتہ ۱۱ شوال" (البداية والنهاية: ۳۳۸/۵) راقم کو متقدمین سے کسی اور تاریخ کی صراحت نہیں ملی۔ اگرچہ متاخرین ۶، ۷ اور ۸ تاریخ بھی بتاتے ہیں۔ (السيرة والدعوة في العهد المدني، احمد غلوش، ص ۳۴۰) ابن اسحٰق کا قول راجح لگتا ہے؛ کیوں کہ یہ طے ہے کہ حضور ﷺ نماز جمعہ پڑھ کر اُحد تشریف لے گئے تھے اور اگلے دن جنگ ہوئی جو یقیناً ہفتے کا دن تھا۔ تقویمی لحاظ سے ہفتے کو تاریخ ۸ شوال تھی یا ۱۵۔ ۸ کا قول صرف قیاسی ہے اور ۱۵ کا قول تقویمی حساب کے علاوہ ابن اسحٰق کے قول کے بھی مطابق ہے۔ پس یہی راجح ہے۔ یہاں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ راقم نے جہاں تک غور کیا ہے، غزوۂ اُحد کی تاریخ ۱۵ شوال خالص قمری یعنی مدنی تقویم کے مطابق ہے۔ اگرچہ مولانا اسحاق النبی علوی مرحوم کی رائے یہ ہے کہ یہ ۷ شوال (مدنی محرم ۴ھ) تھا۔ (نقوش، رسول نمبر، ج:۲) مگر اس کی تائید میں ان کے پیش کردہ شواہد کچھ خاص وزن نہیں رکھتے۔

قریش کے لشکر کے نمایاں افراد:

دن کا اُجالا پھیلتے ہی لشکرِ قریش مسلمانوں کی طرف بڑھنے لگا۔ ان کے دو ماہر جرنیل خالد بن ولید دائیں بازو کے اور عکرمہ بن ابوجہل بائیں بازو کے سو سو گھڑ سواروں کی قیادت کر رہے تھے، خالد کی جنگی مہارت ضرب المثل تھی جبکہ عکرمہ اپنے باپ ابوجہل کے خون کا بدلہ لینے کے لیے بے تاب تھا۔ ان میں ابو عامر راہب نامی مشہور درویش بھی تھا جو مدینہ کا باشندہ تھا اور اسلام سے پہلے عبادت و ریاضت کی وجہ سے مشہور تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے اس کی جعلی روحانیت کا بھرم کھلا تو وہ حسد اور انتقام کی آگ میں جلنے لگا، اس کا طیش اس وقت اور بڑھ گیا جب اس کے بیٹے حنظلہ رضی اللہ عنہ نے بھی اسلام قبول کر لیا، تب ابو عامر اپنے چند چیلوں سمیت مکہ چلا گیا۔ آج وہ انتقام کی آگ بجھانے لشکرِ قریش میں شامل ہو کر آیا تھا۔ اس لشکر میں جُبیر بن مُطعم کے غلام وحشی بن حرب کو بھی شامل کیا گیا تھا، جسے نیزہ پھینک کر مارنے میں ایسی مہارت تھی کہ کبھی نشانہ چوکتا نہ تھا۔ جُبیر بن مُطعم کو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر جنھوں نے جنگ بدر میں قریش کے سپہ سالار عُتبہ کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا، سخت غصہ تھا۔ جُبیر بن مُطعم نے وحشی سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر دے تو اسے آزاد کر دیا جائے گا۔[1]

قریش کی خواتین لشکر کے پیچھے دف بجا بجا کر یہ رزمیہ گیت گا رہی تھیں ؎

إِنْ تُقْبِلُوا نُعَانِقْ   وَنَفْرِشِ النَّمَارِقْ

''اگر تم پیش قدمی کرو گے تو ہم تمھیں گلے سے لگا لیں گی اور تمھارے لیے پھول دار بستر بچھا دیں گی۔''

أَوْ تُدْبِرُوا نُفَارِقْ   فِرَاقَ غَيْرَ وَامِقْ

''لیکن تم پسپا ہوئے تو ہم تمھیں چھوڑ دیں گی، کسی لگاؤ کے بغیر ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں گی۔''[2]

مسلمانوں کی صف بندی کے عسکری پہلو:

مسلمان سارے کے سارے پاپیادہ تھے، صرف دو افراد کے پاس گھوڑے تھے، دشمن کی فوج کے دو سو گھڑ سوار کھلے میدان میں آسانی سے پیادوں پر حاوی ہو سکتے تھے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے وادی کے کشادہ حصے میں زیادہ آگے جا کر صفیں باندھنے سے احتراز کیا تاکہ ضرورت پڑنے پر مسلمان پیچھے ہٹ کر اپنے معسکر میں آ سکیں، جہاں پہاڑی دیوار تقریباً نیم دائرے کی شکل میں کھڑی تھی۔ اس تنگ جگہ میں دشمن کے گھڑ سوار گھوڑوں کو آزادی سے چکر نہیں دے سکتے تھے، جبکہ مسلمان پیادے تیزی سے رخ بدل بدل کر ان کو گھائل کر سکتے تھے۔

اُحد پہاڑ کی طرف پشت کر کے صف بندی میں یہ حکمت بھی تھی کہ اس طرح مسلمانوں کا منہ مغرب کی طرف تھا،

---

[1] البداية والنهاية: 5/ 350، 352، دار هجر ...... یہ جُبیر بن مطعم شرفائے قریش میں سے تھے۔ حضور ﷺ کے رشتے میں چچازاد لگتے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر مشرف باسلام ہوئے، ان سے چند احادیث بھی مروی ہیں، 59 ہجری میں وفات ہوئی۔ (سير أعلام النبلاء: 3/ 99، ط الرسالة)

[2] البداية والنهاية: 5/ 355

اب دشمن کے سپاہی سامنے سے مشرق رُو ہو کر ہی حملہ آور ہو سکتے تھے اور ایسے میں سورج کی شعاعیں ان کی نگاہوں کو چندھیا کر انہیں ضرور پریشان کرتیں۔

مسلمانوں کی پشت پر اتنی دشوار گزار ڈھلوان تھی کہ اس پر گھوڑا چڑھانا ممکن نہیں تھا، ہاں شکست کی صورت میں پاپیادہ مسلمان اس ڈھلوان پر چڑھ سکتے تھے اور قریشی گھڑسواروں پر تیراندازی اور سنگ باری کر کے خود کو بچا سکتے تھے۔ اگر عقب سے کوئی حملہ ممکن تھا تو صرف اسی صورت میں جب قریش کا کوئی دستہ لمبا چکر کاٹ کر عقب میں آتا اور مسلمانوں کے بائیں بازو پر ٹوٹ پڑتا۔ اگرچہ ایسی کارروائی مشکل ضرور تھی مگر ناممکن نہیں۔ حضور ﷺ نے اس خطرے کو بروقت بھانپتے ہوئے ایک انوکھا فیصلہ کیا۔ میدانِ جنگ میں لشکرِ اسلام کی بائیں طرف پہاڑ سے خاصہ دور ہٹ کر ایک لمبا چپٹا ٹیلہ تھا، اس کی پچھلی سمت معمولی بلند تھی جس پر گھڑسوار چڑھ سکتے تھے البتہ اگلا حصہ جو میدان کی طرف تھا خاصا اونچا تھا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جُبیر رضی اللہ عنہ کی کمان میں پچاس تیراندازوں کا ایک دستہ اس ٹیلے پر مقرر کر دیا تھا اور ہدایت دی کہ کسی حالت میں بھی اپنی جگہ مت چھوڑنا۔ یہ تیرانداز اس ٹیلے سے چاروں طرف دور دور تک دیکھ سکتے تھے، ان کے پیچھے کوہِ اُحد تھا، بائیں ہاتھ پر مدینہ اور سامنے دشمن۔ ان کی موجودگی میں دشمن مسلمانوں پر پیچھے سے حملے کے لیے ٹیلے کا چکر نہیں کاٹ سکتا تھا۔ اگر وہ مدینہ میں گھسنے کی کوشش کرتا تو تیرانداز عقب سے انہیں نشانہ بناتے اور نبی اکرم ﷺ کو فوراً خبر دے کر ان کا تعاقب کرواتے۔ اگر قریشی گھوم کر مسلمانوں کے عقب میں آتے تب بھی تیراندازوں سے بھڑے بغیر آگے جانا ممکن نہ تھا۔

جنگ شروع ہونے سے پہلے قریش کے سپہ سالار ابوسفیان نے آخری تنبیہ کے طور پر انصار کو پیغام بھیجا:

''تم ہمارے چچازاد کا ساتھ دینا چھوڑ دو، ہم واپس چلے جائیں گے، ہمیں تم سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

انصار نے اس پیغام کا سخت جواب دے کر قاصد کو لوٹا دیا۔[1]

ابودُجانہ رضی اللہ عنہ کی دلیری اور انفرادی مقابلے:

اب دونوں طرف کے لوگ عمومی حملے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے ضروری سمجھا کہ طاقت ور دشمن پر ابتدا میں نفسیاتی دباؤ ڈالا جائے۔ ایسا بہادری اور سرفروشی کے غیر معمولی مظاہرے ہی سے ممکن تھا۔ اسی لیے جناب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کے جذبات کو اُبھارتے ہوئے اپنی تلوار لہرائی اور فرمایا: ''اسے کون لے گا؟''

کئی جاں نثاروں نے اپنے ہاتھ بڑھائے۔ رسول اللہ ﷺ نے تلوار پیچھے کر لی اور فرمایا: ''اس کا حق ادا کرنے کی ضمانت پر کون لے گا؟'' انصار کے نامور شمشیر زن ابودُجانہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور پوچھا: ''حق سے کیا مراد ہے؟''

فرمایا: اسے اتنا چلاؤ کہ خون سے رنگین ہو جائے۔''

انہوں نے عرض کیا: ''میں حق ادا کرنے کی ضمانت پر لیتا ہوں۔''

---

[1] البدایة والنهایة: ٣٦٩/٥، دار هجر

تلوار لیتے ہی انہوں نے سر پر سرخ پٹی باندھ لی، میدان میں اترتے وقت یہ ان کی عادت تھی۔ یہ دیکھ کر سب نے بے اختیار کہا: ''ابودُجانہ نے موت کی پٹی باندھ لی۔''

ابودجانہ رضی اللہ عنہ تلوار سونت کر دونوں صفوں کے درمیان اکڑتے ہوئے گھوم رہے تھے۔ حضورِاقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا: ''اللہ کو یہ چال صرف ایسے موقع پر پسند ہے۔''

اس کے بعد دونوں طرف سے انفرادی مقابلے ہوئے، مشرکین کا نامور پہلوان طلحہ بن ابی طلحہ اونٹ پر سوار نکلا، اِدھر سے زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ پیدل نمودار ہوئے اور اچھل کر اس کے اونٹ پر چڑھ گئے، ساتھ ہی اسے دھکیل کر زمین پر گرادیا اور تلوار سے ذبح کر ڈالا۔ پھر مقتول کا بھائی ابوسعد آیا اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مارا گیا، یہ دیکھ کر مقتول کے دو بھتیجے: مُسافع اور جُلاس میدان میں نکلے، اِدھر سے عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کمان سنبھال کر کھڑے ہوئے اور دونوں کو تیروں کا نشانہ بنادیا۔ ①

عام حملہ اور مسلمانوں کی برتری:

اب دونوں طرف سے نعرے بلند ہوئے اور دونوں لشکر باہم ٹکرا گئے۔ ابودُجانہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شمشیر اس طرح چلائی کہ پرے کے پرے صاف کر دیے اور دشمن کی صفیں اُلٹتے ہوئے ان کی عورتوں تک جا پہنچے یہاں تک کہ ہند بنت عُتبہ ان کی شمشیر کی زد میں آ گئی۔ انہوں نے عورت ہونے کا لحاظ کرتے ہوئے چھوڑ دیا۔

مہاجرین وانصار نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر شمشیر زنی کے جوہر دکھائے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے سامنے جو مشرک آتا، تلوار کا لقمہ بن جاتا۔ اَرطاۃ بن عبد شُرَحْبِیل اور سِباع بن عبدالعزّٰی جیسے سورما آناً فاناً ان کے آگے ڈھیر ہوگئے۔ اُدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وار سے مشرکین کا علم بردار طلحہ بن عثمان زخمی ہو کر پرچم سمیت گر پڑا۔ قریش کے گھڑ سوار اور پیادے مسلمانوں کی ایمانی طاقت اور جوش وجذبے کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ مسلمان تعاقب کرتے ہوئے ان کی خیمہ گاہ تک پہنچ گئے اور مالِ غنیمت جمع کرنے لگے۔ ②

مشرکین کی عورتیں پائینچے چڑھائے وہاں سے بھاگ رہی تھیں۔ ٹیلے پر تعینات تیراندازوں نے یہ منظر دیکھا تو وہ بھی سمجھے کہ جنگ کا فیصلہ ہوگیا ہے، اس لیے وہ بھی مالِ غنیمت لینے نیچے اُترنے لگے، ان کے امیر عبداللہ بن جُبیر رضی اللہ عنہ نے انہیں روکنے کی کوشش کی اور یاد دلایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حال میں یہاں پہرہ دینے کی تاکید فرمائی ہے مگر جانے والے یہ سوچ کر نہ رکے کہ یہ حکم جنگ کی حالت میں تھا اور اب جنگ ختم ہو چکی ہے۔ ③

پانسہ پلٹ گیا:

اس طرح ٹیلے پر فقط چودہ، پندرہ افراد باقی رہ گئے، مشرکین کے گھڑ سوار دستے کے سالار خالد بن ولید نے پسپائی

① البدایة والنهایة: ۳۶۹/۵ دار هجر ② الکامل فی التاریخ: ۴۴/۲، ۴۵، دار الکتاب العربی
③ صحیح البخاری، ح: ۳۰۳۹، کتاب الجهاد، باب ما یکره من التنازع والاختلاف

کی حالت میں بھی ٹیلے کو خالی ہوتا دیکھ لیا اور اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہ لگائی۔ جلد ہی خالد کا گھڑ سوار دستہ ٹیلے کا چکر کاٹتے ہوئے مسلمانوں کے عقب میں آن پہنچا۔[1]

ٹیلے پر رہ جانے والے باقی ماندہ پہرے دار انہیں روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ اب خالد بن ولید نے مالِ غنیمت جمع کرتے ہوئے بے خبر مسلمانوں پر دھاوا بول دیا اور بہت سوں کو شہید کر دیا۔ اُدھر سے بھاگتے ہوئے مشرکین بھی پلٹ آئے اور مسلمان دونوں طرف سے سخت نرغے کی کیفیت میں آنے لگے۔

وحشی نے موقع پا کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر بھالا پھینکا جو ان کی ناف کے پار ہو گیا۔ اُدھر لشکرِ اسلام کے پرچم بردار مُصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بھی شہید ہو گئے، پرچم کے زمین بوس ہو جانے سے مسلمانوں کی شیرازہ بندی مزید مشکل ہو گئی۔ ساتھ ہی یہ افواہ پھیل گئی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ یہ سن کر مسلمانوں پر بجلی گر پڑی۔ رنج و اضطراب، بدنظمی اور افراتفری کی اس کیفیت میں درجنوں مسلمان شہید ہو گئے اور بہت سے اِدھر اُدھر نکل گئے۔[2]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع میں صحابہ کی بے مثال سرفروشی:

مگر افواہ غلط تھی، اس نازک ترین صورتِ حال میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ جنگ میں موجود تھے۔ قریش کے کئی جنگجو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کر رہے تھے۔ ان کے ناپاک عزائم سے بچانے کے لیے چند صحابہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حصار میں لے لیا تھا اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر آپ کے گرد کھڑے تھے، ان میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حارث بن الصِمہ اور چند انصاری رضی اللہ عنہم پیش پیش تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے پہلے حفاظتی تدبیر کے طور پر اپنی زرہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے بدل لی تھی، لہٰذا آپ کی پہچان مشکل ہو گئی تھی، پھر بھی مشرکین میں سے عُتبہ بن ابی وقاص اس طرف آیا اور یکے بعد دیگرے کئی پتھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پھینکے، جن سے آپ کے دندانِ مبارک زخمی ہو گئے۔ اتنے میں ابن شہاب اور ابنِ قَمِئہ مشرکین کے ایک جتھے کے ساتھ تلواریں کھینچ کر حملہ آور ہوئے۔ موقع پر موجود صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دیوار بن گئے۔ اس کے باوجود ابن شہاب کے وار سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر زخم آ گیا اور ابنِ قَمِئہ کی تلوار آپ کے فولادی خود پر پڑی۔ اگرچہ سر مبارک محفوظ رہا مگر خود کی آہنی کڑیاں رخساروں میں کھب گئیں۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کرنے والوں میں اُمِ عمارہ (نُسَیبہ بنت کعب) رضی اللہ عنہا بھی تھیں، وہ آپ کے دائیں بائیں تلوار اور تیر چلا رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی ان کے خاوند زید بن عاصم اور دو بیٹے: حبیب اور عبداللہ بھی شیروں کی طرح مشرکین سے لڑ رہے تھے۔ اُمِ عمارہ رضی اللہ عنہا ابنِ قَمِئہ سے اُلجھ گئیں۔ اس نے ایسی تلوار ماری کہ اُمِ عمارہ رضی اللہ عنہا کے

---

[1] بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ حضرت خالد پورے پہاڑ کا چکر کاٹ کر آئے تھے۔

[2] الکامل فی التاریخ: ۲/ ۴۴، ۴۵

[3] الکامل فی التاریخ: ۲/ ۴۴، ۴۵؛ سیرۃ ابن ھشام: ۲/ ۸۰ تا ۸۲

کندھے سے بوٹی اتر گئی۔ اُمّ عمارہ رضی اللہ عنہا نے زخم کی پروانہ کرتے ہوئے جواباً اس پر شمشیر کے کئی وار کیے مگر وہ بد بخت دوزرہیں پہنے ہوا تھا، اس لیے بچ گیا۔ اُمّ عمارہ رضی اللہ عنہا کو کئی زخم لگے مگر کفار انہیں راستے سے نہ ہٹا سکے۔ ①

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اُم عمارہ رضی اللہ عنہا کے پاس ڈھال نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ وہ اپنی ڈھال انہیں دے دیں۔ اُم عمارہ رضی اللہ عنہا وہ ڈھال لے کر زیادہ پامردی سے لڑنے لگیں۔

اُم عمارہ رضی اللہ عنہا اس دن کو یاد کرتے ہوئے فرماتی تھیں:

''ہمیں گھڑ سواروں نے زیادہ نقصان پہنچایا۔ اگر وہ ہماری طرح پیدل ہوتے تو ہم انہیں مزا چکھا دیتے۔''

جب کوئی گھڑ سوار حملہ کرتا تو اُم عمارہ رضی اللہ عنہا ڈھال کے ذریعے بڑی مہارت سے بچاؤ کرتیں اور اس کی تلوار کچھ نہ بگاڑ پاتی۔ جب وہ واپس مڑتا تو اُم عمارہ رضی اللہ عنہا اس کے گھوڑے کے پاؤں پر وار کرتیں، گھوڑے اور گھڑ سوار کے گرتے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُم عمارہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے کو آواز دیتے: ''عمارہ کے بیٹے! اپنی ماں کی مدد کرو۔'' دونوں ماں بیٹا مل کر دشمن کو نمٹا دیتے۔ اس دوران ایک حملہ آور نے ان کے بیٹے عبداللہ بن زید کا ہاتھ شدید زخمی کر دیا۔ اُم عمارہ رضی اللہ عنہا دوڑ کر آئیں، اپنے تھیلے سے مرہم پٹی کا سامان نکالا اور پٹی باندھ کر کہا: ''جا میرے بچے! دشمن سے لڑ۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا: ''اُم عمارہ! کون ہے جو تم جیسی ہمت رکھتا ہو۔''

اتنے میں ایک کافر حملے کے لیے دوڑا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اُم عمارہ یہی ہے تمہارے بچے کو زخمی کرنے والا۔''

اُم عمارہ رضی اللہ عنہا نے آگے بڑھ کر اس کی پنڈلی پر ایسا وار کیا کہ وہ گر پڑا۔ پھر بیٹے کے ساتھ مل کر اس کا کام تمام کر دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا: ''تم نے اپنا بدلہ لے لیا۔ اللہ کا شکر ہے جس نے تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیں۔'' ②

مشرکین نے براہِ راست حملے ناکام جاتے دیکھ کر تیر برسانے شروع کر دیے۔ یہ دیکھ کر ابو دجانہ رضی اللہ عنہ تیزی سے لپکے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اوندھے جھک گئے، مشرکین کے تیر ان کی پشت میں پیوست ہوتے گئے۔ ③

منتشر مسلمانوں کی ہمت اور جنت کا شوق:

جو مسلمان وہاں سے دور مختلف ٹکڑیوں میں بکھرے ہوئے تھے انہیں ابھی تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ پتا نہ تھا، تاہم انہوں نے کچھ دیر میں اپنے حواس پر قابو پا لیا اور ایک دوسرے کو ہمت دلانے لگے۔ ثابت بن دحداح رضی اللہ عنہ نے آواز لگائی: ''اے انصاریو! آؤ میری طرف آؤ۔ میں ہوں ثابت بن دحداح۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں تو کیا مگر اللہ تعالیٰ تو موجود ہے۔ تم اپنے دین کو بچانے کے لیے لڑو۔''

کچھ انصاری ان کے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے قریش کے گھڑ سوار دستے کا سامنا کیا جس میں خالد بن ولید،

---

① سیرۃ ابن ہشام: ۲/ ۸۲
② طبقات ابن سعد: ۸/ ۳۱۴ ط صادر
③ البدایۃ والنہایۃ: ۵/ ۲۱۰

عِکرِمہ بن ابی جہل اور عَمرو بن العاص جیسے شمشیرزن شامل تھے۔زوردار جھڑپ کے بعد ثابت بن دحداح رضی اللہ عنہ اوران کے تمام ساتھی شہید ہوگئے۔ ①

اَنس بن نَضر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو بکھرتا دیکھ کر کہا: ''بھائیو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کروگے، آگے بڑھو اور جس مقصد کے لیے ہمارے آقا نے جان دی ہے، اس پر جان دے دو۔''

یہ کہہ کر وہ کفار کی بھیڑ میں گھس گئے اور آخر دم تک تلوار چلاتے رہے۔ ②

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ زخمی ہوچکے تھے، وہ فرماتے ہیں: ''میں نے دیکھا کہ زرہ میں ملبوس اور اسلحے سے لیس ایک لحیم شحیم کافر مسلمانوں پر بڑا بھاری پڑ رہا تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: ''انہیں باندھ باندھ کر مارو۔''

اتنے میں ایک نقاب پوش مسلمان اس کے سامنے آگیا۔دونوں آپس میں بھڑ گئے۔مسلمان نے ایسی تلوار کھینچ کر ماری جو اس کے کاندھے سے ہوکر ران تک اُتر گئی۔وہ کافر زرہ سمیت دو حصوں میں کٹ گیا۔

تب اس نقاب پوش نے اپنا چہرہ کھولتے ہوئے کہا: ''کعب! دیکھا ناں! میں ہوں ابودُجانہ۔'' ③

حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی لاشوں کو دیکھتے پھر رہے تھے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ دکھائی دیے تو سوچنے لگے، یہ ممکن نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میدان چھوڑ جائیں، مگر وہ شہداء میں بھی نہیں ہیں، اس کا مطلب ہے کہ اللہ نے ہماری لغزش سے ناراض ہوکر انہیں آسمان پر اُٹھالیا ہے۔اب یہی کرنا چاہیے کہ دشمنوں سے لڑتے ہوئے جان دے دوں۔یہ سوچ کر انہوں نے تلوار کی نیام توڑ دی اور شمشیر بکف ہوکر مشرکین پر جھپٹ پڑے، یہ حملہ اتنا زور کا تھا کہ کفار دور دور تک ہٹ گئے، تب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نرغے میں ہیں۔ ④

اتنے میں مشرکین کے ایک جتھے نے حملہ کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پکار کر کہا: ''علی! انہیں روکو۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ دشمن پر جھپٹ پڑے اور نہایت زوروشور سے تلوار چلا کر انہیں پسپا کردیا۔اتنے میں ایک دوسرا گروہ حملہ آور ہوا۔رسول اللہ نے صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا۔انہوں نے ایک بار پھر انہیں مار بھگایا۔ ⑤

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پہچان اور صحابہ کی ناقابلِ بیان مسرت:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جنگ کے دوران ایسا خود (ہیلمٹ) پہنا ہوا تھا جس سے صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ان آنکھوں کی چمک اور رعنائی کو صحابہ خوب جانتے تھے مگر مشرکین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پہچان پارہے تھے۔ ⑥

اِدھر سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بھی پہنچ گئے جن کی زرہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنی ہوئی تھی، اپنی زرہ تو وہ پہچانتے ہی تھے، ساتھ ہی خود سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چمکتی آنکھیں بھی دیکھیں تو بے ساختہ پکار اٹھے:

---

① الاستیعاب: ۲۰۳/۱
② سیرۃ ابن ہشام: ۸۳/۲
③ البدایۃ والنہایۃ: ۳۵۹/۵
④ الجہاد لابن ابی عاصم، ح: ۲۷۰
⑤ تاریخ دمشق: ۷۶/۴۲
⑥ البدایۃ والنہایۃ: ۴۱۱/۵، دار ہجر

"اے مسلمانو! یہ ہمارے نبی زندہ سلامت ہیں۔"

رسول اللہ ﷺ نے فوراً انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ ①

کیوں کہ ابھی تک مشرکین صرف اٹکل سے ادھر حملے کر رہے تھے۔ انہیں یقینی علم نہ تھا کہ حضور ﷺ کون سے ہیں۔

اُحد پہاڑ کی طرف عقب نشینی اور صحابہ کی پروانہ وار قربانیاں:

اب صحابہ کرام حضور ﷺ کو اپنے حلقے میں لیے ہوئے اُحد پہاڑ کی طرف بڑھنے لگے۔ مشرکین قدرے پسپائی کے بعد ایک بار پھر تیزی سے پیچھے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہے کوئی جوان مرد! جو انہیں بھگا دے، وہ جنت میں میرا ساتھی ہوگا۔" حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "میں حاضر ہوں۔" آپ نے فرمایا: "تم نہیں۔"

اب ایک انصاری آگے بڑھے اور مشرکین سے بھڑ گئے اور لڑتے لڑتے جان دے دی۔ مشرکین نے اب دوبارہ تعاقب شروع کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ اس طرح جنت کی بشارت دیتے رہے اور ایک ایک انصاری مشرکین کو روکنے کی کوشش میں شہید ہوتے رہے۔ آخر میں صرف حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ رہ گئے، تب انہیں خود مقابلے میں آ کر مشرکین سے لڑنا پڑا، جس میں ان کے دونوں ہاتھ لہولہان ہو گئے، ایک ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں۔ ②

اُبی بن خَلَف واصلِ جہنم ہوا:

حضورِ اکرم ﷺ اپنے جانثاروں کے ساتھ پہاڑ کی ایک گھاٹی کی طرف جا رہے تھے کہ پیچھے سے اُبی بن خلف نیزہ تانے گھوڑا سرپٹ دوڑا کر آپ کی طرف آیا۔ اس شخص نے ہجرت سے قبل مکہ میں حضور ﷺ کو بہت ستایا تھا اور یہاں تک کہا تھا کہ میں تمہیں قتل کروں گا۔ حضور ﷺ نے جواب دیا تھا: "ان شاء اللہ میں ہی تجھے قتل کروں گا۔"

آج یہی اُبی بن خلف کہہ رہا تھا: "محمد کہاں ہیں؟ محمد کہاں ہیں؟ اگر وہ بچ گئے تو سمجھو میں نہ بچوں گا۔"

صحابہ کرام نے چاہا کہ اسے راستے میں روک لیں مگر حضور ﷺ نے فرمایا: "آنے دو۔"

حضور ﷺ نے حارث بن الصمہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے نیزہ لیا اور خود اس کے مقابلے میں آئے۔ اس سے پہلے کہ وہ آپ پر وار کرتا، آپ ﷺ نے بڑی چابک دستی سے اس کے خود اور زرہ کے درمیان سے جھانکتی ہوئی گردن پر نیزہ دے مارا۔ حملہ آور کو بظاہر معمولی زخم سا لگا مگر وہ گھوڑے سے گر پڑا، پھر نہایت بھیانک انداز میں بیل کی طرح چیختا ہوا واپس بھاگا۔ مشرکین نے اسے تسلی دی کہ یہ معمولی زخم ہے مگر وہ درد سے بے تاب ہو کر پکارتا تھا: "محمد نے کہا تھا ناں کہ میں اُبی کو قتل کروں گا۔ بخدا! مجھے اتنی تکلیف ہے کہ سارے حجاز والوں کو تقسیم کی جائے تو وہ سب مر جائیں۔"

آخر اُبی بن خلف اسی زخم سے واصلِ جہنم ہو گیا۔ ③

---

① سیرۃ ابن ھشام: ۸۳/۲

② المعجم الاوسط للطبرانی، ح: ۸۷۰۴، ط دار الحرمین

③ المستدرک للحاکم: ح: ۳۲۶۳ ؛ الجھاد لابن ابی عاصم، ح: ۲۵۳ ؛ مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۳۱، ط المجلس العلمی پاکستان

اُحد پہاڑ پر مورچہ:

مشرکین کے پیادے اور سوار اب بھی حضور ﷺ کی تلاش میں اِدھر کا رخ کر رہے تھے۔ مگر اب آپ نرغے کے خطرے سے باہر نکل آئے تھے؛ کیوں کہ اب آپ ﷺ قدرے بلندی پر تھے، کئی صحابہ کرام بھی آپ کے پاس جمع ہو چکے تھے۔ ان میں زخمی بھی تھے اور صحیح سالم بھی۔ ان میں ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بھی تھے جو زبردست تیر انداز تھے۔ انہوں نے اپنی ڈھال کھڑی کر کے حضور اکرم ﷺ کو اس کے پیچھے چھپالیا اور حریف پر مسلسل تیر برسانے لگے۔ حضور ﷺ ان کی تیر اندازی دیکھنے کے لیے بار بار سر مبارک اٹھا کر دیکھتے کہ دشمنوں کو تیر لگا کہ نہیں۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بے قرار ہو کر کہتے: ''اللہ کے نبی! میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ مت جھانکیے۔ آپ سے پہلے میرا سینہ حاضر ہے۔''[1]

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بھی ایسی زبردست تیر اندازی کی کہ حضور ﷺ نے داد دی اور کہا:

''سعد! تیر چلا۔ میرے ماں باپ تجھ پر فدا۔''[2]

مشرکین کا ریلا ذرا تھما تو نبی اکرم ﷺ اپنے جانثاروں کے ساتھ اُحد پہاڑ کی بلندی پر چڑھنے لگے۔ ان میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابودُجانہ، حضرت طلحہ بن عبید اللہ، حضرت زبیر بن عوام، حضرت حارث بن الصمہ رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔ مشرکین بھی تعاقب میں بڑھے۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دیکھو یہ لوگ ہمارے پیچھے اوپر نہ چڑھنے پائیں۔''

یہ سن کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور چند مہاجرین پلٹے اور ہلہ بول کر کفار کو مار بھگایا۔

اب پہاڑ کی دشوار گزار چڑھائی شروع ہو چکی تھی، آپ ﷺ زخمی تھے اور دو زرہیں پہنے ہوئے تھے، ان کے وزن کی وجہ سے ایک عمودی چٹان پر آپ خود نہ چڑھ سکے تو حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ فوراً جھک کر بیٹھ گئے، آپ ﷺ ان کی پشت پر پاؤں رکھ کر چٹان پر چڑھ گئے اور فرمایا: ''طلحہ نے اپنے لیے جنت واجب کر لی۔''[4]

زخمیوں کی دیکھ بھال...... سکینہ کا نزول:

بلندی پر آ کر قریش کے حملے کا خطرہ نہیں رہا تھا، تاہم یہاں جمع ہونے والے مسلمان سب ہی بری طرح تھکے ماندے اور پیاسے تھے مگر ایسی حالت کے لیے پہلے سے انتظام کر لیا گیا تھا۔ یہاں خدمت کے لیے مسلمان خواتین موجود تھیں۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی بیوی اُم سُلیم اور اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پانی کے مشکیزے بھر بھر کر کمر پر لادتیں اور لا کر مجاہدین اسلام کو پانی پلاتیں۔ بچوں میں سے حضرت اَنس رضی اللہ عنہ جو صرف تیرہ سال کے تھے، حضور ﷺ کے خصوصی خادم کے طور پر یہاں موجود تھے۔[5] حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی وہیں تھیں۔ نبی اکرم ﷺ کے

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۳۸۱۱، کتاب المناقب، مناقب ابی طلحۃ رضی اللہ عنہ

[2] صحیح البخاری، ح: ۴۰۵۹، کتاب المغازی، غزوۃ اُحد باب: اذ ھمت طائفتان منکم

[3] البدایۃ والنہایۃ: ۵/۲۱۱، دارِ ھجر

[4] البدایۃ والنہایۃ: ۵/۲۱۴، دارِ ھجر [5] صحیح البخاری، ح: ۳۸۱۱، کتاب المناقب، مناقب ابی طلحۃ رضی اللہ عنہ

چہرۂ انور سے خون مسلسل بہہ رہا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ ڈھال میں پانی بھر کر لائے اور آپ کے زخموں کو صاف کیا مگر خون بند نہ ہوا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یہ دیکھا تو چٹائی کے ایک ٹکڑے کو جلایا اور اس کی راکھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم پر لیپ دی۔ خون بہنا بند ہو گیا۔ [1]

اس دوران تھکے ہارے مجاہدین پر یکایک اُونگھ طاری ہونے لگی جو ایسے نازک وقت میں ناممکن سی بات تھی۔ مگر حالت یہ تھی کہ صحابہ کوشش کے باوجود بیدار نہ رہ سکے۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے شمشیر بار بار گر جاتی تھی۔ [2]

چند گھڑیوں بعد یہ کیفیت ختم ہوئی تو مسلمان تازہ دم ہو چکے تھے اور اپنے اندر ایک نئی قوت محسوس کر رہے تھے۔ [3]

ابوسفیان سے مکالمہ:

جنگ کا ہنگامہ تھم چکا تھا، قریشی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش سے مایوس ہو چکے تھے، تاہم جاتے جاتے ان کے سپہ سالار ابوسفیان نے پہاڑ کے پاس آ کر فتح کے نعرے لگائے اور کہا:

''لڑائی کا ڈول اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔ آج کا دن یوم بدر کا بدلہ ہے۔ جے ہبل۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر جواب دیا: ''اللہ ہے غالب و بالاتر۔''

ابوسفیان نے کہا: ''ہماری عُزّیٰ ہے، تمہاری کوئی عُزّیٰ نہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تلقین فرمانے پر جواب میں کہا:

''ہمارا مولیٰ ہے اللہ، تمہارا کوئی مولا نہیں۔'' [4]

ابوسفیان نے پوچھا: ''قسم دیتا ہوں، سچ سچ بتاؤ ہم نے محمد کو قتل کر دیا ہے یا نہیں؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سختی سے جواب دیا: ''نہیں، اللہ کی قسم! وہ تو اس وقت تمہاری آواز سن رہے ہیں۔''

ابوسفیان نے جانے سے پہلے کہا: ''اگلے سال پھر بدر میں مقابلہ ہوگا۔''

جواب ملا: ''ٹھیک ہے۔ اگلے سال وہاں مقابلے کا وعدہ رہا۔'' [5]

---

① صحیح البخاری، ح ۴۰۷۵، کتاب المغازی، باب ما اصاب النبی من الجراح ؛ ح: ۲۹۰۳، کتاب الجهاد، باب المجن۔
چٹائی کی راکھ سے زخم کو بھرنا عربوں کا ایک کارگر دیسی علاج تھا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ کی لڑکیوں کو گھروں میں دیسی طب سکھائی جاتی تھی۔ اس سے اسلام میں علاج معالجے خصوصاً نباتاتی علاج کی اہمیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔

② صحیح البخاری، ح: ۳۸۱۱، کتاب المناقب، باب مناقب ابی طلحة رضی اللہ عنہ ③ تفسیر ابن کثیر، سورة آل عمران، آیت: ۵۴

④ صحیح البخاری، ح: ۳۰۳۹، کتاب الجهاد، باب ما یکره من التنازع ⑤ سیرت ابن اسحاق، ص ۳۳۳، ۳۳۴

نوٹ: ابن سعد کی روایت میں وضاحت ہے کہ ابوسفیان نے اگلے سال ''بدر صفراء'' پر مقابلے کا چیلنج دیا تھا۔ بدر صفراء ایک سالانہ میلہ تھا جو ہر خالص قمری ذوالقعدہ کی یکم سے ۸ تاریخ تک وادئ بدر میں لگتا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۶۰/۲) اس میلے کے خالص قمری ذوالقعدہ میں لگنے کی دلیل یہ ہے کہ اگلے سال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب حسب وعدہ بدر پہنچے تو وہ مہینہ بعض رواۃ کے نزدیک شعبان تھا۔ (المحبر، ص ۱۱۳) جبکہ بعض کے نزدیک ذوالقعدہ تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۵۹/۲) اگر تقویمی حساب سے دیکھیں تو کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ مکی تقویم کا شعبان جبکہ خالص قمری تقویم کا ذوالقعدہ تھا۔ اس سے یہ بھی سمجھ آ جاتا ہے کہ غزوۂ احد کے متعلق بعض حضرات کا یہ موقف کہ یہ مکی شوال مطابق مدنی محرم ۴ھ کا واقعہ ہے، درست نہیں؛ کیوں کہ غزوۂ احد میں ابوسفیان نے سال پورا ہونے پر لڑائی کا چیلنج دیا تھا: ''الموعد بیننا وبینکم بدر الصفراء رأس الحول۔ (طبقات ابن سعد: ۵۹/۲) ظاہر ہے غزوۂ احد محرم میں ہو تو ذوالقعدہ تک سال پورا نہیں ہوتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ جاسوسی کے لیے روانہ:

جب کفار کا لشکر واپس ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذمے لگایا وہ ان کا تعاقب کریں اور دیکھیں وہ کیا کر رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر وہ اونٹوں پر سوار ہوں، گھوڑوں کو خالی ساتھ لے جا رہے ہوں تو پھر وہ سیدھے مکہ جائیں گے۔ لیکن وہ گھوڑوں پر سوار دکھائی دیں تو ان کا ارادہ مدینہ پر حملے کا ہوگا۔ اللہ کی قسم! اگر ایسا ہوا تو میں خود ان کے مقابلے میں نکلوں گا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ قریش کے پیچھے گئے اور پھر واپس آ کر بتایا:

''وہ اونٹوں پر سوار مکہ کی طرف جا رہے تھے اور گھوڑے خالی ساتھ جا رہے ہیں۔''

پورا اطمینان کر لینے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہداء کی تجہیز و تکفین کی طرف متوجہ ہوئے۔ [1]

شہدائے اُحد:

میدانِ اُحد میں شہداء کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں، ان میں حضرت اَنس بن نَضر رضی اللہ عنہ بھی تھے جن کو اسی کے لگ بھگ زخم لگے تھے۔ لاش ناقابلِ شناخت ہوگئی تھی۔ ان کی بہن نے انگلیوں کے پوروں سے انہیں پہچانا۔ [2]

شہادت کی سعادت پانے والوں میں اُصَیرِم رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ اسی دن اسلام لائے تھے اور سیدھے میدانِ کارزار میں پہنچ گئے تھے۔ میدان جنگ میں خوب دادِ شجاعت دی اور آخر شدید زخمی ہو کر گر پڑے۔ جنگ کے بعد جب مسلمان شہیدوں کی تجہیز و تکفین کرنے لگے تو لاشوں کے درمیان یہ دم توڑتے نظر آئے۔ کسی کو پتا نہ تھا کہ یہ مسلمان ہوگئے ہیں۔ پوچھا: ''تم یہاں کیسے؟ قومی حمیت کی وجہ سے آئے تھے یا اسلام کی خاطر؟''

بولے: ''اسلام کی خاطر، ہاں میں اللہ اور رسول پر ایمان لا چکا ہوں۔'' یہ کہہ کر دم توڑ دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ جنتی ہیں۔'' یہ ایسے جنتی تھے جنہیں ایک نماز پڑھنے کی نوبت بھی نہیں آئی۔ [3]

عمرو بن الجموح رضی اللہ عنہ:

شہداء میں حضرت عَمرو بن جَموح رضی اللہ عنہ بھی تھے جو ایک پاؤں سے معذور تھے۔ ان کے چار کڑیل جوان بیٹے اس جنگ میں شریک ہونے جا رہے تھے، تب انہوں نے بھی ساتھ نکلنے کی آرزو ظاہر کی تھی۔ لڑکوں نے بڑھاپے اور معذوری کا کہہ کر منع کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر عرض کرنے لگے: ''میرے لڑکے مجھے آپ کے ساتھ جہاد پر جانے سے روک رہے ہیں۔ اللہ کی قسم! میں چاہتا ہوں کہ اپنے لنگڑے پاؤں سے جنت میں چلوں پھروں۔''

یہ جذبہ دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت کی اجازت دے دی تھی۔ اب ان کی لاش بھی میدانِ جنگ میں پڑی تھی۔ [4]

---

[1] البداية والنهاية: ٥/ ٣٢١

[2] البداية والنهاية: ٥/ ٣٠٢

[3] البداية والنهاية: ٥/ ٣١٨ [4] البداية والنهاية: ٥/ ٣١٨

حضرت حنظلہ غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہ:

ان میں حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، جن کا باپ ابوعامر راہب اس جنگ میں مشرکین کے ساتھ تھا۔ عبداللہ بن اُبَی منافق کی بیٹی جمیلہ جو پختہ ایمان والی لڑکی تھی، ان کے نکاح میں آئی تھی۔ گزشتہ رات ہی شادی ہوئی تھی۔ ابھی سہاگ رات کا غسل نہیں کیا تھا کہ مسلمانوں کی شکست کی خبر سنی، سیدھے دوڑے آئے اور معرکے میں جان کی بازی لگا کر شہادت پائی۔ انہیں کفناتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے جسم سے پانی کے قطرے ٹپکتے محسوس ہوئے۔ جب دلہن نے بتایا کہ وہ غسل کے بغیر نکل گئے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس لیے کہ انہیں فرشتوں نے غسل دیا۔''①

حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کا ادھورا کفن:

اِن میں مُصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ بھی تھے جو مکّہ کے سب سے خوبصورت اور خوش لباس نوجوان تھے۔ مگر آج ان کی تدفین اس حال میں ہو رہی تھی کہ جسم ڈھانپنے کے لیے صرف ایک چھوٹی سی چادر ہی مل سکی تھی جس سے سر ڈھانکا جاتا تو پاؤں کھل جاتے۔ پاؤں ڈھانپے جاتے تو سر کھل جاتا۔②

ایک شہید کے آخری کلمات:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان افراد کی خاص طور پر فکر ہو رہی تھی جن کی لاشیں نہیں مل سکی تھیں مگر وہ زندہ بچ جانے والوں میں بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن رَبیع انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ کہاں ہیں؟ بچ گئے یا شہید ہو گئے؟ محمد بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ انہیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سعد بن رَبیع انصاری رضی اللہ عنہ لاشوں کے درمیان پڑے آخری سانسیں لے رہے تھے۔ اس حالت میں بھی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سلامتی کے لیے مضطرب تھے۔

ان کے آخری الفاظ یہ تھے:

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا سلام کہنا، عرض کرنا: اللہ آپ کو ہر اس جزا سے بہتر جزا دے جو کسی امتی کی طرف سے اس کے نبی کو ملی ہو۔ اور مسلمانوں کو بھی سلام کہہ کر یہ پیغام دینا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے جیتے جی ذرا بھی گزند پہنچی تو اللہ کے ہاں تمہارا کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔''

یہ کہتے کہتے ان کی روح پرواز کر گئی۔③

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش:

قریش کے بعض لوگوں نے لاشوں کی بے حرمتی کی تھی۔ ناک، کان اور دیگر اعضاء کاٹے تھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا سینہ چیرا گیا تھا، چہرہ مسخ کر دیا گیا تھا۔④ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چچا سے غیر معمولی محبت تھی، وہ آپ کے رضاعی بھائی اور قریبی

---

① البداية والنهاية: ٥/ ٣٧٠، دار هجر

② صحيح البخاري، ح: ٤٠٤٥، كتاب المغازي، باب غزوة أُحُد

③ البداية والنهاية: ٥/ ٤٢٣ ④ البداية والنهاية: ٥/ ٤٢٣، ٤٢٥

دوست بھی تھے۔ ان کی لاش کا یہ حال دیکھ کر آپ ﷺ کو بے حد دکھ ہوا۔[1] فرمایا: ''اس جیسا صدمہ پھر کبھی نہ پہنچے گا۔''

اِس دوران رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی حضرت صَفِیّہ رضی اللہ عنہا اس حادثے کی خبر سن کر دوڑی آئیں۔ حضور ﷺ نے دیکھا تو فوراً اُن کے صاحبزادے زبیر رضی اللہ عنہ کو کہا کہ انہیں روک لو۔ زبیر رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر انہیں کہا:

''رسول اللہ ﷺ نہیں چاہتے کہ آپ لاش کو دیکھیں۔''

بولیں: ''اپنے بھائی کے لیے کفن کے دو کپڑے لائی ہوں، یہ لے لو۔''

مسلمان ان دو کپڑوں میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو کفنانے لگے تو ایک انصاری کی نوچی گئی لاش نظر آ گئی۔ صحابہ کو گوارا نہ ہوا کہ اسے بے کفن رہنے دیں۔ آخر ایک کپڑے میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے میں اُن انصاری کو کفن دیا گیا۔[2]

کون جیتا؟ کون ہارا؟

اس جنگ میں جانی نقصان مسلمانوں کا زیادہ ہوا تھا، اس لحاظ سے قریش کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ مگر یہ فتح ادھوری تھی، کیوں کہ مسلمانوں کی ریاست بھی باقی تھی اور قیادت بھی۔ مسلمان آخر تک میدانِ جنگ کے پاس مورچہ زن تھے، ان میں سے نہ تو کوئی قیدی بنا اور نہ ہی کسی نے ہتھیار ڈالے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں نے جان پر کھیل کر اپنے آقا و مولا ﷺ کی حفاظت کی تھی اور قریش ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی ان تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ اپنے ان کمزور پہلوؤں کا مشرکینِ مکہ کو پورا احساس تھا۔

غزوۂ حمراء الاسد

حضور ﷺ نے دشمن کے اس احساسِ کمتری کو مزید پختہ کرنے اور مسلمانوں کی نفسیاتی برتری کو ثابت کرنے کے لیے اگلے ہی دن قریش کے لشکر کا تعاقب کرنے کا فیصلہ فرمایا، اللہ کا حکم بھی یہی تھا، اس میں یہ حکمت بھی تھی کہ اگر قریش کو آگے چل کر مدینہ پر حملہ کرنے کا خیال آ جائے تو مسلمانوں کی اس جرأت کو دیکھ کر وہ اپنا ارادہ ترک دیں گے۔

---

[1] حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کی بے حرمتی ضرور ہوئی مگر کسی صحیح روایت میں منقول نہیں کہ کلیجہ ہند رضی اللہ عنہا نے نکالا اور چبایا ہو۔ اگرچہ اس روایت کو ماننے میں کوئی شرعی رکاوٹ حائل نہیں، کیوں کہ یہاں حالتِ کفر کا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے جس میں شدید دشمنی کے باعث ایسا قبیح فعل صادر ہونا غیر ممکن نہیں۔
تاہم یہ پہلو بھی ذہن میں رکھا جائے کہ یہ روایت صرف ابن اسحاق کی ہے جو صالح بن کیسان سے منقول ہے۔ صالح ثقہ تھے مگر ان کی ولادت ۷۰ ہجری کی ہے، ظاہر ہے وہ واقعے کے چشم دید گواہ نہ تھے اس لیے روایت میں یقیناً انقطاع ہے۔ اس عقلی پہلو پر بھی غور کریں کہ صحیح روایت کے مطابق حضور ﷺ کو اپنے چچا کے قاتل وحشی رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے باوجود ان سے ایسا طبعی ملال رہا کہ عمر بھر رو برو دیکھنا گوارا نہ کیا۔ (صحیح ابن حبان، ح: ۷۰۱۷)
اگر ہند رضی اللہ عنہا نے لاش کی بے حرمتی کی ہوتی جو کہیں زیادہ انسانیت سوز فعل ہے تو ان کا بارگاہِ رسالت میں ایسا اعزاز و اکرام نہ ہوتا۔ مگر حضور ﷺ نے فتح مکہ کے دن ان کے گھر کو جائے امن قرار دیا۔ جب انہوں نے اسلام لانے کے بعد عرض کیا کہ پہلے آپ کی جماعت سے بڑھ کر کسی کی اہانت پسند نہ تھی مگر اب آپ کی جماعت سے زیادہ کسی کی عزت عزیز نہیں تو حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! میری کیفیت بھی یہی ہے۔ (صحیح البخاری، ح: ۳۸۲۵، کتاب المناقب، ذکر ھند) ان سے دل بستگی کی باتیں بھی کیں اور اجازت دی کہ شوہر کی رکھوائی ہوئی رقم گھر کے ضروری خرچے میں بغیر پوچھے استعمال کر سکتی ہیں۔ (صحیح البخاری، ح: ۲۴۶۰، کتاب المظالم، باب قصاص المظلوم) اسلام لانے کے بعد ان کے شوہر حضرت ابوسفیان اور بیٹے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہما کو حضور ﷺ کا اعتماد حاصل رہا۔ پس کیا بعید ہے کہ یہ روایت خانوادۂ سفیانی کی کردار کشی کے لیے مشہور کی گئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

[2] البدایۃ والنہایۃ: ۴۲۶/۵

ایسا ہی ہوا۔ کافی آگے جا کر قریش کے فاتح سرداروں کو اپنی مہم کے نامکمل رہ جانے کا احساس ہوا تو وہ مدینہ میں گھس کر لوٹ مار کرنے کا منصوبہ بنانے لگے۔

لیکن اچانک انہیں پتا چلا کہ حضور ﷺ لشکر مرتب کر کے ان کے تعاقب میں آ رہے ہیں، یہ سن کر وہ اتنے بدحواس ہوئے کہ سرپٹ مکّہ کی طرف کوچ کر دیا۔ حضور ﷺ نے پھر بھی حمراء الاسد تک تعاقب کیا، وہاں تین دن ٹھہرے۔

جب قریش کے مکّہ جانے کا اطمینان ہو گیا تب حضور ﷺ واپس ہوئے۔

اس تعاقب کو غزوہ حمراء الاسد کہا جاتا ہے، اس میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے سوا تمام لوگ وہی تھے جو غزوہ اُحد میں شریک تھے، ان کی اکثریت زخمی اور تھکی ماندی تھی۔ اس کے باوجود اس نئی مہم کے لیے خود کو پیش کر دینا جاں نثاری، تابع داری اور قربانی کی حیرت انگیز مثال تھی۔ [1]

اُمّ عمارہ کا جذبہ:

اُمّ عمارہ رضی اللہ عنہا کو جنگ میں بارہ زخم لگے تھے۔ [2] بستر پر پڑی تھیں۔ ابنِ قمئہ کے ہاتھوں ان کے کاندھے پر آنے والا زخم نہایت کاری تھا۔ اس دوران مدینہ کی گلیوں میں رسول اللہ ﷺ کے منادی نے پکارا:

"الیٰ حمراء الاسد"

اُمّ عمارہ رضی اللہ عنہا نے یہ صدا سنی تو اسی حالت میں جانے کے لیے بے تاب ہو گئیں۔ خود کو کپڑوں میں اچھی طرح لپیٹا اور اٹھنے لگیں۔ مگر زخم تازہ تھے۔ ان سے خون جاری ہو گیا۔ رات بھر ان کے زخموں کی مرہم پٹی ہوتی رہی۔

اس دوران رسول اللہ ﷺ حمراء الاسد تشریف لے گئے۔ واپس آئے تو فوراً ایک صحابی عبداللہ بن کعب رضی اللہ عنہ کو اُمّ عمارہ رضی اللہ عنہا کے گھر بھیج کر ان کی خیر خیریت دریافت کی۔ جب معلوم ہوا کہ انہیں افاقہ ہو رہا ہے تو رسول اللہ ﷺ بے حد مسرور ہوئے۔ اُمّ عمارہ رضی اللہ عنہا کے کاندھے کا زخم ایک سال میں جا کر مندمل ہوا۔ [3]

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۴۳، ۷۴. دار طیبہ، ریاض
② طبقات ابن سعد: ۸/۴۱۳، ط صادر
③ طبقات ابن سعد: ۸/۴۱۳

چند گہرے زخم

قریش غزوۂ اُحد میں فتح کے باوجود خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں کر سکے تھے، پھر واپس آ کر انہوں نے فتح کے اثرات کو پائیدار بنانے کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ یہاں تک کہ وہ شام کو جانے والے قافلوں کی حفاظت کا بھی کوئی مؤثر بندوبست نہ کر سکے۔ دو سال تک ان کو مدینہ کے خلاف جنگ کی ہمت نہ ہوئی۔ البتہ انہوں نے اسلام کے خلاف گھناؤنی سازشیں ضرور کیں اور ان کے حلیف یا زیر اثر قبائل نے مسلمانوں کو چند بہت کاری زخم لگائے۔

سانحۂ رجیع:

صفر ۴ ہجری میں دو بدو قبائل: عَضَل اور قارہ کے نمائندے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام کی تعلیم و تبلیغ کے لیے چند معلم طلب کیے۔[1] حضور ﷺ نے عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کر کے دس صحابہ کی جماعت کو اس علاقے کی طرف روانہ کر دیا۔ یہ مہم ''واقعہ رجیع'' کہلاتی ہے۔ جب یہ حضرات اس علاقے میں ''رجیع'' نامی چشمے پر پہنچے تو بنولحیان نے عَضَل اور قارہ کے تقریباً ایک سو تیر اندازوں سمیت ان حضرات کو گھیر لیا اور کہا:

''اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہمارا وعدہ ہے کہ تم میں سے کسی کو قتل نہیں کریں گے۔''

عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر ساتھیوں سے کہا: ''بھائیو! میں کسی کافر کی ضمانت پر یقین نہیں کرتا۔ الٰہی! ہمارے حال کی خبر اپنے نبی کو پہنچا دے۔'' یہ کہہ کر وہ سات صحابہ سمیت لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ کفار نے لاش کی بے حرمتی کرنا چاہی مگر اللہ نے شہد کی مکھیوں کا ایک غول بھیج دیا جس نے ان کی نعش کو گھیر لیا اور کفار اسے چھو نہ سکے۔[2] کفار نے صبح ہونے کا انتظار کیا مگر رات کو زوردار بارش ہوئی جبکہ وہ بارش کا موسم نہ تھا۔ نعش سیلاب میں بہہ گئی۔ شہید نے عہد کیا تھا کہ وہ کسی مشرک کو اپنا بدن چھونے نہ دیں گے۔ اللہ نے اپنی قدرت سے ان کے عہد کی لاج رکھی۔[3]

---

① سیرۃ ابن ھشام: ۲/۱۶۹، ۱۷۰

فائدہ: یہاں واقدی کی ایک روایت قابلِ غور ہے جس کے مطابق ان لوگوں کو بنولحیان کے رؤساء نے (جن کے بعض اقارب جنگِ بدر میں مارے گئے تھے) بھیجا تھا تاکہ کچھ صحابہ کو اپنے ہاں بلوا کر قتل کریں یا قریش کے ہاتھوں فروخت کر دیں اور یوں اپنے انتقام کی آگ بجھائیں۔ (المغازی للواقدی: ۱/۳۵۴)

فائدہ: سیرت ابن ہشام میں یہ قصہ اس طرح ہے کہ عَضَل اور قارہ کے چند نمائندوں نے آ کر حضور ﷺ سے دین سکھانے کے لیے معلم طلب کیے۔ آپ ﷺ نے چھ صحابہ کو بھیج دیا جہاں ان سے دھوکا ہوا۔ (۲/۱۶۹) مگر صحیح بخاری میں بتایا گیا ہے کہ یہ صحابہ دس تھے اور حضور ﷺ نے انہیں ''سَرِیَّہ'' یعنی فوجی دستہ اور ''عَیْنًا'' یعنی جاسوس بنا کر بھیجا تھا۔ ''بعث النبی سریة عینا.'' (ح: ۴۰۸۶)

صحابہ کی تعداد کے لحاظ سے یقیناً بخاری کی روایت ہی درست ہے مگر جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ حضرات جاسوس تھے یا معلم؟ تو اس بارے میں سیرت نگاروں کی روایت بھی یکسر مسترد کر دینے کے قابل نہیں۔ کوئی بعید نہیں کہ ان صحابہ کو تعلیم و تبلیغ کے ساتھ یہ ذمہ داری بھی سونپی گئی ہو کہ وہ اس علاقے میں رہ کر آس پاس آباد قریش کے حلیف قبائل کی نقل و حرکت کی خبریں بھی مدینہ بھیجتے رہیں۔ حافظ ابن کثیر نے بخاری کی روایات اور ابن اسحاق کی روایات میں اس اختلاف کی طرف اشارہ ضرور کیا ہے مگر ساتھ ہی ابن اسحاق کی روایت کا وزن ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے: ''علیٰ ان ابن اسحاق امام فی ھذا الشان وغیر مدافع، کما قال الشافعی رحمہ اللہ: من اراد المغازی فھو عیال علیٰ محمد بن اسحق. (البدایة والنہایة: ۵/۵۰۱)

② صحیح البخاری، باب غزوۃ الرجیع ؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۷۴ ؛ سیرۃ ابن ھشام: ۲/۱۶۹ ③ المغازی للواقدی: ۱/۳۵۶

خُبیب، عبداللہ بن طارق اور زید بن دَثِنَہ رضی اللہ عنہم باقی رہ گئے تھے۔ کفار نے ان سے جان کے تحفظ کا وعدہ کیا۔ انہوں نے خود کو ان کے سپرد کر دیا۔ مگر کفار نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے انہیں قیدی بنا کر مکہ میں بیچ دیا۔ قریشی رؤساء نے انہیں خرید لیا تاکہ انہیں اپنے ان رشتہ داروں کے خون کے انتقام میں جو بدر میں مارے گئے تھے قتل کر دیں۔ ①

اعلیٰ اسلامی اخلاق کی ایک مثال:

قریشی رؤساء ان سب کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے اشہرِ حُرم گزرنے کا انتظار کرتے رہے۔ ② خبیب رضی اللہ عنہ نے جنگِ بدر میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا۔ مقتول کے بیٹوں نے انہیں خرید لیا اور پیروں میں زنجیریں ڈال کر ایک مکان میں قید کر دیا۔ اس دوران بعض اوقات انہیں تازہ انگور کھاتے دیکھا گیا جبکہ مکہ میں اس وقت یہ پھل قطعاً نہیں تھا۔ یہ اللہ کی غیبی نصرت اور صحابی کی کرامت تھی۔ آخر ماہِ محرم گزرنے پر اشہرِ حُرم ختم ہو گئے اور انہیں قتل کی تیاری کر لی گئی۔

خبیب رضی اللہ عنہ نے قتل سے پہلے بالوں کی صفائی کے لیے اُسترا مانگا جو دے دیا گیا۔ اتنے میں اچانک گھر کا ایک چھوٹا بچہ ان کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ گھر والے سہم گئے کہ قیدی کے ہاتھ میں اُسترا ہے اور بچہ اس کی گود میں ہے۔ خبیب نے انہیں گھبرایا ہوا دیکھ کر کہا: ''کیا تمہیں ڈر ہے کہ میں اسے قتل کروں گا؟ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔''

خبیب رضی اللہ عنہ کے پاس جان بچانے کا یہ آخری موقع تھا کہ اس بچے کو یرغمال بنا کر فرار ہو جاتے مگر انہوں نے اپنی جان کے لیے ایک بچے کو آڑ بنانا گری ہوئی حرکت سمجھا اور اعلیٰ اسلامی اخلاق پر کوئی حرف نہ آنے دیا۔

کفار انہیں پکڑ کر حدودِ حرم سے باہر لے گئے۔ انہوں نے شہادت سے قبل دو رکعت نماز کی خواہش ظاہر کی۔ دو مختصر رکعتیں ادا کیں اور پھر کہا: ''اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ تم کہو گے موت سے خائف ہے، تو میں لمبی نماز پڑھتا۔''

قتل ہوتے وقت انہوں نے یہ تاریخی اشعار پڑھے:

وَلَسْتُ اُبَالِیْ حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِمًا ۔۔۔ عَلٰی اَیِّ شِقٍّ کَانَ لِلّٰہِ مَصْرَعِی

''جب میں مسلمان ہو کر قتل ہو رہا ہوں تو مجھے پروا نہیں کہ اللہ کی خاطر میں کس کروٹ پر گرتا ہوں۔''

وَذَاکَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰہِ وَاِنْ یَّشَأْ ۔۔۔ یُبَارِکْ عَلٰی اَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعِ

''یہ اللہ کی ذات کے لیے ہے اور وہ چاہے تو ایک پارہ پارہ کی گئی لاش کے ٹکڑوں پر برکت نازل فرما دے۔'' ③

① صحیح البخاری، ح: ۴۰۸۶، کتاب المغازی، باب غزوة الرجیع ؛ ح: ۳۰۴۵، کتاب الجهاد

② قال ابن هشام: اقام خبیب فی ایدیهم حتیٰ انقضت الاشهر الحرم ثم قتلوه: (سیرة ابن هشام: ۱۷۴/۲)

تنبیہ: اکثر سیرت نگار نقل کرتے ہیں کہ یہ سانحہ صفر ۴ھ میں پیش آیا۔ مگر یہاں پر یہ قوی اشکال ہے کہ ماہِ صفر کے بعد کئی ماہ تک اشہرِ حرم میں سے کوئی مہینہ نہیں آتا جس کی وجہ سے قریش قیدیوں کا قتل مؤخر کرتے۔ اس کا حل یہ ہے کہ یہ صفر مدنی تقویم کا ہے جو کی تقویم کے ذوالقعدہ کے مطابق ہے، جیسا کہ واقدی کی روایت میں ''فی شهر حرام فی ذی القعدة.'' کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ (المغازی للواقدی: ۳۵۴/۱) اور ذوالقعدہ ہی کو دیکھتے ہوئے اسے ۳ ہجری شمار کیا گیا ہے حالانکہ مدنی تقویم میں سن ۴ ہجری کا دوسرا ماہ چل رہا تھا۔ صفر ۳ ہجری بھلا کس طرح ہو سکتا ہے جبکہ بالاتفاق یہ واقعہ غزوہ احد کے بعد ہے۔ صحیح بخاری میں ہے: ''انها بعد احد.'' (صحیح البخاری، باب غزوة الرجیع) اور غزوۂ احد شوال ۳ ہجری میں ہوا تھا۔ پس یہ واقعہ ذوالقعدہ مطابق صفر ۴ ہجری کا ہے۔ اہلِ مکہ نے ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم میں صحابہ کو قید رکھا اور صفر کی میں انہیں شہید کر دیا جو مدنی تقویم میں جمادی الاولیٰ ۴ ہجری ہے۔

③ صحیح البخاری، ح: ۳۰۴۵، ۴۰۸۶، ۷۴۰۲ ؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۵۶/۲۰، ط مکتبة ابن تیمیة

صحابہ ﷺ کی رسول اللہ سے محبت کی عجیب جھلک:

زید بن دثِنہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے سے پہلے ابوسفیان نے آزمائش کے لیے پوچھا:

''زید! کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ محمد یہاں ہوتے اور تمہاری جگہ وہ قتل کر دیے جاتے؟''

زید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''واللہ! ہمیں تو یہ بھی گوارا نہیں کہ انہیں اپنے گھر میں کانٹا بھی چبھے اور ہم اپنے گھر میں آرام سے بیٹھیں۔'' ابوسفیان نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں نے ایسی محبت کسی کی نہیں دیکھی جیسی محمد سے ان کے ساتھیوں کو ہے۔'' اس کے بعد زید بن دثِنہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا۔ یہ جمادی الاولیٰ ۴ ہجری (مطابق صفر کی) کا واقعہ ہے۔ ①

سانحۂ بئرِ معونہ

اسی زمانے میں نجد کے ایک غیر مسلم رئیس ابوبراء (عامر بن مالک) نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ مددگار طلب کیے جو اس کے مخالف قبائل کو رام کریں اور ان کو ریاستِ مدینہ کا پیغام سنا کر حلیف بنائیں۔ حضور ﷺ نے اہلِ نجد کی بدعہدی کا خدشہ ظاہر کیا مگر ابوبراء نے ہر طرح اطمینان دلایا اور مکمل تحفظ کی ذمہ داری لی۔

آخر جمادی الاولیٰ ۴ ہجری میں ② رسول اللہ ﷺ نے ستر حافظ اور قاری صحابہ کو اس سمت بھیج دیا جو عبادت و ریاضت میں ممتاز تھے۔ ان میں منذر بن عَمرو، حرام بن مِلحان، حارث بن الصِمّہ اور عامر بن فُہَیرہ رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ شامل تھے مگر بئرِ معونہ کے مقام پر عامر بن طفیل نے انہیں روک لیا۔ حرام بن مِلحان رضی اللہ عنہ نے عامر بن طفیل کو کہا:

''ہمیں تم سے کوئی سروکار نہیں۔ ہم تو رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے ایک کام سے جا رہے ہیں۔ کیا تم ہمیں تحفظ نہیں دو گے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کا پیغام پہنچا دیں۔''

یہ کہہ کر حرام بن مِلحان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کا مکتوب اسے پیش کیا مگر اس بدبخت نے اسے دیکھا تک نہیں بلکہ اثنائے گفتگو میں اس کے اشارے پر ایک شخص نے پیچھے سے آ کر حرام بن مِلحان رضی اللہ عنہ کی پشت میں نیزہ گھونپ دیا۔ حرام بن مِلحان کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

''فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَة.'' (ربِ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔)

ساتھ ہی انہوں نے بہتے ہوئے خون کو چہرے اور سر پر مَل لیا۔ حرام بن مِلحان رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے عامر بن طفیل نے عُصَیّہ، رِعْل اور ذکوان قبائل کے حمایتی جمع کر لیے اور باقی صحابہ کو بھی گھیر لیا۔ ان حضرات نے بھی شمشیریں سونت لیں اور نہایت دلیری کے ساتھ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ ③

① سیرۃ ابن ہشام: ۱۷۲/۲

② سانحۂ بئرِ معونہ بالکل اسی مہینے پیش آیا جس میں رجیع کے قیدیوں کو قریش نے قتل کیا تھا، یعنی جمادی الاولیٰ مدنی ۴ ہجری، مطابق صفر کی ۴ ہجری۔

③ صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب العون بالمدد ؛ کتاب المغازی، باب غزوة الرجیع ورعل وذکوان وبئر معونة ؛ سیرۃ ابن ہشام: ۱۸۴/۲، ۱۸۵

جبّار بن سَلمیٰ نے عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کے سینے میں نیزہ گھونپ کر باہر نکالا تو عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ نے دم توڑتے ہوئے کہا: "فُزْتُ وَاللّٰه." [1] پھر ان کی نعش یک دم آسمان کی طرف بلند ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ پھر دوبارہ نیچے اپنی جگہ پر آ گئی۔ [2] جبّار بن سَلمیٰ کہتے ہیں کہ میں نے تفتیش شروع کی کہ آخر وہ کونسی کامیابی ہے جس پر وہ قتل ہوتے ہوئے بھی مسرور تھے۔ آخر مسلمانوں نے بتایا کہ وہ کامیابی شہادت ہے۔ اس پر میں اسلام لے آیا۔ [3]

بئر معونہ کے مقام پر صحابہ کے قتلِ عام کے دوران دو صحابی: عمرو بن اُمیہ رضی اللہ عنہ اور منذر بن محمد رضی اللہ عنہ اونٹ چرانے گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے دور آسمان پر مردار خور پرندے منڈلاتے دیکھے تو خطرہ محسوس کر کے اس طرف دوڑ پڑے۔ قریب پہنچے تو دیکھا کہ ساتھیوں کی لاشیں بکھری ہوئی ہیں اور گھڑسوار ارد گرد کھڑے ہیں۔ عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: کیا ہم رسول اللہ کو جا کر خبر نہ کر دیں؟"

مگر منذر بن محمد رضی اللہ عنہ نے کہا: "جہاں یہ لوگ شہید ہوئے ہیں، میں اس جگہ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

آخر یہ دونوں اسی حالت میں دشمن پر حملہ آور ہوئے۔ منذر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے جبکہ عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ زندہ گرفتار ہو گئے۔ عامر بن طفیل کو معلوم ہوا کہ عمرو بن اُمیہ رضی اللہ عنہ مضری ہیں تو یہ کہہ کر کہ "میری والدہ کے ذمے ایک غلام آزاد کرنا تھا۔" انہیں آزاد کر دیا۔ [4] اس سانحے میں عمرو بن اُمیہ رضی اللہ عنہ کے سوا دو افراد زندہ رہے۔ ایک کعب بن زید رضی اللہ عنہ جو شدید زخموں کے باوجود بچ گئے اور کفار انہیں مردہ سمجھ کر نعشوں میں چھوڑ گئے تھے۔ بعد میں وہ وہاں سے نکل گئے اور اگلے سال غزوۂ خندق میں شہید ہوئے۔ [5] دوسرے ایک لنگڑے صحابی تھے جو لڑائی سے قبل قریبی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے تھے اور کفار ان تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ [6] یہ واقعہ سانحۂ بئر معونہ کے نام سے مشہور ہے۔

شہدائے بیر معونہ نے دم توڑنے سے قبل یہ دعا کی تھی:

"اَلَا بَلِّغُوْا عَنَّا قَوْمَنَا...... بِاَنَّا قَدْ لَقِيْنَا رَبَّنَا...... فَرَضِيَ عَنَّا وَ اَرْضَانَا."

(ہماری جانب سے ہماری قوم کو بتادو! کہ ہم اپنے رب سے جا ملے۔ وہ ہم سے خوش ہوا، اور اس نے ہمیں خوش کر دیا۔)

حضرت جبریل علیہ السلام نے ان کے یہ الفاظ رسول اللہ ﷺ تک پہنچا دیے۔

حضور ﷺ اس سانحے پر نہایت غمگین ہوئے اور ایک ماہ تک قنوتِ نازلہ پڑھ کر ان ظالموں کے لیے بددعا فرماتے رہے جنہوں نے عہد شکنی کر کے صحابہ کو بے دردی کے ساتھ شہید کیا۔ [7] اس کے ساتھ حضور ﷺ نے عمرو بن اُمیہ ضمری رضی اللہ عنہ کو ایک ساتھی کے ساتھ خفیہ طور پر مکہ بھیجا تا کہ ابوسفیان کا کام تمام کر دیا جائے مگر ابوسفیان کے مقدر میں اسلام کی دولت لکھی تھی۔ مکہ والے متنبہ ہو گئے، عمرو بن اُمیہ رضی اللہ عنہ اور ان کے رفیق بمشکل بچ کر واپس آ ئے۔ [8]

[1] سیرۃ ابن ہشام: ۱۸۷/۲ [2] سیرۃ ابن ہشام: ۱۸۶/۲ [3] سیرۃ ابن ہشام: ۱۸۷/۲
[4] سیرۃ ابن ہشام: ۱۸۵/۲ [5] سیرۃ ابن ہشام: ۱۸۵/۲
[6] صحیح البخاری، ح: ۳۰۶۴، کتاب الجهاد والسیر، باب العون بالمدد ؛ کتاب المغازی، باب غزوة الرجیع ورعل وذکوان وبئر معونه
[7] بحوالہ بالا
[8] سیرۃ ابن ہشام: ۶۳۳/۲ ؛ دلائل النبوة للبیهقی: ۳۳۳/۳

مشرقی علاقوں کی مہمات۔ جولان گاہِ جہاد وسیع تر

دھوکہ دہی اور فریب۔ کے ساتھ صحابہ کرام کے قتل کے ان مسلسل واقعات سے بظاہر مسلمانوں کو شدید زخم لگے تھے مگر درحقیقت ایسا کرکے کفار نے بڑی حماقت کا ثبوت دیا تھا۔ ان حرکتوں کے ذریعے انہوں نے خود وہ شاہراہ تعمیر کر دی تھی جس کے ذریعے مسلمان دور دراز کے علاقوں پر یلغار کر سکتے تھے۔ اور بالکل ایسا ہی ہوا۔

حضور ﷺ نے ظالموں کے خلاف قنوتِ نازلہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سرکش عناصر کو لگام دینے کے لیے فوری طور پر تیز رفتار دستوں کو متحرک کر دیا۔ ان مہمات کا مقصد بنولحیان اور اس کے حلیف قبائل (عَضل اور قارہ) کے علاوہ رؤسائے مکہ کو بھی مرعوب کرنا تھا جنہوں نے تین صحابہ کو قتل کرنے کے لیے عَضل اور قارہ سے خریدا تھا۔

غزوۂ بنی لحیان:

آخر رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود دو سو مجاہدین کو لے کر جن میں تیس گھڑسوار تھے، نہایت تیزی کے ساتھ مشرق کی طرف کوچ کیا اور نجد کے علاقے ''صُخیرات الثمام'' تک جا پہنچے۔ عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کے خون سے ہاتھ رنگنے والے بنولحیان کو اس پیش قدمی کی اطلاع ملی تو وہ نہایت سراسیمہ ہو کر اپنی بستیوں سے نکل بھاگے اور پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔[1] اس کے بعد حضور ﷺ عُسفان تک گئے جو مکہ سے فقط ۳۶ میل (۵۸ کلومیٹر) دور ہے۔[2] اس مہم کو غزوۂ بنی لحیان کہا جاتا ہے۔ یہ تیز تر مہم فقط چودہ دن میں مکمل کر لی گئی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مکہ کے مضافات تک یلغار:

اب حضور ﷺ کے حکم پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دس سواروں کے ساتھ مکہ کی نواحی وادی ''غَمِیم'' تک جا پہنچے۔ مکہ والوں کو یہ اطلاع پہنچی تو یہ سوچ کر ان پر خوف طاری ہو گیا کہ مسلمان ان کے مضافات تک یلغار کر سکتے ہیں۔[3]

نجد اور بطنِ عرنہ پر چھاپے:

بعض بدوی قبائل کو یہ گمان ہو گیا تھا کہ مسلمان اُحد میں شکست کھا کر کمزور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ بنواسد نے نجد میں اور بنوہُذَیل نے مکہ کے قریب بطنِ عرنہ میں جتھہ بندی شروع کر دی تھی مگر ابھی وہ پوری طرح تیار نہیں ہوئے تھے کہ حضور اکرم ﷺ نے ان دونوں سمتوں میں سرایا بھیج دیے۔ بنواسد مرعوب ہو کر منتشر ہو گئے جبکہ بنوہُذَیل کا سردار

---

① المغازی للواقدی: ۲/۵۳۶ ؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۷۷، مع حاشیة
واقدی نے اس مہم کی تاریخ ربیع الاوّل ۶ھ بتائی ہے مگر خلیفہ بن خیاط کا قول راجح ہے جنہوں نے یہ واقعہ جمادی الاولیٰ ۴ھ کے تحت نقل کیا ہے۔ صحابہ کو دھوکے سے قتل کرنے کے واقعات ۴ھ میں پیش آئے تھے۔ ان واقعات کے مجرموں کو فوری تنبیہ کرنا ضروری تھا۔ اسے دو سال تک مؤخر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۷۷، مع حاشیة

③ المغازی للواقدی: ۲/۵۳۶، واقدی کے بقول روانگی سے مدینہ واپسی بنولحیان کی پوری مہم چودہ دن میں مکمل ہو گئی تھی۔ اس مہم کی تاریخ جمادی الاولیٰ سن ۴ ہجری مدنی ہے جو صفر مکی ۴ھ کے مطابق ہے۔ اندازاً یہ مہم صفر مکی کے اواخر میں شروع ہوئی اور ربیع الاوّل مکی کے آغاز میں مکمل ہو گئی۔

خالد بن سفیان حضرت عبداللہ بن اُنَیس رضی اللہ عنہ سے جھڑپ میں مارا گیا۔ ①

ان مہمات کے اثرات:

ان مہمات کا نتیجہ یہ نکلا کہ غزوۂ اُحد کے بعد مسلمانوں کی طاقت کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتی دکھائی دی۔ اس سے قبل اسلام کا پرچم حجاز کے ایک محدود علاقے میں لہرا رہا تھا مگر واقعہ رجیع اور سانحہ بیر معونہ نے مشرقی علاقوں پر یلغار کا جواز پیدا کر دیا جس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۴ اور ۵ ہجری میں کئی سریے بھیجے اور کئی مہمات میں خود قیادت فرمائی۔ ان مہمات نے سرکش قبائل اور خود اہلِ مکہ کو اس حد تک مرعوب کر دیا کہ انہیں ایک بار بھی کھل کر مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

جہاد کے دوران اسلام کی دعوت:

جہاد کا یہ سفر دعوتِ اسلام کے لحاظ سے بھی مفید رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش اخلاقی اور رحم وکرم نے ہر جگہ اَن مٹ نقوش چھوڑے۔ نجد سے واپسی کے سفر میں ایک تپتی دوپہر میں قافلے نے ایسی وادی میں پڑاؤ ڈالا جہاں جا بجا کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ صحابہ کرام سایہ تلاش کرنے کے لیے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار ایک جھاڑی کی شاخ پر لٹکا دی اور خود اس کے نیچے سو گئے۔ اچانک ایک بدو خلافِ توقع وہاں آن پہنچا۔ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار میان سے کھینچ لی۔ آہٹ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو بدو تلوار سونتے کھڑا تھا۔

اس نے للکار کر کہا: ''تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اطمینان سے فرمایا: ''اللہ!''

بدو نے دوبارہ سہ بارہ یہ سوال دہرایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بار یہی جواب دیا۔ بدو پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار اٹھالی اور فرمایا: ''اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟''

وہ نادم ہو کر کہنے لگا: ''آپ اچھا مواخذہ کرنے والے بن جائیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟''

کہنے لگا: ''نہیں، مگر میرا وعدہ ہے کہ نہ آپ سے لڑوں گا اور نہ ہی اس قوم کا ساتھ دوں گا جو آپ سے لڑے۔''

اتنے میں صحابہ کرام نیند سے بیدار ہو کر وہاں آ گئے، دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اجنبی بدو کو پاس بٹھایا ہوا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو پورا قصہ سنایا۔ قدرت کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سزا نہیں دی اور معاف کر دیا۔ اس نے اپنی قوم میں جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاق کا تذکرہ کیا اور کہا: ''میں بہترین انسان سے مل کر آ رہا ہوں۔'' ②

☆☆☆

① طبقات ابن سعد: ۲/۵۰، ۵۱

اس مہم کی تاریخ بھی صفر ۴ ہجری بیان کی گئی ہے جو بلاشبہ صفر کی ہے اور جمادی الاولیٰ ۴ ہجری کے مطابق ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خود بنولحیان کی سمت نکل رہے تھے تو آپ کے حکم سے صحابہ کی ایک جماعت اس دوسری سمت یلغار کر رہی تھی۔

② مسند احمد، ح: ۱۴۹۲۹؛ صحیح البخاری، ح: ۲۹۱۰، کتاب الجهاد؛ ح: ۱۳۳۶؛ صحیح مسلم، ح: ۶۰۹۰

یہودیوں کے خلاف دوسری مہم: غزوۂ بنونضیر

نجد کی مہم سے واپسی پر بیرونی خطرات کا زور کم ہو چکا تھا۔ اب حضور ﷺ نے اندرونی خطرات کی سرکوبی کے لیے مدینہ کے جنوب میں آباد بنونضیر کے یہودیوں کو جلا وطن کرنا ضروری سمجھا۔ وجہ یہ تھی کہ میثاقِ مدینہ کی رو سے اُحد کی لڑائی میں یہودی مسلمانوں کا ساتھ دینے کے پابند تھے۔ مگر انہوں نے غیر جانب دار رہ کر معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ یہ حضور ﷺ کی بالغ نظری تھی کہ آپ نے مختلف یہودی قبائل کے خلاف ایک ساتھ کارروائی نہیں کی بلکہ ایک کے بعد ایک کو موقع بموقع سزا دی اور وہ بھی تب جب ان کی طرف سے عہد شکنیاں اور شرانگیزیاں سامنے آئیں۔ پہلے بنو قینقاع نے ایک مسلمان خاتون کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کا گھناؤنا جرم کیا تھا، اس لیے انہیں موقع پر سزا دے دی گئی۔

بنونضیر کا رئیس سَلّام بن مِشکَم قریش مکہ سے ساز باز کرتا رہا تھا مگر حضور ﷺ تحمل سے کام لیتے رہے، تاہم اب اس نے ناقابلِ معافی جسارت کی۔ حضورِ اقدس ﷺ کو کسی مقدمے کے سلسلے میں اپنے ہاں بلایا اور گفتگو کے دوران آپ کے قتل کی سازش کی۔ راز فاش ہو جانے پر آپ ﷺ نے آناً فاناً مجاہدین کو طلب کیا اور ۱۲ ربیع الاول ۴ھ کو بنونضیر کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ ۲۳ دن بعد بنونضیر نے ہتھیار ڈال دیے۔ انہیں جلاوطنی کی سزا دی گئی، ان میں سے کچھ مدینہ کے شمال مشرق میں ۹۰ میل (۱۴۴ کلومیٹر) دور واقع ''خیبر'' کا رخ کیا اور کچھ سرحداتِ شام چلے گئے۔ ①

غزوۂ بدر الموعد (ذوالقعدہ ۴ھ):

غزوۂ بنی لحیان اور غزوۂ بنونضیر سے قریش پر اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ وہ مسلمانوں کو ایک بڑی طاقت تصور کرنے لگے۔ ذوالقعدہ ۴ھ میں جب نبی اکرم ﷺ قریش کے اس چیلنج کے جواب میں جو انہوں نے اُحد کی لڑائی کے اختتام پر دیا تھا، ڈیڑھ ہزار صحابہ کے ساتھ میدانِ بدر میں پہنچے، تب بھی قریش میدان میں اترنے کی جسارت نہ کر سکے اور ان کا لشکر مَرّ الظہران تک آ کر واپس ہو گیا۔ مسلمان آٹھ دن تک ان کا انتظار کرتے رہے مگر قریش کو مقابلے پر آنا تھا نہ آئے۔ مسلمان اپنے ساتھ تجارتی سامان بھی لائے تھے۔ وہ بدر کے بازار سے خوب نفع کما کر واپس ہوئے۔ ②

ابورافع کا قتل (ذوالحجہ ۴ ہجری):

خیبر کے یہودی رئیس ابورافع سَلّام بن ابی الحُقَیق نے اپنے قلعے کو نئے جوش و خروش سے مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا مرکز بنا لیا۔ یہ خبریں مدینہ پہنچتی رہیں۔ آخر حضور ﷺ کے حکم پر عبداللہ بن عَتیک رضی اللہ عنہ چند رفقاء کے ساتھ اسے قتل کرنے گئے۔ شام کو وہ قلعے کے باہر اس طرح بیٹھ گئے جیسے قضائے حاجت کے لیے باہر نکلے ہوں۔ دربان نے دروازہ بند کرنے سے قبل انہیں قلعے کا باسی سمجھ کر پکارا کہ اندر آ جاؤ۔ یہ اندر چلے گئے اور کسی گوشے میں چھپے رہے۔

① سیرۃ ابن ھشام: ۱۹۰/۲ تا ۱۹۲؛ طبقات ابن سعد: ۵۷/۲؛ المحبر، ص ۱۱۳۔ یہ ربیع الاول کی تھا جو جمادی الآخرہ مدنی کے مطابق تھا۔

② سیرۃ ابن ھشام: ۲۰۹/۲؛ طبقات ابن سعد: ۵۹/۲، ۶۰۔ یہ واقعہ شعبان کی (المحبر، ص ۱۱۳) مطابق ذوالقعدہ مدنی کا تھا۔

رات کو موقع پا کر ابورافع کی خواب گاہ تک پہنچے اور اسے قتل کر کے بیرونی زینے سے چھلانگ لگادی۔ گرنے سے ان کی پنڈلی ٹوٹ گئی۔ باقی ساتھی انہیں مدینہ لائے۔ حضور ﷺ نے پاؤں پر دستِ مبارک پھیرا تو زخم کا نشان تک نہ رہا۔[1]

شمال کی طرف مہمات (۵ھ)

سن ۵ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے شمال کی طرف بھی مہمات بھیجنے کا آغاز کر دیا۔ اس سلسلے کی پہلی مہم حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں شام کی شاہراہ پر واقع وادی القریٰ کی طرف بھیجی گئی۔ یہاں کے سردار ہُبید بن عارض کی ڈاکہ زنی نے شام کی شاہراہ کو غیر محفوظ بنا دیا تھا۔ زید بن حارثہ نے پانچ سو سواروں کے ساتھ اس کے خلاف لشکر کشی کی۔ اس جھڑپ میں ہُبید مارا گیا اور اس کا مال و متاع مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔[1]

غزوۂ دومۃ الجندل:

۲۵ ربیع الاوّل ۵ھ کو حضور ﷺ خود ایک طویل سفر پر نکلے اور شمال میں دُومۃ الجندل کے مضافات تک یلغار کی جو دمشق سے صرف پانچ منازل دور تھا اور عراق، شام اور عرب کے تجارتی قافلوں کے لیے چوراہے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس علاقے کے مقامی دیہاتی جنہیں ''نَبطی'' کہا جاتا تھا، شام سے ستو اور روغنِ زیتون سمیت متعدد اشیائے خورد و نوش لے کر حجاز آیا کرتے تھے مگر ان دنوں رومی اپنی فوجیں سرحدوں پر لا رہے تھے اور نبطیوں کو تجارت سے روک رہے تھے جس کا مدینہ کی معیشت پر منفی اثر پڑ رہا تھا۔ یہ بھی سننے میں آ رہا تھا کہ رومی مدینہ کی طرف پیش قدمی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ایسے میں ضروری تھا کہ خود آگے بڑھ کر رومیوں کو جزیرۃ العرب کی سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ سے منع کیا جائے۔

حضور ﷺ فقط ایک ہزار مجاہدین کو لے کر اس مہم پر نکلے۔ پیش قدمی کو خفیہ رکھنے کے لیے نہ صرف غیر معروف راستے اختیار کیے گئے بلکہ سفر بھی فقط رات کو کیا جاتا تھا۔ بنو عذرہ کا ایک رہبر مسلمانوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔

آخر حضور ﷺ دشمن کے سر پر جا پہنچے اور اچانک ان کے مویشیوں اور گلہ بانوں پر چھاپہ مارا۔ رومی اس حملے کی خبر سنتے ہی اپنا پڑاؤ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ حضور ﷺ نے آس پاس کی بستیوں میں چھوٹے چھوٹے دستے بھیج کر ان سے اطاعت کا وعدہ لیا اور چند دن قیام کے بعد واپس کوچ کر دیا؛ کیوں کہ پیچھے مرکز کی دیکھ بھال بہت اہم تھی۔ ۲۰ ربیع الآخر کو حضور ﷺ واپس مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ یہ حضور ﷺ کی زندگی کا سب سے طویل اور تیز ترین سفر تھا۔ اس غزوے نے نہ صرف جزیرۃ العرب کے بالائی علاقوں تک اسلام کی دھاک بٹھا دی بلکہ عراق کے فارسی مرزبانوں اور شام پر راج کرنے والے بازنطینی رومی حکام کو بھی یہ احساس دلایا کہ عرب میں عنقریب مسلمانوں کا سکہ چلنے والا ہے۔[2]

① صحیح البخاری، ح: ۴۰۳۹، ۴۰۳۹، باب قتل ابی رافع ۔ یہ مہم واقدی کے بقول ۴ تا ۱۴ ذوالحجہ کی ہے۔ (المغازی: ۱/ ۳۹۱) ابن سعد کے مطابق رمضان ۶ھ کی ہے۔ (طبقات: ۲/ ۹۱) ۶ھ کا قول یقیناً غلط ہے۔ باقی فرق مکی اور مدنی تقویم کا ہے۔ اس سال مدنی ذوالحجہ مکی رمضان کے مطابق تھا۔

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۷۷ ؛ طبقات ابن سعد: ۲/ ۸۸۔ ابن سعد نے اس کی تاریخ جمادی الآخرہ ۶ ہجری نقل کی ہے۔

② المغازی للواقدی: ۱/ ۴۰۲، ۴۰۳ ؛ البدایۃ والنھایۃ: ۶/ ۱، اس کی تاریخ واقدی نے ذکر کی ہے۔ (حاشیہ اور نمبر میں فرق ہے)

غزوۂ بنو مُصطَلِق اور واقعۂ اِفک (شعبان ۵ھ)

جمادی الآخرہ ۵ھ میں چاند گرہن ہوا۔[1] شعبان ۵ھ میں رسول اللہ ﷺ جنوب میں ''مُریسیع'' کے چشمے کی طرف روانہ ہوئے جہاں بنو مُصطَلِق کا سردار حارث بن ابی ضِرار خُزاعی مسلمانوں کے خلاف جتھہ بندی کر رہا تھا۔[2]

رسول اللہ ﷺ حریف کے تیار ہونے سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ایک تند و تیز جھڑپ کے بعد بنو مصطلق نے ہتھیار ڈال دیے،اس موقع پر بنو مصطلق کے سردار حارث بن ضِرار کی بیٹی جُویریہ نے اسلام قبول کر لیا۔نبی اکرم ﷺ نے اعزاز کے طور پر ان سے نکاح کر لیا اور مسلمانوں نے اس رشتے کے احترام میں بنو مصطلق کے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا اور مالِ غنیمت واپس دے دیا۔حارث بن ضِرار بھی قبیلے سمیت اسلام لے آئے اور پکے مسلمان ثابت ہوئے۔[3]

منافقین کی کارستانی:

چونکہ اس غزوہ میں لڑائی کا خطرہ کم اور مالِ غنیمت ملنے کا امکان بہت زیادہ تھا اس لیے عبداللہ بن اُبَی منافقوں کی اچھی خاصی تعداد کے ساتھ لشکرِ اسلام میں شامل ہو گیا تھا۔وہ سمجھ چکا تھا کہ مسلمانوں کو اب کوئی بیرونی طاقت نہیں دبا سکتی،انہیں اندرونی طور پر توڑ کر ہی کمزور کیا جا سکتا ہے،اس لیے اس غزوے میں وہ مسلمانوں کے درمیان منافرت کے شعلے بھڑکانے کا موقع تلاش کرتا رہا۔مسلمان بنو مُصطَلِق کو شکست دے کر ابھی ''مُریسیع'' کے چشمے کے کنارے ٹھہرے ہوئے تھے کہ ایک دن چشمے سے پانی بھرنے کے دوران ایک مہاجر اور انصاری میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔

ایک نے مدد کے لیے آواز لگائی: ''اے مہاجرو!'' دوسرے نے پکارا: ''او انصاریو!'' مگر اس سے پہلے کہ بات بڑھتی،حضور ﷺ کو خبر ہو گئی،آپ فوراً تشریف لائے اور فرمایا: ''ایسے نعرے چھوڑ دو۔یہ بدبودار ہیں۔''[4]

---

① سبل الھدیٰ والرشاد: ۶۷/۱۲،یہ مدنی تقویم ہے جو ۹ نومبر ۶۲۶ء کے مطابق ہے۔

② غزوہ بنو مُصطلق کو غزوہ مُریسیع بھی کہتے ہیں۔اس کے سن کی تعین میں دو اقوال ہیں: ایک ابن اسحٰق کا کہ یہ سن ۶ ہجری میں ہوا۔(سیرت ابن ھشام: ۲۸۹/۲) دوسرا واقدی کا کہ یہ شعبان ۵ھ کا واقعہ ہے۔(طبقات ابن سعد: ۶۳/۲) متعدد مؤرخین نے ابن اسحٰق کے قول کو اختیار کر کے اس غزوے کو ۶ھ کے تحت بیان کیا ہے مگر یہ درست معلوم نہیں ہوتا ؛ کیوں کہ اس غزوے سے واپسی پر واقعۂ افک ہوا جس میں مشہور انصاری صحابی سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ زندہ تھے۔(صحیح البخاری، کتاب التفسیر،باب ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة) وہ ذوالقعدہ ۵ھ میں یہودِ بنو قُریظہ کا فیصلہ کرنے کے بعد جاں بحق ہوئے تھے۔(صحیح البخاری، کتاب المغازی،باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب) پس اگر غزوہ بنو مصطلق و حدیث افک کو ابن اسحٰق کے بقول سن ۶ھ میں مانا جائے تو صحیح بخاری میں کتاب التفسیر کی روایتِ افک کو کیا کہیں گے جس میں سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ افک میں ملوث افراد کے سر قلم کرنے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔یہ روایت شاہد ہے کہ واقعہ افک اور غزوہ مریسیع سعد رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہوئے تھے یعنی غزوۂ خندق سے پہلے۔یہی وجہ ہے کہ حافظ ذہبی نے ''تاریخ الاسلام'' میں سن ۵ھ کے تحت پہلے غزوۂ مریسیع اور واقعہ افک اور اس کے بعد غزوہ خندق کا ذکر کیا ہے۔

③ البدایة والنھایة: ۱۸۱/۲ ۔ یہ سفر ۲۹ دن کا تھا، ۲ شعبان (مدنی) کو روانگی اور یکم رمضان کو واپسی ہوئی۔(المغازی للواقدی: ۴۰۴/۱)

④ صحیح البخاری، ح: ۴۹۰۵، ۴۹۰۷، کتاب التفسیر، سورة المنافقون ؛ صحیح مسلم، ح: ۶۵۸۴،البر والصلة،باب نصر الاخ

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد سن کر مسلمان تو ٹھنڈے پڑ گئے مگر عبداللہ بن اُبَی نے اس واقعے کو اشتعال انگیزی کا ذریعہ بنالیا۔ وہ انصار کو مہاجرین کے خلاف بھڑکانے لگا، اس نے کہا: ''یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے، تم نے انہیں اپنے شہر میں جگہ دی، اپنی دولت میں انہیں حصہ دار بنایا۔ ان کے ساتھ تمہارا سلوک اس کہاوت کا مصداق ہے کہ تم اپنے کتے کو کھلا کھلا کر موٹا کرو اور وہ تمہیں ہی کاٹ کھائے۔ اگر تم ان کے اخراجات برداشت کرنا چھوڑ دو تو یہ لوگ خود ہی بھاگ جائیں گے۔ بخدا! مدینہ پہنچ کر شرفاء گھٹیا لوگوں کو نکال باہر کریں گے۔''

ایک کم سن صحابی زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے یہ گفتگو سن لی اور رسول اللہ ﷺ کو سب کچھ بتادیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جوش میں آکر اجازت چاہی کہ جاکر عبداللہ بن اُبَی کا سر قلم کردیں مگر رسول اللہ ﷺ نے یہ کہہ کر منع فرمادیا کہ لوگ کہیں گے محمد اپنے ہی آدمیوں کو قتل کرادیتا ہے۔ بہر حال عبداللہ بن اُبَی سے باز پرس ہوئی، اس نے قسمیں کھا کر خود کو معصوم ظاہر کیا اور کہا: ''شاید اس بچے کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔'' چونکہ یکے بعد دیگرے دو ناخوشگوار واقعات سے لشکر میں بے چینی سی پھیل رہی تھی اس لیے حضور ﷺ نے خلافِ معمول لشکر کو فی الفور مدینہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔

یہ سہ پہر کا وقت تھا، لشکر پوری رات سفر کرتا رہا۔ صبح تک لوگ بری طرح تھک گئے مگر حضور اقدس ﷺ نے قافلے کو رکنے نہ دیا۔ جب دن نکل آیا اور دھوپ میں شدت آگئی تب رسول اللہ ﷺ نے پڑاؤ ڈالا۔ اس تیز گامی سے لوگ اتنے تھک گئے کہ پڑاؤ ڈالتے ہی سو گئے اور کسی کو کل کے واقعات پر تبصرے کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا اور یہی حضور اقدس ﷺ کا مقصد تھا کہ ایک دوسرے کے خلاف بدگوئی اور غیبت کا ماحول پیدا نہ ہونے پائے۔[1]

لشکر کے مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے دو اور واقعات پیش آئے: ایک یہ کہ ایک رات کو کہیں پڑاؤ کے دوران حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا قضائے حاجت کے لیے قافلے سے دور چلی گئیں، وہاں ان کا ہار جو گلے میں تھا، ٹوٹ کر گر پڑا۔ وہ اسے تلاش کررہی تھیں کہ قافلے کی روانگی کا وقت ہوگیا اور لوگوں نے ان کے ہودج کو اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیا۔ چونکہ وہ ہلکے پھلکے بدن کی تھیں، اس لیے یہ محسوس کیے بغیر کہ وہ اپنے ہودج میں نہیں ہیں، قافلہ روانہ ہوگیا۔

جب یہ پڑاؤ کی جگہ واپس پہنچیں تو قافلے کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔ اُم المؤمنین وہیں ٹھہر گئیں، خوش قسمتی سے ایک صحابی صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ پیچھے آرہے تھے۔ انہوں نے اُم المؤمنین کو اپنے اونٹ پر بٹھالیا اور خود پیدل چلتے ہوئے آپ کو لشکر تک لے آئے۔[2]

دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ سورۃ المنافقون نازل ہوئی، جس میں عبداللہ بن اُبَی اور منافقین کا پول کھول دیا گیا۔ قرآنِ مجید نے ابن ابی کے وہ گستاخانہ جملے تک نقل کردیے جو زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ تک پہنچائے تھے۔

ابن اُبَی کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو جو مخلص مسلمان تھے، اپنے باپ کے اس سنگین جرم کا پتہ چلا تو رسول اللہ ﷺ سے آکر اجازت مانگی کہ اپنے باپ کا سر کاٹ لائیں۔ آپ نے منع فرمایا۔ اس کے باوجود وہ غصے اور ندامت کی ملی جلی

[1] سیرۃ ابن ہشام: ۲/ ۲۹۰، ۲۹۱ [2] صحیح البخاری، ح: ۲۶۶۱، کتاب الشهادات، باب تعدیل النساء

کیفیت میں تلوار سونت کر مدینہ کے راستے میں کھڑے ہو گئے۔ جب باپ کی سواری آئی تو اسے روک کر بولے:

''میں تمہیں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک تم اپنی زبان سے نہ کہہ دو کہ تم گھٹیا ہو اور محمد ﷺ معزز ہیں۔''

حضور ﷺ نے دیکھا تو دوبارہ نرمی کی تاکید کی۔ [1]

سانحۂ اِفک:

مدینہ منورہ پہنچ کر مسلمان اپنی معمول کی زندگی گزارنے لگے۔ نمازیں، تعلیم دین کے حلقے اور دعوتِ اسلام کی سرگرمیاں سب جاری تھیں مگر عبداللہ بن اُبی کی جو بے عزتی ہو چکی تھی اس کے باعث وہ زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا۔ تب اسے یہ شیطانی منصوبہ سوجھا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ایک رات لشکر سے پیچھے رہ جانے اور صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کے ساتھ واپس آنے کو خانۂ نبوت کی توہین کا بہانہ بنایا جائے۔ ابن اُبی نے اس شیطانی تدبیر پر عمل کیا اور اس رات کے واقعے کو لے کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت صفوان رضی اللہ عنہ پر الزام تراشی شروع کر دی۔ یہ بات اہل مدینہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ صحابہ کرام کی اکثریت نے اس سے بے زاری ظاہر کی اور اسے ایک گھناؤنی اور جھوٹی تہمت قرار دیا، البتہ کچھ سیدھے سادے مسلمانوں نے مان لیا کہ ایسا ہوا ہو گا۔ وہ ان باتوں کو نقل بھی کرنے لگے۔ حضور نبی اکرم ﷺ منافقوں کی لگائی ہوئی اس آگ کو دیکھ کر رنج و غم میں ڈوب گئے۔ آپ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ منافقین آپ کی نرمی، درگزر اور احسانات کا یہ صلہ دیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنا غم بانٹنے کے لیے صحابہ کرام کو مسجد میں جمع کیا اور وہاں یہ اعلان فرمایا کہ مجھے اپنی اہلیہ اور اپنے صحابی صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ پر پورا بھروسہ ہے۔ صحابہ نے بھی اُمّ المؤمنین کی عفت و شرافت پر پورے اعتماد کا اظہار کیا۔ اَوس کے سردار سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ایسی باتیں پھیلانے والا اگر اَوس کا کوئی شخص ہے تو ہم اس کا سر قلم کر دیں گے اور اگر خزرج کا ہے تو آپ جو حکم فرمائیں، ہم اس کی تعمیل کریں گے۔''

خزرج کے سردار سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ نے جو باقی صحابہ کی طرح اس سانحے کے باعث جذبات کے تلاطم سے گزر رہے تھے، اسے اپنے قبیلے پر طنز تصور کیا اور طیش میں آ کر سخت جوابی کلمات کہہ دیے۔ قریب تھا کہ منافقین کی خواہش کے عین مطابق دونوں قبیلوں میں جھگڑا ہو جاتا اور مسلمانوں کی یک جہتی کے پرخچے اڑ جاتے، مگر رسول اللہ ﷺ نے صورتحال کو سنبھال لیا اور سرداروں کو ٹھنڈا کر کے مسلمانوں کے اتحاد کو برقرار رکھا۔ آپ ﷺ نے ہفوات بکنے والوں کے سر قلم کرنے کی اجازت اس لیے نہ دی کہ اس گھناؤنے الزام کی صفائی میں آپ کو وحی کا انتظار تھا جو رُک چکی تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بہت دنوں بعد سن گن ملی کہ ان کے متعلق کیا کچھ بدگوئی کی جا رہی ہے۔ وہ حضور ﷺ سے پوچھنے کی ہمت نہ کر سکیں؛ کیوں کہ آپ ﷺ اپنے دکھ میں ایسے بے کل تھے کہ گھر والوں سے ہنسنا، بولنا سب چھوٹ گیا تھا۔ آخر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ سے اجازت لے کر اپنے میکے چلی آئیں۔

[1] سیرت ابن ہشام: ۲/۲۹۱، ۲۹۲

یہاں والدہ سے تصدیق ہوئی کہ ان کے خلاف کیا طوفان برپا ہے۔ سن کر صدمے سے بستر پر پڑ گئیں اور روتے روتے بے حال ہو گئیں۔ آخر ایک ماہ بعد وحی نازل ہوئی۔ ① اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور کی سولہ آیات (۱۱ تا ۲۶) نازل فرما کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت صفوان رضی اللہ عنہ کی پاک دامنی کی گواہی دی اور آخر میں فرمایا:

اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ

''یہ اس تہمت سے پاک ہیں جو (ان کے بارے میں منافق) لوگ کہہ رہے ہیں۔''

اس طرح منافقوں کی ناپاک سازش ناکام ہو گئی۔ آسمانی فیصلے نے خانوادۂ نبوت پر لگنے والے الزامات کا دفاع کر کے اُمّ المؤمنین کی شان دوبالا کر دی۔ علماء اس بات پر متفق ہیں کہ قرآنِ مجید میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت نازل ہونے کے بعد ان پر تہمت لگانے والا بالاتفاق خارج از اسلام ہے؛ کیوں کہ وہ قرآنی آیات کا منکر ہے۔ ②

انھی آیات میں پاک دامن خواتین اور مردوں پر جھوٹی تہمت کی سزا اسّی کوڑے طے کر دی گئی۔ چنانچہ جن لوگوں نے یہ الزام تراشی کی تھی، انہیں اسّی، اسّی کوڑے لگائے گئے۔ ③ شریعت میں اسے ''حدِ قذف'' کہا جاتا ہے۔ اسلامی قانون مسلمان مرد و زن کی پاک دامنی پر بلا ثبوت انگلی اٹھانے کو قابلِ سزا قرار دے کر مسلمان کی عزت و شرافت کو وہ تحفظ فراہم کرتا ہے جس کی نظیر دنیا کے کسی معاشرے اور کسی تہذیب اور کسی قانون میں نہیں ملتی۔ ④

سانحۂ افک میں جہاں حضور ﷺ کی بشریت کا پوری طرح اظہار ہوتا ہے، وہیں رسالتِ محمدیہ کی حقانیت بھی انتہائی طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے غیر معمولی تعلق اور محبت کے باوجود اس معاملے میں اپنے اختیار اور مرضی سے وحی نہ لا سکے۔ اگر آپ کو ہر معاملے پر مطلق اختیارات حاصل ہوتے تو آپ جلد از جلد وحی لاتے۔ اگر آپ اللہ کی طرح ''عالم الغیب'' اور ہر جگہ ''حاضر و ناظر'' ہوتے اور آپ کے بارے میں صحابہ کا بھی یہی عقیدہ ہوتا تو پھر اس ساری پریشانی اور بے چینی کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ مدینہ پر اتنے دنوں تک ایسی سنگین حالت طاری نہ رہتی۔ غیر مسلموں کو سوچنا چاہیے کہ اگر حضور ﷺ ان کے گمان کے مطابق اپنے ذہن سے وحی گھڑ لیتے تھے (نعوذ باللہ) تو پھر اس معاملے میں اتنی تاخیر کیوں کی؟ حضور ﷺ فوراً وحی بنا کر سنا دیتے اور معاملہ ختم ہو جاتا۔ مگر ایسا نہ ہوا؛ کیوں کہ حضور ﷺ سچے نبی تھے۔ وہ وحی بھی سناتے تھے جب آسمان سے اس کا نزول ہوتا تھا۔

☆☆☆

① صحیح البخاری، ح: ۲۶۶۱، کتاب الشهادات، باب تعدیل النساء؛ سیرة ابن هشام: ۲/۲۹۷ تا ۳۰۷
صحیح بخاری میں یہاں ''قد مكث شهرا'' کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سانحے کا دورانیہ ایک ماہ تھا، اگرچہ چالیس دن کا دورانیہ مشہور ہے مگر مستند نہیں۔

② قد اجمع العلماء قاطبة علی ان من سبها بعد هذا ورماها بما رماها بعد الذی ذكر فی هذه الآية فانه كافر لانه معاند للقرآن. (تفسیر ابن کثیر: ۶/۳۱، ۳۲، سورة النور)

③ مجمع الزوائد للهیثمی، ح: ۱۵۳۰۰

④ تفسیر ابن کثیر، سورة النور، آیت: ۴ تا ۶

غزوۂ خندق (شوال ۵ھ/فروری ۶۲۷ء)

اب تک مسلمانوں کی مشرکین مکہ، یہودیوں اور دیگر عرب قبائل سے تمام جنگیں الگ الگ ہوئی تھیں۔ کفار سمجھ گئے تھے کہ کوئی قوت تنہا اسلام کا راستہ نہیں روک سکتی چنانچہ اسلام دشمن طاقتیں اب مسلمانوں کے خلاف متحدہ اقدامات پر غور کرنے لگیں۔ اس منصوبے کے اصل محرک بنونضیر کے وہ یہودی رؤسا تھے جنہیں کچھ مدت پہلے مدینہ سے جلاوطن کیا گیا تھا، ان میں حُیَی بن اَخطب پیش پیش تھا۔ یہ رؤسا پہلے مکہ گئے اور قریش کے سرداروں سے مل کر ریاستِ مدینہ کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے کا معاہدہ کیا۔ پھر وہ مدینہ کے جنوب مشرق میں نجد کی حدود میں آباد غطفان کے جنگجو قبائل سے ملے اور انہیں بھی اس اتحاد میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ [1]

آخر شوال سن ۵ ہجری میں اتحادیوں کا سیلاب مدینہ منورہ کی طرف امنڈ پڑا۔ قریش نے اپنے جوانوں، حلیف قبائل اور احابیش سے چار ہزار جوانوں کی نفری فراہم کی تھی جن میں تین سو گھڑ سوار تھے، بنوغطفان نے سات سو جنگجو پیش کیے تھے جن کی قیادت عُیَینہ بن حِصن کر رہا تھا۔ بنومُرّہ کے چار سو سپاہیوں کا سالار حارث بن عوف تھا۔ مِسْعَر بن رُخَیلہ بنو اَشجع کے ۴۰۰ سورماؤں کو ساتھ لایا تھا، راستے میں بنواسد اور بنوسُلَیم کی فوجیں بھی ہم رکاب ہو گئیں۔ اس طرح حملہ آوروں کی تعداد دس ہزار تک جا پہنچی۔ [2] قریشی سالار ابوسفیان بن حرب کے پاس تمام فوجوں کی عمومی کمان تھی۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے اتحادیوں کی روانگی کی اطلاعات پاتے ہی شہر کے حفاظتی انتظامات کا جائزہ لیا۔ جنوب میں باغات کی دیواروں اور مشرق و مغرب میں "حرہ" کے دشوار گزار ٹیلوں نے حملہ آوروں کی راہیں مسدود کر رکھی تھیں۔ اسی لیے اصل خطرہ شمال کی طرف تھا۔ عام حالات میں یہاں صرف مورچے بنا کر بھی دفاع کیا جا سکتا تھا اور اگر دشمن شہر میں گھس آتا تو شہر کی گلیوں میں جابجا واقع انصار کی قلعہ نما حویلیوں سے ان پر پتھراؤ اور تیراندازی کر کے انہیں چھٹی کا دودھ یاد دلایا جا سکتا تھا، جیسا کہ غزوۂ احد میں نبی اکرم ﷺ کا ابتدائی منصوبہ یہی تھا۔ [3]

لیکن اب دشمن کی افرادی طاقت اتنی زیادہ اور انتظامات اتنے مکمل تھے کہ یہ معمولی دفاعی حربے کارآمد نہیں ہو سکتے تھے۔ کھلے میدان میں لڑنے کے نقصانات جنگ اُحد میں سامنے آ چکے تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے خصوصی طور پر شہر کے دفاع کے بارے میں مشورہ کیا جس میں اکابر ہی نہیں، عام صحابہ کو بھی رائے پیش کرنے کا پورا موقع دیا گیا تھا۔

---

[1] الکامل فی التاریخ: ۶۵/۲

[2] تاریخ الاسلام للذھبی: ۲۸۳/۱، ۲۸۴، المغازی

[3] البدایۃ والنھایۃ: ۳۴۶/۵

فارس سے آئے ہوئے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی تجویز سب سے الگ تھی۔ انہوں نے بتایا کہ فارس میں ایسے مواقع پر خندقیں کھود کر حملہ آور کی پیش قدمی روک دی جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشورے کو بڑے غور سے سنا اور پھر بالآخر اس پر عمل کا فیصلہ کرلیا۔ یہ اس زمانے کی ترقی یافتہ جنگی تکنیک تھی جس سے عرب ناآشنا تھے۔[1]

خندق کی نقشہ سازی اور کھدائی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے پر سوار ہو کر چند مہاجرین وانصار کے ساتھ نکلے اور مدینہ کے آس پاس گشت کر کے دفاع کے لیے مناسب نقشہ تیار کیا۔ آپ نے حکم دیا کہ مجاہدین جن کی تعداد تین ہزار تھی، کوہِ سَلع کے دامن میں پڑاؤ ڈالیں اور مدینہ کے مشرقی ٹیلے ''حرۂ واقم'' سے مغربی ٹیلوں ''حرۂ وبرہ'' تک کمان کی شکل میں ایک لمبی خندق کھودیں۔[2]

کھدائی سے قبل اس سارے علاقے کی پیمائش کی گئی جو تقریباً ساڑھے تین میل (ساڑھے پانچ کلومیٹر) تھی۔ اس طویل پٹی پر خندق کی کھدائی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نشانات لگائے اور حد بندی کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تین ہزار صحابہ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس، دس افراد کی ٹولیاں بنائیں اور بیس، بیس میٹر رقبے کی کھدائی ہر ٹولی کے ذمے لگادی۔[3]

مہاجرین اور انصار میں سے ہر شخص قوی البدن غریب الوطن صحابی سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو اپنی ٹولی میں لینا چاہتا تھا۔ اختلاف اتنا بڑھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فیصلہ کرنا پڑا۔ فرمایا: ''سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہیں۔''[4]

خندق کی گہرائی پندرہ فٹ اور چوڑائی تیس فٹ کے لگ بھگ رکھی گئی تھی، تاکہ گھڑ سوار بھی اسے آسانی سے نہ پھلانگ سکے۔[5] چونکہ وقت کم تھا اس لیے بہت تیزی سے کام شروع کیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وقت کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے سب کو اس کام میں لگا دیا۔ موقع اتنا نازک تھا کہ کوئی بچہ، بڑا اس کام سے پیچھے نہیں رہ سکا۔[6]

---

[1] البداية والنهاية: ٦/١٣، ١٤

[2] السيرة الحلبية: ٢/٤١٨، ط العلمية ؛ مرويات غزوة خندق لدكتور ابراهيم المدخلي: ١/١٩٦، ط عمادة البحث العلمي

[3] خط الخندق بين كل عشرة اربعين ذراعاً. (البداية والنهاية: ٦/٢٦) علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ دس دس آدمیوں پر دس دس گز زمین تقسیم کی مگر اربعین ذراعاً دس گز نہیں، بیس میٹر بنتے ہیں؛ کیوں کہ ایک ذراع ڈیڑھ فٹ کی ہوتی ہے اور چالیس ذراع کی مساحت ساٹھ فٹ یا بیس میٹر کے برابر ہوگی۔

[4] المعجم الكبير للطبراني: ٦/٢١٢، ط مكتبة ابن تيمية

[5] عہد نبوی کے میدانِ جنگ، ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم، ص ٦٨، ط ادارہ اسلامیات لاہور ؛ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، علامہ شبلی نعمانی: ١/٤٢٢

[6] وكانوا باجمعهم من بلغ ومن لم يبلغ يعملون فيه. (السيرة الحلبية: ٢/٤٢٢)

غزوہ خندق ۵ھ میں ہوا مگر مہینے اور دن میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۷ یا ۸ ذوالقعدہ تاریخ متعین کردی ہے جو غلط ہے۔ حافظ ابن کثیر نے امام زہری اور امام مالک کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ جنگ شوال ۵ھ میں ہوئی تھی۔ (البداية والنهاية: ٦/١٠) ابن حبیب نے جنگ کا دورانیہ جمعرات گیارہ شوال تا یکم ذوالقعدہ بتایا ہے۔ (المحبر، ص ١١٣) تقویمی حساب سے یہی درست ہے۔ (تقویم عہد نبوی، ۹۷) نیز موسمی قرائن بھی اسی کے مؤید ہیں۔ ''المهاجرون والانصار يحفرون في غداة باردة. (صحيح البخاري، ح: ٢٨٣٤، كتاب الجهاد، باب التحريض على القتال)

جنگ سے قبل خندق کی کھدائی بعض کے نزدیک ایک ماہ تک اور امام نووی کے قول کے مطابق پندرہ دن تک جاری رہی۔ (السيرة الحلبية: ٢/٤٢٢) امام نووی کا قول راجح معلوم ہوتا ہے اور اس حساب سے کھدائی ۲۵ رمضان کو شروع ہوئی تھی۔ شمسی تقویم کے لحاظ سے یکم شوال (مدنی) ۲۳ فروری کو تھی یعنی خندق کی کھدائی ۱۸ فروری سے ۴ مارچ تک ہوئی۔ محاصرے کا کل وقت تین ہفتے مانا جائے جیسا کہ اکثر روایات میں ہے، تو محاصرہ ۵ مارچ سے ۲۵ مارچ تک رہا۔ پس جنگ کا آغاز شوال میں ہونے کا قول راجح ہے جو کھدائی کے سرد موسم میں ہونے کی صحیح حدیث اور شمسی تقویم کے مطابق ہے۔ جنگ کے آخری ایام یقیناً معتدل موسم میں تھے مگر اس دوران جو غیر متوقع آندھی اور سردی آئی وہ خلافِ عادت تھی اور درحقیقت اللہ کی غیبی امداد تھی۔

اگر کسی کو تھوڑی دیر کے لیے بھی کسی کام سے جانا ہوتا تو حضور ﷺ سے اجازت لیے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ ①

جو کڑیل جوان تھے وہ کدالوں اور پھاوڑوں سے زمین کھود رہے تھے۔ باقی لوگ مٹی اٹھا اٹھا کر کناروں پر جمع کر رہے تھے، جس سے خندق کے اندرونی کنارے پر تقریباً چھ فٹ بلند پشتہ بنایا جا رہا تھا۔ ②

مٹی اٹھانے والوں میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے بزرگ حضرات بھی شامل تھے۔ جلدی میں سب کو ٹوکریاں نہیں مل سکی تھیں، اس لیے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما اپنے کپڑوں میں مٹی ڈھو رہے تھے۔ ③

حضور اکرم ﷺ کام کی نگرانی اور صحابہ کی حوصلہ افزائی کے لیے بذاتِ خود خندق کے پاس ایک پہاڑی پر خیمہ لگا کر وہیں مقیم ہو گئے۔ خندق جہاں جہاں کسی پہاڑی حصے سے گزرتی تھی وہاں پہاڑیوں پر مجاہدین کا پہرہ لگا کر چوکیاں قائم کر دی گئی تھیں۔ حضور ﷺ بھی خندق سے متصل ایسی ہی ایک چوکی پر قیام پذیر تھے۔

بعد میں یادگار کے طور پر یہاں ایک مسجد بنا دی گئی جو "مسجد ذُباب" کے نام سے مشہور ہے۔ ان چوکیوں کے سامنے خندق کو بوقت ضرورت عبور کرنے کا انتظام بھی کیا گیا تھا تا کہ مسلمانوں میں سے کسی کو جاسوسی وغیرہ کے لیے دشمنوں کی طرف جانا ہو تو جا سکے۔ ایسے راستے یا پل کو "باب" کا نام دیا گیا۔ مسجد ذُباب اصل میں "ذو باب" تھی، یعنی "دروازے والی"۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا خیمہ جہاں مسجد ذو باب قائم ہے، ایسے مقام پر تھا جس کے سامنے خندق پر دروازہ لگا تھا جو پل وغیرہ کی شکل کا ہوگا، اس لیے اس جگہ کو ذو باب کہا گیا۔ ④

حضور ﷺ دس آدمیوں کی ایک ٹولی میں بذاتِ خود شامل تھے اور موقع بموقع نہ صرف کھدائی میں شرکت فرماتے تھے بلکہ مٹی اٹھا اٹھا کر پھینکنے میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ یہ سخت سردی کے ایام تھے اور شہر میں کھانے پینے کے ذخائر بہت کم رہ گئے تھے، اس لیے صحابہ کرام کو پیٹ بھر کر کھانا بھی نصیب نہ تھا مگر پھر بھی وہ خندق کی کھدائی میں پورے جوش و جذبے سے شریک تھے۔ کھدائی کا کام روزانہ صبح سویرے شروع ہوتا اور اندھیرا پھیلنے تک جاری رہتا۔ ⑤

شب خون کے دفاع کا انتظام:

اس دوران مشرکین کی پیش قدمی کی خبریں متواتر پہنچ رہی تھیں اور کھدائی مکمل ہونے سے چند دن پہلے یوں لگتا تھا کہ مشرکین کے ہراول دستے کسی بھی شب چھاپہ مار حملے شروع کر دیں گے۔ ممکنہ شب خون میں کھلبلی سے بچنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اگر تم پر شب خون مارا جائے تو (اپنوں کی پہچان کے لیے) شناختی جملہ حٰمٓ لَا یُنْصَرُوْنَ ہوگا۔" ⑥

---

① سورۃ الاحزاب، آیت: ۱۲، ۱۳

② عہد نبوی کے میدانِ جنگ، ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم، ص ۶۸

③ مغازی للواقدی: ۲/۴۴۹، ط دار الاعلمی ؛ السیرۃ الحلبیۃ: ۲/۴۲۰

④ عہد نبوی کے میدانِ جنگ، ص ۶۶

⑤ البدایۃ والنہایۃ: ۶/۱۰ تا ۱۵ ⑥ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۶۷۹۹

صحابہ کے رجزیہ ونعتیہ اشعار:

حیلے نے قبل کھدائی مکمل کرنے کے لیے مسلمان اپنی ساری قوت صرف کیے دے رہے تھے۔ نبی اکرم ﷺ صحابہ کی یہ محنت ومشقت دیکھ کر ان کا حوصلہ بڑھاتے اور فرماتے تھے۔

''اَللّٰهُمَّ لاعَيْشَ اِلَّاعَيْشُ الْاٰخِرَة، فَاغْفِرِ الْاَنْصارَ وَالْمُهاجِرَة.''

''اے اللہ! اصل زندگی تو آخرت ہی کی زندگی ہے پس تو انصار اور مہاجرین کو بخش دے۔''

صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کی دعائیں سن کر اپنی محبت اور ولولے کا اظہار کرتے ہوئے یہ رجز پڑھتے۔

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوا مُحَمَّدا ۔۔۔ عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

''ہم وہ ہیں جو محمد ﷺ سے بیعت کر چکے ہیں جہاد کی۔ جب تک ہم باقی رہیں ہمیشہ کے لیے۔''[1]

مٹی لادتے ہوئے رسول اللہ ﷺ اپنے صحابی عبداللہ بن رواحہ انصاری رضی اللہ عنہ کے یہ اشعار دہراتے تھے۔

وَاللّٰهِ لَوْ لَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا ۔۔۔ وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

''اللہ کی قسم! اللہ کی توفیق نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہ پاتے...... نہ صدقہ وخیرات کرتے، نہ نمازیں پڑھا کرتے۔''

فَاَنْزِلَنْ سَكِيْنَةً عَلَيْنَا ۔۔۔ وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَاقَيْنَا

''پس الٰہی! تو ہم پر سکون نازل فرما...... اور اگر مقابلہ ہو تو ہمارے قدموں کو جما دے۔''

اِنَّ الْاُلٰى قَدْ بَغَوا عَلَيْنَا ۔۔۔ اِذَا اَرَادُوْا فِتْنَةً اَبَيْنَا

''بے شک ان لوگوں نے ہم پر چڑھائی کی ہے...... وہ جب بھی ہمیں آزمائیں گے ہم ہار نہیں مانیں گے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آواز ملا کر دہراتے ''ہم ہار نہیں مانیں گے۔''[2]

مشرق ومغرب کی فتوحات کی پیش گوئی:

کھدائی کے دوران ایک جگہ سخت چٹان آ گئی۔ صحابہ کرام اسے توڑنے سے عاجز آ گئے تو آ کر رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی۔ آپ خود تشریف لائے اور کدال سے اس سخت چٹان پر تین وار کیے۔ وہ ریزہ ریزہ ہو گئی۔[3]

چٹان پر وار کرتے وقت ہر بار کچھ شعاعیں سی چمکیں۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''یہ چمک کیسی تھی؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ نے مجھے پہلی ضرب پر یمن کی، دوسری پر شام اور مغرب کی اور تیسری پر مشرق کی فتح کی خوش خبری دی۔'' صحابہ کرام نے یہ سن کر خوشی سے تکبیر کا نعرہ بلند کیا۔[4]

① صحيح البخاري، ح: ٢٨٣٤، كتاب الجهاد، باب التحريض على القتال ؛ ح ٤٠٩٩، كتاب المغازي، باب غزوة خندق
② صحيح البخاري، ح: ٤١٠٤، كتاب المغازي، باب غزوة خندق
③ صحيح البخاري، ح: ٤١٠١، كتاب المغازي، باب غزوة خندق
④ البداية والنهاية: ٦/ ٢٦. دار هجر

حال یہ تھا کہ صحابہ نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔[1] منافقین جو اپنی ساکھ بچانے کے لیے بادلِ نخواستہ ساتھ تھے، باتیں بنانے لگے کہ جان کے لالے پڑے ہیں مگر مشرق و مغرب کی فتوحات کے مژدے سنائے جارہے تھے۔[2]

ایک صحابی کے ہاں دعوت اور معجزے کا ظہور:

حقیقت یہ تھی کہ اس وقت حضورِ اقدس ﷺ خود فاقے سے تھے۔ مگر اللہ کے وعدوں پر آپ کو اور سچے مسلمانوں کو پورا یقین تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس دن نبی اکرم ﷺ کے چہرۂ انور پر فاقہ کشی کے اثرات بہت نمایاں محسوس کیے، ان سے برداشت نہ ہوسکا۔ تیزی سے گھر گئے تاکہ کچھ پکوائیں مگر وہاں بھی جَو کے تھوڑے سے دانوں اور بکری کے ایک بچے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کی اہلیہ نے جلدی جلدی وہی جو پیس کر آٹا گوندھا اور بکری کے بچے کو ذبح کرکے چولہے پر ہنڈیا چڑھا دی۔ اِدھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ میں کچھ کھانا تیار کررہا ہوں، آپ ایک دو حضرات کے ساتھ تشریف لے آئیں۔

حضور ﷺ نے پوچھا: کتنا کھانا ہے؟''

انہوں نے مقدار بتائی تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''اچھا خاصا ہے۔''

پھر حضور ﷺ نے تمام مہاجرین وانصار کو جو وہاں موجود تھے، ساتھ لیا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے روٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے، خود روٹی سالن نکال نکال کر سب کو دیتے گئے۔ یہ آٹھ سو کے لگ بھگ افراد تھے جو خوب سیر ہوکر اُٹھے مگر جابر رضی اللہ عنہ کی ہنڈیا اسی طرح سالن سے بھری ہوئی تھی اور روٹیاں بھی باقی تھیں۔[3]

پندرہ دن کی شبانہ روز مشقت کے بعد آخر خندق مکمل ہوگئی۔[4]

احزاب کی آمد اور مدینہ کا محاصرہ:

اِدھر سے قریش کا لشکر بھی نمودار ہوا اور اُحد پہاڑ کو پشت پر رکھ کر مدینہ کے شمال میں پھیل گیا۔ ان کے ساتھ احابیش، بنوغطفان، بنی کنانہ، اہلِ نجد اور تہامہ کے مشرکین بھی تھے۔ اپنے سامنے ایک گہری اور وسیع خندق کھودی دیکھ کر وہ حیران رہ گئے اور بولے: ''بخدا! یہ تو ایسا حربہ ہے جو اس سے پہلے عربوں نے کبھی نہیں آزمایا۔''[5]

نبی اکرم ﷺ نے فوری طور پر پندرہ سال سے کم عمر تمام بچوں کو جواب تک کھدائی میں شریک تھے، خواتین کے ساتھ انصار کے قلعہ نما حویلیوں میں پناہ لینے کا حکم دیا۔ زیادہ تر خواتین اور بچوں کو ''اُطمِ حسّان'' میں رکھا گیا،[6] جو کہ

---

[1] مصنف ابن ابی شیبۃ: ح ۳۶۸۱۱، ط الرشد

[2] السنن الکبریٰ للبیہقی، ح: ۱۷۸۶۳؛ تاریخ الطبری: ۲/۵۷۰

[3] صحیح البخاری، ح: ۴۱۰۲، کتاب المغازی، باب غزوۃ خندق

[4] السیرۃ الحلبیۃ: ۲/۴۲۲، ط العلمیۃ

[5] سیرۃ ابن ھشام: ۲/۲۲۳

[6] صحیح مسلم، ح: ۶۳۹۸، فضائل الصحابۃ، فضائل طلحۃ والزبیر

مدینہ کی وسیع ترین عمارت تھی اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی جائیداد تھی۔ [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اب فوج کا پڑاؤ خندق سے پیچھے ہٹا کر جبل سلع کے ساتھ خیمے لگوائے تاکہ کفار کی تیراندازی سے حفاظت رہے۔ خود آپ کا خیمہ اس پہاڑ کی بلندی پر نصب کر دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہیں نمازیں ادا فرماتے تھے۔ بعد میں یادگار کے طور پر یہیں مسجد فتح تعمیر کی گئی جو آج تک موجود ہے۔ [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے دو الگ الگ لشکر ترتیب دیے، زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مہاجرین کا اور سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کو انصار کا امیر مقرر کر کے انہیں پرچم دیے اور خندق کے کنارے مورچہ بندی کرائی۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے مَسلمہ بن اسلم رضی اللہ عنہ کو دو سو افراد کے ساتھ مدینہ کی رکھوالی پر مقرر کیا تاکہ پیچھے سے شہر پر کوئی حملہ نہ ہو سکے۔ خصوصاً بنوقُریظہ کوئی شرانگیزی نہ کر سکیں۔ [3]

بنوقُریظہ کی سازش:

مدینہ میں اب یہودیوں کا فقط ایک قبیلہ بنوقریظہ باقی رہ گیا تھا اور شہر کے اندر وہی مسلمانوں پر کاری ضرب لگا سکتا تھا۔ ادھر قریش نے بنوقریظہ کو بغاوت کی ترغیب دینے کے لیے بنونضیر کے رئیس حُیَیّ بن اَخطب کو خفیہ طور پر روانہ کیا جس نے جا کر بنوقُریظہ کو جنگ پر اُبھارا۔ انہوں نے شروع میں انکار کیا مگر جب حُیَیّ بن اَخطب نے یقین دلایا کہ قریش اور اس کے اتحادی اس بار مسلمانوں کا صفایا کر کے ہی دم لیں گے تو بنوقُریظہ نے اتحادیوں میں شامل ہونے کی حامی بھر لی۔ [4]

یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مل گئی، مسلمانوں کو سب سے زیادہ خطرہ بنوقُریظہ ہی کی بغاوت کا تھا۔ مدینہ کی لڑنے والی تمام نفری مل کر تین ہزار تھی جو بمشکل دس ہزار مسلح دشمنوں کے سامنے چھ کلومیٹر لمبا محاذ سنبھالے ہوئے تھی۔ ان میں کمی کر کے ایک حصے کو بنوقُریظہ کے مقابلے پر لگانا ممکن نہیں تھا۔ دوسری طرف بنوقُریظہ کے جنگجو سات سو سے کم نہ تھے۔ اگر وہ حملہ کرتے تو پورے شہر میں خون کی ندیاں بہا دیتے۔ مسلمانوں کے بیوی، بچے ان کے قیدی بن جاتے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے دو معزز ترین سرداروں: سعد بن مُعاذ اور سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہما کو بنوقُریظہ سے بات چیت کے لیے بھیجا مگر ان بدبختوں نے بڑی بدتمیزی کا سلوک کیا اور بولے:

''ہم نہیں جانتے کون رسول اللہ۔ ہمارا ان سے کوئی عہد و پیمان نہیں۔''

یہ الفاظ کھلی غداری کا اعلان تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفیروں کو بھیجتے وقت ہدایت کر دی تھی کہ یہود کی وفاداری برقرار دیکھو تو واپس آ کر واضح الفاظ میں بیان کرنا (تاکہ سب سن لیں اور ان کا حوصلہ بڑھ جائے) لیکن اگر معاملہ برعکس ہو تو صورتحال اشارے میں بیان کرنا۔

---

[1] وفاء الوفاء لعلی بن عبداللہ السمهودی (م ۹۱۱ھ): ۱/۱۶۷، ط العلمیة

[2] البدایة والنهایة: ۲/۳۳، دار هجر ؛ عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ، ڈاکٹر حمیداللہ مرحوم، ص ۴۲

[3] السیرة الحلبیة: ۲/۴۲۲، ط العلمیة

[4] تاریخ الطبری: ۲/۵۶۵

چنانچہ ان حضرات نے واپس آ کر اشارے میں کہا: ''عضل اور قارہ۔''[1]

حضور ﷺ یہ سن کر کچھ دیر کے لیے چپ چاپ رہ گئے۔ مگر پھر دوسروں کو بددلی سے بچانے کے لیے فرمایا:

''مسلمانو! تمہیں فتح ونصرت کی بشارت ہو۔''[2]

سخت ترین آزمائش شروع ہوگئی تھی، منافقین اب آپ ﷺ سے اجازت لے کر اپنے گھروں کو جا رہے تھے، بہانہ یہ تھا کہ گھر غیر محفوظ ہیں۔ آپ ﷺ چشم پوشی کا معاملہ فرماتے ہوئے انہیں جانے دے رہے تھے۔[3]

اِدھر بنوقُریظہ کی طرف سے مثبت جواب ملتے ہی اتحادیوں کے لشکر نے خندق کے گرد محاصرہ تنگ کرلیا تھا اور تیر اندازی اور سنگ باری کے ذریعے مسلمانوں کو خندق سے دور دھکیلنے کی کوشش شروع کردی تھی۔ مسلمان برابر شہر کا دفاع کررہے تھے اور جوابی نشانہ بازی کے ذریعے انہیں خندق کے قریب آنے سے روکتے رہے تھے۔ ایک دن صبح سے شام تک مشرکین کے حملوں کا اتنا دباؤ رہا کہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام کی تین نمازیں قضا ہوگئیں۔[4]

اس صورتِ حال میں عقب سے شہریوں پر بنوقُریظہ کے حملے کا خدشہ مسلسل لاحق تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے مضبوط دل گردے والے آدمی کا یہ حال تھا کہ بار بار سَلْع پہاڑی کی چوٹی سے مڑ مڑ کر مدینہ کی طرف دیکھتے اور جب خاموشی محسوس ہوتی تو اللہ کا شکر ادا کرتے کہ ابھی تک بنوقُریظہ نے حملہ نہیں کیا۔[5]

حضرت صَفِیّہ بنت عبدالمُطَّلِب رضی اللہ عنہا اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی بہادری:

مگر حقیقت یہ تھی کہ بنوقُریظہ نے نہ صرف مدینہ کی آبادی پر شب وخون مارنے کی تیاری کرلی تھی بلکہ ان حویلیوں کی طرف جن میں عورتیں اور بچے پناہ لیے ہوئے تھے، کچھ مسلح افراد کو روانہ کردیا تھا تاکہ وہ جائزہ لے آئیں کہ حویلیوں کی حفاظت کے لیے مسلح پہرے دار تعینات ہیں یا نہیں۔ اور اگر ہیں تو کتنے؟

ان میں سے ایک یہودی حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی حویلی کے آس پاس منڈلانے لگا جو سب سے بڑی اور محفوظ قلعہ نما عمارت تھی، اس وقت یہاں سب خواتین اور بچے ہی تھے، مردوں میں سے حسان رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی نہ تھا۔

حضور ﷺ کی پھوپھی حضرت صَفِیّہ رضی اللہ عنہا حویلی کی چھت پر کھڑی نگرانی کررہی تھیں۔ انہوں نے یہودی کو چکر لگاتے دیکھا تو پریشان ہوگئیں، پہلے حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے کہا: ''آپ جا کر اسے ماردیں ورنہ یہ جا کر دوسرے یہودیوں کو اطلاع دے دے گا کہ اس حویلی کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔''

---

① یعنی یہود بھی ان کی طرح غداری کرچکے ہیں۔ یہ دو قبیلے تھے جنہوں نے ۳ھ میں تبلیغ اور تعلیم کے لیے بھیجے گئے بعض صحابہ کرام کو شہید کردیا تھا۔ (فتح الباری: ۳۸۰/۷ بروایت ابن اسحاق) یہ واقعہ ہم پیچھے صحیح بخاری کے حوالے سے مختصراً نقل کرچکے ہیں، سیرت ابن اسحٰق میں یہ مفصل مذکور ہے۔

② البدایة والنهایة: ۳۵/۶ تا ۳۸

③ تفسیر ابن کثیر، سورة الأحزاب، آیت: ۱۳

④ سنن نسائی المجتبیٰ، ح: ۶۶۲، کتاب الاذان

⑤ مغازی للواقدی: ج/ ص ۴۶۰، دارالاعلمی بیروت

مگر وہ بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے ہمت نہ کر سکے۔ آخر صَفِیَّہ رضی اللہ عنہا نے خود ہی ایک بھاری بانس اٹھایا، آہستہ سے حویلی کا دروازہ کھولا، دبے پاؤں باہر نکلیں اور پشت کی طرف سے جا کر یہودی پر ایسے پے در پے وار کیے کہ وہ وہیں موت کے گھاٹ اتر گیا۔[1]

اِدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوقُریظہ کی حرکتوں پر نظر رکھنے کے لیے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کو مقرر کر دیا تھا۔ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر تن تنہا گھوڑا دوڑاتے ہوئے مدینہ سے گزر کر بنوقُریظہ کے قلعوں تک جاتے، صورتِ حال کا جائزہ لیتے اور پھر سیدھے خندق پر آ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بہادری پر بے ساختہ فرمایا:

''تجھ پر میرے ماں باپ قربان۔''[2]

نُوفَل بن عبداللہ مارا گیا:

مشرکین کی طرف سے خندق پر دھاوے برابر جاری تھے۔ ابوسفیان، عَمرو بن العاص، خالد بن الولید، عکرمہ بن ابی جَہل اور قریش کے دیگر نامی گرامی سردار گھڑ سواروں کو لے کر باری باری حملے کرتے۔ ایک دن ان کا نامور سردار نُوفَل بن عبداللہ خندق عبور کرنے کی کوشش میں گھوڑے سمیت خندق میں جا گرا۔ مسلمانوں نے اوپر سے اسے پتھروں کا نشانہ بنانا شروع کیا تو اس نے آواز لگائی: ''اے عربو! تلوار سے قتل بہتر ہے۔''

یہ سنتے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ شمشیر سونت کر خندق میں کود گئے اور ایسا وار کیا کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

مشرکین پر اس کی موت بڑی گراں گزری۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام بھیجا کہ نُوفَل کی لاش ہمارے سپرد کر دیں، ہم اس کے عوض دس ہزار درہم دینے پر تیار ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاوضہ لینے سے انکار کر دیا اور صحابہ سے فرمایا:

''لاش ان کے حوالے کر دو۔ یہ بھی ناپاک ہے اور اس کا عوض بھی۔''[3]

انصار کا قریش کے سامنے جھکنے سے انکار:

جیسے جیسے محاصرہ زیادہ شدت اختیار کرتا گیا اہل مدینہ کی تکلیفیں دیکھ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اضطراب بھی بڑھتا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں انصار ہمت نہ ہار جائیں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کو کمزور کرنے کے لیے ان کے دو رئیسوں: عُیَینہ بن حِصن اور حارث بن عوف سے جو غطفان کے سردار تھے خفیہ طور پر مراسلت کی اور انہیں پیش کش کی کہ اگر وہ اپنے گروہوں سمیت قریش کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں تو انہیں مدینہ کی پیداوار کا تہائی دیا جاتا رہے گا۔ یہ دونوں سردار قریش سے چھپ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آ گئے اور صلح میں دلچسپی ظاہر کی مگر ساتھ ہی اصرار کیا کہ نصف پیداوار لیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہائی سے زائد دینے سے انکار کر دیا، آخر غطفانی سردار اسی پر راضی

[1] مستدرک حاکم، ح: ۶۸۶۷، ۶۸۶۷ [2] صحیح مسلم، ح: ۲۴۱۶، فضائل الصحابۃ، فضائل طلحۃ والزبیر رضی اللہ عنہما
[3] السیرۃ الحلبیۃ: ۲/۳۲۳، واخرجہ ابن ابی شیبۃ مختصراً، مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۶۸۲۴

ہو گئے۔ معاہدے کی عبارت لکھ لی گئی مگر دستخط کرنے سے پہلے حضور ﷺ نے اَوس اور خزرج کے سرداروں: حضرت سعد بن مُعاذ اور سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہما کو اعتماد میں لینا ضروری سمجھا اور انہیں بلا کر ساری بات بتائی۔

وہ بولے: ''اللہ کے رسول! اگر یہ اللہ کا حکم ہے تو ٹھیک ہے۔''

آپ نے فرمایا: ''اللہ کا حکم ہوتا تو میں تم سے مشورہ نہ مانگتا۔ مگر میں نے جب دیکھا کہ تمام عرب والے تمہارے خلاف متحد ہو گئے ہیں تو میں نے چاہا اس طرح ان کی قوت کم کردوں۔''

یہ سن کر سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کے رسول! اگر یہ وجہ ہے تو سنیے، جب ہم مشرک تھے تب بھی یہ لوگ ہماری پیداوار ہڑپ نہیں کر سکتے تھے، اب تو اللہ نے ہمیں اسلام کی ہدایت دے دی ہے، آپ کے ذریعے ہمیں معزز بنادیا ہے۔ اب کیسے ممکن ہے کہ یہ لوگ ہماری پیداوار میں حصہ دار بنیں۔ اللہ کی قسم! ہمارے پاس ان کے لیے تلوار کے سوا کچھ نہیں۔''

رسول اللہ ﷺ ان کا جذبہ دیکھ کر خوش ہوئے، آپ نے معاہدے کے مسودے کو چاک کروا دیا اور غطفان کے دونوں سرداروں سے کہا: ''جاؤ، اب تلوار ہی سے فیصلہ ہوگا۔''[1]

سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ کا زخم:

خندق کے کنارے اس طرح محصورانہ جنگ رہی۔ تیروں اور پتھروں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ اَوس کے سردار حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ دراز قامت تھے اور زرہ چھوٹی تھی، جس سے ان کے دونوں ہاتھ باہر دکھائی دیتے تھے۔[2]

ایک دن قریش کے ایک ماہر تیرانداز حِبان بن عَرِقہ نے تاک کر ان پر تیر چلایا جس سے ان کی کلائی کی شہ رگ کٹ گئی۔[3] رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے مسجد ہی میں ایک خیمہ لگوا دیا تاکہ اپنے قریب رکھ کر ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جاسکے۔[4] مگر خون بند ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ایک سلاخ گرم کر کے زخم کو داغا مگر نصیب میں شفا نہ تھی، ہاتھ پھول گیا۔[5] پھر زخم پھٹا اور خون دوبارہ جاری ہو گیا۔ نبیِ اکرم ﷺ نے دوبارہ زخم کو داغا، اس حالت میں سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ نے دعا کی: ''الٰہی! مجھے اس وقت تک موت نہ دے جب تک میری آنکھوں کو بنی قُریظہ (کے انجام سے) ٹھنڈی نہ کردے۔''

یہ دعا ایسی قبول ہوئی کہ خون بہنا فوراً بند ہو گیا۔ تاہم حالت خطرے سے باہر نہ تھی؛ کیوں کہ زخم شہ رگ کا تھا۔[6]

---

① سیرت ابن هشام: ۲۲۳/۲ ، یہ واقعہ مختصراً بعض کتب حدیث میں بھی ہے، دیکھیے: (مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۶۸۱۶، ط الرشد)

② مسند احمد، ح: ۲۵۰۹۷

③ صحیح البخاری، ح: ۴۱۲۲، کتاب المغازی، باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب

④ صحیح البخاری، ح: ۴۶۳، کتاب الصلوة، باب الخیمة فی المسجد

شارحین حدیث نے یہاں وضاحت نہیں کی کہ یہ کونسی مسجد تھی مگر قرینِ قیاس یہ ہے کہ یہ محاذِ جنگ پر خندق کے قریب قائم کی گئی وہ نئی مسجد تھی جہاں رسول اللہ ﷺ قیام پذیر تھے۔ مسجد نبوی مراد لینا اس لیے بعید ہے کہ وہ محاذ سے دور تھی اور وہاں رکھنے میں قریب سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی دیکھ بھال کا مقصد فوت ہو جاتا۔

⑤ صحیح مسلم، ح: ۵۸۷۸، الطب، باب لکل داء دواء

⑥ سنن الترمذی، ح: ۱۵۸۲، ابواب السیر، باب ما جاء فی النزول علی الحکم

عَمرو بنْ عَبدِ وَدّ کا قتل:

ایک دن غیر معمولی واقعہ ہوا، حریف کے چند نامور شہ سواروں نے اپنے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور ایک نسبتاً کم چوڑی جگہ سے جست کر کے خندق کے پار آ گئے، ان میں عرب کا مانا ہوا شمشیر زن عَمرو بن عبدِ وَدّ بھی تھا۔ اس نے للکار کر کہا: ''ہے کوئی جو مقابلے پر آئے؟'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے عرض کیا: ''میں اس سے لڑوں گا۔''

مگر حضور ﷺ نے روکا اور فرمایا: ''علی! یہ عَمرو بن عبدِ وَدّ ہے۔''

عَمرو بن عبدودّ نے دوبارہ سہ بارہ آواز لگائی اور جواب میں خاموشی پا کر کہنے لگا:

''کہاں ہے تمہاری وہ جنت جس میں تم مر کر جانے کا یقین رکھتے ہو۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ بے قرار ہو کر اُٹھنے لگے، رسول اللہ ﷺ نے پھر فرمایا: ''علی! بیٹھ جاؤ۔ یہ عَمرو بن عبدِوَدّ ہے۔''

وہ بولے: ''چاہے وہی ہو۔''

حضور ﷺ نے اجازت دے دی، یہ تلوار سونت کر پیدل نکلے۔ عَمرو بن عبدِ وَدّ انہیں آتا دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور شعلے کی طرح چمکتی شمشیر لے کر حملہ آور ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وار ڈھال پر روکا مگر عَمرو عبدِ وَدّ کا ہاتھ اتنا زور دار تھا کہ تلوار ڈھال کو کاٹتی ہوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیشانی تک پہنچ گئی تاہم زخم کاری نہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً سنبھل کر اس کے کاندھے اور گردن کے بیچ ایسی ضرب لگائی کہ خون کا فوارہ ابل پڑا، عَمرو بن عبدِ وَدّ کے ڈھیر ہوتے ہی مسلمانوں نے خوشی سے نعرہ تکبیر بلند کیا۔[1] جو مشرک خندق کے پار آ گئے تھے فرار ہو گئے۔[2]

اتحادیوں میں پھوٹ:

اس دوران اتحادیوں میں پھوٹ کے اسباب بھی پیدا ہو گئے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بعض یہودیوں کو یہ خدشہ ہونے لگا تھا کہ اگر شکست ہو گئی تو کہیں اتحادی ہمیں مسلمانوں کے آگے چھوڑ کر اپنے اپنے علاقوں کو فرار نہ ہو جائیں۔

جنگ سے پہلے ہی انہوں نے حُیَیّ بن اَخطب سے کہہ دیا تھا: ''ہمیں تمہارے اتحادیوں پر بھروسہ نہیں۔ ان کے پاس جا کر کہو کہ وہ ہر گروہ کے شرفاء میں سے کچھ افراد ہمارے پاس یرغمال کے طور پر رکھوا دیں۔''

چنانچہ حُیَیّ بن اَخطب اتحادی قیادت سے ملا اور طے کرا لیا کہ ستر شرفاء بنو قُریظہ کے پاس یرغمالی رہیں گے۔[3]

مگر جنگ شروع ہونے کے بعد اتحادیوں نے یہ وعدہ پورا کرنے کا نام بھی نہ لیا۔ اس صورتحال میں یہودیوں کے خدشات پختہ ہونے لگے کہ اتحادی انہیں دھوکہ دے کر بھاگ جائیں گے۔ آخر انہوں نے خفیہ طور پر رسول اللہ ﷺ کو اس شرط کے ساتھ صلح کا پیغام بھیجا کہ ان کے ہم قوم بنو نضیر کو جو جلا وطن کر کے خیبر بھیج دیے گئے تھے، دوبارہ مدینہ میں بسنے کی اجازت دے دی جائے۔[4]

---

[1] السنن الکبریٰ للبیهقی، ح: ۱۸۳۵۰
[2] سیرۃ ابن هشام: ۲/ ۲۲۵
[3] دلائل النبوۃ للبیهقی: ۳/ ۴۰۱ عن موسیٰ بن عقبة
[4] دلائل النبوۃ للبیهقی: ۳/ ۴۰۵ عن موسیٰ بن عقبة

انہی دنوں بنوغطفان کے ایک صاحب نُعیم بن مسعود اشجعی نے اسلام قبول کیا تھا مگر ان کے اسلام قبول کرنے کا کسی کو علم نہ تھا۔ وہ باتیں اِدھر سے اُدھر پہنچانے کے ماہر تھے اور غالباً اسی بناء پر یہود سمیت مختلف قبائل اور طبقات میں ان کا خاصا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بلایا اور فرمایا:

''تم سے ایک راز کی بات کہنی ہے۔ مجھے یہود نے صلح کا پیغام بھیجا ہے، شرط یہ رکھی ہے کہ میں بنونضیر کو مدینہ میں دوبارہ آباد ہونے کی اجازت دے دوں۔''[1]

نُعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ باتیں سنیں اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے:

''مجھے اجازت دیں کہ میں ان لوگوں سے جو چاہوں بات کرلوں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم اگر چہ اکیلے آدمی ہو مگر جس قدر ہو سکے، اتحادیوں کو ہم سے ہٹاؤ۔''[2]

ان کے جانے پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جنگ فریب کا نام ہے۔ شاید کہ اللہ تعالیٰ اس طرح ہمارے لیے کوئی صورت نکال دے۔''[3]

نُعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ پہلے بنوقُریظہ کے پاس گئے اور ان سے کہا:

''میرا تم سے دوستی اور خیر خواہی کا معاملہ ہے۔ یہ قریش اور غطفان تمہارے جیسے نہیں۔ یہ تمہارا علاقہ ہے جس میں تمہاری عورتیں اور بچے آباد ہیں۔ تم یہاں سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ تم قریش اور غطفان کا ساتھ دے رہے ہو لیکن اگر انہیں شکست ہوگئی تو وہ تمہیں چھوڑ کر اپنے علاقوں کو بھاگ جائیں گے۔''[4]

یہود پہلے ہی اتحادیوں سے بددل ہو رہے تھے، ان باتوں سے ان کے خدشات مزید بڑھ گئے۔ اب نُعیم رضی اللہ عنہ قریش کے پاس چلے گئے اور ہمدردی کے پیرایے میں انہیں بتا دیا کہ بنوقُریظہ مسلمانوں سے صلح کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ نئی اطلاع ملتے ہی پڑاؤ میں کھلبلی مچ گئی۔ اکثر لوگ کہنے لگے: ''ہمارا خیال ہے، اب واپسی کرنی چاہیے۔''

اتحادی قائدین اس وقت یرغمال کے طور پر بھیجنے کے لیے کچھ لوگوں کو نامزد کر چکے تھے جنہوں نے یہ خبر سنتے ہی شور مچا دیا: ''ہم تو کبھی بھی یہودیوں کے قلعے میں نہیں جائیں گے۔ ہمیں اپنی جان کا خوف ہے۔''

اس کے باوجود ابوسفیان نے آخری کوشش کے طور پر عِکرِمہ بن ابی جَہل کو بنوقُریظہ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا:

''کل بروز ہفتہ ہم فیصلہ کن حملہ کریں گے۔ تم بھی قلعے سے نکل کر ہمارے ساتھ جنگ میں حصہ لینا۔''

جواب ملا: ''ہفتے کو ہمارے ہاں جنگ جائز نہیں۔ آپ یرغمالی بھیج دیں۔ اتوار کو ہم حملے میں شریک ہو جائیں گے۔''

---

① دلائل النبوۃ للبیهقی: ۳/۴۰۵ عن موسیٰ بن عقبة

② سیرۃ ابن هشام: ۲/۲۲۹ عن ابن اسحاق. اسے مختصراً بعض محدثین نے بھی نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۶۸۱۰

③ دلائل النبوۃ للبیهقی: ۳/۴۰۵ عن موسیٰ بن عقبة

④ سیرۃ ابن هشام: ۲/۲۲۹، عن ابن اسحاق

عکرمہ بن ابی جہل نے واپس آ کر ابوسفیان اور دیگر سرداروں کو ماجرا سنایا تو سب کو یہود کی غداری کا یقین ہو گیا۔[1]

طوفانی موسم اور احزاب کی ناکام واپسی:

محاصرے کو تین ہفتے گزر گئے تھے، موسم سرد تر ہوتا جا رہا تھا۔ محصورین اور حملہ آور دونوں خستہ حال تھے، ساتھ ہی طوفانی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ یہ اللہ کی غیبی مدد تھی جس نے اتحادیوں کے حوصلے پست کر دیے۔ ایک طوفانی اور اندھیری شب میں حضور ﷺ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو دشمنوں کی جاسوسی کے لیے روانہ کیا۔ انہوں نے جا کر دیکھا، طوفانی ہوا سے اتحادیوں کے خیمے اکھڑ رہے ہیں، جانور ہلاک ہو رہے ہیں، ہانڈیاں الٹ الٹ کر گر رہی ہیں۔ مشرکین کے رؤساء جو ایک الاؤ کے گرد ہاتھ تاپ رہے تھے، زور وشور سے واپس چلنے پر بحث کر رہے تھے۔ آخر اتحادیوں کے امیر لشکر ابوسفیان نے واپسی کا فیصلہ سنا دیا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے واپس آ کر آنحضرت ﷺ کو یہ خوش خبری سنائی۔ آپ ﷺ مسکرا دیے۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے تاریکی میں دندانِ مبارک کی چمک صاف دیکھی۔ اگلے دن اتحادی افواج اپنے خیمے ڈیرے سمیٹ کر واپس جا رہی تھیں۔ تین ہفتوں تک جنگ کی گھٹاؤں میں گھرے رہنے کے بعد شہر نبی کا افق پھر صاف ہو گیا۔[2]

حضور ﷺ نے اتحادیوں کی واپسی پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''اب حملہ ہماری طرف سے ہوگا۔ وہ ہم پر چڑھائی نہیں کر سکیں گے۔''[3] یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ اہلِ مکہ پھر کبھی مدینہ پر لشکر کشی نہ کر سکے۔

☆☆☆

---

① دلائل النبوۃ للبیہقی: ۴۰۵/۳ عن موسیٰ بن عقبۃ

یہاں ہم نے دلائل النبوۃ میں منقول موسیٰ بن عقبہ اور سیرت ابن ہشام میں منقول ابن اسحاق کی روایات کو اس طرح جمع کرنے کی کوشش کی ہے کہ دونوں روایات کے تضادات کا ازالہ ہو جائے۔ دونوں روایات میں بنیادی تضاد یہ ہے کہ موسیٰ بن عقبہ کی روایت کے مطابق نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک سادہ لوح اور پیٹ کے ہلکے آدمی تھے، رسول اللہ ﷺ نے قصداً ان کے سامنے بنوقریظہ سے مراسلت کا ذکر کیا۔ انہوں نے حسب عادت یہ باتیں قریش کو سنا دیں اور وہ لوگ گھبرا گئے۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ ہوشیار آدمی تھے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے ذمے لگایا تھا کہ وہ دشمنوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کریں۔ اکثر مؤرخین نے یہاں ابن اسحاق کی روایت کو لیا ہے جس میں واقعے کا تسلسل زیادہ واضح ہے، حافظ ابن کثیر جیسے نقاد عالم نے بھی اسی کو زیادہ پسند کیا ہے۔ مگر علامہ شبلی نعمانی نے موسیٰ بن عقبہ کی روایت پر انحصار کیا ہے اور ابن اسحاق کی روایت کو غیر معتبر سمجھا ہے۔ اگر اس کی وجہ یہ ہو کہ ابن اسحاق کے مقابلے میں موسیٰ بن عقبہ زیادہ ثقہ اور نقلِ روایت میں زیادہ محتاط ہیں تو یہ اصولی طور پر درست موقف ہے اور اسی لیے ہم نے بھی موسیٰ بن عقبہ کی روایت کو اہمیت دی ہے۔ لیکن اگر کوئی مستشرقین کے اس اعتراض سے کہ ''یہ کارروائی عیاری اور فریب پر مبنی تھی جو پیغمبرانہ اخلاق کے خلاف ہے'' بچنے کے لیے ابن اسحاق کی روایت کو یکسر مسترد کرتا ہے تو یہ کوشش بے سود ہے، اس لیے کہ چالاکی تو موسیٰ بن عقبہ والی روایت میں بھی نمایاں ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی جاسوسی میں بھی یہ واضح ہے۔

درحقیقت مستشرقین کا اعتراض بالکل بے بنیاد ہے اور اس کا جواب خود رسول اللہ ﷺ کے ارشاد ''الحرب خدعۃ'' میں موجود ہے۔ یقیناً بدعہدی تو جنگ میں بھی جائز نہیں اور رسول اللہ ﷺ ہی نہیں صحابہ نے بھی کبھی اس کا ارتکاب نہیں کیا مگر سیاسی حربوں کا استعمال دنیا کی ہر قوم کرتی ہے، جاسوسوں، مخبروں اور خفیہ ایجنسیوں کی سرگرمیوں میں حریف کو ہمیشہ ذہنی طور پر الجھایا جاتا ہے۔ اسلام نے اسے جائز رکھا ہے۔ صحابہ کرام کا رسول اللہ ﷺ کے حکم سے کعب بن اشرف کو چالاکی سے قتل کرنا بھی اسی نوعیت کا واقعہ ہے جس پر صحیح بخاری کی کتاب الجہاد میں ''الکذب فی الحرب'' کا عنوان لگایا گیا ہے۔ کیا اس روایت کا بھی انکار کر دیا جائے گا؟ اگر اس امر کی گنجائش نہ رکھی جائے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی ملک اپنا دفاع قائم رکھ سکے۔ جوابی کارروائی اور دفاع کے لیے یہ ناگزیر ہے۔

② دلائل النبوۃ للبیہقی: ۴۴۹/۳ تا ۴۵۵، ط العلمیۃ ؛ کنز العمال، ح: ۳۰۰۸۲ عن ابن عساکر ؛ سیرۃ ابن ہشام: ۲۳۲/۲

③ صحیح البخاری، ح: ۴۱۱۰، کتاب المغازی، باب غزوۃ خندق

غزوۂ بنوقُریظہ (ذوالقعدہ ۵ھ)

مسلمان محاذ سے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔ حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ کے زخمی ہونے کے پیش نظر حضور ﷺ نے مسجد نبوی کے صحن میں ایک خیمہ لگوا کر انہیں وہیں منتقل کر دیا تا کہ ان کی دیکھ بھال پر پوری توجہ دی جاسکے۔ ابھی حضور ﷺ نے ہتھیار اتار کر غسل کیا ہی تھا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام غبار آلود حالت میں تشریف لے آئے اور فرمایا:

''آپ نے ہتھیار اتار دیے جب کہ ابھی تک ہم فرشتوں نے ہتھیار نہیں اتارے۔ آپ یلغار کریں۔''

رسول اللہ نے پوچھا: ''کہاں؟'' جبرئیل علیہ السلام نے بنوقُریظہ کی طرف اشارہ کیا۔ [1]

جبرئیل علیہ السلام کا یہ نزول اس لیے تھا تا کہ واضح ہو جائے کہ اللہ کا حکم یہی ہے اور بعد میں کسی کو بھی اس مہم کے برحق اور ضروری ہونے میں شک باقی نہ رہے۔ اگر جبرئیل علیہ السلام تشریف نہ لاتے، تب بھی حضورِ اقدس ﷺ اور صحابہ کرام بنوقُریظہ کی شرانگیزی اور بدعہدی کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، جنہوں نے جنگ کے نازک ترین اوقات میں ان کی پشت پر خنجر تانا تھا۔ البتہ حضور ﷺ اس کارروائی کو چند دن مؤخر کر کے مجاہدین کو آرام دینا چاہتے تھے۔ تاہم اب آسمانی حکم کے بعد ٹھہرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ آپ ﷺ نے اسی روز خندق کے تھکے ماندے مجاہدین کو بنوقُریظہ کی طرف روانہ فرما دیا اور فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی بنوقُریظہ کے علاقے میں پہنچنے سے پہلے عصر کی نماز نہ پڑھے۔''

چنانچہ صحابہ کرام بڑی تیزی سے اس سمت روانہ ہو گئے۔ راستے میں عصر کا وقت ہوا، تو بعض صحابہ نے یہ سوچ کر عصر کی نماز ادا کر لی کہ اس تاکید کا مقصد جلد روانگی کرانا تھا، نہ کہ نماز میں تاخیر کرانا۔

بعض حضرات نے ہدایت پر لفظ بلفظ عمل کیا اور بنوقُریظہ کے قلعے کے سامنے پہنچ کر تاخیر کے ساتھ نمازِ عصر ادا کی۔ رسول اللہ ﷺ نے کسی کے عمل کو غلط نہیں کہا۔ [2] اس قسم کے واقعات سے اجتہاد کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔

یکم ذوالقعدہ کو شام تک بنوقُریظہ کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا گیا۔ آخر ۲۵ دن بعد بنوقُریظہ کی ہمت جواب دے گئی اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ [3] طے یہ ہوا کہ ان کے مستقبل کا فیصلہ حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ کریں گے۔ وہ اسلام سے قبل بنوقُریظہ کے قریبی دوست رہے تھے، اس لیے نہ صرف بنوقُریظہ بلکہ خود انصار کو بھی یہ توقع تھی کہ وہ ماضی کے تعلقات کا لحاظ رکھتے ہوئے نرم فیصلہ کریں گے، زیادہ سے زیادہ بنوقَینُقاع اور بنونضیر کی طرح ان کو جلاوطنی کی سزا

---

① صحیح البخاری، ح: ۲۸۱۳، کتاب الجهاد، باب غسل بعد الحرب والغبار ؛ ح: ۴۱۱۷، کتاب المغازی، مرجع النبی ﷺ من الاحزاب

② صحیح البخاری، ح: ۴۱۱۹، کتاب المغازی، مرجع النبی ﷺ من الاحزاب

③ ثم غزوة بنی قریظة، خرج الیها فی الیوم الذی انقضی فیه امر الخندق فحاصرهم خمسة وعشرین یوماً. (المحبر، ص ۱۱۳)

نائیں گے مگر جان بخشی ضرور کر دیں گے۔ لیکن اس دن حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی نگاہ اسلام کے مفاد کے سوا کسی چیز پر مرکوز نہ تھی۔ وہ ہر رشتے ناتے کو بھلا چکے تھے، جب انہیں سہارا دے کر مجلسِ قضاء میں لایا گیا تو وہ کہہ رہے تھے:

''آج میں اللہ اور اس کے رسول کی خاطر کسی کی ملامت کا لحاظ نہیں کروں گا۔''

فریقین کی رضامندی سے انہیں فیصلے کا اختیار دیا گیا تو انہوں نے اعلان کیا:

''بنو قُریظہ کے لڑنے کے قابل مردوں کو قتل کر دیا جائے، عورتوں کو باندیاں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے''

یہ سن کر سب دنگ رہ گئے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سعد نے اللہ کے فیصلے کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔''[1]

فیصلے پر اسی طرح عمل درآمد ہوا۔ بنو قُریظہ کے چار سو جنگجو مرد قتل کر دیے گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بنو قُریظہ کا انجام دیکھنے کے لیے ہی جی رہے تھے، اس کے فوراً بعد ان کے زخم سے خون بہہ پڑا اور وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔[2]

بنو قُریظہ سے یہ سلوک یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معمول کے خلاف تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جان بخشی کر سکتے تھے مگر آپ نے سزا جاری کرنے کو ترجیح دی۔ اس کا اصل سبب تو یہی تھا کہ آسمانی حکم یہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت جبریل علیہ السلام کو بھیج کر بنو قُریظہ پر حملے کو ایک دن بھی ملتوی نہیں ہونے دیا، اسی طرح ان مجرموں کی سزا بھی آسمان پر یہی طے ہو چکی تھی جو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی زبان پر جاری ہوگئی۔ دنیا کے سابقہ اور موجودہ قانون کے مطابق بھی باغیوں کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔ خود یہودیوں کی مذہبی کتاب تورات ایسے قضیے میں سزائے موت سناتی ہے، جیسا کہ عہد نامہ عتیق میں ہے کہ خداوند کسی شہر کو تیرے قبضے میں کر دے تو تو اس کے ہر مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر۔[3]

رہی یہ بات کہ آسمانی حکم سے ہٹ کر کیا اس اقدام کے پیچھے کوئی خاص زمینی وجہ بھی کارفرما تھی؟ اس کا جواب اثبات میں ہے، مگر وجہ صرف یہ نہ تھی کہ وہ لوگ یہودی تھے؛ کیوں کہ یہودی تو بنو قینقاع اور بنو نضیر بھی تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایسا سخت سلوک نہیں کیا۔ زمینی وجہ بنو قُریظہ کی طبعی شرانگیزی بھی نہ تھی؛ کیوں کہ دوسرے یہودی بھی یقیناً فتنہ پرور تھے جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جلاوطن کرنے پر اکتفا کیا تھا۔ پھر بنو قُریظہ سے رعایت نہ برتنے کی وجہ کیا تھی؟

---

[1] صحیح مسلم، ح: ۴۶۹۵، کتاب الجہاد، باب جواز قتال من نقض العہد، ط دار الجیل

[2] سنن الترمذی، ح: ۱۵۸۲، ابواب السیر، باب ما جاء فی النزول علی الحکم، باسناد صحیح؛ مسند احمد، ح: ۱۴۷۷۳ باسناد صحیح

بنو قُریظہ کے مقاتلین کتنے تھے جنہیں قتل کیا گیا؟ ابن ہشام نے چھ سو، سات سو، آٹھ سو اور نو سو کے چار اقوال ذکر کیے ہیں۔ مشہور روایت کے مطابق حُیَیّ بن اخطب نے قریش سے معاہدہ کرتے وقت سات سو افراد کی مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ (مغازی للواقدی: ۲/۴۵۴)

مگر ترمذی اور مسند احمد کی صحیح روایات میں چار سو افراد کے قتل کا ذکر ہے۔ تطبیق کی صورت یہ ہے کہ یہود کے اپنے دعوے یا اپنے شمار میں مقاتلین زیادہ تھے، غالباً انہوں نے قریب البلوغ لڑکوں کو بھی تربیت دے کر مقاتلین میں شمار کر رکھا تھا مگر مسلمانوں نے ایسے بہت سوں کو شک کا فائدہ دے کر چھوڑ دیا ہو جیسا کہ ایک قیدی عطیہ القرظی کا اپنا بیان ہے کہ میں طبی معائنے میں جوان ثابت نہیں ہوا تھا اس لیے چھوڑ دیا گیا۔ (مستدرک حاکم، ح: ۸۱۷۳)

یہ بھی ممکن ہے کہ بعض قیدیوں نے اسلام قبول کر لیا ہو، جیسا کہ عطیہ القرظی رضی اللہ عنہ کی ایک مثال کتب حدیث میں موجود ہے۔ بہرحال یاد رکھا جائے کہ عورتوں اور نابالغ بچوں کو قتل سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔ فقط ایک عورت ایسی تھی جس نے جنگ میں حصہ لیا تھا اور خلاد بن سوید رضی اللہ عنہ کو بھاری پتھر مار کر قتل کیا تھا۔ (سیرت ابن ہشام: ۲/۲۴۲) وہ اس جرم کی فخر کے ساتھ معترف بھی تھی، چنانچہ وہ قتل کر دی گئی۔ (سنن ابی داؤد، ح: ۲۶۷۱، کتاب الجہاد، باب فی قتل النساء)

[3] بائبل، استثناء، باب: ۲۰، آیات: ۱۰ تا ۱۴

اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بنوقینقاع اور بنونضیر کی طرف سے شرانگیزیاں اور بدعہدیاں عام حالات میں ہوئی تھیں جبکہ بنوقُریظہ نے اعلانیہ بغاوت کا گھناؤنا جرم اسلامی ریاست پر عین بیرونی حملے کے دوران کیا تھا جس کی وجہ سے اس جرم کی سنگینی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اس لیے انہیں اس سنگین ترین جرم کے مطابق نہایت کڑی سزا دی گئی۔

رہی یہ بات یہ کہ اگر حضور ﷺ اپنی طبعی رحم دلی کے مطابق کرم کا معاملہ فرما دیتے تو کیا کوئی نقصان ہو جاتا؟ جی ہاں! یقیناً ہوتا۔ ظاہر ہے کہ بنوقُریظہ کو معاف کر دینے کے باوجود انہیں ان کے ٹھکانوں پر آباد رکھنے کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔ یہ اپنی آستین میں سانپ پالنے کے مترادف تھا۔ انہیں جلاوطن ہی کرنا پڑتا۔ مگر اس کا نتیجہ کیا نکلتا؟ اس سے قبل بنوقینقاع اور بنونضیر کے بہت سے لوگ جلاوطن ہو کر خیبر کے قلعوں میں جا بسے تھے اور وہاں یہودیوں کی ایک عظیم جمعیت تیار ہو گئی تھی جو مدینہ کی سلامتی کے لیے خطرہ تھی۔ بنوقُریظہ کے لوگ جا کر ان کی طاقت میں مزید اضافے کا سبب بنتے۔ اس طرح بنوقُریظہ کی جان بخشی کرنا خود اپنے پیروں پر کلہاڑی چلانے کا مصداق ہوتا۔

یہاں انسانی فطرت اور معاشرتی فلسفے کا یہ پہلو قابل توجہ ہے کہ کوئی مقتدر قوت جو سزا یا معافی دونوں پر قدرت رکھتی ہو، عام اذہان کے نزدیک مقتدر تبھی مانی جا سکتی ہے جب وہ کبھی معاف کرتی دکھائی دے، کبھی سزا جاری کرے۔ اگر کوئی صاحبِ اختیار شخص ہر معاملے اور ہر مسئلے میں فقط معافی کا پہلو اختیار کرتا رہے تو عام لوگ یہی تصور کریں گے کہ وہ حقیقت میں صاحبِ اختیار نہیں، بلکہ دوسروں کو معاف کرنے پر مجبور ہے، اسے سزا جاری کرنے کا اختیار سرے سے دیا ہی نہیں گیا۔ اس سوچ کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عادی مجرم، غنڈے، بدمعاش اور چور اُچکے بے خوف ہو کر وارداتیں کرنے لگیں گے اور معاشرے سے قانون کا احترام اُٹھ جائے گا۔

مجرموں کو سزا کا خوف ہی سرکشی سے باز رکھ سکتا ہے اور یہ خوف تب ہی باقی رہ سکتا ہے جب سزاؤں کا گاہے گاہے عملی طور پر نفاذ ہوتا رہے۔ جس طرح کائنات کے حاکم اعلیٰ، اللہ تعالیٰ اگرچہ اکثر معافی اور درگزر سے کام لیتے ہیں مگر کبھی کبھی وہ مجرموں کو عاد اور ثمود کی طرح عبرت کا نشان بنا کر بھی دکھا دیتے ہیں، اسی طرح اللہ کے آخری رسول ﷺ بھی اگرچہ اکثر مواقع پر سراپا رحم و کرم نظر آتے ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ ﷺ معافی کی بجائے سزا جاری کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ مجرموں پر حدود و قصاص جاری کرنے کی متعدد مثالیں سنتِ نبویہ میں موجود ہیں۔ البتہ کسی قوم کے اجتماعی جرم پر اجتماعی سزا دینے کی یہ سیرت نبوی میں واحد مثال ہے۔ اس کے سوا ہر جگہ آپ ﷺ نے یا تو سب کو معاف کر دیا یا مخصوص مجرموں کو مستثنیٰ کر کے اکثریت سے درگزر کا معاملہ فرمایا۔ سیرتِ نبویہ میں ایسی سخت مثال بھی ایک رحمت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو ''اسلامی ریاست'' کے خلاف سازشوں اور بغاوت کی سزا جاری کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا۔ ہر سنگین سے سنگین بغاوت اور سازش قابل معافی قرار پاتی۔ مصنف ''نبی رحمت'' کا تبصرہ توجہ کے قابل ہے وہ لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے بنوقُریظہ سے جو معاملہ فرمایا، وہ جنگی سیاست اور عرب کے یہودی قبائل کی سرشت اور افتادِ طبع کے مطابق تھا۔ ان کے لیے اسی قسم کی سخت اور عبرت ناک سزا کی ضرورت تھی جس سے عہد شکنی کرنے والوں اور دھوکا

بازوں کو ہمیشہ کے لیے سبق مل جاتا اور آئندہ نسلیں اس سے عبرت پکڑیں۔“[1]

☆☆☆

غزوۂ خندق کے بعد پیش آنے والے چند اہم واقعات

غزوۂ خندق کے بعد ۵ ھ کے اواخر اور ۶ ھ کے درمیان کئی اہم واقعات پیش آئے جن میں سے بعض کا تعلق رسول اللہ کی ﷺ خانگی زندگی سے تھا اور بعض ریاستِ مدینہ سے متعلق تھے۔ ان کا مختصر تذکرہ پیشِ خدمت ہے۔

❶ رسول اللہ ﷺ کا زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح (ذوالقعدہ ۵ ہجری):

زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، اب بھی نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ان کے منہ بولے بیٹے کے طور پر رہتے تھے، لوگ انہیں زید بن محمد کہتے تھے۔ انہوں نے اپنے عنفوانِ شباب میں حضور اکرم ﷺ کے کہنے پر امّ ایمن رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تھا جو اُس وقت ان سے تقریباً دوگنی عمر کی تھیں۔ اب زید رضی اللہ عنہ چالیس سال کے لگ بھگ ہو چکے تھے اور اُمّ ایمن عمر رسیدہ۔ حضور ﷺ کو خیال آتا تھا کہ زید کے لیے ایک جوان بیوی ہونی چاہیے۔

اس مقصد کے لیے رسول اللہ ﷺ نے ایک قریشی خاتون زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کو منتخب فرمایا۔

یہ خاتون نہایت اعلیٰ نسب، عبادت گزار اور سخی تھیں، مگر انہیں زید رضی اللہ عنہ سے نکاح میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے زید کے سرپرست کی حیثیت سے انہیں نکاح کا پیغام دیا تو انہوں نے یہ کہہ کر اپنی دلی کیفیت کا اظہار کر دیا: ”مجھے وہ پسند نہیں ہیں۔“ حضور ﷺ نے فرمایا: ”میں اسے تمہارے لیے پسند کرتا ہوں۔“ زینب رضی اللہ عنہا ارشادِ نبوی کے آگے خاموش ہو گئیں۔ نکاح ہو گیا۔

کچھ دن اچھی طرح گزرے مگر رفتہ رفتہ واضح ہو گیا کہ زید رضی اللہ عنہ کا ان سے نباہ نہیں ہو سکتا۔ تب زید رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کو ماجرا سنایا اور ساتھ ہی بتایا کہ میں انہیں طلاق دینا چاہتا ہوں۔ حضور ﷺ فرماتے رہے: ”زید! ان کے ساتھ نباہ کرو۔“ مگر آخر کار زید رضی اللہ عنہ نے انہیں طلاق دے ہی دی۔

زینب رضی اللہ عنہا اب عدت میں تھیں اور حضور اکرم ﷺ سوچ رہے تھے کہ اس خاتون کی جو دل شکنی ہوئی ہے اس کا تدارک تب ہی ہو سکتا ہے جب میں خود ان سے نکاح کر لوں۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ عرب میں منہ بولے بیٹے کو سگے بیٹے کی طرح سمجھا جاتا تھا اور اس کی بیوی کو حقیقی بہو کی حیثیت دی جاتی تھی۔ اس لیے سخت خدشہ تھا کہ اگر حضور اکرم ﷺ نے یہ نکاح کیا تو بات معاشرے میں بہت عجیب سمجھی جائے گی۔ اغیار تو اعتراضات کریں گے ہی، اپنوں کو بھی وسوسے ہو سکتے ہیں اور یہ بات خود ان کے دین وایمان کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔

تاہم اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحزاب کی ابتدائی آیات نازل فرما کر ان تمام اعتراضات کا قلع قمع کر دیا۔ ارشاد ہوا:

---

[1] نبی رحمت ﷺ، حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، ص ۲۴۵

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ

''(اللہ نے) تمہارے منہ بولے بیٹوں کو (سچ مچ) تمہارا بیٹا نہیں بنا دیا، یہ صرف تمہارے منہ سے کہنے کی بات ہے، اور اللہ حق بات فرما دیتا ہے اور وہی سیدھا راستہ بتلاتا ہے۔ تم ان (لے پالکوں) کو ان کے باپوں کی طرف منسوب کیا کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے۔''[1]

لوگ اب زید رضی اللہ عنہ کو ''ابن محمد'' کہنے سے باز آ گئے۔ انہیں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کہا جانے لگا۔[2]

ادھر زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی عدت پوری ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے خود وحی کے ذریعے ان کا نکاح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا[3]، اعلان ہوا:

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَىْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِىْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا

''پھر جب زید کا جی اس سے بھر گیا ہم نے آپ سے اس کا نکاح کر دیا، تا کہ اہل ایمان کے لیے ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کچھ تنگی نہ رہے جب (منہ بولے بیٹے ان سے اپنا جی بھر چکیں)''[4]

یوں تا قیامت نسلی اولاد اور لے پالکوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کے مابین واضح خطِ امتیاز کھینچ دیا گیا۔

❷ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح:

۶ ھ میں حبشہ کے حکمران نجاشی اَصْحَمہ رحمہ اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح مہاجرینِ حبشہ میں شامل حضرت اُمّ حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا سے پڑھایا اور اپنی طرف سے چار سو دینار کا خطیر مہر ادا کیا۔ نجاشی نے انہیں شُرَحْبِیل بن حَسَنہ کی حفاظت میں مدینہ منورہ بھیج دیا۔ اس وقت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۳۳ برس سے کچھ زیادہ تھی۔[5]

① سورۃ الاحزاب، آیت: ۴، ۵ ② تفسیر ابن کثیر، سورۃ الأحزاب ؛ اسد الغابة، تراجم: زيد بن حارثة رضی اللہ عنہ، زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا

اہم نوٹ: حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے بارے میں طبقات ابن سعد، تاریخ طبری اور جلالین سمیت بعض تفاسیر میں کچھ روایات ایسی ہیں جن کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا پر اچانک نگاہ پڑ جانے کے بعد انہیں پسند کیا جس کے بعد حضرت زید رضی اللہ عنہ نے انہیں طلاق دی۔ مستشرقین ایسی روایات لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت پر اعتراض کرتے ہیں گویا یہ روایات اسلام کے قطعی اور اعتقادی مسائل ہیں۔ حالانکہ یہ روایات سنداً ضعیف اور درایت کے لحاظ سے بالکل بے وزن ہیں۔ محققین علماء مثلاً: امام ابوبکر باقلانی، علامہ ابن حزم، قاضی عیاض، امام قرطبی، حافظ ابن کثیر، علامہ ابن قیم اور حافظ ابن حجر نے انہیں کئی وجوہ سے مسترد کیا ہے، مثلاً: یہ کہ ان روایات کے راوی عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم، محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں۔ پھر وہ صحابی ہیں نہ تابعی، ان سے پہلے ایک دو راوی ضرور ہیں جن سے یہ واقعہ نقل ہوا ہے۔ چونکہ وہ نامعلوم ہیں لہٰذا سند خود بخود منقطع اور ناقابلِ اعتماد ہوگئی۔ ایسی بعض روایات واقدی سے منقول ہیں اور واقدی بھی ضعیف راوی ہیں۔ ایسی ضعیف روایتیں، عقیدے بلکہ احکام حلت وحرمت میں بھی دلیل نہیں بن سکتیں۔

یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ اپنے دل کی بات یا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بتا سکتے تھے یا اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں واضح فرماتا۔ ایسی کوئی صریح عبارت نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی منقول ہے نہ اللہ کے کلام میں ہے، جس سے مستشرقین کا دعویٰ ثابت ہو سکے۔ یہ یقیناً سند میں موجود کسی نامعلوم راوی کا اپنا خیال اور بیان مدرج ہو گیا ہے جو ہرگز قابلِ قبول نہیں۔ ڈاکٹر خلیل عبدالکریم نے ''الوعد المنجز فی نقد النص المؤسس'' میں اس موضوع پر نہایت محققانہ کلام کیا ہے۔ وہ دیکھ لیا جائے۔

③ نکاح ذوالقعدہ ۵ ھ میں ہوا تھا۔ زینب رضی اللہ عنہا اس وقت ۲۵ برس کی تھیں۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۱۷)

④ سورۃ الاحزاب، آیت: ۳۷ ⑤ سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۲۰، ۲۲۱

• سریّہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ (سیف البحر):

غزوۂ خندق میں مشرکینِ عرب کی اجتماعی طاقت کو جس شرمناک ہزیمت سے واسطہ پڑا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور قریش کے خلاف اقتصادی شکنجے کو مزید کس دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی کمان میں تین سو افراد کا ایک بڑا دستہ ساحلِ سمندر کے ساتھ ''سیف البحر'' کے مقام پر تعینات کیا تاکہ قریشی قافلے راستہ بدل کر بھی شام کی طرف نہ جا سکیں۔

یہ قافلہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم رہا، موسم کی شدت اور سامانِ رسد کے ناکافی ہونے کے باوجود اپنی مفوضہ ذمہ داری انجام دیتا رہا۔ اس پہرے کے زمانے میں بھوک کی شدت کے باعث مجاہدین کو صحرائی پودے ''خبط'' (ببول) کے پتے کھانے پڑے جس کی وجہ سے اس مہم کو ''جیش الخبط'' کہا جانے لگا۔

بعد میں اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوئی اور ایک کوہ پیکر مچھلی ساحل پر آ چڑھی۔ مسلمانوں کو شروع میں تردد ہوا کہ کہیں یہ مردار نہ ہو۔ مگر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنی فقہی واجتہادی صلاحیت سے کام لیتے ہوئے فرمایا:

''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے ہیں۔ اللہ کے راستے میں نکلے ہیں۔ اسے کھالو۔''

تین سو افراد کا یہ لشکر اٹھارہ دن تک اس خدائی ضیافت سے شکم سیر ہوتا رہا اور واپسی پر اس کے بچے ہوئے گوشت کا وافر ذخیرہ بھی ساتھ لایا جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تناول فرمایا اور اسے اللہ کی نصرت اور انعام قرار دیا۔[1]

• مکہ کے تین ستم رسیدہ مسلمانوں کی رہائی:

مکہ میں کچھ مسلمان سخت تنگی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان میں ایک عیّاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ تھے جو ابوجہل کے ماں شریک بھائی تھے۔ حبشہ کی دوسری ہجرت میں شریک تھے۔ اس کے بعد دوبارہ مکہ آ گئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہم رکاب ہو کر ہجرتِ مدینہ کی، قبا آ کر ٹھہرے تھے کہ ابوجہل آیا اور یہ کہہ کر واپس لے گیا کہ تمہاری ماں کی حالت بہت خراب ہے، اس نے قسم کھالی ہے کہ جب تک تمہیں نہ دیکھ لے گی سایے میں نہ بیٹھے گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منع کرنے کے باوجود یہ ماں کو دیکھنے مکہ روانہ ہو گئے مگر کفار نے انہیں گرفتار کر کے زنجیروں سے باندھ دیا۔[2]

سلمہ بن ہشام رضی اللہ عنہ بھی حبشہ کی ہجرتِ ثانیہ میں شامل تھے۔ بعد میں مکہ واپس آ گئے تھے۔ انہیں ہجرت سے روک کر قید کر دیا گیا۔ ابوجہل انہیں مارتا پیٹتا اور بھوکا پیاسا رکھتا تھا۔[3]

ولید بن ولید رضی اللہ عنہ مشہور کافر سردار ولید بن مغیرہ کے بیٹے تھے۔ غزوۂ بدر میں مشرکین کے ساتھ تھے۔ شکست کے بعد قیدی بنے اور اسی دوران اسلام کی حقانیت ان کے دل میں گھر کر گئی مگر اسلام کا اظہار نہ کیا۔ کچھ دنوں بعد ان کے

[1] صحیح البخاری، ح: ۴۳۶۰، کتاب المغازی، غزوۃ سیف البحر؛ صحیح مسلم، ح: ۵۱۰۹، الصید والذبائح، اباحۃ میتات البحر
اکثر مؤرخین نے واقدی کی روایت کے مطابق اسے ۸ھ میں فتح مکہ سے قبل کا واقعہ بتایا ہے مگر یہ اس لیے درست نہیں ہو سکتا کہ یہ قریش سے صلح کا زمانہ تھا، اس میں قافلے روکنا جائز نہ تھا۔ علامہ صالحی الشامی نے اس پر بحث کر کے کہا ہے کہ یہ ۶ھ یا اس سے پہلے کا واقعہ ہے۔ (سبل الہدیٰ والرشاد: ۶/۱۷۸، ۱۷۹)
[2] تاریخ المدینۃ لابن شبہ: ۲/۶۶۳؛ طبقات ابن سعد: ۴/۱۲۹ [3] طبقات ابن سعد: ۴/۱۳۰

رشتہ دار آئے اور فدیہ دے کر انہیں آزاد کرا کے ساتھ واپس لے جانے لگے مگر یہ راستے سے واپس بارگاہِ رسالت میں آ گئے اور اسلام کا اعلان کر دیا۔ رشتہ دار پیچھے آئے اور طعنہ دیا کہ اسلام قبول کرنا تھا تو پہلے کر لیتے، ہماری رقم کیوں ضائع کرائی؟ انہوں نے جواب دیا: ''تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ قید سے آزادی کے لیے مذہب تبدیل کیا ہے۔''

اس کے بعد یہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ مکہ چلے گئے جنہوں نے مکہ پہنچ کر انہیں قید کر دیا۔[1]

رسول اللہ ﷺ نمازِ فجر میں قنوت نازلہ پڑھ کر مکہ کے تمام بے بس مسلمانوں کے لیے عمومی طور پر اور ان تین صحابہ کی رہائی کے لیے خاص طور پر نام لے کر دعا فرماتے تھے۔ ساتھ ہی یہ دعا بھی کرتے:

''اے اللہ! اہلِ مکہ کو یوسف علیہ السلام کے دور جیسی قحط سالی میں مبتلا کر دے۔''[2]

پہلی دعا اس طرح قبول ہوئی کہ غزوۂ خندق کے کچھ دنوں بعد ولید بن ولید رضی اللہ عنہ کسی طرح زنجیروں سے آزاد ہو کر مدینہ پہنچ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے عیاش بن ابی ربیعہ اور سلمہ بن ہشام رضی اللہ عنہما کا حال پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ دونوں کا ایک ایک پاؤں ایک ساتھ ایک ہی زنجیر میں بندھا ہوا ہے۔

رسول اللہ ﷺ ان مظلوموں کی آزادی کے لیے فکر مند تھے۔ آخر ایک بندوبست ہو گیا۔ مکہ میں ایک لوہار نے خفیہ طور پر اسلام قبول کر لیا تھا (جو زنجیر کاٹنے میں مدد دے سکتا تھا۔) حضور ﷺ نے ولید بن ولید رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی کہ مکہ جا کر اس لوہار کے گھر میں روپوش ہو جائیں اور جب موقع ملے دونوں قیدیوں کو زنجیروں سے آزاد کر کے ساتھ لے آئیں۔ ولید بن ولید رضی اللہ عنہ اس خطرناک مہم پر گئے اور آخر کار دونوں ساتھیوں کو آزاد کرا کے مدینہ واپس آ گئے۔[3]

دوسری دعا اس طرح قبول ہوئی کہ انہی ایام میں مکہ اور اس کے مضافات شدید قحط کی لپیٹ میں آ گئے۔ مکہ میں غذا اس قدر کمیاب ہو گئی کہ لوگ ہڈیوں کو غذا میں استعمال کرنے لگے۔[4]

⑤ سَرِیّہ عُکاشہ بن مِحصَن رضی اللہ عنہ۔ سَرِیّہ محمد بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ:

ربیع الاوّل میں رسول اللہ ﷺ نے عُکاشہ بن مِحصَن رضی اللہ عنہ کو ۴۰ افراد کے ساتھ بنو اسد کے خلاف چھاپے کے لیے ''غمرِ مرزوق'' نامی چشمے پر بھیجا۔ دشمن فرار ہو گیا، مسلمان ۲۰۰ اونٹ غنیمت میں لے کر لوٹے۔

ربیع الآخر ۶ھ میں رسول اللہ ﷺ نے محمد بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ کو بنو ثعلبہ کی مخبری کے لیے ''ذوالقصہ'' بھیجا۔ یہ دس ساتھی لے کر گئے مگر وہاں ۱۰۰ تیر انداز مقابلے پر آ گئے۔ تیروں سے کئی مسلمان زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد دشمن نے نیزے تان کر حملہ کر دیا اور تقریباً سبھی مسلمانوں کو شہید کر ڈالا۔ محمد بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ کا ٹخنہ ٹوٹ گیا، کوئی مسلمان بعد میں انہیں اٹھا کر لے آیا۔ حضور ﷺ نے ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو دشمن کے پیچھے بھیجا مگر وہ ہاتھ سے نکل چکے تھے۔[5]

① طبقات ابن سعد: ۱۳۲/۴

② صحیح البخاری، ح: ۲۹۳۲، کتاب الجهاد، باب الدعاء علی المشرکین

③ طبقات ابن سعد: ۱۳۲/۴ یہ واقعہ غزوہ خندق کے کچھ عرصے بعد کا ہے۔ (طبقات ابن سعد: ۱۳۰/۴)

④ صحیح مسلم، ح: ۷۲۴۵، کتاب صفة یوم القیامة، باب الدخان ⑤ طبقات ابن سعد: ۸۶،۸۵/۲

⑨ سَریّہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور ابوالعاص بن ربیع کا قبولِ اسلام:

قریش مکّہ کے قافلے اب بھی بچ بچا کے شام آتے جاتے رہتے تھے۔ مسلمان اب بھی ان کی ناکہ بندی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جمادی الاولیٰ سن ٦ ہجری میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے شام سے واپس آنے والے ایک قریشی قافلے پر چھاپہ مارا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص بھی تھے۔ مدینہ پہنچ کر وہ اپنی زوجہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے دروازے پر پہنچے اور ان کی پناہ لے لی۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے نمازِ فجر کے وقت اپنے دروازے پر کھڑے ہوکر بلند آواز سے نمازیوں کو پکارا:

''لوگو! سن لو، میں نے ابوالعاص کو امان دے دی ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک اس بات کا علم نہ تھا۔ یہ آواز سن کر آپ بھی حیران ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین کو معمولی غلط فہمی سے بھی بچانے کے لیے کہا: ''لوگو! کیا جو بات میں نے سنی تم نے بھی سن لی ہے؟''

سب نے کہا: ''جی ہاں۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، مجھے اس واقعے کا ذرا بھی علم نہیں تھا، ہاں جب تم نے یہ اعلان سنا، تو وہی میں نے بھی سنا۔ اہلِ ایمان دوسروں کے بارے میں ایک ہاتھ کی مانند ہیں، ان میں سے کوئی معمولی فرد بھی کسی کو امان دے سکتا ہے۔ ہم نے بھی اسے امان دی جسے زینب نے امان دی۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر تشریف لے گئے۔ زینب رضی اللہ عنہا حاضر ہوئیں اور درخواست کی کہ ابوالعاص کا جو سامان لوٹا گیا ہے، واپس کر دیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوالعاص کو ان کا سامان واپس دلوا دیا۔ پھر انہیں کہا کہ جب تک وہ مشرک ہیں، ان کا زینب سے تعلق حلال نہیں، لہٰذا وہ ان سے دور رہیں۔ ابوالعاص نہایت شریف انسان تھے۔ اسلام کی خوبیاں ان کے سامنے واضح تھیں۔ وہ اسلام قبول کرنا چاہتے تھے مگر اس وقت انہیں یہی بہتر لگا کہ پہلے مکّہ چلے جائیں تاکہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ کسی خوف یا حرص کی وجہ سے انہوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ وہ مکّہ واپس چلے گئے۔ وہاں سب کی امانتیں لوٹائیں، جس کا جو حق تھا، اسے پورا پورا ادا کیا۔ اس کے بعد محرم ۷ ہجری میں وہ مدینہ آئے اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب رضی اللہ عنہا کو ان کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔[1]

کتبِ سیرت کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم جس میں ابوالعاص بن ربیع گرفتار ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے قریش کی اقتصادی ناکہ بندی کے لیے بھیجی جانے والی آخری کارروائی تھی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا اور کچھ مدت بعد صلح حدیبیہ کے معاہدے کے مطابق فریقین کے لیے پورے جزیرۃ العرب میں تمام راستے کھل گئے۔ مگر تب تک قریش کی معاشی طاقت اس حد تک تہس نہس ہو گئی تھی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف دوبارہ کسی جنگ کا اقتصادی بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔

① صحیح البخاری، ح: ۴۱۹۲، کتاب المغازی، باب قصۃ عکل و عرینۃ ؛ سنن ابی داوٗد، ح: ۴۳۶۴، کتاب الحدود

⑦ سَرِیّہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور اُمّ قِرفہ کا قتل:

بنوفزارہ کے جنگجو ایک مدت سے وقتاً فوقتاً مدینہ منورہ کے مضافات پر چھاپے مارتے آرہے تھے۔ آخر ان لٹیروں کو سبق سکھانے کے لیے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ایک دستہ لے کر وہاں گئے۔ فزاریوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ خود شدید زخمی ہوئے اور بمشکل ان کے ساتھی انہیں مدینہ واپس لا سکے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ جب تک بنوفزارہ کا سر نہ کچل دیں، غسلِ جنابت واجب نہیں ہونے دیں گے۔ زخم بھرتے ہی وہ ایک بار پھر بنوفزارہ کے خلاف فیصلہ کن جنگ کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ①

اس قبیلے کی اصل مرکزیت ایک جنگجو عورت اُمّ قِرفہ (فاطمہ بنت ربیعہ) کے دم سے قائم تھی۔ مدینہ منورہ سے سات دن کی مسافت پر وادیٔ القریٰ کے قریب اس کا گڑھ تھا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سب و شتم کرتی تھی اور اپنے تیس بیٹوں اور پوتوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے لیے تیار کر رہی تھی (نعوذ باللہ)۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے ماہِ رمضان میں اس کے خلاف کارروائی کی۔ اس کے بیٹے اور پوتے مارے گئے۔ وہ خود اپنی ایک بیٹی سمیت گرفتار ہوگئی۔ اسے قتل کر دیا گیا جبکہ اس کی بیٹی کی جان بخش دی گئی۔ ②

⑧ مرتدین کو سزا (۶ھ):

اسی سال عُکل اور عُرینہ قبائل کے کچھ لوگ مدینہ منورہ آئے اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ مدینہ کی آب و ہوا راس نہ آنے کے باعث وہ بیمار ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طلب پر انہیں مدینہ کے مضافات میں رہائش کی اجازت دے دی اور انہیں دودھ فراہم کرنے کے لیے چند اونٹنیوں اور ایک چرواہے کا انتظام بھی کر دیا۔ مگر وہ پہنچ کر یہ سب لوگ مرتد ہوگئے، انہوں نے چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹنیوں کو ہانک کر لے جانے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو ان کے تعاقب میں بھیجا۔ آخر یہ لوگ گرفتار ہوگئے اور انہیں ارتداد اور ڈاکہ زنی کی پاداش میں آنکھیں پھوڑ کر اور ہاتھ پاؤں کاٹ کر قتل کر دیا گیا۔ تاہم بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو مُثلہ کرنے (آنکھیں پھوڑنے، ناک کان کاٹنے) کی ممانعت کر دی۔ ③

☆☆☆

---

① سیرۃ ابن ھشام: ۲/۶۱۷

② سیرۃ ابن ھشام: ۲/۶۱۷ ؛ شرف المصطفی: ۳/۵۲

③ الطبقات الکبری لابن سعد: ۸/۳۳، ط صادر...... سبط ابن الجوزیؒ نے یہ پورا واقعہ ۶ھ کے تحت لکھا ہے۔ (مرآۃ الزمان: ۳/۳۷۱)

صلح حدیبیہ (ذوالقعدہ ۶ھ)

مسلمانوں کو مکّہ چھوڑے ہوئے ۶ برس ہونے والے تھے۔ وہ مسجد الحرام اور بیت اللہ کی زیارت کو ترس گئے تھے۔ خود نبی اکرم ﷺ کو شدید اشتیاق تھا کہ اللہ کے گھر کا طواف کیا جائے اور مناسک ادا کیے جائیں۔

انہی دنوں آپ ﷺ نے خواب میں خود کو صحابہ کے ہمراہ مسجد الحرام میں داخل ہوتے اور مناسک کی تکمیل کرتے دیکھا۔ یہ اشارہ تھا کہ دلی ارمان پورے ہونے کو ہیں۔ آپ ﷺ یہ بھی محسوس کر چکے تھے کہ قریش مسلسل جنگوں کی وجہ سے کمزور پڑ چکے تھے، اسی لیے یہ امید تھی کہ وہ آپ کو عمرے کی اجازت دے دیں گے، چنانچہ آپ ﷺ یکم ذوالقعدہ سن ۶ ہجری میں چودہ سو صحابہ کرام کے ساتھ احرام باندھ کر عمرے کے ارادے سے مکّہ روانہ ہو گئے۔ قربانی کے جانور بھی ساتھ تھے۔ عرب کے لوگ کسی ایسے قافلے پر حملہ نہیں کرتے تھے جس کے ساتھ قربانی کے جانور ہوں۔ یہ مہینہ مدنی تقویم میں ذوالقعدہ اور مکی تقویم میں رجب تھا۔ قریش سمیت تمام اہل عرب کے نزدیک ان دنوں جنگ حرام تھی۔ اس لیے آپ ﷺ کو اطمینان تھا کہ جنگ کی نوبت نہیں آئے گی لیکن قریش کو آپ کے آنے کی اطلاع ہوئی تو وہ بھڑک اٹھے، انہوں نے آپ کو روکنے کے لیے خلافِ دستور جنگ کی تیاری شروع کر دی اور راستے میں ایک مسلح جتھہ تعینات کر دیا۔ حضور ﷺ کو معلوم ہوا تو فرمایا: ”قریش پر افسوس ہے، انہیں جنگوں نے نگل لیا، ان کا کیا بگڑ جائے گا اگر وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور باقی عربوں کو ان کے حال پر۔“[1]

قریش سے مذاکرات:

اب حضور اکرم ﷺ عام شاہراہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے راستے سے آگے بڑھے اور مکّہ کے مضافات میں ”حدیبیہ“ پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں آپ ﷺ نے ایک مقامی باشندے بُدَیل بن وَرقاء کو یہ پیغام دے کر قریش کی طرف بھیجا کہ ”ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے، ہمارا مقصد صرف عمرہ کرنا ہے۔“

قریش نے اس پیغام پر ذرا بھی غور نہ کیا۔ انہوں نے ایک جہاں دیدہ شخص عُروہ بن مسعود ثقفی کو سفیر بنا کر بھیجا تا کہ ڈرا دھمکا کر حضور ﷺ کو واپس بھیج دیا جائے۔ تقریباً چھ سال کی طویل مدت میں یہ پہلا موقع تھا کہ قریش نے تلوار کی جگہ سفارت اور گفت وشنید کی راہ اختیار کی تھی۔ یہ اس بات کا عملی اعلان تھا کہ اسلام اپنا لوہا منوا چکا ہے۔

عُروہ بن مسعود نے دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر قریش کی منشاء کے مطابق کئی سخت باتیں کہیں مگر حضور ﷺ کا معقول موقف سننے، آپ کا عزم واستقلال محسوس کرنے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی آپ ﷺ سے بے مثال عقیدت ومحبت دیکھنے کے بعد اس نے جان لیا کہ مسلمان دبنے والے لوگ نہیں۔ چنانچہ واپس آ کر کہا: ”میں نے قیصر وکسریٰ جیسے بادشاہوں کی بھی ایسی عزت وتوقیر ہوتے نہیں دیکھی جیسی محمد (ﷺ) کی عزت ان کے ساتھی کرتے ہیں۔“[2]

[1] سیرۃ ابن ہشام: ۳۰۸/۲، ۳۰۹   [2] صحیح البخاری، ح: ۲۷۳۱، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد

قریش نے اپنے حلیف "احابیش" کے سردار حُلَیس کو بھی ڈرانے دھمکانے کے لیے مسلمانوں کے پاس بھیجا مگر وہ قافلے میں قربانی کے جانور دیکھتے ہی واپس آ گیا اور کہنے لگا: "یہ ہمارے دین کے خلاف ہے کہ قربانی لے کر آنے والوں کو حرم میں داخلے سے روکیں۔ تم انہیں آنے دو ورنہ ہم سب احابیش تمہارا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"

قریش جو کمزور ہو چکے تھے، احابیش سے تعلق توڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے، اس لیے بڑے سٹپٹائے۔ [1]

بیعتِ رضوان:

اس دوران نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر قریش کی طرف بھیج دیا۔ انہوں نے آپ ﷺ کا موقف دوبارہ بڑی وضاحت کے ساتھ قریش کے رئیسوں کے سامنے پیش کر دیا۔ واپسی کے موقع پر قریش نے انہیں پیش کش کی کہ وہ چاہیں تو طواف کر لیں۔ وہ بولے: "جب تک رسول اللہ ﷺ کو طواف کی اجازت نہ ملے گی میں بھی طواف نہیں کروں گا۔" اس پر قریش کے سردار بگڑ گئے اور انہیں نظر بند کر دیا۔ اُدھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ انہیں شہید کر دیا گیا ہے۔

حضور اقدس ﷺ یہ سن کر بہت غم زدہ ہوئے۔ آپ اب تک صلح وصفائی کی راہ تلاش کر رہے تھے مگر آپ ﷺ کے نزدیک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون اتنا قیمتی تھا کہ اسے معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور صحابہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے بدلے موت کی بیعت لی۔ سب نے دل وجان سے آمادگی ظاہر کی کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کے لیے ہم آخری سانس تک لڑیں گے۔ [2]

جرأت اور جاں نثاری کی یہ ادا اللہ تعالیٰ کو اتنی پسند آئی کہ قرآنی آیات نازل فرما دیں جن میں اس بیعت میں شریک صحابہ کرام کو اللہ کی رضا مندی کی بشارت دی گئی۔ ارشاد ہوا:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا [3]

"یقیناً اللہ ان مؤمنوں سے خوش ہوا، جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے، اس لیے اس نے ان پر سکینت اتار دی اور انہیں انعام میں ایک قریبی فتح بھی عنایت کر دی۔"

اس لیے اس بیعت کو "بیعت رضوان" کہا جاتا ہے۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام: ۳۱۲/۲ [2] سیرۃ ابن ہشام: ۳۱۵/۲، ۳۱۶ [3] سورۃ الفتح، آیت: ۱۸

نوٹ (۱): صلح حدیبیہ میں چودہ سو صحابہ کرام شریک تھے جن میں حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کے علاوہ ایسے جلیل القدر صحابہ کا ایک جم غفیر تھا جنہیں روافض منافق قرار دیتے ہیں۔ (نعوذ باللہ)۔ یہ آیتِ قرآنی واضح طور پر ان حضرات سے اللہ کی رضا مندی کا اعلان کرتے ہوئے اس باطل خیال کی جڑ سے تردید کر رہی ہے کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما اور دیگر بہت سے صحابہ نے دلوں میں منافقت پال رکھی تھی۔ اللہ نے اس آیت میں بتا دیا کہ ان کے دلوں کا حال اللہ کو معلوم تھا اور اس حال کو دیکھتے ہوئے اللہ ان سے راضی تھا۔ اگر ان کے دلوں میں نعوذ باللہ نفاق تھا تو کیا اللہ ان کی منافقت پر راضی تھا؟ کیا کوئی مؤمن ایسا سوچ سکتا ہے؟

نوٹ (۲) صلح حدیبیہ کا واقعہ ہلکی گرمی کے موسم (وسطِ مارچ تا وسطِ اپریل) کا ہے۔ حدیبیہ میں پڑاؤ کے فوراً بعد صحابہ کو پانی کی قلت کے باعث پریشانی ہوئی تو معجزۂ نبوی سے تھوڑا پانی سب کو کافی ہو گیا۔ (صحیح البخاری، ح: ۲۷۳۱، کتاب الجہاد، باب الشروط ؛ مسند احمد، ح: ۱۸۹۰۶)

قریش مصالحت پر آمادہ:

مسلمانوں کے اس ولولے کا قریش پر ایسا اثر پڑا کہ وہ مرعوب ہو گئے۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو آزاد کر دیا۔ وہ سمجھ گئے کہ جزیرۃ العرب میں اب مسلمان ایک ایسی طاقت ہیں جس سے ٹکرانا، دیوار سے سر پھوڑنے کے مترادف ہے۔ انہیں اپنی اقتصادی کمزوری کا بھی اندازہ تھا جس کا سبب شام اور عراق کے تجارتی راستوں پر مسلمانوں کے پے در پے چھاپے تھے۔ وہ گزشتہ جنگوں میں اپنے مسلسل جانی نقصانات کے باعث پیدا شدہ عسکری کمزوری کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، اس لیے انہوں نے بادلِ نخواستہ مذاکرات اور معاہدوں ہی کے ذریعے مسلمانوں کی قوت کو کم کرنے اور اپنی توانائی کو محفوظ اور فزوں تر بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ قدم اٹھاتے ہوئے انہیں پہلی بار ''ریاست مدینہ'' کو ایک طاقتور حکومت کے طور پر تسلیم کرنا پڑ رہا تھا مگر یہ کڑوی گولی نگلے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر کچھ شقیں طے کیں اور سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیا۔[1]

صلح کی شرائط اور ان کا تجزیہ:

صلح نامے کی اکثر شقیں بظاہر قریش کے حق میں تھیں اور مسلمانوں کو ان سے زک پہنچنے کا خدشہ تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی شرائط پر پوری گہرائی کے ساتھ غور کیا اور آپ کی غیر معمولی بصیرت نے فیصلہ کیا کہ صلح نامے کی جن شرائط کو قریش اپنے لیے بہت زیادہ مفید سمجھ رہے ہیں، وہ حقیقت میں ان کے لیے اتنی مفید نہیں اور جو شرائط بظاہر مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت لگ رہی ہیں، وہ حقیقت کے اعتبار سے اسلام اور ریاست مدینہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ ہاں کچھ مسلمانوں کو انفرادی طور پر امتحان اور آزمائش کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری اُمید تھی کہ مسلمان اسے جھیل لیں گے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قریش مجھ سے کسی بھی ایسی چیز کا مطالبہ کریں جس میں وہ اللہ کی حُرمتوں کا لحاظ رکھیں تو میں اسے قبول کر لوں گا۔''[2] چنانچہ بات چیت میں ۲ شقیں طے پا گئیں۔

❶ صلح نامے کی پہلی شق یہ تھی کہ دس سال تک جنگ بندی رہے گی۔ اس شق کے ذریعے قریش، مکہ پر مسلمانوں کے ممکنہ حملے کے خطرے کو دور کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر حملہ ہوا تو کوئی بعید نہیں مسلمان غالب آ جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول فرما لیا، کیوں کہ سرزمین عرب میں امن وامان کی فضا قائم ہونے سے اسلام کی تبلیغ کی راہیں کھل جاتیں اور لوگوں کو مدینے کا اسلامی معاشرہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا۔[3]

❷ دوسری شق یہ تھی کہ مسلمان اس سال یونہی واپس چلے جائیں گے، اگلے سال آ کر عمرہ کریں گے۔ اس طرح سے قریش یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اب بھی غالب وہی ہیں، انہی کی ناک اونچی ہے اور مسلمان مغلوب ہیں۔[4]

① صحیح البخاری، ح: ۲۷۳۱، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد
② صحیح البخاری، ح: ۲۷۳۱
③ سیرة ابن هشام: ۲/ ۳۱۷
④ صحیح البخاری، ح: ۲۷۳۱، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد

یہ شق مسلمانوں کے لیے بڑی سخت تھی؛ کیوں کہ وہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے تڑپ رہے تھے اور قریش سے اس وقت کش مکش اسی موضوع پر چل رہی تھی۔ یہ شرط ماننا اعترافِ شکست کے مترادف تھا، مگر رسول اللہ ﷺ نے وقتی طور پر قریش کو برتری کا جھوٹا بھرم قائم رکھنے دیا؛ کیوں کہ آپ جانتے تھے اس طرح زمینی حقائق تبدیل نہیں ہو جائیں گے اور قریش حقیقت میں اس طرح کوئی قوت حاصل نہیں کریں گے۔ اس لیے آپ ﷺ نے اس سال واپسی اور اگلے سال عمرے کی شق قبول کر لی۔

مگر قریش کو خدشہ تھا کہ اگلے سال جب حضور ﷺ مکہ تشریف لائیں گے تو ممکن ہے وہ مکہ میں طویل قیام کریں، یا اسلحے کے زور پر شہر کو قبضے میں لے لیں اور ایسا نہ ہوا تو یہ خطرہ بہرحال ہے کہ مکہ کے عاجز اور لاچار مسلمان اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ مدینہ چلے جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے شق ❷ کے ساتھ کچھ ذیلی دفعات پر اصرار کیا جو یہ تھیں:

(الف) اگلے سال عمرے کے موقع پر مکہ میں مسلمانوں کا قیام فقط تین دن رہے گا۔

(ب) مسلمان میان میں بند تلواروں کے علاوہ کوئی اسلحہ ساتھ نہیں رکھیں گے۔

(ج) مسلمان کسی مکہ کے باشندے کو ساتھ نہیں لے جائیں گے۔

(د) اگر مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہنا چاہے تو اسے منع نہیں کریں گے۔

حضور ﷺ نے اسے بھی قبول فرما لیا۔[1]

❸ تیسری شق یہ تھی کہ اگر اہلِ مکہ کا کوئی فرد مسلمان ہو کر حضور ﷺ سے جا ملا تو اسے واپس بھیج دیا جائے گا۔[2] اس طرح قریش اپنے نوجوانوں کے اسلام میں داخل ہونے کا راستہ بند کرنا چاہتے تھے تاکہ رسول اللہ ﷺ کے حامیوں میں اضافہ نہ ہو۔

یہ شق مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت تھی کہ وہ اپنے کسی ایسے مسلمان بھائی کو جو ہجرت کر کے مدینہ آئے، واپس قریش کے چنگل میں دے دیں۔ مگر حضور ﷺ نے طبعی طور پر سخت گراں محسوس کرتے ہوئے بھی یہ بات مان لی۔ صحابہ کرام کو اس پر غمگین دیکھ کر آپ ﷺ نے انہیں تسلی دی کہ ایسے لوگوں کے لیے اللہ جلد ہی کوئی راستہ نکالے گا۔ آپ جانتے تھے اس شرط کی پیروی سے اسلام اور ریاست مدینہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ پھر اس شرط کی وجہ سے اگر قریش کے کچھ لوگوں کے اسلام لانے میں رکاوٹ پیدا ہوگی تو اس کے بدلے امن وامان کی وجہ سے درجنوں دیگر قبائل میں اسلام کی روشنی پھیلانے کے مواقع ملیں گے۔

---

① صحیح البخاری، ح: ۴۲۵۱، کتاب المغازی ؛ ح: ۲۶۹۹، کتاب الصلح ؛ صحیح البخاری، ح: ۴۲۵۱، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء
ان ذیلی دفعات میں سے "دفعہ: د" شاید قریش نے یہ سوچ کر بڑھائی تھی کہ مسلمانوں میں کچھ لوگ اتنی طویل جلاوطنی سے تنگ آ کر گھر واپس آنا چاہتے ہوں گے اور ان کے مکہ میں رہنے سے مسلمانوں کی طاقت تقسیم ہو جائے گی۔ تاہم حضور ﷺ کے ساتھ آنے والوں میں کوئی نہ تھا جو حضور ﷺ کے بغیر مکہ میں رہنا چاہتا ہو۔ آئندہ بھی نہ کبھی کسی مسلمان نے ایسا کیا نہ ہی اس کی خواہش ظاہر کی۔

② صحیح البخاری، ح: ۲۷۳۱، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد

رسول اللہ ﷺ کی نگاہ اس پہلو پر بھی تھی کہ عقیدہ کوئی ایسی چیز نہیں جو جبر وتشدد سے تبدیل کر دی جائے، وہ تو دل کا سودا ہے، اس لیے جو لوگ دل سے ایمان لے آئیں گے قریش کی پکڑ دھکڑ ان کے ایمان کو بدل نہیں سکے گی۔ ہاں ان کو ذاتی طور پر اذیتوں کا سامنا کرنا پڑے گا مگر ان کے بارے میں آپ کو امید تھی کہ وہ ان آزمائشوں سے سرخرو ہو کر نکلیں گے۔

❹ چوتھی شق یہ تھی کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ کر مکہ والوں سے آملا تو اسے واپس نہیں بھیجا جائے گا۔

اس شرط کے ذریعے قریش اپنے حامیوں میں اضافے کی راہ کھلی رکھنا چاہتے تھے۔ حضور ﷺ نے یہ سوچ کر اسے منظور فرمالیا کہ اگر کوئی بدبخت خود اسلام کا ساتھ چھوڑنا چاہے تو اس کا چلے جانا ہی بہتر ہوگا۔[1]

❺ پانچویں شق یہ تھی کہ فریقین ایک دوسرے کے خلاف خفیہ کارروائیوں اور خیانت سے اجتناب کریں گے۔

❻ چھٹی شق یہ تھی کہ دیگر قبائل میں سے جو چاہے قریش کا حلیف بن کر اور جو چاہے مسلمانوں کا حلیف بن کر اس معاہدے میں شامل ہو سکتا ہے۔[2]

یہ ایک منصفانہ بات تھی جو مسلمانوں کے لیے مفید تھی؛ کیوں کہ اس طرح انہیں نئے اتحادی میسر آسکتے تھے اور پورے عرب میں امن وامان کی فضا قائم ہو سکتی تھی۔ اس شق کے تحت موقع پر موجود بنوخزاعہ حضور ﷺ کے اور بنوبکر قریش کے حلیف بن کر اس معاہدے میں شامل ہو گئے۔[3]

سب سے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے اس شق کا اضافہ کرایا:

''ہمارے وہی حقوق تمہارے ذمے ہوں گے جو تمہارے ہمارے ذمے ہوں گے۔''[4]

مشرکین بھی اس قدر معقول بات پر کوئی اعتراض نہ کر سکے۔ اس شق کے ذریعے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کی برابر حیثیت کو تسلیم کرالیا۔

صلح نامہ تحریر کرنے میں قریش کے اعتراضات اور حضور ﷺ کی انتہائی رواداری:

اس مجلسِ معاہدہ میں قریش کا رویہ شدید ضد، پریشانی اور بے دلی کا عکاس تھا جبکہ رسول اللہ ﷺ حددرجے رواداری، عالی حوصلگی اور فراست کے ساتھ معاہدے کو کامیاب بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ معاہدے کی شرائط لکھوانے کے لیے حضور ﷺ نے اپنی طرف سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کاتب مقرر کیا تھا۔[5] انہوں نے اسلامی آداب

---

[1] سیرۃ ابن ھشام: ۳۱۷/۲

[2] سیرۃ ابن ھشام: ۳۱۷/۲

[3] سیرۃ ابن ھشام: ۳۱۸/۲

[4] طبقات ابن سعد: ۱۰۱/۲

[5] صحیح مسلم، ح: ۴۶۳۱، کتاب الجھاد، باب صلح الحدیبیة

آداب کے عین مطابق دستاویز کی ابتداء ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ '' سے کی۔ اس پر کفار نے اعتراض کیا اور کہا: ''ہم اللہ کو جانتے ہیں، رحمان ورحیم کو نہیں۔ یہاں ''بِاسْمِکَ اللّٰهُمَّ'' لکھو۔''

حضور ﷺ نے ان کی بات قبول کر کے یہی لکھوا دیا۔ ①

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لکھا: ''یہ وہ دستاویز ہے جس کا محمد رسول اللہ نے عہد کیا ہے۔''

یہ عبارت دیکھتے ہی رؤسائے قریش نے شور مچا دیا: ''ہم اگر آپ کو اللہ کا رسول مانتے تو بھلا کسی بات سے کیوں روکتے۔ آپ (ہمارے نزدیک فقط) محمد بن عبداللہ ہیں۔ آپ محمد بن عبداللہ ہی لکھوائیے۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''میں محمد رسول اللہ بھی ہوں۔ میں محمد بن عبداللہ بھی ہوں۔ اگر چہ تم نے مجھ جھٹلایا۔'' ②

پھر آپ ﷺ نے تنازعہ ختم کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اچھا! اسے مٹا دو۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے نام مبارک مٹانے سے خود کو مٹا دینا آسان تھا۔ عرض کیا: ''نہیں، اللہ کی قسم! آپ کا اسم گرامی میں کبھی نہیں مٹاؤں گا۔'' آخر حضور ﷺ نے خود قلم لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ''مجھے وہ جگہ دکھاؤ (جہاں رسول اللہ لکھا ہے۔) انہوں نے وہ مقام دکھایا۔ حضور ﷺ نے اسے مٹا دیا۔ اگر چہ آپ کو کتابت میں مہارت نہ تھی مگر آپ نے اپنے دستِ مبارک سے اس کی جگہ ''بن عبداللہ'' تحریر فرما دیا۔ ③

حوصلے اور اطاعت کا ایک شدید امتحان:

ابھی صلح نامے پر دستخط نہیں ہوئے تھے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا جو مسلمانوں کی ہمت، حوصلے اور اطاعتِ رسول کا سخت ترین امتحان تھا۔ ہوا یہ کہ قریش کے سفیر سہیل بن عمرو کے نوجوان بیٹے ابو جندل نے مکہ میں اسلام قبول کر لیا تھا، انہیں اس کی پاداش میں زنجیروں میں جکڑ کر رکھا گیا تھا مگر وہ حضور اکرم ﷺ کی مکہ کے قریب تشریف آوری کا سن کر کسی طرح بھاگ نکلے اور اس حال میں آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچے کہ پیروں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔

سہیل بن عمرو نے دیکھا تو کہا کہ معاہدے کے مطابق اسے واپس کیا جائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

''ابھی صلح نامہ پر دستخط نہیں ہوئے۔'' مگر سہیل بن عمرو نے بیٹے کی واپسی پر اصرار کیا۔

آخر حضور ﷺ نے انہیں واپس جانے کا حکم دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا تو بے چین ہو کر بولے:

''یا رسول اللہ! کیا ہم حق پر اور ہمارا دشمن باطل پر نہیں؟ پھر کیوں ہم اپنے دین کے معاملے میں سرنیچا کریں؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عمر! اللہ میرا مددگار ہے۔''

وہ بولے: ''کیا آپ نے نہیں فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ کا طواف کریں گے۔''

---

① طبقات ابن سعد: ۱۰۱/۲

② صحیح مسلم، ح: ۴۷۳۱، کتاب الجهاد، باب صلح الحديبية ؛ صحيح البخاری، ح: ۴۲۵۱، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء

③ صحیح مسلم، ح: ۴۷۳۱، کتاب الجهاد، باب صلح الحديبية ؛ صحيح البخاری، ح: ۴۲۵۱، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہاں! مگر میں نے یہ کب کہا تھا کہ اس سال کریں گے۔"①

آخر رسول اللہ ﷺ نے ابوجندل رضی اللہ عنہ کو تسلی دے کر رخصت کیا۔ صلح نامہ پر دستخط ہو گئے۔ آپ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ اپنے جانوروں کو قربان کر کے اور سر منڈوا کر احرام کھول دیں۔② ۲۹ ذوالحجہ کو آپ مدینہ واپس پہنچ گئے۔③

ابوبصیر رضی اللہ عنہ کی کارروائیاں:

رسول اللہ ﷺ کو مدینہ منورہ واپس تشریف لائے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ مکہ سے ایک مسلمان ابوبصیر رضی اللہ عنہ کفار کی قید سے فرار ہو کر آپ کی خدمت میں آ گئے۔ قریش نے دو سفیر بھیج کر معاہدے کے مطابق ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے انہیں واپس بھیج دیا۔ وہ آپ کے فرمان کے مطابق قریش کے سفیروں کے ساتھ چل پڑے مگر راستے میں موقع پا کر ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور بھاگ کر پھر حضور ﷺ کی خدمت میں آ گئے اور عرض کیا:

"آپ نے تو معاہدے کے مطابق مجھے ان کے ساتھ بھیج کر اپنی ذمہ داری ادا فرما دی، پھر اللہ نے مجھے ان سے بچا لیا۔"

مگر حضور ﷺ کے پاس ان کا رہنا اب بھی معاہدے کی خلاف ورزی کے زمرے میں آتا۔ لہٰذا آپ نے فرمایا:

"اگر اس (ابوبصیر) کے ساتھ اور لوگ ہوتے تو یہ جنگ کی آگ بھڑکا دیتا۔"

وہ سمجھ گئے کہ ان کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں اور اگر قریش کی طرف سے انہیں گرفتار کرنے کوئی دوسرا وفد آیا تو انہیں واپس مکہ بھیج دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ فی الفور مدینہ سے نکل گئے اور سمندر کے کنارے "سیف البحر" کے مقام پر قریش کے قافلے کی راہ میں الگ تھلگ رہنے لگے۔

کچھ دنوں بعد ابوجندل رضی اللہ عنہ بھی مکہ سے فرار ہو کر ان کے پاس آ گئے۔ رفتہ رفتہ قریش کے مظالم سے تنگ آنے والے درجنوں نوجوان بھاگ بھاگ کر یہیں جمع ہو گئے اور ان کی تعداد ۷۰ تک پہنچ گئی۔ یہ نوجوان ایک آزاد قوت بن کر قریش کے ہر آتے جاتے تجارتی کارواں پر چھاپے مارنے لگے۔ ان کے حملے اس تسلسل سے ہو رہے تھے کہ قریش کی شام

① صحیح البخاری، ح: ۲۷۳۱، کتاب الشروط؛ سیرۃ ابن ھشام: ۳۱۸/۲، ۳۱۹

② سیرۃ ابن ھشام: ۳۱۹/۲

③ ثم غزوۃ حدیبیۃ خرج ﷺ یوم الخمیس غرۃ ذی القعدۃ..... ورجع سلخ ذی الحجۃ. (المحبر، ص ۱۱۵) یہاں یہ یاد رہے کہ یہ ذوالقعدہ مدنی تھا نہ کہ مکی۔ اگر مکی ہوتا تو یہ موسم حج کا زمانہ ہوتا جس میں مشرکین عمرہ کرنا ممنوع سمجھتے تھے بلکہ اسے سب سے بڑا گناہ تصور کرتے تھے۔

عن ابن عباس قال: کانوا یرون ان العمرۃ فی اشھر الحج من افجر الفجور. (صحیح البخاری، ح: ۱۵۶۴، باب التمتع والقران)

عربوں کے اس قدیم دستور کو مسلمان بھی اس قدر مانتے تھے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو عمرے کا احرام باندھنے کا حکم دیا تو انہیں بھی یہ بات شاق گزری۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں تاکید کے ساتھ بتایا کہ اب یہ حلال ہو گیا ہے۔ فامرھم ان یجعلوھا عمرۃ فتعاظموا ذالک عندھم فقالوا یا رسول اللہ ای الحل؟ قال: حلّ کلہ. (صحیح البخاری، ح: ۱۵۶۴، باب التمتع والقران)

پس حضور ﷺ کا اس ماہ میں عمرے پر اصرار کرنا تو مشرکین کو مزید برہم کرنے بلکہ جنگ چھیڑنے کا باعث ہوتا جبکہ آپ ﷺ پُرامن طور پر عمرے کے لیے گئے تھے۔ پس بلاشبہ یہ مکی نہیں مدنی تقویم کا ذوالقعدہ تھا۔

رہی یہ بات کہ پھر مشرکین اس ماہ کو شہرِ حرام کیوں مان رہے تھے؟ تو اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ مدنی ذوالقعدہ مکی تقویم کے رجب کے بالمقابل آ رہا تھا، جو شہر حرام ہی تھا۔ بلکہ اس مہینے مکہ میں عازمینِ عمرہ کی کثرت ہوتی تھی جس کے باعث اس موقع کو "حج اصغر" کہا جاتا تھا۔ والعمرۃ ھی بمثابۃ "الحج الاصغر" فی الاسلام وکان اھل الجاھلیۃ یقومون بادائھا فی شھر رجب. (المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام: ۳۹۱/۱۱)

کی تجارت جو پہلے ہی کمزور ہو چکی تھی، تقریباً بند ہو گئی۔ آخر کار قریش نے تنگ آکر خود ہی حضور ﷺ سے درخواست کی کہ صلح نامہ سے وہ شق حذف کر دی جائے جس کے تحت مکہ سے آپ کے پاس آنے والوں کو واپس کرنا ضروری ہے۔ اب جو بھی آپ کے پاس آئے گا، وہ مامون سمجھا جائے گا۔ اس طرح ابو جندل رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کو جو ساحل پر مورچہ بنائے ہوئے تھے، حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آنے کا موقع مل گیا، البتہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ اس سے پہلے وفات پا گئے۔ ①

ابو بصیر رضی اللہ عنہ کی مہمات پر دکتور اکرم ضیاء العمری کا محققانہ تبصرہ:

ابو بصیر کی یہ مہم اسلامی تاریخ کا ایک منفرد تجربہ تھی جس نے حالات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ عصرِ حاضر کے نامور محقق جناب دکتور اکرم ضیاء العمری اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے ایمان کی خاطر بے انتہا تکالیف سہیں، لیکن انہوں نے انتہائی استقامت، خلوصِ نیت اور اولوالعزمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جدوجہد اس وقت تک جاری رکھی جب تک مشرکین کا سر نیچا نہ کر دیا۔ وہ مسلمانوں سے اس سخت شرط کو ہٹانے کا ذریعہ بن گئے جو مشرکین نے صلحِ حدیبیہ میں ان پر عائد کی تھی۔ یہ واقعہ ایمان سے وابستگی اور اس کے لیے جدوجہد کی ایک روشن مثال ہے۔ اس واقعے سے یہ اصول بھی اخذ ہوتا ہے کہ کبھی فردِ واحد وہ کام کر جاتا ہے جو پورا معاشرہ نہیں کر سکتا۔

ابو بصیر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء نے مشرکین کو ایسے وقت میں زک پہنچائی جب اسلامی مملکت ایسا کرنے سے قاصر تھی؛ کیوں کہ مسلمان مشرکین سے صلح اور امن کی شرائط طے کر چکے تھے۔ حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء چاہے بظاہر ہی سہی مگر ریاستِ مدینہ کی عمل داری سے باہر تھے۔ تاہم انہوں نے اور ان کے ساتھ مکہ کے مظلوم مسلمان ساتھیوں نے یہ تمام کارروائیاں محض ایسے اجتہاد سے نہیں کی تھیں جس میں حضور ﷺ کی رضا شامل نہ ہو۔ اگر رسول اللہ ﷺ چاہتے تو شروع ہی میں ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو قریشی قافلوں پر حملوں سے منع کر دیتے یا مکہ واپس جانے کا حکم دے دیتے۔ لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہ کیا جو آپ ﷺ کی رضامندی کی علامت تھی۔

حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء نے جو کیا، وہ یقیناً عقل مندی تھی۔ انہوں نے مکہ میں رہ کر مظالم برداشت کرتے رہنا بھی گوارا نہ کیا اور نہ ہی یہ گوارا کیا کہ انہیں ان کے دین سے ہٹانے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ انہوں نے ایک ایسی تدبیر اختیار کی جس سے نہ صرف انہیں اہلِ مکہ کے ظلم و ستم سے نجات مل گئی بلکہ ان کارروائیوں سے مملکتِ مدینہ کو بھی مدد ملی؛ کیوں کہ ان کارروائیوں سے قریش کی معیشت کو نقصان پہنچا۔ ان کارروائیوں کا ایک نفع یہ بھی سامنے آیا کہ صلح کے دور میں بھی قریش کو اپنے تحفظ کا خدشہ لگا رہا۔ یہ بھی کہا جا سکتا

① صحیح البخاری، ح: ۲۷۳۱، کتاب الجهاد، باب الشروط فی الجهاد؛ اسد الغابة، تر: ابو بصیر رضی اللہ عنہ، ابو جندل رضی اللہ عنہ؛ الکامل فی التاریخ: ۸۲/۲

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو بصیر رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کی بالواسطہ حوصلہ افزائی کی؛ کیوں کہ آپ نے فرمایا تھا:
"اگر ابو بصیر کے ساتھ اور لوگ بھی ہوتے تو یہ جنگ کی آگ بھڑکا دیتا۔"[1]

صلح کے اثرات:

"صلح حدیبیہ" سے حضور اکرم ﷺ کا وہ ارمان پورا ہو گیا، جس کا اظہار آپ نے حدیبیہ پر پڑاؤ ڈالتے وقت ان الفاظ میں کیا تھا: "قریش پر افسوس ہے، انہیں جنگوں نے نگل لیا۔ ان کا کیا بگڑ جائے گا اگر وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور باقی عربوں کو ان کے حال پر۔ پھر اگر دوسرے عرب قبائل مجھ پر غالب آ جائیں تو قریش کا مقصد خود بخود پورا ہو جائے اور اگر اللہ نے مجھے غالب کر دیا تو قریش جوق در جوق اسلام میں داخل ہو جائیں۔"[2]

خالد بن ولید اور عمرو بن العاص مشرف بہ اسلام ہوئے:

حضور ﷺ کی توقعات پوری ہونے کے آثار بہت جلد ظاہر ہوئے۔ خود قریش کے بڑے بڑے شریف اور باصلاحیت لوگوں کے دلوں میں اسلام گھر کرنے لگا۔ جب قریش نے حضور اقدس ﷺ سے خود درخواست کر کے صلح نامے سے مکّہ کے نئے مسلمانوں کو مدینہ منورہ سے جبراً واپس بھیجنے کی شق منسوخ کرائی تو اس کے کچھ ہی دنوں بعد قریش کے تین معزز اور قابل جوان حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔

ان میں سے ایک خالد بن ولید تھے جن سے بڑا شہسوار اور مرد میدان مکّہ میں کوئی نہ تھا۔ دوسرے عَمرو بن العاص تھے جن کی دانائی اور ذہانت سے سب واقف تھے۔ تیسرے عثمان بن طلحہ تھے، جن کا خاندان خانہ کعبہ کا کلید بردار تھا۔
جب یہ تینوں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا:

"رَمَتكُم مَكةُ بِأفلاذِ كَبِدِهَا"

(مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے تہمارے حوالے کر دیے۔)[3]

☆☆☆

---

[1] السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ: ۲/ ۴۵۱، ۴۵۲

فائدہ: روایت میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ یہ ہیں: " ویل امه مُسَعِرُ حرب لو کان له احد." مگر یہاں "ویل" سے بددعا نہیں مدح مراد ہے۔ علامہ ابن عبدالبر لکھتے ہیں: وھو کما یقال للشاعر اذا اجاد قاتله اللّٰه...... ومنه قوله "ویل امه مسعر حرب"وھو یرید مدحه. (التمھید لما فی المؤطا: ۸/ ۳۴۰)

حافظ ابن حجر، امام خطابی کے حوالے سے لکھتے ہیں: کانه یصفه بالاقدام فی الحرب والتسعیر لنارھا. "

پھر حافظ ابن حجر اس حدیث کے فوائد پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "وفیه اشارۃ الیه بالفرار لئلا یردہ الی المشرکین ورمز الیٰ من بلغه ذالک من المسلمین ان یلحقوا به. قال جمھور العلماء من الشافعیة وغیرھم: یجوزا لتعریض بذالک لا التصریح." (فتح الباری: ۵/ ۳۵۰)

[2] مسند احمد، ح: ۱۸۹۱۰؛ الکامل فی التاریخ: ۲/ ۸۲

[3] اسد الغابة، تر: خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ؛ جامع الاصول فی احادیث الرسول لابن البر الجزری: ۱۲/ ۵۹۷

اقدامی جہاد کا آغاز

صلح حدیبیہ کے فوراً بعد حضور اکرم ﷺ نے جہاد اور اسلامی سیاست کے ایک اور عظیم مرحلے کی داغ بیل ڈالی اور پہلی بار مدینہ سے باہر منظم فوج کشی کی۔ اب تک کی اکثر جنگیں یا تو دفاعی تھیں جیسے غزوۂ اُحد اور غزوۂ خندق یا ان کی حیثیت دشمن کے علاقوں، قافلوں اور رسد وغیرہ پر چھاپے مارنے کی سی تھی۔ اب تک مسلمانوں نے اپنے علاقے سے نکل کر باقاعدہ کسی اور شہر یا علاقے پر قبضہ نہیں کیا تھا۔ بنونضیر، بنوقَینُقاع اور بنوقُریظہ کی جنگوں میں اگرچہ قلعے چھینے گئے تھے مگر یہ سب مدینہ کے اندرونی محاذ تھے۔ ایسی جنگ جس میں فوج کشی کر کے دشمن کے علاقوں پر قبضہ کیا جائے، پہلی بار غزوۂ خیبر میں ہوئی جو صلح حدیبیہ کے دو ماہ بعد محرم سن ۷ ہجری میں پیش آیا۔ اسی کو ''اقدامی جہاد'' کہا جاتا ہے اور ''دفاعی جہاد'' کی طرح یہ بھی جہاد کی ایک اہم قسم ہے۔

خیبر: یہود کی سازشوں کا مرکز:

خیبر کسی ایک قلعے کا نام نہیں بلکہ یہ مدینہ کے شمال میں نوے میل (۱۴۴ کلومیٹر) دور یہودیوں کی درجنوں آبادیوں، چھوٹے بڑے دس قلعوں اور باغات پر مشتمل ایک وسیع وعریض علاقہ تھا۔ قلعوں میں سے سات ایک دائرے میں تھے اور تین الگ الگ۔ یہاں کے یہودی زراعت پیشہ اور بڑے خوشحال تھے۔ وہ لڑنے بھڑنے میں طاق تھے اور ریاست مدینہ کے خلاف نت نئی سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔ مدینہ سے جلاوطن ہونے والے بنونضیر اور بنوقَینُقاع کے بہت سے فسادی لوگ بھی یہاں آ کر ان سازشوں میں شریک ہو گئے تھے۔ اس طرح خیبر جزیرۃ العرب میں یہودیوں کی طاقت کا سب سے بڑا مرکز بن گیا، جس کے قلعوں میں بیس ہزار مسلح افراد موجود تھے۔

غزوۂ خندق میں اتحادیوں کو مدینہ پر حملے کے لیے ابھارنے والے یہی یہودی تھے۔ بنونضیر کے سردار حُیَیّ بن اَخطب کے قتل کے بعد سَلّام بن ابی الحُقَیق (ابورافع عبداللہ) یہود کا سربراہ مقرر ہوا تو اس نے خیبر کو مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا مرکز بنا لیا، وہ اسلام کے خلاف زہر اگلتا اور مختلف قبیلوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارتا رہا۔ آخر حضور ﷺ نے عبداللہ بن عَتِیک انصاری رضی اللہ عنہ کو خفیہ مہم پر خیبر بھیج کر اس فتنہ پرور سردار کو قتل کرا دیا۔[1]

غزوۂ خیبر کی تمہیدات: یسیر بن رِزام کا قتل:

اب ''یسیر بن رِزام'' خیبر کا سردار بنا اور وہ بھی سَلّام بن ابی الحُقَیق کی طرح غطفان کی مدد سے مدینہ منورہ پر

[1] تاریخ الطبری: ۴۹۰/۳ تا ۴۹۳

چڑھائی کی تیاری کرنے لگا۔ حضور ﷺ نے شوال ۶ ھ میں عبداللہ بن اُنیس اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہما کو خیبر بھیج کر یسیر بن رزام کو پیش کش کی کہ وہ مدینہ آ کر صلح کے مذاکرات کر لے، اس کی حکومت تسلیم کر لی جائے گی۔ ①

یسیر بن رزام اس پیش کش میں دل چسپی لے کر کچھ ساتھیوں کے ساتھ مدینہ روانہ ہوا، آپ ﷺ کے سفارتی وفد کے افراد بھی اس کے ساتھ تھے، مگر دونوں طرف سے خدشات کی فضا برابر قائم تھی، جس کی وجہ سے راستے ہی میں یسیر بن رزام نے عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کو نہتا کرنے کی کوشش کی۔ اس پر بات بڑھ گئی اور کشت وخون میں خود یسیر بن رزام مارا گیا۔ ② اس واقعے کے بعد ریاستِ مدینہ اور خیبر کے مابین تعلقات نہایت کشیدہ ہو گئے۔

غزوۂ ذی قَرَد۔ ایک کم عمر صحابی کی جرأت وشجاعت کا تاریخی واقعہ:

انہی دنوں بنو فزارہ کے چھاپہ ماروں نے مدینہ کی چراگاہ غابہ (ذی قَرَد) پر حملہ کر کے مویشی لوٹے اور ان کے نگران کو قتل کر دیا۔ یہ سب رات کے آخری حصے میں ہوا۔ ایک کم عمر صحابی سَلَمہ بن اَکْوَع رضی اللہ عنہ اس دن فجر سے قبل تیر کمان لیے گھوڑے پر سوار غابہ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ انہیں کسی نے لوٹ مار کی اطلاع دی تو فوراً ایک پہاڑی پر چڑھ کر آواز لگائی: ''ڈاکہ! ڈاکہ!'' یہ اعلان کر کے وہ اکیلے ان لٹیروں کے پیچھے دوڑے۔ ان کی تیز دوڑ ضرب المثل تھی ③ اور نشانہ بازی قابلِ رشک۔ جلد ہی وہ دشمنوں کے قریب پہنچ کر ان پر تیر برسانے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ یہ نعرہ لگا رہے تھے:

''اَنَا ابْنُ الْاَکْوَعْ ..... اَلْیَوْمَ یَوْمُ الرُّضَّعْ'' (میں ہوں ابن اَکْوَع، آج تمہیں چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔)

حضرت سَلَمہ رضی اللہ عنہ کا نشانہ بے خطا تھا، جسے لگتا وہ زخمی یا ہلاک ہو کر گر پڑتا۔ پہلے تو لٹیرے یہ سمجھتے رہے کہ تعاقب کرنے والے کئی ہیں، اس لئے وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے رہے، مگر بعد میں ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک اکیلا لڑکا ہے جو ہمیں پریشان کئے ہوئے ہے۔ اب لٹیروں نے پلٹ کر حملہ کرنے اور انہیں پکڑنے کی کوشش شروع کی مگر جوں ہی کوئی گھوڑا موڑ کر ان کی طرف آتا، یہ کسی درخت یا پتھر کے پیچھے چھپ کر تیر چلاتے اور اس کے گھوڑے کو زخمی کر دیتے، وہ اپنی جان بچانے کے لئے واپس بھاگ جاتا۔ حضرت سَلَمہ رضی اللہ عنہ کے تعاقب سے لٹیرے اتنے بدحواس ہوئے کہ لوٹی ہوئی اونٹنیوں کے علاوہ سامانِ سفر اور زائد ہتھیاروں کا بوجھ بھی پھینک کر بھاگتے چلے گئے۔ سَلَمہ رضی اللہ عنہ اس پھینکے ہوئے مال پر کوئی نشان لگا کر آگے بڑھتے رہے تا کہ پیچھے آنے والے مسلمان اسے مالِ غنیمت سمجھ کر سنبھال لیں۔

آگے چل کر میدانی علاقہ ختم ہو گیا اور پہاڑی گھاٹیاں شروع ہو گئیں۔ لٹیرے نشیبی راستوں میں تھے اور سَلَمہ رضی اللہ عنہ بلندی پر بھاگتے ہوئے ان پر بڑے بڑے پتھر لڑھکاتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد لٹیروں کو ایک اور جماعت مدد کے لئے مل گئی، اب ان کی جان میں جان آئی۔ اور انہوں نے اس تنہا مجاہد کو پکڑنے کی کوشش کی۔ سلمہ رضی اللہ عنہ ایک پہاڑی پر چڑھ گئے اور للکار کر کہا: ''میں ابن اَکْوَع ہوں، حضرت محمد ﷺ کو عزت بخشنے والی ذات کی قسم! تم میں سے کوئی مجھے

① سبل الهدیٰ والرشاد: ۱۱۱/۶ ② البدایة والنهایة: ۲۵۹/۶ ؛ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۷۷

③ ان کے صاحبزادے ایاس کہتے تھے: کان ابی یسبق الفرس شدًا. ''میرے والد دوڑ میں گھوڑے پر فائق تھے۔'' (مسند احمد، ح: ۱۶۵۳۱ بسند صحیح)

پکڑ نہیں سکتا اور میں جس کو چاہوں پکڑ سکتا ہوں۔‘‘

وہ لوگ گھبرا گئے، حضرت سَلَمہ رضی اللہ عنہ نے ان کو باتوں میں لگائے رکھا، تاکہ مدینہ سے مسلمانوں کی مدد آ جائے۔

کچھ دیر بعد دور سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک گھڑ سوار دستہ آتا دکھائی دیا۔ ان کے میدان میں پہنچتے ہی لڑائی شروع ہوگئی، لٹیروں کا سردار مارا گیا، باقی بھاگ نکلے۔ حضرت سَلَمہ رضی اللہ عنہ ایک بار پھر ان کے پیچھے دوڑے اور دیر تک ان کا تعاقب کرتے رہے۔ بھاگنے والے لٹیرے پانی پینے ایک تالاب کے پاس رکے مگر جب حضرت سَلَمہ رضی اللہ عنہ کو آتے دیکھا تو خوف کے مارے پانی پیے بغیر بھاگ کھڑے ہوئے، ان میں سے ایک آدمی ذرا پیچھے رہ گیا، حضرت سَلَمہ بن اَکْوَع رضی اللہ عنہ نے تعاقب کرتے ہوئے ایک پہاڑ کی گھاٹی میں اس کو جالیا اور تیر چلاتے ہوئے نعرہ لگایا:

’’میں ہوں ابن اَکْوَع۔ آج دن ہے ذلیل لوگوں کی ہلاکت کا۔‘‘

تیر اس کے کاندھے سے پار ہوگیا اور وہ تکلیف سے چلاتے ہوئے بولا: ’’ارے! تو وہی صبح والا ابن اَکْوَع ہے؟‘‘

حضرت سَلَمہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ’’ہاں! اپنی جان کے دشمن! میں وہی صبح والا ابن اَکْوَع ہوں۔‘‘

شام ہو چکی تھی اس لیے حضرت سَلَمہ رضی اللہ عنہ ڈاکوؤں کے دو گھوڑے اپنے قبضے میں لئے ہوئے واپس روانہ ہوئے۔

راستے میں دیکھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود مزید صحابہ کے ساتھ تشریف لا چکے تھے۔ کافر جو اونٹنیاں، چادریں اور نیزے چھوڑ گئے تھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کو جمع کر لیا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ ایک اونٹنی ذبح کر کے اس کی کلیجی اور کوہان بھون رہے تھے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نوش فرمائیں۔ حضرت سَلَمہ رضی اللہ عنہ نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا: اللہ کے رسول! اگر ایک سو آدمی میرے ساتھ کر دیں تو میں دشمنوں کا تعاقب کر کے انہیں ختم کر دوں۔‘‘

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کم عمر جانثار کی جرأت اور ہمت پر اتنے خوش ہوئے کہ ہنس دیئے۔ پھر فرمایا: ’’اب مزید تعاقب مناسب نہیں۔ وہ لوگ اپنے قبائل میں پہنچ گئے ہیں۔‘‘ رات بھر آرام کر کے صبح کو جب مدینہ منورہ کی طرف واپسی ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سَلَمہ بن اَکْوَع رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ اپنی اونٹنی پر بٹھا لیا جوان کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔[1]

امام بخاری کے مطابق یہ معرکہ جسے غزوۂ ذی قَرَد کہا جاتا ہے، خیبر پر حملے سے تین دن پہلے لڑا گیا تھا۔[2]

---

① صحیح مسلم، ح: ۴۷۷۹، باب غزوۃ ذی قرد.

ملحوظہ: سَلَمہ بن اَکْوَع رضی اللہ عنہ کی وفات ۷۴ھ کی ہے۔ حافظ عبد البر رحمہ اللہ اور ابن اثیر الجزری ان کی عمر ۸۰ برس بتاتے ہیں۔ (الاصابۃ، اسد الغابۃ، تـ: سلمۃ بن الاکوع رضی اللہ عنہ) اس حساب سے ۷ھ میں غزوۂ ذی قرد کے وقت ان کی عمر ۱۳ سال بنتی ہے مگر اس سے کچھ دن پہلے صلح حدیبیہ ہوئی تھی جس میں ان کی شرکت ثابت ہے۔ (صحیح مسلم، ح: ۴۷۷۹) یہ ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی نابالغ کو اس سفر پر ساتھ نہیں لے گئے تھے، لہٰذا یقیناً ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے وقت وہ بالغ تھے۔ البتہ بھرپور جوان نہیں بلکہ عنفوانِ شباب میں ہوں گے؛ کیوں کہ خود صحیح بخاری میں جہاں ان کے غزوات شمار کیے گئے ہیں وہاں بدر، اُحُد اور خندق کا کوئی ذکر نہیں بلکہ حدیبیہ، خیبر اور حنین کا ذکر ہے۔ (صحیح البخاری، ح: ۴۲۷۳) اس سے صاف ظاہر ہے کہ حدیبیہ ان کا پہلا سفر تھا، یعنی وہ یقیناً بلوغت کی کم از کم عمر یعنی بارہ سال کو عبور کر چکے تھے، اگر بلوغت کو اوسط عمر میں مانا جائے تو صلح حدیبیہ میں ان کی عمر پندرہ سال ہو چکی ہوگی۔ غزوۂ ذی قرد صلح حدیبیہ کے کچھ ہی دنوں بعد پیش آیا تھا۔ اس لیے اس وقت ان کی عمر پندرہ سولہ سال ہوگی۔ پس ان کی انتہائے عمر اسی اور نوے کے درمیان بنتی ہے۔ غالباً اسی لیے حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے انہیں أبنائے تسعین (۹۰ برس کے افراد) میں شمار کیا ہے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۳/ ۱۳۱، ط الرسالۃ) واللہ اعلم

② صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ ذی قرد

غزوۂ خیبر (محرم ۷ھ)

حملہ آور قبیلے بنو فزارہ نے فرار ہو کر بنو غطفان کے پاس پناہ لی تھی جن کو یہود کی طرف سے مدینہ کے خلاف مسلسل بھڑکایا جا رہا تھا۔ یہ تمام قرائن اہل خیبر کے جرائم کو ثابت کر رہے تھے۔ آخر کار ان کی گوشمالی کے لیے نبی اکرم ﷺ نے محرم سن ۷ ہجری کے اواخر میں چودہ سو صحابہ کرام کے ساتھ خیبر کی طرف کوچ کر دیا۔ اس غزوہ میں حضور ﷺ نے انہی چودہ سو اصحاب کو چنا تھا جو حدیبیہ کے سفر میں ساتھ تھے۔[1]

یہودی اگرچہ گرد و پیش سے بہت چوکنا رہتے تھے مگر حضور ﷺ راتوں رات سفر کرتے ہوئے اتنی خاموشی سے وہاں جا پہنچے کہ انہیں کچھ پتا نہ چلا۔ آپ ﷺ نے صبح صادق کے وقت خیبر کے قلعوں کے سامنے پڑاؤ ڈالا۔[2] بے خبر یہودی معمول کے مطابق کھیتی باڑی کے اوزار تھامے اپنے باغوں کی طرف نکلے مگر جب لشکر پر نظر پڑی تو ٹھٹک گئے اور آناً فاناً سارا معاملہ سمجھ کر الٹے قدموں اپنے قلعے میں گھس گئے۔ بستی میں شور مچ گیا: "محمد لشکر لے کر آگئے۔"

حضور ﷺ نے انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر قلعوں کا محاصرہ شروع کر دیا۔ قلعے فتح کرنے والے صحابہ میں حضرت ابو بکر، حضرت عمر، محمد بن مَسلمہ، سعد بن عُبادہ اور حُباب بن المُنذر رضی اللہ عنہم قابل ذکر ہیں۔[3]

قَموص کی فتح اور مَرحَب کا قتل:

"قَموص" نامی قلعہ دو دن متواتر لڑائی کے باوجود سرنگوں نہ ہو سکا تھا۔ آخر کار آپ ﷺ نے رایت کا فرمایا:

"کل میں حملے کا پرچم اسے دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول کا محبوب ہوگا۔"[4]

---

① السیرة الحلبیة: ۴۵/۳، کچھ اور لوگ اگر ساتھ ہوئے تو انہیں پہلے ہی بتا دیا گیا کہ وہ غنیمت میں حصہ دار نہ ہوں گے۔ (السیرة الحلبیة: ۴۵/۳)

② واقدی نے غزوہ خیبر کی توقیت میں ایک جگہ صفر یا ربیع الاوّل ۷ ہجری کا قول نقل کیا ہے۔ (المغازی: ۶۳۴/۲) ابن سعد نے جمادی الاولیٰ ۷ ہجری کا قول نقل کیا ہے۔ (طبقات ابن سعد: ۱۰۶/۲) مولانا اسحاق علوی مرحوم کی رائے میں غزوہ خیبر حدیبیہ سے واپسی کے ۵ ماہ بعد جمادی الاولیٰ مدنی بمطابق محرم مکی میں ہوا تھا۔ مگر راقم کو اس بارے میں ان کے دلائل وزنی محسوس نہیں ہوئے۔ ابن اسحاق، خلیفہ بن خیاط، امام طبری اور ابن حبیب سمیت جمہور مؤرخین کا اتفاق ہے کہ غزوۂ خیبر صلح حدیبیہ سے واپسی کے تقریباً ایک ماہ بعد محرم ۷ ہجری میں ہوا۔ (سیرة ابن هشام: ۳۲۸/۲ ؛ تاریخ الطبری: ۹/۳) اور قرائن سے واضح ہے کہ یہ مدنی توقیت تھی۔ ابن حبیب یہ اضافی معلومات بھی دیتے ہیں کہ خیبر سے مدینہ واپسی یکم ربیع الآخر کو ہوئی۔ (المحبر، ص ۱۱۵)

③ البدایة والنهایة: ۲۶۰/۶ تا ۲۶۵، ط العلمیة

④ روایت میں رایۃ کا لفظ ہے جو اس چھوٹے پرچم کے لیے آتا تھا جو حملہ آور دستے کے سالار کے پاس ہو۔ اسے عَلَم بھی کہا جاتا تھا جسے عموماً نیزے پر باندھ دیا جاتا تھا۔ (العلم هو الرایة ،وقیل هو الذی یعقد علی الرمح. ایضاح شواہد الایضاح: ۳۰۸/۱) اگرچہ کبھی ضرورتاً سپہ سالار اعلیٰ خود بھی رایۃ لے کر اگلی صف میں لڑتا تھا جیسا کہ جنگِ مؤتہ میں تین سپہ سالار رایۃ لے کر لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ بڑا پرچم جو سپہ سالار کے پاس ہوتا تھا، لواء کہلاتا تھا جو مرکزی قیادت کے میدان میں موجود ہونے کی علامت ہوتا ہے۔ جو افسر اسے اٹھاتا تھا وہ حامل اللواء کہلاتا تھا۔ حامل اللواء امیر کے معاون کے طور پر جھنڈا تھامے اس کے ساتھ کھڑا رہتا تھا۔ مامن حامل لواء الا علیٰ امیر. (المزہر فی علوم اللغۃ وانواعہا: ۲۰۹/۲) اسی لیے لواء کا سرنگوں ہونا یا گرنا قیادت کی موت یا پسپائی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ غزوات میں لواء حضور ﷺ کے پاس ہوتا تھا۔ علم بردار صحابی آپ کے ساتھ ہوتے تھے۔ جیسے غزوۂ اُحد میں مُصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ حامل اللواء تھے۔ لواء اور رایۃ کے اس فرق کو نہ سمجھنے سے بعض اوقات جنگ کی صورتحال کے بارے میں غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ غزوۂ خیبر میں بھی لواء حضور اکرم ﷺ کے پاس تھا جب کہ رایات مختلف صحابہ کو دیے جاتے رہے۔ لواء اور رایۃ کے فرق پر علامہ عینی نے عمدہ بحث کی ہے۔ (عمدۃ القاری: ۲۳۲/۱۴)

اگلی صبح سب منتظر تھے کہ یہ سعادت کسے نصیب ہوتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا، ان کی آنکھیں دُکھ رہی تھیں، آپ نے لعاب دہن لگایا تو آنکھیں بالکل ٹھیک ہوگئیں۔ آپ نے پرچم ان کے حوالے کر کے خصوصی ہدایات دیں اور حملے کا حکم دیا۔ اِس دن زبردست جنگ ہوئی۔ قموص کا نامور یہودی پہلوان ''مَرحب'' کسی سے زیر نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عامر بن اَکْوَع رضی اللہ عنہ اس کے مقابلے کے لیے نکلے۔ دونوں کی تلواریں دو بار ٹکرائیں، مَرحب کے اگلے وار کو حضرت عامر بن اَکْوَع رضی اللہ عنہ نے اپنی ڈھال پر روکا، مَرحب کی تلوار ان کی ڈھال میں گھس گئی۔ حضرت عامر بن اَکْوَع رضی اللہ عنہ نے جھک کر اپنی تلوار گھمائی تا کہ مَرحب کی پنڈلی کاٹ دیں مگر وہ وار بچا گیا اور تلوار شدت سے گھوم کر خود عامر رضی اللہ عنہ کی شہ رگ پر آ لگی۔ وہ اسی وقت شہید ہو گئے۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مَرحب کا قتل:

مَرحب مسلسل مسلمانوں کو للکار رہا تھا، آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے مقابلے کے لیے نکلے۔ مَرحب یہ شعر گاتے ہوئے ان کی طرف لپکا۔

قَدْ عَلِمَتْ خَیْبَرُ اَنِّی مَرْحَبُ ۔۔۔ شَاکِی السَّلَاحِ بَطَلٌ مُجَرَّبُ

خیبر جانتا ہے میں مَرحب ہوں۔ ۔۔۔ اسلحہ پہنے ہوئے، کہنہ مشق جنگجو ہوں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ جواباً یہ رجز پڑھتے ہوئے اس کی طرف جھپٹے:

اَنَا الَّذِیْ سَمَّتْنِیْ اُمِّیْ حَیْدَرَہْ ۔۔۔ کَلَیْثِ الْغَابَاتِ کَرِیْہَ الْمَنْظَرَہْ

''میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر یعنی شیر رکھا اور میں جنگل کے شیر جیسا ہی ہیبت ناک ہوں۔''

جھڑپ شروع ہوتے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس زور کا وار کیا کہ مَرحب کا سر دو ٹکڑے ہو گیا۔ [2]

زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں یاسر یہودی کا قتل:

مَرحب کے مرنے کے بعد اس کا بھائی یاسر یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان میں نکلا۔

قَدْ عَلِمَتْ خَیْبَرُ اَنِّی یَاسِرُ ۔۔۔ شَاکِی السَّلَاحِ بَطَلٌ مُغَاوِرُ

''خیبر جانتا ہے میں یاسر ہوں، مسلح، دلیر اور جری ہوں۔''

اِدھر سے زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ مقابلے پر یہ کہتے ہوئے نکلے۔

قَدْ عَلِمَتْ خَیْبَرُ اَنِّی زَبَّارُ ۔۔۔ قَرْمٌ لِقَوْمٍ غَیْرُ نِکْسٍ وَلَا فَرَّارُ

''خیبر جانتا ہے میں ہوں زبیر قوم کا سردار...... نہ بھاگنے والا، نہ بے کار''

---

[1] صحیح مسلم، ح: ۴۶۷۸، کتاب الجہاد، باب غزوۃ ذی قرد، ط دار الجیل

[2] صحیح مسلم، ح: ۴۶۷۸، کتاب الجہاد، باب غزوۃ ذی قرد...... بعض روایات کے مطابق مرحب کو محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا۔ (تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۸۲) مگر اسنادی لحاظ سے صحیح مسلم کی روایت راجح ہے جس میں یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کارنامہ بتایا گیا ہے اور یہی جمہور علماء کا قول ہے۔

اِبْنُ خَمَا قِ الْمَجْدِ وَابْنُ الْاَخْيَار — يَا سِرُ لَا يَغُرُّكَ جَمْعُ الْكُفَّار

"میں ہوں شریفوں اور بزرگوں کی اولاد...... اے یاسر! تجھے دھوکے میں نہ ڈالے لشکرِ کفار۔"

جَمْعُهُمْ مِثْلُ سَرَابِ الْجَرَّار

ان کی فوج ہے غائب ہونے والے سراب جیسی

یاسر اتنا لحیم شحیم اور زور آور تھا کہ زبیر رضی اللہ عنہ کی والدہ صفیہ رضی اللہ عنہا پریشان ہو کر بولیں:

"اللہ کے رسول! آج میرا بیٹا شہید ہو جائے گا۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں۔ان شاء اللہ زبیر ہی اسے قتل کرے گا۔"

ایسا ہی ہوا۔ یاسر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مارا گیا۔[1]

خیبر کے دیگر قلعوں کی فتح:

اپنے نامی گرامی سرداروں کے مارے جانے سے یہود کی ہمت ٹوٹ گئی اور "قموص" فتح ہو گیا۔ جلد ہی ناعم، صَعْب، شموان اور نزار جیسے دیگر قلعے بھی مسخر ہو گئے۔ آخر میں یہودی ہر طرف سے سمٹ کر "وطیح" اور "سُلالم" نامی قلعوں میں محصور ہو گئے۔ چودہ دن کے محاصرے کے بعد انہوں نے درخواست کی کہ ان کی جان بخشی کر دی جائے، وہ خیبر چھوڑ جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ درخواست اس شرط پر منظور فرمائی کہ وہ سونا، چاندی اور اسلحہ چھوڑ جائیں، ان میں سے کچھ نہ چھپائیں ورنہ ان کی جان کی کوئی ضمانت نہیں۔ مگر یہودیوں کے رئیس کنانہ بن ابی الحقیق نے معاہدے کے برخلاف سونا، چاندی اور اسلحہ مسلمانوں کے حوالے کرنے کی بجائے زمین میں دفن کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھ گچھ کی تب بھی اس نے دروغ گوئی سے کام لیا۔ تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ معجزہ صحابہ کو فوراً بتا دیا کہ اس کا مال اور اسلحہ کہاں دفن ہے۔ معاہدہ توڑ کر یہودیوں کی حیثیت جنگی قیدیوں کی ہو گئی تھی۔ کنانہ بن ابی الحقیق فریب کے علاوہ ایک مسلمان کے قتل کا مجرم بھی تھا، لہٰذا اسے قتل کر دیا گیا۔ ان کی خواتین باندیاں بن کر مسلمانوں میں تقسیم ہو گئیں اور پورا خیبر اپنی زرخیز زمینوں، کھیتوں اور باغات سمیت مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔[2]

☆☆☆

---

① تاریخ الطبری: ۳/۱۱

② البدایۃ والنہایۃ: ۶/۲۹۶ تا ۲۹۸ ؛ طبقات ابن سعد: ۲/۱۱۰

نوٹ: بعض روایات میں خیبر کی فتح کے لیے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجنے، ان کے ناکام ہونے، ان کی طرف سے مجاہدین پر اور مجاہدین کی طرف سے ان پر بزدلی کا الزام لگانے اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روانگی کا ذکر ہے۔ اکابر صحابہ کا کسی جنگ سے پسپا ہو جانا کوئی محال بات نہیں مگر یہ ثابت نہیں کہ ایک دوسرے کو بزدلی کے طعنے دیے گئے ہوں۔ پھر یہ روایات سند کے لحاظ سے بھی ضعیف ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ ان کی وجہ ضعف کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں: "وفی اسنادہ من ھو متھم بالتشیع." (البدایۃ والنہایۃ: ۶/۲٦۷) یہ بھی یاد رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پورا خیبر نہیں، بلکہ قموص نامی ایک اہم قلعہ فتح ہوا تھا۔ باقی قلعے دیگر صحابہ نے فتح کیے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام و مرتبہ اپنی جگہ، مگر اس مہم میں دیگر صحابہ کے کارناموں کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔

حضرت صَفِیَّہ رضی اللہ عنہا سے نکاح:

قیدیوں میں صَفِیَّہ بھی تھیں جو حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھیں، یہود کے ایک رئیس حُیَیّ بن اخطب کی بیٹی اور دوسرے رئیس کِنانہ بن ابی الحُقَیق کی بیوی تھیں۔[1] وہ حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے حصے میں آگئیں مگر صحابہ کی رائے یہ بنی کہ ایسی عالی نسب اور حسین خاتون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حرم کے لائق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مشورہ قبول کر لیا اور دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی رضامندی سے صَفِیَّہ کو اپنے حصے میں لے لیا۔[2]

ان کے چہرے پر تازہ زدوکوب کا واضح نشان تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ چند دن پہلے انہوں نے خواب دیکھا تھا کہ چاند ان کی گود میں آگرا ہے۔ اپنے شوہر کنانہ کو یہ خواب سنایا تو اس نے زور کا طمانچہ رسید کیا اور کہا: ''تو عرب کے سردار محمد کے سپنے دیکھ رہی ہے؟''

کِنانہ سزائے موت پا چکا تھا اور اس کی بیوہ صَفِیَّہ اسلام قبول کر چکی تھیں۔ ان کا خواب سچا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آزاد کر دیا اور عدت کے بعد ان سے نکاح کر لیا۔[3]

فَدَک اور وادی القُریٰ کی فتح:

خیبر کے جنوب مشرق میں مدینہ سے دو تین منازل دور ''فَدَک'' ایک سرسبز وشاداب علاقہ تھا، یہاں کے یہودیوں نے لڑے بغیر جاں بخشی کی شرط پر ہتھیار ڈال دیے اور جلاوطنی قبول کر لی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شمال کی طرف مزید پیش قدمی کی اور یہود کی ایک اور آبادی وادی القریٰ تک پہنچے جو عرب کی آخری بستی شمار ہوتی تھی اور اس سے آگے شام کا علاقہ مانا جاتا تھا۔ یہاں بھی یہودیوں کو شکست ہوئی اور یہ تمام علاقہ مسلمانوں کے ہاتھ آگیا۔[4]

یہود کی ایک اور ناپاک سازش:

خیبر کے قلعے گنوانے کے بعد فتنہ پرور یہودی میدانِ جنگ میں مکمل طور پر شکست کھا چکے تھے۔ مگر آخری داؤ کے طور پر انہوں نے ایک گھناؤنا کھیل کھیلا۔ ان کے سردار سَلّام بن مِشْکَم کی بیوی زینب بنت الحارث (مرحب کی بہن) نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ضیافت کی اور بکری کا بھنا ہوا گوشت پیش کیا جس میں زہر ملا ہوا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جونہی پہلا لقمہ منہ میں رکھا اللہ تعالیٰ نے آپ کو خطرے سے آگاہ کر دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً لقمہ تھوک دیا، تاہم اس وقت تک دعوت میں شریک ایک صحابی حضرت بِشر بن براء رضی اللہ عنہ نوالہ حلق سے نیچے اتار چکے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب سے اس ناپاک حرکت کا سبب پوچھا تو وہ بولی: ''میں اپنی قوم کا انتقام لینا چاہتی تھی، جس کا آپ نے یہ حال کیا۔ میں نے سوچا

[1] سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۳۱

[2] صحیح مسلم، ح: ۳۵۷۱، کتاب النکاح، باب فضیلۃ اعتاق امتہ ثم یتزوجھا ؛ صحیح البخاری، ح: ۲۲۰۰، ۲۲۳۵، ۲۸۹۳ ؛ مسند احمد ح: ۱۳۰۲۳ باسناد صحیح

[3] البدایۃ والنھایۃ: ۶/۲۹۰

[4] البدایۃ والنھایۃ: ۶/۳۲۳ تا ۳۲۵

کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو بچ جائیں گے اور اگر عام فاتح ہیں تو ہمیں آپ سے چھٹکارا مل جائے گا۔"

عورت یقیناً حاضر جواب تھی اور اس کی چالاکی شک وشبے سے بالاتر تھی مگر اس طرح جرم پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ تاہم حضور اکرم ﷺ اپنی ذات کے لیے انتقام لینا پسند نہیں کرتے تھے اور وہ بھی ایک عورت سے۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے درگزر سے کام لیا۔① یہ جانی دشمن سے عفو ودرگزر کا بہترین نمونہ تھا۔

مگر کچھ دنوں بعد بشر بن براء رضی اللہ عنہ زہر کے اثر سے وفات پا گئے تو حضور ﷺ نے عدل کا تقاضا پورا کرتے ہوئے اس عورت کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا، جنھوں نے اسے قتل کر دیا۔ یہ قانون کی بالادستی کی عمدہ مثال تھی۔②

یہود سے زمین داری کا معاملہ:

خیبر کے یہودی زراعت اور باغبانی کے ماہر تھے۔ اگرچہ ان کی جلاوطنی طے ہو چکی تھی مگر انہوں نے اس موقع پر یہ تجویز پیش کی کہ انہیں ان زمینوں پر صرف کام کرنے کے لیے رہنے دیا جائے، پیداوار میں سے نصف ان کا ہوگا اور نصف مسلمانوں کا۔ حضور اکرم ﷺ نے غور کیا تو اس تجویز میں مصلحت محسوس کی؛ کیوں کہ مسلمانوں کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ وہ بیک وقت جہاد بھی کرتے اور زراعت بھی۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو جہاد کے لیے فارغ رکھنے کے خیال سے اس تجویز کو منظور فرما لیا مگر یہ واضح فرما دیا کہ جب ہم چاہیں گے یہ معاملہ ختم کر دیں گے۔ آپ ﷺ نے خیبر کی پیداوار سے حصہ وصول کرنے کی ذمہ داری عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو سونپ دی۔ وہ جب بھی خیبر آتے اتنی دیانت داری اور انصاف سے پیداوار تقسیم کرتے کہ یہودی کہہ اُٹھتے: "زمین وآسمان ایسے ہی عدل کی وجہ سے قائم ہیں۔"③

یہود حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور تک یہیں آباد رہے، مگر چونکہ حضور ﷺ کی یہ وصیت تھی کہ جزیرۃ العرب میں دو دین باقی نہ رہنے دیے جائیں اور یہود ونصاریٰ کو یہاں سے نکال دیا جائے۔ اس لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں خیبر اور گرد ونواح سے تمام یہودیوں کو جلاوطن کر کے شام بھیج دیا اور انہیں متبادل زمینیں فراہم کر دیں۔④

حبشہ کے مہاجرین کی آمد:

ابھی رحمت عالم ﷺ خیبر کی فتح سے فارغ ہوئے تھے کہ حبشہ کے مہاجرین جو تیرہ چودہ سال سے بے وطنی کی زندگی گزار رہے تھے، حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں آپ کی خدمت میں آن پہنچے۔

انہیں نجاشی نے حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق دو بڑی کشتیوں میں پورے انتظام اور اہتمام کے ساتھ واپس روانہ کیا تھا۔ حضور اکرم ﷺ حبشہ کے مہاجرین کی آمد سے اتنے خوش ہوئے کہ فرمایا:

"میں بتا نہیں سکتا کہ خیبر کی فتح کی خوشی زیادہ ہو رہی ہے یا جعفر کے واپس آنے کی۔"⑤

---

① صحیح البخاری، ح: ۳۱۶۹، کتاب الجزیۃ، باب اذا غدر المشرکون ؛ سیرۃ ابن ھشام: ۳۳۸،۳۳۷/۲

② طبقات ابن سعد: ۲۰۱/۲

③ الاصابۃ، اسد الغابۃ، ترجمۃ: عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ④ التاریخ الاسلامی العام، ص ۲۰۰

⑤ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۰۸/۲، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ..... یاد رہے کہ مُحَیّصہ رضی اللہ عنہ اس سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۲۰۷/۱)

رحمت عالم ﷺ نے مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ ان نئے مہمانوں کو خیبر سے ملنے والے زرعی رقبوں میں شریک کرلیں تاکہ ان کی آبادکاری ہو اور وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔ مسلمانوں نے اسے خوشی سے منظور کرلیا۔ [1]

حبشہ کے مہاجرین کے ساتھ یمن کے ۵۳ مسلمان بھی آپ کی خدمت میں پہنچے جن میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور ان کے دو بھائی: ابوبُردہ اور ابورُہم بھی تھے۔ یہ لوگ کئی برس پہلے حضور اکرم ﷺ کی ہجرت کا شہرہ سن کر یمن سے کشتی میں بیٹھ کر مدینہ کے لیے نکلے تھے مگر طوفان نے انہیں حبشہ کے ساحل پر جا پھینکا۔ وہاں انہیں جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور دوسرے مہاجرینِ حبشہ مل گئے۔ یہ بھی ان کے ساتھ رہنے لگے۔ اب یہ انہی کے ہم رکاب ہوکر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپ ﷺ نے انہیں بھی خیبر کے اموال سے حصہ عنایت فرمایا۔ [2] اشعری قوم کے یہ لوگ مسجد نبوی میں قرآن مجید بڑے شوق سے سیکھا اور پڑھا کرتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ اپنے حجرے سے ان کی دل آویز قرأت سن کر فرمایا کرتے تھے: ''میں اپنے اشعری دوستوں کو ان کی تلاوت کے انداز سے پہچان لیتا ہوں۔'' [3]

جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بارگاہِ رسالت سے وابستہ ہوئے:

فتح خیبر کے موقع پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ [4] ان کا تعلق یمن کے قبیلے دَوس سے تھا۔ مسلمان ہوکر قبیلے کے ۸۰ گھرانوں کے ساتھ یمن سے نکلے، راستے میں بے خود ہوکر یہ شعر پڑھتے رہے:

يَـا لَيْلَةً مِـنْ طُـوْلِهَـا وَعَـنَـائِهَـا ۔۔۔ عَـلـىٰ أَنَّهَـا مِـنْ دَارِ الْـكُـفْـرِ نَـجَّـتِ

''ہائے! یہ رات کتنی طویل اور پُر مشقت ہے۔ مگر جیسی بھی ہو، اس نے کفریہ ریاست سے نجات دلا دی ہے۔'' [5]

یہ درویشِ خدامست اس وقت مدینہ منورہ پہنچے جب رسول اللہ ﷺ خیبر کے جہاد میں مشغول تھے۔ یہ بھی پیچھے روانہ ہوگئے اور آخر وہیں بارگاہِ اقدس میں حاضری نصیب ہوئی۔

حضور ﷺ نے پوچھا: ''تم کہاں کے ہو؟'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''دَوس کے؟''

حضور ﷺ نے خوشی اور حیرت سے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔ [6]

اس کے بعد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بارگاہِ نبوی سے اس طرح وابستہ ہوئے کہ ساری زندگی آقائے نامدار ﷺ کی باتیں سننے، یاد کرنے اور دہرانے میں گزار دی۔ انہیں صحابہ کرام میں احادیث کا سب سے بڑا حافظ مانا جاتا ہے۔

انہی یمنی مسلمانوں میں دوس کے رئیس طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اور دوس کے تمام مسلمانوں کو خیبر کے اموال میں سے حصہ عطا کیا۔ [7]

---

[1] المختصر فی اخبار البشر: ۱/۱۴۰، ۱۴۱

[2] صحیح مسلم، ح: ۲۵۰۲، فضائل الصحابة، باب فضائل جعفر رضی اللہ عنہ، ط دار الجیل ؛ اسد الغابة، باب الکنیٰ، تر: ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

[3] صحیح البخاری، ح: ۴۲۳۲، کتاب المغازی، باب غزوة خیبر

[4] البدایة والنهایة: ۱۱/۳۶۴

[5] صحیح البخاری، ح: ۴۳۹۳، کتاب المغازی، باب قصة دوس

[6] البدایة والنهایة: ۱۱/۳۶۴

[7] سیرة ابن هشام: ۱/۳۸۵

صلح حدیبیہ اور غزوۂ خیبر کے بعد ریاستِ مدینہ کی حیثیت:

صلح حدیبیہ اور غزوۂ خیبر کے بعد عربوں کی صدیوں قدیم لامرکزیت کا تقریباً خاتمہ ہوگیا تھا۔ اب عرب میں مسلمان واحد بڑی طاقت تھے۔ قریش کی ساکھ بہت گرچکی تھی اور ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ آئندہ کبھی مسلمانوں کو مغلوب کرسکتے۔ جنوب اور جنوب مغرب کی سمت مکہ اور قریش کے حلیف قبائل کے علاقوں میں اسلامی دستوں کی نقل وحرکت تقریباً ختم ہوگئی تھی۔ صلح حدیبیہ کی شرائط کے تحت یہ تمام علاقہ محفوظ اور مامون تھا۔

دیکھا جائے تو ریاست مدینہ اس ابتدائی زمانے ہی میں علاقائی حدود سے بڑھ کر ایک ابھرتی ہوئی بین الاقوامی طاقت سمجھی جانے لگی تھی جو بلاشبہ مسلمانوں کی بیس سالہ طویل اور کٹھن جدوجہد کا مبارک ثمرہ تھا۔ ریاستِ مدینہ کو جونہی قریش سے ذرا سی فرصت ملی، اس کی رگوں میں مچلتی توانائیوں نے نیا محاذ تلاش کرلیا اور اس کی عسکری کارروائیوں کا رخ شمال کی جانب ہوگیا۔ خیبر، فدک اور وادیٔ القریٰ کی فتوحات اس عظیم تغیر کا پہلا مرحلہ تھیں جبکہ اس کا دوسرا مرحلہ جنگِ مُوتہ اور غزوۂ تبوک تھے جہاں سے عظیم سلطنتِ روما کا زوال شروع ہوا۔ تاہم ابھی عرب میں چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستیں موجود تھیں۔ ایسی ریاستیں ہر بڑی مملکت کے قیام میں رکاوٹ بنتی ہیں مگر مسلمان یہ صلاحیت رکھتے تھے کہ انہیں اپنے ساتھ ملالیں اور انکار کرنے والوں کو مغلوب کرلیں۔ چنانچہ ان بدوی قبائل کو جو کسی معاہدے کے پابند نہ تھے اور مسلمانوں کے خلاف سخت عزائم رکھتے تھے، ریاستِ مدینہ کی تادیبی کارروائی کا سامنا کرنا پڑا۔

غزوہ ذات الرِقاع:

اس سلسلے کی اہم مہم غزوۂ ذات الرِقاع تھی جس میں رسول اللہ ﷺ یلغار کرکے قبیلۂ غطفان تک گئے۔[1]

اس سفر میں مجاہدین کے پاس سواریوں کی بہت کمی تھی۔ ایک ایک اونٹ پر چھ چھ افراد باری باری سواری کررہے تھے۔ صحابہ کو عموماً پیدل ہی چلنا پڑ رہا تھا[2] لہٰذا بہت سے افراد کے جوتے پھٹ کر ناکارہ ہوگئے تھے۔ مہم میں شریک حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بقول ہمارے پاؤں زخمی ہوگئے تھے، آخر مجبوراً پیروں پر کپڑوں کے چیتھڑے لپیٹنا پڑے (جنہیں عربی میں ''رِقاع'' کہا جاتا ہے۔) اس لیے یہ مہم ''غزوۂ ذات الرِقاع'' کہلائی۔[3]

---

① صحیح البخاری، ح: ۴۱۲۵، ۴۱۲۶، ۴۱۲۷، کتاب المغازی، باب غزوة ذات الرقاع

② صحیح البخاری، ح: ۴۱۲۸، کتاب المغازی، باب غزوة ذات الرقاع ③ صحیح البخاری، ح: ۴۱۲۸

ذات الرقاع کی وجہ تسمیہ میں اور بھی اقوال ہیں: واقدی کے بقول یہ مہم جس پہاڑی علاقے میں گئی تھی وہاں زمین سرخ، سیاہ اور سفید رنگ کی تھی۔ (المغازی للواقدی: ۱/۳۹۵) زمین پیوندزدہ معلوم ہونے کی وجہ سے مہم کو ''ذات الرقاع'' کا نام دیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذات الرقاع اس علاقے کے ایک درخت کا نام تھا جہاں مہم جوئی کی گئی تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ لشکر کے پرچم پھٹ گئے تھے اور انہیں پیوند لگا کر جوڑا گیا تھا، مگر پیروں پر چیتھڑے لپیٹنے کا قول اصح ہے؛ کیوں کہ اسے مہم میں شریک ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ خود نقل کررہے ہیں۔

ابن اسحاق نے غزوۂ ذات الرقاع کو غزوہ بنونضیر کے بعد (۴ھ میں) قرار دیا ہے۔ (تاریخ الطبری: ۲/۵۵۵) واقدی نے اس کی تاریخ ہفتہ ۱۰ محرم تا ۲۵ محرم ۵ھ بیان کی ہے۔ (المغازی للواقدی: ۱/۳۹۵) مگر صحیح یہ ہے کہ یہ مہم غزوۂ خیبر کے بعد پیش آئی تھی؛ کیوں کہ اس میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ (صحیح البخاری، ح: ۴۱۲۸، ۴۱۳۶) اور یہ دونوں حضرات غزوۂ خیبر کے موقع پر...... (بقیہ اگلے صفحے پر)

صلوٰۃ الخوف:

غزوۂ ذات الرقاع میں جنگ کی نوبت نہیں آئی، البتہ ''نخل'' کے مقام پر مسلمان حالتِ جنگ سے ضرور دوچار ہوئے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے وہاں باجماعت فرض نماز کو ''صلوٰۃ الخوف'' کے طریقے پر ادا کیا۔[1]

نجاشی اَصحَمہ کی وفات:

اسی سال حبشہ میں مسلم بادشاہ نجاشی اَصحَمہ رحمہ اللہ وفات پا گئے۔ حضور اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس کی اطلاع دی تو آپ ﷺ نے اَصحَمہ رحمہ اللہ کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی؛ کیوں کہ وہاں کوئی اور مسلمان نہیں تھا جو ان پر نماز پڑھتا۔[2]

محدثین روایت کرتے ہیں کہ ایک طویل زمانے تک اَصحَمہ رحمہ اللہ کی قبر سے روشنی پھوٹتی رہی۔[3]

ثمامہ بن اُثال کی گرفتاری، قبولِ اسلام، مکہ کی غذائی ناکہ بندی:

۷ ہجری کے وسط میں رسول اللہ ﷺ نے محمد بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ کو نجد کی طرف چھاپے کے لیے بھیجا۔[4] مجاہدین نے

(**بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ**) رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں آئے تھے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں: وھی غزوۃ محارب خصفۃ من بنی ثعلبۃ من غطفان، فنزل نخلاً، وھی بعد خیبر، لان اباموسیٰ جاء بعد خیبر. (صحیح البخاری، ح: ۴۱۲۸) اس لیے قرینِ قیاس ہے کہ یہ مہم غزوۂ خیبر کے بعد آنے والے پہلے محرم میں ہوئی تھی، یعنی محرم کی ۷ھ جو اکتوبر ۶۲۸ء (جمادی الاولیٰ ۷ھ مدنی) کے مطابق ہے۔ واقدی نے اس کا آغاز یوم السبت یعنی ہفتے کو بتایا ہے۔ ا محرم کی ۷ھ کو بھی ہفتہ تھا۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ذات الرقاع نامی دو الگ الگ غزوات پیش آئے ہوں، ایک ۴ھ یا ۵ھ میں اور دوسرا ۷ھ میں۔ (فتح الباری: ۷/ ۴۱۷)

حاشیہ صفحہ موجودہ

[1] جس جگہ صلوٰۃ خوف ادا کی گئی اسے کتبِ حدیث و سیرت میں ''نخل'' یا ''نخلہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ عرب میں ایسے ناموں کے متعدد مقامات تھے جن میں سے دو زیادہ مشہور تھے: ایک مدینہ کی نواحی وادی تھی جہاں سے بصرہ کے لیے راستہ نکلتا ہے۔ (معجم البلدان: ۱/ ۴۴۹) دوسری طائف سے مکہ کی راہ میں مکہ سے ایک شب کی مسافت پر واقع وادی ''بطنِ نخلہ'' تھی جہاں رسول اللہ ﷺ کی جنات سے ملاقات ہوئی تھی۔ (عمدۃ القاری: ۶/ ۴۷)

قرینِ قیاس ہے کہ یہاں یہی دوسرا مقام مراد ہے۔ اگرچہ بعض حضرات نے یہ مہم مدینہ کی نواحی وادی نخلہ میں تصور کی ہے مگر یہ اس لیے درست نہیں کہ مدینہ سے قریبی وادی تک سفر میں جوتے پھٹنے اور پاؤں زخمی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پس یہ یقیناً دور دراز کا سفر تھا۔

[2] صحیح البخاری، ح: ۳۸۷۸، کتاب المناقب، باب موت النجاشی

فائدہ ❶: احناف کے نزدیک یہ غائبانہ نمازِ جنازہ نجاشی رحمہ اللہ کے اعزاز میں وقتی طور پر حضور ﷺ کے لیے مشروع کی گئی تھی۔ اگر یہ عام حکم ہوتا تو حضور ﷺ دور دراز جگہوں پر وفات پانے والے دیگر صحابہ کی نمازِ جنازہ بھی پڑھتے، جبکہ ایسی کوئی اور مثال موجود نہیں۔ (المبسوط للسرخسی: ۲/ ۶۷، ط المعرفۃ)

فائدہ ❷: نجاشی اصحمہ رحمہ اللہ کی وفات کے بارے میں غالب اندازہ یہی ہے کہ ۷ھ کے اوائل میں ہوئی۔ اس کے قرائن یہ ہیں کہ:

نمازِ جنازہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ شریک ہوئے تھے۔ (صحیح البخاری، ح: ۱۳۲۷، باب الصلاۃ علی الجنائز بالمصلیٰ والمسجد) جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت محرم ۷ھ میں اختیار کی تھی۔ (البدایۃ والنھایۃ: ۱۱/ ۳۶۴) اس لیے یہ واقعہ محرم ۷ھ کے بعد کا ہے۔ پھر دوسرا نجاشی تخت نشین ہوا جسے رسول اللہ ﷺ نے ربیع الاوّل ۷ھ میں دعوتِ اسلام پر مشتمل مراسلہ بھیجا۔ (طبقات ابن سعد: ۱/ ۲۰۷)

پس نجاشی اصحمہ کی وفات کا واقعہ محرم سے ربیع الاوّل ۷ھ کے درمیان میں ہونا طے ہو جاتا ہے۔

[3] سنن ابی داوٗد، ح: ۲۵۲۳، باب النور یُریٰ عند قبر الشھید [4] دلائل النبوۃ للبیھقی: ۴/ ۷۸

بیہقی کی روایت میں اس مہم کا مہینہ محرم ۶ ہجری منقول ہے۔ مگر اس تاریخ پر یہ اشکال ہے کہ ثمامہ رضی اللہ عنہ کے مشرف بہ اسلام ہونے کا واقعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جس کے بعض طرق میں صراحت ہے کہ یہ ان کا چشم دید واقعہ ہے۔ (تاریخ المدینۃ لابن شبہ: ۲/ ۴۳۸)

چونکہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بالاتفاق ۷ ہجری میں مدینہ آئے تھے، اس لیے یہ واقعہ ۷ھ سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔ اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے راجح یہی لگتا ہے کہ ثمامہ رضی اللہ عنہ کی گرفتاری کی مہم غزوۂ ذات الرقاع کا تتمہ تھی۔ وہ مہم بھی مشرق کی سمت تھی اور یہ بھی۔ فرق یہ تھا کہ وہ غزوہ تھا اور یہ سریہ۔ ذات الرقاع کی اقرب الی القیاس تاریخ جمادی الاولیٰ ۷ھ مدنی ہے، اس لحاظ سے ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا بھی تقریباً اسی زمانے میں قرینِ قیاس ہے۔

کارروائی کے دوران بنوحنیفہ کے ایک رئیس ثمامہ بن اُثال کو گرفتار کرلیا۔قیدی کو لاکر مسجدِ نبوی کے ایک ستون سے باندھ دیا گیا۔رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''کیا ارادہ ہے؟'' جواب ملا: ''ارادہ نیک ہے۔قتل کردو تو ایسے شخص کو کرو گے جس کا قتل جائز ہے۔احسان کرو گے تو ایسے شخص پر کرو گے جو قدردان ہے۔اگر مال چاہیے تو جتنا چاہو مانگ لو۔''

رسول اللہ ﷺ نے دوسرے اور تیسرے روز بھی یہی سوال کیا۔قیدی کا وہی ایک جواب تھا۔اس دوران قیدی نے مسلمانوں کے احوال،مسجدِ نبوی کے روز و شب اور سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کے جمالِ جہاں آراء کا مشاہدہ کرلیا تھا۔دل نے گواہی دے دی تھی کہ یہ سچے نبی ہیں۔آخر رسول اللہ ﷺ نے ثمامہ کو غیر مشروط طور پر آزاد کردیا۔وہ رہا ہوتے ہی قریبی باغ میں گئے،وہاں غسل کیا۔پھر مسجد میں آئے اور کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہوگئے۔

پھر بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں عرض کیا: ''کل تک آپ کے چہرے سے زیادہ ناپسندیدہ چہرہ کوئی نہ تھا۔آج اس سے زیادہ پسندیدہ چہرہ کوئی نہیں۔کل تک آپ کے دین سے زیادہ ناگوار دین کوئی نہ تھا۔آج اس سے زیادہ محبوب دین کوئی نہیں۔کل تک آپ کے شہر سے زیادہ نفرت کسی شہر سے نہ تھی۔آج اس سے زیادہ محبت کسی شہر سے نہیں۔''

پھر عرض کیا: ''اللہ کے رسول! میں عمرے کے لیے جارہا تھا کہ آپ کے شہ سواروں نے مجھے پکڑلیا۔اب آپ فرمائیں میں کیا کروں؟'' حضور ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ عمرے کا عزم پورا کریں۔

وہ مکہ گئے تو وہاں کے لوگوں کو ان کے اسلام لانے کا پتا چل چکا تھا۔کسی نے کہا: ''بے دین ہوگئے ہو۔'' کہنے لگے: ''نہیں! بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آیا ہوں۔اللہ کی قسم! جب تک رسول اللہ ﷺ کی اجازت نہ ہوگی،تمہیں یمامہ سے گندم کا ایک دانہ بھی نہیں آنے پائے گا۔''

اور ایسا ہی ہوا۔یمامہ کا تجارتی راستہ ان کے ہاتھ میں تھا جس کی انہوں نے ناکہ بندی کردی۔[1]

دشمنی کے باوجود رسول اللہ ﷺ کا اہلِ مکہ پر احسان:

اہلِ مکہ قحط سالی سے پہلے ہی ہلکان ہورہے تھے۔خوراک و رسد کے بیرونی راستے ہی آخری سہارا تھے۔زیادہ تر غلہ یمامہ سے آتا تھا جس کی شاہراہ ثمامہ رضی اللہ عنہ نے بند کردی تھی۔آخر تنگ آکر قریش نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عریضہ بھیجا اور رشتہ داری کا واسطہ دے کر کہا کہ ثمامہ کو ناکہ بندی ختم کرنے کا حکم دیجیے۔

رسول اللہ ﷺ چاہتے تو قریش کو اسی وقت اپنے قدموں پر جھکا سکتے تھے مگر آپ نے پیغمبرانہ اخلاق کا ثبوت دیتے ہوئے ایسے سخت دشمنوں کی درخواست قبول کرلی۔آپ ﷺ کے حکم پر ثمامہ رضی اللہ عنہ نے اہلِ مکہ کی خوراک کا راستہ کھول دیا۔[2] لوگوں کے کہنے پر رسول اللہ ﷺ نے قریش کی قحط سالی ختم ہونے کے لیے بھی اللہ سے دعا کی جس کے باعث مکہ اور گردونواح میں بارشیں ہوئیں۔اہلِ مکہ کی حالت بہتر ہوگئی تاہم وہ کفر اور سرکشی سے باز نہ آئے۔[3]

① صحیح البخاری،ح:۴۳۷۲،کتاب المغازی،باب وفد بنی حنیفة

② دلائل النبوة للبیهقی:۸۰/۴ ③ صحیح مسلم،ح:۷۲۴۵،کتاب صفة القیامة،باب الدخان

سلاطین کو دعوتِ اسلام

رسول اللہ ﷺ کے سامنے صرف جزیرۃ العرب کی اصلاح نہیں تھی بلکہ ساری دنیا آپ ﷺ کی دعوت کے دائرے میں آئی تھی؛ کیوں کہ آپ سب سے آخری اور عالمگیر پیغمبر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ قریش کی طرف سے جلد از جلد بے فکر ہو کر دوسرے محاذوں اور میدانوں کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتے تھے۔ صلح حدیبیہ کی بدولت جب آپ کو یہ موقع میسر آیا تو آپ نے اپنی جدوجہد کے اگلے مرحلے کا آغاز کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی۔

''صلح حدیبیہ'' نہ صرف پورے عرب میں اسلام کا سکہ چلنے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی بلکہ اب اسلام کے ایک عالمگیر دعوت کے طور پر دنیا کے بڑے بڑے درباروں میں متعارف ہونے کا وقت بھی آن پہنچا تھا۔ صلح کی بدولت جزیرۃ العرب کے تمام راستے محفوظ اور مامون ہو گئے تھے اور اسلام کے قاصد اب ہر طرف جا سکتے تھے۔

بادشاہوں سے مراسلت میں ملحوظ نکات:

دُنیا میں اُس وقت درجنوں بادشاہتیں اور حکومتیں تھیں اور ان سب کو اسلام کے حیات آفرین پیغام کی ضرورت تھی مگر حکمت اور موقع کا تقاضا یہ تھا کہ ابتدا ایسے درباروں سے کی جائے جو جزیرۃ العرب کے قریب ہونے کی وجہ سے اس پیغام کے اصل مرکز سے باآسانی رابطہ کر کے اپنے ممکنہ شکوک کا ازالہ کر سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اسلام کی راہ ہموار کرنے کے حوالے سے دوسرے ملکوں پر بھی اثر انداز ہو سکیں۔

حضورِ اکرم ﷺ نے اس سلسلے میں جزیرۃ العرب سے باہر چار بڑی سلطنتوں: روم، ایران، مصر اور حبشہ کے تاجداروں کو اپنے پیغام کا اولین مخاطب بنایا۔ اس کے علاوہ عرب کے چند بڑے امراء کو بھی خطوط بھیجے۔ یہ ضروری نہ تھا کہ یہ حکمران فوراً ایمان لے آتے مگر اتنا بھی کافی تھا کہ ان کے سامنے ایک بار اسلام کا اجمالی خاکہ آجاتا اور وہ جزیرۃ العرب سے اُٹھنے والی عالمگیر اسلامی تحریک کے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار ہونے سے بچ جاتے۔ ان حکمرانوں کے ابتدائی ردِّعمل سے مسلمانوں کو یہ بھی اندازہ ہو جاتا کہ ریاست مدینہ کو جو عنقریب ایک عالمی طاقت بننے جارہی تھی، اپنے پڑوسی ممالک سے کس طرح کے رویوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اس کے لیے کیا جوابی حکمت عملی اختیار کرنا بہتر ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ نے یکساں پیغام کی متعدد نقول بنوانے سے احتراز کیا اور ہر حکمران کو اس کے مذہبی وعلاقائی پس منظر کے لحاظ سے الگ الگ انداز میں مخاطب کیا۔ آپ کے خطوط مختصر اور مؤثر تھے جن میں عجز وانکسار تھا نہ کسی قسم کا غرور وتکبر، ان میں مخاطب کے لیے خیر خواہی اور ہمدردی جھلکتی تھی۔ پتہ چلتا تھا کہ پیغام دینے والا اپنی دعوت پر غیر متزلزل یقین رکھتا ہے۔ ان بڑے بڑے درباروں کی سطوت وشوکت اور عسکری واقتصادی برتری اس کے نزدیک پرِکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی اور وہ ذہنی ونظری طور پر ان سے سب سے بلند وبالا مقام پر کھڑا ہو کر انہیں ان خطرات سے خبردار کر رہا ہے جو ان کے پست نگاہوں سے اوجھل ہیں۔

تحقیقی قول کے مطابق سلاطین کے نام یہ دعوتی مراسلے خیبر کی فتح کے بعد ۷ھ کے آغاز میں روانہ کیے گئے تھے۔ ①

ہرقل کو دعوتِ اسلام:

رسول اللہ ﷺ کے پہلے مراسلے کا مخاطب ہرقل (ہرکولیس) تھا۔ اس نے ایرانیوں سے شکست کھانے والے بدقسمت رومی بادشاہ فوقس (Phocus) کا تختہ الٹ کر ۶۱۰ء میں بازنطینی روما کا اقتدار سنبھالا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ سے ایشیا اور افریقہ تک وسیع یہ عظیم الشان سلطنت ایرانی فاتحین کی بے لگام طاقت کے سامنے زمین بوس ہو رہی تھی، ہرقل نے تخت نشینی کے چھ سال بعد یکا یک فیصلہ کیا کہ وہ ایرانیوں سے ٹکر لے کر بازنطینی سلطنت کی سابقہ آن بان بحال کرے گا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب قرآن مجید نے سورۃ الروم میں رومیوں کی ایران کے خلاف فتح کی پیش گوئی کی تھی، حالانکہ اس وقت روما کا دم لبوں پر تھا مگر اس حالت میں جب ہرقل نے ایران پر حملہ کیا تو قدم قدم پر فتح اس کے قدم چومتی گئی۔ اس نے کسریٰ کو مسلسل ہزیمتوں سے دوچار کیا اور سات، آٹھ برس کی جنگوں سے ایشیا میں روما کا اقتدار بحال کرنے کے بعد وہ ایک نامور فاتح کی طرح سن ۶۲۵ء میں اپنے یورپی پایہ تخت ''قُسطَنطِینِیّہ'' واپس لوٹا۔

کسریٰ پرویز سے اس کے مذاکرات جاری رہے۔ پرویز اس کے مقابلے میں شکست کھا کر اس کے مطالبات ماننے پر مجبور ہو چکا تھا، انجام کار عیسائیوں کی ''صلیب مقدس'' جو ایرانی کئی برس پہلے بیت المَقدِس سے اُٹھا لے گئے تھے، روما کو واپس کر دی گئی۔ اس صلیب کو بیت المَقدِس میں دوبارہ نصب کرنے ہرقل خود قُسطَنطِینِیّہ سے شام آیا۔ ②

یہ تقریباً وہی دن تھے جب حضور ﷺ غزوۂ خیبر سے فارغ ہو کر سلاطین کے نام مراسلے تحریر فرما رہے تھے۔

ہرقل کی ابوسفیان سے گفتگو:

ہرقل پہلے اپنے ایشیائی پایۂ تخت ''حِمص'' آیا اور یہاں سے شکرانے کے طور پر پا پیادہ ''ایلیا'' (بیت المَقدِس) روانہ ہوا۔ مصاحبین اور ارکانِ سلطنت کا ایک جلوس اس کے ساتھ تھا۔ بیت المَقدِس میں شب بسری کے دوران اس نے ایک عجیب خواب دیکھا جس میں بتایا جا رہا تھا کہ ختنہ کرانے والی قوم کا سردار عنقریب سب پر غالب آجائے گا۔

---

① یہ مراسلے صلح حدیبیہ کے بعد ذوالحجہ ۶ھ میں لکھنا شروع کیے گئے تھے۔ بعض صحابہ کے مشورے پر مراسلوں کی حیثیت مستند بنانے کے لیے مہر بھی بنوائی گئی تھی، جس پر ''محمد رسول اللہ'' کندہ تھا۔ مراسلے بھیجنے کا سلسلہ محرم ۷ھ سے ربیع الاوّل ۷ھ کے درمیان جاری رہا۔ (طبقات ابن سعد: ۱/ ۲۰۷، ۲۵۸)
غالباً غزوۂ خیبر کے باعث بعض سفیروں کی روانگی میں کچھ تاخیر ہوئی تھی۔ بعض حضرات اس مغالطے کا شکار بھی ہوئے ہیں کہ سلاطین کو مراسلے ۶ھ میں بھیج دیے گئے تھے، حالانکہ یہ بالاتفاق غلط ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: ''ولا خلاف بینھم ان بدء ذالک کان قبل فتح مکۃ و بعد الحدیبیۃ لقول ابی سفیان لھرقل حین سالہ ھل یغدر؟ فقال: لا ولکن نحن منہ فی مدۃ لا ندری ما ھو صانع فیھا، وفی لفظ للبخاری: فی المدۃ التی ماذ فیھا ابو سفیان رسول اللہ ﷺ. (البدایۃ والنھایۃ: ۶/۲۶۸)
بعض حضرات کو صحیح بخاری میں مراسلے بھیجنے کا ذکر غزوۂ تبوک کے بعد دیکھ کر یہ وہم ہوا ہے کہ یہ مراسلے ۹ھ میں بھیجے گئے تھے، حالانکہ امام بخاری نے زمانی ترتیب کو ملحوظ رکھنے میں زیادہ غور و خوض نہیں کیا ہے۔ ڈکتور اکرم ضیاء عمری لکھتے ہیں:
''وقد ذکر البخاری رسالۃ کسری فی اعقاب غزوۃ تبوک فی العام التاسع الھجری لکن من الواضح ان البخاری لم یراع عنصر الزمن فی سرد محتویات صحیحہ. (السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ: ۲/ ۲۵۴، ۲۵۵)

② نبی رحمت ﷺ، ص ۳۸۱ تا ۳۸۳

ختنے کا رواج یہودیوں میں تھا یا عربوں میں۔ ہرقل نے بیدار ہوتے ہی معلوم کرایا کہ ان دونوں میں سے کس قوم میں کوئی انقلاب آیا ہے۔ کارندوں نے جلد ہی پتا لگا لیا کہ عربوں میں ایک نبی کا ظہور ہو چکا ہے۔

ہرقل نے حکم دیا کہ فوری طور پر کسی عرب کو لایا جائے تا کہ اس سے پوچھ گچھ کی جاسکے۔ تقدیر کی بات کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام آیا ہوا تھا۔ ایک مدت سے مکہ اور مدینہ کی جنگوں نے تجارتی راستے مخدوش کر رکھے تھے، مگر صلح حدیبیہ کے باعث امن و امان تھا، قریش کے ہر فرد نے کچھ نہ کچھ سرمایہ ڈال کر ابوسفیان بن حرب کی قیادت میں یہ قافلہ بھیجا تھا۔ یہ لوگ غزہ میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ ہرقل کے کارندے یک دم ان کے سروں پر جا پہنچے اور ان کو حراست میں لے کر ہرقل کے پاس لے آئے۔ [1] ہرقل نے ترجمان کی وساطت سے پوچھا:

''تم میں سے کون ہے جو اس نبی سے رشتے میں سب سے قریب ہے؟'' ابوسفیان نے کہا: ''میں ہوں۔''

ہرقل کے اشارے پر سپاہیوں نے ابوسفیان کو آگے بٹھا دیا اور باقی عربوں کو پیچھے بٹھا دیا۔

ہرقل نے ترجمان کے ذریعے گفتگو شروع کی مگر اس سے پہلے باقی عربوں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا:

''میں اس (ابوسفیان) سے کچھ سوال کروں گا، اس شخص کے بارے میں جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ اگر یہ سچ سچ جواب دے تو تم اس کی تصدیق کرنا۔ لیکن اگر یہ غلط بیانی سے کام لے تو تم بتا دینا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔''

اس انتظام کے بعد ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا:

''یہ بتاؤ تمہارے جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، اس کا حسب نسب کیا ہے؟''

اس وقت تک ابوسفیان اسلام نہیں لائے تھے مگر زبان کے سچے تھے، اس لیے کہا:

''وہ ایک شریف خاندان اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔''

ہرقل نے سوال کیا: ''ان کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ تو نہیں گزرا؟'' ابوسفیان نے کہا: ''نہیں۔''

ہرقل نے کہا: ''جب انہوں نے نبوت کا اعلان نہیں کیا تھا، تو اس سے پہلے تم نے اس پر کبھی جھوٹ کا الزام لگایا؟''

ابوسفیان کا جواب اب بھی نفی میں تھا۔

ہرقل نے دریافت کیا: ''اچھا ان کے ماننے والے شرفاء کس قسم کے لوگ ہیں؟ امیر کبیر یا کمزور؟''

---

[1] اندازاً یہ واقعہ ۷ ہجری کے موسم گرما کا ہے؛ کیوں کہ قریش شام کا تجارتی سفر ہمیشہ گرمیوں میں کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے سلاطین کے نام مراسلے ۷ ہجری کے آغاز میں غزوہ خیبر کے دوران یا اس کے فوراً بعد روانہ کیے تھے جو مئی جون ۶۲۸ء کے ایام تھے۔ آپ ﷺ کے قاصد دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو قیصر کے دربار میں پہنچتے پہنچتے ایک ماہ لگا ہوگا، یعنی اندازاً قیصر نے یہ مکتوب جون یا جولائی میں پڑھا تھا۔ اس سے کچھ دن پہلے اس نے قریشی تاجروں سے ملاقات کی تھی جو مئی یا جون میں حسب معمول شام پہنچے ہوں گے۔ اس سے یہ پہلو یقینی ہو جاتا ہے کہ غزوہ خیبر مدنی محرم میں واقعہ ہوا تھا نہ کہ کی محرم (مطابق جمادی الاولیٰ مدنی) میں۔ اگر یہ غزوہ جمادی الاولیٰ مدنی میں ہوتا جو ستمبر ۶۲۷ء کے بالمقابل آتا ہے تو دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی قیصر کے پاس حاضری موسم سرما میں ہی ہو سکتی تھی۔ اب قریش کی حاضری اسی موسم میں ماننا بھی بعید ہے؛ کیوں کہ وہ سرما میں شام نہیں جاتے تھے۔ پس یا تو یہ کہا جائے کہ قریشی اس موسم سرما کے چھ سات ماہ بعد اگلی گرمیوں میں شام پہنچے تھے یا کہا جائے کہ وہ اس سے تین چار ماہ پہلے شام کا چکر لگا چکے تھے۔ یہ دونوں امکانات بعید ہیں؛ کیوں کہ روایات سے ظاہر ہے کہ قریشی وفد اور دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی سفارت کا وقت تقریباً ایک ہی تھا۔

ابوسفیان کا جواب تھا: ''زیادہ تر غریب مسکین لوگ۔''

ہرقل نے پوچھا: ''ان کے ساتھی کم ہو رہے ہیں یا بڑھ رہے ہیں؟'' ابوسفیان نے کہا: ''بڑھتے جارہے ہیں۔''

ہرقل نے سوال کیا: ''ان کا کوئی ساتھی ان سے ناراض ہو کر بھاگا ہے؟'' ابوسفیان نے کہا: ''نہیں۔''

ہرقل نے پوچھا: ''تمہاری ان سے جنگیں ہوئی ہیں؟''

ابوسفیان نے اثبات میں جواب دیا تو ہرقل نے پوچھا: ''ان جنگوں کا نتیجہ کیا نکلا؟''

جواب ملا: ''کبھی ہم جیت جاتے ہیں، کبھی وہ۔''

ہرقل نے پوچھا: ''وہ تمہیں کس چیز کا حکم دیتا ہے؟''

ابوسفیان بولے: ''وہ کہتے ہیں کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اپنے آباؤ اجداد کی پیروی چھوڑ دو۔ اور وہ ہمیں نماز پڑھنے، زکوٰۃ ادا کرنے، صلہ رحمی کرنے، سچ بولنے اور پاک باز بننے کا حکم دیتے ہیں؟''

ہرقل نے پوچھا: ''کیا اس نے تمہارے ساتھ کبھی بدعہدی کی ہے؟''

ابوسفیان نے کہا: ''نہیں۔ ہاں! آج کل ہمارا ان سے ایک معاہدہ (صلح حدیبیہ) ہوا ہے، معلوم نہیں وہ اس کی پابندی کرتے ہیں یا نہیں۔'' ابوسفیان بعد میں یہ واقعہ سناتے ہوئے کہتے تھے:

''اس پوری گفتگو میں اس جملے کے سوا مجھے حضور ﷺ پر حرف گیری کی کوئی گنجائش نہیں ملی۔

ہرقل نے پوچھا: ''ان کے خاندان میں پہلے کسی نے یہ دعویٰ کیا ہے؟'' ابوسفیان نے کہا: ''نہیں۔''

ابوسفیان نے جتنی صفات بتائی تھیں وہ سب گزشتہ آسمانی کتابوں میں مذکور نشانیوں کے عین مطابق تھیں، اس لیے ہرقل نے یہ ساری باتیں سن کر کہا:

''میں نے تم سے ان کے حسب نسب کے بارے میں پوچھا، تو تم نے بتایا کہ وہ شریف النسب ہیں۔''

پیغمبر اسی طرح شریف خاندانوں میں مبعوث ہوتے ہیں۔

میں نے تم سے پوچھا کہ ان کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ گزرا، تم نے کہا: نہیں۔ اگر ان کے بڑوں میں کوئی بادشاہ ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ آدمی اپنی آبائی بادشاہت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

میں نے تم سے پوچھا تھا کہ ان کے پیروکار امیر ہیں یا کمزور لوگ؟ تم نے بتایا: کمزور لوگ۔ رسولوں کے پیروکار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں نے تم سے پوچھا کہ اس نے کبھی جھوٹ بولا؟ تم نے کہا کہ نہیں۔ میں سمجھ گیا کہ جو شخص انسانوں کے بارے میں جھوٹ نہیں بولتا، وہ اللہ کے بارے میں کیسے جھوٹ بولے گا۔

میں نے تم سے پوچھا کہ ان کا کوئی ساتھی ان سے ناراض ہو کر بھاگا ہے؟ تم نے کہا: نہیں۔ واقعی ایمان جب دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

میں نے تم سے پوچھا کہ ان کے ساتھی گھٹ رہے ہیں یا بڑھ رہے ہیں؟ تم نے کہا کہ بڑھ رہے ہیں۔

ایمان کی تحریک اسی طرح پایۂ تکمیل کو پہنچ کر رہتی ہے۔

میں نے تم سے پوچھا کہ ان کی تم سے جنگیں ہوئی ہیں؟ تم نے بتایا کہ جنگیں ہوئیں ہیں اور کبھی تم جیت جاتے ہو، کبھی وہ جیت جاتے ہیں۔ رسولوں کو اسی طرح آزمایا جاتا ہے، یہاں تک کہ انجام کار انہی کو فتح ہوتی ہے۔ میں نے تم سے پوچھا کہ کبھی انہوں نے بدعہدی کی؟ تم نے کہا کہ بدعہدی کبھی نہیں کی۔ رسول ایسے ہی ہوتے ہیں کہ بدعہدی نہیں کرتے۔

میں نے تم سے پوچھا کہ یہ دعویٰ پہلے بھی کسی نے کیا تھا؟ تم نے کہا: نہیں۔ اگر یہ دعویٰ پہلے بھی کسی نے کیا ہوتا تو میں کہتا کہ یہ آدمی پہلے والوں کے دعوے کی نقل کر رہا ہے۔

میں نے پوچھا کہ وہ تمہیں کس بات کا حکم دیتا ہے؟ تم نے بتایا کہ وہ اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیتے ہیں، شرک اور بتوں کی پرستش سے منع کرتے ہیں۔ نماز، روزے، صلہ رحمی اور پاک بازی کا حکم دیتے ہیں۔ اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو وہ واقعی نبی ہیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ ظاہر ہونے والے ہیں۔ مگر مجھے یہ گمان نہیں تھا کہ ان کی بعثت تمہارے درمیان ہوگی۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ میں ان تک پہنچ سکتا ہوں تو میں ان کی خدمت میں جانا پسند کرتا۔ اور اگر میں ان کے پاس ہوتا تو ان کے پاؤں دھو کر پیتا۔ یقیناً وہ یہ زمین بھی فتح کر لیں گے جس پر میں کھڑا ہوں۔''[1]

ابوسفیان کہتے ہیں: اس کے بعد سے میں پست حوصلہ ہوگیا اور مجھے یہ یقین ہوگیا کہ رسول اللہ غالب ہو کر رہیں گے، یہاں تک کہ اللہ نے میرے دل میں اسلام کی حقیقت بھی ڈال دی اگرچہ میں اسے ناپسند کر رہا تھا۔[2]

مکتوبِ اقدس ہرقل کے سامنے اور ہرقل کا اپنی قوم سے خطاب:

اسی اثناء میں دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ ہرقل کے نام حضور ﷺ کا مراسلہ لے کر شام کے سرحدی شہر بُصریٰ پہنچ چکے تھے۔ حاکم بُصریٰ نے انہیں ہرقل کے پاس بیت المقدس بھیج دیا۔ مراسلہ پڑھ کر ہرقل سناٹے میں آگیا۔

رسول اللہ ﷺ کے مکتوبِ گرامی میں تحریر تھا:

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ محمد رسول اللہ کی جانب سے روم کے سربراہ ہرقل کے نام۔ ہدایت کی پیروی کرنے والے پر سلامتی ہو۔ میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام لے آؤ سلامت رہو گے اور اللہ تمہیں دوگنا ثواب دے گا۔ اگر بے توجہی برتی تو دوسرے عیسائی فرقوں کی گمراہی کا وبال بھی تمہارے سر ہوگا۔''

---

① صحیح مسلم، ح: ۴۷۰۷، الجهاد والسير، باب كتاب النبی ﷺ الى هرقل؛ صحیح البخاری، ح: ۷، بدء الوحی؛ صحیح البخاری، ح: ۴۵۵۳، كتاب التفسير، باب قوله: قل يااهل الكتب تعالوا؛ البداية والنهاية: ۲/۲۶۸ تا ۲۷۰

② صحیح البخاری، ح: ۲۹۴۱، کتاب الجهاد، باب دعاء النبی ﷺ الناس

اس کے بعد سورۂ آل عمران کی آیت درج تھی:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾

''اے اہل کتاب! ایسی بات کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیاں مشترک ہے، وہ یہ کہ اللہ کے سوا ہم کسی کو معبود قرار نہیں دیں گے، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے اور ہم اللہ کو چھوڑ کر آپس میں کسی انسان کو رب کا درجہ نہیں دیں گے، اگر وہ نہ مانیں تو تم کہہ دو کہ گواہ رہنا ہم تو تابع دار ہیں۔''[1]

ہرقل جو کہ گزشتہ کتابوں اور آخری پیغمبر کی نشانیوں کی اچھی خاصی معلومات رکھتا تھا، جان گیا تھا کہ اس پیغام کا حرف حرف سچ ہے اور اسے قبول کرنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ مگر اسے خطرہ تھا کہ اسلام قبول کرنے میں اس کی قوم اور خصوصاً پادری اس کا ساتھ نہیں دیں گے۔ وہ اسے معزول کر دیں گے اور یہ بھی بعید نہیں کہ قتل کر دیں۔

خاصے سوچ بچار کے بعد بیت المقدس سے حمص لوٹ کر اس نے دربار منعقد کیا۔ جب پادری اور امراء جمع ہو گئے تو اس نے دروازوں پر تالے لگوا دیے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا مشورہ دیتے ہوئے کہا: ''روم والو! کیا تم نہیں چاہتے کہ تمہیں کامیابی ملے، ہدایت نصیب ہو اور تمہاری سلطنت بھی قائم رہے۔ پس تم اس نبی کی پیروی کر لو۔''

یہ سنتے ہی حاضرین بگڑ گئے اور شور مچاتے ہوئے باہر دوڑے، جب دروازے بند دیکھے تو پلٹ آئے۔ انہوں نے اس قدر غیظ وغضب کا اظہار کیا کہ ہرقل کو تخت اور جان دونوں سے ہاتھ دھونے کا خطرہ لاحق ہو گیا، تب اس نے ایک سیاسی ادا کے ساتھ کہا: ''میں تو تمہیں آزمانے کے لیے یہ پوچھ رہا تھا تاکہ پتا چلے تم اپنے دین پر کتنے پکے ہو۔''[2]

ہرقل کا جوابی مراسلہ اور تحائف:

ہرقل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا قائل ہو چکا تھا مگر قومی عصبیت اور اقتدار کی چاہت نے اسے اسلام قبول کرنے سے باز رکھا، تاہم اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب کو نہایت عزت واحترام سے اپنے پاس محفوظ کر لیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام جوابی مراسلہ دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا جس میں ظاہر کیا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مانتا ہے مگر اپنی قوم کے سامنے بے بس ہے۔ اس نے کچھ ہدیہ بھی بھیجا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام میں تقسیم کر دیا۔[3]

ہرقل یہ جان چکا تھا کہ اس کے ملک پر مسلمانوں کا قبضہ اب چند برسوں کی بات ہے، اس لیے اس نے آخری کوشش کے طور پر اپنے امراء کو اس پر راضی کرنا چاہا کہ صرف شام کا علاقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دے کر اپنی باقی سلطنت کے

---

① سورۂ آل عمران، آیت: ۶۴

② صحیح البخاری، ح: ۷، بدء الوحی ۱ ح: ۲۹۴۰، ۲۹۴۱، کتاب الجهاد، باب دعاء النبی ﷺ الناس الی الاسلام ۱ ح: ۴۵۵۳، کتاب التفسیر، باب قوله: قل یا اهل الکتب تعالوا الی کلمة

③ السیرة الحلبية: ۳/۳۴۳، ۳۴۵، ط العلمية

بچاؤ کی ضمانت لے لی جائے مگر امراء نے اس تجویز کو بھی سختی سے مسترد کر دیا۔ آخر کار ہرقل ذہنی طور پر شام سے دستبردار ہو کر یورپ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔[1]

رومیوں کے ہاں مکتوبِ نبوی کی حفاظت:

ہرقل نے اس کے بعد مزید بارہ، تیرہ سال (۶۴۱ء) تک حکومت کی، آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں قُسطُنطِینیہ میں فوت ہوا اور وہیں دفن ہوا، تب تک اس کے ایشیائی علاقوں پر اسلام کا پرچم لہرا چکا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب مبارک عمر بھر اس نے بڑی حفاظت سے اپنے خاص خزانے میں رکھا۔ اس کے جانشینوں نے بھی مدت دراز تک اس کی حفاظت کی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک یہ مکتوب رہے گا، ان کی بادشاہت محفوظ رہے گی۔[2]

حارث بن ابی شمر کے نام مراسلۂ نبوی:

دوسرا مراسلہ سرحداتِ شام کے عرب گورنر حارث بن ابی شمر غسانی کے نام تھا جو شجاع بن وہب رضی اللہ عنہ لے کر گئے تھے۔ حارث بن ابی شمر نے پیغام کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھا اور جواب میں مدینہ پر فوج کشی کی دھمکی دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب سن کر فرمایا: ''اس کی حکومت تباہ ہوگی۔''[3]

شاہِ مصر مُقَوقِس کے نام گرامی نامہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسرا مراسلہ مصر کے حکمران جُریج بن میناء کے نام روانہ کیا تھا، جسے عرب ''مُقَوقِس'' کے لقب سے یاد کرتے تھے، وہ قبطی النسل تھا، مصر میں قیصر کا نائب السلطنت ہونے کے علاوہ بڑے پادری کی حیثیت سے مذہبی پیشوا بھی وہی تھا مگر اندازہ ہوتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مکتوب لکھا تب وہ مقامی قبطیوں کی حمایت سے مصر کا خود مختار حکمران بن چکا تھا یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ''عظیم القبط'' (قبطیوں کا سربراہ) کہہ کر مخاطب کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکتوب میں لکھا تھا:

''اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے محمد رسول اللہ کی جانب سے مُقَوقِس سربراہِ قِبط کے نام! ہدایت کی پیروی کرنے والے پر سلامتی ہو، میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام لے آؤ، سلامت رہو گے، اللہ تمہیں دوگنا ثواب دے گا، اگر انکار کرو گے تو اپنے ہم قوموں کا گناہ بھی تمہارے سر ہوگا۔''[4]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ گرامی نامہ حضرت حاطب بن ابی بَلْتَعہ رضی اللہ عنہ لے گئے۔ مُقَوقِس عیسائیوں کی مذہبی کتابوں کا گہرا علم رکھنے کی وجہ سے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانیوں سے خوب واقف تھا تاہم اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کا امتحان لینے کی غرض سے سوال کیا: ''کیا تم مانتے ہو کہ تمہارے آقا نبی ہیں؟'' حاطب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''ہاں بالکل۔''

① البداية والنهاية: ۶/ ۳۸۱، ۳۸۲، دارِ هجر

② الروض الانف: ۷/ ۴۰۰، ط دار احياء التراث العربی ؛ ارشاد الساری، شرح البخاری للقسطلانی: ۱/ ۸۱، ط الامیریة

③ تاريخ الطبری: ۲/ ۶۵۲

④ الاكتفاء بما تضمنه من مغازی رسول الله ﷺ والثلاثة الخلفاء لابی الربيع الحميری (م ۶۳۴ھ): ۲/ ۱۴، ط العلمية

وہ بولا: ''اگر تمہارے آقا نبی ہیں تو انہیں ان کی قوم نے وطن سے کیسے نکال دیا؟ انہوں نے ان کے خلاف بددعا کیوں نہ کی؟''

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ فوراً بولے: ''کیا تم عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول نہیں مانتے؟''

مُقوقِس نے کہا: ''کیوں نہیں!''

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تو پھر تمہارے گمان کے مطابق جب ان کی قوم نے انہیں سولی دینے کی کوشش کی تو انہوں نے قوم کی ہلاکت کی بددعا کیوں نہ کی؟''

مُقوقِس لاجواب ہو کر بولا: ''تم دانا آدمی ہو اور ایک دانا شخصیت کے نمائندے ہو۔''

اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرامی نامے کو چوما اور حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور تحائف ایک عمدہ پوشاک، ایک بہترین خچر اور دو باندیاں روانہ کیں۔[1]

کسریٰ پرویز کے نام مکتوبِ گرامی:

چوتھا مکتوب ایران کے بادشاہ کسریٰ پرویز کے نام تھا جو بڑے رعب و دبدبے کا مالک اور بہت بڑی سلطنت کا مطلق العنان حکمران تھا۔ اس کو حکومت کرتے اڑتیس سال ہونے والے تھے اور اس عرصے میں اس نے ساسانی خاندان کی سطوت و شوکت کو بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ اگر ہرقل اس سے رومیوں کے مقبوضہ علاقے واپس نہ لے لیتا تو ایران دنیا کی واحد عالمی طاقت کی حیثیت حاصل کر لیتا۔ تاہم ہرقل سے شکست کھانے کے باوجود ابھی تک کسریٰ کی سلطنت چین کی سرحدوں سے لے کر جزیرۃ العرب کے مشرقی اور جنوبی علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ ادھر یمن بھی تقریباً لگ بھگ نصف صدی سے ایرانی استبداد میں جکڑا ہوا تھا، اس لیے ایرانی حکام عربوں کو اپنا محکوم سمجھتے تھے۔ کسریٰ کے نام مکتوب حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ لے کر گئے تھے، جس میں تحریر تھا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے کسریٰ سربراہِ فارس کے نام! سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس بات کی کہ میں تمام جہان کے لیے اللہ کا رسول ہوں۔ اللہ نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ میں ہر زندہ انسان کو خبردار کروں۔ اسلام لے آؤ، سلامت رہو گے۔ اگر منہ پھیرو گے تو ملتِ مجوس کی گمراہی کا وبال تمہی پر ہوگا۔''[2]

کسریٰ پرویز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب پڑھ کر چراغ پا ہو گیا اور اسے پرزے پرزے کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے یمن میں اپنے گورنر باذان کو تاکیدی حکم بھیجا کہ وہ نبوت کے اس دعوے دار کو گرفتار کر کے اس کے دربار میں روانہ کر دے۔

باذان جانتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس مرتبے کے قائد ہیں مگر اس کا خیال تھا کہ کسریٰ کے حکم کے آگے دنیا کا کوئی بھی حکمران چوں چراں کی جرأت نہیں کر سکتا، اس لیے باذان نے فوری طور پر دو نمائندے اور پچیس سپاہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

[1] الاموال لابن زنجویہ، ح: ۹۲۹، ط مرکز الملک فیصل؛ البدایۃ والنہایۃ: ۶/۳۹۲ [2] تاریخ الطبری: ۳/۹۰

طرف روانہ کر دیے، ساتھ ہی حضور ﷺ کے نام یہ پیغام بھی دیا:

''اگر آپ خوشی خوشی کسریٰ کے پاس چل پڑیں تو میں آپ کو اپنا سفارتی خط لکھ دوں گا جو کام آئے گا اور اگر آپ نے انکار کیا تو کسریٰ آپ کی قوم کو ہلاک اور آپ کے ملک کو تباہ و برباد کر دے گا۔''

یہ گماشتے تیزی سے سفر کرتے ہوئے مدینہ منورہ پہنچے اور حضور ﷺ کو اپنی آمد کا مقصد بتا کر باذان کا پیغام سنایا۔

حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

''اگر یہ نبوت کا دعویٰ میں نے اپنی طرف سے کیا ہوتا تو باز آ جاتا مگر مجھے تو اللہ تعالیٰ نے اس کام پر لگایا ہے۔''

حضور ﷺ ایرانی قاصدوں کی لمبی لمبی مونچھیں اور منڈی ہوئی داڑھیوں سے اتنی کراہت محسوس کر رہے تھے کہ ان کے چہروں پر نگاہ بھی نہیں ڈال رہے تھے، آخر آپ نے یہ کہہ کر اپنی ناگواری کا اظہار فرمایا:

''تمہیں کس نے ایسی شکلیں بنانے کا حکم دیا ہے؟'' وہ بولے: ''ہمارے رب کسریٰ نے۔''

حضور ﷺ نے پر جلال انداز میں فرمایا:

''مگر مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے کہ میں مونچھیں کتاؤں اور داڑھی بڑھاؤں۔''

حضور اکرم ﷺ نے قاصدوں کو اپنے ہاں ٹھہرایا اور پھر ایک دن انہیں رخصت کرتے ہوئے کہا:

''جاؤ! اپنے گورنر باذان کو بتا دو کہ گزشتہ شب میرے رب نے تمہارے رب کسریٰ کو ہلاک کر دیا ہے۔''

ایرانیوں نے اس دن کی تاریخ لکھ لی اور بڑی حیرت کے عالم میں واپس روانہ ہوئے۔ اپنے ملک پہنچ کر انہیں پتا چلا کہ سرکارِ مدینہ ﷺ کی بات بالکل درست تھی۔ اسی تاریخ کو کسریٰ پرویز اپنے پایۂ تخت مدائن میں اپنے بیٹے شیرُوَیہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور ساسانی خاندان کی عظیم سلطنت ہچکولے کھانے لگی۔ ①

☆☆☆

① البدایة والنهایة: ۶/۳۸۳ تا ۳۹۰، دار هجر

فوائد نافعہ:

● واقدی نے کسریٰ کی موت کی تاریخ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ ہجری کی شب بتائی ہے، یہ تاریخ مکی تقویم کے مطابق ہے جبکہ مدنی تقویم کی تاریخ دس شوال تھی۔ واقدی نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اس وقت رات کے چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ عیسوی تقویم میں یہ تاریخ ۱۰ فروری ۶۲۹ء ہے۔ فروری میں اکثر ایشیائی ممالک میں چھ بجے تک سورج غروب ہو جاتا ہے، اس حساب سے قتل رات کے تقریباً بارہ بجے ہوا تھا۔

● یہاں تاریخ طبری کی ایک روایت کی غلطی واضح ہونی چاہیے جس میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کسریٰ کے قتل کی اطلاع حدیبیہ میں ملی تھی۔ (۲/۸۱۵، ۱۸۶) حالانکہ یہ درست نہیں۔ ۶ھ میں جب صلح حدیبیہ ہوئی تو سلاطین کے نام رسول اللہ ﷺ کے خطوط روانہ بھی نہیں ہوئے تھے۔

● شیرُوَیہ نے حکومت سنبھالنے کے بعد یمن کے گورنر باذان کو ہدایت کی کہ اس شخص پر نگاہ رکھو جس کے بارے میں کسریٰ نے تمہیں حکم نامہ بھیجا تھا۔ باذان نے اس حکم کی تعمیل نہ کی بلکہ یمن میں موجود متعدد فارسی امراء سمیت اسلام قبول کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس اطلاع پر مسرور ہو کر اسے ایک کمربند ارسال فرمایا۔ چونکہ کمربند کو لغت حمیر میں ''معجزہ'' کہا جاتا ہے، اس لیے باذان کو یمن میں ''ذوالمعجزۃ'' اور اس کی اولاد کو ''بنو ذی المعجزۃ'' کہا جانے لگا۔ (تاریخ الطبری: ۲/۱۳۳)

● علامہ ابن الجوزی نے نقل کیا ہے کہ کسریٰ پرویز مرنے سے پہلے شیرُوَیہ کے قتل کا انتظام کر گیا تھا۔ اس نے اپنے خزانے کے محفوظ ترین صندوق میں ایک شیشی میں چند زہریلی گولیاں رکھ دی تھیں اور اس پر ایسے الفاظ چسپاں کر دیے تھے جن سے ظاہر ہو کہ یہ گولیاں قوتِ باہ کو بے پناہ بڑھا دیتی ہیں۔ شیرُوَیہ نے جب اپنے خزانوں کی تلاشی لی تو آخر اس محفوظ صندوق تک بھی پہنچ گیا۔ شیشی کا عنوان دیکھ کر اس نے گولیاں کھا لیں اور زہر کے اثر سے مر گیا۔ (صید الخواطر، ص ۱۶۷)

نجاشی کے نام مکتوبِ گرامی:

رحمت عالم ﷺ کا پانچواں مراسلہ حبشہ کے نئے بادشاہ نجاشی کے نام تھا جو ربیع الاول ۷ھ میں حضرت عمرو بن اُمیہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ بھیجا گیا۔ گرامی نامہ پڑھ کر نجاشی نے بلا تامل اسلام قبول کر لیا اور کہا:

"اگر ممکن ہوتا تو میں خود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری دیتا۔" ①

عرب امراء کے نام مراسلے:

ان بادشاہوں کے علاوہ رحمت عالم ﷺ نے جزیرۃ العرب کے کئی خود مختار حکمرانوں کے نام بھی خطوط روانہ کیے جن میں سے بحرین کے حاکم مُنذِر بن ساویٰ، یمامہ کے حاکم ہَوذہ بن علی، عُمان کے امراء عیاذ بن جُلُندا اور جَیفَر بن جُلُندا قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے مُنذِر بن ساویٰ اور عُمان کے دونوں حکمران بھائیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ②

☆☆☆

عمرۂ قضا

ذوالقعدہ سن ۷ ہجری میں آنحضرت ﷺ قریش سے گزشتہ سال کیے گئے معاہدے کے مطابق عمرہ قضا کے لیے مکہ تشریف لے گئے۔ یکم ذوالقعدہ کو روانگی ہوئی جس میں وہی لگ بھگ چودہ سو صحابہ ہم رکاب تھے جو گزشتہ سال بیعتِ رضوان میں شریک تھے۔ حضور ﷺ نے کسی ممکنہ خطرے کے پیشِ نظر جنگی ساز و سامان یعنی خود، زرہیں اور نیزے وغیرہ ساتھ رکھے تھے مگر مکہ میں داخلے سے قبل حسب معاہدہ یہ سامانِ حرب سو مجاہدین کی نگرانی میں وادیٔ یاجج میں رکھوا دیا۔ ③

قریش نے آپ ﷺ کے مکہ داخلے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی۔ تاہم صحابہ نے مکہ میں داخل ہوتے ہوئے احتیاطاً حضور ﷺ کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا تاکہ کوئی کافر ایذا رسانی کی حماقت نہ کر بیٹھے۔ ④

---

① طبقات ابن سعد: ۱/۲۰۷، ط دار صادر

فائدہ: صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ان النبی ﷺ کتب الی کسریٰ والی قیصر، والی النجاشی والی کل جبار یدعوھم الی اللہ تعالیٰ ولیس بالنجاشی الذی صلیٰ علیہ. (صحیح مسلم، ح: ۴۶۰۹، الجهاد والسیر، باب کتب النبی ﷺ الی ملوک الکفار)

یعنی حضور ﷺ کی طرف سے بادشاہوں کو دعوتی مراسلے بھیجنے کے دوران جس نجاشی کو دعوتِ اسلام دی گئی، وہ دوسرا نجاشی تھا۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ یہ مکتوب نجاشی اصحمہ کے نام نہیں تھا، بلکہ کچھ دن پہلے ان کی وفات ہو گئی تھی۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں یہ وضاحت ہے کہ جس نجاشی کی نماز جنازہ پڑھی گئی، ان کا نام اصحمہ تھا۔ (صحیح البخاری، ح: ۳۸۷۷، کتاب المناقب، باب موت النجاشی) اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (جن کی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری محرم ۷ھ میں غزوہ خیبر کے دوران ہوئی تھی) اصحمہ کی نماز جنازہ میں شامل تھے۔ "عن ابی ھریرۃ نعیٰ لنا رسول اللہ ﷺ النجاشی صاحب الحبشۃ یوم الذی مات فیہ. (ح: ۱۳۲۷، باب الصلاۃ علی الجنائز بالمصلی)

پس اصحمہ کی وفات محرم یا صفر ۷ھ میں ہوئی تھی اور حبشہ میں فوراً نئے نجاشی کا تقرر ہو گیا تھا جسے یہ مکتوب گرامی ربیع الاول ۷ھ میں بھیجا گیا تھا۔

② الکامل فی التاریخ: ۲/۹۵ تحت ۷ ھجری

③ طبقات ابن سعد: ۲/۱۲۰، ۱۲۱

بیعتِ رضوان کے فقط وہ حضرات اس فہرست میں شامل نہ تھے جو دورانِ سال وفات پا گئے تھے یا جہاد میں شہید ہو گئے تھے۔

④ صحیح البخاری، ح: ۴۲۵۵، باب عمرۃ القضاء، کتاب المغازی

اس دن عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی سواری کے آگے آگے یہ شعر پڑھتے جارہے تھے:

خَلُّوْا بَنِی الْکُفَّارِ عَنْ سَبِیْلِهٖ ......اَلْیَوْمَ نَضْرِبُکُمْ عَلٰی تَنْزِیْلِهٖ

ضَرْبًا یُزِیْلُ الْهَامَ عَنْ مَقِیْلِهٖ......وَیُذْهِلُ الْخَلِیْلَ عَنْ خَلِیْلِهٖ

(اے کافرزادو! حضور ﷺ کا راستہ خالی کردو......آج ان کی تشریف آوری کے موقع پر ہم تم پر وار کریں گے۔
ایسا وار جو کھوپڑیوں کو گردنوں سے الگ کردے......اور دوست کو دوست سے بے گانہ کردے۔)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں ایسے اشعار پڑھتے ہوئے دیکھا تو اعتراض کے طور پر کہا:

''رسول اللہ کے سامنے اور اللہ کے حرم میں ایسے اشعار پڑھتے ہو؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے عمر! جانے دو۔ یقیناً یہ اشعار مشرکین پر تیروں سے سریع الاثر ہیں۔''[1]

قریش اپنے گھروں کو چھوڑ کر کوہِ قُعَیقِعان پر چلے گئے، وہاں سے وہ مسجد الحرام میں مسلمانوں کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے دیکھ رہے تھے۔ حضور ﷺ نے صحابہ کرام کو چستی اور تندرستی کا اظہار کرنے کے لیے حکم دیا کہ وہ طواف کے ابتدائی تین چکروں میں تیزی سے چلیں۔ قریش جو گمان کررہے تھے کہ مسلمان مدینہ جاکر بیمار رہنے لگے ہیں، یہ دیکھ کر بولے: ''یہ لوگ تو زیادہ چاق و چوبند ہوگئے ہیں۔''[2] تیسرے دن کفار نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا:

''اپنے آقا سے کہہ دو کہ یہاں سے نکل جائیں، آج میعاد پوری ہورہی ہے۔''[3]

حضور ﷺ نے حسبِ وعدہ مکہ سے نکلنے کی تیاری کی۔ مکہ میں کچھ مجبور مسلمان سخت پریشانی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ اُمّ عُمارہ (سلمٰی بنت عُمیس رضی اللہ عنہا) اور بیٹی عُمارہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں۔ جب حضور ﷺ مکہ سے نکلنے لگے تو عُمارہ رضی اللہ عنہا ''چچا جان چچا جان'' کہتے ہوئے پیچھے پیچھے دوڑ پڑیں۔ حضور ﷺ نے انہیں اور ان کی والدہ کو ساتھ لے لیا۔ اس یتیم بچی کی کفالت کا شرف حاصل کرنے کے لیے حضرت علی، حضرت جعفر اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم باہم الجھ گئے۔ حضور ﷺ نے یہ دیکھ کر فرمایا: ''خالہ ماں کی طرح ہوتی ہے۔'' یہ کہہ کر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو سرپرست مقرر کردیا؛ کیوں کہ ان کے نکاح میں بچی کی سگی خالہ اسماء بنت عُمیس رضی اللہ عنہا تھیں۔[4]

چونکہ کچھ مدت قبل صلح نامے کی وہ شقیں منسوخ کردی گئی تھیں جن کے تحت مکہ کے کسی مسلمان کا مدینہ جانا ممنوع تھا۔ اس لیے ان بے کسوں کو اپنے ساتھ لے جانے کی پوری گنجائش تھی۔

---

[1] سنن الترمذی، ح: ۲۸۴۷، ابواب الادب، باب فی انشاد الشعر [2] صحیح البخاری، ح: ۴۲۵۶، باب عمرۃ القضاء، کتاب المغازی
فائدہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس عمرے میں حضور ﷺ کے ہمراہ تھے اور وہ حضور ﷺ کے چار عمروں میں سے ایک عمرے کو رجب کا عمرہ شمار کرتے تھے۔ (صحیح البخاری، ح: ۱۷۷۵، باب کم اعتمر النبی ﷺ) جبکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی عمرہ رجب میں نہیں کیا۔ (صحیح البخاری، ح: ۱۷۷۶) اس اختلاف کی وجہ غالباً یہی تھی کہ اس عمرے کی تاریخ ذوالقعدہ (مدنی) محفوظ ہے جبکہ مکی تقویم میں یہ رجب تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس عمرے کی تاریخ مدنی تقویم کے مطابق اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو مکی تقویم کے حساب سے یاد تھی۔
[3] صحیح البخاری، ح: ۴۲۵۱ ؛ صحیح مسلم، ح: ۳۱۱۸، کتاب الحج، باب استحباب الرمل
[4] صحیح البخاری، ح: ۲۶۹۹، باب کیف یکتب هذا ما صالح علیه فلان، کتاب الصلح ؛ طبقات ابن سعد: ۱۲۲/۲

حضرت میمونہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا سے نکاح:

مکہ میں حضرت عباس، ان کے اہل وعیال اور بعض رشتہ دار سخت دباؤ کی زندگی گزار رہے تھے۔[1] اُم فضل (زوجہ عباس بن عبدالمطلب) کی چھوٹی بہن میمونہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا بھی مکہ کے ان مجبور مسلمانوں میں سے ایک تھیں۔ ان کے شوہر ابورُہم کی وفات ہو چکی تھی۔ وہ مدینہ جانا چاہتی تھیں مگر وہاں ان کا کوئی والی نہ تھا۔ ایسے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مکہ کے مجبور مسلمانوں کے حال سے واقف تھے، مناسب معلوم ہوا کہ میمونہ رضی اللہ عنہا کو اپنی زوجیت میں لے لیا جائے۔ خانوادۂ عباس کی بھی خواہش تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ داری میں مزید اضافہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرے کے لیے روانگی سے پہلے ابورافع اور اَوس بن خولی رضی اللہ عنہما کو نکاح کے وکیل اور گواہ کے طور پر حضرت عباس کے پاس بھیج دیا تھا۔ ادھر حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا حضرت عباس کو اپنا ولی مقرر کر چکی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے پیامِ نکاح پہنچا تو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا رضامند ہو گئیں۔ حضرت عباس نے ابورافع اور اَوس بن خولی رضی اللہ عنہما کی موجودگی میں نکاح پڑھا دیا۔

عمرے سے واپسی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ سے نکل کر ''سرِف'' کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔ ابورافع رضی اللہ عنہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کو یہاں لے آئے۔ رسمِ رخصتی انجام پائی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے۔[2]

☆☆☆

حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال

عمرے سے واپسی پر سال ۸ھ کا آغاز ایک المناک سانحے سے ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا وفات پا گئیں۔ ان کے شوہر حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ نے گزشتہ سال اسلام قبول کر کے مدینہ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ مگر دونوں ابھی ایک سال ہی ساتھ گزار پائے تھے کہ زینب رضی اللہ عنہا بیمار ہوئیں اور اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو تجہیز وتکفین کے لیے ابوالعاص رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لائے۔ حضرت اُمّ اَیمن، حضرت سَودہ اور حضرت اُمّ سَلمہ رضی اللہ عنہن نے غسل دیا۔[3] بیٹی کو قبر میں اتارتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید رنجیدہ لگ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد آپ کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ صحابہ کرام کے دریافت کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مجھے اپنی بچی کی کمزوری وناتوانی کا خیال آرہا تھا۔ میں نے اللہ سے دعا کی کہ اسے قبر کی تنگی سے محفوظ رکھا جائے یہ دعا قبول کر لی گئی ہے۔ اس کے ساتھ آسان معاملے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔''[4]

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۱۳۵۷، باب اذا اسلم الصبی فمات [2] طبقات ابن سعد: ۱۲۲/۲؛ سیر اعلام النبلاء: ۲۳۸/۲ تا ۲۴۰

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محرم تھے یا نہیں؟ اس بارے میں ایک رائے نفی کی اور ایک اثبات کی ہے۔ یہ مسئلہ نہایت معرکۃ الآراء ہے جس پر شارحین اور فقہاء نے طویل کلام کیا ہے۔ راقم اس کا خلاصہ یوں سمجھا ہے کہ جو حضرات حالتِ احرام میں نکاح کی نفی کرتے ہیں، وہ اس وقت کا لحاظ کرتے ہیں جب مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغامِ نکاح روانہ کیا تھا، اس وقت آپ نے احرام نہیں باندھا تھا۔ جو حضرات عقدِ نکاح کو حالتِ احرام میں تصور کرتے ہیں ان کا رُخ اس طرف ہے کہ وکلاء کے ذریعے پیغامِ نکاح دے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمرے کے لیے روانہ ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ پہنچنے سے قبل حضرت عباس نکاح کرا چکے تھے۔ پس نکاح کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم محرم تھے۔ یہ اپنے اپنے زاویہ نگاہ کا فرق ہے۔ احناف کا فقہی مذہب یہاں گنجائش پر مبنی ہے اور شوافع کا احتیاط پر۔

[3] طبقات ابن سعد، ترجمۃ: زینب بنت محمد رضی اللہ عنہا [4] اسد الغابۃ، تر: زینب بنت محمد رضی اللہ عنہا

بازنطینی روما سے پہلی ٹکر۔ جنگ مُوتہ

آنحضرت ﷺ کی جانب سے فرمانرواؤں سے مراسلت اور انہیں اسلام کی دعوت دینے کا سلسلہ جاری تھا،اس ضمن میں آپ نے حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کو شام کے سرحدی شہر بُصریٰ کے حاکم شُرحبیل بن عَمرو غسانی کے پاس بھیجا۔شُرحبیل نے تمام سفارتی اور اخلاقی ضابطوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دربارِ رسالت کے سفیر کو شہید کر دیا۔ یہ ایک ایسی حرکت تھی جس کو برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا۔حضور ﷺ کو اس خبر سے شدید صدمہ ہوا،آپ نے اب تک شام کی طرف لشکرکشی سے گریز کیا تھا اور شاید پورے عرب کی تسخیر تک آپ دنیا کی اس سب سے بڑی سلطنت سے محاذ آرائی پسند نہ فرماتے مگر اب خود ریاست مدینہ کی ساکھ کا معاملہ پیش آگیا تھا،اگر اس معاملے کو سرسری لیا جاتا تو کوئی بعید نہ تھا کہ رومی مدینہ کی طرف بڑھنے میں بھی دیر نہ لگاتے۔پس اب دینی حمیت کے ساتھ ساتھ حکمت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ آگے بڑھ کر دشمن پر ضرب لگائی جائے،اس لیے رسول اللہ ﷺ نے جمادی الاولیٰ سن ۸ ہجری میں تین ہزار مہاجرین وانصار کا لشکر مرتب فرما کر اسے شام کی سرحدوں کی طرف روانہ کر دیا۔[1] آپ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو لشکر کا امیر مقرر کیا جو آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام اور آپ کے گھر کے ایک فرد تھے۔اس وقت ان کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ اگر زید شہید ہوجائیں تو جعفر بن ابی طالب قیادت سنبھالیں، وہ بھی شہید ہوجائیں تو عبداللہ بن رَواحہ کو امیر بنایا جائے،وہ بھی شہید ہوجائیں تو مسلمان جسے چاہیں امیر بنالیں۔

یہ لشکر نہایت دور دراز کے سفر پر جارہا تھا۔مرکز سے اس کا رابطہ،خبررسانی کا انتظام اور خوراک ورسد کی فراہمی کا سلسلہ برقرار رکھنا بے حد مشکل تھا۔پھر مقابلے پر اتنی بڑی سلطنت تھی جوایک آن میں لاکھوں افراد مقابلے پر لاسکتی تھی، اس لیے شکست،پسپائی یا بھاری جانی نقصان کے خدشات موجود تھے۔نبی اکرم ﷺ نے لشکر کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔مجاہدین تقریباً گیارہ سوکلومیٹر کا دشوار گزار سفر کر کے رومیوں کی سرحدوں میں داخل ہوگئے۔یہاں انہیں معلوم ہوا کہ ایک لاکھ رومی ان کے مقابلے کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہیں اور لَخم،جُذام اور دوسرے عیسائی عربوں کی فوجیں بھی ان سے جاملی ہیں اور ان کی تعداد بھی لگ بھگ ایک لاکھ ہے۔مسلمانوں نے دو دن ''مَعان'' کے مقام پر مشورہ کرتے گزارے کہ اب کیا کیا جائے؛ کیوں کہ روانہ ہوتے وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنی بڑی فوج یک دم سامنے آجائے گی۔ جہاں دیدہ صحابہ کرام نے رائے دی کہ یہیں ٹھہر کر حضور ﷺ کو خط روانہ کر کے دشمن کی تعداد بتائی جائے۔جس کے بعد حضور ﷺ امدادی فوج بھیج دیں یا حکم دیں تو ہم نتائج سے بے پروا ہو کر جنگ میں کود جائیں۔مگر اس موقع پر عبداللہ بن رَواحہ رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی ایمانی قوت کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا: ''مسلمانو!تمہیں کیا

[1] یہ توقیت مدنی ہے جوکہ ذوالحجہ ۷ ہجری (اگست ستمبر ۶۲۹ء) کے مطابق ہے۔

ہو گیا؟ آج تم اسی چیز سے ڈر رہے ہو جس کے شوق میں گھروں سے نکلے تھے۔ تم شہادت کی تلاش میں نکلے تھے، ہم کبھی بھی تعداد، کثرت اور طاقت کی بنیاد پر نہیں لڑے۔ ہم اس دین کے بل بوتے پر لڑتے آئے ہیں جس کی وجہ سے اللہ نے ہمیں عزت بخشی، بس اب دو ہی باتیں ہیں اور دونوں ہی بہترین ہیں یا تو فتح ملے گی یا شہادت۔''

یہ سن کر سب کے حوصلے بلند ہو گئے۔ سب نے کہا: ''اللہ کی قسم! عبداللہ نے سچ کہا۔''

مسلمانوں نے اب لڑائی کے ارادے سے کوچ کیا اور جنگ کے لیے مناسب میدان تلاش کرتے ہوئے ایک گاؤں ''مُوتہ'' کے قریب جا کر صف بندی کی۔ یہاں دونوں لشکروں میں گھمسان کا رن پڑا۔ مسلمانوں کے امیر زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مرکزی پرچم اٹھائے قلب لشکر میں اپنی فوج کو لڑا رہے تھے، رومیوں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا اوران کے بہت سے سپاہی زید رضی اللہ عنہ تک پہنچ گئے۔ زید رضی اللہ عنہ آخر دم تک لڑتے رہے اور آخر کار نیزوں سے چھلنی ہو کر شہید ہو گئے۔

اسی لمحے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے پرچم سنبھال لیا اور اپنی فوج کو ہمت دلا کر نئے زور وشور سے دشمن کا مقابلہ شروع کیا، آخر رومیوں نے انہیں بھی گھیر لیا۔ وہ فرار کے وسوسے سے بچنے کے لیے اپنے سرخ گھوڑے سے نیچے کود گئے۔ ساتھ ہی گھوڑے کی اگلی ٹانگیں کاٹ دیں تاکہ کوئی رومی اس پر سواری نہ کر سکے۔ وہ دائیں ہاتھ سے پرچم تھامے بائیں ہاتھ سے لڑتے رہے، دایاں بازو کٹ گیا تو انہوں نے پرچم بائیں ہاتھ میں اُٹھا لیا، بایاں بازو بھی کٹ گیا تو انہوں نے پرچم کو دونوں کٹے ہوئے بازوؤں کے ساتھ سینے سے چمٹا لیا۔ دشمن ان پر پے در پے حملے کرتا رہا، آخر تلواروں اور نیزوں کے ۹۰ زخم کھا کر وہ گر پڑے۔ یہ سب زخم سینے اور بازوؤں پر تھے۔ ایک زخم بھی پشت پر نہیں تھا۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ساتھ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کمان سنبھال لی اور فوج کو لڑانے لگے۔ چونکہ مسلمان اپنے مرکز سے بہت دور ہونے کی وجہ سے خوراک ورسد سے محروم تھے، اس لیے عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کئی روز سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ان کی حالت کو بھانپتے ہوئے ان کے چچا زاد بھائی نے تھوڑا سا گوشت پیش کیا اور بولے: ''کچھ کھا لو کہ کچھ توانائی آ جائے۔'' انہوں نے ابھی ایک لقمہ لیا تھا کہ ایک طرف سے رومیوں کے آگے بڑھنے اور مسلمانوں کے جوابی حملے کا شور گونجا۔ انہوں نے گوشت پھینک دیا اور اپنے آپ سے بولے: ''تو دنیا میں لگا ہوا ہے اور لوگ جان کی بازی لگا رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر شمشیر بکف آگے بڑھے، گھوڑے پر سوار لڑتے رہے۔

جب دشمنوں کا دباؤ زیادہ بڑھا تو پیادہ لڑنے کے لیے گھوڑے سے نیچے اترنے کی ضرورت محسوس کی مگر اس میں یہ خطرہ تھا کہ فرار کا کوئی موقع نہ رہتا۔ اترنے میں کچھ تردد ہوا تو اپنے آپ کو مخاطب کر کے یہ اشعار کہہ ڈالے:

أَقْسَمْتُ يَا نَفْسُ لَتَنْزِلَنَّهْ ... لَتَنْزِلَنَّ أَوْ لَتُكْرَهَنَّهْ

''اے دل تجھے قسم ہے تجھے اترنا ہوگا، خوشی سے اُتر جاؤ ورنہ زبردستی اترنا ہوگا۔''

إِنْ أَجْلَبَ النَّاسُ وَشَدُّوا الرَّنَّهْ ... مَا لِي أَرَاكِ تَكْرَهِينَ الْجَنَّهْ

''اگر کافر جمع ہو کر للکار رہے ہیں تو تجھے کیا ہوا کہ جنت کا شوقین نہیں؟''

قَدْ طَالَمَا كُنْتِ مُطْمَئِنَّةً هَلْ اَنْتِ اِلَّا نُطْفَةٌ فِي شَنَّةٍ

''تجھے اطمینان کی زندگی گزارتے ہوئے مدت ہوگئی، اب تو مشکیزے میں ایک قطرے کی مانند عمر باقی رہ گئی۔''

ساتھ ہی اپنے آپ سے کہا: ''اب کس چیز کا شوق باقی ہے؟ اگر بیویوں کا، تو انہیں طلاق۔ غلاموں کا تو وہ آزاد، باغ اور جائیداد کا تو وہ اللہ کے لیے خیرات۔''

یہ کہتے ہوئے وہ گھوڑے سے اتر پڑے اور پہلی صف میں جا کر بڑی بے جگری سے دشمن پر حملہ آور ہوئے، آخر ایک دشمن نے نیزے کا ایسا وار کیا جو سینے سے پار ہوگیا۔ آپ مسلمانوں اور رومیوں کی صفوں کے بیچ میں گر پڑے اور ساتھ ہی پکار کر کہا: ''مسلمانو! اپنے بھائی کی لاش کو بچا لینا۔''

مسلمانوں نے فوراً رومیوں پر دھاوا بول کر انہیں پیچھے دھکیل دیا اور ان کی لاش اُٹھا لائے، ان کے گرتے ہی اسلامی پرچم ثابت بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اٹھا لیا تھا، مسلمانوں نے انہی کی قیادت میں لڑنا چاہا مگر اس وقت کسی غیر معمولی قائد کی ضرورت تھی جو اپنی شجاعت، تدبیر اور حکمت عملی سے پوری اسلامی فوج کو دشمن کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچا سکے، اس لیے ثابت بن ارقم رضی اللہ عنہ نے فوراً حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پرچم دے دیا اور بولے: ''آپ جنگوں کا زیادہ تجربہ رکھتے ہیں۔'' باقی سب نے تائید کی اور یوں مکہ کے مایہ ناز جرنیل کو پہلی بار مدینہ کی فوج کی قیادت کا موقع ملا۔[1]

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی جنگی صلاحیتوں اور قائدانہ بصیرت کے لیے اس وقت کڑا امتحان یہ تھا کہ وہ کس طرح مسلمانوں کو رومیوں کے خطرناک نرغے سے بچا کر لے جائیں مگر پسپائی کی صورت میں انہیں بہرحال رومیوں کی طرف سے کئی سو میل تک تعاقب کا خطرہ لاحق تھا، اس خطرے کو ٹالنے کے لیے ضروری تھا کہ واپسی سے پہلے رومیوں کو پسپا کر دیا جائے۔ قدرتِ الٰہیہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اس آزمائش سے سرخرو ہو کر نکلنے کی توفیق بخشی۔ انہوں نے مسلمانوں کی اگلی صفوں کو پیچھے بھیج دیا اور پچھلی صفوں کو آگے لے آئے۔ دائیں بازو کو بائیں طرف اور بائیں کو دائیں جانب تعینات کر دیا۔ جگہیں تبدیل کرنے سے ایک طرف تو دشوار مقامات پر تازہ دم سپاہیوں کو کھڑے ہونے کا موقع ملا، دوسرے اس نقل و حرکت سے رومیوں پر ایک نفسیاتی رعب طاری ہوگیا۔

اب جو جنگ چھڑی تو مسلمان بڑی پامردی سے لڑے اور انہوں نے دشمنوں کو غیر معمولی جانی نقصان پہنچایا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بذاتِ خود اس جوش و خروش سے تلوار چلائی کہ یکے بعد دیگرے ان کی نو تلواریں ضربات کی شدت کے باعث ٹوٹ گئیں، آخر میں انہوں نے چوڑے پھل والی یمنی تلوار استعمال کی جو ناکارہ ہونے سے محفوظ رہی۔ رات کی تاریکی چھانے پر دونوں فوجوں نے لڑائی روک دی۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس دوران مسلمانوں کی کچھ ٹولیوں کو لشکر سے دور بھیج دیا جو صبح کے وقت بہت بلند آواز سے تکبیر کے نعرے لگاتی ہوئیں لشکر میں شامل ہوئیں۔ اس سے رومیوں کو یہ محسوس ہوا کہ مسلمانوں کو کمک مل رہی ہے۔

[1] السيرة الحلبية: ٩٦/٣، ٩٧، ط العلمية ؛ البداية والنهاية: ٢١٣/٦ تا ٢٢٨ ؛ اسد الغابة، عبد الله بن رواحه رضی اللہ عنہ

اسی لیے انہوں نے جنگ جاری رکھنا نقصان دہ سمجھا اور پیچھے ہٹ گئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اسی موقع کا انتظار تھا۔ انہوں نے فوراً مدینہ کی طرف کوچ کر دیا۔ رومی اس خدشے میں مبتلا رہے کہ یہ مسلمانوں کی جنگی چال ہے اور وہ انہیں تعاقب پر اُکسا کر صحرائے عرب کی بھول بھلیوں میں پھانسنا چاہتے ہیں، اسی لیے انہوں نے پیچھا کرنے کی کوشش نہ کی۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لڑائی کی ساری اطلاعات دی جا رہی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پُرنم آنکھوں سے صحابہ کو حضرت زید، حضرت جعفر اور حضرت عبداللہ بن رَواحہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کی خبر دی اور پھر فرمایا:

''اب لشکر کا پرچم، اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے سنبھال لیا ہے، جس کے ہاتھ پر اللہ نے فتح دی ہے۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے۔ چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ''سیف اللہ'' (اللہ کی تلوار) کہا جانے لگا۔

اگر چہ اس لڑائی میں رومیوں کو فیصلہ کن شکست نہیں ہوئی تھی بلکہ مسلمان ان کو پسپا کر کے مصلحتاً واپس چلے آئے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ''فتح'' سے تعبیر کیا؛ کیوں کہ ساٹھ ستر گنا بڑے لشکر کے مقابلے میں اتنی ثابت قدمی سے لڑنا اور آخر میں اسے پیچھے ہٹا کر تعاقب سے باز رہنے پر مجبور کر دینا کوئی معمولی کامیابی نہیں تھی۔ اگر چہ مسلمانوں کو جانی نقصان اُٹھانا پڑا مگر اس جنگ نے انہیں بڑی سے بڑی فوج سے ٹکرانے کا حوصلہ فراہم کرنے کے علاوہ رومیوں کی جنگی ترتیبات کو سمجھنے کا بہترین موقع دیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب جنگِ مُوتہ لڑنے والے مجاہدین مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور کچھ مسلمانوں نے انہیں ''میدان سے بھاگ آنے والے'' کا طعنہ دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تردید کی اور اپنے غازیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا: ''تم بھاگنے والے نہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ پلٹ کر حملہ کرنے والے ہو۔''[1]

معرکۂ ذات السلاسل:

جنگِ مُوتہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی کمان میں تین سو افراد کا ایک دستہ شمال میں قبیلۂ قضاعہ کو تنبیہ کے لیے بھیجا؛ کیوں کہ جنگِ مُوتہ میں مسلمانوں کی پسپائی کے بعد یہ لوگ رومیوں کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ذمے تھا کہ وہ انہیں دوبارہ مسلمانوں کی حمایت اور اہلِ شام کی مخالفت پر قائم کر دیں۔ عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی دادی کا نسلی تعلق یہاں آباد قبائل سے تھا، اس لیے وہ یہ کام اچھی طرح کر سکتے تھے۔ انہوں نے ''سلاسل'' نامی چشمے کے قریب پہنچ کر دشمن کی طاقت کا اندازہ کیا اور کمک طلب کی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں روانہ فرمائی۔ اس مہم کے ذریعے شمال میں مسلمانوں کا رعب دوبارہ قائم ہوگیا۔[2]

① صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ مؤتہ ؛ السیرۃ الحلبیۃ: ۹۸،۹۷/۳ ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۲۲۸/۶ تا ۲۳۰

② مسند احمد، ح: ۱۶۹۷ ؛ تاریخ الطبری: ۳۲،۳۱/۳ ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۶/۸

ذات السلاسل مدینہ سے لگ بھگ چار سو کلومیٹر شمال مغرب میں ساحل کے قریب ہے۔ سیرت نگاروں نے اس مہم کی توقیت جمادی الآخرہ ۸ھ کی ہے، چونکہ مؤتہ کی توقیت جمادی الاولیٰ ۸ھ مدنی ہے اور ذات السلاسل کی مہم اس کی تکمیل تھی اس لیے عموماً اسے جمادی الآخرہ مدنی (ستمبر/ اکتوبر ۶۲۹ء) میں یعنی جنگ مؤتہ سے فقط ایک ماہ بعد تصور کیا جاتا ہے، حالانکہ صحیح حدیث میں ہے کہ اس مہم میں ایک رات حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پر غسل واجب ہوا تو انہوں نے سخت سردی کے باعث غسل نہ کیا بلکہ تیمم کر کے نماز پڑھائی۔ (سنن ابی داؤد، ح: ۳۳۴، کتاب الطھارۃ، باب اذا خاف الجنب البرد) ظاہر ہے ستمبر/ اکتوبر میں ایسی سردی نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جمادی الآخرہ کی تھا جو فروری ۶۳۰ء، (ذوالقعدہ مدنی ۸ھ) کے مطابق تھا۔ یعنی جنگ مؤتہ اور ذات السلاسل کے مابین چھ ماہ کا فاصلہ تھا۔

قریش سے معاہدہ ٹوٹ گیا:

قریش میں اب دم خم باقی نہیں رہا تھا، خیبر کی فتح کے بعد وہ اپنے حلیف یہودیوں کی مدد سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئے تھے، منافقین بھی دب گئے تھے اور ان سے قریش کو کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ صرف حدیبیہ کا معاہدہ مکّہ پر مسلمانوں کی یلغار میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ مگر کچھ دنوں بعد قریش کی اپنی ایک غلطی سے یہ معاہدہ بھی سبوتاژ ہوگیا۔ ہوا یہ کہ صلح حدیبیہ میں شامل قریش کے اتحادی قبیلے بنوبکر نے ریاست مدینہ کے اتحادی قبیلے بنوخزاعہ پر حملہ کردیا، حالانکہ صلح نامے میں دس سالہ جنگ بندی کی شرط طے تھی، لہٰذا ایسی کسی کارروائی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ طرّہ یہ کہ قریش نے اس ناروا کارروائی میں نہ صرف بنوبکر کو ہتھیار مہیا کیے بلکہ کئی قریشی رئیس اپنے آدمیوں سمیت اس حملے میں شریک ہوئے اور بنوخزاعہ کا بیہمانہ قتل عام کیا، جب وہ پناہ لینے کے لیے حرم میں داخل ہوئے تو وہاں بھی ان کی جان بخشی نہ کی گئی۔ بنوخزاعہ کے ایک مظلوم سالم بن عَمرو نے حضور ﷺ کو اس ظلم وستم کی داستان سنائی تو آپ نے فرمایا:

''تمہاری مدد ضرور کی جائے گی۔''

اب وقت آگیا تھا کہ مسلمان قریش کی جھوٹی نخوت کو خاک میں ملاتے ہوئے مکّہ میں فاتحانہ طور پر داخل ہوں اور کعبہ کو شرک کی آلودگی سے پاک کر کے اسے پہلے کی طرح توحید کا مرکز بنائیں۔ تاہم کسی حتمی کارروائی سے پہلے حضور اکرم ﷺ نے قریش کے پاس قاصد بھیج کر مطالبہ کیا کہ بنوخزاعہ کے مقتولین کا خون بہا ادا کریں یا ان پر حملہ کرنے والوں سے لاتعلقی کا اعلان کریں۔ اگر ان میں سے کوئی بات بھی منظور نہ ہو تو پھر حدیبیہ کا معاہدہ ختم کرنے کا اعلان کریں۔ قریش نے غرور میں آکر حضور ﷺ کے قاصد کو جواب دیا کہ ہمیں معاہدہ ختم کردینا منظور ہے۔

جب قاصد یہ جواب لے کر واپس چلا گیا تب قریش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انہوں نے فوراً ابوسفیان کو مدینہ روانہ کیا تاکہ معاہدے کی تجدید کرالی جائے۔ مدینہ پہنچ کر پہلے وہ حضور ﷺ کے دولت کدہ پر، اپنی بیٹی اُمّ المؤمنین اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر گئے، حضور ﷺ گھر پر موجود نہ تھے۔ وہ حضور اکرم ﷺ کے بستر پر بیٹھنے لگے مگر اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے انہیں روک دیا۔ وہ حیران ہوکر بولے: ''میں اس بستر کے لائق نہیں یا بستر میرے لائق نہیں؟''

وہ بولیں: ''یہ حضور ﷺ کا بستر ہے، آپ مشرک ہونے کی وجہ سے ناپاک ہیں، مجھے گوارا نہیں کہ آپ اس پر بیٹھیں۔'' ابوسفیان یہ کہتے ہوئے وہاں سے نکل آئے کہ ''بیٹی! ہم سے دور ہوکر تم بالکل بدل گئی ہو۔''

اس پریشانی کے عالم میں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور صلح برقرار رکھنے کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا۔ مایوس ہوکر اب وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو ملے مگر کہیں بھی بات نہ بنی اور انہیں ناکام واپس آنا پڑا۔[1]

☆☆☆

[1] سیرۃ ابن ہشام: ۳۹۶/۲، ۳۹۷، ط البابی حلبی

فتح مکہ (رمضان ۸ ہجری)

صلح حدیبیہ کے خاتمے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بڑی سرعت سے جنگ کی تیاری شروع کر دی اور پوری کوشش کی کہ یہ خبر مکہ والوں کو ملنے نہ پائے۔ راز داری کی انتہا یہ تھی کہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو سفر کا سامان تیار کرنے کا حکم تو دیا مگر یہ نہ بتایا یہ کہاں کا سفر ہے۔[1]

حضور اکرم ﷺ چاہتے تھے کہ یک دم مکہ والوں کے سروں پر جا پہنچیں تاکہ وہ مقابلہ نہ کر سکیں اور یوں مکہ کی مقدس سرزمین کسی خون ریزی کے بغیر اپنے اصل وارثوں کو واپس مل جائے۔ آپ ﷺ نے اس بارے میں خصوصی دعائیں کیں اور فرمایا: ''یا اللہ! قریش کا کوئی مخبر اپنا کام نہ کر پائے اور ہم اچانک ان تک پہنچ جائیں۔''

جب سفر کی تیاری مکمل ہوگئی تب آپ نے صحابہ کو آگاہ فرمایا کہ ہم کس طرف جانے والے ہیں۔[2]

اس موقع پر ایک مخلص مسلمان حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کے ذریعے قریش کو حضور ﷺ کی لشکر کشی کا اطلاعی رقعہ روانہ کر دیا۔ یہ ایک سنگین غلطی تھی جو کسی اور سے سرزد ہوتی تو اس پر نفاق کا شبہ کیا جاتا مگر حضرت حاطب رضی اللہ عنہ مخلص اور پرانے صحابی تھے، اس اضطرابی حرکت کی وجہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں ان کے اہل وعیال بے سہارا تھے، کوئی اور رشتہ دار وہاں ان کا حمایتی نہ تھا۔ انہیں خطرہ ہوا کہ کہیں قریش مسلمانوں کو حملہ کرتے دیکھ کر میرے بیوی بچوں کو یرغمال نہ بنالیں۔ اس لیے قریش سے یہ بھلائی کر کے وہ اپنے اہل وعیال کے حق میں ان کے نیک سلوک کے مستحق بننا چاہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس کی اطلاع دے دی۔

آپ نے حضرت علی، حضرت زبیر اور حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہم کو اس عورت کے پیچھے بھیجا۔ انہوں نے سرپٹ گھوڑے دوڑا کر مدینہ کے مضافاتی مقام ''روضۂ خاخ''[3] میں اسے جالیا اور حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کا رقعہ برآمد کرالیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت حاطب رضی اللہ عنہ سے پوچھ گچھ کی تو انہوں نے مکہ میں اپنے اہل وعیال کے بے آسرا ہونے کا عذر بیان کیا اور کہا: ''مکہ میں میرے اہل وعیال کا کوئی قرابت دار نہیں۔ میں نے چاہا کہ مکہ والوں پر کوئی احسان کر دوں تاکہ وہ میرے قرابت داروں کا لحاظ رکھیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عذر کو تسلی بخش نہ سمجھا اور غضب ناک ہو کر کہا: ''یارسول اللہ! اجازت دیں تو میں اس منافق کی گردن اڑا دوں!'' مگر آپ ﷺ نے حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی سابقہ خدمات خصوصاً غزوۂ بدر میں ان کی

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۵۱۹/۲
[2] البدایۃ والنہایۃ: ۵۲۰/۲، دار ہجر
[3] روضۂ خاخ مدینہ سے ایک منزل دور ذوالحلیفہ کے قریب وادی عقیق کی حدود میں ہے۔ (وفاء الوفاء: ۲۶/۳، المعالم الاثیرۃ، ص ۱۰۷)

شرکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے عذر قبول کر کے انہیں معاف کر دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''تمہیں کیا معلوم کہ اللہ نے اہلِ بدر کی طرف توجہ فرما کر کہا تھا کہ جو چاہو کرو، میں تمہاری بخشش کر چکا ہوں۔''[1]

مکہ کی سمت یلغار:

آخر کار حضور ﷺ نے دس ہزار سرفروشوں کے لشکر جرار کے ساتھ ۱۰ رمضان المبارک سن ۸ ہجری کو مدینہ سے کوچ کیا۔[2] یہ سفر شدید گرمی کے موسم میں تھا۔ رمضان کے روزے بھی تھے۔ سفر کی رفتار بھی دوگنی رکھی گئی تھی۔ چونکہ مسافر کو روزہ نہ رکھنے کی شرعی رُخصت ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ وہ روزے نہ رکھیں۔ آپ نے فرمایا: ''اپنے دشمن کے مقابلے میں قوی رہو۔'' مگر حضور ﷺ خود عزیمت پر عمل پیرا ہو کر روزہ دار تھے۔[3]

تاہم بعض صحابہ آپ کی طرف سے افطار کے حکم کے باوجود روزے رکھتے رہے۔ انہیں گوارا نہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ اس قدر مشقت میں ہوں اور وہ کھاتے پیتے رہیں۔ جب العرج کے مقام پر پڑاؤ ڈالا گیا تو حضور ﷺ پیاس یا تپش کی وجہ سے سر پر پانی ڈالنے لگے۔ آپ ﷺ کی مشقت دیکھ کر بعض صحابہ نے چاہا کہ آپ ﷺ افطار کر لیں۔ انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپ نے روزہ رکھا ہے تو بعض لوگوں نے بھی روزہ رکھا ہوا ہے۔''

تاہم حضور ﷺ روزے رکھتے رہے مگر جب مکہ ۹۰ کلومیٹر دور رہ گیا تو آپ ﷺ نے ''کدید'' کے نخلستان میں پڑاؤ ڈالا اور سب کے سامنے ایک پیالہ پانی منگوا کر نوش فرمایا۔ یہ دیکھ کر سب لوگوں نے روزے رکھنا چھوڑ دیے۔[4]

① صحیح البخاری، ح:۳۰۰۷، کتاب الجهاد، باب الجاسوس ؛ تفسیر ابن کثیر، سورة الممتحنة، آیت: ۱ تا ۴

② البداية والنهاية: ۶/۵۲۷

③ امر الناس فی سفره عام الفتح بالفطر و قال: تقوّوا لعدوكم، وصام رسول الله ﷺ. (سنن ابی داؤد، ح: ۲۳۶۵، کتاب الصوم باسناد صحیح)

④ عن ابی بکر بن عبدالرحمن عن بعض اصحاب رسول الله ﷺ ان رسول الله ﷺ امر الناس فی سفره عام الفتح بالفطر وقال تقوّوا لعدوكم، وصام رسول الله ﷺ، قال ابوبكر: قال الذی حدثنی: لقد رايت رسول الله ﷺ بالعرج يصب على راسه الماء من العطش او من الحر. ثم قيل لرسول الله: ان طائفة من الناس قد صاموا حين صمت، قال، فلما كان رسول الله ﷺ بالكديد دعا بقدح فشرب فافطر الناس. (مؤطا امام مالک، باب ماجاء فی الصيام فی السفر)

مالک بن انس، عن سُمَیّ، عن ابی صالح، عن ابی هريرة، قال: رايت رسول الله ﷺ بالعرج يصب على راسه من الماء من الحرّ وهو صائم. (المستدرک للحاکم، ح: ۱۵۷۸)

نوٹ: العرج مدینہ سے شاہراہ مکہ کی تیسری منزل پر الروحاء اور ابواء کے درمیان ہے۔ (احسن التقاسيم فی معرفة الاقاليم، ص ۱۰۶ ؛ معجم ما استعجم من اسماء البلاد والمواضع لابی عبيد البكری الاندلسی: ۳/ص ۹۳۰) مدینہ سے اس کا فاصلہ ۱۱۳ کلومیٹر ہے۔ (المعالم الاثيرة فی السنة والسيرة لمحمد بن حسن الشرّاب، ص ۱۸۱) کدید مکہ سے ۹۰ کلومیٹر دور ہے۔ (المعالم الاثيرة فی السنة والسيرة، ص ۲۳۱)

فتح مکہ کی توقیت: مذکورہ صحیح احادیث سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ فتح مکہ شدید گرم موسم کا واقعہ ہے۔ یہ مدنی رمضان میں نہیں ہو سکتا؛ کیوں کہ ۸ھ کا مدنی رمضان ۲۲ دسمبر ۶۲۹ء کو شروع ہوا تھا یعنی سخت سرد موسم میں۔ بلاشبہ یہ مکی رمضان تھا جس کی توقیت ۲۰ مئی تا ۱۷ جون ۶۳۰ء ہے یعنی حدیث کے عین مطابق یہ غزوہ سخت گرم موسم میں ہوا تھا۔ مدنی تقویم میں یہ صفر ۹ ہجری تھا۔ مزید غور کے لیے پیچھے جا کر دیکھ لیں کہ جنگ مؤتہ جمادی الاولیٰ مدنی (اگست ستمبر ۶۲۹ء) میں ہوئی تھی، اس کے بعد سخت سرد موسم میں یعنی فروری ۶۳۰ء میں سریہ ذات السلاسل بھیجا گیا جسے مؤرخین جمادی الآخرہ ۸ھ کی مہم بتاتے ہیں اور بلاشبہ یہ مکی توقیت تھی جبکہ مدنی تقویم میں یہ ذوالقعدہ ۸ھ تھا یعنی ۸ھ کا مدنی رمضان ذات السلاسل سے پہلے گزر چکا تھا۔ پس مؤرخین نے فتح مکہ میں مکی تقویم بیان کی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ رمضان کے روزے مکی تقویم کے مطابق ہی رکھے جاتے رہے جس میں ہر سال رمضان گرم مہینوں (مئی جون) میں آتا تھا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ملاقات:

لشکر کی نقل وحرکت اتنی خاموش اور تیز تھی کہ قریش کو آخر تک کچھ پتا نہ چلا اور مسلمانوں نے دو ہفتوں کی مسافت صرف ایک ہفتے میں طے کر لی۔ حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی آپ کی روانگی سے بے خبر تھے اور اپنے اہل وعیال کو لے کر ہجرت کے ارادے سے نکل پڑے تھے۔ مکہ سے ۸۲ میل دور جُحفہ کے مقام پر انہیں مسلمانوں کا عظیم لشکر آتا دکھائی دیا تو حیران رہ گئے۔ آپ ﷺ انہیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور انہیں ہم رکاب فرما لیا۔[1]

ابوسفیان بن الحارث مسلمان ہوگئے:

حضور ﷺ نے مکہ کے قریب "مرّ الظہران" پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔ تب قریش کو ہوش آیا اور وہ مکہ کے دروازوں پر اتنی بڑی فوج دیکھ کر سراسیمہ ہوگئے۔ یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ قریش کے متعصب اور سرکردہ لوگوں میں سے دو افراد نے اسلام قبول کر لیا، دونوں "ابوسفیان" تھے۔ ایک ابوسفیان بن حرب، دوسرے ابوسفیان بن الحارث۔

ابوسفیان بن الحارث بنو ہاشم کے ممتاز رکن اور حضور ﷺ کے چچازاد تھے۔ بچپن اور جوانی کے دوست تھے۔ شاعری میں بھی انہیں کمال حاصل تھا مگر انہوں نے شانِ رسالت میں نازیبا اشعار کہہ کہہ کر حضور ﷺ اور مسلمانوں کو بڑا دکھ پہنچایا تھا۔ تاہم اب ان کے دل میں اسلام کی سچائی کا یقین گھر کر گیا تھا۔ انہیں اپنے ماضی پر اتنی ندامت ہوئی کہ دل بھر آیا اور وہ اپنے ایک کم سن بچے کو ساتھ لیے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خیمہ گاہ میں حاضر ہوئے۔ آپ کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو ان کے دیے ہوئے زخم یاد آ گئے، آپ نے فرمایا: "میں ملنا نہیں چاہتا۔"

انہیں معلوم ہوا تو بے تاب ہو کر کہنے لگے: "اللہ کی قسم! اگر حضور ﷺ نے مجھے ملنے کی اجازت نہ دی تو میں اپنے چھوٹے بچے کا ہاتھ تھام کر کسی صحرا میں نکل جاؤں گا اور ہم وہیں بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔"

آپ ﷺ کو یہ بات بتائی گئی تو تڑپ اٹھے، انہیں بلایا اور مشرف بہ اسلام فرمایا۔ ابوسفیان بن الحارث رضی اللہ عنہ اب اپنے ماضی کی کوتاہیوں کی تلافی کرنے کے لیے بے چین تھے۔[2]

ابوسفیان بن حرب کا قبولِ اسلام:

اِدھر ابوسفیان بن حرب جو قریش کے سب سے جری اور نامور سردار تھے، دو ساتھیوں کے ہمراہ لشکرِ اسلام کا جائزہ لینے کے لیے نکلے۔ حضور ﷺ کے حکم سے مسلمانوں نے اپنے خیموں کے سامنے الاؤ روشن کر رکھے تھے، مکہ والے دور سے سینکڑوں روشنیاں جگمگاتی دیکھ کر مرعوب ہو رہے تھے۔ ابوسفیان بن حرب بھی یہ منظر دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھے: "ایسا لشکر اور ایسی روشنیاں میں نے زندگی بھر نہیں دیکھیں۔" ان کی بلند آواز رات کے سناٹے میں دور تک گئی۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو اَب حضور ﷺ کے لشکر میں شامل تھے، اپنے خچر پر قریب ہی گشت کر رہے تھے۔ انہوں

---

① البدایة والنهایة: ٦/٥٢٧

② البدایة والنهایة: ٦/٥٣٢، دار هجر

نے تاریکی میں آواز پہچان لی اور بولے: ''ارے اللہ کے بندے! رسول اللہ ﷺ دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ آچکے ہیں۔ آج تم ان سے مقابلے کی تاب نہیں رکھتے۔'' ابوسفیان بولے: ''بچنے کی کوئی صورت؟''

حضرت عباس رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ اگر کسی مسلمان نے ابوسفیان کو دیکھ لیا تو ان کا بچنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے فوراً ابوسفیان کو اپنے خچر پر ساتھ بٹھالیا اور اسے سرپٹ دوڑا کر لشکر کے مختلف حصوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے سیدھے حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ ادھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی پیچھے دوڑے آئے اور اجازت مانگنے لگے کہ دشمنوں کے سردار کا سر قلم کر دیا جائے۔ مگر حضور اکرم ﷺ ابوسفیان جیسے دشمن کو بھی کامیاب دیکھنا چاہتے تھے۔

حضور ﷺ نے انہیں دعوتِ اسلام دیتے ہوئے فرمایا:

''ابوسفیان! کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟''

ابوسفیان یہ سلوک دیکھ کر پسیج گئے۔ بولے: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ کیسے مہربان، کتنے دریادل اور کتنے بامروت ہیں۔ اللہ کی قسم! میں سمجھ گیا ہوں کہ اگر اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو آج میرے کام ضرور آتا۔''

گویا ابوسفیان کو مسئلۂ توحید سمجھ آگیا تھا، حضور اکرم ﷺ نے چاہا کہ اب وہ اپنی زبان سے کلمہ شہادت پڑھ لیں، اور توحید و رسالت دونوں کا اقرار کریں۔ اسی لیے فرمایا:

''اور کیا اب تک اس بات کا وقت نہیں آیا کہ تم مان لو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟''

ابوسفیان بولے: ''بلاشبہ آپ رحیم وکریم ہیں مگر اس معاملے میں ابھی تک مجھے کچھ تردد ہے۔''

حضرت عباس رضی اللہ عنہ ساتھ کھڑے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ابوسفیان پر حقیقت واضح ہو چکی ہے مگر صرف ایک رئیسانہ نخوت انہیں اللہ کی غلامی اور بارگاہِ رسالت کی حلقہ بگوشی سے روک رہی ہے، انہوں نے فوراً اس شیطانی وسوسے کو دور کرنے کے لیے کہا: ''اللہ کے بندے! اس سے پہلے کہ تمہاری گردن اڑا دی جائے اسلام قبول کر لو۔'' یہ نسخہ کارگر ثابت ہوا۔ ابوسفیان تمام وسوسوں کو ذہن سے جھٹک کر اسلام لے آئے۔ [1]

اس موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کو کوئی اعزاز دینے کی سفارش کی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''کیوں نہیں! جو شخص ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے وہ مامون ہے، جو حرم شریف میں پناہ لے وہ بھی مامون ہے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ بھی مامون ہے۔''

رحمت عالم ﷺ نے یہ پیش کش اس لیے فرمائی تا کہ مکہ کے لوگ عدم تحفظ کا شکار ہو کر لڑنے بھڑنے کی کوشش نہ کریں؛ کیوں کہ بعض اوقات خوف بھی انسان کو حملے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے سب کے لیے امن کی عملی صورتیں مہیا فرما کر اس کا انتظام کر دیا کہ مسلمان کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر مکہ میں داخل ہو جائیں اور مقدس زمین خونریزی سے پاک رہے۔ [2]

---

① سیرۃ ابن ھشام: ۴/۲۰۲، ۲۰۳ ② سیرۃ ابن ھشام: ۴/۲۰۳

لشکرِ اسلام کا نظارہ:

۱۷ رمضان ۸ھ (۷ جنوری ۶۳۰ء) جب اسلامی لشکر مکہ میں داخل ہونے کے لیے تیار ہوا تو حضور ﷺ کے حکم سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کو لے کر لشکر کے راستے میں ایک پہاڑ کی گھاٹی پر کھڑے ہوگئے تاکہ وہ انہیں پورے لشکر کا نظارہ کرا سکیں۔

تھوڑی دیر بعد اسلامی لشکر کے مختلف دستے اپنے اپنے قبائل کے پرچموں کے ساتھ ان کے سامنے سے گزرنے لگے۔

ابوسفیان رضی اللہ عنہ ہر دستے کو دیکھ کر پوچھتے: ''یہ کن کا دستہ ہے؟''

حضرت عباس رضی اللہ عنہ قبیلے کا نام بتاتے تو ابوسفیان رضی اللہ عنہ کہتے: ''ان سے کیا غرض؟''

آخر میں رسول اللہ ﷺ مہاجرین وانصار کے آہن پوش لشکر کے ساتھ تشریف لائے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو بتایا تو وہ بولے:

''بھلا ان کا کون مقابلہ کرسکتا ہے؟ عباس! تمہارا بھتیجا تو بہت بڑا بادشاہ بن گیا ہے۔''

حضرت عباس رضی اللہ عنہ بولے: ''اللہ کے بندے! یہ بادشاہت نہیں، نبوت ہے۔''

ابوسفیان رضی اللہ عنہ اس کے بعد تیزی سے اہلِ مکہ کے پاس پہنچے اور اعلان کر دیا کہ جو میرے گھر میں آجائے یا اپنے گھر میں بند ہو کر بیٹھ جائے یا حرم میں چلا جائے وہ مامون رہے گا۔ لوگوں نے اس پیش کش سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہ لگائی، تاہم صفوان بن اُمیّہ اور کچھ لوگوں نے اپنے طور پر مکہ میں داخل ہونے والے اُس دستے سے مزاحمت کی جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں تھا، حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جوابی حملہ کیا تو چند لوگ مارے گئے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس جھڑپ کے سوا امن وامان کے خلاف کوئی بات نہ ہوئی۔ [1]

مکہ میں فاتحانہ داخلہ:

حضور نبی اکرم ﷺ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو گزشتہ زمانے کا ایک ایک منظر آپ کے سامنے تھا۔ یہی وہ سرزمین تھی جہاں آپ ﷺ پیدا ہوئے، پلے بڑھے، عزت واحترام کے ساتھ جوانی گزاری، پھر منصب نبوت ملنے پر اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے اُٹھے اور پورے شہر کی دشمنی مول لی۔ قریش کا ایک ایک ظلم وستم آپ کو یاد تھا جس کی انتہا یہ ہوئی کہ آپ کو اپنے پیروکاروں کے ساتھ جلاوطنی پر مجبور ہونا پڑا۔ آج وہی شہر آپ کے سامنے سرنگوں تھا مگر آپ ﷺ اتنی بڑی فتح کے باوجود دنیا کے دوسرے کسی فاتح کی طرح سرشاری اور فخر کی کیفیت میں نہیں تھے۔ آپ اللہ کے حضور میں عجز ونیاز کی تصویر بنے ہوئے تھے، احساسِ شکر سے آپ کا سرِ مبارک سواری کی زین سے لگا جاتا تھا۔

رحمت عالم ﷺ سیدھے حرم میں تشریف لائے اور سواری پر ہی اس کا طواف کیا۔ آپ کے ہاتھ مبارک میں ایک چھڑی تھی، طواف کے دوران آپ ﷺ کعبہ کے صحن میں نصب بتوں کی طرف چھڑی سے اشارہ کرتے گئے اور بت زمین بوس ہوتے چلے گئے۔

اس وقت آپ ﷺ کی زبانِ مبارک پر یہ آیات تھی:

﴿جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾

''حق آگیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل مٹنے کے لیے ہی ہے۔''[1]

اس کے بعد کعبہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے چابیاں لے کر کعبہ کا دروزہ کھلوایا۔ اندر دیواروں پر مشرکین کی بنائی ہوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور فرشتوں کی تصاویر نظر آئیں۔ آپ کے حکم سے صحابہ نے تصاویر کو مٹا دیا۔ رحمت عالم ﷺ نے کعبہ کے اندر نماز ادا فرمائی۔ قریش کے لوگ کعبہ کے صحن میں جمع تھے۔ رحمت عالم ﷺ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر ان سے مخاطب ہوئے:

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی اور تمام لشکروں کو تنہا شکست دی۔ آج زمانہ جاہلیت کا ہر فخر اور خونریزی میرے قدموں تلے ہے۔ قریش کے لوگو! اللہ نے تمہارے جاہلیت پرمبنی غرور و پندار کو توڑ دیا۔ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔''

مختصر سے خطبے کے بعد آپ ﷺ نے قریش کے سرداروں سے دریافت کیا: ''بتاؤ، آج میں تم سے کیا سلوک کروں؟'' سردارانِ قریش کو اپنا ایک ایک جرم یاد تھا مگر وہ آپ ﷺ سے رحم کی اُمید کر سکتے تھے، وہ التجا کے انداز میں بولے: ''بھلائی کا سلوک فرمایئے۔ آپ ایک مہربان بھائی اور مہربان بھائی کے فرزند ہیں۔''

رحمت عالم ﷺ نے بڑی کشادہ دلی سے فرمایا: ''جاؤ! تم سب آزاد ہو۔''[2]

جان لینے والے جان دینے والے بن گئے:

قریش کے پُرجوش جوانوں میں اب بھی کچھ ایسے تھے جنہیں اسلام لانے میں تردد تھا مگر حقیقت سے کب تک آنکھیں چُرائی جا سکتی ہیں۔ پھر حضور ﷺ کا حد سے زیادہ فیاضانہ سلوک بھی ان کے سامنے تھا، اس لیے زیادہ دن نہیں گزرنے پائے تھے کہ تقریباً سب ہی ایمان لے آئے۔

ان میں سے ایک فُضالہ بن عمیر تھے جو نبی اکرم ﷺ پر قاتلانہ حملے کی نیت سے نکلے تھے، آپ ﷺ اس وقت کعبہ کا طواف کر رہے تھے، یہ قریب پہنچے ہی تھے کہ نبی کریم ﷺ نے خود انہیں مخاطب کر کے پوچھا:

''فُضالہ ہو ناں؟'' یہ بے اختیار بولے: ''جی ہاں۔''

حضور اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا: ''دل میں کیا سوچ کر آئے ہو؟''

یہ گھبرا کر بولے: ''جی کچھ نہیں۔''

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل، آیت:

[2] سیرۃ ابن هشام: ۲/ ۴۰۹ تا ۴۱۲

حضور اکرم ﷺ ہنس دیے اور فرمایا: ''اللہ سے معافی مانگو۔''

یہ کہہ کر بڑی شفقت سے اُن کے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ ان کا دھڑکتا ہوا دل پرسکون ہوگیا۔ ساتھ ہی ذہنی کیفیت بالکل بدل گئی اور حضور اکرم ﷺ کی محبت اس شدت سے دل میں جاگزیں ہوگئی کہ آپ سے پیارا کوئی نہ رہا۔[1]

ان میں ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کی بیوی ہند بنت عُتبہ بھی تھیں جنھوں نے شروع میں اپنے شوہر کے اسلام لانے پر ان سے سخت جھگڑا کیا تھا مگر رات کو جب حرم میں عبادت کرنے والے مسلمانوں کی گریہ وزاری سنی تو ان کے دل نے گواہی دی کہ یہ لوگ واقعی حقیقی معبود کی عبادت کررہے ہیں، چنانچہ وہ اسلام لے آئیں۔

ان میں صفوان بن اُمیّہ بھی تھے، جنھوں نے مسلمانوں کے مکہ میں فاتحانہ داخلے کے موقع پر مسلح مزاحمت کی تھی اور اس کوشش میں ناکامی کے بعد رنج، نفرت اور غصے سے بے قابو ہوکر جدہ کی بندرگاہ کی طرف روانہ ہوگئے تھے۔ ان کے پرانے دوست عمیر بن وَہب رضی اللہ عنہ نے حضورِ اقدس ﷺ سے ان کے لیے خصوصی امان حاصل کی اور ان کے پیچھے گئے۔ اس سے پہلے کہ صفوان کسی بحری جہاز یا کشتی میں سوار ہوتے، عمیر بن وَہب رضی اللہ عنہ ان تک پہنچ گئے اور بولے:

''میرے عزیز دوست! آنحضرت ﷺ کی طرف سے تمھیں امان کی خوشخبری ہو، اب خود کو ہلاکت میں مت ڈالو۔''

صفوان نے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''مجھے قتل کردیے جانے کا خوف ہے۔''

حضرت عمیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''حضور ﷺ تمھاری سوچ سے کہیں زیادہ بلند اور زیادہ مہربان ہیں۔''

غرض عمیر بن وَہب رضی اللہ عنہ صفوان کو واپس لانے میں کامیاب ہوگئے۔ صفوان خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو اسلام قبول کرنے سے پہلے سوچ بچار کے لیے دو ماہ کی مہلت طلب کی۔ حضور ﷺ نے چار ماہ کی مہلت دے دی۔ صفوان غور وفکر کرتے رہے اور آخر غزوۂ حُنین کے بعد ایمان لے آئے۔[2]

عِکرِمہ بن ابی جَہل یمن کی طرف فرار ہوئے مگر کشتی طوفان میں گھر گئی۔ سب کے منہ سے نکلا: فقط اللہ کو پکارو، دوسرے معبود یہاں کام نہیں آتے۔ عِکرمہ نے عزم کرلیا کہ اگر جان بچ گئی تو اسلام قبول کرلوں گا۔ آخر کشتی یمن کے ساحل سے جالگی۔ اسی دوران عِکرِمہ کی بیوی اُمّ حکیم رضی اللہ عنہا جو اسلام لاچکی تھیں، ان کے پیچھے یمن پہنچ گئیں اور اطمینان دلا کر واپس لے آئیں۔ حضور ﷺ نے کھڑے ہوکر استقبال کیا۔ عِکرمہ رضی اللہ عنہ اسلام لاکر جانباز مجاہد ثابت ہوئے۔[3]

جینا مرنا ساتھ ہے:

اللہ کا گھر شرک کی علامات سے پاک ہو چکا تھا، حرم کو توحید کا مرکز ہونے کا اعزاز واپس مل چکا تھا۔ قریش کے بڑے بڑے رئیس اور اسلام کی مخالفت میں پیش پیش رہنے والے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلام

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۵۸۴/۶، دار ھجر

[2] البدایۃ والنہایۃ: ۵۸۷/۶

[3] مؤطا مالک، کتاب النکاح، باب نکاح المشرک ؛ مستدرک حاکم، ح: ۵۰۵۶

قبول کر رہے تھے۔ حضور ﷺ اب اپنے وطن مکہ والوں کے بھی سردار تھے۔ ایسے میں اگر یہ خیال کیا جاتا کہ حضور اقدس ﷺ اب مکہ مکرمہ ہی میں قیام فرمالیں گے اور اس کو اسلامی ریاست کا مرکز قرار دیں گے تو کوئی عجیب بات نہ تھی۔ انصار کے کچھ لوگ یہی باتیں کر رہے تھے؛ کیوں کہ ان کو مسلسل یہ دھڑ کا لگا ہوا تھا۔

حضور ﷺ صفا پہاڑی پر دعاؤں میں مصروف تھے اور انصار کی نگاہیں آپ ﷺ پر جمی ہوئی تھیں کہ دیکھیے آپ اس معاملے میں کیا فیصلہ فرماتے ہیں۔ حضور ﷺ کو وحی کے ذریعے ان کے خدشات کی خبر مل گئی تھی، اس لیے دعا سے فارغ ہو کر ان سے دریافت فرمایا: ''تم کیا کہہ رہے تھے؟'' وہ بولے: ''کچھ نہیں یا رسول اللہ!''

مگر آپ ﷺ نے اصرار کیا تو انہوں نے دھڑکتے دلوں کے ساتھ اپنی تشویش سے آپ کو آگاہ کر دیا۔ آپ ﷺ اپنے ان جانثاروں کی حوصلہ شکنی کیسے کر سکتے تھے، حضور اکرم ﷺ نے محبت کی گرم جوشی کے ساتھ فرمایا:

''اللہ کی پناہ، ایسا نہیں ہو سکتا..... اَلْمَحْيَا مَحْيَاكُمْ وَالْمَمَاتُ مَمَاتُكُمْ..... جینا مرنا تمہارے ساتھ ہے۔''[1]

فتح مکہ کے فوراً بعد حضور ﷺ نے گردونواح کی تسخیر اور شرک کے قدیم مراکز کو منہدم کرانے پر توجہ دی۔ آپ ﷺ کے حکم سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ''نخلہ'' کے مقام پر واقع عزیٰ کے بت کدے کو تہ و بالا کر آئے۔[2]

☆☆☆

① صحیح مسلم، ح: ۴۷۲۲، کتاب الجهاد، باب فتح مكة. ط دار الجیل ؛ صحیح ابن حبان، ح: ۴۷۶۰ ؛ سیرت ابن هشام: ۴۱۶/۲

② البداية والنهاية: ۶۰۷/۶ ؛ الكامل فی التاريخ: ۱۳۲/۲ تحت ۸ هجری

غزوۂ حنین

فتح مکہ کی خبر آناً فاناً پورے عرب میں پھیل گئی۔ اسلام اب جزیرۃ العرب میں ایک ناقابل تسخیر قوت بن چکا تھا، تاہم کفر وشرک کے ترکش میں ابھی کچھ تیر باقی تھے۔ طائف کے قریب آباد ''ہَوازِن'' کے لوگ جو شجاعت اور سپہ گری میں بڑے نامور تھے، مکہ کے فتح مند لشکر سے مقابلے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ ہَوازِن کے رئیس عوف بن مالک نے اپنے قبیلے کے ساتھ بنو ثقیف، بنو سعد، نصر اور جُشم کے جنگجوؤں کو بھی متحد کر لیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے مکہ معظمہ میں اٹھارہ دن قیام فرمایا۔ اس دوران بنو ہوازن اور ان کے اتحادیوں کی جنگی تیاریوں کی خبریں ملنے لگی تھیں۔ آپ ﷺ کے حکم سے حضرت عبداللہ بن حَدرَد رضی اللہ عنہ ان کی جاسوسی کے لیے گئے اور انہوں نے آکر دشمنوں کی عسکری قوت اور انتظاماتِ حرب کا جوچشم دیدہ حال سنایا اسے نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ مدینہ کا فتح مند لشکر اگر اس مہم سے کترا تا تو اس کے واپس جاتے ہی پانسا پلٹ جاتا۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ نے تیزی سے فوج کشی کے انتظامات مکمل کیے۔ آپ نے صفوان بن اُمیَّہ سے یہ کہہ کر سو (۱۰۰) زرہیں لیں کہ انہیں پوری ذمہ داری سے واپس کیا جائے گا۔[۱]

۵ شوال سن ۸ ہجری کو بارہ ہزار سپاہیوں کا لشکر جرار مکہ مکرمہ سے جنوب مشرق کی طرف روانہ ہوا۔[۲] دس ہزار سپاہی وہی تھے جو فتح مکہ میں آپ ﷺ کے ساتھ تھے[۳] جبکہ دو ہزار وہ تھے جو فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے۔[۴]

لشکر غیر معمولی آن بان کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ مسلمانوں کو توقع تھی کہ دشمن ان سے مرعوب ہو کر پسپا ہو جائے گا اور اگر مڈ بھیڑ ہوئی بھی تو کسی دشواری کے بغیر فتح نصیب ہو جائے گی۔ یہ خیال بے محل نہیں تھا، اس لیے کہ کئی برسوں سے مسلمان کم ہوتے ہوئے بھی کئی کئی گنا بڑے لشکروں کو شکستیں دیتے آ رہے تھے جبکہ آج تو وہ خود عرب کی سب سے بڑی فوج تھے۔ سہ پہر کے وقت حضور ﷺ نے پڑاؤ کا حکم دیا اور نمازِ ظہر کی تیاری فرمانے لگے۔ اس دوران مخبر خبر لایا کہ حریف لشکر اپنے مویشیوں کے ریوڑوں سمیت حنین کے پہاڑی علاقے میں ہے اور مورچہ بندی کر رہا ہے۔ حضور اکرم ﷺ یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا: ''یہ سب کل مسلمانوں کا مالِ غنیمت بنے گا۔''

دشمن زیادہ دور نہیں تھا، اس لیے آپ ﷺ نے شب بیداری سے قبل گھاٹیوں پر گھڑسوار سپاہیوں کا کڑا پہرہ لگوا دیا تاکہ ہوازِن کے چھاپہ مار شب خون نہ مار سکیں۔[۵] یہ ۱۳ شوال کا واقعہ ہے۔[۶]

---

① البدایة والنهایة: ۷/ ۱۰، ۱۱، دارِ هجر ② البدایة والنهایة: ۷/ ۱۳

③ صحیح البخاری، ح: ۴۳۳۷، کتاب المغازی، باب غزوة الطائف

④ جوامع السیرة النبویة لابن حزم، ص ۱۸۹ ط العلمیة...... فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرنے والے ان لوگوں کو ''طُلَقاء'' کہا جاتا تھا۔

⑤ البدایة والنهایة: ۷/ ۱۳، ۱۴ ⑥ طبقات ابن سعد: ۲/ ۱۵۱ ...... یہ ۱۳ شوال کی ۸ھ مطابق ۳۰ جون ۶۳۰ء تھی۔

اگلے دن (۱۴ شوال کو) دشمن سے آمنا سامنا ہوگیا۔ ہَوازِن کے سینکڑوں تیرانداز اس پہاڑی سلسلے کی گھاٹیوں اور غاروں میں گھات لگائے ہوئے تھے۔ جونہی مسلمان اُن کی زد پر آئے انہوں نے تیروں کی بارش کر دی۔ مسلمان اس حملے کے لیے تیار نہیں تھے، ان میں افراتفری پھیل گئی۔ اس اثناء میں ہَوازِن کے گھڑسواروں نے بھی ہلہ بول دیا اور اسلامی لشکر ان کے دباؤ کی تاب نہ لا کر درہم برہم ہونے لگا۔ اس وقت حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابوسفیان بن الحارث، حضرت فضل بن عباس، حضرت اسامہ بن زید اور ان کے بھائی حضرت اَیمن رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلو میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صورتِ حال دیکھی تو بلند آواز سے پکار کر مسلمانوں کو روکنے کی کوشش کی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: ''لوگو! کہاں جا رہے ہو؟ اِدھر آؤ! میں اللہ کا رسول ہوں۔''

اس کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے خچر پر سوار برابر آگے بڑھتے رہے۔ حضرت ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ آپ کے خچر کی لگام تھامے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر یہ رجز تھا:

اَنَـــا الـــنَّـبِـــيُّ لَا كَـــذِب   اَنَـــا ابْــنُ عَبْــدِ الْــمُــطَّــلِــب

''میں جھوٹا نبی نہیں، میں عبدالمُطّلِب کی اولاد ہوں۔''①

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے انصار کو پکارا: ''اے انصاریو! اے درخت کے نیچے بیعت کرنے والو!'' وہ بلند آواز اور دراز قامت تھے، ان کی آواز دور دور تک گونج گئی اور جواب میں مسلمان ''لبیک، لبیک'' کہہ کر واپس پلٹنے لگے۔ جس کسی کی سواری نے مڑنے میں دیر لگائی، وہ سواری سے کود کر پیدل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑ پڑا۔ جونہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد سو کے لگ بھگ افراد جمع ہوئے، آپ نے انہیں لے کر دشمن پر جوابی حملہ کر دیا۔

مسلمان اور کفار آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک دوسرے پر جھپٹتے دیکھ کر فرمایا: ''لڑائی کی بھٹی اب گرم ہوئی ہے۔'' زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ بنو ہَوازِن کی ہمت پست ہوگئی۔ ان میں سے بہت سے مارے گئے اور زیادہ تر فرار ہو گئے۔ ان کا رئیس عوف بن مالک بھی بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ مفرورین کے اونٹوں اور بکریوں کے ریوڑ مسلمانوں کو مالِ غنیمت کے طور پر مل گئے۔②

محاصرۂ طائف:

ہَوازِن اور اس کے اتحادیوں کو اگرچہ میدان میں شکست ہوئی مگر اس جنگ کا دوسرا مرحلہ ابھی باقی تھا۔ ہَوازِن کا سردار عوف بن مالک اپنے لشکر کے باقی ماندہ افراد کے ساتھ پسپا ہو کر ''طائف'' کے فصیل بند شہر میں مورچہ زن ہوگیا تھا۔ پورے عرب میں یہ محفوظ ترین قلعہ بندی تھی اور پہاڑ پر ہونے کی وجہ سے اس پر حملہ کرنا خاصا مشکل تھا؛ کیوں کہ حملہ آور فصیل کے تیراندازوں کی زد میں رہتے تھے، جبکہ خود ان کے تیر فصیل پر مورچہ بند لوگوں تک نہیں پہنچ پاتے

① صحیح البخاری، ح: ۴۳۱۷، کتاب المغازی، باب قول اللّٰہ: ویوم حنین اذ اعجبتکم

② البدایة والنهایة: ۷/۲۰ تا ۲۸، دار ہجر ؛ سبل الهدیٰ والرشاد: ۵/۳۱۸

تھے۔ حضور ﷺ کو اس معرکے کی ان مشکلات کا اندازہ تھا، اس لیے آپ نے غزوۂ حنین سے پہلے ہی حضرت عُروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ کرام کو آلاتِ محاصرہ مثلاً منجنیق اور دبابے حاصل کرنے اور ان آلات کی تکنیک سیکھنے کے لیے یمن کی اسلحہ ساز بستی ''جُرش'' بھیج دیا تھا۔ ابھی تک وہ لوگ یہ فن سیکھ کر واپس نہیں آئے تھے۔

بہر حال دشمن کو زیادہ وقت دینا مناسب نہیں تھا، اس لیے طائف کی طرف کوچ کر دیا گیا۔ شہر کے قریب پہنچ کر خیمے لگائے گئے اور صحابہ کرام نے فصیل کا محاصرہ کر لیا۔ [1]

نبی اکرم ﷺ نے خونریزی کے امکانات کم از کم کرنے کے لیے اعلان کرایا کہ شہریوں میں سے جو بھی باہر آجائے، وہ مامون ہوگا۔ جو غلام ہم سے آملیں گے، وہ آزاد شمار ہوں گے۔ اس اعلان پر طائف کے کچھ غلام فرار ہو کر اسلامی لشکر میں آگئے۔ ان میں سے نُفَیع بن مسروق نامی ایک غلام نے چرخی پر لگی رسّی سے لٹک کر نیچے اترنے میں کامیابی حاصل کی اور اسلام قبول کیا۔ چونکہ چرخی کو عربی میں ''بَکْـرَة'' کہتے ہیں للہذا انہیں ''ابوبکرہ'' کی کنیت سے شہرت ملی۔ نبی اکرم ﷺ نے حسبِ وعدہ انہیں غلامی سے آزاد کر دیا۔ [2]

جنگ بڑے ہولناک انداز میں چھڑی۔ طائف کے محصورین نے مسلسل تیر اندازی کر کے مسلمانوں کو زیادہ آگے نہ بڑھنے دیا۔ کئی مجاہدین زخمی اور شہید ہو گئے۔ مسلمانوں کو مجبوراً پیچھے ہٹ کر اپنی خیمہ گاہ شہر سے دور منتقل کرنا پڑی۔ طائف کا محاصرہ تقریباً تین ہفتوں تک جاری رہا۔ [3] اس دوران عروہ بن مسعود جُرش سے ایک منجنیق اور دو دبابے لے کر آگئے۔ شہر پر سنگ باری شروع کی گئی۔ اسلام کی تاریخ میں یہ دور مار بھاری ہتھیار کا پہلا استعمال تھا۔ ساتھ ساتھ مجاہدین نے دبابوں کی مدد سے فصیل کے پھاٹک تک پہنچنے کی کوشش بھی کی مگر طائف کے جنگجوؤں نے ایک دبابے کو ناکارہ بنا دیا اور مجاہدین کو تیروں کا نشانہ بنا کر ایک بار پھر پسپائی پر مجبور کر دیا۔ [4]

حضور ﷺ نے دشمن کی سخت مزاحمت کو دیکھتے ہوئے صحابہ کرام کو واپسی کا مشورہ دیا تھا مگر ابتدا میں وہ شہر فتح کیے بغیر لوٹنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ تاہم جب جانی نقصانات بڑھ گئے اور ایک بار پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کل ان شاء اللہ تعالیٰ واپسی ہوگی۔'' سب نے بخوشی تائید کی؛ کیوں کہ وہ محاصرے سے خود بھی تنگ آچکے تھے۔ [5]

رضاعی بہن شیما رضی اللہ عنہا سے ملاقات:

اس مہم کا میدان اسی علاقے میں تھا جہاں رسول اللہ ﷺ نے اپنی شیر خوارگی کا زمانہ گزارا تھا۔ دائی حلیمہ رضی اللہ عنہا کے قبیلے ''بنوسعد'' نے بھی اس لڑائی میں ہوازن کے شانہ بشانہ حصہ لیا تھا اور اب اس کے مرد و زن بھی قیدی بن چکے تھے

---

[1] جوامع السیرۃ لابن حزم، ص ۱۹۳
[2] طبقات ابن سعد: ۱۵/۷
[3] ایک قول کے مطابق محاصرہ چالیس دن تک رہا۔ (طبقات ابن سعد: ۱۵۸/۲، ۱۵۹)
[4] جوامع السیرۃ لابن حزم، ص ۱۹۳
[5] صحیح مسلم، ح: ۴۷۲۰، کتاب الجهاد، باب غزوة الطائف

جن میں حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی شیماء بھی شامل تھیں۔ جب انہوں نے مسلمانوں کو بتانے کی کوشش کی کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن ہیں تو کسی کو یقین نہ آیا۔ آخر انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا۔ شیماء جن کی عمر اب ۷۰ سال کے قریب تھی، دوبارہ اسی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہی تھیں، جسے وہ گود میں لیے طرح طرح سے بہلایا کرتی تھیں۔ درمیان میں ساٹھ برس سے زیادہ طویل زمانہ گزر چکا تھا مگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہی تھے۔ سب سے الگ، سب سے ممتاز۔ شیماء حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ کر گویا ہوئیں:

''یارسول اللہ! میں آپ کی رضاعی بہن ہوں۔'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کی کوئی نشانی ہے؟''

کہنے لگیں: ''کیا یہ نشانی کافی نہیں کہ میں آپ کو اٹھائے ہوئے تھی اور آپ نے میری پشت پر کاٹ لیا تھا۔ اس کا نشان موجود ہے۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے غیر معمولی حافظے کی بنا پر بچپن کی وہ بات یاد آنے میں دیر نہ لگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے اعزاز میں اپنی چادر مبارک بچھا کر انہیں پاس بٹھالیا اور فرمایا: ''آپ چاہیں تو میرے ساتھ ہی رہیں۔''

انہوں نے اپنی قوم کے ساتھ واپس جانا پسند کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک غلام اور ایک باندی ہدیے میں دے کر بڑی عزت کے ساتھ رخصت فرمایا۔[1]

حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات اور ان کا اکرام:

طائف سے واپسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''جِعرانہ'' میں قیام کیا۔ یہاں بنوہوازن کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس دوران ایک عمر رسیدہ دیہاتی خاتون آتی دکھائی دیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا، اپنی چادر مبارک بچھائی اور انہیں ساتھ بٹھا کر نہایت ادب کے ساتھ ان سے گفتگو فرمانے لگے۔

صحابہ نے اتنی عزت افزائی دیکھ کر پوچھا: یارسول اللہ! یہ محترمہ کون ہیں؟''

فرمایا: ''یہ میری رضاعی والدہ (حلیمہ سعدیہ) ہیں۔''[2]

---

① سیرۃ ابن ھشام: ۴۵۸/۲ ؛ الروض الانف: ۳۰۴/۷، ۳۰۵

② الاصابۃ: ۸۷/۸، ۸۸ ؛ الاستیعاب: ۱۸۱۲/۴

اندازاً حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کی عمر اس وقت ۸۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ انہیں رواۃِ حدیث میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان سے مروی سب سے مشہور روایت عبداللہ بن جعفر کے واسطے سے منقول ہے، جس میں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور رضاعت کے حالات بیان کرتی ہیں۔ یہ روایت کتبِ حدیث اور سیرت نبویہ کا بیش قیمت اثاثہ ہے جسے ابویعلیٰ نے اپنی مسند، ابن حبان نے اپنی صحیح اور ابن اسحٰق نے اپنی سیرت میں نقل کیا ہے۔ ایک روایت کے مطابق حلیمہ سعدیہ حضور کے حضرت خدیجہ سے نکاح کے بعد ایک بار مکہ تشریف لائی تھیں، اور اپنے علاقے میں قحط سالی کی شکایت کی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہہ کر انہیں ایک اونٹ اور چالیس بکریاں دلوائیں۔ (سبل الھدیٰ والرشاد، بروایت ابن جوزی: ۳۸۳/۱)

بعض روایات کے مطابق حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کا گھرانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ ہجرت فرمانے سے پہلے اسلام قبول کر چکا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے خاوند حضرت حارث (جنہیں ابوکبشہ اور ابوذویب بھی کہا جاتا تھا) مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ کی باتیں سنیں اور اسلام قبول کرلیا۔ وہ فرماتے تھے: ''میرا یہ بیٹا میرا ہاتھ اس وقت تک نہ چھوڑے گا جب تک مجھے جنت میں داخل نہ کردے۔ (الاصابۃ: ۲۷۶/۱) ابن جوزی کی روایت کے مطابق حضرت حارث کے ساتھ حضرت حلیمہ بھی مکہ آئیں اور مشرف بہ اسلام ہوئی تھیں۔ (سبل الھدیٰ والرشاد، بروایت ابن جوزی: ۳۸۳/۱)

غالباً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر رضاعی بھائی بہن اسی وقت مسلمان ہوگئے تھے مگر قوم کے خوف سے اسلام کو چھپائے رکھا۔ شیماء کے الفاظ ''یارسول اللہ'' بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ وہ پہلے سے مسلمان تھیں، اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انہیں یا حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کو دعوتِ اسلام دینے کی ضرورت نہ پڑی۔

بنوہوازن کے قیدیوں کی رہائی:

بنوہوازن کے وفد سے شرفِ باریابی ملا تو انہوں نے اسلام قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان کے چھ ہزار قیدی جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے، مسلمانوں کی تحویل میں تھے۔ وفد کے ایک رُکن ابو بُرقان نے جو رسول اللہ ﷺ کے رضاعی چچا تھے، درخواست کی کہ انہیں آزاد کر دیا جائے۔ حضور ﷺ نے ان لوگوں کے اسلام قبول کرنے اور اپنے رضاعی رشتوں کے اکرام میں صحابہ سے مشورہ کر کے تمام قیدیوں کو آزاد فرما دیا۔ ①

مالِ غنیمت میں زیادہ تر بھیڑ بکریاں تھیں جو مجاہدین میں تقسیم کر دی گئیں۔ آپ ﷺ نے اس میں سے بڑا حصہ ان لوگوں کو دیا جو اسلام کی طرف راغب ہو رہے تھے مگر ابھی کلمہ نہیں پڑھا تھا۔ انہیں "مؤلفۃ القلوب" کہا جاتا تھا، یعنی وہ لوگ جن کی دل داری کی جائے۔ ②

غزوۂ حنین کا اہم ترین سبق:

غزوۂ حنین کا سب سے سبق آموز پہلو، جس کی طرف قرآن مجید میں بطورِ خاص توجہ دلائی گئی، یہ ہے کہ مسلمانوں کو بھرپور اسبابِ حرب جمع کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کے باوجود، کبھی اور کسی حال میں بھی اپنی افواج اور اسلحے پر مغرور نہیں ہونا چاہیے بلکہ اصل اعتماد اور بھروسہ محض اللہ تعالیٰ پر کرنا چاہیے، دعا اور توکل کا ہر لحہ اہتمام کرنا چاہیے؛ کیوں کہ اگر اللہ کا حکم نہ ہو تو بڑی سے بڑی فوج اور زیادہ سے زیادہ اسلحہ جمع کر کے بھی فتح حاصل نہیں کی جاسکتی۔

ابومحذورہ کا قبول اسلام:

حنین سے واپسی پر راستے میں وادیٔ جُعرانہ میں پڑاؤ ڈالا گیا۔ اس دوران اذان دی گئی تو دراز زلفوں والے ایک مقامی نوجوان ابومَحذُورَہ نے مذاقاً اس کی نقل اتارنا شروع کر دی۔ آواز بلند اور دل کش تھی۔ حضور ﷺ کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو اس نوجوان کو بلوالیا، ڈانٹ ڈپٹ کی بجائے شفقت سے اس کی زلفوں ہاتھ پھیر کر اپنے سامنے دوبارہ اذان کی تلقین کی۔ ابومَحذُورَہ پر ایسا اثر ہوا کہ اسلام قبول کر لیا۔ حضور ﷺ کی طرف سے ان کو مسجد الحرام کا مؤذن مقرر کر دیا گیا۔ ③ انہوں نے عمر بھر وہ زلف نہ کاٹی جسے دستِ رسالت مآب ﷺ نے چھوا تھا۔ ④

مکہ سے مدینہ واپسی:

مکہ پہنچ کر عمرے کی ادائیگی کے بعد حضور ﷺ فی الفور مدینہ منورہ روانہ ہوگئے۔ ۲۴ ذوالقعدہ کو مکہ اور حنین کا فاتح لشکر مدینہ منورہ میں داخل ہوا۔ اس طویل مہم میں دو ماہ سولہ دن خرچ ہوئے۔ آپ ﷺ کی عدم موجودگی میں مدینہ کے امیر حضرت ابورُہم کلثوم بن حصین انصاری رضی اللہ عنہ رہے۔ ⑤

---

① سبل الهدى والرشاد: ۵/۳۹۰ تا ۳۹۳

② جوامع السيرة، ص ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۲۹

③ سنن النسائی، ح: ۶۳۲، باب كيف الاذان ؛ الاصابة: ۷/۳۰۲، ۳۰۳

④ معرفة الصحابة لابي نعيم: ۳/۱۴۱۱ ⑤ جوامع السيرة: ص ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۲۹

عتاب بن اَسید کی قیادت میں حج:

حضور ﷺ نے مکہ کے ایک قریشی نوجوان عتاب بن اَسید رضی اللہ عنہ کو مکہ اور مضافات کا حاکم مقرر کردیا تھا۔ان کی عمر فقط بیس سال تھی مگر عابد وزاہد نوجوان تھے۔

فتح مکہ کے تین ماہ بعد حج انہی کی امارت میں ادا ہوا[1] جو حسب معمول کی ذوالحجہ میں تھا۔مشرکین کو حج سے منع نہیں کیا گیا: کیوں کہ اسلام کا مزاج تدریجاً اصلاح کا ہے۔چنانچہ مشرکین حسب معمول اپنی تمام رسوم کے ساتھ اس میں شریک ہوئے۔[2]

☆☆☆

---

① تاریخ ابن خلدون: ۲/۴٦٦

② سعید بن مسیب کی ایک مرسل روایت کے مطابق اس سال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنایا گیا تھا۔(مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۴۱)
مگر حافظ ابن کثیر نے اس پر جرح کی ہے:"و ھذا السیاق فیه غرابة من جهة ان امیر الحج سنة عمرة الجعرانة انما هو عتاب بن اُسید فاما ابوبکر انما کان امیراً سنة تسع. (البدایة و النهایة: ۴/۱۰۴) محدثین،مؤرخین اور سیرت نگاروں کا اسی پر اتفاق ہے۔چند عبارات ملاحظہ ہوں:
فلما رجع فی شوال اعتمر من الجعرانة،ثم حج عتاب بن اسید،فاقام للناس الحج،واستعمله النبی ﷺ علی الحج،ثم حج ابوبکر سنة تسع.(التاریخ الاوسط للبخاری: ۱/۳۳)اقام الحج فی سنة ثمان من الهجرة عتاب بن اسید ......وسائر الناس علیٰ شرکهم.(المحبر،ص ۱۱)
وحج الناس تلک السنة علی ما کانت العرب تحج علیه وحج تلک السنة المسلمین عتاب بن اسید وهی سنة ثمان. (تاریخ الطبری: ۳/۹۵)
محمد بن سعد اور ابن خلدون بھی یہی لکھتے ہیں:(طبقات ابن سعد :۵/۴۴٦ ؛ تاریخ ابن خلدون: ۲/۴٦٦)
نوٹ: عتاب بن اَسید رضی اللہ عنہ تاحیات مکہ کے گورنر رہے۔مگر مختصر عمر پائی،جمادی الآخرہ ۱۳ھ میں عین جوانی میں ان کی وفات ہوگئی۔یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری ایام کا واقعہ ہے۔(الاستیعاب: ۳/۱۰۲۳)

غزوۂ تبوک (۹ ہجری)

فتح مکہ کی مہم کے باعث مکہ اور اس کے مضافات مسخر ہو گئے تھے، پورا جزیرۃ العرب اسلام کے زیر سایہ آ چکا تھا۔ صدیوں سے بکھرے ہوئے صحرائی قبائل اور شتربانوں کے گروہ اب ایک عظیم مقصد کے لیے ایک جھنڈے تلے جمع تھے۔ مشرق میں فارس کی حکومت اندرونی طور پر زبردست ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے کی وجہ سے اس وقت جزیرۃ العرب پر توجہ دینے کے قابل نہیں تھی مگر بازنطینی رومی مؤتہ کی جنگ کے بعد سے چوکنا تھے اور جزیرۃ العرب پر حملے کی پیش بندیاں کر رہے تھے۔ شام کی سرحدوں پر آباد نصرانی عرب بھی انہیں پیغامات بھیج رہے تھے کہ مسلمانوں سے جلد از جلد نمٹ لیا جائے۔ قیصر روم نے یہ مہم شام میں اپنے ماتحت غسانی نصرانیوں کے سپرد کر دی جو عرب ہونے کے ناتے صحرائی نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف تھے۔ لَخم وجُذام کے قبائل بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ سن ۹ ہجری کے وسط میں ان کی تیاری مکمل ہو گئیں، اور چالیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل رومیوں کی ہراول فوج پیش قدمی کر کے "بلقاء" تک پہنچ گئی۔[1]

نبطیوں کے ذریعے جو شام سے زیتون کا تیل لا کر حجاز میں فروخت کرتے تھے،[2] حضور ﷺ کو یہ خبریں مل رہی تھیں اور آپ ﷺ اس بارے میں سخت متفکر تھے۔ مدینہ کے لوگ بھی سخت تشویش کا شکار تھے۔ انہیں ہر آن غسانیوں کے حملے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔[3]

یہ سوال اپنی جگہ برقرار تھا کہ اتنے بڑے دشمن سے جنگ کیسے لڑی جائے گی؟ اگر دشمن کی آمد کا انتظار کیا جاتا تو یقینی بات تھی کہ جنگ سے پہلے ہی مدینہ کے شمال کے تمام علاقے دشمن کے قبضے میں آ جاتے۔ پھر اگر غزوۂ خندق کی طرح مورچہ بندی کر کے جنگ کی بھی جاتی تب بھی یہ خطرہ بدستور تھا کہ حجاز میں داخل ہونے کے بعد دشمن چاروں طرف دور دور تک پھیل جاتا اور مدینہ پورے جزیرۃ العرب سے کٹ کر رہ جاتا۔

رسول اللہ ﷺ نے خاصی سوچ بچار اور مشورے کے بعد فیصلہ فرمایا کہ مسلمان خود شام کی سرحدوں کی طرف پیش قدمی کریں گے تاکہ دشمن پر نفسیاتی رعب طاری ہو جائے اور میدانِ جنگ اپنا علاقہ نہ بنے۔ اس حکم پر لبیک کہنا آسان نہ تھا۔ ایک تو انتہائی گرمی کے دن تھے، دوسرے کھجوروں کے پکنے کا زمانہ تھا۔[4] مدینہ میں اکثر صحابہ کی معاش اس

---

① شرح الزرقانی علی المواھب اللدنیۃ: ۴/۶۶ تا ۶۸؛ الرحیق المختوم، مولانا صفی الرحمن مبارک پوری: ص ۵۸۱، ۵۸۲، ط المکتبۃ السلفیۃ، لاہور

② المغازی للواقدی: ۳/۹۹۰ ..... نوٹ: نبطی نابت بن اسماعیل کی نسل سے تھے، پہلے شمالی حجاز میں ان کا غلبہ تھا، پھر زوال پذیر ہو کر یہ لوگ تاجر اور کاشت کار رہ گئے۔ (الرحیق المختوم، حاشیہ ص ۵۸۱)

③ صحیح مسلم، ح: ۳۷۶۳، باب فی الایلاء ④ صحیح البخاری، ح: ۴۴۱۸، کتاب المغازی، حدیث کعب بن مالک رضی اللہ عنہ

باغ بانی پر منحصر تھی، ایسے وقت میں باغوں کو چھوڑ کر جانا گویا فصل کو ضایع کرنے اور پورے سال کی آمدن سے محروم ہونے کے مترادف تھا۔ان سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک مدت سے قحط سالی چلی آرہی تھی اور اہلِ مدینہ کی مالی حالت خاصی کمزور تھی۔اس کے باوجود روانگی کا فیصلہ اٹل تھا۔مکہ سمیت عرب کے تمام قبائل کو حکم بھیج دیا گیا کہ وہ اپنی نفری روانہ کریں۔[1] حضور ﷺ اکثر لشکر کشی کا رخ ظاہر نہیں فرماتے تھے مگر اس بار سفر کی طوالت اور راستے کی دشواریوں کے پیشِ نظر آپ ﷺ نے واضح کر دیا کہ شام کی طرف کوچ کرنا ہے۔اس اظہار میں غالباً یہ حکمت تھی کہ اس طرح مدینہ میں موجود دشمن کے جاسوسوں کے ذریعے یہ خبر شام والوں تک پہنچ سکتی تھی جس سے وہ ہراساں ہو سکتے تھے۔

حضور ﷺ نے مسجد نبوی میں صحابہ کرام کو جمع کر کے انہیں جہاد کے لیے صدقہ وخیرات کرنے کی ترغیب دی۔شمع رسالت کے پروانوں نے بڑھ چڑھ کر چندہ دیا۔حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ نے ۹۰ وسق کھجوروں کا ذخیرہ نذر کیا۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ساز وسامان سمیت تین سو اونٹ اور ایک ہزار اشرفیاں پیش کیں۔حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے سو اوقیہ چاندی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دو سو اوقیہ چاندی کے علاوہ گھر کا آدھا سامان حاضر کر دیا۔[2] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تو کمال ہی کر دیا، گھر میں جو کچھ تھا، سب ہی اللہ کے نام پر نثار کر ڈالا۔[3] غریب، مسکین بھی پیچھے نہ رہے اور اپنی حیثیت کے مطابق صدقہ وخیرات کر گزرے۔یہ سفر سواریوں کے بغیر طے کرنا بہت مشکل تھا، اس لیے لشکر کی تنظیم میں خیال رکھا گیا کہ ہر شخص کو سواری میسر آجائے۔چونکہ صحابہ کی بہت بڑی تعداد ساتھ چلنے پر تیار تھی، اس لیے سواریاں کم پڑ گئیں۔ایک ایک اونٹ پر باری باری دو دو، تین تین آدمیوں کی ترتیب بنائی گئی پھر بھی کچھ افراد کے لیے کوئی انتظام نہ ہو سکا اور وہ روتے ہوئے دربارِ رسالت سے لوٹ گئے۔[4] البتہ منافقین کی حالت مختلف تھی۔وہ خود بھی اس شدت کی گرمی میں سفر کرنے سے جی چرا رہے تھے اور دوسروں کو بھی روک رہے تھے۔[5]

نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ میں اپنا نائب بنایا تو منافقین باتیں بنانے لگے کہ حضور ﷺ ناراضی کی وجہ سے انہیں ساتھ نہیں لے جا رہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ باتیں حضور ﷺ تک پہنچائیں[6] اور عرض کیا:

''آپ مجھے عورتوں اور بچوں کے ساتھ چھوڑے جا رہے ہیں؟''

آپ ﷺ نے فرمایا:''کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔''

---

① المغازی للواقدی:۳/۹۹۰
② تاریخ الاسلام للذھبی:۲/۶۲۸،۶۲۹
③ سنن ابی داؤد، ح:۱۶۷۸،کتاب الزکوٰۃ
④ سیرۃ ابن ہشام:۲/۵۱۷ ..... کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ:''ولا یجمعھم کتاب حافظ'' سے بھی ظاہر ہے کہ جانے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔(صحیح البخاری، ح:۴۴۱۸)
⑤ تفسیر ابن کثیر، سورۃ التوبۃ، آیت:۸۱
⑥ السنۃ لابن ابی عاصم:۲/۶۰۰

حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ سن کر مطمئن ہو گئے۔[1]

اسلامی فوج تبوک کی طرف گامزن:

جمعرات ۳ رجب ۹ھ کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تیس ہزار افراد کے ہمراہ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔[2] مدینہ منورہ اور اس کے مضافات مردوں سے تقریباً خالی ہو گئے تھے۔ صرف خواتین اور بچے پیچھے رہ گئے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ وہ لوگ تھے جنہیں کوئی سخت عذر تھا اور وہ چاہنے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں جا سکے تھے، البتہ منافقین پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس موقع پر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے اور گھروں میں دبکے رہے۔[3]

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سواری نہ ہونے کی وجہ سے روانہ نہیں ہو سکے تھے مگر بعد میں جذبۂ جہاد اتنا غالب آیا کہ سامانِ سفر کاندھے پر لاد کر پیدل ہی چل پڑے اور لشکرِ اسلام سے جا ملے۔ حضرت ابوخیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ اپنی باغبانی میں مشغول ہو کر پیچھے رہ گئے تھے۔ ایک دن باغ میں اپنی بیویوں کے ساتھ بیٹھے بٹھائے خیال آ گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کتنی دشواری اور تکلیف برداشت کر کے جہاد کے سفر پر نکلے ہوئے ہیں اور ہم یہاں آرام سے ٹھنڈی چھاؤں میں ہیں، ضمیر نے ایسا جھنجھوڑا کہ اس وقت لشکر کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ بھی کئی دن کی تاخیر سے روانہ ہوئے، ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ اور وہ ساتھ مل گئے اور راستہ طے کرتے چلے گئے۔[4]

صرف دس افراد ایسے تھے جو کسی عذر کے بغیر پیچھے رہ گئے اور بعد میں بھی پابہ رکاب نہ ہو سکے۔ ان میں ابولبابہ بن عبدالمنذر،[5] مُرارہ بن ربیع، ہلال بن اُمیہ اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہم کے نام نمایاں ہیں۔[6]

---

① صحیح البخاری، ح: ۴۴۱۶، کتاب المغازی، باب غزوۃ تبوک؛ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۲۰۰۸

ابن ہشام کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر والوں کی خبر گیری کا اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو شہر کے انتظامات کا ذمہ دار بنایا تھا۔ (سیرۃ ابن ہشام: ۵۱۹/۲) مگر یہ سنداً ضعیف ہے جبکہ صحیح بخاری کی روایت میں "استخلف علیاً" کا لفظ واضح طور پر بتا رہا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نائب بنایا گیا تھا۔ ابن ہشام کی روایت کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو (صوبے کی عمومی نیابت کے ساتھ ساتھ) اہل وعیال کی دیکھ بھال کی خصوصی ذمہ داری بھی دی گئی جبکہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو ان کے ماتحت شہر کے منتظم کا عہدہ دیا گیا۔ بعض روایات میں سباع بن عُرفُطہ رضی اللہ عنہ کی نیابت کا ذکر ہے۔ اس کی بھی ایسی ہی توجیہ ممکن ہے۔

② رجب میں روانگی پر اہلِ سیر متفق ہیں۔ ابن حبیب نے روانگی کیم رجب بروز پیر بتائی ہے۔ (المحبر، ص ۱۱۶)
مگر صحیح بخاری میں صراحت ہے کہ سفر جمعرات کو شروع ہوا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر جمعرات میں نکلنا ہی پسند کرتے تھے۔ "خرج یوم الخمیس فی غزوۃ تبوک وکان یحب ان یخرج یوم الخمیس" (صحیح البخاری، ح: ۲۹۵۰، کتاب الجہاد)
اس لیے غالب ظن یہ ہے کہ روانگی ۳ رجب بروز جمعرات ہوئی۔ اس رجب کو مکی رجب تصور کریں تو یہ تاریخ ۱۱ اپریل ۶۳۱ء بنتی ہے جو مئی گرمی کا موسم تھا۔ قرآن مجید کی نص "لَا تَنفِرُوْا فِی الْحَرِّ" (سورۃ التوبۃ: ۸۱) کی روشنی میں غزوہ تبوک موسم گرما ہی میں ثابت ہوتا ہے۔
احادیث میں بھی وضاحت ہے کہ یہ کھجوریں پکنے کا موسم تھا۔ حین طابت الثمار والظلال. (صحیح البخاری، ح: ۴۴۱۸، حدیث کعب بن مالک) جبکہ مدنی تقویم میں رجب، اکتوبر کے مقابل آتا ہیں، اس لیے غزوۂ تبوک کی توقیت یقینی طور پر مکی ثابت ہوتی ہے۔

③ انی لا اری الا رجلاً مغموصاً علیه النفاق او رجلاً مما عذرا اللّٰه من الضعفاء. (صحیح البخاری، ح: ۴۴۱۸، حدیث کعب بن مالک)

④ سیرۃ ابن ہشام: ۵۲۱/۲

⑤ دلائل النبوۃ للبیہقی: ۲۷۲/۵

⑥ صحیح البخاری، ح: ۴۴۱۸، حدیث کعب بن مالک

قوم ثمود کے کھنڈرات سے گزرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خشیت:

اس کٹھن سفر میں نبی اکرم ﷺ کا گزر وادی حجر سے ہوا جہاں قوم ثمود کے کھنڈرات تھے۔ ہزاروں برس پہلے یہاں حضرت صالح علیہ السلام نے توحید کی صدا بلند کی تھی اور قوم ان کی دعوت کا انکار کر کے عذابِ خداوندی کی حق دار بنی تھی۔ اللہ کی طرف سے مسلط کردہ زلزلے اور کڑک نے ان کا نام ونشان مٹا دیا، ہاں پہاڑوں میں تراشے ہوئے ان کے مکانات اور کھنڈر زبانِ حال سے اُن کی داستانِ عبرت سنا رہے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کو خدشہ ہوا کہ کہیں مسلمان اس تباہ شدہ قوم کی عمارتوں کا جائزہ لینے نہ رک جائیں اور اسے تفریح اور تماشا نہ بنا کر اصل تاثر یعنی عبرت اور خوف خداوندی کو فراموش نہ کر دیں اور اس بے حسی کی پاداش میں خود بھی اللہ کے عذاب کے حق دار نہ بن جائیں، اس لئے حضور ﷺ نے یہاں سے گزرتے ہوئے اپنے چہرہ مبارک کو کپڑے سے ڈھانک لیا تاکہ کھنڈروں کے بھیانک منظر پر نگاہ بھی نہ پڑنے پائے۔ آپ ﷺ نے سواری کی رفتار بھی بڑھا دی اور ساتھ ہی صحابہ کرام کو تاکید کی:

''ان ظالم لوگوں کی آبادی سے گزرتے ہوئے، تمہیں اس ڈر سے رونا چاہیے کہ کہیں وہی عذاب تم پر نازل نہ ہو جائے۔''

قوم ثمود کے کنویں سے گزر ہوا تو مسلمان وہاں سے پانی بھرنے لگے۔ حضور اکرم ﷺ کو علم ہوا تو فرمایا:

''اس پانی کو مت پینا، نہ ہی اس سے وضو کرنا۔''[1]

حساس اور لطیف مزاج انسان کو عذاب زدہ مقامات پر ہزاروں سال بعد بھی ایک وحشت بر تی محسوس ہوتی ہے۔ حضور ﷺ سے بڑھ کر ایسے اثرات کا احساس کس کو ہو سکتا تھا، اس لیے آپ نے اس پانی کو استعمال کرنا بھی مناسب نہ سمجھا کہ کہیں عذاب کی نحوست اس میں بھی سرایت نہ کر گئی ہو۔

تبوک میں قیام اور گردونواح کے علاقوں پر قبضہ:

آخر کار یہ سفر مکمل ہوا اور مسلمان شام کی سرحدوں پر تبوک نامی چشمے تک پہنچ گئے۔ حضور ﷺ نے اس چشمے کا پانی استعمال کرنے سے پیشگی منع کر دیا تھا مگر دو افراد نے خیال نہ کیا اور پہلے پہنچ کر حکم کی خلاف ورزی کر دی۔ جب اسلامی لشکر وہاں پہنچا تو چشمے میں برائے نام پانی تھا۔ حضور ﷺ نے خلاف ورزی کرنے والے دونوں مجاہدین کو سرزنش کی اس کے بعد اس پانی میں چہرہ اطہر اور دستِ مبارک دھوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چشمے میں پانی ٹھاٹھیں مارنے لگا۔[2]

اگرچہ یہاں اردگرد عرب نصرانی قبائل آباد تھے مگر مطلع بالکل صاف تھا۔ رومی لشکر کا دور دور تک کوئی پتا نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نبی اکرم ﷺ کی بنفسِ نفیس لشکر کشی نے ان پر رعب طاری کر دیا ہے اور وہ مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ ترک کر چکے ہیں۔ حضور ﷺ نے تبوک کے سرحدی مقام پر پورے بیس دن قیام فرمایا، اس دوران قیصر کی طرف سے کسی قسم کی جوابی کارروائی یا عسکری نقل وحرکت کی کوئی سن گن نہ ملی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رومی مسلمانوں سے مرعوب ہو کر حملے کے خیال سے باز آ گئے ہوں۔ اس صورتِ حال سے خود عرب نصرانی سرداروں کا رومی بادشاہت پر اعتماد ختم

[1] سیرۃ ابن ہشام: ۵۲۲،۵۲۱/۲ [2] صحیح مسلم، ح: ۷۰۸۶، باب فی معجزات النبی ﷺ

ہو گیا اور ان میں سے سب سے پہلے ''اَیلہ'' کے حاکم ''یوحنّا'' نے حاضر ہو کر ریاست مدینہ کی تابع داری قبول کی۔ پھر ''جَرباء'' اور ''اَذرُح'' کے عمائد نے بھی آ کر سر تسلیم خم کر دیا۔ ان سب نے جزیہ دینے کی حامی بھر لی۔

یہاں سے حضور ﷺ نے اپنے نامور شہسوار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دُومۃ الجندل کے نصرانی حاکم اُکَیدِر بن مالک کی گوشمالی کے لیے روانہ کیا؛ کیوں کہ دُومۃ الجندل میں ایک مدت سے مسلمانوں کے قافلوں سے چھیڑ چھاڑ کی جارہی تھی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اُکَیدِر کو ایک چھاپہ مار کارروائی میں عین اُس وقت گرفتار کر لیا جب وہ جنگل میں شکار کھیل رہا تھا۔ آخر اُکَیدِر نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اطاعت کا عہد کیا۔ [1]

جزیے کی مشروعیت:

اسی محاذ پر جزیہ مشروع ہوا اور یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی: [2]

''اور وہ اہلِ کتاب جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخرت پر اور جو اللہ اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے، اور نہ دینِ حق کو اپنا دین مانتے ہیں، ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ خوار ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔'' [3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے واپسی کا مشورہ:

تبوک میں قیام کو خاصے دن گزر چکے تو نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام سے آگے پیش قدمی کے بارے میں مشورہ طلب کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اللہ کے رسول! رومیوں کی افواج بہت زیادہ ہیں۔ ہم اُن کے قریب آ کر انہیں خوفزدہ کر چکے ہیں۔ اس سال اتنا ہی کافی ہے کہ ہم انہیں مرعوب کر کے لوٹ جائیں۔ پھر آئندہ جو ہوگا دیکھ لیں گے۔ اللہ تعالیٰ راستے کھول دے گا۔'' یہ رائے احتیاط اور حکمت پر مبنی تھی، حضور ﷺ نے اسے پسند فرمایا۔ [4]

قیصر کے سفیر کو دعوتِ اسلام:

اس سے قبل آپ نے ہرقل کو تبوک سے ایک مراسلہ بھی بھیجا تھا۔ کچھ دنوں بعد ہرقل کی طرف سے عرب قبیلے تنوخ کا ایک شخص اس کا جواب لے کر حاضر ہوا۔ آپ نے مکتوب پڑھا جو مؤدبانہ اور ملاطفت آمیز باتوں پر مشتمل تھا۔

حضور ﷺ نے سفیر سے پوچھا: ''کس قوم کے ہو؟'' سفیر نے جواب دیا: ''بنو تنوخ کا۔''

---

① تاریخ ابن خلدون: ۲/۴۶۸ ② الاموال لابی عبید قاسم بن سلام، ص ۲۷

③ سورۃ التوبہ، آیت: ۲۹. جزیہ وہ معمولی رقم ہے جو اسلامی حکومت غیر مسلم شہریوں سے ان کو مہیا کردہ سہولیات کے بدلے سال میں ایک بار وصول کرتی تھی۔ اس کے بعد ہر جہادی مہم میں حریف کو اسلام لانے یا جزیے کی ادائیگی قبول کرنے کی پیش کش کی جاتی تھی۔ دونوں سے انکار کی صورت میں جنگ ہوتی تھی۔ اب رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کو لشکروں کا امیر بناتے ہوئے ہدایت کرنے لگے کہ اگر مد مقابل اسلام قبول نہ کریں تو ان پر جزیہ عائد کیا جائے۔ فان ابوا فخذ منهم الجزية. (سنن الترمذی، ح: ۱۶۱۷) غالباً یہ ارشاد پہلی بار ان سرایا کے امراء کو فرمایا گیا جو آیتِ جزیہ کے نزول کے بعد تبوک میں قیام کے دوران گرد و نواح میں بھیجے گئے۔ نیز جیشِ اسامہ رضی اللہ عنہ بھی اسی حکم کے ساتھ روانہ ہوا ہوگا۔

④ السیرۃ الحلبیۃ: ۳/۲۰۰

آپ ﷺ نے اسے اسلام کی دعوت دیتے ہوئے کہا: ''تمہیں ابراہیم علیہ السلام کے دین میں دلچسپی ہے؟''
اس نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا: ''میں ایک قوم کا ایلچی اور ایک مذہب کا پیروکار ہوں۔ اپنی قوم کے پاس واپس جائے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔'' حضور ﷺ ہنس دیے اور آیت تلاوت فرمائی:

اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ

(بے شک آپ جسے پسند کریں اسے ہدایت نہیں دے سکتے مگر اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔)[1]

پھر فرمایا: ''تم سفیر ہو۔ سفیر کا حق بنتا ہے۔ مگر ہم سفر میں ہیں۔ کچھ میسر ہوتا تو تمہیں انعام واکرام سے نوازتے۔''
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سنا تو فوراً ایک عمدہ پوشاک لا دی۔ سفیر دربارِ رسالت سے یہ خلعت لے کر رخصت ہوا۔[2]

غزوۂ تبوک سے واپسی اور مسجدِ ضِرَار کا انہدام:

آخر اسلامی لشکر شام کی سرحدوں پر اپنے پرچم گاڑ کر واپس ہوا۔ اگرچہ منافقین کی اکثریت اس جہاد میں شامل نہ تھی مگر کچھ منافق شرانگیزیوں کے لیے ساتھ چل پڑے تھے، تاہم ان کے ہاتھ کچھ نہ آیا اور پھر سورۃ التوبہ کی آیات نے ان کی رسوائی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس سورہ کی متعدد آیات میں اُن کی مکاریوں، سازشوں اور شرانگیزیوں کو کھول کھول کر بیان کر دیا گیا۔ انہی دنوں منافقین نے مدینہ منورہ کے مضافات میں ایک مسجد تعمیر کی تھی جو دراصل مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے اور ان کی جڑیں کاٹنے کے لئے ایک مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔

منافقین نے اس مرکز کو ''سرکاری'' حیثیت دینے کے لیے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ آپ یہاں تشریف لا کر نماز ادا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے وعدہ فرمالیا تھا کہ تبوک سے واپس آکر وہاں نماز پڑھیں گے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافقین کے عزائم اور اس نام نہاد مسجد کی حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ وحی نازل ہوئی:

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّکُفْرًا وَّتَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَکٰذِبُوْنَ۝ لَا تَقُمْ فِیْهِ اَبَدًا[3]

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ایک مسجد (جیسی شکل) اس کام کے لیے بنائی ہے کہ (مسلمانوں کو) نقصان پہنچائیں، کافرانہ باتیں کریں، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالیں اور اس شخص کو ایک اڈہ فراہم کریں جسکے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ ہے۔ اور یہ قسمیں ضرور کھالیں گے کہ بھلائی کے سوا ہماری کوئی اور نیت نہیں۔ لیکن اللہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ (اے پیغمبر!) تم اس (نام نہاد مسجد) میں کبھی (نماز کے لیے) کھڑے مت ہونا۔''

یوں نے اللہ نے اس مسجد کو ''مسجدِ ضِرار'' قرار دے کر اس کی حقیقت کھول دی۔ چنانچہ حضور ﷺ نے تبوک سے واپسی پر صحابہ کو بھیج کر اس نام نہاد مسجد کو نذرِ آتش کرا دیا۔[4]

[1] سورۃ القصص، آیت: ۵۶ [2] البدایۃ والنہایۃ: ۱۷۵/۷ [3] سورۃ التوبۃ، آیت: ۱۰۷، ۱۰۸ [4] سیرۃ ابن ہشام: ۵۲۹/۲، ۵۳۰

مدینہ تشریف آوری۔ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات:

ماہِ رمضان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے مدینہ منورہ واپس تشریف لائے۔① ادھر آپ کی صاحبزادی اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوگیا۔ اسماء بنت عُمیس، اُمّ عطیہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی صفیہ رضی اللہ عنہن نے مل کر غسل دیا۔

قبر کی کھدائی کے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نم آنکھوں کے ساتھ کنارے پر تشریف فرما تھے۔ آپ نے اپنے پیارے داماد کی تنہائی کا دکھ بھی بخوبی محسوس کیا اور فرمایا: ''میری تیسری بیٹی ہوتی تو وہ بھی عثمان کے نکاح میں دے دیتا۔''②

چند مخلص صحابہ کی آزمائش۔ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی توبہ:

غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے منافقوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے غیر حاضری کے جھوٹے بہانے پیش کر کے اپنی عزت بچانے کی کوشش کی۔ البتہ ان حضرات نے جو کسی معقول عذر کے بغیر شرکت سے رہ گئے تھے، غلط بیانی نہ کی اور اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ یہ دس افراد تھے۔ ان میں سے سات نے خود کو مسجدِ نبوی کے ان ستونوں سے باندھ لیا جہاں سے نبی اکرم گزر کر محراب میں تشریف لاتے تھے۔ انہیں ابولبابہ بن عبدالمنذر انصاری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ انہوں نے خود کو ستونوں سے باندھ کر قسم کھائی کہ اس وقت تک بندھے رہیں گے جب تک اللہ کی طرف سے توبہ قبول نہیں ہو جاتی۔③

ساتویں دن ابولبابہ رضی اللہ عنہ بے ہوش ہو گئے۔ اِدھر اللہ کی طرف سے مغفرت کی بشارت آ گئی۔ جب ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو یہ خوش خبری دی گئی تو وہ کہنے لگے: اس وقت تک خود کو نہیں کھولوں گا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ کھول دیں۔''

آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے انہیں کھولا۔ ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے اس گناہ کے کفارے کے لیے اپنا سارا مال صدقہ کرنے کا عزم کیا،④ ان کے باقی چھ ساتھیوں نے بھی یہی ارادہ ظاہر کیا۔⑤

تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک تہائی کافی ہے۔''⑥

---

① تبوک سے واپسی ابن اسحاق کے مطابق رمضان میں (سیرۃ ابن اسحاق: ۳/ ۵۳۷) اور ابن حبیب کے بقول شوال کی آخری تاریخ کو ہوئی تھی (المحبر، ص ۱۱۶) ایک قول شعبان کا بھی ہے جو بہت بعید ہے۔ قرائن سے ابن اسحاق کا قول قوی لگتا ہے۔

② الطبقات الکبریٰ لابن سعد: ۸/ ۳۸ دار صادر ③ دلائل النبوۃ للبیہقی: ۵/ ۲۷۲

④ مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۴۵ ⑤ دلائل النبوۃ للبیہقی: ۵/ ۲۷۲ ⑥ مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۴۵

حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی توبہ کی توقیت پر بحث: بعض روایات کے مطابق یہ غزوہ بنو قریظہ کا واقعہ ہے۔ بنو قریظہ کے یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر خود کو حوالے کرنے کے بارے میں ابولبابہ رضی اللہ عنہ سے مشورہ مانگا (کیوں کہ وہ یہود کے حلیف رہے تھے۔) ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے گلے پر ہاتھ پھیر کر یہودیوں کو اشارہ کر دیا تھا کہ قتل کا فیصلہ ہوگا، تب یہود نے سعد بن معاذ کو حَکم بنانا بہتر سمجھا۔ (مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۴۲؛ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۶۷۹۶؛ مجمع الزوائد، ح: ۱۰۱۵۵، قال الهیثمي، وفیه محمد بن عمرو بن علقمة وهو حسن الحدیث وبقیة رجاله ثقات.)

مگر ان روایات میں یہ مذکور نہیں کہ ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے بعد میں ندامت کے باعث خود کو ستون سے باندھ لیا۔ یہ اضافہ محمد بن اسحاق کی روایت میں ہے۔ (سیرت ابن هشام: ۲/ ۲۳۷) نیز امام بیہقی نے اسے موسیٰ بن عقبہ سے نقل کیا ہے۔ (دلائل النبوۃ: ۴/ ۱۳)

امام حلبی کے نزدیک اس روایت کو قبول کریں تو ماننا پڑے گا ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے دو بار خود کو باندھا تھا: وعلی هذا فقد تکرر منه ربط نفسه. (السیرۃ الحلبیة: ۳/ ۲۰۷) حافظ ابن کثیر یقین کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے خود کو دو بار باندھا تھا۔ (البدایة والنهایة: ۷/ ۲۲۰)

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی توبہ:

غزوۂ تبوک سے رہ جانے والے باقی تین افراد: کعب بن مالک، مُرارہ بن الربیع اور ہلال بن اُمیہ رضی اللہ عنہم تھے جن کی آزمائش بہت طویل ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم کے تحت مسلمانوں کو ان سے سلام وکلام کرنے سے روک دیا، ان کے معاشرتی مقاطعے کا سلسلہ پچاس دن تک جاری رہا۔ ان تینوں حضرات میں سے مُرارہ بن الربیع اور ہلال بن اُمیہ رضی اللہ عنہما تو رنج وغم اور گریہ وزاری کے سبب گھروں میں بند ہو کر رہ گئے جبکہ کعب رضی اللہ عنہ جو نہایت مضبوط دل گردے کے آدمی تھے، مسجدِ نبوی اور بازاروں میں آتے جاتے رہتے تھے، تاہم کوئی مسلمان ان سے سلام وکلام نہیں کرتا تھا۔ انہی دنوں بنوغسان کے نصرانی گورنر نے ایک نبطی تاجر کے ذریعے انہیں یہ مکتوب بھیجا:

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے آقا نے تمہارے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے۔ اللہ تمہیں ذلّت کی جگہ نہ رکھے۔ تم ہمارے پاس آجاؤ۔ ہم تمہارا اعزاز واکرام کریں گے۔'' ①

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے غیرتِ ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس مراسلے کو یہ کہہ کر تنور میں جھونک دیا: ''یہ بھی ایک آزمائش ہے۔'' یہ تینوں حضرات مسلسل توبہ واستغفار میں مشغول رہے۔ ان کی حالت پر صحابہ بھی غم زدہ تھے اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا بے حد رنج تھا۔ آخر پچاس دن مکمل ہونے پر نمازِ فجر کے بعد وحی نازل ہوئی:

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۝

''اور ان تینوں پر بھی (اللہ نے رحمت کی نظر فرمائی ہے) جن کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا تھا، یہاں تک کہ جب ان پر یہ زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تنگ ہو گئی، ان کی زندگیاں ان پر دوبھر ہو گئیں اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ (کی پکڑ سے) خود اُسی کی پناہ میں آئے بغیر کہیں اور پناہ نہیں مل سکتی، تو پھر اللہ نے ان پر رحم فرمایا تاکہ وہ (آئندہ اللہ ہی کی طرف) رجوع کیا کریں، یقین جانو! اللہ بہت معاف کرنے والا بڑا مہربان ہے۔'' ②

اس آیت میں ان تینوں حضرات کی توبہ قبول ہونے کی بشارت دے گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ اس دن بے حد مسرور ہوئے۔ مسجدِ نبوی میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ صحابہ کرام دوڑ دوڑ کر ان تینوں کو مبارک باد دینے لگے۔ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک خوشی سے چاند کی طرح تمتما رہا تھا۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں بیٹھ گئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! توبہ کی قبولیت آپ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے؟'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: ''اللہ کی طرف سے۔''

① کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کے سیاق سے پتا چلتا ہے کہ غسانی گورنر کا مکتوب مقاطعے کے چالیسویں دن سے پہلے موصول ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رومیوں کے مخبر مدینہ منورہ میں موجود رہتے تھے اور یہاں کی اطلاعات فوراً وہاں پہنچا دیتے تھے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ غسانی گورنر کو جس کا علاقہ مدینہ منورہ سے کم وبیش نو سو کلو میٹر دور تھا، دو ہفتے کے اندر یہ اطلاع مل گئی اور چوتھے پانچویں ہفتے میں اس کا مراسلہ بھی مدینہ پہنچ گیا۔

② سورۃ التوبہ: آیت ۱۱۸

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اجازت چاہی کہ اس کوتاہی کے کفارے میں اپنا تمام مال خیرات کر دیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کچھ مال رکھ لو۔ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔''

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''مجھے اللہ نے سچ بولنے ہی کی وجہ سے نجات دی ہے۔ میں اپنی توبہ کی قبولیت کے شکرانے میں عہد کرتا ہوں کہ کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔'' پھر انہوں نے زندگی بھر اپنے عہد کو بخوبی نبھایا۔ [1]

☆☆☆

وفود کی آمد

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تبوک سے واپس تشریف لانے کے کچھ دنوں بعد مدینہ منورہ میں مختلف قبیلوں کے وفود کی آمد شروع ہوگئی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے فتح مکہ سے اب تک تقریباً ایک سال کے عرصے میں اسلام کے بارے میں اچھی طرح غور و فکر کیا اور اس کے بعد دل کی گہرائیوں سے اسلام لانے کا فیصلہ کیا۔

ان وفود کی آمد سے اسلام کی دعوت بہت کم وقت میں دور دور تک پھیل گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وفود کا اکرام کرتے مختلف قبائل کی خوبیوں کا لحاظ اور ان کے فضائل و مناقب کا اظہار فرماتے جس سے ان کی ہمت افزائی ہوتی۔ کوئی خاص کوتاہی دیکھتے تو تنبیہ بھی فرما دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان وفود کو بڑے اہتمام کے ساتھ اسلامی عقائد، ارکانِ دین اور شرعی احکام سکھاتے۔ چونکہ اس دور میں علم کے پیاسے صحابہ ہر آن دربارِ رسالت میں بکثرت موجود رہتے تھے۔ اس لیے یہ روایات بہت اچھی طرح محفوظ کر لی گئیں اور چونکہ یہ دورِ رسالت کا آخری زمانہ تھا، اس لیے اس دور میں محفوظ کیے گئے نئے احکام سابق احکام کے لیے ناسخ بھی مانے گئے۔ [2]

وفدِ طائف:

فتح مکہ اور غزوۂ حنین کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا محاصرہ کیا تھا مگر شہر والوں کی تیر اندازی سے پریشان ہو کر صحابہ نے عرض کیا تھا: ''یا رسول اللہ! بنو ثقیف کے لیے بددعا فرمائیے کہ ان کی تیر اندازی نے ہمیں جلا ڈالا۔''

مگر رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمادی: ''یا اللہ! ثقیف کو ہدایت عطا فرما۔'' [3] یہ دعا قبول ہوئی۔ غزوۂ تبوک کے بعد سب سے پہلے طائف کا وفد آ کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر مقرر کیا جو نوجوان تھے مگر علم و فہم میں بہت نمایاں تھے۔

طائف کا مشہور بت ''لات'' پورے عرب میں پوجا جاتا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان بن حرب اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما کو بھیج کر یہ بت پاش پاش کرا دیا۔ [4]

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۴۴۱۸، کتاب المغازی، باب حدیث کعب بن مالک ؛ تاریخ ابن خلدون: ۳۶۹/۲۔ دار الفکر

[2] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب وفد بنی تمیم، باب وفد عبدالقیس، باب قدوم الاشعریین واھل الیمن، باب قصة وفد طی

[3] سنن الترمذی، ح: ۳۹۴۲، ابواب المناقب　[4] الکامل فی التاریخ: ۱۵۱/۲

وفدِ بنو تمیم:

بنو تمیم کے لوگ حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضور ﷺ نے ان کی تعریف فرماتے ہوئے کہا: ''میری اُمت کے یہ لوگ دجال کے خلاف سب سے سخت ہوں گے۔'' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس بنو تمیم کی ایک باندی تھی۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اسے آزاد کر دو۔ یہ نسلِ اسماعیل سے ہے۔

بنو تمیم کی طرف سے زکوٰۃ پیش کی گئی تو فرمایا: ''یہ میری قوم کی زکوٰۃ ہے۔''[1]

بنو تمیم کے وفد میں صَعصعہ بن ناجیہ بھی تھے۔[2] انہوں نے دین کے احکام اور قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عرض کیا: ''اللہ کے رسول! اسلام لانے سے پہلے میں نے جو نیکیاں کی ہیں، ان کا اجر ملے گا؟''

رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''تم نے کیا عمل کیا؟'' صَعصعہ بن ناجیہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''زمانہ جاہلیت میں ایک بار میری دس ماہ کی حاملہ دو اونٹنیاں گم ہو گئیں۔ میں ایک اونٹ پر سوار ہو کر ان کی تلاش میں نکلا کہ کھلے صحرا میں ایک مکان دکھائی دیا، جس کے باہر ایک بوڑھا کھڑا تھا۔ میں نے اس سے اپنی اونٹنیوں کا پوچھا تو اس نے کہا: وہ ہمیں ملی ہیں اور انہوں نے بچے جن دیے ہیں۔ اس دوران گھر سے کسی عورت کی آواز آئی: ولادت ہوئی۔ بوڑھے نے صدا لگائی: اگر لڑکا ہے تو قوم اس میں حصہ دار ہے۔ لڑکی ہے تو اسے دفن کر دیں گے۔ عورت نے کہا: لڑکی ہوئی ہے۔ میں نے بوڑھے سے پوچھا: یہ لڑکی کس کی ہے؟ اس نے کہا: ''میری بیٹی ہے۔ میں نے کہا: میں اسے خریدنا چاہتا ہوں۔ بوڑھے نے کہا: کیا قیمت دو گے؟ میں نے کہا: وہ دونوں اونٹنیاں اور ان کے بچے۔ بوڑھے نے کہا: اپنا یہ اونٹ بھی دے دو۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے مگر تمہارا ایک آدمی میرے ساتھ جائے، میں گھر پہنچ کر یہ اونٹ اس کے ہاتھ بھیج دوں گا۔ بوڑھا مان گیا۔ میں نے گھر پہنچ کر وہ اونٹ بھی بھیج دیا۔ اسی رات میں سوچنے لگا کہ اس طرح بچیوں کی جان بچانا تو ایسی نیکی ہے جو عربوں میں اس سے پہلے کسی نے نہیں کی۔ پس جب اسلام کا ظہور ہوا تب تک میں ۳۶۰ بچیوں کی جانیں بچا چکا تھا۔ ہر ایک کے بدلے میں نے دس ماہ کی حاملہ دو اونٹنیاں اور ایک اونٹ دیا۔ تو کیا اس عمل کا مجھے اجر ملے گا؟''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''یہ نیکی کا ایک باب ہے جس کا اجر تمہیں ملے گا کیونکہ اللہ تمہیں اسلام سے نواز چکا ہے۔''[3]

---

① صحیح البخاری، ح: ۴۳۶۶، کتاب المغازی، باب وفد بنی تمیم

② طبقات ابن سعد: ۳۸/۷

③ الآحاد والمثانی لابن ابی عاصم، ح: ۱۱۹۹

فائدہ: یہ صعصہ بن ناجیہ رضی اللہ عنہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا تھے۔

فائدہ: کسی نو مسلم کے حالتِ کفر میں کیے ہوئے نیک کاموں پر اجر و ثواب کے بارے میں امام نوویؒ کا کہنا یہ ہے کہ ان کا پورا اجر و ثواب اسے ملتا ہے جیسا کہ صعصہ بن ناجیہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت کے علاوہ صحیح مسلم میں حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے منقول ایک حدیث ''اسلمت علی ما اسلفت من خیر'' (ح: ۳۲۸) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بعض علماء کے نزدیک حالتِ کفر میں کیے گئے نیک عمل کے اجر سے مراد اخروی اجر نہیں بلکہ دنیوی صلہ ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ان نیک کاموں کی برکت سے اسلام کی توفیق مل جاتی ہے۔ (شرح النووی علی مسلم: ۱۴۰/۲، نیل الاوطار: ۳۷۱/۱)

عدی بن حاتم کا قبول اسلام:

اسی سال حضرت علی رضی اللہ عنہ عرب کے مشہور سخی حاتم طائی کے قبیلے بنو طے کے علاقے میں جہاد کے لیے گئے۔ یہ لوگ رَکوسی فرقے کے نصرانی تھے جن کے بعض عقائد صابیوں سے ملتے جلتے تھے۔[1] یہ ''فلس'' نامی ایک بت کو پوجتے تھے جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے توڑ دیا اور مقامی لوگوں میں سے بہت سوں کو قیدی بنا کر مدینہ منورہ لے آئے۔ ان میں حاتم طائی کی بیٹی ''سَفّانہ'' بھی تھیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں لباس، سواری اور سفر کے اخراجات دے کر بڑی عزت واحترام سے آزاد کر دیا۔ وہ واپس اپنے علاقے میں آئیں تو اپنے بھائی عدی بن حاتم سے ملیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حملے کے وقت فرار ہو گئے تھے۔ جب انہوں نے بہن کی زبانی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند اخلاق کی گواہی سنی تو سیدھے مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی پہلی نظر اس وقت پڑی جب آپ مدینہ کی ایک گلی میں کھڑے کسی بڑھیا کی درخواست سن رہے تھے۔ بڑھیا بہت دیر تک اپنا مدعا بیان کرتی رہی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سنتے رہے۔ عدی بن حاتم نے یہ دیکھ کر دل میں کہا: ''یہ شخص محض بادشاہ نہیں۔''[2]

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو شور ہوا: ''عدی بن حاتم آ گئے۔''

آپ نے انہیں دیکھ کر فرمایا: ''عدی اسلام لے آؤ، سلامت رہو گے۔''

یہ بولے: ''میں تو پہلے ہی ایک دین کا پیروکار ہوں۔''

آپ نے فرمایا: ''میں تمہارے دین کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔''

یہ حیران ہو کر بولے: ''بھلا وہ کیسے؟'' فرمایا: ''کیا تم رَکوسی فرقے کے نہیں؟'' بولے: ''جی ہاں!''

آپ نے فرمایا: ''کیا تم قوم سے چوتھائی مال وصول نہیں کرتے؟'' بولے: ''جی ہاں۔''

آپ نے فرمایا: ''مگر یہ تمہارے دین میں جائز تو نہیں ہے!!'' بولے: ''جی ہاں۔''

آپ نے فرمایا: ''عدی! تم کیوں فرار ہوئے تھے، کیا اس لیے کہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہنا پڑ جائے؟ تو بتاؤ کیا اللہ کے سوا کوئی اور عبادت کے لائق ہے بھی سہی۔ کیا تم اس لیے بھاگے پھرتے ہو کہ اللہ اکبر نہ کہنا پڑے۔ خود بتاؤ اللہ سے بڑا کوئی ہے؟''

پھر فرمایا: ''عدی میں جانتا ہوں تم اسلام لانے سے کیوں گریز کر رہے ہو، صرف اس لیے کہ اس دین کے پیروکار کمزور لوگ ہیں۔ سنو عدی! تم حیرہ سے واقف ہو'' بولے: ''نام ہی سنا ہے، دیکھا نہیں۔''

فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، بات یہاں تک پہنچے گی کہ ایک مسافر عورت حیرہ سے چل کر بیت اللہ کا طواف کرے گی اور اسے کسی کی حفاظت درکار نہیں ہوگی۔''

عدی بن حاتم کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ فوراً اسلام قبول کر لیا۔ ان کی دعوت سے ان کی قوم بھی مسلمان ہو گئی۔[3]

---

[1] صابئین کا ذکر ''اہل عرب کی دینی حالت'' کے عنوان کے تحت پیچھے آ چکا ہے۔

[2] الکامل فی التاریخ: ۱۵۱/۲ [3] البدایۃ والنہایۃ: ۲۹۴/۷ تا ۲۹۶؛ مسند ابی داؤد طیالسی، ح: ۱۱۳۵

عبداللہ بن اُبی کی موت:

ذوالقعدہ ۹ ہجری میں اسلام کا بدترین دشمن اور منافقین کا سردار عبداللہ بن اُبَی بیس دن بیمار رہ کر مرگیا۔اس کی آخری خواہش تھی کہ حضور اقدس ﷺ اسے اپنے کرتے میں کفن دیں، اس کی نمازِ جنازہ پڑھائیں اور دعائے مغفرت فرمائیں۔اس کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کی بھی یہی درخواست تھی، آپ ﷺ نے بیٹے کی لاج رکھتے ہوئے ایسا ہی کیا۔

مگر جب آپ تدفین اور دعائے مغفرت سے فارغ ہو چکے تو اللہ کی طرف سے سورۃ التوبہ کی آیات نازل ہوئیں جن میں ایسے منافقوں کی نمازِ جنازہ پڑھانے اور ان کے لیے دعا کی ممانعت کردی گئی۔ ①

قبائل کی لگا تار آمد:

اب اسلام قبول کرنے والے قبائل کا ایک تانتا بندھ چکا تھا۔آئے دن کسی نہ کسی قبیلے کا وفد مسجد نبوی میں حاضر خدمت ہوتا، اسلام قبول کرتا اور دین کے احکام سیکھتا۔اس لیے اس سال کو ''عام الوفود'' کہا جاتا ہے۔

بنواسد، بنوفزارہ، بنومُرّہ، بنو کلاب، بنو بکاء، بنو کنانہ، بنوسُلیم، بنو ہلال بن عامر، بنو بکر بن وائل اور اَزد جیسے مشہور قبائل اسلام لائے۔یمن، عمان اور بحرین سے قافلے آئے۔یمن کے ملوکِ حِمیَر کا وفد بھی آیا۔وائل بن حجر، جریر بن عبداللہ، اشعث بن قیس اور تمیم داری رضی اللہ عنہم جیسے شرفائے عرب نے انہی ایام میں اسلام قبول کیا۔بنوسعد بن بکر کے سردار ضِمام بن ثَعلَبہ بھی حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے اور پھر اپنی قوم میں جا کر اس جوش وخروش کے ساتھ تبلیغ کی کہ ایک ہی دن میں پورے قبیلے نے کلمہ پڑھ لیا۔ ②

☆☆☆

---

① البدایة والنهایة: ۷/۲۱۸، ۲۱۹

② الکامل فی التاریخ: ۲/۱۵۵، تحت ۹ ہجری

حافظ ابن کثیر نے ایک سو سے زائد صفحات میں ان وفود کی آمد بڑی تفصیل سے بیان کی ہے۔(البدایة والنهایة: ۷/۲۳۲ تا ۳۶۴)

حج کی فرضیت اور پہلا حج (۹ ہجری)

وفود کی آمد کا سلسلہ جاری تھا کہ حج کا موسم آ گیا، حج کی فرضیت کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے ذوالقعدہ سن ۹ ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کر تین سو حاجیوں کا قافلہ مکہ روانہ فرمایا۔ صحابہ کی اکثریت حج میں شریک نہ ہوئی؛ کیوں کہ حضور ﷺ تشریف نہیں لے جا رہے تھے، دراصل اب تک حج میں مشرکین کی شرکت پر پابندی کا کوئی حکم اللہ کی جانب سے نازل نہیں ہوا تھا اور اس سال مشرکین حسب معمول حج میں شریک تھے اور ان کی بے ہودہ رسوں خصوصاً برہنہ طواف کے ہوتے ہوئے آپ ﷺ کو حج کرنا ناگوار تھا۔ [1]

تاہم اللہ کی طرف سے یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ مشرکین کی یہ رسوم جلد مٹادی جائیں چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روانگی کے بعد سورۃ التوبہ کی آیات نازل ہوئیں جن کی ابتداء اس طرح تھی:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ لا وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

(دست برداری ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین سے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا۔ سو اے مشرکو! تم زمین میں چار ماہ چل پھر لو اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے بلکہ اللہ ہی مشرکوں کو رسوا کرنے والا ہے۔ اور اعلان کیا جاتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑے حج کے دن کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے دست بردار ہیں۔ پھر بھی اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر تم روگردانی کیے رہے تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور کافروں کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجیے۔) [2]

انہی آیات میں آگے یہ حکم بھی تھا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا

(اے ایمان والو! مشرکین بالکل ناپاک ہیں پس وہ اس سال کے بعد مسجد الحرام کے قریب بھی نہ آنے پائیں۔) [3]

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۴/ ۱۰۳، سورۃ التوبۃ، آیت: ۳

[2] سورۃ التوبۃ، آیت: ۱، ۲، ۳ ..... مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم ان آیات کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں: ''من المشرکین، مشرکین سے سیاق میں وہی مشرکین مراد ہیں جو نقضِ عہد کے مرتکب ہو چکے ہیں۔ (تفسیر ماجدی، سورۃ التوبۃ، آیت: ۱)

[3] سورۃ التوبۃ، آیت: ۲۷

نبی اکرم ﷺ نے فوراً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سورۃ التوبہ کی یہ آیات اور ان کے مطابق یہ اعلامیہ دے کر مکہ روانہ فرمادیا: ''آج کے بعد کسی مشرک کو حج کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ کوئی شخص برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف نہیں کرے گا، جن قبائل کا رسول اللہ ﷺ سے کسی مخصوص مدت تک کا معاہدہ تھا وہ اپنی مدت تک باقی ہے۔ باقی لوگوں کو صرف چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان سے کوئی معاہدہ نہیں رہے گا۔''[1]

---

[1] مسند احمد، ح:۷۹۷۷ باسناد حسن ؛ واخرجہ البخاری بالاختصار (صحیح البخاری، ح:۳۶۹ ؛ ح:۳۱۷۷)

حج صدیق اکبر کی توقیتی بحث: سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ یہ حج ذوالحجہ ۹ھ (مکی) میں ہوا تھا۔ عیسوی لحاظ سے اس کی تاریخ مارچ ۶۳۱ء بنتی ہے مگر مولانا اسحٰق علوی مرحوم کی رائے کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ حج غزوۂ تبوک سے پہلے ہوا تھا۔ (نقوش رسول نمبر، ۱۹۴/۲)

اس کی بڑی دلیل ان کے نزدیک یہ ہے کہ سورۃ التوبہ میں غزوۂ تبوک کا مفصل ذکر ہے۔ پس یقیناً غزوۂ تبوک اس وقت ہو چکا تھا اور سورہ کی ابتدائی آیات جو حج صدیق اکبر میں پڑھ کر سنائی گئیں، اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔ مگر مولانا مرحوم کی یہ دلیل تب محکم ہوسکتی ہے جب یہ مانا جائے کہ قرآن مجید جس ترتیب سے نازل ہوا، اسی ترتیب سے لکھا گیا۔ یا یہ ثابت ہو جائے کہ سورۃ التوبہ ان سورتوں میں سے ہے جو مکمل ایک ساتھ نازل ہوئیں۔

یہ بات طے ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب مصحف، ترتیب نزولی سے مختلف ہے۔ نزول کے اعتبار سے مؤخر آیتیں اور سورتیں لکھنے میں مقدم اور مؤخر آیتیں اور سورتیں لکھنے میں مقدم بھی ہوئی ہیں۔ ایک ہی سورت کے بعض حصوں کے نزول میں کئی سالوں کا فرق بھی ہو جاتا تھا اور درمیان میں متعدد سورتیں نازل ہو چکی ہوتی تھیں۔ مثلاً سورۃ المائدہ کی آیت:۶ جس سے تیمم کی مشروعیت ثابت ہے، غزوۂ مریسیع میں نازل ہوئی تھی۔ (صحیح البخاری، ح: ۴۶۰۸) جبکہ اسی سورت کی آیت:۳ جس میں تکمیل دین کا ذکر ہے، کئی سال بعد حجۃ الوداع میں نازل ہوئی تھی۔ (صحیح البخاری، ح:۴۵)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: ''فکان اذا نزل علیه الشيء دعا بعض من کان یکتب فیقول: ضعوا هؤلاء الآیات في السورة التي یذکر فیها کذا وکذا، واذا نزلت علیه الآیة فیقول ضعوا هذه الآیة في السورة التي یذکر فیها کذا وکذا.'' (سنن الترمذی، ح:۳۰۸۶، ابواب تفسیر القرآن، باب سورۃ التوبۃ ؛ سنن ابی داؤد، ح:۷۸۶، کتاب الصلوٰۃ ؛ مسند احمد، ح:۳۹۹)

بڑی سورتوں میں ایسی سورتیں گنی چنی ہی ہیں جن کے بارے میں تصریح ہے کہ وہ ایک ساتھ نازل ہوئیں۔ ورنہ عموماً بڑی سورتیں ٹکڑوں میں نازل ہوتی رہیں۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ ایسے ٹکڑوں کو ایک کتاب کی شکل میں مسلسل نہیں لکھا جاتا تھا بلکہ ایک بار نازل ہونے والا ہر ٹکڑا الگ پارچے پر لکھوایا جاتا تھا تاکہ تکمیل کے بعد ان پارچوں کو ایک فولڈر کی شکل میں بالترتیب آسانی سے جمع کر لیا جائے۔ سورۃ التوبہ بھی انہی سورتوں میں سے تھی جو ٹکڑوں میں نازل ہوئیں، جس کی دلیل یہ ہے کہ یہ اسی طرح الگ الگ پارچوں پر لکھی گئی تھی۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جمع القرآن کی مہم میں اپنی کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ سورۃ التوبہ کی آخری دو آیات (جو ایک ساتھ الگ نازل ہوئی تھیں) مجھے ابوخزیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس لکھی ہوئی ملیں۔ (صحیح البخاری، ح:۴۹۸۶، باب جمع القرآن)

پس ممکن ہے کہ آیات غزوۂ تبوک نزول میں مصحف میں درج ابتدائی آیات سے مقدم ہوں۔ رہی یہ بات کہ نزول کے وقت انہیں کس سورت کے ساتھ ملحق مانا گیا ہوگا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ میں بظاہر کوئی فصل نہ تھا اور اس وقت دونوں سورتیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔ پس قرین قیاس ہے کہ جب غزوۂ تبوک کے بارے میں آیات نازل ہوئیں تو انہیں سورۃ التوبہ کے ساتھ متصل سمجھا گیا ہو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

وکانت الانفال من اوائل ما نزلت بالمدینة وکانت التوبة من آخر القرآن وکانت قصتها شبیهة بقصتها فظننت انها منها.'' (سنن الترمذی، ح:۳۰۸۶، ابواب تفسیر القرآن، باب سورۃ التوبۃ ؛ سنن ابی داؤد، ح:۷۸۶، کتاب الصلوٰۃ)

بہر حال مولانا مرحوم نے جب یہ نظریہ قائم کر لیا کہ حج ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غزوہ تبوک سے مقدم ہے تو پھر وہ یہ ماننے پر بھی مجبور ہو گئے کہ یہ حج مدنی تقویم کے مطابق ہوا تاکہ غزوۂ تبوک کا سردیوں میں ہونا لازم نہ آئے۔ حالانکہ یہ بات قدیم سیرت نگاروں کی تصریح کے خلاف ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امارت میں کیا گیا حج مدنی تقویم کے مطابق ہوا تھا۔ محمد بن اسحاق سے مروی ہے کہ انہوں نے ابن ابی نجیح (جو ثقہ راوی ہیں) سے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد: ''ان الزمان قد استدار کهیئته یوم خلق السموات والارض.'' کا حوالہ دے کر پوچھا کہ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حج کس مہینے میں تھا۔ اس پر انہوں نے جواب دیا: ''علیٰ ما کان الناس یحجون علیه.'' (سیرۃ ابن اسحاق: ص ۱۰۰)

معلوم ہوا کہ یہ حج دورِ جاہلیت کی تقویم کے مطابق تھا، اسی لیے مشرکین بھی شریک تھے، اگر یہ خالص قمری تقویم کے مطابق ہوتا تو مشرکین اپنی تقویم کے خلاف اس میں نہ آتے۔ جب ہم اس حج کو مکی تقویم کے مطابق مانتے ہیں تو پھر غزوہ تبوک اس سے قبل کی تقویم ہی کے مطابق موسم گرما میں پڑتا ہے۔ یعنی غزوہ تبوک اپریل تا جون ۶۳۱ء ہوا، حج ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کے تین ماہ بعد ستمبر ۶۳۱ء میں ہوا اور یوم عرفہ ۱۲ ستمبر ۶۳۱ء کو آیا۔ مدنی تقویم میں یہ جمادی الآخرہ ۱۰ ہجری تھا، یعنی یہ رسول اللہ ﷺ کی وفات سے ۹ ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔ پس حج کو غزوہ تبوک سے قبل لا کر تمام سیرت نگاروں کی واضح تصریحات کے خلاف جانے کی ضرورت نہیں۔

(بقیہ اگلے صفحے کے حاشیے پر)

یہ اعلامیہ میدانِ عرفات میں ۹ ذوالحجہ کو پورے عرب سے آئے ہوئے حاجیوں کو سنایا گیا جن میں مسلم بھی تھے اور مشرک بھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سمیت متعدد صحابہ حاجیوں کے مجمعوں اور ڈیروں میں گشت کر کے یہ اعلان سناتے رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس قدر یہ صدا لگائی کہ میری آواز بیٹھ گئی۔ ①

اس ترتیب کے ذریعے بیت اللہ اور حرم پاک سے مشرکین اور شرکیہ رسومات کا تعلق جو زمانہ دراز سے چلا آرہا تھا، ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ قرآنِ مجید نے اس حج کو ''حجِ اکبر'' کا نام دیا۔ صدیوں بعد پہلی بار حج کی عظیم عبادت میں وہ لوگ شامل ہوئے تھے جن کا عقیدہ کعبہ کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عقیدے کے مطابق تھا اور ایک طویل زمانے کے بعد کعبہ، حرم اور مناسکِ حج کو اپنی اصل اور پاکیزہ شکل واپس مل گئی تھی۔ ②

نجران کے پادریوں سے مناظرہ:

سن ۱۰ ہجری میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق نجران کے علاقے میں فوج کشی کی۔ یہاں نصرانی آباد تھے، حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو اس کے ردِعمل میں نجران کے پادریوں کا ایک وفد مدینہ چلا آیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مذہبی بحث چھیڑ دی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

..... بلاشبہ ایک روایت میں جسے امام بخاری نے نقل کیا ہے، براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے: ''آخر سورة نزلت كاملة براءة.'' (صحیح البخاری، ح: ۴۳۶۴) مگر خود امام بخاری نے اس روایت کو دوسرے مقام پر ''کاملة'' کے اضافے کے بغیر نقل کیا ہے۔ نیز صحیح بخاری و صحیح مسلم کی متفق علیہ روایت بتاتی ہے کہ سورۃ التوبہ ایک ساتھ مکمل نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کا نزول تدریجاً ہوتا رہا تھا۔ عبداللہ بن عباس سے مروی ہے:

"التوبة هي الفاضحة، مازالت تنزل، ومنهم ومنهم، حتىٰ ظنوا انها لن تبقي احداً منهم الا ذكر فيها. (صحيح البخاري، ح: ۴۸۸۲، كتاب التفسير ؛ صحيح مسلم، ح: ۷۷۴۳)

اس لیے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ''کاملة'' کا لفظ یا کسی راوی کا وہم ہے، یا یہ لفظ مؤول ہے۔

لفظ كاملة ليس بشيء لان البراءة نزلت شيئاً بعد شيء، قلت ولهذا لم يذكر لفظ كاملة في هذا الحديث في التفسير ولفظه هناك: آخر سورة نزلت براءة. (عمدة القاری: ۱۸/۱۸)

حاشیہ صفحہ موجودہ

① مسند احمد، ح: ۷۹۷۷ باسناد حسن

② اس سے واضح ہو گیا کہ حجِ اکبر سے کوئی الگ یا خاص حج مراد نہیں جیسا کہ عوام میں مشہور ہے۔ انما قيل الحج الاكبر من اجل قول الناس الحج الاصغر (صحيح البخاري، ح: ۳۱۷۷) فكان حُميد يقول: يوم النحر يوم الحج الاكبر من اجل حديث ابي هريرة. (صحيح البخاري، ح: ۴۶۵۷)

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم لکھتے ہیں: یوم الحج الاکبر: حجِ اکبر حج ہی کو کہتے ہیں۔ کوئی مخصوص قسم کا حج مراد نہیں۔ اکبر کا لفظ صرف حجِ اصغر یا عمرہ سے تقابل و امتیاز کے لیے ہے۔ هذا هو الحج الاكبر لان العمرة تسمىٰ الحج الاصغر (كبير) قال مجاهد: الحج الاكبر القران والحج الاصغر العمرة. (ابن العربي) قال القاضي: اذا نظرنا في هذه الاقوال فالمتقح منها ان الحج الاكبر الحج كما قال مجاهد. (ابن العربي) اور امام ابوحنیفہ اور امام شافعی دونوں اسی کے قائل ہوئے۔'' (تفسیر ماجدی، سورۃ التوبۃ، آیت ۳)

ایک اہم سوال اور اس کا جواب: رہا یہ سوال کہ مسلمانوں نے حج جاہلی تقویم کے مطابق کیسے کر لیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت یہی تقویم مشروع تھی۔ جیسا کہ مسلمان ایک زمانے تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نمازیں ادا کرتے رہے اور وہ بلاشبہ ادا ہوتی رہیں، اسی طرح جب تک حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے نسئی پر مشتمل کی تقویم کو باطل قرار نہیں دیا تب تک نہ صرف حج بلکہ روزے بھی اسی قدیم تقویم کے مطابق ادا ہوتے رہے۔ جب یہ تقویم من جانب اللہ باطل قرار دی گئی تو اس کے بعد تمام معاملات خالص اسلامی یعنی صحیح قمری تقویم کے مطابق انجام دیے جانے لگے اور ایسا حجۃ الوداع میں ہوا تھا۔

بحث میں شکست کھانے کے بعد پادریوں نے مباہلے کی دعوت دے ڈالی یعنی دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف بددعائیں کریں کہ جو جھوٹا ہے اس پر اللہ کی لعنت ہو۔نبی اکرم ﷺ اس کے لئے تیار ہو گئے۔اہل بیت میں سے تمام امہات المؤمنین تو اس مباہلے میں شامل تھیں ہی مگر آپ نے مزید اہتمام کے لیے اپنی اولاد کو بھی بلالیا۔چونکہ اس وقت تک آپ ﷺ کی بیٹیاں: حضرت زینب، حضرت رُقیّہ اور حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہن وفات پا چکی تھیں،اس لیے صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تشریف لاسکیں۔حضرت علی رضی اللہ عنہ داماد ہونے کے ناتے،آپ کے بیٹوں کی مانند تھے، وہ بھی اور ان کے ساتھ حضور ﷺ کے دونوں نواسے حسن وحسین رضی اللہ عنہما بھی آگئے۔ ①

ابھی مباہلہ شروع نہیں ہوا تھا کہ عین وقت پر پادریوں کی ہمت جواب دے گئی اور ان کے ضمیر نے گواہی دی کہ حضور ﷺ کی بددعا خالی نہیں جائے گی۔

انہوں نے آپس میں کہا:''اگر یہ واقعی پیغمبر ہیں تو نہ ہی ہم کو کبھی کوئی فلاح نصیب ہوگی نہ ہماری نسلوں کو۔''

انہوں نے اسلامی ریاست کے ماتحت رہنے کا ارادہ ظاہر کیا اور درخواست کی کہ (ہمارا انتظام سنبھالنے کے لیے) کوئی امانت دار انسان ہمارے ساتھ بھیج دیں۔

حضور ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ روانہ فرمادیا۔ ②

عاملینِ زکوٰۃ کا تقرر:

حضور ﷺ نے اس سال عرب کے مختلف علاقوں میں اپنے امراء اور عاملینِ زکوٰۃ مقرر فرمادیے۔کئی صحابہ اس کام کے لیے بھیجے گئے۔ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو مآرب،عَمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو نجران،زیاد بن لبید انصاری رضی اللہ عنہ کو حضرموت اور یعلیٰ بن اُمَیَّہ رضی اللہ عنہ کو جند بھیجا۔حضرت مُعاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کے لوگوں کی دینی تعلیم اور رہنمائی کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کے محصولات کی وصولی کا کام دے کر بھیجا گیا۔ ③

مزید وفود کی آمد:

اسلام قبول کرنے والوں میں اس سال بنوزبید کا وفد حاضر ہوا،جس کے امیر عَمرو بن مَعدی کَرِب تھے۔اَشعث بن قیس نے بنوکندہ کے ساٹھ سواروں کے ساتھ آکر اسلام قبول کیا۔محارِب،بنوعَبس اور دیگر وفود بھی آئے اور ایمان کی دولت سے مالا مال ہوکر گئے۔ ④

کچھ بدقسمت لوگ:

کچھ بدبخت ایسے بھی تھے جو اب بھی محروم رہے۔یمامہ سے مُسَیلِمَہ بنوحنیفہ کا وفد لے کر آیا اور حضور اکرم ﷺ سے

① الکامل فی التاریخ:۲/۱۵۸،۱۵۹، تحت ۱۰ ھجری
② صحیح البخاری،ح:۴۳۸۰،کتاب المغازی،باب قصۃ اھل نجران
③ الکامل فی التاریخ:۲/ ۱۶۴،۱۶۵، تحت ۱۰ ھجری
④ الکامل فی التاریخ:۲/ ۱۶۲ تا ۱۶۴، تحت ۱۰ ھجری

مگر اس کا دل سرکشی اور تکبر سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایمان نہ اتر سکا۔ اس نے یہ پیش کش کی کہ ہم آپ کی نبوت کی مخالفت نہیں کریں گے بشرطیکہ آپ اپنے بعد نبوت ہمارے نام کر جائیں۔

حضور ﷺ کے دستِ مبارک میں اس وقت ایک چھڑی تھی۔ اس بے ہودہ مطالبے پر آپ نے غضب ناک ہو کر فرمایا: ''اگر تو مجھ سے یہ چھڑی بھی مانگے گا تو میں تجھے نہیں دوں گا۔''

پھر دربارِ رسالت کے خطیب ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کو حکم ہوا کہ اس بدبخت کو مفصل اور منہ توڑ جواب دیں۔ ①

انہی دنوں رسول اللہ ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ آپ ﷺ کے دونوں ہاتھوں میں دو سونے کے کنگن ہیں جو آپ ﷺ کو ناگوارِ خاطر گزر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں پھونک ماری تو وہ دونوں غائب ہوگئے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کی تعبیر یہ لی کہ دو جھوٹے مدعیٔ نبوت ظاہر ہوں گے۔ ایسا ہی ہوا۔ ②

ان میں سے ایک اسود عنسی تھا جس نے اسی سال یمن میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ بہت سے لوگ اس کے چنگل میں پھنس گئے۔ ان میں مجوسی پیش پیش تھے۔ دوسرا مسیلمہ کذاب تھا جو آپ ﷺ کے دوٹوک جواب سے مایوس ہو کر واپس گیا اور کچھ مدت بعد اس نے بھی یمامہ میں نبوت کا دعویٰ کر کے ہزاروں لوگوں کو گمراہ کر دیا جن میں اکثریت اس کے قبیلے بنی حنیفہ کی تھی۔ ③

عامر بن طفیل بھی جو بنی عامر کے وفد میں شامل تھا، نہ صرف اسلام لانے سے گریزاں رہا بلکہ حضور اکرم ﷺ کو دھمکی دے کر گیا کہ میں گھڑسواروں اور پیادوں کو لے کر مدینہ پر چڑھائی کروں گا۔ حضور نے دعا کی:

''یا اللہ! بنو عامر کو ہدایت نصیب فرما اور مسلمانوں کو عامر بن طفیل سے نجات دلا دے۔''

عامر بن طفیل کو فوراً اپنی گستاخی کی سزا مل گئی۔ وہ مدینہ سے واپس جا رہا تھا کہ راستے میں اسے طاعون کی ایسی بڑی گلٹی نکل آئی جیسے اونٹ کو نکلتی ہے۔ اسے مجبوراً راستے میں بنو سلول کی کسی عورت کے گھر میں ٹھہرنا پڑا۔ عرب کا حکمران بننے کے خواب دیکھنے والا یہ بدبخت حسرت اور تکلیف کے مارے چیختا رہا: ''اونٹ جیسی گلٹی! سلولی عورت کا گھر''

آخر اپنے وطن میں موت کی تمنا لیے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا مگر جلد ہی گھوڑے کی زین پر اس کا دم نکل گیا۔ ④

☆☆☆

---

① صحیح البخاری، ح: ۴۳۷۸، کتاب المغازی، باب قصة الاسود العنسی ② صحیح البخاری، ح: ۴۳۷۹، کتاب المغازی

③ الکامل فی التاریخ: ۲/ ۱۶۳، ۱۶۲، تحت ۱۰ ھجری...... اسود عنسی کو ایک یمنی صحابی فیروز رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے آخری ایام میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مسیلمہ کی سرکوبی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ہوئی جس کی تفصیل آگے دورِ خلافتِ راشدہ میں آئے گی۔

④ مسند احمد، ح: ۱۳۱۹۵؛ صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة رجیع ورعل و ذکوان؛ تاریخ المدینة لابن شبه: ۲/ ۵۲۰؛ الکامل فی التاریخ: ۲/ ۱۶۳، تحت ۱۰ ھجری

ملحوظ رہے کہ یہ عامر بن طفیل عامری وہی بدبخت تھا جس نے ۴ھ میں بئر معونہ کے ۷۰ قاری صحابہ کو شہید کرایا تھا۔ اسی کے ہم نام عامر بن طفیل بن الحارث الازدی ایک الگ شخص ہیں جو صحابی تھے اور انہوں نے دورِ صدیقی کے فتنۂ ارتداد میں اپنی قوم کو اسلام پر جمانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ (الاستیعاب: ۲/ ۷۹۲، ط دار الجیل)

حجۃ الوداع......(۱۰ ہجری)

ہجرت کا دسواں سال ختم ہونے کو تھا۔ اسلام صحرائے عرب کے ہر گوشے کو محیط ہو کر فارس اور روم کی سرحدوں پر جا پہنچا تھا۔ قرآنِ مجید کی آیات اور حضورِ اکرم ﷺ کے ارشادات کے ذریعے اللہ کے آخری دین کی تکمیل ہو چکی تھی۔ دین کے ایک ایک پہلو کو حضورِ اقدس ﷺ نے نہ صرف اپنے قول بلکہ عمل سے بھی واضح کر دیا تھا، تاہم ایک فریضے کی ادائیگی باقی تھی اور وہ تھا فریضہ حج جو مسلمانوں کی اجتماعیت اور وحدتِ اُمت کا مظہر تھا۔

فتح مکہ کے تین ماہ بعد عتاب بن اُسید رضی اللہ عنہ کی امارت میں پہلا حج ہوا تھا جبکہ اس کے ایک سال بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امارت میں دوسرا حج ادا کیا گیا تھا۔ یوں فتح مکہ کے بعد تقریباً سوا سال تک مشرکین کو مناسکِ حج میں شریک سمجھا گیا اور انہی کی تقویم جاری رہی۔ مشرکین کی شرکت کے باعث حضور ﷺ نے اب تک خود حج ادا نہیں فرمایا تھا، اس لیے مناسکِ حج کے اسلامی احکام کی تعلیم ابھی باقی تھی۔

تاہم اب مشرکین کا حرم میں داخلہ ممنوع ہو چکا تھا۔ انہیں دی گئی مہلت بھی گزر چکی تھی۔ چنانچہ اس آخری فریضے کو ادا کرنے کے لیے حضورِ اکرم ﷺ نے ذوالقعدہ سن ۱۰ ہجری میں حج کی تیاری فرمائی تاکہ اس فریضے کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ لوگوں کو مناسکِ حج سکھائے جائیں، حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا بانگِ دُہل اعلان ہو، تمام کفریہ رسمیں اور جاہلی مفاخر نیست و نابود کر دیے جائیں، عورتوں، غلاموں اور پس ماندہ طبقات کے حقوق کی تعلیم عام ہو۔ صدیوں بعد یہ پہلا حج تھا جو صحیح فطری اوقات میں ادا کیا جا رہا تھا۔[①]

رحمتِ عالم ﷺ نے حج کا ارادہ ظاہر کیا تو ہر طرف ہل چل مچ گئی اور اس مبارک سفر میں آپ ﷺ کے ساتھ یہ سعادت حاصل کرنے کے لیے مسلمان پروانہ وار اُمنڈ پڑے۔ ۲۴ ذوالقعدہ بروزِ جمعہ کو حضورِ اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کے مجمعے میں سفرِ حج اور مناسکِ حج سے متعلق تفصیلی ہدایات دیں، اگلے دن رحمتِ عالم ﷺ نے مدینہ سے کچھ دور ذُو الحُلَیفَہ کے مقام سے حج کا احرام باندھا اور ۲۶ ذوالقعدہ کو ایک بہت بڑے قافلے کے ساتھ لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ کی صدا بلند کرتے ہوئے مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ رفقاء کی تعداد چالیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ تمام اُمہات المؤمنین بھی آپ ﷺ کے ہم رکاب تھیں۔ یہ سفر نہ صرف ایک عظیم عبادت کی ادائیگی کے لیے تھا بلکہ یہ اُمت کو مناسکِ حج کی عملی تربیت دینے کا ذریعہ بھی تھا۔ اس سے ان بے شمار مسلمانوں کو حضور ﷺ کی زیارت اور رفاقت کا موقع بھی مل رہا تھا جنہوں نے قریبی دنوں میں دینِ اسلام قبول کیا تھا مگر آپ ﷺ کے دیدار سے محروم تھے۔

① صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا حج ستمبر ۶۳۱ء میں ہوا تھا جو خالص قمری تقویم کا جمادی الآخرہ تھا، اس کے فقط پانچ ماہ بعد حجۃ الوداع کی تیاری شروع کر دی گئی تھی۔

آٹھ دن کے سفر کے بعد ۴ ذوالحجہ کو رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ بیت اللہ پر نگاہ پڑی تو دعا فرمائی:

"اَللّٰهُمَّ زِدْ بَيْتَكَ هٰذَا تَشْرِيْفًا وَّتَعْظِيْمًا وَتَكْرِيْمًا وَمَهَابَةً."

"اے اللہ! اپنے اس گھر کی عزت، عظمت، بزرگی اور توقیر میں اضافہ فرما۔"

رحمتِ عالم ﷺ نے حجرِ اسود کے استلام کے بعد طواف شروع کیا، اس کے بعد سعی کے لیے صفا پہاڑی پر تشریف لے گئے اور دعا فرمائی:

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ. اَنْجَزَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهُ"

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کی بادشاہت ہے اور اس کے لیے ہر تعریف ہے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اپنے بندے کی مدد فرمائی اور تمام لشکروں کو تن تنہا شکست دی۔"

اس کے بعد آں حضرت ﷺ نے سعی کا عمل کر کے عمرہ پورا فرمایا۔[1]

جمعہ، ۹ ذوالحجہ کو حضورِ اقدس ﷺ نے حج کا رکنِ اعظم وقوفِ عرفہ ادا فرمایا اور اس دوران میدانِ عرفات میں لگ بھگ ایک لاکھ صحابہ کرام کے عظیم مجمعے کے سامنے ایک تاریخی خطبہ دیا جس میں باہمی معاملات، اخلاقِ حسنہ، حقوق العباد اور سیاستِ اسلامی کے حوالے سے اُمتِ مسلمہ کے لیے نہایت اہم نصیحتیں تھیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول اور کائنات کے سب سے برگزیدہ رہنما کی طرف سے انسانوں کے لیے ایک وصیت نامہ تھا، جس کے ہر ہر فقرے میں دنیا و آخرت کی کامیابی کے اصول سمو دیے گئے تھے۔ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اے لوگو! میری باتیں غور سے سنو! شاید اس کے بعد تم سے اس طرح ملاقات نہ ہو۔ لوگو! تمہاری جانیں، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں، ایک دوسرے کے لیے اسی طرح قابلِ احترام ہیں جیسے یہ دن اور یہ مہینہ محترم ہے۔ تم عن قریب اپنے رب کے سامنے پیش ہوگے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بابت پوچھ گچھ کرے گا۔

لوگو! شیطان اس بات سے تو مایوس ہوگیا کہ تمہاری سرزمین میں کبھی اس کی عبادت کی جائے گی مگر وہ اس پر بھی مطمئن ہے کہ تم چھوٹی چھوٹی چیزوں میں اس کی پیروی کرتے رہو، پس اپنے دین کے معاملات میں شیطان کی پیروی سے بچو۔ میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں۔ اگر تم انہیں مضبوطی سے تھامے رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے: ایک اللہ کی کتاب قرآنِ مجید اور دوسری میری سنت۔

لوگو! تمہاری عورتوں کا تم پر حق ہے۔ ان سے اچھا سلوک کیا کرو۔ بے شک وہ تمہارے ماتحت ہیں۔ تم نے انہیں اللہ کے نام پر اپنے لیے حلال کیا ہے۔

[1] السیرة الحلبیة: ۳/۳۶۵ تا ۳۶۸، ط العلمیة

لوگو! یاد رکھو، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کے مال میں سے کوئی چیز اس کی مرضی کے بغیر لے لے۔''[1]

لوگوں کو اتحاد، یکجہتی اور اپنے سربراہ کی اطاعت کی تلقین کرتے ہوئے حضور ﷺ نے بڑی تاکید کے ساتھ فرمایا:

''اگر کسی نکٹے، سیاہ رنگ غلام کو بھی تمہارا حاکم مقرر کر دیا جائے جو تمہیں کتاب اللہ اور سنت کے مطابق لے کر چلے تو تم اس کی بات سنتے اور مانتے رہنا۔''[2]

حضور ﷺ نے عقیدے کو خالص رکھنے اور گناہوں سے پرہیز کرنے پر زور دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ انسانی جان کو جسے اللہ نے محترم بنایا ہے، ہرگز قتل نہ کرنا، سوائے ایسے موقع کے کہ جہاں شریعت نے جان لینے کا حق دیا ہو۔ زنا مت کرنا، چوری نہ کرنا۔''[3]

آں حضرت ﷺ نے اُمت کو انتشار اور خانہ جنگی کے خطرات سے خبردار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''دیکھو کہیں میرے بعد گمراہ مت ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔''[4]

خطبے کے اختتام پر خاتم النبیین ﷺ نے حاضرین کو تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

''جو موجود ہیں، وہ ان لوگوں تک یہ باتیں پہنچا دیں جو یہاں نہیں۔ بعض اوقات خود سننے والے کی بہ نسبت وہ شخص بات کو زیادہ محفوظ رکھتا ہے جسے بات کسی ذریعے سے پہنچائی گئی ہو۔''[5]

اپنی بات مکمل کر کے نبی آخر الزمان ﷺ نے پوری اُمت کے اس نمائندہ اجتماع سے دریافت فرمایا:

''تم سے قیامت کے دن میرے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟''

مجمعے نے بیک زبان کہا: ''ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے رب کا پیغام پہنچا دیا، اپنا فرض پورا کر دیا اور ہماری خیر خواہی کا حق ادا فرما دیا۔''

حضور اکرم ﷺ نے اپنی انگشت مبارک آسمان کی طرف بلند کی اور عرض کیا: ''اے اللہ! تو گواہ رہنا۔''[6]

اِس کے بعد آپ ﷺ نے ظہر اور عصر کی نمازیں ایک ساتھ ادا فرمائیں اور قبلہ رخ ہو کر سورج غروب ہونے تک کھڑے کھڑے بڑی گریہ وزاری کے ساتھ دعا کرتے رہے۔[7]

---

① تاریخ ابن خلدون: ۲/۲۰۳، ۲۰۴

② صحیح مسلم، ح:۳۱۹۸، کتاب الحج، باب استحباب رمی جمرۃ العقبۃ ؛ ح: ۴۷۶۱، ۴۷۶۲، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء، ط دارالجیل

③ مسند احمد، ح: ۱۸۹۹۰ باسناد صحیح

④ مسند احمد، ح: ۲۰۳۶ باسناد صحیح

⑤ صحیح البخاری، ح:۶۷، کتاب العلم، باب قول النبی ﷺ: رب مبلغ اوعیٰ من سامع ؛ ح: ۱۰۵، باب لیبلغ العلم الشاھد الغائب

⑥ صحیح مسلم، ح: ۳۰۰۹، کتاب الحج، باب حجۃ النبی ﷺ ؛ سیرت ابن حبان: ۱/۳۹۶

⑦ صحیح مسلم، ح: ۳۰۰۹ ؛ سیرت ابن حبان: ۱/۳۹۶،

نبی آخر الزمان ﷺ فرما رہے تھے:

''اے اللہ! میں ایک مصیبت زدہ فقیر، فریادی اور پناہ گزیں، گھبرایا ہوا اور خوف زدہ، اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہا ہوں۔ میں تجھ سے ایک مسکین کی طرح ایک مجرم اور بے حیثیت شخص کی طرح مانگ رہا ہوں، ایک ایسے خوف زدہ، ہراساں بندے کی مانند دعا کرتا ہوں جس کی گردن تیرے آگے جھک چکی، جس کے آنسو تیرے سامنے بہہ پڑے، جس کا جسم تیرے آگے مسخر ہو چکا، جو تیرے دربار میں ناک رگڑ رہا ہے۔ اے اللہ! اے میرے رب! مجھے اپنی فریاد میں محروم نہ بنانا۔ میرے حق میں شفیق اور مہربان ہو جا۔ اے بہترین سوال کیے جانے والے! سب سے بڑھ کر عطا کرنے والے!''[1]

اِس دوران قرآنِ مجید کی آخری آیت نازل ہوئی، جس میں شریعت کی تکمیل کی خوشخبری کے ساتھ قیامت تک اللہ کے نزدیک صرف اسلام کے پسندیدہ دین ہونے کے فیصلے پر مہرِ توثیق ثبت کر دی گئی۔ ارشاد ہوا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہاری شریعت کو کامل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی، اور اسلام کو تمہارے لیے دین کے طور پر پسند کر لیا۔''[2]

۱۲ ذوالحجہ کو حضور نبی اکرم ﷺ منیٰ میں مناسک حج ادا فرما رہے تھے کہ اس دوران سورۃ النصر کا نزول ہوا جو نزول کے اعتبار سے قرآنِ مجید کی آخری سورت ہے۔ ارشاد ہوا:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ کَانَ تَوَّابًا

''جب اللہ کی مدد اور فتح حاصل ہوگئی اور آپ نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو آپ اپنے رب کی تسبیح وتحمید بیان کریں اور استغفار کریں۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔''[3]

یہ سورہ مبارکہ اشارہ دے رہی تھی کہ پیغمبر آخر الزمان ﷺ جس عظیم ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے تشریف لائے تھے وہ انجام پا چکی ہے اور اب آپ کا سفرِ آخرت قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کے نزول کے موقع پر جہاں دیگر صحابہ کو مسرت ہو رہی تھی، وہاں مقامِ رسالت کے سب سے بڑے رمز شناس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رو رہے تھے؛ کیوں کہ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس سورت میں حضورِ اقدس ﷺ کو دنیا سے واپسی کی تیاری کا حکم دیا گیا ہے۔[4]

---

[1] السیرۃ الحلبیۃ: ۳/۳۷۴، ط العلمیۃ

[2] سورۃ المائدۃ، آیت: ۳، تفسیر ابن کثیر، المائدۃ، آیت: ۳

[3] البدایۃ والنہایۃ: ۷/۶۵۲

[4] تفسیر ابن کثیر، سورۃ النصر

خطاب غدیرِ خُم:

مکّہ سے واپسی پر ۱۸ ذوالحجہ کو مدینہ کے راستے میں ''خُم'' نامی ایک تالاب پر پڑاؤ ہوا۔ یہاں حضورِ اکرم ﷺ نے حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے چند اہم نصیحتیں فرمائیں۔ ①

ارشاد ہوا: ''میں تمہارے درمیان دو اہم چیزیں چھوڑے جارہا ہوں: ایک کتاب اللہ، جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ پس تم اللہ کی کتاب کو لے لو، اسے تھامے رہو۔''

پھر فرمایا: ''اور میرے اہل بیت۔ میں ان کے بارے میں تمہیں اللہ یاد دلاتا ہوں۔''

آخری جملہ نبی آخر الزمان ﷺ نے تین بار دُہرایا۔ ② اِسی خطاب میں آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاہُ'' (جس کا میں دوست ہوں، اس کا علی بھی دوست) ③

رسالت مآب ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ تا قیامت آنے والے مسلمان حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنا محبوب، رہنما اور بڑا سمجھیں، ان کا مقام ملحوظ رکھیں، ان کا پورا احترام کریں اور کسی بے ادبی کے مرتکب نہ ہوں۔

دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ ارشاد ان لوگوں کی تنبیہ کے لیے ہے جو بعد کے دور میں ''ناصبی'' بن گئے۔ یہ فرقہ حضرت علی، فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم پر بے محابا طعنہ زنی کرتا آیا ہے۔ کسی مسلمان کو ایسا کرنا ہرگز زیبا نہیں۔ سخت خطرہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا سادات کرام کی تحقیر پر مبنی سوچ بروزِ حشر رُسوائی، شفاعتِ محمدیہ سے محرومی اور بُرے انجام کا باعث ہوگی۔

☆☆☆

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۲۶۶/۷

② صحیح مسلم، ح: ۶۳۷۰، کتاب فضائل الصحابۃ، باب فضائل علی رضی اللہ عنہ، ط دار الجیل

③ مستدرک حاکم، ح: ۶۲۷۲، باب مناقب علی رضی اللہ عنہ

اس کا ترجمہ اگر ''آقا'' کیا جائے تب بھی بالکل درست ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام اہلِ ایمان کے آقا و مولا ہیں اور ہر مسلمان انہیں اپنا سردار، مربی، قائد اور آقا مانتا ہے جیسا کہ وہ باقی خلفائے ثلاثہ کو یہی مقام دیتا ہے۔

مگر یہ ترجمہ لے کر کوئی یہ اشکال نہ کرے کہ جب وہ تمام مسلمانوں کے آقا ہیں تو پھر خلفائے ثلاثہ کے بھی آقا ہوں گے: کیوں کہ یہ مفہوم خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مراد نہیں لیا۔ انہوں نے کبھی اپنے آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ پر فضیلت نہیں دی۔ نہ ہی ان کے دور میں کبھی یہ کہا کہ خلافت میرا حق تھا۔ بلکہ انہوں نے ارشادِ نبوی کا وہی مفہوم لیا جو درحقیقت اس کا بے تکلف مطلب ہے۔ انہوں نے خود کو خلفائے ثلاثہ کے ماتحت رکھا، ان کی خلافت قبول کی اور ان کے جانثار کا کردار ادا کیا۔ پس ہم بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اتباع میں یہی مطلب مراد لیتے ہیں۔

اہلِ تشیع حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اتباع چھوڑ کر اس خطاب میں ''مولا'' کے لفظ سے امام اور خلیفہ مراد لیتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ اس سے حضور ﷺ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانشینی اور امامت ثابت ہو رہی ہے۔ پھر وہ اس سے بڑھ کر مزید یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں کسی اور صحابی کا خلیفہ بننا بالکل ناجائز تھا۔ مگر یہ استدلال بالکل بے محل ہے؛ کیوں کہ ''مولا'' کے لگ بھگ تیس معانی ہیں مثلاً: دوست، محبوب، مددگار، آزاد کردہ غلام، مالک، سردار، آقا وغیرہ۔ صحابہ کرام کے ایک جم غفیر نے یہ روایت سنی مگر کسی نے اس کا یہ مطلب نہیں لیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جانشین یا خلیفہ قرار دے دیے گئے ہیں۔ سب نے اس سے یہی مراد لیا کہ حضور ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اپنی خصوصی محبت کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہی مطلب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لیا تھا۔ وہ فرماتے تھے:

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَعْهَدْ إِلَيْنَا فِي هٰذِهِ الْإِمَارَةِ شَيْئًا

''لوگو! رسول اللہ ﷺ نے اس حکومت کے معاملے میں ہمارے لیے کوئی وصیت نہیں فرمائی۔'' (دلائل النبوۃ للبیهقی: ۲۲۳/۷)

سفرِ آخرت

اب وقت آچکا تھا کہ پیغمبر آخر الزمان ﷺ دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائیں کہ نبی آخر الزمان ﷺ نے اپنا فرضِ منصبی پورا پورا ادا کر دیا تھا۔ اللہ کا پیغام پوری وضاحت کے ساتھ دنیا والوں کو پہنچا دیا تھا اور اس کے ابلاغ میں جدوجہد، صبر، ایثار اور قربانی کی انتہا کر دی تھی۔ اب شریعت کی تکمیل ہو چکی تھی، وحی کا نزول پورا ہو گیا تھا۔ دین حق کا پرچم اب سربلند تھا اور اُس کی حفاظت و اشاعت کے لیے ایک ایسی اُمت تیار کر دی گئی تھی جسے "خیر اُمت" کا لقب ملا تھا جو قیامت تک بنی نوع آدم کی رہنمائی، امامت اور قیادت کی ذمہ دار تھی۔

۲۳ سال کے اُن تھک مجاہدوں اور قربانیوں کے ذریعے رحمتِ دوعالم ﷺ نے بنی نوع انسان کے لیے ایک ایسے جہانِ نو کی بنیاد رکھ دی تھی جس کی پناہ میں انسانیت تا قیامت سکھ کا سانس لے سکتی تھی۔ اگر چہ اب تک اسلامی ریاست کی حدود جزیرۃ العرب تک محدود تھیں مگر دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کو دعوتِ اسلام پہنچ چکی تھی اور ہر قوم اس انقلاب کو بچشم حیرت دیکھ رہی تھی جس نے صحرائے عرب کے ہر ذرّے میں ایک نئی تابانی پیدا کر دی تھی۔

حج سے واپسی کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کا اشتیاق غالب محسوس ہونے لگا تھا۔ آپ ﷺ معمول سے زیادہ استغفار اور حمد و تسبیح میں مشغول رہنے لگے، گویا آپ سفرِ آخرت کی تیاری فرما رہے ہیں۔ آپ ﷺ کے ارشادات بھی آپ کی رُخصتی کا پتا دے رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ایک دن غزوۂ اُحد کے شہیدوں کے لیے یوں دعا فرمائی جیسے آپ سب کو الوداع کہہ رہے ہوں۔ پھر آپ ﷺ مسجد میں آئے اور منبر پر تشریف فرما ہو کر صحابہ کرام کو یوں خطاب کیا:

> "میں تم سے پہلے اگلی منزل پر جا رہا ہوں۔ میں تمہارے لیے گواہی دوں گا۔ اب تم سے حوضِ کوثر پر ملاقات ہوگی۔ مجھے یہ خدشہ تو نہیں ہے کہ تم میرے بعد شرک کرنے لگو۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ تم دنیاداری میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگو اور جس طرح گزشتہ قومیں ہلاک ہوئی ہیں، تم بھی اسی طرح ہلاک ہو جاؤ۔"[1]

رومیوں کے خلاف نئی یلغار کی تیاری:

خیبر، فدک اور وادیٔ القریٰ کی شمالی فتوحات کے بعد ریاستِ مدینہ کی سرحدیں اس بازنطینی روما کی سرحدوں سے جا ملی تھیں جس نے کچھ ہی مدت پہلے فارس جیسی عالمگیر طاقت کو گھٹنوں پر جھکا کر دنیا کو اپنی قوت و شوکت کا از سرِ نو یقین دلایا تھا۔ مگر اس عظمت و ہیبت کے باوجود رومی اربابِ اقتدار عرب انقلاب کی لہر سے غیر معمولی طور پر خائف تھے۔

[1] صحیح البخاری، کتاب الصلوۃ، باب الصلوۃ علی الشہید ؛ صحیح مسلم، ح: ۶۱۱۳،۶۱۱۷، کتاب الفضائل، باب اثبات الحوض

اسی بناء پر انہوں نے بلقاء جانے والے اسلامی سفیر حارث بن عمیر کو قتل کیا تھا جس کے ردِعمل میں جنگِ مؤتہ برپا ہوئی اور بازنطینیوں نے مدینہ پر یلغار کی تیاریاں کر لیں جسے رسول اللہ ﷺ نے تبوک تک پیش قدمی کر کے ناکام بنا دیا۔

اس وقت رسول اللہ ﷺ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مشورے پر مزید پیش قدمی مناسب وقت کے لیے ملتوی کر کے واپس چلے آئے تھے۔ مگر اس کے کچھ عرصہ بعد رومیوں کو سرزنش کرنے کی ایک اہم وجہ پیدا ہو گئی تھی، وہ یہ کہ شامی سرحدی علاقے ''معان'' کے نصرانی عرب گورنر فروہ بن عَمرو جُذامی نے اسلام قبول کر کے حضور ﷺ کی حلقہ بگوشی اختیار کر لی تھی اور اس بارے میں اطلاعی مراسلہ مدینہ بھیج دیا تھا۔ رومیوں نے اس پر مشتعل ہو کر فروہ بن عَمرو کو سولی پر چڑھا دیا تھا۔[1] دریں حالات رسول اللہ ﷺ رومیوں کے خلاف جہاد کو مزید مؤخر کرنے کی گنجائش نہیں سمجھتے تھے۔ اگرچہ ۱۰ ہجری کے موسم بہار کا بڑا حصہ حجۃ الوداع میں صرف ہو گیا تھا، اس کے باوجود مسلمان رومیوں کے خلاف جنگ کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح مستعد تھے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ بار بار انتہائی رنج کے ساتھ اپنے لے پالک زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور اپنے عم زاد جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کو یاد کرتے تھے جو رومیوں سے جنگ میں شہید ہوئے تھے۔ چنانچہ حجۃ الوداع سے واپس تشریف لا کر ماہ صفر میں آپ ﷺ نے بڑے اہتمام سے ایک لشکر تیار کرانا شروع کیا۔[2]

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی امارت:

توقع کے برخلاف حضور ﷺ نے اکابر کو چھوڑ کر لشکر کا سپہ سالار حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو بنایا جن کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی، انہیں یہ اعزاز اس لیے دیا گیا کہ جنگِ مؤتہ میں لشکر کے اوّلین سپہ سالار انہی کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ تھے جو لڑتے لڑتے شہید ہو گئے تھے۔ حضور ﷺ چاہتے تھے کہ باپ کی ادھوری مہم کی تکمیل بیٹے کے ہاتھوں ہو، تاکہ رومیوں پر مسلمانوں کی دینی غیرت وحمیت کا رعب بھی پڑے اور وہ جان لیں کہ مسلمان اپنے شہداء کا خون بھولا نہیں کرتے۔[3] پیر ۲۹ صفر کو حضور اکرم ﷺ نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کر ارشاد فرمایا:

''اللہ کا نام لے کر وہاں تک پیش قدمی کرو جہاں تمہارے والد شہید ہوئے تھے۔ تیزی سے سفر کرنا۔ اللہ فتح عطا کرے تو وہاں مختصر مدت قیام کرنا۔ راہبروں سے کام لینا، جاسوسوں اور ہراول دستوں کو آگے بھیجنا۔''[4]

مرض الوفات کا آغاز:

ماہِ صفر کے آخری ایام تھے[5] کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ جنت البقیع تشریف لے گئے اور مرحومین کے لیے

---

① سیرۃ ابن ہشام: ۲/۵۹۰، ۵۹۱

② طبقات ابن سعد: ۲/۱۸۹، ۱۹۰؛ سبل الھدیٰ والرشاد: ۶/۲۴۸

③ دلائل النبوۃ للبیہقی: ۷/۲۰۰ ④ طبقات ابن سعد: ۲/۱۸۹، ۱۹۰؛ سبل الھدیٰ والرشاد: ۶/۲۴۸

⑤ حضور ﷺ کی بیماری کی مدت راجح قول کے مطابق ۱۳ دن رہی۔ (طبقات ابن سعد: ۲/۲۰۶؛ سبل الھدیٰ والرشاد: ۱۲/۲۴۴) چونکہ قولِ مشہور کے مطابق ۱۲ ربیع الاوّل کو یومِ وفات ہے، اس لیے مرض کا آغاز ۲۹ صفر کو متعین ہوتا ہے۔ یہ وہی دن ہے جس دن حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا گیا تھا۔

دعائے مغفرت فرمائی۔ صبح ہوئی تو آپ ﷺ کو سر میں شدید درد محسوس ہوا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اسی دن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بھی سر درد کی تکلیف لاحق ہوئی۔ وہ کہہ اُٹھیں: ''ہائے میرے سر میں درد!''

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مجھے تم سے زیادہ درد ہو رہا ہے۔''

پھر حضور ﷺ نے مزاحاً فرمایا: ''عائشہ! اگر تم مجھ سے پہلے مر جاؤ تو کیا حرج ہے۔ تمہارا کفن دفن میں کر دوں گا۔''

وہ بولیں: ''جی ہاں، اگر میں پہلے مر گئی تو آپ اس گھر میں کسی دوسری بیوی کو لے آئیں گے۔''

حضور اکرم ﷺ ان کی حاضر جوابی پر ہنس دیے۔ [1]

جیشِ اسامہ کی روانگی:

اگلے دو دنوں میں حضور اکرم ﷺ کی بیماری میں شدت آ گئی۔ اُدھر لشکر روانگی کے لیے تیار تھا۔ جمعرات ۲ ربیع الاوّل کو حضور ﷺ نے پرچم تیار کر کے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو عطا کیا اور دعاؤں کے ساتھ انہیں رخصت فرمایا۔ [2]

اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے روانگی سے پہلے عرض کیا: ''اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو شفا عطا فرمائیں گے۔ آپ مجھے کچھ دن ٹھہرنے کی اجازت دیجیے۔ اگر میں اسی حالت میں روانہ ہو گیا تو دل میں خلجان رہے گا۔'' حضور ﷺ نے سکوت فرمایا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فوج کو لے کر مدینہ منورہ سے تین میل دور ''جُرف'' کے مقام پر جا ٹھہرے۔ اس مہم میں حضور ﷺ کی غیر معمولی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے صحابہ کرام جوق در جوق وہاں پہنچنے لگے۔ [3]

حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابوعبیدہ بن جراح اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہم جیسے صفِ اوّل کے جلیل القدر صحابہ بھی لشکر میں شمولیت کے لیے نامزد تھے۔ [4]

حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا میں مستقل قیام:

رسول اللہ ﷺ کے سر کا درد بڑھتا چلا گیا۔ اس کے باوجود آپ ازواجِ مطہرات کے ہاں روزانہ باری باری تشریف لے جاتے رہے مگر جب تکلیف زیادہ بڑھ گئی تو آپ نے ازواجِ مطہرات سے اجازت چاہی کہ بیماری کے دن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ہاں گزار لیں تاکہ گھر بدلنے کی زحمت نہ ہو۔ سب نے خوشی سے اجازت دے دی۔ تب آپ ﷺ حضرت علی اور حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کا سہارا لے کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی طرف تشریف لے چلے۔ آپ کے سرِ مبارک پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور قدم زمین پر گھسٹ رہے تھے۔ [5]

رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر آرام فرما ہوئے۔ بیماری کی شدت میں آپ کو محسوس ہو رہا تھا

---

[1] مسند احمد، ح: ۲۵۹۰۸؛ السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ۷۰۴۲؛ سیرۃ ابن ہشام: ۲/۶۴۳
[2] طبقات ابن سعد: ۲/۱۹۰؛ سبل الھدیٰ والرشاد: ۶/۲۴۸
[3] دلائل النبوۃ للبیہقی: ۷/۲۰۰
[4] طبقات ابن سعد: ۲/۱۹۰؛ سبل الھدیٰ والرشاد: ۶/۲۴۸
[5] صحیح البخاری، ح: ۴۴۴۲، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ و وفاته

کہ خیبر میں زینب بنت سلام بن مشکم کی ضیافت میں جو زہر آلود لقمہ آپ ﷺ نے منہ میں رکھا تھا اس کے کمی اثرات ظاہر ہو رہے ہیں۔ آپ ﷺ فرماتے تھے: ''اس وقت اس زہر کے اثر سے میری شہ رگ کٹتی جا رہی ہے۔''①
آپ کی اذیت دیکھ کر امہات المؤمنین بھی صدمے سے بے حال تھیں۔ ام المؤمنین حضرت صَفِیَّہ رضی اللہ عنہا فرما رہی تھیں: ''اللہ کی قسم! یا نبی اللہ! میں چاہتی ہوں کہ آپ کی تکلیف مجھ پر آ جائے۔''②

اُمت کو اہم امور کی ذمہ داریاں سونپنا:

اِس قدر شدید بیماری کے باوجود حضور اکرم ﷺ اُمتِ مُسلِمہ کی خیر خواہی اور ریاست کے اہم انتظامی و سیاسی اُمور سے لاتعلق نہیں تھے۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ جزیرۃ العرب میں دو دین باقی نہ رہنے پائیں۔③
یہ تاکید بھی فرمائی کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کو جزیرۃ العرب کی حدود سے نکال باہر کیا جائے۔④
حضور اکرم ﷺ نے یہ اس لیے فرمایا کہ یہ خطہ پورے عالم اسلام کے مرکز اور ہیڈ کوارٹر کی حیثیت رکھتا تھا اور مرکز میں اغیار کی موجودگی بہت سے فتنوں کا باعث بن سکتی تھی۔⑤

حضور نبی اکرم ﷺ کی نماز میں آخری بار امامت:

حضور نبی اکرم ﷺ کی بیماری بڑھتی چلی گئی۔ ایک دن مغرب کی نماز پڑھائی جس میں سورۃ المرسلات کی تلاوت کی۔ یہ آخری رسول کی اقتداء میں آخری اُمت کی آخری نماز تھی۔⑥

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امامت کا حکم اور ان کی نیابت کے اشارات:

اس کے بعد بخار کی شدت سے غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ عشاء کی نماز کے وقت آپ ﷺ کو افاقہ ہوا تو پوچھا: ''کیا لوگ نماز پڑھ چکے؟'' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''جی نہیں، وہ آپ کے منتظر ہیں۔''
رسول اللہ ﷺ نے وضو فرما کر مسجد تشریف لے جانے کا ارادہ کیا مگر نقاہت اور غشی کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوا۔
تب آپ ﷺ نے تازہ دم ہونے کے لیے سات مشک پانی منگوایا اور ایک بڑے برتن میں تشریف فرما ہوئے۔
گھر کی خواتین نے آپ ﷺ پر پے در پے پانی انڈیلا۔ آپ کو ٹھنڈک پہنچی تو ہاتھ کے اشارے سے مزید پانی گرانے سے منع فرمایا اور نماز کے لیے اٹھنے لگے مگر دوبارہ غشی طاری ہوگئی۔ ہوش آیا تو دریافت فرمایا:

---

① صحیح البخاری، ح: ۴۴۲۸، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ و وفاته ② طبقات ابن سعد: ۱۲۸/۸، ط صادر
③ لا یجتمع دینان فی جزیرة العرب. (شرح مشکل الآثار للامام ابی جعفر الطحاوی، ح: ۲۷۶۳، ط مؤسسة الرسالة)
④ اخرجوا الیهود والنصاریٰ من جزیرة العرب. (الآحاد والمثانی، ح: ۲۳۴ عن ابی عبیدة بن الجراح رضی اللہ عنہ) و اخرج البزار عن عمر رضی اللہ عنہ بمثله (مسند البزار، ح: ۲۳۰) امام طحاوی نے اس مسئلے پر مفصل کلام کر کے راجح اور مرجوح طرق میں فرق کیا ہے۔ (شرح مشکل الآثار: ۱۸۴/۷ تا ۱۹۲)
⑤ امام ابو عبید قاسم بن سلام نے اس حکم کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ ان لوگوں نے عہد شکنی کی تھی یا ان کی دیگر سرگرمیوں سے مسلمانوں کو خطرہ تھا۔
انما نراه قال ذلک ﷺ لنکث کان منهم او لامر احدثوه بعد الصلح و ذلک بین فی کتاب کتبه عمر الیهم قبل اجلائه ایاهم عنها (الاموال للقاسم بن سلام: ۱۲۹/۱، ط دار الفکر)
⑥ صحیح البخاری، ح: ۴۴۲۹، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ و وفاته

"کیا لوگ نماز پڑھ چکے؟" عرض کیا گیا "جی نہیں، وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ غسل فرمایا اور مسجد تشریف لے جانے کی کوشش فرمائی مگر پھر ہوش وحواس نے ساتھ نہ دیا۔ ایسا تین بار ہوا۔ آخر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ابوبکر کو کہو کہ وہ نماز پڑھائیں۔"

امہات المومنین نے ذرا پس و پیش کی اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: "وہ نرم دل انسان ہیں۔ آپ کی جگہ کھڑے ہو کر اپنے اوپر قابو نہیں پاسکیں گے۔" رسول اللہ ﷺ نے اُن کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ سہ بارہ بڑے اٹل لہجے میں ارشاد فرمایا: "ابوبکر کو حکم دو کہ وہ نماز پڑھائیں۔" [1]

یہ حضور اکرم ﷺ کی جانب سے اُمت کے لیے اپنے نائب اور جانشین کی نامزدگی کا لطیف اشارہ تھا۔ حضور اکرم ﷺ کو سفر آخرت پر روانہ ہوتے ہوئے پیچھے رہ جانے والی اُمت کے نظم و ضبط اور وحدت کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری کا پورا احساس تھا مگر آپ نے اس اہم فریضے کو عام بادشاہوں کی طرح ولی عہدی اور جانشین کی نامزدگی کے ذریعے انجام دینا پسند نہیں فرمایا کہ کہیں مسلمانوں کے سیاسی نظام میں انتقالِ اقتدار کا معاملہ "ولی عہدی" میں محدود نہ ہو جائے۔ آپ ﷺ اس معاملے میں وسعت اور کشادگی رکھنا چاہتے تھے۔ آپ مسلمانوں میں باہمی مشاورت، قومی ہمدردی و خیر خواہی، سیاسی شعور، ذاتی ایثار، اتفاقِ رائے، غور و تفکر اور افہام و تفہیم جیسی صفات کو اجاگر کرنے کے خواہش مند تھے۔ یہ تب ہی ہوسکتا تھا جب انہیں "انتقالِ اقتدار" کے معاملات میں ایک لگے بندھے طرز کا پابند نہ کیا جاتا بلکہ انہیں موقع دیا جاتا کہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں حسب ضرورت، بہتر سے بہتر سیاسی نظام تشکیل دے لیا کریں۔ تاہم آپ ﷺ کے ذہن میں اپنے جانشین کا نام بہت واضح تھا اور وہی شخصیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے ہو چکی تھی۔ آپ ﷺ کو مسلمانوں کی بصیرت اور معاملہ فہمی کی صلاحیت پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ بھی اسی شخصیت کو خلیفہ چنیں گے۔ یہ شخصیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تھی جو آپ ﷺ کے سب سے قریبی رفیق، صحابہ میں سب سے زیادہ بزرگ اور سیادت و امامت کے بارِ گراں کو سنبھالنے کے سب سے زیادہ اہل تھے۔

حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امامت کا حکم فرمایا مگر حضور ﷺ کی بیماری کی وجہ سے وہ اتنے غم زدہ اور دل شکستہ تھے کہ فوراً تعمیل نہ کر سکے اور ان کی جگہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نماز پڑھانے لگے، حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قرأت سنی تو حجرۂ مبارکہ سے ہی صدا بلند فرمائی:

"نہیں، نہیں، نہیں! صرف ابوبکر نماز پڑھایا کریں۔" [2]

یہ بھی فرمایا: "نہ اللہ تعالیٰ ابوبکر کے سوا کسی کو امام بننے دے گا نہ مسلمان ایسا ہونے دیں گے۔" [3]

---

[1] صحیح البخاری، ح: ٦٦٤، کتاب الاذان، باب حد المریض ان یشهد الصلوة، عن الاسود عن عائشة رضی اللہ عنہا ؛ باب اهل العلم والفضل احق بالامامة، ح: ٦٧٨ عن ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ ؛ ح: ٦٧٩ عن عروة بن الزبیر عن عن عائشة رضی اللہ عنہا ؛ ح: ٦٨٢ عن عبدالله بن عمر رضی اللہ عنہ

[2] سنن ابی داؤد، ح: ٤٦٦١، کتاب السنة، باب فی استخلاف ابی بکر رضی اللہ عنہ

[3] سنن ابی داؤد، ح: ٤٦٦١، کتاب السنة، باب فی استخلاف ابی بکر رضی اللہ عنہ ؛ البدایة والنهایة: ٨/٢٦، دار هجر

چنانچہ اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک تمام نمازیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی پڑھاتے رہے۔

مسجد نبوی کا مصلی وہ مقام تھا جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کسی اور کو قدم رکھنے کی جرأت نہ تھی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی زندگی میں کسی کو خود اپنی جگہ مقرر کرنا اس بات کا واضح قرینہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جانشینی کے لیے کس پر اعتماد کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے رسول کی منشا کو خود سمجھ کر اپنی رمز شناسی اور سیاسی بصیرت کا ثبوت پیش کریں۔ اور بعد میں ایسا ہی ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی صحابہ کرام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توقع پر پورے اترے۔

اگرچہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جانشین کی نامزدگی کو خلاف مصلحت سمجھا تھا اور اسے مسلمانوں کی شوریٰ پر چھوڑنا پسند کیا تھا مگر ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یکا یک خیال ہوا تھا کہ کہیں اس طرح مسلمانوں میں کوئی تنازعہ نہ کھڑا ہو جائے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابوبکر اور ان کے صاحبزادے کو بلالو! میں کچھ تحریر کروادوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ابوبکر کی موجودگی میں اقتدار کا کوئی اور امیدوار اُٹھ کھڑا ہو۔''[1]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیا وصیتیں لکھوانا چاہتے تھے؟

جمعرات کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری نہایت شدت اختیار کر گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حالت میں کچھ نصیحتیں لکھوانے کے لیے کاغذ طلب کیا۔[2] اس وقت حضرت عمر، حضرت عباس اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم خدمت میں حاضر تھے۔ کچھ نے حکم کی تعمیل کرنا چاہی مگر اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر شدید نقاہت طاری تھی، بار بار غشی ہوتی تھی، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ نے آپ کی زحمت کا خیال کر کے کچھ لکھنے لکھانے سے منع کیا اور کہا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید تکلیف میں ہیں۔ ہمارے پاس قرآنِ مجید موجود ہے۔ وہ ہمیں کافی ہے۔''

اس کہنے سننے کی وجہ سے مجلس میں آوازیں کچھ بلند ہونے لگیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب سن رہے تھے۔ شور سے آپ کو ناگواری تو ہوئی مگر یہ اطمینان بھی ہوگیا کہ دین کی تکمیل کے متعلق یہ تربیت یافتہ جماعت پُراعتماد ہے اور بعد میں پیش آنے والے نئے مسائل کا حل کتاب وسنت کی روشنی میں اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصائح لکھوانے پر اصرار نہ فرمایا اور مجلس برخاست کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ''اچھا! اب تم جاؤ۔''

تاہم ضروری وصیتیں زبانی بتاتے ہوئے فرمایا:

''مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دینا۔ اُسامہ کے لشکر کو اسی اہتمام سے روانہ کرنا جس طرح میں لشکروں کو

---

[1] "ادعی لی ابا بکر اباک واخاک، حتیٰ اکتب کتابا فانی اخاف ان یقول قائل او یتمنیٰ متمن ویقول: انا اولیٰ، ویابی اللّٰہ والمؤمنون الا ابابکر. (صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ)
واخرجہ احمد فی مسندہ، ح: ۲۵۱۱۳، و ابو داؤد الطیالسی فی مسندہ، ح: ۱۶۱۱، والنسائی فی سننہ الکبریٰ، ح: ۷۰۴۴

[2] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اسے جمعرات کا واقعہ بتایا ہے۔ (صحیح البخاری، ح: ۳۱۶۸) پس یہ یوم وفات یعنی پیر سے پانچ دن قبل کا واقعہ ہے۔

رخصت کیا کرتا تھا۔ وفود کا ویسے ہی اعزاز واکرام کرتے رہنا جیسا کہ میں کرتا تھا۔"①

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلافت نامے کا خیال بھی ترک کر دیا اور فرمایا:

"اللہ بھی اور مسلمان بھی ابوبکر کے سوا کسی کو خلیفہ نہیں بننے دیں گے۔"②

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصیت:

ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کاغذ قلم لانے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ کچھ وصیتیں لکھوانا چاہتے تھے تاکہ لوگ گمراہ نہ ہوں۔ دیگر صحابہ کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی لکھنا خلافِ مصلحت سمجھا اور عرض کیا: "آپ بیان فرمادیں۔ میں زبانی یاد کرلوں گا۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میں وصیت کرتا ہوں کہ نماز کا، زکوٰۃ کا اور ماتحتوں کا بہت خیال رکھنا۔"③

مسجد نبوی میں آخری بار تشریف آوری:

لشکرِ اسلام رسول اللہ ﷺ کی بیماری سے مضطرب ہوکر "جُـــرُف" میں رُکا ہوا تھا۔ ہفتہ دس ربیع الاوّل کو امیرِ لشکر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ اور بہت سے صحابہ حضور ﷺ کی عیادت کے لیے "جُرُف" سے مدینہ منورہ آگئے۔④

اسی دن ظہر کی نماز کے وقت حضورِ اکرم ﷺ کو کچھ افاقہ ہوا۔ آپ حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا سہارا لے کر مسجد میں تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ کے سر مبارک پر پٹی بندھی تھی۔ بدنِ مبارک پر کمبل لپٹا ہوا تھا۔ جماعت کھڑی ہوچکی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے حجرے کا دروازہ پہلی صف کے بائیں جانب تھا، جو مسجد کے اندر کھلتا تھا، اس لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی آمد کو فوراً محسوس کرلیا اور امام

---

① صحیح البخاری، ح: ۳۰۵۳، کتاب الجهاد ؛ ح: ۳۱۶۸ کتاب الجزیة، باب اخراج الیهود والنصاری ؛ ح: ۴۴۳۱، کتاب المغازی، باب مرض النبی ووفاته ؛ صحیح مسلم، ح: ۴۲۱۹، کتاب الوصیة، باب ترک الوصیة، ط دار الجیل

اہم تنبیہ: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک بار روتے ہوئے فرمایا: "جمعرات کا دن، آہ! جمعرات کا دن۔" پھر یہ پورا واقعہ ذکر کیا۔ (صحیح البخاری، ح: ۳۱۶۸، باب اخراج الیهود من جزیرة العرب) اور آخر میں فرمایا: بڑا المیہ ہوا کہ صحابہ کے اختلاف اور شور کی وجہ سے وہ باتیں لکھنے سے رہ گئیں۔" (صحیح البخاری، ح: ۷۳۶۶، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، باب کراهیة الخلاف)

کوئی اس کا یہ مطلب نہ لے کہ حضور ﷺ اس وقت کوئی عقیدہ یا رکنِ دین لکھوانا چاہ رہے تھے جو نہ لکھا جاسکا اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ دین کے ناقص رہ جانے پر رو رہے تھے۔ دراصل عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اس واقعے کے وقت تقریباً چودہ سال کے تھے اور احادیث جمع کرنے کے انتہائی شیدائی تھے۔ انہیں حسرت تھی کہ اس مجلس میں حضور ﷺ جو لکھوانا چاہتے تھے وہ بہر حال لکھ لیا جاتا۔ غالباً انہیں گمان تھا کہ حضور ﷺ شاید اس وقت جنگِ جمل وصفین جیسے واقعات سے بچاؤ کے لیے خلافت (کے حق داروں) کی تصریح، یا بعض شرعی احکام، یا خلفاء کے درجہ بدرجہ نام بتانا چاہتے ہوں گے۔ جیسا کہ علامہ عینی فرماتے ہیں: "اراد ان ینص علی الامامة فترتفع تلک الفتن العظیمة کحرب الجمل والصفین...... اراد ان یبین کتابا فیه مهمات الاحکام...... اراد ان ینص علیٰ اسامی الخلفاء بعده." (عمدة القاری: ۱۷۱/۲)

بہر کیف یہ خیال بالکل غلط ہے کہ آپ اپنے جانشین کے طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت یا خلافت کا فرمان لکھوانا چاہ رہے تھے۔ آخر اس کے بعد بھی نبی ﷺ کئی دن حیات رہے۔ اگر وہ امامتِ علی کی وضاحت کرنا چاہ رہے تھے (جو اہلِ تشیع کے نزدیک دین کا رکنِ اعظم ہے) تو بعد میں یہ وضاحت کیوں نہ فرمادی۔

درحقیقت اس وقت موقع پر موجود کسی بھی صحابی کو یہ خیال نہ گزرا کہ کوئی رُکن بتایا جانے والا تھا۔ ورنہ کم از کم حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھ لیتے کہ کیا ارشاد فرمانے کا ارادہ تھا۔ ہاں بعد میں جب اُمت میں خانہ جنگی ہوئی اور فرقے بننے لگے تو اس وقت ایک حسرت کے طور پر ابن عباس رضی اللہ عنہما کا رونا اور زبان سے یہ نکل جانا ایک طبعی بات تھی کہ کاش! ان چیزوں کے متعلق کھلی وضاحت محفوظ کرلی جاتی۔ (خلفاء کے درجہ بدرجہ نام سامنے آجاتے) تو شاید یہ آفتیں ٹل جاتیں۔

② صحیح البخاری، ح: ۷۲۱۷، کتاب الاحکام، باب الاستخلاف ؛ مسند احمد، ح: ۲۴۷۵۱ ؛ مسند ابی داوُد طیالسی، ح: ۱۶۱۱

③ مسند احمد، ح: ۲۶۷۴۷ باسناد صحیح لغیره ④ طبقات ابن سعد: ۱۹۰/۲

کی جگہ خالی کر کے پیچھے ہٹنے لگے مگر آپ ﷺ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے انہیں منع فرما دیا۔[1]
حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو حکم فرمایا: ''مجھے ابوبکر کی بائیں طرف بٹھا دو۔''[2]
اب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تکبیرات پر نماز ادا کر رہے تھے۔[3] یہ اپنی موجودگی میں اُمت کو اپنے جانشین کی تابع داری کرانے کا بڑا دلکش نمونہ تھا اور اس بات کا ثبوت بھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پیروی دراصل نبی رحمت ﷺ ہی کی پیروی ہے۔

اُمت سے آخری خطاب:

نماز کے بعد حضور ﷺ اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا سہارا لے کر اٹھے جو لشکر کو جُرف کی خیمہ گاہ میں چھوڑ کر آپ ﷺ کی عیادت کے لیے واپس آگئے تھے۔ حضور ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا:

''اللہ نے اپنے بندے کو اختیار دے دیا کہ وہ چاہے تو دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے، چاہے تو اللہ کے پاس موجود انعامات کو اختیار کر لے، پس اس بندے نے اللہ کی نعمتوں کو پسند کر لیا ہے۔''

یہ الفاظ سنتے ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بے ساختہ بولے:

''آپ پر میرے ماں باپ قربان۔ ہماری جانیں اور مال آپ پر فدا۔''[4]

یہ کہتے ہوئے وہ زار و قطار رونے لگے؛ کیوں کہ پورے مجمع میں فقط وہی سمجھے تھے کہ یہ الفاظ حضور اکرم ﷺ کی رخصتی کا پیغام ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا رونا برداشت نہ ہو سکا۔ فرمایا: ''ابوبکر! مت روؤ۔''[5]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے احسانات کا ذکر:

پھر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

''مجھ پر سب سے زیادہ احسانات ابوبکر کے ہیں۔ اگر مجھے کسی انسان کو محبوب بنانا ہوتا تو ابوبکر ہی کو محبوب بناتا مگر ان سے رشتہ دینی بھائی بندی کا ہے۔ اچھا! مسجد میں کھلنے والے سب دروازے بند کر دینا۔ صرف ابوبکر کے گھر کا دروازہ کھلا رہنے دینا۔''[6]

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی امارت کا فیصلہ برقرار:

اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی کم عمری کے پیش نظر بعض صحابہ کو ان کی قیادت پر اطمینان نہ تھا۔ اس سے قبل جنگِ موتہ میں

---

① صحیح البخاری، ح: ۹۲۷، کتاب الجمعة، باب من قال فی الخطبة بعد الثناء اما بعد ؛ ح: ۶۸۳، کتاب الاذان، باب من قام الی جنب الامام لعلة ؛ ح: ۷۱۲، ۷۱۳، کتاب الاذان، باب من اسمع الناس بتکبیر الامام
② سیرت ابن حبان: ۳۹۹/۱
③ صحیح مسلم، ح: ۹۶۸، کتاب الصلوة، باب استخلاف الامام اذا عرض له عذر
④ صحیح البخاری، ح: ۳۹۰۴، کتاب المناقب، باب هجرة النبی ﷺ و اصحابه الی المدینة
⑤ صحیح البخاری، ح: ۳۹۰۴، کتاب المناقب، باب هجرة النبی ﷺ و اصحابه الی المدینة
⑥ صحیح البخاری، ح: ۴۶۶، کتاب الصلوة، باب الخوخة والممر فی المسجد

جب ان کے والد کو امیر اوّل بنایا گیا تھا تو اس وقت بھی اس قسم کی چہ می گوئیاں ہوئی تھیں۔ حضور ﷺ کو ان باتوں سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اعتراض کرنے والوں کو مخاطب کر کے انہیں یوں سرزنش کی:

''اگر تم اسامہ کی قیادت پر اعتراض کر رہے ہو تو اس سے پہلے تم اس کے والد کی قیادت پر بھی اعتراض کر چکے ہو۔ اللہ کی قسم! وہ اس منصب کے قابل تھے اور اللہ کی قسم! وہ مجھے تمام لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب تھے۔ اور اللہ کی قسم! یہ (اسامہ) بھی اس منصب کے لائق ہیں۔''

اس طرح آپ ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ پر مکمل اعتماد ظاہر کرتے ہوئے ان کی امارت کا فیصلہ برقرار رکھا۔ ①

قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی ممانعت:

حضور ﷺ کو خدشہ تھا کہ مسلمان دیگر قوموں کی طرح انبیاء اور اولیاء کی عقیدت میں غلو کر کے شرک میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ آپ نے قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو خبردار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''گزشتہ قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔ خبردار! تم ایسا نہ کرنا۔ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔'' ②

انصار سے حسنِ سلوک کی تاکید:

رسول اللہ ﷺ نے انصار کے بے پایاں احسانات اور ان کی گراں قدر خدمات کو یاد کرتے ہوئے، مہاجرین کو ان سے حسن سلوک کی وصیت کی اور فرمایا:

''لوگو! انصار کے بارے میں تمہیں اچھا رویہ رکھنے کی تاکید کرتا ہوں۔ عام مسلمان بڑھتے جائیں گے اور انصار گھٹتے گھٹتے کھانے میں نمک کی مانند ہو جائیں گے۔ وہ اپنی ذمہ داری ادا کر چکے۔ اب ان کی ذمہ داری تمہیں ادا کرنی ہے۔ تمہارے اربابِ حل وعقد کو چاہیے کہ انصار کے نیک وکار لوگوں کی قدر دانی کرتے رہیں اور ان میں سے جو کسی خطا کے مرتکب ہوں، ان سے درگزر کریں۔'' ③

یہ بھی فرمایا: ''تم میں سے ہر کسی کو مرتے وقت اللہ تعالیٰ سے اچھا گمان رکھنا چاہیے۔'' ④

یہ رسول اللہ ﷺ کا آخری خطبہ تھا۔ ⑤ اس کے بعد آپ گھر تشریف لے گئے۔ ⑥

---

① صحیح مسلم میں حضور ﷺ کی ناراضی کی یہ الفاظ منقول ہیں:

ان تطعنوا فی امارته یعنی اسامة بن زید ،فقد طعنتم فی امارة ابیه من قبله ، وایم الله! ان کان لخلیقاً لها ، و ایم الله! ان کان لاحب الناس الیّ وایم الله ان هذا لها لخلیق،یرید اسامة بن زید.(صحیح مسلم ،ح: ۲۲۱۸،فضائل الصحابة ،باب فضائل زید بن حارثة رضی اللہ عنہ)

سیرت نگاروں نے بھی اس خطاب کو محفوظ کیا ہے۔ (سیرت ابن ھشام: ۲/۶۵۰)

② صحیح مسلم،ح: ۱۲۱۲، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰة، باب النهی عن بناء المساجد علی القبور،ط دارالجیل

③ ان الفاظ میں اشارہ تھا کہ خلفاء مہاجرین میں سے ہوں گے، انصار میں سے نہیں۔ جیسا کہ بعد میں صحابہ کا اسی پر اجماع ہوا۔

④ صحیح مسلم، ح: ۷۲۱۲ ،کتاب الجنة و صفة نعیمها ،باب الامر بحسن الظن بالله ،ط دارالجیل

⑤ صحیح البخاری ،ح: ۳۷۹۹،کتاب المناقب،باب مناقب الانصار ⑥ طبقات ابن سعد: ۲/۱۹۰

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے لیے خاموش دعا:

اگلے دن (بروز اتوار) اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ دوبارہ خاضر خدمت ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیکھا تو آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ اسامہ رضی اللہ عنہ نے جھک کر آپ ﷺ کا بوسہ لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دستِ مبارک آسمان کی طرف اٹھا کر اسامہ رضی اللہ عنہ پر رکھ دیا، گویا ان کے لیے دعا کر رہے ہوں۔ ①

اسبابِ دنیا سے قطع تعلق:

جیسے جیسے آخری لمحات قریب آرہے تھے، رسول اللہ ﷺ اس عالمِ فانی کے اسباب سے لاتعلقی اختیار کرتے جارہے تھے۔ دولت کدے میں کچھ اشرفیاں موجود تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تاکید فرمائی کہ انہیں صدقہ کردیں۔ ②

کچھ دیر بعد پوچھا: ''کیا وہ اشرفیاں صدقہ کردیں؟''

عرض کیا: ''ابھی تک نہیں۔''

آپ نے وہ منگوائیں، دستِ مبارک پر رکھ کر انہیں گنا۔ وہ چھ تھیں۔ فرمایا:

''محمد اپنے رب سے کس گمان کے ساتھ ملے گا، اگر یہ دولت اس کے گھر میں ہو۔''

یہ کہہ کر آپ ﷺ نے وہ تمام اشرفیاں فی الفور صدقہ کرادیں۔'' ③

جسدِ اطہر پر ایک کمبل تھا جسے آپ ﷺ بخار کی شدت میں کبھی چہرے پر ڈال لیتے کبھی ہٹا دیتے۔ اسی دوران آپ ﷺ نے اچانک فرمایا:

''یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو۔ انہوں نے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔'' ④

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''حضور ﷺ کو خدشہ تھا کہ کہیں ان کی قبر پر بھی سجدے نہ کیے جانے لگیں۔ (اس خطرے کے باعث یہ ارشاد فرمایا۔) اگر یہ خدشہ نہ ہوتا تو آپ کی قبرِ اطہر بھی ظاہر کی جاتی۔ (مگر مسلمانوں کو شرک کے امکان سے بچانے کے لیے مکان کے اندر تدفین ہوئی اور قبر تک رسائی کا راستہ بند کردیا گیا۔) ⑤

☆☆☆

---

① طبقات ابن سعد: ۲/۱۹۰

② مسند احمد، ح: ۲۴۵۶۰ باسناد صحیح

③ طبقات ابن سعد: ۲/۲۳۷

④ صحیح البخاری، ح: ۴۳۵، کتاب الصلوۃ، باب الصلوۃ فی البیعۃ

⑤ صحیح البخاری، ح: ۴۴۴۱، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ

حیاتِ مبارکہ کا آخری دن ...... یومِ رحلت

یہ پیر کا دن تھا۔[1] ربیع الاوّل کی ۱۲ تاریخ۔ حیاتِ مبارکہ کا آخری یوم۔[2]

فجر کی اذان کے وقت حضور ﷺ کی طبیعت بہتر معلوم ہو رہی تھی۔ جب جماعت کھڑی ہوئی تو آپ ﷺ نے حجرے کا پردہ اُٹھایا۔ عمر بھر کی محنت کا حاصل آپ کے سامنے تھا۔ صحابہ کرام صف بستہ، ہاتھ باندھے بارگاہِ الٰہی میں باادب کھڑے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ منظر اتنا دلکش تھا کہ چہرۂ انور خوشی سے تمتمانے لگا۔ آپ ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہونے پر خوش تھے کہ اسلام کی وارث ایک اُمّت تیار ہو چکی ہے جو تاقیامت اللہ کا پیغام عام کرنے اور بندوں کو بندگی سکھانے کے لیے مستعد ہے۔ آپ ﷺ ایک ایسی جماعت چھوڑے جا رہے تھے جو ہر حال میں دعوتِ اسلام اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پوری طرح کمربستہ تھی۔

---

① صحیح البخاری، ح: ۱۳۸۷، کتاب الجنائز، باب موت یوم الاثنین

② وفات کے بارے میں مشہور قول بارہ ربیع الاوّل کا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے: "ولد رسول اللہ ﷺ عام الفیل یوم الاثنین، الثانی عشر من ربیع الاول، وفیه بعث، وفیه عرج به الی السماء، وفیه هاجر، وفیه مات." (البدایة والنهایة: ۳/۳۷۵) اگرچہ ابن کثیرؒ نے اس کی سند کو منقطع کہا ہے مگر اس کے الفاظ "فیه هاجر وفیه مات" کو دیکھتے ہوئے جمہور سیرت نگاروں نے بارہ ربیع الاوّل ہی کو یوم وفات مانا ہے۔

اس قول پر ایک نہایت مشہور اشکال ہے، وہ یہ کہ صحیح روایات کے مطابق وفات کا دن پیر تھا۔ اور اس سے قبل یوم عرفہ (۹ ذوالحجہ) صحیح روایات کے مطابق بروز جمعہ ادا ہوا تھا۔ پس تقویمی حساب کے اعتبار سے بارہ ربیع الاوّل کسی بھی طرح نہیں ہو سکتی۔ اگر ذوالحجہ، محرم اور صفر کو تیس تیس دن کا مانا جائے تو ربیع الاوّل میں پہلا پیر "۶" کو اور دوسرا "۱۳" تاریخ کو ہوگا۔ اگر تینوں مہینوں کو ۲۹، ۲۹ دن کا تصور کیا جائے تو ربیع الاوّل کا پہلا پیر "۲" کو، دوسرا "۹" کو اور تیسرا "۱۶" کو ہوگا۔ اگر دو مہینے تیس اور ایک ۲۹ کا مانا جائے تو پہلا پیر "۷" اور دوسرا "۱۴" کو ہوگا۔ اگر دو مہینے ۲۹ کے اور ایک تیس کا سمجھا جائے تو پہلا پیر یکم کو، دوسرا "۸" اور تیسرا "۱۵" کو ماننا پڑے گا۔ غرض کسی بھی لحاظ سے پیر کو ۱۲ تاریخ نہیں آ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات نے دو ربیع الاوّل کو راجح قرار دیا ہے۔ قاضی سلیمان منصور پوری مرحوم نے ۱۳ ربیع الاوّل کو تاریخ وفات قرار دیا ہے۔ بعض حضرات نے تاریخ ولادت (۹ ربیع الاوّل) کی مناسبت سے تاریخ وفات کے بارے میں بھی ۹ کو بہتر سمجھا ہے۔ مگر چونکہ "۱۳" یا "۹" کا امکان تبھی ہے جب ذوالحجہ، محرم اور صفر تینوں مہینے ۳۰ کے یا تینوں ۲۹ کے ہوں اور ایسا کم ہوتا ہے، اس لیے بعض حضرات نے ۸ ربیع الاوّل کے قول کو لے لیا ہے۔

بہرحال یہ سارے عقلی امکانات ہیں۔ ۱۲ ربیع الاوّل کے قولِ جمہور کے خلاف یہ عقلی امکانات اسی وقت لیے جا سکتے ہیں جب مذکورہ اشکال کا کوئی جواب نہ ملے۔ حالانکہ اس کا ایک قوی جواب موجود ہے جسے حافظ ابن کثیر نے ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

"ولقد حصل له جواب صحیح فی غایة الصحة ولله الحمد، افردته مع غیره من الاجوبة. وهو ان هذا انما وقع بحسب اختلاف رؤیة هلال ذی الحجة فی مکة والمدینة فرآه اهل مکة قبل اولئک بیوم، وعلیٰ هذا یتم القول المشهور."

"الحمدللہ! اس کا ایک صحیح جواب موجود ہے جو نہایت صحیح ہے، دیگر جوابات کے ساتھ اسے ذکر کرنے میں میں منفرد ہوں۔ وہ یہ کہ یہ مسئلہ مکہ اور مدینہ میں ذوالحجہ کا چاند دیکھنے کے اختلاف سے پیدا ہوا۔ اہل مکہ نے اہلِ مدینہ سے ایک دن پہلے چاند دیکھ لیا۔ اس بنیاد پر قولِ مشہور ثابت ہو جاتا ہے۔" (الفصول فی السیرة، ص ۲۴۰)

حافظ ابنِ کثیر کی اس توجیہ پر کوئی اشکال پیدا نہیں ہو رہا، اس لیے یوم وفات بارہ ربیع الاوّل ہی راجح لگتا ہے جو مدنی چاند کے مطابق ہے۔

زیادہ سے زیادہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس طرح مدینہ میں چار ماہ مسلسل ۳۰ دن کے ہوئے تھے مگر یہ ناممکن نہیں۔ رؤیتِ ہلال کمیٹی پاکستان کے فیصلے کے مطابق ذوالقعدہ، ذوالحجہ ۱۴۰۸ھ اور محرم، صفر ۱۴۰۹ھ کے چار چاند مسلسل تیس دن کے ہوئے تھے۔ اس کے سات سال بعد ذوالحجہ ۱۴۱۵ھ اور پھر محرم، صفر اور ربیع الاوّل ۱۴۱۶ھ کے چار چاند مسلسل تیس دن کے ہوئے۔ پس تیس دن کے چار چاندوں کا وقوع نادر تو ہے ناممکن نہیں۔

صحابہ کو احساس ہوگیا کہ حضور ﷺ پردہ اُٹھا کر ان کی طرف متوجہ ہیں۔ آپ ﷺ دو دن سے مسجد نبوی میں تشریف نہیں لائے تھے۔ سوائے ان اکابر صحابہ کے جو روزانہ گھر میں حاضر ہوا کرتے تھے، اکثر جانثاروں نے دو دن سے آپ ﷺ کی زیارت نہیں کی تھی۔ آپ ﷺ کو متوجہ پا کر سب کے رگ و پے میں سرور کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ پلٹ کر آپ کی زیارت کے لیے بے تاب ہونے لگے مگر آپ ﷺ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں نماز مکمل کرنے کا حکم دیا اور چند لمحوں تک اپنے پروانوں پر الوداعی نگاہ ڈالنے کے بعد حجرہ شریف کا پردہ گرا لیا۔[1]

صبح سویرے حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کی حالت بہتر دیکھ کر انہیں تسلی ہوئی، باہر نکلے تو صحابہ کرام آپ ﷺ کی خیر خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے۔

ان کے دریافت کرنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''الحمد للہ! حضور ﷺ اب ٹھیک ہیں۔''

صحابہ کرام مطمئن ہو کر اپنے معمول کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔[2]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کچھ دیر کے لئے آپ ﷺ سے اجازت لے کر مدینہ کے مضافاتی گاؤں ''سُنح'' میں اپنی دوسری اہلیہ کے گھر تشریف لے گئے۔[3] پیچھے رسول اللہ ﷺ کی طبیعت پھر ناساز ہوگئی۔ بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ سہ پہر کے وقت پورے مدینہ منورہ پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ رحمت دو عالم ﷺ پر غشی کی حالت طاری تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کا سر مبارک گود میں رکھ کر آپ کو سہارا دیا ہوا تھا، آس پاس اس وقت صرف اہل خانہ ہی تھے، اس دوران پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا:

اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ وَالصَّالِحِیْنَ

(ان لوگوں کے ساتھ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا: انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین۔)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ سنا تو سمجھ گئیں کہ آپ ﷺ سے دنیا میں رہنے یا آخرت کا سفر اختیار کرنے کی بابت پوچھا جا رہا ہے اور آپ ﷺ نے رحلت کو پسند کر لیا ہے۔[4]

آخری وصیت: نماز کا اہتمام اور کمزوروں پر رحم:

اب جان کنی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ آخری لمحات میں رسول اللہ ﷺ آہستہ آہستہ یہ فرما رہے تھے:

"اَلصَّلٰوۃَ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ"

''نماز کا اہتمام کرنا۔ ماتحتوں اور کمزوروں کا خیال رکھنا۔''

آپ ﷺ یہ الفاظ دُہراتے رہے، یہاں تک کہ آواز پست ہوتی چلی گئی۔ صرف ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے تھے۔[5]

① صحیح البخاری، ح:۴۴۴۸، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ

② صحیح البخاری، ح:۴۴۴۷؛ السیرۃ الحلبیۃ: ۳/۴۸۵ ③ السیرۃ الحلبیۃ: ۳/۴۹۵؛ صحیح البخاری، ح:۴۴۵۲

④ صحیح البخاری، ح:۴۵۸۶، کتاب التفسیر؛ صحیح مسلم، ح:۶۲۲۸

⑤ السیرۃ النبویۃ لابن کثیر: ۴/۴۷۳؛ دلائل النبوۃ للبیہقی: ۷/۲۰۵

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ کر آپ ﷺ پر دم کرنے لگیں۔ اس دوران حضور نبی اکرم ﷺ نے آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا: "فِي الرَّفِيقِ الاَعْلٰى، فِي الرَّفِيقِ الاَعْلٰى"
(سب سے عالی شان رفیق کے پاس، سب سے عالی شان رفیق کے پاس)

اتنے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ پیلو کی تازہ شاخ ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوئے۔ نبی اکرم ﷺ کی نگاہ ادھر جم گئی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور اقدس ﷺ کا مطلب سمجھ گئیں۔ بھائی سے شاخ لے کر اسے صاف اور نرم کیا اور مسواک تیار کر کے آپ ﷺ کو پیش کی۔ آپ ﷺ نے اپنے معمول کے مطابق اچھی طرح مسواک فرمائی مگر جب واپس فرمانے لگے تو مسواک آپ کے ہاتھ سے گر گئی۔ [1]

رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا سہارا لے کر نیم دراز تھے۔ آپ کے سامنے پانی کا پیالہ رکھا تھا، آپ لیٹے لیٹے بار بار اس میں ہاتھ بھگو کر چہرۂ انور پر پھیرتے اور فرماتے:

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه . اِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَات . اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى سَكَرَاتِ الْمَوْتِ"

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، بے شک موت کی سختی برحق ہے۔ اے اللہ! موت کی سختی میں میری مدد فرما۔" [2]

اپنے والد ماجد کی تکلیف دیکھ کر حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا بے ساختہ سسک اٹھیں:

"وَا كَرْبَ اَبَاهُ" (ہائے! میرے ابا کی تکلیف۔)

رحمت عالم ﷺ نے لاڈلی بیٹی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے فرمایا:

"بیٹی! آج کے بعد تیرے ابا کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔" [3]

اسی حالت میں آپ ﷺ پر ایک لمحے کے لیے غشی طاری ہوئی، دستِ مبارک پانی کے پیالے میں ایک طرف ڈھلک گیا پھر ہوش آیا، آپ ﷺ نے دولت کدے کی چھت کی طرف نگاہ اٹھائی، ہاتھ سے اوپر کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا:

"اَللّٰهُمَّ الرَّفِيقَ الاَعْلٰى" (اے اللہ! اے سب سے عالی مرتبت رفیق!)

پھر ہاتھ سے اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے رہے:

"فِي الرَّفِيقِ الْاَعْلٰى، فِي الرَّفِيقِ الْاَعْلٰى"

یہ کہتے کہتے دستِ مبارک ایک طرف ڈھلک گیا۔ روحِ مبارک عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔ [4]

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

عمرِ مبارک مشہور قول کے مطابق ۶۳ سال تھی۔ [5] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ۶۵ سال کا قول بھی منقول ہے۔ [6]

---

[1] السيرة النبوية لابن كثير: ۴/۴۷۴، ۴۷۵ [2] سنن الترمذی، ح: ۹۷۸
[3] صحیح البخاری، ح: ۴۴۶۲، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ وفاته [4] صحیح البخاری، ح: ۴۴۳۹
[5] صحیح مسلم، ح: ۲۳۴۷، کتاب الفضائل۔ یہ شمسی تقویم کے مطابق ہے۔ ولادت ۸ ربیع الاوّل اور وفات ۱۲ کو مانی جائے تو ۶۳ سال چار دن ہوں گے۔
[6] صحیح مسلم، ح: ۲۳۴۸، کتاب الفضائل، خالص قمری تقویم کے مطابق عمر مبارک ۶۵ برس بنتی ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین صدمے سے بے حال:

حضور ﷺ پر نزع کا عالم دیکھ کر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اور سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے اپنے والد محترم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بلوا لیا تھا مگر اُن کے پہنچنے سے پہلے حضور ﷺ دارِ فانی سے پردہ فرما چکے تھے۔ ①

حضورِ اکرم ﷺ کی وفات کی اطلاع سن کر صحابہ کرام پر بجلی گر پڑی۔ کسی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ جب سے یہ دنیا بنی تھی کسی نے کسی سے ایسی محبت نہیں کی تھی، جیسی صحابہ کرام نے اپنے آقا و مولا سے۔ وہ یہ فراق کیسے برداشت کر پاتے۔ سہ پہر کا وقت تھا مگر شدتِ غم سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مدینہ منورہ پر تاریکی کے پرت لپیٹ دیے گئے ہوں۔ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ ②

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بے اختیار فرما رہی تھیں:

"يَا اَبَتَاهُ! اَجَابَ رَبًّا دَعَاهُ. يَا اَبَتَاهُ! مَنْ جَنَّةُ الْفِرْدَوْسِ مَأْوَاهُ. يَا اَبَتَاهُ! اِلٰى جِبْرِيْلَ نَنْعَاهُ."

''ہائے میرے ابا جی! آپ نے داعی اجل کی پکار پر لبیک کہہ دیا۔ ہائے میرے ابا جن کا مسکن جنت الفردوس ہے۔ ہائے ابا جی! ہم جبرئیل کو آپ کی وفات کا دکھڑا سناتے ہیں۔'' ③

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی یہ حالت تھی کہ جیسے گویائی و سماعت سلب ہوگئی ہو، حضرت علی رضی اللہ عنہ بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے تھے۔ ④ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سانحے پر حواس کھو بیٹھے اور ماننے سے انکار کر دیا کہ حضورِ اکرم ﷺ کی رحلت ہوگئی ہے۔ منافقین کو اس سانحے پر خوش ہوتا اور سر اُٹھاتا دیکھ کر ان پر حالتِ غضب طاری تھی۔ ⑤

اِس کٹھن وقت میں حضورِ اکرم ﷺ کے راز دار اور رفیقِ خاص سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی خود پر قابو پائے ہوئے تھے۔ آقائے نامدار ﷺ کی وفات کی خبر سنتے ہی وہ گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ''سُنح'' سے مدینہ پہنچے، حجرے میں داخل ہوئے۔ جسدِ اقدس چادر سے ڈھانک دیا گیا تھا۔ انہوں نے چادر کھول کر پیشانی مبارک پر بوسہ دیا اور روتے ہوئے فرمایا: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ کی زندگی بھی بہترین تھی اور وفات بھی بہترین۔'' ⑥

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اب مسجد میں آئے، دیکھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کے درمیان کھڑے نہایت جوش سے کہہ رہے ہیں: ''کچھ منافق قسم کے آدمی افواہیں پھیلا رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی۔ اللہ کی قسم! آپ زندہ ہیں۔ اپنے رب سے ملنے گئے ہیں، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام گئے تھے۔ بہت جلد وہ لوٹ آئیں گے اور اُن کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیں گے جو حضور ﷺ کی وفات کی خبریں پھیلا رہے ہیں۔'' ⑦

① السيرة الحلبية: ۳/۴۹۹، ط العلمية. اس دن عیسوی تاریخ ۹ جون ۶۳۲ء تھی۔ ② مسند احمد، ح: ۱۲۲۳۴
③ صحيح البخاری، ح: ۴۴۶۲، باب مرض النبی ﷺ ووفاته
④ طبقات ابن سعد: ۲/۳۱۲، ط دار صادر ؛ السيرة الحلبية: ۳/۵۰۰، ط العلمية
⑤ مصنف ابن ابی شيبة، ح: ۳۷۰۲۱ باسناد صحيح
⑥ صحيح البخاری، ح: ۴۴۵۲، كتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاته ؛ مصنف ابن ابی شيبة، ح: ۳۷۰۲۱ باسناد صحيح
⑦ صحيح البخاری، ح: ۳۶۶۷، ۳۶۶۸، كتاب المناقب، باب لو كنت متخذا خليلا

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تاریخ ساز خطبہ:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خاموش کرایا اور صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''لوگو! جو کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو جان لے کہ وہ وفات پا گئے ہیں اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ تسلی رکھے کہ اللہ زندہ ہے، ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔'' پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رسول ہی تو ہیں (خدا تو نہیں) ان سے پہلے بھی تو کتنے رسول دنیا سے جا چکے ہیں، پس اگر وہ فوت ہو جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم دین سے منحرف ہو جاؤ گے؟ اور جو انحراف کرے گا وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو بدلہ دے گا۔''

یہ آیات غزوۂ اُحد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی جھوٹی افواہ پھیل جانے پر صحابہ کرام کی تسلی کے لیے نازل ہوئی تھیں مگر آج جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں دہرایا تو صحابہ کرام کو ایسا لگا کہ ان کا اس سے زیادہ موزوں موقع کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا کہ یہ آیات ابھی آسمان سے نازل ہو رہی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جوں جوں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حقیقت پسندانہ خطاب سنتے گئے، اُن کا جوش، غم واندوہ میں تبدیل ہوتا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کا یقین ہوتے ہی اُن کے قدم ساتھ نہ دے سکے، وہ اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ [1]

☆☆☆

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۴۴۵۴

اُمت کی قیادت سنبھالنے کا سوال

اِس وقت ہر شخص بے حد غم زدہ اور مضطرب ہو کر یہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟ قدرتی طور پر یہ سوال ذہنوں پر دستک دے رہا تھا کہ اَب اُمت کی کشتی کا ملاح کون ہوگا؟ پیش آمدہ معاملات کس سے پوچھ کر طے کیے جائیں گے؟ مسائل کے حل کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ دینی وشرعی امور میں مسلمان کس سے رہنمائی لیا کریں گے؟ صحابہ منصب و اقتدار کے حریص نہ تھے مگر یہ سوال ضرور ذہنوں میں اُبھر رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا نائب کون ہوگا؟

رسول اللہ ﷺ کے آخری لمحات تک حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو اپنے خاندانی قرب کی وجہ سے کسی حد تک گمان تھا کہ آپ ﷺ شاید ان کے لیے حکومت کی وصیت فرمائیں۔ ان کا خیال تھا کہ شاید پیغمبر ﷺ کی جانشینی میں نسبی قرابت کی اہمیت بھی ملحوظ ہو۔ یہ دونوں حضرات پوری نیک نیتی سے یہ سمجھتے تھے کہ اگر خلیفہ اہلِ بیت میں سے ہوا تو مسلمانوں کا اتفاق واتحاد زیادہ پائیدار ہوگا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کی وفات سے کچھ پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ حضور ﷺ سے جا کر پوچھ لیں کہ خلافت کس کے لیے طے ہوگی، ہم اہلِ بیت کے لیے یا دوسروں کے لیے؟ اگر ہمارے لیے طے ہو تو ہمیں اطمینان ہو جائے گا، اور اگر آپ ﷺ اسے دوسروں کے لیے طے کرنا چاہتے ہوں تو ہم انہیں مشورہ دیں گے کہ وہ یہ ذمہ داری ہمیں سونپ کر جائیں۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس معاملے میں کچھ پوچھنے سے معذرت کر لی اور فرمایا: ''اگر ہم حضور اکرم ﷺ سے اس بارے میں پوچھیں اور آپ ﷺ منع فرما دیں تو بعد میں لوگ ہمیں کبھی بھی اقتدار نہیں دیں گے۔ اس لیے اللہ کی قسم! میں رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ کون جانتا ہوگا کہ حضور ﷺ اپنے گھر والوں کو قربانیوں میں آگے اور مناصب میں پیچھے رکھنے کے عادی تھے، لہٰذا ڈر تھا کہ خود قیادت مانگنے پر آپ ﷺ خفا نہ ہو جائیں۔ یہی اندیشہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو تھا، ورنہ وہ تو رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے۔ اگر انہیں کوئی خدشہ نہ ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کہنے کی بجائے وہ خود رسول اللہ ﷺ سے یہ درخواست کر سکتے تھے۔ دراصل اہلِ بیت کو اقتدار ملنا محض ان حضرات کا طبعی میلان اور ایک وقتی رائے تھی جسے وہ مناسب اور مسلمانوں کی فلاح کے لیے اہم سمجھ رہے تھے، مگر جب رسول اللہ ﷺ ایسی کوئی وصیت کیے بغیر چلے گئے تو ان عاشقانِ رسالت نے بھی رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے اُمت کی مصلحت اسی میں سمجھی کہ مسلمانوں کو سیاسی قیادت کا آزادانہ فیصلہ خود کرنے دیا جائے۔ یہی وجہ ہے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد خلافت کے دعوے کے بارے میں ایک لفظ تک منہ سے نہیں نکالا۔

[1] صحیح البخاری، ح: ۴۴۴۷، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاته

ہاں! انصار اس معاملے میں پہل کرنے لگے تھے، اور سقیفۂ بنی ساعدہ میں ان سے ایک لغزش ہونے لگی تھی۔

پیر کی شام: سقیفۂ بنی ساعدہ میں کیا ہوا؟

اس وقت اسلام کا سیاسی و مذہبی مرکز مدینہ منورہ تھا جس کے مسلمان دو حصوں میں تقسیم تھے: مہاجرین اور انصار۔ مہاجر کم تھے اور انصار زیادہ۔ پھر انصار میں دو قبیلے تھے: اَوس اور خزرج۔ اَوس کم تھے اور خزرج زیادہ۔ خزرج کے لوگ اس وقت کسی خاص منصوبے کے یا پیش بندی کے بغیر اپنے سردار سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کے گھر کے پاس بنے چبوترے پر جمع تھے۔ اسے ''سقیفۂ بنی ساعدہ'' کہا جاتا تھا، یہاں جمع ہونا خزرج والوں کا معمول تھا۔ اس دوران اگر اُن کے ذہنوں میں یہ بات آرہی تھی کہ مسلمانوں کا اگلا قائد خزرج سے ہو تو یہ ایک فطری بات تھی؛ کیوں کہ ماضی میں عربوں کے ہاں اقتدار کا انحصار افرادی قوت پر ہوتا تھا اور یہ حقیقت تھی کہ مدینہ میں خزرج کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ چنانچہ یہ خیال ذہنوں سے زبانوں پر منتقل ہوگیا اور بعض لوگ کہنے لگے: ''اب خزرج کے سردار سعد بن عُبادہ کو امیر بننا چاہیے۔''

ایک انصاری نے بات کو بڑھاتے ہوئے کہا: ''اور اگر مہاجرین نے اس سے اتفاق نہ کیا تو ہم کہیں گے: ایک ہمارا امیر ہونا چاہیے اور ایک تمہارا۔'' یہ ایک ایسا خیال تھا جو اُمت کی وحدت کو فوری طور پر دو حصوں میں بانٹ سکتا تھا، اسی لیے خود خزرج کے سردار حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس سے تو عدمِ استحکام کی ابتدا ہوگی۔''[1]

سقیفۂ بنی ساعدہ میں ہونے والی اس گفتگو کی اطلاع حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ملی جو ابھی تک مسجد نبوی میں تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر افتراق کے اس شگاف کو فوری طور پر بند نہ کیا گیا تو اُمت کی تقسیم در تقسیم کا عمل شروع ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ ان کے سامنے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات بھی تھے جن میں حکومت وسیادت کی ذمہ داری قریش پر ڈالی جانے کے واضح اشارات تھے اِس لیے انہوں نے ضروری سمجھا کہ انتقالِ اقتدار کے متعلق لوگوں کے شبہات کو فوراً دور کر کے انہیں آمادہ کیا جائے کہ وہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبیلے کے کسی بہتر شخص کو امیر چن لیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما کو ساتھ لے کر تیزی سے ''سقیفۂ بنی ساعدہ'' پہنچے۔

وہاں پہلے انصار کے ایک نمائندے نے اپنی تقریر میں انصار کے فضائل اور کارنامے بیان کیے۔ اس کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے اپنے ذہن میں ایک تقریر تیار کر لی تھی مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں بولنے سے منع کر دیا اور خود موقع کی مناسبت سے نہایت موزوں گفتگو فرمائی۔[2]

یہ ایک کھلی مشاورت تھی جس میں صحابہ کرام پوری وسعت ظرفی سے ایک دوسرے کی بات سن رہے تھے اور اپنے خیالات کو کسی روک ٹوک اور دباؤ کا سامنا کیے بغیر ظاہر کر رہے تھے، سب کا مقصد ایک تھا اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم موجودگی میں مسلمانوں کی مرکزیت متاثر نہ ہونے پائے اور ایک مستحکم سیاسی نظام تشکیل پائے۔ اس مجلس مشاورت

[1] تاریخ الطبری: ۲/۴۵۵

[2] صحیح البخاری، ح: ۳۶۶۸، کتاب المناقب، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو کنت متخذا خلیلاً

کو جو حضور ﷺ کے بعد پہلی بڑی مشاورت تھی، مسلمانوں میں شورائیت کا اہم سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ارشاداتِ نبوی کی روشنی میں قریش کی قیادت کو ضروری سمجھتے تھے۔ جبکہ انصار میں سے کسی کو امیر بنانے پر خود انصار بھی متفق نہ ہوتے۔ اَوس والوں کو امیر بنایا جاتا تو خزرج والے ناراض ہوتے، خزرج والوں کو بنایا جاتا تو اَوس والے مطمئن نہ ہوتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسلام کی ابتداء سے بات شروع کرتے ہوئے فرمایا:

''اللہ نے محمد ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق دے کر مبعوث کیا، پس اللہ نے ہمارے دلوں اور پیشانیوں کو تھام کر ہمیں ان کی دعوت قبول کرنے کی سعادت بخشی۔''①

آپ نے انصار کی قومی ودینی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا اور فرمایا:

''آپ ان تمام فضائل کے بجا طور پر حق دار ہیں، جن کا آپ نے ذکر کیا ہے۔''②

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انصار کے فضائل کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث نہ چھوڑی اور ان سے حضورِ اکرم ﷺ کے دِلی تعلق کا اعتراف کرتے ہوئے یہ ارشادِ نبوی دہرایا:

''اگر لوگ ایک راستے پر چلیں اور انصار دوسرے راستے پر تو میں انصار کی راہ پر چلوں گا۔''③

لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے لوگوں کو یہ بھی یاد دلایا کہ اس وقت قیادت قریش کو سونپنے میں خیر ہے۔ آپ نے فرمایا:

''ہم مہاجرین لوگوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے ہیں، ہم رسول اللہ ﷺ کے قرابت دار ہیں۔④ اللہ کی قسم! ہم آپ لوگوں کی فضیلت، اسلام کے لیے آپ حضرات کے کارناموں اور اپنے اوپر عائد آپ کے حقوق کا انکار نہیں کرتے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ یہ قریش کا قبیلہ عرب میں ایسی قدر و منزلت کا حامل ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں۔ عرب قبائل قریشی آدمی کے سوا کسی شخص پر متفق نہیں ہوں گے۔ آپ اللہ سے ڈریں اور اسلام کو پارہ پارہ نہ کریں، اسلام میں سب سے پہلے رخنہ ڈالنے والے نہ بنیں۔''⑤

پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسئلے کا حل پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''امراء ہمارے ہوں اور وزراء آپ کے۔''⑥

مگر ایک انصاری سردار حُباب بن مُنذر رضی اللہ عنہ بولے: ''یوں کر لیا جائے کہ ایک امیر ہمارا ہو۔ ایک تمہارا۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نہیں! وزارت تمہاری قیادت ہماری؛ کیوں کہ قریش سب سے معزز سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں اور حسب ونسب میں بھی سب سے اعلیٰ ہیں۔''⑦

① السنن الكبرى للبيهقي، ح:١٩٢٣، ط دار الكتب العلمية
② مسند احمد، ح:٣٩١
③ مسند احمد، ح:١٨
④ السنن الكبرى للبيهقي، ح:١٩٢٣
⑤ مصنف ابن ابی شیبة، ح:٣٧٠٤٣، ط الرشد
⑥ صحيح البخاري، ح:٣٦٦٨، كتاب المناقب، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم لو كنت متخذا خليلاً
⑦ صحيح البخاري، ح:٣٦٦٨، كتاب المناقب، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم لو كنت متخذا خليلاً

دراصل دو حکمرانوں کی تجویز پر عمل کرنا اسلامی ریاست کو ابتداء ہی سے سبوتاژ کرنے کے مترادف تھا؛ کیوں کہ یہ ندرتی بات ہے کہ ایک سلطنت میں دو بادشاہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ نیز عرب کے لوگ بھی اس بات کو قبول نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا سردار پیغمبر ﷺ کے قبیلے کے سوا کسی اور قبیلے کا ہو۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس خیال کو مسترد کرتے ہوئے فرمایا: ''ایک نیام میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتیں۔''[1]

اس دوران حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے موقف پر دلیل پیش کرتے ہوئے حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''اے سعد! آپ جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے آپ کی موجودگی میں فرمایا تھا: قیادت کے ذمہ دار قریش ہیں، اچھے لوگ ان کے اچھوں کے پیچھے چلتے ہیں اور بُرے لوگ ان کے بُروں کی اتباع کرتے ہیں۔''

سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کو حدیث یاد آ گئی، وہ بلا پس و پیش بولے: ''آپ نے ٹھیک کہا۔ ہم وزیر اور آپ امیر۔''[2]

تب انصار میں سے بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور اپنی قوم کو مخاطب کر کے ولولہ انگیز لہجے میں گویا ہوئے:

''اے انصار! بلاشبہ ہم مشرکین سے جہاد میں پیش پیش رہے مگر اس سے ہمارا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا پانا اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنا رہا ہے۔ ہمیں زیب نہیں دیتا کہ اپنی دینی خدمات کے بدلے کسی منصب کے حصول کی کوشش کریں یا دنیا کے طلب گار بنیں، بلاشبہ محمد ﷺ قریش سے تھے اور اُن کا قبیلہ اُن کا جانشین بننے کا زیادہ حق دار ہے۔''[3]

ایک اور انصاری نے پکار کر کہا: ''بھائیو! حضور ﷺ مہاجرین میں سے تھے۔ ان کا نائب بھی مہاجرین میں سے ہونا چاہیے۔ ہم حضور ﷺ کے مددگار تھے۔ ان کے نائب کے بھی مددگار رہیں گے۔''[4]

انصار نے ان کی پکار پر لبیک کہا۔ انصار کے بخوشی دستبردار ہو جانے کے بعد خلافت کا مسئلہ حل کرنا اتنا کٹھن نہیں رہا تھا۔ دو باتوں پر سب کا اتفاق ہو گیا تھا: ایک یہ کہ امیر ایک ہی ہو گا۔ دوسرے یہ کہ اس کا تقرر قریش ہی سے ہو گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مناسب سمجھا کہ اب اگلے مسئلے یعنی امیر کے چناؤ کو بھی اس مجلس میں طے کر لیا جائے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: ''تو بہتر ہے کہ تم لوگ عمر یا ابوعبیدہ کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔''[5]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی شان اس سے ظاہر تھی کہ حضور ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا:

''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔''[6]

---

① مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۵۸، ط المجلس العلمی پاکستان

② مسند احمد، ح: ۱۸ ③ تاریخ الطبری: ۲۲۱/۳

④ البدایۃ والنہایۃ: ۹۰/۸؛ تاریخ دِمَشق لابن عساکر: ۲۷۷/۳۰ عن بیہقی

⑤ صحیح البخاری، ح: ۳۶۶۸۔ دراصل اس وقت عشرۂ مبشرہ میں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا یہی دو حضرات موقع پر موجود تھے اس لیے ان کا نام لیا گیا۔ پس یہ مطلب نہ لیا جائے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فضیلت حاصل تھی۔ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما باقی عشرہ مبشرہ سے افضل تھے جیسا کہ متعدد احادیث سے واضح ہے جو کتب حدیث میں ''مناقب'' اور ''فضائل'' کے عنوانات کے تحت دیکھی جا سکتی ہیں۔

⑥ سنن الترمذی، ح: ۳۶۸۶؛ مسند احمد، ح: ۱۷۴۰۵

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ بھی عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور اُن کی امانت اور قائدانہ صلاحیت کی وجہ سے انہیں دربارِ نبوت سے ''امین الامت'' کا خطاب ملا تھا، مگر سب کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے کہیں بڑھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خود بھی کہاں گوارا تھا کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں بڑے بنیں۔ انہوں نے لوگوں کو پکار کر کہا: ''تم جانتے ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کو نماز کے لیے آگے کیا تھا اور انہوں نے سب کو نماز پڑھائی تھی۔'' سب نے کہا: ''ہاں بالکل''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تو تم میں سے کون ہے جو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے آگے بڑھنا چاہتا ہے؟''

سب نے کہا: ''اللہ معاف کرے۔ ہم میں سے کسی کو یہ اچھا نہیں لگے گا۔''[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہوگئی:

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: ''ہم سب آپ ہی کے ہاتھ پر بیعت کریں گے، آپ ہمارے بزرگ، بہترین انسان اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے دوست ہیں۔''[2]

اِدھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بازو پکڑ کر انہیں بیعت لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھانے پر آمادہ کیا، اُدھر بشیر بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ لپک کر آئے اور سب سے پہلے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کی اور وفاداری کا عہد کیا۔ اس کے بعد سب ہی ٹوٹ پڑے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اس نمائندہ اجلاس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اتفاق ہوگیا۔[3]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیعت کیوں لی؟

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خود حکومت کے طلب گار نہیں تھے مگر اس موقع پر انہیں خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ یہ ذمہ داری خود نہیں سنبھالیں گے تو لوگوں میں انتشار پھیل جائے گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''وَتَخَوَّفْتُ اَنْ تَكُوْنَ فِتْنَةٌ بَعْدَهَا رِدَّةٌ.''

''مجھے خوف محسوس ہوا کہ کوئی ایسا فتنہ رونما نہ ہو جائے کہ لوگ بکھر جائیں۔''[4]

---

① الشريعة للامام الآجرى، ح: ۱۱۹۸، ط دار الوطن ؛ السنن الكبرى للنسائى، ح: ۸۵۵ ؛ مسند احمد، ح: ۱۳۳، اسناده حسن

② صحيح البخارى، ح: ۳۶۶۸، كتاب المناقب، باب قول النبى صلى الله عليه وسلم لو كنت متخذا خليلاً

③ مصنف ابن ابى شيبة، ح: ۳۷۰۴۳، ط الرشد ؛ تاريخ الطبرى: ۲۲۱/۳ ④ مسند احمد، ح: ۴۲ بسند صحيح

یاد رہے کہ مشاورت، بحث اور بیعت کی یہ مجلس (جو مغرب اور عشاء کے درمیان ہوئی) آدھے پونے گھنٹے سے زیادہ طویل نہیں تھی۔ مگر داستان طراز راویوں نے اس مجلس کے حوالے سے صحابہ کرام کی باہم تلخ کلامی اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی بیعت سے روگردانی پر کئی صفحے سیاہ کیے ہیں۔ حالانکہ اس مختصر وقت میں اتنی لمبی چوڑی باتوں کا امکان ہی نہ تھا۔ ہم نے یہاں تاریخ کو چھوڑ کر مذکورہ روداد زیادہ تر کتبِ حدیث خصوصاً بخاری اور مسند احمد کی معتبر روایات کے حوالے سے لکھی ہے، صرف دو تین ٹکڑے تاریخ طبری اور البدایہ والنہایہ سے لیے ہیں۔ بخاری کی روایت ''صحیح'' ہے اور مسند احمد کی ''صحیح مرسل'' ہے۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلافت کا مشورہ کھلی بحث کے ساتھ اور فیصلہ خوش گوار ماحول میں ہوا تھا اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے اسی مجلس میں خلافت کا حق قریش کے لیے تسلیم کر لیا تھا۔ اسی لیے ابومخنف جیسے لوگوں کی تاریخی روایات ان مضبوط روایات کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ایسی بے سروپا روایات سے متاثر ہو کر صحابہ کرام کے بارے میں بدگمان ہونا اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

حضور ﷺ کا غسل اور تکفین:

اِس دوران خانۂ اقدس میں حضورِ اکرم ﷺ کے غسل اور تجہیز و تکفین کے اُمور انجام دینے کی تیاری شروع ہوگئی تھی۔ پہلے دن تو رنج وصدمے اور دُکھ کی انتہا کی وجہ سے شمع رسالت کے پروانے ایک سکتے کی سی کیفیت میں تھے، اِس لیے کسی میں اِن اُمور کی انجام دہی کی سکت ہی پیدا نہ ہوسکی۔ بھلا کون تھا جو اپنے محبوب آقا ﷺ کے جسدِ اَطہر کو مٹی تلے دفن کرنے کی ہمت کرتا؟ کون تھا جو اپنے ہاتھوں سے اپنے جینے کی آس کو نظروں سے اُوجھل کرتا؟ اعصاب شل ہو چکے تھے اور ذہنی قوتیں مفلوج لیکن تقریباً چوبیس گھنٹے بعد ہوش وحواس بحال ہوئے اور وہ شدید ترین کیفیت جاتی رہی تو حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ، داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور پھوپھی زاد حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ غسل دینے اور کفن پہنانے کے اُمور میں مشغول ہوگئے۔[1] یہ حضرات حضورِ اقدس ﷺ کے قریبی رشتے دار تھے، اسی لیے یہی آپ ﷺ کی آخری خدمات انجام دینے کے زیادہ حق دار تھے۔

نائبِ رسول کی باقاعدہ بیعت:

سقیفۂ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت اُنہی صحابہ نے کی تھی جو وہاں اتفاق سے پہلے جمع تھے، ان میں زیادہ تر انصاری تھے وہ بھی بنو خزرج کے۔ چونکہ وہاں اتفاقیہ طور پر خلافت کے استحقاق پر بات چل نکلی تھی اس لیے کسی کو مدعو کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے بہت سے صحابہ کرام یہاں تک کہ حضرت علی، حضرت عباس اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم جیسے لوگ بھی اس موقع پر موجود نہ تھے۔ اہل شوریٰ کو باقاعدہ مدعو کرکے مشورہ نہیں ہوا تھا جیسا کہ اسلامی اصولِ سیاست کا تقاضا تھا۔[2] چنانچہ اگلے دن، منگل کو صحابہ کے عام اجتماع میں حضورِ اکرم ﷺ کے نائب اور خلیفہ سے بیعت کا اہتمام کیا گیا۔[3] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہوکر یہ ابتدائی کلمات ارشاد فرمائے:

---

① سیرت ابن ھشام: ۲/ ۶۶۲، ط مصطفی البابی

② اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اضطراری طور پر ہونے والے ایک فیصلے اور شریعت کے مستقل سیاسی اصول کا فرق واضح کرتے ہوئے بعد میں فرمایا کرتے تھے:
"مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ فلاں کہتا ہے کہ: اگر عمر کا انتقال ہوگیا تو میں فلاں سے بیعت کرلوں گا۔ کسی کو اس بات سے دھوکہ نہ ہو کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت بھی اچانک ہونے کے باوجود نافذ ہوگئی تھی۔ بلاشبہ وہ اسی طرح اچانک ہی ہوئی تھی مگر اللہ نے اس کے شر سے بچالیا۔ تم میں سے اب کون ہے جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرح نگاہوں کا محور ہو۔ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو وہ ہمارے بہترین آدمی تھے۔" (صحیح ابن حبان، ح: ۴۱۳، ۴۱۴)
یہ بھی فرمایا: "جو مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی کی بیعت کرے گا تو نہ اس کی پیروی کی جائے گی نہ بیعت کیے جانے والے کی، بلکہ دونوں کو قتل کردیا جائے گا۔" (مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۵۸، ط المجلس العلمی پاکستان)
دراصل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ابتدائی بیعت میں جو سقیفۂ بنی ساعدہ میں ہوئی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بہت بنیادی کردار تھا اور ان کی نگاہِ دوربین نے یہ بھانپ لیا تھا کہ اگر بہت سے اکابر کی غیر حاضری کے باوجود اس معاملے کو ابھی یہیں طے نہ کرلیا گیا تو مسلمان روزِ اوّل ہی سے دو ٹکڑوں میں بٹ کر رہیں گے۔ اس لیے انہوں نے اپنے طور پر فوراً یہ اجتہادی فیصلہ کرلیا کہ چند بڑے نمائندوں کی یہاں موجودگی سب کے قائم مقام ہے اور ان شاء اللہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق باقی سب کی رضا بھی حاصل ہوجائے گی۔ اور الحمدللہ ایسا ہی ہوا۔ یہ اُمت کی خوش قسمتی اور اللہ کی مشیت تھی کہ حضرات شیخین کے وہاں پہنچنے تک انصار نے اپنے کسی سردار سے بیعت نہیں کرلی تھی ورنہ ایک بار بیعت کرکے وہ اسے توڑنے پر بمشکل آمادہ ہوتے؛ کیوں کہ اہل عرب کے ہاں زبانی قول کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اچانک بیعت کے باوجود اُمت کا ان پر اتفاق بلاشبہ ان کی اجماعی افضلیت، عنداللہ مقبولیت، اللہ کی مشیت، اور اس کی تکوینی تائید کی کھلی دلیل ہے۔

③ صحیح البخاری، ح: ۷۲۱۹، کتاب الاحکام، باب الاستخلاف؛ البدایة والنهایة: ۹/ ۴۱۶

”میں تو اُمید کرتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ زندہ رہیں گے حتیٰ کہ ہم سب کے بعد تشریف لے جائیں گے، بہر حال حضور ﷺ دنیا سے رخصت ہو چکے مگر اللہ نے ہمارے درمیان وہ نور باقی رکھا ہے جس سے تم ہدایت لے سکتے ہو۔ یہ وہی نورِ ہدایت ہے جو اللہ نے اپنے نبی کو عنایت کیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے معتمد صحابی ہیں۔ بتاؤ ”اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ“ سے کون دونوں مراد ہیں؟ ”اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ“ کا مصداق اور کون ہے؟ ”لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا“ کن کے متعلق ہے؟ لوگو! یہ ثانی اثنین ہیں۔ یہ مسلمانوں کے امور انجام دینے کے لیے سب سے بہتر ہیں۔ پس آپ کھڑے ہوں اور ان سے بیعت کر لیں۔“[1]

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اصرار کر کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو منبر پر بٹھایا اور لوگوں نے بیعت کی۔ بیعت کا طریقہ وہی تھا جو عربوں میں قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا یعنی ہاتھوں میں ہاتھ دے کر وفاداری کا عہد کیا جاتا تھا۔

حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے بیعت کرنے میں تاخیر کیوں کی؟

تین اہم افراد اس وقت بھی موجود نہ تھے: ایک خزرج کے سردار حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ، دوسرے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، تیسرے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ۔ چونکہ حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ گزشتہ روز خلافت پر قریش کے حق کو تسلیم کر چکے تھے، اس کے علاوہ وہ بیمار بھی تھے، اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں دوبارہ زحمت دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ مگر حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے نہ ہونے سے غلط فہمیاں جنم لے سکتی تھیں، اس لئے آپ رضی اللہ عنہ نے دونوں کے بارے میں خصوصی طور پر پوچھا۔ ان کی عدم موجودگی کی وجہ یہ تھی کہ دونوں بیتِ نبوی میں تجہیز و تکفین میں مشغول تھے، اسی لیے حاضر نہ تھے۔[2]

مگر چونکہ منافق افواہ اڑا سکتے تھے کہ یہ حضرات بیعت سے متفق نہیں، لہٰذا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کی نہ صرف موجودگی ضروری سمجھی بلکہ جب وہ آئے، تو اپنے کسی شبہے کی بناء پر نہیں بلکہ ممکنہ افواہوں کے ازالے کے لیے سب کے سامنے ان سے پوچھا: ”کیا تم مسلمانوں میں انتشار پھیلانا چاہتے ہو؟“

دونوں بولے: ”رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ! ایسی کوئی بات نہیں۔“ یہ کہہ کر دونوں نے بیعت کی۔[3]

دونوں نے یہ بھی کہا: ”ہمیں قلق تو ہوا کہ انتخاب کے مشورے میں ہمیں شریک نہیں کیا گیا مگر ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ ہی سب سے افضل ہیں۔“[4]

---

① صحیح البخاری، ح: ۷۲۱۹، کتاب الاحکام، باب الاستخلاف؛ السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ۱۱۱۵۵

② البدایة والنهایة: ۹/۲۱۶، ۲۱۷

③ السنة لعبد اللہ بن احمد، ح: ۱۲۹۲؛ مستدرک حاکم، ح: ۴۴۵۷؛ السنن الکبریٰ للبیهقی، ح: ۱۶۵۳۸ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی یہ روایت امام مسلم کو دکھائی گئی تو انہوں نے اس کی توثیق کی۔ (السنن الکبریٰ للبیهقی، ح: ۱۶۵۳۹) معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیعت میں چھ ماہ تاخیر کرنے کی روایت قابلِ تاویل ہے۔

④ البدایة والنهایة: ۹/۲۱۷، عن موسیٰ بن عقبة. قال الحافظ ابن کثیر اسناده جید وللّٰہ الحمد ...... چھ ماہ تک بیعت کو مؤخر کرنے کی اگر کوئی دلیل ہے تو وہ امام زہری کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک طویل روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی وفات...... (بقیہ اگلے صفحے پر)

ایک روایت کے مطابق حضرت علی ؓ کو جب بتایا گیا کہ ابوبکر ؓ کے ہاتھ پر بیعت ہو رہی ہے تو وہ اتنی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ) کے چھ ماہ بعد حضرت فاطمہ ؓ کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد حضرت علی ؓ نے حضرت ابوبکر ؓ سے بیعت کرنے کا ارادہ کیا اور انہیں تنہا اپنے ہاں بلوا کر کہا: ''ہم آپ کی فضیلت اور اللہ کے آپ کو بخشے ہوئے مقام سے واقف ہیں۔ ہم اس شرف کی حرص نہیں کرتے جو اللہ نے آپ کو عطا کیا ہے۔ مگر آپ ہمارے مشورے کے بغیر حکمران بن گئے جبکہ ہمارا خیال تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی رشتہ داری کی وجہ سے ہمارا بھی مشورے میں حصہ ہوگا۔'' یہ سن کر حضرت ابوبکر ؓ کے آنسو بہ پڑے اور فرمایا: ''بخدا! رسول اللہ ﷺ کی قرابت مجھے اپنے رشتے نباہنے سے زیادہ عزیز ہے۔'' مزید کچھ گفتگو کے بعد حضرت علی ؓ نے فرمایا: ''میں آپ سے کل ملوں گا۔'' جب (اگلے دن) حضرت ابوبکر ؓ منبر پر تشریف فرما ہوئے تو حمد وثنا کے بعد حضرت علی ؓ کا حال اور بیعت میں ان کی تاخیر کا سبب اور ان کا عذر بیان کیا اور ان کے لیے استغفار کی۔ اس کے بعد حضرت علی ؓ نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابوبکر ؓ کی عظمت بیان کی، پھر فرمایا: ''مجھے ابوبکر ؓ سے حسد نے ایسا کرنے پر آمادہ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی ان فضائل کا منکر ہوں جو اللہ نے انہیں مرحمت کیے ہیں۔ مگر ہمارا خیال تھا کہ ہمارا بھی مشورے میں حصہ ہوگا اور یہ اس کے بغیر ہمارے حاکم بن گئے ہیں۔ پس ہم دل میں خفا ہوئے۔'' (صحیح البخاری، ح: ۴۲۴۰، باب غزوۃ خیبر؛ صحیح مسلم، ح: ۴۶۷۹، کتاب الجہاد)

اسی روایت کو بعض محدثین نے اس اضافے کے ساتھ نقل کیا ہے کہ کسی شخص نے زہری سے پوچھا کہ کیا حضرت علی ؓ نے چھ ماہ تک بیعت نہیں کی تھی؟ انہوں نے کہا: "لا، ولا احد من بنی هاشم حتی بایعه علیّ." (مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۷۴؛ السنن الکبری للبیهقی، ح: ۱۲۷۳۲)

علماء کی ایک جماعت ان روایات کو من وعن قبول کرتے ہوئے یہ رائے رکھتی ہے کہ حضرت علی ؓ نے چھ ماہ بعد بیعت کی تھی، مگر یہ حضرات واضح کرتے ہیں کہ اس کے باوجود حضرت علی ؓ پر کوئی الزام عائد ہو سکتا ہے نہ حضرت ابوبکر ؓ کی بیعت کا انعقاد مشکوک ہوتا ہے۔ امام نووی ؒ لکھتے ہیں:

''جہاں تک حضرت علی ؓ کے بیعت میں تاخیر کرنے کا مسئلہ ہے تو حضرت علی ؓ نے خود اسے مذکورہ روایت میں بیان کر دیا ہے اور حضرت ابوبکر ؓ نے ان کے عذر کو قبول کیا ہے۔ اور اس کے باوجود یہ تاخیر نہ بیعت کو متاثر کرتی ہے نہ حضرت علی ؓ کو۔ بیعت کے متعلق علماء کا اتفاق ہے کہ اس کی صحت کے لیے تمام لوگوں یا تمام اہل حل وعقد کا اجماع شرط نہیں۔ بلکہ علماء، امراء اور عوامی رہنماؤں میں سے جو میسر ہوں ان کا بیعت پر اجماع شرط ہے۔ یہ (بیعت میں تاخیر) حضرت علی ؓ کے مقام کو اس لیے متاثر نہیں کرتی کہ ہر شخص پر یہ واجب نہیں کہ وہ خلیفہ کے پاس جائے اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر بیعت کرے بلکہ واجب صرف یہ ہے کہ جب اہل حل وعقد کسی کی امامت پر متفق ہو جائیں تو اس کی اطاعت کی جائے۔ اختلاف نہ کیا جائے اور اجتماعیت کا ماحول نہ توڑا جائے۔ حضرت علی ؓ کی بیعت سے پہلے یہی حالت تھی کہ انہوں نے حضرت ابوبکر ؓ سے کوئی اختلاف ظاہر کیا نہ اجتماعیت کو توڑا۔ ہاں ایک عذر کی وجہ سے بیعت کے لیے حاضری میں تاخیر کی جو اس روایت میں مذکور ہے۔ (حضرت ابوبکر ؓ کی) بیعت کا قائم ہونا یا نہ ہونا، حضرت علی ؓ کی حاضری پر منحصر نہ تھا۔ جب یہ ضروری نہ تھا، تو وہ حاضر بھی نہ ہوئے۔ جو ان سے منقول ہے، وہ نہ بیعت کو متاثر کرتا ہے نہ اس کی مخالفت ظاہر کرتا ہے۔ ہاں لیکن ان کے دل میں ناراضی تھی اور جب تک وہ دور نہ ہوئی، انہوں نے حاضری کو ملتوی رکھا۔ اس ناراضی کا سبب یہ تھا کہ اپنی وجاہت، فضیلت اور نبی ﷺ سے قربت کے سبب وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہر خلافت ان کے مشورے اور موجودگی ہی میں طے ہوگا۔ مگر حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور تمام صحابہ ؓ کا عذر واضح ہے؛ کیوں کہ انہوں نے فوری بیعت کو مسلمانوں کی سب سے اہم مصلحت سمجھا اور اس کی تاخیر میں انہیں اختلاف اور تنازعہ اٹھنے کا خوف ہوا جس سے بڑے بڑے فتنے رونما ہو سکتے تھے۔''

(شرح نووی: ۱۲/۷۸، دار احیاء التراث، وکذا قال العینی فی عمدة القاری: ۱۷/۲۵۸، ط دار احیاء التراث)

یہ تو ان حضرات کی رائے تھی جو چھ ماہ بعد بیعت کی روایات کو من وعن تسلیم کرتے ہیں۔ درحقیقت اس سے بھی جمہور مسلمین کے مسلک پر کوئی حرف نہیں آتا جیسا کہ امام نووی کے کلام سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ مگر دوسری طرف علماء کی ایک بڑی جماعت ان روایات کو محل نظر سمجھتی ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ چاہے یہ روایات صحیح ہوں مگر ضروری نہیں کہ صحیح السند روایت کسی بھی لحاظ سے موضوع بحث نہ بن سکے۔ خصوصاً جبکہ ان کے بالمقابل ابوسعید خدری ؓ کی صحیح روایت موجود ہے۔ ان علماء میں امام بیہقی ؒ سرفہرست ہیں جنہوں نے روایتِ زہری کو نقل کرنے کے بعد درج ذیل تبصرہ کیا ہے:

''زہری کا حضرت فاطمہ ؓ کی وفات تک حضرت علی ؓ کے حضرت ابوبکر ؓ کی بیعت سے احتراز کرنے کا قول منقطع ہے۔ ابوسعید خدری ؓ کی روایت جس کے مطابق حضرت علی ؓ نے بیعتِ سقیفہ کے بعد حضرت ابوبکر ؓ کی عام بیعت کی تھی، اصح ہے۔ (السنن الکبری للبیهقی، ح: ۱۲۷۳۲)

ان علماء نے روایت زہری میں لفظ ''چھ ماہ بعد'' کو امام زہری کے وہم اور راوی کے ادراج پر محمول کیا ہے۔ (الاعتقاد، ص ۳۵۲، ط دار الآفاق)

حافظ ابن حجر ؒ اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ابن حبان اور دیگر علماء نے ابوسعید خدری ؓ اور دیگر حضرات کی ان روایات کو صحیح قرار دیا ہے جن کے مطابق حضرت علی ؓ نے شروع ہی میں بیعت کر لی تھی۔'' اس کے بعد وہ ان علماء کی رائے ذکر کرتے ہوئے جنہوں نے روایات کا تعارض دور کرنے کے لیے تطبیق کا طریقہ اختیار کیا، فرماتے ہیں:

''دیگر حضرات نے روایات کو یوں جمع کیا ہے کہ یہ دوسری بیعت تھی جو پہلی بیعت کی تاکید کے لیے تھی تاکہ میراث کی وجہ سے جو کچھ ہوا تھا، اس کا ازالہ ہو جائے جیسا کہ پیچھے گزر چکا۔ اس صورت میں زہری کا قول کہ حضرت علی ؓ نے ان ایام میں بیعت نہیں کی تھی، حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

تیزی سے گھر سے نکل کر آئے کہ چادر تک ساتھ نہ لی۔[1]

بیعت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا پہلا خطاب:

بیعت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بحیثیت سربراہِ مملکت مسلمانوں سے پہلا خطاب کیا۔ آپ نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! مجھے کبھی سرداری کی آرزو نہیں رہی۔ میں نے کبھی اللہ سے حکومت کی دعا نہیں مانگی۔ مگر میں فتنے پھیل جانے کے خوف سے یہ ذمہ داری اُٹھانے پر مجبور ہوا۔ مجھے اس عہدے میں کوئی آرام نہیں مل رہا۔ مجھے تو ایسی ذمہ داری کا طوق پہنا دیا گیا ہے کہ اللہ کی توفیق کے بغیر مجھ میں اس کی سکت نہیں ہے۔''[2]

پھر آپ نے فرمایا:

''لوگو! مجھے تمہارا حاکم بنایا گیا ہے، اگرچہ میں تم سے افضل نہیں ہوں۔ اگر میں بھلائی کروں تو مجھ سے تعاون کرنا، اگر برائی کروں تو میری اصلاح کر دینا۔ سچائی، امانت ہے اور جھوٹ، خیانت۔''

آپ نے حکومت کی بنیادی ذمہ داری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''قوم کا معمولی آدمی میرے نزدیک اُس وقت تک سب سے اہم ہے جب تک میں اسے اُس کا حق نہ دلوا دوں۔ قوم کا طاقتور فرد میرے نزدیک معمولی ہے، جب تک میں اُس سے مظلوم کا حق وصول نہ کرلوں۔''[3]

(بقیہ حاشیہ گزشتہ)......ہم نشین اور حاضر باش نہ رہنے کے ارادے یا ایسی ہی کسی صورتحال پر محمول ہوگا۔ چونکہ ایسی ہستی کا ایسی شخصیت سے الگ رہنا، حقیقتِ حال کو نہ جاننے والوں کو اس شبہے میں ڈال سکتا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر راضی نہیں اور کہنے والوں نے اس بات کو مشہور کر دیا۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد بیعت کو سرِ عام کیا تاکہ یہ شبہ دور ہو جائے۔'' (فتح الباری: ۷/۴۹۴، ۴۹۵، ط دار المعرفہ)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے کہ چھ ماہ بعد یہ عام مجمع میں تجدید بیعت تھی۔ اصل بیعت پہلے ہو چکی تھی۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۸/ ۱۸۸)

چھ ماہ بعد بیعت کا ذکر بعض ضعیف روایات میں بھی ہے مثلاً ایک روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت میں تاخیر کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: "الی آلیت بیمین حین قبض رسول اللہ ان لا ارتدی برداء الا الی الصلوۃ المکتوبۃ حتیٰ اجمع القرآن فانی خشیت ان یتفلّت القرآن." ''میں نے حضور ﷺ کی وفات کے وقت قسم کھائی تھی کہ فرض نماز کے سوا اپنی چادر نہ اوڑھوں گا جب تک کہ قرآن مجید جمع نہ کرلوں؛ کیوں کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں قرآن مجید ضائع نہ ہو جائے۔'' (مصنف عبد الرزاق، ح: ۹۷۶۵، واخرجہ ابن سعد فی الطبقات بلفظ: "آلیت بیمین ان لا ارتدی بردائی الا الی الصلوۃ حتیٰ اجمع القرآن.": ۲/ ۲۵۸) یعنی انہوں نے بیعت کو چھ ماہ تک اس لیے مؤخر کیا کہ وہ اس دوران قرآن مجید کو جمع کرنے کے لیے گھر میں تھے۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ اہلیہ کی تیمارداری میں مشغولیت بھی ان کا عذر تھا جو چھ ماہ بیمار رہنے کے بعد رحلت فرما گئی تھیں، مگر ظاہر ہے کہ یہ اعذار کسی شخص کو ایسا مشغول نہیں کرسکتے کہ وہ گھر میں بند ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان اعذار کے باوجود نماز کے لیے مسجد نبوی میں حاضر ہوتے تھے، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نمازیں ادا کرتے تھے۔ وہ کسی بھی نماز کے بعد بیعت کر سکتے تھے جو ایک منٹ کا کام تھا۔ پس ایسی روایات کا صحیح محمل یہی ہو سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت کے باوجود بیعت کے تحت لازم خدمات سے خود کو کچھ مدت تک مستثنیٰ کرائے رکھا تھا۔ اس سے جو شبہات پھیلے، انہیں دور کرنے کے لیے بعد میں تجدید بیعت کی۔

شیعہ اثنا عشریہ کی معتمد اور قدیم کتب سے بھی شہادت ملتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابتداء میں بیعت کر چکے تھے۔ امام محمد باقر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر سن کر مدینہ آئے تو دیکھا کہ لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گرد جمع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: فھل بایعتہ؟ ''کیا آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی ہے۔'' قال: نعم "انہوں نے جواب دیا: جی ہاں" (الاحتجاج للطبرسی: ۱/ ۱۳۱)

ظاہر ہے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی مدینہ واپسی حضور ﷺ کی وفات کی خبر سنتے ہی ہو گئی تھی۔ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بیعت کا اقرار ثابت کر دیتا ہے کہ قدیم شیعہ علماء کے نزدیک بھی اصل بیعت فی الفور ہو چکی تھی۔ پس چھ ماہ بعد بیعت کی روایت مرجوح اور قابلِ تاویل ہے۔

﴿حاشیہ صفحہ موجودہ﴾ [1] تاریخ الطبری: ۳/۲۰۷

[2] المستدرک للحاکم، ح: ۴۴۲۲، باسناد صحیح [3] طبقات ابن سعد: ۳/۱۸۲؛ تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۵۹، ط مکتبۃ نزار

اس ارشاد میں یہ پیغام مضمر تھا کہ حکومت درحقیقت عام لوگوں اور کمزوروں کی دیکھ بھال کے لیے وجود میں آتی ہے ورنہ امراء ورؤساء کو تو اپنی وجاہت اور رعب داب کی وجہ سے گھر بیٹھے حقوق ملتے رہتے ہیں، حکومتی خدمات کی اصل ضرورت عوام کو ہے اس لیے اسلامی حکومت انہی کو ترجیح دے گی۔ اس ارشاد میں یہ تنبیہ بھی تھی کہ امراء کو دوسروں کا حق مارنے کی عادت بد سے دور رہنا چاہیے؛ کیوں کہ اسلامی حکومت محروم لوگوں کی حمایت کے لیے مستعد اور ان کی حامی ہے۔

آپ نے جہاد کی اہمیت اور گناہوں کی نحوست کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''یاد رکھو! جب کبھی کسی قوم نے جہاد ترک کیا تو اللہ نے اس پر ذلت ورسوائی ضرور مسلط کی ہے۔ جب بھی کسی قوم میں بدکاری بڑھتی ہے تو اللہ اسے ہمہ گیر آفات میں مبتلا کر دیتا ہے۔''

آخر میں اسلامی حکومت میں اقتدار اعلیٰ اللہ کے سپرد ہونے کا نظریہ یاد دلاتے ہوئے فرمایا:

''جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تب تک میری پیروی کرنا۔ اگر میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کرنے لگوں تو تم پر میری پیروی لازم نہیں۔''[1]

جب شمع رسالت نگاہوں سے اوجھل ہوگئی:

حضور اقدس ﷺ کی تجہیز وتکفین ہوچکی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز جنازہ ادا کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: ''نماز جنازہ کیسے پڑھیں؟'' فرمایا: ''ٹولیاں بنا بنا کر اندر جاؤ، نماز پڑھتے رہو۔''

چنانچہ اس طرح نماز جنازہ ادا کی گئی، رسول اللہ ﷺ کا جنازہ حجرۂ عائشہ میں ہی رہا، تھوڑے تھوڑے لوگ حجرے کے اندر جاتے اور اپنی نماز پڑھ کر باہر نکل آتے۔ نماز جنازہ کی امامت کوئی نہیں کرتا تھا۔ یہ رسول اللہ ﷺ ہی کی وصیت تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے وفات سے پہلے فرمایا تھا:

''پہلے میرے گھر والے میری نماز جنازہ ادا کریں۔ سب لوگ تنہا تنہا نماز جنازہ ادا کریں۔''[2]

اس حکم کے مطابق پہلے اہل بیت، پھر مردوں، پھر خواتین، پھر بچوں اور پھر غلاموں نے نماز جنازہ پڑھی۔[3]

چونکہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے، جبکہ حجرۂ عائشہ میں ایک وقت میں تھوڑے ہی افراد سما سکتے تھے۔ اس لیے نماز جنازہ کے عمل میں پورا دن گزر گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ کہاں دفن کیا جائے؟ لوگوں نے الگ الگ تجاویز دیں اور اختلاف پیدا ہونے لگا۔ کسی نے کہا: حجرۂ شریفہ میں ہی دفن کیا جائے اور کسی نے کہا: عام مسلمانوں کے ساتھ۔ تب

[1] تاریخ الطبری: ۳/۲۴۰

[2] دلائل النبوۃ للبیہقی: ۷/۲۳۲ [3] دلائل النبوۃ للبیہقی: ۷/۲۵۰

یاد رہے کہ حجرہ سے مراد کمرہ نہیں بلکہ گھر کا برآمدہ یا چھپر ہے، جو کمرے اور صحن کے درمیان ہوتا ہے۔ مدینہ منورہ ایئرپورٹ روڈ پر ڈاکٹر عبدالعزیز بن عبدالرحمن کے قائم کردہ جدید میوزیم میں اس دور کے مدنی تمدن کو امکانی حد تک تحقیق کے بعد ماڈلز کی شکل میں پیش کر دیا گیا ہے۔ وہاں عہد رسالت کی مسجد نبوی اور امہات المؤمنین کے گھروں کے ماڈلز بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر حجرے کا صحیح مفہوم بھی سمجھ آجاتا ہے۔ حجرۂ شریفہ کے دو دروازے تھے۔ ایک گلی میں اور دوسرا مسجد کے اندر کی جانب کھلتا تھا، اس لیے قرین قیاس ہے کہ نماز جنازہ کے لیے لوگ ایک دروازے سے داخل ہوتے ہوں گے اور نماز جنازہ پڑھ کر دوسرے دروازے سے باہر نکلتے جاتے ہوں گے۔

حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گویا ہوئے: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر نبی کو اُسی جگہ دفن کیا جاتا ہے جہاں اس کی روح قبض کی گئی ہو۔''

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا بستر ہٹا کر وہیں قبر کی کھدائی شروع کی گئی۔ ①

منگل اور بدھ کی درمیانی شب اُمہات المؤمنین اپنے حجروں میں سخت زمین پر کدالیں چلنے کی آواز سن رہی تھیں۔ ②

قبر تیار ہو چکی تو رسول اللہ ﷺ کے غلام شقران رضی اللہ عنہ نے جلدی سے ایک سرخ چادر قبر کے اندر بچھا دی، حضرت علی، حضرت عباس اور ان کے لڑکے قثم بن عباس رضی اللہ عنہم نے قبر میں داخل ہو کر جسد اطہر کو اندر اُتارا۔ ③

سب سے آخر میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ مرقد میں اُترے اور حضور اکرم ﷺ کے کفن کو درست کیا، اس کے بعد مرقد پر مٹی ڈال دی گئی۔ ④ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے مشک لے کر قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ ⑤

یوں حرا کا چاند طیبہ کی خاک میں روپوش ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی سسکیوں اور ہچکیوں کی آوازوں سے پورا مدینہ گونج اُٹھا۔ زمین و آسمان نے اس سے زیادہ سوگوار اور دردناک منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ⑥

پیغمبر آخر الزمان ﷺ کے جاں نثاروں کے لیے یہ احساس ناقابل برداشت تھا کہ اب اس دنیا میں مشتاق نگاہیں آقائے نامدار ﷺ کی زیارت کبھی نہ کر سکیں گی۔ صحابہ کرام نے باقی رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح صادق کے وقت حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ حسبِ معمول اذان دینے لگے۔ '' اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ '' پر پہنچے تو ضبط کی تاب نہ رہی۔ زار و قطار رونے لگے۔ ⑦

نمازِ جنازہ اور تدفین میں تاخیر کیوں ہوئی؟

رسول اللہ ﷺ کی وفات پیر کی سہ پہر ہوئی تھی اور نمازِ جنازہ اگلے روز منگل کو ظہر کے بعد۔ پھر تدفین منگل اور بدھ کی درمیانی شب ہوئی۔ ان امور میں تأخیر کا ایک سبب تو صحابہ کرام اور اہلِ بیت کا رنج و غم سے نڈھال ہونا تھا۔ دوسرا بڑا سبب امرِ خلافت کو طے کرنا تھا۔ نمازِ جنازہ اور تدفین کے امور اس کے بعد ہی انجام پذیر ہوئے۔

اس اہم کام کے رسول اللہ ﷺ کی نمازِ جنازہ اور تدفین سے بھی پہلے انجام پا جانے میں بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی مصلحت معلوم ہوتی ہے۔ جنازے میں تاخیر ہونے سے یہ امکان تو ہرگز نہ تھا کہ حضور ﷺ کے جسد اطہر میں کوئی تغیر پیدا ہو جائے گا؛ کیوں کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے اجسام وفات کے بعد بھی محفوظ رہتے ہیں۔ ہاں اگر خلیفہ کا انتخاب فوراً نہ ہوتا تو کئی مسئلے کھڑے ہو جاتے۔

① دلائل النبوة للبيهقي: ٢٦٠/٧

② دلائل النبوة للبيهقي: ٢٥٦/٧، ط العلمية

③ البداية والنهاية: ١٤٣/٨، دار هجر

④ مسند احمد، ح: ٢٠٤٦٦

⑤ دلائل النبوة للبيهقي: ٢٦٣/٧

⑥ دلائل النبوة للبيهقي: ٢٦٧/٧

⑦ دلائل النبوة للبيهقي: ٢٦٧/٧

تجہیز و تکفین سے قبل خلافت کے مسئلے کو حل کرنا کیوں ضروری سمجھا گیا؟

پیغمبرِ اسلام ﷺ کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری غیر معمولی اہمیت رکھتی تھی، اگر اس عظیم کام کو کسی قائد کی نگرانی کے بغیر انجام دیا جانے لگتا تو بات بات پر اختلافات رونما ہوتے۔ اوّل تو یہی بات تنازعے کا باعث بن جاتی کہ نمازِ جنازہ کہاں ادا کی جائے؟ لوگ جذبات کی شدت سے مغلوب ہو رہے تھے، اس لیے کھلے میدان میں نمازِ جنازہ ادا کرنا چاہتے، بہت سے لوگ دیدارِ عام کی تمنا بھی کرتے، ایسے میں آخری نگاہیں ڈالتے ہوئے ہزاروں لوگوں کا غم کی انتہا سے حواس کھو بیٹھنا بالکل بعید نہ تھا۔ اس بات پر بھی اختلاف ہوتا کہ نمازِ جنازہ کون پڑھائے؟ تدفین کہاں ہو؟ جب پہلے قیادت کا مسئلہ طے ہو گیا تو پھر ہر کام ایک امیر کے اختیار کے ساتھ خوش اسلوبی سے انجام پا گیا۔

امرِ خلافت کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ تھی کہ اسلام کے آغاز سے اب تک مسلمانوں پر کوئی وقت ایسا نہیں آیا تھا کہ وہ کسی امیر کے بغیر ہوں، حضور ﷺ ہی سب کے امام، رہنما اور امیر تھے جن کے تحت مسلمان متحد و متفق تھے۔ اب کسی امیر یا خلیفہ سے تھوڑی دیر کی محرومی بھی مسلمانوں کے لیے نہایت گراں تھی اور اُمت کے اکابر خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ اگر یہ صورتحال زیادہ دیر رہی تو کہیں اُمتِ مسلمہ کسی افتراق و انتشار کا شکار نہ ہو جائے۔ شر پسند عناصر جو منافقین کی شکل میں دورِ نبوت میں بھی سرگرم رہے کوئی بات اُڑا کر اس مسئلے کو اختلاف بلکہ خانہ جنگی کی شکل دے سکتے تھے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں کئی بار وہ ایسی مذموم کوششیں کر چکے تھے۔ ان وجوہ سے صحابہ کرام کے پاکیزہ اذہان اور دور اندیش دماغوں کی رَو خود بخود اس طرف ہو گئی کہ سب سے پہلے حضورِ اقدس ﷺ کے جانشین کا مسئلہ طے کر لیا جائے۔ وہ لوگ ظاہر بین بلکہ کوڑھ مغز ہیں جو گمان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام کو حضور ﷺ کی محبت سے زیادہ اقتدار کی فکر تھی، اس لیے وہ تجہیز و تکفین کی بجائے خلافت کے استحقاق پر بحث کرنے لگے۔ حقیقت یہ تھی کہ انہیں پیغمبر ﷺ کی محبت ہی کی وجہ سے پیغمبر کے دین کو بچانے کی فکر لاحق تھی اور اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ فی الفور خلافت کا منصب کسی ذمہ دار ترین شخص کو سونپ کر اُمتِ مسلمہ کو متحد اور یکجا رکھا جائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا رنج و غم:

حضور ﷺ کی رحلت کے سانحے نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جس کرب و غم میں مبتلا کیا تھا اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے، جسے آقائے نامدار ﷺ کی محبت کا درد نصیب ہوا ہو۔ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس ﷺ کی تدفین سے فارغ ہو کر آئے تو حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا فرما رہی تھیں:

''انس! تم نے کیسے گوارا کر لیا کہ رسول اللہ ﷺ کو دفنا کے مٹی ڈال کر واپس چلے آئے۔''[1]

بچپن سے بڑھاپے تک حضورِ اکرم ﷺ کی غم گسار و سرپرست حضرت اُم ایمن رضی اللہ عنہا روتے ہوئے فرما رہی

---

[1] سنن ابن ماجۃ، ح: ۱۳۲۱

تھیں: ''ہم نزولِ وحی کی برکت سے محروم ہو گئے۔''[1]

حضرت مُعاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو چند ماہ پہلے حضور ﷺ نے یمن کے شہر ''صنعاء'' بھیجا تھا، جہاں وہ لوگوں کو دین سکھانے اور شریعت کے مطابق اُن کے مابین فیصلے کرنے کی ذمہ داری انجام دے رہے تھے۔ اس رات وہ اپنے بستر پر سو رہے تھے کہ کسی نے پکارا ''مُعاذ! رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی اور تم زندگی کے مزے لے رہے ہو۔''

وہ اس طرح ہڑبڑا کر اُٹھے جیسے قیامت کا صور پھونک دیا گیا ہو۔ دوڑتے ہوئے صنعاء کی گلیوں میں آئے اور چلائے: ''یمن والو! مجھے جانے دو۔ کیا المناک دن تھا جب میں اپنے آقا کے قدموں کو چھوڑ کر یہاں آن بسا۔''

لوگ پوچھتے رہے کہ کیا ہوا؟ مگر وہ کچھ کہے سنے بغیر اپنی سواری کو ایڑی لگا کر سرپٹ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

مدینہ سے تقریباً پچاس میل (۸۰ کلومیٹر) دور تھے کہ سامنے سے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ آتے دکھائی دیے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضور ﷺ کی وفات کی خبر لے کر یمن جا رہے تھے۔ حضرت مُعاذ رضی اللہ عنہ کو پہچان کر حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے انہیں روکا اور سانحے کی اطلاع دی۔ وہ بولے:

''عمار! اب رہنمائی کس سے لیں گے اور فریاد کس کو سنایا کریں گے؟''

اسی حالت میں اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے تک پہنچے۔ دستک دے کر اپنا تعارف کرایا اور تعزیت کی۔ وہ بولیں: ''مُعاذ! اگر تم رسول اللہ ﷺ کا آخری وقت دیکھ لیتے تو دنیا کی زندگی چاہے کتنی ہی طویل ہوتی، کبھی اچھی معلوم نہ ہوتی۔''

یہ سن کر حضرت مُعاذ رضی اللہ عنہ اتنا روئے کہ غشی طاری ہو گئی۔[2]

يَا خَيْرَ مَنْ دُفِنَتْ بِالْقَاعِ أَعْظُمُهُ ۔۔۔ فَطَابَ مِنْ طِيبِهِنَّ الْقَاعُ وَالْأَكَمُ

نَفْسِي الْفِدَاءُ لِقَبْرٍ أَنْتَ سَاكِنُهُ ۔۔۔ فِيهِ الْعَفَافُ وَفِيهِ الْجُودُ وَالْكَرَمُ

''اے وہ سب سے پاکیزہ ہستی جس کی استخواں زیرِ خاک دفن ہیں
پس ان کی خوشبو سے یہ زمین بھی مہک اٹھی اور یہ برگ و بار بھی
میری جان اس مرقد پر قربان جس میں آپ تشریف فرما ہیں
شرافت، سخاوت اور جود و کرم کی ساری صفات یہیں جمع ہیں۔

---

[1] مسند احمد، ح: ۱۳۲۱۵

[2] سیرت ابن حبان: ۲/ ۴۲۷، ۴۲۸

شمائلِ مصطفیٰ ﷺ

حضور رحمت دو عالم ﷺ کے شمائل، خصائل اور کمالات کا احاطہ کرنا کسی بڑے سے بڑے سیرت نگار، سخن ور اور نکتہ دان کے لیے بھی ممکن نہیں۔ اس باب میں چودہ صدیوں سے لکھا جا رہا ہے اور تا قیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا مگر رسول اللہ ﷺ کی خوبیوں کا شمار نہیں ہو سکے گا۔ یہاں ہم اس بارے میں اپنی عاجزی اور تہی دامنی کا اعتراف کرتے ہوئے، انتہائی اختصار کے ساتھ کتب حدیث و سیرت کی سیپیوں سے چند سچے موتی پیش کر رہے ہیں۔[1]

حلیہ مبارکہ:

حضرت ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے حلیہ مبارکہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''رسول اللہ ﷺ کا چہرہ مبارک ماہِ بدر کی طرح چمکتا تھا۔ آپ ﷺ کا قد مبارک بالکل متوسط قد والے آدمی سے کسی قدر طویل تھا، لیکن زیادہ لمبے قد والے سے پست تھا، سر مبارک اعتدال کے ساتھ بڑا تھا، بال مبارک کسی قدر بل کھائے ہوئے تھے۔ اگر بسہولت مانگ نکل آتی تو نکال لیتے تھے اور اگر کسی وجہ سے بسہولت نہ نکلتی تو اس وقت نہ نکالتے (کسی دوسرے وقت جب کنگھی وغیرہ موجود ہوتی تو نکال لیتے۔) جس زمانے میں حضور ﷺ کے بال مبارک زیادہ ہوتے تو کان کی لو سے متجاوز ہو جاتے تھے۔

رنگ مبارک چمک دار تھا اور پیشانی مبارک کشادہ تھی۔ ابرو خم دار باریک اور گنجان تھے، دونوں ابرو جدا جدا تھے۔ ملے ہوئے نہیں تھے، ان دونوں کے درمیان ایک رگ تھی جو غصہ کے وقت ابھر جاتی تھی۔

ناک مبارک بلندی مائل تھی اور اس پر ایک چمک اور نور تھا، ابتداء میں دیکھنے والا آپ ﷺ کو بڑی ناک والا سمجھتا (لیکن غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا کہ حسن اور چمک کی وجہ سے بلند لگتی ہے ورنہ زیادہ بلند نہیں ہے۔) داڑھی مبارک بھرپور اور گنجان بالوں کی تھی اور آنکھ مبارک کی پتلی نہایت سیاہ تھی، رخسار مبارک ہموار ہلکے تھے۔ دہن مبارک اعتدال کے ساتھ فراخ تھا (یعنی تنگ منہ نہ تھا) آپ ﷺ کے دندان مبارک باریک آبدار تھے اور ان میں سے سامنے کے دانتوں میں ذرا ذرا فصل بھی تھا۔ گردن مبارک ایسی خوبصورت اور باریک تھی، جیسا کہ مورتی کی گردن صاف اور تراشی ہوئی ہوتی ہے اور رنگ میں چاندی جیسی صاف اور خوبصورت تھی۔''

---

[1] خصائل مبارکہ میں جہاں جہاں شمائل الترمذی کے حوالے ہیں، وہاں عبارت کے ترجمے اور قوسین کی تشریحی عبارات میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمہ اللہ کی تالیف ''خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی'' سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے سب اعضاء نہایت معتدل اور پُر گوشت تھے اور بدن گھٹا ہوا تھا۔ پیٹ اور سینہ مبارک ہموار تھا، لیکن سینہ فراخ اور چوڑا تھا۔ آپ ﷺ کے دونوں کاندھوں کے درمیان قدرے زیادہ فاصلہ تھا، جوڑوں کی ہڈیاں قوی اور کلاں تھیں (جو قوت کی دلیل ہوتی ہے)۔ کپڑا اتارنے کی حالت میں آپ کا بدن مبارک روشن چمک دار نظر آتا تھا، ناف اور سینہ کے درمیان ایک لکیر کی طرح سے بالوں کی باریک دھاری تھی۔ اس لکیر کے علاوہ دونوں چھاتیاں اور شکم مبارک بالوں سے خالی تھا، البتہ دونوں بازوؤں اور کندھوں اور سینہ مبارک کے بالائی حصہ پر بال تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی کلائیاں دراز تھیں اور ہتھیلیاں فراخ، نیز ہتھیلیاں اور دونوں قدم گداز اور پر گوشت تھے۔ ہاتھ پاؤں کی انگلیاں تناسب کے ساتھ لمبی تھیں۔

رسول اللہ ﷺ کے تلوے قدرے گہرے تھے اور قدم ہموار تھے کہ پانی ان کے صاف ستھرا ہونے اور ان کی ملامت کی وجہ سے ان پر ٹھہرتا نہیں تھا، فوراً ڈھلک جاتا تھا، جب رسول اللہ ﷺ چلتے تو قوت سے قدم اٹھاتے اور آگے جھک کر تشریف لے جاتے، قدم زمین پر آہستہ پڑتا، زور سے نہیں پڑتا تھا۔ حضور ﷺ تیز رفتار تھے اور ذرا کشادہ قدم رکھتے تھے، چھوٹے چھوٹے قدم نہیں رکھتے تھے۔ جب چلتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا پستی میں اتر رہے ہیں۔ جب کسی طرف توجہ فرماتے تو پورے بدن سے پھر کر توجہ فرماتے۔

رسول اللہ ﷺ کی نظر نیچی رہتی تھی۔ نگاہ بہ نسبت آسمان کے زمین کی طرف زیادہ رہتی تھی۔ عادت شریفہ عموماً گوشہ چشم سے دیکھنے کی تھی (یعنی حیاء کی وجہ سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھتے تھے۔) چلنے میں صحابہ کو اپنے آگے کر دیتے تھے اور خود پیچھے رہ جاتے تھے، جس سے ملتے سلام کرنے میں خود ابتدا فرماتے۔''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ فراخ دل، کشادہ قلب، راست گفتار، نرم طبیعت اور معاشرت و معاملات میں نہایت درجہ کریم تھے۔ جو پہلی بار آپ کو دیکھتا وہ مرعوب ہو جاتا اور جو آپ ﷺ کی صحبت میں رہتا اور جان پہچان حاصل ہوتی تو آپ ﷺ کا فریفتہ اور دلدادہ ہو جاتا۔ آپ ﷺ کا ذکرِ خیر کرنے والا کہتا ہے کہ نہ آپ ﷺ سے قبل میں نے آپ ﷺ جیسا کوئی شخص دیکھا نہ آپ ﷺ کے بعد۔ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيه وَ سَلَّمُ''[2]

ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ خود بھی بہت باوقار اور شان و شوکت کے حامل تھے اور دوسروں کی نگاہ میں بھی نہایت پُر شکوہ۔ آپ کا روئے انور چودھویں رات کے چاند کی طرح دمکتا تھا۔''[3]

---

① شمائل الترمذی، باب ما جاء فی خلق رسول اللّٰه ﷺ

② شمائل الترمذی، باب ما جاء فی خلق رسول اللّٰه ﷺ

③ شمائل الترمذی، باب ما جاء فی تواضع رسول اللّٰه ﷺ

براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ میانہ قامت تھے، میں نے آپ ﷺ کو ایک مرتبہ سرخ قبا میں دیکھا، آپ ﷺ سے زیادہ حسین کوئی شخصیت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔''①

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''میں نے کوئی ایسا حریر یا ریشم نہیں چھوا جو رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک سے زیادہ نرم ہو۔ میں نے عنبر اور مشک یا کوئی بھی ایسی چیز نہیں سونگھی جس کی خوشبو رسول اللہ ﷺ کے پسینے مہک سے بہتر ہو۔''②

اخلاقِ عالیہ:

ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ ہر وقت آخرت کی فکر میں اور امورِ آخرت کی سوچ میں رہتے، اس کا ایک تسلسل قائم تھا کہ کسی وقت آپ ﷺ کو چین نہیں ہوتا تھا، اکثر طویل سکوت اختیار فرماتے، بلا ضرورت کلام نہ فرماتے، گفتگو کا آغاز فرماتے تو دہنِ مبارک سے اچھی طرح الفاظ ادا فرماتے، (یعنی متکبروں کی طرح بے توجہی و بے نیازی کے ساتھ ادھ کٹے الفاظ استعمال نہ فرماتے) اور اسی طرح اختتام فرماتے۔ آپ کی گفتگو اور بیان بہت صاف، واضح اور دوٹوک ہوتا، نہ اس میں غیر ضروری طوالت ہوتی نہ زیادہ اختصار۔

رسول اللہ ﷺ نہ دُرشت خُو (بدمزاج) تھے اور نہ کسی کی اہانت پسند کرتے تھے، نعمت کی بڑی قدر کرتے اور اس کو بہت زیادہ جانتے، خواہ کتنی ہی قلیل ہو (کہ آسانی سے نظر بھی نہ آئے) اور اس کی برائی نہ فرماتے، کھانے پینے کی چیزوں کی برائی کرتے نہ تعریف۔ دنیا اور دنیا سے متعلق جو بھی چیز ہوتی اس پر آپ ﷺ کو کبھی غصہ نہ آتا، لیکن جب اللہ کے کسی حق کو پامال کیا جاتا تو اس وقت آپ ﷺ کے جلال کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہ سکتی تھی، یہاں تک کہ آپ ﷺ اس کا بدلہ لے لیتے۔ آپ کو اپنی ذات کے لیے نہ غصہ آتا نہ اس کے لیے انتقام لیتے۔ جب اشارہ فرماتے تو پورے ہاتھ کے ساتھ اشارہ فرماتے، جب کسی امر پر تعجب فرماتے تو اس کو پلٹ دیتے، گفتگو کرتے وقت داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے ملاتے، غصہ اور ناگواری کی بات ہوتی تو روئے انور اس طرف سے بالکل پھیر لیتے اور اعراض فرما لیتے، خوش ہوتے تو نظریں جھکا لیتے، آپ ﷺ کا ہنسنا زیادہ تر تبسم تھا جس سے صرف آپ ﷺ کے دندانِ مبارک جو بارش کے اولوں کی طرح پاک وشفاف تھے، ظاہر ہوتے۔''③

---

① شمائل الترمذی، باب ما جاء فی خلق رسول اللہ ﷺ

② صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب طیب رائحۃ النبی ﷺ

③ شمائل الترمذی، باب کیف کان کلام رسول اللہ ﷺ

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدکلامی اور بے حیائی و بے شرمی سے دور تھے۔ بازاروں میں کبھی آواز بلند نہ فرماتے۔ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے، بلکہ عفو و درگزر کا معاملہ فرماتے۔''

اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کا بیان ہے:

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی پر کبھی دست درازی نہ فرمائی سوائے اس کے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا موقع ہو۔ کسی خادم یا عورت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔''[1]

اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ بھی فرمایا کرتی تھیں:

''میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی ظلم و زیادتی کا انتقام لیتے ہوئے بھی نہیں دیکھا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی نہ ہو۔ ہاں! اگر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو پامال کیا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے سب سے زیادہ غضب ناک ہوتے۔''[2]

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''میں نے دس سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی۔ آپ نے مجھے کبھی ''اُف'' نہیں کہا۔ نہ کسی کام کے کرنے پر یہ کہا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ نہ ہی کسی کام کے چھوڑ دینے پر یہ فرمایا کہ تم نے یہ کیوں نہیں کیا۔''[3]

انتظامی خوبیاں:

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''دو چیزیں سامنے ہوتیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ آسان صورت کا انتخاب فرماتے، بشرطیکہ وہ ناجائز نہ ہو۔''[4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان مبارک محفوظ رکھتے اور صرف اسی چیز کے لیے کھولتے جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ سروکار ہوتا۔ لوگوں کی دل داری فرماتے اور ان کو متنفر نہ کرتے، کسی قوم کا کوئی معزز شخص آتا تو اس کے ساتھ اکرام و اعزاز کا معاملہ فرماتے اور اسی کو اس کی قوم کا ذمہ دار بناتے۔ لوگوں کے بارے میں محتاط تبصرہ کرتے، بغیر اس کے کہ اپنی بشاشت اور اخلاق سے ان کو محروم فرمائیں۔ اپنے اصحاب کے حالات کی برابر خبر رکھتے، لوگوں سے لوگوں کے معاملات کے بارے میں دریافت کرتے رہتے۔ اچھی بات کی اچھائی بیان کرتے اور اس کو قوت پہنچاتے، بری بات کی برائی کرتے اور اس کو کمزور کرتے۔

① شمائل الترمذی، ص۱۹۷، ط احیاء التراث العربی

② شمائل الترمذی، ص۱۹۸، ط احیاء التراث العربی

③ شمائل الترمذی، ص۱۹۶، باب ما جاء فی خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ط احیاء التراث العربی

④ شمائل الترمذی، ص۱۹۸، ط احیاء التراث العربی

آپ کا معاملہ معتدل اور یکساں تھا، اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا تھا، آپ کسی بات سے غفلت نہ فرماتے تھے اس خدشے سے کہ کہیں دوسرے لوگ بھی غافل ہونے لگیں اور اکتا جائیں۔

رسول اللہ ﷺ کے پاس ہر حال کے مطابق ضروری بندوبست ہوتا تھا۔ نہ حق کے معاملہ میں کوتاہی فرماتے نہ حد سے آگے بڑھتے۔ آپ ﷺ کے قریب جو لوگ رہتے تھے وہ سب سے اچھے اور منتخب ہوتے تھے، آپ کی نگاہ میں سب سے زیادہ افضل وہ تھا جس کی خیر خواہی اور اخلاق عام ہو، سب سے زیادہ قدر و منزلت اس کی تھی جو غم خواری اور ہمدردی اور دوسروں کی مدد اور معاونت میں سب سے آگے ہو۔"[1]

مجلس کا حسن و جمال:

حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس کا حسن و جمال اپنی فصیح و بلیغ عبارت میں یوں بیان فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ اللہ کا ذکر کرتے ہوئے کھڑے ہوتے اور اللہ کا ذکر کرتے ہوئے بیٹھتے۔ کہیں تشریف لے جاتے تو جہاں مجلس ختم ہوتی وہیں تشریف رکھتے اور اس کا حکم بھی فرماتے۔ اپنے حاضرینِ مجلس اور ہم نشینوں میں ہر شخص کو (اپنی توجہ اور التفات میں) پورا حصہ دیتے۔ آپ کا ہر شریکِ مجلس یہ سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر آپ ﷺ کی نگاہ میں کوئی اور نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص آپ ﷺ کو کسی غرض سے بٹھا لیتا یا کسی ضرورت میں آپ ﷺ سے گفتگو کرتا تو نہایت صبر و سکون سے اس کی پوری بات سنتے یہاں تک کہ وہ خود ہی اپنی بات پوری کر کے رخصت ہوتا۔ اگر کوئی شخص آپ ﷺ سے کچھ سوال کرتا اور کچھ مدد چاہتا تو بلا اس کی ضرورت پوری کیے واپس نہ فرماتے، یا کم از کم نرم و شیریں لہجہ میں جواب دیتے۔

آپ کا حُسنِ اخلاق تمام لوگوں کے لیے وسیع اور عام تھا اور آپ ﷺ ان کے حق میں باپ ہو گئے تھے۔ تمام لوگ حق کے معاملہ میں آپ ﷺ کی نظر میں برابر تھے۔ آپ کی مجلس علم و معرفت، حیا و شرم اور صبر و امانت داری کی مجلس تھی، نہ اس میں آوازیں بلند ہوتی تھیں، نہ کسی کے عیوب بیان کیے جاتے تھے، نہ کسی کی عزت و ناموس پر حملہ ہوتا، نہ کمزوریوں کی تشہیر کی جاتی تھی، سب ایک دوسرے کے مساوی تھے اور صرف تقویٰ کے لحاظ سے ان کو ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی تھی، اس میں لوگ انکساری کے ساتھ رہتے تھے۔ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کے ساتھ رحم دلی اور شفقت کا معاملہ کرتے تھے، حاجت مند کو اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے، مسافر اور نو وارد کا خیال رکھتے تھے۔"[2]

---

[1] شمائل الترمذی، ص ۱۹۲، ۱۹۳، باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ ﷺ، ط احیاء التراث العربی

[2] شمائل الترمذی، ص ۱۹۳، باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ ﷺ، عن علی رضی اللہ عنہ۔ ط احیاء التراث العربی

انبساط اور کشادہ روئی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ ہمہ وقت کشادہ اور انبساط و بشاشت کے ساتھ رہتے تھے۔ بہت نرم اَخلاق اور نرم پہلو تھے (یعنی جلد مہربان ہو جانے والے اور بہت آسانی سے درگزر کرنے والے تھے) نہ سخت طبیعت کے مالک تھے، نہ سخت بات کہنے کے عادی، نہ چلا کر بولنے والے، نہ عامیانہ اور متبذل (گھٹیا) بات کرنے والے، نہ کسی کو عیب لگانے والے، نہ تنگ دل بخیل۔ جو چیز آپ ﷺ کو پسند نہ ہوتی اس سے تغافل فرماتے (یعنی اس کو نظر انداز کر دیتے اور گرفت نہ فرماتے) اور صاف صاف اس چیز سے مایوس بھی نہ فرماتے اور اس کا جواب بھی نہ دیتے۔

تین باتوں سے رسول اللہ ﷺ نے خود کو بالکل بچا رکھا تھا، ایک جھگڑا، دوسرے تکبر اور تیسرے غیر ضروری اور لایعنی کام۔ لوگوں کو بھی تین باتوں سے آپ نے بچا رکھا تھا، نہ کسی کی برائی کرتے تھے، نہ کسی کو عیب لگاتے تھے اور نہ کسی کی کمزوریوں اور پوشیدہ باتوں کے پیچھے پڑتے تھے۔ صرف وہ کلام فرماتے تھے جس پر ثواب کی امید ہوتی تھی۔

جب گفتگو کرتے تھے تو شرکاءِ مجلس ادب سے اس طرح سر جھکا لیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان سب کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں (یعنی بے حس و حرکت کہ کہیں جنبش سے چڑیاں اڑ نہ جائیں) جب آپ ﷺ خاموش ہوتے تب یہ لوگ بات کرتے، آپ ﷺ کے سامنے کبھی نزاع نہ کرتے۔ اگر آپ ﷺ کی مجلس میں کوئی شخص گفتگو کرتا تو بقیہ سب لوگ خاموشی سے سنتے یہاں تک کہ وہ اپنی بات ختم کر لیتا۔ آپ ﷺ کے سامنے ہر شخص کی گفتگو کا وہی درجہ ہوتا جو ان کے پہلے آدمی کا ہوتا۔ (کہ پورے اطمینان کے ساتھ اپنی بات کہنے کا موقع ملتا اور اسی قدر دانی اور اطمینان کے ساتھ اسے سنا جاتا) جس بات سے سب لوگ ہنستے اس پر آپ بھی ہنستے، جس سے سب تعجب کا اظہار کرتے آپ بھی تعجب فرماتے، مسافر اور پردیسی کی بے تمیزی اور ہر طرح کے سوال کو صبر و تحمل کے ساتھ سنتے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم ایسے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے۔ (تاکہ آپ ﷺ پر کوئی بار نہ ہو) آپ ﷺ فرماتے تھے کہ ''تم کسی حاجت مند کو پاؤ تو اس کی مدد کرو۔''

رسول اللہ ﷺ مدح و تعریف اسی شخص کی قبول فرماتے جو حدِ اعتدال میں رہتا۔ کسی کی گفتگو کے دوران کلام نہ فرماتے اور اس کی بات کبھی نہ کاٹتے، ہاں اگر وہ حد سے بڑھنے لگتا تو اس کو منع فرما دیتے یا مجلس سے اٹھ کر اس کی بات قطع فرما دیتے۔''[1]

---

[1] شمائل الترمذی، ص ۱۹۹، ۲۰۰، باب ماجاء فی خُلقِ رسول اللہ ﷺ، ط احیاء التراث العربی

بیماروں کی عیادت:

نبی کریم ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ جب صحابہ کرام میں کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ ایک یہودی خادم اور اپنے مشرک چچا کی عیادت کے لیے بھی تشریف لے گئے اور ان دونوں کو اسلام کی دعوت دی۔ چنانچہ یہودی نے اسلام کو قبول کر لیا۔ ①

ذکر و عبادت:

نبی کریم ﷺ اپنے معمول (تلاوت) کی پابندی کرتے تھے۔ آپ قرآن پاک ترتیل سے (ایک ایک حرف واضح کر کے) پڑھا کرتے تھے، ایک ایک آیت پر وقفہ کرتے، مد کے حروف کو کھینچ کر پڑھتے مثلاً الرحمٰن الرحیم کو مد سے پڑھتے تھے اور تلاوت کے آغاز میں "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" پڑھتے۔

آپ ﷺ کبھی کبھی آواز کھینچ کر بہترین انداز میں قرآن پاک کی تلاوت فرماتے تھے۔ دوسروں کی زبان سے قرآن سننا بھی پسند فرماتے تھے۔ ایک بار آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا تو انہوں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، آپ کو سنتے وقت اس قدر خشوع طاری ہوا کہ آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور آنسو جاری ہو گئے۔ ①

اللہ کا ذکر اور خشیت:

نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا ذکر سب سے زیادہ کرتے تھے بلکہ آپ کا ہر کلام اللہ کے ذکر اور اس کی فکر میں ہوتا تھا۔ آپ کا اُمت کو حکم کرنا، روکنا اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور اس کے احکام اور وعدو وعید کی تفصیلات سب کی سب ذکرِ الٰہی کے قبیل سے ہیں۔ اسی طرح اُس کی بے حساب نعمتوں پر حمد وثناء اور تسبیح وتمجید بھی ذکر اللہ تھا۔

اللہ تعالیٰ سے سوال و دعا اور خوف وخشیت بھی ذکر ہی تھا بلکہ آپ کی خاموشی تک بھی قلبی طور پر ذکرِ الٰہی پر مشتمل تھی۔ جس طرح ذکر اللہ سے رطب اللسان تھے، اسی طرح قلب وجگر بھی اس سے سرشار تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ آپ ہر آن، ہر حالت میں ذاکر وشاغل رہتے تھے اور ذکر اللہ آپ کی سانس کے ساتھ جاری وساری رہتا۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوار ہوتے اترتے، سفر وحضر ہر وقت اور ہر حال میں آپ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے تھے اور اس کے ذکر وفکر میں رہتے تھے۔ جب آپ نیند سے بیدار ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ

"تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہم کو مارنے کے بعد زندہ کیا اور اس کے پاس اٹھ کر جانا ہے۔"

اسی طرح نبی کریم ﷺ سے ہر موقع کی دعائیں مذکور ہیں مثلاً: جب نیند سے بیدار ہو، جب نماز شروع کرے، جب گھر سے نکلے، جب مسجد میں داخل ہو، صبح وشام کی دعا، جب کپڑے تبدیل کرے، جب گھر میں داخل ہو، جب بیت الخلاء میں داخل ہو، وضوء کی دعاء، اذان کی دعاء، رویت ہلال کی دعاء، کھانے کی دعاء اور چھینکنے کی دعا۔ ②

① زاد المعاد: ۱/۴۷۵، ط الرسالة
② زاد المعاد: ۱/۴۶۳ تا ۴۶۵، فصل فی هدیه ﷺ فی قراءة القرآن، ط الرسالة

گھریلو زندگی:

نبی کریم ﷺ کی گھریلو زندگی نہایت سادہ تھی۔ جب اپنے دولت خانہ پر تشریف لے جاتے تو عام انسانوں کی طرح نظر آتے، اپنے کپڑوں کو صاف کرتے، بکری کا دودھ دوہتے اور اپنی سب ضرورتیں خود انجام دیتے۔ ②

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''نبی کریم ﷺ کا بستر بوسیدہ و کھردرا تھا، میں نے چاہا کہ اس کی جگہ دوسرا بستر رکھوں جو آپ کے لئے آرام دہ ہو، چنانچہ میں نے نرم بستر بچھا دیا۔ نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو پوچھا:

''اے عائشہ! یہ کیا ہے؟''

میں نے کہا: ''میں آپ کا بستر سخت کھردرا دیکھتی تھی تو میں نے اس نرم بستر کو پسند کیا۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اسے اٹھا دو، اللہ کی قسم! میں نہیں بیٹھوں گا جب تک اسے نہ اٹھا لو۔''

چنانچہ میں نے وہ بستر اٹھا دیا۔'' ③

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا: ''نبی کریم ﷺ گھر میں کیا کرتے تھے؟''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''وہ انسانوں میں سے ایک انسان تھے۔ اپنا سر صاف فرماتے، بکری کا دودھ دوہتے، کپڑا سیتے، اپنے کام سرانجام دیتے، اپنا جوتا ٹانکتے، عام لوگ اپنے گھروں میں جو کرتے ہیں وہ کرتے اور اپنے گھر والوں کی خدمت کرتے، لیکن جب مؤذن کی آواز سنتے تو نماز کے لئے نکل کھڑے ہوتے۔'' ④

نبی کریم ﷺ ازواجِ مطہرات کے درمیان برابری فرماتے تھے اور دعا کرتے تھے: ''یا اللہ! یہ میری برابری ہے جو میرے اختیار میں ہے، تو اس بات (یعنی قلبی محبت) پر مؤاخذہ نہ کر جو تیرے اختیار میں ہے، میرے نہیں۔'' ⑤

اُمت کو بھی اہل و عیال کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

''تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا ہو اور میں تم میں سب سے بڑھ کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا ہوں۔'' ⑥

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں (جب میری شادی کا ابتدائی دور تھا تو) میں رسول اللہ ﷺ کے یہاں گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی اور میری سہیلیاں بھی میرے ساتھ کھیلتی تھیں۔ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے تو میری سہیلیاں (شرم کی وجہ سے) آپ ﷺ سے چھپ جاتی تھیں۔ لیکن آپ ﷺ ان کو میرے پاس بھیج دیا کرتے تھے اور وہ میرے ساتھ کھیلنے لگتی تھیں۔ ⑦

---

① زاد المعاد: ۳۳۲/۲ تا ۳۴۰، فصل فی ھدیہ ﷺ فی الاذکار، ط الرسالۃ

② شمائل الترمذی، ص ۱۹۳، باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ ﷺ، عن عائشۃ رضی اللہ عنہا۔ ط احیاء التراث العربی

③ سبل الھدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد: ۳۵۶/۷ ④ مسند احمد، ح: ۲۶۱۹۴

⑤ سنن ابی داؤد، ح: ۲۱۳۴، کتاب النکاح، باب فی القسم بین النساء

⑥ سنن الترمذی، کتاب المناقب، باب فی فضل ازواج النبی ﷺ ⑦ صحیح البخاری، کتاب الفضائل، باب فضل عائشۃ رضی اللہ عنہا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ مجھ سے فرمانے لگے: ''جس وقت تم مجھ سے خوش ہوتی ہوتو میں جان جاتا ہوں اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہوتو بھی مجھے معلوم ہوجاتا ہے۔''

میں نے عرض کیا کہ آپ کس طرح پہچان لیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

''جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہوتو اس طرح کہتی ہو: یہ بات نہیں، محمد ﷺ کے رب کی قسم! اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہوتو کہتی ہو: یہ بات نہیں، ابراہیم علیہ السلام کے رب کی قسم!'' (یعنی میرا نام نہیں لیتیں)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''ہاں ہاں یا رسول اللہ! یہ بات ٹھیک ہے لیکن میں صرف آپ کا نام (زبان سے) ہی چھوڑتی ہوں۔'' (نہ کہ دل سے)[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: مجھے یاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ میرے حجرے کے دروازے پر کھڑے تھے اور حبشی لوگ مسجد میں اپنے نیزوں سے کرتب دکھارہے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی چادر سے میرے لئے پردہ کر رکھا تھا تاکہ میں بھی آپ کے کان اور کندھوں کے درمیان سے ان حبشیوں کا کھیل دیکھتی رہوں۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ اس وقت تک (پردہ کئے) کھڑے رہے جب تک میں خود وہاں سے نہ ہٹ گئی۔ اور اب تم خود اندازہ کرلو کہ ایک کم عمر لڑکی جو کھیل تماشہ کی شوقین ہو کتنی دیر تک کھڑی رہی ہوگی۔[2]

اندازِ گفتگو:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ کی گفتگو تم لوگوں کی طرح مسلسل اور تیز نہیں ہوتی تھی، آپ ﷺ دھیرے دھیرے بولتے تھے، مضمون اس قدر سادہ اور واضح کہ سننے والے اچھی طرح ذہن نشین کر لیتے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق: ''اگر کوئی شخص چاہتا تو حضور ﷺ کے بولے ہوئے الفاظ گن سکتا تھا۔''[3]

بچوں سے پیار:

رسول اللہ ﷺ بچوں سے نہایت پیار محبت سے پیش آتے تھے، ان کی تربیت کے لیے بڑے پیارے انداز سے کوشش فرماتے تھے، اس شفقت سے ہدایات دیتے تھے کہ بچوں کے دلوں میں اتر جاتی تھیں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود بچوں کو کبھی نظر انداز نہیں فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ بچوں کی پیدائش کے وقت کان میں اذان دلوانے کا اہتمام فرماتے تھے، حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی پیدائش ہوئی تو میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ نے ان کے کان میں اذان کہی۔''[4]

[1] صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب غیرۃ النساء

[2] صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب حسن المعاشرۃ مع الاھل

[3] شمائل ترمذی، باب کیف کان کلام رسول اللہ ﷺ

[4] سنن ابی داؤد، ح: ۵۱۰۵، کتاب الادب، باب فی الصبی یولد ؛ سنن الترمذی، ح: ۱۵۱۴، ابواب الاضاحی، باب الاذان فی اذن المولود، حدیث صحیح

اس میں حکمت یہ ہے کہ بچہ شروع سے دین کی پکار سن لے اور اسلام و توحید اس کے لاشعور میں جاگزیں ہو جائے۔
رسول اللہ ﷺ بچوں کو زندگی کے آداب سکھاتے، کوئی ساتھ کھانے بیٹھتا تو اسے کھانے کا سلیقہ بھی بتاتے تھے۔ اپنے سوتیلے بیٹے عمر بن ابی سلمہ کو آداب کے خلاف کھاتے دیکھا تو فرمایا: ''اے بچے! جب کھانا شروع کرو تو بسم اللہ کہہ کر شروع کرو اور دائیں ہاتھ سے کھانا کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔''[1]

رسول اللہ ﷺ بچوں کی ولادت کے موقع پر گھٹی دیا کرتے تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: ''میرے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ میں اسے لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے اس کا نام ابراہیم رکھا اور کھجور چبا کر اس کے منہ میں ڈالی۔ اس کے لیے برکت کی دعا فرمائی۔ پھر اسے میرے حوالے کر دیا۔''[2]

بچوں کا اتنا لحاظ فرماتے کہ اگر عبادت میں حرج ہوتا تب بھی ناراض نہ ہوتے۔ ایک بار حضور ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ سجدے میں جاتے تو حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما آپ کی پشت پر بیٹھ جاتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انہیں ہٹانا چاہتے تو آپ اشارے سے فرماتے کہ رہنے دو، نماز سے فارغ ہو کر آپ انہیں اپنی گود میں بٹھا لیتے اور فرماتے: ''جو مجھ سے محبت کرتا ہے، اسے چاہیے کہ ان دونوں سے محبت کرے۔''[3]

نبی کریم ﷺ بچوں کا نام اچھا رکھنے کا حکم فرماتے تھے، اسے والدین کی اہم ذمہ داری شمار کرتے تھے، اس سلسلے میں بکثرت احادیث موجود ہیں، ایک جگہ ارشاد ہے: ''اللہ کو سب سے زیادہ پیارے نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں۔''[4]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں ایک دن نبی کریم ﷺ کے ساتھ نکلا۔ راستے میں نہ آپ کی مجھ سے بات ہوئی نہ میری آپ سے۔ حتیٰ کہ بنو قینقاع کا بازار آ گیا۔ پھر وہاں سے واپس لوٹے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تک آئے۔ آپ فرما رہے تھے: ''کیا یہاں منا (حسین) ہے؟ کیا یہاں منا ہے؟''

تو ہم سمجھ گئے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا انہیں تیار کر رہی ہیں۔ تھوڑی دیر میں حسین آ گئے، اور حسین اور نبی کریم ﷺ نے ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالا (گلے ملے) نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''اے اللہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تو بھی اسے محبوب رکھ اور جو اس سے محبت کرے اسے بھی محبوب رکھ۔''[5]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بچپن میں ایک دن نبی کریم ﷺ کے پیچھے سواری پر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

''اے بچے! میں تجھے چند باتوں کی تعلیم دیتا ہوں: اللہ کو یاد رکھنا، وہ تجھے یاد رکھے گا۔ اللہ کو یاد رکھنا، تو

---

① صحیح البخاری، ح: ۵۳۷۶، کتاب الاطعمۃ، باب التسمیۃ علی الطعام
② صحیح البخاری، ح: ۵۴۶۷، کتاب العقیقۃ، باب تسمیۃ المولود ③ مسند ابی یعلیٰ، ح: ۵۰۱۷، باسناد حسن
④ سنن ابی داؤد، ح: ۴۹۴۹، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسماء ؛ سنن الترمذی، ح: ۲۸۳۳، ابواب الادب، باب ماجاء ما یستحب من الاسماء
⑤ صحیح البخاری، ح: ۲۱۲۲، کتاب البیوع، باب ما ذکر فی الاسواق

اے اپنے سامنے پائے گا۔ جب مانگنا، اللہ سے مانگنا۔ جب مدد طلب کرنا، اللہ سے کرنا۔ خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ ساری دنیا اگر اتفاق کر لے کہ تجھے کوئی نفع پہنچائے، تب بھی تجھے کوئی نفع نہیں پہنچا سکے گی، سوائے اس کے جو اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے۔ اگر ساری دنیا اتفاق کر لے کہ تجھے مل جل کر کوئی نقصان پہنچائے تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی، لیکن اتنا ہی جتنا اللہ نے لکھ دیا ہے۔ قلم خشک ہو گئے اور دفتر تہہ کر دیے گئے۔''[1]

حضور ﷺ بچوں کو ہنساتے اور بہلاتے بھی تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر تشریف لایا کرتے تھے۔ میرا ایک چھوٹا بھائی ابوعمیر تھا، اس کے پاس ایک نُغَر (سرخ چونچ والی چھوٹی سی چڑیا) تھی جس سے وہ کھیلتا تھا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو دیکھا کہ ابوعمیر غم گین بیٹھا ہے۔

دریافت فرمایا: ''کیا ہوا؟ ابوعمیر غم زدہ کیوں ہے؟''

گھر والوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! اس کی وہ چڑیا مرگئی ہے جس سے وہ کھیلتا تھا۔''

رسول اللہ ﷺ نے بچے کو بہلاتے ہوئے فرمایا: ''اے ابوعمیر! کیا ہوا نُغَیر؟''[2]

دلکش اندازِ مزاح:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا:

''یا رسول اللہ! آپ ہم سے مذاق بھی فرما لیتے ہیں؟''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! مگر میں کبھی غلط بات نہیں کہتا۔''[3]

ایک دن مجلس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''جنت میں ایک شخص اللہ تعالیٰ سے کھیتی کرنے کی خواہش بیان کرے گا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: کیا تمہاری ہر خواہش پوری نہیں ہوگئی ہے؟ وہ کہے گا: جی ہاں! لیکن میں چاہتا ہوں کہ فوراً بوؤں اور ساتھ ہی تیار ہو جائے۔ چنانچہ وہ بیج ڈالے گا، فوراً دانہ اگے گا، بڑھے گا اور کاٹنے کے قابل ہو جائے گا۔''

ایک بدو بیٹھا ہوا یہ باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا: ''یہ سعادت تو صرف کسی قریشی یا انصاری کو نصیب ہوگی؛ کیوں کہ وہی زراعت پیشہ ہیں، ہم نہیں۔'' یہ سن کر نبی کریم ﷺ مسکرا دیے۔[4]

ایک بار کسی بوڑھی عورت نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

''یا رسول اللہ! دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل کر دے۔''

---

[1] سنن الترمذی، ح: ۲۵۱٦ حدیث صحیح

[2] سنن ابی داؤد، ح: ۴۹٦۹، کتاب الادب؛ مسند احمد، ح: ۱۳۰۷۱، باسناد صحیح

[3] سنن الترمذی، ح: ۱۹۹۰

[4] صحیح البخاری، ح: ۷۵۱۹، کتاب التوحید، باب کلام الرب مع اهل الجنة

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں کوئی بوڑھی عورت نہیں جائے گی۔''

وہ عورت روتے ہوئے واپس جانے لگی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''اسے بتادو کہ وہ جنت میں بڑھاپے کی حالت میں داخل نہ ہوگی (جوان بن کر جنت میں جائے گی)[1] کیوں کر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا

(ہم نے ان عورتوں کو خاص طور پر بنایا ہے، پس بنایا ہے ان کو کنواریاں۔)[2]

حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں آیا اور اپنے لیے سواری مانگی۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہم تمہیں اونٹنی کا بچہ دیں گے۔''

اس نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! میں اونٹنی کے بچے کا کیا کروں گا۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہر اونٹ اونٹنی کا بچہ ہی تو ہوتا ہے۔''[3]

ایک بار حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات کے لئے آئیں۔ وہاں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا بن سنور کر اچھی حالت میں آئی تھیں۔ ان پر خوبصورت یمنی منقش چادر تھی۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''حضور ﷺ تشریف لاتے ہیں اور یہ (سَودہ) ہمارے درمیان چمکتی ہیں۔ میں آج ضرور ان کی زینت خراب کروں گی۔'' ان دونوں کی سرگوشیاں سن کر حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: ''تم کیا کہہ رہی ہو؟'' حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''کانا (دجال) نکل آیا ہے۔''

حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا بہت گھبرائیں اور ان پر کپکپی طاری ہوگئی۔ کہا: ''ہاں! میں کہاں چھپوں؟''

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''خیمے میں چلی جاؤ۔''

وہ وہاں چلی گئیں۔ وہ خیمہ سامان خانہ تھا جس میں کچرا اور مکڑی کے جالے تھے۔ نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہا ہنس رہی تھیں، ہنسی کے مارے بات بھی نہیں کی جارہی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے پوچھا:

''کیوں ہنس رہی ہو؟'' ان دونوں نے خیمے کی طرف اشارہ کیا۔

نبی کریم ﷺ خیمے کے پاس گئے۔ وہاں سَودہ رضی اللہ عنہا کپکپارہی تھیں۔ فرمایا: ''سودہ! کیا ہوا؟''

حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''کانا (دجال) نکل آیا ہے۔''

آپ نے فرمایا: ''ابھی نہیں نکلا۔ البتہ نکلے گا۔ ابھی نہیں نکلا۔ البتہ ضرور نکلے گا۔''

یہ کہہ کر نبی کریم ﷺ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے کپڑے سے غبار اور مکڑی کے جالے جھاڑنے لگے۔[4]

---

① شرح السنة للبغوی: ۱۸۳/۱۳، باب المزاح، ط المکتب الاسلامی دِمَشق

② سورة الواقعة، آیت: ۳۵، ۳۶

③ سنن ابی داؤد، ح: ۴۹۹۸، کتاب الادب، باب ما جاء فی المزاح

④ مسند ابی یعلی الموصلی: ۸۹/۱۳، ط دار المامون

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس حریرہ (ایک قسم کا حلوہ) لے کر آئی۔ نبی اکرم ﷺ میرے اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے درمیان تھے۔ میں نے سودہ رضی اللہ عنہا سے کہا: کھاؤ۔ انہوں نے (کسی وجہ سے) انکار کیا۔ میں نے کہا: کھالو ورنہ یہ تمہارے چہرے پر مل دوں گی۔ پھر بھی انہوں نے انکار کیا تو میں نے حریرے میں ہاتھ ڈالا اور ان کے چہرے پر مل دیا۔ نبی کریم ﷺ ہنس رہے تھے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: تم اس کے چہرے پر مل دو۔ انہوں نے میرے چہرے پر مل دیا اور نبی کریم ﷺ ہنس رہے تھے۔ [1]

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں ایک مرتبہ سفر میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تھی۔ میں نے آپ ﷺ کے ساتھ دوڑ لگائی اور آپ سے آگے نکل گئی۔ پھر جب (کچھ مدت بعد) میں فربہ ہوگئی تو پھر ہماری دوڑ ہوئی اور اس مرتبہ آپ ﷺ مجھ سے آگے نکل گئے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

"یہ اس کے بدلے میں ہے۔" (یعنی پہلے تم جیتی تھیں۔ اب میں جیت گیا لہٰذا دونوں برابر رہے) [2]

☆☆☆

① مجمع الزوائد، ح: ۷۶۸۳، قال الهيثمي: رواه ابو يعلى و رجاله رجال الصحيح

② سنن ابی داؤد، ح: ۲۵۷۸، كتاب الجهاد، باب في السبق على الرجل

خراجِ عقیدت

۱ شاعر دربارِ رسالت حضرت کعب بن زُہیر رضی اللہ عنہ

اِنَّ الـــرَّسُـــوْلَ لَسَيْفٌ يُسْتَـــضَـــاءُ بِـــهٖ
مُهَـــنَّـــدٌ مِّـــنْ سُيُـــوْفِ اللهِ مَسْـــلُـــوْلُ

''بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ تلوار ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے، وہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک کھینچی ہوئی تلوار ہیں۔''

☆☆☆

۱ مجاہدِ اسلام، شہیدِ جنگ مُوتہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ

رُوْحِـــي الْـــفِـــدَاءُ لِـــمَـــنْ اَخْلَاقُـــهٗ شَهِـــدَتْ
بِـــاَنَّـــهٗ خَيْـــرُ مَـــوْلُـــوْدٍ مِّـــنَ الْبَشَـــرِ

''میری جان ان پر فدا جن کے اخلاق شاہد ہیں کہ وہ بنی نوع انسان میں افضل ترین ذات ہیں۔''

☆☆☆

۱ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ[1]

ولے یہ رتبہ کہاں مشتِ خاکِ قاسم کا
کہ بن کے جائے ترے کوچۂ اطہر میں بن کے غبار

☆☆☆

۱ شاعرِ مشرق ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم

وہ دانائے سُبُل، ختم الرسل، مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یاسیں وہی طٰہٰ

☆☆☆

---

[1] بانی دارالعلوم دیوبند

سلام بحضور خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم

(حضرت سید نفیس شاہ الحسینی رحمہ اللہ)

الٰہی محبوبِ کُل جہاں کو، دل و جگر کا سلام پہنچے
نفسؔ نفس کا دُرود پہنچے، نظر نظر کا سلام پہنچے
بساطِ عالم کی وسعتوں سے، جہانِ بالا کی رِفعتوں سے
مَلَك مَلَك کا درود اُترے، بشر بشر کا سلام پہنچے
حضور کی شام شام مہکے، حضور کی رات رات جاگے
ملائکہ کے حسین جلو میں، سحر سحر کا سلام پہنچے
زبانِ فطرت ہے اس پہ ناطق، بارگاہِ نبیِ صادق
شجر شجر کا درود جائے، حجر حجر کا سلام پہنچے
نبیِ رحمت کا بارِ احساں، تمام خلقت کے دوش پر ہے
تو ایسے محسن کو بستی بستی، نگر نگر کا سلام پہنچے
مرا قلم بھی ہے ان کا صدقہ، مرے ہنر پر ہے ان کی رحمت
حضورِ خواجہ مرے قلم کا، مرے ہنر کا سلام پہنچے
یہ التجا ہے کہ روزِ محشر، گناہ گاروں پہ بھی نظر ہو
شفیعِ اُمّت کو ہم غریبوں کی چشمِ تر کا سلام پہنچے
نفیسؔ کی بس دعا یہی ہے، فقیر کی اب صدا یہی ہے
سوادِ طیبہ میں رہنے والوں کو عمر بھر کا سلام پہنچے

☆☆☆

حیاتِ طیبہ کا توقیتی خاکہ

ملحوظات:

❶ سیرتِ نبویہ کے قدیم مآخذ میں بیان کی گئی اکثر تاریخیں مکی تقویم کے مطابق ہیں؛ کیوں کہ اس وقت اکثر اسی کا رواج تھا جس کے بہت سے شواہد موجود ہیں۔لیکن اگر کوئی تاریخ کسی دلیل یا قرینے سے مدنی تقویم کے مطابق ثابت ہو تو پھر اس کے بالمقابل عیسوی تاریخ بھی لازماً بدل جائے گی۔

❷ توقیتی جداول میں جہاں کسی تاریخ کو سایہ دار کر کے دکھایا گیا ہے، وہاں مراد یہ ہے کہ اصحابِ سیر کے ہاں مشہور منقول تاریخ یہی ہے جبکہ غیر سایہ دار تاریخیں تقویمی حسابات، موسمی قرائن یا دیگر شواہد کے ذریعے تخمیناً نکالی گئی ہیں۔

مکی دور...... قبل از نبوت

واقعہ	مکی (شمسی قمری) تقویم	عیسوی تقویم	مدنی ہجری تقویم	حضور ﷺ کی عمر مبارک مکی تقویم کے مطابق
ابرہہ کا مکہ پر حملہ	۱۸ رجب۔۵۳ سال قبل الہجرۃ۔	۲۳ مارچ ۵۶۹ء	۱۸ محرم (۵۴ سال دس ماہ قبل الہجرۃ)	**۵۰ دن قبل از میلادِ نبوی**
ولادتِ باسعادت	پیر، ۸ **رمضان**، (۵۳ سال چار ماہ قبل الہجرۃ) ایک میلادِ نبوی	پیر ۱۳ مئی ۵۶۹ء	**پیر ۸ ربیع الاول** (۵۵ سال قبل الہجرۃ)	یوم ولادت
شقِ صدر	۳ میلادِ نبوی	۵۷۱ء		**دو سال** سے کچھ زیادہ

دائی حلیمہ کے ہاں سے واپسی	۵ میلادنبوی	۵۷۳ء		چار سال سے کچھ زیادہ
والدہ ماجدہ کی وفات	۷ میلادنبوی	۵۷۵ء		چھ سال سے کچھ زیادہ
عبدالمطلب کی وفات	سنہ ۹ میلادِنبوی کا آغاز، رمضان	مئی ۵۷۷ء	جمادی الآخرہ ۹ میلادنبوی	آٹھ سال سے چند دن زیادہ
چچا جناب ابوطالب کے ساتھ شام کا سفر	۱۳ میلادنبوی	اپریل ۵۸۲ء		تقریباً ساڑھے بارہ سال
حرب فجار رابع میں شرکت	شوال ۱۶ میلادنبوی	جون ۵۸۴ء		۱۵ سال ایک ماہ
بکریاں چرانا	۱۷ میلادنبوی	۵۸۵ء، ۵۸۶ء		۱۶، ۱۷ سال (اندازاً)
چچا جناب زبیر کے ساتھ یمن کا سفر	۱۹ میلادنبوی	اکتوبر نومبر ۵۸۷ء		۱۸ سال سے زیادہ (اندازاً)
حلف الفضول میں شرکت	ذوالقعدہ ۲۱ میلادنبوی	جولائی ۵۸۹ء		۲۰ سال دو ماہ
تجارت کے لیے شام کا دوسرا سفر	رجب، شعبان ۲۵ میلادنبوی	مارچ اپریل ۵۹۳ء		۲۴ سال ۱۰ ماہ (اندازاً)
حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح	شوال ۲۶ میلادنبوی	جون ۵۹۴ء		۲۵ سال دو ماہ (اندازاً)
حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ولادت	۳۱ میلادنبوی کا آغاز، ۱۰ سال قبل از بعثت	۵۹۹ء		۳۰ سال سے کچھ اوپر
حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہا کی ولادت	۳۳ میلادِنبوی، ۷ سال قبل از بعثت	۶۰۲ء		۳۲ سال سے کچھ اوپر
غیبی انوارات کا مشاہدہ	۳۳ میلادِنبوی، ۷ سال قبل از بعثت	۶۰۲ء		۳۲، ۳۳ سال کے درمیان
ولادتِ اُمِّ کلثوم رضی اللہ عنہا	۸ سال قبل از بعثت	۶۰۳ء		۳۴ سال

تعمیر کعبہ اور تنصیب حجر اسود۔	۱۲ شعبان ۳۶ میلاد نبوی (پانچ سال قبل از بعثت)	اپریل ۶۰۴ء	۱۲ ربیع الاول	۳۴ سال گیارہ ماہ
ولادتِ فاطمہ رضی اللہ عنہا	شعبان ۳۶ میلاد نبوی (پانچ سال قبل از بعثت)	اپریل ۶۰۴ء	ربیع الاول	۳۴ سال گیارہ ماہ
ارہاصات (علاماتِ نبوت) کا ظہور	۳۹، ۴۰ میلاد نبوی	۶۰۸ء، ۶۰۹ء		۳۸، ۳۹ سال
غارِ حرا میں تنہائی اور گوشہ نشینی کے ایام	۴۰، ۴۱ میلاد نبوی	۶۰۹ء، ۶۱۰ء		۴۰ سال

☆☆☆

مکی دور بعد از نبوت

یہ حضور ﷺ کے اعلانِ نبوت سے ہجرتِ مدینہ تک کے حالات کی توقیت پر مشتمل جدول ہے۔ اصولاً توقیت میں سالہائے نبوت کا شمار رمضان تا رمضان شمار ہونا چاہیے؛ کیوں کہ ہم نے حافظ ابنِ کثیر کی ترجیح کے پیشِ نظر آغازِ نبوت رمضان میں راجح سمجھا ہے۔ مگر عموماً مؤرخین نے اس میں کی تقویم کے محرم تا محرم کا حساب رکھا ہے۔ ہم بھی اسی کو اختیار کر رہے ہیں تا کہ قارئین عام تقاویم سے اس تقویم کے ظاہری تضاد دیکھ کر الجھ نہ جائیں۔ مگر اس کے لیے ناگزیر طور پر ہمیں نبوت کا پہلا سال سولہ مہینے کا شمار کرنا پڑا ہے۔

یہ نکتہ بہر حال ذہن میں ہونا چاہیے کہ نبوت کا ہر اصلی سال، سالِ مشہور سے چار ماہ قبل رمضان میں مکمل ہوتا رہا اور بعض راویوں نے اس حساب سے بھی واقعہ نقل کیا ہے۔ اس لیے ایسے مقام پر ذوالحجہ ۹ نبوی کے دو ماہ بعد صفر ۹ نبوی، یا شعبان ۵ نبوی کے ایک ماہ بعد رمضان ۶ نبوی دیکھ کر حیرت نہ ہو؛ کیوں کہ اصل توقیت کے مطابق سال رمضان میں بدل رہا ہے، محرم میں نہیں۔ اس درست حساب کے باعث سیرت نگاروں کی نقل کردہ بعض تاریخوں سے انحراف ہو جاتا ہے مگر یہی دشوار گزار راستہ فنِ سیرت کے بعض اشکالات اور بعض ظاہری تضادات کا ازالہ بھی کر دیتا ہے۔

واقعہ	مکی تقویم	عیسوی تقویم	مدنی تقویم	حضور ﷺ کی عمر مبارک مکی تقویم کے مطابق
پہلا سالِ نبوت	رمضان	مئی ۶۰۹ء		
پہلی وحی	پیر ۹ رمضان، آغازِ سنہ ایک نبوی، تیرہ سال چار ماہ قبل الہجرۃ، ۹ ربیع الاوّل (شمسی قمری ربیعی تقویم)	۱۹ مئی ۶۰۹ء	۹ جمادی الآخرہ تیرہ سال پانچ ماہ قبل الہجرۃ	مکی تقویم کے ۴۰ سال مکمل
خفیہ تبلیغ شروع	آغاز رمضان سنہ ا نبوی	مئی ۶۰۹ء		۴۱ ویں سال کا آغاز
دوسرا سال نبوت	آغاز محرم	ستمبر ۶۱۰ء		
تیسرا سال نبوت	آغاز محرم	ستمبر ۶۱۱ء		
اعلانیہ تبلیغ کا آغاز	بعثت کے تین سال مکمل ہونے پر۔ ماہِ رمضان۔ دس سال چار ماہ قبل الہجرۃ	مئی ۶۱۲ء	رجب۔ دس سال سات ماہ قبل الہجرۃ	۴۳ سال مکمل
چوتھا سال نبوت	آغاز محرم	ستمبر ۶۱۲ء		
سوقِ عکاظ میں دعوت	شوال	جون ۶۱۳ء		
عازمینِ حج میں تبلیغ کا آغاز	ذوالحجہ	اگست ۶۱۳ء		

پانچواں سال نبوت	آغاز محرم	ستمبر ۶۱۳ء		
ہجرتِ حبشہ اولیٰ	**رجب ۵ نبوی** ۸ سال ۵ ماہ قبل الہجرۃ	مارچ ۶۱۴ء	جمادی الآخرہ ۸ سال ۷ ماہ قبل الہجرۃ	۴۴ سال ۱۰ ماہ
سورۃ النجم کا نزول	**رمضان ۵ نبوی**	مئی ۶۱۴ء		
حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام	**ذوالحجہ** ۵ نبوی ۸ سال ایک ماہ قبل الہجرۃ	اگست ۶۱۴ء	ذوالقعدہ ۸ سال ۴ ماہ قبل الہجرۃ	۴۵ سال ۳ ماہ
چھٹا سال نبوت	آغاز محرم	ستمبر ۶۱۴ء		
ہجرتِ حبشہ اولیٰ سے واپسی	۶ نبوی کا آغاز (اندازاً)	موسم خزاں ۶۱۴ء (اندازاً)		
ہجرتِ حبشہ ثانیہ	اواخرِ ۶ نبوی (اندازاً)	موسم خزاں ۶۱۵ء (اندازاً)		۴۶ سال کے قریب
ساتواں سال نبوت	محرم	ستمبر ۶۱۵ء		
قریشی وفد کی نجاشی کے پاس حاضری	اوائل ۷ نبوی			
اوس اور خزرج کے درمیان جنگ بُعاث	وسط ۷ نبوی	اوائل ۶۱۶ء		۴۶ سال چند ماہ
آٹھواں سال نبوت		ستمبر ۶۱۶ء		
شعب ابی طالب کا محاصرہ	**محرم ۸ نبوی**	ستمبر ۶۱۶ء	محرم	۴۷ سال چار ماہ

حضرت ابوبکرؓ کی کفار کے ساتھ روم کے غلبے کی شرط	رمضان ۸ نبوی	مئی ۶۱۷ء		
نواں سال نبوت	محرم	ستمبر ۶۱۷ء		
حضرت ابوبکرؓ کی حبشہ روانگی اور واپسی				
دسواں سال نبوت	محرم	ستمبر ۶۱۸ء		
شعب ابی طالب کا محاصرہ ختم	۵ ربیع الآخر ۱۰ نبوی	۹ دسمبر ۶۱۸ء	شعبان	۴۹ سال دس ماہ
وفات حضرت خدیجہؓ	۱۰ رمضان	۳۰ مئی ۶۱۹ء	شوال	پچاس سال دو دن
حضرت سودہؓ سے نکاح	اواخر رمضان	وسط جون ۶۱۹ء	اواخر شوال	پچاس سال نصف ماہ
جناب ابوطالب کی وفات	۱۵ شوال	۳ جولائی ۶۱۹ء	۱۵ ذوالقعدہ	پچاس سال ایک ماہ سات دن
سفر طائف کا آغاز	۲۷ شوال	۵ جولائی ۶۱۹ء	۲۷ ذوالقعدہ	پچاس سال ڈیڑھ ماہ
طائف سے واپسی	۲۳ ذوالقعدہ	۱۰ اگست ۶۱۹ء	۲۳ ذوالحجہ	پچاس سال اڑھائی ماہ
جنات کا قبول اسلام	ذوالحجہ	اواخر اگست ۶۱۹ء	محرم	پچاس سال تین ماہ
گیارہواں سال نبوت	محرم	ستمبر ۶۱۹ء		
حضرت عائشہؓ سے نکاح	شوال	جون ۶۲۰ء	ذوالقعدہ	۵۱ سال ایک ماہ
بیعت عقبہ اولیٰ	ذوالحجہ	وسط اگست ۶۲۰ء	محرم	۵۱ سال تین ماہ
بارہواں سال نبوت	محرم	ستمبر ۶۲۰ء		

سفرِ معراج	۲۷رجب	۲۶اپریل ۶۲۱ء	۲۷رمضان	۵۱ سال دس ماہ بیس دن
بیعتِ عقبہ ثانیہ	ذوالحجہ	اوائلِ ستمبر ۶۲۱ء	صفر	۵۲ سال ۳ ماہ
تیرھواں سالِ نبوت	محرم	اواخرِ ستمبر ۶۲۱ء		
صحابہ کی مدینہ ہجرت	شعبان تا ذوالقعدہ	اپریل ۶۲۲ء تا جولائی ۶۲۲ء	شوال تا محرم	۵۳ سال سے کچھ اوپر

مدنی دور

مدنی دور میں ایک واضح تبدیلی یہ دکھائی دیتی ہے کہ واقعات کو بکثرت محفوظ کیا گیا ہے۔ مکی دور کے پورے پورے سالوں میں ایک دو واقعات ہی منقول ملتے ہیں جن میں دن یا تاریخ کا تعین بہت کم ہے، عموماً سال یا زیادہ سے زیادہ اس کے ساتھ مہینہ مذکور ملتا ہے جبکہ مدنی دور کے ایک سال میں کئی کئی واقعات مع تاریخ اور دن کے بھی محفوظ ہیں۔

اس دور میں مکی تقویم کے ساتھ مدنی تقویم بھی استعمال ہونے لگی۔ اس لیے یہاں مکی تقویم کے شانہ بشانہ مدنی تقویم پر منحصر روایات بھی ملتی ہیں۔ سالوں کو ہجری سال کہہ کر یاد کیا جاتا ہے مگر ایک الجھن یہ ہے کہ راوی ان ہجری سالوں کے آغاز و اختتام کے متعلق کبھی مکی تقویم اختیار کرتے رہے اور کبھی مدنی تقویم۔ تعین نہ ہونے کی وجہ سے آج بھی واقعاتِ سیرت کی توقیت میں متعدد غلط فہمیاں جنم لیتی رہتی ہیں۔ پیشِ خدمت جدول میں اس الجھن کو ختم کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔ مکی تقویم جو ''نسی'' کی رسم پر مبنی تھی، حجۃ الوداع میں منسوخ ہوئی تھی۔ اس لیے اس سے پہلے کے دور پر مکی تقویم کی چھاپ گہری دکھائی دیتی ہے۔

واقعہ	**مکی تقویم**	**عیسوی تقویم**	**مدنی تقویم**	**حضور ﷺ کی عمر مبارک مکی تقویم کے مطابق**
	ذوالقعدہ	جمعہ ۱۶ جولائی ۶۲۲ء	**۱ ہجری کا آغاز۔ یکم محرم**	
حضور ﷺ کی غارِ ثور میں روپوشی	۲۷ ذوالحجہ	۱۰ ستمبر ۶۲۲ء	جمعہ ۲۷ صفر ایک ہجری	۵۳ سال ۵ ماہ ۲۰ دن

مکی سنہ ۱ ہجری کا آغاز۔یکم محرم		پیر/۱۳ستمبر/۶۲۲ء		
غارِثور سے روانگی	یکم محرم	۱۳ستمبر۶۲۲ء	پیر یکم ربیع الاوّل ایک ہجری	۵۳سال ۵ماہ ۲۳دن
قُبا میں آمد،مسجدِ قبا کی بنیاد	۸محرم	۲۰ستمبر۶۲۲ء بروز پیر	پیر ۸ربیع الاوّل ایک ہجری	۵۳سال چھ ماہ مکمل
مسجد بنوسالم میں پہلا جمعہ	۱۲محرم	۲۴ستمبر۶۲۲ء	جمعہ ۱۲ ربیع الاوّل ایک ہجری	
مدینہ میں پہلی بار تشریف آوری	۱۲محرم	۱۷اکتوبر۶۲۲ء بروز جمعہ	جمعہ ۱۲ ربیع الاوّل ایک ہجری	
قُبا کا قیام ترک کرکے مدینہ میں مستقل آمد	۲۲محرم (قبا میں چودہ روزہ قیام کا اختتام)	۱۴اکتوبر۶۲۲ء	پیر۲۲ربیع الاوّل ایک ہجری	
مسجدِ نبوی کی تاسیس		اوائلِ اکتوبر۶۲۲ء	اواخرِ ربیع الاوّل ایک ہجری	
سریۂ حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ	رجب	مارچ۶۲۳ء	رمضان۔ایک ہجری	۵۳سال دس ماہ مکمل
سریۂ عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ	شعبان	اپریل۶۲۳ء	شوال۔ایک ہجری	۵۴سال ایک ماہ
رخصتی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا	شوال	جون۶۲۳ء	ذوالحجہ	۵۴سال ایک ماہ

		منگل ۵ جولائی ۶۲۳ء	مدنی سنہ ۲ ہجری کا آغاز۔یکم محرم	
	مکی سنہ ۲ ہجری کا آغاز۔یکم محرم	۱۲ اکتوبر ۶۲۳ء		
غزوۂ ابواء، غزوہ ذات العشیرہ (ایک مسلسل سفر کی دومہمات۔)	صفر	نومبر ۶۲۳ء	جمادی الاولیٰ ۲ ہجری	۵۴ سال ۶ ماہ
کرز بن جابر کا مدینہ پر چھاپہ	ربیع الاول	دسمبر ۶۲۳ء	جمادی الآخرہ ۲ ہجری	۵۴ سال ۷ ماہ
غزوہ بواط	ربیع الآخر	جنوری ۶۲۴ء	رجب ۲ ہجری	۵۴ سال ۸ ماہ
تحویلِ قبلہ	جمادی الاولیٰ	فروری ۶۲۴ء	۱۵ شعبان ۲ ہجری	۵۴ سال ۹ ماہ
سریہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ	جمادی الآخرہ، رجب	مارچ ۶۲۴ء	رمضان ۲ ہجری	۵۴ سال ۱۰ ماہ
غزوۂ ینبع	اوائل شعبان	اوائلِ مئی ۶۲۴ء	ذوالقعدہ ۲ ہجری	۵۴ سال ۱۱ ماہ
غزوہ بنوغفار واسلم	وسطِ شعبان	وسطِ مئی ۶۲۴ء		۵۴ سال ۱۱ ماہ
فرضیت صوم رمضان	شعبان	مئی ۶۲۴ء		۵۴ سال ۱۱ ماہ
غزوۂ بدر	جمعہ ۱۷ رمضان	۱۲ جون ۶۲۴ء	۱۷ ذوالحجہ ۲ ہجری	۵۵ سال ۹ دن

وفات رقیہ رضی اللہ عنہا	فتح بدر کی خبر مدینہ پہنچنے سے قبل (۱۹ رمضان اندازاً)	۱۵ جون ۶۲۴ء		[illegible]
رخصتی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا	آخری عشرہ رمضان	اواخرِ جون ۶۲۴ء	اواخرِ ذوالحجہ ۲ ہجری	[illegible]
مشروعیت صدقہ فطر و زکوٰۃ	۲۷ رمضان	۲۲ جون ۶۲۴ء	۲۸ ذوالحجہ ۲ ہجری	۵۵ سال ۱۹ دن
		ہفتہ ۲۳ جون ۶۲۴ء	**مدنی سنہ ۳ ھجری کا آغاز۔یکم محرم**	
پہلی نماز عید الفطر	یکم شوال	۲۳ جون ۶۲۴ء	یکم محرم ۳ ہجری	۵۵ سال ۲۲ دن
غزوہ بنی قینقاع، آغاز	۱۴ شوال ۲ھ	۷ جولائی ۶۲۴ء	۱۴ محرم ۳ھ	۵۵ سال ایک ماہ ۶ دن
غزوہ بنی قینقاع، اختتام	۲۹ شوال ۲ھ	۲۲ جولائی ۶۲۴ء	۲۹ محرم ۳ھ	۵۵ سال ایک ماہ ۲۱ دن
غزوہ سویق	۵ ذوالحجہ ۲ھ	۲۶ اگست ۶۲۴ء	۵ ربیع الاول ۳ھ	۵۵ سال دو ماہ ۲۶ دن
پہلی نماز عید الاضحیٰ	۱۰ ذوالحجہ ۲ھ	جمعہ ۳۱ اگست ۶۲۴ء	۱۰ ربیع الاول	۵۵ سال ۳ ماہ ۲ دن
قتل کعب بن اشرف	۱۴ ذوالحجہ ۲ھ	۴ ستمبر ۶۲۴ء	۱۴ ربیع الاول ۳ھ	۵۵ سال ۳ ماہ ۶ دن
	مکی سنہ ۳ ھجری کا آغاز۔یکم محرم	جمعرات ۲۰ ستمبر ۶۲۴ء		

سریۂ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ۔ذو قردہ کی مہم (شاہراہِ عراق پر)	ربیع الاول ۳ھ	نومبر ۶۲۴ء	جمادی الآخرہ	۵۵ سال ۶ ماہ
نکاحِ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا	ربیع الاول ۳ھ	نومبر ۶۲۴ء	جمادی الآخرہ	۵۵ سال ۳ ماہ
غزوۂ اُحد	رجب ۳ھ	۳۰ مارچ ۶۲۵ء	۱۵ شوال ۳ھ	۵۵ سال ۱۰ ماہ ۷ دن
غزوۂ حمراء الاسد		۳۱ مارچ ۶۲۵ء	۱۶ شوال	۵۵ سال ۱۰ ماہ ۸ دن
		جمعرات ۱۳ جون ۶۲۵ء	**مدنی سنہ ۴ ہجری کا آغاز۔یکم محرم**	
سریۂ رجیع۔صحابہ کی گرفتاری	ذوالقعدہ ۳ھ	جولائی ۶۲۵ء	صفر ۴ ہجری	۵۶ سال ۲ ماہ
	مکی ۴ ہجری کا آغاز، یکم محرم	پیر ۹ ستمبر ۶۲۵ء		
سانحۂ رجیع۔صحابہ کا قتل	صفر ۴ھ	اکتوبر ۶۲۵ء	جمادی الاولیٰ ۴ ہجری	۵۶ سال ۵ ماہ
سانحۂ بئر معونہ	صفر ۴ھ	اکتوبر ۶۲۵ء	جمادی الاولیٰ ۴ ہجری	۵۶ سال ۵ ماہ
غزوۂ بنو لحیان (۱۴ دن کا سفر)	صفر ۴ھ	اکتوبر ۶۲۵ء	جمادی الاولیٰ ۴ ہجری	۵۶ سال ۵ ماہ
غزوۂ بنی نضیر (۲۳ دن کی مہم) آغاز	۱۲ ربیع الاول ۴ھ	۱۹ نومبر ۶۲۵ء	۱۲ جمادی الآخرہ ۴ ہجری	۵۶ سال ۶ ماہ

غزوۂ بنو نضیر، اختتام	۵ ربیع الآخر ۴ھ	۱۱ دسمبر ۶۲۵ء	۵ رجب ۴ ہجری	۵۶ سال ۷ ماہ
غزوۂ بدر الموعد	شعبان ۴ھ	اپریل ۶۲۶ء	ذوالقعدہ ۴ ہجری	۵۶ سال ۱۱ ماہ
سریۂ عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ ۔ قتل ابو رافع یہودی	روانگی ۴ رمضان ۔ (تاریخ قتل اندازاً ۹ رمضان ۴ھ)	۶ مئی ۶۲۶ء (تاریخ قتل اندازاً ۱۱ مئی)	روانگی ۴ ذوالحجہ، (تاریخ قتل اندازاً ۹ ذوالحجہ ۴ھ)	۵۶ سال ۱۱ ماہ ۲۵ دن
سریۂ عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ، واپسی	واپسی ۱۴ رمضان	۱۶ مئی ۶۲۶ء	واپسی ۱۴ ذوالحجہ	۵۷ سال ۶ دن
		پیر ۲ جون ۶۲۶ء	**مدنی سنہ ۵ ہجری کا آغاز، یکم محرم**	
غزوۂ دومۃ الجندل (۲۴ دن) روانگی	۲۵ ذوالقعدہ ۴ھ	۲۴ جولائی ۶۲۶ء	۲۵ ربیع الاول ۵ ہجری	۵۷ سال ۲ ماہ ۱۷ دن
واپسی	۲۰ ذوالحجہ ۴ھ	۱۷ اگست ۶۲۶ء	۲۰ ربیع الآخر	۵۷ سال ۳ ماہ ۱۲ دن
	مکی ۵ ہجری کا آغاز، یکم محرم	اتوار ۲۸ ستمبر ۶۲۶ء		
چاند گرہن		۹ نومبر ۶۲۶ء	جمادی الآخرہ	
غزوۂ مُرَیسیع (غزوۂ بنو مُصطلِق) روانگی	۲ ربیع الآخر ۵ھ	۲۷ دسمبر ۶۲۶ء	۲ شعبان ۵ ہجری	۵۷ سال ۶ ماہ ۲۴ دن
۲۹ دن بعد واپسی	یکم جمادی الاولیٰ ۵ھ	۲۵ جنوری	یکم رمضان	۵۷ سال ۷ ماہ ۲۳ دن

واقعہ	ہجری تاریخ	عیسوی تاریخ	ہجری تاریخ	عمر
واقعہ اِفک	جمادی الاولیٰ ۵ھ	جنوری ۶۲۷ء	رمضان ۵ہجری	۵۷سال ۸ماہ
غزوۂ خندق۔ خندق کی کھدائی، آغاز (کل مدت پندرہ دن)	۲۵ جمادی الاولیٰ ۵ ہجری	۱۸فروری ۶۲۷ء	۲۵رمضان ۵ہجری	۵۷سال ۸ماہ، ۱۷دن
کھدائی مکمل	۱۰جمادی الآخرہ ۵ھ	۴مارچ ۶۲۷ء	۱۰شوال ۵ہجری	۵۷سال ۹ماہ ۲دن
غزوۂ خندق۔ آغازِ محاصرہ۔ کل مدت ۲۱دن	۱۱جمادی الآخرہ ۵ھ	۵مارچ ۶۲۷ء	۱۱شوال ۵ہجری	۵۷سال ۹ماہ، ۳دن
محاصرہ ختم	یکم رجب ۵ھ۔صبح	۲۵مارچ ۶۲۷ء	یکم ذوالقعدہ ۵ھ	۵۷سال ۹ماہ ۲۴دن
غزوۂ بنی قریظہ، آغازِ محاصرہ۔ مدت ۲۵دن	یکم رجب شام	۲۵مارچ ۶۲۷ء شام	یکم ذوالقعدہ ۵ہجری، شام	۵۷سال ۹ماہ ۲۴دن
اختتامِ محاصرہ	۲۶رجب	۱۹اپریل ۶۲۷ء	۲۶ذوالقعدہ ۵ھ	۵۷سال ۱۰ماہ ۱۷دن
مکہ میں قحط سالی کا آغاز	شعبان ۵ہجری (اندازاً)	موسم بہار ۶۲۷ء (اندازاً)	ذوالحجہ ۵ھ (اندازاً)	
		جمعہ ۲۲مئی ۶۲۷ء	**مدنی سنہ ٦ ہجری کا آغاز۔یکم محرم**	
سریۂ عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ۔ غمرِ مرزوق کی مہم	ذوالقعدہ ۵ھ	جولائی ۶۲۷ء	ربیع الاول ۶ھ	
سریۂ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ۔ ذوالقصہ کی مہم	ذوالحجہ ۵ھ	اگست ۶۲۷ء	ربیع الآخر ۶ھ	

	مکی ٦ ھجری کا آغاز، یکم محرم	جمعرات ۱۷ ستمبر ٦٢٧ء		
سریۂ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ۔ ابوالعاص بن ربیع کی گرفتاری اور قبول اسلام			جمادی الاولیٰ ٦ھ	
اُمّ قرفہ کا قتل		جنوری ٦٢٨ء	رمضان ٦ھ	
رئیس خیبر یسیر بن رزام کا قتل		فروری ٦٢٨ء	شوال ٦ھ	
غزوۂ حدیبیہ۔ مدینہ سے روانگی	یکم رجب	۱۳ مارچ ٦٢٧ء	یکم ذوالقعدہ ٦ھ	۵۸ سال، ۹ ماہ، ۲۲ دن
صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ آمد	۲۹ شعبان ٦ھ	۱۰ مئی ٦٢٨ء	۲۹ ذوالحجہ ٦ ہجری	۵۸ سال، ۱۱ ماہ، ۲۱ دن
		بدھ ۱۱ مئی ٦٢٨ء	مدنی سنہ ۷ ھجری کا آغاز۔ یکم محرم	
غزوہ ذی قرد۔ سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی بہادری	ابتدائے رمضان	وسط مئی ٦٢٨ء	ابتدائے محرم ۷ ہجری	۵۹ سال
غزوۂ خیبر۔ روانگی	ابتدائے رمضان	وسط مئی ٦٢٨ء	ابتدائے محرم ۷ ہجری	۵۹ سال سے کچھ دن زائد
غزوۂ فدک اور وادی القریٰ	ذوالقعدہ	جولائی ٦٢٨ء	ربیع الاول ۷ھ	۵۹ سال ۲ ماہ سے زائد

سلاطین کو دعوت اسلام		مئی، جون، جولائی ۶۲۸ء	محرم، صفر، ربیع الاول ۷ ہجری	۵۹ سال سے زائد
خیبر اور فدک کی مہمات سے واپسی	یکم ذوالحجہ	۱۷ اگست ۶۲۸ء	یکم ربیع الآخر	۵۹ سال دو ماہ ۲۲ دن
	مکی ۷ ھجری کا آغاز۔یکم محرم	بدھ ۱۵ اکتوبر ۶۲۸ء	یکم جمادی الاولیٰ ۷ھ	
غزوہ ذات الرقاع، روانگی	۱ محرم ۷ھ	۱۵ اکتوبر ۶۲۸ء	۱۱ جمادی الاولیٰ ۷ھ	۵۹ سال چار ماہ تین دن
واپسی	۲۵ محرم ۷ھ	۲۹ اکتوبر ۶۲۸ء	۲۵ جمادی الاولیٰ ۷ھ	۵۹ سال چار ماہ ۱۷ دن
ثمامہ بن اُثال کا قبول اسلام اور مکہ کی غذائی ناکہ بندی	اواخرِ محرم ۷ھ	اوائلِ نومبر ۶۲۸ء	اواخرِ جمادی الاولیٰ ۷ھ	
کسریٰ پرویز کا قتل	۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ	۱۰ فروری ۶۲۹ء	۱۰ شوال ۷ھ	
عمرۂ قضا۔روانگی	یکم رجب ۷ھ	مارچ ۶۲۹ء	یکم ذوالقعدہ ۷ ہجری	۵۹ سال ۹ ماہ ۲۲ دن
		یکم مئی ۶۲۹ء	**مدنی سنہ ۸ ھجری کا آغاز۔یکم محرم**	
وفات زینب رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ	رمضان	مئی ۶۲۹ء	اوائل محرم ۸ھ	۶۰ سال مکمل

جنگ مُوتہ، روانگی	ذوالحجہ	اگست ۶۲۹ء	جمادی الاولیٰ	
	مکی ۸ ہجری کا آغاز۔یکم محرم	پیر ۲۵ ستمبر ۶۲۹ء	جمادی الآخرہ ۸ ہجری	۶۰ سال ۲ ماہ
جنگ ذات السلاسل	جمادی الآخرہ	فروری ۶۳۰ء	ذوالقعدہ	۶۰ سال ۹ ماہ
	شعبان	جمعہ ۲۰ اپریل ۶۳۰ء	**مدنی سنہ ۹ ہجری کا آغاز۔یکم محرم**	
فتح مکہ کے لیے روانگی	۱۰ رمضان ۸ ہجری	۲۹ مئی ۶۳۰ء	صفر ۹ھ	۶۱ سال دو دن
فتح مکہ	۱۷ رمضان ۸ ہجری	۵ جون ۶۳۰ء	صفر ۹ھ	۶۱ سال ۹ دن
غزوۂ حنین	۱۴ شوال ۸ ہجری	یکم جولائی ۶۳۰ء	ربیع الاوّل ۹ھ	۶۱ سال ایک ماہ چھ دن
غزوۂ طائف	شوال، ذوالقعدہ ۸ ہجری	جولائی، اگست ۶۳۰ء	ربیع الاوّل، ربیع الآخر ۹ھ	۶۱ سال دو ماہ
ابراہیم بن رسول اللہ ﷺ کی ولادت	ذوالحجہ ۸ ہجری	اگست ۶۳۰ء		
عتاب بن اُسید رضی اللہ عنہ کی امارت میں حج	ذوالحجہ ۸ ہجری	اگست ۶۳۰ء	جمادی الاولیٰ ۹ھ	
	مکی ۹ ہجری کا آغاز، یکم محرم	جمعہ ۱۴ ستمبر ۶۳۰ء	جمادی الآخرہ	

واقعہ	تاریخ	عیسوی تاریخ	مدنی تاریخ	عمر
وفود کی آمد	مختلف مہینوں میں			۶۱ سال سے زائد
	رجب	منگل ۹ اپریل ۶۳۱ء	مدنی سنہ ۱۰ ہجری کا آغاز۔یکم محرم	
غزوہ تبوک۔روانگی	جمعرات ۳ رجب ۹ ہجری	۱۱ اپریل ۶۳۱ء	محرم ۱۰ ہجری	۶۱ سال نو ماہ ۲۴ دن
غزوہ تبوک۔واپسی	رمضان ۹ ہجری	جون ۶۳۱ء	ربیع الاوّل ۱۰ ہجری	۶۲ سال مکمل
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امارتِ حج	۹ ذوالحجہ ۹ ہجری	۱۲ ستمبر ۶۳۱ء	جمادی الآخرہ ۱۰ ہجری	۶۲ سال تین ماہ ایک دن
	مکی ۱۰ ہجری کا آغاز۔یکم محرم	جمعرات ۱۳ اکتوبر ۶۳۱ء	رجب ۱۰ھ	
ابراہیم بن رسول اللہ ﷺ کی وفات	منگل دس ربیع الاول	۱۰ دسمبر ۶۳۱ء	رمضان	۶۲ سال ۶ ماہ ۲ دن
وفود کی آمد	مختلف مہینوں میں			
حجۃ الوداع کے لیے ذوالحُلَیفہ سے روانگی		۲۳ فروری ۶۳۲ء	۲۶ ذوالقعدہ ۱۰ھ	۶۲ سال ۸ ماہ ۱۸ دن
مکہ میں داخلہ		۲ مارچ ۶۳۲ء	۴ ذوالحجہ	۶۲ سال ۸ ماہ ۲۶ دن
حجۃ الوداع،یوم عرفہ	۹ جمادی الآخرہ۔ مکی تقویم منسوخ	۷ مارچ ۶۳۲ء بروزِ جمعہ	۹ ذوالحجہ ۱۰ ہجری بروز جمعہ	۶۲ سال ۹ ماہ ایک دن
خطاب غدیرِ خم		۱۶ مارچ	۱۸ ذوالحجہ	۶۲ سال ۱۰ ماہ ۲۲ دن

	یکم رجب	۲۸ مارچ ۶۳۲ء	**مدنی سنہ ۱۱ ہجری کا آغاز۔ یکم محرم**	
اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی امیرِ لشکر کے طور پر تقرری	۲۹ شعبان	۲۵ مئی ۶۳۲ء	۲۹ صفر ۱۱ ہجری	۶۲ سال ۱۱ ماہ ۲۲ دن
مرض الوفات کا آغاز		۲۵ مئی ۶۳۲ء	پیر ۲۹ صفر ۱۱ ہجری	۶۲ سال ۱۱ ماہ ۲۲ دن
جیشِ اسامہ کی روانگی	۲ رمضان	۲۸ مئی	جمعرات ۲ ربیع الاوّل	۶۲ سال ۱۱ ماہ ۲۴ دن
واقعۂ قرطاس		۴ جون	جمعرات ۸ ربیع الاوّل	۶۳ سال مکمل
مسجد نبوی میں آخری بار تشریف آوری۔ اُمت سے آخری خطاب		۶ جون	ہفتہ ۱۰ ربیع الاوّل	۶۳ سال دو دن
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفاتِ حسرتِ آیات	۱۲ رمضان	۸ جون ۶۳۲ء	پیر ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ ہجری، بوقت سہ پہر	۶۳ سال، چار دن نوٹ: خالص قمری تقویم کے اعتبار سے عمر مبارک ۶۵ سال چار دن ہے۔
تدفین	۱۳ رمضان	۹ جون ۶۳۲ء	۱۳ ربیع الاوّل، منگل و بدھ کی درمیانی شب	

ہجری سالوں کے اہم واقعات کی کچھ جھلکیاں

سن ایک ہجری (۶۲۲، ۶۲۳ء)

- بیعتِ عقبہ کے بارہ نقیبوں میں سے ایک بزرگ بَراء بن مَعرُور رضی اللہ عنہ، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے ایک ماہ قبل، صفر میں وفات پاگئے۔
- انصار کے سردار اَسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ، مسجد نبوی کی تعمیر کے دنوں میں انتقال کر گئے۔
- کلثوم بن ہدم انصاری رضی اللہ عنہ، جن کے ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آکر پہلا قیام کیا تھا، دنیا سے رخصت ہوگئے۔
- مکہ کے ایک مسلمان ضَمرہ بن جُندُب رضی اللہ عنہ، بیماری کی حالت میں سفرِ ہجرت کرتے ہوئے فوت ہوگئے۔[1]
- ہجرت کے بعد مہاجرین وانصار کے ہاں پہلی نرینہ اولاد ہوئی، مہاجرین کے ہاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور انصار کے ہاں نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ۔[2]

سن دو ہجری (۶۲۳، ۶۲۴ء)

- مہاجرین میں سے حضرت عثمان بن مَظعُون رضی اللہ عنہ نے وفات پائی۔
- ۱۵ شعبان کو بیت اللہ قبلہ قرار پایا۔
- اذان مشروع ہوئی۔ رمضان کے روزے فرض ہوئے۔ عاشوراء کا روزہ جو پہلے فرض تھا، منسوخ ہو کر نفل رہ گیا۔[3]
- جمادی الآخرۃ کے اواخر میں سَریّۂ عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ روانہ ہوا۔
- حضرت رُقَیّہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ کی وفات ہوئی۔
- غزوہ بدر کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی ہوئی۔
- ۱۵ شوال کو غزوۂ قَینُقاع پیش آیا۔[4]

سن تین ہجری (۶۲۴، ۶۲۵ء)

- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔ ان کی عمر ۱۹ برس تھی۔[5]
- ۱۵ شوال کو غزوۂ اُحد پیش آیا۔

---

① مختصر سيرة الرسول للشيخ محمد بن عبدالوهاب : ا هـ

② الكامل في التاريخ : ا هـ

③ مختصر سيرة الرسول: ٢ هـ

④ العبر في خبر من غبر: سن ٢ هجرى

⑤ اسد الغابة،ترجمة: حفصة بنت عمر رضی اللہ عنہا

- رمضان میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔ [1]

سن چار ہجری (۶۲۵، ۶۲۶ء)

- شعبان میں حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔ [2]
- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا جو اپنی سخاوت کی وجہ سے اُمّ المساکین کے لقب سے مشہور تھیں، نکاح کے صرف چھ ماہ بعد انتقال کر گئیں۔ ان کی عمر ۳۵ برس تھی۔ [3]
- حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی۔ ان کی بیوہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا عدت کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں اور ان کے بیٹے عمر بن ابی سلمہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پرورش میں لے لیا۔ [4]

سن پانچ ہجری (۶۲۶، ۶۲۷ء)

- ربیع الاوّل کے اواخر سے ربیع الآخر کے وسط تک غزوۂ دومۃ الجندل میں مصروفیت رہی۔
- شعبان میں غزوۂ بنو مُریسیع (بنو مُصطلق) سے واپسی پر تیمم کا حکم نازل ہوا۔
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جُویریہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔
- رمضان میں سانحۂ إفک رونما ہوا۔
- حدِ قذف کے بارے میں سورۃ النور کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔
- وسطِ شوال تا ذوالقعدہ غزوۂ خندق لڑا گیا۔
- ذوالقعدہ میں غزوہ بنو قُریظہ برپا ہوا۔
- ذوالقعدہ میں حضرت زینب بنت جحش سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ہوا۔
- پردے کا حکم نازل ہوا۔ [5]

سن چھ ہجری (۶۲۷، ۶۲۸ء)

- شمال کی طرف زید بن الحارثہ رضی اللہ عنہ اور ساحل پر ابوعبیدہ بن الجرّاح رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مہمات بھیجی گئیں۔
- حبشہ میں نجاشی اَصحمہ رحمہ اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت اُمّ حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا سے پڑھایا۔
- ذوالقعدہ میں صلح حدیبیہ ہوئی۔
- سال ختم ہونے سے چند دن قبل غزوۂ ذی قَرد پیش آیا۔

[1] قال ابوبشر الانصاری الدولابی باسناده الی اللیث بن سعد قال: ولدت فاطمة بنت رسول الله صلی الله علیه وسلم الحسن بن علی فی شهر رمضان سنة ثلاث وولدت الحسین فی لیال خلون من شعبان سنة اربع. (الذریة الطاهرة للدولابی، ح: ۱۰۱)

[2] الذریة الطاهرة للدولابی، ح: ۱۰۱

[3] الاستیعاب، تر: زینب بنت خزیمة رضی الله عنها

[4] الاصابة، تر: ام سلمة رضی الله عنها

[5] الکامل فی التاریخ: ۵ھ، العبر فی خبر من غبر: سن ۵ هجری

- نجاشی اَصحمہ رحمہ اللہ نے حبشہ میں وفات پائی، نبی کریم ﷺ نے غائبانہ نمازِ جنازہ ادا فرمائی۔ ①

سن سات ہجری (۶۲۸، ۶۲۹ء)

- محرم تا ربیع الاوّل بادشاہوں کو دعوتی خطوط ارسال کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ②
- محرم اور صفر میں خیبر اور فدک کے علاقے فتح ہوئے۔
- خیبر کی شہزادی صَفیّہ بنت حُیی رضی اللہ عنہا سے حضور ﷺ کا نکاح ہوا۔
- مہاجرینِ حبشہ کی واپسی ہوئی۔
- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے اور اسلام قبول کر کے حفظِ حدیث کے لیے زندگی وقف کر دی۔
- ذوالقعدہ میں حضور ﷺ نے عمرۂ قضا کیا۔
- ذوالقعدہ میں حضرت میمونہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا سے حضور ﷺ کا نکاح ہوا۔ ③

سن آٹھ ہجری (۶۲۹، ۶۳۰ء)

- حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا۔
- جمادی الاولیٰ میں مُوتہ کی جنگ لڑی گئی جو عرب کی سرحد سے باہر کسی غیر ملکی طاقت سے پہلی باقاعدہ جنگ تھی۔
- ۱۷ رمضان المبارک کو مکہ فتح ہوا۔
- ۱۴ شوال کو حُنین کی جنگ ہوئی۔
- ذوالقعدہ میں طائف کا محاصرہ ہوا۔
- حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی۔
- حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے نبی کریم ﷺ کی آخری اولاد حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔ ④

سن نو ہجری (۶۳۰، ۶۳۱ء)

- رجب میں، تبوک کی مہم درپیش ہوئی۔
- ماہِ رمضان میں نبی اکرم ﷺ تبوک کے سفر سے لوٹے تو آپ کی صاحبزادی حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا وفات پا گئیں۔
- ذوالقعدہ میں منافقوں کا سردار عبداللہ ابن اُبَی موت کے گھاٹ اترا۔

---

① غائبانہ نماز جنازہ پڑھانا نبی اکرم ﷺ کی خصوصیت تھی؛ کیوں کہ نماز جنازہ میں میت کی جنازہ گاہ میں موجودگی شرط ہے۔
قال الامام السرخسي: لا يصلىٰ على ميت غائب، وقال الشافعي يصلىٰ عليه فان النبي عليه الصلوة والسلام صلي على النجاشي وهو غائب. ولكنا نقول: طويت الارض وكان هو اولى الاولياء ولا يوجد مثل ذلك في حق غيره. (المبسوط: ۲/۶۷، ط دارالمعرفة)

② الكامل في التاريخ: ۶ھ، العبر في خبر من غبر: سن ۶ ھ

③ الكامل في التاريخ: ۷ھ، العبر في خبر من غبر: سن ۷ ھ

④ الكامل في التاريخ: ۸ھ، العبر في خبر من غبر: سن ۸ ھ

- ستر سے زائد وفود اسلام قبول کرنے مدینہ حاضر ہوئے۔
- حج فرض ہوا، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ امیر حج بنا کر مکہ بھیجے گئے۔ ①

سن دس ہجری (۶۳۱، ۶۳۲ء)

- ربیع الاول میں حضرت ابراہیم بن رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی۔
- نجران کے پادری مناظرے کے لیے مدینہ آئے۔
- یمن میں اَسود عنسی اور یمامہ میں مُسَیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا۔
- حجۃ الوداع ہوا، وحی کی تکمیل ہوئی۔ ②

سن گیارہ ہجری (۶۳۲، ۶۳۳ء)

- نبی اکرم ﷺ نے رومیوں سے جہاد کے لیے اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں لشکر تیار فرمایا۔
- حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو وفات سے چار دن پہلے اپنے مصلے پر مقرر کیا۔
- ۱۲ ربیع الاول کو نبی اکرم ﷺ ۶۳ سال کی عمر میں دنیا سے رحلت فرما گئے۔ ③

☆☆☆

ملحوظہ:

سیرتِ نبویہ اور اسلامی تاریخ کے قدیم مآخذ میں اکثر واقعات کی ہجری تاریخ بیان کی گئی ہے۔ آج کل کی کتب سیرت و تاریخ میں تقویمی حسابات کے ذریعے ہجری کے ساتھ شمسی تاریخ بھی درج کر دی جاتی ہے۔ مگر یہ تطبیق تخمینے کے طور پر ہوتی ہے۔ اسے حتمی نہ سمجھا جائے۔ ہم نے اولاً علی محمد خان مرحوم کی ''تقویم عہد نبوی'' سے استفادہ کیا ہے۔ ثانیاً ڈاکٹر عبدالقدوس ہاشمی مرحوم کی ''تقویم تاریخی'' پر اعتماد کیا ہے۔ بعض مقامات پر تقویمی سوفٹ ویئرز خصوصاً ڈکتور عبدالعزیز محمد غانم کے ''برنامج للتقویم الهجری والمیلادی'' سے بھی مدد لی ہے۔ اگر دیگر سیرت کتب میں بعض تاریخیں مختلف دکھائی دیں تو اسے حسابی اختلاف پر محمول کیا جائے۔

☆☆☆

① الکامل فی التاریخ: ۹ھ، العبر فی خبر من غبر: سن ۹ ھ، البدایة والنهایة: سن ۹ ھ
② الکامل فی التاریخ: ۱۰ھ، العبر فی خبر من غبر: سن ۱۰ ھ، البدایة والنهایة: سن ۱۰ ھ
③ الکامل فی التاریخ: ۱۱ھ، العبر فی خبر من غبر: سن ۱۱ ھ، البدایة والنهایة: سن ۱۱ ھ

سیرتِ مصطفیٰ کا پیغام

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ

''اگر مسلمان صرف تجارت کے لیے پیدا کیے جا رہے تھے تو مکّہ کے ان تاجروں کو جو شام و یمن کا تجارتی سفر کیا کرتے تھے اور مدینہ کے ان بڑے یہودیوں، سوداگروں کو یہ پوچھنے کا حق تھا کہ اس خدمت کے لیے ایک نئی اُمّت کیوں پیدا کی جارہی ہے؟ اگر زراعت مقصود تھی تو مدینہ اور خیبر کے، طائف اور نجد کے، شام، یمن اور عراق کے کاشتکاروں اور زراعت پیشہ آبادی کو یہ پوچھنے کا حق تھا کہ کاشت کاری اور زراعت میں ہم محنت وکوشش کا کون سا دقیقہ اٹھا رکھتے ہیں کہ جس کے لیے ایک نئی اُمّت کی بعثت ہو رہی ہے؟ اگر دنیا کی چلتی ہوئی مشینری میں صرف فٹ ہونا تھا اور حکومتوں کے نظم ونسق اور دفتری کاروبار کو معاوضہ لے کر چلانا تھا تو روم ایران کے کارپرداز اِن سلطنت کو یہ کہنے کا حق تھا کہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے ہم بہت ہیں اور ہمارے بہت سے بھائی بیروزگار ہیں، اس کے لیے نئے امیدواروں کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن درحقیقت مسلمان بالکل ہی ایک نئے اور ایسے کام کے لیے پیدا کیے جا رہے تھے، جو دنیا میں نہ کوئی اور انجام دے رہا تھا اور نہ دے سکتا تھا اور اس کے لیے ایک نئی اُمّت ہی کی بعثت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ فرمایا:

''تم بہترین اُمّت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔''[1]

اسی مقصد کی خاطر لوگ وطن سے بے وطن ہوئے، اپنے کاروبار کو نقصان پہنچایا، اپنی عمر بھر کا اندوختہ لٹایا، اپنی جمی جمائی تجارتوں پر پانی پھیرا، اپنی کھیتی باڑی اور باغات کو ویران کیا، اپنے عیش وتنعم کو خیرباد کہا، دنیا کی تمام کامیابیوں اور خوش حالیوں سے آنکھیں بند کرلیں اور زریں موقعے کھودیے، پانی کی طرح اپنا خون بہایا اور اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی عورتوں کو بیوہ کیا۔

آج مسلمان جن مقاصد ومشاغل پر قانع نظر آتے ہیں ان کے لیے اس ہنگامہ آرائی اور اس محشر خیزی کی ضرورت نہ تھی، اس کے حصول کا راستہ تو بالکل بے خطر اور ہموار تھا۔ اگر مسلمان کو اُسی سطح پر آجانا تھا جس پر زمانہ بعثت کی تمام کافر قومیں تھیں اور اس وقت بھی دنیا کی تمام غیر مسلم آبادی ہے اور اگر اسے زندگی کے انہی مشاغل میں منہمک اور سرتاپا غرق ہوجانا تھا، جن میں اہلِ مغرب اور رومی وایرانی ڈوبے ہوئے تھے اور انہی کامیابیوں کو اپنا انتہائے زندگی بنانا تھا جن کو ان کے پیغمبر (ﷺ) اس کے بہترین موقع پر رد کرچکے

[1] سورۃ آل عمران، آیت: ۱۱۰

تھے تو یہ اسلام کی ابتدائی تاریخ پر پانی پھیر دینے کے مترادف ہے اور اس بات کا اعلان ہے کہ انسانوں کا وہ بیش قیمت خون جو بدر وحنین واحزاب اور قادسیہ ویرموک میں بہایا گیا، بے ضرورت بہایا گیا۔

آج اگر سردارانِ قریش کو کچھ بولنے کی طاقت ہوتو وہ مسلمانوں کو خطاب کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم جن چیزوں کے پیچھے سرگرداں ہو اور جن چیزوں کو تم نے اپنا حاصل زندگی سمجھ رکھا ہے انہی چیزوں کو ہم گناہ گاروں نے تمہارے پیغمبر (علیہ الصلاۃ والسلام) کے سامنے پیش کیا تھا، وہ تمام چیزیں خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر حاصل ہو سکتی تھیں تو کیا ساری جدوجہد کا حاصل اور ان تمام قربانیوں کی قیمت وہ طرزِ زندگی ہے جس کو تم نے اختیار کیا ہے اور کیا ان کاوشوں کا بدلہ زندگی واخلاق کی وہی سطح ہے جس پر تم نے قناعت کر لی ہے؟؟

اگر ان سردارانِ قریش میں سے جو اسلام کے حریف تھے، کسی کو یہ جرح کرنے کا موقع ملے تو آج ہمارا کوئی بڑے سے بڑا لائق وکیل بھی اس کا تشفی بخش جواب نہیں دے سکتا اور اُمّت کے لیے اس پر شرمندہ ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو مسلمانوں کے متعلق یہ خطرہ تھا کہ وہ دنیا میں پڑ کر اپنا اصل مقصد نہ بھول جائیں اور دنیا کی عام سطح پر نہ آ جائیں، آپ نے وفات کے قریب جو تقریر فرمائی اس میں مسلمانوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا:

''مجھے تمہارے بارے میں کچھ فقر وافلاس کا خطرہ نہیں ہے۔ مجھے تو اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا میں تم کو بھی وہی کشائش نہ حاصل ہو جائے جیسی تم سے پہلے لوگوں کو حاصل ہوئی تو تم بھی اسی طرح اس میں حرص ومقابلہ کرو جیسے انہوں نے کیا، پھر تمہیں بھی ہلاک کر دیا جائے جیسے ان کو ہلاک کر دیا گیا۔''[1]

مسلمانوں کی اصل شناخت یہی ہے کہ یا تو اسلام کی دعوت اور عملی جدوجہد میں مشغول ہوں یا اس دعوت وعملی جدوجہد میں مشغول ہونے والوں کے لیے پشت پناہ اور مددگار ہوں، اس کے ساتھ عملی جدوجہد میں حصہ لینے کا عزم اور شوق ہو۔ مطمئن شہری اور محض کاروباری زندگی اسلامی زندگی نہیں اور کسی طرح بھی یہ ایک مسلمان کا مقصودِ حیات نہیں ہو سکتا۔ سیرت محمد ﷺ کا یہ سب سے بڑا پیغام ہے، جو خالص مسلمانوں کے نام ہے۔''[2]

☆☆☆

[1] صحیح البخاری، ح: ۴۰۱۵، کتاب المغازی، باب شهود الملائكة بدرا
[2] ماخوذ از خطبات حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ

کیا اسلام جبراً پھیلایا گیا؟

مستشرقین اور اسی طرح سیکولر مورخین بڑی شدت سے یہ پروپیگنڈا کرتے آرہے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے جانشینوں نے لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا اور اسلام دلوں کو فتح کر کے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے پھیلایا گیا تھا۔ اس مکروہ پروپیگنڈے کی تردید کے متعلق یہاں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی مایہ ناز تصنیف ''سیرت خاتم الانبیاء ﷺ'' سے دو اقتباسات نقل کیے جارہے ہیں۔ حضرت رحمہ اللہ پہلی وحی سے ہجرت مدینہ تک کے حالات بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''اس وقت تک جو ہزارہا انسان اسلام کے حلقہ بگوش بن کر ہر قسم کے مصائب کا نشانہ بننے پر راضی ہوئے ظاہر ہے کہ وہ کسی دنیوی طمع یا حکومت کے جبر یا تلوار کے ذریعہ سے مجبور نہیں ہو سکتے۔

اس کھلی ہوئی ہدایت کو دیکھتے ہوئے بھی کیا وہ لوگ خدا سے نہ شرمائیں گے جو اسلام کی حقانیت پر پردہ ڈالنے کے لئے کہا کرتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا۔ کیا وہ اس کا کوئی جواب دے سکتے ہیں کہ ان تلوار چلانے والوں پر کس نے تلوار چلائی تھی جو نہ صرف مسلمان بنے بلکہ اسلام کی حمایت پر تلوار اٹھانے اور اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالنے پر راضی ہوگئے؟ کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ ابوبکر صدیق، فاروق اعظم، عثمان غنی، علی المرتضی رضوان اللہ علیہم اجمعین پر کس نے تلوار چلا کر ان کو مسلمان بنایا تھا؟ اور ابوذر رضی اللہ عنہ و انیس رضی اللہ عنہ اور ان کے قبیلہ کو کس نے مجبور کیا تھا کہ وہ سب کے سب مسلمان ہوگئے؟ ضماد ازدی کو کس نے مجبور کیا تھا؟ اور طفیل بن عمرو دوسی اور ان کے قبیلہ پر کس نے تلوار چلائی؟ اور قبیلہ بنی عبدالاشہل کو کس نے دبایا تھا؟ اور تمام انصار مدینہ پر کس نے زور دیا تھا؟

جنہوں نے فقط اسلام قبول نہیں کیا بلکہ آپ ﷺ کو اپنے یہاں بلا کر تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی اور اپنے جان و مال آپ ﷺ پر قربان کئے۔ بُریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ کو کس نے مجبور کیا کہ ستر آدمیوں کی جماعت لے کر مدینہ [illegible] استے میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور برضا و رغبت مسلمان ہوگئے۔ نجاشی بادشاہ حبشہ پر کونسی [illegible] کہ باوجود اپنی سلطنت و شوکت کے قبل از ہجرت مسلمان ہوگئے۔ ابوہند اور تمیم اور نعیم وغیرہ وغیرہ [illegible] ملک شام کے سفر کر کے آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچیں اور آپ ﷺ کی غلامی اختیار [illegible] [illegible]ات جن سے کتب تاریخ بھری ہوئی ہیں۔

[illegible] کھ کر ہر انسان یہ یقین رکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسلام اپنی اشاعت میں [illegible] سکتا ہے کہ لوگوں پر تلوار رکھ کر کہا جائے کہ مسلمان ہو جاؤ یا ان [illegible] تھ ہی جزیہ کے احکام اور کفار کو اہل ذمہ بنا کر ان کے

جان ومال کی حفاظت بالکل مسلمان کی طرح کرنے کے متعلق اسلامی قواعد خود اس کی شہادت ہیں کہ اسلام نے کبھی کفار کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔

اس لئے ایک منصف مزاج انسان کا فرض ہے کہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرے کہ اسلام میں فرضیت جہاد کس غرض اور کن فوائد کے لئے ہوئی اور اسے اس وقت یہ یقین کرنا پڑے گا کہ جس طرح وہ مذہب کامل نہیں سمجھا جاسکتا جس نے لوگوں کا گلا گھونٹ کر بجبر واکراہ ان کو اپنے سلسلے میں داخل کیا ہو، اسی طرح وہ مذہب مکمل نہیں جس میں سیاست نہ ہو۔ وہ سیاست نہیں جس کے ساتھ تلوار نہ ہو۔ وہ ڈاکٹر اپنے فن کا ماہر نہیں ہوسکتا جو صرف مرہم لگانا جانتا ہے مگر سڑے ہوئے فاسد شدہ اعضاء کا آپریشن کرنا نہیں جانتا۔

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا ہو عجم کے ساتھ
کچھ بھی نہیں ہے، تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ

سمجھو اور خوب سمجھو کہ جب عالم کے جسم میں شرک کے زہریلے جراثیم پیدا ہوگئے اور وہ ایک مریض جسم کی طرح ہوگیا تو رحمت خداوندی نے اس کے لئے ایک مصلح اور مشفق طبیب (آپ) کو بھیجا جس نے ترپن سال تک متواتر اس کے ہر عضو اور ہر رگ و ریشہ کی اصلاح کی فکر کی جس سے قابل اصلاح اعضاء تندرست ہوگئے مگر بعض اعضاء جو بالکل سڑ چکے تھے ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہ رہی، بلکہ خطرہ ہوگیا کہ ان کی سُمیت تمام بدن میں سرایت کر جائے اس لئے حکیمانہ اصول کے موافق عین رحمت وحکمت کا اقتضاء یہی تھا کہ آپریشن کر کے ان اعضاء کو کاٹ دیا جائے، یہی جہاد کی حقیقت ہے اور یہی تمام جارحانہ اور مدافعانہ غزوات کا مقصد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عین میدان کارزار گرم ہونے کے وقت بھی اسلام نے اپنے مقابل جماعت میں سے صرف انہی لوگوں کو قتل کی اجازت دی ہے جن کا مرض متعدی تھا، یعنی جو اسلام کے مٹانے کے منصوبے گانٹھتے اور برسر جنگ آتے تھے۔ اور ان کے متعلقین، عورتیں، بچے اور بوڑھے اور مذہبی علماء جو لڑائی میں حصہ نہیں لیتے، اس وقت بھی مسلمانوں کی تلواروں سے مامون تھے، بلکہ وہ لوگ جو کسی دباؤ سے مجبور ہوکر مقابلے پر آئے ہوں وہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے محفوظ تھے۔"

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ اس بارے میں چند روایات پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"الغرض مدافعانہ اور جارحانہ جہاد کا مقصد صرف مکارم اخلاق کی اشاعت اور اسلام کا تحفظ وتبلیغ، اسلام کے راستے میں جور کاوٹیں ڈالی جاتی تھیں ان کا ہٹانا تھا۔ ان تمام واقعات پر نظر ڈالنے کے بعد جس طرح عام یورپین مورخین اور مارگولیس وغیرہ کا یہ خیال بالکل غلط اور افتراء رہ جاتا ہے کہ اسلامی جہاد کا مقصد لوگوں کو بجبر مسلمان کرنا اور لوٹ مار کر کے اپنا معاش مہیا کرنا تھا۔ اسی طرح اسلامی روایات اور تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کرنے کے بعد اس میں بھی شک نہیں رہتا کہ اسلام میں جس طرح بغرضِ تحفظ مدافعانہ جہاد کو فرض کیا گیا ہے، اسی طرح

حفظ ماتقدم اور موانع تبلیغ کو راستے سے ہٹانے کے لئے جارحانہ جہاد بھی قیامت تک کے لئے ضروری کیا گیا ہے اور جس طرح مدافعانہ جہاد کی غرض لوگوں کو بجبر مسلمان بنانا نہیں ہے اسی طرح جارحانہ جہاد کا مقصد بھی کسی طرح یہ نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جب کہ اسلام کا وسیع دامن عین وقتِ جہاد میں بھی کفار کو اپنی پناہ میں لینے اور کفر پر قائم رہتے ہوئے ان کی جان و مال عزت و آبرو کی اسی طرح حفاظت کی جاتی ہے جس میں مدافعانہ انداز اور جارحانہ جہاد دونوں برابر ہیں، نیز دنیا میں حقیقی امن و امان قائم کرنا، ضعیفوں کو ظلم سے چھڑانا وغیرہ جو جہاد کے مقاصد ہیں ان میں بھی دونوں قسمیں یکساں ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسلامی روایات کو مسخ کر کے جارحانہ جہاد کا انکار کیا جائے جیسا کہ ہمارے بعض آزاد خیال مؤرخین نے کہا ہے۔''[1]

کم سے کم جانی نقصان۔ زیادہ سے زیادہ فائدہ:

سیرتِ طیبہ کے غزوات اور سرایا کو خونریزی اور نسل کشی سے تعبیر کرنے والوں کو اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہیے کہ حضور ﷺ کے دور کی تمام لڑائیوں میں جانی نقصانات کا تخمینہ کیا تھا اور اس کے ثمرات کیا تھے؟

محققین کے مطابق ان تمام جنگوں میں ۲۵۹ مسلمان شہید اور مخالفین کے ۷۵۹ افراد قتل ہوئے۔ یوں فریقین کے مقتولین کی مجموعی تعداد صرف ''۱۰۱۸'' بنتی ہے۔[2] اب ایک نظر جزیرۃ العرب کی وسعتوں کو دیکھیے اور دوسری طرف عرب قبیلوں کی جنگجوئی اور سخت مزاجی پر غور کیجیے تو ہرگز باور نہیں کیا جا سکتا کہ اتنا معمولی جانی نقصان اتنے وسیع رقبے پر آباد سینکڑوں بت پرست قبیلوں کو اپنا آبائی مذہب چھوڑنے پر آمادہ کر سکتا تھا؟

اس کے ساتھ اگر اس ایمانی و اخلاقی انقلاب کا تصور کیا جائے جس نے چند سالوں کی اس کش مکش کے بعد عرب کے بکھرے ہوئے قبائل کو متحد کر دیا اور ایک جہالت زدہ معاشرے کو دنیا کی قیادت و سیادت کے مقام پر لا کھڑا کیا، تو اس عظیم الشان فائدے کے مقابلے میں بھلا ایک ہزار نفوس کے ضیاع کی کوئی حیثیت رہ جاتی ہے؟ تاریخ اور حالاتِ حاضرہ سے آگاہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اکثر جنگوں میں ہزاروں لاکھوں لوگ مارے جاتے ہیں، پھر ستم یہ کہ مقتولین میں سپاہیوں یا عام شہریوں کی بھی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ ان جنگوں کا دنیا کی تاریخ پر کوئی مثبت اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود ان جنگی نقصانات کو دنیا کے انقلابات کا ایک لازمی حصہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

یورپ اور امریکا میں جمہوریت کی خاطر جو کشت و خون ہوا، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ پھر پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں بلا مبالغہ کروڑوں انسان، چند خود غرض سیاست دانوں کی ہوسِ ملک گیری کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس قدر نقصانات کے باوجود دنیا میں کوئی صالح انقلاب نہیں آیا بلکہ سرمایہ داروں کی عالمگیریت مستحکم ہوئی اور غریب اقوام کا استحصال کئی گنا بڑھ گیا۔ اہلِ مغرب اپنے اس ماضی کے ساتھ کس منہ سے سیرتِ طیبہ پر انگشت نمائی کی جرأت کرتے ہیں!!

---

① سیرت خاتم الانبیاء ﷺ، ص ۶۱ تا ۶۷

② رحمۃ للعالمین ﷺ: ۲۶۴/۱

اسباقِ تاریخ

☆ جناب رسالت مآب ﷺ تریسٹھ برس کے بعد دنیا سے پردہ فرما گئے لیکن آپ کی تعلیمات کی روشنی آج بھی موجود ہے اور قیامت تک لوگ اس کے نور سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔

☆ حضور انور ﷺ کے فیضِ نگاہ سے ذرے آفتاب بنے اور خاکِ عرب کیمیا بن گئی! شتربان جہاں بان گئے اور رہزن راہبر۔ کیا تاریخ میں ایسا کوئی اور معلم، ایسا کوئی اور رہنما پیدا ہوا ہے؟؟

☆ رحمت عالم ﷺ نے عرب کے سردار ہو کر بھی کوئی جائیداد نہ چھوڑی! اسلام کے سوا کہیں اور ایسی مثال مل سکتی ہے؟

☆ نبی کریم ﷺ کو زبانی و جسمانی ایذائیں دی گئیں، پتھر مارے گئے قتل کی کوشش کی گئی، وطن سے نکلنے پر مجبور کیا گیا۔ مگر جب اللہ نے آپ کو غلبہ واقتدار عطا کیا اور مکّہ میں آپ فاتحانہ داخل ہوئے تو آپ نے مثالی رحم وکرم کا معاملہ کیا۔ بدترین دشمنوں کو بھی معاف کر دیا۔ کیا اُمّت محمدیہ کی تاریخ کے سوا ایسی مثال کہیں ملے گی؟ اور کیا ہم کافر دشمنوں کو نہیں اپنے کلمہ گو مخالفین سے بھی ایسی نرمی کا سلوک کرنے کے لیے تیار ہیں؟ اگر نہیں تو ہم کس منہ سے اس ہادی عالم ﷺ کے پیروکار کہلاتے ہیں؟

☆ جو افرادِ رحمتِ دو عالم ﷺ کی آواز پر سب سے پہلے جمع ہوئے اور "السابقون الاوّلون" کہلائے ان میں حضرت ابو بکر صدیق، سیدنا عمر فاروق، سیدنا عثمان غنی اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم جیسے معزز افراد شامل تھے، وہاں یمن سے آئے ہوئے ایک غریب خاندان کے عمار بن یاسر، حبشہ کے سیاہ فام بلال اور غلام بن کر بکنے والے صہیب رومی رضی اللہ عنہم جیسے مسکین لوگ بھی تھے۔ ہر طبقے کے لوگ اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے۔ کیا ہم دین کی دعوت تمام طبقات کے لیے عام کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں؟؟

☆ جناب رسول اللہ ﷺ نے بندوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ اللہ سے جوڑ دیا۔ آج ہم حضور ﷺ کے امتی ہو کر بھی اس رشتے کو کیوں توڑے ہوئے ہیں؟

☆ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے ایمان وصداقت کا پرچم اٹھایا اور خیر وسعادت کے بیج بوئے۔ آج ہم شر وفساد اور ظلم وبے حیائی کے خوگر کیوں ہیں؟

☆ حضور اقدس ﷺ نے عمر بھر قربانیاں دیں اور اپنی اُمّت کو عالمگیر فتح دلوا کر امن وعدالت کی بادشاہت قائم کی۔ آج ہم جبر واستبداد کے جھوٹے خداؤں کے آگے سرنگوں کیوں ہیں؟

☆ حضور اکرم ﷺ نے ہمیں جو کچھ دیا تھا کیا آج ہم اپنی بداعمالیوں کے سبب وہ سب کچھ کھو نہیں چکے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اسے واپس پانے کی فکر کیوں نہیں؟

☆ کیا ہماری گمراہانہ زندگی اور ہمارے سیاہ کرتوتوں سے اس محسن انسانیت کی عزت پر حرف نہیں آ رہا؟ ہم اپنی زندگیوں کو کب بدلیں گے؟

☆ ہماری دینی حالت اس قدر گری ہوئی کیوں ہے؟ ہم حضور اقدس ﷺ کی لائی ہوئی شریعت سے ایسے بے پروا کیوں ہیں؟

☆ ہم نماز کے عادی کیوں نہیں؟ ہم زکوٰۃ اور صدقہ وخیرات میں بخل کیوں کرتے ہیں؟ وہ پرہیز گاری اور وہ اتباع سنت کا جذبہ کہاں گیا جو کبھی اُمتِ مسلمہ کے بچوں تک کا طرۂ امتیاز تھا؟

☆ ہم حرام وحلال میں فرق کیوں نہیں کرتے؟ شبے کی چیزوں سے کیوں نہیں بچتے؟ ہماری زندگی حضور اقدس ﷺ کے سچے جانثاروں یعنی صحابہ کرام کی زندگیوں سے ملتی جلتی کیوں نہیں؟

☆ سیرت النبی کے ہر ورق کا مطالعہ بتا رہا ہے کہ سچا دین کیا تھا؟ سچے مسلمان کیسے تھے؟ اسلام کو کیسی جانکاہ قربانیاں دے کر پھیلایا گیا۔ ان اوراق سے ثابت ہوتا ہے کہ آج ہمارے عشق ومحبت کے دعوے فقط نمائشی ہیں۔ ہمارا منہ سے خود کو نبی کا غلام کہنا اور اپنے لیے جنت کا ٹکٹ پکا سمجھنا محض ایک نفسانی فریب ہے، جس میں ہم نے خود کو مبتلا کر رکھا ہے۔

☆ اللہ نے ہماری بداعمالیوں سے خفا ہو کر اپنی نعمتیں ہم سے چھین لی ہیں۔ ہم آزاد سے غلام، مالک سے مملوک اور خوشحال سے بدحال بن چکے ہیں۔

☆ ارشادِ نبوی تھا کہ ایک مسلمان کے ناحق مارے جانے کے مقابلے میں اللہ کے نزدیک تمام دنیا کا مٹ جانا زیادہ آسان ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں آج انسانی جان کی کیا قیمت ہے۔ کیا مسلم معاشرہ ایسا ہوتا ہے!!

☆ حضور رحمت عالم ﷺ نے ہمیں رنگ ونسل، زبان اور قومیت کے نام پر تعصب روا رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ محبت اور ہمدردی کا پیغام عام کیا تھا۔ مگر آج ہمارے مزاج پر ہر قسم کا تعصب پورے زور وشور سے حاوی ہے۔ آخر کیوں؟

☆ سیرت یا تاریخ کا مطالعہ سب اپنے محاسبے کے لیے ہونا چاہیے۔ کیا ہم اپنے محاسبے کے لیے تیار ہیں؟

☆ ہادیٔ برحق ﷺ کی زندگی قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ آپ کی محبت کائنات کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔ لازم ہے کہ ہم رسول پاک ﷺ کی محبت میں ڈوب کر ایک اچھے اور سچے مسلمان کی سی زندگی گزاریں اور تعمیرِ اُمتِ مسلمہ کے لیے خود کو وقف کر دیں۔ بقول جناب خالد اقبال تائب ؎

دیوانگیٔ شوق بڑھا کر تو دیکھیے الفت میں اُن کی خود کو مٹا کر تو دیکھیے
کھل جائے بابِ رحمتِ حق آپ کے لئے حبِّ نبی کو دل میں بسا کر تو دیکھیے

☆ ☆ ☆

تیسرا باب

تاریخ اُمّتِ مُسلِمہ (حصہ اوّل)

خلافتِ راشدہ

عروج وفتوحات کا دور

۱۱ھ......تا......۳۴ھ

(632ء......تا......654ء)

☆☆☆

خود کشی شیوہ تمہارا، وہ غیور و خوددار
تم اُخوّت سے گریزاں وہ اُخوّت پہ نثار

☆

تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو وہ گلستاں بہ کنار

☆

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت ان کی

☆☆☆

(اقبال مرحوم)

خلافتِ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

ربیع الاوّل سن ۱۱ھ......تا......جمادی الآخرۃ ۱۳ ہجری
(632ء......تا......634ء)

خلافتِ راشدہ سے کیا مراد ہے؟

خلافتِ راشدہ سے مراد، وہ مثالی دورِ حکومت ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مسند نشینی سے لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور تک رہا۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی حکومت کے چھ ماہ تتمے کے طور پر خلافتِ علویہ ہی کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ ربیع الاوّل ۱۱ھ سے لے کر ربیع الاوّل ۴۱ھ تک یہ پورے تیس سال بنتے ہیں۔ اسی کو خلافتِ راشدہ کہا جاتا ہے۔

اس بارے میں ایک صحیح حدیث موجود ہے:

''اَلْخِلَافَةُ فِي أُمَّتِي ثَلَاثُونَ سَنَةً ، ثُمَّ مُلْكٌ بَعْدَ ذَالِكَ''

(میرے بعد خلافت تیس سال تک رہے گی، اس کے بعد بادشاہت ہوگی۔)[1]

جمہور مسلمین کا عقیدہ ہے کہ یہی تیس سال خلافتِ راشدہ کے ہیں۔ ''العقیدۃ الطحاویۃ'' میں ہے:

''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو افضل اور ساری اُمت پر فائق مانتے ہوئے، خلافت کو سب سے پہلے انہی کے لیے ثابت کہتے ہیں۔ پھر عمر بن الخطاب، پھر عثمان، پھر علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم کے لیے مانتے ہیں۔ یہی خلفائے راشدین اور ائمہ ہدایت ہیں۔''[2]

اس دور کو خلافتِ راشدہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ مکمل طور پر اسلامی سیاست اور نبوی طرزِ حکومت کا نمونہ ہے۔ اس دور میں اُمت کی قیادت ان افضل ترین صحابہ کرام کے ہاتھ میں تھی جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا طویل زمانہ پایا۔ یہ حضرات اس ابتدائی زمانے میں اسلام لائے جب سخت ترین قربانیاں اور آزمائشیں ہر پل درپیش تھیں۔ انہوں نے اسلام کی خاطر ہجرت کی اور ہر قدم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جیے۔ اسلام کی تاسیس، تبلیغ واشاعت اور استحکام میں ان حضرات کا بنیادی حصہ ہے۔ یہی چاروں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے مقرب و محبوب اور تمام صحابہ سے افضل ہیں۔ اسی لیے نطقِ رسالت سے ان کی پیروی کا تاکیدی حکم جاری ہوا۔ فرمانِ نبوی ہے:

''میری سنت پر چلو اور خلفائے راشدین کی جو ہدایت یافتہ ہیں اور ان کے طریقے کو دانتوں سے مضبوط پکڑلو۔''[3]

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کے اس حصے کو بعد کے دور سے ممتاز رکھا جاتا ہے، اگرچہ بعد میں بھی عادل خلفاء اور نیک سلاطین آتے رہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ''ازالۃ الخفاء'' میں خلافتِ راشدہ کے بارے میں بڑی مفصل اور دقیق

① سنن الترمذی: ۲۲۲۶، باب ما جاء فی الخلافة. قال الالبانی صحیح

② العقیدة الطحاویة، ص ۸۱، ط المکتب الاسلامی بیروت

③ علیکم بسنتی وسنة الخلفاء راشدین المهدیین وعضوا علیها بالنواجذ. (سنن ابی داؤد، ح: ۴۶۰۷، کتاب السنة، باب فی لزوم السنة) واخرجه الترمذی فی سننه، ح: ۲۶۷۶، وقال: حسن صحیح، وصححه الالبانی

بحث کی ہے، جس کا خلاصہ راقم عام فہم الفاظ میں پیش کر رہا ہے:

❶ خلیفۂ راشد میں خلافت کی عام شرطوں کے علاوہ ایک شرط یہ بھی ہے کہ اسے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ خصائل اور افعال میں خاص مشابہت ہو یعنی وہ نبی ﷺ کی صفات کا نمونہ اور عکس ہو۔ فقط بعض صفات میں مشابہ ہونا کافی نہیں کیوں کہ کچھ نہ کچھ مشابہت تو ہر مسلمان کو ہوتی ہے مثلاً پنج وقتہ نماز پڑھنا، تلاوتِ قرآن کرنا۔ ایسی کامل مشابہت انہی حضرات کو حاصل ہو سکتی ہے جو اُمت کے اعلیٰ ترین طبقے سے ہو، نہ کہ درمیانے یا ادنیٰ طبقے سے۔

❷ نبی کا خلیفہ، نبی یا رسول نہیں ہوتا مگر نبی کی صفات کا نمونہ اور عکس ہوتا ہے، پس خلیفۂ راشد وہ ہے جو عقلی اور عملی قوتوں میں پیغمبر کی عقلی اور عملی قوت کے مشابہ اور ہم رنگ ہو۔ جن مقاصد کے لیے پیغمبر کی بعثت ہوئی ہے، ان کی تکمیل اس خلیفہ کے ہاتھ پر ہو۔ یعنی نبی اور رسول جس کام کی بنیاد رکھ گئے ہوں، اللہ تعالیٰ اپنی خاص تائید کے ذریعے ان کاموں کو اس نبی کے خلیفۂ خاص کے ہاتھ پر پورا فرما دیتے ہیں۔ لہٰذا جو خلیفہ، پیغمبر کے باقی ماندہ امور کو علمی اور عملی طور پر تکمیل تک پہنچاتا ہے، وہ اس کا خاص خلیفہ اور خلیفۂ راشد ہے۔

❸ تعلیم کتاب و حکمت کے مراحل تو حضور ﷺ کی زندگی میں طے ہو گئے تھے۔ مگر کچھ مراحل باقی تھے۔ مشیتِ الٰہیہ یہ تھی کہ ان کی تکمیل خلفائے راشدین کے ہاتھوں ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے اس کے لیے درج ذیل مثالیں دی ہیں:

- دورِ صدیقی میں قرآنِ مجید کا مصحف کی شکل میں جمع کیا جانا
- احکام کی احادیث کی تحقیق و اشاعت
- روایتِ حدیث میں حزم و احتیاط کی پابندی کرانا
- بہت سے مختلف فیہ فقہی مسائل کو مشورے اور اتفاقِ رائے سے طے کر کے اجماع کی بنیاد رکھنا
- غیر منصوص مسائل میں اجتہاد کا طریقہ جاری کرنا
- ان فتوحات کی تکمیل جن کی بشارت لسانِ نبوت سے دی گئی تھی

❹ خلیفۂ راشد کو پیغمبر سے وہی نسبت ہے جو اعضاء کو دل و دماغ سے۔ حکم دل و دماغ سے جاری ہوتا ہے اور اعضاء اسے بجا لاتے ہیں۔ اسی طرح خلافتِ راشدہ میں بھی فرمانروائی، پیغمبر کی ہوتی ہے۔ دورِ نبوت اور دورِ خلافتِ راشدہ میں بس اتنا فرق ہے کہ پہلے پیغمبر اپنی زبانِ مبارک سے حکم دیا کرتے تھے۔ اب لسانِ نبوت خاموش ہے مگر خلفائے راشدین منشاءِ نبوت کو سمجھ کر پیغمبر کے اعضاء کی مانند متحرک ہیں۔ اسی لیے خلفائے راشدین کے اقوال اور افعال کے حجتِ شرعیہ ہونے پر پوری اُمتِ مُسلِمہ کا اتفاق ہے۔ جس نے ان حضرات کو سمجھنے میں غلطی کی، وہ اس کی سمجھ کا قصور ہے۔[1]

[1] شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ کا مفصل کلام ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ''ازالۃ الخفاء'' میں ملاحظہ کریں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اُمت مسلمہ کے خلیفہ بلافصل بن گئے، یعنی نبی کریم ﷺ کے رحلت فرما جانے کے فوراً بعد امّت مُسلمہ نے انہیں اپنا خلیفہ تسلیم کرلیا۔ آپ رضی اللہ عنہ اُمّت کے اس اتفاق کے باوجود شورائیت کی تکمیل کے لیے احتیاطاً تین دن تک مسندِ خلافت سے کنارہ کش رہے۔ روزانہ آپ رضی اللہ عنہ اعلان فرماتے:

"میں نے تمہاری بیعت معاف کردی۔ تم جس سے چاہو، بیعت ہو جاؤ۔"

ہر بار حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر فرماتے: "ہم نہ بیعت توڑیں گے نہ آپ کو مستعفی ہونے دیں گے۔ آپ کو رسول اللہ ﷺ نے آگے کیا تھا۔ کون ہے جو آپ کو پیچھے کر سکے۔"①

اس سے ایک طرف تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کی رضا اور رغبت کے بغیر ان کی قیادت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اخلاص اور عشقِ رسالت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جسے حضور ﷺ امام بنا گئے ہوں، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے مرتبے میں کمی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مختصر حالاتِ زندگی:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام عبداللہ اور لقب صدیق اور عتیق تھا۔ ابوبکر آپ کی کنیت تھی۔ والد کا نام عثمان بن عامر تھا جو ابوقحافہ کی کنیت سے مشہور تھے۔ والدہ کا نام سلمیٰ بنت صخر تھا مگر وہ بھی اپنی کنیت "اُمّ الخیر" سے جانی پہچانی جاتی تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کا تعلق قریش کی شاخ بنو تیم سے تھا۔②

آپ نے چار نکاح کیے تھے: پہلا نکاح قُتَیلَہ بنت عبدالعزیٰ سے ہوا۔ ان سے عبداللہ اور اسماء رضی اللہ عنہما پیدا ہوئے۔ دوسرا نکاح اُمّ رُومان سے ہوا جن سے عبدالرحمٰن اور عائشہ رضی اللہ عنہما پیدا ہوئے۔ تیسرا نکاح اسماء بنت عُمَیس رضی اللہ عنہا سے ہوا جو حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بیوہ تھیں، ان سے محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے۔ چوتھا نکاح حبیبہ بنت خارجہ رضی اللہ عنہا سے ہوا۔ پہلے دو نکاح اسلام لانے سے قبل اور آخری دو نکاح اسلام لانے کے بعد کیے تھے۔③

① فضائل الصحابة للامام احمد بن حنبل، ح: ۱۰۲، ط موسسة الرسالة

② شجرۂ نسب یہ ہے: عبداللہ بن ابوقحافہ عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ بن کعب بن لوئی۔ مُرّہ پر آپ کا نسب حضور ﷺ سے جا ملتا ہے۔ مُرّہ کے ایک بیٹے کلاب کی نسل سے حضور ﷺ اور دوسرے بیٹے تیم کی اولاد سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ (الاصابة: ۱۴۴/۴، ۱۴۵، ط العلمية)

③ الكامل في التاريخ: ۲۶۳/۲ تحت ۱۳ هجری

آپ رضی اللہ عنہ شروع ہی سے نہایت شریف، پاکباز، منصف مزاج اور خوش اخلاق تھے۔ مکہ مکرمہ میں آپ کو ایک معزز فرد کی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کا ذریعۂ معاش تجارت تھا، جس کی وجہ سے آپ کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ آپ عربوں کے حسب ونسب کے بڑے علماء میں شمار ہوتے تھے۔ آپ زمانہ جاہلیت میں لوگوں کے جھگڑوں کے فیصلے بھی کیا کرتے تھے، اس لیے آپ کو امورِ سیاست وعدلیہ کا تجربہ دورِ جوانی ہی سے ہو گیا تھا۔ آپ کی معلومات اور تعلقات کی یہ وسعت اور کچہری کے تجربات بعد میں اسلام کی تبلیغ اور خلافت کے لیے بڑے معاون ثابت ہوئے۔

آپ رضی اللہ عنہ کو مردوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہے۔ اسلام لانے کے بعد آپ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور دین کی خدمت کے لیے وقف ہو گئے۔ آپ کو تمام صحابہ کرام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے زیادہ قرب حاصل تھا۔ آپ نے ایسے سترہ افراد کو کفار کے مظالم سے نجات دلانے کے لیے انہیں خرید کر آزاد کیا جنہیں اسلام لانے کی وجہ سے شدید اذیتیں دی جاتی تھیں۔[1]

ہجرت کی مشکل ترین مہم میں آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہے، غارِ ثور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہرے داری کی، غزوۂ بدر میں شمعِ رسالت کے محافظ بنے، اپنی لختِ جگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آفتابِ رسالت کے عقد میں دی۔ تمام غزوات اور مہمات میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خلافت کی طرف واضح اشارے فرمائے تھے۔ ایک بار ارشاد فرمایا: ''اِقْتَدُوْا بِالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِی اَبِی بَکْرٍ وَعُمَرَ.''

''میرے بعد ان دونوں کی یعنی ابوبکر وعمر کی پیروی کرنا۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری ایامِ حیات میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بڑی تاکید کے ساتھ اپنی جگہ امامت کے لیے متعین کیا تھا۔ یہ اس بات کی طرف عملی رہنمائی تھی کہ مسلمانوں کو نبی کی عدم موجودگی میں ان کی اقتداء کرنی چاہیے۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو در پیش آزمائشیں:

ساٹھ سالہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زمامِ خلافت اپنے ہاتھ میں لی تو خود کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل ترین جانشین ثابت کر دکھایا۔ آپ نے ''خلیفۃ اللہ'' کہلانا پسند نہیں کیا بلکہ ''خلیفۃ الرسول'' کا لقب مناسب سمجھا۔ خلیفہ بننے کے بعد بھی آپ نے اپنی معاش کا بوجھ کسی پر نہ ڈالا، مسلمانوں کے اجتماعی فنڈ بیت المال سے ایک درہم لینا بھی گوارا نہ کیا۔ آپ حسبِ معمول صبح بازار نکل جاتے اور کپڑے فروخت کرتے، ظہر کے بعد خلافت کی ذمہ داریاں انجام دیتے۔ ایک دن حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما نے آپ کو کندھے پر کپڑے لادے بازار جاتے دیکھا تو دریافت کیا: ''رسول اللہ کے خلیفہ! آپ کہاں چلے؟''

بولے: ''بازار جاتا ہوں۔''

---

[1] الکامل فی التاریخ: ۲/۲۶۳، ۲۶۵ ذکر بعض اخبارہ ومناقبہ

[2] سنن الترمذی، ح: ۳۶۶۲، ابواب المناقب ؛ صحیح ابن حبان، ح: ۶۹۰۲

سوال ہوا: ”آپ مسلمانوں کے معاملات کے ذمہ دار بنائے گئے ہیں۔ آپ تجارت کیسے کر سکتے ہیں؟“

فرمایا: ”تو پھر اپنے بال بچوں کی کفالت کیسے کروں؟“

دونوں نے اس بارے میں غور کیا اور پھر بڑے اصرار کے ساتھ انہیں آمادہ کیا کہ وہ ”بیت المال“ سے اپنے اور گھر والوں کی ضرورت کے مطابق خرچہ لے لیا کریں تاکہ پورے اوقات مسلمانوں کے معاملات دیکھنے بھالنے میں صرف ہوں۔[1]

آپ رضی اللہ عنہ کے سامنے سب سے اہم ہدف یہ تھا کہ اسلامی شریعت اور قانونِ الٰہی کو اس شکل میں باقی رکھا جائے جیسا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تھا۔ شریعت کا منبع قرآنِ کریم آپ کے سامنے تھا۔ اس کی تشریح سنتِ رسول کی شکل میں موجود تھی۔ یہ شریعت کے مآخذ تھے اور آپ امّت کو قدم بقدم ان کے مطابق چلانا چاہتے تھے۔

میراثِ نبوی..... ایک اہم قضیہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی استقامت:

طبیعت اور جذبات پر شریعت کو غالب رکھنے کا ایک اور امتحان میراثِ نبوی کے مسئلے کی صورت میں سامنے آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے اس وقت صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حیات تھیں۔ انہیں قدرتی طور پر یہ خیال ہوا کہ باپ کی جائیداد میں اولاد کا حصہ ہوتا ہے لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث میں ہمارا حق ہوگا۔ مگر اس خیال میں وہ تنہا نہ تھیں۔ اکثر اُمہات المؤمنین کو بھی یہی توقع تھی۔ عمر بھر کی طرح وفات کے وقت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خانہ اقدس میں تو کوئی درہم و دینار تھا نہ ساز و سامان۔ البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کی گزر بسر کے لیے تین قسم کے اموال تھے:

1. مدینہ میں یہودِ بنونضیر سے جہاد میں حاصل ہونے والے مالِ فئے کی پیداوار کا پانچواں حصہ۔[2]
2. خیبر کے جہاد سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کا حصہ۔
3. خیبر کے شمال مشرق میں فدک نامی زرخیز علاقے کے باغات کی پیداوار۔

خیبر کی غنیمت اور فدک کی زرعی زمینیں اس جہاد میں شامل تمام صحابہ میں جو ۱۴۰۰ تھے، تقسیم ہوئی تھیں۔ ایک حصہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ملا تھا۔ آمدن کے ان ذرائع کا بیشتر حصہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی ضروریات میں صرف فرما دیتے تھے، تاہم کچھ اپنے اہل و عیال پر بھی خرچ فرماتے تھے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور امہات المؤمنین ان ذرائع آمدن کو میراث نبوی سمجھ کر توقع کرنے لگیں کہ ان سے ایک حصہ ان کی ملکیت میں دے دیا جائے گا۔ مگر یہاں شرعی مسئلہ کچھ اور تھا۔ بنونضیر والی زمین تو مالِ فئے کی تھی جو اللہ کے رسول کی ملکیت نہیں تھی بلکہ ان کی تولیت میں تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ خود بخود مسلمانوں کے شرعی خلیفہ کی تولیت میں آ گئی

---

① تاریخ الاسلام للذہبی: ۱۱۳/۳، ت تدمری

② دشمنوں سے لڑے بغیر جو مال حاصل ہو، وہ مالِ فئے کہلاتا ہے۔ اس کا پانچواں حصہ مسلم سربراہ اپنی صوابدید پر خرچ کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مال کو جہاں ضرورت ہوتی خرچ فرماتے تھے۔ الفیء ما اخذ من اموال اهل الحرب بحق من غير قتال، كالاموال التي يهرب الكفار ويتركونها فزعا عند علمهم بقدوم المسلمين. اما مصرفه فهو في مصالح المسلمين بحسب مايراه الامام كرزق القضاة والمؤذنين، والائمة والفقهاء والمعلمين وغير ذلك. (الفقه الميسر في ضوء الكتاب والسنة، ص ۱۰۷)

تھی۔ وہ اپنی صوابدید کے مطابق اس کی آمدن اہل بیت پر خرچ ضرور کر سکتے تھے مگر اسے کسی کی ملکیت نہیں بنا سکتے تھے۔
جہاں تک خیبر اور فدک کے حصے کا تعلق ہے، وہ حضور ﷺ کی ملکیت میں ضرور تھا مگر نبی کریم ﷺ واضح طور پر فرما گئے تھے: "إِنَّا مَعْشَرَ الأَنْبِيَاءِ لَا نُوْرَثُ، مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ."

"ہم انبیاء کی جماعت کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ ہم جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔"[1]

یعنی گزشتہ امتوں کے پیغمبروں کے لیے بھی یہی حکم تھا کہ ان کی ملکیت میں اگر دنیا کی کچھ چیزیں رہ بھی جاتی تھیں تو ان کی وفات کے بعد ان کے ورثاء میں تقسیم نہیں کی جا سکتی تھیں، بلکہ ان کا مصرف صدقہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس میں اللہ کی طرف سے ایک بڑی حکمت یہ تھی کہ رسولوں کے منکروں کو کہیں یہ کہنے کا بہانہ نہ مل جائے کہ منصب رسالت بھی اہل و عیال کو پالنے اور اپنے خاندان کو مالا مال کرنے کا ایک ڈھونگ ہوا کرتا ہے۔

مگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور اکثر امہات المؤمنین کو یا تو اس شرعی مسئلے سے متعلقہ حدیث کا علم نہیں تھا یا ان کے نزدیک اس کا مطلب کچھ اور تھا۔ مگر چونکہ یہ ایک منفرد مالی معاملہ تھا، اس اُمت کو پہلی اور آخری بار اس سے سابقہ پڑا تھا اس لیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے چند ہی اکابر کا اس کے صحیح معنی سے آگاہ ہونا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ اسی طرح اکثر خواتین کا اس سے لاعلم رہنا، سننے کے بعد بھول جانا یا اس کا صحیح مطلب نہ سمجھنا بھی کوئی محال کی بات نہیں تھی۔ بہر حال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس شرعی مسئلے کی اسی طرح پاسداری کی جیسے رسول اللہ ﷺ کا حکم تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں فرمایا: "اللہ کی قسم میں اس طرز عمل کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا جسے رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے۔"[2]

چنانچہ آپ نے خیبر کے اموال اور فدک کے باغات کو میراث کے طور پر اہل بیت میں تقسیم کرنے کی بجائے مسلمانوں کی اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا گویا اس جائیداد کو صدقہ وخیرات کی بہترین صورت "صدقہ جاریہ" میں تبدیل کر دیا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اہل بیت کو بے سہارا چھوڑ دیا۔ بلکہ آپ تو فرماتے تھے: "رسول اللہ ﷺ کی قرابت میرے نزدیک اپنی قرابت داری سے زیادہ پسندیدہ ہے۔"[3]

آپ نے مناسب ترین فیصلہ فرمایا کہ کسی کو مالکانہ حقوق دیے بغیر، ان جائیدادوں کے متولی کی حیثیت سے ان کی آمدن اہل بیت پر خرچ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسی میں اہلِ بیت اور سادات کرام کی مصلحت بھی تھی۔ کیوں کہ چند افراد کو مالکانہ حقوق مل جاتے تو ممکن تھا چند پشتوں بعد یہ ذریعۂ آمدن ختم ہو جاتا اور بعد والے سادات کو اس سے حصہ نہ ملتا۔ اب اس جائیداد کے سرکاری سرپرستی میں محفوظ ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً دو صدیوں تک اہل بیت کی آل اولاد کو ان اموال سے حصہ پہنچتا رہا اور وہ معاشی طور پر فارغ البال رہے۔[4]

① صحیح البخاري، ح: ٦٧٢٧، كتاب الفرائض، باب قول النبي ﷺ لا نورث ما تركنا صدقة
② صحیح البخاري، ح: ٦٧٢٦، كتاب الفرائض
③ صحیح البخاري، ح: ٤٠٣٥، كتاب المغازي، باب حديث بني نضير
④ السنن الكبرى للبيهقي، ح: ١٢٧٣٣، ط العلمية

بہر کیف جب ان اموال کو اہل بیت میں تقسیم نہ کیا گیا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور اکثر امہات المؤمنین کو مسئلے سے لاعلمی کی وجہ سے شکایت پیدا ہوئی۔ انہوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اپنے مطالبے سے آگاہ کر کے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجنا چاہا۔ اس موقع پر اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا واحد زوجہ مطہرہ تھیں جو پیغمبروں کی میراث کے صحیح مصرف کے قانون سے آگاہ تھیں، چنانچہ انہوں نے فوراً دیگر ازواج مطہرات کو یاد دلاتے ہوئے کہا:

''کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں تھا، جو ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے؟''①

چنانچہ امہات المؤمنین کو یہ مسئلہ معلوم ہوا تو انہوں نے اپنا مطالبہ ترک کر دیا۔ ہاں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا پھر بھی خیال تھا کہ ان کا میراث میں حصہ ہونا چاہیے۔ غالباً ان کے خیال میں حدیث کا مطلب یہ تھا کہ انبیاء کے ترکے سے درہم و دینار یا سونا چاندی جیسی چیزوں میں وراثت جاری نہیں ہوگی کیوں کہ بعض احادیث میں ہے: ''لا يَقْتَسِمُ وَرَثَتِي دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا''② ان کے نزدیک کھیت، زمین اور باغ جیسی غیر منقولہ چیزوں کے بارے میں یہ حکم نہیں تھا۔ اس لیے ان کا اشکال باقی رہا۔ اپنی تسلی کے لیے وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک بار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں۔ خلیفہ اوّل نے انہیں یہی حدیث سنائی کہ انبیاء جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔③

اس موقع پر جگر گوشۂ رسول نے اپنے علمی ذوق کی بناء پر سوال اٹھایا کہ آخر آپ کی اولاد آپ کی وارث ہوگی تو میں اپنے باپ کی وارث کیوں نہیں ہو سکتی؟

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے رسول اللہ کی لختِ جگر! آپ کے والد ماجد نے کوئی گھر، کوئی غلام، کوئی مال، کوئی چاندی یا سونا وراثت میں چھوڑا ہی نہیں۔''

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا: ''اور فدک کی اس زمین کی حیثیت کیا ہے جو اللہ نے ہمارے لیے مقرر کی اور صافیہ (مال فئے کے پانچویں حصے) کا کیا مصرف ہے جو ہمارے لیے آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

خلیفۂ رسول نے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ یہ ایک لقمۂ رزق ہے جو اللہ مجھے کھلا رہا ہے، میں فوت ہو جاؤں تو یہ مسلمانوں کے لیے وقف ہے۔''④

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس ارشاد کے سامنے سکوت اختیار کر لیا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت میں بھی یہ حکم اسی طرح باقی رہا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے ان سے اس قضیے میں دوبارہ بات کی تھی مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دلائل کے سامنے یہ دونوں حضرات خاموش ہو گئے تھے۔⑤

---

① صحیح البخاری، ح: ٦٧٣٠؛ صحیح مسلم، ح: ٤٦٧٩، ط دار الجیل

② صحیح البخاری، ح: ٢٧٧٦، کتاب الوصایا، باب نفقۃ القیم ③ صحیح البخاری، ح: ٦٧٢٦، کتاب الفرائض

④ انما ھی طعمۃ اطعمنیھا اللہ عزو جل فاذا مت کانت بین المسلمین. (شرح معانی الآثار، ح: ٥٣٣٧)

⑤ صحیح البخاری، ح: ٦٧٢٨، کتاب الفرائض

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے درست ہونے اور بنو ہاشم کے اس پر راضی رہنے کا نہایت واضح ثبوت یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا یا ان کی اولاد میں سے دوبارہ کسی نے یہ مطالبہ نہیں دہرایا۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے دورِ خلافت میں اس حکم کو اسی طرح باقی رکھا اور باغ فدک کو اہل بیت کی ملکیت میں نہیں دیا۔ اگر یہ واقعی بنو ہاشم کا حق ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے دور میں پورا اختیار تھا کہ یہ حق حقداروں کو دے دیتے۔ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ظلم تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھی اختیار واقتدار کے باوجود اس ظلم کی تائید کا الزام عائد ہوگا۔ نعوذ باللہ کہ ہم ان حضرات کے بارے میں ایسا سوچیں۔

بعض لوگ یہ جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں کہ ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر اہلِ بیت کو میراث سے محروم کرنے کی سازش کی تھی۔'' حالانکہ میراث کی تقسیم خود حضور ﷺ کے ارشاد کی وجہ سے روکی گئی تھی۔ پھر یہ تاثر انتہائی گمراہ کن ہے کہ صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو محروم کیا گیا۔ درحقیقت امہات المؤمنین میں سے بھی کسی کو میراث نہیں ملی۔ اگر حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما میراث تقسیم کرواتے تو اس میں ان کا اپنا فائدہ تھا کہ ان کی بیٹیاں حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما بھی حصہ پاتیں۔ مگر انہوں نے تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر فرمانِ نبوی کی تعمیل کی۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ناراضی کی روایت اور اس کی توجیہات:

بعض صحیح روایات کے ظاہری الفاظ سے شبہ ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اتنی ناراض ہوئیں کہ دوبارہ ان سے بات چیت نہ کی۔ حالانکہ:

1. ان روایات کا بے تکلف مطلب یہ ہے کہ مسئلۂ میراث میں دوبارہ بات نہیں کی۔
2. اگر مان لیا جائے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا طبعی طور پر کبیدہ خاطر ہوں تو اس سے بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام آسکتا ہے نہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر۔ آخر وہ انسان تھیں۔ قدرتی بات ہے کہ انسان کو کچھ ملنے کی توقع ہو اور پھر معلوم ہو کہ ضابطے کے تحت اس کا استحقاق نہیں ہوسکتا، تو دل میں ایک کڑھن پیدا ہو جاتی ہے۔
3. ممکن ہے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو یہ توقع بھی ہو کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ اور سرپرست ہونے کی حیثیت سے فدک ان کے نام کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ مگر درحقیقت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو شرعاً یہ اختیار نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے جو کیا اس کے علاوہ کچھ کرنا ان کے لیے روا بھی نہ تھا۔ اگر انسانی فطرت کے مطابق حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کچھ حزن وملال ہوا ہو تو یہ ناممکن نہیں۔ مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ یہ ملال قطع تعلق تک جا پہنچا ہو۔
4. سکوت الگ چیز ہے اور سلام وکلام بند کر دینا الگ بات۔ سلام وکلام بند کرنا تب ثابت ہوتا جب ان کا پہلے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے اکثر ملنا جلنا ہوتا اور اس مسئلے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو جاتا۔ ظاہر بات ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے لیے غیر محرم تھے۔ پہلے بھی وہ ان سے شدید ضرورت کے بغیر نہیں ملتی تھیں تو اب کیوں ملتیں۔
5. حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نہ ملنے کی ایک اور بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا

اپنے والد کی وفات کے بعد غم واندوہ میں ڈوبی رہتی تھیں۔ اسی دوران وہ بیمار پڑیں اور چھ ماہ بعد دنیا سے چل بسیں۔ ادھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس وقت مرتدین اور منکرینِ ختم نبوت سے جنگوں اور ایران وشام کے لیے لشکرکشی جیسے اہم ترین امور میں مصروف تھے۔ اس لیے رسمی ملاقاتوں کا وقت کہاں نکل سکتا تھا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے رضامندی کا ثبوت:

یہ ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بیمار پرسی کے لیے ان کے گھر تشریف لے گئے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی گھر تشریف آوری اور خبر گیری سے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو تسلی ہوئی۔ بعد میں بھی وہ ان سے راضی رہیں۔[1]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر کامل اعتماد تھا:

یہ بھی ثابت ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آخر تک اتنے اچھے مراسم تھے کہ راز کی باتیں بھی ان سے کہہ دیا کرتی تھیں۔ چنانچہ جب اُمّ المؤمنین نے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے پہلے تمہارے کان میں کیا کہا تھا کہ تم پہلے روئیں اور پھر ہنس دیں۔ تو جواب دیا کہ انہوں نے پہلے اپنی وفات کی خبر دی جس سے مجھے رونا آ گیا۔ پھر بتایا کہ میرے گھرانے میں سے سب سے پہلے تم مجھ سے آملوگی۔ اس پر میں ہنس دی۔[2]

اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ناراضی ہوتی تو ان کا اپنے گھر آنا پسند کیوں فرماتیں اور ان کی بیٹی سے راز کی باتیں کیوں کرتیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اظہارِ محبت:

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی دوسری بیوی لیلیٰ بنت مسعود سے تولد ہونے والے ایک بیٹے کا نام ابوبکر رکھا۔[3]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو ان کے بیٹے محمد بن ابی بکر اڑھائی سال کے تھے۔[4] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنا منہ بولا بیٹا بنا کر پالا۔[5]

کیا یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے محبت کا واضح ثبوت نہیں؟ سچ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جگر گوشہ اور اہل بیت کو خلفائے راشدین کا مخالف باور کرنے والے ان ہستیوں کی عظمتِ کردار سے واقف ہی نہیں ہیں۔

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی وفات:

خلافتِ صدیقی کے چھٹے ماہ، ۳ رمضان ۱۱ھ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوگئی۔[6] ایک روایت کے مطابق

---

① الاعتقاد للبیهقی، ص ۳۵۳، عن طریق الشعبی باسناد صحیح مرسل

② صحیح مسلم، ح: ۶۳۶۶، باب فضائل فاطمہ رضی اللہ عنہا

③ البدایة والنهایة: ۲۵/۱۱ ...... یہ ابوبکر بن علی سانحہ کربلا میں شہید ہوئے تھے۔

④ طبقات ابن سعد، ترجمة: محمد بن ابی بکر

⑤ طبقات ابن سعد: ۲۹/۸، ط صادر

⑥ طبقاتِ ابن سعد: ۲۸/۸، ط صادر

نمازِ جنازہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اور دوسری روایت کے مطابق حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔[1]

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دل پر گہرا اثر تھا۔ اکثر یہ شعر پڑھتیں:

صُبَّتْ عَلَيَّ مَصَائِبٌ لَوْ أَنَّهَا صُبَّتْ عَلَى الْأَيَّامِ صِرْنَ لَيَالِيَا

''مجھ پر ایسے مصائب ٹوٹے کہ اگر وہ دنوں پر نازل ہوتے تو دن بھی رات بن جاتے۔''

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کو کبھی کسی نے ہنستے ہوئے نہ دیکھا۔ غم واندوہ سے اندر ہی اندر گھلتی رہیں۔ صحیح قول کے مطابق آپ کی عمر ۲۸ برس تھی۔[2]

☆☆☆

---

① حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ کس نے پڑھائی؟

اس بارے میں ابن سعد نے تین روایات پیش کی ہیں، تینوں واقدی کی ہیں۔

❶ واقدی بروایت عمرۃ بنت عبدالرحمٰن کے مطابق نمازِ جنازہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ (طبقاتِ ابن سعد: ۲۸/۸، ط صادر)
مگر روایت کنندہ عمرۃ بنت عبدالرحمٰن (م ۹۸ھ) یقیناً گیارہ ہجری کے اس واقعے کی عینی شاہد نہیں ہو سکتیں۔

❷ واقدی بروایت عروہ بن زبیر کے مطابق نماز جنازہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ ان علیا صلی علیٰ فاطمة (طبقات ابن سعد: ۲۹/۸)
اس کی سند یہ ہے: محمد بن عمر (الواقدی) عن معمر عن الزهری عن عروة...... ظاہر ہے کہ عروہ بن الزبیر رحمہ اللہ بھی اس واقعے کے عینی شاہد نہیں کیوں کہ ان کی ولادت ۲۳ ہجری کی ہے (تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۵۶) پس یہ اسناد منقطع ہے اور واقدی کی وجہ سے اس کا ضعف بھی ظاہر ہے۔
اس روایت کو امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی نقل کیا ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا نورث) اس کا ابتدائی حصہ تو یقیناً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے مگر بعد کا حصہ زہری کا ادراج ہے اور عروہ بن زبیر رحمہ اللہ سے منقطعاً منقول ہے جیسا کہ شارحین نے اس روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیعت سے چھ ماہ تک تخلف کے واقعے کو اسی ادراج پر محمول کیا ہے، پس نمازِ جنازہ کا واقعہ بھی مدرج من الراوی اور سنداً منقطع ہے۔

❸ واقدی بروایت شعبی کے مطابق نمازِ جنازہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ صلی علیها ابوبكر رضی الله عنه وعنها (طبقات ابن سعد: ۲۹/۸) سند یہ ہے: اخبرنا محمد بن عمر حدثنا قیس بن الربیع عن مجالد عن الشعبی
واقدی کا ضعف ظاہر ہے۔ قیس بن الربیع صدوق ہیں۔ (تقریب التهذیب، تر: ۵۵۷۳)
مجالد بن سعید کو لین، لیس بشیء کہا گیا ہے، (تقریب التهذیب، تر: ۶۴۷۸) مگر امام مسلم کا ان سے روایت لینا ظاہر کرتا ہے کہ ان کا ضعف معمولی ہے۔
امام شعبی کا ثقہ ہونا ظاہر ہے۔ سند یہ بھی منقطع ہے کیوں کہ امام شعبی بھی واقعے کے عینی شاہد نہیں۔ مگر اس روایت کا درج ذیل متابع موجود ہے:
صلی ابوبکر الصدیق علیٰ فاطمة بنت رسول الله فکبر علیها اربعا۔ (طبقات ابن سعد: ۲۹/۸)
سند یہ ہے: شبابة بن سوار، عبدالاعلیٰ بن ابی المساور، حماد (شیخ الامام ابی حنیفة)، ابراهیم (النخعی)۔
سند یہ بھی منقطع ہے، مزید اس میں عبدالاعلیٰ کی وجہ سے ضعف آ گیا ہے کیوں کہ انہیں متروک اور ''لیس بشیء'' کہا گیا ہے (میزان الاعتدال: ۵۳۲/۲)
غرض اس سلسلے کی تمام روایات ضعیف ہیں۔ مگر تیسرا قول متابع کی موجودگی کے باعث نسبتاً قوی معلوم ہوتا ہے۔

② المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۹۹/۲۲
ایک قول ۲۵ برس کا بھی ہے مگر وہ خلافِ تحقیق ہے جیسا کہ ہم اسے سیرتِ نبویہ کے باب میں حواشی کے تحت واضح کر چکے ہیں۔

تین بڑے فتنے

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی تین ایسے فتنوں سے سابقہ پڑا کہ اگر آپ ان کو خداداد استقامت اور محیر العقول قوتِ ایمانی کے ساتھ نہ روکتے تو وہ ابتدائی دور ہی میں اُمت کے تار و پود بکھیر دیتے۔

پہلا فتنہ، اقتدار کے اُن بھوکوں کا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر کے سرزمین عرب کے مختلف گوشوں میں اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ہزاروں نومسلم اور ناسمجھ لوگ ان کے پیروکار بن گئے تھے۔ ان جھوٹے نبیوں میں اَسود عَنسی، طلیحہ بن خُوَیلد، مُسیلمہ کذاب اور بنو تمیم کی ایک عورت سَجاح شامل تھی۔

دوسرا فتنہ ارتداد کا تھا۔ نجد، یمن اور دوسرے علاقوں میں ہزاروں لوگ یہ تصور کر کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ اسلام کی شمع بھی گل ہو چکی، مرتد ہو گئے تھے، انہوں نے دوبارہ اپنا آبائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔

تیسرا فتنہ ان لوگوں کا تھا جو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر رہے تھے۔

منکرین زکوٰۃ سے معاملہ:

زکوٰۃ کے منکرین نے دربارِ خلافت میں اپنے نمائندے بھیج کر مطالبہ کیا کہ وہ توحید و رسالت اور اسلام کے تمام ارکان کو مانتے ہیں مگر انہیں زکوٰۃ معاف کر دی جائے۔ بعض صحابہ کرام نے حالات کی نزاکت اور وقتی مصلحت کو دیکھتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو رائے دی کہ فی الحال ان لوگوں کا یہ مطالبہ منظور کر لیا جائے اور زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی چھوٹ دے دی جائے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے دلیر اور بلند حوصلہ انسان کا مشورہ بھی یہی تھا کہ بغاوت کے فتنے سے بچنے کے لیے ان کی شرط مان لی جائے۔ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا:

"یہ لوگ کلمہ لا الٰہ الا اللہ تو پڑھ رہے ہیں، آپ ان سے کیوں جنگ کرنا چاہتے ہیں؟"

لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سیاسی مصلحتوں اور وقتی ضرورتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اسلام کو اصلی شکل میں باقی رکھنے کا عزم کیے ہوئے تھے، اس لیے آپ نے فرمایا: "اللہ کی قسم! جو شخص زکوٰۃ کو نماز کے برابر اہمیت نہیں دے گا، میں اس سے ضرور لڑوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو لوگ زکوٰۃ میں بکری کا ایک بچہ بھی دیتے تھے، اگر آج اس کی ادائیگی روکیں گے تو میں ان سے بزورِ شمشیر لے کر رہوں گا۔"[1]

جیشِ اُسامہ کی روانگی:

باطل کے ان تمام گروہوں سے نمٹنا ضروری تھا مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جس کام کو سب سے زیادہ اہمیت

[1] صحیح البخاری، کتاب الزکوۃ، باب وجوب الزکوۃ ؛ سنن نسائی مجتبیٰ، ح: ۳۰۹۱، ط حلب۔ .. یہ فقط قیاس نہ تھا بلکہ نصوص اس کی مؤید تھیں: امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یشهدوا ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله ویقیموا الصلوة ویؤتوا الزکوة (صحیح مسلم، ح: ۱۳۸)

دی وہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے اس لشکر کی روانگی تھی جسے حضور ﷺ نے اپنے آخری ایام میں ترتیب دیا تھا مگر آپ ﷺ کی بیماری اور پھر وفات کے سبب اب تک یہ لشکر مدینہ منورہ کے باہر رکا ہوا تھا اور اب صحابہ کرام کی اکثریت کا خیال یہ تھا کہ اس لشکر کو روک کر پہلے جزیرۃ العرب میں برپا ہونے والی بغاوتوں کی سرکوبی کی جائے تاکہ اپنی طاقت منتشر نہ ہونے پائے۔

اس چوطرفہ آزمائش میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کا حوصلہ تھا جو نبوت کے معیارِ سیاست کو باقی رکھ سکے۔ انہوں نے توکل اور تدبیر کا ایسا امتزاج پیش کیا کہ مسلمان حالات کے ان سخت ترین طوفانوں سے بخیریت گزر گئے اور دین وشریعت کے کسی رکن میں معمولی رخنہ آنے کی نوبت بھی نہ آئی۔

اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس وقت دینی صلابت اور ایمانی استقامت میں ذرا بھی ضعف کا مظاہرہ کرتے تو اسلام ایک عملی دین اور ابدی نظامِ حیات کی سطح سے گر کر ایک فلسفہ بن کر رہ جاتا یا محض عبادات کا ایک ذاتی نظام الاوقات تصور کیا جاتا۔ اسی وقت سے یہ فرض کر لیا جاتا کہ یہ دین بھی حکومت وسیاست کے امور کا ساتھ دینے سے قاصر ہے، پس چلتی پھرتی زندگی کے معاملات کو شریعت سے آزاد عقل اور تجربے ہی کے تحت حل کرنا چاہیے۔ مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بصیرت و بالغ نظری نے اس خطرے کو بھانپا اور اس کا بروقت تدارک کیا۔

حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے لشکر کی روانگی کا معاملہ سامنے آیا تو حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہم جیسے اکابر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی روانگی مؤخر کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا: ''عرب میں ہر طرف بغاوت پھیل چکی ہے۔ اس لشکر کو شام بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں، اسے مرتدین کے خلاف روانہ کیجیے۔ اس لشکر کی عدم موجودگی میں مدینہ محفوظ نہیں رہے گا۔ یہاں ہمارے بچے اور خواتین ہیں، آپ رومیوں سے جہاد کو اُس وقت تک ملتوی رکھیں جب تک مرتدین کا معاملہ نمٹ جائے۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُن کی باتیں بوجھل طبیعت کے ساتھ سنیں اور پھر گویا ہوئے: ''مزید کچھ کہنا ہے؟''

وہ بولے ''جی نہیں۔ ہم اپنی بات کہہ چکے۔''

تب خلیفہ بلافصل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اُس ذات کی قسم جس کی قبضے میں میری جان ہے اگر درندے مدینہ میں گھس کر مجھے کھا جائیں، تب بھی میں اس لشکر کو ضرور بھیجوں گا۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اسے روک لوں، جبکہ جناب رسول اللہ ﷺ جن پر آسمان سے وحی نازل ہوتی تھی، فرما گئے ہیں کہ اس لشکر کو روانہ کردو۔''[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اٹل فیصلہ سن کر سب خاموش ہوگئے، تاہم بعض حضرات نے تجویز دی کہ اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی جگہ اکابر صحابہ میں سے کسی کو امیر بنا دیا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ سن کر بڑے جوش سے بولے:

''جسے رسول اللہ ﷺ نے امیر بنایا ہے، تم اسے معزول کرنے کا مشورہ دے رہے ہو!''

[1] تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۰۱ ؛ کنز العمال، ح: ۳۰۲۶۶، ۳۰۲۶۷

لشکر روانگی کے لیے تیار ہوا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مجاہدین کی حوصلہ افزائی کے لیے اس طرح ساتھ چلے کہ آپ پیادہ تھے اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے مؤدبانہ طور پر درخواست کی:

''خلیفۃ الرسول آپ سوار ہو جائیں ورنہ میں بھی پیدل چلوں گا۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بولے: ''نہ تمہیں اُترنے کی ضرورت ہے نہ مجھے سوار ہونے کی۔ کیا حرج ہے، میرے پیروں پر اللہ کے راستے کی کچھ دھول لگ جائے، مجاہد کو تو ہر قدم پر سات سو نیکیاں ملتی ہیں۔''

آپ رضی اللہ عنہ مشاورت کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ مدینہ منورہ میں رکھنا چاہتے تھے مگر وہ لشکرِ اسامہ میں شامل تھے۔ آپ نے نظم وضبط کی اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے انہیں خود روکنے کی بجائے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے انہیں اپنے پاس رکھنے کی باقاعدہ اجازت لی۔ اس طرح سب پر واضح ہو گیا کہ امیر کا مقام کیا ہے اور نظم وضبط کسے کہتے ہیں۔ روانگی کے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو درجِ ذیل ہدایات دیں:

''خیانت اور بدعہدی مت کرنا، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، کھجوروں اور پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا۔ تمہیں وہاں عبادت خانوں میں گوشہ نشین راہب ملیں گے، ان کو کوئی گزند نہ پہنچانا۔'' ①

لشکرِ اسامہ میں دو ہزار پیادے اور ایک ہزار گھڑ سوار تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو افراد اس میں شامل ہوئے تھے اُن میں سے کوئی کم نہ ہوا۔ ②

لشکرِ اُسامہ کے جانے کے بعد مدینہ منورہ کا دفاع:

حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے لشکر کی روانگی کے بعد مدینہ منورہ میں عسکری طاقت بہت کم رہ گئی تھی، اس لیے مرتد قبائل نے مدینہ منورہ کے اِردگرد جمع ہونا شروع کر دیا، مدینہ کے شمال سے عَبس اور ذُبیان، شمال مشرق سے بنوفَزارہ اور جنوب مشرق سے بنوغطفان کے مرتدین امنڈ پڑے۔ شہر کو خطرے میں دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بڑی مستعدی سے حفاظتی انتظامات کیے۔ تمام شاہراہوں اور راستوں کی ناکہ بندی کرائی اور اہلِ مدینہ کو ہر وقت تیار اور چوکس رہنے کی تاکید کی۔ ③

اُدھر حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر شام کی سرحدوں کی جانب نکلا تو راستے میں کئی ایسے قبائل کے پاس سے اس کا گزر ہوا جو ارتداد اور بغاوت کے لیے پر تول رہے تھے مگر جب انہوں نے اسلامی لشکر کو اس آن بان اور بے خوفی سے گزرتے دیکھا تو مرعوب ہو گئے اور بغاوت کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر نے شام کی سرحد عبور کر کے ''بَلقاء'' اور ''دارُوم'' کے علاقوں میں رومیوں سے ٹکر لی اور انہیں شکست دے دی۔ ④

لشکرِ اسامہ کی کامیابی کی خبریں سن کر وہ باغی قبائل جو مدینہ کے شمال اور مشرق میں صرف چند میل دور پڑاؤ ڈالے

---

① الکامل فی التاریخ: تحت ۱۱ ھجری ② المغازی للواقدی: ۱/۱۰۷۴

③ الکامل فی التاریخ: تحت ۱۱ ھجری ④ البدایة والنهایة: ۹/۲۲۴، دار ھجر

ہوئے تھے سہم گئے، وہ کہہ رہے تھے: ''اگر مدینہ والوں میں غیر معمولی طاقت نہ ہوتی تو اس حالت میں وہ یہ لشکر روانہ نہیں کر سکتے تھے۔''[1] چنانچہ انہیں مدینہ پر حملے کی جرأت نہ ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی لشکرِ اسامہ کی واپسی تک احتیاط سے کام لیا اور مدینہ کے دفاع پر توجہ دیتے ہوئے باغیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔

باغیوں کی سرکوبی:

چالیس دن بعد جونہی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ فتح کا پرچم لہراتے ہوئے واپس آئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں مدینہ منورہ میں اپنا نائب بنایا اور خود لشکر لے کر باغیوں کی سرکوبی کے لیے چل پڑے۔ صحابہ کرام نے اصرار بھی کیا کہ آپ کا دار الخلافہ میں رہنا ضروری ہے مگر آپ نہ رکے۔ لشکر لے کر بذاتِ خود سپہ سالار کی ذمہ داریاں انجام دیتے ہوئے آپ نے مدینہ کے گردونواح میں پیش قدمی کی۔ یہ جمادی الآخرۃ کے ایام تھے۔ عَبس، ذُبیان، بنومُرّۃ اور بنو کنانہ کے فسادی مدینہ کے اطراف میں منڈلا رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اچانک یلغار کی اور ایک دن صبح کا اُجالا نمودار ہونے سے قبل انہیں جالیا۔ فسادی انہیں یکایک سامنے پاکر دہشت زدہ ہوگئے، مسلمان ان پر پل پڑے، سورج نکلتے نکلتے حریف لاشوں کے ڈھیر چھوڑ کر فرار ہو چکا تھا۔ یہ شورش پسندوں کے خلاف پہلی فتح تھی۔[2]

اس طرح آپ رضی اللہ عنہ نے باغیوں پر اپنی ہیبت طاری کر کے انہیں منتشر کر دیا۔

منکرینِ ختم نبوت سے جہاد

اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ سے بارہ میل (۲۰ کلومیٹر) دور ''ذی القصّہ'' کے مقام پر کیمپ لگا کر فوج کو گیارہ حصوں میں تقسیم کیا۔ ہر حصے پر تجربہ کار صحابہ کرام کو امیر مقرر کیا اور ایک مربوط نقشہ جنگ مرتب کر کے ان گیارہ لشکروں کو پورے جزیرۃ العرب میں پھیلا دیا۔ آپ کا سب سے بڑا ہدف اب جھوٹے نبیوں کی سرکوبی کرنا تھا۔

آپ اس سے قبل تمام مرتد سرداروں، نبوت کے جھوٹے دعوے داروں اور اُن کے پیروکاروں کی طرف اپنے قاصد بھیج کر انہیں دوبارہ اسلام کی دعوت دے چکے تھے۔ آپ کے نائبین سرتوڑ کوششیں کر چکے تھے کہ یہ گمراہ لوگ دوبارہ ہدایت پر آجائیں مگر فتنوں کی گھٹا ایسی گھنگھور تھی کہ بہت کم لوگوں پر اس دعوت کا اثر ہوا، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی پوری قوت، ہمت اور ایمانی جوش کے ساتھ ان کے مقابلے پر آ گئے۔[3]

طُلَیحہ کی سرکوبی:

بنو اسد کے سردار طُلَیحہ نے نبوت کا دعویٰ کر کے اپنے گرد ایک بھاری جمعیت اکٹھی کر لی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ جبرئیل علیہ السلام اس کے پاس بھی آیات لاتے ہیں، اس کی من گھڑت آیات کچھ اس قسم کی تھیں:

[1] الکامل فی التاریخ: تحت ۱۱ ھجری
[2] البدایۃ والنھایۃ: ۹/۴۴۳
[3] تاریخ الطبری: ۳/۲۴۸، ۲۴۹

"وَالْحَمَامِ وَالْيَمَامِ، وَالصُّرَدِ الصَّوَّامِ، قَدْ صُمْنَ قَبْلَكُمْ بِأَعْوَامٍ، لَيَبْلُغَنَّ مُلْكُنَا بِالشَّامِ"

"قسم ہے شہری کبوتر اور جنگلی کبوتر کی اور روزہ دار لٹورے کی[1] ان سب نے تم سے کئی سال پہلے روزے رکھے۔ ہماری حکومت شام تک پھیل کر رہے گی۔"[2]

لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے وہ طرح طرح کی شعبدہ بازیاں دکھاتا تھا۔ ایک بار اس نے ریگستان میں پانی کے بڑے بڑے مٹکے چھپا دیے۔ جب اس کے ساتھیوں کو پانی کی تنگی محسوس ہوئی تو بولا:

"گھوڑوں پر سوار ہو کر اس سمت چند میل طے کرو۔ پانی کے مٹکے ملیں گے۔"

لوگوں کو اس جگہ پانی ملا تو اسے طلیحہ کا "معجزہ" سمجھے۔ اس شعبدہ بازی کے ذریعے اس نے بنو اسد، بنو غطفان اور بنو طے کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ غرض یہ ایک مہلک فتنہ تھا جس نے مدینہ منورہ کے مشرق کو گرد آلود کر دیا تھا۔[3]

طلیحہ کی سرکوبی کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسلام کے بہترین سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا۔ اس وقت طلیحہ اپنی فوج کے ساتھ "بُزاخہ" کے مقام پر فروکش تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو روانہ کرتے ہوئے ہدایت کی: "پہلے قبیلہ بنو طے کے پاس جانا، پھر بُزاخہ کا رخ کرنا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر بطاح میں (بنو تمیم کے مالک بن نُوَیرہ) کی گوشمالی کرنا اور میرا دوسرا حکم آنے تک وہیں ٹھہرنا۔"

اِن ہدایات میں سے ہر ایک بڑی گہری حکمتوں پر مبنی تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ حکم کے مطابق متاثرہ علاقوں میں پہنچے اور سب سے پہلے بنو طے سے رابطہ کیا، یہ لوگ طلیحہ کی حمایت کے باوجود ابھی تک اسلام پر قائم تھے، بنی طے کے سردار عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مشورہ دیا کہ تین دن تک صبر کریں، اس دوران وہ اپنے قبیلے کو سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ مان گئے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور بنو عدی کے لوگ طلیحہ کا ساتھ چھوڑ کے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی فوج میں شامل ہو گئے۔[4]

یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی پر عمل کرنے کا نتیجہ تھا کہ لڑائی سے پہلے ہی دشمن کی صفوں میں دراڑیں پڑ گئیں اور مسلمان لشکر کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ اب حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے طلیحہ کے خلاف کارروائی شروع کی "بُزاخہ" کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ یہ جگہ مدینہ منورہ سے کوئی چار سو کلو میٹر شمال مشرق میں ہے۔ طلیحہ خود ایک چادر اوڑھ کر مراقبے کی حالت میں اس طرح بیٹھ گیا جیسے اس پر وحی نازل ہونے والی ہو۔ اس کی فوج کا سپہ سالار عُیَینَہ بن حصن جس کے پاس بنو فزارہ کے سات سو جنگجو تھے، مسلمانوں پر حملہ آور ہوا۔ گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔

جلد ہی عُیَینَہ نے محسوس کر لیا کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو شکست دینا مشکل ہے۔ اس نے طلیحہ کے پاس آ کر پوچھا:

"کیا جبرئیل کوئی پیغام لائے ہیں؟" طلیحہ کا جواب تھا: "ابھی نہیں۔"

---

[1] لٹورا لشکرے جیسا ایک پرندہ ہوتا ہے جو چھوٹے پرندوں کو شکار کرتا ہے۔ [2] الكامل في التاريخ: تحت ۱۱ھ
[3] سیرت ابن حبان: ۴۳۱/۲ [4] تاريخ الطبري: ۲۵۳/۳

لڑائی نے طول کھینچا اور عُیینہ کو کامیابی دور معلوم ہونے لگی تو پھر طلیحہ کے پاس گھبرایا ہوا آیا اور چلایا:

"تیرا باپ مرے، جبرئیل کچھ حکم لائے کہ نہیں۔" طلیحہ بولا: "ابھی تک تو نہیں آئے۔"

عُیینہ پھر جا کر فوج کو لڑانے میں مصروف ہو گیا۔ مگر جب ساتھیوں کے قدم ڈگماتے دیکھے تو پھر دوڑا ہوا آیا اور بولا: "جبرئیل آئے کہ نہیں؟" طلیحہ بولا: "ہاں آئے تھے۔" عیینہ نے خوش ہو کر پوچھا: "کیا حکم لائے؟"

طلیحہ نے من گھڑت آیات پڑھ دیں: "اِنَّ لَکَ رِحاً کَرِحاہُ . وَحَدِیثًا لا تَنسَاہُ"

(تیرے نصیب میں ہے اک چکی، جیسے اُس کی چکی۔ تیری حالت ہوگی ایسی، تو بھولے گا نہ کبھی)

یہ اُوٹ پٹانگ جملے سن کر عُیینہ سمجھ گیا کہ طلیحہ نے نبوت کا ڈھونگ رچایا ہوا ہے۔ اس نے لشکر میں جا کر آواز لگائی:

"لوگو! جان بچا کر بھاگو، یہ شخص تو جھوٹا اور مکار ہے۔"

عُیینہ اور اس کے قبیلے کے بھاگتے ہی مرتدین کے قدم اکھڑ گئے، عُیینہ تو پکڑا گیا مگر طلیحہ نے ایسے موقع کے لیے پہلے سے ایک نہایت تیز رفتار گھوڑے کا انتظام کر رکھا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو لے کر اس پر سوار ہوا اور یہ کہتے کہتے فرار ہو گیا:

"لوگو! جو اپنی بیوی کو لے کر بھاگ سکتا ہے، بھاگ جائے۔"

وہ جان بچا کر شام پہنچ گیا، پھر مدتوں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا، آخر دوبارہ مسلمان ہو گیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دربار میں معافی کی درخواست بھیج دی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ارتداد سے توبہ تائب ہونے والوں کے لیے نرم رویہ اپنایا تھا، چنانچہ اس کی معذرت قبول کر لی گئی۔ بعد میں طلیحہ نے عراق کے جہاد میں اسلام کے بہترین سپاہی کا کردار ادا کیا۔ عُیینہ نے اسلام قبول کر لیا تو اسے بھی رہا کر دیا گیا۔ [1]

اُمِّ زِمل کی سرکوبی:

طلیحہ کے لشکر سے نمٹنے کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے مطابق اس علاقے میں ٹھہرے رہے، اس قیام کی مصلحت یہ سامنے آئی کہ اس دوران آس پاس ارتداد کے جو معمولی اثرات دوبارہ ظاہر ہوئے، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو انہیں مٹانے کے لیے دوبارہ مہم جوئی نہیں کرنا پڑی۔

ان دونوں بنوغطفان، ہوازن اور بنوسُلیم کے مرتدین ایک عورت اُمِّ زِمل (سلمٰی بنت مالک) کی قیادت میں جمع ہو گئے تھے۔ ایک جہاد میں یہ قید ہو کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی باندی بنی تھی۔ انہوں نے احسان کرتے ہوئے اُسے رہا کر دیا تھا۔ اس کی ماں اُمِّ قرفہ بھی اپنے قبیلے کی سردار تھی جو مسلمانوں سے لڑائی میں ماری گئی تھی۔ اُمِّ زِمل نے ماں کے انتقام کے جوش میں عرب قبائلیوں کو اپنے گرد جمع کر لیا اور انہیں مسلمانوں سے لڑنے پر برانگیختہ کر دیا۔

اس کے عزائم کی اطلاع ملنے پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ لشکر لے کر بڑھے۔ اُمِّ زِمل ایک اونٹ پر سوار ہو کر اپنے عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں مقابلے پر آئی۔ ایک شدید لڑائی کے بعد مسلمانوں نے اس کے اونٹ کو گرا کے اسے

[1] الکامل فی التاریخ: تحت ۱۱ ہجری

قتل کر دیا۔ اس لڑائی میں سو مرتد، اُمِّ زِمل کی حفاظت کرتے کرتے قتل ہوئے۔[1]

اَسود عنسی کا فتنہ:

جھوٹے مدعیانِ نبوت میں سے اسود عنسی نے حضور ﷺ کے زمانے ہی میں فتنہ برپا کر دیا تھا۔ ہزاروں دیہاتی اس کے پیروکار بن گئے تھے۔ اس کی قوت سے سارے یمن والے خائف تھے۔ اسود عنسی کی ستم رانیوں کا یہ عالم تھا کہ اس نے یمن کے مشہور تابعی حضرت ابو مسلم خولانی رحمہ اللہ کو (جنہوں نے حضور ﷺ کا زمانہ پایا مگر زیارت کا شرف حاصل نہ کر سکے تھے) اپنی جھوٹی نبوت کا کھلم کھلا انکار کرنے کی پاداش میں گرفتار کر کے بے دریغ بھڑکتے الاؤ کے شعلوں میں پھینک دیا، تاہم ابو مسلم خولانی بالکل محفوظ رہے، اللہ تعالیٰ نے اُن کا بال بھی بیکا نہ ہونے دیا، یہ حیرت انگیز منظر دیکھ کر اسود عنسی کے چیلوں نے کہا: ''اسے یہاں سے چلتا کریں ورنہ لوگ آپ سے برگشتہ ہو جائیں گے۔'' اسود نے انہیں یمن سے چلے جانے کا حکم دیا۔ وہ خود ان بدبختوں سے دور رہنا چاہتے تھے، چنانچہ یمن چھوڑ دیا۔

یہ واقعہ حضور ﷺ کے مرض الوفات کا ہے۔[2] حضور ﷺ نے اسود کی شورش کا حال سن کر مقامی رئیسوں کو مکتوب بھیجا تھا کہ وہ اسود کے فتنے کی سرکوبی کریں، چنانچہ یمن کے ایک صحابی فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ نے خفیہ طور پر ایک شب اسود عنسی کی رہائش گاہ میں گھس کر اسے قتل کر دیا، اس طرح عارضی طور پر یہ فتنہ دب گیا تھا۔[3] مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں اس کے پیروکاروں نے یمن میں پھر سے شورش برپا کر دی تھی، آخر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت مہاجر بن اُمیّہ رضی اللہ عنہ کو فوج دے کر یمن بھیجا۔ انہوں نے شرپسندوں کو شکست فاش دی اور یمن میں امن وامان بحال کر دیا۔[4]

انہی دنوں ابو مسلم خولانی رحمہ اللہ مدینہ منورہ حاضر ہوئے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں مسجد نبوی میں نماز پڑھتے دیکھا تو چونکے، پوچھا: ''کہاں کے ہیں؟'' بولے، ''یمن کا۔'' پوچھا: ''وہ کون تھا جسے اسود کذاب نے آگ میں ڈالا تھا؟'' بولے: ''عبداللہ بن ثَوب۔'' (ان کا اصل نام یہی تھا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تاڑ لیا اور قسم دے کر پوچھا: ''وہ آپ ہی تو نہیں؟'' بولے: ''جی ہاں'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں گلے سے لگا کر رو دیے۔ پھر انہیں ساتھ لے کر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور ماجرا سنایا۔ وہ بولے: ''اللہ کا شکر ہے کہ جس نے موت سے پہلے پہلے مجھے اس اُمت کے ایسے فرد کی زیارت کرادی جس کے ساتھ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسا معاملہ فرمایا۔''[5]

مالک بن نُویرہ کا قتل:

بِطاح میں بنوتمیم کا رئیس مالک بن نُویرہ بھی سرکشی ظاہر کر رہا تھا۔ حضور ﷺ نے آخری ایام میں اپنے عاملین کو

---

[1] الکامل فی التاریخ: تحت ۱۱ ھجری
[2] البدایة والنهایة: ۳۲۹/۹
[3] الکامل فی التاریخ: ۱۹۸/۲؛ البدایة والنهایة: ۴۳۵/۹، ۴۳۶
[4] الکامل فی التاریخ: ۲۲۷/۲ تا ۲۲۹، ذکر خبر ردة الیمن ثانیاً
[5] البدایة و النهایة: ۳۲۹/۹

زکوۃ وصول کرنے اُس کے پاس بھیجا تھا، اس دوران حضور ﷺ کے وصال کی خبر آئی تو مالک بن نُویرہ اَڑ گیا کہ یہ زکوۃ اب مدینہ نہیں بھیجی جائے گی بلکہ یہیں کے مستحقین میں خرچ کی جائے گی۔ جب حضور ﷺ کے عاملین نے زکوۃ کی رقم مدینہ منورہ بھیجنے پر اصرار کیا تو مالک بن نُویرہ لڑائی پر آمادہ ہوگیا۔ انہی دنوں عراق کے سرحدی علاقے "الجزیرہ" سے نبوت کا دعویٰ کرنے والی عورت سَجاح بنت حارث وہاں پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ اچھا خاصا جتھا تھا جن میں بنو تغلب کے عیسائی بھی شامل تھے جو مسلمانوں کی خانہ جنگی میں ایندھن ڈالنے کے لیے تیار تھے۔

سَجاح اس لشکر کو لے کر مدینہ پر حملہ کرنا چاہتی تھی، راستے میں اس نے بنو تمیم کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے مالک بن نُویرہ سے مذاکرات کیے۔ مالک نے اُسے سمجھایا کہ ابھی مدینہ پر حملہ کی بجائے اپنی طاقت بڑھانا بہتر ہے۔ سجاح کو یہ مشورہ پسند آیا چونکہ اُن دنوں یمامہ کے مُسَیلِمَہ کذاب کی قوت کا بڑا چرچا ہو رہا تھا، اس لیے سجاح اس سمت روانہ ہوگئی۔ مالک بن نُویرہ یہ مشورہ دے کر پیچھے تنہا رہ گیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان حالات سے خوب واقف تھے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے روانہ کرتے وقت بطاح والوں کی بھی خبر لینے کی ہدایت دے چکے تھے۔ چنانچہ طُلَیحہ سے نمٹتے ہی انہوں نے بطاح پر یلغار کر دی۔ مالک بن نُویرہ ساتھیوں سمیت گرفتار ہوگیا۔ اس نے زکوۃ اور کسی رکنِ اسلام کا انکار نہیں کیا تھا مگر بہرحال وہ خلافتِ اسلامیہ کا باغی ضرور تھا، اس کے باوجود حضرت خالد رضی اللہ عنہ اُسے قتل نہیں کرنا چاہتے تھے، کیوں کہ وہ ایک شریف، سخی اور بہادر انسان کے طور پر مشہور تھا مگر قسمت کا ہونا ہو کر رہتا ہے۔ مالک بن نُویرہ گرفتاری کے بعد غلط فہمی میں ایک سپاہی کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ مالک کا بھائی مُتمم بہترین شاعر تھا، اس نے بھائی کی یاد میں جو اشعار کہے وہ عربی ادب کا حصہ بن گئے۔ وہ کہتا ہے۔

وَكُنَّا كَنَدْمَانَيْ جَذِيْمَةَ حَقْبَةً
مِنَ الدَّهْرِ حَتّٰى قِيْلَ لَنْ يَّتَصَدَّعَا
وَعِشْنَا بِخَيْرٍ فِي الْحَيَاةِ وَقَبْلَنَا
أَصَابَ الْمَنَايَا رَهْطُ كِسْرٰى وَتُبَّعَا
فَلَمَّا تَفَرَّقْنَا كَأَنِّيْ وَمَالِكًا
لِطُوْلِ اجْتِمَاعٍ لَمْ نَبِتْ لَيْلَةً مَعًا

"ہم جذیمہ بادشاہ کے دو وزیروں کی طرح ایک مدت تک ساتھ رہے، یہاں تک کہ کہا جانے لگا یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ ہم خیر و عافیت کی زندگی گزارتے رہے حالانکہ ہم سے پہلے کسریٰ اور تبع جیسے بادشاہوں کو بھی موت آکر رہی۔ پس جب ہم جدا ہوئے تو ایسا لگتا ہے کہ میں اور مالک اتنی مدت ساتھ رہ کر بھی ایک رات بھی ساتھ نہ رہے تھے۔"[1]

[1] المختصر فی اخبار البشر: ۱/۱۵۸؛ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۱۰۵، ۱۰۶

اِس طرح اس کے یہ اشعار بھی اشک آور ہیں:

لَقَدْ لَامَنِی عِنْدَ الْقُبُوْرِ عَلَی الْبُکَاءِ
رَفِیْقِی لِتِذْرَافِ الدُّمُوْعِ السَّوَافِکِ
وَقَالَ اَتَبْکِی کُلَّ قَبْرٍ رَأَیْتَہُ
لِقَبْرٍ ثَوٰی بَیْنَ اللِّوٰی فَالدَّکَادِکِ
فَقُلْتُ اِنَّ الْاَسٰی یَبْعَثُ الْاَسٰی
فَدَعْنِی فَھٰذَا کُلُّہٗ قَبْرُ مَالِکٍ

''مجھے قبروں پر زار و قطار روتا دیکھ کر میرے ساتھی نے ملامت کرتے ہوئے کہا: کیا ''ثوی'' سے ''دکادک'' تک جو بھی قبر تمہیں نظر آئے گی تم اُس پر بین کرو گے۔ میں نے کہا: صدمہ صدمے کو بڑھا دیتا ہے، پس مجھے اسی حال میں رہنے دو، میرے لیے ہر قبر مالک کی قبر ہے۔''[1]

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر ایک ناروا الزام اور اس کا جواب:

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ مالک بن نُوَیرَہ کے قتل میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا ہرگز کوئی کردار نہیں تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایک رات شدید سردی کے پیشِ نظر قیدیوں کے بارے میں سپاہیوں کو ہدایت دیتے ہوئے کہا تھا: ''اَدْفِئُوْا اَسْرَاکُم'' ''اپنے قیدیوں کو حرارت پہنچاؤ یعنی ان کو گرم کپڑے، لحاف وغیرہ فراہم کرو۔'' اس علاقے کی زبان لغت بنی کنانہ میں یہ لفظ قتل کے لیے استعمال ہوتا تھا، اس لیے بعض سپاہیوں نے غلط فہمی میں قیدیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا، اس سے پہلے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ موقع پر پہنچ کر منع کرتے، مالک بن نُوَیرَہ بھی ان سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس واقعے پر رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''جب اللہ کسی سانحے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ ہو کر رہتا ہے۔'' حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے مالک بن نُوَیرَہ کی بیوہ اُمِ تمیم کی اشک شوئی اور کفالت کی خاطر اس کی عدت گزرنے کے بعد اس سے نکاح کر لیا۔[2]

غور فرمائیے! اگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ مالک بن نُوَیرَہ کے قتل کے قصداً مرتکب ہوتے تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ اُمِ تمیم اُن سے نکاح کرتی بلکہ وہ عربوں کی طبعی غیرت کے مطابق مقتول شوہر کا بدلہ لینے اٹھ کھڑی ہوتی۔ یہ بات بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی، یہاں تک کہ دیت کا بوجھ بھی ان پر نہیں ڈالا، اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ خالد رضی اللہ عنہ ان کے نزدیک بھی بے قصور تھے۔ اگر واقعہ ویسے ہوتا جیسے غیر محتاط مؤرخین بیان کرتے ہیں، یعنی حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے مالک بن نُوَیرَہ کو قتل کیا ہوتا اور پھر اس کی بیوی کو زبردستی اپنے نکاح میں داخل کیا ہوتا، تو ممکن نہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس ظلم کو برداشت کر جاتے۔

[1] البداية والنهاية: ٩/٦٢٣، دار هجر [2] الكامل في التاريخ: تحت ١١ هجرى

مُسَیلمہ کذاب کا فتنہ:

نبوت کے جھوٹے دعوے داروں میں مُسَیلمہ کذاب کی طاقت سب سے زیادہ تھی جو جزیرۃ العرب کے مشرقی علاقے نجد سے نمودار ہوا تھا۔ وہ نہایت مکار اور شاطر تھا۔ میٹھی میٹھی باتوں اور خوبصورت وعدوں سے لوگوں کا دل جیتنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ وہ اپنے ہاں مسلمانوں کی طرح اذان اور نماز کا اہتمام کراتا تھا۔ بنوحنیفہ کا سارا قبیلہ اس کے گرد جمع ہوگیا تھا۔ ''یمامہ'' کو اپنا مرکز بنا کر اس نے اسے مکہ مکرمہ کی طرح ''حرم'' قرار دے دیا تھا۔[1] قرآنِ مجید کے اسلوب سے ملتی جلتی آیات بنانے کی بھی ناکام کوشش کرتا رہتا تھا۔ اس کی جعلی ''وحی'' کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

❶ وَالشَّاءِ وَ اَلْوَا نِهَا، وَاَعْجَبُهَاالسُّوْدُ وَاَلْبَانُها، وَالشَّاۃُ السَّوْدَاءُ وَاللَّبَنُ الاَبْيَضُ، اِنَّ هٰذا لَعَجَبٌ مَحْض ، وَقَدْ حُرِّمَ الْمَذْقُ فَمَا لَكُمْ لَا تَمَجَّعُوْنَ

''قسم ہے بکریوں اور اُن کے رنگوں کی، ان میں سے کالی بکریاں اور اُن کا دودھ سب سے عجیب ترین چیز ہیں، بکریاں کالی اور دودھ سفید۔ یہ بڑی عجیب بات ہے۔ یقیناً لسی حرام کر دی گئی ہے۔ تو تمہیں کیا ہوا کہ تم دودھ کے ساتھ کھجوریں نہیں کھاتے۔''

❷ يَا ضِفْدَع ابْنَةِ ضِفْدَع، نُقِّيَ مَا تُنَقِّين، اَعلاكِ فِي الماءِ وَاَسْفَلُكِ فِي الطِّين، لَا الشَّارِبَ تَمْنَعِيْنَ وَلَا الْمَاءَ تُكَدِّرِيْن

''اے مینڈک کی بچی، جسے تو صاف رکھے وہ صاف ہوا، تیرا بالائی بدن پانی میں اور نچلا مٹی میں ہے۔ نہ تو پینے والے کو روکتی ہے، نہ پانی کو گدلا کرتی ہے۔''

❸ وَالْمُبَذِّرَاتِ زَرْعًا، وَالْحَاصِدَاتِ حَصْدًا، وَالذَّارِيَاتِ قَمْحًا، وَالطَّاحِنَاتِ طَحْنًا، وَالْخَابِزَاتِ خُبْزًا، وَالثَّارِدَاتِ ثَرْدًا، وَاللَّاقِمَاتِ لُقْمًا، اِهَالَةً وَسَمْنًا، لَقَدْ سُبِّقْتُم عَلٰى اَهْلِ الْوَبَر، وَمَا سَبَقَكُمْ اَهْلُ الْمَدَر، رِيفُكُمْ فَامْنَعُوْه، وَالْمُعْتَرُّ فَآوُوْه''

''قسم ہے ان عورتوں کی جو کھیت میں بیج بوتی ہیں، جو فصل کاٹتی ہیں، جو گندم کے دانے بکھیرتی ہیں، جو آٹا پیستی ہیں، جو روٹی پکاتی ہیں، جو ثرید تیار کرتی ہیں، جو لقمے بناتی ہیں سالن اور چربی کے ساتھ۔ بے شک تمہیں خانہ بدوشوں پر فضیلت دی گئی، دیہاتی تم سے آگے نہیں۔ اپنی زرخیز زمین کا دفاع کرو اور سوالی کو پناہ دو۔''[2]

مُسَیلمہ کے پیروکار اس قسم کی عجیب و غریب آیتوں کو بڑے شوق سے سنتے۔ ان میں سے زیادہ تر جانتے تھے کہ یہ جھوٹا نبی ہے مگر نسلی تعصب نے انہیں گمراہ کر دیا تھا۔ یہ لوگ عربوں کے مشہور قبیلے رَبیعہ کی شاخ تھے جو زمانہ دراز سے ''مُضَر'' کے مخالف تھے۔ جبکہ قریش جن سے حضور ﷺ کا نسبی تعلق تھا، مُضَر ہی کی شاخ تھے، رَبیعہ والوں کو حسد تھا کہ نبی مُضَر میں کیوں پیدا ہوا۔ اب جبکہ ان کے ایک فرد نے نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا انہیں بدلہ لینے کا گویا بہانہ ہاتھ آ گیا۔

---

[1] الكامل في التاريخ: تحت ١١ هجری [2] تاريخ الطبری: ٢٨٣/٣

ان کا نسلی تعصب اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ جب مُسَیلِمہ کے ایک پیروکار سے پوچھا گیا کہ کیا وہ واقعی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ مُسَیلِمہ نبی ہے؟ تو اس نے جواب دیا: ''میں جانتا ہوں کہ محمد ﷺ سچے نبی ہیں اور مُسَیلِمہ جھوٹا، مگر مجھے مدینہ کے سچے نبی سے یمامہ کا جھوٹا نبی زیادہ پسند ہے۔''[1]

اِس قبائلی عناد کے ساتھ علاقائی سیاسی مفادات کی اُمیدیں بھی تھیں جنھوں نے ہزاروں افراد کو مُسَیلِمہ کے گرد جمع کر دیا تھا۔ مُسَیلِمہ کی یہ طاقت اس وقت اور بڑھ گئی جب جھوٹی نبیہ سَجاح اپنے لاؤلشکر کے ساتھ یمامہ پہنچی اور مُسَیلِمہ سے دوبدو بات چیت کی۔ مُسَیلِمہ نے اسے سبز باغ دکھایا کہ وہ دونوں مل کر عرب کو فتح کریں گے۔ سَجاح نہ صرف آمادہ ہوگئی بلکہ اتحاد کو مضبوط کرنے کے لیے اس نے مُسَیلِمہ کی طرف سے رشتے کی پیش کش بھی منظور کر لی۔

شادی کے بعد جب سجاح واپس اپنے لشکر میں آئی تو اس کے عقیدت مندوں نے پوچھا: ''آپ کو مہر میں کیا دیا گیا؟'' بولی: ''کچھ بھی نہیں۔'' وہ بگڑ کر بولے: 'واپس جائیے اور کچھ مہر لے کر آئیے۔''

سَجاح یہ مطالبہ لے کر اپنے فریبی شوہر کے پاس گئی تو اس نے بڑی بے نیازی سے کہا: ''اپنی قوم میں اعلان کرا دو کہ مُسَیلِمہ نے ان کے ذمے سے دو نمازیں معاف کر دی ہیں: فجر اور عشاء۔''

سَجاح کے پیروکار اس انوکھے مہر سے بڑے خوش ہوئے کہ دو نمازوں سے جان چھوٹ گئی۔ وہ دل و جان سے سَجاح کے ساتھ ساتھ مُسَیلِمہ کے بھی گن گانے لگے۔[2]

مُسَیلِمہ پوری طرح مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کو مٹانے کے لیے آمادہ تھا، اس کی اس اسلام دشمنی کا یہ عالم تھا کہ آتے جاتے اور آس پاس سے گزرتے ہوئے ہر مسلمان کو پکڑ لیتا اور زبردستی اپنا کلمہ پڑھوانے کی کوشش کرتا۔ جو نہ مانتا اسے قتل کر دیتا۔ ایک صحابی عبداللہ بن وَہب رضی اللہ عنہ کا گزر اس طرف سے ہوا تو مُسَیلِمہ نے انہیں بھی گرفتار کر لیا اور اپنا کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے قرآنِ مجید کی دی گئی رخصت ﴿إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾[3] سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے زبانی اقرار کر لیا، چنانچہ مُسَیلِمہ نے انہیں قتل کرنے کی بجائے قید کر دیا۔[4]

مشہور دلیر صحابیہ حضرت اُمِّ عمارہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے حضرت حبیب بن زید رضی اللہ عنہ کو بھی مُسَیلِمہ نے گرفتار کر لیا تھا۔ ان کی مُسَیلِمہ سے تکرار ہوئی۔ مُسَیلِمہ انہیں کہتا: ''کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؟'' وہ کہتے: ''ہاں، بالکل'' مُسَیلِمہ پوچھتا: ''اور کیا تم یہ گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔'' وہ اَن جان بن کر کہتے: ''مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔''

مُسَیلِمہ ان کا ایک ایک عضو کٹواتا چلا گیا مگر وہ محمد ﷺ کی ختمِ نبوت کے برملا اظہار سے باز نہ آئے اور اس طرح شدید ترین اذیتیں سہتے ہوئے شہید ہو گئے۔[5]

---

① الكامل في التاريخ: تحت ١١ هجرى

② الكامل في التاريخ: تحت ١١ هجرى

③ ''سوائے ان لوگوں کے جن پر زبردستی کی جائے، جبکہ ان کا دل ایمان پر جما ہوا ہو۔'' (سورة النحل، آيت: ١٠٦)

④ طبقات ابن سعد: ٣١٦/٤، دار صادر ⑤ البداية والنهاية: ٣١٨/٤ دار هجر

مُسَیلمہ کے خلاف لشکر کشی:

ایسے ظالم و جابر اور شاطر دشمن کے فتنے کو مٹانے کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دو لشکر بھیجے تھے: پہلا لشکر حضرت عِکرِمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ کی قیادت میں گیا تھا اور دوسرا حضرت شُرَحبیل بن حَسنہ رضی اللہ عنہ کی کمان میں۔ حضرت عِکرِمہ رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ ہدایت کی تھی کہ جب تک شُرَحبیل بن حَسنہ کا لشکر نہ پہنچے تم مُسَیلمہ کے پیروکاروں سے جنگ شروع نہ کرنا۔ مگر حضرت عِکرِمہ رضی اللہ عنہ نے اس ہدایت پر زیادہ توجہ نہ دی اور نجد پہنچتے ہی دشمن پر حملہ کر دیا۔ مُسَیلمہ کے سپاہی بڑے جنگجو تھے، انہوں نے اسلامی لشکر کو شکست دے کر پسپا کر دیا۔ حضرت عِکرِمہ رضی اللہ عنہ نے شکست کی خبر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھیجی تو انہوں نے فی الفور حضرت شُرَحبیل رضی اللہ عنہ کے لشکر کو جو مُسَیلمہ ہی سے لڑائی کے لیے جا رہا تھا، راستے میں رکوا لیا اور حکم بھیجا کہ خالد بن ولید کی فوج کے آنے کا انتظار کرو۔ دراصل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسیلمہ کذاب کی طاقت سے اچھی طرح واقف تھے، اس لیے اس پر حملے کے لیے ایک بڑی فوج کا مرتب ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ آخر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ طلیحہ کی سرکوبی کر کے مدینہ آئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تازہ ہدایات کے ساتھ انہیں مُسَیلمہ کذاب سے مقابلے کی کمان سونپی اور ساتھ ہی ہدایت کر دی کہ راستے سے شُرَحبیل بن حَسنہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو ساتھ ملاتے جائیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس حکم کے مطابق حضرت شُرَحبیل رضی اللہ عنہ کے لشکر کو ساتھ لیتے ہوئے یمامہ کے نواح میں پہنچے۔[1]

فیصلہ کن معرکہ:

مُسَیلمہ کے ہاتھوں شہید کیے جانے والے حبیب بن زید رضی اللہ عنہ کی والدہ اُمّ عمارہ رضی اللہ عنہا بھی اپنے دوسرے بیٹے عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس لشکر کشی میں شریک تھیں۔[2] لشکر کی آمد کی خبر سن کر مسیلمہ کذاب بنی حنیفہ کے چالیس ہزار مسلح افراد کے ساتھ عقرباء کے میدان میں صف بندی کر چکا تھا۔ مسلمانوں کے پہنچتے ہی شدت کی جنگ چھڑ گئی۔ بنی حنیفہ اپنے جھوٹے نبی اور قومی حمیت کی خاطر غیر معمولی جوش و جذبے سے لڑے۔ مسلمانوں کو اتنی سخت مزاحمت کا پہلے کسی جنگ میں تجربہ نہیں ہوا تھا۔ کئی نامور صحابہ کرام یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے۔ مہاجرین کے علمبردار حضرت عبداللہ بن حفص رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو حضرت سالم مولی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جھنڈا سنبھال لیا، جن کی قراءت کی تعریف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔ لڑائی کی شدت دیکھ کر کسی نے اُن سے کہا: ''آپ کو اپنی جان کی پروا نہیں؟'' بولے: ''جان کی پروا کروں تو مجھ سے بُرا حافظِ قرآن کون ہو گا۔''

ان کے آقا ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ بھی ساتھ میں مصروفِ پیکار تھے اور پورے جوش سے کہہ رہے تھے:

''اے قرآن کے قاریو! قرآنِ مجید کو اپنی کارکردگی کی زینت بنائے رکھو۔''

---

[1] الکامل فی التاریخ: تحت ۱۱ هجری

[2] سیرۃ ابن هشام: ۱/ ۴۶۶

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کو حوصلہ دلاتے ہوئے کہا:

''لوگو! دشمن پر وار کرو اور آگے بڑھتے چلے جاؤ۔''

لڑائی کی یہ حالت تھی کہ کبھی مسلمان غالب آنے لگتے اور کبھی کفار۔ ایک بار مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے اور دشمن انہیں دھکیلتے ہوئے اُن کی خیمہ گاہ تک آن پہنچے۔

حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی یہ حالت دیکھی تو پکار کر کہا:

''اے اللہ! میں مسلمانوں کی طرف سے تجھ سے معذرت کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر حملہ کیا اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ حضرت سالم، حضرت ابوحذیفہ اور حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہم نے بھی اپنی جانیں قربان کر دیں۔

میدانِ جنگ میں دیر تک کشتوں کے پشتے لگتے رہے، آخر کار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو منظم کر کے ایک زوردار حملہ کیا اور دشمن کی صفیں اُلٹ دیں۔ منکرینِ ختم نبوت سر پر پاؤں رکھ کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔ میدانِ جنگ سے کچھ دور بلند و بالا دیواروں میں گھرا ہوا ایک باغ تھا جسے ''حدیقۃ الرحمٰن'' کہا جاتا تھا، منکرینِ ختم نبوت فرار ہو کر اس باغ میں مورچہ بند ہو گئے۔ مسلمان وہاں تک پہنچے تو وہ دروازہ بند کر چکے تھے۔ اندر داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔ حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ کے بھائی بَراء رضی اللہ عنہ نے یہ منظر دیکھ کر اصرار کیا کہ انہیں اُچھال کر باغ میں ڈال دیا جائے تا کہ وہ اندر سے دروازہ کھول دیں۔ پہلے پہل مسلمان نہ مانے مگر اُن کے اصرار پر انہیں اندر پھینک دیا گیا۔ وہ لڑتے بھڑتے دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گئے، تب تک انہیں اَسی (۸۰) سے زائد زخم لگ چکے تھے۔ اب مسلمان ایک ریلے کی طرح اندر گھسنے لگے۔ ①

دشمنوں نے انہیں روکنے کی جان توڑ کوشش کی، اسی کش مکش میں ابودجانہ رضی اللہ عنہ باغ کے دروازے پر شہید ہو گئے۔ اُمِ عمارہ اور ان کے صاحبزادے عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ مسیلمہ کذاب کی تلاش میں دشمنوں کو چیرتے ہوئے باغ میں داخل ہونے لگے۔ اس دوران ایک شخص نے اُمِ عمارہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ کاٹ ڈالا جو پہلے ہی تلوار اور نیزوں کے ۹ زخم کھا چکی تھیں، مگر اس کے باوجود یہ بلند ہمت خاتون آگے بڑھتی چلی گئیں۔ ②

بنوحنیفہ کا سالار محکم مرتدین کو حوصلہ دلا رہا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے تاک کر ایسا تیر مارا کہ حلق سے پار ہو گیا۔ آخر دشمنوں کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ مسلمانوں نے انہیں تلواروں کی باڑھ پر رکھ لیا۔ دشمن مایوس ہو کر باغ سے فرار ہونے لگے تو مسلمانوں نے تعاقب کیا۔ مسیلمہ کذاب بھی مفرورین کے ساتھ بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ گھات میں تھے جو غزوۂ اُحد میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جیسے عظیم شخص کے قتل کے بدلے بڑی نیکی کے طور پر اس بدترین انسان کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے روایتی انداز میں ایسا برچھا مارا کہ ملعون گھائل ہو کر وہیں گر پڑا۔ ③

① الکامل فی التاریخ: تحت ۱۱ ھجری

② مغازی للواقدی: ۱/ ۲۶۹، حلیۃ الاولیاء: ۶۵/۲ ③ الکامل فی التاریخ: تحت ۱۱ ھجری

اسی لمحے اُمّ عمارہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے تلوار کا وار کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ اِدھر اُمّ عمارہ رضی اللہ عنہا بھی وہاں پہنچ گئیں۔ اپنے بیٹے کو ملعون کے خون میں تر بتر تلوار پونچھتے دیکھا تو خوشی سے سجدے میں گر گئیں۔ ①

اس ہولناک جنگ میں مدینہ کے مہاجرین و انصار میں سے تین سو ساٹھ (360) حضرات صحابہ کرام نے جام شہادت نوش کیا، جن میں سے پینتیس (35) بڑے نامور قاری اور حافظ قرآن تھے۔

دشمن کے سات (7) ہزار افراد میدانِ جنگ میں، سات (7) ہزار باغ میں اور تقریباً اتنے ہی فرار ہوتے ہوتے مارے گئے۔ ②

جنگ یمامہ سن ۱۱ ہجری کے اواخر میں پیش آئی تھی۔ یہ جزیرۃ العرب میں برپا ہونے والی شورشوں کے خلاف آخری بڑی کارروائی تھی۔ اس کے بعد فتنوں کا زور بالکل ٹوٹ گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جرنیلوں نے عرب کے ہر شورش زدہ گوشے میں پہنچ کر وہاں بغاوت کے شعلوں کو ٹھنڈا کیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تدبر، استقامت اور منصوبہ بندی کی بدولت ایک سال کے اندر اندر پورے ملک میں مکمل امن وامان قائم ہوگیا۔ ③

قرآنِ مجید کی حفاظت:

جنگ یمامہ میں حفاظ وقراء کی اتنی بڑی تعداد کے شہید ہو جانے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو شدید تشویش لاحق ہوئی، اس وقت تک قرآنِ مجید لکھ کر محفوظ کرنے کا طرز عام نہیں تھا۔ زیادہ تر زبانی یاد کرنے کا رواج تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں حفاظ کے ختم ہو جانے سے قرآن ضائع نہ ہو جائے، چنانچہ انہوں نے قرآنِ کریم کو کتابی شکل میں جمع کرنے کا ارادہ کیا، پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنی رائے پیش کی، دونوں حضرات نے اس موضوع پر کھل کر بحث کی اور آخر طے ہوگیا کہ یہ کام ناگزیر ہے۔ انصار میں سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ذمے یہ کام لگایا گیا جو کہ کاتبِ وحی رہے تھے اور نوجوان صحابہ کرام میں علم وفضل کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ انہوں نے دن رات ایک کر کے یہ عظیم مہم انجام دی۔ حضور ﷺ کی رحلت تک چونکہ وحی نازل ہو رہی تھی لہٰذا ایک مکمل مصحف ترتیب دینا ممکن نہ تھا کیوں کہ شرعاً مصحف کو ترتیبِ نزولی کی بجائے جبرئیل علیہ السلام کی بتائی ہوئی ترتیب پر مرتب کرنا تھا اور یہ ترتیب آخری سورت اور آخری آیت کے نزول کے بعد ہی مکمل علم میں آسکتی تھی۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں قرآنِ مجید کی مختلف آیات اور سورتیں چمڑے کے پارچوں، کھجور کی چھالوں اور شانے کی چوڑی ہڈیوں پر مختلف صحابہ کے پاس لکھی ہوئی تھیں۔ زبانی حفظ کا رواج بہت عام تھا اور حافظ حضرات ترتیبِ نزولی کی بجائے ترتیب لوحِ محفوظ کے مطابق قرآن سناتے تھے۔ انہیں علم ہوتا تھا کہ کونسی آیت یا سورت پہلے ہے اور کونسی بعد میں۔

---

① مغازی للواقدی: ۱/ ۲۶۹ ؛ حلیۃ الاولیاء: ۲/ ۶۵ ط السعادۃ

② الکامل فی التاریخ: تحت ۱۱ ھجری

③ العبر للذھبی: ۱۲ ھجری

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ان تمام تحریری وسائل اور حافظوں کی یادداشت کو بروئے کار لا کر ایک مکمل محفوظ نسخہ تیار کیا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس رکھ دیا گیا۔[1] یہی نسخہ بعد میں خلیفہ دوئم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور پھر اُن کی شہادت کے بعد اُن کی صاحبزادی اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جب یہ شکایت ملی کہ دور دراز کے علاقوں میں لوگ قرآنِ مجید کی قرأت میں اختلافات کا شکار ہو رہے ہیں تو اسی نسخے کو دوبارہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا گیا اور انہوں نے قرآنِ مجید کے ماہر صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر اس اصل نسخے سے متعدد نسخے تیار کر کے پورے عالمِ اسلام میں ان کی اشاعت کرائی۔

دورِ نبوی، دورِ صدیقی اور دورِ عثمانی کے جمع قرآن میں فرق یہ تھا کہ:

1. حضور ﷺ کے دور میں تحریر کردہ نوشتوں میں آیات بھی الگ الگ لکھی ہوئی تھیں۔
2. حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں ہر ہر سورت کا مکمل الگ صحیفہ تیار کیا گیا اور ان سب صحیفوں کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا۔ اسے اصل نسخے (ماسٹر کاپی) کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اسے ''اَلْاُم'' کہا جاتا تھا۔
3. حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ''اَلْاُم'' کو سامنے رکھ کر سورتوں کے الگ الگ صحیفوں کو ایک ہی بڑے صحیفے پر نقل کر لیا گیا۔ اور پھر اس صحیفے کی نقول تیار کی گئیں۔[2]

علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ، بحرین کے محاذ پر:

مرتدین کے خلاف کارروائیوں کے دوران حضرت علاء بن الحَضْرَمی رضی اللہ عنہ بحرین کے علاقے میں مصروفِ پیکار رہے جہاں حضور ﷺ کے عامل مُنذِر بن ساوی رضی اللہ عنہ کی وفات کے ساتھ ہی لوگ مرتد ہو گئے تھے۔ حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں حضرت ابوہریرہ اور بنوحنیفہ کے ثُمامہ بن اُثال رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ راستے میں ایک بہت بڑے صحرا میں شب بسری کے دوران یہ عجیب حادثہ پیش آیا کہ تمام اونٹ جن پر پانی اور غذا کا ذخیرہ لدا ہوا تھا، بھاگ گئے۔ مسلمانوں نے بیدار ہو کر یہ منظر دیکھا تو بہت پریشان ہوئے کیوں کہ شدید گرمی کے دن تھے، صحرا میں پانی کے بغیر آگے سفر کرنا تو کجا زندہ رہنا بھی مشکل تھا۔ لوگوں نے ایک دوسرے کو آخری وصیتیں کرنا شروع کر دیں۔

اس کے باوجود حضرت علاء بن حَضْرَمی رضی اللہ عنہ ذرا بھی نہ گھبرائے اور فرمایا:

---

[1] صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، ح: ۴۹۸۶، ۴۹۸۷

[2] فتح الباری: ۹/۱۱ تا ۲۱، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن

''جمع القرآن'' ایک بہت اہم موضوع ہے۔ آج کل کثرتِ مطالعہ کے عادی مگر فہم کی کمی کے شکار بعض حضرات نے خلفائے ثلاثہ کے دور میں جمع القرآن کی مہم پر روافض اور مستشرقین کے اعتراضات کا یہ جواب نکالا ہے کہ صحیح البخاری میں ابن شہاب زہری سے منقول جمع القرآن کی روایات جعلی ہیں اور ابنِ شہاب زہری تقیہ باز دشمنِ اسلام تھا، دورِ صدیقی اور دورِ عثمانی میں جمع القرآن کی کوئی مہم نہیں چلی تھی، پورا قرآنِ مجید موجودہ شکل میں حضور ﷺ کی زندگی میں ہی تیار ہو گیا تھا۔ اس جواب سے ایک اعتراض تو دور ہو گیا مگر دوسری طرف انکارِ حدیث اور پھر اس کے ضمن میں ابھرنے والی گمراہیوں کے کئی دروازے چوپٹ کھل گئے۔ قارئین کو چاہیے کہ اس موضوع پر دکتور علی بن سلیمان العبید کی ''جمع القرآن حفظاً وکتابۃً'' اور حضرت مفتی محمد تقی عثمانی کی ''علوم القرآن'' (اردو) کا مطالعہ فرمائیں جن میں اس مسئلے پر ایسی سیر حاصل بحث ہے جس سے انکارِ حدیث کا فتنہ بھی نہیں جاگتا اور مستشرقین و روافض کے اعتراضات بھی دم توڑ جاتے ہیں۔

"پریشان نہ ہوں، آپ اللہ کے راستے میں اور اللہ کے دین کے مددگار ہیں۔ اللہ آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔"

نمازِ فجر کے بعد آپ نے گڑگڑا کر دعا کی۔ سب مسلمان دعا میں شریک رہے۔ فارغ ہوئے تو دور پانی کی چمک دکھائی دی۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو ایک بہت بڑا چشمہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ پورے لشکر نے وہاں سے پانی پیا اور نہائے دھوئے۔ ابھی سورج بلند نہیں ہوا تھا کہ تمام اونٹ بھی ساز و سامان سمیت واپس آ گئے۔

آگے کا سفر شروع ہوا تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جنہوں نے اپنا پانی سے بھرا مشکیزہ چشمے کے کنارے چھوڑ دیا یکدم واپس مڑے۔ دیکھا تو اس جگہ سوائے ایک چھوٹے سے تالاب کے کچھ نہ تھا۔ مشکیزہ اسی طرح بھرا ہوا کنارے پر رکھا تھا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "میں سمجھ گیا کہ یہ اللہ کا خاص احسان تھا۔"

علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ نے ہجر کے مقام پر مرتدین کی جمعیت کو شکستِ فاش دی۔ باقی ماندہ دشمن فرار ہو کر دارین کی طرف بھاگے جو خلیج فارس کی ایک پٹی کے پار فصیل بند شہر تھا۔ مفرورین کشتیوں میں بیٹھ کر وہاں چھپ گئے۔ علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ نے ساتھیوں سے فرمایا: "اللہ نے خشکی میں اپنی نصرت کے مناظر دکھائے ہیں تاکہ تم سمندر میں بھی اس کی مدد کو آزماؤ۔ اب دشمن کی طرف یلغار کرو اور سمندر عبور کر جاؤ۔"

سب تیزی سے پیش قدمی کرتے ہوئے ساحل پر پہنچے، یہاں سے دوسرے کنارے تک کشتی کا سفر پورے چوبیس گھنٹے کا تھا مگر مرتدین نے مسلمانوں کے لیے کوئی کشتی نہیں چھوڑی تھی۔ علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ نے دعا فرمائی:

" یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ! یَا کَرِیْمُ یَا حَلِیْمُ یَا اَحَدُ یَا صَمَدُ یَا حَیُّ یَا مُحْیِ الْمَوْتٰی، یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ یَا رَبَّنَا"

(اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے! اے کرم فرمانے والے! اے بردباری والے! اے واحد ذات! اے بے نیاز ذات! اے مردوں کو زندہ کرنے والے! اے ہمیشہ زندہ اور ہمیشہ قائم رہنے والے۔ تیرے سوا ہمارا کوئی معبود نہیں، اے ہمارے رب!)

یہ دعا کر کے گھوڑا سمندر میں ڈال دیا۔ تمام مجاہدین جو گھوڑوں، اونٹوں اور گدھوں پر سوار تھے، یہ دعا دہراتے ہوئے بلاتامل اپنے امیر کے پیچھے پانی میں داخل ہو گئے اور اس بحرِ ذخار کو بڑے اطمینان سے عبور کر لیا، کوئی ایک فرد بھی ڈوبنے نہ پایا۔ دارین میں چھپنے والے مرتدین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ علاء نے انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر جا گھیرا اور ان کی قوت ختم کر دی۔ سمندر کو گھوڑوں پر عبور کر لینا صحابہ کرام کی وہ کرامت تھی جس نے دنیا کو ششدر کر دیا۔ اسے دیکھ اسلام قبول کرنے والے ایک عیسائی راہب کا کہنا تھا:

"اگر میں یہ کرامتیں دیکھ کر بھی اسلام نہ لاتا تو ڈرتا کہ اللہ میری شکل نہ مسخ کر دے۔"[1]

☆☆☆

[1] الكامل في التاريخ: تحت سن ١١ هجرى، ذكر ردة اهل البحرين.

بیرونی جنگیں......ایران وروم

اندرونی مہمات سے فارغ ہو کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیرونی خطرات کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس وقت جزیرۃ العرب دنیا کی دو عظیم ترین طاقتوں کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ مشرق میں ساسانی ایرانی سلطنت تھی اور مغرب میں بازنطینی روم۔ ان دونوں سلطنتوں کو عربوں سے دیرینہ دشمنی تھی۔ کئی بار انہوں نے جزیرۃ العرب میں فوج کشی کی تھی اور بارہا سرحدوں پر جھڑپیں ہوئی تھیں۔ ایرانی، عربوں سے خاص طور پر عداوت رکھتے تھے، انہیں نہ صرف اپنے تمدن اور عسکری وسیاسی برتری پر بڑا غرور تھا بلکہ اپنی نسل کو بھی دنیا کی تمام قوموں سے برتر سمجھتے تھے، اسی لیے وہ عربوں کو بڑی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انہیں جاہل، مفلس اور جنگلی تصور کرتے تھے۔ اُن کے رہن سہن، وضع قطع اور بودوباش کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

اسلام سے پہلے چونکہ عربوں کی کوئی مضبوط حکومت نہیں تھی بلکہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے سرداروں کی اجارہ داری تھی، اس لیے ان کے انتشار سے فائدہ اُٹھا کر ایرانی حکام سرزمین عرب میں مداخلت کرتے رہتے تھے اور بعض اوقات ان کے سرداروں کو اپنا ماتحت بنا کر ان سے لگان بھی وصول کیا کرتے لیکن عربوں کی حریت پسندی انہیں زیادہ دن کسی کی غلامی میں رہنے نہیں دیتی تھی، چنانچہ وہ بار بار بغاوت کر کے ایرانیوں کی بالادستی سے آزاد ہوتے رہتے تھے۔ اسلام کے بعد عرب قبائل ایک پرچم تلے جمع ہو کر ایک مستحکم طاقت بن گئے تھے، اسی لیے ایرانی سلطنت کو جزیرۃ العرب سے مزید تشویش لاحق ہوگئی۔ عربوں کے وہ عیسائی قبائل بھی جو عراق کی سرحدوں پر آباد تھے، ایرانی دربار میں مسلمانوں کو ایک سنگین خطرہ بنا کر پیش کر رہے تھے۔ اس لیے ایرانی زعماء چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی طاقت کو پارہ پارہ کر دیا جائے، مگر ان دنوں ایران خود شدید ترین سیاسی بحران کا سامنا کر رہا تھا، اس لیے دربارِ ایران کو کسی بیرونی محاذ پر توجہ دینے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔

اس سیاسی بحران کا آغاز کسریٰ پرویز کی موت سے ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوتی مکتوب چاک کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنے بیٹے شیرَوَیہ کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ پھر جب شیرَوَیہ نے بغاوتوں کے امکانات سے نجات پانے کے لیے اپنے تمام بھائیوں کو قتل کر ڈالا تو ساسانی سلطنت یک لخت جانشینوں کی کھیپ سے تہی دامن ہوگئی۔ اپنی حکومت کے استحکام کے ان مبالغہ آمیز انتظامات کے باوجود بدقسمت شیرَوَیہ صرف آٹھ ماہ حکومت کر کے اس حالت میں مر گیا کہ پیچھے اس کے سات سالہ لڑکے اَرْدشیر کے سوا کوئی جانشین نہ تھا۔ اسے تخت پر بٹھا دیا گیا مگر کم سنی کی وجہ سے وہ اس قابل نہ تھا کہ حکومتی ذمہ داریاں انجام دے سکتا، نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ بعض اوقات حکومتی معاملات

عورتوں کو سنبھالنے پڑے۔ حضور ﷺ کی حیات بابرکات کے آخری برسوں سے لے کر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور تک ایران کی سیاسی صورت حال جوں کی توں تھی۔ ''بُوران دُخت'' اور ''آرزمی دُخت'' نامی دو شہزادیاں سلطنت کے معاملات پر حاوی تھیں اور ایرانی سیاست اپنی بحرانی کیفیت سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔ [1]

غرض ان وجوہ سے ایرانیوں کو اب تک جزیرۃ العرب کے خلاف کسی کارروائی کا موقع نہیں مل سکا تھا، تاہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ ایرانیوں کی حالت جوں ہی سنبھلے گی وہ سرزمین عرب پر یلغار کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے، اس لیے آپ مشرقی سرحدوں کی طرف سے پوری طرح چوکنا تھے۔

ایران پر فوج کشی کا موقع:

اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ انہی دنوں میں از خود ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ایرانی سرحدوں پر پہلی بار لشکر کشی کا انقلابی فیصلہ کرنے میں کوئی تردد باقی نہ رہا۔ ہوا یہ کہ عراق کی سرحدوں پر آباد بعض عرب قبائل جو صدیوں سے ایرانیوں کے مظالم برداشت کر رہے تھے، ان کے سیاسی بحران سے فائدہ اٹھا کر اُن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ عرب قبائل عیسائی تھے مگر انہوں نے وطنی غیرت کے سبب ایرانیوں کی غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالی تھیں اور اب عرب سے ملے ہوئے ایرانی صوبے ''سواد'' (عراق) میں گھس کر کارروائیاں کر رہے تھے۔ ان قبائلیوں میں مزاحمت کا جذبہ پیدا کرنے میں قبیلہ وائل کے ایک رئیس مُثنّی بن حارثہ الشیبانی رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے جنہوں نے ۹ھ میں مدینہ آ کر اسلام قبول کیا تھا۔ وہ اپنی قوم کو لے کر ایرانیوں کی چوکیوں پر چھاپہ مار حملے کرتے رہتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کی کارروائیوں کی اطلاعات ملیں تو ان کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ لوگوں نے بتایا:

''یہ مُثنّی بن حارثہ ہیں جو کوئی گمنام شخص نہیں، مشہور و معروف اور بلند مرتبہ آدمی ہیں۔'' [2]

مُثنّی بن حارثہ کو خوب اندازہ ہو گیا تھا کہ کسریٰ کی افواج میں اَب پہلے جیسا دم خم نہیں ہے۔ انہوں نے سوچا اگر مدینہ منورہ سے افواج فراہم ہو جائیں تو ایران کو فتح کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ چنانچہ وہ خود مدینہ منورہ آئے اور دربارِ خلافت سے عراق پر حملے کی اجازت لی اور امدادی افواج کا مطالبہ بھی کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آٹھ ہزار سپاہیوں کی کمک کے ساتھ اس فوج کشی کی منظوری دے دی۔ تاہم آپ محسوس کر رہے تھے کہ ایران جیسی عظیم الشان سلطنت کے ساتھ ٹکر لینے کے لیے کسی غیر معمولی قائد کی ضرورت ہے۔ آپ کی نگاہِ انتخاب ایک بار پھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر پڑی، جنہوں نے مرتدین اور منکرین ختم نبوت کے خلاف جہاد میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر کے اپنی عسکری صلاحیتوں کا لوہا منوالیا تھا۔

---

① الاخبار الطوال لابی حنیفة الدِینَوَرِی، ص ۱۱۱، ط دار احیاء الکتب العربی

② فتوح البلدان لاحمد بن یحییٰ البلاذُرِ، ص ۲۳۸، ط مکتبة الھلال ؛ الاستیعاب: ۱۴۵۶/۴، ۱۴۵۷

نوٹ: مُثنّی بن حارثہ صحابی ہیں جو ۹ ہجری میں مدینہ آ کر زیارت و صحبت سے مشرف ہوئے تھے۔ (الاستیعاب: ۱۴۵۶/۴) اگرچہ بعض نے انہیں تابعی کہا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں عراق کی طرف کوچ کرنے اور مُثنّٰی بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی مہم کو کامیاب بنانے کا حکم دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ انہیں کمک فراہم کی جائے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت قَعقاع بن عَمرو رضی اللہ عنہ کو روانہ کر دیا جو جنگی اور سفارتی معاملات میں اپنی مثال آپ تھے۔ لوگوں نے اعتراض کیا کہ صرف ایک آدمی بھیجنے سے کیا فائدہ۔ مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

''ان جیسا ایک آدمی جس فوج میں شامل ہوا سے شکست نہیں دی جا سکتی۔''[1]

عراق پر اس پہلی یلغار کی کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ حریف پر بھرپور حملے کیے جائیں تاکہ مسلمانوں کی قوت کی دھاک بیٹھ جائے، اس مقصد کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے مشیروں کے ساتھ مل کر بہت سوچ سمجھ کر جنگی نقشہ مرتب کیا، ساتھ ہی حضرت عِیاض بن غَنم رضی اللہ عنہ کو بھی تاکید کی کہ وہ اپنی فوج لے کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ جا ملیں۔[2]

ایرانیوں کو پیغام:

حکمت عملی کے مطابق یہ تمام فوجیں خلیج فارس کے قریب ساحلی مقام ''اُبُلّہ'' کے قریب جمع ہو گئیں۔ ان کی ایک سمت ایران تھا اور دوسری سمت جزیرۃ العرب، جبکہ تیسری طرف خلیج فارس کا گہرا پانی تھا۔ یہاں پر قابض فوج نہ صرف بیک وقت عراق اور عرب کی سرحدوں پر تسلط حاصل کر سکتی تھی بلکہ سمندر کے راستے بلا روک ٹوک ہندوستان تک جا سکتی تھی۔ عراق کے اس خطے میں ایرانیوں کے گورنر ''ہُرمُز'' کی حکومت تھی، جس کے ظلم وستم سے رعایا اتنی پریشان تھی کہ اسے برملا بددعائیں دیتی۔ لوگوں میں ہُرمُز کا نام ایک گالی بن گیا تھا۔ کسی کو کوسنے کے لیے ''ہُرمُز سے بڑا کافر'' عام محاورہ بن گیا تھا۔[3] حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے آتے ہی ہُرمُز کو مراسلہ بھیج دیا کہ یا تو اسلام قبول کر لو یا جزیہ دے کر ہماری حفاظت میں آ جاؤ۔ ورنہ تمہارے مقابلے میں ایسی قوم آ رہی ہے جسے اللہ کے راستے میں قتل ہونا اتنا ہی پسند ہے جتنی تمہیں شراب مرغوب ہے۔''[4]

مجوسیوں سے پہلی جنگ...... ذات السلاسل:

ہُرمُز نے یہ خط ایران کے پایۂ تخت مدائن میں کسریٰ اَرْدَشیر کو روانہ کر دیا اور خود اپنی تمام فوج کو رکاب میں لے کر مسلمانوں سے ٹکر لینے نکل کھڑا ہوا، اس کے ساتھ نامی گرامی شہزادے اور پہلوان بھی تھے۔ ایرانی سورماؤں نے اپنی صفوں کو زنجیروں سے باندھ رکھا تھا تاکہ شکست کھا کر بھاگنے کا خیال بھی نہ آئے اس لیے اس جنگ کو 'ذات السلاسل' یعنی زنجیروں والی جنگ کہا جاتا ہے۔

---

① الکامل فی التاریخ: تحت ۱۲ ھجری

② بحوالہ بالا ③ بحوالہ بالا

④ لقد جئتکم بقوم یحبون الموت کما تحبون شرب الخمر. (تاریخ الطبری: ۳/۳۷۰)

مزید دیکھیے: ''ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وبنوہ'' ص ۱۰۸؛ عبدالفتاح محمود، بحوالہ ابن رحلان، الفتوحات، ص ۹۸

چونکہ یہ اسلامیانِ عرب اور مجوسِ عجم کی پہلی باقاعدہ جنگ تھی اس لیے طبلِ جنگ پر چوٹ پڑی تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ دشمن پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے تلوار سونت کر دونوں فوجوں کے درمیان آ کھڑے ہوئے اور ایکا ایکی مقابلے کے لیے للکارا۔ مسلمانوں کے سپہ سالارِ اعلیٰ کو شمشیر بکف دیکھ کر ہُرمُز کو بھی اپنی قوم کا حوصلہ بحال رکھنے کے لیے میدان میں آنا پڑا مگر ساتھ ہی اس نے اپنے کچھ سپاہیوں کو سمجھا دیا کہ وہ موقع پاتے ہی صفوں سے نکل کر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر ٹوٹ پڑیں۔

مقابلہ شروع ہوا، حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور ہُرمُز دونوں اپنے اپنے گھوڑوں سے کود کر آمنے سامنے آ گئے، دونوں طرف سے تلواروں کے چند بھرپور وار ہوئے اور آخر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ہُرمُز کو اپنے آہنی بازوؤں میں جکڑ لیا۔ یہ دیکھ کر ہُرمُز کے ساتھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی طرف لپکے، تاہم اِدھر سے حضرت قعقاع بن عَمرو رضی اللہ عنہ نے بروقت حملہ کر کے انہیں مار بھگایا، اتنی دیر میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ہُرمُز کا کام تمام کر دیا جس سے ایرانیوں میں بھگدڑ مچ گئی، ان کے پہلوان اپنی زنجیریں توڑ توڑ کر بھاگے، مسلمانوں نے تعاقب کرتے ہوئے ان کے بے شمار سپاہی کاٹ ڈالے۔

یہ سن ۱۲ ہجری کے آغاز کا واقعہ ہے، سرحداتِ عجم کی اس پہلی فتح کی خوشخبری مالِ غنیمت کے پانچویں حصے کے ساتھ دربارِ خلافت بھیج دی گئی۔

ثَنِیّ کا معرکہ:

اس دوران دربارِ ایران سے ایک نامور جرنیل قارن کی کمان میں ہُرمُز کی مدد کے لیے کمک بھیج دی گئی تھی۔ یہ فوج راستے میں تھی کہ ہُرمُز کی شکست خوردہ فوج آتے ہوئے ملی جس نے اپنے اوپر پڑنے والی آفت کی خبر دی، قارن یہ سن کر خوفزدہ ہو گیا اور وہیں ثَـنِـیّ کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔ اِدھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کو آگے بڑھایا اور ایرانیوں پر ہلا بول دیا۔ حریف فوج یہاں بھی جم کر نہ لڑ سکی، قارن مارا گیا اور اس کے تیس (۳۰) ہزار سپاہی بھی موت کے گھاٹ اتر گئے۔[1]

وَلَجہ کی جنگ:

ایرانی دربار میں اس رسوا کن شکست کی خبر پہنچی تو دو سپہ سالار اَنْدَرْزَگر اور بَہمن جادَوَیہ ایک لشکرِ جرار لے کر مسلمانوں سے انتقام لینے روانہ ہوئے۔

صفر سن ۱۲ ہجری میں ''وَلَجہ'' کے مقام پر مسلمانوں اور مجوسیوں میں بڑی خون ریز جنگ ہوئی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کا کچھ حصہ گردونواح کی نشیبی زمین میں چھپا دیا تھا۔ جب دونوں فریق لڑتے لڑتے تھک گئے تو مسلمانوں کی اس تازہ دم فوج نے یکا یک دھاوا بول دیا، ایرانی اس غیر متوقع حملے سے بدحواس ہو کر بھاگ نکلے۔ ان کا سردار اَنْدَرْزَگر فرار ہوتے ہوئے پیاس کی شدت سے مر گیا۔[2]

---

① الکامل فی التاریخ: تحت ۱۲ ھجری ② الکامل فی التاریخ: تحت ۱۲ ھجری

اَمْغِیْشِیَا کا مالِ غنیمت:

سرحداتِ عراق پر آباد قبیلہ بکر بن وائل کے عیسائی عرب، ایرانی سلطنت کے حامی تھے اور ولجہ کی جنگ میں انہوں نے ایرانیوں کی مدد کی تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے انہیں سبق سکھانا ضروری سمجھا اور دریائے فُرات کی طرف پیش قدمی کی۔ عرب عیسائی، ایرانی سپہ سالار جابان کے لشکر میں شامل ہو کر مقابلے پر نکل آئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے یہاں بھی دشمنوں کو مبارزت کی دعوت دی۔ نامور عیسائی جنگجو مالک بن قیس مقابلے میں آیا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد عام معرکہ ہوا جس میں ستر ہزار ایرانی اور عیسائی عرب قتل ہوئے۔ ان کی خیمہ گاہ، ''اَمْغِیْشِیَا'' میں تھی جہاں ساز وسامان، اسلحے اور جانوروں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع تھا، دشمن خوف کی وجہ سے یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ نکلا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جب اس مالِ غنیمت پر قبضہ کر کے پانچواں حصہ مدینہ منورہ بھیجا تو مال ودولت کے یہ انبار دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بے ساختہ کہہ اُٹھے:

''کوئی ماں خالد جیسا بیٹا نہیں جن سکتی۔''[1]

فتح حِیرہ:

دریائے فُرات کے قریب ''حِیرہ'' عیسائی عربوں کا قدیم مرکز تھا۔ لشکرِ اسلام نے آگے بڑھ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ شہر کے لوگ مقابلے سے عاجز آ گئے تو اپنے ایک رئیس عَمرو بن عبدالمسیح کو صلح کی بات چیت کے لیے بھیج دیا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: ''جنگ چاہتے ہو یا امن؟'' وہ بولا: ''امن۔''

عَمرو بن عبدالمسیح کا خادم اپنے ساتھ زہر کی تھیلی لیے ہوئے تھا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پوچھا ''یہ ساتھ کیوں لائے ہو؟'' بولا: ''ڈرتا ہوں کہ اگر صلح کے مذاکرات میں ناکام ہو گیا تو اپنی قوم کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اس سے بہتر ہوگا کہ زہر کھا کے مر جاؤں۔'' حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے تھیلی لے کر زہر اپنی ہتھیلی پر اُلٹ دیا اور بولے: ''جب تک وقت پورا نہ ہو جائے، موت نہیں آ سکتی۔'' آپ نے ''بِسْمِ اللّٰهِ خَيْرِ الْاَسْمَآءِ، رَبِّ الْاَرْضِ وَالسَّمَاءِ، الَّذِیْ لَيْسَ يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ دَاءٌ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ''[2] پڑھتے ہوئے زہر پھانک لیا اور آپ کو کوئی گزند نہ پہنچی۔

عَمرو بن عبدالمسیح یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا اور کہہ اُٹھا ''جب تک مسلمانوں میں تم جیسے موجود ہیں، وہ جس چیز کا بھی ارادہ کریں گے اسے حاصل کر کے رہیں گے۔'' غرض اہل حِیرہ نے ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ پر صلح کر لی۔

یہ ربیع الاوّل سن ۱۲ ہجری کا واقعہ ہے۔ مسلمانوں نے مقامی باشندوں کے ساتھ بڑی کشادہ دلی کا معاملہ کیا، یہ سلوک دیکھ کر گرد ونواح کے زمینداروں اور رئیسوں نے بھی جزیہ دینا قبول کر کے مسلمانوں کی ماتحتی اختیار کر لی۔[3]

---

① الکامل فی التاریخ: تحت ۱۲ ھجری ؛ تاریخ ابن خلدون: ۲/ ۵۱۰، ط دار الفکر ؛ البدایة والنهایة: ۹/ ۵۲۲

② تمام ناموں سے بہتر اللہ کے نام سے جو زمین وآسمان کا مالک ہے۔ جس کے نام کے ساتھ کوئی بیماری نقصان نہیں دے سکتی جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

③ البدایة والنهایة: ۹/ ۵۲۲، ۵۲۳

معرکہ عین التمر:

محلاتی سازشوں میں مصروف ایرانی سیاست دانوں کے باہمی اختلافات اپنی جگہ تھے مگر مسلمانوں کے مقابلے میں وہ سب ایک تھے اور اپنے ملک کی حفاظت کے لیے نہایت پرجوش تھے۔ انہوں نے اپنے سپہ سالار بَہمَن جادوَیہ کو مسلمانوں سے مقابلے کے لیے نااہل سمجھ کر ہٹا دیا تھا اور اس کی جگہ ''بہرام چوبین'' کو مقرر کر دیا تھا۔

بہرام نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لیے اپنے بیٹے مہران کو لشکر دے کر بھیجا جس نے شمالی عراق کے علاقے عین التمر میں پڑاؤ ڈال دیا، اس کی مدد کے لیے ایک عیسائی عرب سردار عُقبہ بن ابی عُقبہ بھی قبائلیوں کی فوج لے کر پہنچ گیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بھی شمال کی طرف پیش قدمی کی اور انبار سمیت راستے کی بستیوں کو زیرنگین کرتے ہوئے دشمن کے مقابلے میں ''عین التمر'' پہنچ گئے۔

جنگ شروع ہوئی تو حضرت خالد نے بذاتِ خود عیسائی سردار عُقبہ پر حملہ کیا اور اسے جکڑ لیا، یہ دیکھ کر دشمنوں کے قدم اکھڑ گئے اور ان کی بڑی تعداد نے فرار ہو کر ایک قلعے میں پناہ لی، جبکہ مہران خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے قلعے کا محاصرہ کر کے اسے بزورِ قوت فتح کیا اور دشمنوں کا کام تمام کر کے چھوڑا۔ [1]

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ دَوْمۃ الجندل میں:

اس دوران جزیرۃ العرب کے شمال میں دَوْمَۃ الجَندل کے علاقے میں بھی عرب عیسائی قبائل بنوغسان، بنوتنوخ اور بنوکلب مسلمانوں کے خلاف جتھہ بندی کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی سرکوبی کے لیے حضرت عِیاض بن غَنم رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا تھا، مگر وہ تنہا اُن پر قابو نہ پا سکے تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے مدد طلب کی۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ بلا پس و پیش وہاں پہنچ گئے۔ عیسائی عربوں نے انہیں آتا دیکھا تو گھبرا گئے، ان کے سردار اُکَیدِر بن مالک نے جو غزوۂ تبوک میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی یلغار کا مشاہدہ کر چکا تھا، اپنی قوم کو صلح کرنے کا مشورہ دیا مگر عیسائی قبائل لڑنے مرنے پر آمادہ تھے۔

اُکَیدِر نے یہ رنگ دیکھا تو ایک طرف نکل گیا مگر راستے میں ایک مسلمان کے ہاتھوں مارا گیا۔ اِدھر ایک عرب نصرانی سردار جُودِی بن ربیعہ نے قبائل کو مزید جوش دلایا۔ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور عیاض بن غَنم رضی اللہ عنہ کی فوجوں سے، جو الگ الگ سمتوں میں تھیں، لڑنے کے لیے نکلے۔

گھمسان کی جنگ کے بعد عیسائیوں کو دونوں محاذوں پر شکست ہوئی، جودی گرفتار ہو گیا اور باقی عیسائی پسپا ہو کر قلعہ بند ہو گئے، تاہم حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس قلعے کو بھی بزورِ شمشیر فتح کر کے دم لیا۔ اس طرح عرب نصرانیوں کی طاقت پارہ پارہ ہو گئی۔ [2]

---

[1] الكامل في التاريخ: تحت ١٢ هجرى

[2] تاريخ ابن خلدون: ٢/ ٥١٢، ط دار الفكر

فِراض کی جنگ:

اب حضرت خالد ولید رضی اللہ عنہ واپس ''حِیرَہ'' کی طرف پلٹے جہاں عجمی سیاستدان اور عرب عیسائی سردار از سرِ نو طاقت جمع کر کے جنگ کی آگ بھڑکا رہے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے یکے بعد دیگرے مُصَیَّخ، ثَنِی اور زُمَیل کے میدانوں میں ان سے جنگیں کیں اور ان کا شیرازہ بکھیر دیا۔

''فِراض'' شام، عراق اور ریاست حِیرَہ کی سرحدات کا سنگم ہونے کی وجہ سے نہایت اہم مقام تھا۔ ذوالقعدہ سن ۱۲ ہجری میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اسے فتح کرنے کے لیے فوج مرتب کی۔ شام کے رومی، عراق کے عجمی اور حِیرَہ کے عیسائی قبائل میں سے کوئی یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اتنا اہم علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آئے، اس لیے جب اسلامی لشکر یہاں پہنچا تو ایرانیوں اور عیسائی عربوں کے ساتھ ساتھ رومی افواج بھی مسلمانوں کے مقابلے کے لیے شانہ بشانہ کھڑی تھیں، دونوں فوجوں کے درمیان دریائے فُرات حائل تھا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حریف کو دریا پار کرنے کا موقع دیا۔ یہاں ایک نہایت خون ریز جنگ کے بعد اتحادیوں کی ہمت جواب دے گئی، جب وہ فرار ہوئے تو دریائے فُرات کی موجوں کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قریب قریب ساری اتحادی فوج ماری گئی، کم وبیش ایک لاکھ افراد قتل ہوئے۔[1]

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا حج اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تنبیہ:

اس شاندار فتح کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر اچانک حج بیت اللہ کا شوق غالب آ گیا، جس میں صرف دو ہفتے باقی رہ گئے، چونکہ اسلامی لشکر کے سپہ سالار کی محاذِ جنگ سے غیر حاضری سے سپاہیوں پر منفی اثر پڑ سکتا تھا، اس لیے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنا ارادہ کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا اور خفیہ طور پر نہایت تیز رفتاری سے صحرائے عرب عبور کرتے ہوئے مکّہ جا پہنچے۔ مناسک حج ادا کر کے آپ اسی تیزی سے واپس عراق پہنچ گئے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس سال خود حج کے لیے تشریف لائے تھے مگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی آمد ورفت سے وہ بھی اس وقت بے خبر رہے، مدینہ واپس پہنچ کر معلوم ہوا تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا:

''خبردار! آئندہ ایسا خطرہ مول نہ لینا۔ خیال رکھنا کہ تمہارے اندر خود پسندی کا مادہ پیدا نہ ہونے پائے ورنہ نقصان ہوگا۔ اپنے کسی کارنامے پر ناز مت کرنا کیوں کہ یہ سب اللہ ہی کا احسان ہے، وہی بہترین بدلہ دینے والا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی آپ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو فوری حکم جاری کیا کہ وہ عراق چھوڑ کر شام کی سرحدوں پر پہنچ جائیں، کیوں کہ اب وہاں سخت جنگوں کا وقت آ گیا تھا اور حضرت خالد سیف اللہ رضی اللہ عنہ کی وہاں زیادہ ضرورت تھی۔[2]

☆☆☆

---

① تاریخ ابن خلدون: ۲/۵۱۳، ۵۱۴

② المنتظم لابن جوزی: ۴/۱۱۱

رُومی بادشاہت

شام قیصر روم کی بادشاہت کا نہایت اہم صوبہ تھا جس میں عیسائیوں کے مقدس مقامات واقع تھے۔ ایرانیوں کی طرح رومی بھی عربوں کے دیرینہ دشمن تھے، مگر ایرانیوں کی دشمنی میں سیاسی اور تہذیبی عنصر غالب تھا جبکہ رومیوں کی عداوت میں مذہبی جذبات کا دخل زیادہ تھا۔ اسلام سے پہلے یمن کے عیسائی حاکم ابرہہ نے بازنطینی رومی سلطنت ہی کی شہ پر کعبہ کے مقابلے میں گرجا تعمیر کر کے عربوں کو اس کے حج کی دعوت دی تھی، جسے عربوں نے سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ جب عرب اسلام قبول کر کے ایک منظم طاقت بنے تو اس سے بازنطینی رومیوں کو سخت تشویش لاحق ہوئی کیوں کہ اسلام کی خوبیوں اور رعنائیوں کے سامنے نصرانیت کی مصنوعی چمک دمک ماند پڑ رہی تھی اور خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اسلام کا پیغام مشرق و مغرب کو اپنے جلو میں لے کر نصرانیت کو ایک بھولی بسری داستان بنا دے۔ یہی وجہ تھی کہ شام کے نصرانی رسول اللہ ﷺ کے دور ہی سے مسلمانوں کے خلاف کمر بستہ تھے۔ اسی حکومت نے حضور ﷺ کے سفیر حضرت حارث بن عُمیر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا، جن کے انتقام کے لیے نبی کریم ﷺ نے لشکر بھیجا جو مؤتہ کے مقام پر سر پر کفن باندھ کر رومیوں کے ٹڈی دل لشکر سے لڑا۔ پھر اسی مہم کی تکمیل کے لیے آپ ﷺ نے زندگی کے آخری لمحات میں جیش اُسامہ بن زید کو روانہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ حضور ﷺ نے سن ۹ ہجری میں اپنا آخری جہادی سفر بھی رومیوں کی متوقع یلغار کی روک تھام کے لیے کیا تھا اور تبوک تک جا کر اسلام کے جھنڈے گاڑے تھے جو عرب اور شام کی سرحد تھی۔ رومی اسلام کو اپنے لیے سخت ترین خطرہ تصور کر کے عربوں کے خلاف چڑھائی کے لیے نہ صرف مسلسل تیاریاں کر رہے تھے بلکہ ان دنوں عراق کی سرحد پر مسلمانوں کے خلاف لڑنے والے عرب عیسائیوں کو بھی ان کی پشت پناہی حاصل تھی اور جنگ فراض میں تو رومیوں نے باقاعدہ شرکت کر کے مسلمانوں کے خلاف عملی طور پر اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔

ان حالات کے پیش نظر اب ضروری ہو گیا تھا کہ رومیوں کی طاقت کا غرور ہمیشہ کے لیے توڑ کر ایشیا کے لاکھوں بے کس و مجبور لوگوں کو ان کے ظلم و ستم سے نجات دلائی جائے اور اسلام کی دعوت کی قبولیت اور اس کے نظامِ عدل کے نفاذ میں حائل اس جابرانہ سلطنت کے تار و پود بکھیر دیے جائیں۔

رومیوں کے خلاف پہلی مہم:

اتنی بڑی طاقت سے ٹکر لینے میں احتیاط ملحوظ رکھنا ضروری تھا، اس لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اب تک شام کی طرف بھیجے جانے والے لشکروں کو زیادہ دور تک پیش قدمی کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ آپ نے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ جو شام کی سرحدوں پر تعینات کیے جا چکے تھے، ہدایت کی کہ وہ آگے بڑھیں مگر رومیوں سے جنگ میں پہل نہ کریں اور اندھا دھند پیش قدمی مت کریں۔

حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ ان ہدایات کے تحت محتاط انداز میں رومیوں کے مقابل آئے جو پوری طرح تیار ہوکر اپنے بطریق باہان کی قیادت میں چلے آرہے تھے۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے بڑی پامردی سے مقابلہ کرکے اس لشکر کو پسپا کر دیا مگر رومیوں کی فوجی طاقت کا کوئی حد و شمار نہ تھا اس لیے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے دربارِ خلافت میں مزید افواج کی درخواست بھیجی۔ ①

نئے لشکروں کی ترتیب:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس معاملے کو پوری سنجیدگی سے لیا، آپ نے یمن، تہامہ، عُمان اور بحرین سے جمع ہونے والے رضا کاروں کو حضرت عِکرِمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ کی قیادت میں جمع کر کے فوری مدد کے طور پر شام کے محاذ پر روانہ کر دیا مگر ضرورت اس سے پوری نہیں ہوئی، وہاں ایک بڑے لشکر کی ضرورت تھی جس کی تیاری اور قیادت کے لیے اکابر صحابہ ہی موزوں تھے۔ چنانچہ آپ نے حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے محکمہ زکوٰۃ کے افسر تھے، مشورہ دیا کہ وہ یہ عہدہ چھوڑ کر ایک دوسری اہم خدمت کے لیے تیار ہو جائیں۔ حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

''میں اسلام کے تیروں میں سے ایک تیر ہوں۔ چلانے والے آپ ہیں۔ جو ہدف سب سے خطرناک، سب سے اہم اور سب سے زیادہ اجر و ثواب والا محسوس ہو، مجھے اس پر دے ماریں۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے اور انہیں نئی فوج کے لیے رضا کار بھرتی کرنے کا کام سونپ دیا۔ جب ایک بڑا مجمع تیار ہوگیا تو آپ نے تین فوجیں تشکیل دیں۔ ایک کا سالار حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو بنا کر اسے فلسطین کے رخ پر روانہ کیا، دوسرے کی قیادت حضرت ولید بن عُقبہ رضی اللہ عنہ کو سونپی اور اسے اُردُن کی سمت بھیج دیا۔ ②

تاریخی وصیت:

تیسرا لشکر جو سب سے بڑا تھا، حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی کمان میں دیا۔ اس لشکر کو آپ نے خود بڑے اہتمام سے روانہ کیا اور مدینہ کے باہر تک اسے رخصت کرنے کے لیے پیدل ساتھ چلے۔ امیر لشکر کو یہ تاریخی ہدایات دیں:

''تمہیں قیادت اس لیے سونپی ہے تاکہ تمہاری آزمائش ہو اور تمہاری صلاحیتیں ظاہر ہوں۔ تم نے اچھی کارکردگی دکھائی تو تمہارا رتبہ بڑھا دیا جائے گا۔ اگر ذمہ داری اچھی طرح انجام نہ دی تو معزول کر دیے جاؤ گے۔ تمہیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ وہ تمہاری چھپی ہوئی باتوں کو اسی طرح جانتا ہے جیسے تمہارے ظاہر کو، لوگوں میں سے اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ نزدیک وہی ہے جو سب سے زیادہ اُس سے لو لگائے رکھے۔ اللہ کے ہاں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اعمال کے ذریعے اس کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرنے

① الکامل فی التاریخ: تحت ۱۳ ہجری ② الکامل فی التاریخ: تحت ۱۳ ہجری

کی کوشش کرتا ہے۔ خبردار! جاہلی تعصب سے بچ کر رہنا، اللہ تعالیٰ تعصب کو اور تعصب برتنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اپنے سپاہیوں سے اچھا سلوک کرنا، ان کو اچھی اُمید دلاتے رہنا۔ جب انہیں نصیحت کرو تو مختصر بات کرنا کہ طویل تقریر کا کچھ حصہ یاد رہتا ہے، کچھ بھول جاتا ہے۔ اپنے نفس کو نیک بنالو، لوگ بھی تمہارے ساتھ نیکی کریں گے۔ نمازوں کو اپنے اوقات میں رکوع وسجود کے پورے آداب کے ساتھ اور خشوع وخضوع سے ادا کرنا۔ دشمن کے سفیروں کا اعزاز واکرام کرنا مگر زیادہ دیر انہیں اپنے ہاں مت ٹھہرنے دینا، کہیں وہ تمہارے راز نہ جان لیں۔

اپنے رازوں کو کبھی ظاہر نہ ہونے دینا ورنہ سارا نظام گڑبڑ ہو جائے گا۔ جب مشورہ کرنا ہو تو سچ بولنا اور مشیروں سے صورتحال کا کوئی پہلو مت چھپانا۔ پہرے کا بہت اہتمام کرنا۔ سپاہیوں کی حالت سے غافل نہ ہونا، مگران سنے پوشیدہ معاملات کی ٹوہ میں بھی مت رہنا۔ اپنا اُٹھنا بیٹھنا سچے خیرخواہ اور وفادار افراد کے ساتھ رکھنا، بزدلی مت دکھانا، ورنہ سپاہی بھی بزدل بن جائیں گے۔ دشمنوں کے جو لوگ اپنی عبادت گاہوں تک محدود ہوں، انہیں مت چھیڑنا۔"[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ نصیحتیں کسی بھی دینی کام کی قیادت کرنے اور اہم ذمہ داریاں سنبھالنے والے افراد کے لیے ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہیں۔

شکست اور نئی حکمت عملی:

حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ شام کی سرحدوں پر کمک کا انتظار کر رہے تھے، جوں ہی انہیں اسلامی افواج کی روانگی کی اطلاع ملی، انہوں نے شام کی سرحدوں میں پیش قدمی شروع کر دی اور فلسطین میں مَرْجُ الصُفّر کے مقام تک جا پہنچے، لیکن یہاں رومی جرنیل باہان ایک زبردست فوج کے ساتھ تیار کھڑا تھا۔ اس نے ناکہ بندی کر کے اتنا سخت حملہ کیا کہ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے لشکر کو بری طرح شکست ہوئی، ان کے بیٹے سمیت بڑی تعداد میں مسلمان شہید ہوئے۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ بمشکل کچھ افراد کے ساتھ زندہ سلامت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور سیدھے مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں مدینہ میں ٹھہرا کر حضرت شُرَحْبیل بن حَسَنہ، حضرت مُعاویہ بن ابی سفیان اور حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہم جیسے آزمودہ کار صحابہ کرام کو شام کے محاذ پر روانہ کر دیا۔ ان سے پہلے کچھ امدادی فوجیں حضرت عِکرمہ بن ابی جَہل اور حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کی قیادت میں وہاں پہنچ چکی تھیں۔[2]

جنگی منصوبے کے مطابق یہ تازہ دم افواج شام کی سرحد عبور کر کے الگ الگ مقامات پر ٹھہر گئیں۔ حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ نے جابیہ میں، حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے بلقاء میں اور حضرت شُرَحْبیل بن حَسَنہ رضی اللہ عنہ نے

[1] الکامل في التاریخ: تحت ۱۳ ھجری
[2] الکامل في التاریخ: تحت ۱۳ ھجری

اُرْدُن کے میدانوں میں خیمے گاڑ دیے۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس سات، سات ہزار سپاہی تھے۔ اس طرح اسلامی لشکر کی مجموعی تعداد اکیس ہزار تھی۔

رومی بادشاہ ہرقل کو مسلمانوں کی اس منظم یلغار کی اطلاع ہوئی تو تیزی سے کوچ و قیام کرتا ہوا اپنے دارالحکومت حمص پہنچا اور یہاں سے ہر مسلمان امیر کے مقابلے میں الگ الگ فوجیں روانہ کر دیں تاکہ مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر لڑنے نہ پائیں۔ ان میں سے حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں جانے والا لشکر ساٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا جس کی قیادت فیقار نامی افسر کے ہاتھ میں تھی۔ اُدھر ہرقل کا سگا بھائی تذارق ۹۰ ہزار کا لشکر لے کر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی طرف چل پڑا تھا۔

مسلمان سپہ سالاروں نے یہ صورتحال دیکھ کر خط و کتابت کے ذریعے باہم مشورہ کیا اور متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ سب کے سب ایک جگہ جمع ہو جائیں اور دربارِ خلافت سے مزید کمک کی درخواست کریں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے انہیں حکم دیا کہ پیچھے ہٹ کر دریائے یرموک کے کنارے کسی موزوں علاقے میں پڑاؤ ڈالیں۔[1]

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی شام روانگی:

یہی وہ دن تھے جب دربارِ خلافت سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پیغام ملا تھا کہ وہ عراق کے محاذ کی قیادت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر کے جلد از جلد اپنی نصف سپاہ کے ساتھ شام کے محاذ پر پہنچ جائیں۔[2]

اِن حالات میں جبکہ شام کی سرحدوں پر جنگ کے مہیب بادل چھائے ہوئے تھے اور رومی لشکر مسلسل نقل و حرکت میں تھا، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا انہیں جُل دے کر اپنی منزل تک پہنچنا بہت مشکل تھا مگر وہ اللہ کی تلوار تھے، اپنے ہدف سے پہلے رکنا نہیں جانتے تھے، انہوں نے عراق کی آدھی فوج کے ساتھ جو نو ہزار مجاہدین پر مشتمل تھی، حِیرہ سے شمال مغرب کی طرف کوچ کرتے ہوئے ایک ایسا بے آب گیاہ صحرائی راستہ اختیار کیا جسے عبور کرنے کا کسی کو وہم و گمان تک نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ صحرا ''قُرا قِر'' سے ''سُوئی'' تک پھیلا ہوا تھا اور رومی فوجیں اس کے جنوب مغرب میں سرحدوں کی ناکہ بندی کیے موجود تھیں۔ اس صحرا میں کوئی چشمہ تھا نہ نخلستان۔

قبیلہ بنو طے کے حضرت رافع بن عمیرہ رضی اللہ عنہ جنہیں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے راہبر مقرر کیا تھا، بولے: ''اس صحرا کو تو تیز رفتار تنہا سوار بھی آسانی سے عبور نہیں کر سکتا چہ جائے کہ آپ فوج اور قافلے کے ساتھ یہاں سے گزر سکیں۔''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مجھے یہاں سے گزرنا ہی ہوگا، رومیوں سے کترا کر مدد کے منتظر مسلمانوں تک پہنچنے کے لیے یہ ضروری ہے۔''[3]

---

① تاریخ الطبری: ۳۹۲/۳، ط دار المعارف
② الکامل فی التاریخ: تحت ۱۳ ہجری ③ الکامل فی التاریخ: تحت ۱۳ ہجری

صحرا، پیاس اور چشمہ:

خالد رضی اللہ عنہ نے ہم راہیوں کو حکم دیا کہ وہ اونٹوں کو خوب سیراب کرلیں اور جتنا ہوسکے پانی ساتھ لے لیں۔اب صحرا کا دشوار گزار سفر شروع ہوا۔گرمی کی شدت اور سخت پیاس کی وجہ سے آخر پانی ختم ہوگیا، گھوڑے پیاس سے نڈھال ہونے لگے تو اونٹوں کو ذبح کر کے ان کے کوہانوں میں محفوظ رطوبت انہیں پلائی گئی۔پانچویں دن قافلے کا دم لبوں پر تھا۔راہبر حضرت رافع بن عمیرہ رضی اللہ عنہ کی آنکھیں بیماری کی وجہ سے دُکھ رہی تھیں، وہ بمشکل صحرا کی وسعتوں پر نگاہ دوڑا رہے تھے مگر کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔آخر کار وہ قافلے کو ایک سمت لے جا کر کہنے لگے:

''دیکھو، کہیں ایسا درخت نظر آتا ہے، جیسے بیٹھا ہوا آدمی۔'' جواب ملا: ''نہیں''

بولے: ''پھر تو تم بھی ختم اور میں بھی۔دیکھو، دوبارہ غور سے دیکھو۔''

تب اچانک کسی شخص نے پکار کر کہا: ''ہاں، ایک درخت کا کٹا ہوا تنا دکھائی دے رہا ہے۔''

حضرت رافع رضی اللہ عنہ نے وہاں جا کر کہا: ''اس کی جڑ میں کھدائی کرو۔''

لوگوں نے کھدائی کی تو نیچے سے ایک چشمہ جاری ہوگیا۔حضرت خالد رضی اللہ عنہ حیران تھے کہ رافع رضی اللہ عنہ کو یہاں پانی کے امکانات کا اندازہ کیوں کر ہوا۔پوچھا تو وہ بولے: ''میں صرف ایک بار بچپن میں والدین کے ساتھ یہاں سے گزرا تھا، تب اس درخت کے پاس چشمہ بہا کرتا تھا۔''

قافلہ سیراب ہوکر آگے بڑھا اور پانچویں دن صحیح سلامت موت کی وادی سے نکل کر اس خاموشی سے شام کی حدود میں داخل ہوگیا کہ دشمن کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔[1]

بُصریٰ کی فتح:

شام پہنچتے ہی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی ایک بڑی کمزوری کا اندازہ کیا، وہ یہ کہ اب تک انہوں نے کوئی شہر یا قلعہ فتح نہیں کیا تھا۔حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ جب تک ایک محفوظ پناہ گاہ کے طور پر کوئی فصیل بند شہر زیر نگیں نہ ہو، شام میں قدم جمانا ممکن نہیں، چنانچہ انہوں نے اپنے راستے میں آنے والے سب سے پہلے شہر ''بُصریٰ'' کے سامنے خیمے گاڑ دیے، اس دوران دیگر اسلامی قائدین کی فوجیں بھی مدد کے لیے پہنچ گئیں۔اہل شہر نے جزیہ دینا قبول کر کے ہتھیار ڈال دیے اور شہر مصالحت کے ساتھ فتح ہوگیا۔[2]

جنگِ اَجنادَین:

اَب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور دیگر امرائے اسلام نے اَجنادین کا رخ کیا، جہاں حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں ہرقل کا بھائی ۹۰ ہزار سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا، یہ علاقہ فلسطین کی بستی رَملَہ اور بیتِ جبرِین کے درمیان واقع ہے۔

---

① الکامل فی التاریخ: تحت ۱۳ ھجری

② تاریخ الطبری: ۲/۷ا۴، دار المعارف

جنگ سے پہلے رومیوں کے سپہ سالار نے ایک عرب جاسوس کو مسلمانوں کی خیمہ گاہ میں بھیجا۔ اس نے واپس آکر یہ رپورٹ پیش کی۔ بِاللَّيْلِ رُهْبَان، وَبِالنَّهَارِ فُرْسَان ''رات کو عبادت گزار، دن کو شہ سوار''

ساتھ ہی کہا: ''ان میں قانون کی بالادستی اتنی ہے کہ اگر ان کے حکمران کا بیٹا بھی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا، اگر بدکاری کرے تو اسے بھی سنگسار کیا جائے گا۔''

یہ سن کر رومی سپہ سالار نے کہا:

''تو پھر ان سے لڑنے سے زمین میں زندہ دفن ہونا بہتر ہے۔ کاش! مجھے ان سے لڑنا نہ پڑتا۔''

آخر ۲۷ جمادی الاولیٰ سن ۱۳ ہجری کو اَجنادَین کے میدان میں نہایت گھمسان کی جنگ ہوئی۔ مسلمانوں کے تمام امرائے فوج نے متفقہ طور پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار اعلیٰ بنالیا تھا، اس لیے حضرت عَمرو بن العاص، حضرت یزید بن سفیان، حضرت شُرَحبیل بن حَسَنہ اور حضرت ابوعبیدہ بن جَرّاح رضی اللہ عنہم سمیت تمام اکابر انہی کی کمان میں لڑ رہے تھے۔ [1] آخر کار رومیوں کو شکست فاش ہوئی، ہرقل کا بھائی تذارق مارا گیا اور میدانِ جنگ مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے رومیوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور بڑی تیزی سے پوری فوج کو لے کر شمال کی طرف بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ یَرمُوک تک جا پہنچے جہاں ہرقل کی بہت بڑی فوج سے مقابلہ ناگزیر تھا۔ [2]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رحلت:

مگر اس سے پہلے کہ یَرمُوک کا میدان دو قوموں کے درمیان ایک شدید جنگ کا نظارہ دیکھتا، مدینہ منورہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوگیا۔ انہوں نے ۶۳ سال عمر پائی تھی۔ وہ کئی دنوں سے بیمار چلے آرہے تھے۔ ایک سال پہلے وہ اور عرب کا مشہور طبیب حارث بن کَلَدَہ کھانا نوش کرنے ساتھ بیٹھے تھے، دسترخوان پر چاول تھے، حارث نے لقمہ نگلتے ہی کہا تھا: ''خلیفۂ رسول! کھانے سے ہاتھ کھینچ لیں، اس میں خاص قسم کا زہر ملا ہے، جس کا اثر ٹھیک ایک سال بعد ظاہر ہوتا ہے۔''

تاریخ اس کی وضاحت نہیں کرپاتی کہ زہر کھلانے کی سازش کرنے والا کون تھا۔ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس کھانے میں یہودیوں نے زہر ملا دیا تھا'' مگر یہ پتا نہیں چلتا کہ یہود نے کب اور کیسے خلیفۃ المسلمین کے کھانے میں زہر ملایا؟ وہ اس سازش میں کیسے کامیاب ہوئے، سازش کرنے والا یہودی کونسا تھا؟ یہ سب سوالات تشنۂ تکمیل رہ جاتے ہیں، بہرکیف جو یہودی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کو زہریلا لقمہ کھلانے میں کامیاب ہوسکتے ہیں، وہ خلیفۃ الرسول کے لیے ایسا جال کیوں نہیں بچھا سکتے تھے۔

زہر کے اثر سے حارث بن کَلَدَہ ایک سال بعد چل بسا اور ٹھیک اسی دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی وفات پاگئے۔ [3]

---

① الكامل في التاريخ: تحت ١٣ هجرى ؛ البداية والنهاية: ٥٥٢/٩ ② تاريخ ابن خلدون: ٥١٧/٢

③ الكامل في التاريخ: تحت ١٣ هجرى ④ تاريخ الخلفاء، ص ٦٥، ط نزار

جانشین کے تقرر کے لیے مشاورت:

اپنی رحلت کا وقت قریب محسوس کر کے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہما کو مشورے کے لیے بلایا کہ کسے جانشین مقرر کریں۔ آپ کے ذہن میں پہلے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام تھا جو بلاشبہ اس منصب کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھے۔ اس لیے پوچھا: ''عمر کے بارے میں کیا رائے ہے؟''

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بولے:

''ان کی فضیلت اور قابلیت میں تو کوئی شک نہیں ہے مگر ان کی طبیعت میں کچھ سختی ہے۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اُن میں سختی اس لیے ہے کہ میں نرم ہوں، جب اُن پر خلافت کی ذمہ داری پڑے گی تو خود بخود نرم ہو جائیں گے۔ میں نے کئی بار یہ دیکھا ہے کہ جب میں کسی پر غصہ کرتا تو وہ مجھے اس سے راضی کراتے ہیں اور جب میں کسی معاملے میں نرمی کرتا تو وہ سخت مزاج نظر آتے ہیں۔''

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس فیصلے پر اپنے تحفظات ظاہر کرتے ہوئے کہا:

''آپ عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے جا رہے ہیں، جبکہ لوگوں سے معاملات میں اُن کی سخت مزاجی کا آپ کو علم ہے۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پورے اطمینان سے فرمایا:

''ہاں، جب میں اللہ سے ملوں گا تو کہہ سکوں گا کہ میں تیرے بندوں پر بہترین انسان کو خلیفہ بنا کر آیا ہوں۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے رائے پوچھی تو وہ بولے: ''اُن جیسی خوبیوں والا ہم میں اور کوئی نہیں۔''

ان حضرات سے گفتگو کے بعد آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو وصیت نامہ لکھنے کا حکم فرمایا۔ آپ نے ابھی اتنا ہی لکھوایا تھا کہ ''ابوبکر بن ابی قحافہ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے وصیت۔'' کہ آپ پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا فیصلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے بارے میں ہے، وہ یہ سوچ کر پریشان ہو گئے کہ کہیں اس بے ہوشی میں خلیفہ کی وفات نہ ہو جائے اور وصیت نامہ ادھورا رہ جانے کی وجہ سے خلافت کا قضیہ متنازعہ نہ بن جائے، چنانچہ انہوں نے یہ عبارت خود لکھ دی:

''میں نے عمر کو تمہارے لیے خلیفہ مقرر کر دیا ہے۔ میں نے تمہاری خیر خواہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔''

چند لمحوں بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہوش آ گیا، پوچھا: ''کیا لکھا؟''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبارت پڑھ کر سنائی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پہلے فرمایا: ''اللہ اکبر!''

پھر ان کی دانش مندی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

''اللہ تمہیں تمام مسلمانوں کی طرف سے بہترین جزائے خیر دے۔''[1]

---

[1] الکامل فی التاریخ: تحت ۱۳ ہجری

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خصوصی وصیتیں:

اس کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بلوا کر انہیں کہا:

''میں تمہیں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے لیے خلیفہ بنا کر جا رہا ہوں۔''

پھر آپ نے انہیں خلافت کی ذمہ داریوں کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''اے عمر! اللہ کے کچھ حقوق رات کے ہیں اور کچھ دن کے۔ نہ رات کے حقوق وہ دن میں قبول کرتا ہے نہ دن کے رات میں۔ وہ نفل کو اُس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک فرائض ادا نہ ہوں۔''

چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رعب و ہیبت کی وجہ سے بعض صحابہ کرام کو یہ خوف تھا کہ وہ کہیں بے جا سختی نہ کر گزریں۔ اس لیے آپ نے انہیں اعتدال کا دامن تھامے رکھنے کی خصوصی وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

''عمر! کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں سختی کے ساتھ نرمی کا اور عذاب کے ساتھ رحمت کا ذکر کیا ہے تا کہ بندے اُمید وارِ رحمت رہیں اور عذاب سے لرزاں بھی، تا کہ نہ تو کسی کو اتنی خوش فہمی ہو کہ اللہ کے ہاں اپنے حق سے زیادہ کی خواہش کرے اور نہ ایسی مایوسی ہو کہ ہلاکت میں پڑ جائے۔''

پھر اپنی دلی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''اے عمر! کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے جہنمیوں کا ذِکر اُن کے برے اعمال کے ساتھ کیا ہے جسے پڑھ کر مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں میں اُن میں سے نہ شمار ہوں اور جنتیوں کا ذِکر اُن کے بہترین اعمال کے ساتھ کیا ہے، جسے پڑھ کر میں سوچتا ہوں بھلا میں اُن میں سے کیسے ہوں پاؤں گا۔ عمر! اگر میری ان باتوں کو یاد رکھو گے تو نظر سے اُوجھل دنیا تمہیں اس نظر آنے والی دنیا سے زیادہ محبوب رہے گی، اور تم یقیناً ایسا کر سکتے ہو۔''[1]

ان نصیحتوں اور وصیتوں کے بعد منگل، ۲۲ جمادی الآخرۃ ۱۳ ہجری کو اُمّتِ مُسلمہ کے اس غم خوار نے جس کے دل کی ہر دھڑکن اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی سربلندی کے لیے وقف تھی، داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا اور اپنے محبوب حضور سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پہلو میں دفن ہوئے۔[2]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت پر ایک نظر:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اخلاق و کردار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے قریب تھے کہ اُمّتِ مُسلمہ کا کوئی فرد اس بارے میں اُن کی ہم سری نہیں کر سکتا۔ آپ رضی اللہ عنہ نرم دل، مہربان، سخی اور سادہ مزاج تھے۔ ابراہیم نخعیؒ فرماتے تھے:

''حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ان کی نرمی اور رحم دلی کی بناء پر اَوّاہ (بہت آہ و زاری کرنے والا) کہا جاتا تھا۔''[3]

---

① الكامل في التاريخ: تحت ۱۳ هجری
② الكامل في التاريخ: تحت ۱۳ هجری
③ طبقات ابن سعد: ۳/ ۱۷۱، ط صادر

فطرتِ سلیمہ کا یہ عالم تھا کہ زمانہ جاہلیت میں بھی کبھی بتوں کی عبادت کی نہ کبھی شراب کو ہاتھ لگایا۔ (1) گرمی میں کثرت سے روزے رکھتے تھے (2) جس کی وجہ سے جسم پر چربی کا نام ونشان تک نہ رہا تھا، بالکل نحیف ہو گئے تھے۔ (3) آپ تاجر پیشہ تھے۔ اسلام کے لیے خوب خرچ کرتے رہے۔ (4) خلیفہ بنے تو تمام پیسہ بیت المال میں جمع کر دیا۔ (5)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کچھ مناقب:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

مَا لِاَحَدٍ عِنْدَنَا یَدٌ اِلَّا وَقَدْ کَافَیْنَاہُ مَاخَلَا اَبُوْبَکْرٍ فَاِنَّ لَہٗ عِنْدَنَا یَدًا یُکَافِئُہُ اللّٰہُ بِہٖ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ

(ہم نے ہر شخص کی بھلائیوں کا بدلہ ادا کر دیا ہے، سوائے ابوبکر کے، ان کے ہم پر اتنے احسانات ہیں کہ ان کا بدلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی عطا کرے گا۔) (6)

نبی اکرم ﷺ سے ایک بار پوچھا گیا: ''آپ کو سب سے زیادہ کس سے محبت ہے؟'' فرمایا: ''عائشہ سے'' پوچھا گیا: ''مردوں میں سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟'' فرمایا: ''عائشہ کا باپ (ابوبکر رضی اللہ عنہ)۔'' (7)

نبی کریم ﷺ فرماتے تھے:

''لَوْ کُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِیْلًا غَیْرَ رَبِّیْ لَاتَّخَذْتُ اَبَا بَکْرٍ خَلِیْلًا''

(اگر میں اللہ کے سوا کسی کو اپنا محبوب بناتا تو یقیناً ابوبکر ہی کو محبوب بناتا۔) (8)

ایک بار فرمایا: ''جس شخص نے سب سے زیادہ میرا ساتھ دیا اور میری خاطر اپنا مال سب سے زیادہ لگایا وہ ابوبکر ہیں۔ اگر میں کسی شخص کو اپنا محبوب بناتا تو یقیناً ابوبکر کو محبوب بناتا۔ مگر اسلامی اخوت (اپنی جگہ کافی) ہے۔'' (9)

صحابہ کرام کی متفقہ رائے تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اُمّت میں افضل ترین ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم صحابہ نبی ﷺ کے زمانے میں کسی صحابی کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ (10)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ نے پوچھا: حضور ﷺ کے بعد بہترین شخص کون ہے؟'' انہوں نے بلاتردد فرمایا: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ۔'' (11)

---

(1) تاریخ الخلفاء، ص ۲۹، ط نزار

(2) الزھد لاحمد بن حنبل، ح: ۵۸۵، ط العلمیۃ

(3) تاریخ الطبری: ۳/۴۲۴

(4) طبقات ابن سعد: ۳/۱۷۱، ط صادر (5) تاریخ الاسلام للذھبی: ۳/۱۱۳، ت تدمری

(6) سنن الترمذی، ح: ۳۶۶۱، ابواب المناقب، باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ، باسناد صحیح

(7) صحیح مسلم، ح: ۶۳۲۸، فضائل الصحابۃ، باب فضائل ابی بکر رضی اللہ عنہ

(8) صحیح مسلم، ح: ۶۳۲۷، فضائل الصحابۃ، باب فضائل ابی بکر رضی اللہ عنہ

(9) صحیح مسلم، ح: ۶۳۲۰، فضائل الصحابۃ، باب فضائل ابی بکر رضی اللہ عنہ

(10) صحیح البخاری، ح: ۳۶۹۷، کتاب المناقب، باب مناقب عثمان بن عفان

(11) صحیح البخاری، ح: ۳۶۷۱، کتاب المناقب، باب فضل ابی بکر رضی اللہ عنہ

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''تم میرے رفیقِ غار اور حوضِ کوثر پر مصاحب ہو۔'' ①

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کچھ تلخی ہوگئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جلد ہی اس پر نادم ہوکر معذرت بھی کرلی مگر رسول اللہ ﷺ اس واقعے پر اتنے دل فگار ہوئے کہ تاقیامت لوگوں کو تنبیہ کے لیے ایک عام پیرایے میں خطاب فرمایا: ''اللہ نے مجھے تم لوگوں کی طرف مبعوث کیا۔ تم لوگوں نے مجھے جھٹلایا اور ابوبکر نے میری تصدیق کی۔ اپنی جان اور مال کے ساتھ میری غم خواری کی۔ تو کیا تم میری خاطر میرے دوست کو بخش نہیں سکتے؟'' ②

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

''ابوبکر رضی اللہ عنہ ہمارے سردار ہیں، ہم سب سے افضل ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے سب سے زیادہ چہیتے ہیں۔'' ③

ایک بار رسول اکرم ﷺ نے فرمایا'' جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے جنت کا وہ دروازہ دکھلایا جس سے میری اُمّت کے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''یارسول اللہ! کاش اس وقت میں آپ کے ساتھ ہوتا تو جنت کا دروازہ دیکھنا نصیب ہوجاتا۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''اَمَا اِنَّکَ یَا اَبَابَکْرٍ اَوَّلُ مَنْ یَّدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِیْ''

(ابوبکر! آگاہ رہو کہ میری اُمّت میں سے سب سے پہلے جنت میں داخل ہونے والے شخص تم ہی ہوگے۔) ④

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے تو بڑے مال دار تھے۔ چالیس ہزار درہم کے مالک تھے۔ مگر یہ ساری دولت اللہ کی راہ میں خرچ کردی۔ ⑤

اسی لیے آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے:

''مَا نَفَعَنِیْ مَالُ اَحَدٍ مَا نَفَعَنِیْ مَالُ اَبِیْ بَکْرٍ''

''مجھے ابوبکر کے مال سے جتنا فائدہ پہنچا ہے اتنا فائدہ کسی دوسرے کے مال نے نہیں دیا۔'' ⑥

غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ گھر کا سارا مال راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لیے لے آئے۔ حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: مَا اَبْقَیْتَ لِاَھْلِکَ (گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟)

عرض کیا: اَبْقَیْتُ لَھُمُ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (ان کے لیے اللہ اور اللہ کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں۔) ⑦

خلیفہ بننے کے بعد بھی آپ رضی اللہ عنہ کی تواضع اور سادگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بذاتِ خود غریبوں، بیواؤں اور

① سنن الترمذی، ح: ۳۶۷۰، ابواب المناقب، باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ، باسناد ضعیف
② صحیح البخاری، ح: ۳۶۶۱، باب لو کنت متخذا خلیلاً
③ سنن الترمذی، ح: ۳۶۵۶، کتاب المناقب، باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ
④ سنن ابی داؤد، ح: ۴۶۵۲، باب فی الخلفاء، باسناد ضعیف
⑤ تاریخ الخلفاء، ص ۳۴، طبع نزار
⑥ سنن الترمذی، ح: ۳۶۶۱، ابواب المناقب، باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ، باسناد صحیح
⑦ سنن ابی داؤد، ح: ۱۶۷۸، کتاب الزکوٰۃ، باب الرخصة فی ذلک، باسناد حسن

محتاجوں کی خدمت کر کے خوشی محسوس کرتے۔ کسی کی بکریوں کا دودھ دوہ دیتے، کسی کے اونٹ چرانے لے جاتے، کسی کے گھر میں جا کر صفائی کرآتے۔ ①

اللہ تعالیٰ کا خوف ہمیشہ طاری رہتا، دنیا سے ذرا بھی دل نہ لگاتے، ہر وقت آخرت کی فکر دل ودماغ پر حاوی رہتی۔ کبھی فرماتے: ''کاش، میں کوئی درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا۔'' ② کبھی فرماتے: ''کاش میں کسی مومن کے جسم کا بال ہوتا۔'' کبھی فرماتے کاش میں کوئی گھاس ہوتا جسے جانور چر جاتے۔ ③

امورِ مملکت کے انتظام میں خداداد مہارت:

اس خدا خوفی، پرہیز گاری اور تواضع کے باوجود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سیاسی ذمہ داریوں اور انتظامی کاموں کو پوری حاضر دماغی اور مستعدی سے نبھاتے۔ یہاں آپ بیداری اور چوکسی کی انتہا پر نظر آتے۔ مدینہ منورہ میں بیٹھ کر آپ دور دراز کے علاقوں کے معاملات کو یوں سنبھالتے گویا پورا جزیرۃ العرب، عراق اور شام آپ کی ہتھیلی پر نقش ہو۔ ایران سے شام تک ایک ایک راستہ اور ایک ایک بستی آپ کی نظر میں تھی۔ کون سا امیرِ فوج کہاں ہے، دشمن کا رُخ کس طرف ہے اور کتنی فوج کو کہاں سے ہٹا کر کہاں متعین کرنا ہے، یہ سب آپ کے ذہن میں حاضر رہتا۔ جو جنگیں سینکڑوں میلوں تک پھیلے ہوئے محاذوں پر ہو رہی تھیں ان کی اصل کمان آپ کے ہاتھ میں تھی۔

آپ افسران کو تیز ترین پیام رسانی کے ذریعے یوں آگے بڑھاتے اور پیچھے ہٹاتے جیسے شطرنج کے مہروں کو بدلا جاتا ہے، آپ کی طرف سے ذرا سی تبدیلی میدانِ جنگ کا پانسا پلٹ دیتی۔ عرب وعجم اور شام وروم کی جنگوں میں پلے بڑھے بڑے بڑے عسکری ماہرین کے دماغ مل کر آپ کی منصوبہ بندی اور دور اندیشی کا مقابلہ نہیں کر پاتے تھے۔ ④

آزمائشوں کا ڈٹ کر مقابلہ:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلافت کا منصب سنبھالتے ہی جن آزمائشوں سے پالا پڑا اُن سے نمٹنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے منتقل ہونے والے فیضانِ خاص کا اثر تھا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان سب مصائب میں ثابت قدم رہے۔ مدینہ منورہ کا محاصرہ ہو رہا تھا، زکوٰۃ سے انکار کیا جا رہا تھا، جھوٹے نبیوں نے آفت مچا رکھی تھی، قبائل مرتد ہو رہے تھے، رومی افواج امنڈ نے کو تیار تھیں مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ایمانی قوت، غیر معمولی استقامت اور حسنِ تدبیر نے تمام فتنوں کا زور توڑ دیا۔ مرتدین، منکرینِ ختمِ نبوت، ایرانی، عرب قبائل اور رومی سب ہی مقابلے پر تھے، مگر آپ کی سیاسی اور عسکری مہارت کے سامنے سب طفلِ مکتب ثابت ہوئے۔

بلاشبہ یہ غیر معمولی صلاحیتیں اُس نورِ نبوت کا اثر تھیں جو پوری اُمّت میں سے سب سے زیادہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو

① تاریخ الخلفاء، ص ۶۴، ۶۵، ط نزار
② تاریخ الخلفاء، ص ۸۲، ط نزار
③ الزهد لاحمد بن حنبل، ح: ۵۰۶، ۵۸۳، ط العلمیة
④ اس کی مثالیں گزشتہ اوراق میں جنگوں کے احوال میں گزر چکی ہیں۔

نصیب ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے جس اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی، اس کو استحکام بخشا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کارنامہ ہے۔ آپ نے جزیرۃ العرب اور نو مفتوحہ علاقوں کو دس حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے پر اپنی جانب سے ایک امیر مقرر کیا، جسے حاکم ہونے کے ساتھ ساتھ قاضی کے اختیارات بھی حاصل تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلامی فوج کو بہتر ترتیبات سے آراستہ کیا۔ ایک محاذ کے لشکر کو آپ چھوٹی چھوٹی فوجوں میں تقسیم کرتے، پھر ان سب کو ایک سپہ سالار اعلیٰ کے ماتحت کر دیتے، اس طرح اجتماعیت بھی باقی رہتی اور مختلف نقاط پر پیش قدمی بھی آسان بن جاتی۔ ①

سپاہیوں کو تاکید کی گئی تھی کہ فصلوں اور باغات کو نہ اجاڑیں، عورتوں، بوڑھوں، بچوں اور ضعیفوں کو گزند نہ پہنچائیں، کسی پر زیادتی نہ کریں، دھوکا اور فریب نہ کریں، جزیہ ادا کرنے والوں کی حفاظت کا مکمل انتظام کریں۔ ②

اِن اخلاق وصفات سے آراستہ اسلامی لشکروں نے جہاں بھی قدم رکھا عوام اُن کے گرویدہ ہو گئے۔

اسلام پہلے مسلمان بعد میں:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں نہ صرف حضور ﷺ کی نیابت کا حق ادا کر گئے بلکہ خلافت اور اس کی ذمہ داریوں کے احساس سے متعلق ایک معیار پیش کر گئے۔ آپ نے ارتداد، انکارِ ختم نبوت اور انکارِ زکوٰۃ کے فتنوں کے مواقع پر تاریخ ساز استقامت کا مظاہرہ کر کے خلفاء اور مسلم قائدین کے لیے ایک مثال قائم کر دی کہ خطرات چاہے ہر حد سے متجاوز ہوں مگر عقیدے اور اسلامی احکام میں کوئی ردّ و بدل نہیں کیا جائے گا اور اصولوں پر سودے بازی نہیں کی جائے گی۔

غرض آپ رضی اللہ عنہ نے رہتی دنیا تک ''اسلام پہلے اور مسلمان بعد میں'' کی ایک ایسی روایت رَقم کر دی جس کی وجہ سے آج تک اسلام اپنی صحیح شکل میں زندہ و تابندہ ہے۔

☆☆☆

---

① عصر الخلافۃ الراشدۃ للدکتور اکرم ضیاء عمری، ص ۳۵۳ تا ۳۵۶ ، نیز تاریخ الطبری اور مغازی واقدی میں لشکروں کی ترتیبات کا مطالعہ کریں۔

② مالک عن یحییٰ بن سعید ،ان ابابکر الصدیق بعث جیوشا الی الشام ،فخرج یمشی مع یزید بن ابی سفیان......وفی آخرہ...... :
" انی موصیک بعشر ، لاتقتلن امرأۃ ولا صبیا،ولا کبیراً ھرما،ولاتقطعن شجرا مثمرا،ولاتخربن عامرا،ولاتعقرن شاۃ ولا بعیرا الا لماکلۃ ،ولا تحرقن نخلاً ولاتغرقنہ ،ولا تغلل ،ولا تجبن ." (مؤطا امام مالک،ح:۱۶۲۷ ،کتاب الجہاد،النہی عن قتل النساء،ط مؤسسۃ زاید بن سلطان الامارات)

خلافتِ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

۲۳ جمادی الآخرۃ ۱۳ ھ ...... تا ...... یکم محرم ۲۴ ھ

(634ء تا 644ء)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ قریش کی شاخ بنوعدی سے تعلق رکھتے تھے، آپ کے والد کا نام خطاب بن نُفَیل اور والدہ کا نام حَنتمہ بنت ہاشم تھا۔ والد عدوی تھے اور والدہ مخزومی۔ [1] آپ کی ولادت حربِ فِجار کے چار سال بعد ہوئی۔ [2] حضور ﷺ نے آپ کی کنیت اَبُوحَفص رکھی تھی۔ حفص کا مطلب شیر ہے یعنی آپ شیر جیسے دلیر تھے۔ حضور ﷺ ہی نے آپ کو فاروق کا لقب دیا جس کا معنٰی ہے حق اور باطل کے مابین فرق کرنے والا۔ [3]

اگرچہ آپ رضی اللہ عنہ کے والد خطاب نے آپ کو لڑکپن میں اونٹ چرانے پر لگائے رکھا، مگر اس کے باوجود آپ نے پڑھنا لکھنا سیکھ لیا تھا جو پورے مکہ مکرمہ میں گنے چنے لوگ ہی جانتے تھے۔ آپ نے نوجوانی میں تجارت کا پیشہ اپنایا تھا اور عرب سے باہر کے سفر بھی کیے تھے، اسی لیے آپ کو دنیا کے جغرافیائی، سیاسی، تمدنی اور معاشی واقتصادی معاملات کا اچھا خاصا علم تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں سفارت کا عہدہ آپ رضی اللہ عنہ کے ہی پاس تھا۔

قریش کے لوگ شروع سے آپ کی جرأت، قوتِ ارادی، جنگجوئی، معاملہ فہمی اور عقل وفراست کے معترف تھے۔ آپ انتہائی بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ طبیعت میں غیرت اور جوش کا مادہ بہت تھا۔ جسم نہایت توانا اور قد دراز تھا۔ نوجوانی میں آپ اسلام کے سخت مخالف تھے مگر حضور ﷺ نے آپ کی قابلیت اور خوبیوں کے پیشِ نظر آپ کی ہدایت کے لیے خصوصی دعا کی تھی جو قبول ہوئی۔ [4] حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت کم وبیش اٹھائیس سال کے تھے۔ [5]

اس وقت تک صرف چالیس مرد اسلام لائے تھے۔ مسلمان کھلم کھلا نماز نہیں پڑھ سکتے تھے، مگر آپ نے اسلام قبول کرتے ہی مسلمانوں کو ساتھ لے کر علانیہ طور پر مسجد الحرام میں نماز ادا کی اور کسی کو منع کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ہجرت کے موقع پر جب قریش کی ستم رانیوں کے ڈر سے سب مسلمان چھپ چھپا کر مدینہ جارہے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ باقاعدہ کفار کے جمِ غفیر کو للکار کر مکہ سے نکلے کہ کسی میں جرأت ہے تو میرا راستہ روک کر دکھائے۔ [6] حضور نبی اکرم ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایمانی جرأت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے تھے: ''یقیناً شیطان عمر سے ڈرتا ہے۔'' [7]

---

① شجرۂ نسب یہ ہے: عمر بن الخطاب بن نفیل بن عبدالعزیٰ بن ریاح بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب بن لوئی۔ کعب پر آپ کا نسب حضور ﷺ سے جاملتا ہے۔ کعب کے بیٹے مرہ کی نسل سے حضور ﷺ اور دوسرے بیٹے عدی کی اولاد سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہوئے۔ (تاریخ الاسلام للذھبی: ۲۵۳/۳)

② الاستیعاب: ۱۱۴۵/۳ ③ مرقاۃ المفاتیح لملا علی القاری: ۴۰/۱، ط دار الفکر

④ اللھم اعز الاسلام باحب ھذین الرجلین الیک بابی جھل او بعمر بن الخطاب، وکان احبھما الیہ عمر (سنن الترمذی، ح: ۳۶۸۱)

⑤ آپ سن ۶ نبوی میں اسلام لائے تھے (سبل الھدیٰ والرشاد: ۳۷۰/۲) اور راجح قول کے مطابق آپ نے ۵۸ یا ۵۹ کی عمر پائی تھی۔ (تہذیب التہذیب ۴۴۱/۷) اس لحاظ سے ۶ ہجری میں عمر ۲۸ سال ہی بنے گی۔ اگرچہ قبولِ اسلام میں ۲۶ اور ۳۳ سال کے اقوال بھی ہیں۔ اسی طرح ایک قول کے مطابق شہادت ۶۳ سال کی عمر میں ہوئی تھی مگر یہ خلافِ تحقیق ہے۔

⑥ تاریخ الخلفاء، ص ۹۴

⑦ مسند احمد، ح: ۲۲۹۸۹

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ مَا لَقِیَکَ الشَّیْطَانُ سَالِکًا فَجًّا قَطُّ اِلَّا سَلَکَ فَجًّا غَیْرَ فَجِّکَ

(قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر شیطان تمھیں کسی راہ پر چلتا دیکھ لیتا ہے تو اس راستے سے کترا کر دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔)[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی غیر معمولی سمجھ بوجھ کی وجہ سے حضور ﷺ نے اپنا خصوصی مشیر بنالیا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے نکاح میں تھیں، اس لیے سسر ہونے کے ناتے آپ نبی اکرم ﷺ کے خاندانی امور کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے خانگی معاملات میں آپ کی رائے بہت اہمیت رکھتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے زمانے کے تمام غزوات اور اہم معاملات میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں آپ کی حیثیت خلیفہ کے دستِ راست اور قریب ترین مشیر کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ میں قیادت کے ایسے جوہر پیدا کیے تھے جو اُمت میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوئے۔[2]

حضور ﷺ نے ایک بار فرمایا: لَمْ اَرَ عَبْقَرِیًّا مِنَ النَّاسِ یَفْرِیْ فَرِیَّہٗ

(میں نے خوبیوں سے مالا مال ایسا انسان جوان جیسی کارکردگی دکھا سکے کوئی نہیں دیکھا۔)[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ علم دین، دوراندیشی اور تفقہ میں بلند مقام رکھتے تھے۔ آپ سے منقول احادیثِ مرفوعہ کی تعداد ۵۳۷ ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ پہلے خلیفہ ہیں جنھیں امیر المؤمنین کا لقب ملا۔

آپ رضی اللہ عنہ کی انگوٹھی پر نقش تھا: کَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظًا ''موت نصیحت کے لیے کافی ہے۔''[4]

ریاست مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کے دور میں آپ کو قاضی کی حیثیت حاصل تھی اور آپ اپنے گہرے علم، بصیرت اور فقاہت کے ساتھ نہایت عدل وانصاف کے فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ آپ واحد صحابی تھے جن کی تجاویز اور مشوروں کو کئی بار اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سراہا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جو آپ کے ذہن میں آیا قرآنِ مجید کی آیات اس کے مطابق نازل ہوئیں اسی لیے حضور ﷺ نے آپ کو اپنی اُمت کا وہ خصوصی اور ممتاز فرد شمار کیا جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق بات ڈالی جاتی ہے۔[5] آپ ﷺ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِہٖ

''اللہ تعالیٰ نے عمر کی زبان وقلب کو حق وصداقت کا محور بنا دیا ہے''۔[6]

ایک بار فرمایا: ''لَقَدْ کَانَ فِیْمَا قَبْلَکُمْ مِنَ الْاُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنْ یَکُ اَحَدٌ فِیْ اُمَّتِیْ فَاِنَّہٗ عُمَرُ.''

''تم سے پہلی اُمتوں میں مُحَدَّث ہوا کرتے تھے۔ اگر میری اُمت میں کوئی محدَّث ہے تو وہ عمر ہی ہیں۔''[7]

---

① صحیح البخاری، ح: ۳۲۸۳، کتاب المناقب ؛ صحیح مسلم، ح: ۲۳۵۵، فضائل الصحابۃ، ط دار الجیل

② تاریخ الخلفاء، ص ۹۵ تا ۱۰۱، ط نزار ③ صحیح مسلم، ح: ۲۳۴۷، ۲۳۴۳، فضائل الصحابۃ، فضائل عمر رضی اللہ عنہ، ط دار الجیل

④ الاصابۃ: ۳۰۷/۲ ⑤ الاستیعاب: ۱۱۴۵/۳

⑥ سنن الترمذی، ح: ۳۶۸۲، مناقب عمر رضی اللہ عنہ، اسنادہ صحیح ⑦ صحیح البخاری، ح: ۳۶۸۹، کتاب المناقب، مناقب عمر رضی اللہ عنہ

محدَّث سے مراد وہ انسان ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صحیح بات ڈال دی جاتی ہو اور پھر وہ اسے دوسروں تک پہنچاتا ہو۔ حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس صفت سے نوازے گئے تھے اسی لیے آپ کی رائے کی تائید میں قرآن مجید کی متعدد آیات نازل ہوئیں۔ [1] آپ کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ حدیث کافی ہے:

"لَوْ كَانَ بَعْدِيْ نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّاب" (اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر بن خطاب ہوتے۔) [2]

غرض ان خوبیوں سے آراستہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہوئے تو اسلام کی فتوحات کا دھارا ایک سیلاب بن کر مشرق و مغرب کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔

معرکہ یَرْمُوک اوّل

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت میں پیش آنے والا پہلا بڑا معرکہ یَرمُوک کا تھا، جس نے رومیوں کے مزاحمتی حصار میں دراڑیں ڈال دیں اور ان کے پایۂ تخت حمص تک فتوحات کا راستہ آسان ہوگیا۔

یَرمُوک کا یہ پہلا معرکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے صرف چھ دن بعد پیش آیا تھا۔ اس وقت تک سانحہ وفات کی خبر مسلمانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ [3]

---

① امام سیوطی نے "موافقات عمر رضی اللہ عنہ" کے عنوان سے اس کے نظائر میں ایک پورا باب پیش کیا ہے اور ۲۰ نظائر شمار کیے ہیں۔ (تاریخ الخلفاء، ص ۹۹ تا ۱۰۲)

② سنن الترمذی، ح: ٣٦٨٦، ابواب المناقب، مناقب عمر رضی اللہ عنہ

③ البدایة والنهایة: ۹/ ۵۷۰، دار هجر

ملحوظہ: ❶ بعض حضرات کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات سے کچھ دنوں پہلے پیش آنے والی جنگ اجنادین کے بارے میں شبہ ہوگیا ہے کہ وہ اور جنگ یرموک ایک ہی ہیں کیوں کہ دونوں میں اسلامی لشکر کی تعداد اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت اور رومیوں کی شکستِ فاش جیسی کئی باتیں بالکل یکساں ہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ جنگِ اجنادین الگ ہے اور جنگِ یَرمُوک الگ۔ جنگِ اجنادین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے آخری ایام میں اور جنگ یرموک ان کی وفات کے کچھ دنوں بعد خلافت فاروقی میں لڑی گئی۔ دونوں الگ الگ علاقوں میں الگ الگ اوقات میں لڑی گئیں۔

ملحوظہ ❷ یَرمُوک کے معرکے کی تفاصیل میں چند اہم اختلافات ہیں۔ اسے طبری، ابن اثیر الجزری اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے جمادی الآخرة سنہ ۱۳ ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے فوراً بعد ذکر کیا ہے، جبکہ ابن عساکر، ابن اسحٰق اور خلیفہ بن خیاط رحمہ اللہ اسے رجب سنہ ۱۵ ہجری میں ذکر کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی کئی اختلافات ایسے ہیں جن میں کوئی تطبیق نہیں دی گئی مثلاً بعض روایات میں ہے کہ یہ جنگ اچانک لڑی گئی اور مرکز سے کوئی ہدایت یا کمک نہیں پہنچ سکی جبکہ بعض روایات کے مطابق مرکز سے ہدایات پہنچتی رہیں اور دونوں طرف سے طویل منصوبہ بندی ہوئی۔ کچھ روایات بتاتی ہیں کہ یہ جنگ شام کے سرحدی قلعوں کی فتح کے بعد شروع ہوئی تھی جبکہ بعض روایات کے مطابق یہ دِمشق اور رومیوں کے شامی پایۂ تخت حمص کی فتح کے بھی بعد ہوئی تھی۔ کچھ روایات کہتی ہیں کہ اکابر صحابہ نے جو الگ الگ تھے، اپنے لشکروں کو جمع کر لیا تھا مگر ان کا کوئی ایک امیر دربارِ خلافت سے طے نہ تھا اس لیے انہوں نے خود خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو امیر مان لیا اور انہی کی قیادت میں جنگ لڑی گئی جبکہ بعض روایات میں ہے کہ ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو دربارِ خلافت سے امیر مقرر کر دیا گیا تھا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ ان کے تابع تھے۔ غرض اس معرکے کی روایات کی جزئیات کے اختلافات سے قطع نظر کرکے بھی یہ کچھ اہم ترین اختلافات ہیں جو بہرحال تحقیق طلب ہیں۔ قدیم مؤرخین چونکہ صرف روایات جمع کرتے تھے۔ متن کی تحقیق اور تطبیق پر توجہ دینا ان کا ہدف نہ تھا، اس لیے یہ مسئلہ آج تک لاینحل ہی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے الفاروق میں ۱۵ ہجری والے قول کو اختیار کر لیا اور اختلافِ روایات کو بالکل نظر انداز کر دیا حالانکہ ضروری تھا کہ اس مسئلے کو حل کیا جاتا۔

جہاں تک راقم نے غور کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یَرمُوک کے میدان میں دو بڑی جنگیں لڑی گئی ہیں اور دونوں کی نوعیت بالکل الگ الگ ہے: ایک جنگ سنہ ۱۳ ہجری میں ہوئی اور دوسری سنہ ۱۵ ہجری میں۔ پہلی جنگ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اور دوسری حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کی قیادت میں لڑی گئی۔ اس طرح روایات کے تمام اختلافات خود بخود رفع ہو جاتے ہیں اور ساری کڑیاں آپس میں مل جاتی ہیں۔ ان صفحات میں اسی نظریے کو بنیاد بنا کر حالات بیان کیے جا رہے ہیں۔

یرموک کے میدان میں شام کے محاذ کے تمام مسلمان جمع ہو گئے تھے، جن کی مجموعی تعداد چھتیس ہزار تھی۔ ان میں حضرت عمرو بن العاص، حضرت یزید بن ابی سفیان اور حضرت شُرَحبیل بن حَسَنہ رضی اللہ عنہم کے پاس سات، سات ہزار سپاہی تھے۔ حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ بھی جو چھ ہزار افراد کے ساتھ شام کی ان شاہراہوں پر تعینات تھے جن سے فی الحال رومیوں کے حملے کا خطرہ تھا، یہیں چلے آئے تھے۔ ان ستائیس ہزار افراد کے ساتھ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے نو ہزار مجاہدین کے مل جانے سے چھتیس ہزار کا لشکر بن گیا تھا۔ دوسری طرف رومی دو لاکھ چالیس ہزار کا لشکرِ جرار لے کر مقابلے پر آ چکے تھے۔ انہوں نے اپنی خیمہ گاہ کو گہری خندقوں کے ذریعے محفوظ بنا لیا تھا۔

اب تک مسلمانوں کے تمام امرائے لشکر اپنے اپنے سپاہیوں کے ساتھ الگ الگ دستوں کی شکل میں تھے اور ان کا خیال یہی تھا کہ اسی طرح اپنی اپنی فوجوں کی امتیازی شکل باقی رکھتے ہوئے لڑیں گے، مگر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی دور رس نگاہوں نے موجودہ صورتحال میں اس ترتیب کے خطرناک عواقب کا اندازہ لگا لیا اور مجلس مشاورت میں صحابہ کرام کو خطاب کر کے کہا:

''رومیوں کے منظم اور متحدہ لشکر کے مقابلے میں اس طرح الگ فوجوں کی شکل برقرار رکھتے ہوئے لڑنا درست نہیں۔ خلیفۃ الرسول حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ہماری یہ ترتیب فقط اس لیے بنائی تھی تا کہ ہم سہولت سے مختلف محاذوں پر برسر پیکار رہیں، اگر انہیں ہماری موجودہ صورتِ حال کا علم ہوتا تو وہ ہمیں ایک فوج کی شکل میں ڈھال دیتے۔ ہماری یہ ترتیب تو دشمن کا کام آسان کر دے گی اور ہمیں سخت ہلاکت میں ڈال دے گی۔''

صحابہ کرام نے پوچھا: ''اچھا، آپ ہی بتایئے کیا، کیا جائے؟''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''ہم ایک فوج بن کر ایک ہی امیر کی کمان میں لڑیں، ہاں قیادت کا موقع سب کو دیا جائے، ایک دن ایک شخص امیر ہو، اگلے دن دوسرا۔ اور اگر آپ حضرات اجازت دیں تو پہلے دن مجھے امیر بننے دیجیے۔''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے یہ درخواست اس لیے کی تھی کہ آپ رومیوں کی جنگی ترتیب کو سمجھ کر اس کا جوابی منصوبہ سوچ چکے تھے۔ سب نے خوشی سے آپ کو قیادت کی اجازت دے دی۔

اگلے دن دونوں لشکر میدان میں نکلے تو رومیوں کی صف بندی اس شان وشوکت کی تھی جو دیکھتا دنگ رہ جاتا، مگر دوسری طرف جب مسلمانوں کی صفوں پر نگاہ جاتی تو آنکھوں پر یقین نہ آتا کہ یہ جزیرۃ العرب کی فوج ہے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عسکری منصوبہ بندی کی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اسلامی فوج کو چھتیس حصوں میں بانٹ کر ان کی علیحدہ علیحدہ صفیں قائم کر دی تھیں۔ اس سے پہلے عربوں کا کوئی لشکر اس نظم وضبط سے میدان میں نہیں اترا تھا۔ درمیان میں سولہ دستے رکھے اور وہاں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ دس دستے دائیں طرف حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت شُرَحبیل بن حَسَنہ رضی اللہ عنہ کی سر کردگی میں اور دس دستے بائیں جانب

حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی کمان میں دیے۔ پھر لشکر کے دلیر اور تجربہ کار افراد کو منتخب کر کے ہر دستے پر الگ الگ افسر مقرر کیے۔ حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ قرآنِ مجید کی آیات سنا سنا کر مسلمانوں کی روح کو گرمائیں۔ حضرت ابوسفیان بن حرب اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کو سیرت واحادیث کے واقعات سنانے کے لیے مقرر کیا تاکہ مسلمانوں کے حوصلے بلند ہوں۔ ①

لڑائی سے پہلے کسی مسلمان کے منہ سے نکل گیا: ''رومی کتنے زیادہ اور ہم کتنے کم!!''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے سنا تو بڑی بے فکری سے بولے:

''نہیں ان رومیوں کے لیے یہ مسلمان بہت زیادہ ہیں اور اتنے مسلمانوں کے لیے یہ رومی بہت کم ہیں۔ جس لشکر کو نصرت الٰہیہ نصیب ہو حقیقت میں وہی زیادہ ہوتا ہے۔ اور جسے یہ نصیب نہ ہو وہ بہرحال کم ثابت ہوتا ہے۔ اللہ کی قسم! اگر آج میرا گھوڑا تندرست ہوتا تو مجھے پروانہ تھی کہ رومی اس سے بھی دو گنے ہو جاتے۔''

جنگ کے نقارے پر چوٹ پڑنے والی تھی کہ ایک عجیب بات ہوئی، رومیوں کا سپہ سالار جارج (جرجہ) گھوڑا دوڑا کر سامنے آیا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے گفتگو کرنا چاہی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بھی آگے بڑھے۔

جارج نے پوچھا: ''خالد! سچ سچ بتاؤ کہ کیا اللہ نے تمہارے نبی پر آسمان سے کوئی تلوار اُتاری تھی جوانہوں نے تمہیں دی ہے، جس کی وجہ سے تم ہر جنگ میں فتح یاب ہوتے ہو۔''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے نفی میں جواب دیا تو جارج نے پوچھا:

''پھر تمہیں اللہ کی تلوار کیوں کہا جاتا ہے؟''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بڑے اطمینان سے کہا:

''دیکھو، ایک زمانے میں، میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلاتا تھا، مگر پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت دی، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا کہ 'تم اللہ کی تلوار ہو، جو اللہ نے کافروں پر سونت رکھی ہے۔' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے نصرتِ الٰہیہ کی دعا بھی فرمائی تھی۔''

جارج جو مبہوت ہو کر یہ باتیں سن رہا تھا، بولا: ''مجھے بتاؤ وہ تمہیں کس بات کی طرف بلاتے تھے؟''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''وہ فرماتے تھے اسلام قبول کر لو، یا جزیہ دو، یا جنگ کے لیے تیار رہو۔''

یہ سن کر جارج نے پوچھا: ''جو اس پیغام کو قبول کر کے تمہارے حلقے میں شامل ہو جائے، اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ بولے: ''وہ ہمارے جیسا اور ہم رتبہ ہوتا ہے بلکہ ایک لحاظ سے افضل ہوتا ہے، کیوں کہ ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے معجزات اور پیش گوئیوں کو دیکھ کر اسلام قبول کیا ہے جبکہ تم اس کے بغیر ہی اسلام لارہے ہو پس تمہارا مقام ہم سے بلند ہوگا۔''

---

① البدایة والنهایة: ۵۳۵/۹، دار هجر

یہ سن کر جارج نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور اُن کے ساتھ اپنی قوم کے خلاف تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا۔ ①

آخر کار لڑائی کا آغاز ہوا اور دونوں طرف کے سپاہی نہایت جوش و خروش سے ایک دوسرے پر پل پڑے۔ دن بھر لڑائی ہوتی رہی۔ اس دوران مدینہ منورہ سے ایک تیز رفتار قاصد آیا اور آتے ہی اطلاع دی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا ہے، ان کی جگہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ امیر المومنین مقرر ہوئے ہیں اور انہوں نے حکم دیا ہے کہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ تمام مسلمانوں کے سپہ سالار ہوں گے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے یہ خبر نہایت ہی تحمل کے ساتھ سنی اور اسے جنگ کے اختتام تک خفیہ رکھنے کا اہتمام کیا، کیوں کہ خلیفہ کی وفات سے مسلمانوں میں بددلی پھیل سکتی تھی اور امیرِ لشکر کی تبدیلی سے پورا نقشۂ جنگ تلپٹ ہو سکتا تھا۔

لڑائی کے دوران ایک موقع ایسا بھی آیا کہ رومی مسلمانوں کو دھکیلتے دھکیلتے ان کی خیمہ گاہ تک جا پہنچے، اس موقع پر حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ نے پکار کر کہا: ''میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کئی بار لڑا ہوں، آج آزمائش کا موقع ہے، اسلام لانے کے بعد آج قربانی دینے کا دن آیا تو کیا میں بھاگ جاؤں گا۔''

پھر گرج کر بولے: ''کون ہے جو موت پر بیعت کر کے میرے ساتھ چلے گا؟''

چار سو مجاہدین ان کے گرد جمع ہو گئے۔ حضرت عکرمہ اور ان کے چچا حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہما (ابوجہل کے بھائی) ان مجاہدین کو لے کر دشمن پر پل پڑے اور انہیں اپنے خیموں سے پیچھے دھکیل دیا۔ اس لڑائی میں حضرت زبیر بن عوام اور ان کے تیرہ سالہ بیٹے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بھی شریک تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''کم عمری کی وجہ سے میں لڑنے والوں میں تو شامل نہ تھا مگر اپنے ابا کے ساتھ میدان میں چلا گیا تھا، میں دیکھتا تھا کہ ابوسفیان بن حرب سمیت قریش کے کئی بوڑھے ایک ٹیلے پر چڑھے مسلمانوں کو غیرت دلا رہے ہیں، جب مسلمان پیچھے ہٹتے تو ان کی آوازیں سن کر پھر قدم جما لیتے۔'' ②

حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور نومسلم جارج بھی بڑی پامردی سے لڑے۔ لڑائی کی شدت کی وجہ سے مسلمانوں نے ظہر اور عصر کی نمازیں اشاروں سے ادا کیں اور جنگ جاری رکھی۔ آخر کار شام کے وقت رومیوں کی ہمت کمزور پڑنے لگی اور وہ پیچھے ہٹنے لگے، تب حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دشمن کے قلبِ لشکر پر ایک زوردار حملہ کر کے ان کے پیادوں اور سواروں کی صفیں اُلٹ دیں۔ رومی بھاگتے ہوئے اپنی خندقوں میں گرنے لگے۔ مسلمانوں نے ان کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔

تیس ہزار رومی میدان میں مارے گئے۔ مسلمانوں کا بھی نقصان ہوا۔ حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ جو جنگ کے دوران مسلمانوں کو حوصلہ دلانے کی ذمہ داری انجام دے رہے تھے، تیر لگنے سے اپنی ایک آنکھ سے محروم ہو گئے۔ جنگ کے آخری مرحلے میں نومسلم جارج نے بہادری سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ عکرمہ رضی اللہ عنہ اور ان کے

① الکامل فی التاریخ: تحت ۱۳ ہجری		② الکامل فی التاریخ: تحت ۱۳ ہجری

بیٹے عمرو کو شدید زخم آئے تھے۔ فتح کے اگلے دن صبح سویرے ان کا دم بھی لبوں پر تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دونوں کے سر اپنی گود میں رکھے اور محبت سے ان کے چہروں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ چند ہی لمحوں بعد باپ بیٹا دونوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی گود میں جان، جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ رضی الله عنهم وارضاهم.[1]

حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ......اسلام کے پہلے سپہ سالارِ اعلیٰ:

جنگ کے آخری دن مخبر نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کی اطلاع پہنچائی۔ انہوں نے فوج کا حوصلہ برقرار رکھنے کے لیے اسے راز میں رکھا۔ اسی شام ہنگامہ کارزار تھا تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے صحابہ کو اس سانحے کی خبر دی اور ساتھ ہی بتایا کہ نئے خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شام کی تمام افواج کا سپہ سالارِ اعظم حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اگلی تمام مہمات میں افسرِ اعلیٰ حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ ہوں گے اور حضرت خالد، حضرت عمرو بن العاص، حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم اور دوسرے سالار اُن کی ہدایات کے تحت چلیں گے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ از خود ایسی کوئی ترتیب طے کر کے نہیں گئے تھے کہ جب افواج ایک جگہ ہوں تو سپہ سالارِ اعلیٰ کون ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ یرموک کی اس پہلی جنگ میں مسلمانوں نے از خود مشورہ کر کے وقتی طور پر مرکزی کمان حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو دی تھی، مگر چونکہ ہر نئی مہم اور ہر نئے معرکے سے پہلے از سرِ نو مرکزی کمانڈر کا انتخاب اُلجھن کا باعث ہوسکتا تھا اس لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے منصبِ خلافت سنبھالتے ہی اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے صحابہ کرام میں سے تجربہ کارترین فرد حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کر دیا۔ رہی یہ بات کہ جب عسکری امور میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سب سے کامیاب ثابت ہو رہے تھے تو انہی کو مستقل طور پر کمانڈر ان چیف کیوں نہ بنایا گیا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مکمل طور پر ایک عسکری شخصیت رکھتے تھے، انہیں سیاسی امور اور ملکی انتظامات کا تجربہ نہیں تھا جبکہ حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ عسکری اور سیاسی دونوں قسم کے معاملات کے ماہر تھے۔ اب چونکہ مہمات کی نوعیت بدل گئی تھی، لشکر کشی کے ساتھ ساتھ مفتوحہ شہروں کے انتظامات کی ذمہ داریاں بھی سامنے آگئی تھیں، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا، جو بالکل درست ثابت ہوا۔

یہاں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اخلاص اور نظم وضبط کی داد دینا پڑتی ہے کہ اپنی بے مثال عسکری قابلیت کے باوجود انہوں نے دربارِ خلافت کے حکم پر بلا تأمل سر جھکا دیا اور حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ کی ماتحتی قبول کرلی۔[2]

اہم وضاحت:

بعض مؤرخین نے سنہ ۱۳ ہجری میں عہدوں کی تشکیلِ نو کے اس حکم نامے کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی سے تعبیر کیا ہے جو درست نہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ سمیت تمام سالاروں کو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت کرنے سے متعلق تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ بدستور اپنی فوج کے سالار تھے۔ ان

[1] الكامل في التاريخ: تحت ۱۳ هجرى　　[2] البداية والنهاية: ۹/ ۵۷۰، دار هجر

کی معزولی کا واقعہ سنہ ۱۷ ہجری کا ہے جو آگے آئے گا۔

چونکہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اللہ کی تلوار کی حیثیت اور مقام سے خوب واقف تھے، اس لیے انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی صلاحیتوں سے بہترین انداز میں فائدہ اُٹھایا اور انہیں اکثر معرکوں میں نمایاں عہدہ دیا۔

دِمشق کی فتح:

یرموک کے معرکے سے فارغ ہو کر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ہدایات کے مطابق اسلامی لشکر کو لے کر آگے بڑھے اور شام کے اہم ترین شہر دِمشق تک جا پہنچے۔ ایک طرف سے خود محاصرہ کیا، دوسری سمت کی ناکہ بندی پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا اور تیسری طرف حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ اس تاریخی شہر کی فصیل بہت مضبوط تھی، مسلمان کئی دنوں تک باہر پڑاؤ ڈالے رہے۔ دونوں طرف سے تیروں اور پتھروں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ہرقل نے دِمشق والوں کی مدد کے لیے شامی پایۂ تخت حمص سے کمک روانہ کی، مگر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے راستے کی ناکہ بندی کرادی تھی، اس لیے دِمشق تک کوئی امداد نہ پہنچ پائی۔

ایک دن شہر والے کوئی جشن منانے میں منہمک تھے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ موقع پا کر چند جانثاروں کے ساتھ کمند کے ذریعے فصیل پر چڑھ گئے اور فصیل کا دروازہ کھول کر فوج کو اندر داخل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ شہر والوں نے یہ صورتحال دیکھی تو فوراً دوسری سمت کا دروازہ کھول کر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے ملے اور صلح کی چند شرائط پیش کردیں، حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی کارروائی سے لاعلم تھے، اسی لیے شرائط قبول کر لیں اور پُر امن طور پر شہر میں داخل ہو گئے، چوک میں پہنچے تو دیکھا کہ دوسری طرف سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ مزاحمت کرنے والے رومیوں کو مارتے کاٹتے چلے آرہے ہیں۔ تب یہ ماجرا کھلا کہ شہر کی ایک سمت بزورِ شمشیر فتح ہوئی ہے اور دوسری مصالحت کے ساتھ۔ صحابہ کرام میں سے بعض نے کہا کہ پہلے حضرت خالد قوت کے بل بوتے پر لڑ بھڑ کر شہر میں داخل ہوئے ہیں، اس لیے ہم شہر والوں کی کسی شرط کے پابند نہیں ہوں گے۔ دوسرے حضرات کا کہنا تھا کہ امیر ابو عبیدہ ہیں، انہوں نے شرائط منظور کر کے شہر میں قدم رکھا ہے، اس لیے مصالحتی شرائط ملحوظ رہیں گی۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ آدھے شہر کا انتظام حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے طے کردہ شرائط کے مطابق ہوگا اور آدھے کو بزورِ شمشیر فتح کیا گیا تصور کیا جائے گا۔[1]

علامہ بلاذری رحمہ اللہ کے بقول دِمشق کا محاصرہ محرم سنہ ۱۴ ہجری میں شروع ہوا تھا اور فتح رجب میں ہوئی تھی۔[2]

دِمشق کی فتح کے بعد حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما اپنی فوج کو لے کر بحیرۂ روم کے ساحلی شہروں کو فتح کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ اسی فوج کے ہراول دستے کے سالار ان کے بھائی حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما تھے، جنہوں نے فتوحات میں اہم کردار ادا کیا۔ "عرقہ" کا شہر انہوں نے بذاتِ خود فتح کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُن کی قیادت کے

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۹/۵۸۵، دار ھجر
[2] فتوح البلدان، ص ۱۲۳، ۱۲۶، ط مکتبۃ الھلال

جوہر کھلے۔ صیدا، جُبَیل اور بیروت بھی اس مہم کے دوران فتح ہوئے۔ ①

فِحل کی جنگ:

دِمشق کی فتح سے رومیوں کو سخت زک پہنچی تھی۔ بدلہ لینے کے لیے انہوں نے بکھری ہوئی فوجیں جمع کیں جن کی تعداد تیس ہزار تھی اور اُردن کے علاقے ''بیسان'' میں کیمپ لگالیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ان کی روک تھام کے لیے پیش قدمی کی اور ان کے سامنے فحل کے میدانی علاقے میں پڑاؤ ڈال دیا۔ رومیوں نے مرعوب ہوکر مذاکرات کی پیش کش کی تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ رومی انہیں بڑے احترام سے اپنے سپہ سالار کے خیمے میں لے گئے؛ جہاں قیمتی قالین بچھے تھے، حضرت مُعاذ رضی اللہ عنہ قالین سے ہٹ کر زمین پر تشریف فرما ہوئے۔ رومیوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا: ''میں اس قالین پر بیٹھنا گوارا نہیں کرتا جو غریبوں کا حق مار کر تیار ہوا ہے۔''

وہ بولے: ''ہم تو آپ کی عزت کرنا چاہتے ہیں۔''

فرمایا: ''جسے تم عزت سمجھتے ہو مجھے اس کی ضرورت نہیں اور اگر زمین پر بیٹھنا غلاموں کا کام ہے تو بلاشبہ میں اللہ کا غلام ہوں۔ اگر تمہیں کچھ کہنا ہے تو کہو ورنہ میں واپس جاتا ہوں۔''

انہوں نے کہا ''ہم وجہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم لوگ حبشہ اور فارس کو چھوڑ کر ہم سے لڑنے کیوں آئے ہو، جبکہ ہماری بادشاہت سب سے بڑی ہے، ہماری افواج کی تعداد آسمان کے ستاروں اور ریت کے ذروں کی طرح ہے۔''

حضرت مُعاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''ہماری آمد کا سبب یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں اپنی سرحدوں سے متصل ممالک سے جہاد کا حکم دیا ہے۔ ہماری پیشکش ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ ہمارے بھائی بن جاؤ گے۔ یہ منظور نہیں تو جزیہ دے کر ہماری حفاظت میں آ جاؤ۔ یہ بھی قبول نہیں تو تلوار سے فیصلہ ہوگا۔ رہی یہ بات کہ تمہارا بادشاہ بڑا اور افواج بکثرت ہیں تو سن لو کہ ہمارا بادشاہ اللہ ہے اور ہمارا حکمران ہم میں سے ایک آدمی ہے جو کسی بات میں بالاتر نہیں۔ اگر وہ قرآن و سنت کو نافذ کرے گا تو عہدے پر برقرار رہے گا ورنہ معزول کر دیا جائے گا۔ بدکاری کرے گا تو اس پر بھی حد جاری ہوگی۔ چوری کرے گا تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ وہ کسی حفاظتی حصار میں نہیں رہتا۔ خود کو ہم سے بڑا نہیں سمجھتا۔''

رومی یہ سن کر حیران رہ گئے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے بات چیت کے لیے اپنا سفیر بھیج دیا۔ وہ اسلامی لشکر گاہ میں پہنچا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اس وقت زمین پر بیٹھے تیروں کو چھانٹ کر دیکھ رہے تھے، سفیر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا کہ سپہ سالار کون ہے۔ کچھ سمجھ نہ آیا، کیوں کہ سب ایک ہی جیسے معلوم ہوتے تھے، آخر تنگ آکر پوچھا:

''تمہارا امیر کہاں ہے؟''

بتایا گیا کہ یہ امیر لشکر ہیں، تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ آخر اس نے اپنی آمد کا مقصد بتاتے ہوئے کہا:

''ہماری حکومت آپ کو فی کس دو، دو اشرفیاں دے گی۔ آپ واپس چلے جائیں۔''

① الکامل فی التاریخ: تحت ۱۳ ھجری

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے صاف انکار کر دیا کیوں کہ ان کا مقصد اللہ کے دین کو غالب کرنا تھا نہ کہ مال گیری۔ ①

آخر کار رومیوں نے مقابلے کے لیے صف بندی کی اور ذوالقعدہ سنہ ۱۴ ہجری (۶۳۵ء) میں فِحل کے میدان میں گھمسان کا رَن پڑا۔ مسلمانوں کے دائیں بازو کی فوج حضرت ابوعبیدہ اور بائیں بازو کی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی کمان میں تھی۔ پیادہ فوج کے امیر حضرت عِیاض بن غَنْم اور گھڑ سواروں کے حضرت ضرار بن اَزْوَر رضی اللہ عنہما تھے۔ ایک سخت ترین جنگ کے بعد یہاں بھی رومیوں کو شکست ہوئی اور مسلمان اس علاقے پر قابض ہو گئے۔ ②

حضرت ابوعبیدہ بن جَرّاح رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو فتح کی اطلاع ارسال کی اور دریافت کیا کہ مقامی لوگوں سے کیا برتاؤ کیا جائے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہدایت بھیجی کہ رعایا کو ذمی قرار دیا جائے اور زمین پہلے کی طرح زمینداروں کے پاس رہنے دی جائے۔

فِحل کی جنگ کے بعد اُرْدُن کے تمام علاقے آسانی سے فتح ہو گئے، ہر جگہ صلح کی شرائط میں یہ طے کر دیا گیا کہ مقامی لوگوں کی جان و مال، گھر، جائیدادیں اور عبادت گاہیں سب محفوظ رہیں گی، صرف مساجد تعمیر کرنے کے لیے مسلمان ضرورت کے مطابق زمین لیا کریں گے۔ ③

بازنطینی پایۂ تخت حِمص کا محاصرہ:

شام میں اب صرف تین بڑے شہر رہ گئے تھے، سب سے پہلے حمص پڑتا تھا جو قیصر کا ایشیائی دار السلطنت تھا، پھر بیت المقدس تھا جو مذہبی لحاظ سے سب سے باعظمت شہر تھا، شمال میں انطاکیہ تھا جہاں قیصر ان دنوں قیام پذیر تھا۔

اسلامی لشکر راستے میں بعلبک کے تاریخی شہر کو فتح کرتا ہوا "حمص" کے سامنے جا رکا۔ یہ سخت سردیوں کے دن تھے مگر مسلمان محاصرے سے نہ اُکتائے۔ سردی کا یہ عالم تھا کہ عام لوگوں کے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے تھے۔ رومیوں میں سے کتنے ہی لوگ تھے جو موزے اور گرم جوتے پہننے کے باوجود چلنے پھرنے کے قابل نہ رہتے تھے، کسی کی انگلیاں جواب دے جاتیں، کسی کے ہاتھ پاؤں۔ مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معمولی لباس اور عام سے جوتوں میں موسم کی سختیاں سہتے رہے اور ان میں سے کسی کو گزند نہ پہنچی۔

جب محاصرہ بہت طویل ہو گیا تو ایک دن صحابہ کرام نے جمع ہو کر نعرۂ تکبیر بلند کیا، اللہ اکبر کی صدا سے فضا گونج اٹھی، ساتھ ہی حمص کی بلند و بالا عمارتوں میں ایسا زلزلہ آیا کہ کئی دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں، شہر والے یہ دیکھ کر کانپ گئے اور فوراً شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ ④

☆☆☆

① فتوح الشام لابی اسماعیل الأزدی، ص ۹۵ تا ۱۰۹، ط کلکتة

② البدایة والنهایة: ۵۸۹/۹

③ فتوح الشام لابی اسماعیل الأزدی، ص ۱۲۲، ۱۲۳

④ البدایة والنهایة: ۶۴۹/۹، دار هجر

یرموک کی دوسری جنگ

فحل، دمشق اور حمص سے شکست کھا کر بھاگنے والے رومی افسران ہرقل کے پاس انطاکیہ میں جمع ہو گئے تھے۔ ①
ہرقل جس نے چند سال پہلے نبی کریم ﷺ کا مکتوب پڑھا تھا، اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی قوم کا ستارہ گردش میں آ چکا ہے اور دینِ احمد ﷺ کے پیروکاروں کا راستہ روکنا ممکن نہیں ہے۔ اس نے ایک بار پھر قوم کے عمائد کو سمجھانے کی کوشش کی اور کہا: ''عربوں سے جنگ اب بے سود ہے۔ تم میری مانو تو اُن سے صلح کر لو۔ اس طرح کم از کم ایشیائے کوچک کے علاقے ہمارے پاس رہ جائیں گے، لیکن اگر تم لڑنے پر بضد ہو تو یاد رکھو، شام پر قبضے کے بعد عرب افواج ایشیائے کوچک کے کوہستان تک ہمارا تعاقب کریں گی۔''

مگر رومی افسران نے ہرقل کے مشورے کو مسترد کرتے ہوئے اصرار کیا کہ بہرحال جنگ جاری رکھی جائے۔ ②
تب ہرقل نے قومی حمیت کے تحت حکم دیا کہ قُسطَنطِینِیّہ، ایشیائے کوچک، الجزیرہ اور آرمینیا سمیت تمام علاقوں سے ہر بالغ شخص کو بھرتی کر کے تازہ افواج فراہم کی جائیں۔ جلد ہی بہت بڑے پیمانے پر رومی افواج انطاکیہ پہنچنے لگیں، رومیوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ گرجوں کے پادری بلکہ تارک الدنیا راہب بھی جو کبھی اپنی خلوت گاہوں سے باہر نہیں نکلے تھے، اس فیصلہ کن جنگ میں شرکت کے لیے نکل پڑے تھے۔ بھرپور تیاری کے بعد اس ٹڈی دل لشکر نے جنوب کا رخ کیا جہاں مسلمان اپنا پرچم لہرا چکے تھے۔ ③

علامہ ازدی نے جن کا بیان شام کے معرکوں کے متعلق سب سے زیادہ معتبر ہے، رومیوں کی تعداد چار لاکھ بیان کی ہے۔ ④ جبکہ دیگر مؤرخین دو لاکھ بتاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیشہ ور رومی فوج دو لاکھ تھی اور باقی نصرانی عرب، رضا کار اور نئے بھرتی کیے جانے والے لوگ تھے۔

سپہ سالارِ اسلام حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ فوج کے ایک حصے کے ساتھ حمص کے فصیل بند شہر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ بہت سے مجاہدین کے اہل وعیال بھی ساتھ تھے کیوں کہ یہاں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اس حال میں رومیوں کے اتنے بڑے اجتماع کی خبر ملی تو اکابر صحابۂ کرام سر جوڑ کر بیٹھ گئے، سپہ سالارِ اعظم حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مسلمانو! دشمن اتنی بڑی تعداد میں آ رہا ہے کہ زمین لرز اُٹھی ہے۔ اب بتاؤ کیا تجویز ہے؟''
حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما نے خواتین اور بچوں کو شہر میں رکھ کر خود کھلے میدان میں لشکر لے جانے کی رائے دی مگر حضرت شُرَحْبِیل بن حَسَنہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

''شہر والے سب عیسائی ہیں، خدشہ ہے کہ ہماری غیر موجودگی میں وہ ہمارے اہل وعیال کو یرغمال بنا لیں۔''

---

① فتوح الشام لابی اسماعیل الأزدی، ص ۱۳۲
② البدایة والنهایة: ۹/۵۴۶
③ فتوح الشام لابی اسماعیل الأزدی، ص ۱۳۳
④ فتوح الشام للأزدی، ص ۱۹۴

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بولے: ''اس کا علاج یہ ہوسکتا ہے کہ ہم شہر والوں کو پہلے باہر نکال دیں۔''
حضرت شُرَحبیل رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یا امیر! یہ کیسے جائز ہوگا؟ ہم انہیں امن دے چکے ہیں، حفاظت کے بدلے ان سے جزیہ لے چکے ہیں۔ ان سے بدعہدی کیسے کرسکتے ہیں۔''
حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے سے رجوع کرتے ہوئے متبادل طریقہ دریافت کیا۔ اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیج کر ان کی کمک کا انتظار کیا جاتا جو فوج کے دوسرے حصے کے ساتھ دِمشق میں قیام پذیر تھے۔ آخر کار طے یہ ہوا کہ مسلمان از خود حمص خالی کر کے دِمشق چلے جائیں۔
فیصلہ ہوتے ہی حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے سرکاری خزانے کے افسر حضرت حبیب بن مَسلَمَہ رضی اللہ عنہ کو طلب کر کے حکم دیا کہ عیسائیوں سے جزیے کی مد میں لیا گیا ایک ایک درہم واپس کردیا جائے؛ کیوں کہ یہ رقم اُن کی حفاظت کے بدلے لی جاتی ہے اور اب ہم ان کی حفاظت کی ذمہ داری ترک کر کے یہاں سے کوچ کر رہے ہیں۔
یہی حکم ان دیگر بستیوں اور شہروں میں بھیج دیا گیا، جنہیں فتح کرنے کے بعد اب مسلمان چھوڑنے پر مجبور تھے۔ شہر والوں کو یہ لاکھوں درہم واپس کرنے کے بعد مسلمانوں نے رختِ سفر باندھا۔
حالت یہ تھی کہ شہر کے لوگ غیر مسلم ہونے کے باوجود اس حسنِ سلوک اور دیانت داری سے متاثر ہو کر اشک بار تھے۔ عیسائی دعا کر رہے تھے: ''خداوند تم کو واپس لائے۔''
اور یہودی کہہ رہے تھے: ''جب تک ہم زندہ ہیں قیصر کو اس شہر میں قبضہ نہیں کرنے دیں گے۔''
حضرت ابوعبیدہ بن جَرّاح رضی اللہ عنہ مسلمانوں کا قافلہ لے کر دِمشق پہنچے، یہاں تمام افسران کو جمع کر کے جنگی حکمت عملی مرتب کی اور پھر اُردن کی طرف کوچ کیا، جہاں یَرمُوک کا میدان تھا اور حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنی فوج کے ساتھ پہلے سے وہیں تعینات تھے، یہاں سارا میدانی علاقہ تھا اور عرب کی سرحد قریب تھی، شکست کی صورت میں مسلمان پیچھے ہٹ کر محفوظ علاقے میں داخل ہوسکتے تھے۔ [1]
حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حمص سے چلتے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رومیوں کی کثرت کی اطلاع اور فوری امداد کی درخواست پر مشتمل عریضہ بھیج دیا تھا مگر جب تک قاصد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا، کوئی بڑی فوج تیار کر کے بھیجنے کا وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے نام حوصلے، صبر اور توکل کی تعلیم پر مبنی ایک مراسلہ تحریر کیا اور ساتھ ہی سعید بن عامر کو فوری طور پر ایک ہزار افراد کے ساتھ شام روانہ کردیا۔ [2]
امیر المومنین نے عام مجاہدین کے لیے ایک خصوصی پیغام بھی اس تاکید کے ساتھ بھیجا کہ اسے لڑائی سے پہلے فوج کی صفوں میں کھڑے ہو کر مجاہدین کو سنا دیا جائے، جس میں آپ نے فرمایا تھا: ''اے مسلمانو! دشمن سے جم کر لڑنا، اُن پر شیر کی طرح حملہ کرنا۔ وہ تمہارے نزدیک چیونٹیوں سے بھی حقیر معلوم ہوں۔ ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف

[1] فتوح الشام للازدی، ص ۱۳۶ تا ۱۳۸
[2] فتوح الشام للازدی، ص ۱۳۸ تا ۱۴۲

سے فتح ونصرت تمہارے قدم چومے گی۔“

یہ کمک اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا پیغام ایک ہی دن ایسے عالم میں محاذ پر پہنچے کہ لڑائی کا آغاز ہونے کو تھا۔ ①

مسلمانوں کی تعداد تیس، پینتیس ہزار سے زیادہ نہ تھی مگر ان میں ایک ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جن میں سے ایک سو بدری حضرات تھے۔ یمنی قبیلے اَزد کے دس ہزار سے زائد بہادر مسلمانوں کی صفوں میں موجود تھے۔ یمن سے قبیلہ حمیر کے سرفروش بھی بڑی تعداد میں آئے۔ لشکرِ اسلام کے دائیں بازو کے امیر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، بائیں کے حضرت قباث بن اشیم رضی اللہ عنہ، پیادوں کے حضرت ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ اور سواروں کے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مقرر تھے۔ سپہ سالارِ اعظم اگرچہ حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ تھے مگر وہ تمام جنگی امور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مشورے سے طے کر رہے تھے، انہی کے مشورے سے صف بندی کی ترتیب طے پائی اور افسران کی تعیناتی ہوئی۔ ②

ابھی باقاعدہ جنگ شروع نہیں ہوئی تھی کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ چنیدہ گھڑسواروں کے دستے کے ساتھ یلغار کرتے ہوئے رومیوں کی خیمہ گاہ تک جا پہنچے، رومی جو یہ تصور کیے بیٹھے تھے کہ مسلمان ان کی ہیبت سے مرعوب ہوکر شاید خود پسپا ہو جائیں گے، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو آتا دیکھ کر ششدر رہ گئے اور فوری طور پر آمادۂ پیکار ہوئے۔ معرکہ انفرادی مقابلوں سے شروع ہوا۔ رومیوں کا ایک دیو پیکر گھڑسوار نکلا۔ ادھر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے اشارے پر حضرت قیس بن ہُبیرہ رضی اللہ عنہ جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ماتحت افسر تھے، تلوار سونت کر سامنے آئے اور حریف کے سنبھلنے سے پہلے ہی ایسا وار کیا کہ تلوار اس کے سر کو خود سمیت کاٹتی ہوئی گردن تک اُتر گئی۔

اس کے بعد عام لڑائی شروع ہوئی، مگر ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا تاہم رومی مسلمانوں سے مرعوب ہو گئے تھے۔ انہوں نے جنگ روک کر مسلمانوں کو ایک بار پھر مال ودولت کا لالچ دے کر جنگ ٹالنے کی تجویز پر غور کیا اور قاصد بھیج کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ اپنا کوئی قابلِ اعتماد سفیر بھیج دیں تاکہ صلح کی بات چیت شروع کی جائے۔ ③

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ رومیوں کے معسکر میں گئے۔ ان کے سپہ سالار باہان نے اپنی قومی شان میں زمین وآسمان کے قلابے ملانے کے بعد کہا: ”اے عرب والو! ہم تمہارے اچھے پڑوسی رہے، تمہارے جو قبیلے بھی ہمارے وطن میں آکر آباد ہوئے، ہم نے ان سے ہمیشہ اچھا برتاؤ کیا۔ ہمیں اُمید تھی کہ اہلِ عرب اس حسنِ سلوک پر ہمارے شکر گزار ہوں گے، مگر اس کے برعکس تم ہم پر دھاوا بول کر ہمیں یہاں سے بے دخل کرنا چاہتے ہو۔ حالانکہ اس کوشش میں اہلِ فارس سمیت دنیا کی کوئی قوم آج تک کامیاب نہیں ہو سکی۔ اور تم تو دنیا کی سب سے پس ماندہ اور جاہل قوم ہو، تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟ بہرحال ہم تمہیں پیش کش کرتے ہیں کہ اگر اب بھی واپس چلے جاؤ تو ہم تمہارے سپہ سالار کو دس ہزار، افسروں کو ہزار، ہزار اور سپاہیوں کو فی کس سو، سو دینار دیں گے۔“

---

① فتوح الشام للأزدی، ص ۱۶۳

② تاریخ الطبری: ۳۹۷/۳؛ فتوح الشام للأزدی، ص ۱۲۵ تا ۱۲۸، ۱۹۵ ③ فتوح الشام للأزدی، ص ۱۷۰ تا ۱۷۲

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے باہان کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے کہا: ''تمہاری طاقت اور شان وشوکت کو ہم خوب جانتے ہیں مگر تم نے عربوں سے جس حسن سلوک کا ذکر کیا ہے وہ عنایت صرف انہیں نصرانی بنانے کے لیے تھی، چنانچہ ان کے کتنے ہی قبیلے عیسائی ہو کر آج تمہاری صفوں میں ہمارے خلاف لڑ رہے ہیں۔ رہی بات ہماری محتاجی، تنگ دستی، جہالت اور بدبختی کی، تو بلا شبہ ہم اس سے بھی گئے گزرے تھے، ہم صحرائی خانہ بدوش تھے، ہمارے طاقتور کمزوروں پر ظلم کرتے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے اور پتھروں کو پوجتے تھے۔ غرض ہم تباہی کی کھائی میں گرنے والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بھیج کر ہمیں ہدایت دی، جنہوں نے ہمیں کفر وشرک سے منع کیا اور بدعقیدہ لوگوں سے جہاد کا حکم دیا اور کہا کہ اس توحید کے پیغام کو دوسروں تک پہنچائیں جو مانے وہ ہمارا بھائی ہے اور جو نہ مانے وہ جزیہ دے ہم اس کے محافظ ہوں گے۔ جو اس سے بھی انکار کرے اس کے لیے تلوار ہے۔''

باہان یہ سن کر سمجھ گیا کہ لڑے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ ①

غرض ایک عارضی وقفے کے بعد پھر جنگ ٹھن گئی۔ اس دن نماز فجر میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے سورۃ الفجر تلاوت کی، جب ﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾ (پس برسایا تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا) پر پہنچے تو مسلمانوں کو محسوس ہوا اللہ کا عذاب رومیوں پر ضرور نازل ہوگا اور فتح اسلام ہی کی ہوگی۔ ②

اب دونوں فریق پوری تیاری کے ساتھ میدان میں نکلے، لڑائی سے ذرا دیر پہلے ایک کڑیل جوان امیر عساکر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور گویا ہوا:

''میں جان دینے کا تہیہ کر چکا ہوں، اگر آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں تو فرمائیے۔''

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ تڑپ اُٹھے اور بولے: ''ہاں، آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے میرا اسلام عرض کرنا اور کہنا یا رسول اللہ! اللہ نے (آپ کی وساطت سے) ہم سے جو وعدے کیے تھے وہ سب پورے ہوئے۔''

اس واقعے کو شاعر مشرق اقبال مرحوم نے یوں بیان کیا ہے۔

صف بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ بند
تھی منتظر حنا کی عروسِ زمینِ شام
اِک نوجوان صورتِ سیماب مضطرب
آ کر ہوا امیرِ عساکر سے ہم کلام
اے بوعبیدہ رخصتِ پیکار دے مجھے
لبریز ہو گیا مرے صبر و سکوں کا جام

---

① فتوح الشام للأزدی، ص ۱۷۷ تا ۱۸۳
② فتوح الشام للأزدی، ص ۱۹۰

جاتا ہوں میں حضورِ رسالت پناہ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام
یہ ذوق و شوق دیکھ کے پرنم ہوئی وہ آنکھ
جس کی نگاہ تھی صفتِ تیغ بے نیام
بولا امیرِ فوج کہ وہ نوجواں ہے تو
پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام
پوری کرے خدائے محمد تری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہِ رسولِ امیں میں تو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پہ کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضور نے

یہی جوان جنگ کی آگ میں سب سے پہلے کودا اور لڑتے لڑتے شہید ہوا۔[1]

آخر رومیوں کا باقاعدہ حملہ شروع ہوا، ان کے تیس ہزار سپاہی زنجیریں ڈال کر لڑنے آئے تھے تاکہ میدان سے بھاگنے نہ پائیں، آگے ہزاروں تیر انداز تھے جو تیروں کی بارش کرتے ہوئے آرہے تھے۔ پھر نیزہ باز تھے جنہوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر دھاوا بولا اور مسلمان دباؤ میں آکر پیچھے ہٹنے لگے، مسلمانوں کے دائیں بازو میں قبیلہ اَزد بڑی پامردی سے ڈٹا رہا، عیسائی پوری طاقت صرف کر کے بھی انہیں پسپا نہ کر سکے۔ البتہ دائیں بازو کے دیگر دستے نصرانی سیلاب کے سامنے جم نہ سکے اور بکھر گئے۔ رومی یلغار کرتے ہوئے مسلمانوں کو اُن کی خیمہ گاہوں تک دھکیل کر لے گئے۔ یہاں مسلم خواتین نے اپنے مردوں کو پسپا ہوتے دیکھا تو خیموں کے بانس اُٹھا کر دوڑیں اور آواز لگائی کہ اگر پیچھے ہٹے تو تمہارے سر توڑ دیں گی۔

مسلمانوں کو غیرت آئی اور وہ واپس لوٹ کر لڑنے لگے۔ مُعاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے گھوڑے سے کود کر صدا لگائی:
''میں پیدل جم کر لڑ سکتا ہوں۔ کوئی اس گھوڑے کا حق ادا کر سکے تو اسے لے لے۔''

[1] البدایة والنهایة: ۹/۵۶۱..... بعض حضرات کا دعویٰ ہے کہ یہ نوجوان حضور ﷺ کے نواسے، زینب رضی اللہ عنہا کے بیٹے علی بن ابی العاص رضی اللہ عنہ تھے۔ مگر کسی روایت سے یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں ایک قول کے مطابق علی بن العاص رضی اللہ عنہ جنگِ یرموک میں شہید ہوئے تھے۔ (جبکہ مشہور قول کے مطابق وہ لڑکپن میں فوت ہو گئے تھے۔ الاصابه، تر: ۵۶۹۴) ان حضرات کی واحد دلیل ابن عساکر کی ایک عبارت ہے جس میں کسی سند کے بغیر صرف اتنا ہے: ذکر بعض اهل العلم بالنسب انه قتل یوم الیرموک (تاریخ دمشق: ۸/۴۳) اس روایت کے بے سند ہونے سے قطعِ نظر کر کے یہ تو کہا جائے گا ایک قول کے مطابق علی بن العاص رضی اللہ عنہ یرموک میں شہید ہوئے۔ مگر یہ کیسے مان لیا جائے کہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے مذکورہ گفتگو انہی کی ہے جبکہ گفتگو کرنے والے نوجوان کا نام کہیں مذکور نہیں۔ یرموک میں ہزاروں مسلمان شہید ہوئے تھے۔ یہ تخصیص آخر کس دلیل سے کی جارہی ہے کہ وہ علی بن العاص رضی اللہ عنہ ہی تھے۔

اُن کے بیٹے حضرت عبدالرحمٰن فوراً بولے: ''یہ حق میں ادا کروں گا۔'' اور گھوڑے پر چڑھ گئے، دونوں باپ بیٹا شیروں کی طرح دشمن سے جا بھڑے۔ اِدھر سے قبیلہ زبید کے سردار حجاج بن عبد یغوث پانچ سو مجاہدین کے ساتھ رومیوں کے راستے میں دیوار بن کر کھڑے ہو گئے اور انہیں پسپا ہونے والے مجاہدین کا تعاقب کرنے سے روک دیا۔

یہ تو دائیں بازو کی حالت تھی، اُدھر مسلمانوں کا بایاں بازو بھی رومیوں کا غیر معمولی دباؤ برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے پیچھے ہٹ کر اپنی خیمہ گاہ تک آ گیا۔ یہاں بھی مسلمان خواتین نے حیرت انگیز دلیری کا ثبوت دیتے ہوئے رومیوں کے مقابلے میں اپنی فوج کے قدم جمائے۔ مسلم افسران میں سے حضرت یزید بن ابی سفیان، حضرت عَمرو بن العاص اور حضرت شُرَحبیل بن حَسَنہ رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام اس طرف تھے اور پہاڑ کی طرح جم کر لڑ رہے تھے۔

حضرت شُرَحبیل بن حَسَنہ رضی اللہ عنہ کے چاروں طرف رومیوں کا مجمع تھا اور وہ یہ آیات پڑھتے ہوئے چٹان کی طرح ڈٹے ہوئے تھے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی جانوں اور مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے۔''

انہوں نے بار بار آواز لگائی: ''اللہ کے ساتھ سودا کرنے والے کہاں ہیں؟''

جس مسلمان نے یہ پکار سنی لوٹ آیا۔ آخر کار پسپا ہوتے ہوئے مسلمان پھر سے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا کہ بلند آواز سے پکار رہے تھے:

''مسلمانو! حور عین کے لیے بن سنور کر آگے بڑھو، اپنے رب کی جنت کی طرف لپکو۔''

حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ بھی اسی طرح مجاہدین کے حوصلے بلند کرتے کرتے اپنے بیٹے حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے جو فوج کے چوتھائی حصے کے کمانڈر تھے، بولے: ''بیٹا! میدان میں ہمارا ایک ایک سپاہی جان کی بازی لگائے ہوئے ہے، تمہارے اوپر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑو۔''

حضرت یزید رضی اللہ عنہ یہ سن کر اور جوش و خروش سے لڑنے لگے۔

بائیں بازو کے سالار حضرت قَباث بن اَشیم رضی اللہ عنہ جنگجوئی میں بے مثال تھے۔ وہ اس شدت سے لڑ رہے تھے کہ تلواریں ٹوٹ ٹوٹ کر گر جاتیں اور نیزے دہرے ہو جاتے۔ وہ بار بار پکارتے: ''کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے نام پر مرنے مارنے کی قسم کھانے والے کو اسلحہ پکڑا دے۔'' لوگ انہیں فوراً ہتھیار دیتے اور وہ پھر دشمن پر جھپٹ پڑتے۔

بائیں بازو میں حضرت حنظلہ بن جُوَیہ رضی اللہ عنہ بھی پامردی سے لڑتے رہے۔ رومیوں کا ایک زرہ پوش پہلوان جو عربوں کا سا لباس پہنے ہوئے تھا، یہ کہتے ہوئے آیا ''اے عرب والو! اپنے دیہاتوں اور یثرب کی طرف لوٹ جاؤ''

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھا تو ٹوٹ پڑے، اس نے بھی حملہ کیا، تلواروں کے وار پر وار ہوئے مگر پلہ برابر رہا۔ آخر حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے اسے بازوؤں میں جکڑ کر گرا لیا، چند لمحوں کی کشتی کے بعد دونوں پھر اُٹھ کھڑے

ہوئے، حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا حریف کی زرہ گردن کے پاس ذرا سی کھلی ہوئی ہے۔ انہوں نے تاک کر وہیں حملہ کیا اور تلوار اپنے ہدف سے پار کر دی۔

اِسلامی لشکر کے قلب کے افسر حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ گھٹنوں کے بل بیٹھے نیزہ سنبھال کر اپنی جگہ جم کر لڑ رہے تھے، دشمن کے دستے حملہ کرتے یہ بھرپور جواب دیتے اور ان کے ہر دستے کے پہلے حملہ آور کو نیزہ بھونک کر موت کے گھاٹ اُتار دیتے۔[1]

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ رومیوں پر اس شدت سے حملہ آور تھے کہ دو بار ان کی صفوں کو چیرتے ہوئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نکل گئے۔ دوسری بار واپسی میں ان کے کندھے پر دو بہت گہرے زخم بھی آئے۔[2]

لڑائی میں گرم جوشی کا یہ عالم تھا کہ کسی کو سروتن کا ہوش نہیں تھا۔ حضرت حُباس بن قیس رضی اللہ عنہ اس قدر جوش وخروش سے لڑ رہے تھے کہ دشمن کی ضرب سے اُن کا پاؤں کٹ کر علیحدہ ہو گیا، مگر انہیں احساس تک نہ ہوا۔ کچھ دیر بعد تکلیف محسوس کی تو اپنا پاؤں ڈھونڈنے لگے۔[3]

اِس دوران حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے گھڑ سواروں کو لے کر دھاوا بولا اور دشمن کے دس ہزار سپاہیوں کو روند ڈالا۔ دن ڈھلنے تک لڑائی عروج پر تھی اور اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ کون جیتے گا کون ہارے گا۔ مگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ سمجھ چکے تھے کہ رومیوں کا دم خم ٹوٹنے والا ہے۔ انہوں نے اپنے گھڑ سواروں کو حوصلہ دِلا کر کہا: ''مسلمانو! رومیوں میں جتنی طاقت تھی وہ دِکھا چکے، پس اب ایک زوردار حملہ کرو۔ اللہ کی قسم! ہمیں ابھی فتح نصیب ہو جائے گی۔''

یہ کہہ کر آپ نے اپنے ایک ہزار بہترین شہ سواروں کو رکاب میں لیا اور رومیوں کی گھڑ سوار فوج پر جو ایک لاکھ کی تعداد میں تھی، ایسا ہولناک حملہ کیا کہ ان کی صفیں اُلٹ پلٹ ہو گئیں۔

اِدھر سے حضرت قیس بن ہُبیرہ رضی اللہ عنہ جو تازہ دم سپاہیوں کے ساتھ بائیں بازو کی پشت پر کھڑے تھے، یکا یک نکلے اور رومیوں کی صفیں چیر کر رکھ دیں۔

اسلامی لشکر کے قلب سے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے ہلہ بولا اور رومیوں کے قلب کو میدان کے آخری سرے تک دھکیلتے چلے گئے۔ رومیوں کے قدم اب ایسے اکھڑے کہ پھر جم نہ سکے۔ مسلمانوں نے تعاقب کرتے ہوئے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ شام تک یَرمُوک کے میدان میں بازنطینی رومی سلطنت کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ ایک لاکھ سے زائد رومی قتل ہوئے تھے۔ مسلمان شہداء کی تعداد تین ہزار کے قریب تھی جن میں حضرت ضِرار بن اَزْوَر اور حضرت ہِشام بن العاص رضی اللہ عنہما جیسے گراں مایہ افراد بھی شامل تھے۔

---

① فتوح الشام للأزدی، ص ۱۰۰ تا ۱۱۷

② صحیح البخاری، ح: ۳۷۲۱، کتاب المناقب، مناقب الزبیر رضی اللہ عنہ ؛ ۳۹۹۵، کتاب المغازی، قتل ابی جَہل

③ فتوح البلدان، ص ۱۳۸، حُباس کو بعض نسخوں میں حُباش بھی لکھا گیا ہے۔ مگر ''حباس'' ہی صحیح ہے۔

ہرقل اس وقت اَنطاکِیَہ میں اپنی قوم کے بارے میں تقدیر کے فیصلے کا منتظر تھا، جونہی اسے شکست فاش کی خبر ملی تو اس نے ایشیا کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا اور قُسطَنطِینِیَہ کے لیے کوچ کرنے کی تیاری شروع کردی۔

شام کی سرحد عبور کر کے وہ رُہا (اڈیسہ) پہنچا، اس نے آخری بار اس سرزمین کو پلٹ کر دیکھا جہاں چند برس پہلے اس نے شہرت وتوقیر کے آسمان کو چھوا تھا۔ مگر اب پانسا بالکل پلٹ چکا تھا۔ عرب کے اسلامی انقلاب نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ اس نے بے ساختہ کہا: ''الوداع اے شام! تجھے آخری سلام!'' اور گھوڑے کو ایڑ لگادی۔ ①

ایران کا محاذ

اِس دوران ایران کے محاذ پر بھی جنگ مسلسل جاری تھی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سنہ ۱۳ ہجری میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم سے ایران میں تعینات آدھی فوج لے کر شام چلے گئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں ایرانی مقبوضات کو سنبھالنے کی کڑی ذمہ داری حضرت مُثَنّٰی بن حارثہ رضی اللہ عنہ پر آپڑی تھی جن کا عسکری مرکز عراقی عربوں کا تاریخی شہر حیرہ تھا۔ اس وقت تختِ ایران پر ''شہریران'' نامی ایک جنگجو ایرانی افسر تخت نشین تھا، جس نے ایرانیوں کے سیاسی بحران سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے سابق کم عمر بادشاہ اَرْدَشیر بن شِیْرَوَیْہِ کو قتل کر کے تخت حاصل کرلیا تھا۔ یہ حکمران اگرچہ ساسانی نسل سے نہیں تھا مگر رومیوں سے جنگوں میں پیش پیش رہنے کی وجہ سے اسے عسکری امور کا زبردست تجربہ تھا۔ ②

چنانچہ جونہی اسے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی نصف فوج محاذ سے چلی گئی ہے، اس نے دس ہزار سپاہی بھیج کر مسلمانوں کو حیرہ سے بے دخل کرنے کی کوشش کی۔ حضرت مُثَنّٰی رضی اللہ عنہ نے فوراً اپنا لشکر مرتب کیا اور آگے بڑھ کر قدیم عراقی شہر بابل کے قریب ایرانی افواج کا سامنا کیا۔ لشکرِ اسلام کے دائیں اور بائیں بازوؤں پر حضرت مُثَنّٰی رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت مُعَنّٰی اور حضرت مسعود تعینات تھے۔ انہوں نے بڑھ چڑھ کر بہادری کا ثبوت دیا۔ آخر کسریٰ کی فوج کو شکست ہوئی اور مسلمان تعاقب کرتے ہوئے ایرانی دارالحکومت مدائن تک پہنچ گئے، مگر چونکہ ان کی فوج کم تھی، اسی لیے حضرت مُثَنّٰی رضی اللہ عنہ نے اس مہم کو ملتوی کر کے دربارِ خلافت میں حاضری کے لیے مدینہ منورہ کی طرف کوچ کیا۔ ③

حضرت مُثَنّٰی بن حارثہ مدینہ میں:

یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آخری ایام تھے۔ حضرت مُثَنّٰی رضی اللہ عنہ نے اس حال میں انہیں عراق کے محاذ کی صورتِ حال تفصیل سے بتائی اور ایرانیوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے مزید فوج بھیجنے کی درخواست کی۔ چونکہ مدینہ طیبہ اور عرب کے ہزاروں بہترین جانثار پہلے ہی شام کے محاذ پر جاچکے تھے، اسی لیے اب نئے محاذ کو بھرتی کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس وقت ایک فیصلہ کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور فرمایا:

---

① فتوح الشام للأزدی، ص ۲۰۲ تا ۲۱۳

② المختصر فی اخبار البشر: ۵۵/۱، ۵۶　③ الکامل فی التاریخ: تحت ۱۳ ھجری

''شاید آج میری زندگی کا آخری دن ہے، اگر آج میں مر جاؤں تو تم شام ہونے کا انتظار کیے بغیر لوگوں کو جہاد پر اُبھار کر مُثنّیٰ کے ساتھ کر دینا۔ میری موت کا صدمہ بھی تمہیں اس دینی فریضے سے نہ روکنے پائے۔''

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اسی شب انتقال فرمائے گئے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اُن کی وصیت کے مطابق اگلے دن لوگوں کو مسجد نبوی میں جمع کر کے ایرانیوں سے جہاد کی ترغیب دینا شروع کی۔ تین دن تک آپ لوگوں کو جہاد پر اُبھارتے رہے۔ آخر بنو ثقیف کے ابو عبید بن مسعود رحمہ اللہ نے اپنے قبیلے کے ساتھ اس مہم کے لیے اپنا نام لکھوانے میں پہل کی، پھر دوسرے لوگ بھی شامل ہو گئے۔ حضرت مُثنّیٰ رضی اللہ عنہ کو ان سے خطاب کا موقع دیا گیا تو وہ بولے:

''بھائیو! کسریٰ کی طاقت سے مرعوب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، ہم ان کی سرسبز وشاداب سرحدیں فتح کر چکے ہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ اس سے آگے کا علاقہ بھی فتح ہو جائے گا۔''

لشکر ترتیب دینے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبید ثقفی رحمہ اللہ ہی کو امیر مقرر کر دیا، حالانکہ وہ تابعی تھے، کسی نے اعتراض کیا کہ صحابہ کی موجودگی میں ایک تابعی کو ان کا امیر کیوں مقرر فرمایا؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''واللہ! میں اس کے سوا کسی کو امیر نہیں بناؤں گا جس نے ندائے جہاد پر سب سے پہلے لبیک کہا ہے۔''

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبید ثقفی رحمہ اللہ کو فوج میں شامل صحابہ سے ہر قدم پر مشورہ کرتے رہنے اور فوج سے اچھا سلوک کرنے کی نصیحت فرما کر رخصت کیا۔[1]

ایرانی مقبوضات میں بغاوت:

دربارِ ایران کا یہ حال تھا کہ ایک حکمران قدم جمانے نہیں پاتا تھا کہ دوسرا اُس کا تختہ الٹ دیتا تھا۔ ان دنوں وہاں ایک اور تبدیلی آ چکی تھی، ایرانی امراء نے اپنے فوجی حکمران شہریران کو جس نے بغاوت کر کے اَرْدشیر بن شیرُوَیہ سے حکومت چھینی تھی، قتل کر دیا اور حکومت کسریٰ پرویز کی بیٹی ''بُوران'' کے سپرد کر دی کیوں کہ شاہی نسل مردوں میں اب کوئی نہ تھا جو حکمرانی کے قابل ہوتا۔ بوران سیاسی امور میں مستعد ثابت ہوئی۔ اس نے ایرانیوں کے سب سے جنگ آزما سردار رُستم کو مسلمانوں سے مقابلے کی ذمہ داری سونپ دی۔ رُستم نے عرب کے سرحدی علاقوں میں زمینداروں اور کاشتکاروں کو ڈرا دھمکا کر انہیں مسلمانوں کے خلاف عام بغاوت پر برانگیختہ کر دیا اور مسلمانوں سے عراق کے بیشتر اضلاع چھین لیے۔ حضرت مُثنّیٰ رضی اللہ عنہ اس دوران دربارِ خلافت میں کمک کی درخواست پیش کر کے واپس آ چکے تھے۔ وہ حیرہ میں تھے کہ عام بغاوتوں کا بھونچال آ گیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ رُستم کا ایک سالار جابان دریائے فُرات کے ساحل کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے اور ایک دوسرا لشکر نرسی نامی سردار کی قیادت میں کسکر کا رُخ کر رہا ہے۔

حضرت مُثنّیٰ رضی اللہ عنہ نے یہ سنتے ہی حیرَہ کو خالی کر دیا اور پیچھے ہٹ کر حضرت ابو عبیدہ ثقفی رحمہ اللہ کی کمان میں آنے والی کمک کا انتظار کرنے لگے۔ آخر ابو عبید رحمہ اللہ کا امدادی لشکر آن پہنچا اور حضرت مُثنّیٰ رضی اللہ عنہ کی فوج کے ساتھ مل کر

[1] الكامل فی التاریخ: تحت ١٣ هجری

"نمارق" کے مقام پر جابان سے نبرد آزما ہوا، یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھیجا ہوا پہلا لشکر تھا جس نے گھمسان کی جنگ کے بعد فتح کا پرچم گاڑ دیا۔ ایرانی سالار جابان شکست کھا کر گرفتار ہوا مگر چونکہ گرفتار کرنے والا مسلمان اُس کی حیثیت کا اندازہ نہ لگا سکا تھا، اسی لیے جابان نے اس کی لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنے بدلے دو جوان غلام دینے کے عوض امان حاصل کر لی، اتنے میں دوسرے مسلمانوں نے اسے پہچان لیا اور پکڑ کر امیر لشکر حضرت ابوعبید ثقفی رحمہ اللہ کے پاس حاضر کر دیا اور بولے: "یہ ایرانیوں کا سردار جابان ہے، اسے قتل کر دینا چاہیے۔"

مگر حضرت ابوعبید ثقفی رحمہ اللہ سارا ماجرا سن چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اتنے بڑے دشمن کو چھوڑ دینا بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے، مگر انہوں نے قانون اور ایفائے عہد کی پاس داری کی بہترین مثال قائم کرتے ہوئے کہا:

"اسے ایک مسلمان پناہ دے چکا ہے اور مسلمان ایک جسم کی طرح ہیں۔ ایک کی زبان کا وعدہ سب کا وعدہ شمار ہوتا ہے۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں کہ اسے قتل کر کے گناہ گار نہ بن جاؤں۔"[1]

اس کے بعد حضرت ابوعبید رحمہ اللہ "کسکر" کی طرف بڑھے اور یہاں صف بندی کرنے والے نرسی کے لشکر کو بھی مار بھگایا۔ رُستم نے اس شکست سے تلملا کر ایک اور نامی گرامی سردار جالینوس کو مسلمانوں سے بدلہ لینے بھیجا مگر حضرت ابوعبید ثقفی رحمہ اللہ نے اسے بھی شکستِ فاش سے دوچار کیا۔ جالینوس بچے کھچے افراد کو لے کر بڑی مشکل سے رُستم کے پاس پہنچا۔

جنگِ جسر:

اب رُستم نے عجم کے نہایت تجربہ کار سپہ سالار بہمن جادویہ کو لڑائی کے لیے منتخب کر کے اسے جوصلہ افزائی کے لیے ساسانی سلطنت کا خاص شاہی پرچم "دِرَفش کاویانی" دیا۔ یہ فوج دریائے فرات کے مشرقی کنارے "قُسّ ناطف" پر اُتری۔ اسلامی لشکر مغربی کنارے "مَرْوَحَہ" پر خیمہ زن تھا۔ یہ شعبان سنہ ۱۳ ہجری کے ایام تھے، جنگ سے پہلی رات سالارِ اسلام حضرت ابوعبید ثقفی رحمہ اللہ کی اہلیہ نے خواب دیکھا کہ ایک شخص آسمان سے شربت کا برتن لیے اُترا اور ابوعبید رحمہ اللہ سمیت کئی مسلمانوں نے وہ شربت پیا۔ حضرت ابوعبید رحمہ اللہ نے خواب سن کر اہلیہ سے کہا:

"ان شاء اللہ تعالیٰ شہادت کی بشارت ہے۔"

لڑائی شروع ہونے سے پہلے ایرانی سالار بہمن نے حضرت ابوعبید رحمہ اللہ کو دعوت دی کہ تم دریا کے پار آ جاؤ یا ہمیں دریا عبور کرنے کا موقع دو۔ جواب میں حضرت ابوعبید رحمہ اللہ نے مسلمانوں کی جرأت ظاہر کرنے کے لیے دریا عبور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے تجربہ کار ساتھیوں نے فیصلے سے اختلاف کیا تو وہ بولے:

"ہم ایرانیوں پر یہ ثابت نہیں ہونے دیں گے کہ ہم موت سے گھبراتے ہیں۔"

آخر دریا پر پل باندھا گیا اور مسلمان پار اتر گئے۔[2] جب جنگ شروع ہوئی تو شروع ہی میں یہ محسوس ہو گیا کہ اتنی بڑی فوجوں کے لیے میدانِ جنگ خاصا تنگ ہے۔ مسلمان ذرا بھی پیچھے ہٹتے تو دریا کی لہروں کی نذر ہو جاتے۔

[1] الكامل في التاريخ: تحت ١٣ هجرى
[2] عربی میں پل کو جسر کہا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے یہ جنگ حرب الجسر کہلائی۔

شدت کی لڑائی کے دوران ایرانیوں نے اپنے جنگی ہاتھی مسلمانوں کی گھڑسوار فوج کے سامنے کھڑے کر دیے۔ عربی گھوڑوں نے ہاتھیوں کو پہلے نہیں دیکھا تھا، وہ اُن سے خوفزدہ ہو گئے، جب بھی مسلمان گھڑسوار حملہ کرنے کی کوشش کرتے اُن کے گھوڑے ساتھ نہ دیتے، جب ایرانی اپنے ہاتھیوں کے ساتھ پیش قدمی کرتے تو مسلمانوں کے گھوڑے بدک کر اِدھر اُدھر بھاگتے اور صفیں درہم برہم ہو جاتیں۔ اس کے ساتھ ایرانی تیر اندازی کر رہے تھے، جن سے مسلمانوں کو شدید نقصان ہو رہا تھا۔ یہ تشویش ناک حالت دیکھ کر امیر لشکر حضرت ابوعبید ثقفی رحمہ اللہ اپنے گھوڑے سے کود پڑے اور تلوار سونت کر ہاتھیوں کی طرف لپکے، ان کے ساتھ اور بھی بہت سے مسلمان اس طرح آگے بڑھے اور ہاتھیوں پر حملہ آور ہوئے، ہاتھی کسی کو قریب نہیں آنے دے رہے تھے۔ حضرت ابوعبید رحمہ اللہ نے بلند آواز سے پکار کر کہا:

''ہاتھیوں کے شکم چاک کر دو اوران کے ہودج الٹ دو۔''

اب مسلمان جان ہتھیلی پر رکھ کر ہاتھیوں پر پل پڑے۔ کئی ہاتھی مار گرائے اور ان کے سواروں کو ڈھیر کر دیا۔ حضرت ابوعبید ثقفی رحمہ اللہ خود سفید ہاتھی سے نبرد آزما تھے، جو سب سے بڑا اور سخت جان تھا، آخر حضرت ابوعبید رحمہ اللہ نے اس پر تلوار کا زوردار وار کیا۔ ہاتھی وار سہہ کر جھکا اور حضرت ابوعبید رحمہ اللہ کو اپنی سونڈ میں لپیٹ کر گرا دیا اور پھر ان پر اپنا پہاڑ جیسا پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ حضرت ابوعبید رحمہ اللہ کا جسم کچلا گیا اور وہ موقعے پر شہید ہو گئے۔

یہ منظر دیکھ کر مسلمان گھبرا گئے، اِدھر حضرت ابوعبید رحمہ اللہ سے گرنے والا پرچم اسلام بنی ثقیف کے ایک دوسرے جانباز نے سنبھال لیا، ساتھ ہی ہاتھی پر حملہ کر کے اسے حضرت ابوعبید رحمہ اللہ کی لاش سے ہٹا دیا، ہاتھی نے لاش سے ہٹتے ہی اس دوسرے جانباز پر حملہ کر دیا اور اُسے بھی کچل ڈالا۔ اس طرح یکے بعد دیگرے بنو ثقیف کے سات افراد ایک دوسرے سے پرچم لے کر ہاتھیوں پر حملے کرتے رہے اور شہید ہوتے گئے۔ ①

ان مٹھی بھر جانبازوں کے سوا اکثر مسلمان پسپا ہو رہے تھے، یہ کیفیت دیکھ کر بنو ثقیف کے ایک رضا کار نے دریا پر بندھا عارضی پل توڑ دیا تا کہ مسلمان فرار کا خیال دل سے نکال دیں۔ اب مسلمانوں کے پاس پیچھے ہٹنے کی جگہ بھی نہ بچی اور ایرانی انہیں دھکیل کر دریا میں گرانے لگے، ہزاروں مسلمان اسی طرح زخمی اور شہید ہوئے۔

اس نازک وقت میں حضرت مُثَنّٰی بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے جو خود بھی زخمی ہو چکے تھے، غیر معمولی استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو حوصلہ دلایا۔ وہ کچھ مجاہدین کے ساتھ ایرانیوں کے سامنے جم کر کھڑے ہو گئے اور فوری طور پر پل دوبارہ بندھوانے کا انتظام کرایا۔ اس کے بعد فوج کو مخاطب کر کے کہا:

''میں تمہاری حفاظت کے لیے سینہ تانے کھڑا ہوں۔ تم بلاخوف وخطر اطمینان سے دریا پار کرو۔''

---

① الكامل في التاريخ: تحت ۱۳ هجری

افسوس کہ ابوعبید ثقفی جیسے مردِ مجاہد اور شہیدِ اسلام کا بیٹا مختار ثقفی اُمّت کا شریر ترین فرد ثابت ہوا، حتیٰ جھوٹا مدعی نبوت بنا۔ یہ حقائق بتاتے ہیں کہ بعض اوقات بہترین شخصیات کی اولاد بھی بدترین ہو سکتی ہے اور خود خیر القرون بھی شریر افراد سے یکسر خالی نہ تھا۔ پس بعض لوگوں کا قرنِ اوّل کے مشہور و معروف بڑے افراد کو نیک وصالح قرار دینے کے لیے یہ کہنا کہ ''صالحین کی آل اولاد اور وہ بھی خیر القرون میں، بھلا بری کیسے ہو سکتی تھی؟'' کوئی معقول دلیل نہیں۔

یوں اُن کی ثابت قدمی سے باقی مسلمانوں کو سنبھلنے اور بچ نکلنے کا موقع مل گیا۔ حضرت مُثَنّٰی رضی اللہ عنہ تین ہزار باقی ماندہ مسلمانوں کو لے کر واپس پلٹے۔ نو ہزار کے لشکر میں سے چار ہزار دشمن کی تلواروں اور دریا کی لہروں کی نذر ہو گئے تھے، جبکہ دو ہزار افراتفری کے عالم میں فرار ہو چکے تھے۔ اگرچہ جنگ میں چھ ہزار ایرانی بھی مارے گئے تھے، مگر انجام کار انہیں فتح ہوئی تھی۔ مسلمانوں کو دورِ نبوت سے اب تک اتنی بڑی شکست کا کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع ملی تو نہایت غمگین ہوئے اور کہا:

"اللہ ابوعبید پر رحم فرمائے۔ کاش وہ پسپا ہو کر میرے پاس چلے آتے تو مجھے اپنا پشت پناہ پاتے۔"[1]

جِسر کا بدلہ، معرکہ بُوَیب:

ایک میدان میں فتح یاب ہو کر ایرانیوں کی ہمت بہت بڑھ گئی تھی، جبکہ مسلمان حیرت اور ندامت کی ملی جلی کیفیت میں مبتلا تھے۔ اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے ایرانیوں سے ایک بھرپور معرکہ ناگزیر تھا جسے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک لمحہ بھی نظر انداز نہ کیا۔ انہوں نے دعوتِ جہاد دے کر تازہ دم رضا کاروں کو حضرت مُثَنّٰی رضی اللہ عنہ کی کمک پر بھیجنا شروع کیا۔ بنو بَجِیلَہ کے سردار جَرِیر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی اپنے مجاہدین کے ساتھ عراق کے محاذ پر پہنچ گئے۔ حضرت مُثَنّٰی رضی اللہ عنہ نے اپنے قبیلے سے بھی نئے نوجوان بھرتی کر لیے، اس طرح مسلمانوں کی عسکری حالت مستحکم ہو گئی۔

ایرانی سپہ سالارِ اعظم رُستم نے مسلمانوں کی ان تیاریوں سے آگاہ ہوتے ہی مِہران کو ایک ٹڈی دَل لشکر دے کر بھیج دیا۔ رمضان المبارک سنہ ۱۴ ہجری میں دریائے فُرات کے کنارے "بُوَیب" کے مقام پر دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ حضرت مُثَنّٰی بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے دریا عبور کرنے کی غلطی نہیں کی بلکہ مخالف فوج کو پار آجانے کی دعوت دی۔ ایرانی گزشتہ فتح کے نشے میں مسلمانوں کو کسی خاطر میں نہیں لا رہے تھے، اسی لیے بے خوف وخطر دریا عبور کر کے اس طرف آگئے۔ مسلمانوں نے پیچھے ہٹ کر ان کے لیے کھلا میدان چھوڑ دیا اور صفیں باندھ لیں۔ حضرت مُثَنّٰی رضی اللہ عنہ کے ایک بھائی حضرت مُعَنّٰی گھڑ سواروں کی اور دوسرے بھائی حضرت مسعود پیادہ فوج کی قیادت کر رہے تھے۔ حضرت مُثَنّٰی بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے مجاہدین کی صفوں میں گشت کرتے ہوئے انہیں ہمت دلائی اور آخر میں اعلان کیا:

"میں تین تکبیریں کہوں گا۔ تم تیار ہو جانا۔ چوتھی تکبیر کہوں تو ایک ساتھ حملہ کر دینا۔"

اس دوران ایرانی سامنے سے صفیں باندھے بڑھے چلے آرہے تھے۔ ان کی تین صفیں تھیں، جن میں سے ہر ایک میں گھڑ سوار اور پیادوں کے علاوہ جنگی ہاتھی بھی تھے۔ ساتھ ہی نقاروں اور نفیریوں کی آوازیں اتنی بلند تھیں کہ کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ حضرت مُثَنّٰی رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کو سمجھاتے ہوئے کہا:

"یہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو، بزدلی کی دلیل ہے۔ تم نظم وضبط کے ساتھ خاموش کھڑے رہو۔"

کچھ دیر گزری تو حضرت مُثَنّٰی رضی اللہ عنہ نے یکے بعد دیگرے تین تکبیریں کہیں۔ مسلمان ہتھیار سنبھال کر تیار ہو گئے۔

[1] الکامل فی التاریخ: تحت ۱۳ ہجری

ابھی چوتھی تکبیر کی آواز بلند نہیں ہوئی تھی کہ بنو عجل کے چند گھڑ سوار صف سے آگے نکل کر دشمن کی طرف لپکنے لگے۔ حضرت مُثنّٰی نے افسوس کی شدت سے اپنی داڑھی کو مٹھی میں دبالیا اور چلائے:

''اللہ کے لیے آج اسلام کو رسوامت کرو۔'' گھڑ سوار اپنی غلطی کو محسوس کر کے فوراً پلٹ آئے۔

اس کے بعد امیر لشکر کی ہدایت کے مطابق منظم حملہ شروع ہوا۔ حضرت مُثنّٰی رضی اللہ عنہ قلب کی قیادت کرتے ہوئے حریف کے قلب پر حملہ آور ہوئے اور اسے دھکیلتے ہوئے دائیں بازو تک لے گئے، یہاں دونوں فوجیں ایسی گتھم گتھا ہوئیں کہ کسی کو سر پیر کا ہوش نہ رہا۔ اس شدت کی لڑائی میں ایرانی سپہ سالار مہران مارا گیا، جس سے ایرانیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ اِدھر مسلمانوں کے دائیں اور بائیں بازو ایرانی فوج کے دونوں پہلوؤں کو پسپا کرتے ہوئے میدان کے آخری کنارے تک لے گئے۔ ایرانیوں کے لیے اب دریا عبور کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، مگر اتنی دیر میں حضرت مُثنّٰی رضی اللہ عنہ نے خود اپنے کچھ جانبازوں کے ساتھ پل تک پہنچ کر دشمن کی راہِ فرار مسدود کر دی۔

ایرانی افراتفری کے عالم میں دائیں بائیں بھاگے اور مسلمان ان کا تعاقب کرتے رہے جو نہ صرف ساری رات بلکہ اگلے دن بھی جاری رہا۔ اس فتح نے جس میں ایرانیوں کے ایک لاکھ سپاہی مارے گئے، ایک بار پھر سرزمین عجم میں عربوں کے پاؤں جما دیے۔ مقتول ایرانیوں کی ہڈیاں ایک مدت تک نمونہ عبرت بنی رہیں۔ اس لڑائی میں حضرت مُثنّٰی بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بھائی مسعود شہید ہو گئے تھے۔ حضرت مُثنّٰی رضی اللہ عنہ نے اُن کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور فرمایا:

''یہ سوچ کر میرا غم ہلکا ہو گیا ہے کہ میرا بھائی میدان میں جم کر لڑا اور شکست نہیں کھائی۔''[1]

یزد گرد، آخری کسریٰ:

بُویب کی شکست نے ایرانیوں کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ عورتوں کی حکومت کے تحت وہ عربوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، ایرانی دربار میں یہ بحث چلی کہ مسلمانوں سے ٹکر لینے کے لیے کسریٰ کی اولاد میں سے کسی مرد کی تخت نشینی ضروری ہے۔ چنانچہ درباریوں نے ملکہ ''بُوران دُخت'' کو معزول کر دیا اور خاصی تلاش کے بعد ساسانی خاندان کے ایک اکیس سالہ نوجوان یزدگرد کو اپنا بادشاہ مقرر کر کے اس کی قیادت میں مسلمانوں سے لڑنے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ یہی یزدگرد آخری کسریٰ ثابت ہوا۔[2]

اب رُستم کو ایک بار پھر مسلمانوں کے سیل رواں کے آگے بند باندھنے کی مہم سونپی گئی اور ساتھ ہی دھمکی دی گئی کہ اگر ناکام رہے تو قتل کر دیے جاؤ گے۔ رُستم نے بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں شروع کیں اور ساتھ ہی دور دراز کے دیہاتوں اور بستیوں کو ایک بار پھر مسلمانوں کے خلاف مشتعل کر دیا، یزدگرد کی تخت نشینی سے پست حوصلہ عجمیوں کی اُمنگیں پھر جوان ہو گئیں اور انہوں نے بغاوت کر کے مسلمانوں کو تمام مفتوحہ اضلاع سے نکال دیا۔ یہ ذوالقعدہ سنہ ۱۳ ہجری کا واقعہ ہے۔

---

[1] الکامل فی التاریخ: تحت ۱۳ ھجری [2] الاخبار الطوال، ص ۱۱۹

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ تشویش ناک خبریں ملیں تو فوراً حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ کو پیچھے ہٹ کر عرب کی سرحدوں پر ٹھہرنے کی تاکید کی۔ ساتھ ہی نئے سرے سے افواج کی تیاری شروع کی اور فرمایا: ''اللہ کی قسم میں عجم کے شہزادوں کے مقابلے میں اب عرب کے شہزادوں کو لاکھڑ کروں گا۔'' اب آپ نے قاصد بھیج کر عرب کے تمام بلند مرتبہ رئیسوں، عالی نسب قبائلی سرداروں، نامور بہادروں، بہترین شاعروں اور شعلہ نوا خطیبوں کو جہاد کے لیے اُبھارا اور انہیں مدینہ منورہ آنے کی دعوت دی۔ حج کے ایام قریب تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خود حج کے لیے تشریف لے گئے، اس دوران آپ کی طرف سے عرب کے تمام گوشوں میں جہاد کی تیاری کا پیغام پہنچ چکا تھا۔[1]

آپ رضی اللہ عنہ حج سے واپس آئے تو مدینہ میں ہزاروں رضا کار آچکے تھے، مگر فوج کی تیاری کے علاوہ اس کی قیادت کے حوالے سے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سر پر بہت کٹھن ذمہ داری آن پڑی تھی۔ عراق کے سپہ سالار حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ جنگِ جسر کے زخموں سے اب تک شفایاب نہیں ہوئے تھے بلکہ دن بدن ان کی تکلیف بڑھتی چلی جارہی تھی۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح، حضرت خالد بن ولید اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم جیسے سارے تجربہ کار جرنیل شام میں مصروف پیکار تھے۔ ان میں سے کسی کو واپس بلانے کی گنجائش نہیں تھی۔ اِدھر ایرانیوں کی غیر معمولی عسکری تیاریوں کی اطلاعات سے اندازہ ہورہا تھا کہ اب جو معرکہ ہوگا اس پر دونوں قوتوں کی مکمل فتح یا شکست کا دارومدار ہوگا۔ آخر بہت غور وفکر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود میدانِ جنگ میں قیادت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ آپ کو یقین تھا کہ اس طرح مسلمانوں کے حوصلوں کو نئی جلا ملے گی اور ایران کے محاذ پر وہ ڈٹ کر لڑیں گے۔

آپ نے محرم سنہ ۱۵ ہجری میں لشکر ترتیب دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود فوج کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے چند منازل دور تک پہنچے۔ یہ دیکھ کر ہر طرف ایک ولولہ پیدا ہوگیا اور سب نے سر پر کفن باندھ لیے۔ آپ نے مدینہ طیبہ سے تین میل (پونے پانچ کلو میٹر) دور 'صرار' نامی چشمے پر پڑاؤ ڈالا اور یہاں اکابر صحابہ کرام کی مجلس مشاورت میں فوج کی کمان خود سنبھالتے ہوئے عراق کے محاذ پر جانے کا عزم ظاہر فرما کر اس بارے میں ان کی رائے طلب کی۔ کئی حضرات نے اثبات میں ہی رائے دی مگر حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کسی پس وپیش کے بغیر اس کی مخالفت کی اور فرمایا:

''امیر المؤمنین! خدانخواستہ اگر آپ کو شکست ہوگئی تو تمام محاذوں پر ہمارے قدم اُکھڑ جائیں گے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہیں اور کسی قابل شخص کو فوج کی کمان دے کر بھیج دیں۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس بات کی معقولیت کو محسوس کرتے ہوئے خود محاذ پر جانے کا ارادہ منسوخ کردیا اور ساتھ ہی پوچھا: ''پھر فوج کی کمان کسے دی جائے؟''

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بولے: ''شیر ببر سعد بن ابی وقاص کو۔''

[1] الکامل فی التاریخ: تحت ۱۳ ھجری

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو فوج کی کمان دے دی اور انہیں رخصت کرتے ہوئے بڑے بڑے اہتمام سے یہ نصیحتیں فرمائیں:

''اے سعد! تمہیں یہ بات خود پسندی میں مبتلا نہ کرے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں اور اُن کے صحابی کہلاتے ہو۔ اللہ تعالیٰ برائی کو برائی کے ذریعے نہیں، نیکی کے ذریعے معاف کرتا ہے۔ اللہ کا کسی سے کوئی رشتہ ناتا نہیں، اس سے تعلق صرف اطاعت اور فرمانبرداری سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ہٹ کر انسان چاہے اونچے مرتبے کا ہو یا عام طبقے کا، اللہ کے نزدیک سب برابر ہیں۔ ہمیشہ اُس طرزِ حیات کو سامنے رکھنا جس پر تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا۔ یہی ہماری بنیاد ہے۔

تم بڑے صبر آزما حالات سے گزرنے والے ہو، پس صبر کا دامن تھامے رکھنا۔ اس سے اللہ کا تعلق پیدا ہوگا۔ یاد رکھنا، اللہ کا تعلق دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے، دوسرا گناہوں سے بچنے سے۔ اللہ کی اطاعت، آخرت کی محبت اور دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے وجود میں آتی ہے اور گناہ دنیا کی حرص اور آخرت سے بے پروائی کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔

لوگوں میں پسندیدہ بننے کو مت ٹھکرانا۔ انبیائے کرام علیہم السلام نے بھی اسی کی دعائیں کی ہیں، کیوں کہ جب اللہ کسی بندے کو اپنا محبوب بناتا ہے تو لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دیتا ہے اور جب کسی بندے سے نفرت کرتا ہے تو لوگوں کے نزدیک اسے قابل نفرت بنا دیتا ہے، لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنا مقام جاننے کے لیے یہ دیکھتے رہو کہ لوگ تمہارے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔''[1]

حضرت مُثنّیٰ رضی اللہ عنہ کی وفات:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس چار ہزار کے لشکر کو دعاؤں کے ساتھ اس طرح رخصت کیا کہ پل پل کی اطلاعات ملنے اور قدم قدم پر احکام بھیجنے کا انتظام کیا جا چکا تھا۔ حضرت سعد ابی وقاص رضی اللہ عنہ عراق کی سرحدوں پر ''دریائے زرود'' تک پہنچے تھے کہ عراقی محاذ کے سپہ سالار حضرت مُثنّیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی اطلاع ملی۔

حضرت مُثنّیٰ رضی اللہ عنہ بلاشبہ عراق و فارس کے جہاد کے بانی تھے، اس وقت جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مرتدین اور منکرین ختم نبوت کی سرکوبی میں مصروف تھے، حضرت مُثنّیٰ رضی اللہ عنہ نے محض اپنے بل بوتے پر عرب کی حدود عبور کر کے کسریٰ کے علاقے میں چھاپہ مار کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ بعد میں وہ خود دربارِ خلافت میں آئے اور باقاعدہ جنگ کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منظوری اور امدادی فوج لے کر گئے۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منکرینِ ختم نبوت کا مسئلہ ختم ہوتے ہی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو بھی ان کی امداد کے لیے روانہ کر دیا تھا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے شام جانے کے بعد سے اب تک حضرت مُثنّیٰ رضی اللہ عنہ نے تنہا عراق کا محاذ سنبھالا ہوا تھا۔[2]

---

[1] البداية والنهاية: ۹/۶۱۳، ۶۱۴، دار هجر ؛ العبر للذهبي: سن ۱۵ هجری

[2] اسد الغابة، ترجمة: مثنى بن حارثة رضي الله عنه

ان کی وفات کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ عراق کے تمام سالاروں کے عمومی قائد قرار پائے۔ ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ عراق کے محاذ پر مجاہدین کے تازہ دم دستے مسلسل روانہ کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پرچم تلے جمع ہونے والے مجاہدین کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ گئی۔ ان میں تین سو سے زائد صحابہ کرام تھے جن میں سے ستر سے زائد حضرات وہ تھے جو جنگ بدر میں شریک رہ چکے تھے۔ صحابہ کرام کے سات سو نوجوان لڑکے بھی اس محاذ پر پہنچے ہوئے تھے۔ شام کے محاذ سے حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کمک لے کر آچکے تھے۔ ①

اس دوران حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا پیغام آن پہنچا کہ آگے بڑھ کر قادِسیّہ کے مقام پر خیمے لگاؤ اور اس طرح صف بندی کرو کہ سامنے عراق کا میدان اور پیچھے عرب کے چٹیل پہاڑ ہوں تاکہ فتح نصیب ہو تو آگے بڑھتے چلے جاؤ اور اگر پسپائی ہو تو عرب کے ان پہاڑوں میں مورچہ بندی کر سکو، جن سے اہلِ عجم ناواقف ہیں۔

اِسلام کے سفیر دربارِ ایران میں:

قادِسیّہ پہنچ کر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے نعمان بن مُقرّن، عاصم بن عُمر و اور مغیرۃ بن شُعبہ رضی اللہ عنہم کو عرب کے شرفاء کی ایک جماعت کے ساتھ ایرانیوں کے پایہ تخت مدائن روانہ کر دیا تاکہ کسریٰ یزدگرد کو اسلام کی دعوت دے کر اس قوم پر اتمام حجت کر دیا جائے۔

جب یہ حضرات مدائن پہنچے تو انہیں دیکھنے کے لیے مقامی لوگوں کا ایک جمِ غفیر اکٹھا ہو گیا، اسلام کے ان جانبازوں کے جسموں پر سادہ چادریں اور پیروں میں معمولی چپل تھے۔ ہاتھوں میں چابک تھامے وہ دبلے پتلے گھوڑوں پر سوار تھے، جن کی زوردار ٹاپوں سے فضا گونج رہی تھی۔ ایرانی حیران تھے کہ یہ معمولی قسم کے لوگ اتنے بڑے بڑے لشکروں کو کیسے تہ و بالا کرتے آرہے ہیں۔

وفد یزدگرد کے دربار میں پہنچا جو بڑے ناز و نخرے کے ساتھ تیوری چڑھائے اُن کا منتظر تھا۔ اس نے پہلے مسلمانوں کے لباس اور وضع قطع کی ہنسی اُڑاتے ہوئے ایک ایک چیز کا نام یوں پوچھا جیسے ایران کے عشرت کدے میں ایسی معمولی اور گھٹیا چیزوں کا وجود ہی نہ ہو، پھر طنزیہ لہجے میں گویا ہوا: ''تم یہاں کیوں آئے ہو؟ کیا ہمارے باہمی انتشار کو دیکھ کر تمہیں غلط فہمی ہوگئی ہے کہ ہم کمزور ہوگئے ہیں؟ اس لیے اتنی جرأت کر رہے ہو؟''

وفد کے سربراہ حضرت نعمان بن مُقرّن رضی اللہ عنہ نے جواب میں بڑی متانت اور خوش اسلوبی کے ساتھ اسے اسلام کی دعوت دی، آخر میں یہ بھی وضاحت کر دی کہ اسلام کی تعلیم سمجھ نہ آئی ہو تو جزیہ دے کر مسلمانوں کی ماتحتی قبول کی جا سکتی ہے۔ ورنہ پھر جنگ کے بغیر چارہ نہ ہوگا۔

یزدگرد نے ان کی دعوت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: ''میرے علم کے مطابق تم سے زیادہ بد بخت، تم سے بڑھ کر کمزور اور تم سے زیادہ منتشر قوم کوئی اور نہیں۔ ہم جب بھی تمہیں سیدھا کرنا چاہتے تھے تو سرحد کے کسی حاکم کو کہہ دیتے

① البدایة والنهایة: ۹/۶۲۵، ۶۳۰

تھے، وہ تمہاری گوشمالی کر دیا کرتا تھا۔ تم سلطنت فارس سے کبھی ٹکر نہیں لے سکتے۔ اس کے مقابلے میں سر اُٹھانے کا سوچنا بھی مت، اگر تمہاری تعداد کچھ بڑھ گئی ہے تو اس سے خوش فہمی میں مبتلا نہ ہونا۔ ہاں، اگر تمہیں غربت اور بھوک نے ہمارے علاقوں کا رخ کرنے پر مجبور کیا ہے تو بتاؤ ہم تمہاری غذا کا بھی بندوبست کیے دیتے ہیں اور کپڑے کا بھی۔ ہم تمہارے ممتاز لوگوں کا اکرام کریں گے اور انہیں کپڑے جوڑے بھی دیں گے۔ ہم تمہاری ہی مرضی کا کوئی رحم دل حاکم بھی تم پر مقرر کر دیں گے۔ بولو کیا خیال ہے؟''

یزدگرد کی اس طنزیہ تقریر کو سن کر حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور درباری تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر بڑی جرأت سے بولے:

''بادشاہ سلامت! یہ میرے ساتھ آنے والے تمام حضرات عرب کے شریف ترین لوگ ہیں، اس لیے شرافت کا خیال رکھتے ہیں۔ آپ مجھ سے بات کریں۔ میں ہر بات کا جواب دوں گا۔ آپ نے ہمارے جو حالات بتائے ہیں، وہ ہماری سابقہ پستی کا پورا منظر بیان نہیں کرتے۔ آپ نے ہماری بدحالی کا ذکر کیا ہے۔ ہاں، واقعی ہم سے زیادہ بدحال کوئی اور نہ تھا۔ ہم جیسا بھوکا کوئی اور نہ تھا۔ ہم کیڑے مکوڑے، سانپ اور بچھو تک کھا جاتے تھے۔ کھلی زمین ہمارا مکان تھی۔ ہم اُونٹ اور بکریوں کے بالوں سے بنے کپڑے پہنتے تھے، ایک دوسرے کو قتل کرنا اور ظلم کرنا ہمارا وطیرہ تھا۔ ہمارے بعض لوگ بیٹی کو کھانا کھلانے کے ڈر سے زندہ قبر میں دفن کر دیا کرتے تھے۔ ہماری یہی حالت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ایک مشہور و معروف انسان کو نبی بنا کر بھیجا۔ جو حسب و نسب، گھرانے، قبیلے اور شہر کے علاوہ اپنی ذاتی خوبیوں میں بھی ہم سب سے بہتر، سب سے سچے اور رحم دل تھے۔ انہوں نے ہمیں اسلام کی دعوت دی، مگر وہ سچ کہتے رہے اور ہم انہیں جھٹلاتے رہے۔ ان کے ساتھی بڑھتے گئے اور ہم گھٹتے گئے، آخر اللہ نے ہمارے دل میں اُن کی سچائی کا یقین ڈال دیا۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ وہ جو دین لے کر آئے وہ حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جو اس دین کو مانے اسے اپنے جیسے حقوق اور ذمہ داریاں دو، جو نہ مانے مگر جزیہ دے اسے اپنی حفاظت میں لے لو اور جو اس سے انکار کرے، اس سے جنگ کرو۔ تو بادشاہ سلامت! اب آپ چاہیں تو جزیہ دیں، چاہیں تو جنگ کریں۔ چاہیں تو مسلمان ہو کر خود کو محفوظ رکھیے۔''

یزدگرد یہ سن کر تلملا اُٹھا اور بولا: ''تمہیں مجھ سے ایسی باتیں کرنے کی ہمت کیسے ہوئی؟''

حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ بے ساختہ بولے:

''آپ ہی نے مجھ سے ویسی باتیں کی تھیں، اس لیے میں نے آپ سے ایسی باتیں کیں۔ اگر وہ باتیں کوئی اور کرتا تو میں بھی یہ باتیں آپ سے نہ کرتا۔''

یزدگرد غصے سے لال پیلا ہو گیا اور چلایا:
"اگر سفیروں کو قتل کرنا جائز ہوتا تو میں تمہیں زندہ نہ چھوڑتا۔ جاؤ اپنے سپہ سالار سے کہہ دو کہ میں رُستم کو تمہارے مقابلے کے لیے بھیج رہا ہوں۔ وہ تم سب کو قادِسیّہ کی خندق میں دفن کر دے گا، تمہیں عبرت کا نشان بنا دے گا۔"
اس کے بعد اپنے درباریوں کو حکم دیا کہ مٹی کا ایک ٹوکرا لاؤ اور ان کے سب سے معزز آدمی کے سر پر لاد کر انہیں یہاں سے نکال دو۔ جب مٹی کا ٹوکرا لایا گیا تو صحابہ کے وفد میں سے حضرت عاصم بن عَمرو رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر کہا:
"ان میں سے سب بڑا میں ہوں۔"
جونہی مٹی کا ٹوکرا ان کے سر پر لادا گیا، وہ تیزی سے باہر نکلے اور ٹوکرا اپنے گھوڑے پر رکھ کر اسے ایڑ لگا دی۔
اُدھر رُستم کو جب مسلمان سفیروں سے یزدگرد کے اس سلوک کا علم ہوا تو وہ بڑا جھلایا اور بولا:
"خدا کی قسم، وہ ہماری زمین کی چابیاں لے گئے۔"
پھر اپنے ماتحتوں سے گویا ہوا: "اگر ہم یہ مٹی راستے میں روک سکے تو سمجھو ہمارا ملک بچ گیا۔ لیکن اگر ان کے سپہ سالار تک یہ مٹی پہنچ گئی تو پھر ہمارا ملک ان کے قبضے میں جا کر رہے گا۔"
یہ کہہ کر اس نے آدمی دوڑائے کہ کسی طرح مسلمانوں کے وفد کو قادِسیّہ پہنچنے سے پہلے روک لیا جائے اور مٹی کا ٹوکرا بازیاب کرا لیا جائے، مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ حضرت عاصم بن عَمرو رضی اللہ عنہ منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے قادِسیّہ پہنچ گئے اور مٹی کا ٹوکرا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سامنے رکھ کر سارا ماجرا سنا ڈالا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ خوش ہو کر بولے: "اللہ کی قسم! اللہ نے ہمیں اس مٹی کی شکل میں سلطنت ایران کی چابیاں دے دی ہیں۔"
رُستم کو پتا چلا کہ وفد ہاتھ سے نکل گیا ہے تو اسے یقین ہو گیا کہ اب ایران کا آفتاب زوال پذیر ہو کر رہے گا۔[1]

رُستم کے دربار میں:

قادِسیّہ کے فوجی پڑاؤ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہدایات پر مشتمل مراسلے مسلسل آ رہے تھے۔ اپنے ایک مراسلے میں انہوں نے مسلمانوں کو دشمنوں کی تعداد اور وسائل سے مرعوب نہ ہونے اور کثرت سے "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ" کا ورد کرنے کی نصیحت بھی کی۔
حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایک ماہ تک قادِسیّہ میں ٹھہرے رہے۔ اس دوران شاہِ ایران یزدگرد نے اپنے پایۂ تخت مدائن سے رُستم کی قیادت میں ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں کا لشکرِ جرار روانہ کر دیا تھا، جسے مزید اسی ہزار قبائلی جنگجوؤں کی کمک بھی حاصل تھی۔ رُستم مسلمانوں کے خلاف جنگ میں کامیابی کے بارے میں زیادہ پراُمید نہیں تھا، اس لیے وہ بادلِ نخواستہ فوج لے کر نکلا تھا، کوچ کے دوران بھی لڑائی کو ٹالنے کے لیے اس نے رفتار بہت کم رکھی۔ جگہ جگہ قیام کرتے ہوئے آخر وہ "ساباط" میں خیمہ زن ہوا۔

[1] البداية والنهاية: ۹/۶۲۵ تا ۶۲۹، دار هجر

اس لشکر کا ہراول دستہ چالیس ہزار جنگ آزما جوانوں پر مشتمل تھا، جس کی قیادت جالینوس کررہا تھا۔ دائیں بازو میں تیس ہزار سپاہی تھے جن کی کمان ہُرمُزان کے ہاتھ میں تھی، جو نہایت شاطر افسر تھا۔ بائیں بازو کے تیس ہزار سپاہیوں کا افسر مہران تھا، جسے مسلمانوں سے لڑنے کا اچھی طرح تجربہ تھا۔ تینتیس جنگی ہاتھی ان کے علاوہ تھے جو مسلمانوں کو روندنے کے لیے تیار کیے گئے تھے۔

ان تمام تیاریوں کے باوجود رُستم کی کوشش تھی کہ جنگ کی نوبت نہ آئے، چنانچہ اس نے مذاکرات کی طرف رجحان ظاہر کرتے ہوئے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کوئی نمایندہ طلب کیا۔ انہوں نے حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا۔ رُستم نے کہا: ''تم لوگ ہمارے پڑوسی ہو، ہم نے تم سے ہمیشہ اچھا سلوک کیا ہے، تمہیں تکالیف سے بچایا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ واپس چلے جاؤ۔ ہم تمہیں تجارت سے منع نہیں کرتے۔''

حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

''ہمارا ہدف دنیا ہے ہی نہیں، ہم تو آخرت کے طلب گار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف اپنا سچا رسول بھیج کر ہمیں اصل دین دیا ہے، جو اس پر عمل کرے گا، کامیاب ہوگا، جو اسے ترک کرے گا، ذلیل وخوار ہوگا۔''

رُستم نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے اسلام کا تعارف چاہا تو حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ نے مختصراً اسلام کی تعلیمات اور خوبیاں بیان کردیں۔ رُستم ہر بات پر کہتا رہا: ''یہ بہت اچھی چیز ہے۔''

آخر میں اس نے پوچھا: ''اگر ہم یہ دین قبول کرلیں تو تم کیا سلوک کروگے؟''

فرمایا: ''ہم تمہارے ملک کے پاس بھی نہ پھٹکیں گے۔''

رُستم نے مسرت ظاہر کی اور انہیں رخصت کرنے کے بعد اپنے سرداروں کے سامنے اسلام قبول کرکے اپنی سلطنت بچانے کی تجویز رکھی مگر سب بپھر گئے اور اصرار کرنے لگے کہ مسلمانوں کو طاقت کی زبان ہی میں جواب دیا جائے۔

رُستم پھر بھی لڑائی میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ اس نے ایک بار پھر مسلمانوں کے نمایندے کو طلب کیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے حضرت رِبعی بن عامر رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا۔ اس بار رُستم نے بڑا شاندار دربار لگا کر مسلمانوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی کہ شاید اس طرح حریف پر کچھ نفسیاتی دباؤ پڑ جائے، مگر دربار کی تمام سج دھج اور رنگینیوں کا حضرت رِبعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے ذرا بھی اثر نہیں لیا بلکہ اپنی بے نیازی ظاہر کرنے کے لیے وہ گھوڑے سمیت ان کے قالینوں کو روندتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور گھوڑے کو ایک بھاری بھرکم گاؤ تکیے کے ساتھ باندھ دیا۔

ایرانی پہرے داروں نے ان کا اسلحہ اُتارنا چاہا تو بولے:

''میں تمہاری درخواست پر آیا ہوں۔ اگر ایسے ہی اندر جانے دوگے تو ٹھیک ورنہ میں واپس جارہا ہوں۔''

پہرے دار گنگ رہ گئے اور یہ اپنے نیزے کی اَنی قالینوں پر ٹیکتے ہوئے اس طرح آگے بڑھے کہ رُستم کے خیمے

کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بچھا ہوا قیمتی قالین پھٹتا چلا گیا۔

رستم اس بے باکانہ رویے سے خود مرعوب ہو چکا تھا۔ پوچھنے لگا: ”یہ بتاؤ، تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟“

حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر مسلمانوں کی آمد کا مقصد جن فصیح و بلیغ الفاظ میں بیان فرمایا وہ تاریخ کے صفحات پر اَن مٹ نقوش بن کر جگمگا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

”اَللّٰهُ ابْتَعَثَنَا لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ اِلٰى عِبَادَةِ اللّٰهِ وَمِنْ ضِيقِ الدُّنْيَا اِلٰى سَعَتِهَا وَمِنْ جُوْرِ الْاَدْيَانِ اِلٰى عَدْلِ الْاِسْلَامِ“

”ہمیں اللہ نے بھیجا ہے تاکہ جن کو وہ چاہے، انہیں بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں، دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی خوشحالی میں اور دیگر مذاہب کے جور و ستم سے نکال کر اسلامی عدل کے دائرے میں لے آئے۔“

رستم نے ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کا یہ خطاب سن کر ایک بار پھر غور و فکر کے لیے مہلت مانگی۔ [1]

تیسری بار مسلمانوں کی طرف سے حضرت حذیفہ بن محصن رضی اللہ عنہ گفت و شنید کے لیے گئے مگر کچھ بات نہ بنی۔ آخر میں ایک بار پھر حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کو حتمی گفتگو کے لیے بھیجا گیا۔ وہ رستم کے دربار میں داخل ہوئے اور بڑی بے تکلفی سے سیدھے اس کے تخت پر ساتھ ہی جا بیٹھے۔

درباری بھنا کر شور مچانے لگے تو حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”اس سے میرا مقام بلند ہوا، نہ تمہارے آقا کی عزت کو بٹہ لگا۔“

اس وقت تک رستم سمجھ چکا تھا کہ جنگ ٹل نہیں سکتی اس لیے اس نے مسلمانوں کے نمایندے کو مرعوب کرنے کی پوری کوشش کی۔ رستم نے متکبرانہ لہجے میں عربوں کی تحقیر کرتے ہوئے کہا:

”تم لوگ اُس مکھی کی طرح ہو جو دوسروں کے سہارے شہد کے برتن تک پہنچے اور پھر اس میں گر کر اس طرح پھنسے کہ نکلنے کے لیے بھی دوسروں کی منت سماجت کرے۔ تم اس لاغر اور لالچی لومڑی کی طرح ہو جو ایک سوراخ سے انگور کے باغ میں گھسے اور کھا کھا کر اتنی موٹی ہو جائے کہ باہر نہ نکل سکے اور باغبان کے ہاتھوں ماری جائے۔“

اس کے الفاظ سے اس نخوت کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے جو عجمیوں کی رگ رگ میں سرایت کر چکی تھی۔ یہی وہ روگ تھا جو انہیں حق بات کو قبول کرنے سے روک رہا تھا۔

حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ اس کی لن ترانیاں سنتے رہے اور جونہی وہ چپ ہوا، جواب بالمثل کے طور پر مزے سے بولے:

”بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہمیں ہدایت بھی عطا کی اور رزق بھی۔ اس رزق کا ایک حصہ تمہاری سرزمین میں ہے۔ جب سے ہم نے اس کے کچھ دانے اپنے اہل و عیال کو کھلائے ہیں، وہ اصرار کر رہے ہیں کہ اس ملک کو جلد فتح کرو تاکہ ہم یہ پیداوار ہمیشہ کھاتے رہیں۔“

[1] البداية والنهاية: ٩/٦٢٢، دار هجر

رُستم یہ سن کر آپے سے باہر ہو گیا اور چیخا: ''اچھا تو پھر ہم تمہیں قتل ہی کر کے دم لیں گے۔''

حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ اطمینان سے بولے:

''ہم قتل بھی ہوئے تو جنت میں داخل ہوں گے، تم قتل ہو کر جہنم میں جھونکے جاؤ گے۔''

رُستم نے غصے کو دباتے اور ایک بار پھر سخاوت جھاڑتے ہوئے کہا: ''تمہیں ایک خلعت عطا کی جاتی ہے اور تمہارے سپہ سالار کو ایک ہزار اشرفیاں پوشاک اور گھوڑے سمیت۔ بس اب تم لوگ واپس چلے جاؤ۔''

حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ نے جوابی طنز کرتے ہوئے کہا:

''واہ! تمہاری سلطنت کو شکست دینے اور تمہاری شان کو ملیامیٹ کرنے کے بعد ہم اتنی آسانی سے کیسے چلے جائیں؟ اب تو بس اتنی کسر رہ گئی ہے کہ کل تم ناک رگڑ کر ہماری نوکری پر مجبور ہو جاؤ۔''

رُستم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ دھاڑ کر بولا:

''قسم ہے آفتاب کی! کل میں تم سب کو موت کے گھاٹ اُتار دوں گا۔''

''جو ہونا ہے وہ تمہیں کل پتا چل جائے گا۔''

حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ نے بے باکی سے کہا اور واپس چلے آئے۔[1]

☆☆☆

---

[1] البداية والنهاية: ٩/٦٢٣، ٦٢٤، دار هجر

جنگِ قادِسیّہ

اسی دن رُستم نے فوج کو کوچ کا حکم دیا۔ دہری زرہ اور چمکتا خود پہن کر وہ ایک ہی جست میں اپنے برق رفتار گھوڑے پر بیٹھا اور چلایا: ''کل میں عربوں کو مٹا کر رکھ دوں گا۔'' ایک افسر نے کہا: ''اگر خدا نے چاہا تو۔''
رُستم نے ڈپٹ کر کہا ''خدا نہ چاہے تب بھی۔''

وہ ایک لاکھ بیس ہزار سپاہ کے ساتھ ساباط کی چھاؤنی سے نکلا، مسلمان دریائے فُرات کے مغرب میں خیمہ زن تھے، رُستم نے یہاں پہنچ کر کشتیوں کا عارضی پل بنانے کی بجائے لکڑی، مٹی اور پتھروں کی بھرائی کر کے راتوں رات ایک مضبوط راستہ تیار کرایا۔ صبح ہوتے ہی اس نے دریا عبور کر کے ساحل کے ساتھ صف بندی کر لی۔ تیس ہزار چنیدہ ایرانی سور ماؤں نے زنجیریں پہن کر صفیں بنائی تھیں تا کہ نہ تو کوئی ان کی صفوں کو توڑ سکے، نہ وہ خود پیٹھ پھیر کر بھاگ سکیں۔ اٹھارہ جنگی ہاتھی لشکر کی درمیانی صفوں میں اور پندرہ دونوں پہلوؤں کے آگے کھڑے تھے، ان کے ہودجوں میں انتہائی ماہر تیر انداز بیٹھے تھے۔ رُستم اپنے لشکر کے پیچھے دریا کے کنارے ایک شاندار تخت پر براجمان ہو کر فوج کا معاینہ کر رہا تھا۔ شاہِ ایران یزدگرد نے جنگ کی صورتِ حال سے لحہ بہ لحہ آگاہ رہنے کے لیے قادِسیّہ سے اپنے شہر مدائن تک جگہ جگہ نقیب مقرر کر دیے تھے جو پیغام کو ایک دوسرے سے سن کر با آوازِ بلند آگے نقل کرتے جا رہے تھے، یوں رُستم کی بات یزدگرد تک اور اس کی رُستم تک آناً فاناً پہنچ رہی تھی۔

اِدھر مسلمان اپنی صف بندی کر رہے تھے۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ لشکر کے امیر سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے جسم پر پھوڑے نکل آئے تھے، وہ اتنی تکلیف میں تھے کہ بیٹھ سکتے تھے نہ ہی کھڑے ہو سکتے تھے۔ وہ اپنے لشکر کے پیچھے ایک کھنڈر نما عمارت کی چھت پر سینے کے نیچے تکیہ لگا کر اس طرح اوندھے منہ لیٹ گئے تھے کہ سارا میدانِ جنگ ان کے سامنے تھا۔ یہ شوال سنہ ۱۵ ہجری کے دن تھے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بیماری کے باوجود فوج سے خطاب کیا اور انہیں حوصلہ دلاتے ہوئے فرمایا: ''مسلمانو! اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ﴾[1]

(ہم نے نصیحت کی بات کے بعد زبور میں بھی یہ بات لکھ دی کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔)

لوگو! یہ زمین تمہاری میراث ہے، یہ اللہ کا تم سے کیا گیا وعدہ ہے۔ اگر تم دنیا کے حریص نہ بنو اور آخرت کے طلبگار رہو تو اللہ دنیا بھی تمہیں دے گا اور آخرت بھی۔ اور اگر تم نے بزدلی اور کمزوری دکھائی تو تمہارا رعب داب جاتا رہے گا اور تمہاری آخرت بھی برباد ہو جائے گی۔''

① سورة الأنبياء، آيت: ۱۰۵

لشکر کے دیگر سالار بھی اپنے اپنے سرفروشوں کے سامنے تقریریں کر کے ان کی ہمت اور جذبے کو اُبھار رہے تھے۔
چونکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بیماری کا اکثر سپاہیوں کو علم نہ تھا، اس لیے انہیں لشکر کے پیچھے عمارت میں دیکھ کر بعض لوگوں نے اعتراض کیا اور اسے تن آسانی پر محمول کرنے لگے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو سامنے آکر اپنے جسم کے پھوڑے دکھائے، تاکہ کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔

آپ نے حضرت خالد بن عُرفُطہ غِفاری رضی اللہ عنہ کو میدان میں اپنا نائب مقرر کیا کہ ماتحت سپہ سالاران کی آواز پر لبیک کہیں گے۔ ابو مِحجَن ثقفی رضی اللہ عنہ نے خالد بن عُرفُطہ رضی اللہ عنہ کی تقرری سے اتفاق نہ کیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے تنبیہ کے طور پر انہیں اس عمارت میں قید کر دیا جس کی چھت پر ان کی نشست تھی۔[1] حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ترتیب یہ بنائی کہ پرچوں پر ہدایات لکھ لکھ کر نیچے خالد بن عُرفُطہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کرتے جاتے اور وہ یہ پیغامات سالارانِ لشکر تک پہنچاتے جاتے۔[2]

یوم اَرماث:

ظہر کے وقت تک دونوں لشکر اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔[3]

امیر لشکر کے حکم سے صفوں میں جگہ جگہ سورۃ الانفال کی تلاوت کی جاتی رہی۔ مسلمانوں نے صف بندی کی حالت ہی میں نماز ظہر ادا کی۔ آخر حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کی پہلی تکبیر گونجی اور سب سمجھ گئے کہ اب حملہ شروع ہوا چاہتا ہے۔ دوسری تکبیر بلند ہوئی اور سب نے ہتھیار سنبھال لیے۔ تیسری تکبیر سن کر اسلامی لشکر نے بھی ''اللہ اکبر'' کا فلک شگاف نعرہ لگایا۔ ساتھ ہی تیر اندازوں نے تیر برسائے اور گھڑسوار نیزے تان کر آگے بڑھے۔ چند لمحوں بعد چوتھی تکبیر گونجی تو ترتیب کے مطابق پورے اسلامی لشکر نے یک بارگی حریف پر دھاوا بول دیا۔[4]

لڑائی میں ایرانی شہزادہ ہُرمُز تاج پہنے حضرت غالب بن عبداللہ اسدی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں آیا اور گرفتار ہو گیا۔ ایک اور فارسی افسر قیمتی کنگن اور جڑاؤ کمر بند پہنے للکارتا ہوا سامنے آیا تو حضرت عَمرو بن مَعدِی کَرِب رضی اللہ عنہ اس کی طرف لپکے اسے زمین پر پٹخ کر خنجر سے ذبح کر دیا۔[5] اب گھمسان کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ محل کی چھت سے برابر فوج کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ان کی بے خوفی کا یہ عالم تھا کہ محل کے دروازے کھلے تھے اور کوئی پہرہ نہیں تھا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑتا تو ایرانی سیدھے محل میں گھس کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر سکتے تھے، مگر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اس خطرے کی کوئی پروا نہ تھی۔[6]

عربوں کے قبیلے بنوبَجیلہ کے گھڑسوار بڑی پامردی سے لڑ رہے تھے، ایرانیوں نے سترہ ہاتھیوں کا ریلا لے کر ان کی

---

[1] المنتظم لابن جوزی: ۱۷۰/۴، ۱۷۱ ...... ابو محجن کو قید کرنے کی وجہ ان کے کچھ اشعار بھی تھے۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔
[2] المنتظم لابن جوزی: ۱۷۰/۴
[3] الکامل فی التاریخ: ۳۰۲/۲ ط دارالکتاب العربی
[4] المنتظم لابن جوزی: ۱۷۲/۴
[5] الکامل فی التاریخ: ۳۰۲/۲
[6] البدایۃ والنہایۃ: ۶۳۲/۹، دار ہجر

طرف یلغار کی۔ گھوڑے ہاتھیوں کو دیکھ کر بدک گئے اور بنو بجیلہ کی صف بندی ٹوٹنے لگی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ منظر دیکھا فوراً بنو اسد کے دستے کو ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ اب ہاتھیوں کا غول بنو اسد کی طرف پلٹ پڑا اور انہیں روندنے لگا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بے چین ہو کر حضرت عاصم بن عمرو رضی اللہ عنہ سے کہا: ''ان ہاتھیوں سے نجات کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟'' وہ بولے: ''کیوں نہیں۔'' یہ کہہ کر اپنے قبیلے کے بہترین تیراندازوں کو لے کر آگے بڑھے اور تیروں کی اتنی شدید بوچھاڑ کی کہ کوئی فیل بان زخمی ہوئے بغیر نہ رہا۔ بنو تمیم کے بہادروں نے ہاتھیوں کے ہودج الٹ دیے اور انہیں توڑ پھوڑ دیا۔ فیل بان نیچے گر کر واپس دوڑے اور یوں اس کالی آندھی کا رخ پھر گیا۔ ①

اس پہلے دن کی جنگ کو تاریخ میں ''یوم الارماث'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یوم اَغواث:

پہلے دن کی لڑائی میں مسلمانوں کے خاصے افراد شہید اور زخمی ہوئے تھے، شہداء کی تدفین اور زخمیوں کے علاج معالجے کے انتظامات کے بعد اگلے دن مسلمان پھر صف بستہ ہوئے، ابھی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی کہ اچانک حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت ہشام رضی اللہ عنہ پانچ ہزار کے امدادی دستے کے ساتھ آن پہنچے۔ وہ شام کے محاذ پر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت رومیوں سے برسرِ پیکار تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوعبیدہ کو حکم بھیجا تھا کہ عراق کے محاذ سے جو مسلمان خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہمراہ کمک کے لیے شام بھیجے گئے تھے، انہیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے واپس عراق بھیج دیا جائے، چنانچہ یہ فوج دوبارہ ادھر آگئی جس سے مسلمانوں کی ہمتیں بلند ہو گئیں۔

اس فوج کے آنے کی ترتیب یہ رکھی گئی کہ دس دس سپاہی تکبیریں بلند کرتے تھوڑی تھوڑی دیر بعد آکر لشکر اسلام میں شامل ہوتے رہے۔ دن بھر یہ سلسلہ جاری رہا اور دشمن یہ سمجھا کہ مسلمانوں کی مدد کے لیے بہت بڑی فوج آئی ہے۔ سب سے پہلا دستہ جو آکر شامل ہوا اس کے امیر حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ تھے، جن کی دلیری اور فراست کی بڑی شہرت تھی۔ ان کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ارشاد تھا: ''جس لشکر میں اس جیسا شخص ہو اسے شکست نہیں ہو سکتی۔'' انہوں نے آتے ہی ایرانیوں کو للکارا کہ ''ہے کوئی بہادر تو سامنے آئے۔''

مقابلے میں سلطنت فارس کا نامور سردار بہمن خود آیا جو ذوالحاجب کے لقب سے مشہور تھا۔ اسی نے جنگِ جسر میں مسلمانوں کو شکست دی تھی جس میں حضرت ابوعبید ثقفی رحمہ اللہ شہید ہوئے تھے۔

حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھتے ہی آواز لگائی: ''ہائے ابوعبید اور شہدائے جسر کا انتقام!!!''

یہ کہہ کر اس پر حملہ آور ہوئے، چند لمحے دونوں کی تلواریں ٹکراتی رہیں، آخر حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے اسے مار گرایا۔ اس کے بعد عام جنگ شروع ہو گئی۔ شام سے آنے والی امدادی فوج کے دس دس آدمیوں کا جب بھی کوئی دستہ اُفق سے نمودار ہوتا۔ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ اس میں شامل ہو کر بڑے زور و شور سے دشمن پر حملہ آور ہوتے۔ گزشتہ روز کی جنگ

① الکامل فی التاریخ: ۲/۳۰۶

میں مسلمانوں نے ہاتھیوں کے جو ہودج چھلنی کیے تھے، ایرانی ان کا متبادل انتظام اب تک نہیں کر پائے تھے اس لیے ایرانی اس دن ہاتھیوں کو میدان میں نہیں لا سکتے تھے لہٰذا مسلمان گھڑ سوار جم کر لڑ رہے تھے۔

اِدھر حضرت قعقاع بن عَمرو رضی اللہ عنہ نے ایرانیوں کے گھوڑوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے یہ عجیب چال چلی کہ اپنے اونٹوں کو سیاہ چادریں پہنا کر ان ایرانی گھڑ سواروں کے سامنے لے آئے جنھوں نے ایک دوسرے کو زنجیروں سے متصل کیا ہوا تھا تا کہ میدان سے فرار نہ ہونے پائیں اور دشمن پر یک بارگی حملے کرتے رہیں، مگر جب عربی اونٹ سیاہ چادروں میں سامنے آئے تو ایرانی گھوڑے بدکنے لگے اور ان کی صفیں درہم برہم ہوگئیں۔

ایرانی لشکر کا ایک دستہ ماہر تیر اندازوں کا تھا جو زرق برق لباس میں سونے چاندی کے کنگن اور کمر بند پہنے سب سے نمایاں نظر آتا تھا۔ ان میں سے ایک تیر انداز مسلسل مسلمانوں کو نشانہ بنائے جا رہا تھا۔ اس دوران عَمرو بن مَعْدِی کَرِب رضی اللہ عنہ یہ آواز لگاتے ہوئے کہ ''مسلمانو! شیر بن کر دکھاؤ۔ فارس والے بھیڑ بکریاں ہیں۔'' اسی سمت آگئے۔

ایک مسلمان نے چلا کر کہا: ''ابو ثور! اس فارسی سے بچ کے رہنا، اس کا کوئی نشانہ خطا نہیں جاتا۔''

حضرت عَمرو بن مَعْدِی کَرِب رضی اللہ عنہ نے پلٹ کر تیر انداز کو دیکھا اور پھر اس کی طرف دوڑ پڑے۔ تیر انداز نے کمان پر تیر چڑھا کر ان پر چھوڑ دیا جو سنسناتا ہوا آیا۔ حضرت عَمرو بن مَعْدِی کَرِب رضی اللہ عنہ بھی چوکنا تھے، فوراً ڈھال آگے کر دی، تیر اس میں پیوست گیا، اس سے قبل کہ تیر انداز دوسرا تیر چلّے پر چڑھاتا، عَمرو بن مَعْدِی کَرِب رضی اللہ عنہ اس تک جا پہنچے اور اسے یکدم دبوچ کر ذبح کر ڈالا، اس کے سونے کے دو کنگن، طلائی کمر بند اور ریشمی واسکٹ اُتار لی۔[1]

ابو مِحجَن رضی اللہ عنہ کی شجاعت:

ابو مِحجَن ثقفی رضی اللہ عنہ کو جنگ سے پہلے فوجی نظم وضبط کی خلاف ورزی پر زنجیر ڈال کر اس محل میں قید کر دیا گیا تھا جس کی چھت پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے۔ حضرت ابو مِحجَن کو جنگ میں شرکت سے محرومی کا اتنا قلق تھا کہ بے اختیار یہ اشعار پڑھنے لگے۔

كَفٰى حُزْنًا اَنْ تُدْحَمَ الْخَيْلُ بِالْقَنَا　　وَاُتْرَكَ مَشْدُوْدًا عَلَیَّ وَثَاقِيَا

''کتنے غم کی بات ہے کہ گھڑ سوار نیزے تان کر بھڑے ہوئے ہیں اور میں زنجیروں میں باندھ کر یہاں پھینک دیا گیا ہوں۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی باندی زہراء کا وہاں سے گزر ہوا تو ابو مِحجن نے ان سے درخواست کی:

''میری زنجیر کھول کر ایک گھوڑا مجھے دے دو، شام کو میں واپس آجاؤں گا تو مجھے پھر سے باندھ دینا۔''

باندی کو رحم آگیا، انہیں کھول کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا گھوڑا ان کے حوالے کر دیا، وہ سیدھے میدانِ جنگ میں پہنچے اور اس بے جگری سے لڑے کہ کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کون بہادر میدان میں آکودا ہے؟

[1] البداية والنهاية: ٩/٢٣٢

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی جب بھی ان پر نظر پڑتی تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہتے کہ یہ سپاہی بھی ابو محجن کی طرح لڑ رہا ہے اور گھوڑا بھی میرے گھوڑے کی مانند ہے۔ پھر سوچتے کہ ابو محجن تو قید ہیں۔ دن بھر یہ معما حل نہ ہو سکا۔

شام ڈھلنے تک جنگ جاری رہی اور اندھیرا ہونے پر دونوں لشکر اپنی خیمہ گاہوں کو لوٹ آئے۔ ابو محجن رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی جگہ آ کر پہلے کی طرح خود کو زنجیر ڈلوالی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نیچے اُترے تو سب سے پہلے اپنے گھوڑے کی طرف گئے، دیکھا پسینے سے تر ہو رہا ہے، تفتیش کی تو ساری بات سامنے آگئی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ ابو محجن رضی اللہ عنہ کی بہادری سے بڑے خوش ہوئے اور انہیں آزاد کر دیا۔[1]

ابو مِحجَن پر شراب نوشی کا الزام اور اس کی حقیقت:

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ بعض تاریخی روایات میں بتایا گیا ہے کہ ابو محجن رضی اللہ عنہ کو شراب نوشی کی وجہ سے قید کیا گیا تھا، مگر یہ روایات بہت ضعیف ہیں، محققین کے نزدیک حضرت ابو محجن رضی اللہ عنہ کو نظم وضبط کی خلاف ورزی کی بنا پر یہ سزا دی گئی تھی کہ انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی نیابت کے لیے خالد بن عرفطہ رضی اللہ عنہ کی تقرری پر اعتراض کیا تھا جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور تھی اور وہ یہ کہ انہوں نے کچھ ایسے اشعار کہے تھے جن میں ذوقِ مے نوشی کا ذکر تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو یہ بات بہت ناگوار گزری تھی۔ ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ نے روایت نقل کی ہے کہ ابو محجن رضی اللہ عنہ سے جب ان کی سزا کی وجہ پوچھی گئی تو وہ بولے: ''اللہ کی قسم میں کوئی حرام چیز کھانے پینے کی وجہ سے قید نہیں ہوا تھا بلکہ میں اسلام لانے سے قبل شاعر بھی تھا اور شرابی بھی۔ تو مے نوشی کے بارے میں کچھ اشعار میری زبان پر آگئے تھے۔ اس لیے حضرت سعد بن ابی وقاص نے مجھے قید کر دیا۔''[2]

دوسرے دن کی یہ لڑائی ''یوم اَغواث'' کے نام سے یاد کی جاتی ہے، اس میں دو ہزار کے لگ بھگ مسلمان شہید اور زخمی ہوئے جبکہ ایرانیوں کا نقصان دس ہزار افراد سے کم نہیں تھا۔[3]

---

① البدایة والنهایة: ۶۳۲/۹، دارِ هجر

② الکامل فی التاریخ: ۳۰۶/۲ تا ۳۰۹

فائدہ ❶: بعض روایات میں ابو مِحجَن رضی اللہ عنہ کو زنجیروں سے آزاد کرنے اور گھوڑا فراہم کرنے میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت سلمٰی کا نام لیا جاتا ہے جو محاذ پر موجود تھیں۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ کام حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی باندی زہرا نے کیا تھا۔ تطبیق کی صورت یہ ہے کہ زہرا نے حضرت سلمٰی کی اجازت سے یہ کام کیا تھا۔ باندیوں کے لیے پردے کے احکام نسبتاً نرم ہوتے ہیں اس لیے وہ ایسی خدمات انجام دے سکتی ہیں۔ یہ قدرے بعید ہے کہ حضرت سلمٰی، مِحجَن رضی اللہ عنہ کو کھولنے اور گھوڑا دینے کی خدمت بدستِ خود انجام دیتی رہی ہوں، کیوں کہ اس پابندِ شریعت پردہ دار معاشرے میں یہ بات اَقدار کے خلاف تھی، اگرچہ ایسی سخت ضرورت میں شرعاً اس کی گنجائش تھی جیسا کہ ہنگامی حالت کے باعث جہاد میں صحابیات کا مردوں کی مرہم پٹی کرنا صحیح روایات سے ثابت ہے۔ (صحیح البخاری، ح: ۲۸۸۲، ۲۸۸۳، کتاب الجهاد، باب مداواة النساء الجرحیٰ فی الغزو) مگر جہاد میں خواتین کی شرکت اور مردوں کی مرہم پٹی کا یہ مطلب نکالنا کہ ''قرنِ اوّل کے اسلامی معاشرے میں پردے کی پابندی نہیں تھی اور پردہ بعد میں مولویوں نے ایجاد کیا۔'' بالکل غلط ہوگا۔

فائدہ ❷: سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی ان اہلیہ کا نام سلمٰی بنت جعفر تھا۔ یہ پہلے مثنیٰ بن الحارثہ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، ان کے بعد سعد رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آگئیں۔ (الاصابة: ۵۶۹/۵؛ اسد الغابة، ۵۵/۵؛ الاستیعاب: ۱۴۵۶/۴، ترجمة مثنیٰ بن الحارثه)

③ الکامل فی التاریخ: ۳۰۹/۲

خنساء بنت عمرو کا جذبۂ جہاد:

خنساء بنت عمرو رضی اللہ عنہا (جن کا اصل نام "تُماضِر" تھا) عرب کی مشہور شاعرہ تھیں۔ فنِ شعر کے ماہرین کا کہنا ہے کہ عربوں کی تاریخ میں ایسی بلند پایہ شاعرہ ان سے پہلے گزری نہ ان کے بعد۔ زمانۂ جاہلیت کی ایک لڑائی میں ان کا ایک بھائی مُعاویہ قتل جبکہ دوسرا بھائی صَخر شدید زخمی ہوگیا۔ خنساء ایک سال تک صَخر کی تیمارداری کرتی رہیں، مگر آخر کار وہ بھی دم توڑ گیا۔ خنساء رنج و غم میں ڈوب گئیں۔ اس سے پہلے وہ اکا دُکا اشعار کہا کرتی تھیں مگر اب غم کی آگ مرثیہ گوئی کی صورت میں ظاہر ہوئی اور اس اللہ کی بندی نے ایسے دردانگیز مرثیے کہے کہ بڑے بڑے شعراء سر دُھنتے رہ گئے۔

پھر اللہ نے انہیں اسلام کی سعادت بخشی۔ وہ اپنے قبیلہ بنوسُلیم کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنے بیٹوں سمیت مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اشعار بہت پسند تھے۔ فرمائش کرکے ان کا کلام سنتے اور داد سے نوازتے۔[1]

جنگِ قادِسیہ میں خنساء بنت عمرو رضی اللہ عنہا اپنے چاروں بیٹوں کے ساتھ شریک ہوئیں۔ جس رات جنگ چھڑنے والی تھی، انہوں نے بیٹوں کو جمع کیا اور کہا:

"میرے بیٹو! تم نے اپنی خوشی سے اسلام قبول کیا۔ اپنی خوشی سے ہجرت کی۔ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! تم ایک ہی باپ کے بیٹے ہو جیسا کہ تمہاری ماں ایک ہے۔ میں نے نہ تو تمہارے باپ سے خیانت کی نہ تمہاری ماموں کو رُسوا ہونے دیا۔ تمہارے حسب و نسب کو بٹہ نہیں لگایا۔ تم جانتے ہو کہ اللہ نے کفار سے جہاد کے بدلے کتنا عظیم اجر رکھا ہے۔ یاد رکھو! دارِ آخرت باقی رہنے والا ہے جبکہ دنیا کی زندگی فانی ہے۔

اللہ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ[2]

(اے ایمان والو! صبر کرو، مقابلے میں جم جاؤ اور مستعد رہو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔)

صبح تم بھرپور جذبے کے ساتھ اپنے دشمن سے جہاد کے لیے جانا۔ ان شاء اللہ تم اللہ کی نصرت سے اس کے دشمنوں پر فتح یاب ہوگے۔ جب تم دیکھو کہ میدانِ جنگ تپ گیا ہے تو اس کے مشکل ترین مقامات میں کود جانا۔ ان شاء اللہ تمہیں جنت میں عزت کا مقام نصیب ہوگا۔"

اگلے دن چاروں بیٹے رجز پڑھتے ہوئے پورے جوش و جذبے کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے۔ ایک کے بعد دوسرا شہید ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ چاروں شہادت سے سرفراز ہوئے۔ وہی خنساء رضی اللہ عنہا جو اپنے دو بھائیوں کے غم میں مرثیے کہہ کہہ کر پورے عرب کو رُلاتی رہی تھیں، چار بیٹوں کی شہادت کی خبر سن کر بولیں: "اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے ان کی شہادت کا اعزاز بخشا۔ اُمید ہے وہ مجھے ان کے ساتھ اپنی بارگاہِ رحمت میں جگہ دے گا۔"[3]

---

[1] الاستیعاب: ۱۸۲۷/۴؛ الوافی بالوفیات: ۲۳۹/۱۰ تا ۲۴۲

[2] سورۂ آل عمران، آیت: ۲۰۰ — [3] اسد الغابۃ: ۸۹/۷، ط العلمیۃ

یوم عماس:

تیسرے دن کی لڑائی ''یوم عماس'' کے نام سے مشہور ہے۔ رات ہی کو حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے چند دستوں کو میدان جنگ سے خاصی دور چھپا دیا تھا اور انہیں ہدایت کی تھی کہ صبح جنگ شروع ہونے سے ذرا پہلے سو سو کی ٹولیوں میں یکے بعد دیگرے میدان میں آتے رہیں۔ چنانچہ صبح جب مسلمان اور ایرانی آمنے سامنے ہوئے تو یہ دستے تکبیر کے نعرے بلند کرتے باری باری آئے جس سے ایرانیوں پر رعب طاری ہو گیا۔ آخر میں حضرت ہشام بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سات سو سواروں کے ساتھ اس طرح ٹولیوں میں تقسیم ہو کر میدان میں اترے۔

جنگ کا آغاز ہوا تو پہلے ایک دیو پیکر فارسی پہلوان نے آ کر للکارا۔ ایک پستہ قد مسلمان شَمِر بن عَلقَمَہ اس کی طرف لپکے۔ پہلوان گھوڑے سے کودا، شَمِر بن عَلقَمَہ کو بازوؤں میں جکڑ کر نیچے گرایا اور سینے پر چڑھ کر انہیں ذبح کرنے کے لیے تلوار سونتنے لگا مگر اچانک اس کا گھوڑا بدک کر بھاگا جس کی لگام پہلوان کے کمر بند سے بندھی ہوئی تھی۔ پہلوان بھی الٹ کر گرا اور گھوڑے کے پیچھے گھسٹنے لگا، شمر رحمہ اللہ یہ دیکھ کر پیچھے دوڑے اور پہلوان کا کام تمام کر دیا۔

اس دن ایرانیوں کے ہاتھی پھر میدان میں موجود تھے اور ان کی حفاظت کے لیے پیادوں اور گھڑ سواروں کا زبردست پہرہ لگا ہوا تھا لہٰذا مسلمانوں کو حملے میں بڑی دشواری پیش آ رہی تھی، کیوں کہ گھوڑے پہلے کی طرح آج بھی ہاتھیوں کے سامنے آنے سے گھبرا رہے تھے۔ حضرت عَمرو بن مَعدِی کَرِب رضی اللہ عنہ نے اپنے سامنے والے ہاتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے قبیلے والوں سے کہا: ''میں اس ہاتھی اور اس کے پہرے داروں پر حملہ کر رہا ہوں، اگر میں تھوڑی دیر نہ لوٹوں تو تم میرے پیچھے چلے آنا، ورنہ مجھ سے محروم ہو جاؤ گے، پھر مجھ جیسا کہاں ملے گا۔''

یہ کہہ کر وہ ایرانیوں پر حملہ آور ہوئے اور گرد و غبار میں چھپ گئے، جب کچھ دیر تک وہ نہ لوٹے تو ان کے ساتھی ایرانیوں کی صفیں توڑتے ہوئے ان کے پیچھے گئے، تب تک وہ زخمی ہو چکے تھے مگر برابر لڑ رہے تھے۔ ان کے ساتھی انہیں بمشکل نکال کر لائے۔ ان کا گھوڑا بھی زخمی ہو چکا تھا۔ اتنے میں ایک فارسی ان کے پاس سے گزرا، انہوں نے اس کے گھوڑے کی ٹانگ پکڑ لی۔ ایرانی اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتا رہا مگر بے سود، آخر وہ اُتر کر بھاگ نکلا اور یہ اس کے گھوڑے پر سوار ہو گئے۔

ہاتھیوں کی تباہ کاریاں دیکھ دیکھ کر حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ بے چین تھے، وہ جانتے تھے اس مصیبت سے نجات پانا سب سے پہلے ضروری ہے۔ ایرانیوں کا ایک سفید اور ایک خارش زدہ ہاتھی سب سے زیادہ تباہی مچا رہے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت قَعقاع بن عَمرو اور حضرت عاصم بن عَمرو رضی اللہ عنہما کو پیغام بھیجا: ''سفید ہاتھی کو نمٹا دو۔''

امیر کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے حضرت عاصم اور حضرت قَعقاع رضی اللہ عنہما لمبے نیزے سنبھال کر سفید ہاتھی کی طرف بڑھے اور دونوں نے ایک ساتھ اس کی آنکھوں کو نشانہ بنایا۔ آنکھوں میں زخم کھاتے ہی سفید ہاتھی سر پٹخنے لگا، اس پر بیٹھے سائیس اور تیر انداز نیچے گر پڑے۔ اِدھر حضرت قَعقاع رضی اللہ عنہ نے ہاتھی کی سونڈ پر وار کر کے اسے کاٹ ڈالا، خارش

زدہ ہاتھی کو بھی اسی طرح آنکھیں پھوڑ کر ناکارہ کیا گیا۔ یہ ہاتھی زخمی ہو کر بھاگے تو دوسرے ہاتھیوں نے بھی ان کا ساتھ دیا اور میدان ان سے خالی ہوگیا۔ اب مسلمان گھڑسواروں اور پیادوں کو جم کر لڑنے کا موقع میسر آ گیا۔ اس وقت تک سورج ڈھلنے لگا تھا۔ مسلمان سر ہتھیلی پر رکھ کر شام تک لڑتے رہے۔ مقابلے میں ایرانی بھی غیر معمولی جوش وخروش سے نبرد آزما رہے۔[1]

لیلۃ الہریر:

یہ دو قوموں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ تھی اسی لیے سورج ڈوب جانے کے بعد بھی تلواروں کی بجلیاں کوندتی رہیں، لڑنے والے تھکن سے بے حال ہوئے جا رہے تھے، مگر جنگ کا رکنا اب کسی ایک کی مکمل شکست کے بغیر ناممکن تھا۔ لوگ ہوش وحواس سے بے گانہ ہو کر لڑے جا رہے تھے۔ پوری رات کسی کو کھانے پینے کا موقع ملا، نہ آرام یا بات چیت کرنے کا۔ سب کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا اور زبانوں پر نعرے، اس لیے اس شب کو "لَیْلَةُ الْھَرِیْر" (شوروغُل کی رات) کہا جاتا ہے جس میں بہادروں کی للکار اور زخمیوں کی چیخ وپکار سے قیامت کا سماں رہا۔

حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ نے حضرت عاصم بن عمرو اور حضرت قیس بن ہبیرہ رضی اللہ عنہما جیسے حضرات کو ساتھ لے کر رات بھر پینترے بدل بدل کر حملے کیے جن کی ترتیب خود ہی بنائی تھی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس پر فرمایا: "اے اللہ! ان کی مغفرت فرما، ان کی مدد فرما، میری طرف سے انہیں اجازت ہے، اگر چہ وہ مجھ سے اجازت نہیں لے سکے۔"

ان حملوں نے ایرانیوں کو شدید نقصان پہنچایا مگر پھر بھی ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔[2]

یوم قادِسیّہ:

صبح کو دونوں فوجیں لڑ لڑ کے بے حال ہو چکی تھیں۔ یہ آخری دن کی لڑائی "یوم قادِسیّہ" کہلاتی ہے جو دوپہر تک برابر جاری رہی۔ حضرت قَعْقاع رضی اللہ عنہ سمجھ گئے تھے کہ اب دشمن کی قیادت کو ٹھکانے لگا کر ہی جنگ کو اختتام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے بہادروں کو حوصلہ دلاتے ہوئے فرمایا:

"اب جو بھی آگے بڑھ کر حملہ کرے گا، وہ فتح پائے گا، تم کچھ دیر مزید ثابت قدم رہو اور حملہ کرو، نصرت خداوندی صبر کے ساتھ مشروط ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے حضرت عَمرو بن مَعدِی کَرِب رضی اللہ عنہ اور طُلَیحہ بن خُوَیلد جیسے کئی نامور شمشیر زنوں کے ساتھ ایرانیوں پر ہلہ بول دیا۔ ایرانی افسران فیروزان اور ہُرمُزان نے حائل ہونے کی سرتوڑ کوشش کی مگر مسلمانوں کا یہ ریلا ان کی صفوں کو درہم برہم کرتے ہوئے رُستم کے قریب جا پہنچا جو فوج کے آخر میں اپنے شاندار تخت پر بیٹھا تھا۔ مسلمانوں کو آتا دیکھ کر رُستم دریا میں کود گیا مگر ہلال بن علقمہ نامی ایک مسلمان اس کے پیچھے پانی میں اُتر گئے اور اسے ٹانگوں سے پکڑ کر کنارے پر کھینچ لائے، پھر تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا اور اس کے تخت پر چڑھ کر آواز لگائی کہ "میں نے رُستم کو قتل کر دیا ہے۔"

[1] الکامل فی التاریخ: ۲/ ۳۰۹ تا ۳۱۱ [2] الکامل فی التاریخ: ۲/ ۳۱۱، ۳۱۲

یہ سن کر ایرانیوں کے رہے سہے ہوش بھی اڑ گئے اور وہ میدان سے فرار ہونے لگے۔ مسلمانوں نے تعاقب کرتے ہوئے دور تک ان کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ ①

زنجیروں سے متصل نامور ایرانی سورما بھی جو تیس ہزار تھے، جان بچانے کے لیے دریا میں کود گئے تھے، مسلمانوں نے نیزے اور تیر مار مار کر ان سب کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ غرض ایرانی لشکر کا اکثر حصہ قادِسیّہ میں بے نام ونشان ہو گیا۔ مسلمانوں کے مجموعی طور پر ساڑھے چھ ہزار افراد نے جامِ شہادت نوش کیا۔ ②

اسلامی لشکر میں بچے بھی تھے اور خواتین بھی۔ ان کے ذمے مجاہدین کی خدمت کے کام تھے، شہداء کی قبریں کھودنے اور زخمیوں کا خیال رکھنے کی ذمہ داری بھی انہی پر تھی۔ جنگ ختم ہوئی تو دشمنوں کے مقتولین سے قیمتی کپڑے اُتارنے کا کام بچوں کے سپرد کر دیا گیا تا کہ بالغوں کے سامنے لاشوں کی پردہ دری نہ ہو۔ ③

جنگ قادِسیّہ کی تاریخ کے بارے میں اختلاف ہے، ایک قول محرم ۱۴ھ کا ہے جو یقینی طور پر غلط ہے، ایک قول شوال ۱۶ھ اور ایک شوال ۱۵ھ کا ہے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخری قول درست ہے۔

میں کوئی بادشاہ نہیں:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ قادِسیّہ کے معرکے کے بارے میں اتنے بے تاب تھے کہ روزانہ صبح سویرے مدینہ منورہ سے باہر عراق جانے والی شاہراہ پر کھڑے ہو جاتے اور دوپہر تک ہر آنے والے سوار سے عراقی مجاہدین کی خیر خبر پوچھتے۔ اِدھر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ قاصد کو فتح کی خوشخبری دے کر مدینہ طیبہ روانہ کر چکے تھے جو مدینہ کے پاس پہنچا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ باہر ہی منتظر کھڑے تھے۔ اسے دیکھتے ہی پوچھا:

''کہاں سے آئے ہو؟'' قاصد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہچانتا نہیں تھا اور اسے خلیفہ تک پہنچنے کی جلدی تھی، لہٰذا اس نے رُکے بغیر کہا: ''قادِسیّہ سے۔'' آپ بے چینی سے بولے ''اللہ کے بندے! مجھے بتاؤ وہاں کیا ہوا؟''

قاصد نے کہا: ''اللہ نے مشرکوں کو شکست دے دی۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے سوال پوچھتے رہے اور وہ جواب دیتا رہا۔ یہاں تک کہ سوار شہر میں داخل ہو گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ لوگ ان کے ساتھ دوڑنے والے کو امیر المؤمنین کہہ کر سلام کر رہے ہیں تو کانپ اُٹھا اور بولا: ''حضرت! اللہ آپ پر رحم کرے، آپ نے مجھے کیوں نہ بتایا کہ آپ امیر المؤمنین ہیں۔''

آپ نے بے ساختہ فرمایا: ''میرے بھائی! اس میں حرج ہی کیا ہے۔'' ④

اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو جمع کر کے ایک پر اثر تقریر کی اور فرمایا:

① الکامل فی التاریخ: ۲/ ۳۱۲ تا ۳۱۴
② تاریخ الطبری: ۳/ ۵۶۴، دار المعارف
③ البدایۃ والنہایۃ: ۲/ ۵۳۶، دار ہجر
④ الکامل فی التاریخ: ۲/ ۳۱۵

"مسلمانو! میں کوئی بادشاہ نہیں کہ تمہیں غلام بنا کر رکھوں۔ میں خود اللہ کا غلام ہوں۔ ہاں، خلافت کی ذمہ داری میرے سر پر رکھی گئی ہے۔ اگر میں اپنی ذمہ داریوں کو اس طرح انجام دوں کہ تم اپنے گھروں میں چین کی نیند سوسکو تو یہ میری سعادت ہے۔ اگر میری خواہش یہ ہو کہ تم میرے دروازے پر کھڑے رہا کرو، تو یہ میری بدبختی ہوگی۔ میں تم کو اچھی تعلیم دینا چاہتا ہوں مگر گفتار سے نہیں کردار سے۔"[1]

بابل سے مدائن تک:

رُستم سمیت ایرانیوں کے کئی بڑے سالار قادِسیّہ میں مارے گئے تھے، لیکن ہُرمُزان، قارن اور کئی سردار بچ کر نکل گئے تھے، ان کے علاوہ اور بھی کہنہ مشق ایرانی جرنیل ابھی مختلف قلعوں اور شہروں میں مقابلے کے لیے تیار تھے۔

حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کی ہدایت پر ان کا قصہ پاک کرنے کے لیے قادِسیّہ کی جنگ کے دو ماہ بعد ذوالحجہ ۱۵ ہجری میں آگے پیش قدمی کی اور تاریخی شہر ''بابل'' کو فتح کیا۔ پھر ''کوفہ'' کے لیے حضرت زُہرہ کو امیر بنا کر روانہ کیا، یہ شہر تاریخی روایات کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے۔ یہاں کے نواب شہریار نے مقابلے کے لیے صف بندی کی اور خود آگے آکر للکارا۔ حضرت زُہرہ رضی اللہ عنہ نے اس کے غرور کا سرنیچا کرنے کے لیے ایک جنگجو عربی غلام نائل بن جَشعَم کو مقابلے کے لیے بھیج دیا۔ دونوں گھوڑوں کو ایڑ لگا کر ایک دوسرے کے مقابل آئے۔ شہریار نے نائل کو کمزور سمجھ کر اپنا نیزہ پھینک دیا اور ان کی گردن میں دونوں بازو ڈال کر انہیں دبوچنے کی کوشش کی، نائل نے بھی خالی ہاتھ زور آزمائی شروع کی اور دونوں گھوڑوں سے نیچے آگرے۔ شہریار نے ایک ہاتھ سے نائل کے چہرے کو دبایا اور دوسرے سے خنجر نکالا تاکہ ان کے حلق پر پھیر دے کہ نائل نے یکدم اس کا انگوٹھا اس زور سے چبایا کہ ہڈی تک چیخ گئی۔ شہریار درد سے دوہرا ہو کر پیچھے ہٹا اور نائل اسے گرا کر اس کے سینے پر چڑھ گئے اور آنافانا اس کا خنجر چھین کر اس کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ شہریار کے مرتے ہی اس کی فوج کا حوصلہ ٹوٹ گیا اور وہ معمولی مزاحمت کے بعد تتر بتر ہوگئی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بعد میں یہاں پہنچے۔ حضرت نائل کا کارنامہ سنا تو بہت خوش ہوئے اور شہریار کی پوشاک، اسلحہ اور سواری انعام میں انہی کو عطا کر دی۔ نائل جب شہریار کا قیمتی لباس اور اسلحہ زیب تن کر کے مسلمانوں کے مجمعے میں آئے تو ایک غلام کی یہ سجاوٹ دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔

ایرانی پایۂ تخت مدائن دریائے دِجلہ کے مشرقی کنارے پر واقع تھا۔ دریا کے مغربی کنارے پر اس کی حفاظت کے لیے ایک قلعہ موجود تھا جہاں کسریٰ کا پلا ہوا ایک شیر رکھا گیا تھا، اسی مناسبت سے اس مقام کو ''بَہُر شیر'' کہا جاتا تھا۔ یہاں جنگ شروع ہوئی تو ایرانیوں نے یہ شیر بھی مسلمانوں پر چھوڑ دیا۔ اِدھر سے حضرت ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور تلوار کا ایسا وار کیا کہ شیر نے وہیں دم توڑ دیا۔ اس بہادری پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ کی پیشانی چوم لی۔ ''بَہُر شیر'' کا قلعہ کچھ مدت کے محاصرے کے بعد صفر سنہ ۱۶ ہجری میں فتح ہوگیا۔[2]

[1] تاریخ الطبری: ۵۷۵/۳، دار المعارف [2] الکامل فی التاریخ: ۳۳۴/۲، ۳۳۵، ۳۳۷

اسلامی لشکر دجلہ کی موجوں میں:

"بہُرشیر" کے قلعے کا عقبی دروازہ دریائے دجلہ کے ساحل پر کھلتا تھا جس کے پار ایرانیوں کا پایۂ تخت مدائن دکھائی دیتا تھا۔ مسلمان اس طرف بڑھے مگر راستے میں دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایرانیوں نے تمام پُل توڑ دیے تھے اور کشتیاں غائب کر دی تھیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اطلاع مل چکی تھی کہ یزدگرد سارے مال واسباب کے ساتھ مدائن سے فرار ہونے کی تیاری کر رہا ہے اور اگر دریا عبور کرنے میں تاخیر ہوئی تو وہ سب کچھ سمیٹ کر صاف نکل جائے گا اور کسی محفوظ علاقے میں پہنچ کر از سرِ نو افواج مرتب کر لے گا، اس لیے دریائے دجلہ کو فوراً عبور کرنا ناگزیر تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر مسلمانوں سے کہا:

"بھائیو! دشمن نے ہر طرف سے بھاگ کر دریا کے پار پناہ لی ہے۔ مگر یہ ایک قطرہ تمہیں نہیں روک سکتا۔ میری رائے تو یہ ہے کہ دشمن کو سنبھلنے سے پہلے گھیر لو۔ پس اب میں تو گھوڑا دریا میں ڈالنے کا عزم کر چکا ہوں۔"

سب نے کہا: "ہم آپ کے پیچھے ہیں، آپ قدم بڑھائیے۔"[1]

لشکر کی پہلی صف میں موجود حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے پکار کر کہا: "مسلمانو! تمہارے سامنے اس قطرے کی کیا حیثیت! اسے چیر کر دشمن تک پہنچو۔ ارشاد باری ہے ﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾ (اور کسی بھی جان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ مر جائے مگر اللہ کے حکم سے یہ ایک لکھا ہوا وقت ہے۔)[2]

یہ کہہ کر وہ گھوڑے سمیت دریائے دجلہ میں کود گئے۔[3]

ادھر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عاصم بن عَمرو رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ دریا کے پار پہنچ کر گھاٹ پر متعین ایرانیوں سے نبرد آزما ہوں تاکہ دریا عبور کرنے کے درمیان دشمن کی تیراندازی کا خطرہ نہ رہے۔ عاصم رضی اللہ عنہ ساٹھ گھڑ سواروں کے ساتھ دریا میں اتر کر دوسرے کنارے کے پاس پہنچے تو اُدھر سے فارسی پہرے دار بھی دریا میں گھس کر راستہ روکنے لگے۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی ہدایت پر مسلمانوں نے نیزے سنبھال کر ان کی آنکھوں کو نشانہ بنایا اور درجنوں کو مار گرایا۔ اِدھر حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں سے کہا: "سب یہ دعا پڑھیں:

"نَسْتَعِيْنُ بِاللّٰهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْه. حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل. وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ وَلِيَّه وَلَيُظْهِرَنَّ دِيْنَهٗ وَلَيَهْزِمَنَّ عَدُوَّهٗ، لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْم."[4]

(ہم اللہ سے مدد چاہتے ہیں، اس پر بھروسہ کرتے ہیں، اللہ ہمیں کافی ہے اور بہترین کارساز ہے، اللہ ضرور اپنے دوست کی مدد کرے گا، ضرور اپنے دین کو غالب کرے گا اور ضرور اپنے دشمن کو شکست دے گا، نہ گناہ سے بچنے کی طاقت اور نہ نیکی کی قوت ہے مگر اللہ عظیم کے حکم سے۔)

---

① الكامل في التاريخ: ۳۲۹/۲

② آل عمران، آیت: ۱۴۵   ③ تفسير ابن ابي حاتم: ۷۷۹/۳، ط العلمية

یہ الفاظ کہتے ہوئے سب دریا میں اتر گئے۔ سب سے پہلے حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے گھوڑا دریا میں ڈالا۔ یہ حضرات آپس میں یوں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے جیسے کسی پختہ شاہراہ پر چلے جا رہے ہوں۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کہہ رہے تھے: ''اسلامی روح ابھی تازہ ہے، اس لیے خشکی کی طرح پانی بھی مسلمانوں کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے، فوج جس طرح دریا میں اتری ہے، اسی طرح باہر نکلے گی۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے: ''حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ۔ اگر لشکر میں سرکشی نہ ہو، اور ایسے گناہ نہ ہوں جو نیکیوں پر غالب آ جائیں تو ایسا ہی ہوگا۔''①

مسلمانوں کو اس طرح بے خوف وخطر پانی میں چلتا دیکھ کر ایرانیوں پر اتنا خوف طاری ہوا کہ ان میں سے زیادہ تر ''دیواں آمدند، دیواں آمدند'' (جن بھوت آ گئے) کہتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔②

مجاہد کا پیالہ اور دریا کی امانت داری:

جو دشمن مقابلے کے لیے رکے، مسلمان انہیں مارتے کاٹتے ساحل پر اتر گئے۔ پوری فوج جوں کی توں پار ہوگئی، صرف ایک سپاہی حضرت مالک بن عامر رضی اللہ عنہ کا پیالہ دریا میں گر گیا تھا، کسی نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا: ''تقدیر کی بات تھی کہ وہ ضائع ہوگیا۔'' وہ بولے: ''واللہ! مجھے تو اس پیالے کی سخت ضرورت تھی۔''

پھر دعا کی: ''الٰہی! پوری فوج میں سے صرف میری چیز ضائع ہو، مجھے ایسا محروم نہ بنا۔''

جب سب دریا کے پار اترے تو اچانک پانی کی ایک لہر نے وہ پیالہ کنارے پر لا ڈالا، کسی سپاہی نے پہچان کر حضرت عامر بن مالک رضی اللہ عنہ کو پہنچا دیا۔③

یزدگرد نے اپنے اہل وعیال اور خزانے کو پہلے ہی ''حلوان'' روانہ کر دیا تھا۔ مسلمانوں کے دریا پار کرنے کی اطلاع ملتے ہی وہ خود بھی پایۂ تخت سے بھاگ کھڑا ہوا، اگرچہ ایرانی مال ودولت کا خاصا ذخیرہ ساتھ لے گئے تھے مگر اکثر ساز و سامان پیچھے رہ گیا تھا۔ مسلمان جب ساسانیوں کے اس قدیم عشرت کدے میں داخل ہوئے تو چار سو خاموشی طاری تھی۔④

کسریٰ کے خزانے قدموں میں:

سامنے آلِ ساسان کا عظیم الشان قصرِ ابیض تھا جس کی فتح کی بشارت نطقِ رسالت سے دی گئی تھی۔⑤ یہ وہ شاہکار تھا جس کی ہیبت اور وسعت دیکھ کر انسان دم بخود رہ جاتا تھا۔ جس کی دیواروں، محرابوں اور ستونوں کی رعنائی نگاہوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔ مگر آج قصرِ ابیض کے فلک بوس برج اپنی تمام تر رفعتوں کے باوجود آج سرنگوں معلوم ہوتے تھے۔

---

① الكامل في التاريخ: ۲/۳۳۹، ۳۴۰ ؛ تاريخ خليفة بن خياط، ص ۱۳۳

② تاريخ الطبرى: ۴/۱۴

③ تاريخ الطبرى: ۴/۱۲ ④ المنتظم: ۴/۲۰۶

⑤ "عصبة من المسلمين يفتحون البيت الابيض بيت كسرى" "مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کسریٰ کے سفید محل کو فتح کرے گی" (صحیح مسلم، ح: ۳۸۱۵، كتاب الامارة، باب الناس تبع لقريش)

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کسریٰ کے قصر میں داخل ہوئے تو زبان پر بے ساختہ یہ آیات آ گئیں:

كَمْ تَرَكُوا مِن جَنَّاتٍ وَّعُيُونٍ ○ وَزُرُوعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيمٍ ○ وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ ○ كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ ○

(وہ لوگ چھوڑ گئے کتنے ہی باغ اور چشمے، اور کھیتیاں اور عمدہ مکانات، اور آرام کے سامان جن میں وہ خوش رہا کرتے تھے اسی طرح ہوا اور ہم نے ایک دوسری قوم کو اس کا وارث بنا دیا۔)[1]

صدیوں سے نصف ایشیا پر راج کرنے والی خسروی سلطنت کے خزانے آج مسلمانوں کے قدموں میں تھے، مگر اس بے مثال فتح کا کوئی جشن نہیں منایا گیا۔ مسلمانوں نے کسریٰ کے دربار میں جا کر نماز ادا کی اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائے کہ اس کی توفیق سے کفر و شرک کے مرکز میں اسلام کا پرچم نصب کرنے کی سعادت ملی۔[2]

مدائن سے اس قدر مال و دولت ہاتھ آیا کہ حضرت جابر بن سَمُرہ رضی اللہ عنہ جو اپنے والد کے ساتھ اس فتح میں شریک تھے، فرماتے تھے کہ جب شریعت کے مطابق چار حصے مجاہدین میں تقسیم کیے گئے تو ہر ایک کے حصے میں بارہ، بارہ ہزار درہم آئے۔ (جو آج کل کے لحاظ سے پچیس تیس لاکھ روپے سے کم نہیں)

سونا چاندی اتنا زیادہ تھا کہ بعض بوریوں کو اناج سمجھ کر اٹھایا گیا مگر جب کھولا گیا تو سونا چاندی برآمد ہوا۔ کچھ سپاہی یزدگرد اور اس کے ساتھیوں کے تعاقب میں نکلے تھے۔ انہیں نہروان کی نہر کے پل پر کسریٰ کے خادموں کی ایک ٹولی مل گئی جو ایک خچر کو اپنے پہرے میں لے جا رہی تھی۔ خچر کو ان سے چھینا گیا تو اس پر لدے سامان میں سے کسریٰ کے کپڑے، زیور، جوتیاں اور زرہ برآمد ہوئے جو ہیروں اور جواہرات سے جڑے ہوئے تھے۔[3]

امانت و دیانت کی اعلیٰ مثالیں:

مسلمانوں کی امانت داری اور خدا خوفی کا یہ حال تھا جسے جو چیز ملی اس نے لا کر امیر لشکر کی خدمت میں پیش کر دی، بعض چیزوں کی مالیت آج کل کے حساب سے کروڑوں روپے تھی، مگر مجاہدین نے ذرا بھی ہیرا پھیری نہ کی۔ ایک اللہ کے بندے کے ہاتھ ایسا ڈبہ لگا جس میں کسریٰ کا تاج تھا، اس نے جوں کا توں پیش کر دیا۔ یہ طلائی تاج جو نایاب ہیروں اور موتیوں سے مرصع تھا، اتنا وزنی تھا کہ آدمی سر پر اس کا وزن برداشت نہیں کر سکتا تھا، اسے تخت شاہی کے دائیں بائیں لگے دو ستونوں کے درمیان زنجیروں کے ذریعے لٹکایا جاتا تھا۔ بادشاہ تخت پر بیٹھ کر اپنا سر تاج میں لگا لیتا تھا۔ بعض مجاہدین کو خوبصورت ڈبوں میں کسریٰ کے ملبوسات ملے جن میں لگے ایک، ایک موتی کی قیمت لاکھوں روپے تھی۔ حضرت قَعقاع بن عَمرو رضی اللہ عنہ کو ایسے صندوق ملے جن میں کسریٰ، ہرقل، خاقانِ چین اور ہندوستان کے مہاراجوں کی نہایت نفیس اور نادر تلواریں، زرہیں اور خود تھے جن میں سے ہر چیز اپنی ایک تاریخی حیثیت رکھتی تھی۔

---

[1] سورۃ الدخان، آیت: ۲۵ تا ۲۸

[2] المنتظم لابن جوزی: ۲۰۶/۴

[3] المنتظم: ۲۰۷/۴، ۲۰۸

یہ سب چیزیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے قدموں میں لا کر رکھی گئیں تو ان کے منہ سے نکلا:
''بے شک یہ امانت دار لوگوں کا لشکر ہے۔''[1]

سب سے عجیب واقعہ یہ ہے کہ ایک مسلمان ایک صندوقچہ لیے ہوئے ان افسران کے پاس آیا جو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے حکم سے غنیمت کا سامان جمع کر رہے تھے۔ صندوقچہ کھولا گیا تو وہ ایسے نایاب موتیوں اور جواہرات سے بھرا ہوا تھا جن کی قیمت اب تک جمع کیے گئے سارے مال واسباب سے کہیں زیادہ تھی۔ وصول کرنے والے افسران حیران ہو کر بولے: ''تم نے ان میں سے خود کچھ نہیں لیا؟''

جواب ملا: ''واللہ! اگر اللہ کے ساتھ ہونے کا احساس نہ ہوتا تو میں یہ صندوقچہ تمہارے پاس لے کر ہی نہ آتا۔''

پوچھا گیا ''تم کون ہو؟'' جواب دیا: ''میں نے یہ عمل اس لیے کیا ہی نہیں کہ تم میری تعریف کرو۔ میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں اس توفیق پر اور اس کے ثواب پر خوش ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے قبیلے کی بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ بعد میں تحقیق کی گئی تو پتا چلا کہ وہ حضرت عامر بن عبد قیس رحمہ اللہ ہیں۔

یہ چیزیں مال غنیمت کے پانچویں حصے میں شامل کر کے خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیج دی گئیں۔ انہوں نے دیکھ کر بے ساختہ فرمایا: ''جن لوگوں نے اتنی قیمتی چیزیں بھی جوں کی توں بھیج دیں، وہ یقیناً دیانت دار ہیں۔'' حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''امیر المومنین! آپ پاکباز ہیں، اس لیے آپ کی رعایا بھی باکردار ہے۔''[2]

قالینِ نو بہار:

اس ساز وسامان میں ایرانی بادشاہوں کا شہرۂ آفاق قالین نو بہار بھی تھا جسے نوشیروان کے حکم سے اس کے وزیر بزرجمہر نے اس لیے تیار کرایا تھا کہ موسم گرما میں بھی بہار کا لطف لیا جا سکے۔ اس کا طول وعرض ۹۰ فٹ تھا۔ قالین کو سونے کے تاروں سے بُنا گیا تھا، موتیوں اور ہیروں سے سجایا گیا تھا، ریشم اور سونے کے پانی سے پھول پتیوں کی ایسی حیران کن کشیدہ کاری کی گئی تھی کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ اس میں سڑکوں اور نہروں کی عکاسی بھی تھی۔

ایرانی بادشاہ اکثر گرمی کے موسم میں اپنے خاص مصاحبین کے ساتھ اس قالین پر محفل جماتے، شراب کا دور چلاتے اور خود کو موسم بہار میں محسوس کرتے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جب یہ قالین مدینہ منورہ بھیجا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام وتابعین کو جمع کر کے اس کا نظارہ کرایا، سب اس کی دلکشی سے حیران ہوئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مشورہ طلب کیا کہ اس کا کیا کیا جائے؟ بعض حضرات اس عجوبے کو باقی رکھنا چاہتے تھے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پُر زور لہجے میں اسے مسلمانوں میں تقسیم کرنے کا مشورہ دیا، چنانچہ اسے کاٹ کر سب میں بانٹ دیا گیا۔ اس کا معمولی حصہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملا، بیس ہزار میں فروخت ہوا۔[3]

---

[1] الکامل فی التاریخ: ۳۴۳،۳۴۲/۲ [2] المنتظم: ۲۰۹/۴

[3] المنتظم: ۲۰۹/۴، ۲۱۰، بظاہر بیس ہزار درہم مراد ہیں نہ کہ دینار، مگر اتنے درہم بھی آج کل کے لحاظ سے چالیس پچاس لاکھ روپے سے کم نہیں۔

کسریٰ کا تاج اور کنگن۔معجزہ نبوی:

مال غنیمت میں آنے والے خزانے میں کسریٰ کا تاج اور کنگن دیکھ کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کی ایک پیش گوئی یاد آ گئی۔حضور ﷺ نے ہجرت کے سفر کے دوران اپنے تعاقب میں آنے والے سُراقہ بن مالک کو خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا تھا:

''تمہاری کیا کیفیت ہوگی جب کسریٰ کے کنگن، کمر بند اور تاج تمہیں پہنائے جائیں گے۔''

جب آپ ﷺ نے یہ پیش گوئی فرمائی تھی، اس وقت مسلمانوں کی کسمپرسی کا یہ عالم تھا کہ ان کے رسول اور آقا کو اپنے وطن میں سر چھپانے کی جگہ میسر نہیں تھی، وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر اجنبی سرزمین میں پناہ لینے جا رہے تھے اور جانی دشمن ان کی تلاش میں ہر طرف پھر رہے تھے۔ایسی حالت میں یہ پیش گوئی وہی کر سکتا تھا جس کی نگاہوں میں مکہ والے ہی نہیں، فارس و روم کی عظیم سلطنتوں کے مالک بھی اللہ کی معمولی مخلوق سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے ہوں اور اس کا پورا اعتماد صرف اپنے اللہ پر ہو، جس نے اسے دنیا میں آنے والے اس انقلاب کی پیشگی خبر دے دی ہو۔

صرف پندرہ برس بعد یہ کایا پلٹ چکی تھی اور کسریٰ کے خزانے مسلمانوں کے قدموں میں تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دنیا کو ارشادِ نبوی کی صداقت کا مشاہدہ کرانے کے لیے حضرت سُراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کو بلوا کر عام مجمعے میں انہیں وہ کنگن، تاج اور کمر بند پہنائے جن کی حسرت بڑے بڑے بادشاہ کرتے تھے، اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تلقین پر حضرت سُراقہ رضی اللہ عنہ نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور کہا: ''سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے یہ چیزیں خدائی کا دعوے کرنے والے کسریٰ سے چھین کر ایک عرب دیہاتی کو پہنا دیں۔''[①]

جنگ جَلُوْلاء:

مدائن سے بھاگنے کے بعد یزد گرد حلوان میں ڈیرے ڈال کر ایک بار پھر افواج جمع کر رہا تھا۔ادھر سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فتوحاتِ عراق کی تکمیل کے لیے پورا منصوبہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا تھا جس کے مطابق حضرت ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں بارہ ہزار کا لشکر پیش قدمی کرتے ہوئے جلولاء پہنچا، یہاں ایرانی سپہ سالار مہران مورچہ زن تھا جسے یزد گرد کی طرف سے مسلسل کمک پہنچ رہی تھی۔مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔اسّی دن تک ایرانی قلعہ بند ہو کر لڑتے رہے۔آخر ایک دن وہ شہر سے باہر نکل کر صف آراء ہوئے، مسلمانوں کو زخمی کرنے کے لیے انہوں نے میدان کے خاص حصوں میں کانٹے دار گولے بچھا دیے تھے، جنہیں ''حَسَک'' (گھوکرو) کہا جاتا تھا۔ اپنے دفاع کے لیے انہوں نے خندقیں بھی کھودی ہوئی تھیں۔

بہرحال جب جنگ انتہا کو پہنچی تو اچانک سیاہ آندھی چل پڑی جس سے ایرانی حواس باختہ ہو کر شہر کی طرف پسپا

---

① اسد الغابۃ، تر: سُراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ

ہونے لگے مگر اس بھگدڑ میں ہزاروں خندق میں گر کر مرے اور ہزاروں اپنے ہی بچھائے ہوئے کانٹے دار گوکھروں میں پھنس گئے، اس طرح ایک لاکھ کے لگ بھگ ایرانی ہلاک ہوئے، ان کا سالار مہران فرار ہوتے ہوئے مارا گیا اور یہ شہر بھی مسلمانوں کے قبضے آ گیا۔

یہ ذوالقعدہ سنہ ۱۶ ہجری کا واقعہ ہے۔ یزد گرد اس شکست کی خبر سنتے ہی حلوان سے بھی نکل بھاگا۔ مسلمانوں نے حلوان، مُوصل اور تکریت پر بھی فتح کے پرچم لہرا دیے، اس طرح پورا عراق اسلام کے سائے تلے آ گیا۔

مسلم فاتحین نے مقامی عوام کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا، سب کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا، ایرانی رئیسوں اور زمینداروں نے کسریٰ کے جابرانہ نظام سے نجات پانے پر چین کا سانس لیا اور خود آ کر اطاعت کا اظہار اور جزیہ دینے کا وعدہ کیا۔ یوں ہر طرف امن وامان قائم ہو گیا۔ ①

عراق کی پیداوار کا انتظام:

کسریٰ کی طاقت بکھر جانے کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اب فتوحات سے زیادہ نظامِ حکومت کو منظم کرنے اور مفتوحہ علاقوں کی آبادکاری وترقی کے لیے فکر مند تھے۔ آپ نے عراق کی زمین کی زرخیزی کو پیش نظر رکھتے ہوئے بڑے اہتمام سے زمین کے ایک، ایک چپے کی پیمائش کروائی، یہ کام کئی ماہ میں مکمل ہوا۔ پھر آپ نے ایرانی شاہی خاندان کے لوگوں، باغیوں اور مفروروں کی جائیدادوں، نیز آتش کدوں اور جنگلوں کی زمینوں کو الگ کر کے ان کی آمدنی سرکاری نگرانی میں عوام کی خدمت کے لیے مخصوص کر دی، باقی تمام زمینوں کو مقامی زمینداروں کے پاس رہنے دیا اور ان پر مناسب لگان مقرر کر دیا، جس کی وجہ سے لوگوں نے بھرپور انداز میں کاشت کاری میں دلچسپی لی اور بڑے بڑے خالی رقبے فصلوں اور باغوں سے ہرے بھرے ہو گئے۔ ایک سال میں صرف عراق کی زرعی پیداوار کا محصول آٹھ کروڑ سے بڑھ کر دس کروڑ درہم تک پہنچ گیا۔ (آج کل کے لحاظ سے یہ رقم پچیس ارب روپے کے لگ بھگ ہے) ②

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو الگ آباد کرنے اور فوجی چھاؤنیاں قائم کرنے کے لیے عراق میں بہترین آب وہوا والی زمین تلاش کرا کے باقاعدہ نقشے کے ساتھ بَصْرَہ اور کوفہ جیسے شہر تعمیر کرائے اور اکابر صحابہ کرام کو وہاں بسایا تاکہ ایمان ومعرفت اور علم وحکمت کی شمعیں روشن ہوں۔ ③

اگلے سال اسلامی فوجوں نے شمال کی طرف بڑھتے ہوئے الجزیرہ، نصیبین، الرہا اور آرمینیا تک یلغار کی۔ حضرت عیاض بن غنم، حضرت ولید بن عقبہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہم ان مہمات میں پیش پیش تھے۔ ④

---

① الكامل فى التاريخ: ۳۴۵/۲ تا ۳۴۹

② الخراج للقاضى ابى يوسف، ص ۳۶، ط المكتبة الازهرية مصر

③ الكامل فى التاريخ: تحت ۱۷ ہجری

④ بحوالہ بالا

ہُرمُزان......معرکہ تُستَر

اب مشرق میں غازیانِ اسلام عراق کی حدود سے نکل کر فارس کے میدانوں میں شہ سواری کر رہے تھے۔ ایرانیوں کا صرف ایک شہزادہ تھا جو شروع سے لے کر اب تک مسلمانوں سے نبرد آزما تھا۔ اس کا نام ہُرمُزان تھا جس کی عیاری، جنگجوئی اور سفاکی کا مسلمانوں کو بارہا تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ یزدگرد کے پاس جو ''رے'' میں ٹھہرا ہوا تھا، حاضر ہوا اور درخواست کی: ''اگر آپ خوزستان اور فارس کی حکومت میرے سپرد کر دیں تو میں مسلمانوں کے طوفان کو روک لوں گا۔'' یزدگرد نے فوراً حامی بھر لی، جس کے بعد ہرمزان نے خوزستان میں قلعہ بندی کر کے زبردست فوج جمع کر لی۔

حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس کے مقابلے کے لیے حضرت عُتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ مقرر تھے، جن کی کمک کے لیے بعد میں حضرت نُعَیم بن مسعود، حضرت نُعَیم بن مُقَرّن اور حضرت حَرمَلہ بن مُرَیطہ رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام بھی پہنچ گئے۔ ان حضرات نے نہر ''تیری'' کے کنارے ہرمزان کو جا لیا اور ایک خون ریز جنگ کے بعد اسے شکست دے دی۔ ہُرمُزان جان بچا کر ''اَہواز'' جا پہنچا مگر اسے خطرہ تھا مسلمان اس سے یہ علاقہ بھی چھین سکتے ہیں چنانچہ اس نے امیر لشکر عُتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ سے اس شرط پر صلح کر لی کہ ''اَہواز'' کا علاقہ اس کے پاس رہنے دیا جائے گا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس صلح کی منظوری دے دی۔ یوں چند ماہ تک کے لیے ہُرمُزان مسلمانوں کے حملے سے بے فکر ہو گیا۔ اس دوران وہ اپنی طاقت بڑھاتا رہا اور آخر مسلمانوں سے کچھ انتظامی معاملات میں اختلاف کو بہانہ بنا کر اس نے اعلانِ جنگ کر دیا، کسریٰ کے ہزاروں منتشر سپاہی اور ہزاروں پرجوش مجوسی اس کے گرد جمع ہو گئے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس کی سرگرمیوں کا پتا چلا تو آپ نے فوری طور پر اس کے تدارک کی طرف توجہ دی کہ کہیں دوسرے مفتوحہ علاقوں میں بھی اس کے منفی اثرات نہ پھیل جائیں۔ آپ نے اس مہم میں عُتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ کی کمک کے لیے حُرقُوص بن زُہَیر کی کمان میں تازہ دم فوج روانہ کی جس نے ''بازارِ اہواز'' کے پل کے پار اُتر کر ہُرمُزان سے ٹکر لی۔ ہرمزان شکست کھا کر بھاگا اور ''رام'' میں جا کر پناہ لی، اب اس نے ایک بار پھر صلح کی درخواست کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے ایک بار پھر فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہُرمُزان کی درخواست قبول کر لی۔

کچھ ہی مدت گزری تھی کہ یزدگرد کی ترغیب پر ہُرمُزان از سرِنو مسلمانوں کے خلاف صف بندی میں مصروف ہو گیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور بَصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو اس کی روک

تھام کرنے اور لشکر کا امیر حضرت نعمان بن مُقرّن رضی اللہ عنہ کو بنانے کا حکم بھیجا، ساتھ ہی نام لے کر جلیل القدر صحابہ کو ان کا ساتھ دینے کی تاکید کی، اس طرح اس لشکر میں حضرت نعمان بن مُقرّن اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کی کمان میں حضرت جَریر بن عبداللہ بجلی، حضرت براء بن عازب، حضرت اَنس بن مالک اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہم جیسے حضرات جمع ہو گئے۔ اَہواز کے قریب ''اَرْبَک'' کے مقام پر کھلے میدان میں زبردست جنگ ہوئی اور ہُرمُزان پسپا ہو کر تُسْتَر میں قلعہ بند ہو گیا۔ ①

اسلامی فوج ایک ماہ تک ''تُسْتَر'' کی فلک بوس فصیل کا محاصرہ کیے رہی، دونوں طرف سے پتھروں اور تیروں کی بارش ہوتی رہی، ہُرمُزان وقفے وقفے سے تھوڑی تھوڑی فوج کے ذریعے مسلمانوں پر تند و تیز حملے کرتا رہتا تھا اور انہیں شدید زِک پہنچاتا تھا، مگر ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ ② دونوں طرف سے کئی کئی ایکا ایکی مقابلے بھی ہوئے۔ حضرت براء بن مالک، مَجزأۃ بن ثور، حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہم اور حضرت کعب بن سور رحمہ اللہ جیسے بہادروں نے ایسے مقابلوں میں ایک سو ایرانی سورماؤں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ ③

ایک شب ایرانی فصیل سے نکل کر اچانک مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ مسلمان ان کے دباؤ کی وجہ سے درہم برہم ہونے لگے۔ اچانک کسی کو حضرت بَراء بن مالک رضی اللہ عنہ کا خیال آیا جو بہادری اور طاقت کے علاوہ دعاؤں کی قبولیت کے لیے بھی مشہور تھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''بعض خستہ حال گرد آلود ایسے ہوئے کہ اللہ کی قسم کھا کر کوئی بات کہہ دیں تو اللہ تعالیٰ اسے کر دکھاتا ہے۔ بَراء بن مالک بھی ایسے ہی ہیں۔'' ④

انہی کی جانبازی کی بدولت مسلمانوں نے جنگ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کے حصار میں گھس کر اس کا قصہ پاک کیا تھا۔ مسلمانوں نے انہیں پکار کر کہا: ''بَراء! آج تو اللہ کی قسم کھا لو کہ اللہ دشمنوں کو شکست دے۔''

حضرت بَراء رضی اللہ عنہ بولے: ''یا اللہ! آج تجھے قسم ہے ہمیں دشمنوں پر غالب کر دے اور مجھے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا دے۔'' ⑤ یہ کہہ کر وہ آندھی کی طرح ایرانیوں پر حملہ آور ہوئے، دوسرے مسلمانوں نے بھی ان کے پیچھے زوردار حملہ کیا اور انہیں دھکیلتے ہوئے خندق پار کر کے فصیل تک پہنچا گئے۔

اس دوران شہر والوں میں سے کسی نے مسلمانوں کو شہر میں داخل ہونے کا ایک خفیہ راستہ بتا دیا۔ یہ ایک چھوٹی سی نہر تھی جس سے شہر میں پانی داخل ہوتا تھا، کچھ مسلمان تیر کر اس کے ذریعے فصیل کے اندر چلے گئے اور پہرے داروں پر قابو پا کر دروازے کھول ڈالے۔ یہ فجر کا وقت تھا، سورج طلوع ہونے تک شہر فتح ہو چکا تھا، اس دوران ہُرمُزان قلعے میں گھس گیا اور وہاں سے مسلمانوں کو تیروں کا نشانہ بنا رہا تھا۔

① الکامل فی التاریخ: ۳۶۴/۲ تا ۳۶۸
② الکامل فی التاریخ: ۳۶۸/۲
③ البدایۃ والنہایۃ: ۵۹/۱۰   ④ سنن الترمذی، ح: ۳۸۵۴، ابواب المناقب، باب مناقب البراء بن مالک رضی اللہ عنہ
⑤ اسد الغابۃ، تر: البراء بن مالک رضی اللہ عنہ، الکامل فی التاریخ: ۳۶۸/۲

حضرت بَراء بن مالک رضی اللہ عنہ قلعے پر حملہ آور ہوئے تو ہُرمُزان نے انہیں شہید کر ڈالا۔ حضرت مَجزأۃ بن ثور رضی اللہ عنہ بھی اسی طرح قلعے میں داخل ہونے کی کوشش کے دوران ہُرمُزان کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

آخر میں ہُرمُزان نے پکار کر کہا: ''میرے ترکش میں سو تیر باقی ہیں۔ مجھ تک پہنچنے سے پہلے تمہاری سو لاشیں گریں گی۔ ہاں اگر تم مجھے عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) کے پاس زندہ سلامت لے جانے کا وعدہ کرو تو میرے بارے میں وہ جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔''

مسلمانوں نے وعدہ کر لیا اور ہرمزان نے ہتھیار ڈال دیے۔ راجح قول کے مطابق یہ واقعہ ۲۰ھ کا ہے۔

اسے مدینہ منورہ لے جا کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔

امیر المؤمنین اس وقت مسجد میں زمین پر سو رہے تھے۔ کوئی دربار تھا نہ پہرا۔ ہُرمُزان پوچھنے لگا:

''تمہارے امیر کہاں ہیں؟'' اسے بتایا گیا: ''یہی تو ہیں۔''

حیران ہو کر بولا: ''ان کے دربان اور محافظ کہاں گئے؟'' بتایا گیا: ''وہ دربان یا محافظ نہیں رکھتے۔''

اس دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیدار ہو گئے۔ ہُرمُزان شہزادہ تھا، اپنا ریشمی لباس اور تاج پہنے ہوئے تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم سے اسے عام کپڑے پہنا کر سامنے لایا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے عار دلاتے ہوئے کہا:

''ہُرمُزان! بدعہدی کا انجام اور اللہ کا فیصلہ دیکھ لیا۔''

وہ خوشامدانہ انداز میں بولا: ''زمانہ جاہلیت میں خدا نے ہمیں موقع دیا تھا، ہم غالب رہے، اب خدا آپ کے ساتھ ہو گیا، آپ غالب آ گئے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''دراصل اس زمانے میں تم اس لیے ہم پر مسلط رہے کہ تم متحد تھے اور ہم منتشر۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے متعلق اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ کیا کہتے ہیں؟ (قتل کیا جائے یا نہیں)

ہُرمُزان اگرچہ اَنس رضی اللہ عنہ کے بھائی بَراء بن مالک رضی اللہ عنہ کا قاتل تھا مگر اَنس رضی اللہ عنہ نے انتہائی وسعتِ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا: ''امیر المؤمنین! آپ اسے قتل کر دیں گے تو اس کی قوم کے لوگ زندگی سے مایوس ہو جائیں گے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''انس! میں بَراء اور مَجزأۃ رضی اللہ عنہما کے قاتل کو کیسے چھوڑ دوں!!''

اس دوران ہُرمُزان نے پانی مانگا۔ پانی لایا گیا تو وہ بولا: ''ڈرتا ہوں کہ پانی پینے لگوں تو آپ اس دوران مجھے قتل کروا دیں۔'' آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''لَابَاسَ عَلَیْکَ حَتّٰی تَشْرَبَہ.'' (جب تک تم پانی نہ پی لو مامون ہو۔)

یہ سنتے ہی اس نے پیالہ گرا دیا اور بولا: ''اب تو آپ نے جان بخشی کر دی۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انکار کیا کہ میرا یہ مطلب نہ تھا مگر خود حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''اب اس کے قتل کی کوئی گنجائش نہیں، آپ نے اسے لَابَاس کہہ دیا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس مسئلے پر کوئی اور بھی تمہارے ساتھ گواہی دینے والا ہے۔''

حضرت اَنس رضی اللہ عنہ جا کر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو لے آئے۔ انہوں نے تائید کی کہ لَا بَــــاْس کہنے سے جان بخشی ثابت ہو جاتی ہے۔ ذاتی طور پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہُرمُزان کو جو حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ جیسے صحابی کا قاتل تھا اس طرح چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے، مگر جب دیگر حضرات نے بھی حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کی تائید کی تو آپ رضی اللہ عنہ نے ہُرمُزان سے فرمایا: ''دیکھو! میں دھوکے میں آنے والا آدمی نہیں ہوں، ہاں، تم اسلام لے آؤ تو اور بات ہے۔''

ہُرمُزان نے فوراً اسلام لانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خوش ہوئے اور اسے انعام کے طور پر دو ہزار درہم اور مدینہ میں ایک مکان بھی دے دیا۔[1]

غسانی شہزادہ...... جَبَلَة بن اَیْهَم:

انہی دنوں ایک یمنی شہزادہ جَبَلَة بن اَیْهَم بھی مشرف بہ اسلام ہوا تھا، یہ شام میں بسنے والے عرب عیسائیوں کے قبیلے بنوغسان کا سرکردہ فرد اور شاہی خانوادے کا آخری شہزادہ تھا۔ یَرمُوک کی جنگ میں رومیوں کا سالار بھی رہا تھا۔ ایک مدت تک مسلمانوں سے برسرِ پیکار رہنے کے بعد آخر اس نے اسلام قبول کر لیا اور اپنے ساتھیوں، محافظوں اور غلاموں کے ساتھ مدینہ منورہ آیا۔ اس کی شان و شوکت دیکھ کر لوگوں کو تعجب ہو رہا تھا۔ یہ سنہ ۱۶ ہجری کا واقعہ ہے۔

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور وہ مسلم معاشرے کا ایک حصہ بن گیا مگر جاہلیت کا فخر و غرور اب تک اس کی رگوں میں رچا بسا تھا چنانچہ وہ حج کے لیے مکہ گیا تو وہاں طواف کے دوران بنوفزارہ کے ایک شخص کا پاؤں اس کے احرام کی چادر پر اس طرح پڑا کہ بدن کھل گیا۔ جَبَلہ نے غصے سے بے قابو ہو کر اسے ایسا طمانچہ رسید کیا کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی، مظلوم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فریاد کی، آپ نے جَبَلہ کو بلوا کر معاملہ دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا: ''ہاں، امیر المؤمنین! میں نے ایسا کیا ہے اور اگر کعبہ کی حرمت کا پاس نہ ہوتا تو میں اپنی تلوار اس کے سر میں اُتار دیتا۔'' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''تم نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے، اب یا تو اس فریادی کو کسی طرح راضی کرو، ورنہ مجھے تم سے بدلہ لینا ہوگا۔''

جَبَلہ اپنی خاندانی وجاہت اور مرتبے کی وجہ سے یہ تصور کیے بیٹھا تھا کہ وہ قانون سے بالاتر شمار ہوگا، اس لیے یہ سن کر ششدر رہ گیا اور بولا: ''یہ کیسے ہو سکتا ہے!! میں شہزادہ ہوں اور وہ عام آدمی!!'' آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اسلامی شرع کے لحاظ سے تم دونوں یکساں ہو۔'' وہ بھنا کر بولا: ''میں تو سمجھتا تھا کہ مسلمان ہو کر میں زیادہ معزز بن جاؤں گا۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''جو تم دیکھ رہے ہو یہی عزت ہے۔ اب قصاص دو یا فریادی کو راضی کر لو۔''

جَبَلہ نے کہا: ''اگر یہ بات ہے تو میں دوبارہ عیسائی ہو جاؤں گا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر ایسا کرو گے تو اسلام سے برگشتہ ہونے کی پاداش میں قتل کر دیے جاؤ گے۔'' جَبَلہ سمجھ گیا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ قانون اور انصاف کے تقاضے پورے کیے بغیر اسے نہیں چھوڑیں گے تو اس نے حیلہ جوئی کا راستہ اپناتے ہوئے سوچ بچار کے لیے ایک دن

[1] الكامل فی التاريخ: ۳۶۹/۲ تا ۳۷۱؛ تاريخ خليفة بن خياط، ص ۱۴۷

کی مہلت مانگی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عنایت کر دی۔ جبلہ اسی رات اپنے ساتھیوں سمیت کوچ کر گیا۔[1]

جبلہ بن ایہم کا حسرت ناک انجام:

جبلہ نے وہاں سے سیدھا ہرقل کے پاس قُسْطَنْطِيْنِيَّه جا کر دم لیا اور عیسائی ہونے کا اعلان کر دیا۔ ہرقل نے اسے جاگیریں دے کر فکرِ معاش سے بے فکر کر دیا۔ جبلہ نے باقی زندگی وہیں عیش وعشرت میں گزاری۔ اسے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے وہ اشعار بہت پسند تھے جو انہوں نے زمانہ جاہلیت میں آلِ غسان کے عروج کے متعلق کہے تھے۔ اپنا غم بھلانے کے لیے وہ یہ اشعار سُنتا رہتا تھا۔[2] ساتھ ہی کبھی وہ حسان رضی اللہ عنہ کے وہ اشعار بھی یاد کرتا جس میں اس خاندان کے دورِ زوال کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔[3]

---

[1] فتوح الشام للواقدی: ۱/۱۰۰، ط العلمیة ؛ البدایة والنهایة: ۱۱/۲۶۳، ۲۶۵

[2] ان میں سے کچھ اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

لِلّٰهِ دَرُّ عِصَابَةٍ نَادَمْتُهُمْ ... يَوْمًا بِجِلِّقَ فِي الزَّمَانِ الْأَوَّلِ

"اللہ بھلا کرے اس ٹولی کا جس کے ساتھ میں پرانے زمانے میں ایک دن جِلّق نامی مقام پر مے نوشی کے لیے ہم نشین ہوا۔"

أَوْلَادُ جَفْنَةَ حَوْلَ قَبْرِ أَبِيْهِمُ ... قَبْرُ ابْنِ مَارِيَةَ الْكَرِيْمِ الْمُفْضِلِ

"یہ لوگ آلِ جفنہ ہیں جن کے والد کی قبر کے پاس سخی اور صاحبِ فضیلت ابن ماریہ کی قبر ہے۔"

يَسْقُوْنَ مَنْ وَرَدَ الْبَرِيْصَ عَلَيْهِمُ ... صَفْقًا يُصَفَّقُ بِالرَّحِيْقِ السَّلْسَلِ

"جو بھی بریص نامی مقام پر ان کے پاس آتا ہے، یہ اسے میٹھے اور بہتے پانی سے ملی شراب پلاتے ہیں۔"

بِيْضُ الْوُجُوْهِ كَرِيْمَةٌ أَحْسَابُهُمْ ... شُمُّ الْأُنُوْفِ مِنَ الطِّرَازِ الْأَوَّلِ

"ان کے چہرے چمک دار ہیں اور حسب نسب اعلیٰ۔ یہ بلند ناکوں والے قدیم آباء کے نقشِ قدم پر ہیں۔"

يُغْشَوْنَ حَتّٰى مَا تَهِرُّ كِلَابُهُمْ ... لَا يَسْأَلُوْنَ عَنِ السَّوَادِ الْمُقْبِلِ

"ان کے پاس اس قدر آمد ورفت ہوتی ہے کہ ان کے کتوں نے بھونکنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ لوگ کسی آنے والے سے پوچھ گچھ نہیں کرتے۔"

(بحواله: العقد الفريد: ۱/۳۱۳؛ البداية والنهاية: ۱۱/۲۶۶، ۲۶۷؛ الوافي بالوفيات: ۱۱/۴۲)

[3] ان میں سے کچھ اشعار یہ ہیں:

لِمَنِ الدَّارُ أَقْفَرَتْ بِمَعَانٍ ... بَيْنَ أَعْلَى الْيَرْمُوْكِ فَالصَّمَّانِ

"یرموک اور صمان کے بلندیوں کے مابین واقع مَعان شہر میں یہ کس کی حویلی اجڑ گئی؟"

ذَاكَ مَغْنًى لِآلِ جَفْنَةَ فِي الدَّهْـ ... ـرِ، مَحَاهُ تَعَاقُبُ الْأَزْمَانِ

"یہ تو ایک زمانے سے آلِ جفنہ کی رہائش گاہ تھی، جسے زمانے کی گردشوں نے مٹا دیا۔"

قَدْ أَرَانِي هُنَاكَ دَهْرًا مَكِيْنًا ... عِنْدَ ذِي التَّاجِ مَجْلِسِي وَمَكَانِي

"میں یاد کرتا ہوں کہ وہاں میں ایک مدت تک آباد رہا۔ میری نشست اور جگہ تاج دار (بادشاہ) کے پاس تھی۔"

ثَكِلَتْ أُمُّهُمْ وَقَدْ ثَكِلَتْهُمْ ... يَوْمَ حَلُّوْا بِحَاوِثِ الْجَوْلَانِ

"ان کی ماں انہیں گم کرے، اور وہ گم کر چکی جب وہ حوادث کی گردش میں جا پڑے۔"

وَدَنَا الْفِصْحُ فَالْوَلَائِدُ يَنْظِمْـ ... ـنَ سِرَاعًا أَكِلَّةَ الْمَرْجَانِ

"(اب مفلسی کا یہ عالم ہے کہ) عید قریب آ گئی اور بچیاں جلدی جلدی مونگے کے دانوں کی غذا تیار کر رہی ہیں۔"

(بحواله: العقد الفريد: ۱/۳۱۴؛ البداية والنهاية: ۱۱/۲۶۷؛ الوافي بالوفيات: ۱۱/۴۳)

اپنی ریاست اُجڑ جانے کا غم اسے دُکھی کر دیتا تھا۔ مگر اس سے کہیں بڑھ کر اللہ کے سچے دین کو ترک کرنے کی خلش کانٹے کی طرح اس کے دل میں چبھتی رہی۔ وہ خود بھی بڑا شاعر تھا۔ جب اسے مسلمانوں کے معاشرے میں گزارے گئے دن یاد آتے تو رنج و غم میں ڈوب کر بڑے الم انگیز اشعار کہتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار جُثّامہ بن مُساحق کو قیصر ہرقل کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ ہرقل نے ملاقات اور ضروری گفتگو کے بعد انہیں کہا کہ تم جَبَلہ سے بھی مل لو۔ جُثّامہ بن مُساحق جبلہ کے قصر پر پہنچے تو دیکھا اس کی شان و شوکت قیصر سے کم نہیں۔ جبلہ نے ان کی اچھی طرح خاطر تواضع کی۔ پھر محفل آراستہ کر کے انہیں حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بہت سے اشعار سنوائے۔ اس کے بعد حسان رضی اللہ عنہ کا حال احوال پوچھا: جثّامہ بن مُساحق نے کہا: ''وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ بینائی بھی جواب دے چکی ہے۔''

جَبلہ خاموش ہو گیا اور پھر اپنی حالت پر یہ اشعار پڑھے:

تَنَصَّرَتِ الْاَشْرَافُ مِنْ اَجْلِ لَطْمَةٍ
وَمَا كَانَ فِيْهَا لَوْ صَبَرْتُ لَهَا ضَرَرْ

شرفاء صرف ایک تھپڑ سے بچنے کی خاطر نصرانی بن گئے،
حالانکہ اگر میں اسے برداشت کر لیتا تو اس میں کچھ نقصان نہ ہوتا۔

تَكَنَّفَنِيْ فِيْهَا لَجَاجٌ وَنَخْوَةٌ
وَبِعْتُ لَهَا الْعَيْنَ الصَّحِيْحَةَ بِالْعَوَرْ

مجھے اس معاملے میں ضد اور تکبر نے جکڑ لیا،
اور میں نے صحیح و سالم آنکھ (اسلام) کو بے نور آنکھ (عیسائیت) کے بدلے بیچ ڈالا۔

فَيَالَيْتَ اُمِّيْ لَمْ تَلِدْنِيْ وَلَيْتَنِيْ
رَجَعْتُ اِلَى الْقَوْلِ الَّذِيْ قَالَهُ عُمَرْ

اے کاش! کہ میری ماں مجھے نہ جنتی،
اور اے کاش! میں اس بات کی طرف لوٹ سکتا جو عمر (رضی اللہ عنہ) نے کہی تھی۔

وَيَا لَيْتَنِيْ اَرْعَى الْمَخَاضَ بِقَفْرَةٍ
وَكُنْتُ اَسِيْرًا فِيْ رَبِيْعَةَ اَوْ مُضَرْ

اے کاش! کہ میں کسی جنگل میں اونٹنیاں چراتا رہتا
اور ربیعہ یا مُضر (کی کسی جنگ) میں قیدی بن جاتا۔

وَيَا لَيْتَنِيْ بِالشَّامِ اَدْنٰى مَعِيْشَةٍ
اُجَالِسُ قَوْمِيْ ذَاهِبَ السَّمْعِ وَالْبَصَرْ

اے کاش! کہ شام میں میرے پاس معمولی گزربسر کا سامان ہوتا
اور میں اندھا بہرا ہو کر ہی سہی، اپنی قوم کی ہم نشینی کر سکتا۔

پھر جبلہ پر رقت طاری ہوگئی اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر زاروقطار رونے لگا۔ جب کچھ سنبھلا تو حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لیے ایک ہزار اشرفیاں اور گندم سے لدی بہت سی اونٹنیاں تیار کرنے کا حکم دیا اور سفیر کو کہا: ''حسان کو میرا سلام کہہ کر یہ رقم انہیں دے دینا۔ اگر وہ فوت ہو چکے ہوں تو رقم ان کے ورثاء کے سپرد کر دینا اور اونٹنیاں ان کی قبر پر قربان کر دینا۔'' دوران گفتگو سفیر نے جبلہ کو اسلام لانے کی ترغیب دی مگر وجاہت اور مناصب کی حرص اس سعادت میں آڑے آگئی۔ واپس آکر سفیر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جبلہ سے ملاقات کا حال سنایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اس نے جلد بازی کی۔ فانی دنیا کو ابدی آخرت پر ترجیح دی۔ پس اس کی تجارت نفع بخش نہ ہوئی۔''

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بلوایا۔ انہوں نے آتے ہی فرمایا: ''امیر المومنین آلِ جفنہ کی بو آرہی ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہاں یہ صاحب ان کے ہاں سے ہو کر آئے ہیں۔''

حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: ''لاؤ ان کا ہدیہ۔ میں نے زمانہ جاہلیت میں ان کی مدح سرائی کی تھی جس پر انہوں نے قسم کھائی تھی کہ انہیں جب کبھی میرا کوئی واقف کار ملے گا تو اس کے ہاتھ مجھے ہدیہ ضرور بھیجیں گے۔''[1]

جبلہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت تک زندہ رہا۔ ۵۳ھ میں اس نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ اگر دمشق کے نواحی قصبے غوطہ میں واقع آلِ غسان کا آبائی محل اور بیس گاؤں اس کے نام کر دیے جائیں تو وہ واپس شام آجائے گا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے (اس کے اسلام لانے کی امید پر) یہ وعدہ کر لیا۔ مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سفیر عبداللہ بن مسعدہ رضی اللہ عنہ جب یہ پیغام لے کر قسطنطنیہ پہنچے تو آلِ غسان کے اس آخری شہزادے کی آخری رسومات ادا کی جارہی تھیں۔

نہایت عبرت کا مقام ہے کہ ایک شخص حق کو پہچان کر اس سے برگشتہ ہوگیا۔ اسلام میں داخل ہو کر پھر اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہوگیا۔ نخوت اور تکبر نے اسے اس حال تک پہنچایا۔ اسی لیے تکبر کو ''اُم الامراض'' کہا جاتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اہلِ حق کا ساتھ چھوڑ کر اس نے ہر قسم کا اسبابِ عیش و آرام جمع کر لیا مگر پھر بھی عمر بھر اسے دلی سکون نصیب نہ ہوا۔ جان بوجھ کر اہلِ حق کا ساتھ چھوڑنے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ یہ بھی دیکھیے کہ اسے رجوع اور توبہ کے لیے طویل مدت ملی مگر وہ افسوس ہی کرتا رہا اور توبہ نہ کی۔ یہ شیطان کا بہت بڑا دھوکہ ہے۔ فقط افسوس کچھ کام نہیں آتا۔ جب انسان پر اپنی غلطی ظاہر ہو جائے تو اسے رجوع، انابت اور توبہ میں بالکل دیر نہیں کرنی چاہیے۔

☆☆☆

---

[1] البداية والنهاية: ۲۶۵/۱۱ تا ۲۶۸؛ المنتظم لابن الجوزی: ۲۵۹/۵، ۲۶۰؛ العقد الفريد: ۳۱۴/۱، ۳۱۵؛ تاريخ دمشق: ۲۸/۷۲ تا ۳۶

[2] البداية والنهاية: ۲۶۸/۱۱، ۲۶۹

شمالی شام میں

جن دنوں قادسیہ اور مدائن میں ساسانیوں کے تاج وتخت الٹے جارہے تھے، شام میں بازنطینیوں کا سورج بھی غروب ہو رہا تھا۔ جنگ یرموک کے بعد سنہ ۱۵ ہجری میں حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ نے تیزی سے شمال کی طرف پیش قدمی کی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو 'قِنّسرین' پر یلغار کا حکم دیا جہاں قیصر ہرقل کا نائب السلطنت میناس خود موجود تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کھلے میدان میں رومیوں کو شکست دے کر میناس کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور قِنّسرین کو زیرنگین کر کے قیصر کی تلاش میں شام کی آخری حدود تک بڑھتے چلے گئے۔ مگر قیصر شام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ کر قُسطَنطِینِیّہ جا چکا تھا۔ اس کے بعد رومیوں نے بھی بڑے بڑے قلعے خالی کر دیے اور شہروں سے فوجیں نکال لیں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کسی خاص مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اسی سال شام کے شمالی صوبوں حَلب اور اَنطاکیہ کو بھی فتح کر لیا۔ ①

☆☆☆

فتح بیت المقدس:

غرض حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ابھی تین سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ شام میں حمص، دمشق، حلب، انطاکیہ اور قِنّسرین جیسے بڑے بڑے شہر فتح ہو چکے تھے۔ تاہم بیت المقدس کے محل وقوع اور اس کی مذہبی وتاریخی اہمیت کے پیش نظر اس کی فتح کو مؤخر کیا جاتا رہا تاکہ یہاں کشت وخون کے بغیر قبضہ کیا جا سکے۔

شام میں مسلمانوں کے سپہ سالار اعلیٰ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت سالاروں میں حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی تھے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور سے فلسطین کے محاذ پر تعینات تھے۔ جب قبلۂ اوّل کی بازیابی کے لیے یلغار کا فیصلہ ہوا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حمص سے خود حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس فلسطین چلے آئے۔ حضرت خالد بن ولید، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت مُعاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام بھی اس محاذ پر جمع ہو گئے۔

سنہ ۱۶ھ میں اس مقدس شہر کا محاصرہ کر لیا گیا، مقامی عیسائیوں نے مقابلہ بے سود سمجھتے ہوئے صلح کی شرائط پیش کر دیں۔ چونکہ یہ مقام عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں تینوں کے لیے انتہائی مقدس حیثیت رکھتا تھا اس لیے شہر کے عمائد نے خواہش ظاہر کی کہ مسلمانوں کے سربراہ خود تشریف لا کر یہاں صلح کے معاہدے کی منظوری دیں تاکہ بعد میں مختلف اقوام کے درمیان کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہونے پائے۔ مسلمان خود بھی اس بابرکت شہر میں خون ریزی نہیں چاہتے تھے، اس لیے فوراً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف قاصد دوڑایا، آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کیوں کہ اس میں یہ احتمال

---

① الکامل فی التاریخ: ۳۲۴/۲ تا ۳۲۶

بھی تھا کہ صرف ایک شہر کی فتح کے لیے مسلمان سربراہ کا خود چل کر آنا منصبِ خلافت کے رعب داب کو متاثر نہ کرے، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے پر فیصلہ ہوا جو امیر المؤمنین کے بیت المقدس تشریف لے جانے کو بہتر بتا رہے تھے۔

آخر رجب سنہ ۱۶ ہجری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر مدینہ طیبہ سے اس طرح بیت المقدس روانہ ہوئے کہ تنہا ایک اُونٹ پر سوار تھے، کوئی محافظ دستہ ساتھ تھا نہ درباریوں اور خادموں کی فوج۔ کوئی چھتری تھی نہ عمامہ، صحرائے عرب میں آپ اس طرح سفر کرتے رہے کہ سورج کی تیز شعاعیں بدن کو جھلسائے دیتی تھیں۔ آرام کے وقت آپ اونٹ کی زین اتارتے اور اسے تکیہ بنالیتے، اپنی اونی چادر بچھا کر اس پر سو جاتے۔

شام کی سرحدوں میں داخل ہونے تک آپ کی قمیص میلی ہو چکی تھی بلکہ پھٹ بھی گئی تھی۔ شام کے امرائے فوج کو طے شدہ دن میں دمشق کے قریب ''جابیہ'' کے مقام پر آپ رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے لیے جمع ہونے کی ہدایت بھیج دی گئی تھی۔ آپ بیت المقدس کو بائیں ہاتھ پر چھوڑتے ہوئے شمال کا سفر کرتے ہوئے سیدھا ''جابیہ'' کی طرف جا رہے تھے۔ دمشق کی خوشنما آبادیاں، باغ اور مکانات دیکھے تو بے ساختہ یہ آیات تلاوت فرمائیں:

﴿كَمْ تَرَكُوا مِن جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ○ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ○ وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ ○ كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ ○﴾

(وہ لوگ چھوڑ گئے کتنے ہی باغ اور چشمے، اور کھیتیاں اور عمدہ مکانات، اور آرام کے سامان جن میں وہ خوش رہا کرتے تھے اسی طرح ہوا اور ہم نے ایک دوسری قوم کو اس کا وارث بنا دیا۔)[1]

راستے میں ایک یہودی نے اچانک آپ کو دیکھا اور غالباً اپنی مذہبی روایات کی بنا پر فوراً پہچان لیا اور بولا:

''اے فاروق! تم ہی بیت المقدس کے فاتح ہو۔''[2]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب شام پہنچے تو مسلمان سپاہی آپ کے منتظر تھے، آپ صرف ایک چادر لپیٹے، عمامہ اور موزے پہنے اپنے اونٹ کی لگام تھامے پانی کے چشموں اور تالابوں سے گزر کر ان کی طرف آ رہے تھے۔ کسی نے کہا:

''امیر المؤمنین! یہاں شام کی افواج اور عیسائی پادری آپ کے استقبال کے لیے کھڑے ہیں اور آپ کی یہ حالت؟'' آپ نے فرمایا: ''إِنَّا قَوْمٌ أَعَزَّنَا اللّٰهُ بِالْإِسْلَامِ فَلَنْ نَبْتَغِيَ الْعِزَّةَ بِغَيْرِهٖ''

''ہم وہ قوم ہیں جسے اللہ نے عزت اسلام کی وجہ سے دی، پس ہم عزت کسی اور چیز میں تلاش نہیں کریں گے۔''[3]

جابیہ پہنچے تو مسلمان آپ کے بے چینی سے منتظر تھے۔ حضرت ابوعبیدہ، حضرت خالد بن ولید اور حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم نے آپ کا استقبال کیا۔ آپ نے یہاں سالارانِ فوج سے ایک مؤثر خطاب کیا جس میں فرمایا:

---

① سورۃ الدخان، آیت: ۲۵ تا ۲۸
② البدایۃ والنہایۃ: ۹/۶۵۵ تا ۶۵۹
③ مستدرک حاکم، ح: ۲۰۷. ط العلمیۃ

"اپنے دل کو درست رکھو، ظاہر بھی درست ہو جائے گا۔ ہر کام آخرت کی نیت سے کرو، دنیا بھی سنور جائے گی۔ جو جنت میں جانے کی تمنا رکھے وہ مسلمانوں کی اجتماعیت میں جڑا رہے کہ اکیلے کے ساتھ شیطان شریک ہو جاتا ہے۔"

جابیہ ہی میں بیت المقدس کے نصرانی عمائد بات چیت کے لیے آئے، چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لباس اور سواری بہت معمولی تھے، اس لیے سالارانِ فوج نے چاہا کہ آپ موقع کے مطابق گھوڑے پر سوار ہوں اور عمدہ پوشاک پہن کر ان لوگوں کے سامنے جائیں مگر آپ رضی اللہ عنہ نے سختی سے منع کر دیا اور فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کی بدولت جو عزت دی ہے ہمارے لیے وہی کافی ہے۔"[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کی دی ہوئی پوشاک صرف تھوڑی دیر کے لیے پہنی وہ بھی صرف اس لیے کہ اس دوران آپ کی قمیص کو دھویا گیا اور اس کی پھٹن پر پیوند لگائے گئے، پھر آپ نے یہی پیوند لگی قمیص پہن لی۔[2]

اس سادہ وضع قطع میں القدس کے عمائد سے گفتگو کی، صلح کے امور طے پا گئے اور درج ذیل معاہدے پر دستخط کیے گئے:

"اللہ کے بندے امیر المومنین عمر کی طرف سے ایلیاء (بیت المقدس) والوں کے لیے جان و مال کی امان ہے۔ ان کے گرجے، صلیبیں اور پوری قوم سب مامون ہیں۔

ان کی عبادت گاہوں کو کوئی رہائش گاہ بنائے گا نہ اُن کو منہدم کیا جائے گا، نہ ان کی تعمیرات اور احاطے میں کمی کی جائے گی، نہ ان کی صلیبیں اور اموال چھینے جائیں گے، دین بدلنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

بیت المقدس کے باشندوں پر لازم ہوگا کہ وہ دوسرے شہر والوں کی طرح جزیہ ادا کریں۔ ان پر یہ بھی لازم ہے کہ رومی (سپاہیوں اور عملے) کو شہر سے نکال دیں۔"[3]

معاہدے کے مطابق مقامی باشندوں نے تین دن کے اندر رومی سپاہیوں کو شہر سے نکال دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ قبلۂ اوّل کی زیارت کے لیے تشریف لے چلے۔ راستے میں ایک نہر آئی تو آپ نے موزے اُتار کر ہاتھ میں لیے اور اونٹ سے اتر کر پیدل اسے پار کر لیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حیران ہو کر فرمایا:

"آپ کا اس طرح کرنا مقامی لوگوں کی نگاہوں میں بہت معیوب ہوگا۔"

آپ رضی اللہ عنہ نے ان کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: "ابوعبیدہ! ایسی بات تم کہہ رہے ہو! بھول گئے تم لوگ دنیا میں سب سے بے قدر، کمزور اور گرے ہوئے تھے، اللہ نے صرف اسلام کی بدولت تمہیں عزت دی ہے۔ پس اب تم جب بھی اسلام کو چھوڑ کر کسی چیز میں عزت ڈھونڈو گے اللہ تمہیں پھر ذلیل کر دے گا۔"[4]

---

[1] البداية والنهاية: ۲۲۵/۹ [2] بحواله بالا

[3] تاريخ الطبرى: ۲۰۹/۳ [4] البداية والنهاية: ۲۲۶/۹، دار هجر

آپ نے مسجد میں جا کر محرابِ داؤد کے پاس دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کی۔

قبلۂ اوّل یعنی صخرۂ مقدسہ کو رومیوں نے گندگی اور نجاست کا ڈھیر بنا رکھا تھا، وجہ صرف یہ تھی کہ یہ یہودیوں کا قبلہ تھا، عیسائی یہودیوں کو جلانے کے لیے یہ حرکت کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مقدس چٹان کو تلاش کرنے لگے تو حضرت کعب اَحبار نے جو ایک یہودی عالم تھے اور انہی دنوں مسلمان ہوئے تھے، آپ کو اشارے سے بتایا کہ صخرۂ مقدسہ یہاں ہے۔ ساتھ ہی تجویز پیش کی کہ یہاں نئی مسجد اس طرح تعمیر کرائیں کہ محراب صخرہ کے پیچھے ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہاں کے نمازی کعبہ کے ساتھ ساتھ قبلۂ اوّل کا رخ بھی کر سکیں مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ناپسند کیا اور مقدس چٹان کے آگے اس طرح مسجد بنانے کا حکم دیا کہ نمازیوں کا رُخ کعبہ کی طرف اور پشت صخرۂ مقدسہ کی طرف رہے تاکہ یہودیوں سے مشابہت کا کوئی ذرا سا بھی امکان نہ رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے صخرۂ مقدسہ سے کوڑا کرکٹ ہٹایا جانے لگا۔ ابتدا آپ نے خود کی، اپنی چادر پھیلا کر اس میں کچرا اُٹھانے لگے، دوسرے حضرات بھی لپکے۔ یوں اس جگہ کو پاک صاف کیا گیا اور سامنے مسجد تعمیر کی گئی جو آج تک ''مسجد عمر'' کے نام سے مشہور ہے۔ اسی کو مسجدِ اقصیٰ کہا جاتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ دن شام ٹھہرے اور پھر سنہ ۱۷ ہجری کے آغاز میں واپس مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ ①

☆☆☆

قیصر کی آخری کوشش:

بیت المَقدِس کی فتح کے بعد رومیوں کی ساری امیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔ خود قیصر ہرقل شام میں دوبارہ مداخلت سے مایوس تھا مگر سنہ ۱۷ ہجری میں الجزیرہ کے حکام اور باشندوں نے اسے اپنے تعاون کا یقین دلا کر از سرِ نو مسلمانوں سے لڑنے پر ابھارا۔ چنانچہ قیصر نے اپنے ایشیائی دارالحکومت حِمص کو واپس لینے کے لیے آخری کوشش کے

① البدایۃ والنہایۃ: ۹/۶۵۵، ۶۶۷، دارِ ھجر

ایک غیر مستند روایت کا محاکمہ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بیت المَقدِس کے سفر کے بارے میں واعظین حضرات اکثر بیان کرتے ہیں کہ:

- سفر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک غلام تھا، دونوں باری باری اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔
- بیت المَقدِس پہنچتے وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اونٹ کی مہار پکڑ کر چل رہے تھے اور غلام سوار تھا، کیوں کہ سواری کی باری اس کی تھی۔
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس حالت میں دیکھتے ہی بیت المَقدِس کے پادریوں اور راہبوں نے شہر کی چابیاں آپ کے ہاتھ میں دے دیں اور ان میں سے بعض نے اسلام قبول کر لیا۔
- اہلِ کتاب کی کتب میں یہ درج تھا کہ اس شہر کا فاتح اونٹنی کی مہار پکڑے آئے گا۔

مجھے تلاشِ بسیار کے باوجود تاریخ کی کسی کتاب میں کوئی ضعیف سے ضعیف روایت بھی ایسی نہیں ملی جس سے مذکورہ واقعات ثابت ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں واعظ حضرات کو یہ روایات کہاں سے ملیں!!! قارئین سے گزارش ہے کہ ان کو نقل کرنے سے احتراز کریں کیوں کہ اگر کوئی ثبوت مانگ بیٹھے تو اسے جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس کی فتح کے دو سال بعد جب شام کا سفر کیا تھا تو اپنی منزل ''اَیلہ'' اس طرح پہنچے تھے کہ خود اونٹ کی مہار تھامے پیدل تھے اور آپ کا غلام سوار۔ چونکہ بیت المَقدِس کا قدیم نام ''ایلیاء'' تھا جو ''ایلہ'' سے ملتا جلتا ہے اس لیے شاید نقل کرنے والوں نے ایلہ کو ایلیاء سمجھ لیا اور اس طرح اس روایت کو سفرِ بیت المَقدِس کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔

طور پر ایک عظیم الشان لشکر روانہ کیا جس نے حمص کا محاصرہ کر لیا۔ الجزیرہ کے نصرانی بھی تیس ہزار کا لشکر لے کر ان کی مدد کو نکل پڑے۔ یوں شام میں مسلمانوں کے مفتوحہ علاقے سخت خطرے کی زد میں آ گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس نئے طوفان کے مقابلے کے لیے ایک طرف تو الجزیرہ کی شاہراہوں پر فوج تعینات کر کے وہاں سے نکلنے والے تیس ہزار رومیوں کی کمک کو روک دیا۔ ساتھ ہی عراق سے کمک منگوا کر شام کے دفاع کو مضبوط کیا اور خود سفر کر کے دمشق تشریف لے گئے تاکہ مسلمانوں کے حوصلے بلند رہیں، ان ہمہ جہت تدابیر کی بدولت رومی کمزور پڑ گئے اور آخر میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حمص کا محاصرہ کرنے والے عیسائی لشکر کو کھلے میدان میں شکست دے کر مار بھگایا۔ اس کے بعد شام میں عیسائیوں کو دوبارہ کبھی شورش برپا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی، چونکہ اس شورش کی بنیاد الجزیرہ کے شرپسندوں نے رکھی تھی اس لیے اس کے بعد مسلمانوں نے بھی الجزیرہ اور پھر آرمینیا کی طرف قدم بڑھانے میں دیر نہ کی۔[1] مہمات کے اسی سلسلے میں تکریت اور قیساریہ فتح ہوئے۔ یہ ۱۹ھ کے واقعات ہیں۔ قیساریہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہوا تھا۔[2]

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی اور اس کی اصل وجہ:

بیت المقدس کی فتح کے کچھ عرصے بعد سنہ ۱۷ ہجری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سالاری کے عہدے سے معزول کر دیا۔ بعض مؤرخین کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بنتے ہی سنہ ۱۳ ہجری میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ بعض کا گمان ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے شروع سے مخالف تھے یا انہیں نااہل تصور کرتے تھے، حالانکہ یہ باتیں سراسر غلط ہیں۔ نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سالاری سے فوراً معزول کیا تھا، نہ وہ اُن کے مخالف تھے، نہ ہی ان کی اہلیت اور قابلیت میں انہیں کوئی شبہ تھا۔ شبہ ہو بھی کیسے سکتا تھا جبکہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو "سَیْفٌ مِنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ" (اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار) کا خطاب عطا فرمایا تھا۔

اس معاملے میں پہلی بات جو سمجھنے کے قابل ہے، یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سنہ ۱۳ ہجری میں خلیفہ بنتے ہی فوراً بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی جگہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو سپہ سالارِ اعلیٰ بنانے کا جو حکم جاری کیا تھا اس میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے معزول ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، کیوں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نامزد کردہ کئی سالارانِ لشکر کی طرح ایک لشکر کے امیر تھے، یہ سب لشکر الگ الگ امراء کے تحت شام میں لڑ رہے تھے۔ جب جنگ اجنادین میں رومیوں کی کثرت کے باعث مسلمانوں کے سب لشکر ایک جگہ جمع ہوئے تو سوال اٹھا کہ سب سالار اب کس کے ماتحت ہوں گے؟ اس موقع پر سب کے اتفاق سے وقتی ضرورت کے پیش نظر

---

[1] الکامل فی التاریخ: ۳۴۹/۲ تا ۳۵۱

[2] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۴۱

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سالارِ اعظم مان لیا گیا۔ یہ ترتیب اگرچہ وقتی تھی مگر یرموک کی پہلی لڑائی میں بھی اس کو برقرار رکھا گیا۔ اس دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو انہوں نے ضرورت محسوس کی کہ شام کے محاذ کی مختلف اسلامی افواج کا ایک سالارِ اعظم دربارِ خلافت کی طرف سے طے ہونا چاہیے۔ اس کے لیے انہوں نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ چونکہ عارضی یا عبوری سپہ سالار تھے جو دربارِ خلافت کے مستقل سالارِ اعظم کی تقرری تک کے لیے طے کیے گئے تھے، اسی لیے جوں ہی یہ حکم نامہ آیا تو وہ فوراً حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی کمان میں آ گئے اور اپنی سابقہ حیثیت یعنی ایک خاص فوج کے سالار کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔

ہاں، یہ درست ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بعد میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کیا تھا یہ خلافتِ فاروقی کے چوتھے سال سنہ ۱۷ ہجری کا واقعہ ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ جس بھی جنگ میں شرکت کرتے ہیں مسلمان فتح یاب ہوتے ہیں، چنانچہ عام ذہن یہ بن گیا تھا کہ ان کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کو شکست نہیں ہو سکتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کے نہ صرف عقائد و نظریات بلکہ خیالات اور رجحانات کو بھی درست رکھنے کا بڑا خیال رہتا تھا۔ آپ بداعتقادی کا باعث بننے والے کسی معمولی سے شوشے کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ جب آپ نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی یہ شہرت ابتداء میں شخصیت پرستی اور بعد میں بدعقیدگی کا سبب بن سکتی ہے تو آپ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی عبقری شخصیت سے اسلام کو خاصا فائدہ پہنچانے کے بعد ایک موقع پر یہ فیصلہ کر لیا کہ اب ''سیف اللہ'' کو معزول کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس اسلام کے بے لوث سپاہی نے بے مثال اطاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس فیصلے کو قبول کر لیا اور بعد میں ایک عام سپاہی کی طرح لڑتے رہے۔

بعض مؤرخین نے معزولی کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک شاعر کا قصیدہ سن کر اسے انعام میں ایک ہزار درہم دے ڈالے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو ناراض ہو کر کہا:

''اگر انہوں نے بیت المال سے دیے ہیں تو بدعنوانی ہے، اپنی جیب سے دیے ہیں تو فضول خرچی ہے۔''[1]

مگر اسی روایت میں آگے یہ وضاحت بھی ہے کہ تحقیق سے معاملہ واضح ہو گیا تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے یہ رقم اپنی جیب سے دی ہے۔ ظاہر ہے یہ کوئی گناہ نہیں تھا۔ ہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے پسند نہیں فرمایا تھا کیوں کہ ان کا مزاج بہت محتاط تھا مگر اس سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ پھر کمال یہ ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس نامناسب خرچ کی تلافی کے لیے بیت المال میں اتنی ہی رقم جمع کرائی جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے۔ سب سے آخری بات جو تمام شکوک کا ازالہ کرتی ہے وہ معزولی کے فیصلے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ ہیں:

''اے خالد! تم میرے نزدیک بڑے معزز ہو۔ تم میرے پیارے دوست ہو۔''[2]

یہی نہیں بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے کردار کے بارے میں شکوک و شبہات

[1] الكامل في التاريخ: ۲/ ۳۵۹، ۳۶۰ [2] بحوالہ بالا

سے بچانے کے لیے پوری مملکت میں یہ اعلان کرایا:

''میں نے خالد کو کسی ناراضگی یا بدعنوانی کی وجہ سے معزول نہیں کیا بلکہ بات یہ ہے کہ لوگ ان کے گرویدہ اوران پر فریفتہ ہورہے تھے۔ مجھے خوف محسوس ہوا کہ لوگ انہی پر بھروسہ کرنے لگیں گے، پس میں نے چاہا کہ لوگ یہ جان لیں کہ سب کچھ کرنے والی ذات صرف اور صرف اللہ کی ہے اور میں نے یہ چاہا کہ لوگ کسی فتنے میں مبتلا ہونے سے بچ جائیں۔''[1]

قحط سالی:

فتوحات اور برکات کے اس اُمنگوں بھرے زمانے میں اُمتِ مُسلِمہ کو دو قدرتی آفات کا سامنا کرنا پڑا، یہ اللہ کی طرف سے مسلمانوں کی ہمت وفراست کی آزمائش اوران کے صبر وتحمل کا امتحان تھا۔ پہلی آزمائش سنہ ۱۸ ہجری میں پڑنے والی شدید قحط سالی تھی، جس کی وجہ سے جزیرۃ العرب کے باشندوں کی زندگیاں داؤ پر لگ گئیں، بارشیں بالکل بند ہوگئیں اور ہر طرف خاک اڑنے لگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قحط زدگان کے لیے اتنے فکر مند تھے کہ جب تک خشک سالی رہی آپ نے گھی، دودھ یا گوشت چکھا تک نہیں۔ بھوک کی وجہ سے لوگوں کی یہ حالت تھی کہ چہروں کے رنگ راکھ جیسے ہوگئے تھے، اس لیے اس سال کو عام الرمادہ (راکھ والا سال) کہا جاتا ہے۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کرکے مشورہ کیا اور اس کے مطابق شام اور عراق کے گورنر کو خطوط بھیج کر غلے کے قافلے منگوائے، حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے چار ہزار اونٹ اناج سے لدے ہوئے روانہ کیے۔

ان دنوں قبیلہ مُزَینہ کے ایک دیہاتی نے بھوک سے تنگ آکر اپنی پالتو بکری کو جو دیکھنے میں بھی بہت کمزور تھی ذبح کیا۔ مگر جب کھال اُتاری تو اندر سے صرف ہڈیاں نکلیں۔ یہ دیکھ کر دیہاتی کے منہ سے چیخ نکلی ''ہائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! (وہ ہوتے تو ایسا نہ ہوتا۔) جب وہ سویا تو خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''عمر کو میرا اسلام کہو اوران سے کہو تم تو عہد کے پابند اور بات کے پکے آدمی ہو، تمہیں کیا ہوگیا، عقلمندی اختیار کرو۔''

وہ دیہاتی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دروازے پر پہنچا اوران کے غلام سے کہا:

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہوں، مجھے اندر جانے کی اجازت دو۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مل کر اس نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ یہ نمازِ استسقاء کی سنت کو تازہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

آپ رضی اللہ عنہ سنت کے مطابق نمازِ استسقاء کے لیے مدینہ منورہ کی آبادی کو لے کر جنگل میں نکل گئے، حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ رکھا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بڑی عاجزی سے دعا کی۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اُفق پر سے بادل نمودار ہوئے جن میں گرج چمک کے ساتھ یہ آواز گونج رہی تھی:

اَتَاكَ الْغَوْثُ اَبَا حَفْص (ابوحفص تمہارے پاس مدد آ گئی۔)[2]

---

[1] الكامل في التاريخ: ۳۵۹/۲، ۳۶۰ [2] ابوحفص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ابھی مدینہ طیبہ کی آبادی میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ زوردار مینہ برسنے لگا۔ تمام تالاب اور گڑھے پانی سے بھر گئے، پورے عرب کی خشک سالی دور ہوگئی، ادھر شام و عراق سے غلے کے قافلے بھی آن پہنچے اور مسلمانوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ ①

طاعونِ عَمَواس:

دوسری مصیبت اور آزمائش طاعون کی وہ وبا تھی جو شام کے علاقے میں پھیلی اس کا آغاز سنہ ۱۷ ہجری کے اواخر میں بیت المقدس کی نواحی بستی ''عَمَواس'' سے ہوا اور کئی ماہ تک لوگ اس کی لپیٹ میں رہے۔ مسلمانوں کا عسکری کیمپ بھی جو اس علاقے میں تھا وبا کی زد میں رہا، روزانہ کئی کئی جنازے اٹھ رہے تھے۔ مسلمانوں کے سپہ سالارِ اعلیٰ حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ بڑی استقامت کے ساتھ اس علاقے میں جمے رہے، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ارشادات سے طاعون زدہ علاقے سے فرار کی ممانعت معلوم ہوتی ہے۔ ②

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وبا سے متاثر لوگوں کی اتنی فکر تھی کہ خود شام جا کر اسلامی فوج کو کسی دوسرے علاقے میں منتقل کرنے کی تاکید کی مگر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس سے معذرت کی کہ یہ تو تقدیر سے بھاگنے کے مترادف ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو طاعون زدہ علاقے سے نکالنا چاہتے تھے اس لیے انہیں مراسلے میں لکھا:

''مجھے ایک ضرورت پیش آگئی ہے جس کے بارے میں زبانی بات کرنا چاہتا ہوں لہٰذا سخت تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ جونہی میرا یہ خط دیکھیں تو اسے ہاتھ سے رکھتے ہی فوراً میری طرف روانہ ہو جائیں۔''

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ ضرورت جس کے لیے مجھے مدینہ منورہ بلوا رہے ہیں یہی ہے کہ وہ مجھے طاعون زدہ علاقے سے نکالنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ساتھیوں سے فرمایا:

''میں امیر المؤمنین کی ضرورت سمجھ گیا ہوں وہ ایک ایسے شخص کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جو باقی رہنے والا نہیں۔''

یہ کہہ کر جوابی خط میں لکھا: ''امیر المؤمنین! آپ نے جس ضرورت کے لیے بلایا ہے وہ مجھے معلوم ہے۔ میں ایسے لشکر کے درمیان بیٹھا ہوں جس سے دل کو مفر نہیں۔ میں انہیں چھوڑ کر اس وقت تک آنا نہیں چاہتا جب تک اللہ تعالیٰ میرے اور ان کے بارے میں تقدیر کا فیصلہ نہ فرما دے لہٰذا مجھے حکم کی تعمیل سے معذور سمجھیں اور لشکر میں رہنے دیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خط پڑھا تو آنکھیں بھیگ گئیں۔ ہم نشینوں نے انہیں آبدیدہ دیکھ کر پوچھا: ''کیا ابوعبیدہ کی

---

① کنز العمال، ح: ۲۳۵۳۸ ؛ تاریخ الطبری: ۴/۹۸، ۹۹، ۱۰۰ ؛ حیاۃ الصحابۃ (اردو ترجمہ، مولانا احسان الحق): ۳/۶۴۰

② بقية رجز او عذاب ارسل علىٰ طائفة من بنى اسرائيل ،فاذا وقع بارض وانتم بها فلا تخرجوا منها واذا وقع بارض ولستم بها فلا تهبطوا عليها.
''یہ ایک آفت یا عذاب کی باقیات ہیں جو بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر نازل ہوا، پس جب یہ کسی زمین پر واقع ہو تو تم وہاں سے مت نکلو، اور اگر یہ کہیں واقع ہوا اور تم وہاں نہ ہو تو وہاں قیام مت کرو۔'' (سنن الترمذی، ح: ۱۰۶۵، ابواب الجنائز ،باب ما جاء فى كراهية الفرار من الطاعون)
ہمارے استاذ گرامی حضرت مولانا محمد زاہد (شیخ الحدیث جامعہ امدادیہ فیصل آباد) نے سنن ترمذی کی شرح ''تکملۃ معارف السنن'' کی پہلی جلد میں اس موضوع پر نہایت مفصل، تحقیقی اور کافی وشافی کلام کیا ہے، جو اس بارے میں تمام شرعی اور طبی پہلوؤں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اہلِ علم اس کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔

وفات ہوگئی؟'' فرمایا: ''ہوئی تو نہیں لیکن لگتا ہے کہ ہونے والی ہے۔''

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو دوسرا خط لکھا: ''آپ نے لوگوں کو ایسی زمین میں رکھا ہوا ہے جو نشیب میں ہے اب انھیں کسی بلند جگہ پر لے جائیے جس کی ہوا صاف ستھری ہو۔''

جب یہ خط حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو پہنچا تو انھوں نے حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کو بلا کر کہا:

''امیر المؤمنین کا یہ خط آیا ہے۔ اب آپ ایسی جگہ تلاش کیجیے جہاں لے جا کر لشکر کو ٹھہرایا جا سکے۔''

حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ جگہ کی تلاش میں نکلنے کے لیے پہلے گھر پہنچے تو دیکھا کہ اہلیہ طاعون میں مبتلا ہیں، انہوں نے واپس آ کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو بتایا۔ یہ سن کر انھوں نے خود تلاش میں جانے کا ارادہ کیا اور اپنے اونٹ پر کجاوہ کسوالیا۔ ابھی انہوں نے اس کی رکاب میں پاؤں رکھا ہی تھا کہ ان پر بھی طاعون کا حملہ ہو گیا۔ اسی حال میں وہ فوج کو جابیہ کی طرف لے گئے۔ تب تک ہزاروں لوگ بیمار پڑ چکے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اسی بیماری میں داصل بحق ہوئے۔ ان کے بعد حضرت مُعاذ بن جبل، حضرت یزید بن ابی سفیان، حضرت حارث بن ہشام، حضرت سہیل بن عَمرو، حضرت عُقبہ بن سہیل اور حضرت عامر بن غَیلان رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے بزرگ اس وبا میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک اُمتِ مُسلِمہ کے استحکام کے لیے ایک ستون کی مانند تھا۔

حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جب یہ حالت دیکھی تو اس طرح آفت زدہ مقام میں پڑے رہنے کو درست نہ سمجھا اور فوج کو سمجھا بجھا کر صحت بخش آب و ہوا والے پہاڑی علاقے میں لے گئے، یہاں اللہ نے مسلمانوں کو اس وبا سے نجات عطا فرمائی، تاہم س وقت تک پچیس ہزار کے لگ بھگ مسلمان جاں بحق ہو چکے تھے۔ اس قدرتی آفت سے شام کے محاذ پر مسلمانوں کی افرادی طاقت کو زبردست دھچکا لگا اور ایک مدت تک وہ اپنے علاقے کے دفاع سے زیادہ کچھ کرنے کے قابل نہ رہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کچھ دنوں بعد اپنے غلام یَرفاء کو ساتھ لیے ایک اُونٹنی پر سوار ہو کر ان مصیبت زدگان کی تسلی کے لیے شام روانہ ہوئے۔ راستے بھر کبھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سوار ہوتے کبھی غلام۔

اَیلہ (شام) پہنچے تو لوگوں کو پوچھنا پڑا کہ امیر المؤمنین کون سے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت اونٹنی کی نکیل پکڑے ہوئے تھے۔ یرفاء سوار تھا، آپ نے تعارف کرایا تو لوگ حیران رہ گئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کچھ دنوں وہاں ٹھہرے۔ مرحومین کے ورثاء اور مریضوں کو تسلی دی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی اس لشکر میں تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے سے ایک دن انہوں نے اذان دی۔ لوگ ویسے ہی طاعون کے زخم کھا کر دل گرفتہ تھے، اس حالت میں یکدم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا سماں بندھا تو سب بے اختیار رو دیے۔ سب سے زیادہ گریہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر طاری تھا جو ہچکیاں لے لے کر رو رہے تھے۔

یہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کے عسکری و سیاسی انتظامات کی از سرِ نو تنظیم کی۔ حضرت شُرَحبیل بن حَسَنہ رضی اللہ عنہ کو

اُرْدُن کا ولی بنایا۔ طاعون میں حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد دِمشق اور نواحی علاقوں کے لیے ایک موزوں ترین آدمی درکار تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہی کے چھوٹے بھائی حضرت مُعاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو یہ عہدہ سونپ دیا۔ اس کے بعد ۴۲ سال تک دِمشق انہی کے ماتحت رہا۔[1]

☆☆☆

مصر کی فتح

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور کی مہمات میں مصر کی فتح کو خاص اہمیت حاصل ہے جو دنیا کی قدیم ترین تہذیب کا حامل اور حضرت یوسف، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام جیسے پیغمبروں کا مسکن ہونے کا اعزاز رکھتا ہے۔ اس زمانے میں بھی یہ تجارت وزراعت کا بہت بڑا مرکز تھا۔

مسلمان جب بیت المقدس فتح کر چکے تو حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مصر کی طرف پیش قدمی کا خیال آیا۔ وہ تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے اسلام سے پہلے مصر کا سفر کر چکے تھے اور اس کی عسکری، اقتصادی اور سیاسی اہمیت سے خوب واقف تھے۔ مصر کا زیادہ تر علاقہ دیہی تھا۔ صرف دریائے نیل اور بحیرۂ روم کے ساحل پر آباد دو تین بڑے شہروں کو زیر نگیں کرنے سے پورا ملک قبضے میں آسکتا تھا۔

یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ مصر کے قبطی پادری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کے بارے میں رومیوں کے عقائد سے اختلافات رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ قیصر روم سے ان کی بے زاری کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مصر کا حکمران مُقوقِس رومیوں کو خوش کرنے کے لیے مقامی باشندوں (قبطیوں) کو اذیتیں دیتا رہتا تھا، اس لیے اہل مصر کسی نجات دہندہ کے شدت سے منتظر تھے۔ مصر کو فتح کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ قیصرِ روم مُقوقِس کو ساتھ ملا کر کسی بھی وقت نہ صرف شام کی سرحدوں پر دھاوا بول سکتا تھا بلکہ مفتوحہ علاقوں میں بغاوت بھی برپا کرا سکتا تھا لہٰذا قیصر کی طاقت کا قلع قمع کرنے اور شام کا دفاع مستحکم رکھنے کے لیے مصر کو زیر نگیں کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔

غرض حالات خود مسلمانوں کو فوج کشی کی دعوت دے رہے تھے جن کے پیش نظر حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اصرار کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس مہم کی اجازت طلب کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس مہم کے بارے میں تردد تھا۔ قحط اور طاعونِ عَمواس نے حجاز اور شام کے مسلمانوں کو خاصا مضمحل کر دیا تھا، اس کے علاوہ ابھی تک ایران کے محاذ پر سخت جنگیں لڑی جارہی تھیں اور کسی نئی مہم کا خطرہ مول لینا احتیاط کے خلاف تھا، تاہم حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے اصرار پر آپ نے لکھ بھیجا کہ فوج کشی کرو لیکن مصر کی سرحدوں میں داخل ہونے سے پہلے میرا دوسرا خط مل جائے تو واپس آجانا۔

حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اجازت ملتے ہی چار ہزار مجاہدین کو لے کر شام سے مصر کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ

[1] البدایة والنهایة: تحت ۱۸ھ ؛ الکامل فی التاریخ: ۳۷۶/۲ تا ۳۷۹

سن ۱۹ ہجری کا واقعہ ہے۔ چند دنوں کے سفر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم نامہ ملا کہ لوٹ آؤ۔ لیکن اس وقت تک حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مصر کی سرحد عبور کر کے سرحدی بستی ''عریش'' کے قریب پہنچ چکے تھے اور انہیں پورا اطمینان تھا کہ مصر کی مہم میں کامیابی ہوگی۔ آپ کو اہلِ مصر کے ساتھ حسن سلوک کی وہ نصیحت یاد تھی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے تھے، کیوں کہ اہل مصر سے مسلمانوں کی قرابت داری بھی تھی۔ عرب مستعربہ کے جدِ امجد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ہاجر رضی اللہ عنہا مصر سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس کے علاوہ مصر کے مقامی باشندوں یعنی قبطیوں کی ایک خاتون حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باندی اور آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی والدہ تھیں۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ یہ بھی جانتے تھے کہ مصر کے بادشاہ مُقوقس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوتی پیغام کی تکریم و تعظیم کی تھی، لہٰذا انہوں نے بڑی احتیاط سے کام لیا اور مقامی باشندوں کے دلوں کو اپنے عمدہ برتاؤ سے جیت لیا۔ مصر کے بڑے پادری ابومریم نے جو سرحد پر فوج لے کر ان کے مقابلے پر آیا تھا، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی باتیں اور اہل مصر کے بارے میں نیک برتاؤ کی حدیث سن کر بے اختیار کہا: ''اتنی دور دراز کی رشتہ داری کا لحاظ پیغمبر ہی رکھا کرتے ہیں۔''

آخر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ عریش اور بلبیس کے سرحدی قلعوں کو فتح کرتے ہوئے دریائے نیل کے کنارے مصریوں کے پایۂ تخت تک پہنچ گئے جسے ''بابلیون'' کہا جاتا تھا، شاہِ مصر مُقوقس یہیں قلعہ بند تھا۔ وہ مسلمانوں سے صلح کرنا چاہتا تھا مگر یورپ سے قیصر کا حکم آیا کہ جنگ جاری رکھو۔ مصر کے مقامی باشندے قبطی بھی صلح کرنا چاہتے تھے مگر رومیوں کے دباؤ کے باعث خاموش تھے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے شہر کا محاصرہ کیا جو پورے سات ماہ تک جاری رہا۔ آپ کا بڑا خیمہ جسے عربی میں ''فُسطاط'' کہا جاتا ہے مصر کے قلعے کے سامنے نصب تھا، اتنی مدت تک یہاں خیمہ لگا رہنے کی وجہ سے اس کی کڑیوں میں ایک کبوتری نے گھونسلہ بنا لیا تھا۔ اِدھر لڑائی وقتاً فوقتاً جاری تھی قلعے کی مضبوطی اور بلندی کی وجہ سے کامیابی بے حد مشکل ہوگئی تھی۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کمک کے لیے جمادی الآخرۃ ۱۹ ہجری میں بارہ ہزار کا لشکر تیار کرا کے بھیجا جس کی قیادت حضرت زبیر بن عوام، حضرت عُبادہ صامت اور حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام کے ہاتھ میں تھی۔

ایک دن حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کچھ جانبازوں کے ساتھ سیڑھی لگا کر تنہا فصیل پر چڑھ گئے اور لڑتے بھڑتے اندر اتر کر دروازہ کھول دیا۔ اس طرح ربیع الآخر، ۲۰ ہجری، مطابق ۶۴۱ء میں فرعونوں کا یہ طلسماتی مرکز اسلام کے سامنے سرنگوں ہوگیا۔ مُقوقس سمیت یہاں تمام قبطیوں اور رومیوں کو امان دے دی گئی۔

مُقوقس سیدھا اِسکندریہ جا کر قلعہ بند ہوگیا جو بحیرۂ روم کے کنارے مملکت مصر کا سب سے بڑا شہر تھا۔ جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوا تین سو سال قبل اسکندر اعظم نے آباد کیا تھا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اب اسے فتح کرنا چاہتے تھے۔ قیصر نے مسلمانوں کا ارادہ بھانپ کر فوراً اِسکندریہ کے دفاع کے لئے ایک بھاری بھرکم فوج بھیج دی۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جب اسکندریہ کی طرف کوچ کا ارادہ کیا تو دیکھا خیمے میں کبوتری نے گھونسلہ بنا کر انڈے دے

رکھے ہیں، آپ نے خیمے کو جوں کا توں رہنے دیا اور فوج لے کر اسکندریہ پہنچے۔

شہر کا محاصرہ جاری تھا کہ قیصر روم ہرقل کا قُسطنطنیہ میں انتقال ہو گیا۔ اس کی جگہ اس کا پوتا قُسطنطین قیصر بنا جو کہ ناتجربہ کار اور کم عمر تھا اس لیے شاہِ مصر مُقوقس نے اس کی مرضی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے قبطیوں کی رائے کے مطابق مسلمانوں سے صلح کر لی اور اسکندریہ ان کے حوالے کر دیا۔ اس موقع پر صلح کا جو معاہدہ ہوا اس میں عیسائیوں اور یہودیوں کو جزیہ ادا کرنے کی شرط پر جان و مال اور عبادت گاہوں کے تحفظ اور مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی، یہ بھی طے ہوا کہ رومیوں کا بحری بیڑہ اور سپاہی اسکندریہ سے واپس چلے جائیں گے اور آئندہ مصر والے انہیں اپنے ملک میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ قیصر قُسطنطین کو بھی بادلِ نخواستہ یہ معاہدہ مان کر اپنی فوجوں اور بحری بیڑے کو واپس بلانا پڑا۔

قیصر اور اس کے نائب مُقوقس کی مذہبی سخت گیری، ناروا ٹیکسوں اور بے انصافی کی وجہ سے مصر کے مقامی لوگ ایک عذاب میں گرفتار تھے۔ یہ ایک غیر معمولی استعماری طاقت کا چنگل تھا، جس میں قبطی صدیوں سے جکڑے ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے انہیں نجات دلا کر عدل و انصاف کا بول بالا کر دیا۔

اسکندریہ کی فتح سے ایک طرف تو ایشیائے کوچک کے سوا باقی پورے براعظم ایشیا سے رومیوں کا عمل دخل ختم ہو گیا اور ان کی طاقت پر کاری ضرب لگی، دوسرے شام میں مسلمانوں کی پشت مضبوط ہو گئی۔ اسکندریہ کے بعد مصر کے باقی قلعے بھی معمولی مزاحمتوں کے بعد فتح ہوتے چلے گئے۔ حضرت مُعاویہ بن حُدیج رضی اللہ عنہ جب مصر کی فتح کی خوشخبری لے کر مدینہ منورہ پہنچے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مژدہ سنتے ہی سجدے میں گر گئے۔ اس کے بعد منادی کرا کے تمام اہلِ مدینہ کو جمع کیا اور حضرت مُعاویہ بن حدیج رضی اللہ عنہ کی زبانی فتح کے حالات ان کو سنوائے۔

مصر کی فتح میں ہزاروں رومی اور قبطی گرفتار ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان قیدیوں کے بارے میں عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی کہ سب کو جمع کر کے اختیار دے دو، جو چاہے اسلام قبول کر کے ہمارا بھائی بن جائے اور جو چاہے سابقہ مذاہب پر برقرار رہ کر آزاد شہری کی حیثیت سے زندگی گزارے، صرف اسے جزیہ دینا ہوگا جو ذمیوں پر لازم ہے۔ حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اس حکم پر عمل کیا، چنانچہ ایک ہی دن میں بکثرت قیدی مسلمان ہو گئے جس کی مسلمانوں نے بڑی خوشی منائی۔

حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ان فتوحات سے فارغ ہو کر فرعونوں کے پایۂ تخت ''بابلیون'' واپس آئے تو ان کا خیمہ اب بھی قلعے کے سامنے اسی طرح گڑا ہوا تھا جسے کبوتری کی خاطر چھوڑ دیا گیا تھا۔ حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اس میدان میں زمین کے قطعات ناپ کر مسلمانوں میں تقسیم کیے، چنانچہ جلد ہی لوگوں نے اس جگہ کچے پکے مکان بنا لیے اور یہ آبادی خیمے کے نام پر ''فُسطاط'' کہلانے لگی۔ آگے چل کر مصر کے دارالحکومت کا یہی نام پڑ گیا۔[1]

---

[1] چوتھی صدی ہجری میں جب بنوعبید نے فسطاط کے قریب قاہرہ آباد کیا تو دارالحکومت کی حیثیت فسطاط سے چھن گئی، چھٹی صدی ہجری میں صلاح الدین ایوبی نے دونوں جڑواں شہروں کو ملا کر ایک کر دیا اور یوں فسطاط قاہرہ میں مدغم ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصر کے محصولات کا خصوصی انتظام کرتے ہوئے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو جنوبی حصے کا والی برقرار رکھتے ہوئے، شمالی علاقے کا والی حضرت عبداللہ ابی سرح رضی اللہ عنہ کو مقرر فرما دیا۔ ①

نیل کی دلہن:

انہی ایام میں مصر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے تاریخ میں اسلام کی حقانیت، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی جلالت اور مسلمانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کو زمانے بھر کے لیے آشکار کر دیا۔ مصر میں یہ دستور تھا کہ قبطی مہینے بؤنہ کی بارہ تاریخ (۲۵ مئی) کو ایک کنواری لڑکی کو دلہن کی طرح عمدہ کپڑوں اور زیورات سے سجا کر دریائے نیل میں پھینک دیتے تھے۔ مقامی باشندوں کا کہنا تھا کہ اس رسم کو انجام نہ دیا جائے تو دریائے نیل کا پانی خشک ہو جاتا ہے۔

انہوں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہو کر درخواست کی کہ انہیں یہ رسم انجام دینے کی اجازت دی جائے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے سختی سے انہیں منع کر دیا اور فرمایا: ''اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔''

اللہ کو مسلمانوں کی آزمائش منظور تھی، اس لیے جب رسم کو انجام دینے کی تاریخ گزر گئی تو دریا کا پانی واقعی خشک ہونے لگا۔ جون اور جولائی گزر کر اگست شروع ہو گیا مگر دریا میں پانی رواں نہ ہوا۔ نہریں بھی خشک اور کھیت بنجر ہو گئے اور مقامی لوگوں نے تنگ آ کر ملک سے نقل مکانی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے یہ صورتِ حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجی۔ انہوں نے جواب میں لکھا:

''تم نے جو کیا بالکل درست کیا، میرے اس خط کے ساتھ ایک پرچہ ہے، اسے دریائے نیل میں پھینک دینا۔''

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے وہ پرچہ دیکھا تو اُس میں تحریر تھا:

''اللہ کے بندے امیر المؤمنین کی طرف سے مصر والوں کے دریائے نیل کے نام! اے نیل! اگر تو اپنی مرضی سے بہتا ہے تو ہمیں تیری کوئی ضرورت نہیں اور اگر تو اللہ واحد و قہار کے حکم سے بہتا ہے تو ہم اللہ ہی سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ تیرا پانی جاری کر دے۔''

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ رات کے وقت وہ پرچہ دریائے نیل میں پھینک کر لوٹ آئے۔

مقامی لوگ نقل مکانی کرنے کے لیے اپنا ساز و سامان باندھ چکے تھے مگر صبح کو انہوں نے دیکھا کہ دریا میں پانی موجیں مار رہا ہے۔ ناپ کر دیکھا گیا تو چوبیس فٹ پانی تھا۔ اس دن سے لے کر آج تک دریائے نیل کا پانی خشک نہیں ہوا۔ ② فرعونوں کی یہ رسم بد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی قوتِ ایمانی کی بدولت ایسی مٹی کہ اب صرف تاریخ کے اوراق ہی میں باقی رہ گئی ہے۔

---

① فتوح البلدان، بلاذری، ص ۲۰۶ تا ۲۱۳ ؛ تاریخ الطبری: ۱۰۴/۳ تا ۱۱۲، دار المعارف ۔ البدایۃ والنہایۃ: ۱۰۰/۷،
فتح مصر للدکتور حسان عبد الهادی، ص ۱۳ تا ۳۳، ط دار الوفاء

② البدایۃ والنہایۃ: ۱۰۰/۷ تحت ۲۰ ہجری

یزد گرد کی آخری کوشش۔ معرکۂ نہاوند

عراق اور فارس سے ساسانیوں کی بساط لپیٹ دی گئی تھی، مگر یزد گرد ابھی زندہ تھا۔ رَے، اِصفہان، کرمان اور دوسرے مقامات پر از سرِ نو قوت جمع کرنے کی ناکام کوششوں کے بعد آخر کار اسے خراسان کے مرکزی شہر "مرو" میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ آتش کدۂ ایران سے سلگائی ہوئی آگ وہ ہر جگہ ساتھ لیے پھر رہا تھا۔ مرو میں ایک عظیم الشان آتش کدہ تعمیر کر کے اس نے ایک بار پھر مجوسیت کے نام پر لوگوں کو مشتعل کیا اور ساسانی سلطنت کے ماتحت رہنے والے دور دراز کے علاقوں میں منادی کرا دی کہ آتش پرستی کی بقا، آلِ ساسان کے تحفظ اور اپنے وطن کی عزت کی خاطر ایک پرچم تلے جمع ہو جائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طرف ایک غل مچ گیا اور اصفہان و طبرستان سے لے کر مکران اور سندھ کے ریگزاروں تک سے لوگ جوق در جوق اس کے گرد جمع ہونے لگے، یہاں تک کہ ڈیڑھ لاکھ کا لشکر تیار ہو گیا جسے آلِ ساسان کے نامور شہزادے مردان شاہ بن ہرمز کی کمان میں دے کر اس طرح روانہ کیا گیا کہ ایرانیوں کے نزدیک مقدس پرچم "دِرَفْش کاویانی" سپہ سالار کے سر پر لہرا رہا تھا۔ یہ لشکر نہاوند میں آ کر خیمہ زن ہوا جس سے دور دور تک دہشت پھیل گئی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یزد گرد کی ان غیر معمولی تیاریوں کی اطلاعات نے اتنا فکر مند کیا کہ مجلس شوریٰ بلا کر رائے طلب کی۔ قادِسیّہ کی طرح ایک بار پھر کئی صحابہ کرام نے رائے دی کہ امیر المؤمنین کو اس فیصلہ کن جنگ میں خود کمان کرنا چاہیے، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ امیر المؤمنین مرکز میں رہیں اور ہر محاذ سے ایک تہائی فوج کو ایرانیوں کے خلاف لڑنے کے لیے بھیج دیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس رائے کو مانتے ہوئے قیادت کے لیے حضرت نعمان بن مُقرِّن رضی اللہ عنہ کا نام لیا جو کوفہ میں تھے۔ امیر المؤمنین کا حکم ملتے ہی وہ تیس ہزار مجاہدین کو لے کر نہاوند کی طرف بڑھے۔ مسلمانوں کی ایک فوج نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تاکید پر فارس سے ایرانیوں کی کمک کا راستہ بند کر دیا تھا، اس طرح کوفہ کا اسلامی لشکر کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر نہاوند تک جا پہنچا۔ اسلامی لشکر میں حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت مُغیرہ بن شُعبہ، حضرت حُذَیفہ بن یمان، حضرت عَمرو بن مَعدی کَرِب اور حضرت جَرِیر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہم جیسے نامی گرامی حضرات موجود تھے، ان میں سے حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ نے سفیر بن کر ایرانی سپہ سالار مردان سے گفتگو کی مگر بات چیت بے نتیجہ رہی۔

آخر دونوں فوجیں آمنے سامنے صف آراء ہوئیں۔ حضرت نعمان بن مُقرِّن رضی اللہ عنہ نے فوج کے ہراول دستوں پر اپنے بھائی حضرت نُعیم رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا، دائیں اور بائیں پیادوں کی کمان حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور اپنے دوسرے بھائی حضرت سُوید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دی۔

ایرانیوں نے اس بار جنگ کے لیے بڑی عجیب منصوبہ بندی کی تھی۔ وہ خندقیں کھود کر ان میں اُتر گئے تھے اور تیرد

پیکان سنبھالے بیٹھے تھے۔ خندقوں کے سامنے انہوں نے دور دور تک ''حَسَک'' (کانٹے دار گولے) بچھا دیے تھے جن کی وجہ سے مسلمانوں کا آگے بڑھ کر حملہ کرنا بہت مشکل ہوگیا تھا۔ ایرانی جب چاہتے اپنی خندقوں سے سر اُبھار کر مسلمانوں پر تیروں کی بارش کرتے اور پھر خندقوں میں چھپ کر مسلمانوں کی جوابی تیراندازی سے محفوظ ہوجاتے۔

کئی دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ مسلمان انہیں کسی بھی طرح ان کی محفوظ پناہ گاہوں سے باہر نکالنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ آخر سب سر جوڑ کر بیٹھے۔ کئی تجاویز سامنے آئیں مگر کوئی قابل عمل نہ لگی۔ آخر طلیحہ بن خُویلد نے کہا:

''آج تک دشمن نے ہمیں پشت پھیر کر بھاگتے نہیں دیکھا، میری رائے ہے کہ ہماری گھڑ سوار فوج ان پر ایک بار حملہ کر کے فرار ہوجائے تاکہ وہ بے فکر ہوکر ان کے پیچھے کھلے میدان میں نکل آئیں تو ہم ان کی خبر لیں۔''

حضرت نعمان بن مُقرّن رضی اللہ عنہ نے اس تجویز کو سراہتے ہوئے حضرت قَعقاع بن عَمرو رضی اللہ عنہ کو یہ ذمہ داری سونپ دی۔ وہ گھڑ سواروں کو لے کر ایرانیوں کی خندقوں کے قریب جہاں تک پہنچنا ممکن تھا، چلے گئے اور ان پر زبردست تیر اندازی کی۔ جواب میں ایرانیوں نے تیر چلائے تو یہ یکدم میدان سے بھاگ نکلے۔ ایرانی یہ سمجھے کہ مسلمان شکست کھا گئے ہیں اور جان بچا کر بھاگ رہے ہیں۔ وہ خندقوں سے نکل کر ان کے پیچھے دوڑے، سات سات زرہ پوش ایک ایک زنجیر میں پروئے ہوئے پہاڑ کی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔ مردان شاہ نے سپاہیوں کو مزید جوش دلانے کے لیے ان کے پیچھے پورے میدان میں کانٹے دار گولے پھیلا دیے تاکہ ایرانی اپنے دشمن کو نمٹا کر ہی دم لیں اور فرار ہوکر دوبارہ خندقوں میں چھپنے کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ حضرت قَعقاع رضی اللہ عنہ کے گھڑ سوار دور تک پسپا ہوتے چلے گئے اور ایرانی تیر برساتے ہوئے ان کا تعاقب کرتے رہے۔ میدان کے دوسرے سرے پر حضرت نعمان بن مُقرّن رضی اللہ عنہ اصل فوج کے ساتھ موجود تھے۔ اپنے ساتھیوں کے اصرار کے باوجود ظہر تک انہوں نے جوابی حملے کی اجازت نہیں دی۔

نمازِ ظہر ادا کر کے حضرت نعمان رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار ہوئے، فوج کو مرتب کیا اور دعا کی: ''الٰہی! آج اپنے بندوں کی مدد فرما، اسلام کو فتح مند کر کے میری آنکھیں ٹھنڈی کر اور مجھے شہادت کی موت عطا فرما۔''

پھر ساتھیوں سے کہا: ''میں شہید ہوجاؤں تو حذیفہ بن یمان امیر ہوں گے۔''

یہ کہہ کر مسلمانوں کے دستورِ جنگ کے مطابق یکے بعد دیگرے تین تکبیریں کہیں اور دشمن پر پوری شدت سے حملہ کر دیا۔ ایرانی جو اپنی خندقوں سے خاصی دور نکل آئے تھے، اب کھلے میدان میں لڑنے پر مجبور ہوگئے، شام تک فریقین جان توڑ لڑائی لڑتے رہے۔ لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آوازیں میلوں دور تک سنائی دے رہی تھیں، بے تحاشا خون بہنے سے میدان میں ایسا کیچڑ ہوگیا کہ گھوڑے پھسل پھسل کر گر رہے تھے۔

اِس دوران امیر لشکر حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کو ایک تیر لگا، ساتھ ہی گھوڑا پھسلا اور وہ زمین پر آ گرے، مگر اسی حالت میں پکار کر کہا: ''کوئی مسلمان جنگ سے ہٹ کر میری طرف متوجہ نہ ہو، میں شہید ہوجاؤں تو پروا مت کرنا۔''

اِدھر ان کے بھائی حضرت نُعیم بن مُقرّن رضی اللہ عنہ نے اُن سے پرچم لے کر فوراً حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے

ہاتھ میں دے دیا، لڑائی برابر جاری رہی، کسی کو پتا نہ چلا کہ مسلمانوں کا امیر جاں بلب ہے۔

رات کے وقت ایرانیوں کی ہمت جواب دے گئی اور وہ میدان سے پسپا ہونے لگے مگر خندقوں میں جانے کا راستہ کانٹے دار گولوں نے بند کر دیا تھا، ایرانی کانٹوں سے زخمی ہو کر گرتے رہے اور مسلمان انہیں ٹھکانے لگاتے رہے۔ اس طرح لگ بھگ ایک لاکھ ایرانی مارے گئے۔

حضرت نعمان بن مُقرّن رضی اللہ عنہ کا دم لبوں پر تھا کہ انہیں فتح کی خوشخبری دی گئی۔ وہ بولے:

''اللہ کا شکر واحسان ہے، حضرت عمر فاروق کو یہ اطلاع دے دینا۔'' یہ کہہ کر جان خالق حقیقی کے سپرد کر دی۔

حضرت قَعقاع رضی اللہ عنہ نے نہاوند کے بچ نکلنے والے ایرانیوں کا ''ہمدان'' تک تعاقب کیا اور اسے فتح کر کے واپس آئے۔ یہ تاریخی معرکہ ۲۱ھ میں لڑا گیا۔ نہاوند میں شکست کے بعد آلِ ساسان کی طاقت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو گئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس معرکے کی اتنی فکر تھی کہ دن رات بے تابانہ دعائیں کر رہے تھے۔ جب انہیں فتح کی بشارت کے ساتھ ہی حضرت نعمان بن مُقرّن رضی اللہ عنہ شہادت کی خبر دی گئی تو زار و قطار رو دیے۔ پھر قاصد سے پوچھا: ''اور کون کون حضرات شہید ہوئے ہیں؟'' قاصد نے چند مشہور افراد کے نام بتائے اور کہا: ''ان کے علاوہ بہت سے لوگ شہید ہوئے ہیں جن سے آپ واقف نہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہہ پڑے اور فرمایا: ''اگر عمر اُن لوگوں کو نہیں جانتا تو کیا ہوا، اللہ تو انہیں جانتا ہے، جس نے انہیں شہادت کا اعزاز بخشا ہے، پس عمر کے جاننے نہ جاننے سے انہیں کیا فرق پڑتا ہے۔''①

یزدگرد روپوش:

جنگِ نہاوند کے اسباب پر غور کرنے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ جب تک آلِ ساسان اور اُن کے حکمران یزدگرد کو پورے فارس وخراسان سے بے دخل نہیں کر دیا جاتا تب تک ایرانیوں کی بغاوتیں ختم ہونے میں نہیں آئیں گی، اسی لیے سنہ ۲۱ ہجری میں آپ نے مشرق کی طرف عمومی یلغار کی منصوبہ بندی کی اور کئی افواج ترتیب دے کر انہیں مختلف خطوط پر روانہ کر دیا، اس ترتیب کے مطابق حضرت اَحنف بن قیس نے خراسان، حضرت ساریہ بن زُنیم نے کرمان، حضرت عاصم بن عَمرو نے سیستان (جنوبی افغانستان)، حضرت حکم بن عمیر تغلبی نے مکران وبلوچستان کا رخ کیا، حضرت مُغیرہ بن شُعبہ اور حضرت عُتبہ بن فَرقد رضی اللہ عنہما نے آذربائی جان کی طرف پیش قدمی کی اور مختصر مدت میں یہ تمام علاقہ فتح کر لیا۔ ان کے علاوہ حضرت سُوَید بن مُقرّن رضی اللہ عنہ نے طبرستان اور حضرت علاء بن حَضرمی رضی اللہ عنہ نے خلیج فارس کے ساحلی علاقوں پر اسلام کا پرچم لہرا دیا۔

---

① الکامل فی التاریخ: ۲/۳۹۵ تا ۳۹۸ ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۱۱۷ تا ۱۲۴ ؛ العبر للذھبی: ۲۱ھ
سابق مدعی نبوت طُلَیحہ بن خُوَیلد نے بھی اسی معرکے میں جام شہادت نوش کیا۔ جھوٹی نبوت سے تائب ہو کر اسلام کے لیے جان دینا اس بات کی علامت تھی کہ طُلَیحہ کی توبہ سچی اور مقبول تھی۔ (تاریخ الاسلام للذھبی: ۳/۲۲۹، ۲۳۰ ت تدمری)

یزدگرد سے آخری معرکہ خراسان میں مرو کے نزدیک دریائے مُرغاب کے کنارے ہوا، مسلمانوں کے امیر حضرت احنف بن قیس رضی اللہ عنہ تھے، یہاں یزدگرد کی مدد کے لیے خاقانِ چین خود فوج لے کر آیا تھا، مگر یزدگرد میدان میں موجود نہیں تھا۔ خاقانِ چین عام جنگ سے انفرادی مقابلوں میں مسلمانوں کی بہادری کا مظاہرہ دیکھ کر بددل ہوگیا اور فیصلہ کن لڑائی سے پہلے ہی میدان سے نکل بھاگا، تب یزدگرد بھی انتہائی مایوسی کی حالت میں سارا خزانے کو لاد کر خاقان کی پناہ میں جانے کے لیے خراسان سے ترکستان روانہ ہوا، مگر راستے میں درباریوں نے یہ کہہ کر سارا خزانہ اس سے چھین لیا کہ ہم ایرانیوں کی دولت، ترکستان نہیں لے جانے دیں گے۔

یزدگرد بمشکل جان بچا کر خاقانِ چین کے دارالحکومت فرغانہ پہنچا اور ایک پناہ گزین کی طرح برسوں وہیں روپوش رہا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس کے انجام کی خبر ملی تو ایک تاریخی خطبہ دیا جس میں فرمایا:

''یاد رکھو! مجوسیوں کی بادشاہت کا خاتمہ ہوگیا۔ اب وہ اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی زمین، دولت اور شہروں کا مالک تمہیں بنا دیا ہے تاکہ وہ عمل میں تمہیں آزمائے، لیکن اگر تم نے اپنا کردار بدل دیا تو اللہ حکومت تم سے چھین کر دوسروں کو عطا کردے گا۔''[1]

لشکرِ اسلام کی پیش قدمی مکران پر روک دی گئی:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری سالوں تک فارس سے ملحقہ علاقے اور بلوچستان کے بعض اضلاع فتح ہو چکے تھے۔ اس کے بعد مکران اور قندابیل کا علاقہ تھا۔ لشکر مالِ غنیمت لے کر واپس آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے علاقے کا حال پوچھا۔ سالارِ لشکر صحار العبدی نے فصیح و بلیغ انداز میں جواب دیا: ''وہاں کا پانی قلیل، کھجور بدمزہ اور راہزن دلیر ہیں۔ اگر زیادہ فوج بھیجیں تو بھوکی مرجائے، کم بھیجیں تو ماری جائے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر مزید پیش قدمی مؤخر کردی۔[2]

☆☆☆

---

① الکامل فی التاریخ: ۴۰۵/۲ تا ۴۱۷۔ ط دار الکتاب العربی

② تاریخ الطبری: ۱۸۲/۴ ؛ عیون الاخبار لابن قتیبۃ الدینوری: ۲۱۷/۲ ؛ الکامل فی التاریخ: ۴۲۵/۲

بلاذری نے ''فتوح البلدان'' میں یہ واقعہ یوں نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے سندھ کی فتح کے لیے حکیم بن جبلہ کی قیادت میں ''طلائع'' (ریکی کرنے والے دستے) بھیجے گئے۔ واپسی پر حکیم بن جبلہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے سندھ کے متعلق یہ الفاظ ذکر کیے جو دیگر مؤرخین نے بلوچستان کے متعلق صحار العبدی کی طرف منسوب کیے ہیں۔ بلاذری نے اسے علی بن محمد (ابوالحسن المدائنی) کی منقطع سند سے نقل کیا ہے (خلیفہ بن خیاط نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے مگر بلا سند) اسنادی کمزوری کے علاوہ درایتاً بھی یہ روایت ناقابلِ قبول ہے، اوّلاً اس لیے حکیم بن جبلہ کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد کی فتوحات میں کوئی قابلِ ذکر کردار نہیں ملا، بلکہ یہ شخص سبائی گروہ سے تعلق رکھتا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف باغیانہ تحریک میں پیش پیش رہا جیسا کہ حصہ دوئم میں تفصیل سے یہ واقعات آئیں گے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جو صفات بتائی گئی ہیں وہ سندھ پر پوری نہیں اترتیں، سندھ کی کھجور پوری دنیا میں مشہور ہے، جبکہ اس روایت میں وہاں کی کھجور کو بدمزہ بتایا گیا ہے، یہ صفت بلوچستان کی ہوسکتی ہے، سندھ کی نہیں۔ پانی کی قلت کی صفت بھی سندھ کی بہ نسبت بلوچستان پر زیادہ صادق آتی ہے کیوں کہ سندھ کا وسیع علاقہ دریائے سندھ کے باعث سرسبز ہے جبکہ بلوچستان دریاؤں اور نہروں سے بالکل محروم اور بے آب و گیاہ ہے۔ پس یہ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ مکران اور بلوچستان کی مہمات سے متعلق ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کا ہے اور یہ الفاظ حکیم بن جبلہ کے نہیں بلکہ صحار العبدی کے ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور کا عالم اسلام

یہ سنہ ۲۲ ہجری ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا نواں سال۔

خلافتِ اسلامیہ جو ''اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام'' کے منشور کے تحت وجود میں آئی تھی اب مشرق میں سطحِ مرتفع پامیر، مغرب میں افریقہ کے صحرائے اعظم، شمال میں بحیرۂ کیسپین اور جنوب میں بحرِ ہند تک وسیع ہو چکی ہے، مجموعی طور پر ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل (۳۶ لاکھ ۲۱ ہزار مربع کلومیٹر) میں شرعی قانون نافذ ہے۔ اسلام کے غلبے کے جیتے جاگتے مناظر نے قرآنِ مجید کے وعدوں اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیوں کو پورا کر دکھایا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں پہلی بار اتنے وسیع رقبے پر ایک ایسی عظیم الشان مملکت قائم ہو چکی ہے، جس میں اللہ کا وہ ابدی دین نافذ ہے جو بندوں کے لیے سراسر ہدایت، رحمت اور امن وسلامتی کی ضمانت ہے۔ پہلی بار اللہ کے بندوں کو اس کی زمین پر پورے اطمینان، سکون اور امن کے ساتھ جینے کا موقع ملا ہے، انہیں بھرپور مواقع میسر آئے ہیں کہ وہ رب کی رضا حاصل کریں۔ اس وسیع وعریض مملکت میں کوئی بھوکا نہیں سوتا، کوئی غربت وافلاس کی وجہ سے خودکشی نہیں کرتا، کسی کو لاقانونیت اور بے انصافی کی شکایت نہیں، کوئی کسی پر ظلم کرنے کی جرأت نہیں کر پاتا۔ اگر زیور سے لدی ہوئی کوئی عورت اس سلطنت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک تنہا سفر پر نکل جائے تو اسے ذرا بھی اندیشہ نہیں ہوتا کہ کوئی اس کی طرف میلی نگاہ سے دیکھے گا۔ انصاف کے تقاضوں کے سامنے امیر وغریب، سپاہی اور افسر، بادشاہ اور غلام، مسلم اور غیر مسلم سب برابر ہیں۔ مسلمانوں کا کوئی بادشاہ ہے، نہ شہزادہ اور شاہی خانوادہ۔ ان کا سربراہ صرف امیر المؤمنین ہے جو کسی پہرے کے بغیر سفر کرتا ہے، جس کے دروازے پر کوئی دربان نہیں، جو پیوند زدہ کپڑے پہنتا اور روکھی سوکھی کھاتا ہے۔ جس کے دل میں ایک طرف مخلوق کی ہمدردی اور خدمت گاری کا جذبہ موجزن رہتا ہے اور دوسری طرف آخرت میں جوابدہی کے احساس سے وہ کانپ کانپ اٹھتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس قدر ڈرتا ہے کہ اکثر کہہ اٹھتا ہے، کاش، میں کوئی گھاس کا تنکا ہوتا، کاش میں آزمائش وابتلا کی اس نگری میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔[1]

جب وہ نماز پڑھاتا ہے تو تلاوت کے وقت اس کے رونے کی آواز کئی صفوں تک جاتی ہے۔ میدانِ حشر، حساب وکتاب اور اللہ کے عذاب کا ذکر سن کر وہ بعض اوقات غش کھا کر گر پڑتا ہے۔[2]

یہ امیر المؤمنین کا قائم کردہ نظامِ حکومت ہے جس میں تمام اہم فیصلے مشورے کے تحت ہوتے ہیں۔ شورائیت کا یہ نظام قرآن وسنت کے مأخوذ ہونے کے ساتھ ساتھ عربوں کے قبائلی تمدن سے ہم آہنگ بھی ہے اور انسانی فطرت

---

① الکامل فی التاریخ: ۲/۴۳۲ تا ۴۳۶ ؛ تاریخ الخلفاء، ص ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۱۴
② حیاۃ الصحابۃ: ۳/۴۲۳، ۴۲۴، ط الرسالۃ

ومعاشرتی اصولوں سے قریب تر بھی۔ شوریٰ کے قبائلی رواج کو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک باقاعدہ ادارے کی شکل دے دی ہے جس میں حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر بن عوام، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت معاذ بن جبل، حضرت اُبَیّ بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے مدبرینِ زمانہ شامل ہیں۔[1] امیر المؤمنین کا کوئی محل ہے نہ کوئی دربار۔ مسجد نبوی ہی ان کا مرکز ہے، جہاں وہ نمازیں بھی خود پڑھاتے ہیں اور مسلمانوں سے ملتے ملاتے ہیں، خاص فیصلے شوریٰ میں کھلی بحث کے بعد ہوتے ہیں اور دلیل کی روشنی میں کسی بھی معاملے کو پرکھا جاتا ہے۔[2]

عام مسلمانوں کو کسی معاملے میں اعتماد میں لینے یا رائے عامہ کو ہموار کرنے یا کوئی خاص ہدایت دینے کے لیے امیر المؤمنین بسا اوقات خود مسجد نبوی میں لوگوں سے خطاب کرتے ہیں، آزادیٔ رائے اور احتساب کی روایت اتنی پختہ کر دی گئی ہے کہ کوئی بھی آدمی سرِ عام حکمرانِ وقت کے لباس، آمدن وخرچ اور دیگر امور کے بارے میں باز پرس کر لیتا ہے اور امیر المؤمنین اسے مطمئن کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ رعایا کی ضروریات کے لیے سربراہِ حکومت خود راتوں کو گشت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ راستے میں کوئی معمر خاتون ڈانٹ بھی دیتی ہیں تو بُرا نہیں مناتے۔[3]

عرب کا نظامِ حکومت اب تک بہت سادہ چلا آرہا تھا جبکہ عجم اور روم کی سلطنتوں میں عہدوں اور شعبوں کی کثرت نے طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا کر رکھی تھیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ حکومتی نظام کو بہتر بنانے پر بھی پوری توجہ دے کر انتظامیہ کا مثالی نمونہ پیش کر دیا ہے۔

انہوں نے عالم اسلام کو آٹھ صوبوں میں تقسیم کر دیا ہے: مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، شام، الجزیرہ، فلسطین اور مصر۔

پھر ہر صوبے کے الگ الگ اضلاع مقرر کر رکھے ہیں۔ ہر جگہ پوری جانچ پڑتال کے ساتھ چن چن کر بہترین اور قابل افراد کا تقرر کیا ہے جن کی معقول تنخواہیں مقرر ہیں، اس لیے وہ فکرِ معاش سے بے نیاز ہو کر دین وملت کی خدمت میں شب و روز منہمک رہتے ہیں۔ مکہ معظمہ میں حضرت خالد بن العاص، کوفہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص، بصرہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری، شام میں حضرت معاویہ، الجزیرہ میں حضرت عیاض بن غَنْم اور یمن میں حضرت یعلیٰ بن اُمَیّہ رضی اللہ عنہم خلیفہ کے نائب ہیں۔ احتساب اور شہری نظم ونسق کا شُعْبَہ (جسے آج کل پولیس کہا جاتا ہے) ''اَحداث'' کے نام سے قائم ہے جس کے اعلیٰ افسران میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے عالم فاضل صحابی شامل ہیں۔[4]

ان گورنروں، افسروں اور عہدیداروں پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی کڑی نگاہ رہتی ہے اور کسی بھی ضابطے کی خلاف ورزی پر انہیں دربارِ خلافت کی طرف سے پوچھ گچھ اور تادیب کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔[5]

---

① عصر الخلافة الراشدة، ص ١٠٠، ١٠١

② تاریخ الطبری: ٢٠١/٣، ٢٠٢

③ تاریخ الطبری: ٢٠٣/٣ تا ٢٠٨ ؛ تاریخ الخلفاء، ص ١٠٣

④ تاریخ الطبری: ٢٢١/٣ ؛ اسد الغابة، تر: ابو هريرة رضی اللہ عنہ

⑤ اسد الغابة، تر: محمد بن مَسلمة رضی اللہ عنہ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پہلی بار ''بیت المال'' کی باقاعدہ بنیاد رکھ کر حکومتِ اسلامیہ کی آمدن اور اثاثوں کی حفاظت کا نظام بنادیا ہے تاکہ یہ مال مسلمانوں کی ضروریات میں ٹھیک ٹھیک خرچ ہوتا رہے۔ ہر صوبے کے بیت المال کے لیے وسیع اور مستحکم عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں تاکہ ہر چیز اور ہر جنس اپنی جگہ پر محفوظ رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ''رفاہِ عام'' کے شعبے کی بنیاد بھی رکھ دی ہے (جسے آج کل ''بلدیہ'' کہا جاتا ہے) جس کے تحت عالم اسلام کے ہر صوبے اور ضلع میں سرکاری عمارتوں کی تعمیر، نہروں کی کھدائی، سڑکیں اور پل بنانے اور ہسپتال قائم کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ تک کی شاہراہ کو خاص طور پر محفوظ بنا کر اس پر جگہ جگہ چوکیاں، مسافر خانے اور پانی کے تالاب بنا دیے گئے ہیں۔ ہر صوبے کے صدر مقام میں سرکاری حسابات کے دفاتر، بیت المال اور سرکاری مہمانوں کے لیے گیسٹ ہاؤس کی الگ الگ عمارتیں ہیں۔[1]

اگرچہ جرائم کی شرح بہت کم ہے مگر مستقبل کے مسائل کے پیشِ نظر مجرموں کو سزا دینے کے لیے قید خانے بھی تعمیر کیے جارہے ہیں۔[2]

عراق میں کوفہ، بَصرَہ اور مُوصِل، اور مصر میں ''فُسطاط'' اور ''جِیزَہ'' جیسے نئے شہر بسائے گئے ہیں، جن کی رونق اور ترقی روز افزوں ہے۔[3]

مملکت کی باقاعدہ مردم شماری کی جاچکی ہے، تمام بالغ مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصے کو باقاعدہ فوج کی حیثیت دے کر ان کی تنخواہیں مقرر کر دی گئی ہیں، جبکہ دوسری قسم کے لوگ تعلیم، تجارت، صنعت اور زراعت جیسے امور میں مشغول رہنے کے باوجود بہر حال رضا کار فوج کے زمرے میں آتے ہیں، جنھیں کسی بھی وقت محاذ پر طلب کیا جاسکتا ہے۔ ان کو ''مُطَوِّعَہ'' کہا جاتا ہے اور یہ بھی سالانہ تنخواہیں پاتے ہیں۔ ان کے علاوہ مملکت کے ہر معزز یا ضرورت مند شہری، یہاں تک کہ خواتین کا سرکاری وظیفہ بھی مقرر ہے۔ شیر خوار بچوں کا وظیفہ کم از کم ایک سو درہم (آج کل کے حساب سے تقریباً دو سو ڈالر یا بیس ہزار روپے) ہے۔ جن شہریوں کو اعزازی وظائف جاری کیے گئے ہیں، ان میں اعزاز صرف دینی نسبت اور قومی خدمات کو مانا گیا نہ کہ دنیوی مراتب کا۔[4]

مدینہ، کوفہ، بصرہ، مُوصِل، فُسطاط، دِمَشق اور حِمص میں بڑی بڑی چھاؤنیاں تعمیر کر دی گئی ہیں جن میں مجاہدین کی رہائش کے لیے مکانات بھی ہیں۔[5] عمدہ نسل کے گھوڑوں کی پرورش کے لیے اصطبل اور جنگلات میں چراگاہیں مختص کر دی گئی ہیں۔ ایک ایک اصطبل میں چار چار ہزار گھوڑے ہر وقت تیار رکھے جاتے ہیں۔[6]

---

① تاریخ الطبری: ۳/۵۹ ؛ عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۲۵۰، ۲۵۱ ؛ الفاروق شبلی نعمانی، ص ۲۲۸ تا ۲۳۰ ② فتح الباری: ۵/۷۶

③ تاریخ الطبری: ۳/۵۹۰ ؛ عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۲۴۸ تا ۲۵۰ ؛ معجم البلدان: بصرۃ، کوفۃ، موصل، جیزۃ، فسطاط

④ عصر الخلافۃ الراشدۃ للدکتور اکرم ضیاء عمری، ص ۲۳۴، ط مکتبۃ العبیکان ریاض

⑤ الفاروق، علامہ شبلی نعمانی، ص ۲۴۲ ط دار الاشاعت کراچی ، نیز معجم البلدان میں مذکورہ شہروں کے احوال دیکھیے۔

⑥ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۳۰۵۲، ط الرشد

اپنوں اور غیروں کے حالات سے آگاہ رہنے کے لیے خبر رسانی کا محکمہ بھی کام کر رہا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے لاکھوں مربع میل کے اندرونی حالات سے بھی واقف ہیں اور حریف طاقتوں کی تیاریاں بھی ان کے علم میں رہتی ہیں۔ ①

پورے عالم اسلام میں مذہبی اور علمی سرگرمیاں دن بدن فروغ پا رہی ہیں، مسجد الحرام اور مسجد نبوی میں توسیع کر دی گئی ہے، نئی جامع مساجد تعمیر کرائی جا رہی ہیں، جن میں پنج وقتہ نمازوں اور ذکر و تلاوت کے علاوہ دعوتِ دین اور علم کی اشاعت کا بھرپور اہتمام دکھائی دیتا ہے۔ نمازوں کے اوقات میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی، کوئی شخص نماز باجماعت سے پیچھے نہیں رہتا، اگر کوئی اکا دکا شخص یہ حرکت کرتا نظر آئے تو لوگوں کو اس کے منافق ہونے کا شک ہوتا ہے۔ ②

اس معاشرے میں صحابہ کرام پیشوا اور رہنما ہیں جو علم و عمل کے پیکر ہیں۔ ان کے حلقوں میں قرآن و سنت، حکمت و معرفت اور فکر آخرت کی دولت بانٹی جاتی ہے۔ شام میں حضرت ابو دَرداء، حضرت عُبادہ بن صامت اور حضرت مُعاویہ بن ابی سفیان، بَصرہ میں حضرت مَعْقِل بن یَسار، حضرت عبداللہ بن مُغَفَّل، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عمران بن حُصَین، اور کوفہ میں عبداللہ بن مسعود اور ان کے ساتھ ستر بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ ③ درس کے ایک ایک حلقے میں سینکڑوں طلبہ بیٹھتے ہیں، حضرت ابو دَرداء رضی اللہ عنہ کے حلقۂ درس کے شرکاء سولہ سو سے زائد ہیں۔ ④

مسلمان ہی نہیں غیر مسلم شہریوں (ذمیوں) کے حقوق بھی پوری طرح محفوظ ہیں، ان کی جان و مال، کاروبار، عزت و آبرو اور مذہبی آزادی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں، ان کی جان و مال کو مسلمانوں کی جان و مال کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ رعایا کی خبر گیری میں مسلم و غیر مسلم کا فرق نہیں فرماتے۔ ایک خستہ حال بوڑھے کو دیکھ کر اس کی مزاج پرسی کرتے ہیں، پتا چلتا ہے کہ وہ یہودی ہے۔ اس کے مسائل پوچھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: ''جزیے سے معافی، مفلسی اور بڑھاپا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے ساتھ لے جا کر اس کی تمام ضروریات پوری کر دیتے ہیں۔ پھر بیت المال کے خازن کو کہتے ہیں: ''اس جیسے لوگوں کو تلاش کر کے ان کی ضروریات پوری کرو۔''

پھر اسی وقت مفلس غیر مسلموں سے جزیہ معاف کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ انصاف نہیں کہ ہم ان کی جوانی کا جزیہ لیتے رہیں اور بڑھاپے میں انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیں۔'' ⑤

---

① فتوح الشام للأزدی، ص ۱۵۴

② الاصابۃ: ۲۳۵/۴

ان معلمین صحابہ کی سب سے زیادہ تفصیل محمد بن سعد نے پیش کی ہے۔ انہوں نے الطبقات الکبریٰ کی پانچویں اور چھٹی جلد میں مدینہ، مکہ، طائف، یمن، بحرین، کوفہ وغیرہ میں تعلیم کے لیے کوشاں صحابہ کرام کے حالات بڑی تفصیل سے الگ الگ بیان کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو: طبقات ابن سعد: جلد پنجم و جلد ششم

③ صحیح مسلم، ح: ۱۵۱۹، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجماعۃ من سنن الھدی

④ غایۃ النھایۃ فی طبقات القراء، ابن الجزری: ۶۰۶/۱

⑤ الخراج للقاضی ابی یوسف، ص ۱۳۹، ط المکتبۃ الازھریۃ

غیر مسلموں پر کوئی زیادتی ہو جاتی ہے تو فوری انصاف مہیا کیا جاتا ہے۔ مصر کا ایک قبطی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مراسلہ بھیج کر فریاد کرتا ہے کہ مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے نے اسے پیٹا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدعی اور مدعی علیہ کو مدینہ بلوا لیتے ہیں اور زیادتی ثابت ہونے پر اپنے سامنے بدلہ دلواتے ہیں۔ ①

صحابہ کرام غیر مسلموں کی عیادت کے لیے بھی جاتے ہیں۔ ② عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بکری ذبح کراتے ہیں اور اس کا گوشت اپنے یہودی پڑوسی کو بڑے اہتمام سے بھیجتے ہیں اور کسی کے اعتراض پر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسیوں کا خیال رکھنے کی اتنی تاکید کی تھی کہ ہمیں خیال ہوا کہ وراثت میں بھی ان کا حصہ ہو جائے گا۔ ③

غرض ہر طرف امن وسکون ہے، لوگ جیتے جی گویا ایک جنت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہیں کسی بیرونی حملے کا خوف ہے نہ اندرونی خلفشار کا ڈر مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ فکر اب بھی لاحق ہے کہ کہیں کسی کا حق نہ مارا جا رہا ہو، مملکت کے کسی خطے میں ایسا کوئی مظلوم نہ ہو جو مجھ تک نہ پہنچ سکتا ہو۔ ④

☆☆☆

---

① جامع الاحادیث للسیوطی: ۲۵/ ۴۷۱

② الدرایۃ فی تخریج الهدایۃ لابن حجر العسقلانی: ۲/ ۲۳۹، ط المعرفة

③ الادب المفرد للامام محمد بن اسماعیل البخاری، ص ۵۸، ط دار البشائر

اسلامی معاشرے میں اہلِ ذمہ سے سلوک کے مزید جائزے کے لیے دیکھیں غالی الذہبی کا مقالہ: معاملة غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص ۱۱۰ تا ۱۱۴، ط مکتبة غریب

نیز شریعت میں ذمیوں کے حقوق پر مفصل بحث کے لیے دیکھیں صالح بن غانم السد لان کی ''وجوب تطبیق الشریعة الاسلامیة فی کل عصر، ص ۲۲۰ تا ۲۵۰، ط داربلنسیہ ریاض

④ الکامل فی التاریخ: ۲/ ۴۳۳

واقعۂ شہادت

سنہ ۲۳ ہجری اختتام پذیر ہونے کو تھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے طے کر لیا تھا کہ اگلے سال پوری مملکت اسلامیہ کا دورہ کریں گے۔ ایک ایک صوبے میں دو دو ماہ قیام کر کے کھلی کچہری لگائیں گے تاکہ اگر کسی بھی شہری کو کوئی تکلیف ہو تو وہ بلا جھجک بیان کر سکے۔[1] آپ فرماتے تھے: ''اگر اللہ نے مجھے سلامت رکھا تو میں عراق کے مساکین کے لیے ایسا انتظام کر جاؤں گا کہ انہیں میرے بعد کبھی کسی کی ضرورت نہیں رہے گی۔''[2]

یہ وہ دن تھے جب شمشیرِ اسلام مشرق و مغرب سے خراج وصول کر رہی تھی، حق کا بول بالا ہو گیا تھا، دین مبین نے ہر طرف امانت و دیانت، عدل و انصاف، اخوت اور ہمدردی کے پھول کھلا دیے تھے۔ بدی کی ظلمتیں منہ چھپا کر منظر عام سے غائب ہو گئی تھیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو پھلتا، پھولتا دیکھ کر مطمئن تھے۔ اب ان کی دو ہی خواہشیں رہ گئی تھیں: ایک اللہ کے راستے میں شہید ہونے کی، دوسری اپنے آقا و مولا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں دفن ہونے کی۔

خلیفہ کی دُعا:

سنہ ۲۳ ہجری میں حج کے لیے تشریف لے گئے۔ واپسی میں وادی ابطح میں ٹھہرے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی:

''الٰہی! میں عمر رسیدہ ہو گیا ہوں، میری قوت کمزوری میں تبدیل ہو رہی ہے، میری رعایا دور دور پھیل گئی ہے، ڈرتا ہوں کہ اب کہیں ان کے حقوق میں کوتاہی نہ ہو جائے۔''

پھر انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں اپنی دونوں تمنائیں ایک ساتھ پیش کر دیں:

''اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ شَهَادَةً فِیْ سَبِیْلِکَ وَمَوْتًا فِیْ بَلَدِ رَسُوْلِکَ.''

''یا اللہ! میں تیری راہ میں شہادت اور تیرے رسول کے شہر میں موت کی التجا کرتا ہوں۔''[3]

بظاہر یہ دونوں باتیں ایک ساتھ واقع ہونا مشکل تھا۔ شہادت اور وہ بھی مدینہ میں!! کیسے ممکن تھا؟ اب مدینہ طیبہ پر کسی بیرونی طاقت کے حملے کا کوئی خطرہ نہ تھا، وہاں جنگ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دوسری طرف خلافت کی بھاری ذمہ داریوں کے پیشِ نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خود کسی محاذ پر جا کر لڑنا بھی مشکل تھا۔ اور اگر وہ باہر کسی محاذ پر جا کر لڑتے اور شہید ہو بھی جاتے تو اس صورت میں ان کی مدینہ طیبہ میں وفات یا تدفین نہ ہوتی، کیوں کہ مردے کو تدفین کے لیے

---

① الکامل فی التاریخ: ۴۴۴/۲

② صحیح البخاری، ح: ۳۷۰۰، کتاب المناقب، باب قصة البیعة

③ البدایة والنهایة: ۱۴۰/۱۰

دوسرے علاقے میں منتقل کرنا اسلامی شرع میں نامناسب ہے۔

مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے لیے یہ دونوں سعادتیں طے کر دیں اور ان کی دعا کو قبول کر لیا۔ اس کے بعد جو پیش آیا وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے لیے سراسر سعادت تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اُمت کے لیے وہ ایک ایسا سانحہ تھا جس کا شدید اثر کم و بیش نصف صدی تک رہا جب کہ اس کے ضمنی اثرات آج تک محسوس ہوتے ہیں۔

زیرِ زمین سازشیں:

دورِ فاروقی کے آخری برسوں میں مسلمانوں کی فتوحات کی دھاک چہار سو بیٹھ چکی تھی۔ کسریٰ کی بادشاہت ایک بھولا بسرا افسانہ بن گئی تھی۔ قیصر بھی ایشیائی سلطنت کے اکثر حصے سے محروم ہو چکا تھا۔ ایران میں مجوسیت کے آتش کدے ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ یہودی جزیرۃ العرب سے مکمل طور پر جلاوطن کر دیے گئے تھے۔ شام اور مصر سے تثلیث کے اثرات مٹتے جا رہے تھے۔ ان مفتوحہ علاقوں میں کسی ایک فرد کو بھی جبراً مسلمان نہیں کیا گیا تھا۔ اکثر لوگ جو سابقہ ادوار میں مظلومیت کی زندگی بسر کر رہے تھے، مسلمانوں کے اخلاق اور اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اپنی رغبت سے مسلمان ہوئے تھے۔ بہت سے لوگ وہ تھے جو سابقہ مذاہب پر قائم رہتے ہوئے بھی مسلمانوں کے وفادار تھے۔

بہرحال آبائی دین پر باقی رہنے والوں میں ایک طبقہ ایسا تھا جس کی ضد اور حسد کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، یہ لوگ اسلام سے صرف اس لیے نفرت کرتے تھے کہ اس دین نے ان کی آبائی سلطنتوں کو مٹا ڈالا تھا اور ان پر نفس پرستی کے دروازے بند کر دیے تھے لہٰذا اِن کو خلافتِ اسلامیہ کا عروج ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ ان میں سے کچھ عیاروں نے مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے زبانی کلمہ بھی پڑھ لیا تھا اور بظاہر پر امن شہریوں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے مگر اندرونی طور پر مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے۔ چونکہ ہر کلمہ گو کو معاشرے میں قانونی طور پر مسلمان شہری مانا جاتا تھا، اس لیے کوئی مؤرخ یقینی طور پر نہیں بتا سکتا کہ ایسے غدار کون کون تھے جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے پر تلے ہوئے تھے مگر تاریخ میں ایک دو افراد کا ذکر ضرور ملتا ہے، جن کا کردار اس حوالے سے مشتبہ ہے۔

قاتلانہ حملہ...... کیوں...... کیسے؟

ان میں سے ایک شخص ہرمزان تھا جو کسریٰ یزدگرد کا قریبی رشتہ دار تھا اور مدینہ منورہ میں رہائش پذیر تھا۔ آج چودہ صدیاں بعد اس شخص کے اسلام میں مخلص ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنا ممکن نہیں کیوں کہ دلوں کے بھید اللہ تعالیٰ جانتا ہے مگر ظاہری قرائن سے اس شخص کے احوال مشکوک ضرور ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کے یزدگرد سے روابط باقی ہوں جو اس وقت تک زندہ تھا۔ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیابی سے مایوس ہو کر وہ کوئی بھی انتقامی حربہ آزما سکتا تھا۔ یہ بات ہرگز بعید از قیاس نہیں کہ مجوسی سیاست دان عالمِ اسلام میں رہنے بسنے والے اپنے کارندوں کو استعمال کر کے مسلمانوں کو ان کے عظیم المرتبت خلیفہ سے محروم کر دینے کا منصوبہ بنا رہے ہوں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حج سے واپس آ کر حسبِ معمول سرکاری ذمہ داریوں کی انجام دہی میں مشغول ہوگئے تھے۔ مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں ایک مجوسی غلام فیروز ابولؤلؤ رہائش پذیر تھا۔ وہ دو سال پہلے (سنہ ۲۱ ہجری کے دوران) فارس کی آخری حدود میں برپا ہونے والی تاریخی لڑائی معرکۂ نہاوند میں گرفتار ہوا تھا اور غلام بن کر حضرت مغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کے حصے میں آیا تھا۔ یہ بیک وقت بڑھئی، مصور اور لوہار تھا۔ مختلف قسم کی چیزیں بنانے میں بہت مشہور تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدینہ میں بالغ غیر مسلم غلاموں کو رہنے کی منظوری نہیں دیتے تھے مگر حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کی اس سفارش پر کہ اس غلام کی ہنرمندی سے اہلِ مدینہ کو فائدہ ہوگا فیروز کو رہائش کی اجازت دے دی۔

اِس دور میں یہ دستور تھا کہ ایسے ہنرمند غلاموں سے ذاتی خدمات لینے کی بجائے انہیں صنعت وحرفت کا موقع دیا جاتا تھا۔ جو آمدن ہوتی اس میں سے ایک طے شدہ حصہ آقا وصول کر لیتا جسے ''خراج'' کہا جاتا تھا۔ حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ فیروز کی آمدن سے یومیہ دو درہم (تقریباً دو سو روپے) وصول کرتے تھے کیوں کہ اس کا کاروبار خوب چل نکلا تھا۔ فیروز کو اتنی رقم کی ادائیگی گراں گزرتی تھی، اس لیے ایک دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوکر شکایت کی کہ ''میرے آقا مجھ سے بہت زیادہ خراج وصول کرتے ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کتنا وصول کرتے ہیں؟'' بولا: ''روزانہ دو درہم۔''

آپ نے دریافت کیا: ''تم کون کون سے ہنر سے کماتے ہو؟'' بولا: ''بڑھئی، لوہار اور نقاشی کے کام سے۔''

یہ سن کر آپ نے فرمایا: ''ان کاموں کی آمدن کے لحاظ سے تو وصول کی جانے والی رقم زیادہ نہیں ہے۔''

فیروز یہ کہتے ہوئے چلا گیا: ''ان کا دِرعدل میرے سوا سب کے لیے کشادہ ہے۔''

تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک سوالی مایوس ہو، اس لیے دل میں سوچ لیا تھا کہ حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ سے خراج کم کرنے کی سفارش ضرور کریں گے۔ آپ نے دو چار دن بعد فیروز کو کہیں سے گزرتے دیکھا تو اس کی دل بستگی کے لیے فرمایا: ''سنا ہے تم پَون چکی[1] اچھی بنا سکتے ہو۔ مجھے بنا دو گے۔''

وہ عجیب سے لہجے میں بولا ''ایسی بنا کردوں گا کہ مشرق ومغرب والے دیکھتے رہ جائیں گے۔''

فہم وفراست کے پیکر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سرد لہجے میں چھپی انتقام کی چنگاریاں محسوس کرلیں، ساتھیوں سے فرمایا: ''سنو! یہ غلام مجھے دھمکی دے گیا ہے۔'' اس کے باوجود آپ نے اسے گرفتار کرنے کی کوشش نہیں کی۔[2] آپ قانون کی بالادستی کے قائل تھے۔ جانتے تھے کہ جرم ثابت ہوئے بغیر کسی کو سزا نہیں دی جاسکتی اور اب تک فیروز کا کوئی جرم ثابت نہیں تھا۔ حاکم کو اختیار نہیں تھا کہ اپنے شک اور اندازے کی بنا پر کسی کے خلاف ریاستی طاقت استعمال کرے۔

---

① پن چکی اور پون چکی میں فرق ہے۔ پَون کا مطلب ہے ہوا۔ پَون چکی میں ہوا کی طاقت استعمال ہوتی ہے۔ پَن چکی وہ ہوتی ہے جو پانی کی طاقت سے چلتی ہے۔ اسے بہتے پانی کے کنارے پر لگایا جاتا ہے۔

② الکامل فی التاریخ: ۲/۴۲۷ ؛ طبقات ابن سعد: ۳/۳۴۷ دار صادر ؛ اسد الغابۃ، تر: عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قتل وقتی اشتعال کا نتیجہ تھا یا کوئی سازش؟:

عام طور پر مؤرخین اس واقعے کو اس طرح نقل کرتے ہیں کہ گویا فیروز کو غصہ اسی بات پر آیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی فریاد رسی نہیں کی، چنانچہ مشتعل ہو کر اس نے خلیفہ کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس واقعے کے پس پردہ امکانات کا جائزہ لینے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی اور اگر کسی کا ذہن اس طرف گیا بھی ہے تو اسے دلجمعی سے تحقیق کرنے کا موقع نہیں ملا، حالانکہ اس معاملے کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح دیکھنے بھالنے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً اس پہلو کی کہ کیا واقعی قاتل نے اتنا بڑا اقدام صرف چند درہموں کی کمی بیشی کے لیے کیا!!!

ممکن تو ہے کہ بات اتنی سی ہو مگر تاریخ، فلسفۂ عمرانیات اور انسانی نفسیات خصوصاً بشری رویوں اور ذہنی تبدیلی کے مرحلوں سے واقف شخص یہاں مطمئن نہیں ہو پاتا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک عام آدمی اپنے ہی جیسے کسی دوسرے شخص سے ایسی کسی معمولی بات پر جھگڑ پڑے، لیکن اپنے سے کسی بلند مرتبہ فرد سے بحث و تکرار وہ تب ہی کرے گا جب اس کی جان پر بن جائے یا اس پر ناقابل برداشت ظلم ہوا ہو، کیوں کہ اسے ایسے جھگڑے کے عواقب کا پتا ہوتا ہے، وہ سارے خطرات سامنے رکھ کر ہی ایسی جرأت دکھاتا ہے۔ یہاں مشتعل شخص کا معاملہ کسی افسر سے نہیں تھا۔ یہ ایک غلام اور ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل (۳۶ لاکھ ۲۱ ہزار مربع کلومیٹر) کے بے تاج حکمران کے درمیان کش مکش تھی۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی بڑی طاقت اور اختیارات کے مالک سے صرف اتنی معمولی بات پر دشمنی پال لی جائے۔

نفسیاتِ انسانی کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔ عام طور پر یہ تو ہوتا رہتا ہے کہ دو افراد کے درمیان کوئی اختلافی بات بحث اور گالم گلوچ سے بڑھ کر ہاتھا پائی تک پہنچ جائے اور اس اشتعال میں اچانک ایک کے ہاتھوں دوسرے کا خون ہو جائے مگر ایسے جھگڑوں کے دوران اگر بیچ بچاؤ ہو جائے تو سو میں سے ننانوے مثالوں میں معاملہ جان لینے تک نہیں پہنچتا۔ معمولی باتوں سے مشتعل ہو کر قتل کرنے کی نوبت تب آتی ہے جب بیچ میں سوچنے سمجھنے کا وقفہ نہ ملے، اگر وقفہ میسر آ جائے تو انسان کو اپنی حماقت کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ انتہائی قدم اٹھانے سے گریز کرتا ہے۔ اب زیر بحث واقعے کا جائزہ لیں تو یہاں فیروز کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس بات چیت اور پھر اقدام قتل کے واقعے میں پورے تین دن کا وقفہ ہے۔[1] اتنا بڑا وقفہ سوچ بچار کے لیے بہت کافی تھا۔ کوئی بھی شخص جو کسی معمولی بات پر برافروختہ ہوا ہو، اتنی دیر تک مشتعل نہیں رہ سکتا سوائے اس کے کہ وہ نفسیاتی مریض ہو، جبکہ فیروز کے نفسیاتی مریض ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، بلکہ اس کی ہنرمندی اس کی ذہانت اور ہوشیاری کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ پھر خاص طور پر ہم اس گفتگو کو دیکھتے ہیں جو فیروز اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان ہوئی، اس میں بھی امیر المؤمنین کی طرف سے تحقیر، ڈانٹ پھٹکار یا سختی کا کوئی تاثر نہیں ملتا۔ اس مکالمے میں کوئی ایسی بات سرے سے نہیں تھی کہ فیروز مشتعل ہوتا۔

---

[1] الکامل فی التاریخ: ۴۲۸/۲

ظاہر ہے وہ بازار کا پیشہ ور آدمی تھا، اسے خوب معلوم تھا کہ غلاموں سے لیے جانے والے خراج کی شرح کیا ہوتی ہے۔ اگر حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ نے کوئی غیر معمولی سخت لگان مقرر کیا ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ضرور چونکتے کہ وہ بھی بازار کے معاملات سے آگاہ تھے، مگر چونکہ لگان مناسب تھا اس لیے بجا طور پر فرمایا کہ تمہارے کاموں کی آمدن کے لحاظ سے یہ خراج زیادہ مقرر نہیں کیا گیا۔ یہ بات زمینی حقیقت کے عین مطابق تھی۔ ممکن ہے فیروز، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ تصور کر کے آیا ہو کہ وہ بازار اور صنعتوں کے معاملات سے ناواقف ہوں گے اور اس کی بے جا شکایت کو درست مان کر اس کے حق میں فیصلہ کر دیں گے، مگر اس صورت میں بھی اس کا ردّعمل شرمندگی یا زیادہ سے زیادہ مایوسی کی شکل میں نکلتا۔ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ جان لینے کے درپے ہو جاتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ مزدور نے سیٹھ پر اس لیے قاتلانہ حملہ کر دیا کہ اس کو پوری مزدوری مل رہی تھی، جبکہ وہ دوگنا معاوضہ چاہتا تھا یا ملازم نے فیکٹری کے مالک کو اس لیے قتل کر دیا کہ اسے وقت پر تنخواہ ملتی تھی جبکہ وہ وقت سے پہلے وصول کرنے کا خواہاں تھا۔ ظاہر ہے ایسا نہیں ہوتا۔

غرض سارے معاملے کو غور سے دیکھنے سے یہ امکان بہت واضح ہو جاتا ہے کہ فیروز نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کا تہیہ پہلے سے کیا ہوا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے آخر کیوں؟ غور کیا جائے تو لگتا ہے کہ اس عزم کے پیچھے کوئی بہت قوی محرک موجود تھا جس کی اشتعال انگیزی اتنی تھی کہ فیروز نے اپنی جان جانے کا یقینی خطرہ مول لیتے ہوئے، مجمع عام میں امیر المؤمنین پر حملہ کیا۔ نفسیات سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ عموماً ایسے انتہائی جارحانہ اقدام پر برانگیختہ کرنے والا محرک مذہبی اور قومی ہوا کرتا ہے۔ حکمرانوں پر حملوں کے درجنوں واقعات تاریخ میں ملیں گے، تقریباً سب کے پس پردہ کوئی قومی، وطنی یا مذہبی دشمنی کارفرما نظر آئے گی۔ ذاتی دشمنی کے تحت کی گئی انتقامی کارروائیوں میں ایسا شدید جذبہ نہیں ہوتا بلکہ حملہ آور عموماً چھپ کر وار کرتا ہے اور جائے فرار محفوظ رکھتا ہے مگر فیروز کا حملہ بڑی حد تک خودکش قسم کا تھا جو قومی، وطنی اور مذہبی اشتعال پر ہی مبنی ہوسکتا ہے۔ اس قومی جذبے کا پتا اس سے چلتا ہے کہ فیروز مدینہ میں لائے جانے والے کم سن مجوسی قیدیوں کے سروں پر ہاتھ پھیرتا اور روتے ہوئے کہتا تھا: ''عربوں نے میرا کلیجہ چھلنی کر دیا ہے۔''[1]

ہمیں فیروز کا دھمکی آمیز جملہ بھی یاد رکھنا چاہیے: ''ایسی پون چکی بنا کر دوں گا کہ مشرق و مغرب والے دیکھتے رہ جائیں گے۔'' ایسا معنی خیز فقرہ وہی کہہ سکتا ہے جو پہلے سے کچھ ٹھان چکا ہوا اور اپنی بدفی منصوبہ بندی کر چکا ہو۔ فوری اشتعال میں آنے والا ایسے گہرے فقرے نہیں کہتا بلکہ عام طور پر وہ کھلم کھلا کہہ دیتا ہے کہ چھوڑوں گا نہیں، جان سے مار دوں گا۔

ایک سوال رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ فیروز نے جو کچھ کیا، اپنی صوابدید سے کیا یا اس کے پیچھے کوئی طاقت بھی کارفرما تھی؟ دونوں باتیں ہوسکتی ہیں، مگر کسی بیرونی طاقت کی پشت پناہی کے امکانات زیادہ ہیں، اس کی دو وجوہ ہیں:

فیروز جیسے غلام کو جسے اسلامی معاشرے میں ہر سہولت کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے، دو سال ہونے والے تھے،

[1] طبقات ابن سعد: ۳/۳۴۷ ط صادر

دیگر غیر مسلموں کی طرح اسلامی خلافت اور مملکت کا وفادار بن جانا چاہیے تھا مگر نہ صرف یہ کہ وہ اس معاشرے سے ہم آہنگ نہیں ہوا، بلکہ اس مملکت اور حکومت کا غدار ثابت ہوا۔ ایسا کردار عموماً انھی لوگوں کا ہوتا ہے جو کسی بیرونی طاقت کے آلۂ کار یا جاسوس ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ امکانات موجود ہیں کہ شروع سے فیروز کسی طاقت کا ایجنٹ ہو۔ اب وہ طاقت کونسی ہوسکتی تھی!! مدینہ منورہ میں رہائش پذیر ایرانی شہزادے ہرمزان سے فیروز کے گہرے تعلقات اور خود فیروز کا سابق مجوسی ہونا ان امکانات کو وزنی کرتا ہے کہ مجوسیوں کا شکست خوردہ شاہی خانوادہ اسے آلۂ کار بنائے ہوئے ہو اور انہی لوگوں کی طرف سے اسے موقع ملتے ہی قاتلانہ وار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہو۔

ان امکانات تک پہنچنے کے بعد یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ فیروز کا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے جا کر ملنا، درحقیقت فریاد سنانے کے لیے نہیں تھا بلکہ اس کا اصل مقصد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حفاظتی انتظامات کا جائزہ لینا تھا۔ تاریخ سے اس کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہی ایک دو ملاقاتیں ثابت ہیں۔ ظاہر ہے کوئی غیر مسلم غلام کسی خاص ضرورت کے بغیر امیر المؤمنین کے پاس آتا جاتا تو اس پر شبہ کیا جاسکتا تھا۔ ہاں اپنے مسائل کے حل کے لیے مسلم و غیر مسلم بھی حاضر ہوتے رہتے تھے۔ فیروز نے بھی اس بہانے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور حفاظتی انتظامات سمیت تمام موقع محل اچھی طرح دیکھ لیا۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھی جائے کہ فیروز نے قاتلانہ حملے کے لیے ایک خاص قسم کا خنجر حاصل یا تیار کیا تھا جو مدینہ طیبہ یا عرب معاشرے میں نئی چیز تھی۔ اس کے دو پھل تھے، اور دستہ درمیان میں تھا۔ خنجر کو زہر آلود بھی کر لیا گیا تھا کہ حملہ ناکام رہنے کا امکان کم سے کم ہو۔[1] یہ انتظامات بھی کسی غیر معمولی منصوبہ بندی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

قاتلانہ حملہ:

بدھ ۲۷ ذوالحجہ کو امیر المؤمنین معمول کے مطابق فجر کی نماز پڑھانے محراب میں تشریف لائے، جیسے ہی آپ نے تکبیر تحریمہ کہی، ایک کونے میں چھپا ہوا فیروز باہر آیا اور ان کی پشت پر خنجر سے پے در پے چھ وار کیے۔ ہمت و برداشت کے پیکر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کسی چیخ و پکار کے بغیر شدید زخمی ہو کر گر پڑے۔ حملہ اتنا اچانک ہوا تھا کہ پچھلی صفوں کے لوگوں کو کچھ پتا نہ چل سکا کہ کیا ہوا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قرأت کی آواز نہ آئی تو پچھلی صفوں کے لوگ کچھ دیر تک سبحان اللہ! سبحان اللہ! کہہ کر لقمہ دیتے رہے۔ اس دوران قاتل بھاگنے لگا۔ کچھ لوگوں نے معاملہ بھانپ کر اس کو پکڑنے کی کوشش کی مگر اس دن پتا چلا کہ وہ خنجر زنی میں نہایت مشاق ہے، آناً فاناً اس نے اپنی طرف بڑھنے والے تیرہ آدمیوں کو خون میں لت پت کر دیا جن میں سے نو آدمی زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہوگئے۔ آخر ایک شخص نے چادر پھینک کر اسے جکڑ لیا مگر فیروز نے گرفتاری دینے کی بجائے اس وقت اپنے گلے پر خنجر پھیر کر خودکشی کر لی۔

خنجر زنی میں فیروز کی حیرت انگیز مہارت بھی اس کے غیر ملکی ایجنٹ ہونے کے امکان کو پختہ کرتی ہے، کیوں کہ اتنی سخت تربیت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جن کو حکومتیں یا دہشت گرد گروہ خصوصی اہداف کے لیے تیار کرتی ہیں۔

[1] الکامل فی التاریخ: ۴۲۹/۲؛ تاریخ الخلفاء، ص ۱۰۸ ط نزار

قاتل کی خودکشی بھی سوالیہ نشان تھی جس سے تحقیق کے راستے بند ہو گئے تھے کہ حملے کے پس پردہ قوتیں کون سی ہیں مگر اس سے اتنا اشارہ ضرور مل جاتا ہے کہ کسی بہت ہی گھناؤنی سازش کے بعد اتنی بڑی کارروائی ہوئی تھی۔ چونکہ تفتیش کی صورت میں اس سازش کے بانیوں کے چہروں سے نقاب اُتر جاتا۔ اس لیے فیروز کو پہلے ہی تیار کر لیا گیا تھا کہ ایسے موقع پر وہ اپنے آقاؤں کو بچانے کے لیے کیا کرے؟

☆☆☆

زخم کھا کر امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ محراب میں گرے ہوئے تھے مگر ہوش باقی تھا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں آگے کر دیا کہ نماز پڑھائیں۔ انہوں نے مختصری دو رکعتیں پڑھا دیں۔ دودھارے خنجر نے خلیفۃ المسلمین کا شکم چیر دیا تھا، مگر ہمت کا یہ عالم تھا کہ تمام حواس قابو میں تھے۔ لوگ نماز سے فارغ ہوئے تو امیر المؤمنین کی آواز اُبھری: ''ابن عباس! جا کر دیکھو مجھے مارنے والا کون ہے؟''

وہ دیکھ کر آئے اور بتایا: ''مُغیرہ بن شُعبہ کا غلام!!''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اچھا وہی کاریگر؟'' عرض کیا ''جی ہاں، وہی۔''

فرمایا ''اللہ اسے ہلاک کرے، میں نے تو اس کے بارے میں انصاف کا معاملہ کیا تھا۔''

پھر فرمایا: ''حمد وستائش ہے اُس اللہ کی جس نے میری موت کسی اسلام کا کلمہ پڑھنے والے کے ہاتھوں نہیں ہونے دی۔''[1]

آخری وصیتیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اُٹھا کر گھر لایا گیا۔ زخموں کی شدت کی وجہ سے خون رکنے میں نہیں آ رہا تھا، اسی لیے بار بار غشی طاری ہو رہی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ کو غذا کے طور پر پہلے نبیذ اور پھر دودھ دیا گیا مگر سب کچھ پیٹ کے زخم کے راستے خارج ہو گیا، یہ دیکھ کر طبیب نے بھی زندگی سے مایوسی ظاہر کر دی، مگر اس حالت میں بھی نماز کے وقت انہیں ہوشیار کیا جاتا رہا اور آپ فرماتے: ''ہاں، ہاں، اس شخص کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں جو نماز ترک کر دے۔''

اصلاحِ خلق کے ولولے کا یہ عالم تھا کہ اس حالت میں بھی عیادت کے لیے آنے والے ایک نوجوان کی شلوار ٹخنوں سے نیچے دیکھی تو بڑی شفقت سے فرمایا: ''بیٹا! شلوار اُوپر رکھنا، کپڑا صاف رہے گا اور یہ خوفِ خدا کی علامت ہے۔''

اپنے اوپر چڑھنے والے قرض کا اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حساب لگوایا جو چھیاسی ہزار درہم بنے۔ بیٹے کو ان کی ادائیگی کی ترتیب سمجھائی۔[2]

اس موقع پر کسی نے تعریف کی کہ آپ اتنے بڑے صحابی اور عادل حکمران ہیں، اب شہادت کا مرتبہ پا رہے ہیں۔ آپ نے تعریف کا کوئی اثر لیے بغیر حسرت کے ساتھ فرمایا: ''کاش حساب برابر ہو جائے، نہ کوئی سزا ملے نہ جزا۔''[3]

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۳۷۰۰، کتاب المناقب، قصة البیعة ومقتل عمر رضی اللہ عنہ

[2] بحوالہ بالا [3] صحیح البخاری، ح: ۳۷۰۰، کتاب المناقب، قصة البیعة ومقتل عمر رضی اللہ عنہ ؛ المنتظم: ۳۲۹/۴

اس وقت آپ کی جانشینی کا مسئلہ واقعی سب سے اہم تھا، رفقاء نے مشورہ دیا کہ کسی کو جانشین مقرر فرما دیں۔ آپ نے فرمایا: ''اَتَحَمَّلُهَا حَيًّا وَ مَيِّتاً۔'' (مجھے گوارا نہیں کہ زندگی میں بھی یہ بوجھ اٹھاؤں اور مر کر بھی)[1]

تاہم آپ خلافت کی منتقلی کی فکر ضرور لاحق تھی، چنانچہ آپ نے نہایت معقول فیصلہ کرتے ہوئے چھ بزرگ صحابہ: حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم پر مشتمل ایک جماعت کو نامزد کر دیا اور فرمایا: ''میری موت کے بعد تین دن کے اندر اندر یہ حضرات باہم مشورہ کر کے آپس میں سے کسی ایک کو امیر چن لیں۔''

حضرت ابوبکر صدیق و حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے بعد یہی چھ حضرات پوری اُمّتِ مُسلمہ میں سب سے افضل اور صحابہ کرام میں سب سے عظیم المرتبت تھے، جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخر دم تک خوش رہنا، مشہور و معروف تھا، ان کی زندگی ہی میں جنت کی خوشخبری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے مل چکی تھی۔ عشرہ مبشرہ کے ساتویں فرد جو اس وقت تک حیات تھے، حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ تھے مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ انہیں اس شوریٰ سے الگ رکھا کیوں کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی بھی تھے اور چچازاد بھی۔ اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو شوریٰ میں فقط اس طور پر شرکت کی اجازت دی کہ وہ صرف مشورہ دے سکتے ہیں، خلافت کے لیے نامزد نہیں ہو سکتے۔[2]

وصیت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آخری لمحات سے قبل فرمایا: ''میں اپنے بعد مقرر ہونے والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ:

۱ وہ مہاجرینِ اوّلین کے حقوق کو پہچانے اور ان کی حرمت ملحوظ رکھے۔

۱ میں اسے انصار کے ساتھ جو دارالاسلام اور ایمان میں پہلے سے قرار پکڑے ہوئے ہیں، خیر کا معاملہ کرنے، ان کے اچھا کرنے والوں کی اچھائی قبول کرنے اور بُرا کرنے والوں کی برائی سے درگزر کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔

۱ میں شہریوں سے بھلائی کرنے کی وصیت کرتا ہوں کہ یہ لوگ اسلام کا حصار، محصولات کا ذریعہ اور کفار کے لیے باعثِ غیظ ہیں۔ ان سے ان کی رضامندی کے ساتھ اتنا ہی محصول لیا جائے جو زائد ہو۔

۱ میں وصیت کرتا ہوں کہ دیہاتی باشندوں کے ساتھ خیر کا معاملہ کرنا کہ یہ اصل عرب ہیں، اسلام کا خمیر ہیں۔ ان کے زائد از ضرورت اموال میں سے محصول لیا جائے اور انہی کے فقراء پر خرچ کیا جائے۔

۱ میں وصیت کرتا ہوں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری میں آنے والے غیر مسلم شہریوں کا خیال رکھے، ان سے عہد کی پابندی کی جائے، ان کی حفاظت کے لیے جنگ کی جائے، ان پر برداشت سے زائد بوجھ نہ ڈالا جائے۔[3]

---

[1] تاریخ دمشق: ۴۲۸/۴۴

[2] صحیح البخاری، ح: ۳۷۰۰، کتاب المناقب، قصة البيعة ومقتل عمر رضي الله عنه؛ البداية والنهاية: ۲۰۸/۱۰

[3] بحوالہ بالا

آخری خواہش:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شدید خواہش تھی کہ اپنے آقا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں دفن ہوں۔ آپ نے یہ درخواست اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں بھیجی۔ انہوں نے فرمایا:

''یہ جگہ میں نے اپنی تدفین کے لیے پسند کی تھی، مگر عمر فاروق کو اپنے اوپر ترجیح دیتی ہوں''

یہ کہہ کر اجازت دے دی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو فرمایا: ''اس سے بڑھ کر کوئی تمنا نہ تھی۔''[1]

جان کنی کا وقت آیا تو امیر المؤمنین نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا:

''میرا سر تکیے سے ہٹا کر زمین پر رکھ دو۔ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ کو میری حالت پر رحم آجائے۔ واللہ! آج کے دن کی ہولناکی سے بچنے کے لیے اگر ممکن ہوتا تو میں ساری دنیا قربان کر دیتا۔''[2]

وفات:

تین دن زخمی حالت میں گزار کر یکم محرم ۲۴ھ کو دنیا کی تاریخ کے اس بے مثال حکمران نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے جو آپ کی جگہ تین دن تک مسجد نبوی کے امام رہے، نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپ اپنی آخری خواہش کے مطابق حجرۂ عائشہ (رضی اللہ عنہا) میں رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔[3]

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

☆☆☆

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۱۳۹۲، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی قبر النبی ﷺ

[2] الکامل فی التاریخ: ۲/ ۴۲۹، ۴۳۰

[3] البدایة والنہایة: تحت ۲۳ ھجری ؛ الکامل فی التاریخ: ۲/ ۴۲۹، ۴۳۰ ؛ تاریخ الخلفاء، ص ۱۰۹، ط نزار

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عمر کے بارے میں مشہور قول ۶۳ سال کا ہے، جیسا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ (المجالسة و جواہر العلم، ح: ۳۵۶۵۔ اسد الغابة: ۴/ ۱۵۶، العلمیة) مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود اپنی وفات سے ایک سال قبل اپنی عمر ۵۷ یا ۵۸ برس بتائی تھی۔ اس حساب سے ان کی عمر ۵۸ یا ۵۹ برس سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ حافظ ابن حجر نے اس روایت کو صحیح الاسناد کہا ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے کیوں کہ امیر المؤمنین اپنی عمر کے بارے میں یقیناً دوسروں سے بہتر جانتے تھے۔ (تہذیب التہذیب: ۷/ ۴۴۱، ط، حیدر آباد دکن)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تاریخ وفات یکم محرم ۲۴ ہجری مشہور ہے مگر اس تاریخ کی صراحت کہیں منقول نہیں۔ یہ ایک غالب احتمال ہے، یقینی بات نہیں۔ امام ابونعیم الاصبہانی نے سند کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تاریخ شہادت کے متعلق صحابہ وتابعین کے اقوال کو جمع کر دیا ہے۔ (معرفة الصحابة: ۱/ ۴۳ تا ۴۶)

اسی طرح علامہ ابن اثیر الجزری اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی ایسے اقوال جمع کر دیے ہیں۔ (دیکھیے اسد الغابة والبدایة والنہایة: سن ۲۳ ہجری کی وفیات)

اس بارے میں ہمارے سامنے درج ذیل تاریخی اقوال ہیں:

1. اکثر راویوں کا کہنا ہے: قُتِل یوم الاربعاء لاربع بقین من ذی الحجة. ذوالحجہ ختم ہونے سے چار دن قبل بدھ کو قتل کیے گئے۔ بعض نے تین دن قبل کہا ہے۔
2. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ترجیح اس کو دی ہے کہ بدھ کو حملہ ہوا۔ اس دن ۲۷ ذوالحجہ تھی، تین دن زخمی رہ کر وفات ہوئی۔ (یعنی ہفتے کو)
3. بعض رواۃ کا کہنا ہے: اتوار یکم محرم کو تدفین ہوئی۔ (یہاں یہ صراحت منقول نہیں کہ اسی دن شہادت ہوئی۔ مگر گمان یہی کیا جاسکتا ہے کہ وفات، نماز جنازہ اور تدفین میں بہت زیادہ وقت نہیں لگا ہوگا جیسا کہ سنت طریقہ یہی ہے۔ پس ۲۷ ذوالحجہ کو حملہ ہوا، چار دن زخمی رہے اور یکم محرم کو شہادت اور تدفین ہوئی۔)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سال ذوالحجہ ۲۹ دن کا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تین دن زخمی رہے اور یکم محرم کو شہید اور دفن ہوئے۔ لیکن اگر مہینہ ۳۰ کا ثابت ہو تو پھر دو صورتیں رہ جاتی ہیں: یا تو یوم شہادت ہفتہ ۳۰ ذوالحجہ کو مانا جائے۔ یا یہ کہا جائے کہ چار دن زخمی رہ کر یکم محرم کو شہید ہوئے۔

جانشینی:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وفات سے پہلے اپنے جانشین کے انتخاب کے لیے حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت طلحہ بن عبیداللہ اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم پر مشتمل جو کمیٹی بنائی تھی، اس کے ارکان ایک مکان میں الگ بیٹھ کر مشورہ کرتے رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ باہر مسلح پہرہ دے رہے تھے، کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ فیصلہ ہونے میں دیر ہوتی چلی گئی۔ حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ شوریٰ کے ارکان منصب خلافت کے خواہش مند تھے بلکہ ان میں سے ہر کوئی یہ منصب دوسرے کو سونپنا چاہتا تھا۔''[1]

ان کا خیال درست تھا کیوں کہ مشورے کے اگلے مرحلے میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے حق میں دست بردار ہوگئے۔ اب خلافت کے لیے صرف تین افراد: حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم رہ گئے۔

اس صورتحال میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے فرمایا: ''آپ دونوں میں سے کوئی ایک اپنے حق سے دستبردار ہوجائے اور معاملے کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں دے دیا جائے، وہ اللہ کو اور اسلام کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے دل میں جسے سب سے بہتر سمجھتا ہے، اس کے بارے میں فیصلہ کردے۔''

حضرت عثمان اور علی رضی اللہ عنہما کو خاموش دیکھ کر پھر وہ خود ہی بولے: ''اچھا تو کیا آپ فیصلے کرنے کا اختیار مجھے سونپیں گے؟ اللہ کی قسم! میں آپ میں سے بہترین شخص کے چناؤ میں کوئی کسر نہ چھوڑوں گا۔''

حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے اس پیش کش کو بخوشی قبول کرلیا۔[2]

اب حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے درمیان فیصلہ ہونا تھا، جس کا اختیار حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس آچکا تھا۔ یہ دونوں حضرات اُمت کے بہترین فرد، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیرینہ رفیق اور اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے مالک تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شوریٰ تشکیل دیتے ہوئے خود فرما چکے تھے کہ ''میرے خیال میں لوگ عثمان اور علی ہی میں سے کسی کو ترجیح دیں گے۔''[3]

ظاہر بات تھی کہ ان دونوں میں سے جسے بھی منتخب کیا جاتا اُمت کے لیے خیر ہی خیر تھی۔ ادھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو ذاتی صوابدید پر فوری فیصلے کا اختیار مل چکا تھا۔ مگر انہوں نے اسلامی سیاست کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ صائب الرائے لوگوں کو انتقالِ اقتدار کی مشاورت میں شریک کیا۔

---

① البداية والنهاية: ۲۰۹/۱۰

② صحيح البخاري، ح: ۳۷۰۰، كتاب المناقب، باب قصة البيعة والاتفاق على عثمان رضي الله عنه، وفيه مقتل عمر رضي الله عنه

③ البداية والنهاية: ۲۰۹/۱۰

یہ بات تو طے ہو چکی تھی کہ اُمّت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل اور زیادہ قابل اس وقت کوئی نہیں یہاں تک کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تنہائی میں دریافت کیا:

''اگر آپ کے سوا کسی کو خلیفہ بنایا جائے تو کون بہتر ہوگا؟'' تو وہ بلا توقف بولے: ''عثمان''

یہی سوال انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا تو وہ بولے: ''علی''۔ ①

اس ذمہ داری کی نزاکت اور اہمیت کے پیش نظر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تین دن رات تک مسلسل استصوابِ رائے میں مشغول رہے، اس دوران سوائے نماز اور مختصری نیند کے وہ کسی وقت فارغ نہ بیٹھے، ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا اور استخارے کا اہتمام بھی کیا۔ انہوں نے اکابر صحابہ کے علاوہ مہاجرین وانصار اور اربابِ فکر ونظر سے گھر گھر جا کر الگ الگ ملاقاتیں کر کے پوچھا کہ حضرت عثمان یا حضرت علی میں سے کس کو منتخب کیا جائے؟ اس بارے میں عام مجمعوں کے افراد، چھاؤنیوں کے مجاہدین، دیہاتوں کے بدوؤں اور مدینہ آنے جانے والے قافلوں سے براہِ راست ملاقاتیں کر کے رائے معلوم کی، سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ اس منصب کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ زیادہ بہتر ہیں۔ ②

رائے عامہ کا یہ فیصلہ غیر متوقع نہیں تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ مبارکہ ہی میں عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں خلافت کی خوشخبری دے دی تھی۔ صحابہ جانتے تھے کہ جب مسجد نبوی کی تعمیر شروع ہوئی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی اینٹ اٹھائی تو دوسری حضرت ابوبکر اور تیسری حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے اٹھائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر فرمایا تھا:

''هٰؤُلَاءِ الْخُلَفَاءُ مِنْ بَعْدِي'' ''یہ میرے بعد خلفاء ہوں گے۔'' ③

صحابہ کرام کا کہنا تھا: ''ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضرت ابوبکر کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے، ان کے بعد حضرت عمر کو اور ان کے بعد حضرت عثمان کو سب سے افضل سمجھتے تھے۔'' ④

ہر طرف سے اطمینان کر کے آخر عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ چوتھے دن نمازِ فجر کے بعد منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھام کر کہا: ''آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری اور ابتدا میں اسلام لانے کا شرف حاصل ہے۔ میں آپ سے اللہ کے نام کا حلفیہ عہد لیتا ہوں کہ اگر خلافت کا فیصلہ آپ کے حق میں کروں تو آپ ضرور عدل وانصاف کریں گے اور اگر میں عثمان کو امیر بناؤں تو آپ ان کی بات بخوشی سنیں گے اور مانیں گے۔''

پھر یہی بات انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہی۔ دونوں حضرات نے یہ عہد کیا۔

① تاریخ الطبری: ۲۳۷/۴

② البدایۃ والنہایۃ: ۲۱۱/۱۰

③ مستدرکِ حاکم، ح: ۴۵۳۲، بسند صحیح

④ صحیح البخاری، ح: ۳۶۹۷، فضائل الصحابۃ، باب مناقب عثمان رضی اللہ عنہ

ایک روایت کے مطابق حضرت مقداد رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے حق میں آواز اٹھائی تھی۔ (تاریخ الطبری: ۲۳۳/۴) مگر یہ فقط ابومخنف کی روایت ہے جو رافضی اور کذاب ہے۔ اس لیے یہ روایت بالکل من گھڑت ہے۔ دوسری روایات سے یہ ثابت ہے کہ ان دونوں حضرات نے بھی سب کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۲۱۱/۱۰)

تب انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے علی! میں نے لوگوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا۔ وہ عثمان کو ترجیح دیتے ہیں۔ لہٰذا آپ ذرا بھی محسوس نہ فرمائیے گا۔''

پھر فرمایا: ''عثمان ہاتھ بڑھائیے۔'' اور ان کا ہاتھ تھام کر یہ کہتے ہوئے ان سے بیعت کی:

''ہم آپ سے اللہ کے حکم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ان کے دو سابق خلفاء کی سنت پر بیعت کرتے ہیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی بیعت کی اور اسی مجمع عام میں مہاجرین و انصار سمیت سب لوگوں نے جمع ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

بیعت کا یہ پورا واقعہ دو صحیح روایات سے لیا گیا ہے[1] جو واضح کرتی ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں کسی کو اختلاف نہیں تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اسے بخوشی قبول کیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرما گئے:

''حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی بیعت جیسی مضبوط و مستحکم بیعت کسی اور خلیفہ کی نہیں ہوئی، جس میں سب کا اتفاق تھا۔''[2]

☆☆☆

---

① یہ دو صحیح روایات درج ذیل ہیں:

❶ صحیح البخاری، ح: ۳۷۰۰، کتاب المناقب، قصة البیعة والاتفاق علیٰ عثمان

❷ صحیح البخاری، ح: ۷۲۰۷، کتاب الاحکام، کیف یبایع الامام الناس

مگر یہاں صحیح حدیث کے مقابلے میں ابومخنف وغیرہ کی روایت کچھ اور مناظر دکھا رہی ہے۔ اس روایت کے بعض حصوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اندر ہی اندر بڑی لے دے ہوئی تھی۔ حضرت علی، حضرت عباس، حضرت مقداد اور دیگر کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے دھاندلی تصور کیا تھا۔ اس روایت میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی طرف یہ بھی منسوب کیا گیا ہے کہ انہوں نے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کتاب و سنت کے مطابق حکومت کرنے پر حلف اٹھانے کا کہا تو انہوں نے کہا: ''حسب استطاعت کروں گا۔'' پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے یہی حلف اٹھانے کا کہا تو انہوں نے کسی قید کے بغیر یہ الفاظ دہرا دیے چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ شریعت پر عمل کرنے کے عزم میں کمزور نکلے (نعوذ باللہ) اس لیے ان کو خلافت نہیں دی گئی۔ اس روایت میں آگے یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ ہونے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ ناراض ہو گئے اور بولے: ''یہ پہلی بار ایسا نہیں ہوا کہ تم نے ہمارے خلاف پارٹی بازی کی ہو، تم نے یہ فیصلہ صرف اس لیے کیا کہ کل کو تم حاکم بنو، بہر حال ہم صبر کریں گے۔'' یہ کہہ کر آپ بیعت کیے بغیر نکل گئے، حضرت مقداد رضی اللہ عنہ، حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ناراض تھے، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعد میں بیعت کی۔ (تاریخ طبری ۴/ ۲۳۰ تا ۲۳۴)

بہر کیف ابومخنف وغیرہ کی یہ روایت اپنی آلودگیوں اور سند کی کمزوری کی وجہ سے قابل قبول نہیں خصوصاً جبکہ وہ صحیح روایات سے ٹکرا رہی ہے، اسی لیے محققین نے اسے قبول نہیں کیا۔

② السنة للخلال، ص ۳۲۰، لابی بکر الخلال، دار الرایة ریاض

الحمد للہ! یہاں تک مسودہ بدھ، ۶ شعبان، ۱۴۳۳ھ مطابق ۲۷ جون ۲۰۱۲ء کو پورا ہوا۔

محرم ۲۴ھ......تا......ذوالحجہ ۳۵ھ

(644ء......تا......655ء)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ قریش کے خاندان بنواُمیہ کے معزز اور شریف ترین فرد تھے۔ عام الفیل کے چھ سال بعد طائف میں پیدا ہوئے۔[1] جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اعلان کیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چونتیس سال کے بھرپور جوان تھے۔ ان کے والد عفان کی وفات ہو چکی تھی اور ترکے میں انہیں خاصی دولت ملی تھی جسے اپنے آبائی پیشے تجارت میں لگا کر وہ ایک خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے مگر اسلام کی آواز کانوں میں پڑتے ہی انہوں نے اپنی دولت، مرتبے اور راحت وسکون سے بھرپور زندگی کو داؤ پر لگا کے کلمہ طیبہ پڑھ لیا۔ اس طرح وہ اسلام لانے والی اولین ہستیوں میں شامل ہو گئے۔ ان کے چچا حکم بن العاص نے انہیں سخت زدوکوب کیا مگر وہ دینِ حق پر جمے رہے۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عشرۂ مبشرہ یعنی اُن دس خوش قسمت ترین افراد میں سے ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں ہی جنت کی خوشخبری سنا دی تھی۔[3] وہ ان چھ مخصوص رفقائے نبوت میں سے ہیں جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر دم تک رضا مندی ثابت ہے۔[4]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دو باتوں میں خاص الخاص امتیاز حاصل تھا: ایک یہ کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دُہرے داماد تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہا ان کے نکاح میں دی تھیں۔ جب وہ بیمار ہو کر وفات پا گئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دوسری بیٹی حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کو اُن کے نکاح میں دیا اور جب ان کا بھی انتقال ہو گیا تو فرمایا: ''اگر میری اور کوئی بیٹی ہوتی تو وہ بھی دے دیتا۔''[5] اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دنیا کی تاریخ میں وہ واحد انسان ہیں جن کے نکاح میں کسی نبی کی دو بیٹیاں آئی ہوں، اسی بناء پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا لقب ذوالنورین ہے۔[6]

یہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کردار کی بلندی کا پروانہ اور ان کی شخصیت پر کامل اعتماد کا اظہار بھی تھا، اس لئے کہ کوئی بھی شریف انسان اپنی بیٹیاں کسی کم ظرف یا معیوب کردار والے شخص کے نکاح میں دینا گوارا نہیں کرتا۔

---

① البدایة والنهایة: ۲۱۳/۳
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مختصر شجرۂ نسب یہ ہے۔ عثمان بن عفان بن ابوالعاص بن اُمیّہ بن عبد شمس بن عبد مناف۔ عبد مناف کے ایک بیٹے ہاشم کی نسل سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے بیٹے عبد شمس کی اولاد سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہوئے۔ دولتِ مروانیہ کے بانی مروان کا والد حکم بن ابی العاص آپ کا چچا تھا۔ والدہ کی طرف سے نسب یہ ہے: اروٰی بنت کریز بن ربیعہ۔ آپ کی نانی اُم حکیم البیضا، جناب عبد المطلب کی صاحبزادی تھیں۔ (طبقات ابن سعد: ۵۳/۳، صادر)
② الاصابة: ۳۷۷/۴ ؛ طبقات ابن سعد: ۵۵/۳، ط صادر
③ سنن ابی داؤد، ح: ۴۶۴۹، کتاب السنة، باب فی الخلفاء
④ صحیح البخاری، ح: ۱۳۹۲، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم
⑤ البدایة والنهایة: ۲۱۴/۴ ⑥ الکامل فی التاریخ: ۵۴۹/۲

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دوسری غیر معمولی خصوصیت یہ حاصل تھی کہ وہ شرم وحیا میں دنیا کے تمام انسانوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار آرام فرمارہے تھے، پنڈلیاں مبارک کھلی ہوئی تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح لیٹے ہوئے اُن سے بات چیت کرتے رہے۔ یہ دونوں حضرات چلے گئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دروازے پر آئے اور اندر داخل ہونے کی اجازت مانگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یکدم اُٹھ کر بیٹھ گئے اور کپڑے درست کرنے لگے۔ پوچھا گیا: حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے آنے پر آپ نہ چونکے، مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو آپ اٹھ بیٹھے اور کپڑے درست کرنے لگے۔ وجہ پوچھی گئی تو فرمایا:

''کیا میں اس شخص سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔''①

ایک روایت میں ہے کہ فرمایا: عثمان بہت حیادار آدمی ہیں، مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر مجھ سے اپنا مدعا بیان نہ کر پائیں گے۔''②

اِس شدتِ حیا کی وجہ سے عثمان غنی رضی اللہ عنہ کبھی پاجامہ اُتار کر نہیں نہائے حالانکہ بند غسل خانے میں نہاتے تھے۔③

آپ رضی اللہ عنہ نے اسلام کی خاطر مکہ مکرمہ سے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت رُقیّہ رضی اللہ عنہا بھی آپ کے ساتھ تھیں۔④ کچھ مدت بعد آپ رضی اللہ عنہ مکہ معظمہ لوٹ آئے، پھر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ ہجرت کا حکم دیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ کے ساتھ وہیں تشریف لے گئے۔⑤

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنا مال ودولت راہِ مولا میں بے دریغ لٹائی۔ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو میٹھے پانی کی فراہمی میں بڑی مشکل پیش آتی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کو منہ مانگے دام دے کر اس سے میٹھے پانی کا کنواں بیر رومہ خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔⑥ جنگِ تبوک کے موقع پر آپ رضی اللہ عنہ نے جہاد کے لیے تین سو اُونٹ سازوسامان سمیت پیش کیے، اس کے علاوہ ایک ہزار دینار بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جھولی میں لا ڈالے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش ہوکر فرمایا: ''آج کے بعد عثمان کچھ بھی کریں، انہیں کچھ نقصان نہیں۔''⑦

ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ جبل اُحد پر تشریف لے گئے، یکایک پہاڑ لرزنے لگا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پکار کر کہا: ''ٹھہر جا، تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا اور کوئی نہیں۔''⑧

---

① صحیح مسلم، ح: ۶۳۶۲، فضائل الصحابہ، فضائل عثمان رضی اللہ عنہ، ط دار الجیل
② صحیح مسلم، ح: ۶۳۶۳، فضائل الصحابہ، فضائل عثمان رضی اللہ عنہ، ط دار الجیل
③ البدایة والنهایة: ۲۳۰/۴
④ الکامل في التاریخ: ۵۵۰/۲
⑤ البدایة والنهایة: ۲۱۴/۴
⑥ البدایة والنهایة: ۱۹۱/۴
⑦ البدایة والنهایة: ۲۱۴/۴
⑧ صحیح البخاري، ح: ۳۶۹۹، کتاب المناقب، باب مناقب عثمان رضی اللہ عنہ

صلح حدیبیہ سے بھی آپ رضی اللہ عنہ کے مقام کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا۔ پھر جب آپ کے شہید کر دیے جانے کی افواہ پھیلی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو جمع فرما کر خونِ عثمان کا بدلہ لینے کے لیے اُن سے موت کی بیعت لی جسے بیعتِ رضوان کہا جاتا ہے کیوں کہ اس میں شریک ہونے والوں کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح میں اپنی رضا مندی کا پروانہ دیا۔[1]

یہی وجہ تھی کہ اکثر صحابہ کرام حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کو سب سے افضل مانتے تھے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اپنے دورِ خلافت میں جس فتنے اور آزمائش سے سابقہ پڑنے والا تھا اس کی طرف خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرما دیا تھا۔ صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما یکے بعد دیگرے تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دربان حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی زبانی دونوں کو جنت کی بشارت دی، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو فرمایا: انہیں جنت کی بشارت دو مگر ایسی آزمائش کے ساتھ جو انہیں پیش آ کر رہے گی۔[2]

ایک بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے ایک فتنے کا تذکرہ کیا، اس دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چادر اوڑھے ہوئے قریب سے گزرے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''یہ اس دن حق پر ہوں گے۔''[3]

خلافت کی ذمہ داریاں:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داری ایسے حالات میں سنبھالی تھی کہ اسلامی خلافت کی حدود مشرق سے مغرب تک پھیل چکی تھیں۔ خراسان، فارس، عراق عجم، عراق عرب، الجزیرۃ، شام، مصر، آرمینیا اور آذربائی جان تک کے علاقے چند برس قبل اسلامی قلمرو میں شامل ہوئے تھے، ان علاقوں میں متعدد اقوام بستی تھیں جن کی زبانیں، تہذیبیں اور عادات ونفسیات الگ الگ تھیں۔ ان سب کو ایک لڑی میں پروئے رکھنا، عدل وانصاف مہیا کرنا، حکومت اسلامیہ پر ان کا اعتماد متزلزل نہ ہونے دینا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور کی طرح قانون کی بالادستی کا معیار قائم رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ فتوحات کا جو ریلا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں چلا تھا، ابھی اس کے سامنے وسیع میدان باقی تھے۔ اسلام دشمن طاقتیں بکھرنے کے بعد مسلسل پسپائی کی حالت میں تھیں، ایسے میں اسلام کی شوکت وسطوت کو باقی رکھنے کے لیے لشکروں کی مہم جوئیوں کو رکنے نہ دینا بھی نہایت ضروری تھا۔

ہُرمُزان کا قتل۔ ایک نازک قضیہ:

اگرچہ بظاہر اس زمانے میں مسلمانوں کی دھاک ایسی بیٹھ چکی تھی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے لیے حکومت

---

① سورۃ الفتح، آیت: ۱۸، تفسیر ابن کثیر ؛ صحیح البخاری، ح: ۳۲۹۸، المناقب، مناقب عثمان رضی اللہ عنہ ؛ سنن الترمذی: ح ۳۷۰۲

② صحیح البخاری، ح: ۳۶۹۵، کتاب المناقب، مناقب عثمان رضی اللہ عنہ

③ مسند احمد، ح: ۱۸۱۱۸

وانتظامی مسائل پریشانی کا باعث نہیں ہونا چاہیے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے کچھ ایسے حقائق بھی تھے جن سے انہیں اندازہ ہو چلا تھا کہ اسلام دشمن طاقتیں اب چھپ کر وار کرنے کی منصوبہ بندی کر رہی ہیں اور ان کے آئندہ حملے خفیہ انداز کے ہوں گے۔ مدینہ منورہ میں امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ایک مجوسی کے ہاتھوں قتل محض کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر ایک بہت بڑی غلطی نہ ہو جاتی تو اس سازش کا راز یقیناً دنیا کے سامنے آجاتا۔ یہ ایسی غلطی تھی جس سے نہ صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل کی سازش کے پس پردہ اصل منصوبہ سازوں کا سراغ ہمیشہ کے لیے گم ہو گیا تھا بلکہ اس کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنتے ہی ایک نہایت نازک فیصلہ کرنا پڑ گیا تھا، اگر وہ اپنی خداداد بصیرت سے کام لے کر مسئلے کا حل نہ نکال لیتے تو سابق خلیفہ کی شہادت کے ساتھ ہی ایک اور فتنہ پھوٹ پڑتا۔

آپ رضی اللہ عنہ ابھی خلافت کی بیعت لے کر فارغ ہوئے تھے کہ آپ کے پاس حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبید اللہ رضی اللہ عنہ کا مقدمہ پیش کیا گیا کہ انہوں نے ایک مسلمان ہُرمُزان کو ناحق قتل کر دیا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو اُن کے دوست حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ کرنے والے مجوسی ابولؤلؤ کو قاتلانہ حملے سے ایک دن پہلے آلۂ قتل سمیت ہُرمُزان کے ساتھ کھڑے دیکھا تھا۔ اس وقت ہُرمُزان فیروز کو یہ خنجر دے رہا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے انہیں دیکھ لیا تو وہ دونوں گھبرا گئے، خنجر چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اگلے دن صبح اسی خنجر سے ابولؤلؤ ملعون نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا۔ عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ پر جب یہ انکشاف ہوا تو اس وقت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دم لبوں پر تھا۔ باپ کی موت کو یقینی دیکھ کر انہوں نے جوشِ انتقام میں ہُرمُزان کو قتل کر ڈالا، کیوں کہ ان کی معلومات کے مطابق وہ حملے کی سازش میں شریک تھا مگر اس کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہ تھا۔ چنانچہ عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر کے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے مکان میں قید کر دیا گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد یہ مقدمہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ کرام کو جمع کر کے مشورہ لیا، یہاں سیدھی بات یہ تھی کہ عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک کلمہ گو کو ناحق قتل کیا ہے، لہٰذا انہیں قصاص میں قتل کر دیا جائے۔ بعض صحابہ کرام کی رائے بھی یہی تھی۔ ادھر عبید اللہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل میں ہُرمُزان کی شرکت کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے تھے، اس لیے مقدمے میں ان کا پلہ کمزور پڑ گیا تھا۔ تاہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فقیہانہ نگاہ معاملے کو جس گہرائی سے دیکھ رہی تھی عام لوگ اس سے قاصر تھے۔ عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا تھا، اس یقین کے تحت کیا تھا کہ ہُرمُزان قتل کی سازش میں شریک ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اُن کے سامنے تھا:

''اگر تمام زمین وآسمان کے لوگ ایک مسلمان کے قتل میں شریک ہوں تو اللہ ان سب کو جہنم میں اوندھا ڈال دے۔''[1]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی مشہور تھا: ''اگر صنعاء کے تمام باشندے ایک آدمی کے قتل میں شریک ہوں تو

[1] ''لو ان اهل السماء والارض اشتركوا في دم مؤمن واحد لاكبهم الله في النار.'' (سنن الترمذی، ح: ۱۳۹۸، باب الحکم فی الدماء)

میں اس کے قصاص میں سب کو سزائے موت دے دوں۔''[1]

چنانچہ عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے والد کے قتل کا بدلہ لیا تھا، کیوں کہ ان کے خیال میں ہُرمُزان اس قتل میں برابر کا شریک تھا، لیکن چونکہ انہوں نے محض گمان پر عمل کیا تھا اور ہُرمُزان کے جرم کا کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکے تھے، نیز قانون کو ہاتھ میں لینے کا اختیار بھی انہیں قطعاً نہیں تھا اس لیے اُن کا یہ اقدام غلط اور ان کی سرزنش ضروری تھی، جیسا کہ حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو ایک ایسے شخص کے قتل پر ڈانٹا تھا جس نے میدانِ جنگ میں تلوار سر پر دیکھ کر کلمہ پڑھ لیا تھا، مگر حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے اس خیال سے اسے مار ڈالا کہ شاید وہ جان بچانے کے لیے ڈھونگ رچا رہا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ پر سخت ناراضی ظاہر کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا۔''[2]

مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو کوئی سزا نہیں دی، کیوں کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں اپنے فعل کی ایک وجہ جواز موجود تھی جو انہیں شبہے کا فائدہ دے رہی تھی اور ان پر کسی سزا کے اجراء کو ٹال دینے کے لیے کافی تھی۔

یہی حال حضرت عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا تھا کہ اُن کے ذہن میں اپنے فعل کی وجہ جواز موجود تھی۔ اگرچہ ان کا قانون کو ہاتھ میں لینا غلط تھا مگر ان کی تاویل سے انہیں شبہے کا فائدہ مل رہا تھا۔[3] اسی لیے اس معاملے کو عام مقدمات کی مانند سمجھ کر ملزم کو ''جان کے بدلے جان'' کے اصول پر قتل کر دینا، خود قانون کے ان احتیاطی پہلوؤں کے خلاف تھا جو مدعا علیہ کے لیے گنجائش پیدا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جس طرح شہید کیا گیا تھا اس کے پس پردہ عجمی سازش کے پورے امکانات موجود تھے۔ فیروز کی خودکشی اور ہرمزان کے قتل کے بعد اس تفتیش کے سارے راستے بند ہو گئے تھے مگر غیر ملکی مداخلت کا قوی امکان تو اپنی جگہ تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بصیرت سے یقیناً پوشیدہ نہیں ہوگا۔ اس سے ہُرمُزان کی مظلومیت کا پہلو خود بخود کمزور پڑ گیا تھا۔

آخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غور و فکر کے بعد ایک نہایت مناسب فیصلہ صادر فرمایا جو قانونِ شریعت کے عین مطابق ہونے کے ساتھ ساتھ گھمبیر حالات اور غیر یقینی کی کیفیت میں سب کے نزدیک قابل تعریف تھا۔ آپ نے حضرت

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الدیات، باب اذا اصاب قوم من رجل

مگر یاد رہے کہ فقہائے احناف نے ان احادیث کے ساتھ دیگر شرعی دلائل کو بھی سامنے رکھتے ہوئے یہ فرمایا ہے ایک شخص کے قتل میں متعدد افراد کو اس وقت تماما قتل کیا جائے گا جب ہر مجرم مہلک وار میں شریک ہو۔ اگر کسی نے مہلک وار نہیں کیا بلکہ فقط قتل میں تعاون کیا ہے تو اسے حاکم تعزیراً کوئی مناسب سزا دے گا مگر اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ امام محمد بن حسن نے ''الحجة علیٰ اهل المدینة'' میں اس مسئلے پر بڑی دقیق بحث کی ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہی فتویٰ نقل کیا ہے کہ معاونِ قتل سے قصاص نہیں لیا جا سکتا۔ البتہ انہوں نے اہلِ مدینہ کا مذہب یہ نقل کیا ہے کہ معاون کو بھی قتل کیا جائے گا اور پھر اس کی تردید میں احناف کے دلائل پیش کیے ہیں۔ (الحجة علیٰ اهل المدینة: ۴/۴۰۴، الرجل یمسک الرجل للرجل حتیٰ یقتله، ط عالم الکتب)

بہرحال اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ عبیداللہ بن عمر کا ہُرمُزان کو قابلِ قصاص سمجھنا بالکل بے بنیاد نہ تھا بلکہ ان کے شبہے کی کچھ نہ کچھ دلیل موجود تھی۔

[2] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسامة

[3] فقہاء کا مشہور اصول ہے: الاسباب الموجبة للعقوبات من الحدود والقصاص والعقوبات تندری بالشبهات. (التقریر والتحبیر لابن امیر الحاج الحنفی م ۸۸۹ھ: ۲/۲۰۲) یعنی حدود و قصاص کو واجب کرنے کی بنیادیں شک کی بناء پر زائل ہو جاتی ہیں۔

عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو "قتل خطا" کا مجرم قرار دیتے ہوئے انہیں خون بہا کی ادائیگی کا ذمہ دار بنایا اور پھر اپنی جیب سے یہ خطیر رقم حضرت عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے مقتول کے ورثاء کو ادا کر دی۔

اس طرح ایک طرف تو مدعی خاندان کو انصاف مل گیا، دوسری طرف ان مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر پہلے ہی غمزدہ تھے اور ان کے لیے یہ بات بڑی صدمہ انگیز ہوتی کہ باپ کے قتل کے فوراً بعد بیٹا بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا۔① بعض روایات کے مطابق ہُرمُزان کے بیٹے نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے بعد خود بھی عبیداللہ رضی اللہ عنہ کو معاف کر دیا تھا جس پر اہل مدینہ نے خوش ہو کر اسے کاندھوں پر اٹھا لیا تھا۔②

جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر معترض رہے وہ نہ صرف غیر ملکی سازش کے امکان بلکہ قتل خطا کے پہلو کو بھی نظر انداز کر رہے تھے۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شریعت، حالات، عوامی جذبات، اصولِ سیاست اور میزانِ انصاف سب کو ملحوظ رکھتے ہوئے مناسب ترین فیصلہ دیا جو عادلانہ بھی تھا اور حکیمانہ بھی۔ اسی طرح اپنی خلافت کی ابتداہی میں انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک مثالی قائد اور رہنما کی تمام خصوصیات سے مالا مال ہیں۔

پہلا خطبہ:

خلیفہ بننے کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو جو پہلا خطبہ دیا اس میں ارشاد فرمایا:

"لوگو! تم ایک عارضی گھر میں رہ رہے ہو اور اپنی عمر کے باقی ماندہ ایام پورے کر رہے ہو، لہٰذا جو نیک کام تمہارے بس میں ہے وہ موت سے پہلے کر گزرو، تمہیں صبح جانا ہوگا یا شام۔ خبردار! دنیا کی زندگی فریب میں لپٹی ہوئی ہے۔ کہیں یہ تمہیں دھوکا نہ دے جائے، کہیں فریبی شیطان تمہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں فریب نہ دے جائے۔ گزرنے والوں سے عبرت حاصل کرو۔ کہاں ہیں دنیا دار لوگ، دنیا کے عاشق! جنہوں نے دنیا کو آباد کیا، ترقی دی اور مدتوں لطف اندوز ہوئے۔ کیا دنیا نے انہیں چھوڑ نہیں دیا؟ تم دنیا کو وہی ثانوی حیثیت دو جو اللہ تعالیٰ نے اسے دی ہے اور آخرت کے طلب گار بنو۔"③

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں رہتے ہوئے مکہ دور کی جان گسل آزمائشوں، حبشہ اور مدینہ منورہ کی ہجرتوں اور مدینہ منورہ میں نخلِ اسلام کی نشوونما کے مختلف مرحلوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کاتبِ وحی اور حافظِ قرآن ہونے کی حیثیت سے آپ کلام اللہ کے لفظ لفظ سے واقف تھے اور رسول اللہ ﷺ کے شب و روز کے گہرے مشاہدے نے آپ کو شریعت کا مزاج شناس بنا دیا تھا۔ آپ نے دورِ صدیق اکبر کے فتنوں کو اُبھرتے اور مٹتے بھی دیکھا، سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی فتوحات کا سنہرا دور بھی آپ کا دیکھا بھالا تھا۔ اسلام کی ہر فتح کے پیچھے مرکزِ خلافت میں آپ کے مشورے کارفرما رہتے تھے۔ اس لیے اب عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد خلیفہ کو جو کرنا

---

① البداية والنهاية: ۲۱۷/۱۰

② تاريخ الطبرى: ۲۴۳/۴

③ البداية والنهاية: ۲۱۵/۱۰، دار هجر

چاہیے تھا، آپ اس سے اچھی طرح واقف تھے۔

اگر سرسری نظر سے دیکھا جاتا تو آپ رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کی ذمہ داریاں ذرا بھی گراں نہیں تھیں کیوں کہ یہ اسلام کے عروج کا زمانہ تھا۔ مشرق و مغرب میں اسلام کے خلاف سر اٹھانے والی کوئی طاقت باقی نہیں بچی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنی بے پناہ انتظامی و احتسابی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایک مثالی معاشرہ اور ایک مضبوط انتظامی ڈھانچہ اُمت کو دے گئے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ اس بنے بنائے بہترین نظام میں کوئی رخنہ اندازی نہ ہونے دیتے۔

مگر ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل (۳۶ لاکھ ۲۱ ہزار مربع کلومیٹر) پر مشتمل اتنی بڑی مملکت کے بنے بنائے نظام کی دیکھ بھال بھی یقیناً ایک بھاری اور توجہ طلب ذمہ داری تھی۔ مسلمانوں کا امیر اللہ کے ہاں بھی جوابدہ تھا اور بندوں کے سامنے بھی۔ یہ اتنا سخت امتحان تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے آخری سال میں جبکہ ان کی عمر ساٹھ سال بھی نہیں ہوئی تھی، یہ دعا فرمانے لگے تھے: ''اے اللہ! میں بوڑھا ہو گیا ہوں، طاقت کم ہو گئی ہے، رعایا دور دور تک پھیل گئی ہے، پس مجھے اس حال میں دنیا سے اٹھا لے کہ مجھ سے کسی کے حق میں کوتاہی ہوئی ہو، نہ کسی پر زیادتی۔''[1]

اِدھر خلافت کے آغاز میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عمر ستر سال ہو چکی تھی۔ صحت اور بدنی طاقت کے لحاظ سے بھی وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے برابر نہ تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی تمام تر توانائیاں مسلمانوں کی دیکھ بھال، ان کے حقوق کے تحفظ اور مرکزِ خلافت کے استحکام کے لیے وقف کر دی تھیں، جس کے پیچھے یقیناً ایک غیر معمولی قوتِ ایمانی، جذبۂ ایثار و قربانی، تحمل و برداشت کی صلاحیت اور روحانی توانائی کار فرما تھی۔

فتنوں کا احساس:

اُمت کے حالات کو جس بلند نگاہی سے آپ دیکھ رہے تھے، اس سے دو خاص پہلو آپ کے سامنے آ چکے تھے، جن کے لیے تدبیر و انتظام کرنا آپ کی ذمہ داری تھی: ایک پہلو یہ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کسی بہت بڑے فتنے کا پیش خیمہ ہے جس سے یہ اُمت دوچار ہو کر رہے گی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علم میں حضرت حذیفہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی وہ گفتگو بھی تھی جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا تھا: ''اس فتنے کے بارے میں بتایئے جو موجوں کی طرح اُمت کو بہا لے جائے گا۔''

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا جواب تھا:

''امیر المؤمنین! آپ کے اور اس کے درمیان ایک مضبوط دروازہ حائل ہے جو آپ کی حیات تک بند رہے گا۔''

بعد میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے خود لوگوں کو بتایا کہ ''وہ دروازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود تھے، جن کی موت کے بعد فتنے سر اُٹھائیں گے۔''[2]

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۱۰۷، ط نزار

[2] صحیح البخاری، ح: ۷۰۹۶، کتاب الفتن، الفتن التی تموج کموج البحر

خلیفہ ثالث کو اس بارے میں حضور نبی اکرم ﷺ کے ارشادات اچھی طرح یاد تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں جنت کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا تھا: ''یہ خوشخبری ایسی آزمائش کے ساتھ ہے جو انہیں پہنچ کر رہے گی۔''[1] حضور ﷺ نے وفات سے پہلے ایک بار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تنہائی میں بلا کر اُن سے کچھ راز کی باتیں کی تھیں جن سے ان کا رنگ اڑ گیا۔[2] اس دوران آپ ﷺ نے ان سے کہا تھا: ''عن قریب اللہ تمہیں ایک کرتہ (یعنی منصب خلافت) بخشے گا۔ اگر منافق لوگ تم سے وہ کرتہ چھیننا چاہیں تو تم ہرگز مت اُتارنا، یہاں تک کہ تم مجھ سے آملو۔''[3]

حضور ﷺ کے ارشادات پر آنکھوں دیکھے سے زیادہ یقین کرنے والے عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور ان کے مشیر صحابہ کرام کو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد عن قریب فتنے پھوٹیں گے۔ ان احادیث کے علاوہ خود خلیفہ کا محرابِ مسجد میں شہید ہونا اور تفتیش کی راہوں کا بند ہو جانا ظاہر کر رہا تھا کہ اسلام دشمن طاقتیں میدانِ جنگ سے پسپا ہو کر اب خفیہ جنگ لڑنے پر تل گئی ہیں اور ان کی طرف سے فتنہ وفساد کو ہوا دینے کی سازشیں شروع ہو چکی ہیں۔ پس یہ بات تو طے تھی کہ ان فتنوں کو روکا نہیں جا سکتا۔ ہاں ان سے نبرد آزما ہونے اور ان کے مضرات کو کم سے کم کرنے کی کوشش ضروری تھی، اس میں کامیابی کی امید موجود تھی اور اصحابِ رسول اسی حد تک سعی کے مکلف تھے۔ یہی وہ سب سے بڑا چیلنج تھا جس کا سامنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کرنا تھا۔ اور بلاشبہ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے ساتھ ہی وہ ذہنی طور پر ان فتنوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے اپنی پالیسیوں میں اس دفاعی ہدف کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔

☆☆☆

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی بہترین پالیسی

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے پیش آمدہ فتنوں کے مقابلے اور استحکام خلافت کے لیے جو پالیسی اپنائی، اس میں نرمی اور گنجائش کا پہلو غالب نظر آتا ہے جسے مستشرقین اور سیکولر مؤرخین نے محض ضد کی بنا پر ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ خلیفۂ ثالث کی پالیسی کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس بنیادی بات پر غور کرنا ہوگا کہ کوئی بھی حکومت فتنوں کا سدباب دو طرح کر سکتی ہے:

1. سخت گیری اور قلع قمع کی پالیسی اپنا کر
2. نرمی، گفت وشنید اور کھلے احتساب کا انداز اختیار کر کے

سخت گیر پالیسی اپنانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مخالفین اور فتنہ پرور لوگوں کا جڑ سے صفایا کر دیا جائے۔ انہیں چن چن کر گرفتار، قید اور قتل کیا جائے تاکہ دوسرے لوگ بھی ان کے انجام سے عبرت حاصل کریں اور فتنہ وفساد میں شرکت سے گریز کریں۔

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۳۶۹۵، کتاب المناقب، مناقب عثمان رضی اللہ عنہ

[2] مسند احمد، ح: ۲۴۲۵۳ باسناد صحیح [3] مسند احمد، ح: ۲۴۵۶۶ باسناد صحیح

یہ پالیسی بعض مواقع پر کامیاب ہو جاتی ہے۔ کئی حکمرانوں نے یہ انداز اپنا کر طویل عرصے تک تاج وتخت برقرار رکھا ہے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ داروگیر، پکڑ دھکڑ اور عبرت ناک سزاؤں کی پالیسی کسی حکومت اور مملکت کو مستقل پائیداری نہیں بخشتی، بلکہ اس کے نتیجے میں حکومتیں زوال کی کھائی میں گرتی چلی جاتی ہیں، کیوں کہ فتنہ وفساد جب اپنے شہریوں کی طرف سے ظاہر ہو تو انہیں کچلنے اور روندنے کی پالیسی کے ردعمل میں بہت سے بے قصور لوگ بھی لپیٹ میں آ جاتے ہیں، شہریوں کے حقوق کی پامالی عام ہو جاتی ہے بہت سے افراد معمولی شرانگیزی کی بڑی سزا پا جاتے ہیں تو حکومت کے پکے مخالف بن کر باغیانہ سرگرمیوں کو زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں۔ پھر حکومت کی طرف سے جواب میں مزید تشدد ہوتا ہے اور ردعمل میں باغیانہ کارروائیوں کا دائرہ بھی پھیلتا ہے، جس کے نتیجے میں آخر ملک تباہ ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس نرمی، گفت وشنید اور قانون کے مطابق احتساب کا انداز اپنانے سے وقتی طور پر تو فسادی لوگوں کو کچھ چھوٹ مل جاتی ہے مگر انہیں عوام کو مشتعل کرنے میں زیادہ کامیابی نہیں ہوتی کیوں کہ ہر شخص جب اپنے حقوق محفوظ دیکھتا ہے تو خواہ مخواہ کسی پرخطر سرگرمی میں کودنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ فسادی لوگوں میں سے بھی بہت سے افراد جو غلط فہمی کا شکار ہو کر حکومت سے ٹکرانے کی کوشش کرتے ہیں جواب میں حکام کو مخلص وہمدرد، اپنے حقوق کو محفوظ، گفت وشنید کا دروازہ کھلا اور احتساب کو صاف وشفاف پا کر اپنی غلط روش سے باز آ جاتے ہیں۔ جو لوگ عادی سرکش یا غیر ملکی ایجنٹ ہوتے ہیں وہ قانون کے مطابق سزا پاتے ہیں اور اگر بچ بھی جائیں تو معاشرے پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنی معاملہ فہمی، تدبر اور فراست ایمانی کی بناء پر یہی طرز اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ چھپے ہوئے فسادی لوگ جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کے فوراً بعد فتنہ وفساد برپا کر سکتے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارہ برسوں میں سے دس سال تک ذرہ برابر بھی کامیاب نہ ہوئے۔ انہیں اس تمام عرصے میں ایسا کوئی موقع نہ مل سکا جس سے وہ فساد کی چنگاریاں بھڑکاتے اور مسلمانوں کو خلافت کا باغی بناتے۔

دورِ حاضر کے بعض نام نہاد محققین کا یہ دعویٰ سراسر خلافِ حقیقت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرم خوئی اور درگزر نے خلافتِ اسلامیہ میں فتنوں کو سر ابھارنے کا موقع دیا۔ ایسے لوگ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ اگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہوتے تو ان فتنوں کو سختی سے کچل دیتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو پالیسی اپنائی، زمانے کے لحاظ سے وہ موزوں تھی اور اس میں اکابرِ صحابہ کی مشاورت بھی شامل تھی۔ اگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حکومت مزید دس بارہ سال رہتی تو پیش آمدہ حالات کو دیکھ کر شاید ان کا طرزِ عمل بھی اس سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوتا۔

پالیسی کی امتیازی خوبیاں:

یہ خیال بھی بالکل غلط ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے طرزِ سیاست کو یکسر ترک کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فاروقی نظمِ حکومت کو برقرار رکھتے ہوئے انہی کی طرزِ سیاست کی پیروی کی تھی۔ مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا، علم ومعرفت کے مراکز آباد رہے، لوگ اسلام میں داخل ہوتے

رہے، رعایا کو تمام حقوق برابر ملتے رہے، گورنروں اور افسران کی نگرانی ہوتی رہی، عہدے داروں کی کی کوتاہی پر باز پرس جاری رہی، اپنے فرائض میں غفلت برتنے والوں کو برطرف کیا جاتا رہا۔

مگر ان تمام انتظامی وسیاسی اقدار کی بقا کے ساتھ اُمت نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں جو نئی چیز دیکھی وہ رویے کی تبدیلی تھی جس کا اظہار تین طرح سے ہوا:

❶ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رویہ سخت تھا؛ کیوں کہ ان کی طبیعت میں جلالِ الٰہی کا غلبہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا رویہ نرم اور شائستہ تھا۔ ان کا مزاج جمالِ نبوی کا عکس تھا۔ طبعی طور پر وہ بڑے نرم گفتار، رحم دل اور وضع دار انسان تھے۔ اس شائستہ گفتاری اور نرم خوئی میں آپ کی تاجرانہ زندگی اور لین دین کے تجربے کا دخل بھی تھا، آپ کسی کو جھڑکنے یا ڈرانے کے عادی نہ تھے۔ ضرورت کی بات صاف لہجے، مختصر الفاظ اور شریفانہ انداز میں کہہ دیتے تھے۔

❷ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما لوگوں کو انعام واکرام سے نوازنے کے عادی نہیں تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ذاتی طور پر اتنے خوشحال نہ تھے اور بیت المال سے ایسے خرچ اُن کے نزدیک خلافِ احتیاط تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ داد ودہش کو اچھا سمجھتے تھے، ایک کامیاب تاجر ہونے کے ناطے ان کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی اور وہ اسے جمع کر کے رکھنے کی بجائے خرچ کرنے کو ترجیح دیتے تھے، چنانچہ صدقہ وخیرات بھی کثرت سے کرتے تھے اور آنے جانے والے کو اس ذاتی سرمائے سے تحائف سے بھی نوازتے تھے۔

(مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیت المال سے بے جا خرچ کرتے تھے۔ ہرگز نہیں، بیت المال سے وہ ایک درہم بھی ذاتی طور پر نہیں لیتے تھے، نہ اپنے کسی مقصد کی خاطر کسی کو دیتے تھے۔ یہاں تک کہ گزشتہ دو خلفاء بیت المال سے جو وظیفہ اپنی گزراوقات کی خاطر لیتے تھے، خلیفہ ثالث نے اسے بھی اپنے لیے جاری نہ کروایا۔)

❸ رویے میں تبدیلی کا تیسرا مظاہرہ یہ تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اُمت مسلمہ میں عوام وخواص سب کے لئے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کی گنجائش رکھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتوحات کی اتنی کثرت نہیں ہوئی تھی کہ دولت کی ریل پیل ہوتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں قیصر وکسریٰ کے خزانے قدموں میں آپڑے تھے مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کو نمونہ قرار دیتے ہوئے مسلمانوں، خصوصاً اپنے گورنروں اور افسران کے لیے سادگی کو پسند فرمایا اور کوشش کی کہ مسلمان دولت کی کثرت کے باوجود عرب کے بے تکلف بدویانہ تمدن کو اپنائے رکھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود اس بارے میں سب سے زیادہ محتاط تھے اور فقیرانہ زندگی گزارتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نہایت حکمت وتدبر کا ثبوت دیتے ہوئے اُمّت کو یہ گنجائش دی کہ لوگ اللہ کے دیے ہوئے حلال مال میں سے مباح اور جائز سہولیات کو اختیار کر سکتے ہیں، کیوں کہ آپ کی نگاہ صرف ان احادیث پر نہیں تھی جن میں دنیاداری اور آرام پسندی کی مذمت آئی ہے بلکہ آپ کی فقیہانہ نگاہ ان نصوص قرآنیہ اور فرامین نبویہ پر بھی تھی جن میں حلال نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِىٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾

''آپ کہہ دیجیے کس نے حرام کیا ہے اللہ کی دی ہوئی زیب وزینت کی چیزوں کو اور پاکیزہ رزق کو۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''اللہ تعالیٰ جب کسی بندے پر انعام اکرام فرماتے ہیں تو یہ بات پسند کرتے ہیں کہ ان نعمتوں کا اثر آدمی پر ظاہر ہو۔''[2]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اگرچہ مسلمانوں کو اچھی پوشاک اور زیب وزینت سے منع کرتے تھے مگر ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمان ان میں منہمک نہ ہو جائیں ورنہ بذاتِ خود ان نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے جواز کو وہ اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ جب انہوں نے بیت المقدس کی فتح کے موقع پر اپنے بعض افسران کو بیش قیمت لباس پہنے ہوئے دیکھا تو انہیں ملامت کی لیکن جب جواباً کہا گیا: ''یہاں اس قسم کا لباس پہننے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے'' تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے خاموشی اختیار کر لی۔[3]

اس پالیسی کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ اگر مباح آسائش اور سہولیات پر پابندی لگا دی جاتی تو اس دولت کا کیا مصرف ہوتا جس کے انبار بیت المال میں لگے رہتے تھے اور جب لوگوں کو حصے تقسیم کیے جاتے تو ان کے ہاں بھی غلے کی طرح دولت کے ڈھیر لگ جاتے تھے۔

بیت المال کی یہ آمدن، استعماری طاقتوں کی مشرق میں لوٹ مار کی مانند نہیں تھی بلکہ اس میں بڑا حصہ اس خراج کا تھا جو سالانہ عراق، فارس، خراسان اور مصر سے آتا تھا اور جس کی مالیت آج کل کے حساب سے اربوں ڈالر بنتی ہے۔ اس وقت اسلامی دنیا کی کل آبادی غالباً ایک کروڑ افراد سے بھی کم تھی جن کے لیے یہ وسائل ضروریات سے بہت زیادہ تھے۔ ضروریات کی حد ویسے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں طے کردہ وظائف کے نظام سے بڑی فراغت سے پوری ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود جب بیت المال میں عوام کو مزید دینے کی گنجائش تھی تو کیوں نہ دیا جاتا۔

اب ظاہر ہے کہ کسی کو اس کی ضرورت سے زائد رقم دے کر اگر پابند کر دیا جائے کہ وہ ضروریات سے ہٹ کر خرچ نہ کرے تو پھر اس فیاضی کا کوئی مطلب نہیں رہے گا اور اسے ایک غیر سنجیدہ رویہ ہی کہا جائے گا جو اسلامی حکومت کے شایانِ شان ہرگز نہ تھا۔ اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مناسب سمجھا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے غنائم اور مفتوحہ علاقوں کی پیداوار کے محصولات بڑی مقدار میں مل رہے ہیں اسی انداز سے حکومت کو بھی عوام پر کھلم کھلا خرچ کرنا چاہیے اور انہیں مباحات کے دائرے میں پر آسائش زندگی گزارنے کی چھوٹ دینی چاہیے۔

چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد جو ابتدائی اقدامات کیے، ان میں ایک اہم فیصلہ یہ تھا کہ فی کس

---

[1] سورۃ الأعراف، آیت: ۳۲

[2] شعب الأیمان: ۲۶۳/۸، ط الرشد۔ [3] البدایۃ والنہایۃ: ۶۵۸/۹

سالانہ وظیفے میں سو درہم (آج کل کے لحاظ سے تقریباً ۲۵ ہزار روپے) کا اضافہ کر دیا گیا۔ ①

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ماہِ رمضان المبارک میں لوگوں کو سحر و افطار کرانے کے لیے ایک ایک درہم تقسیم کیا کرتے تھے۔ جب ان سے کسی نے کہا کہ ”کیوں نہ آپ اجتماعی کھانے کا انتظام کرا دیں۔“

تو فرمایا: ”میں لوگوں کو گھر بیٹھے شکم سیر کرنا چاہتا ہوں۔“

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح رقم تقسیم کرنے کے طریقے کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ سحر و افطار کے اجتماعی دسترخوان کا نظام بھی شروع کرا دیا اور فرمایا:

”یہ مسافروں، اجنبیوں اور مساجد میں عبادت کے لیے جمع رہنے والوں کے لیے ہے۔“ ②

اس معقول، ہمدردانہ اور فیاضانہ طرزِ عمل کے مثبت اثرات ظاہر ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رعایا پر دریے نے دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کے دل جیت لیے۔ مؤرخین تسلیم کرتے ہیں کہ ان اقدامات کے نتیجے میں رعایا انہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ چاہنے لگی کیوں کہ کامل عدل وانصاف اور عمدہ و مستحکم نظام ویسا ہی تھا مگر ساتھ میں فیاضی، سخاوت اور نرمی بھی تھی جو دشمنوں کو بھی گرویدہ بنا لیا کرتی ہے۔ ③

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”میں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خطاب کرتے دیکھا، اس وقت میں بالغ ہونے کے قریب تھا، میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے زیادہ حسین اور تروتازہ چہرہ کسی مرد کا دیکھا تھا نہ کسی عورت کا۔ میں نے سنا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ”حضرات! آیئے اور اپنے وظائف لے جایئے۔“ پس لوگ آ کر بھرپور انداز میں مال وصول کرتے۔ ارشاد ہوتا: ”حضرات! آیئے، کپڑے اور ملبوسات لے جایئے۔“ پس لوگ آتے، ملبوسات لا کر لوگوں میں بانٹ دیے جاتے۔ اللہ کی قسم! میرے کانوں نے یہاں تک سنا: ”حضرات! آیئے، گھی اور شہد وصول کر لیجیے۔“ لوگوں میں گھی اور شہد تقسیم کیا جاتا۔ لوگ آتے اور مشک و عنبر جیسی خوشبوئیں لے کر جاتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں لوگوں کے مابین دشمنیوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ عطیے اور انعامات کی بارش برستی تھی۔ روئے زمین پر کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جسے دوسرے مسلمان سے کوئی خدشہ ہو۔ جو کسی بھی شہر میں کسی بھی مسلمان سے ملتا اسے اپنا بھائی، دوست، مددگار اور خیر خواہ محسوس کرتا۔“ ④

☆☆☆

① الكامل في التاريخ: ۲/۴۵۳

② تاريخ الطبرى: ۴/۲۴۵

③ الامامة والسياسة لابن قتيبة، ص ۴۵، ط مكتبة البلل

④ الامامة والسياسة، لابن قتيبة، ص ۴۵، ۴۶

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے جانباز میدانِ جہاد میں

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے جانے سے پرچم جہاد سرنگوں نہیں ہوا، فتوحات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ علامہ ابن جریر طبری حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کے تحت عسکری نظام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کوفہ کی چھاؤنی میں چالیس ہزار سپاہی تیار رہتے تھے جن میں سے ہر سال دس ہزار سپاہی سرحدوں پر اس طرح تعینات کیے جاتے تھے کہ چھ ہزار ''آذربائیجان'' میں ہوتے اور چار ہزار ''رے'' میں۔''[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے ہی سال حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور سے الجزیرہ کے گورنر تھے، اپنے سالار سلمان بن ربیعہ رحمہ اللہ کو بارہ ہزار کا لشکر دے کر آرمینیا بھیجا جو خاصا علاقہ فتح کر کے بکثرت مالِ غنیمت سمیت واپس آئے۔[2]

رومی سردار کے خیمے میں:

اسی سال مسلمانوں نے شام کی سرحدوں پر رومیوں کو نہ بھولنے والا سبق سکھایا۔ رومی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت سے دل گرفتہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر شام کی سرحدوں پر دھاوا بولنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جیسے ہی اطلاع ہوئی آپ نے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو تاکیدی خط بھیجا کہ ''آٹھ، دس ہزار سپاہیوں کا لشکر شام والوں کی مدد کے لیے روانہ کریں۔''

حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے فوراً سلمان بن ربیعہ رحمہ اللہ کی قیادت میں لشکر تیار کر کے شام کی سرحد پر بھیج دیا جہاں حضرت حبیب بن مَسلَمَہ الفہری رضی اللہ عنہ مقامی سپاہیوں کے ساتھ کمک کے منتظر تھے، اُدھر سرحدوں پر رومی سپہ سالار اسی ہزار رومیوں اور ترکوں کے ساتھ خیمہ زن ہو چکا تھا۔ حضرت حبیب بن مَسلَمَہ رضی اللہ عنہ پینترے بدل کر لڑنے کے ماہر تھے، انہوں نے دشمن پر شب خون مارنے کا فیصلہ کیا، جب وہ اپنے خیمے سے نکلنے لگے تو اُن کی اہلیہ محترمہ اُمّ عبداللہ بنت یزید نے پکار کر کہا: ''پھر کہاں ملاقات ہوگی؟'' بولے: ''رومی سپہ سالار کی خیمہ گاہ میں یا جنت میں۔''

جب وہ رات کی تاریکی میں رومیوں کی طرف بڑھے تو اُن کی اہلیہ بھی بھیس بدل کر اُن کے جانبازوں میں شامل ہو گئیں، حضرت حبیب بن مَسلَمَہ رضی اللہ عنہ بجلی کی طرح دشمن پر حملہ آور ہوئے اور لڑتے لڑتے رومی سپہ سالار کے خیمے تک جا پہنچے تو دیکھا ان کی اہلیہ پہلے سے وہاں موجود ہیں اور دشمن سے بھڑی ہوئی ہیں، آخر رومیوں کو شکست فاش ہوئی اور مسلمان فتح کا پرچم لہراتے ہوئے واپس آئے۔[3]

---

[1] تاریخ الطبری: ۲۴۶/۴

[2] تاریخ الطبری: ۲۴۷/۴

[3] تاریخ الطبری: ۲۴۸/۴ ؛ البدایة والنهایة: ۲۲۰/۱۰، ۲۲۱

اس شکست کے باوجود بازنطینی رومیوں کو یہ توقع تھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد مسلمانوں کی قوت وشوکت میں کمی ضرور آئی ہوگی، اس لیے اب ان سے کچھ نہ کچھ سرحدی علاقے واپس لیے جاسکتے ہیں، شام کی سرحدوں پر شکست کھانے کے بعد انہوں نے مصر کے ساحلی شہر اسکندریہ پر قبضے کا منصوبہ بنایا تھا، ان کا سالار منوئیل وہاں ایک بھاری بحری بیڑا لے کر پہنچ گیا، مقامی رومی باشندوں نے اس سے پہلے ہی مسلمانوں کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا تھا اس لیے رومی اسکندریہ پر قابض ہوگئے۔

مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے انہیں زیادہ دن تک فتح کا جشن منانے کا موقع نہیں دیا اور ربیع الاول سن ۲۵ھ میں جوابی حملہ کر کے رومی بیڑے کو شکست فاش سے دوچار کیا اور شہر پر دوبارہ اسلامی پرچم لہرا دیا۔[1] اسکندریہ کے مقامی قبطی باشندے بغاوت میں رومیوں کے ساتھ شریک نہ تھے۔ اس لیے رومیوں نے فرار ہوتے ہوتے انہیں بڑا مالی نقصان پہنچایا تھا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حتی الامکان ان کے نقصان کی تلافی کر دی۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو برسوں میں ہونے والے ان دو بڑے معرکوں میں مسلمانوں کی پوزیشن دفاعی تھی جبکہ جارحیت دشمن کی طرف سے تھی، تاہم ان کے علاوہ آپ کی خلافت کے مختلف برسوں میں کئی مہمات سرحدوں کے پار بھیجی گئیں، مگر ان کی حیثیت چھاپہ مار کارروائیوں کی سی تھی۔ مسلمان سرحدوں پر خیمہ زن ہوتے اور تیز رفتار چھوٹے چھوٹے گھڑ سوار دستے دشمن کے علاقے میں پھیلا کر ان کی خوراک ورسد لوٹتے اور حفاظتی چوکیوں پر حملے کرتے۔ اسی طرح حریف کو زک پہنچا کر کسی علاقے یا قلعے پر قبضہ کیے بغیر واپس آجاتے۔ ایسی مہمات کے چار مقاصد تھے:

1. اپنی قوت کی دھاک بٹھائے رکھنا
2. دشمن کی طاقت کا اندازہ لگاتے رہنا
3. دشمن کو اقتصادی طور پر کمزور کرنا
4. اپنی فوج کو متحرک رکھ کر سرحدوں کو محفوظ بنانا

مستشرقین مسلمانوں کی ایسی مہمات کو لوٹ مار اور ڈاکا زنی سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ اس قسم کی کارروائیاں بازنطینیوں کی طرف سے بھی جاری تھیں۔ پس یہ کش مکش جو دو حکومتوں کے درمیان تھی ''جنگ'' ہی کہلائے گی، جس کی نوعیت قدرے مختلف تھی۔ اسے لوٹ مار یا ڈاکا زنی سے تعبیر کرنا اصولِ سیاست سے ناواقفیت کی علامت ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فتوحات کا دائرہ پھیلانے کی افادیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے، مگر اس سے پہلے عواقب کو مدنظر رکھنا بھی ضروری تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی سات برسوں میں اسلامی افواج سیلاب کی طرح چاروں اطراف پھیلتی چلی گئی تھیں مگر خلیفۂ ثانی نے فتوحات کو چند مخصوص جغرافیائی حدود کا پابند رکھا۔ مشرق کی فتوحات کو آپ نے خراسان کے میدانوں میں روک لیا اور افواج کو سطح مرتفع پامیر یا دریائے آمو عبور کر کے ترکوں کے وطن چین اور وسط ایشیا کی طرف بڑھنے نہ دیا۔ غالباً آپ کے سامنے یہ ارشادِ نبوی تھا:

---

[1] البداية والنهاية: ۱۰/۲۲۳
[2] الكامل في التاريخ: ۲/۲۵۵

"اُتْرُکُوا التُّرْکَ مَا تَرَکُوکُمْ۔"

"جب تک ترک تمہیں نہ چھیڑیں تم بھی ان سے تعرض نہ کرنا۔"[1]

مغرب میں آپ نے بحیرۂ روم کے ساحلوں تک یلغار پر اکتفا کیا اور سیدنا معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے اصرار کے باوجود سمندر میں پیش قدمی کی اجازت نہ دی۔ اس احتیاط کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی افواج کے نظم وضبط اور ہمت وحوصلے کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سمندر کی ہولناکیوں سے تشویش لاحق تھی، انہیں خطرہ تھا کہ مسلمان کسی سمندری طوفان کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس وقت تک مسلمان سمندری سفر، جہاز رانی اور بحری جنگوں سے واقف بھی نہیں تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے سپاہی اس موت کی وادی میں ضائع کرنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھے۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ بحری جنگ کے لیے جس طرح کے تربیت یافتہ افسران اور سپاہیوں اور جس قسم کے بحری جہازوں اور کشتیوں کی ضرورت تھی، اسلامی فوج اس سے محروم تھی، اسی لیے سمندر میں جہاد کرنا خود کو بازنطینی جہاز رانوں کے ہاتھوں غرق کرانے کے مترادف تھا۔

یہی احتیاطی پہلو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی تھے، اس لیے شروع کے چند برسوں میں آپ کی زیادہ تر توجہ ان کمزوریوں کو دور کرنے اور اپنی افواج کو مضبوط بنانے پر مرکوز رہی۔

تاہم مغرب میں مصر سے متصل افریقہ میں پیش قدمی کے مواقع موجود تھے، اس لیے خلیفۂ ثالث نے اپنی خلافت کے دوسرے سال سن ۲۵ ہجری میں مصر کی اسلامی افواج کو مغرب کی سمت یلغار کی نہ صرف اجازت دی بلکہ کمک بھیج کر حوصلہ افزائی بھی کی۔

افریقہ کی فتوحات

مصر کی سرحدوں سے متصل شمالی افریقہ کے وسیع علاقے ایک رومی حاکم جُرجیر (گریگوری) کے قبضے میں تھے۔ پہلے وہ قیصر روم کا ماتحت گورنر تھا مگر ایشیا سے رومیوں کی بے دخلی کے بعد حال ہی میں اس نے خود مختاری کا اعلان کیا تھا، اس کی مملکت کی حدود مصر کی سرحدوں سے مراکش تک پھیلی ہوئی تھیں۔ (آج کل یہاں تیونس، لیبیا، الجزائر اور مراکش واقع ہیں)

خلیفۂ ثالث کی اجازت ملنے پر شمالی مصر کے گورنر حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ دس ہزار کا لشکر لے کر صحرائے اعظم عبور کرتے ہوئے جُرجیر کی عملداری کے سرحدی علاقے میں داخل ہوئے، یہاں کئی مقامات پر جنگیں ہوئیں، دشمنوں کی بڑی تعداد گرفتار اور قتل ہوئی، مال غنیمت بھی بھاری مقدار میں حاصل ہوا۔ اکثر علاقوں میں ان لوگوں نے جو جُرجیر کے ظلم وستم اور رومیوں کے سخت قوانین سے تنگ آئے ہوئے تھے، جوق در جوق اسلام قبول کیا۔ بعض علاقوں

[1] المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۰/۱۸۱، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ

میں لوگوں نے لڑے بغیر صلح کر لی۔ حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا مقصد بھی اسلام کی اشاعت اور غلبہ تھا جو بڑی حد تک پورا ہو گیا تھا، اس لیے وہ واپس لوٹ آئے۔[1]

جُرجیر مسلمانوں کی ان فتوحات کو کہاں برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ اِدھر حضرت عبداللہ بن سرح رضی اللہ عنہ بھی پورے شمالی افریقہ کو فتح کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ سن ۲۷ ہجری میں انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس بارے میں اپنے عزائم سے آگاہ کر کے اجازت طلب کی۔ یہ ایک غیر معمولی مہم تھی جس میں کامیابی کے نتیجے میں مراکش تک اسلامی پرچم گڑ سکتے تھے اور ناکامی کی صورت میں مصر بھی ہاتھ سے نکل سکتا تھا۔

گزشتہ خلفاء کی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں مسلمانوں کے اہم امور کے لیے مسلسل مشوروں میں مصروف رہتے تھے، اس اہم معاملہ کو بھی مجلس شوریٰ میں پیش کیا گیا، اکثر ارکان نے اس مہم کے حق میں رائے دی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مہم کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سمیت کئی بڑے بڑے صحابہ کرام کمک کے لیے روانہ کیا۔ یہ حضرات مصر پہنچے تو مسلمان بے چینی سے ان کے منتظر تھے، لشکر نے کوچ کیا اور برقہ پہنچا جہاں حضرت عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ سرحدی افواج کے ساتھ موجود تھے۔ یہاں سے طَرَابُلُس تک کا علاقہ حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے دورِ فاروقی میں فتح کر لیا تھا۔ مسلمان جواب بیس ہزار ہو گئے تھے، ان حدود سے آگے نکل کر جُرجیر کے علاقے میں داخل ہو گئے، جو اپنے پایہ تخت سُبَیطِلَہ سے ایک منزل آگے ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی رکاب میں لیے مڈبھیڑ کے لیے تیار تھا۔

آخر دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ جُرجیر کی فوج چھ گنا زائد تھی مگر مسلمان ذرا بھی ہراساں نہ تھے کیوں کہ قادِسیّہ اور یَرمُوک کی جنگوں کے نتائج نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ مسلمان تعداد کی کمی یا کثرت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ ایمان اور جذبہ جہاد کی بنا پر لڑتے ہیں۔ جنگ سے پہلے حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے جرجیر کو اسلام قبول کرنے یا جزیہ ادا کرنے کی پیش کش کی، جو اس نے بڑی نخوت سے مسترد کر دی۔ آخر کار گھمسان کی جنگ چھڑی جو کئی دنوں تک جاری رہی، روزانہ صبح سے دوپہر تک لڑائی ہوتی اور اس کے بعد دونوں فریق اپنی خیمہ گاہوں میں لوٹ آتے۔

اِس دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جانب سے جو اس محاذ کے بارے میں بڑے متفکر تھے، تازہ دم مجاہدین کا ایک دستہ آن پہنچا، جس کی قیادت پچیس سالہ نوجوان حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کر رہے تھے، چونکہ کم عمری ہی سے ان کی برکات مشہور تھیں اس لیے مسلمانوں نے ان کا پرجوش استقبال کرتے ہوئے اس زور و شور سے تکبیر کے نعرے لگائے کہ جُرجیر سن کر اپنی جگہ چونک گیا۔ وجہ پوچھی، تو بتایا گیا مسلمانوں کو کمک مل گئی ہے۔ جُرجیر پریشان ہو گیا مگر اپنی فوج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اس نے اعلان کرا دیا:

---

[1] البداية والنهاية: ۲۲۵/۱۰

"جو شخص مسلمانوں کے امیر عبداللہ بن سعد ابن ابی سرح کو قتل کرے گا، اسے میں اپنی بیٹی کا رشتہ دوں گا اور ساتھ ایک لاکھ اشرفیاں بھی۔"

اس اعلان سے اس کی فوج میں ایک غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا۔ ادھر مسلمانوں کو معلوم ہوا تو انہیں اپنے امیر کے بارے میں خدشات لاحق ہو گئے، حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ بھی احتیاط کے طور پر ایک دن میدانِ جنگ سے غائب رہے۔ اس موقع پر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو حوصلہ دلانے کے لئے امیر لشکر کو مشورہ دیا:

"آپ بھی اعلان کرا دیں کہ جو شخص جُرجیر کو قتل کرے گا، ہم جُرجیر کی بیٹی سے اس کا نکاح کرا دیں گے، ایک لاکھ اشرفیاں بھی دیں گے اور جُرجیر کے علاقے کا حاکم بھی اس کو مقرر کریں گے۔"

امیر لشکر کو یہ رائے پسند آئی، جب یہ اعلان کیا گیا تو مسلمانوں میں ایک نئی ہمت پیدا ہو گئی، جبکہ جُرجیر اور اس کی فوج خوفزدہ ہو گئی، چونکہ کئی دن سے جاری اس جنگ کا فیصلہ ہونے میں نہیں آ رہا تھا، لہٰذا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جنگی حکمت عملی میں تبدیلی کی رائے دیتے ہوئے کہا:

"کل کی جنگ میں ہم کچھ فوج خیموں میں رہنے دیں گے، جب دونوں فریق لڑتے لڑتے بے حال ہو جائیں تو اس تازہ دم فوج کو بھیج کر تھکے ماندے دشمن کو مار بھگائیں گے۔"

سالارانِ فوج کی اتفاق رائے کے بعد حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ بھی قبول کر لیا۔

حسبِ معمول اگلے دن طلوعِ آفتاب کے ساتھ جنگ شروع ہوئی تو امیرِ لشکر نے منتخب شہ سواروں کو خیموں میں آرام کرنے کا حکم دیا۔ زوال کے وقت جب دونوں لشکر تھک کر واپسی کا ارادہ کرنے لگے، تب بھی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اصرار کر کے جنگ رکنے نہ دی۔ آخر سہ پہر کے وقت دونوں فریق بالکل بے حال ہو گئے۔ تب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کچھ تازہ دم بہادروں کو لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے اور ان کی صفوں کو الٹتے ہوئے عقب میں جا پہنچے جہاں جُرجیر اپنے گھوڑے پر سوار تھا اور دو باندیاں اسے مور پنکھ سے ہوا دے رہی تھیں۔ وہ اور اس کے محافظ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو چند سواروں کے ساتھ آتا دیکھ کر سمجھے کہ یہ دشمن کے سفیر وغیرہ آ رہے ہیں، اس لیے بھاگنے یا مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔ مگر جب ان کو ہتھیار سونتے دیکھا تو گھبرا گئے۔ جُرجیر نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر بھاگنے کی کوشش کی مگر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اس کے سر پر جا پہنچے اور تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا، پھر اسے نیزے میں پرو کر، تکبیر کا نعرہ لگاتے ہوئے اسی تیزی سے واپس آ گئے۔

اپنے بادشاہ کے قتل سے کفار کے چھکے چھوٹ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا لشکر بھاگ نکلا، ان کی شہزادی گرفتار کر لی گئی، جو وعدے کے مطابق حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دی گئی۔ اسلامی لشکر نے آگے بڑھ کر ان کے پایۂ تخت سُبَیطِلہ پر قبضہ کر لیا اور گرد و نواح کے کئی قلعے بھی فتح کر لیے۔

ان فتوحات میں مقامی حکمرانوں کے جمع کردہ خزانوں سے جو ساز و سامان غنیمت کے طور پر حاصل ہوا، وہ اتنا تھا

کہ فاتح لشکر کے بیس ہزار سپاہیوں میں سے ہر ایک کو کم از کم ایک ہزار دینار ملے۔[1]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ابتداءً دمشق کے حاکم تھے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں ترقی دے کر پورے شام کا گورنر مقرر کر دیا، اس طرح ان کی عملداری کی حدود سرحداتِ مصر تک پہنچ گئی تھیں۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں اس عہدے پر برقرار رکھا۔ یہ بات سب مانتے تھے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ شام کے اندرونی معاملات اور سرحدی انتظامات کو جس خوبی سے سنبھالے ہوئے ہیں وہ انہی کا کمال تھا۔ وہ ہر موسم گرما میں رومیوں سے جہاد کے لیے لشکر بھیجتے تھے اور انہیں جانی و مالی نقصانات پہنچا کر مسلمانوں کی ہیبت قائم رکھتے تھے۔

افریقہ میں حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کی فتوحات کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا اور مسلمانوں کی فتوحات کی تکمیل کے لیے حضرت مُعاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا جنہوں نے مراکش کی سرحدوں میں ثُمونِیَّہ (سوس) سمیت کئی اہم مقامات فتح کیے۔[3]

☆☆☆

---

① الکامل فی التاریخ: ۴۶۲/۲ تا ۴۶۴ ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۲۲۶/۲، ۲۲۷

ایک دینار ۲۵ء۴ گرام سونے کا ہوتا تھا، اس لحاظ سے ہر ایک کا حصہ آج کل کے لحاظ سے ایک کروڑ روپے یا ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ تھا۔

واقدی سے مروی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان فتوحات کا خمس (بیت المال میں رکھنے کی بجائے) آلِ حکم یعنی مروان اور اس کے خاندان کو بخش دیا تھا۔ (تاریخ الطبری: ۴/ص ۲۵۶) بعض روایات میں ہے کہ خمس عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو دے دیا تھا۔

اس پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ آیا یہ معاملہ مروان کے ساتھ کیا گیا تھا یا عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کے ساتھ؟

اس کا جواب علامہ ابن اثیر نے یہ دیا ہے کہ ایسا دو بار ہوا تھا۔ ایک بار مروان کے ساتھ، ایک بار عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس کا کیا حق تھا؟ کیا یہ بد دیانتی نہیں تھی؟

اس کے جواب میں علامہ ابن اثیر نے کہا ہے کہ مروان نے خمس میں آنے والے ساز و سامان کو پانچ لاکھ دینار میں خریدا تھا۔

" فاشتراہ مروان بخمس مائۃ الف ." (الکامل فی التاریخ: ۴۶۴/۲۔ تحت ۲۷ھ)

عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو افریقہ کے مالِ غنیمت میں سے پانچواں نہیں بلکہ خمس کا خمس (پچیسواں) حصہ بطور انعام دیا گیا تھا۔ کیوں کہ افریقہ کی مہم نہایت مشکل تھی، اس لیے مہم سے پہلے ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ان سے یہ انعام دینے کا وعدہ ہو چکا تھا۔

بہر حال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق ان باتوں کو اس طرح بڑھا چڑھا کر مشہور کیا گیا کہ لوگ بے چین ہو گئے۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے باز پرس کی تو آپ نے وضاحت کی کہ "میں نے عبداللہ کو مالِ غنیمت کے خمس کا خمس (پچیسواں حصہ) دیا ہے، یہ شرعاً غلط نہیں تھا۔ ایسے انعامات حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی دیتے رہے تھے۔" بہر حال جب لوگوں نے ناگواری کا اظہار کیا تو وہ انعام واپس لے لیا گیا۔

یہ بھی مشہور کیا گیا کہ آپ نے سرکاری اموال سے مروان بن حکم کو پندرہ ہزار کا عطیہ دے دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے وضاحت فرمائی کہ یہ عطیے میں نے اپنے ذاتی مال سے دیے ہیں۔ یہ سن کر لوگ مطمئن ہو گئے۔ (تاریخ الطبری: ۳۴۵/۴)

نوٹ: حضرت عثمان پر الزامات اور ان کے جوابات تفصیل سے حصہ دوئم میں آرہے ہیں۔

② خلیفہ بن خیاط حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حالات کے تحت لکھتے ہیں: ثم جمع الشام کلھا لمعاویۃ بن ابی سفیان. (تاریخ خلیفہ، ص ۱۵۵)

③ الکامل فی التاریخ: ۴۶۵/۲

بحری جنگیں

ایشیائے کوچک اور افریقہ کے رومیوں سے ان بار بار کی جنگوں میں یورپ کسی نہ کسی طرح ضرور دخل انداز رہا۔ وہ ہر اسلام دشمن فوج کی پشت پر خفیہ یا کھلم کھلا موجود رہا۔ بحیرۂ روم میں بازنطینیوں کے جنگی بیڑے کی نقل وحرکت مسلمانوں کے لئے بہرحال ایک مستقل خطرہ تھی، اس لئے اب سمندر کو میدانِ جنگ بنا کر بحیرۂ روم میں یورپیوں سے مقابلہ کرنا ناگزیر ہوگیا تھا۔ اس کے لیے بحری فوج کی ضرورت بھی اب ایک ناقابل انکار حقیقت بن گئی تھی۔

شام کے ساحلوں پر حضرت مُعاویہ بن سفیان رضی اللہ عنہ اور مصر میں حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ آئے دن اس ضرورت کو محسوس کرتے تھے اور خود خلیفۂ ثالث بھی ان زمینی حقائق سے آگاہ تھے، چنانچہ رجب سن ۲۸ ہجری میں جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے بحری جہاد کی اجازت طلب کرتے ہوئے یقین دلایا کہ یہ مہم مشکل ثابت نہیں ہوگی تو دربارِ خلافت سے اس مہم کی منظوری مل گئی۔ تاہم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اسلام کی اس پہلی بحری فوج کا حوصلہ برقرار رکھنے کے لیے نہایت حکمت سے کام لیتے ہوئے یہ شرط عائد کی کہ امرائے لشکر اپنی بیویوں کو بھی ساتھ لے کر جائیں گے۔ یہ شرط اس لیے تھی تاکہ امرائے لشکر سفر کی مہم کو حتی الامکان محفوظ بنانے کا اطمینان کر کے نکلیں اور محض جوش وجذبے کی بناء پر مسلمانوں کو خطرے میں نہ ڈالیں۔ یہ حکمت بھی ملحوظ تھی کہ عورتوں کی موجودگی میں، وہ مرد جو پہلی بار سمندری مہم پر جارہے ہیں، طبعی گھبراہٹ کا اظہار کرنے سے کترائیں گے اور یوں ہمت وحوصلے کی فضا قائم رہے گی۔

سیدنا مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اجازت ملتے ہی نئے بہترین بحری جہاز تیار کرائے، اس جہاد کے لیے ایسے حوصلہ مند جوانوں کو بھرتی کیا جو اپنی خوشی سے آگے آئے۔ حضرت مُعاویہ اور حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہما بحیرۂ روم کے نقشے اور یورپی جہاز رانوں کی آمد ورفت کے نقاط کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مصر اور شام کے ساحلی قلعوں کے علاوہ خود بحیرۂ روم کے درمیان مسلمانوں کا کوئی جنگی مرکز ہونا ضروری ہے۔ اس کے لیے انہوں نے جزیرۂ قُبرص کو منتخب کیا جو شمالی شام کے ساحلوں کے قریب بازنطینیوں کا اہم معسکر تھا۔

سن ۲۸ ہجری کے موسم بہار میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اپنے سالارِ بحریہ عبداللہ بن قیس کے ساتھ شام کے ساحل عکا سے پہلا اسلامی بیڑہ لے کر سمندر کی موجوں میں اترے۔ ان کے ساتھ ان کی اہلیہ حضرت فاختہ بنت قُرظہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ اسی طرح حضرت عُبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ حضرت اُمّ حرام بنت مِلحان رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس تاریخی مہم میں شامل تھے۔ [1]

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ عمر رسیدہ ہو چکے تھے۔ ان دنوں تلاوت کرتے ہوئے اس آیت مبارکہ پر پہنچے:

① فتوح البلدان، ص ۱۵۳، ۱۵۴، ط مکتبۃ الہلال

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ①

''نکلو اللہ کی راہ میں خواہ ہلکے ہو خواہ بوجھل ہو، اور جہاد کرو اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔''

آیت پڑھتے ہی اس جہاد میں شرکت کے لیے بے چین ہوئے۔ گھر والوں سے کہنے لگے: میرا خیال ہے میرا رب چاہتا ہے کہ ہم بوڑھے ہوں یا جوان، جہاد میں نکل کھڑے ہوں۔ بچو! میرا سامان تیار کرو، میں بھی جاؤں گا۔

ان کے بچے جوان تھے، انہوں نے کہا: ''ابا جان! اللہ آپ پر رحم فرمائے آپ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کیا، پھر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں بھی جہاد کیا۔ اب آپ تشریف رکھیے، ہم آپ کی جگہ جہاد کریں گے۔'' مگر وہ نہ مانے اور اس مہم میں شریک ہو گئے۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اس سمندری سفر کے دوران بحری جہاز میں وفات پا گئے۔ آس پاس کوئی جزیرہ نہ تھا جہاں انہیں دفن کیا جاتا۔ نو دن بعد ساحل دکھائی دیا، جہاں انہیں دفنایا گیا۔ تب تک ان کی نعش بالکل تر و تازہ تھی۔ ②

یہ وہی جہاد تھا جس کے مناظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دکھائے گئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''میں نے اپنی اُمت کے کچھ لوگوں کو دیکھا ہے وہ بحری جہازوں پر سمندر میں اس شان سے سفر کر رہے ہیں جیسے بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ خواب سن کر حضرت اُمّ حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کرائی تھی کہ وہ بھی اس جہاد میں شامل ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ تمنا پوری ہونے کی خوشخبری دی تھی، چنانچہ وہ بھی اس بحری قافلے میں شامل تھیں۔ واپسی کے سفر میں ایک جگہ ان کا خچر بدکا، وہ گر پڑیں، گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ وفات پا گئیں۔ ③

اسلامی فوج قُبرُص کے ساحل پر اتری تو مقامی سپاہ نے لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیے اور ان شرائط پر صلح ہو گئی:

1. اہل قُبرُص سالانہ ستر ہزار دینار جزیہ ادا کیا کریں۔
2. مسلمان ان کی پوری حفاظت کریں گے۔
3. اہل قُبرُص مسلمانوں کو رومیوں کے خلاف سمندری مہمات کے لیے آمد و رفت کا موقع فراہم کریں گے۔
4. مسلمانوں کو رومیوں کی نقل و حرکت سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ ④

یہ صلح چار سال تک قائم رہی۔ صلح کی مدت ختم ہوتے ہی ۳۲ھ میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے قُسطَنطِینِیّہ کی طرف

① سورۃ التوبۃ، آیت: ۴۱ ② مستدرک حاکم، ح: ۲۵۰۳ ؛ تفسیر ابن ابی حاتم: ۲۵/۲۲۰، سورۃ التوبۃ
③ صحیح البخاری، ح: ۲۷۸۸، کتاب الجهاد، باب الدعاء بالجهاد والشهادة ؛ الکامل فی التاریخ: ۳۶۸/۲ تا ۴۷۰
ایک روایت کے مطابق ام حرام رضی اللہ عنہا کی قبر قبرص میں ہے اور ''المرأۃ الصالحۃ'' کی قبر کے نام سے مشہور ہے۔ (المنتظم لابن الجوزی: ۲۸۸/۵)
④ الکامل فی التاریخ: ۴۶۹/۲۔

نوج کشی کر دی۔ وہ ایشیائے کوچک شمال کی طرف پیش قدمی کر کے بحیرۂ اسود کے ساحل تک پہنچے۔ پھر وہ آبنائے قُسطَنطِینِیّہ پر جا کر خیمہ زن ہوئے جہاں سے قیصر کے پایۂ تخت کی فصیل صاف دکھائی دیتی تھی۔ [1]

قیصر روم قُسطَنطِین، افریقہ اور ایشیائے کوچک میں مسلمانوں کی مسلسل کامیابیوں سے سخت مضطرب تھا۔ اسلامی افواج کے خیمے اب وہ اپنے قلعے کے برجوں سے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے مسلمانوں کا حملہ روکنے کے لیے اہل قُبرُص سے ساز باز شروع کر دی۔ اہل قُبرُص نے عہد شکنی کرتے ہوئے رومیوں کو مسلمانوں کے خلاف مددی اور انہیں جنگی کشتیاں فراہم کر دیں۔ یہ خبر ملنے پر سیدنا مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے پانچ سو کشتیوں کے ساتھ قُبرُص پر حملہ کر دیا اور پورا جزیرہ بزورِ شمشیر فتح کر لیا۔ انہوں نے یہاں بارہ ہزار سپاہیوں کو ان کے اہل وعیال سمیت آباد کر دیا جنھوں نے یہاں مساجد تعمیر کیں۔ اس طرح قُبرُص بحیرۂ روم کا مضبوط اسلامی معسکر بن گیا۔ قُبرُص کی فتح سن ۳۳ ہجری کا واقعہ ہے۔ [2]

غزوہ ذات الصَّواری:

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا سب سے بڑا اور خطرناک ترین معرکہ ''ذات الصَّواری'' تھا، جو سن ۳۴ ہجری میں لڑا گیا۔ صواری صاریۃ کی جمع ہے جس کا معنی ہے ''جہاز کا مستول''۔[3] چونکہ اس جنگ میں دونوں فوجوں نے اپنے اپنے جہازوں کے مستولوں کو باندھ کر لڑائی کی تھی، اس لیے اس معرکے کو ذات الصَّواری یعنی مستولوں والی لڑائی کا نام دے دیا گیا۔

ہوا یہ کہ قیصر نے مسلمان فاتحین کا قدم اپنے سینے پر محسوس کرتے ہوئے نہایت سرگرمی کے ساتھ ایک عظیم الشان بحری بیڑہ ترتیب دیا، جس میں شامل جہازوں کی تعداد پانچ سو سے چھ سو تک بتائی جاتی ہے۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ جب سے رومیوں سے جنگیں شروع ہوئی تھیں اتنی بڑی فوج کبھی مسلمانوں کے مقابلے کے لیے جمع نہیں ہوئی تھی۔ قیصر چاہتا تھا کہ بحیرۂ روم میں مسلمانوں کی مداخلت ہمیشہ کے لیے ختم کر دی جائے۔ آخر وہ اس بے پناہ بحری طاقت کے ساتھ بحیرۂ روم میں اترا اور ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔

---

[1] البداية والنهاية: ۱۰/۲۲۳. قُسطَنطِینِیّہ پر یہ مسلمانوں کی پہلی چڑھائی تھی مگر اس میں جنگ کی نوبت نہ آئی بلکہ اس سے پہلے ہی مسلمانوں کو دوبارہ قُبرُص کا رُخ کرنا پڑا۔ محققین کے نزدیک اُم حرام رضی اللہ عنہا سے منقول حدیث ''أوّل جيش من أمتي يغزون مدينة قيصر مغفور لهم'' سے یہی مہم مراد ہے کیوں کہ قُسطَنطِینِیّہ کی پہلی مہم یہی تھی اور اس سے کچھ دنوں پہلے اُمّ حرام رضی اللہ عنہا جہاد کے سفر میں فوت ہو گئی تھیں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اسی حدیث میں یہ پیش گوئی بھی فرما دی تھی کہ وہ اس جہادِ قُسطَنطِینِیّہ میں شریک نہ ہو سکیں گی۔ اس حدیث کا کچھ حصہ پیچھے گزر چکا ہے۔ ایک بار پوری حدیث سامنے رکھیں تو بات واضح ہو جائے گی،

قال عمير: حدثتنا أم حرام رضي الله عنها انها سمعت النبي ﷺ يقول: اوّل جيش من أمتي يغزون البحر قد اوجبوا، قالت أمّ حرام، قلت: يارسول الله انا فيهم؟ قال: انت فيهم. ثم قال النبي ﷺ: اوّل جيش من أمتي يغزون مدينة قيصر مغفور لهم. فقلت: انا فيهم يارسول الله؟ قال: لا.

عمیر (بن اسود) کہتے ہیں ہمیں اُمّ حرام رضی اللہ عنہا نے یہ حدیث سنائی کہ انہوں نے نبی ﷺ کو کہتے سنا کہ میری اُمّت کا جو لشکر سب سے پہلے سمندر میں جہاد کرے گا، اس کے لیے (جنت یا مغفرت) واجب ہے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا میں ان میں ہوں؟ فرمایا: تم ان میں ہو۔ پھر نبی ﷺ نے فرمایا: میری اُمت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر جہاد کرے گا، اس کی بخشش ہو جائے گی۔ میں نے عرض کیا: کیا میں ان میں بھی ہوں۔ فرمایا: نہیں۔ (صحیح البخاری، ح: ۲۹۲۴، کتاب الجهاد)

[2] فتوح البلدان، ص ۱۵۴

[3] بحری جہاز یا کشتی میں نصب کیے گئے اس بلند ستون کو مستول کہتے ہیں جس پر بادبان باندھا جاتا ہے۔

یہ خبر سنتے ہی شام سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور مصر سے حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے اپنی بحری طاقت یکجا کی اور اس سے پہلے کہ بازنطینی اسلامی ساحلوں پر اترتے وہ سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے ان کے سامنے جا پہنچے۔ قبرص اور جزیرہ روڈس کے درمیان موجود ترکی کے ساحل ''کیلیکیا'' کے پاس رات کے وقت دونوں بحری فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔

مجاہدینِ اسلام کے جہازوں کی تعداد دو سو کے لگ بھگ تھی۔ اس بحری فوج کی تشکیل کو ابھی بمشکل چند سال ہوئے تھے، اس لیے ملاحوں کو جہاز رانی کا ایسا تجربہ تھا نہ سپاہیوں کو سمندری لڑائی کا۔ اس کے برخلاف بازنطینی صدیوں سے سمندروں کے شہ سوار تھے، ان کی جہاز رانی کی دھاک پوری دنیا پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کا بحری بیڑہ بھی تقریباً تین گنا بڑا تھا۔ اب تک اسلامی بیڑے کی کارروائیاں اسی حد تک تھیں کہ مسلمان سمندری سفر کر کے کسی ساحل پر اتر جاتے اور وہاں قبضہ کر لیتے مگر اس بار لڑائی کا میدان ہی سمندر کی طوفانی موجوں کے بیچ تھا۔ اس کے باوجود مسلمان اللہ تعالیٰ پر بھروسا کر کے پوری ہمت کے ساتھ مقابلے میں آ گئے تھے۔ طے یہ ہوا کہ رات کو فریقین میں سے کوئی ایک دوسرے پر حملہ نہیں کرے گا، چنانچہ رات بھر مسلمان نماز، دعا اور تلاوت میں مصروف رہے، جبکہ بازنطینی بحریہ نقارے اور باجے بجاتی رہی۔

صبح ہوئی تو امیر مجاہدین حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے جہازوں کے مستولوں کو ایک دوسرے سے باندھ کر صف بنانے کا حکم دیا اور مجاہدین کو تاکید کی کہ وہ مسلسل تلاوت اور ذکر کرتے رہیں۔ مسلمانوں کے لیے ایک تشویش کی بات یہ بھی تھی کہ ہوا کا رخ اُن کی طرف تھا، اس لیے دشمن کے جہاز بادبان کھول کر تیزی سے اُن کی طرف آ سکتے تھے، جبکہ اسلامی بحریہ اگر آگے بڑھنا چاہتی تو اس کے لیے بادبان کھولنا مزید نقصان دہ تھا، صرف چپو چلا کر معمولی رفتار سے جہاز آگے بڑھائے جا سکتے تھے۔ یہ دیکھ کر امیر لشکر نے جہازوں کے لنگر گرانے کا حکم دیا۔

دشمن کے جہاز آگے بڑھتے آ رہے تھے کہ اچانک اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوا مسلمانوں کے موافق ہو گئی اور ان کی ہمتیں بڑھ گئیں۔ اس موقع پر حضرت عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ نے حریف کو پیش کش کی کہ دونوں فوجیں ساحل پر اتر جائیں اور اپنی شمشیر زنی کے جوہر دکھا کر ہار جیت کا فیصلہ کر لیں۔

بازنطینی کمانڈروں نے یہ گمان کر کے کہ مسلمان ناتجربہ کاری کی وجہ سے بحری جنگ سے خوفزدہ ہیں، نخوت بھرے لہجے میں جواب دیا: ''معرکہ سمندر میں ہوگا، سمندر میں۔''

یہ جواب سن کر حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے لنگر اٹھانے اور بادبان کھولنے کا حکم دیا۔ اسلامی بحریہ رومیوں کی طرف بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے قرونِ اولیٰ کے ان ملاحوں نے اپنے جہازوں کو حریف کے جہازوں سے ٹکرا دیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں طرف کے سپاہی تلواروں اور خنجروں سے ایک دوسرے پر پل پڑے۔

مسلمانوں نے ایسی شدید بحری جنگ لڑی جس کی مثال نہیں ملتی۔ ہزاروں آدمی کٹ کٹ کر سمندر میں جا

گرے اور سمندر خون سے سرخ ہوگیا، مسلمانوں کے بھی سینکڑوں افراد شہید ہوئے مگر رومیوں کے نقصانات کہیں زیادہ تھے، اس دوران سمندر میں طغیانی آگئی اور دونوں طرف کے بحری جہاز تنکوں کی طرح اُچھلنے لگے، جب تک مسلمانوں نے رومیوں کی بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا، اسی اثناء میں خود قیصر قُسطَنطِین بھی زخمی ہوگیا، اس نے بقیہ سپاہیوں کو پسپائی کا حکم دے دیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو شاندار فتح عنایت کی۔ مسلمان قریبی ساحل پر اترے تو ہلاک شدہ رومیوں کی لاشیں بھی بہہ بہہ کر یہاں جمع ہوگئیں، یہاں تک کہ جگہ جگہ ان کے ڈھیر لگ گئے۔

اس معرکے کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ سن ۳۱ ہجری میں ہوا تھا۔[۱]

قُسطَنطِینِیّہ کی فتح کا منصوبہ:

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کئی برسوں سے قیصر کے پایۂ تخت قُسطَنطِینِیّہ پر کارگر حملے کی ممکنہ تدابیر پر غور کر رہے تھے۔ چونکہ اس محاذ پر جہاد کرنے والے لشکر کے لیے حدیث میں مغفرت اور جنت کی بشارت دی گئی تھی، اس لیے صحابہ کرام اس کی فتح کو بہت اہم سمجھتے تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ قُسطَنطِینِیّہ کی خلیج تک یلغار کر چکے تھے مگر یہاں تینوں اطراف سمندر سے گھرے اس شہر کی جغرافیائی قلعہ بندی نے یہ ثابت کر دیا کہ اس سمت سے اس پر حملہ تقریباً ناممکن ہے۔ مگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا حوصلہ اتنا بلند تھا کہ انہوں نے یہ طے کیا کہ پہلے پورے یورپ کو فتح کیا جائے اور پھر خشکی کے راستے شمال سے آ کر قُسطَنطِینِیّہ کو گھیرا جائے۔ اس کے لیے آپ نے یہ نقشہ مرتب کیا کہ پہلے مرحلے میں اسپین، پھر فرانس اور پھر مغربی یورپ پر حملہ کیا جائے، اس کے بعد مشرقی یورپ کو زیرِ نگیں کر کے قُسطَنطِینِیّہ تک پہنچا جائے۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے افریقہ کے سپہ سالار حضرت عُقبہ بن نافع کو اپنے منصوبے کی خبر دیتے ہوئے مراسلے میں لکھا: ''بلاشبہ قُسطَنطِینِیّہ اَندَلُس کے راستے سے فتح ہو سکتا ہے۔''[۲]

اسلامی افواج اس وقت تک مراکش پر قابض ہو چکی تھیں۔ اسپین اور مراکش کے درمیان صرف سمندری پٹی حائل تھی۔ اس سے قبل حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حکم سے سن ۲۷ ہجری میں افریقہ کی اسلامی فوج نے خلیج عبور کر کے اَندَلُس پر ایک حملہ کیا تھا اور کامیابی سے واپس لوٹ آئی تھی۔[۳] یہ حملہ باقاعدہ جنگ کے اصول پر نہیں تھا جس میں علاقہ فتح کیا جاتا بلکہ یہ چھاپہ مار کارروائی کی حیثیت رکھتا تھا تاکہ دشمن کی قوت کا اندازہ لگایا جائے۔

یہ یورپ میں مسلمانوں کا پہلا قدم تھا، اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس کے بعد داخلی فتنوں کا سامنا نہ ہوتا تو شاید قُسطَنطِینِیّہ اور اس سے پہلے پورا یورپ اسی زمانے میں فتح ہو جاتا۔ مگر افسوس کہ ۳۳ھ کے بعد داخلی فتنوں نے اس سلسلۂ جہاد کو ایسا روکا کہ پھر ایک عشرے تک اسلامی سرحدیں وسیع نہ ہونے پائیں۔

[۱] الكامل في التاريخ: ۲/۴۸۸، ۴۸۹ ؛ البداية والنهاية: ۱۰/۲۳۷ تا ۲۳۹

[۲] الكامل في التاريخ: ۲/۴۶۶ [۳] الكامل في التاريخ: ۲/۴۶۶

مشرقی محاذ

دورِ عثمانی میں مغرب کے ساتھ مشرق میں بھی فتوحات کا دائرہ بڑھتا رہا۔ ۲۹ ھ میں اہلِ فارس نے بغاوت کی تو خلیفۂ ثالث کی طرف سے مقرر کردہ بَصرہ کے نئے حاکم حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا اور انہوں نے بَصرہ سے فارس کے مرکز اِصطَخر پر یلغار کر کے نہایت چابک دستی اور حوصلہ مندی سے باغیوں کو شکست دی اور فارس پر اسلامی حکومت کی بالادستی بحال کر دی۔ ①

سن ۳۰ ہجری میں بُحَیرۂ خَزَر (کیسپین سی) کے قریب طبرستان کے خطے میں جہاد ہوا۔ کوفہ کے حاکم حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نے یہاں فوج کشی کی تو حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام ہم رکاب تھے، جنہوں نے شدید معرکوں کے بعد طبرستان پر قبضہ کر لیا۔ ②

اِدھر یزدگرد کی موت کے بعد حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے پورے خراسان اور گرد و نواح کو فتح کر کے فارسیوں کی شرانگیزیوں کا قلع قمع کرنے کا فیصلہ کیا اور سن ۳۱ ہجری میں مختلف اضلاع فتح کرتے ہوئے نیشاپور کا محاصرہ کر لیا۔ آخر ایک ماہ بعد نیشاپور کے حاکم نے صلح کر لی۔ ③

یزدگرد کی موت کیسے ہوئی؟

ساسانی خانوادے کا آخری حکمران، سابق شاہِ ایران یزدگرد پانچ برس سے بجستان (جنوبی افغانستان) میں چھپا ہوا تھا۔ دورِ فاروقی میں نہاوند میں ایرانیوں کی آخری شکست کے بعد وہ اصفہان میں پناہ گزین رہا تھا اور جب وہاں حالات ناسازگار ہوئے تو ''رَے'' میں جا پڑا تھا جہاں طبرستان کے والی نے حاضر ہو کر اپنے قلعوں میں آنے کی دعوت دی تھی مگر یزدگرد نہ مانا اور بجستان چلا آیا۔ مسلمان سپاہی اب بھی اس کی کھوج میں تھے۔

اس وقت وہ اہلِ بجستان سے بھی مایوس ہو کر مَرو کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ہزار افراد کی مختصر فوج اور چند امراء تھے۔ مَرو پہنچ کر اس نے مقامی مجوسی حاکم ماہُویَہ اور اس کے امیر سے مالی تعاون طلب کیا مگر یہ لوگ ساسانیوں کے سابقہ مظالم اور جھوٹی سیاست سے اس قدر تلملائے ہوئے تھے کہ انہوں نے نہ صرف کسی بھی قسم کی مدد سے انکار کر دیا بلکہ ترکمانوں کو بلوا کر یزدگرد کے قافلے پر دھاوا بول دیا۔ اس مڈبھیڑ میں یزدگرد کے سارے ساتھی مارے گئے اور وہ خود گھوڑے کو ایڑ لگا کر تن تنہا بیابانوں کی طرف بھاگ نکلا۔ یہ واقعہ سن ۳۱ ہجری کا ہے۔

---

① الکامل فی التاریخ: ۲/۴۷۳،۴۷۴
② الکامل فی التاریخ: ۲/۴۸۰،۴۸۱
③ الکامل فی التاریخ: ۲/۴۹۰ تا ۴۹۴

زخمی گھوڑے نے راستے میں دم توڑ دیا تو وہ پیدل چلنے پر مجبور ہو گیا، اسی خستہ حالی میں وہ دریائے مرغاب کے کنارے مَرْ و سے دو فرسخ (تقریباً دس کلومیٹر) دور ایک پن چکی پر پہنچا، اس کا شاہی لباس اور تاج دیکھ کر پن چکی کا مالک حیران ہو گیا اور اسے اپنے ہاں پناہ دے دی۔ اس دوران مَرْو کے حاکم مَاہُوْیَہ کو یزْ دَگرْد کا سراغ مل گیا۔ اس نے کچھ سپاہی بھیج دیے کہ یَزْ دَگرْد کا سر کاٹ کے لے آئیں، ان سپاہیوں نے پہلے چکی والے کو مار پیٹ کر یزدگرد کا پتا معلوم کیا، پھر اس کو ساتھ لے کر پن چکی کی اس کوٹھری کے پاس پہنچ گئے جس میں یزدگرد روپوش تھا۔

سپاہیوں نے چکی والے کو کہا: ''تم ہی اندر جا کر اسے قتل کرو۔''

اس نے اندر جا کر یَزْ دَگرْد کو جو گہری نیند سو رہا تھا، قابو کرنے کی کوشش کی، وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا اور چکی والے کا ارادہ بھانپ کر بولا ''میری یہ انگوٹھی اور کنگن لے لو، مجھے کچھ نہ کہو۔''

چکی والے کو ان چیزوں کی قیمت معلوم نہ تھی۔ بولا: ''چار درہم دے دو، چھوڑ دوں گا۔''

یَزْ دَگرْد کے پاس درا ہم نہیں تھے، اپنی ایک بالی اُتار کر اسے دے دی۔

اتنے میں باہر کھڑے سپاہی تلواریں سونتے اندر آ گئے، یَزْ دَگرْد نے گڑگڑا کر کہا:

''مجھے قتل مت کرنا، چاہے اپنے حاکم کے حوالے کر دو یا عربوں کے سپرد کرو۔''

مگر سپاہیوں نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے اسے وہیں قتل کر دیا اور لاش دریائے مرغاب کی لہروں کے حوالے کر دی۔ یہ لاش ایک مقامی پادری کو دریا کے کنارے جھاڑیوں میں پھنسی ملی جس نے اسے اپنی رسم کے مطابق دفنا دیا۔ اس طرح ساسانیوں کا آخری بادشاہ ایک عبرت ناک موت مر گیا اور شاہانِ کسریٰ کی داستان ختم ہو کر ایسا افسانہ بن گئی جو آج بھی دنیاوی جاہ وجلال اور مادی شان وشوکت کے فانی ہونے کا یقین دلاتی ہے۔[1]

خراسان کی فتوحات:

نیشاپور کے بعد حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے سَرَخس کو بزورِ شمشیر اور طوس کو صلح کے ساتھ فتح کیا۔ اس کے بعد ہرات اور بادغیس بھی ان کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ مرو کے مجوسی حاکم نے بھی بائیس لاکھ درہم سالانہ جزیہ دینے کی شرط پر صلح کر لی۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے مایہ ناز جرنیل حضرت احنف بن قیس رحمہ اللہ کو آگے روانہ کیا، جنہوں نے بلخ، جوز جان، فاریاب، تخار اور طالقان جیسے دشوار گزار علاقوں میں جنگجو ترکوں اور مجوسیوں سے خون ریز معرکے لڑے اور ہر جگہ فتح یاب ہو کر ان تمام علاقوں میں اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے، ان میں سے کچھ علاقے جنگ کے بغیر صلح کے معاہدوں کے ساتھ بھی فتح ہوئے۔ اس طرح کرمان، بجستان، زَرَنج، قندھار، زابُل، غزنی اور کابل بھی یکے بعد دیگرے فتح ہوتے چلے گئے، ان فتوحات میں حضرت اقرع بن حابس، حضرت عبدالرحمٰن بن سَمُرَہ، حضرت مُجاشع بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن خازم رضی اللہ عنہم جیسے اولوالعزم اسلامی سپہ سالار پیش پیش تھے۔

[1] الكامل في التاريخ: ۴۹۰/۲ تا ۴۹۴

غرض حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور ان کے امراء نے ایک ڈیڑھ سال کے اندر اندر مشرق میں اسلامی عمل داری کا دائرہ نہ صرف غزنی اور کابل تک پھیلا دیا بلکہ ہندوستان کی سرحدوں تک جا پہنچے۔ ①

اس طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بابرکت دور میں خلافتِ اسلامیہ کی حدود ہندوستان کی سرحدوں سے لے کر شمالی افریقہ کے ساحلوں اور بحیرۂ روم میں مشرقی یورپ کی سرحدات تک وسیع ہو گئیں۔

اسلامی حکومت جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل (۳۶ لاکھ ۲۱ ہزار مربع کلومیٹر) کو محیط تھی، دورِ عثمانی میں ۴۴ لاکھ مربع میل (۷۰ لاکھ ۸۱ ہزار مربع کلومیٹر) تک حاوی ہو گئی۔ ②

اس طرح خلیفۂ ثالث کے مبارک زمانے میں ایک وسیع و عریض علاقہ کفر و شرک کی بالادستی سے آزاد ہو کر قرآن و سنت کے انوارات سے جگمگایا۔

☆☆☆

نوٹ: حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں ابھرنے والی حکومت مخالف تحریک، اس کے پسِ پردہ سبائی فتنے کی سازش اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی الم ناک شہادت کا تفصیلی ذکر ان شاء اللہ "تاریخِ اُمتِ مسلمہ حصہ دوئم" میں ہو گا۔

① الکامل فی التاریخ: ۲/۴۹۳ تا ۴۹۶

② حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ، مولانا ضیاء الرحمن فاروقی شہید، ص ۸۰۲

چوتھا باب

تاریخ اُمّتِ مُسلِمَہ (حصہ اوّل)

خلافتِ راشدہ

کے اہم امتیازی پہلو
اور اسلامی سیاست کی خصوصیات

خلافتِ راشدہ میں اصولِ سیاست

یہ بات واضح ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو سیاسی نظام کا ایک دستورِ اساسی عطا کیا ہے۔ یہ کتاب وسنت میں موجود چند اصول ہیں جو مقاصدِ سیاست، اہدافِ حکومت، طریقِ انتقالِ اقتدار اور نفاذِ احکام سے لے کر حکمران کے عزل ونصب تک تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ تاہم اسلام نے حکومت کی تشکیل وساخت میں لچک بھی رکھی ہے اور ملتِ اسلامیہ کو کسی ایسے لگے بندھے طرزِ سیاست کا پابند نہیں کیا جس سے اُمت جمود کا شکار ہو کر انتظامی جدتوں سے محروم اور دیگر اقوام سے پیچھے رہ جائے۔ اسلامی تعلیمات میں یہ بات بہت واضح ہے کہ انسان زمین پر اللہ کا بندہ اور اس کا نائب ہے اور یہ کہ اصل حکمرانی یا حاکمیتِ اعلیٰ صرف اللہ ہی کے لیے ثابت ہے کیوں کہ وہی خالقِ کائنات اور مالکِ دوجہاں ہے۔ تاہم دیگر مخلوقات اور انسان میں اس لحاظ سے فرق یہ ہے کہ شمس وقمر اور زمین وآسمان سمیت تمام مخلوق اللہ کے تکوینی نظام کی اس طرح پابند ہے کہ اسے اپنے معمول سے ہٹ کر کچھ کرنے کا اختیار نہیں مگر انسان کو اللہ کی حاکمیت کے تحت چلنے میں اختیار دے کر پیغمبروں اور کتبِ سماویہ کی وساطت سے اسے وہ تعلیمات پہنچا دی گئی ہیں جن کے ذریعے وہ اللہ کے احکام مان کر اس کی بندگی اور نیابت کا حق ادا کر سکے۔ جو معاشرہ اللہ کی بندگی کو اختیار کر لیتا ہے تو اللہ کی جانب سے اسے زمین میں سیاسی نیابت بھی عطا کر دی جاتی ہے۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾

''وعدہ کیا اللہ نے تم میں سے ان لوگوں سے جو کہ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کیے، وہ انہیں لازماً خلافت عطا کرے گا زمین میں جیسا کہ اس نے خلافت دی تھی ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔''[1]

یہاں اس نیابت کے بارے میں لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ کا لفظ خود بتا رہا ہے کہ اللہ کی موعودہ اور پسندیدہ حکومت مؤمن اور صالح معاشرے کو ادا کی جائے گی نہ کہ اس کے کسی خاص فرد کو۔ دوسرے لفظوں میں وہ اہلِ ایمان کی مشترکہ نمائندہ حکومت ہوگی جس میں کسی خاص فرد یا طبقے کی اجارہ داری نہیں ہوگی بلکہ جمہور مسلمین اسے چلائیں گے۔ اس نظام میں اور مغربی جمہوریت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہاں انسان اپنی مرضی کے مالک اور مطلق آزاد ہوتے ہیں۔ ان کی نمائندہ حکومت اور اس کے اراکین اکثریتِ رائے سے جو چاہیں قانون وضابطہ طے کر سکتے ہیں، چاہے وہ اللہ کے قانون کے بالکل خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ جبکہ ایک ایمانی معاشرے کی حکومت میں اللہ کے بندے، خود اپنی مرضی سے

[1] سورۃ النور، آیت: ۵۵

اپنے آپ کو اللہ کی حاکمیتِ اعلیٰ کا پابند کر دیتے ہیں۔ وہ شرعی احکام سے تجاوز کی جسارت نہیں کرتے اور اپنے تمام قواعد و ضوابط اللہ کی بتائی ہوئی حدود کے دائرے میں طے کرتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا حاکم اعلیٰ اللہ کے سوا کوئی نہیں اور ہم اس کے بندے ہیں جو اس کی نیابت میں زمین کا نظام ان اصولوں کے مطابق چلائیں گے جو اس کے کلام اور اس کے رسول کے فرمان میں بیان کیے گئے ہیں۔

اِسلامی سیاست کے اہم اصول

قرآن وسنت میں اسلام کے دیے ہوئے دستورِ اساسی کے اہم ترین نکات یہ ہیں:

① مقصدِ حکومت:

مقصدِ حکومت شریعت کا نفاذ ہے تاکہ تمام شعبوں میں اسلام نافذ ہو، خیر کو پھیلایا اور شر کو روکا جائے۔

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

''یہ (اہلِ ایمان) وہ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں اختیار دے تو وہ قائم کریں نماز اور وہ ادا کریں زکوۃ، حکم دیں نیکی کا اور روکیں برائی سے۔ اور تمام معاملات کا انجام اللہ ہی کی طرف ہے۔''①

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾

''تم ہو بہترین اُمّت تمہیں نکالا گیا ہے لوگوں (کی بھلائی) کے لئے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''②

② خلافت اور ملوکیت میں فرق:

اللہ کی نیابت اور خلافت وہ ہے جو اہلِ ایمان کی شورائیت کے ذریعے وجود میں آئے اور جس میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد پورے پورے ادا کیے جائیں ورنہ وہ بادشاہت اور عام حکومت ہے۔

❶ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اسلامی امارت اور بادشاہت کا فرق بتاتے ہوئے کہتے تھے:

اِنَّ الاِمْرَةَ مَا اُوْتُمِرَ فِيْهَا وَاِنَّ الْمُلْكَ مَاغُلِبَ عَلَيْهِ بِالسَّيْفِ

(امارت وہ ہے جس کے لیے مشورہ کیا جائے اور بادشاہت وہ ہے جو تلوار کے بل پر حاصل کی جائے۔)③

❷ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ؟'' انہوں نے فرمایا: ''اگر آپ مسلمانوں کی زمین سے ایک درہم بھی ناحق وصول کریں، ناحق خرچ کریں تو آپ بادشاہ ہیں، ورنہ خلیفہ۔'' یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اشک بار ہو گئے۔④

① سورۃ الحج، آیت: ۴۱ ② سورۂ آل عمران، آیت: ۱۱۰ ③ طبقات ابن سعد: ۱۱۳/۴ ط صادر

④ "عن سلمان رضی اللہ عنہ ان عمر رضی اللہ عنہ قال لہ: أ ملک انا أمّ خلیفة ؟فقال له سلمان رضی اللہ عنہ: ان انت جبیت من ارض المسلمین درهما اواقل او اكثرثم وضعته فی غير حقه فانت ملک غير خليفة ،فاستعبر عمر رضی اللہ عنہ ."(طبقات ابن سعد: ۳۰۶/۳ ط صادر)

③ شوریٰ کی اساسی حیثیت:

❶ حکومت کے قیام، امیر کے انتخاب، انتقالِ اقتدار کے مراحل اور تمام اہم امور شورائیت سے طے ہوں گے۔
وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (ان کے معاملات باہم مشورے سے طے پاتے ہیں۔)[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے تھے: لَا خِلَافَةَ إِلَّا عَنْ مَشْوَرَةٍ (خلافت بغیر مشورے کے منعقد نہیں ہوتی۔)[2]

❷ اربابِ حل وعقد اور اکابرِ امّت کی شورائیت کے بغیر کسی کا دعوائے حکمرانی کرنا درست نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: "مَنْ بَايَعَ رَجُلًا مِنْ غَيْرِ مَشُورَةٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَلَا يُبَايَعُ هُوَ وَالَّذِي بَايَعَهُ." (جو شخص مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی سے بیعت کر لے تو بیعت منعقد نہیں ہوگی نہ کرنے والے کی نہ بیعت لینے والے کی۔)[3]

حضرت ذوعمر و رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت شورائیت سے طے ہونے پر حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

"إِنَّكُمْ يَا مَعْشَرَ الْعَرَبِ لَنْ تَزَالُوا بِخَيْرٍ مَا كُنْتُمْ، إِذَا هَلَكَ أَمِيرٌ تَأَمَّرْتُمْ بِآخَرَ، فَإِذَا كَانَتْ بِالسَّيْفِ، كَانُوا مُلُوكًا، يَغْضَبُونَ غَضَبَ الْمُلُوكِ، وَيَرْضَوْنَ رِضَى الْمُلُوكِ."

(اے اہل عرب تم اس وقت تک اس بھلائی کے ساتھ رہو گے جب تک ایک حاکم کی موت پر دوسرے کو مشورے سے مقرر کرتے رہو گے۔ مگر جب تلوار سے حکومت قائم ہو تو حاکم بادشاہ بن جائیں گے۔ بادشاہوں کی طرح غضب ناک ہوں گے اور بادشاہوں کی طرح ہی راضی ہوا کریں گے۔)[4]

④ عہدے داروں کا انتخاب اہلیت کی بنیاد پر:

1 سیاسی وعسکری عہدوں کے لیے موزوں ترین اور اہل افراد چنے جائیں، جو علم، امانت اور تن درستی کی صفات سے مالا مال ہوں۔ ﴿قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ "نبی نے فرمایا کہ بے شک اللہ نے اس (طالوت) کو تمہارے لیے (امیر) چن لیا ہے اور اللہ نے اسے فوقیت دی ہے علم میں اور جسم میں۔"[5]

⑤ طالبِ منصب کی حوصلہ شکنی:

❶ جو شخص خود عہدوں کا طالب ہو اسے عہدہ نہ دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس نیت سے آنے والے لوگوں سے کہا تھا: "وَاللَّهِ لَا نُعْطِيهَا مَنْ طَلَبَهَا مِنْكُمْ."

"اللہ کی قسم! ہم تم میں سے اسے عہدہ نہیں دیں گے جو اسے طلب کرے گا۔"[6]

---

① سورۃ الشوریٰ، آیت: ۳۸
② مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۰۴۲، ط الرشد ؛ السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ۷۱۱۳
③ صحیح البخاری، ح: ۶۸۳۰، کتاب الحدود، باب رجم الحبلی
④ صحیح البخاری، ح: ۴۳۵۹، کتاب المغازی، باب ذهاب جریر الی الیمن ؛ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۰۴۳
⑤ سورۃ البقرہ، آیت: ۲۴۷
⑥ مسند ابی داؤد طیالسی، ح: ۵۳۱

❷ منصب کی خواہش اور اس کی طلب، طلبگار اور خواہش مند فرد کے ناموزوں ہونے کی دلیل ہوگی۔

ارشادِ نبوی ہے:

"اِنَّا وَاللّٰهِ لَا نُوَلِّی هٰذَا من سَأَلَهُ ولا مَنْ حَرِصَ عَلَيْهِ ."

"اللہ کی قسم! ہم ایسے کسی شخص کو عہدہ نہیں دیتے جو اسے طلب کرے یا اس کی خواہش رکھے۔"[1]

❸ بلا طلب ملنے والے عہدے میں برکت ہوگی اور عہدے کی خواہش سے پاک لوگ ذمہ داری کو بہتر طریقے سے نبھا سکیں گے۔

"لَاتَسْأَلِ الْاِمَارَةَ ،فَاِنَّکَ اِنْ اُوْتِيْتَهَا عَنْ مَسْئَلَةٍ وُكِّلْتَ اِلَيْهَا،وَاِنْ اُوْتِيْتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْئَلَةٍ اُعِنْتَ عَلَيْهَا ."

حکومت طلب نہ کرنا۔ اگر تمہیں طلب کے ساتھ ملے گی تو تمہیں اسی کے سپرد کر دیا جائے گا اور اگر بغیر طلب کے ملے گی تو تمہیں اس میں (اللہ کی طرف سے) مدد نصیب ہوگی۔[2]

⑨ حکمرانوں کی اطاعت:

❶ شرعی حدود کے اندر امیر و خلیفہ کا ہر حکم قابلِ تعمیل ہوگا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

"اَمَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ اَسْمَعَ وَاُطِيْعَ وَلَوْ لِعَبْدٍ حَبْشِيٍ مُجَدَّعِ الْاَطْرَافِ"

مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ میں سنوں اور مانوں چاہے حکم دینے والا کوئی نکٹا حبشی ہی کیوں نہ ہو۔[3]

❷ عوام کو حکمرانوں کی غلط کاری پر صبر کرنا ہوگا سوائے اس کے کہ وہ کھلم کھلا کفر کا ارتکاب کرنے لگیں۔

ارشادِ نبوی ہے: "جو اپنے حاکم کو اللہ کی نافرمانی کرتا دیکھے تو اس گناہ سے نفرت کرے مگر حاکم کی اطاعت سے دست بردار نہ ہو۔"[4]

ایک روایت میں ہے کہ صحابہ نے عرض کیا: "کیا ہم تلوار کے زور سے ایسے حکام کو نہ ہٹا دیں؟"

فرمایا: "نہیں، جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں ایسا نہ کرنا۔ البتہ جب تم حکام کو ناگوار کام کرتا دیکھو تو ان کے عمل سے

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۷۱۴۹، کتاب الاحکام، باب ما یکرہ من الحرص علی الامارۃ

اسلام کا عمومی ضابطہ اور تعلیم یہی ہے۔ اسی میں سیاسی کشاکشی، تعصب، گروہ بندی اور اس کھینچا تانی سے حفاظت ہے جو دنیا کی سیاست کا وطیرہ چلا آ رہا ہے۔ تاہم کسی ناگزیر صورتحال میں جب کسی کو یقین ہو کہ اس جگہ میرے علاوہ کسی اور کے آگے آنے سے فساد پیدا ہوگا تو وہاں منصب طلب کرنے کا جواز ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ﴾ "(یوسف علیہ السلام نے) کہا کہ آپ مجھے زمین کے خزانوں پر ذمہ داری دے دیں بے شک میں امانت دار بھی ہوں اور صاحب علم بھی۔" (سورۃ یوسف: ۵۵) یہ ایسا ہی ہے جیسے جہلاء کے مجمع میں نماز باجماعت کے لیے کسی عالم یا قاری کا خود امامت کے لیے آگے بڑھنا۔ لیکن جہاں متعدد علماء و قراء موجود ہوں اور کوئی امام پہلے سے متعین نہ ہو، وہاں امامت میں خود سبقت کرنے کی بجائے، افضل فرد کو موقع دینے کا حکم ہے۔

[2] سنن ابی داؤد، ح: ۲۹۲۹، کتاب الامارۃ

[3] السنن الکبریٰ للبیهقی، ح: ۱۶۶۰۷، ط العلمیة

[4] صحیح مسلم، ح: ۴۹۱۰، کتاب الامارۃ، باب خیار الائمة وشرارھم

نفرت کرو مگر طاعت سے دست کشی مت کرو۔"[1]

⑦ حکمرانی سخت ترین ذمہ داری ہے جس پر حکمران کی نجات یا ہلاکت موقوف ہے:

اگر حاکم جان بوجھ کر اپنے فرض کی انجام دہی میں کوتاہی اور عوام سے بددیانتی کرے تو اس پر جنت حرام ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

"مَا مِنْ وَالٍ يَلِي رَعِيَّةً مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَيَمُوتُ وَهُوَ غَاشٍ لَهُمْ إِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ."

"جو حاکم مسلمانوں کے کسی گروہ کا ذمہ دار بنے اور پھر ان سے خیانت کرتا ہوا مرے تو اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔"[2]

⑧ بغاوت کا مرتکب سخت سزا کا حق دار ہے:

بغاوت سنگین جرم ہے۔ حکمران کی موجودگی میں کسی دوسرے حکمران کی بیعت درست نہ ہوگی بلکہ بیعت کرنے اور لینے والا دونوں قابلِ سزا ہوں گے۔ ارشادِ نبوی ہے:

"إِذَا بُويِعَ لِخَلِيفَتَيْنِ فَاقْتُلُوا الْآخَرَ مِنْهُمَا."

"جب دو خلفاء کی بیعت کی جائے تو دوسرے کو قتل کر دو۔"[3]

⑨ اجتہادی غلطیاں معاف:

غیر منصوص مسائل یا مباح صورتوں میں کسی ایک کو اختیار کرنے پر حاکم سے ہونے والی نادانستہ انتظامی لغزشوں پر کوئی گناہ نہیں ہوتا جب کہ وہ خود صحیح فیصلے کی کوشش کرے۔

"إِذَا اجْتَهَدَ الْحَاكِمُ فَأَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ وَإِذَا اجْتَهَدَ فَأَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ وَاحِدٌ."

"جب حاکم درست اجتہاد کرے تو اسے دوہرا اجر ملتا ہے۔ اگر اجتہاد میں غلطی کر جائے تو ایک اجر ملتا ہے۔"[4]

⑩ حکمرانوں کی اصلاح ۔ اہلِ علم کی ذمہ داری:

اہلِ علم کے ذمے ہے کہ وہ حکام کو غلطیوں پر ٹوکیں اور ان کی اصلاح کریں۔ حدیث میں ہے:

"ثُمَّ يَكُونُ مِنْ بَعْدُ خُلَفَاءُ يَعْمَلُونَ بِمَا لَا يَعْلَمُونَ وَيَفْعَلُونَ مَا لَا يُؤْمَرُونَ فَمَنْ أَنْكَرَ عَلَيْهِمْ فَقَدْ بَرِئَ."

"پھر بعد میں ایسے خلفاء آئیں گے جو لاعلمی کے ساتھ عمل کریں گے اور وہ کام کریں گے جن کا حکم نہیں دیا گیا، جس

---

① صحیح مسلم، ح: ۴۹۱۰، کتاب الامارۃ، باب خیار الائمۃ وشرارھم

② صحیح البخاری، ح: ۷۱۵۱، کتاب الاحکام، باب من استرعی رعیۃ

③ صحیح مسلم، ح: ۴۹۰۵، کتاب الامارۃ، ط دار الجیل ..... بظاہر یہ روایت اسلام کی رواداری اور نرمی کے خلاف لگتی ہے مگر درحقیقت اس حکم میں باغی سربراہ کو سزا دے کر بغاوت کا بروقت انسداد کرنے اور پورے ملک کو خانہ جنگی سے بچانے کی حکمت کارفرما ہے۔

④ المنتقیٰ من السنن المسندۃ لابن جارود، ح: ۹۹۶، ط مؤسسۃ الکتاب

ان کو ٹوکا وہ بری الذمہ ہو گیا۔"[1]

یہ بھی فرمانِ نبوی ہے:

"تمہارے اوپر ایسے حکام مسلط ہوں گے کہ تم انہیں پہچان کر ان پر تنقید کرو گے۔ جس نے (ان کے برے عمل کو دل سے) برا سمجھا وہ محفوظ رہا۔ جس نے (زبانی) تنقید کی وہ بھی سلامت رہا۔ ہاں مگر جو (برے عمل پر دل سے) راضی رہا اور (ان کے برے کام میں) پیروی کر لی (وہ ہلاک ہو گیا)۔"[2]

خلافتِ راشدہ کے سنہرے دور میں یہ تمام اسلامی اصول پوری طرح نظامِ سیاست میں کارفرما تھے اور ان کی پیروی کے باعث مسلم معاشرہ ایمان و اعمال اور علم و اخلاق کی معراج پر تھا۔

☆☆☆

[1] صحیح ابن حبان، ح: ۶۶۶۰

[2] صحیح مسلم، ح: ۲۹۰۶، کتاب الامارۃ، باب وجوب الانکار علی الامراء، ط دار الجیل

خلافتِ راشدہ میں عالمِ اسلام

سن ۳۴ ہجری میں ریاستِ مدینہ کی قیادت کو تہائی صدی بیت چکی تھی، اس تمام عرصے میں پورا نظامِ مملکت قرآن وسنت کے عین مطابق چلتا آیا تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ اس حکومت کی ساخت اور خدوخال میں درج ذیل خصوصیات نمایاں تھیں:

① شورائیت:

خلافتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا سیاسی ادارہ مجلس شوریٰ تھی جسے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے منظم کیا تھا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں اس کے اختیارات اور کارکردگی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ ایک لحاظ سے اس کی فعالیت مزید بڑھ گئی تھی، کیوں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرم طبعی کی وجہ سے سب کو اپنی رائے کھل کر بیان کرنے کا پورا موقع ملتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ واحد خلیفہ تھے جن کی خلافت کا انعقاد ہی مجلس شوریٰ کے اعلیٰ ترین چھ افراد کی کونسل کے ذریعے ہوا تھا، اس لیے ان کے دور میں مجلس شوریٰ بہت بااختیار اور بے حد مستعد رہی۔

② انتقالِ اقتدار کا ضابطہ:

نئے خلیفہ کے انتخاب میں شوریٰ کا کردار سب سے اہم ہوتا تھا۔ شوریٰ حکمران کے انتخاب میں خدمتِ اسلام اور صحبتِ نبویہ کو خاص اہمیت دیتی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خلفاء کے تقرر کے بارے میں یہ ضابطہ مقرر کیا تھا:

”امرِ خلافت بدری صحابہ کے لیے رہے گا جب تک ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہے۔ پھر غزوۂ اُحد والوں کے لیے رہے گا جب تک ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہے۔ پھر فلاں اور فلاں غزوے والوں کے لیے۔ طلقاء، ان کی اولاد اور فتح مکہ کے وقت اسلام لانے والوں کا اس (خلافت) میں کوئی حصہ نہیں۔“[1]

③ عہدے داروں کی تقرری:

صوبے داروں اور گورنروں کی تقرری اور برخاستگی کے اختیارات خلیفہ کے پاس ہوتے تھے۔ مختلف شہروں اور صوبوں میں عمال اور حکام کا تقرر ہمیشہ کردار، قابلیت، علمی صلاحیت اور انتظامی مہارت کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ پرہیز گار، امانت دار، بہادر اور مضبوط دل گردے کے افراد منتخب کیے جاتے تھے۔ تقرری میں یہ ضرور دیکھا جاتا تھا کہ عمال قابل اعتبار ہوں، اُمّتِ مُسلمہ کے دل سے خیر خواہ ہوں اور عوامی سطح پر ان کا احترام ہوتا ہو۔ اس لیے اعلیٰ عہدوں کے لیے صحابہ کرام کو ترجیح دی جاتی تھی جو ان صفات سے اچھی طرح آراستہ تھے۔

---

① عن عبدالرحمن بن ابزی رضی اللہ عنہ عن عمر رضی اللہ عنہ قال: ھذا الامر فی اھلِ بدر ما بقی منھم احد، ثم فی اھلِ احد ما بقی منھم احد، و فی کذا و کذا، ولیس فیھا لطلیق ولا لولدِ طلیق ولا لمسلمۃ الفتح شیءٌ (طبقات ابن سعد: ۳۴۲/۳؛ جامع الاحادیث للسیوطی، ح: ۳۱۵۶۸؛ کنز العمال، ح: ۳۶۰۳۶؛ واخرجه الحافظ فی فتح الباری: ۲۰۷/۱۳)

④ تبادلہ اور برطرفی:

یہ ضروری نہیں تھا کہ کسی کو اعلیٰ عہدہ دینے کے بعد اس کو مستقل اس پر برقرار رکھا جائے۔ قومی مفاد کے پیشِ نظر بعض اوقات حکام کو تبدیل بھی کر دیا جاتا تھا۔ ایک خلیفہ کے مقرر کردہ عاملوں کو دوسرا خلیفہ چاہتا تو باقی رکھ سکتا تھا لیکن اگر کسی کا زیادہ عرصے تک تقرر قومی مصلحت کے خلاف معلوم ہوتا تو اس کو برخواست بھی کر دیا جاتا تھا۔ تقرری اور برخواستگی کے احکام بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ پر بھی جاری ہوتے مگر اُمّتِ مُسلمہ کی خیر خواہی کا جذبہ اور خلافت کا احترام ایسا تھا کہ کبھی کسی نے اسے اپنی اَنا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ میرے بعد میرے مقرر کردہ حکام کو ایک سال سے زیادہ مدت تک باقی نہ رکھا جائے، سوائے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے۔ انہیں چار سال مزید اس عہدے پر رہنے دیا جائے۔[1] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے مطابق عمل کیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اس کے بعد دوبارہ بھی کوفہ کے گورنر بنائے گئے۔ انہوں نے بھی اپنی معزولی کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔

⑤ مرکزی عہدے:

صوبوں میں مرکزی عہدے چار ہوا کرتے تھے:

❶ عامل (گورنر)

❷ کاتبِ دیوان (سیکرٹری) جو دفتری کام انجام دیتا تھا۔

❸ والی بیت المال (وزیر خزانہ)

❹ عاملِ خراج (وزیرِ محصولات۔ کلکٹر) جو زمینوں پر لگان مقرر کرتا اور وصول کرتا

ان چاروں عہدے داروں میں سے ہر ایک کا تقرر خلفاء خود کیا کرتے تھے اور وہ تمام معاملات میں براہِ راست خلیفہ کو جواب دہ ہوتے تھے۔[2]

⑥ عامل کی ذمہ داریاں:

عاملین کی ذمہ داریاں غیر معمولی ہوتی تھیں اور اختیارات بھی۔ وہ بیک وقت سپہ سالار بھی تھے اور سیاسی نظم وضبط کے ستون بھی۔ اپنے علاقے کی وزارتِ داخلہ اور فوجی کمان دونوں ان کے ماتحت ہوتی تھیں۔ ان کی اپنی شوریٰ ہوتی تھی جس میں تمام امور پر بحث ہوتی۔ عوامی مسائل سننے کے لیے کچہری لگا کرتی تھی۔ نہریں کھدوانا، پل بنوانا، جیل خانوں کا انتظام، نئے شہروں، بازاروں اور مساجد ومدارس کی تعمیر، عوام وخواص کی رہائش اور زراعت کرنے کے لیے زمینوں کی الاٹمنٹ یہ سب کام ان کے ذمے تھے۔ سرحدوں پر دشمنوں سے دفاع، ان کے احوال اور عزائم کی خبر رسانی، قلعوں کا استحکام، افواج کی بھرتی اور تیاری، لڑکوں کی عسکری تربیت (جس میں گھڑسواری، تیراندازی اور تیراکی کی مشق لازماً کرائی جاتی تھی) بھی ان کی اہم ذمہ داریاں تھیں۔

[1] سیر اعلام النبلاء: ۳۹۱/۲، ط الرسالۃ [2] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۵۴ تا ۱۵۶

دشمن کے خلاف لشکر کشی کے لیے دربار خلافت سے منظوری لینا ضروری تھا، البتہ اگر اپنی سرحدوں پر جارحیت ہوتی تو گورنر خلیفہ سے پوچھے بغیر ملک کے دفاع کا پابند تھا۔ ①

ان ذمہ داریوں کے صلے میں عاملین کو گزر بسر کے لیے معقول تنخواہیں دی جاتی تھیں تاکہ وہ فکرِ معاش سے بالکل بے پروا ہو کر پوری یکسوئی کے ساتھ عوام کی خدمت کریں۔ تنخواہ کا بلند اسکیل دو سو دینار سالانہ تک چلا جاتا تھا۔ ②

بعض اوقات شعبۂ مالیات بھی گورنر کے سپرد ہوتا تھا، جیسے شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اُز دُن میں حضرت شُرَحبیل بن حَسَنہ رضی اللہ عنہ مالی امور کا خود حساب و کتاب کرتے تھے۔ مگر عام طور پر بیت المال اور محصولات کا شعبہ گورنر کے اختیار سے باہر ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جب کوفہ کے عامل تھے تو صوبائی خزانے کے نگران حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ ③ جب حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کوفہ کے عامل بنے تو خراج وصول کرنے کی ذمہ داری حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کی تھی۔ ④

⑦ مالی معاملات میں احتیاط:

گورنر کو بھی بیت المال سے کچھ لینا ہوتا تو اسے نگران سے منظوری لینا پڑتی تھی۔ رقم کے لین دین کے سلسلے میں بڑی سے بڑی شخصیت سے رعایت نہیں کی جاتی تھی۔ ایک ایک درہم کا حساب ہوتا تھا تاکہ مسلمانوں کے سرکاری خزانے کا ایک ذرہ بھی ضائع نہ ہونے پائے۔ اگر غلطی سے بھی رقم آگے پیچھے ہو جاتی تو پوچھ گچھ ضرور ہوتی اور بعض اوقات خلیفہ تادیبی کارروائی بھی کرتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اس معاملے میں نرمی نہیں برتتے تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جو کوفہ کے عامل تھے، صوبائی نگران بیت المال حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھ کر خزانے سے کچھ رقم قرض لی۔ بعد میں اپنے مالی حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے وہ طے شدہ وقت پر یہ رقم بیت المال میں نہ لوٹا سکے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تقاضے کے باوجود جب گورنر ادائیگی نہ کر سکے تو خلیفہ کو اطلاع دے دی گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے مرتبے اور مقام کے باوجود اس موقع پر انہیں معزول کرنا ہی بہتر سمجھا تاکہ عوام میں یہ تاثر نہ پھیلے کہ حکام اپنے عہدے سے ناجائز مفادات حاصل کر رہے ہیں۔ ⑤

اوپر کے یہ اثرات نیچے تک پڑتے تھے۔ اس لیے افسران اور ماتحتوں میں بھی دیانت داری اور مالی احتیاط عام تھی۔ افسران کی جانب سے دیانت داری کی نصیحتیں بار بار کی جاتی تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری سال ایک محاذ پر لڑنے والے کُلیب جرمی رحمہ اللہ اپنے صاحبزادے کو اپنا واقعہ یوں سناتے تھے:

---

① عصر الخلافة الراشدة، ص ۱۱۷، ۱۱۸

② عصر الخلافة الراشدة، ص ۱۳۰

③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۴۹

④ الخراج للقاضی ابی یوسف رحمہ اللہ، ص ۳۶

⑤ الکامل فی التاریخ: ۴۵۶/۲

"ہم نے "توج" کا محاصرہ کیا۔ بنی سلیم کے مُجاشع بن مسعود رضی اللہ عنہ ہمارے امیر تھے۔ قلعہ فتح ہوگیا۔ میرا کرتا بہت پھٹا پرانا تھا۔ میں ایک عجمی کی لاش کی طرف بڑھا، اس کی قمیص اتاری، اسے چٹانوں پر رکھ کر خوب رگڑا، دھویا اور پاک صاف کر کے پہن لیا۔ پھر سوئی دھاگا حاصل کیا، ایک دیہات میں جا کر اپنے کرتے کی سلائی کرائی۔ اس دوران امیر لشکر مجاشع بن مسعود نے کھڑے ہو کر اعلان کیا: "لوگو! مالِ غنیمت میں سے کچھ نہ دبانا۔ جو کسی چیز میں خیانت کرے گا قیامت کے دن اس چیز سمیت حاضر ہوگا چاہے وہ دھاگا ہی کیوں نہ ہو۔"

یہ سنتے ہی میں نے وہ قمیص اتار دی۔ پھر اپنے کرتے کو بھی ادھیڑنے لگا۔ بیٹے اللہ کی قسم! میں نے پوری احتیاط کی کہ کوئی دھاگا تک ٹوٹنے نہ پائے۔ پھر مالِ غنیمت سے لی گئی وہ قمیص، وہ دھاگا اور وہ سوئی سب چیزیں وہیں واپس پہنچا دیں۔"[1]

⑧ ہدایت اور تادیب پر مشتمل مراسلے:

خلفاء کی طرف سے عاملوں کے نام خصوصی ہدایات بھی وقتاً فوقتاً جاری ہوتی رہتی تھیں اور عمومی نصیحت نامے یا اعلامیے (سرکلر) بھی بھیجے جاتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلافت کے آغاز میں عمال کو جو اعلامیہ جاری کیا اس میں کہا گیا تھا:

"اللہ نے حکمرانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ محافظ بنیں، انہیں ٹیکس لینے والا بننے کا حکم نہیں دیا۔ وہ وقت دور نہیں جب وہ ٹیکس وصول کرنے والے بن جائیں گے، محافظ نہیں رہیں گے۔ تب حیاء، امانت اور وفا ختم ہو جائے گی، انصاف کا چلن یہ ہے کہ ہر وقت مسلمانوں کے معاملات پر نظر رہے کہ ان کی ذمہ داریاں اور حقوق کیا ہیں، ان کے حقوق ادا کرو اور ذمہ داریاں ان پر ڈالو، ذمیوں کے حقوق ادا کرو اور جو ان کے ذمے ہے وصول کرو۔"[2]

⑨ مملکت کی تقسیم...... مرکز اور صوبوں کا رابطہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلامی ریاست کے صوبے مکہ، مدینہ، بحرین، یمن، شام، کوفہ، بصرہ اور مصر پر مشتمل تھے، افریقہ مصر کے ماتحت تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں آرمینیا فتح ہوا تو کئی علاقوں کو ایک مستقل صوبہ بنا دیا گیا۔

عاملوں سے گاہے گاہے ملاقات کی جاتی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس مقصد کے لیے دو تین بار خود شام کے سفر کیے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اکثر حج کے لیے بھی تشریف لے جاتے، وہاں عاملوں کے علاوہ پوری دنیا کے مسلمانوں سے عام مجمع میں ملاقات ہوتی، لوگوں کو اپنی شکایات بیان کرنے کا موقع دیا جاتا۔[3]

⑩ تجارتی شعبہ:

معاشی واقتصادی ترقی کے لیے تجارتی شعبے کی خاص دیکھ بھال کی جاتی۔ حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم بذاتِ خود تاجر پیشہ تھے، اس لیے خرید وفروخت کے معاملات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور ناجائز طریقوں

---

① مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۳۸۲۸ ② تاریخ الطبری: ۲۴۴/۴، ۲۴۵ ③ عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۱۱۸، ۱۱۹

سے دولت کمانے کی سخت ممانعت تھی، سودی لین دین بالکل ممنوع تھا، شراب نوشی کی طرح شراب فروشی پر بھی مکمل پابندی عائد تھی۔ بازار میں تجارت کے لیے بیٹھنے سے قبل لازم تھا کہ تجارت کے احکام سیکھے جائیں۔ [1]

(11) نظامِ کفالت ۔ ادارۃ العُرَفاء:

نظامِ خلافت کا ایک خاص ادارہ ''العُرَفاء'' تھا جو رعایا کی کفالت، عوامی نمایندگی اور قومی نظم وضبط کی بہترین مثال تھی۔ اس نظام کے تحت رعایا کے ہر بڑے مجمعے مثلاً فوج، کسی شہر کی آبادی یا کسی قبیلے کے افراد سے دس نمایندے چن لیے جاتے تھے، ان میں سے ہر ایک کو ''عَرِیف'' کہا جاتا تھا اور انہیں دس، دس افراد کی نمایندگی اور ان کے احوال کی دیکھ بھال کی خدمت سونپ دی جاتی تھی۔ یہ ماتحت افراد اسی طرح مزید دس، دس افراد سے رابطے کے ذمہ دار بنتے تھے اور وہ مزید دس، دس کے۔ یہ سلسلہ چلتا جاتا، اس طرح اوپر سے نیچے تک لاکھوں افراد جن میں خواتین اور بچے تک شامل ہوتے، ربط وضبط کی ایک لڑی میں پروئے جاتے۔

حکومت کو تازہ دم مجاہدین درکار ہوتے تو قبیلے یا شہر کے ''عریف'' فوراً بات نیچے پہنچا کر یہ ضرورت پوری کر دیتے۔ سرکاری اعلانات اسی طرح مشتہر ہوتے۔ کسی غریب ولاچار کو اپنی فریاد پہنچانا ہوتی تو وہ اپنے ''عریف'' کو کہہ دیتا۔ مسئلہ فوراً اوپر پہنچ جاتا اور اس کی شکایت دور کر دی جاتی۔ سرکاری خزانے، سالانہ وظائف بھی عرفاء کے ذریعے تقسیم ہوتے اور ہر شہری کو اپنا حصہ کسی بھاگ دوڑ کے بغیر گھر بیٹھے مل جاتا تھا۔ [2]

(12) عدلیہ:

عدلیہ کا شعبہ نہایت فعال اور بااختیار تھا۔ عوام کو فوری انصاف ملتا تھا، اکثر شہروں میں عامل کو قاضی کے اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے، ان میں سے زیادہ تر صحابہ کرام اور بعض تابعین تھے جو قرآن وسنت سے خوب واقف تھے۔

چونکہ ہر طرف امن وسکون کا دور دورہ تھا، لہٰذا عامل کے پاس اکادکا مقدمے ہی آیا کرتے تھے، جنہیں وہ بلاتاخیر نمٹا دیا کرتے تھے۔ بعض مقامات پر قاضی الگ سے مقرر کیے جاتے تھے، جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں حضرت کعب بن سور رضی اللہ عنہ کو یہ منصب دیا تھا۔ [3]

عام طور پر قاضی حضرات اپنے گھروں یا مساجد میں ہی مقدمہ سنتے اور فیصلہ دیتے تھے۔ عدالتوں کی الگ سے عمارتیں نہیں تھیں۔ [4] وجہ یہی تھی کہ مقدمات بہت کم آتے تھے اور عموماً فوری ساعت پر فیصلے ہو جاتے تھے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں مدینہ طیبہ کے قاضی حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، دو سال میں ان کے پاس ایک مقدمہ بھی نہیں آیا۔ [5]

حضرت ملحان بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کوفہ کے قاضی مقرر ہوئے تو فارغ ہی بیٹھے رہتے تھے۔ ان کے ایک دوست کا کہنا ہے: ''میں چالیس دن تک روزانہ ان کے پاس جاتا رہا، کبھی کوئی مقدمہ ان کے ہاں نہیں آیا۔'' [6]

---

(1) عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۱۴۸، ۱۴۹ (2) تاریخ الطبری: ۴/۴۸، ۴۹ (3) تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۷۹
(4) عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۱۸۹ (5) تاریخ الطبری: ۳/۴۲۶ (6) اسد الغابۃ، تر: ملحان بن ربیعۃ رضی اللہ عنہ

قاضیوں کی تنخواہیں معقول تھیں تا کہ وہ رشوت لینے کی طرف مائل نہ ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور قاضی شریح رحمہ اللہ کی ماہانہ تنخواہیں سو، سو درہم تھیں۔[1]

⑬ ذاتی زندگی میں بے جامداخلت سے اجتناب:

اگر چہ قانون اپنی جگہ بے لچک تھا اور زیر سماعت مقدمات میں کسی کی بے جا رعایت نہیں کی جاتی تھی مگر حکومت عوام کی نجی زندگی میں از خود مداخلت کر کے ان کے عیوب، خفیہ گناہوں اور قانونی خلاف ورزیوں کا کھوج لگانے کی قائل نہیں تھی، بلکہ خلفاء کی طرف سے عاملوں کو ترغیب دی جاتی تھی کہ کسی کے پوشیدہ گناہ کا پتا چل جائے تو اسے چھپایا جائے اور کوشش کی جائے کہ گناہ گار نادم ہو کر توبہ کرلے۔ معاشرے میں اس گناہ کے ارتکاب کا شور وشغب نہ پھیلے۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے پوری اسلامی ریاست میں عاملوں کو یہ ہدایت تھی:

"لوگوں کو وہ گناہ افشاء کرنے کا مت کہو جن پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ ہاں جب لوگ کوئی معاملہ عدالت میں لے آئیں تو پھر حکومت کو کسی لچک کے بغیر سزا کے قانون پر عملدرآمد کرنا چاہیے۔"[3]

⑭ ذرائع آمدن:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے حکومت کی آمدن کے ذرائع زکوٰۃ، عشر، جزیہ، خراج اور مالِ غنیمت تھے۔ زکوٰۃ مسلمانوں کے مخصوص اموال مثلاً سونے، چاندی، سامانِ تجارت وغیرہ پر عائد ہوتی تھی۔ اس کی شرح ڈھائی فیصد تھی۔
عشر بھی مسلمانوں پر فرض تھا جو زرعی و معدنی پیداوار سے لیا جاتا تھا، اس کی شرح پانچ سے بیس فیصد تک ہوا کرتی تھی۔
جزیہ اور خراج غیر مسلمانوں پر عائد ہوتے تھے۔ خراج زرعی پیداوار کا لگان تھا جس کی شرح کسی علاقے کی فتح کے وقت مقامی عمائد سے مل کر مقرر کی جاتی تھی جیسا کہ آذر بائیجان کے غیر مسلم سالانہ ۸۰ لاکھ درہم خراج دیا کرتے تھے۔
جزیہ وہ رقم تھی جو ہر غیر مسلم شہری حکومت سے مہیا کردہ سہولیات کے بدلے ادا کرتا تھا۔ اس ٹیکس کی شرح نہایت معمولی تھی یعنی مالداروں پر اڑتالیس درہم، متوسط طبقے کے افراد پر چوبیس درہم اور غریبوں پر بارہ درہم سالانہ۔ (وقت کے لحاظ سے اس میں کمی بیشی ہو جاتی تھی)
غیر مسلموں پر اس کے سوا کسی قسم کا کوئی ٹیکس نہیں تھا اور یہ بھی سال میں صرف ایک بار ادا کرنا پڑتا تھا۔ جو غیر مسلم بالکل تنگ دست ہو، اسے جزیہ معاف کر دیا جاتا تھا۔ ان رعایتوں کے باوجود خلفائے اسلام کو غیر مسلم شہریوں کا اتنا خیال تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وفات سے قبل بڑے اہتمام سے یہ وصیت کی تھی:

---

① عصر الخلافة الراشدة، ص ۱۷۳
آج کل کے حساب سے یہ تقریباً پچیس ہزار روپے بنتے ہیں۔ اگر اس دور میں اجناس کی ارزانی اور تمدن کی سادگی کو پیش نظر رکھا جائے تو ایک خطیر رقم تھی جو ایک کنبے کو فارغ البال رکھنے کے لیے بہت کافی تھی۔
② کتاب الأم للامام الشافعی: ۱۴۹/۲، ط المعرفة
③ مصنف عبد الرزاق، ح: ۹۳۷۱، ط المجلس العلمی پاکستان

"ذمیوں سے اچھا سلوک برقرار رکھا جائے، ان سے کیے گئے معاہدوں کی پابندی کی جائے، انہیں تحفظ فراہم کیا جائے اور ان کی سکت سے زیادہ ٹیکس نہ لگایا جائے۔"

دشمن پر بزورِ شمشیر فتح حاصل کرنے کے دوران جو مال واسباب ہاتھ آتا، اسے "غنائم" یا "مالِ غنیمت" کہا جاتا تھا۔ اس کا اَسّی (۸۰) فیصد فوج پر تقسیم کیا جاتا اور بیس فیصد (پانچواں حصہ) بیت المال میں جمع کرایا جاتا تھا۔ ①

⑮ زرعی ترقی۔ مالی خوشحالی:

آمدن کے ان محدود ذرائع کے باوجود اسلامی حکومت مالی طور پر بہت مستحکم تھی۔ زرعی علاقوں میں نئی نہریں کھود کر دور دور تک زمینیں سرسبز وشاداب کر دی گئی تھیں۔ بصرہ کے شہریوں کو میٹھے پانی کی فراہمی کے لیے دریائے دجلہ سے نومیل (ساڑھے ۱۴ کلومیٹر) لمبی نہر کھود کر شہر تک لائی گئی تھی۔ ②

کبھی ایک صوبے میں قحط پڑتا تو دوسرے صوبے کی فاضل پیداوار وہاں بھیجنے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں قحط کے دور میں خلیج اَیلہ سے بحیرۂ احمر میں کشتیاں روانہ کی تھیں جو غذائی ذخائر مدینہ کی قریبی بندرگاہ تک لے گئی تھیں۔ ③

زمین دار اور کسان محنت کا پورا پھل پاتے تھے اس لیے پوری جانفشانی سے کھیتی باڑی کرتے تھے۔ بارشیں اکثر وقت پر ہوتی تھیں۔ محصولات کے افسران نہایت دیانت دار تھے، اس لیے رقم خرد برد نہیں ہوتی تھیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر سال بیت المال میں کروڑوں درہم جمع ہو جاتے تھے۔ ④

⑯ بیت المال کے مصارف:

سرکاری خزانے میں جمع شدہ اموال کو پوری احتیاط سے ان کے مصارف پر خرچ کیا جاتا تھا۔ زکوٰۃ کی رقم غریبوں، فقیروں، یتیموں، بیواؤں، مسافروں، طلبہ اور مجاہدین میں تقسیم کی جاتی تھیں۔ دیگر اموال کو ملک کے دفاع، رعایا کی ضروریات اور سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں خرچ کیا جاتا تھا۔ رفاہِ عامہ یعنی سڑکوں، پلوں، نہروں، مساجد، مدارس، مسافر خانوں اور نئے شہروں کی تعمیر پر بھی سالانہ خطیر رقم صرف کی جاتی۔ ⑤

خلفائے راشدین سرکاری سامان اور بیت المال کی رقوم کو صحیح مصرف میں خرچ کرنے اور اسے ضائع نہ ہونے دینے کا سخت اہتمام کرتے تھے۔ اپنے لیے طے شدہ معمولی وظیفے کے سوا کچھ لینے سے شدید احتراز کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ کے ذاتی مال میں کوئی دینار تھا نہ کوئی درہم۔ ایک خادم اور ایک اونٹنی کے سوا

---

① عصر الخلافة الراشدة، ص ۱۸۵ تا ۱۹۰
② فتوح البلدان، ص ۳۴۷، ط الهلال
③ تاريخ المدينة ابن شبة: ۷۴۵/۲
④ فتوح البلدان، ص ۲۶۶، ط الهلال
⑤ تاريخ الطبري: ۲۵۶/۳؛ فتوح البلدان، ص ۲۶۹، ۲۷۲، ۳۴۷ تا ۳۵۰، ۳۷۵، ط الهلال

کوئی سرکاری چیز بھی آپ کے استعمال میں نہیں تھی۔ ان دو چیزوں کے بارے میں بھی وصیت فرما گئے تھے کہ فوراً گلے خلیفہ کے حوالے کردی جائیں۔ ①

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عموماً صحابہ کرام میں بیت المال سے عمدہ کپڑے تقسیم کرتے اور مہاجرین کو ترجیح دیتے مگر اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو پیچھے رکھتے اور انہیں معمولی کپڑے کے قابل شمار کرتے۔ ② آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے اگر فرات کے کنارے ایک اونٹ بھی ضایع ہوا تو ڈر ہے کہ اللہ کے ہاں مجھ سے باز پرس ہوگی۔ ③

⑰ حرمین شریفین اور مساجد کی تعمیر و توسیع:

خلفائے راشدین کو مقاماتِ مقدسہ: حرمین شریفین اور قبلہ اوّل کی خدمت اور نگہبانی کا ہمیشہ خیال رہا۔ مسجدِ نبوی اس سے پہلے مٹی کی بنی ہوئی تھی، چھت کھجور کی چھال کی تھیں، ستون کھجور کے تنوں کے تھے۔ ④

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی پر کھجور کی ٹہنیوں کی نئی چھت تعمیر کرائی۔ ⑤ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مسجد کے رقبے میں اضافے کے لیے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا مکان اس میں شامل کردیا۔ ⑥ کچی اینٹوں سے نئی دیواریں چنائیں، مسجد حرام میں بھی تعمیری کام کرایا، مقام ابراہیمی بیت اللہ سے ملا ہوا تھا جس سے طواف کرنے والوں کو مشکل پیش آتی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے ہٹا کر دور کردیا اور اس کے گرد کٹہرا نصب کرایا۔ ⑦

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں مسجد الحرام میں غیر معمولی توسیع ہوئی۔ ⑧ مسجدِ نبوی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی توسیع اور مرمت کے باوجود مسجد کی ہیئت وہی قدیم تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسجد کو بہتر انداز میں ازسرِ نو تعمیر کرایا۔ چونے اور پتھر کی مضبوط دیواریں بنوائیں جن پر نقاشی اور مینا کاری کرائی گئی۔ ساگوان کی پائیدار چھت ڈالی گئی۔ رقبے میں اضافہ کیا گیا۔ ⑨ یہ کام ربیع الآخر ۲۹ھ سے محرم ۳۰ھ کے دوران دس ماہ میں مکمل ہوا جس کے بعد مسجد کا طول ۲۴۰ فٹ اور عرض ۲۲۵ فٹ ہوگیا۔ جنوب کی سمت محرابِ نبوی سے آگے نئی محراب تعمیر کرائی گئی جو آج تک قائم ہے۔ ⑩

مساجد کی تعمیر و توسیع کے ساتھ ان کو اعمالِ صالحہ سے آباد کرنے کا پورا اہتمام کیا جاتا تھا۔ حرمین شریفین اور

---

① طبقات ابن سعد: ۱۹۲/۳ ط صادر

② الاموال لابن زنجویه: ۵۵۱/۲، ط مرکز الملک فیصل

③ "لومات جمل ضیاعا علیٰ شط الفرات لخشیت ان یسئلنی اللّٰه عنه" (تاریخ الطبري: ۵۲۶/۲ ؛ طبقات ابن سعد: ۳۰۵/۳)

④ صحیح البخاری، ح: ۴۴۶، کتاب الصلوٰة، باب بنیان المسجد

⑤ عصر الخلافة الراشدة، ص ۳۹۶، ۳۰۷

⑥ سنن ابی داؤد، ح: ۴۵۱، کتاب الصلوٰة، باب فی بناء المساجد

⑦ طبقات ابن سعد: ۲۱/۴، ۲۲، ط صادر

⑧ تاریخ الطبری: ۲۵۱/۴

⑨ صحیح البخاری، ح: ۴۴۶، کتاب الصلوٰة، باب بنیان المسجد

⑩ تاریخ مکة المشرفة والمسجد الحرام والمدینة الشریفه لابن ضیاء المکی، ص ۲۸۱

کوفہ، بصرہ اور فسطاطِ مصر کی نوتعمیر کردہ وسیع وعریض جامع مساجد نہ صرف نمازیوں سے بھری رہتی تھیں بلکہ وہ ذکر و عبادت، علم ومعرفت، وعظ وتذکیر اور مسلمانوں کے باہمی میل ملاپ کے مراکز کی حیثیت رکھتی تھیں۔ عدالتی فیصلے اور سرکاری احکام بھی یہیں سنائے جاتے تھے۔[1]

⑱ نوجوانوں کی صلاحیتوں کی آزمائش:

کلیدی عہدے اکابر صحابہ کے پاس ہوتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ نئے خون کو بھی آزمایا جاتا اور نوجوانوں کو صلاحیتوں کے اظہار کا موقع فراہم کیا جاتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا عامل بنایا اور مصر میں عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کے اختیارات میں اضافہ کر کے انہیں پورے صوبے کا گورنر بنا دیا۔ ان نوجوانوں نے فتوحاتِ اسلامیہ کا دائرہ دور دور تک پھیلا دیا۔[2]

☆☆☆

---

① عصر الخلافة الراشدة، ص ۲۹۹، ۳۰۰

② ان فتوحات کی تفصیلات دورِ فاروقی اور دورِ عثمانی کے ذیل میں پیچھے گزر چکی ہیں۔

خلافتِ راشدہ میں علمی سرگرمیاں

خیر و برکت کے اس زمانے میں تعلیمی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ بلند مرتبہ اس کو ملتا تھا جو علم میں ممتاز ہوتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت لگ بھگ پندرہ برس کے تھے۔ قرآن وسنت کا زیادہ علم حاصل نہیں کر سکے تھے، مگر علمی ولولے کا یہ حال تھا کہ صحابہ کرام میں سے ایک ایک کے پاس جا کر احادیث یاد کرتے۔ چند برسوں میں وہ تفسیر، حدیث اور فقہ کے بڑے عالموں میں شمار ہونے لگے اور ان کے گرد علم کے پیاسوں کا جمگھٹ لگ گیا[1] اور اسی وجہ سے وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مجلس شوریٰ میں اکابر صحابہ کرام کی صف میں شامل کیے گئے، جبکہ ان کی عمر بیس، بائیس سال تھی۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کو لڑکپن میں تعلیم کی طرف متوجہ ہونے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کرتے تھے:

"سردار بننے سے پہلے علم حاصل کرو۔"[3]

مطلب یہ تھا کہ علم حاصل کرو گے تو کچھ بن پاؤ گے۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ عملی زندگی میں قدم رکھنے اور اہم ذمہ داریاں سنبھالنے سے پہلے علم حاصل کر لو، ورنہ بعد میں فرصت نکالنا مشکل ہوگا۔

علمی سرگرمیوں کے مختلف شعبوں اور متنوع پہلوؤں کا مختصر جائزہ یہ ہے:

① قرآنِ مجید کی حفاظت:

سب سے زیادہ زور قرآنِ مجید کے الفاظ کی حفاظت اس کی صحیح تلاوت اور اس کے معانی سمجھنے پر تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی: "خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ" سب کے پیشِ نظر تھا۔[4]

الفاظ کی حفاظت کے سلسلے میں دورِ صدیقی میں جو کام ہوا، صحیح البخاری میں مذکور ابن شہاب زہری کی روایات کے مطابق اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یمامہ کی جنگ میں قاری صحابہ کی خاصی تعداد کے شہید ہو جانے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خطرہ محسوس ہوا تھا کہ کہیں حفاظ کے چلے جانے سے قرآن کی حفاظت میں کوئی رخنہ نہ آ جائے کیوں کہ اس وقت تک دار و مدار حفظِ قرآن پر تھا اور مکمل مصاحف موجود نہ تھے۔ تب ان کے حکم پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ

① مستدرک حاکم، ح: ٦٢٩٤

② اسد الغابة، الاستيعاب، تر: عبد الله بن عباس رضی اللہ عنہ

③ قال عمر رضی اللہ عنہ: تفقهوا قبل ان تسودوا. (مصنف ابن ابی شيبة، ح: ٢٦١١٦، ط الرشد)

④ صحيح البخاری، ح: ٥٠٢٧، کتاب فضائل القرآن

نے قرآنِ مجید کی ایک ایک آیت کو پوری احتیاط کے ساتھ جمع کیا اور ایک تصدیق شدہ مجموعہ تیار کر دیا۔[1]

② حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں حفاظتِ قرآن کی مہم:

اس سلسلے میں دوسرا بڑا کردار حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا تھا جنہوں نے اُمّت کو قرآنِ مجید کے ایک نسخے اور ایک رسم الخط پر یکجا کر دیا۔ انہیں اس بارے میں عملی اقدام کا خیال اس وقت آیا جب آذر بائیجان کے محاذ پر جہاد کرنے والے اسلامی سالار حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے مدینہ آکر انہیں بتایا کہ لوگ قرآنِ کریم کی تلاوت کے بارے میں اختلافات کا شکار ہو رہے ہیں۔ ایک آیت کو کوئی ایک طرح پڑھتا ہے، کوئی دوسری طرح۔ وجہ یہ تھی کہ اسلام دور دور تک پھیل گیا تھا اور مختلف قوموں کے لوگ اپنے اپنے انداز میں قرآنِ مجید کو نقل کر رہے تھے اور پھر مختلف طریقوں سے اسے پڑھنے لگے تھے۔ اس لیے یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں تورات، انجیل کی طرح قرآن بھی کئی قسموں کا نہ بن جائے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس خدشے کے پیشِ نظر قرآنِ مجید کی کتابت اور اشاعت کا کام سرکاری تحویل میں لے لیا۔ یہ کام دوبارہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوا۔ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں مرتب کردہ مصدقہ مجموعے کو سامنے رکھا۔ اس نسخے کے ایک ایک لفظ کو دوبارہ جانچا اور صحت کی تصدیق کے بعد، پوری احتیاط سے اس کی کئی نقول تیار کیں جنہیں عالمِ اسلام کے تمام صوبائی مراکز میں بھیج دیا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے غیر سرکاری طور پر لکھے گئے قرآنی نسخے تلف کر دیے گئے، کیوں کہ ان کی صحت توثیق شدہ نہ تھی۔ سرکاری نسخے کو "مصحفِ عثمانی" اور اس کے اندازِ کتابت کو "رسمِ عثمانی" کہا جاتا ہے اور آج تک اُمتِ مسلمہ اسی سے مستفید ہو رہی ہے۔[2]

③ قرآن مجید کی تعلیم پر توجہ:

خلفائے راشدین نے قرآن مجید پڑھنے پڑھانے کو عام کرنے پر خاص توجہ دی تھی۔ صحابہ کرام اور تابعین کا ایک ایک جمِ غفیر اس خدمت میں مشغول تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی جانب سے دیہات میں قرآنِ کریم کی خواندگی کا جائزہ لینے کے لیے نگران مقرر کیے گئے تھے۔[3]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بَصرہ میں اتنے شاگرد تیار کیے کہ وہاں قاری حضرات کا ایک مستقل طبقہ پیدا ہو گیا۔[4] کوفہ کی علمی رونقیں سب سے بڑھ کر تھیں جہاں بیعتِ رضوان سے مشرف تین سو اور غزوۂ بدر میں شامل ستر صحابہ کرام آباد تھے۔[5]

---

① صحیح البخاری، ح: ۴۹۸۶، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن

② صحیح البخاری، ح: ۴۹۸۷، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن ؛ فتح الباری: ۹/۱۷ تا ۲۱، ط دار المعرفة
اس وقت رسمِ عثمانی میں بھی نقطے اور زبر، زیر وغیرہ نہیں تھے، لوگ ان کے بغیر بلا تکلف عربی عبارت پڑھ لیتے تھے، نقطے اور اعراب لگانے کا رواج بنواُمیہ کے دور میں شروع ہوا، کیوں کہ نومسلم عجمیوں کو اس کے بغیر حروف شناسی میں دشواری ہوتی تھی۔

③ الاصابة: ۱/۲۹۸، الترجمة: أوس بن خالد. ط العلمية ④ عصر الخلافة الراشدة، ص ۲۹۶، ۲۹۷

⑤ عن عبيدة بن ابراهيم قال هبط الكوفة ثلاثمائة من اصحاب الشجرة وسبعون من اهل البدر (طبقات ابن سعد: ۶/۹ ط صادر)

صحابہ کرام کے اس زریں دور میں قرآنِ مجید پڑھانے اور یاد کرانے والوں میں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت معاذ بن جبل، حضرت اُبی بن کعب اور حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہم سب سے فائق تھے، کیوں کہ ان چاروں کے بارے میں خود حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ان سے قرآن مجید سیکھا جائے۔ [1] حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی قرآن کے نامور معلم تھے۔ [2] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پختہ حافظ تھے، روزانہ ایک ختم کرتے تھے۔ [3] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت اور حفظ میں مہارت مشہور ہے۔ [4] صفِ اوّل کے ان قراء نے حضور اکرم ﷺ سے قرآن سیکھا تھا۔ حضرت ابوذرداء، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہم بھی بہترین قاریوں میں سے تھے۔ [5]

تابعین بھی حافظ وقاری بن کر آگے اس علم کو پھیلاتے رہے۔ ان میں مُغیرہ بن ابی شہاب، اسود بن یزید، علقمہ بن قیس، ابوعبدالرحمٰن السلمی، عبداللہ بن عیاش، ابورَجاء العصری، ابوالاسود الدؤلی، حسن بصری، عیسیٰ بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، مجاہد بن جبر، یحییٰ بن یعمر اور سعید بن جُبیر رحمہم اللہ بہت نمایاں تھے۔ [6]

قرآن مجید کے الفاظ کے ساتھ اس کے احکام اور آیات کی تفسیر بھی سکھائی جاتی تھی۔ کسی آیت کی وہ تفسیر معتبر مانی جاتی تھی جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ ایک آیت کے الفاظ سکھاتے اور پھر دیر تک اس کی تفسیر سمجھاتے۔ حضرت عبداللہ عباس رضی اللہ عنہ اُمتِ مُسلمہ کے سب سے بڑے مفسرِ قرآن کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے، مگر تفسیر میں اپنی رائے اور خیال کو دخل دینے سے احتراز کیا جاتا تھا۔ کوشش یہی کی جاتی تھی کہ اگر تفسیر کے متعلق کوئی حدیث معلوم ہو تو بیان کر دی جائے ورنہ خاموشی اختیار کی جائے۔ [7]

④ سنت کی حفاظت کی کوشش:

سنت کے متن یعنی حدیث کے الفاظ کو یاد کرنے کا ولولہ بھی بہت عام تھا۔ حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں حدیثوں کو لکھنے کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی تھی کہ کہیں قرآنِ مجید کے اوراق، احادیث کے اوراق میں نہ مل جائیں مگر اب یہ خدشہ نہیں تھا۔ قرآنِ کریم کے مکمل نسخے مرتب ہو چکے تھے، اس لیے صحابہ کرام اور تابعین میں احادیث لکھنے کا سلسلہ بھی عام ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ لکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ ان کی کاپی "صحیفہ صادقہ" کے نام سے مشہور تھی۔ اسی طرح حضرت سعد بن عُبادہ، حضرت سَمُرہ بن جُندُب، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ بن ابی اَوفی رضی اللہ عنہم کے لکھے ہوئے مسوداتِ حدیث سے لوگوں نے بہت استفادہ کیا۔ [8]

---

① صحيح البخاري، ح: ٣٧٥٨، كتاب المناقب، باب مناقب سالم

② صحيح البخاري، ح: ٣٨١٠، كتاب المناقب، باب مناقب زيد بن ثابت

③ المعجم الكبير للطبراني: ١/٨٧، ط مكتبة ابن تيمية

④ معرفة القرآء الكبار للذهبي: ص ١٣، ط العلمية

⑤ معرفة القرآء الكبار للذهبي، ص ١١، ١٩، ٢١، ٢٢، ٢٤

⑥ معرفة القرآء الكبار للذهبي، ص ٢٥ تا ٤٠

⑦ عصر الخلافة الراشدة، ص ٣٠٧

⑧ عصر الخلافة الراشدة، ص ٣٠٣ تا ٣٠٩

حدیث سیکھنے کے لیے خود صحابہ دور دراز کے اسفار کرتے تھے۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ ایک حدیث کے لیے شام اور ایک کے لیے مصر تک گئے۔ ①

مساجد میں مجالسِ حدیث عام تھیں۔ مسجدِ نبوی میں حضرت ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم کے حلقے مشہور تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے حجرے سے پردے میں احادیث بیان فرماتی تھیں۔ کوفہ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ، بصرہ میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ، مصر میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اور شام میں ابو درداء رضی اللہ عنہ کے حلقے مرجع خلائق تھے۔ ②

⑤ فقہ پر توجہ:

دین اسلام میں علم کے تصور کی بلندی اور خلفاء کی طرف سے اس کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی نے کچھ ہی برسوں میں علم کو مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کا ایسا لازمی عنصر بنا دیا تھا کہ ہر مسلمان علم کا متوالا نظر آتا تھا۔ اسلام سے پہلے عربوں کا علم چند مذہبی قصوں اور شعر وشاعری تک محدود تھا، اسلام نے قرآن وسنت کی روشنی بخشی تو زندگی کو ایک نیا معنی ملا۔ انسان ہر کام یہ سوچ کر کرنے لگا کہ اس سے اللہ راضی ہوگا یا ناراض۔ ہر معاملے کو جائز یا ناجائز کے پہلو سے دیکھا جانے لگا۔ بہت سے معاملات کے بارے میں قرآن وسنت میں واضح فیصلے موجود تھے۔ چوری، ڈاکا، بدکاری، شراب نوشی اور ناحق تہمت کا حرام ہونا واضح تھا، ان کی شرعی سزائیں بھی طے تھیں جو ''حدود'' کہلاتی تھیں۔ بعض جرائم سنگین تھے مگر ان کی سزا طے کرنے کا حکام کو اختیار دیا گیا تھا، جیسے ہم جنس پرستی، جادو ٹونا، نماز ترک کرنا وغیرہ۔ ان کی سزائیں ''تعزیرات'' کہلاتی تھیں۔ بعض گناہ بہت سخت تھے مگر ان پر سزا دینا حکومت کے ذمے نہیں تھا۔ جیسے جھوٹ، بدنظری، حسد، چغلی وغیرہ۔ قرآن وسنت سے واقف حضرات، عوام کو اُن کی خرابیوں سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔

بعض مسائل کی نوعیت نئی ہوتی تھی، زمانے کی تبدیلی، احوال کے تغیر، وسائل اور رہن سہن کے معیارات کی ترقی ایسے نئے واقعات کو جنم دے رہی تھی جن کے بارے میں قرآن وسنت میں کوئی واضح فیصلہ نہیں تھا۔ لوگ ان مسائل کے بارے میں شرعی حکم دریافت کرتے تھے۔ اب جن کو قرآن وسنت کا علم نصیب ہوا تھا وہ آیات واحادیث کے الفاظ میں سوچ بچار کرنے لگے کہ ان سے نت نئے پیش آمدہ مسئلے کا حل کس طرح نکلے گا۔ یہ لوگ فقہاء کہلائے۔ ان میں سے جدید مسائل میں رہنمائی کرنے والے جنہیں اہل فتویٰ کہا جاتا ہے، تیس سے زائد تھے جن میں حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت مُعاذ بن جبل اور حضرت ابو سعید خدری رضوان اللہ علیہم اجمعین زیادہ مشہور تھے۔ ③

---

① الرحلة فی طلب الحدیث للخطیب البغدادی، ح: ۳۱، ۳۲، ط العلمیة

② عصر الخلافة الراشدة، ص ۲۷۸ ؛ منہاج المحدثین فی القرن الاوّل الھجری وحتیٰ عصرنا الحاضر، علی عبدالباسط مزید، ص ۱۸۷
الانوار الکاشفة لما فی کتاب "اضواء علی السنة" من الزلل والتضلیل والمجازفة، عبدالرحمن الیمانی، ص ۳۶
نیز الاصابہ، الاستیعاب اور اسد الغابہ میں مذکورہ صحابہ کے احوال دیکھیے۔

③ عصر الخلافة الراشدة، ص ۳۱۲

⑬ افتاء:

فقہاءِ کرام میں اہلِ فتویٰ کا ایک مستقل طبقہ موجود تھا جن سے لوگ مسائل پوچھا کرتے تھے، ان میں اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ، عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابو سعید خدری، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہم سب سے نمایاں تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم فقہاء اور اہلِ فتویٰ میں سب سے بلند پایہ تھے۔ ①

دورِ خلافتِ راشدہ میں بعض تابعین بھی نہایت ماہر فقیہ، مفتی اور قاضی تھے۔ ان میں حضرت کعب بن سور اور حضرت شریح رحمہما اللہ بہت مشہور ہوئے۔ کعب بن سور رحمہ اللہ بصرہ اور شریح رحمہ اللہ کوفہ کے قاضی تھے۔ ②

⑭ شعروادب، تاریخ، زبان دانی:

خالص عربی زبان سیکھنے سکھانے اور اس کی لغات یاد رکھنے کے لیے عرب شعراء کے کلام کو بھی سنا اور سنایا جاتا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تاکید کرتے تھے کہ عرب شاعری کو اوراق میں محفوظ رکھا جائے، کیوں کہ قرآن وسنت کی نصوص کو سمجھنے میں عربی لغت کی اہمیت ثابت ہے۔

مسلمانوں میں تاریخ کا ذوق بھی پیدا ہو گیا تھا۔ حضور ﷺ کی سیرت اور خصوصاً جہادی مہمات کے احوال اس طرح یاد کیے جاتے تھے جیسے قرآن وحدیث۔ غیر ملکی زبانیں سیکھنے کی اہمیت بھی محسوس کی گئی تھی۔ حضرت زید بن ثابت نے حضور ﷺ کی زندگی میں آپ ﷺ کے حکم سے عبرانی، سُریانی، حبشی اور قبطی زبانیں سیکھ لی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی اہلِ کتاب کی زبانیں جانتے تھے۔ حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ فارسی جانتے تھے۔ ③

☆☆☆

① اعلام الموقعین من رب العالمین، لابن قیم الجوزیۃ: ۱/۱۰ تا ۱۲، ط دار الکتب العلمیۃ
② طبقات ابن سعد، تراجم: کعب بن سور، شریح بن الحارث
③ عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۳۱۳ تا ۳۲۱

دورِ فتوحات ۔ عہدِ صحابہ

اہم واقعات ایک نظر میں

سنہ ۱۱ھ......تا......سنہ ۳۴ھ

☆☆☆

۱۱ھ:

☆ خلافتِ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ......ربیع الاوّل (مئی 632ء)

☆ جیشِ اسامہ کی روانگی......ربیع الاوّل کے اواخر میں (جون 632ء)

☆ چالیس دن بعد جیشِ اسامہ کی فاتحانہ واپسی......جمادی الاولیٰ کے اوائل میں (جولائی 632ء)

☆ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا باغیوں پر حملہ......۱۰ جمادی الاولیٰ (جولائی 632ء)

☆ وفات حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا......رمضان (نومبر 632ء)

☆ وفات حضرت اُمّ ایمن رضی اللہ عنہا......رمضان (نومبر 632ء)

☆ قتل مُسَیلِمہ کذاب......ذوالحجہ......(فروری 633ء)

☆☆☆

۱۲ھ:

☆ ایران پر فوج کشی۔ جنگ ذات السلاسل......محرم (مارچ 633ء)

☆ وَلَجہ کا معرکہ......صفر (اپریل 633ء)

☆ حیرہ کی فتح......ربیع الاوّل (جون 633ء)

☆ جنگِ فراض......ذوالقعدہ (جنوری 634ء)

☆ وفات دامادِ رسول حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ......ذوالحجہ (فروری 634ء)

☆☆☆

۱۳ھ:

☆ شام پر فوج کشی کا آغاز......محرم (مارچ 634ء)

☆ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی عراق سے شام روانگی......محرم (مارچ 634ء)

☆ جنگِ اَجنادین......جمادی الاولیٰ (جولائی 634ء)

☆ وفات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ......۲۲ جمادی الآخرۃ (24 اگست 634ء)

☆ خلافت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا آغاز......۲۲ جمادی الآخرۃ (25 اگست 634ء)
☆ یرموک کی پہلی جنگ......۲۹ جمادی الآخرۃ (یکم ستمبر 634ء)
☆ جنگِ جسر......شعبان (اکتوبر 634ء)
☆ جنگِ بُوَیب......رمضان (نومبر 634ء)

☆☆☆

۱۴ھ:

☆ دمشق کے محاصرے کا آغاز......محرم (فروری 635ء)
☆ دمشق کی فتح......۱۵ رجب (اگست 635ء)
☆ فحل کا معرکہ......ذوالقعدہ (دسمبر 635ء)
☆ فتح حمص رومی پایہ تخت، فتح بعلبک......ذوالقعدہ (دسمبر 635ء)

☆☆☆

۱۵ھ:

☆ بصرہ شہر کی تعمیر کا آغاز......ربیع الآخر (مئی 636ء)
☆ جنگ یرموک ثانی......۵ رجب (۲۴ اگست 636ء)
☆ جنگ قادسیہ......شوال (نومبر 636ء)

☆☆☆

۱۶ھ:

☆ فتح مدائن، پایۂ تختِ کسریٰ......صفر (مارچ 637ء)
☆ کوفہ شہر کی تعمیر کا آغاز......رجب (جولائی 637ء)
☆ فتح بیت المقدس......رجب (جولائی 637ء)
☆ جنگ جلولاء......ذوالقعدہ (نومبر 637ء)

☆☆☆

۱۷ھ:

☆ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی......(638ء)
☆ شامی نصرانیوں کی بغاوت اور اس کی سرکوبی......(638ء)

☆☆☆

۱۸ھ:

☆ قحط سالی......(639ء)

☆ طاعون عَمواس......(639ء)

☆ وفات حضرت ابوعبیدۃ بن الجرّاح، حضرت معاذ بن جبل، حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم

☆☆☆

۱۹ھ:

☆ فتح قیساریہ......(640ء)

☆ فتح تکریت......(640ء)

☆ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی مصر کی مہم کے لیے روانگی......(640ء)

☆☆☆

۲۰ھ:

☆ مصر کی فتح......ربیع الآخر (مارچ 641ء)

☆ قیصر روم ہرقل کی موت......شوال (ستمبر 641ء)

☆ فتح اسکندریہ......ذوالقعدہ (اکتوبر 641ء)

☆ وفات اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ......(641ء)

☆ فتح تُستر، ہرمزان کی گرفتاری......(641ء)

☆☆☆

۲۱ھ:

☆ جنگ نہاوند......ربیع الآخر (مارچ 642ء)

☆ وفات حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ......جمادی الآخرۃ (مئی 642ء)

☆ اسلامی افواج کی مشرق اور شمال مشرق میں عمومی یلغار......(642ء)

☆ وفات اُمّ المؤمنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا......(642ء)

☆ وفات اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ......(642ء)

☆ وفات حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ......(642ء)

☆☆☆

۲۲ھ:

☆ فتح آذربائی جان......(643ء)

☆ فتح طرابلس (لیبیا)......(643ء)

☆ فتح خراسان......(643ء)

☆☆☆

۲۳ھ:

☆ فتح اِصطخر، کرمان، بجستان، مکران......(644ء)

☆ وفات قتادہ بن نعمان انصاری رضی اللہ عنہ......(644ء)

☆ وفات اُمّ المؤمنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا......(644ء)

☆ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ......بدھ، ۲۷ ذوالحجہ (3 نومبر 644ء)

☆☆☆

۲۴ھ:

☆ تدفینِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ......یکم محرم (7 نومبر 644ء)

☆ خلافتِ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ......محرم (نومبر 644ء)

☆ فتح ہمدان......۱۴ جمادی الاولیٰ (19 مارچ 644ء)

☆ جہادِ آرمینیا......(19 مارچ 644ء)

☆☆☆

۲۵ھ:

☆ اسکندریہ میں بغاوت کی سرکوبی......ربیع الاوّل (دسمبر 644ء)

☆ کوفہ میں ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کا بطورِ گورنر تقرر......(645ء)

☆☆☆

۲۶ھ:

☆ مسجد الحرام میں توسیع......(646ء)

☆ پہلی اسلامی بحری فوج کی تیاری......(646ء)

☆☆☆

۲۷ھ:

☆ جہادِ افریقہ، شاہ جُرجیر کا قتل......(647ء)

☆ یورپ میں پہلا قدم۔ اَندُلس پر پہلا بحری چھاپہ (647ء)

☆☆☆

۲۸ھ:

☆ پہلی بحری مہم، فتح قُبرُص......(648ء)

☆☆☆

۲۹ھ:

☆ بصرہ اور فارس پر عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا تقرر......(649ء)

☆ مسجد نبوی کی توسیع اور از سر نو تعمیر کا آغاز......ربیع الآخر (جنوری 650ء)

☆☆☆

۳۰ھ:

☆ مسجد نبوی کی از سر نو تعمیر مکمل......محرم (ستمبر 650ء)

☆ فارس و خراسان میں نئی فتوحات، یزدگرد کا تعاقب......(650ء)

☆ خراسان میں احنف بن قیس کی فتوحات......(650ء)

☆☆☆

۳۱ھ:

☆ یزدگرد کی عبرت ناک موت اور آل ساسان کا خاتمہ......(651ء)

☆ فتح نیشاپور......(651ء)

☆ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی وفات......(651ء)

☆☆☆

۳۲ھ:

☆ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلیج قسطنطینیہ تک پیش قدمی......(652ء)

☆ وفاتِ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ (عمر 82 سال)

☆ وفات عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن مسعود، ابوذر غفاری، ابوالدرداء......رضوان اللہ علیہم اجمعین

☆☆☆

۳۳ھ:

☆ قبرص میں بغاوت اور دوبارہ قبضہ......(653ء)

☆ وفات حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ

☆☆☆

۳۴ھ:

☆ غزوہ ذات الصواری (مستولوں کی جنگ)......(654ء)

☆ وفات ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ

اسباقِ تاریخ

☆ عہد صحابہ میں فتوحات اور کامیابیوں کے یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ جب انسان اللہ کی فرمانبرداری کرتا ہے تو اللہ کی مدد ونصرت اس کے شاملِ حال ہو جاتی ہے اور باطل قوتیں ہر جگہ پسپائی پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

☆ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عزمِ صمیم نے ثابت کیا کہ دین کی بقا پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ ایک سچے مسلمان کو زیب نہیں دیتا کہ اس کے جیتے جی اللہ کے دین میں کوئی رخنہ آئے۔

☆ عقیدۂ ختم نبوت اسلام کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اس کے منکرین کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ ختم نبوت کے منکرین کو سر اٹھاتے ہی کچل ڈالنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام کی سنت ہے۔ اس مسئلے پر کوئی نرمی نہیں دکھائی جاسکتی۔

☆ اسلام کے پھلنے اور پھولنے کے لیے غیر معمولی انتظامی قابلیت کے افراد کی موجودگی ضروری ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایسے ہی ایک غیر معمولی منتظم تھے۔

☆ انتظام میں جدتیں پیدا کرنا، نظم وضبط کے نئے طریقے متعارف کرانا اور کاموں کو سہولت کے ساتھ بہتر سے بہتر سانچے میں ڈھالنا صحابہ کرام کے دور سے شروع ہو گیا تھا۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس طرزِ فکر کے بانی تھے۔ مسلمانوں کی کامیابی اور خوشحالی کے لیے سادگی کے ساتھ ساتھ انتظامی وحربی امور میں جدتوں کی تلاش بہت اہم ہے۔

☆ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ عوام کی سہولتوں اور راحتوں پر توجہ دے۔ ان کی سہولتوں، رجحانات اور جائز دلچسپیوں پر قدغن لگانے سے معاشرے میں گھٹن پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلامی قانون کی حدود میں رہتے ہوئے عوام کے لیے لچک رکھنی چاہیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل اس میں ہمارے لیے مثال ہے۔

☆ غیر شرعی کاموں خصوصاً فحاشی و بے حیائی کے اسباب کی مسلم معاشرے میں کوئی جگہ نہیں۔ معاشرہ ان چیزوں سے پاک ہو کر ہی حقیقی ترقی کر سکتا ہے جیسا کہ دورِ صحابہ کا معاشرہ تھا۔

☆ عدل وانصاف کی فراہمی اور امن وامان کا قیام ہر معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے۔ صحابہ کرام کی حکومتوں کی یہ پہلی ترجیح تھی۔ اس لیے مسلم وغیر مسلم سبھی ان سے خوش اور مطمئن تھے۔

☆ حکمران کی توجہ صرف فتوحات پر نہیں ہونی چاہیے۔ اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ مفتوحہ علاقوں میں دین زندہ ہو، عوام مامون ہوں، ظلم ناپید ہو، محبت واخوت کا ماحول ہو، انتظام اعلیٰ درجے کا ہو، دولت کی تقسیم شفاف ہو، بنیادی ضروریات سے کوئی محروم نہ ہو، تعلیم عام ہو، علمی رجحانات ترقی پذیر ہوں، اصلاح وتربیت کے ادارے فعال ہوں۔ صحابہ کرام کے دورِ حکومت میں ان سب امور پر بھرپور توجہ دی جا رہی تھی۔

☆ اُمّتِ مُسلِمہ پر صحابہ کرام کے بڑے احسانات ہیں۔ان کی قربانی، سرفروشی، جذبۂ جہاد اور دعوتِ دین کی وجہ سے آج ہم مسلمان ہیں۔ان حضرات کے احسانات کو یاد رکھنا سعادت مندی کی علامت ہے۔اس کے برعکس ان کی کمزوریوں کو تلاش کر کے ان پر اعتراضات کرنا احسان فراموشی، ناشکری اور بدبختی ہے۔

☆ صحابہ کرام کی زندگیاں ہمارے لیے نمونہ ہیں۔دین کے لیے ان کی قربانیاں دیکھ کر بحیثیتِ امتی یہ جذبہ پیدا ہونا لازمی ہے کہ ہم ان کے نقشِ قدم پر چل کر دنیا و آخرت کی کامیابیاں حاصل کریں۔اگر دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا تو یہ ایمان کے انحطاط اور ضمیر کی موت کی علامت ہے۔

☆ صحابہ کی زندگیاں ہمارے لیے دو طرح سے امتحان ہیں:

ایک اس طرح کہ آیا ہم ان کی پیروی کر کے عشق و محبت کی آزمائش میں کودنے کا حوصلہ کریں گے یا اپنے نفس کو خوش رکھنے ہی میں منہمک رہیں گے؟

دوسرے اس طرح کہ آیا ہم صحابہ کے بارے میں قرآن و حدیث میں بیان کردہ تابندہ نقوش پر ایمان رکھیں گے یا ان کے خلاف مشکوک مواد پر یقین کر لیں گے؟ پہلی صورت ہدایت کا دروازہ کھول دیتی ہے اور دوسری صورت دور دراز کی گمراہی میں پھینک دیتی ہے۔

☆☆☆

پانچواں باب

تاریخ اُمّتِ مُسلِمہ (حصہ اوّل)

عہدِ رسالت اور عہدِ خلافت راشدہ کی

جلیل القدر اسلامی شخصیات

خانوادۂ رسالت مآب ﷺ

اُمہات المومنین رضی اللہ عنہن

حضور اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات کو قرآن کریم نے امہات المؤمنین (مسلمانوں کی مائیں) قرار دیا ہے۔

جن خوش قسمت ہستیوں کو یہ مقام ملا ان کے نام یہ ہیں:

1. اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا
2. اُمّ المؤمنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا
3. اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا
4. اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا
5. اُمّ المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا
6. اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا
7. اُمّ المؤمنین حضرت جُویریہ رضی اللہ عنہا
8. اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا
9. اُمّ المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا
10. اُمّ المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا
11. اُمّ المؤمنین زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا

اس طرح امہات المؤمنین کی تعداد گیارہ ہے جن میں دو حضور ﷺ کی حیات میں وفات پا گئیں یعنی: حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا۔ باقی نو آپ ﷺ کی وفات کے وقت تک زندہ تھیں۔

اُمتِ مُسلِمہ کا اجماع ہے کہ یہ صرف آنحضرت ﷺ کی خصوصیت تھی کہ آپ کے نکاح میں بیک وقت چار سے زائد خواتین آسکتی تھیں۔ کسی امتی کے لئے بیک وقت چار سے زائد بیویاں رکھنا جائز نہیں۔

ذیل میں امہات المؤمنین کے مختصر حالات لکھے جاتے ہیں۔

اُم المؤمنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا

حضرت خدیجہ بنت خولید رضی اللہ عنہا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی اہلیہ اور امت کی سب سے برگزیدہ خاتون ہیں۔قریش کے ایک تاجر گھرانے سے تعلق تھا۔ان کی نیکی اور پاکیزگی کی وجہ سے لوگ انہیں طاہرہ کہا کرتے تھے۔ [1]

ان کا پہلا نکاح عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوا تھا۔اس کی وفات کے بعد ابو ہالہ بن زُرارہ تمیمی کے نکاح میں آئیں۔جب عرب کی مشہور لڑائی حرب فجار چھڑی تو اس میں ان کے والد اور شوہر دونوں شریک ہوئے اور دونوں مارے گئے۔دونوں تجارت پیشہ تھے اور گھر کی گزر بسر کا دارومدار اسی پر تھا۔باپ اور شوہر کی موت کے بعد حضرت خدیجہ کو سخت دقت ہوئی چناں چہ اپنے عزیزوں میں سے کسی کا انتخاب کر کے اس کے ہاتھ مال تجارت بھجواتیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت و دیانت اور صداقت شعاری کے چرچے ان دنوں مکہ میں عام تھے،آپ صادق اور امین کے لقب سے پکارے جاتے،حضرت خدیجہ نے اسی شہرت کو مدنظر رکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام بھجوایا کہ ان کا مال تجارت شام لے جائیں،آپ کو دوسروں کی بہ نسبت دگنا معاوضہ دیا جائے گا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول فرمایا اور مال تجارت لے کر حضرت خدیجہ کے غلام مَیْسَرَہ کے ہمراہ تشریف لے گئے۔اس سال کا نفع بھی گزشتہ سالوں کی بہ نسبت دوگنا ہوا۔حضرت خدیجہ کے بیوہ ہونے کے بعد بہت سے لوگ ان سے نکاح کرنے کے خواہش مند تھے،لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شام کے سفرِ تجارت سے واپس لوٹے تو حضرت خدیجہ نے پیغامِ نکاح بھیجا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا اور نکاح کی تاریخ متعین ہوگئی۔متعین تاریخ کو ابو طالب،حضرت حمزہ اور دیگر روسائے خاندان جمع ہو کر حضرت خدیجہ کے مکان پر گئے،حضرت خدیجہ نے بھی اپنے خاندان کے کچھ افراد کو بلا بھیجا تھا۔چنانچہ ان سب کی موجودگی میں ابو طالب نے خطبۂ نکاح یوں پڑھا:

”سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہمیں آلِ ابراہیم (علیہ السلام) اور حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی نسلِ سعد اور مضر کے عنصر سے پیدا کیا،اپنے گھر کا رکھوالا اور اپنے حرم کا نگہبان بنایا،ہمیں اس نے وہ گھر عنایت فرمایا جس کا حج کیا جاتا ہے اور جو امن وسلامتی کا مرکز ہے۔ہم اس کا شکر ادا کرتے ہیں،جس نے ہم لوگوں کو یہ فضیلت دی ہے۔اے لوگو! میرے بھتیجے محمد بن عبداللہ سے کون واقف نہیں ہے۔بے شک ان کے پاس مال نہیں ہے مگر مال تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے اور ایک عارضی چیز ہے۔اے حاضرین! تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کو جانتے ہو۔وہ خویلد کی بیٹی خدیجہ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں اور میرے مال میں سے بیس اونٹ مہر

[1] والد کی طرف سے ان کا نسب یہ ہے:خديجة بنت خويلد بن اسد بن عبدالعزىٰ بن قصي۔والدہ کی طرف سے نسب یہ ہے:خديجة بنت فاطمه بنت زائده بن اصم (جندب) بن هدم بن رواحه بن حجر بن عبد بن معيص بن عامر بن لُؤَيّ۔ (اسد الغابة: ٧/ ٨٠، ط العلمية)

مقرر کرتے ہیں۔ اللہ کی قسم! میرا بھتیجا بڑی شان اور بزرگی والا ہے۔"

عمرو بن اسد کے مشورے سے پانچ سو طلائی درہم مہر مقرر ہوا۔ اس طرح خدیجہ بنت خویلد زوجۂ رسول بن کر پوری اُمتِ مسلمہ کی قابلِ تعظیم ماں بن گئیں، اس وقت رسول اللہ ﷺ ۲۵ برس کے تھے جبکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر مشہور قول کے مطابق چالیس سال تھی۔[1]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے سب سے پہلے حضور ﷺ کی تصدیق کی، آپ کو تسلی دی اور اسلام کی خاطر اپنی دولت وقف کر دی۔ وہ مکی دور کی ان تمام صعوبتوں میں آپ کے ساتھ شریک رہیں جنہیں جھیلنے کے لیے پہاڑ کا جگر درکار تھا۔[2] اسی لیے حضور ﷺ انہیں اُمت کی سب سے افضل خاتون فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"خَيْرُ نِسَائِهَا خَدِيْجَةُ بِنْتِ خُوَيْلِد" (امت کی بہترین عورت خدیجہ ہیں۔)[3]

ایک بار جب وہ حضور ﷺ کے لیے کھانا لے جا رہی تھیں، جبریل علیہ السلام انہیں انسانی شکل میں ملے تھے۔ بعد میں جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ انہیں جنت میں ایک محل کی بشارت دیجیے۔[4]

حضور ﷺ کے ایک بیٹے ابراہیم کے سوا باقی سب اولاد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوئی۔ آپ ﷺ نے ان کے ہوتے ہوئے کسی اور عورت سے نکاح نہیں کیا۔ رمضان ۱۰ نبوی میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوگئی۔ عمر ۶۰ یا ۶۵ برس تھی جبکہ اس وقت حضور اکرم ﷺ ۴۹ برس کے ہو چکے تھے۔ اس سانحے سے حضور ﷺ اس قدر غمگین ہوئے کہ صحت گرنے لگی۔[5] بعد میں بھی حضور ﷺ اپنی اس غم گسار اہلیہ کو یاد کیا کرتے تھے۔ کسی دن گھر میں کھانے پینے میں وسعت نصیب ہو جاتی تو خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں کے گھر کھانا بھیجتے۔[6]

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں: "مجھے رسول اللہ ﷺ کی ازواج میں کسی پر اتنا رشک نہیں آیا جتنا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ انہیں بہت یاد کرتے تھے۔"[7]

حضور ﷺ ان کی اسلام کے لیے قربانیوں کا ذکر کرتے تھے اور فرماتے تھے: "مجھے ان جیسی کوئی اور نہیں ملی۔ انہوں نے اس وقت اسلام قبول کیا جب لوگ کفر پر ڈٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس وقت میری تصدیق کی جب لوگ مجھے جھٹلا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے مال سے مجھے فائدہ پہنچایا جب لوگوں نے اپنے مال سے مجھے محروم رکھا۔ اللہ نے انہی سے مجھے اولاد عطا کی، کسی اور زوجہ سے نہیں۔"[8]

رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاها

① طبقات ابن سعد: ۱۳۲/۱ ط صادر ...... ایک قول کے مطابق حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر تیس یا ۳۵ سال تھی (السیرۃ الحلبیۃ: ۲۰۲/۱، ط العلمیۃ؛ تاریخ الخمیس: ۲۶۴/۱، ط دار صادر) بعض علماء نے ان کی بکثرت اولاد کو دیکھتے ہوئے اسی کو راجح قرار دیا ہے کیوں کہ عموماً چالیس سال کے بعد اولاد کم ہوتی ہے۔

② الاصابة: ۱۰۰/۸ ③ صحیح مسلم، ح: ۶۴۲۲، کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل خديجة رضی اللہ عنہا، ط دار الجیل

④ صحیح مسلم، ح: ۶۴۲۶، کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل خديجة رضی اللہ عنہا، ط دار الجیل

⑤ الاصابة: ۱۰۳/۸، دلائل النبوة للبیهقی: ۳۵۳/۲، ۳۵۴، ط العلمیة

⑥ صحیح مسلم، ح: ۶۴۳۰، ۶۴۳۱، کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل خديجة رضی اللہ عنہا، ط دار الجیل

⑦ صحیح البخاری، ح: ۳۸۱۷، باب تزویج النبی ﷺ خديجة رضی اللہ عنہا ⑧ اسد الغابة: ۸۰/۷، تر: خديجة رضی اللہ عنہا، ط العلمیة

اُم المؤمنین حضرت سَودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا

حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا کا تعلق قریش کی شاخ بنو عامر سے تھا۔[1] وہ پہلے سکران بن عمرو رضی اللہ عنہ نامی ایک صحابی کے نکاح میں تھیں۔ان کی وفات ہوگئی۔ادھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی رحلت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایک رفیقہ حیات کی ضرورت تھی۔عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی اہلیہ خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا نے ایک دن حاضر ہوکر عرض کیا:

''آپ کو ایک غم خوار ساتھی کی ضرورت ہے!!''

آپ نے فرمایا:''ہاں! گھر بار کا انتظام اور بچوں کی دیکھ بھال سب کچھ خدیجہ نے سنبھال رکھا تھا۔''

خولہ رضی اللہ عنہا یہ سن کر سَودہ رضی اللہ عنہا کے ہاں گئیں اور ان کے والدین سے رشتے کی بات کرلی۔

ہجرت سے تین سال قبل ان سے نکاح ہوا اور مکہ ہی میں رخصتی ہوئی۔یہ رمضان ۱۰ نبوی کا واقعہ ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کی بڑی تعریف کرتی تھیں اور فرماتی تھیں:

''مجھے ان کے سوا کسی کے بارے میں یہ پسند نہیں کہ اس کے قالب میں میری جان ہوتی۔''

وہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑی محبت کرتی تھیں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری سالوں میں انہوں نے اپنی باری کا دن عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امہات المؤمنین کو حجۃ الوداع میں نصیحت فرمائی تھی کہ میرے بعد گھروں میں بیٹھنا۔حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا نے اس ارشاد پر اتنی سختی سے عمل کیا کہ عمر بھر پھر حج یا عمرے کے لیے بھی نہیں نکلیں۔گھر ہی میں بیٹھی رہتیں تھیں۔فرماتی تھیں:''حج و عمرہ کرچکی ہوں۔اب اللہ کے حکم کے مطابق گھر ہی میں رہوں گی۔''

خودداری کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہاتھ کی کمائی استعمال کرتیں۔طائف سے دباغت کے لیے کھالیں آتیں،انہیں دباغت دے کر فروخت کرتیں اور آمدن کا بڑا حصہ صدقہ کردیتیں۔کوئی ہدیہ ملتا تو وہ بھی راہِ خدا میں دے دیتیں۔

طبیعت میں مزاح بھی تھا۔ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دراہم کی تھیلی بھیجی۔حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا نے لانے والے سے پوچھا:''اس میں کیا ہے؟''اس نے کہا:''درہم''

فرمایا:''دیکھنے میں تو کھجور کی تھیلی جیسی لگتی ہے!''

پھر وہ تمام درہم لوگوں میں بانٹ دیے۔

---

① انہیں ''سودہ'' بھی پڑھا جاتا ہے۔والد کی طرف سے نسب یہ ہے: سودة بنت زمعة بن قيس بن عبد شمس بن عبدود بن نصر بن مالك بن حسل بن عامر بن لؤي۔
والدہ کی طرف سے نسب یہ ہے: سودہ بنت شموس بنت قیس بن زید بن عمرو بن لبيد بن خداش بن عامر بن غنم بن عدي بن النجار (اسد الغابة، تر: سودة بنت زمعة رضی اللہ عنہا)

اپنی باتوں سے رسول اللہ ﷺ کو ہنسا دیا کرتی تھیں۔ ایک بار نوافل میں وہ آپ ﷺ کے پیچھے کھڑی تھیں۔ بعد میں کہنے لگیں: ''رکوع اتنا طویل تھا کہ مجھے لگا میری نکسیر پھوٹ پڑے گی۔ اس لیے میں اپنی ناک پکڑے رہی۔''

آپ ﷺ یہ سن کر ہنس دیے۔ ①

کبھی رسول اللہ ﷺ ان کی خوش طبعی کو سنجیدہ حقائق کی طرف موڑ دیا کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے عرض کیا:

''اللہ کے رسول! اگر ہم مرجائیں تو آپ سے پہلے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ ہمارا جنازہ پڑھادیں گے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''زمعہ کی بیٹی! اگر تم موت کی حقیقت جان لیتیں تو پتا چل جاتا کہ وہ تمہارے اندازے سے کہیں زیادہ سخت چیز ہے۔'' ②

وفات دورِ خلافتِ فاروقی کے اواخر میں ۲۳ ہجری میں ہوئی۔ ایک قول ۵۴ھ کا ہے مگر اس کی توثیق نہیں ہوسکی۔ ③

رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاها

☆☆☆

① الاصابة: ۸/۱۹۷، ۱۹۸

② الزھد والرقائق لعبداللہ بن المبارک، ح: ۲۵۰

③ اسد الغابة: ۷/۱۵۷

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں۔ والدہ کا نام اُمّ رومان بنت عامر تھا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی اہلیہ خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا آپ مزید نکاح نہیں کریں گے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا "کس سے؟"

حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "کنواریوں میں عائشہ ہیں اور بیوگان میں سودہ بنت زمعہ"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سے رشتے کی بات کرنے کی اجازت دی، چنانچہ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کی وساطت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سے نکاح فرمایا۔[1]

اس نکاح کا حکم اللہ کی طرف سے ملا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے بعد اُمّ المؤمنین سے فرمایا:

"اُرِیتُکِ فِی الْمَنَامِ ثَلٰثَ لَیَالٍ جَاءَ نِیْ بِکِ الْمَلَکُ فِیْ سَرَقَۃٍ مِنْ حَرِیْرٍ یَقُوْلُ ھٰذِہٖ اِمْرَاَتُکَ."

"تم مجھے تین رات تک خواب میں دکھائی جاتی رہیں، ایک فرشتہ سفید ریشمی کپڑے پر تمہاری تصویر لاتا تھا اور کہتا تھا: یہ آپ کی اہلیہ ہیں۔"[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ہجرت سے تین برس قبل ہوا اور رخصتی غزوہ بدر کے فوراً بعد شوال ۲ھ میں ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی کنیت آپ کے بھانجے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نام پر اُمّ عبداللہ تجویز فرمائی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نو سالوں میں اس قدر فیض حاصل کیا کہ علم و فقاہت کا پیکر بن گئیں۔

صحابہ کرام فرمایا کرتے تھے: "ہمیں کسی مسئلے میں شک ہوتا تھا تو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس کا علم پاتے تھے۔"

یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے صحابہ اور تابعین آپ رضی اللہ عنہا کے شاگرد تھے۔[3]

آپ رضی اللہ عنہا کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

"فَضْلُ عَائِشَۃَ عَلَی النِّسَاءِ کَفَضْلِ الثَّرِیْدِ عَلٰی سَائِرِ الطَّعَامِ."

"عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت تمام خواتین پر ایسی ہے جیسے ثرید کی تمام کھانوں پر۔"[4]

حضرت جبرئیل امین علیہ السلام وحی لے کر نازل ہوتے تو انہیں سلام عرض کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے:

"یَاعَائِشُ ھٰذَا جِبْرِیْلُ یَقْرَءُ عَلَیْکِ السَّلَامَ."

"اے عائشہ! یہ جبرئیل ہیں، آپ کو سلام کہہ رہے ہیں۔"

---

[1] اسد الغابۃ: ۱۸۶/۷ ط العلمیۃ [2] صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابۃ، باب فی فضل عائشۃ رضی اللہ عنہا
[3] صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابۃ، باب فی فضل عائشۃ رضی اللہ عنہا [4] صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابۃ، باب فی فضل عائشۃ رضی اللہ عنہا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتیں: ”وَعَلَيْهِ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ“ (ان پر بھی سلام اور اللہ کی رحمت ہو۔)[1]

اُمّ المؤمنین رضی اللہ عنہا پورے عالم اسلام کی ماں اور علمی و روحانی سرپرست تھیں۔ پوری اُمّتِ مُسلمہ میں آپ سے بڑھ کر عالمہ فاضلہ خاتون کوئی نہ تھی۔ ریاضی اور علم میراث میں ایسا ملکہ حاصل تھا کہ صحابہ اور تابعین میراث کے مسائل پوچھنے آپ کے پاس آتے تھے۔ عروہ بن زبیر فرماتے ہیں کہ میں نے فقہ، طب اور شعر میں اُمّ المؤمنین سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔[2] آپ نے تفسیر و حدیث کی تعلیم براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی۔ شعر اور نسب کا علم اپنے والد بزرگوار سے سیکھا تھا۔[3] آپ سے کم و بیش اڑھائی ہزار احادیث منقول ہیں۔[4]

آپ بہترین طبیبہ بھی تھیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیرونی مہمانوں میں سے جو کوئی بیمار ہوتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے علاج کی فکر ہوتی۔ اُمّ المؤمنین کا حافظہ بہت تیز تھا۔ اس بیماری اور دوا کی معلومات لے کر فوراً یاد کر لیتیں۔ اس طرح آپ حاذق طبیبہ بن گئیں۔[5]

زہد و سخاوت میں آپ اپنی مثال آپ تھیں۔ ہزاروں دراہم و دینار صبح آتے اور شام تک غریبوں مسکینوں میں تقسیم ہو جاتے۔ ایک بار کہیں سے ایک لاکھ دراہم کا ہدیہ آیا، شام تک سب صدقہ کر دیے، خود روزے سے تھیں، مگر خیال تک نہ آیا۔ کسی خاتون نے کہا: ”شام کو افطار کے لیے ایک درہم ہی بچا لیا ہوتا، گوشت سے افطار کر لیتیں۔“ فرمایا: ”تم ہی اس وقت یاد دلاتیں تو بات تھی۔“[6]

فصاحت و بلاغت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے سخن دان ان کا کلام سن کر اقرار کرتے تھے کہ روئے زمین پر ان سے بڑھ کر فصیح و بلیغ ہستی کوئی اور نہیں تھی۔[7]

۵۸ھ میں ام المؤمنین بیمار ہوئیں اور ۱۷ رمضان کی شب دنیائے فانی سے رحلت فرما گئیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نمازِ تراویح کے بعد نمازِ جنازہ پڑھائی۔[8]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کئی ایسی خصوصیات ہیں جو کسی اور صحابیہ کو حاصل نہیں مثلاً:

① وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چہیتی بیوی اور سب سے محبوب رفیق کی صاحبزادی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

① صحیح مسلم، ح: ۲۴۵۴، ط دار الجیل ؛ سنن ابی داؤد، ح: ۵۲۳۲ ؛ سنن الترمذی، ح: ۳۸۸۶

② الاصابۃ: ۸/۲۳۳

③ ”هذه القرآن تلقيته عن رسول الله ﷺ وكذلك الحلال والحرام وهذا الشعر والنسب والاخبار سمعتها من ابيك“ (سیر اعلام النبلاء: ۲/۱۹۷)

④ ان کی ۲۴۰۳ احادیث امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں جمع کر دی ہیں۔ دیکھیے: مسند احمد، ح: ۲۴۰۱۰ تا ۲۶۴۱۳

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۲/۱۸۲، ۱۸۳، ط الرسالۃ

⑥ سیر اعلام النبلاء: ۲/۱۸۶، ۱۸۷

⑦ سیر اعلام النبلاء: ۲/۱۹۱، ط الرسالۃ

⑧ سیر اعلام النبلاء: ۲/۱۹۲

اس کا برملا اظہار فرماتے تھے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ آپ کو سب سے زیادہ پیارا کون ہے؟ تو فرمایا: ''عائشہ۔'' انہوں نے پوچھا: ''اور مردوں میں؟'' فرمایا: ''اس کے والد۔''[1]

② رسول اللہ ﷺ نے آپ رضی اللہ عنہا کے سوا کسی کنواری لڑکی سے شادی نہیں کی۔

③ وفات کے وقت حضور ﷺ کا سر مبارک آپ رضی اللہ عنہا کی آغوش میں تھا۔

④ حجرۂ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہی میں نبی ﷺ کو دفن کیا گیا۔

⑤ نبی ﷺ پر اس وقت بھی وحی نازل ہوتی تھی جب کہ آپ ﷺ عائشہ رضی اللہ عنہا کے لحاف میں ہوتے تھے۔ باقی ازواج کو یہ اعزاز حاصل نہیں تھا۔

⑥ آپ رضی اللہ عنہا کی پاک دامنی کے بارے میں آیاتِ قرآنی نازل ہوئیں جن کی تلاوت تا قیامت کی جاتی رہے گی۔ سلف صالحین کا کہنا ہے کہ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اور کوئی فضیلت نہ بھی ہوتی جب بھی واقعۂ اِفک میں جس طرح قرآن حکیم نے ان کی برأت بیان فرمائی وہ ان کی فضیلت اور علوِ مرتبہ کی ناقابلِ تردید دلیل ہے۔

⑦ ایک سفر میں آپ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہوا تو اس کی تلاش کے دوران صبح کی نماز کا وقت ہو گیا۔ وہاں پانی نہیں تھا، اللہ نے وحی بھیج کر تیمم کا طریقہ بتا دیا۔ اُمت کے لیے تیمم کی آسانی اُمّ المؤمنین کی تا قیامت باقی رہنے والی برکت ہے۔

⑧ آپ رضی اللہ عنہا ان چھ، سات صحابہ میں سے ایک ہیں جن سے بکثرت احادیث منقول ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہا کی روایت کردہ احادیث کی تعداد دو ہزار چار سو تین (۲۴۰۳) ہیں۔

⑨ آپ رضی اللہ عنہا کے علمی کمالات تمام صحابیات اور بیشتر صحابہ سے بڑھ کر ہیں۔ بڑے بڑے صحابہ اختلافی مسائل میں آپ سے استفادہ کرتے تھے۔ حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا افقہ الناس اور احسن الرائی خاتون تھیں۔''[2]

رضی اللہ تعالیٰ عنها وارضاها

☆☆☆

---

① صحیح البخاری، ح: ۳٦٦٢، کتاب المناقب، باب لو کنت متخذاً خلیلاً

② اسد الغابة: ۱۸٦/۷ ط العلمیة

اُم المؤمنین کا پدری نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات کے ضمن میں آ چکا ہے۔

والدہ کی طرف سے نسب یہ ہے: عائشہ بنت اُمّ رومان بنت عامر بن عویمر بن عبد شمس بن عتاب بن اذینہ بن سبیع بن دھمان بن حارث بن غنم بن مالک بن کنانة

اُم المؤمنین حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا

اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حقیقی بہن تھیں۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا چھ سال بڑی تھیں۔ دونوں کی والدہ حضرت زینب بنت مظعون رضی اللہ عنہا ہیں۔ [1]

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی ولادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت سے پانچ سال پہلے اس وقت ہوئی جب قریش خانہ کعبہ کی ازسرِنو تعمیر میں مشغول تھے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سنِ شعور کو پہنچیں تو ان کے والدِ ماجد حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہو چکے تھے۔ اس طرح حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے نہایت پاکیزہ ماحول میں تربیت پائی۔ [2]

آپ بڑی فصیح و بلیغ، ادبی ذوق کی حامل اور نہایت عالمہ فاضلہ اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ قرآن مجید کی حافظ تھیں۔ پہلے خُنیس بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی ساتھیوں میں سے تھے۔ (یہ مُسَیلِمہ کذاب کے ہاتھوں شہید ہونے والے عبداللہ بن حُذافہ رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔)

خُنیس بن حُذافہ رضی اللہ عنہ نے پہلے حبشہ ہجرت فرمائی پھر مکہ لوٹ آئے۔ پھر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ہمراہ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا شرف پایا۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے اور زخمی ہو کر کچھ عرصہ بعد خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ انہیں جنت البقیع میں حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ اس طرح حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نوجوانی میں بیوہ ہو گئیں، انہیں شوہر سے جدائی کا بے حد قلق تھا، مگر صبر کا دامن نہ چھوڑا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے پاس تشریف لا کر دلجوئی کرتے رہے۔ [3]

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی عدت پوری ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بیٹی کا گھر بسانے کی فکر ہوئی اور مناسب کسی رشتے کی تلاش شروع کر دی۔ پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خیال آیا کہ ان کی اہلیہ حضرت رُقیّہ رضی اللہ عنہا کچھ دنوں پہلے فوت ہوئی تھیں۔ مگر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے رشتے کی بات کی تو انہوں نے معذرت کی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رشتہ پیش کیا۔ انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان حضرات کی عدمِ دلچسپی اچھی نہ لگی اور دل میں ناراض ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک معاملہ پہنچا تو فرمایا: ”گھبراؤ نہیں، عثمان کو حفصہ سے بہتر بیوی مل جائے گی اور حفصہ کو عثمان سے بہتر خاوند مل جائے گا۔“

---

① الاستیعاب: ۴/۱۸۱۱۔ والد کی طرف سے سلسلہ نسب یہ ہے:
حفصہ بنت عمر بن الخطاب بن نفیل بن عبدالعزی بن ریاح بن عبداللہ بن قرط بن زراح بن عدی بن کعب بن لؤی......
والدہ کی طرف سے سلسلہ نسب یہ ہے۔ حفصہ بنت زینب بنت مَظعُون بن وَہب بن حُذافہ (اسد الغابۃ، تر: حفصۃ بنت عمر رضی اللہ عنہا)

② سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۲۷، ط الرسالۃ۔ الاعلام للزرکلی: ۲/۲۶۴

③ الاستیعاب: ۴/۱۸۱۱ ط دار الجیل

کچھ دنوں بعد نبی اکرم ﷺ نے خود حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا ارادہ ظاہر کیا اور یہ مبارک نکاح [illegible]
ہجرت کے تیسرے سال کا واقعہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کا مہر چار سو درہم مقرر فرمایا۔ اس وقت [illegible]
تھی۔ نکاح کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کہا:

''جب تم نے حفصہ کا رشتہ پیش کیا اور میں نے جواب نہ دیا تو شاید تم ناراض ہوئے تھے۔''

وہ بولے: ''ہاں بالکل''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ان (ت [illegible]
کرتے سنا تھا۔ میں آپ ﷺ کا راز ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ (اس لیے تمہاری پیش کش پر میں خاموش رہا) [illegible]
ان سے رشتہ نہ کرتے تو میں یہ پیش کش قبول کر لیتا۔''[1]

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ان پانچ امہات المؤمنین میں سے ایک تھیں جنہیں قریشی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یعنی حضرت سودہ، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت اُمّ حبیبہ، حضرت اُمّ سلمہ۔ رضی اللہ عنہن

عبادت و ریاضت میں بھی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بلند درجہ رکھتی تھیں، صوم و صلوٰۃ کی کثرت کا یہ حال تھا کہ خود حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا: ''اِنَّھَا صَوَّامَۃٌ قَوَّامَۃٌ ''(بے شک یہ بہت روزے رکھنے والی، بڑی تہجد گزار خاتون ہیں۔)

آنحضرت ﷺ کی رضامندی اور قرب کے لیے کوشاں رہتی تھیں، خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں، اپنے والد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی راحت رسانی کا بھی پورا خیال کرتی تھیں۔[2]

لکھنے پڑھنے کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں۔ علومِ قرآن وسنت سے وافر حصہ ملا تھا، تقریباً ساٹھ روایاتِ حدیث آپ سے منقول ہیں جو آپ کے علمی ذوق کی دلیل ہیں۔

آپ رضی اللہ عنہا کی ذہانت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''ان شاء اللہ تعالیٰ ان لوگوں میں سے کوئی بھی دوزخ میں نہ جائے گا جنہوں نے غزوہ بدر میں شرکت کی اور حدیبیہ کے موقع پر درخت کے نیچے مجھ سے بیعت کی۔''

یہ سن کر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُھَا

(تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کا اس جہنم پر سے گزر نہ ہو۔)

حضور ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ یہ بھی تو فرماتے ہیں:

ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا.[3]

(پھر ہم پرہیزگاروں کو نجات دیں گے اور ظالموں کو اس حال میں پڑا رہنے دیں گے کہ

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۴۰۰۵، کتاب المغازی، باب شهود الملائكة بدرا؛ اسد الغابة: ترجمة حفصة بنت عمر رضی اللہ عنہا
[2] اسد الغابة: ۶۷/۷ ط العلمية [3] حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اور حضور ﷺ کے سوال وجواب میں مذکورآیات سورۂ مریم: کی آیات (۷۱، ۷۲) ہیں۔

وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔“ [1]

آنحضرت ﷺ نے ایک مرتبہ کسی وجہ سے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو ایک طلاق دے دی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بے حد دکھ ہوا کہ وہ ایک عظیم سعادت سے محروم ہو گئے۔

آخر حضور ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: مجھے جبریل امین نے کہا ہے: ”حفصہ کی طلاق سے رجوع فرمالیجیے کیونکہ وہ بہت روزے رکھنے والی، عبادت گزار اور پرہیزگار خاتون ہیں اور جنت میں بھی آپ کی بیوی ہوں گی۔“ [2]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں: ”ازواجِ مطہرات میں سے وہی میری برابری کیا کرتی تھیں۔“ [3]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مشورے پر جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید جمع کرنے کا فیصلہ کیا تو امہات المومنین میں سے حفاظتِ قرآن کے لیے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا انتخاب فرمایا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کا صحیفہ تیار کیا۔ یہ صحیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس رہا۔ پھر ان کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس آ گیا۔ انہوں نے اس کی حفاظت حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے سپرد کی۔ یہ نسخہ تقریباً پندرہ سال تک انہی کے پاس محفوظ رہا۔ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس کی عام اشاعت کی ضرورت پیش آئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے وہی صحیفہ قرآنی طلب فرمایا، اس کی نقول تیار کرا کے پھر انہی کو واپس کر دیا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے بعد یہ قرآن مجید میرے بھائی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حفاظت میں دے دیا جائے۔ اس طرح حفاظتِ قرآن مجید میں آپ کا بہت بڑا کردار ہے۔ [4]

اپنے والد کی طرح طبیعت میں دلیری اور جرأت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لیے کسی سے دبتی نہ تھیں۔ عمر بھر نفلی روزوں کا اہتمام کرتی رہیں۔ انتقال ہوا تو ان ایام میں بھی مسلسل روزے رکھ رہی تھیں۔ [5]

سخاوت کا یہ حال تھا کہ والد سے انہیں میراث میں غابہ کی کچھ زمین ملی تھی، وفات سے پہلے وہ بھی صدقہ کر دی۔

وفات صحیح قول کے مطابق ۴۵ ہجری میں ہوئی۔ ایک قول ۲۷ھ کا ہے جو خلافِ تحقیق ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا کی نماز جنازہ مدینہ کے گورنر مروان نے پڑھائی، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی نمازِ جنازہ میں شریک تھے۔ جنت البقیع میں تدفین ہوئی۔ بھائیوں میں سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور عاصم نے جبکہ بھتیجوں میں سے حضرت سالم، حضرت حمزہ اور حضرت عبداللہ رحمہم اللہ نے لحد میں اتارا۔ [6]

رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاھا

---

[1] مسند احمد، ح: ۲۶۴۴۰

[2] الآحاد والمثانی لابن ابی عاصم، ح: ۳۰۵۲، ط دار الرایۃ ریاض

[3] سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۲۷، ط الرسالۃ

[4] الکامل فی التاریخ: ۲/۴۸۲

[5] ”ما ماتت حفصۃ حتیٰ ما تفطر“ (الاصابۃ: ۸/۸۲ ط دار صادر)

[6] طبقات ابن سعد: ۸/۸۶ ط صادر۔ سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۲۹ ط الرسالۃ

ہند بنت ابی اُمیّہ، اُم المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کا اصل نام ہند تھا۔ ان کے والد ابواُمیّہ مکہ کے مشہور رئیس اور سخی تھے۔ سفر میں جاتے تو تمام قافلے کی کفالت خود کرتے۔ ان کی آغوشِ محبت میں حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے نہایت ناز و نعمت کے ساتھ پرورش پائی۔ مشہور صحابی عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ان کے رضاعی بھائی تھے۔[1]

اپنے شوہر کے ساتھ بالکل ابتدائی زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ ان کے شوہر عبداللہ بن عبدالاسد اپنی کنیت ابوسلمہ سے مشہور تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی اور زبردست شہ سوار تھے۔ قریش کی ستم رانیوں سے تنگ آکر میاں بیوی نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ کچھ مدت بعد دونوں واپس مکہ آگئے۔[2] اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کبھی کبھار حبشہ کے ان ایام کو یاد کرتی تھیں اور بتاتی تھیں کہ وہاں نصرانیوں کے چرچ "ماریہ" میں تصاویر اور مجسمے ہوا کرتے تھے۔[3]

ان کی ہجرتِ مدینہ کا واقعہ بڑا دردناک ہے۔ جب مسلمانوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا بھی اپنے شوہر اور شیرخوار بیٹے سلمہ کے ساتھ مکہ سے نکلیں۔ ان کے گھر والوں نے تعاقب کر کے روک لیا۔ ان کے شوہر مجبوراً انہیں اور بچے کو چھوڑ کر تنہا مدینہ چلے گئے۔ ادھر ان کے سسرال والے آگئے اور بچے کو ان سے چھین کر لے گئے۔

یہ بہت نرم دل، غیور اور حساس تھیں، شوہر اور بچے کی جدائی میں روزانہ ویرانوں کی طرف نکل جاتیں اور زار و قطار رویا کرتیں۔ ان کے گھر والوں کو کوئی احساس نہ ہوا مگر کچھ لوگوں نے ان کی گریہ وزاری سے متاثر ہو کر ان کے گھر والوں کو عار دلائی۔ آخر برادری والوں نے بچہ ان کے حوالے کر کے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ ان کی ہمت کا یہ عالم تھا کہ اونٹ پر سوار ہو کر اس طویل راستے پر تنہا ہی نکل کھڑی ہوئیں۔ خوش قسمتی سے راستے میں کعبہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ مل گئے جو ابھی مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے مگر نہایت غیرت مند انسان تھے۔ انہوں نے منزل بمنزل ساتھ چل کر انہیں مدینہ کے سامنے چھوڑ دیا۔ چونکہ ان کے گھرانے کی دولت و ثروت مشہور تھی اس لیے اہلِ مدینہ کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ واقعی ابواُمیّہ کی بیٹی ہیں جو اتنا تکلیف دہ سفر طے کر کے آئی ہیں۔

مدینہ منورہ میں کچھ مدت شوہر کا ساتھ نصیب رہا۔ زوجین میں مثالی محبت تھی۔ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ بدر اور احد کی جنگوں میں شریک رہے۔ اس دوران لگنے والے بعض زخم بگڑ گئے، انہی دنوں ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر سے کہا: "سنا ہے کہ اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے مرنے کے بعد دوسرا نکاح نہ کرے اور شوہر جنتی ہو تو اللہ دونوں کو جنت میں جمع کر دیں گے۔ تو آؤ طے کریں کہ نہ تم میرے بعد کوئی نکاح کرو گے، نہ میں تمہارے بعد کوئی نکاح کروں گی۔"

---

[1] پدری شجرہ نسب یہ ہے: ہند بنت ابی اُمیّہ بن مُغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم۔
والدہ کی طرف سے نسب یہ ہے: ہند بنت عاتکہ بنت عامر بن ربیعہ بن مالک بن جذیمہ بن علقمہ (اسد الغابۃ، ترجمۃ اُمّ سلمۃ رضی اللہ عنہا)

[2] سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۰۲، ط الرسالۃ

[3] صحیح البخاری، ح: ۴۳۴، کتاب الصلوۃ، باب الصلوۃ فی البیعۃ

ابوسَلَمہ رضی اللہ عنہ بولے: ''تم میری بات مانو گی؟'' بولیں: ''ہاں ضرور''

وہ بولے: دیکھو! اگر میں پہلے مر گیا تو تم ضرور دوسرا نکاح کر لینا۔''

یہ کہہ کر انہوں نے دعا کی: ''الٰہی! میرے بعد اُمّ سَلَمہ کو مجھ سے بہتر آدمی عطا کر جو نہ اسے غمزدہ کرے نہ ستائے۔''

اُمّ سَلَمہ رضی اللہ عنہا سوچنے لگیں کہ بھلا ان سے بہتر کون مل سکتا ہے۔[1]

ابوسَلَمہ رضی اللہ عنہ نے انہیں یہ حدیث سنائی: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کسی کو مصیبت پہنچے تو وہ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھے اور دعا کرے: ''اَللّٰهُمَّ عِنْدَكَ اَحْتَسِبُ مُصِيْبَتِي فَأْجُرْنِي فِيهَا وَاَبْدِلْنِي خَيْرًا مِنْهَا''

(اے اللہ! میں نے اپنی مصیبت کا اجر تیرے پاس مانا ہے۔ مجھے اس کا اجر دے اور اس سے بہتر بدل عطا فرما۔)

کچھ دنوں بعد ابوسَلَمہ رضی اللہ عنہ پر حالتِ نزع طاری ہوگئی، وہ آخری لمحات میں یہ دعا کر رہے تھے:

''الٰہی میرے گھر والوں کو بہتر سہارا میسر فرما۔'' اس کے بعد وہ فوت ہو گئے۔[2]

ان کی وفات پر اُمّ سَلَمہ رضی اللہ عنہا غم سے بے حال ہو گئیں۔ حسرت و غم کے عالم میں منہ سے نکلا:

''افسوس پردیس میں موت آئی۔ میں ایسا نوحہ کروں گی کہ جسے یاد رکھا جائے گا''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو منع فرمایا اور صبر کی تلقین کی۔[3]

اُمّ سَلَمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کردہ دعا ''اَللّٰهُمَّ عِنْدَكَ اَحْتَسِبُ مُصِيْبَتِي فَأْجُرْنِي فِيهَا وَاَبْدِلْنِي خَيْرًا مِنْهَا'' پڑھنے لگیں، مگر اس کے آخری الفاظ پر انہیں ہمیشہ یہ خیال آتا کہ ابوسَلَمہ سے بہتر بھلا کون مل سکتا ہے۔[4] اُمّ سَلَمہ رضی اللہ عنہا اس وقت امید سے تھیں۔ دن پورے ہوئے تو وہ ایک بچی کی ماں بنیں۔[5]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۰۳، ط الرسالة. طبقات ابن سعد: ۸/۸۷، ط صادر

② مسند احمد، ح: ۲۶۶۶۹

③ صحیح مسلم، ح: ۲۱۷۳، کتاب الجنائز، باب البکاء علی المیت

④ سنن ابن ماجه، ح: ۱۵۹۸؛ مسند احمد، ح: ۲۶۶۶۹ ⑤ طبقات ابن سعد: ۸/۸۹ صادر

فائدہ: اس وقت اُمّ سَلَمہ رضی اللہ عنہا کے چار بچے تھے: سَلَمہ، عمر، زینب اور دُرّۃ۔ (سیر اعلام النبلاء: ۳/۴۰۷. ط الرسالة تحت عمر بن ابی سلمة) دونوں لڑکوں میں سے جو بڑا تھا، وہ نکاح میں اپنی والدہ کے لیے ولی بنا تھا۔ حافظ ابن حجر نے ابن اسحٰق کی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے اسے اہمیت کہا ہے کہ سَلَمہ سب سے بڑے تھے اور وہی نکاح میں ولی بنے تھے۔ (الاصابة: ۳/۱۲۶) مگر نسائی کی ایک روایت کے مطابق اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے عمر بن ابی سلمہ کو نکاح میں اپنا ولی بنایا تھا۔ فقالت لابنها: یا عمر قم فزوّج رسول اللہ ﷺ فزوجه (سنن نسائی مجتبیٰ، ح: ۳۲۲۵، کتاب النکاح، باب انکاح الابن لامه) شیخ البانی نے اس روایت پر ضعف کا حکم لگایا ہے۔ مگر جہاں تک راقم نے سند کو دیکھا ہے اس میں کوئی راوی ضعیف نہیں، ہاں ابن عمر (محمد بن عمر بن ابی سَلَمہ) ثقاہت کے ادنیٰ درجے پر یعنی مقبول ہیں۔ پس روایت کم از کم حسن ضرور ہے۔ ممکن ہے سَلَمہ ہی بڑے ہوں مگر نکاح چھوٹے بھائی یعنی عمر بن ابی سَلَمہ نے کرایا ہو۔ بہرکیف اس کے بعد عمر بن ابی سَلَمہ، رسول اللہ ﷺ کی پرورش میں رہے، آپ ﷺ انہیں کھانے پینے تک کے آداب بتاتے تھے کہ بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ، دائیں ہاتھ سے کھاؤ، اپنے سامنے سے کھاؤ۔ (صحیح مسلم، ح: ۵۳۸۸، کتاب الاشربة، باب آداب الطعام؛ سنن الترمذی، ح: ۱۸۵۸) اندازہ یہ ہے کہ وہ اس وقت قریب البلوغ ضرور تھے کیوں کہ حضور ﷺ کی حیات میں ہی (یعنی سات برس کے اندر) ان کا نکاح ہو گیا تھا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا کہ کیا روزہ دار بوسہ لے سکتا ہے۔ (صحیح مسلم، ح: ۲۶۴۴، کتاب الصیام، باب القبلة فی الصوم)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مدینہ سے عراق منتقل ہوتے ہوئے حضرت اُمّ سَلَمہ رضی اللہ عنہا سے درخواست کی تھی کہ وہ ساتھ تشریف لے چلیں، انہوں نے اپنی جگہ عمر بن ابی سَلَمہ کو بھیج دیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے طویل عمر پائی اور عبدالملک بن مروان کے دورِ خلافت میں ۸۳ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۳/۴۰۵، الرسالة)

کچھ مدت بعد جمادی الآخرۃ ۴ ہجری میں آپ ﷺ نے انہیں نکاح کا پیغام دیا۔ انہوں نے جواباً کہلوایا:

''میں بہت غیور ہوں، عمر بھی زیادہ ہو چکی ہے اور بال بچوں والی ہوں۔'' [1]

یہ عذر بھی پیش کیا: ''میرے بڑوں میں سے کوئی بھی یہاں نہیں ہے۔''

حضور ﷺ نے ان تمام چیزوں کے باوجود ان سے نکاح کرنا پسند فرمایا۔ بچوں کے بارے میں کہا کہ ان کی کفالت ہو جائے گی، عمر کے بارے میں فرمایا کہ میں بہر حال تم سے زیادہ عمر کا ہوں، بڑوں کے نہ ہونے کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ تمہارے بڑوں میں سے کسی کو بھی اس نکاح پر ناگواری نہیں ہوگی۔ چنانچہ یہ رضامند ہو گئیں اور نکاح ہو گیا۔ [2]

حضور ﷺ نے انہیں دو چکیاں، ایک مٹکا اور کھجور کی چھال سے بھرا ایک تکیہ دیا۔ یہی سامان باقی ازواج کو دیا گیا تھا۔ [3]

حضور ﷺ نے رخصتی کر کے انہیں ایک حجرے میں بھیج دیا، ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''میں نے دیکھا کہ وہاں ایک گھڑے میں تھوڑے سے جَو ہیں، ایک چکی ہے، ایک ہنڈیا ہے اور چربی کے تیل کی ایک کُپی ہے۔ میں نے جَو نکال کر انہیں چکی میں پیس ڈالا، پھر انہیں ہنڈیا پر چڑھا دیا اور تیل ملا کر سالن تیار کر لیا۔ یہ حضور اور ﷺ آپ کے گھر والوں کی شبِ زفاف کا کھانا تھا۔'' [4]

راویانِ حدیث یہ واقعہ سنا کر کہا کرتے تھے: ''عرب کے سردار کی بیٹی، رسولوں کے سردار کے نکاح میں آئی، رات کی ابتداء میں وہ دلہن تھیں اور آخرِ شب میں خود ہی چکی پیس رہی تھیں۔'' [5]

فہم و فراست میں وہ اپنی مثال آپ تھیں۔ صلح حدیبیہ کے سفر میں شریک تھیں۔ جب قریش سے مذاکرات میں طے ہوا کہ اس سال عمرہ نہیں کیا جائے گا تو حضور ﷺ نے صحابہ کرام کو احرام کھولنے، قربانی کرنے اور سر منڈوانے کا حکم دیا۔ چونکہ معاہدے کی شرائط بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھیں اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے حضرات بھی غم سے نڈھال تھے، عمرے سے محرومی کا دکھ مزید برآں تھا۔ اس لیے کسی نے پہل کرنے کی ہمت نہ کی۔

اُمّ سَلمہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا تو حضور ﷺ کو مشورہ دیا کہ آپ خود پہل کرتے ہوئے اپنا جانور ذبح کریں اور سر منڈوالیں۔ حضور ﷺ نے اس صائب مشورے پر عمل کیا۔ آپ کو دیکھ کر سب دیوانہ وار اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کی اتباع کر کے احرام کھول دیے۔ [6]

---

① المعجم الکبیر للطبرانی، ح: ۲۳/۲۲۷، ط مکتبۃ ابن تیمیہ قاھرہ

② سنن النسائی المجتبیٰ، ح: ۳۲۵۴، کتاب النکاح، باب انکاح الابن لامہ ؛ مسند احمد، ح: ۲۶۶۶۹، ۲۶۷۲۲

③ مسند احمد، ح: ۲۶۶۶۹

④ طبقات ابن سعد: ۸/۹۱، ط صادر

⑤ طبقات ابن سعد: ۸/۹۱

⑥ صحیح البخاری، ح: ۲۷۳۱، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد

احادیث یاد کرنے کا اتنا شوق تھا کہ ایک دن بالوں کی چوٹی بنوا رہی تھیں کہ مسجد نبوی سے حضور ﷺ کی آواز آئی: ''اے لوگو!!'' اُمّ المؤمنین فوراً کھڑی ہوگئیں اور کھڑے ہو کر پورا خطبہ سنتی رہیں۔ ①

علم کے اس ذوق وشوق کی وجہ سے وہ فقہاءِ صحابیات میں شمار ہونے لگیں۔ ② امہات المؤمنین میں علم وفضل کے لحاظ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بعد انہی کا درجہ تھا۔ خاص کر طہارت کے مسائل حضور ﷺ سے اکثر پوچھا کرتی تھیں۔ ان سے ۳۷۸ احادیث مروی ہیں ③ اور اکثر روایات صحت کے اعلیٰ درجے پر ہیں یعنی بخاری ومسلم دونوں میں موجود ہیں۔ صحابہ کرام اور تابعین ان سے مسائل پوچھا کرتے تھے۔ حاکمِ مدینہ مروان کارندہ بھیج کر ان سے مسائل معلوم کرتا اور کہتا: ''امہات المؤمنین کے ہوتے ہوئے ہم کسی اور سے مسائل کیوں پوچھیں۔'' ④

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ بھی بعض اوقات ان سے استفادہ کرتے تھے۔ ⑤ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اگر ان کے فتاویٰ جمع کیے جائیں تو ایک رسالہ تیار ہو جائے۔ ⑥

بہترین قاریہ اور خوش الحان تھیں۔ قرآن مجید کو حضور اکرم ﷺ کی طرزِ ادا پر پڑھ سکتی تھیں۔ کوئی پوچھتا کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح قراءت کرتے تھے تو اسی طرح تلاوت کر کے بتاتی تھیں۔ ⑦

حضور ﷺ سے محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک سفر میں حضرت بلال اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو حضور ﷺ کا استعمال کردہ پانی پیتے دیکھا تو پردے کے پیچھے سے آواز دی: ''اپنی ماں کے لیے بھی کچھ بچا دینا۔'' انہوں نے باقی پانی آپ کو بھیج دیا۔ ⑧

حضور ﷺ کے کچھ بال تبرک کے طور پر محفوظ کر لیے تھے۔ لوگوں کو ان کی زیارت کرایا کرتی تھیں۔ ⑨

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے تمام ازواجِ مطہرات کے بعد ۶۴ ہجری میں انتقال فرمایا۔ ⑩

ان کے بیٹوں عمر رضی اللہ عنہ اور سلمہ رضی اللہ عنہ نے قبر میں اتارا۔ ⑪

رضی اللّٰہ تعالٰی عنہا وارضاہا

---

① مسند احمد، ح: ۲۶۵۴۶ ② سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۰۳، ط الرسالۃ ③ سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۱۰، ط الرسالۃ

④ مسند احمد، ح: ۲۶۶۹۶ ⑤ مسند احمد، ح: ۲۶۵۸۶، ۲۵۶۷۳ ⑥ اعلام الموقعین: ۱/۱۰، ط العلمیۃ

⑦ مسند احمد، ح: ۲۶۵۸۳ ⑧ صحیح البخاری، ح: ۴۳۲۸، کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف

⑨ مسند احمد، ح: ۲۶۵۳۵ ⑩ الاصابۃ: ۸/۴۱۲..... اگرچہ ایک قول ۵۹ھ اور ایک ۶۱ھ کا بھی ہے مگر ۶۴ھ کا قول اس لیے راجح ہے کہ ۲۷ ذوالحجہ ۶۳ھ کو وقعہ حرہ ہوا، اس کے بعد تین دن تک مدینہ میں لوٹ مار ہوئی۔ پھر مسلم بن عقبہ نے محرم ۶۴ھ کے شروع میں اہلِ مدینہ سے جبری بیعت لی تو اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے اسے بیعتِ ضلالت قرار دیا۔ (الاصابۃ: ۴/۱۱، ط العلمیۃ) اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ۶۴ھ کے اوائل میں زندہ تھیں اور پھر اسی سال ان کی وفات ہوئی۔

⑪ طبقات ابن سعد: ۸/۹۶، ط صادر

نوٹ: طبقات کی اسی روایت کے مطابق ان کی عمر ۸۴ سال تھی۔ اس قول کے لحاظ سے ۴ ہجری میں رسول اللہ ﷺ سے نکاح کے وقت ان کی عمر ۲۴ سال ہوگی۔ مگر علامہ زرکلیؒ نے ان کی ولادت ہجرت سے ۲۸ سال قبل بتائی ہے۔ (الاعلام: ۸/۹۷) اس حساب سے نکاح کے وقت ان کی عمر ۳۲ سال ہوگی۔ حضور ﷺ کے پیغامِ نکاح کے جواب میں ان کا یہ کہنا کہ میری عمر زیادہ ہو چکی ہے، ظاہر کرتا ہے کہ یہی قول راجح ہے۔ ورنہ ۲۴ سال تو نکاح کے لیے بہت موزوں عمر ہے۔ اس دوسرے قول کے لحاظ سے وفات کے وقت ان کی عمر ۹۲ سال ہوگی۔

اُم المومنین حضرت زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کی بیٹی ہیں۔[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ پر غلامی کی چھاپ لگ چکی تھی اس لئے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو یہ رشتہ پسند نہ تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل میں اس وقت راضی ہو گئیں۔

تقریباً ایک سال تک وہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے نکاح میں رہیں مگر طبیعتوں میں میل نہ ہوا، مسلسل شکر رنجی رہنے لگی۔ آخر زید رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں دینے طلاق کا ارادہ ظاہر کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا بجھا کر روک دیا لیکن زوجین میں کسی طرح موافقت نہ ہوئی اور زید رضی اللہ عنہ نے آخر انہیں طلاق دے دی۔

چونکہ انہوں نے زید رضی اللہ عنہ سے نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر کیا تھا، اس لیے جب انہیں طلاق ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجا طور پر یہ سمجھا کہ ان کی جس قدر دل شکنی ہوئی ہے، اس کا ازالہ تبھی ہو سکتا ہے کہ خود ان سے نکاح کر لیا جائے۔ مگر رکاوٹ یہ تھی کہ اہلِ عرب منہ بولے بیٹے کو اصلی بیٹے کے برابر سمجھتے تھے۔ اس لئے خدشہ تھا کہ لوگ کہیں گے: بہو سے نکاح کر لیا۔ چونکہ یہ دورِ جاہلیت کی رسم تھی جس کا مٹانا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرضِ منصبی بھی تھا اس لئے درج ذیل آیتیں نازل ہوئیں:

﴿وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَتَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْھَا وَطَرًا زَوَّجْنٰکَھَا لِکَیْ لَا یَکُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِھِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْھُنَّ وَطَرًا وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا﴾[2]

''یاد کیجئے جب آپ کہہ رہے تھے اس شخص کو جس پر انعام کیا تھا اللہ نے اور جس پر کہ انعام کیا تھا آپ نے بھی کہ روکے رکھو اپنے پاس اپنی بیوی کو اور اللہ سے ڈرو۔ اور آپ اپنے جی میں وہ بات چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔ اور آپ لوگوں سے ڈر رہے تھے جبکہ اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس سے ڈریں۔ تو جب زید نے اس خاتون سے پوری کر لی اپنی غرض۔ تو ہم نے اس کا نکاح کرا دیا آپ کے ساتھ، تاکہ مومنوں پر کوئی تنگی نہ رہے ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے حوالے سے اور جو اللہ کا فیصلہ ہے وہ پورا ہونے والا ہے۔''

---

① ان کا پدری نسب یہ ہے: زینب بنت جحش بن رباب بن یعمر بن صبرۃ بن مرۃ بن کثیر بن غنم بن دودان بن اسد بن خزیمۃ۔ یہ خاندان بنو اسد کہلاتا تھا۔ والدہ کی طرف سے نسب یہ ہے: زینب بنت امیمۃ بنت عبدالمطّلب بن ھاشم۔ (اسد الغابۃ، ترجمۃ: زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا)

② سورۃ الاحزاب، آیت: ۳۷

چونکہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح کا حکم خود اللہ نے دیا تھا، اس لیے اس نکاح میں ان کی طرف سے کوئی سرپرست تھا اور نہ ہی الگ سے نکاح کی رسم انجام پائی تھی بلکہ اللہ کے ارشاد ''زَوَّجْنٰکَھَا'' (ہم نے آپ کا نکاح کرادیا ان سے) کے ساتھ عقدِ نکاح ہوگیا۔ یہ واقعہ ۵ھ کا ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۵ برس تھی۔ ①

اس طرح لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ منہ بولا بیٹا اصلی اولاد کا حکم نہیں رکھتا، اس کی بیوی طلاق ہوجانے کے بعد حرام نہیں ہوتی، جن لوگوں نے اس شرعاً حلال تعلق کو حرام مان رکھا تھا وہ حقیقت جان گئے اور جاہلیت کی یہ رسم ٹوٹ گئی۔ اس قدیم رسم کا ٹوٹنا تب ہی ممکن تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ایسا کرکے دکھاتے، اس لیے یہ نکاح اُمّت کے حق میں نہایت رحمت و برکت کا باعث بنا اور صدیوں کی ایک رسمِ بد سے انسانیت کو نجات ملی۔ ②

اس نکاح کے بارے میں بعض نامناسب روایات بھی مشہور ہیں جو نہایت ضعیف ہیں، بعض مؤرخین اور مفسرین نے انہیں بلاتنقید نقل کردیا ہے مگر محققین نے ان کی مدلل تردید کی ہے۔

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا میں کئی ایسی خوبیاں تھیں جو انہیں دیگر امہات المؤمنین سے ممتاز بناتی تھیں۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی اُمیمہ کی بیٹی تھیں، امہات المؤمنین میں سے کوئی اور اتنی قریبی رشتہ دار نہ تھی۔ ان کے نکاح کا حکم خود اللہ نے دیا تھا۔ ازواجِ مطہرات میں سے ہر ایک بارگاہِ رسالت کے زیادہ سے زیادہ قرب کی امیدوار رہتی تھی مگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بعد یہ دولت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کو سب سے بڑھ کر نصیب تھی اسی لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ وہ میری ہم پلہ تھیں۔

زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا بہت نیک و صالح، روزہ دار اور صابرہ شاکرہ خاتون تھیں۔ راتوں کو بیدار رہ کر تہجد پڑھا کرتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: ''اِنَّھَا اَوَّاھَۃٌ'' (بلاشبہ یہ آہ و بکا کی دولت سے مالا مال ہیں۔)

فیاضی اور سخاوت میں سب سے بڑھ کر تھیں۔ خود اپنے ہاتھ کی محنت سے کماتیں اور اللہ کی راہ میں صدقہ کردیتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا: ''تم میں سے جس کے ہاتھ زیادہ لمبے ہیں وہ سب سے پہلے مجھ سے آملے گی۔'' اُمہات المؤمنین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد ایک دوسرے کے ہاتھ ناپ کر دیکھا کرتی تھیں۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا قد و قامت میں طویل تھیں اس لیے انہی کے ہاتھ زیادہ لمبے تھے۔ خیال تھا کہ ان کا انتقال سب سے پہلے ہوگا۔ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا قد نسبتاً کم تھا اس لیے ان کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امہات المؤمنین میں سب سے پہلے انہی کا انتقال ہوا۔ یہ ۲۰ ہجری کا واقعہ ہے۔ تب سب کو معلوم ہوا کہ ارشادِ نبوی میں ہاتھوں کی طوالت سے ''سخاوت'' مراد تھی اور اس صفت میں بلاشبہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سب پر فوقیت رکھتی تھیں۔ ③

رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہا وارضاھا

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲/ ۲۱۱ تا ۲۱۷

② تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورۃ الاحزاب، آیت: ۳۷ ③ سیر اعلام النبلاء: ۲/ ۲۱۱ تا ۲۱۸

اُمّ المؤمنین رملہ بنت ابی سفیان، حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا

حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا قریش کے سردار حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی سگی بہن تھیں۔ اصل نام رملہ تھا مگر کنیت اُمّ حبیبہ کے ساتھ مشہور ہوئیں۔ رشتے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چچازاد لگتی تھیں۔ ابتدائے اسلام میں ایمان لائیں اور اپنے شوہر عبیداللہ بن جحش کے ساتھ حبشہ ہجرت کی۔ وہاں عبیداللہ بن جحش نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا۔ تاہم اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا اسلام پر قائم رہیں۔ [1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیارِ غیر میں ان کی بے کسی اور اسلام پر استقامت کا علم ہوا تو شاہِ حبشہ نجاشی کو پیغام بھیجا کہ ان سے رشتے کی بات کی جائے، اگر وہ راضی ہوں تو ان کا نکاح مجھ سے کرادیا جائے۔ حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اس سعادت کو بسر وچشم قبول کیا اور نجاشی نے وکیلِ بارگاہِ رسالت بن کر چار ہزار درہم مہر پر یہ نکاح کرادیا۔

نکاح کے کچھ دنوں بعد نجاشی نے اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کو شُرَحبیل بن حَسنہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ بھیج دیا۔ [2]

اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کی ایمانی غیرت کا یہ عالم تھا کہ ان کے والد ابوسفیان اسلام لانے سے پہلے ایک بار قریش کی طرف سے صلح کے سفیر بن کر مدینہ آئے۔ اس دوران بیٹی کے گھر بھی آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر بیٹھنے لگے تو اُمّ المؤمنین نے جلدی سے بستر لپیٹ دیا تاکہ والد اس پر نہ بیٹھ سکیں۔ ابوسفیان نے حیران ہوکر اس کی وجہ پوچھی تو بولیں:

''یہ بستر اللہ کے رسول کا ہے اور آپ ناپاک مشرک ہیں۔'' [3]

اُمّ المؤمنین کا مقام پانے کے علاوہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن ہونے کے باعث عالم اسلام میں ان کا غیر معمولی اثر ورسوخ تھا۔ تاہم انہوں نے نہایت سادہ اور منکسرانہ زندگی گزاری۔ ۴۴ھ میں وفات پائی۔ خداخوفی کا یہ حال تھا کہ آخری لمحات میں حضرت عائشہ اور حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کو الگ الگ بلا کر کہا:

''سوکن ہونے کے ناطے ہمارے بیچ حقوق میں جو کمی بیشی ہوئی ہو، دعا کرو اللہ اسے معاف فرمادے۔''

امہات المؤمنین نے پوری کشادہ دلی سے کہا: ''جو کچھ ہوا، اللہ معاف فرمائے۔'' تب ان کی تسلی ہوئی۔ [4]

اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا علم وفضل میں بہت بلند مقام رکھتی تھیں۔ ان سے ۱۶۵ احادیث مروی ہیں جو ان کی علمی صلاحیت کی دلیل ہیں۔ [5] رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاھا

---

(1) طبقات ابن سعد: ۹۶/۸، ط صادر
حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کا پدری سلسلہ نسب یہ ہے: رملہ بنت صخر بن حرب بن امیة بن عبد شمس۔
والدہ کی طرف سے نسب یہ ہے: رملہ بنت صفیة بنت ابو العاص۔ ابوالعاص پر ان کا نسب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے۔

(2) مسند احمد، ح: ۲۷۴۰۸۔ یہ ۷ھ کا واقعہ ہے۔

(3) طبقات ابن سعد: ۹۹/۸، ط صادر

(4) طبقات ابن سعد: ۱۰۰/۸

(5) سیر اعلام النبلاء: ۲۱۹/۲، الرسالة

اُم المؤمنین جُویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا

حضرت جُویریہ رضی اللہ عنہا بنو مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں۔[1] ۴ھ میں غزوۂ مریسیع میں گرفتار ہوئیں، اسی لڑائی میں ان کا شوہر مُسافع بن صفوان مارا گیا۔ حضرت جُویریہ رضی اللہ عنہا گرفتاری کے بعد مشرف بہ اسلام ہوگئیں۔ ان کے والد نے جب رسول اللہ ﷺ سے سفارش کی کہ میری بیٹی کو آزاد کر دیا جائے تو آپ نے حضرت جُویریہ رضی اللہ عنہا کو اختیار دے دیا کہ چاہیں تو چلی جائیں، چاہیں تو امہات المؤمنین میں شامل ہو جائیں۔

ان کے لیے اس سے بڑھ کر شرف کیا ہو سکتا تھا۔ بولیں: ''میں اللہ اور اس کے رسول کو ترجیح دیتی ہوں۔''

یوں وہ آپ ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ اس خوشی میں مسلمانوں نے ان کے قبیلے کے گرفتار شدگان رہا کر دیے۔ اس حسن سلوک سے ان کے والدین سمیت تمام قبیلے والے مسلمان ہو گئے۔[2]

سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا بہت عبادت گزار تھیں۔ نمازِ فجر کے بعد مصلّے پر بیٹھے بیٹھے سورج بلند ہونے تک ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتی تھیں۔[3] ان کی وفات ۵۶ ہجری میں ہوئی اور حاکم مدینہ مروان بن الحکم نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔[4]

رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاها

☆☆☆

اُمّ المؤمنین حضرت صَفِیّہ بنت حُییّ رضی اللہ عنہا

حضرت صَفِیّہ رضی اللہ عنہا کا تعلق ایک اسرائیلی خاندان سے تھا جس کا سلسلۂ نسب حضرت ہارون علیہ السلام سے جا ملتا تھا۔ ان کا باپ حُیَیّ بن اخطب بنو نضیر کے یہودیوں کا سردار تھا جو غزوۂ بنو نضیر میں قتل ہوا۔ اسی طرح ان کا شوہر کنانہ ابن ابی الحُقیق بھی سخت اسلام دشمن یہودی تھا۔ غزوۂ خیبر میں وہ بھی قتل ہو گیا۔ حضرت صَفِیّہ رضی اللہ عنہا پر اسلام کی حقانیت واضح ہو چکی تھی، اس لیے وہ ایمان لے آئیں۔ آپ ﷺ نے ان سے نکاح کر لیا۔ یہ ۷ ہجری کا واقعہ ہے۔ اس وقت ان کی عمر سترہ برس تھی۔ ۵۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔[5]

رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاها

☆☆☆

---

① حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا قبیلہ بنو خزاعہ کی شاخ تھا۔ شجرہ نسب یہ ہے: جویریہ بنت الحارث بن ابی ضِرار بن حبیب بن عائذ بن مالک بن جذیمة (مصطلق) بن سعد بن عَمْرو بن ربیعة (اسد الغابة، ترجمة: جویریة رضی اللہ عنہا)

② سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۶۱، ۲۶۲، ط الرسالة ③ سنن الترمذی، ح: ۳۵۵۵، ابواب الدعوات

④ تاریخ الاسلام للذھبی تدمری: ۴/۱۹۰؛ بشار: ۲/۴۸۱ ⑤ سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۳۳، ط الرسالة

حضرت صَفِیّہ رضی اللہ عنہا کا شجرہ نسب یہ ہے: صفية بنت حُیَیّ بن اخطب بن سعیه بن ثعلبه بن عبید بن کعب بن خَزرَج بن ابی حبیب (اسد الغابة: ۷/۱۶۸)

اُم المؤمنین حضرت زینب بنت خزیمہ ہلالیہ رضی اللہ عنہا

حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا اپنی سخاوت کی وجہ سے اُم المساکین کے نام سے مشہور تھیں۔ پہلے طفیل بن حارث کے نکاح میں تھیں، اس نے طلاق دے دی، پھر اس کے بھائی عبیدہ رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوگیا۔ یہ بھی غزوہ بدر میں شہید ہوگئے۔[1] عام سیرت نگاروں اور مؤرخین نے ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے کی تاریخ رمضان ۳ھ بتائی ہے۔[2] رخصتی کے صرف آٹھ ماہ بعد ان کا انتقال ہوگیا۔[3] حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد یہ دوسری زوجہ ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں فوت ہوئیں۔ اس وقت ان کی عمر ۳۰ سال تھی۔[4]

رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاھا

☆☆☆

اُم المؤمنین حضرت میمونہ بنت حارث ہلالیہ رضی اللہ عنہا

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چچی اُم فضل رضی اللہ عنہا کی ہمشیرہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی سگی خالہ تھیں۔ پہلے یہ مسعود بن عمر نامی شخص کے نکاح میں تھیں اس نے طلاق دے دی تو ابورہم سے نکاح ہوا۔ ان کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری زوجہ ہیں۔ ان کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نکاح نہیں کیا۔ عقد ذوالقعدہ ۷ھ میں عمرۂ قضا کے لیے جاتے ہوئے ''سرف'' کے قصبے میں ہوا۔ واپسی پر وہیں رخصتی ہوئی۔ ۵۱ھ میں حج کے سفر میں اسی مقام پر ان کا انتقال ہوا اور اسی سائبان میں دفن ہوئیں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا تھا۔[5]

رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاھا

☆☆☆

---

① الاصابة: ۸/۹۱،۹۲. الاستیعاب: ۴/۱۸۵۳

② طبقات ابن سعد: ۸/۱۱۵ ط صادر ..... مگر ایک دوسرے قول کے مطابق یہ آخری خاتون ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔
(مزید دیکھیے: مستدرک حاکم، ح: ۶۷۱۳ ؛ سیر اعلام النبلاء ط الرسالة: ۲/۲۵۴ ؛ مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۳۹۹۵، ط المجلس العلمی پاکستان ؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۴/۵۷، ط مکتبة ابن تیمیه قاهره. الکندی نے انہی کو گیارہویں اور آخری زوجہ شمار کیا ہے۔ السلوک فی طبقات العلماء والملوک: ۱/۷۶ ط صنعاء)

③ طبقات ابن سعد: ۸/۱۱۵، ط صادر

④ الاصابة: ۸/۹۱،۹۲ ؛ الاستیعاب: ۴/۱۸۵۳
سلسلہ نسب یہ ہے: زینب بنت خزیمة بن بن حارث بن عبداللّٰه بن عمرو بن عبد مَناف بن هلال بن عامر بن صعصعه

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۴۵، ط الرسالة
حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کا نسب یہ ہے: میمونة بنت الحارث بن حزن بن بجیر بن هرم۔
والدہ کی طرف سے نسب یہ ہے: میمونة بنت هند بن عوف بن الحارث بن حطامه بن جرش

ازواجِ مطہرات سے کسی اُمتی کا نکاح کیوں مشروع نہ تھا؟

قرآن مجید کے حکم کے مطابق حضور ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد کسی اُمتی کو ازواجِ مطہرات سے نکاح کی اجازت نہیں تھی۔ اس بارے میں یہ ارشادِ باری نازل ہو چکا تھا:

وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا

''اور نہ یہ جائز ہے کہ تم نکاح کرو آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی بیویوں سے کبھی بھی۔ یہ اللہ کے نزدیک بڑی بھاری (معصیت کی) بات ہے۔''[1]

اس ارشاد میں کیا حکمتیں تھیں؟ علماء نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، حاصلِ کلام یہ ہے کہ اہم ترین وجوہ تین تھیں:

1. وہ قرآنِ مجید کے حکم کے مطابق مسلمانوں کی مائیں ہیں:

   وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ (اور آپ ﷺ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔)[2]

   اس اعزاز کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے یہ حکم دیا گیا۔

2. مسلمان عورت کا نکاح جنت میں اسی مرد سے ہوگا جو دنیا میں اس کا آخری شوہر ہوگا۔ اُمہات المؤمنین کے لیے دنیا و آخرت میں حضور ﷺ کی رفاقت طے ہے۔ چنانچہ یہ طے کر دیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد وہ دوسرا نکاح نہیں کر سکتیں۔[3]

3. انبیائے کرام دنیا سے پردہ فرمانے کے باوجود ایک خصوصی حیات سے مشرف ہوتے ہیں اور روحِ مبارکہ کا جسدِ عنصری سے ایک خاص اتصال بھی ہوتا ہے۔ اس لیے حضور ﷺ کی رحلت کے بعد بھی ازواجِ مطہرات کا نکاح بعض وجوہ سے باقی رہا۔ امہات المؤمنین کے لیے دوسرا نکاح مشروع نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں۔ آپ ﷺ کی وفات کا درجہ ایسا ہے جیسا کہ کوئی زندہ شوہر گھر سے غائب ہو۔ اسی لیے آپ ﷺ کی میراث تقسیم نہیں ہوئی۔''[4]

☆☆☆

---

① سورۃ الاحزاب، آیت: ۵۳

② سورۃ الاحزاب، آیت: ۶

③ عن حذیفة انه قال لامرأته ان سرك ان تكونی زوجتی فی الجنة فلا تزوجی بعدی فان المرأة فی الجنة لآخر زوجها فی الجنة فلذلك حرم على ازواج النبی ان ینكحن بعده لانهن ازواجه فی الجنة۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲ / ۲۰۸ ط الرسالة)

④ معارف القرآن: ۷ /۲۰۳

سیرتِ نبویہ اور تعددِ ازواج

مستشرقین حضورنبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات کی تعداد کو لے کر ایک عرصے سے اسلام کی حقانیت پر حملے کررہے ہیں۔بعض ہندواسکالر بھی اس بارے میں دریدہ ذہنی کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔اعتراض برائے اعتراض کا تو کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا،تاہم سلیم الطبع لوگوں کی تسلی کے لیے اس حوالے سے چند نکات کافی ہوں گے۔

❶ اسلام سے پہلے بھی دنیا کے اکثر مذاہب اور اکثر خطوں میں ایک سے زائد نکاحوں کا رواج تھا۔عرب، ہندوستان،ایران،مصر،یونان اور بابل وغیرہ کی تاریخ پڑھیں تو ہر قوم کے شرفاء ایک سے زائد بیویاں رکھنے والے ملیں گے۔موجودہ بائبل کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کی سات بیویاں تھیں اور تین سو باندیاں۔[1] داؤد علیہ السلام کی ننانوے بیویاں تھیں،حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین اور حضرت یعقوب اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی چار چار۔[2]

تعددِ ازواج کی فطری ضرورت سے آج بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔اہل مغرب ایک مدت تک اسلام دشمنی میں تعددِ ازواج کے خلاف واویلا کرتے رہے مگر اب اس کی فطری ضرورت وہ سمجھ چکے ہیں اور اس فطری گنجائش کو عام کرنے کی کوششیں وہاں بھی ہورہی ہیں۔ایک عیسائی دانشور ڈیون پورٹ تعددِ ازواج کی حمایت میں بائبل کے کئی حوالے پیش کر کے لکھتا ہے:''تعددِ ازواج صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ خدا نے اس میں خاص برکت دی ہے۔''

اگر دیکھا جائے تو اسلام نے تعددِ ازواج کی فطری ضرورت کو مناسب ترین شکل دی ہے۔اسلام سے پہلے تعددِ ازواج کی کوئی حد نہ تھی،بادشاہوں کے تحت چار چار ہزار عورتیں ہوتی تھیں،عیسائیوں کے پادری برابر کثرت ازواج کے عادی تھے۔سولہویں صدی عیسوی تک جرمنی میں اس کا عام رواج تھا۔شاہ فلسطین اور اس کے جانشینوں نے بہت سی بیویاں کیں۔ہندومت کی قدیم کتب لامحدود حد تک شادیوں کو جائز رکھتی ہیں۔شری کرشن جی جو ہندوؤں میں واجب التعظیم اوتار جانے جاتے ہیں ان کی سینکڑوں بیویاں تھیں۔منو جی جو ہندوؤں کے بڑے پیشوا مانے جاتے ہیں،دھرم شاستر میں لکھتے ہیں کہ اگر ایک آدمی کی چار پانچ عورتیں ہوں اور ایک ان میں سے صاحبِ اولاد ہو تو باقی بھی صاحبِ اولاد کہلاتی ہیں۔[3]

اسلام سے قبل کسی مذہب اور قانون نے شادیوں کی تعداد پر کوئی حد نہیں لگائی تھی۔اسلام نے اس تعداد کو زیادہ سے زیادہ چار میں منحصر کردیا۔اور تاکید کی کہ سب سے برابری رکھی جائے،سب کے حقوق برابر ادا کیے جائیں اور اگر اتنی ہمت نہ ہو تو پھر ایک سے زیادہ رکھنا ظلم ہے۔اس حکم کے مطابق چار سے زائد بیویاں نکاح میں جمع رکھنا حرام ہوگیا۔ جن صحابہ نے چار سے زائد نکاح کر رکھے تھے،انہوں نے زائد عورتوں کو طلاق دے دی۔

---

① بائبل عہد نامہ عتیق، سلاطین: ۱۱/۳

② بائبل عہد نامہ عتیق، پیدائش: ۳۰/۲۹ ③ منوشاستر، ادھیائے: ۹، اشلوک: ۱۸۲

رہی یہ بات کہ حضور ﷺ کی ازواج چار تک محدود کیوں نہ رہیں تو اس کی کئی وجوہ اور حکمتیں ہیں مثلاً:

❶ امہات المومنین دوسری عورتوں کی طرح نہیں۔ خود قرآن کا ارشاد ہے:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (اے نبی کی عورتو! تم نہیں ہو جیسی دوسری عورتیں)[1]

وہ تمام اُمّت کی مائیں ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے بعد وہ کسی کے نکاح میں نہیں آسکتیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ ازواج مطہرات کے بارے میں حضور ﷺ کو کچھ خصوصیات سے نواز جائے۔ چنانچہ چار سے زائد بیویوں کو رکھنا آنحضرت ﷺ کی خصوصیت قرار دے دیا گیا۔

❷ حضورِ اکرم ﷺ کی گھریلو زندگی کے حالات جو اُمّت کے لئے دستور العمل ہیں، ازواج مطہرات ہی کے ذریعے ہم تک پہنچ سکتے تھے۔ اس مقصد لئے پوری اُمّتِ مُسلِمہ سے منتخب کر کے گیارہ خواتین کو آپ ﷺ کے گھر سے وابستہ کر دیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو گھر کی زندگی کے شرعی احکام ہم تک کیسے پہنچتے۔

❸ بعض نکاحوں کا ایک مقصد قبیلوں سے رشتہ داری پیدا کر کے انہیں دین کے قریب لانا تھا۔ چنانچہ یہ مقصد بخیر وخوبی پورا ہوتا رہا۔ جیسا کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کی وجہ سے ان کا پورا قبیلہ بنو مصطلق اسلام لے آیا۔

❹ بعض خواتین کے شوہر جنگوں میں قتل ہوئے تھے اور آپ ﷺ نے ان کی دلجوئی کے لئے ان سے نکاح کیا تھا جیسا کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اور حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا۔ ان کے بعد مذکورہ بالا مصلحتوں کے تحت مزید نکاح بھی کیے گئے۔ اس وقت اگر عام شرعی قاعدہ عائد کیا جاتا تو مزید نکاح کرتے وقت چار کے سوا باقی ازواج مطہرات کو طلاق دے کر الگ کرنا پڑتا اور اُمہات المومنین ہونے کی حیثیت سے وہ کہیں اور بھی نکاح نہ کر پاتیں۔ تو اندازہ لگایئے کہ ایسے میں ان کے دلوں کو کتنی ٹھیس پہنچتی۔ پس انہیں صدمے سے بچانے لیے حضور ﷺ کو چار سے زیادہ نکاحوں کی گنجائش دے دی گئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے حبیب ﷺ اور امہات المومنین پر خاص انعام تھا۔

❺ تعددِ ازواج کو نفسانی خواہش پر محمول کرنے والے سوچیں کہ اگر آپ ﷺ چاہتے تو عرب کی جتنی کنواری عورتوں سے چاہتے نکاح کر سکتے تھے، مگر آپ کے نکاح میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سوا کوئی کنواری خاتون نہیں تھی۔ ہر کوئی بیوہ تھی یا مطلقہ۔ پھر عمر مبارک کے ۵۳ سال پورے ہونے تک ایک ہی اہلیہ پر اکتفا فرمایا۔ باقی سب نکاح آخری دس سالوں میں ہوئے۔ اگر خواہشِ نفسانی کا کوئی شائبہ بھی ہوتا تو یہ نکاح جوانی میں ہونے چاہیے تھے نہ کہ کہنہ سالی میں۔

❻ مکی زندگی میں جب کہ کفار اسلام کی سرتوڑ مخالفت پر تلے ہوئے تھے، اس وقت بھی انہوں نے خواہشِ نفسانی کے حوالے سے آپ ﷺ پر کوئی الزام لگایا نہیں۔ اگر الزام کی ذرا بھی گنجائش ہوتی تو کفارِ عرب بڑھا چڑھا کر اسے بیان کرتے۔ مگر آپ ﷺ کی پاکیزہ حیات سب کے سامنے تھی۔ اس لیے کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

پس تعددِ ازواج کے حوالے سے حضور ﷺ پر لب کشائی وہی کر سکتا ہے جو عقل کا اندھا اور تعصب کا مارا ہو۔

---

[1] سورۃ الاحزاب، آیت: ۳۲

اولادِ اطہار

آنحضرت ﷺ کی تمام نرینہ اولاد بچپن میں ہی داغ مفارقت دے گئی، اس وقت روایات محفوظ کرنے والی جماعتِ صحابہ تیار نہیں ہوئی تھی، اس لیے اولادِ نرینہ کی تعداد میں اختلاف ہے۔

فرزندانِ گرامی:

معتبر اور مستند قول یہ ہے کہ تین صاحبزادے تھے:

1. قاسم
2. عبداللہ (جن کو طیب اور طاہر کے لقب سے بھی پکارا جاتا تھا۔)
3. ابراہیم

قاسم اور عبداللہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ انہی عبداللہ کا دوسرا نام طیب وطاہر بھی تھا۔[1] آپ کی اولاد میں سب سے پہلے حضرت قاسم پیدا ہوئے اور بعثت سے پہلے انتقال کر گئے۔ آنحضرت ﷺ کی کنیت ابوالقاسم ان ہی کی نسبت سے تھی۔

حضرت ابراہیم حضور ﷺ کی اُمّ ولد ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے، یہ آخری اولاد تھے۔ حضرت ابراہیم کے سوا تمام اولاد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہی کے بطن سے ہے اور کسی بیوی سے آپ ﷺ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔[2] ابراہیم کی ولادت ذوالحجہ ۸ھ (مئی) میں ہوئی۔ حضور ﷺ نے ساتویں دن دو دنبے قربان کر کے عقیقہ کیا[3] اور اپنے جدِ امجد کے نام پر ان کا نام "ابراہیم" رکھا۔ مدینہ کے مضافات میں رہائش پذیر ایک لوہار ابوسیف رضی اللہ عنہ کی اہلیہ اُمّ سیف بچے کی دائی مقرر ہوئیں۔ نبی اکرم ﷺ کو اس بیٹے سے بہت محبت تھی۔ گاہے گاہے اسے دیکھنے ابوسیف رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے جاتے جو بھٹی کے دھوئیں سے بھرا ہوتا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ آگے آگے دوڑ کر جاتے اور ابوسیف رضی اللہ عنہ کو کہتے کہ بھٹی دھونکنا بند کر دو، حضور ﷺ آرہے ہیں۔ حضور ﷺ گھر میں داخل ہوتے، بچے کو گود میں لیتے، سونگھتے اور چومتے۔[4]

ابراہیم ابھی دودھ پیتے بچے تھے کہ سخت بیمار ہوگئے۔ حضور ﷺ ابوسیف رضی اللہ عنہ کے گھر گئے، بچے کو گود میں لیا جس کی حالت نازک تھی، کچھ ہی دیر میں معصوم جان دارِ فانی سے رخصت ہوگئی۔ حضور ﷺ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی

---

① بعض سیرت نگار کہتے ہیں کہ طیب اور طاہر آپ ﷺ کے دو صاحبزادے تھے جو حضرت قاسم اور حضرت عبداللہ کے علاوہ تھے۔
② عیون الاثر، ابن سید الناس: ۲/۳۵۶، ۳۵۷ ط دار القلم
③ سبل الهدیٰ والرشاد: ۱۱/۲۱
④ صحیح مسلم، ح: ۶۱۶۷؛ صحیح البخاری، ح: ۱۳۰۳

لڑیاں بہہ پڑیں۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہمراہ تھے، کہنے لگے: ''اللہ کے رسول! آپ بھی رو رہے ہیں؟''
فرمایا: ''یہ تو رحمت کی علامت ہے۔'' پھر لختِ جگر کی نعش کی طرف متوجہ ہو کر گویا ہوئے:

اِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ، وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ، وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا يَرْضَى رَبُّنَا، وَاِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ

(آنکھ سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ دل غمزدہ ہے۔ مگر ہم وہی کہیں گے جس سے اللہ عزوجل راضی ہو۔ اے ابراہیم! ہم تیری جدائی پر بہت رنجیدہ ہیں۔)[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: ''ابراہیم کی موت شیر خوارگی کے دوران ہوئی ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جنت میں اس کے لیے دو دائیاں مقرر کردی ہیں جو اس کی شیر خوارگی کی تکمیل کریں گی۔''[2]

یہ واقعہ دس ربیع الاوّل (مکی) سنہ ۱۰ ہجری کا ہے۔ ابراہیم کی عمر سترہ مہینے تھی۔[3]

ابراہیم کی وفات کے دن سورج گرہن ہو گیا۔ عربوں میں پہلے ہی مشہور تھا کہ سورج گرہن یا چاند گرہن کسی عظیم شخصیت کی وفات کی علامت ہوتے ہیں۔ چنانچہ لوگ آپس میں کہنے لگے کہ ابراہیم کی موت کے باعث سورج گرہن ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان توہمات کی تردید کے لیے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا:

''سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ انہیں کسی کی موت کی وجہ سے گرہن نہیں لگتا۔ جب تم انہیں گرہن لگتے دیکھو تو اس وقت تک نماز پڑھا کرو جب تک یہ گرہن سے نکل نہ آئیں۔''[4]

دخترانِ ذی شان:

صاحبزادیوں کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں، یہ بالاتفاق چار تھیں:

1. زینب رضی اللہ عنہا
2. رُقیّہ رضی اللہ عنہا
3. اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا
4. فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا

چاروں بڑی ہوئیں، بیاہی گئیں، اسلام لائیں اور ہجرت کی۔
اگلے اوراق میں ان کے حالات مختصراً پیش خدمت ہیں۔

☆☆☆

---

① صحیح البخاری، ح: ۱۳۰۳، کتاب الجنائز؛ صحیح مسلم، ح: ۲۱۶۷
② صحیح مسلم، ح: ۲۱۶۸
③ سبل الهدیٰ والرشاد: ۲۱/۱۱
④ صحیح البخاری، ح: ۱۰۶۰، باب الدعاء فی الخسوف

حضرت زینب رضی اللہ عنہا

حضرت زینب رضی اللہ عنہا صاحب زادیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ بعثت سے دس سال پہلے پیدا ہوئیں، اسلام لائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ابتدائی سخت ترین آزمائش کے ایام کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب بازاروں میں دین کی دعوت دیتے تو لوگ آپ پر مٹی پھینکتے، طرح طرح کی ایذائیں دیتے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا وہاں پہنچ جاتیں اور اپنے پیارے والد کو سہارا دیتیں۔[2]

ان کا نکاح اپنے خالہ زاد ابوالعاص بن ربیع سے ہوا تھا۔ ابوالعاص کا اصل نام لَقِیط تھا۔ یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سگی بہن ہالہ کے صاحبزادے تھے۔ مکہ کے شریف ترین نوجوانوں میں سے تھے۔ ہجرتِ مدینہ کے موقع پر انہوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مدینہ چلے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے بعد وہ خود تجارت کے لیے شام چلے گئے۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ نہ جا سکیں۔ بعد میں تنہا روانہ ہوئیں مگر کفار نے زبردستی روک لیا، جس میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا زخمی ہوئیں اور ان کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔

ابوالعاص غزوۂ بدر میں گرفتار ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وعدے پر رہا کیا کہ واپس جا کر زینب رضی اللہ عنہا کو مدینہ بھیج دیں گے۔ ابوالعاص نے وعدہ نبھایا۔[3] زینب رضی اللہ عنہا کو لینے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ خفیہ طور پر مکہ پہنچے۔ ابوالعاص نے زینب رضی اللہ عنہا اور اپنے دونوں بچوں علی اور اُمامہ کو ان کے ساتھ رات کی تاریکی میں مدینہ روانہ کر دیا۔

جمادی الاولیٰ سن چھ ہجری میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے شام سے واپس آنے والے ایک قافلے پر چھاپہ مارا جس میں ابوالعاص بھی گرفتار ہو گئے۔ مدینہ پہنچ کر انہوں نے اپنی زوجہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی پناہ لی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امان کو باقی رکھا اور زینب رضی اللہ عنہا کی درخواست پر ابوالعاص کو ان کا سامان بھی لوٹا دیا۔

ابوالعاص مکہ چلے گئے اور صلح حدیبیہ سے پانچ ماہ پہلے مدینہ واپس آ کر اسلام کا اعلان کیا۔[4] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابوالعاص رضی اللہ عنہ کا ذکر بڑی محبت سے کرتے اور فرماتے: "اس نے مجھ سے جو کہا سچ کہا۔ جو وعدہ کیا وہ پورا کیا۔"[5]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا ۸ ہجری میں وفات پا گئیں۔[6] امہات المومنین میں سے اُمّ سلمہ اور سَودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہما نے غسل دیا۔ اُمّ عَطِیّہ انصاریہ رضی اللہ عنہا اور اُمّ اَیمن رضی اللہ عنہا بھی تجہیز و تکفین میں شریک تھیں۔[7] رضی اللہ عنہا و ارضاھا

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲۴۶/۲ ط الرسالة

② مجمع الزوائد للهيثمي، ح: ۹۸۲۸،۹۸۲۷ ③ سیر اعلام النبلاء: ۲۴۷/۲، ط الرسالة

④ تاريخ دمشق: ۵،۴،۳/۶۷۔ اس روایت میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی جگہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے جو کسی راوی کا وہم ہے کیوں کہ اس وقت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ بمشکل دس برس کے تھے۔ تاریخ دمشق میں کچھ آگے (۱۰/۶۷) دوسری روایت زیادہ مفصل روایت میں ہے کہ یہ مہم زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے انجام دی تھی۔

⑤ الطبقات الكبرىٰ لابن سعد: ۳۳/۸ ط صادر

⑥ سیر اعلام النبلاء: ۲۵۰/۲ ...... ابوالعاص رضی اللہ عنہ نے ۱۲ھ میں وفات پائی۔ ⑦ الطبقات الكبرىٰ لابن سعد: ۳۶،۳۵/۸ ط صادر

حضرت رُقیّہ رضی اللہ عنہا

حضرت رُقیّہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی دوسری بیٹی تھیں۔ بعثت سے سات سال پہلے ولادت ہوئی۔

ابولہب کے بیٹے عُتبہ سے منسوب تھیں۔ فقط نکاح ہوا تھا، رخصتی نہیں ہوئی۔ جب سورۂ لہب نازل ہوئی تو ابولہب کے بہکانے پر عُتبہ نے انہیں طلاق دے دی۔[1]

اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت رُقیّہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے جب حبشہ کی طرف ہجرت کی تو حضرت رُقیّہ رضی اللہ عنہا بھی ہمراہ تھیں۔ حضور ﷺ فرماتے تھے:

''حضرت لوط علیہ السلام کے بعد یہ دونوں پہلا کنبہ ہیں جس نے اللہ کی خاطر ہجرت کی۔''[2]

حضرت رُقیّہ رضی اللہ عنہا کچھ مدت بعد اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ سے واپس مکّہ آ گئیں اور پھر مدینہ ہجرت کی۔

حضور ﷺ غزوہ بدر کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت رُقیّہ رضی اللہ عنہا بیمار تھیں۔ ان کی تیمارداری کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غزوہ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو رُقیّہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کے لیے مدینہ میں چھوڑا تھا۔ جس دن بدر کی فتح کی خبر مدینہ پہنچی اسی دن حضرت رُقیّہ رضی اللہ عنہا نے انتقال فرمایا۔[3]

رسول اللہ ﷺ کی بدر سے واپسی ہوئی تو گھر میں خواتین کو حضرت رُقیّہ رضی اللہ عنہا کی موت پر روتے پایا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ انہیں سختی سے چپ کرانے لگے تو آپ ﷺ نے انہیں روک دیا، پھر خواتین کو مخاطب کر کے کہا:

''شیطانی نوحے سے بچتی رہنا۔ جہاں تک دل (کے غم) اور آنکھ (کے آنسوؤں) کی بات ہے تو یہ اللہ کی طرف سے ہے اور رحم دلی کی علامت ہے۔ جو زبان سے (شکوہ شکایت یا نوحہ) ہو یا ہاتھ سے (سینہ کوبی وغیرہ) ہو، وہ شیطان کی طرف سے ہے۔''

آپ بیٹی کی قبر پر تشریف لے گئے۔ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا جو ساتھ تھیں، بہن کی قبر کے کنارے بیٹھ کر رونے لگیں، آپ ﷺ اپنی چادر کے کونے سے ان کے آنسو پونچھتے رہے۔[4]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ سے بیٹی کی وفات پر تعزیت کی، آپ جواب میں فرماتے:

'' اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، دَفْنُ الْبَنَاتِ مِنَ الْمُکْرَمَات. '' ''الحمدللہ! بیٹیوں کی تدفین سعادت کی بات ہے۔''[5]

---

① طبقات ابن سعد: ۳۶/۸، صادر..... عُتبہ نے بعد میں فتح مکّہ کے موقع پر اسلام قبول کر لیا تھا۔ ② سیر اعلام النبلاء: ۲۵۱/۲، الرسالۃ

③ التاریخ الاوسط للبخاری: ۱۹/۱، ط دار الوعی ④ طبقات ابن سعد: ۳۷/۸، ط صادر

⑤ المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۶۶/۱۱، ط مکتبۃ ابن تیمیہ. ارشادِ پاک کا مطلب یہ ہے کہ بیٹیوں کی موت پر صبر کرنا ثواب اور شرف کی بات ہے۔
کسی شاعر نے یہ شعر بھی کہا تھا ۔ اَلْقَبْرُ اَخْفٰی سَتْرٌ لِلْبَنَاتِ..... وَدَفْنُهَا یُرْوٰی مِنَ الْمُکْرَمَات
''قبر بیٹیوں کو چھپانے کی اچھی جگہ ہے اور انہیں دفن کر دینا عزت کی بات شمار ہوتی ہے۔'' (زہر الاکم فی الامثال والحکم: ۲۴۰/۲)
مگر ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مراد (نعوذ باللہ) ہرگز وہ نہیں ہو سکتی جو زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی تھی جو لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔

حضرت اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا

اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری صاحبزادی ہیں۔ ان کا کوئی اصل نام منقول نہیں۔ بظاہر یہ کنیت ہی ان کا نام تھا۔ ان کا نکاح ابولہب کے بیٹے عُتیبہ سے ہوا تھا۔ باپ کے کہنے پر اس نے بھی انہیں رخصتی سے قبل طلاق دے دی۔ اگرچہ ابولہب کے دوسرے بیٹے عتبہ نے بھی حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دی تھی مگر عُتیبہ نے فقط طلاق پر اکتفانہ کیا بلکہ طلاق دے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور بولا: ''میں آپ کے دین کا منکر ہوں۔ میں نے آپ کی بیٹی کو طلاق دے دی۔ نہ وہ مجھے پسند کرتی ہے نہ میں اسے۔'' اس کے بعد وہ بدبخت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھپٹا اور آپ کا کرتا چاک کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بددعا نکل گئی کہ ''اے اللہ! اس پر کوئی درندہ مسلط فرما۔''

کچھ دنوں بعد قریش کا تجارتی قافلہ شام روانہ ہوا۔ ابولہب اور عُتیبہ بھی اس قافلے میں تھے۔ زرقاء نامی علاقے میں پڑاؤ کے دوران میں رات کے وقت ایک شیر آ گیا۔ وہ قافلہ والوں کے چہروں کو دیکھتا اور سونگھتا ہوا عُتیبہ تک پہنچا تو فوراً اس کا سر چبالیا۔ عُتیبہ کا اسی وقت دم نکل گیا اور شیر ایسا غائب ہوا کہ کہیں اس کا پتہ نہ چلا۔ ①

اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا اپنی بہن حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد ربیع الاوّل ۳ ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں۔ ② حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نکاح کے بارے میں فرمایا: ''میں نے اُمِ کلثوم کا نکاح، عثمان سے وحی آسمانی ہی کے سبب کرایا ہے۔'' ③ اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا چھ سال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہیں۔ شعبان ۹ ھ میں انتقال ہوا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے نعش کو قبر میں اتارا۔ ④ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اس وقت فرمایا:

''اگر میری کوئی تیسری لڑکی ہوتی تو اسے بھی عثمان کے نکاح میں دے دیتا۔'' ⑤

کتبِ سیر و تواریخ میں حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہا کی طرح حضرت اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا کے حالات بھی بہت مختصر ملتے ہیں تاہم نصیحت والوں کے لیے ان چند جھلکیوں میں بھی بہت کچھ سامانِ نصیحت ہے۔

---

① دلائل النبوۃ للبیہقی: ۳۳۸/۲، ۳۳۹، ط العلمیۃ ② طبقات ابن سعد: ۳۷/۸ ط صادر

③ التاریخ الکبیر للبخاری: ۳۰۸/۳، ط حیدر آباد دکن ④ صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب من یدخل قبر المرأۃ روایت میں صاحبزادی کا نام نہیں ہے۔ بعض جگہ یہ واقعہ حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہا کی تدفین کا بیان کیا گیا ہے مگر محققین نے اس کی تردید کی ہے کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہا کی تدفین کے وقت غزوہ بدر میں تھے۔ (عمدۃ القاری: ۱۵۲/۸، ط التراث) اس لیے یہ حضرت اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا کی تدفین کا واقعہ ہے جیسا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ (شرح مشکل الآثار، ح: ۲۵۱۲، ط الرسالۃ)

⑤ البدایۃ والنہایۃ: ۲۴۳/۸. بعض روایات میں ہے: "لَوْ كُنَّ عَشْرًا لَزَوَّجْتُهُنَّ عُثْمَانَ" (ابن سعد: ۳۸/۸) طبقات ابن سعد اور البدایہ والنہایہ میں اسے بلا اسناد نقل کیا گیا ہے تاہم ابن ابی عاصم نے اس کے ہم معنی دو روایتیں سند کے ساتھ الگ الگ مقامات پر نقل کی ہیں۔ (السنۃ لابن ابی عاصم، ح: ۱۲۹۱، ۱۳۰۱) مگر پہلی روایت میں عثمان بن خالد بن عمر الاموی متروک ہے۔ (تقریب التھذیب، تر: ۴۴۶۴) اور دوسری میں عبدالملک بن ہارون بن عنترۃ کو دجال اور کذاب کہا گیا ہے۔ (الکامل فی الضعفاء، تر: ۱۴۴۸) اس لیے محفوظ روایت وہی ہے جو متن میں نقل کی گئی ہے۔

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا

آپ کا نام فاطمہ تھا۔ زہراء اور بتول آپ کے لقب تھے۔ بتول اس لیے کہا جاتا ہے کہ اپنے فضل و کمال کی وجہ سے دنیا کی عورتوں سے ممتاز تھیں، یا اس لیے کہ ماسوا اللہ سے لاتعلق تھیں۔ سیرت کی نورانیت کے باعث زہراء کہلاتی تھیں۔ بعثت سے پانچ سال پہلے پیدا ہوئیں۔ تمام صاحبزادیوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ ①

کم عمری کے باوجود نہایت باادب اور دلیر تھیں، اپنے والد ماجد کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ ایک بار حضور ﷺ کعبہ کے پاس نماز ادا کر رہے تھے کہ ابوجہل کے کہنے پر ایک کافر اونٹ کی اوجھڑی اٹھا لایا اور جب آپ سجدے میں گئے تو آپ کی گردنِ مبارک پر رکھ دی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کسی نے بتایا تو دوڑی آئیں، اوجھڑی کو دھکیل کے آپ ﷺ کی گردن سے گرایا، پھر کفار کو خوب برا بھلا کہا۔ ②

ہجرتِ مدینہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے پیغامِ نکاح آیا، حضور ﷺ خوش ہوئے مگر ایسے موقع پر بیٹی سے بھی رائے لینا اہم سمجھا۔ ان سے کہا: ''علی تمہارا ذکر کر رہے تھے؟'' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا خاموش رہیں۔ فقہاء نے اس سے مسئلہ مستنبط کیا کہ کنواری لڑکی کی خاموشی، رضا سمجھی جائے گی۔

نکاح کا فیصلہ کرکے حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''مہر کیا ہوگا؟''

بولے: ''میرے پاس تو مہر کے لیے کچھ بھی نہیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہاری وہ زرہ کہاں ہے جو میں نے تمہیں دی تھی؟''

عرض کیا: ''وہ تو ہے'' ارشاد ہوا: ''تو اسی کو مہر بنالو۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک اونٹ بھی تھا، وہ بھی فروخت کر دیا گیا۔ ۴۸۰ درہم حاصل ہوئے۔ اس رقم کو مہر مقرر کرکے نکاح ہوگیا۔ حضور ﷺ کے کہنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مسجدِ نبوی سے کچھ دور ایک مکان لے لیا۔

① طبقات ابن سعد: ۱۹/۸، ط صادر ؛ سیر اعلام النبلاء: ۳۱۵/۳، ط الرسالۃ

② صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب اذا لقی علیٰ ظھر المصلی قذراً ؛ صحیح مسلم: کتاب الجھاد: باب مالقی النبی ﷺ من اذی

مسئلہ عمرِ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا:

صحیح مسلم کی یہ حدیث اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عمر کا مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات بالاتفاق ۱۱ ہجری میں ہوئی ہے مگر ولادت کے بارے میں متعدد اقوال ہیں جو اخباری راویوں کی ضعیف السند روایات پر مشتمل ہیں۔ تین اقوال زیادہ مشہور ہیں:

❶ قریش کے ہاتھوں ماہ ربیع الاول میں تعمیر کعبہ کے وقت ولادت ہوئی جبکہ حضور ﷺ ۳۵ سال کے تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۱۹/۸ ؛ الاصابۃ: ۲۶۳/۸) یہ ہجرت سے پورے ۱۸ سال قبل کا واقعہ ہے۔ پس رمضان ۱۱ھ میں بوقتِ وفات عمر ۲۸ سال چھ ماہ تھی۔ نکاح کے وقت (شوال ۲ ہجری میں) عمر ۱۹ سال سات ماہ تھی۔

❷ حضور ﷺ ۴۱ سال کے تھے تب ولادت ہوئی (الاصابۃ: ۲۶۳/۸) اس لحاظ سے نکاح کے وقت عمر ۱۵ سال سات ماہ تھی۔ اور وفات کے وقت ۲۴ سال چھ ماہ۔

❸ حضور ﷺ ۴۰ سال کے تھے تب ولادت ہوئی (الاصابۃ: ۲۶۳/۸)

عام طور پر مؤرخین اور سیرت نگاروں کے ہاں دوسرا قول مشہور ہے اسی لیے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نکاح کے وقت عمر..... بقیہ اگلے صفحہ پر

دولہا کے گھر میں کچھ نہ تھا، بعض صحابیات نے رخصتی سے پہلے کچھ ضروری سامان مہیا کیا جو یہ تھا: کھجور کی چھال سے بھرے ہوئے دو بچھونے، دو تکیے، پانی پینے کا پیالہ، ایک مشک، ایک تخت، دو چکیاں، دو مٹکے۔ پھر رخصتی ہوئی۔ اُمّ ایمن رضی اللہ عنہا نے دلہن کو گھر پہنچایا۔ کمرے میں ایک مٹی کا چبوترا تھا جس پر دنبے کی ایک کھال بچھا کر میاں بیوی رات کو سو جاتے۔ دن کو اسی کھال میں بھوسہ ڈال کر اس اونٹنی کو کھلاتے جس پر گھر کے لیے پانی لاد کر لایا جاتا تھا۔[1]

پختہ قرائن واضح کرتے ہیں کہ رخصتی رمضان ۲ ہجری کے اواخر یا شوال ۲ھ کے اوائل میں ہوئی تھی۔[2]

رخصتی کے بعد انصار نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ''ولیمہ تو ضرور ہونا چاہیے۔'' اس کے لیے حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایک دنبہ پیش کیا، کچھ دوسرے انصاریوں نے چند صاع جو جمع کیے۔ اس طرح ولیمے کا انتظام ہو گیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)......

ساڑھے پندرہ سال بتاتی ہے۔ (البدایة والنهایة: ۹/ ۴۸۶) ؛ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بوقتِ وفات عمر ۲۵ سال کو صحیح کہا ہے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲/ ۱۲۱)

مگر مسلم کی اس روایت کو (جو عمرِ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا تعین کرنے میں مدد دینے والی واحد صحیح روایت ہے) کو درج ذیل قرائن کے ساتھ ملائیں تو پہلا قول ہی راجح لگے گا:

(۱) یہ بات واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلانیہ دعوت تین سال خفیہ دعوت دینے کے بعد نبوت کے چوتھے برس شروع ہوئی اور کفار کی طرف سے سختیاں اس کے بعد شروع ہوئیں۔ پس یہ واقعہ اعلانیہ دعوت کے دور کا ہے جو ۴ نبوی میں شروع ہوئی۔ تب مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی محفوظ نہ تھے۔

(۲) قرینِ قیاس ہے کہ یہ واقعہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے کا ہے، کیوں کہ ان کے اسلام لانے کے بعد مشرکین اس حد تک جسارت نہیں کرسکتے تھے اور مسلمان کعبہ میں اعلانیہ باجماعت نماز پڑھنے لگے تھے۔ یہ دونوں حضرات بعثت کے چھٹے سال میں اسلام لائے تھے (سبل الهدیٰ والرشاد للصالحی الشامی: ۲/ ۳۷۰)۔ اس لیے قرینِ قیاس یہ ہے کہ یہ واقعہ اس سے پہلے ہے۔ اب غور فرمائیں کہ اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ولادت سالِ بعثت یا اس سے ایک سال قبل کی ہو تو نبوت کے چوتھے یا پانچویں سال وہ چار پانچ برس کی ہوں گی۔ یہ بات عقل سے بعید ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف میں دیکھ کر کوئی شخص اس قدر چھوٹی بچی کو مدد کے لیے بلا لائے۔ بھاری اوجھڑی کا پشتِ مبارک سے ہٹانا اور مشرکین کو بُرا بھلا کہنا بھی چار پانچ سالہ بچی کا کام نہیں، البتہ پہلے قول کے مطابق حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس وقت لگ بھگ نو سال کی ہوں گی اور اتنی عمر کی لڑکی ہمت والی ہو تو ایسا کرسکتی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں سے بڑھ کر ہمت والا کون ہوسکتا ہے۔

اگرچہ مسلم کی اس روایت میں ان کے لیے جویریۃ (چھوٹی سی لڑکی) کا لفظ آیا ہے، مگر اس کا اطلاق نو دس سال کی لڑکی پر بلا تکلف ہوسکتا ہے۔

حاشیہ صفحہ موجودہ

① حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے میں یہ جزئیات طبقات ابن سعد (ج۸/ ۲۲، ۲۳) کی چند مسلسل روایات سے لی گئی ہیں۔

② الدولابی کی روایت کے مطابق نکاح صفر ۲ھ میں جبکہ رخصتی اور ولیمہ ذوالحجہ ۲ھ میں ہوا تھا۔ (الذریة الطاهرة، ص ۶۳) یعنی نکاح اور رخصتی کے مابین گیارہ ماہ کا وقفہ تھا۔ تاہم کسی اور روایت میں اس کی تائید نہیں ملی۔ بہر حال ذوالحجہ میں رخصتی مانی جائے تو پھر یقیناً یہ ذوالحجہ مدنی تھا کیوں کہ ۲ھ میں رمضان مکی، ذوالحجہ مدنی کے مطابق تھا۔ یاد رہے کہ بخاری و مسلم کی روایات کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ولیمے کے اخراجات کے انتظام کے لیے دو اونٹنیوں پر جنگل سے گھاس کاٹ کر لانے اور بیچنے کا ارادہ کیا تھا، ان میں سے ایک اونٹنی غزوہ بدر کے مالِ غنیمت میں ملی تھی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے شراب کے نشے میں ان اونٹنیوں کو اچانک ذبح کر دیا۔ (صحیح البخاری، ح: ۲۳۷۵، کتاب المساقاة، باب جمع الحطب ؛ صحیح مسلم، ح: ۱۹۷۹، کتاب الاشربة، باب تحریم الخمر) ظاہر ہے یہ شراب کی حرمت اور غزوۂ اُحد سے قبل کا واقعہ ہے۔ (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ غزوۂ اُحد میں شہید ہو گئے تھے۔) اس سے بعض مؤرخین کا یہ قول غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ نکاح غزوۂ اُحد کے بعد ہوا تھا۔ اسی طرح طبقات ابن سعد کی بعض روایات میں منقول رجب سن ایک ہجری میں نکاح ہونا بھی غلط ثابت ہو جاتا ہے اور ۲ھ میں ہونا راجح ہو جاتا ہے جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے کہا ہے۔ (البدایة والنهایة: ۵/ ۳۰۵، وبه جزم الطبری وابن الجوزی والذهبی) یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ نکاح غزوۂ بدر (۱۷ رمضان) کے بعد ہوا تھا اور چونکہ اسی روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ وہ بنوقینقاع کے ایک سنار کے ساتھ کاروبار کا ارادہ کیے ہوئے تھے، لہٰذا متعین ہو جاتا ہے کہ نکاح غزوۂ قینقاع (۱۵ شوال) سے قبل ہوا تھا۔ کیوں کہ اس غزوے کے نتیجے میں بنوقینقاع جلاوطن کر دیے گئے تھے جس کے بعد بنوقینقاع کے کسی سنار کے ساتھ کاروبار کا منصوبہ بنانا ممکن نہیں تھا۔

نیز اسی واقعے سے یہ معلوم ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ولیمے کا انتظام کیوں نہیں کرسکے تھے، کیوں کہ جس ذریعے سے وہ رقم حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ ختم ہو گیا اس لیے رخصتی کے وقت ان کے پاس کچھ نہیں تھا، جو تھوڑا بہت اثاثہ تھا وہ فروخت کر کے فقط مہر کی رقم جمع کی تھی۔ اسی لیے انصار نے ان کے ولیمے کا انتظام کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گھر بیت نبوی سے دور تھا، آپ ﷺ چاہتے تھے کہ بیٹی کا گھر قریب ہوجائے۔ حضور ﷺ کے ایک پڑوسی حارثہ بن نعمان انصاری رضی اللہ عنہ تھے، وہ اس سے پہلے بھی آپ ﷺ کے خاندان کے لیے بعض مکانات خالی کرچکے تھے۔ جب آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کہا کہ میں تمہیں قریب منتقل کرنا چاہتا ہوں تو وہ بولیں:

''آپ حارثہ بن نعمان سے کہیں، وہ ہمیں قریب کوئی مکان دے دیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ہمیں پہلے بھی گھر دے چکے ہیں، اب مجھے انہیں مزید کہتے ہوئے حیا آتی ہے۔''

حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کو یہ پتا چلا تو فوراً اپنا گھر خالی کرکے دور منتقل ہوگئے، اور پھر خدمت میں حاضر ہوکر کہا:

''اللہ کے رسول! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ فاطمہ کو قریب منتقل کرنا چاہتے ہیں، یہ میرے گھر حاضر ہیں۔ میں اور میرا مال، سب اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہیں۔ جو آپ لے لیں وہ ہمیں اس سے زیادہ پسند ہے جو آپ چھوڑ دیں۔''

حضور ﷺ نے خوش ہوکر فرمایا: تم نے سچ کہا، اللہ تمہیں برکت دے۔''

اس کے بعد حضرت علی اور حضرت فاطمہ، حضور ﷺ کے پڑوس میں منتقل ہوگئے۔ [1]

سرورِ دوعالم ﷺ کی چہیتی صاحبزادی ہونے کے باوجود حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی بڑی سادہ اور پرمشقت تھی۔ گھر میں خود صفائی کرتیں، خود لکڑیاں جلا کر کھانا پکاتیں، کنوئیں سے پانی کی مشک بھر کر لاتیں جس سے بدن پر نشان پڑ گئے تھے۔ خود چکی چلا کر آٹا پیستیں جس سے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ مفلسی کی وجہ سے گھر کے کاموں میں کوئی معاون رکھنے کی بھی استطاعت نہ تھی۔

ایک بار رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ غلام آئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خیال ہوا کہ گھر کے کاموں میں معاونت کے لیے ایک غلام لے لیا جائے۔ ان کے کہنے پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے پاس گئیں مگر شرم کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکیں اور چپ چاپ لوٹ آئیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم ﷺ کو بتایا کہ فاطمہ آئی تھیں۔

بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جا کر مدعا عرض کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا؛ کیوں کہ اہلِ صفہ بھوکے ہیں، میرے پاس کچھ نہیں کہ میں ان پر خرچ کروں، میں ان غلاموں کو بیچ کر ان کی قیمت ان پر خرچ کروں گا۔''

رات کو آپ بیٹی کے گھر تشریف لائے اور فرمایا:

''جو تم نے مانگا، کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز نہ بتاؤں۔ جب تم سونے لگو تو ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ یہ تمہارے لیے خادم سے بہتر ہے۔''

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''میں اللہ اور اس کے رسول سے راضی ہوں۔'' [2]

---

[1] طبقات ابن سعد: ۸/ ۲۲، ط صادر

[2] مسند احمد، ح: ۱۱۴۱، ۱۳۱۳؛ فضائل الصحابة للامام احمد بن حنبل، ح: ۱۲۰۷

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں: ''میں نے فاطمہ سے بڑھ کر گفتگو میں رسول اللہ ﷺ کے مشابہہ کسی کو نہیں دیکھا۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جاتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے، انہیں چومتے اور خوش آمدید کہتے۔ ①

نیز فرماتی تھیں: ''ان کی چال ڈھال بالکل رسول اللہ ﷺ کی طرح تھی۔'' ②

آنحضرت ﷺ کی اپنی اس بیٹی سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے منبر پر ارشاد فرمایا: ''فاطمہ میرے جسد کا ٹکڑا ہے۔ جس نے اسے پریشان کیا، اس نے مجھے پریشان کیا۔ جس نے اسے ایذاء دی، اس نے مجھے ایذاء دی۔'' ③

ایک شب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ابھی ایک ایسا فرشتہ آسمان سے نازل ہوا، جو اس رات سے پہلے زمین پر نہیں اترا تھا، اس نے اپنے پروردگار سے اجازت لی کہ مجھے سلام کرے، اس نے مجھے بشارت دی کہ فاطمہ جنتی خواتین کی سردار ہوں گی اور حسن و حسین جنتی نوجوانوں کے سردار ہوں گے۔'' ④

حضور ﷺ کی وفات پر آپ رضی اللہ عنہا کو اتنا غم ہوا کہ بیمار پڑ گئیں۔ اس کے بعد آپ کو کبھی ہنستے نہیں دیکھا گیا۔ چھ مہینے بعد ماہ رمضان ۱۱ھ میں انتقال فرمایا۔ عمر ۲۸ یا ۲۹ سال تھی۔ ⑤

ایک قول کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، دوسرے قول کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تیسرے قول کے مطابق حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ رات کے وقت بقیع میں تدفین ہوئی۔ حضرت علی، حضرت عباس اور فضل بن عباس رضی اللہ عنہم نے قبر میں اتارا۔ ⑥

☆☆☆

---

① سنن ابی داؤد، ح: ۵۲۱۷، کتاب الادب، ما جاء فی القیام
② صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة. باب فضائل فاطمة بنت النبی ﷺ
③ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابه. باب فضائل فاطمة بنت النبی ﷺ
④ سنن الترمذی، ح: ۳۷۸۳، کتاب المناقب، باب مناقب الحسن والحسین، اسناده حسن
⑤ توفیت فاطمة وهی بنت ثمان وعشرین، وکانت مولدها وقریش تبنی الکعبة، وبنت قریش الکعبة قبل مبعث النبی صلی الله علیه وسلم بسبع سنین و ستة اشهر. (المعجم الکبیر للطبرانی، ح: ۲۲/۳۹۸، ۳۹۹، ط مکتبة ابن تیمیه قاهره)
⑥ معرفة الصحابة لابی نُعَیم: ۶/۳۱۸۵ تا ۳۱۹۲، ط دار الوطن؛ الاستیعاب: ۴/۱۸۹۳؛ الاصابة: ۸/۲۲، ۲۵

نواسے اور نواسیاں

حضور اکرم ﷺ کا نسب اپنی بیٹیوں کی اولاد یعنی نواسوں اور نواسیوں ہی سے چلا ہے۔ ذیل میں بنات طیبات کی اولاد کا مختصر حال پیش کیا جا رہا ہے۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی اولاد:

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا ایک بیٹا تھا جس کا نام علی تھا۔ ایک بیٹی تھی جس کا نام اُمامہ تھا۔

اُمامہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت ﷺ بہت محبت فرماتے تھے۔ اُمامہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ سے اتنی مانوس تھیں کہ بعض اوقات نماز میں آپ ﷺ کے کاندھے پر چڑھ جاتی تھیں۔ آپ ﷺ آہستہ سے ان کو اتار دیتے تھے۔ ان کی والدہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا ۸ ھ میں انتقال کر گئی تھیں، اس لیے حضور ﷺ اس بن ماں کی بچی پر زیادہ شفقت فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار آنحضرت ﷺ کے پاس ہدیہ میں سونے کا ہار آیا۔ تمام ازواج مطہرات جمع تھیں اور اُمامہ رضی اللہ عنہا گھر کے ایک گوشے میں مٹی سے کھیل رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں یہ ہار اہلِ خانہ میں اپنی سب سے پیاری کو دوں گا۔'' سب کا گمان یہ تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو عطا فرمائیں گے لیکن آپ ﷺ نے اُمامہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور وہ ہار ان کے گلے میں ڈال دیا۔[1]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُمامہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی تو مُغیرہ بن نَوفل سے نکاح ہوا۔ مُغیرہ سے حضرت اُمامہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ایک لڑکا ہوا جس کا نام یحییٰ تھا۔[2]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بیٹے علی بن ابی العاص حضور ﷺ کے سب سے بڑے نواسے تھے۔ ہجرت مدینہ سے سات آٹھ سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔

عرب کے دستور کے مطابق انہوں نے شیر خوارگی کا زمانہ ایک دیہی آبادی بنو غاضر میں گزارا۔ چونکہ اس وقت تک ان کے والد نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اس لیے نبی اکرم ﷺ نے انہیں اپنی کفالت میں لے لیا تھا اور فرمایا:

''میں اس کی کفالت کا زیادہ حق دار ہوں۔''[3]

علی بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے نبی اکرم ﷺ کو بہت محبت تھی۔ فتح مکہ کے دن وہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اونٹنی پر سوار تھے۔[4]

---

① طبقات ابن سعد: ۸/۴۰، ط صادر ؛ اسد الغابة: ۷/۲۰ ط العلمية
② اسد الغابة: ۷/۲۰
③ اسد الغابة: ۴/۱۱۸ ؛ الاصابة: ۴/۲۶۹، ترجمة: علی بن ابی العاص رضی اللہ عنہ
④ المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۲/۴۲۳، ط مکتبة ابن تیمیة قاهرة

ایک قول کے مطابق لڑکپن میں ہی ان کی وفات ہوگئی تھی۔ دوسرے قول کے مطابق جوان ہو کر جنگِ یرموک میں شہید ہوئے۔[1]

حضرت رُقَیَّہ رضی اللہ عنہا کی اولاد:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت رُقَیَّہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نواسا ہوا جس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ مشہور روایات کے مطابق عبداللہ کا انتقال اپنی والدہ کی وفات سے ایک سال قبل یعنی سن ایک ہجری میں ہوگیا تھا۔ ان کی عمر چھ سال تھی۔[2]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد:

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں تین لڑکے حسن، حسین اور محسن اور دو لڑکیاں اُمّ کلثوم اور زینب تھیں۔ محسن کا بچپن میں انتقال ہوگیا۔ باقی اولاد جوان ہوئی اور ان سے نسب چلا۔[3]

اُمّ کلثوم کا نکاح ۱۷ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ ان سے ایک لڑکی رُقَیَّہ اور ایک لڑکا زید پیدا ہوئے۔[4]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد محبت تھی جس کی شہادت میں بکثرت احادیث موجود ہیں، ان کے مناقب میں کتبِ حدیث کے مستقل ابواب ہیں۔ (ان دونوں کے مفصل حالات حصۂ دوئم میں آرہے ہیں۔)

خلاصہ یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور نواسیاں کل آٹھ تھے:

① علی بن ابوالعاص
② اُمامۃ بنت ابی العاص
③ عبداللہ بن عثمان
④ حسن بن علی
⑤ حسین بن علی
⑥ محسن بن علی
⑦ اُمّ کلثوم بنتِ علی
⑧ زینب بنت علی

☆☆☆

---

① الاصابۃ: ۴/۲۶۹، ط العلمیۃ

② الاصابۃ: ۵/۱۶، ۱۷، ط العلمیۃ
ایک قول یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت رُقَیَّہ رضی اللہ عنہا کا عبداللہ نامی ایک اور بیٹا بھی ہوا تھا جنہیں عبداللہ اصغر کہا جاتا تھا۔ انہوں نے ۷۶ سال عمر پائی۔ (مروج الذھب: ۳/۷۵، ۷۶، ط الجامعۃ اللبنانیۃ)
یہ فقط المسعودی نے نقل کیا ہے اور وہ بھی بلاسند۔ تاریخ وانساب کے کسی دوسرے مآخذ میں اس کا ذکر نہیں۔

③ التبیین فی انساب قریش لابن قدامۃ، ص ۱۳۳

④ سیر اعلام النبلاء: ۳/۵۰۲، ط الرسالۃ؛ اسد الغابۃ: ۷/۳۷۷

چچا اور پھوپھیاں

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تیرہ تھے:

① سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ
② حضرت عباس رضی اللہ عنہ
③ ابو طالب۔ اصل نام عبد مناف تھا۔
④ ابولہب۔ اصل نام عبد العزّیٰ تھا۔
⑤ زبیر
⑥ عبد الکعبہ
⑦ ضِرار
⑧ قثم
⑨ مُصعب۔ ''عیداق'' کے عرف سے مشہور تھے۔
⑩ حارث
⑪ مُقوّم
⑫ مغیرہ
⑬ حَجل یا حجلاء

بعض علماء کا خیال ہے کہ حارث ہی کا نام مقوّم بھی تھا۔ اسی طرح مغیرہ کا نام حجل یا حجلاء تھا، اس طرح کل گیارہ چچا ہوئے، جن میں سے صرف حضرت عباس اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما مسلمان ہوئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھیاں چھ تھیں جن کے نام یہ ہیں:

① صَفیّہ رضی اللہ عنہا ② عاتکہ
③ بَرّہ ④ اروٰی
⑤ اُمیمہ ⑥ اُمّ حکیم بیضاء

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے اسلام لانے پر اتفاق ہے۔ اروٰی اور عاتکہ کے اسلام لانے میں اختلاف ہے۔[1]

☆☆☆

① طبقات ابن سعد: ۸/۴۱ تا ۴۳، ط صادر

اکابر صحابہ......عشرۂ مبشرہ

صحابہ میں سب سے بڑا مرتبہ عشرۂ مبشرہ کا ہے اور عشرۂ مبشرہ میں سے خلفائے راشدین سب سے افضل ہیں۔ یعنی

1. حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
2. حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ
3. حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ
4. حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ

ان چاروں کی باہمی فضیلت اسی ترتیب سے ہے۔ ان کے بعد درج ذیل چھ حضرات کا مرتبہ ہے:

5. حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ
6. حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ
7. حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ
8. حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ
9. حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ
10. حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ

ان حضرات کو عشرۂ مبشرہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ فضائل ومناقب میں باقی صحابہ کرام پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ان میں چند باتیں مشترک ہیں:

① یہ سب مہاجرین ہیں۔
② سب قریشی ہیں۔
③ سب بعثت کے ابتدائی دور میں اس وقت ایمان لائے جب مسلمانوں پر آزمائشوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، اس لیے یہ ﴿اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ﴾ میں داخل ہیں۔
④ انہیں ایک ہی مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی۔[1]

---

① سنن الترمذی، ح: ۳۷۴۷، ۳۷۴۸، ۳۷۵۷، کتاب المناقب

اہم نوٹ:
اگرچہ جنت کی بشارت بعض دیگر صحابہ کرام کو بھی الگ الگ مواقع پر دی گئی ہے۔ مگر انہیں عشرۂ مبشرہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔ کیوں کہ ان میں مذکورہ چار صفات یکجا نہیں ہیں۔ پس عشرۂ مبشرہ ایک اصطلاح ہے جو خاص صفات کے صحابہ کے لیے مخصوص ہے۔

تعارفِ عشرۂ مبشرہ

عشرۂ مبشرہ میں سے پہلے چار حضرات خلفائے راشدین ہیں۔ان میں سے حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے مناقب اور کارنامے گزشتہ اوراق میں پوری تفصیل کے ساتھ آچکے ہیں جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مفصل سیرت حصہ دوئم میں آرہی ہے۔اس لیے ان حضرات کے حالات یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔البتہ عشرۂ مبشرہ میں سے باقی چھ حضرات کے حالات پیشِ خدمت ہیں۔

☆☆☆

امین الامۃ

عامر بن عبداللہ......ابوعبیدہ بن الجرّاح رضی اللہ عنہ

حضرت ابوعبیدہ بن الجرّاح رضی اللہ عنہ اسلامی تاریخ کے ان مشاہیر میں سے ہیں جنہیں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی اعتماد حاصل رہا اور جو ہر میدان میں صفِ اوّل کے سپاہی بن کر اسلام کی خاطر لڑے۔دورِ فاروقی میں شام کی فتوحات کے دوران وہ لشکر کے سپہ سالارِ اعظم تھے۔یرموک کی فیصلہ کن جنگ انہی کی قیادت میں لڑی گئی۔ان کے مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اتفاق کرانے میں ان کی رائے کا بڑا دخل تھا۔

ان کا اصل نام عامر بن عبداللہ ہے، اپنی کنیت ابوعبیدہ سے زیادہ مشہور تھے اور اپنے دادا جرّاح کی طرف منسوب ہوکر ابوعبیدہ بن الجرّاح کہلاتے تھے۔ان کا نسبی تعلق بنوفہر سے تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دارِ ارقم کو مرکز بنانے سے پہلے ہی دامنِ نبوی سے وابستہ ہوکر انہوں نے ''السابقون الاوّلون'' میں شمولیت کا اعزاز پایا۔

حضرت ابوعبیدہ بن الجرّاح، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عبیدہ بن حارث بن عبدالمطّلب اور حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہم ایک ہی ساتھ اسلام لائے یعنی جن دس صحابہ کرام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی مجلس میں جنت کی بشارت دی ان میں ایک نام حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔

حبشہ کی طرف پہلی ہجرت میں شامل تھے مگر زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ واپس چلے آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ ہی میں رہے۔پھر ہجرتِ مدینہ کی سعادت ملی۔مدینہ منورہ میں مواخات کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا۔[1]

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱/ ۶۰۵، ط الرسالۃ

جہاد کی بعض مہمات میں انہیں امیر بنا کر بھیجا گیا۔ ان کی قیادت میں جانے والا ایک لشکر جو ساحل پر تعینات تھا، فاقوں کا شکار ہو گیا۔ اس دوران اللہ کی مدد نازل ہوئی اور ایک کوہ پیکر مچھلی ساحل پر آ چڑھی۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو پہلے تردد ہوا کہ کہیں مردار نہ ہو۔ پھر اپنی فقیہانہ بصیرت کے تحت ساتھیوں سے فرمایا: ''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے ہیں۔ اللہ کے راستے میں نکلے ہیں۔ اسے کھالو۔'' تین سو افراد کا یہ لشکر اٹھارہ دن تک اس غدائی ضیافت سے شکم سیر ہوتا رہا اور واپسی پر اس کے گوشت کا ذخیرہ ہمراہ تھا جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نوش فرمایا اور اسے غیبی مدد قرار دیا۔ [1]

آپ کی والدہ اُمیمہ بنت غنم رضی اللہ عنہا اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئیں مگر والد عبداللہ بن الجراح نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور جنگ بدر میں مشرکین کی طرف سے شرکت کی، لڑائی کے دوران باپ بیٹے کا آمنا سامنا ہو گیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ پہلے باپ کو بچنے کا موقع دیتے رہے مگر جب وہ حملے پر تلا رہا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا۔ اس ایمانی غیرت کے مظاہرے پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [2]

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ

(جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں آپ ان کو نہ دیکھیں گے کہ وہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول کے برخلاف ہیں گو وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ ہی کیوں نہ ہو۔) [3]

آپ کو غزوہ بدر سمیت تمام غزوات میں شرکت کی فضیلت حاصل ہے۔ غزوۂ احد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں پیش پیش رہے۔ چہرۂ انور میں فولادی ٹوپی کی حفاظتی زنجیر کی کڑیاں کھب گئی تھیں۔ کوئی ایسا اوزار موجود نہ تھا کہ انہیں کھینچ کر نکال لیا جاتا۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دانتوں سے ان کڑیوں کو کھینچا، اس کوشش میں ان کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ کر گر گئے۔ اس سعادت کا اثر یہ ہوا کہ ان کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گیا۔

کہا جاتا تھا: ''دانت ٹوٹ جانے کے باوجود حسین دکھائی دینے والا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔'' [4]

فتوحات کے ایام میں نجران کے پادریوں نے دربارِ رسالت میں درخواست کی:

'' اِبْعَثْ اِلَيْنَا رَجُلًا اَمِيْنًا '' (ہمارے پاس کوئی قابل اعتماد اور دیانت دار انسان بھیج دیجیے۔)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَاَ بْعَثَنَّ اِلَيْكُمْ رَجُلًا اَمِيْنًا حَقَّ اَمِيْنٍ.

(میں تمہارے پاس ایسا امین بھیجوں گا جو امین ہونے کا حق ادا کر دے گا۔)

پھر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو ان کے پاس بھیج دیا۔

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۴۳۶۰، کتاب المغازی، غزوۃ سیف البحر؛ صحیح مسلم، ح: ۵۱۰۹، الصید والذبائح، اباحة میتات البحر
[2] المعجم الکبیر للطبرانی: ۱/۱۵۴، ط مکتبة ابن تیمیة؛ الاصابة: ۳/۴۷۶
[3] سورۃ المجادلة، آیت: ۲۲
[4] دلائل النبوۃ للبیہقی: ۳/۲۶۳، ۲۶۴

یوں یہ ''امین الامۃ'' کے خطاب سے نوازے گئے۔ یہ ان پر نبی اکرم ﷺ کے کامل اعتماد کی دلیل ہے۔ ①
ایک موقع پر آپ نے فرمایا:

إِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَمِينًا وَأَمِينُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَبُو عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ

(بے شک ہر اُمت کا ایک امین ہوتا ہے اور اس اُمت کے امین ابوعبیدہ بن الجرّاح ہیں۔) ②

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں پہلے بیت المال کا نگران مقرر کیا تھا۔ پھر انہیں شام بھیجے جانے والے لشکر کی قیادت سونپی۔ ملک شام کی فتوحات میں ان کا نمایاں کردار ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں پورے شام کا امیر عساکر اور افواج کا سپہ سالار بنا دیا تھا۔ ③

شام کی فتوحات کے بعد مسلمانوں کے پاس مال و دولت کی کوئی کمی نہیں رہی تھی۔ اس کی وجہ سے زندگیوں میں دورِ رسالت کی بہ نسبت کچھ نہ کچھ تغیر آ گیا تھا۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سادہ رہن سہن کے عادی تھے مگر اپنے عہدے اور منصب کے لحاظ سے کچھ سواریاں اور غلام ساتھ رکھتے تھے۔ مگر اس ضروری متاع کے ہونے پر بھی رویا کرتے تھے۔

ایک دن روتے روتے کہہ اٹھے: ''نبی اکرم ﷺ نے ایک بار مسلمانوں کو ملنے والی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا تھا: 'اگر تمہیں زندگی نے مہلت دی تو بس تمہیں تین خادم کافی ہوں گے۔ ایک تمہاری خدمت کے لیے، ایک سواری کی دیکھ بھال کے لیے اور ایک گھر کے کاموں کے لیے۔ اور تین سواریاں کافی ہوں گی۔ ایک سفر کے لیے، ایک بار برداری کے لیے اور ایک تمہارے غلام کے لیے، مگر آج میرا گھر غلاموں سے اور میرا اصطبل سواریوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس حالت میں نبی اکرم ﷺ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ جبکہ وہ ہمیں وصیت فرما گئے تھے کہ تم میں سے مجھ سے قریب تر اور محبوب تر وہی ہوگا جو اسی حال پر رہے جس پر میں اسے چھوڑ کر جاؤں۔'' ④

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں شام کا گورنر مقرر کر دیا تھا، اس کے باوجود ان کی زندگی بہت سادہ تھی۔ ان کے حصے میں جو مالِ غنیمت آتا، وہ زیادہ تر راہِ خدا میں خرچ کر دیتے۔ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خادم کے ہاتھ انہیں چار ہزار دینار بھجوائے، ساتھ ہی خادم کو تاکید کی کہ دیکھنا وہ کیا کرتے ہیں۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اسی وقت وہ سب دینار خیرات کر دیے۔ خادم نے واپس آ کر ماجرا سنایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہہ اٹھے:

''اللہ کا شکر ہے جس نے مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا کیے جن کا عمل ایسا ہے۔'' ⑤

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شام تشریف لے گئے تو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ نہایت درویشانہ حالت میں ہیں۔ ایک

---

① صحيح البخاري، ح: ۳۷۴۴، كتاب المناقب؛ التاريخ الاوسط: ۴۰/۱
② سنن الترمذي، ابواب المناقب، حديث حسن صحيح
③ تاريخ خليفة بن خياط، ص ۱۲۳
④ مسند احمد، ح: ۱۶۹۶
⑤ سير اعلام النبلاء: ۱۷/۱، ط الرسالة

عام سی اونٹنی پر سوار ہیں جس کی رسی بھی بہت معمولی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا گھر کا اثاثہ بستر، پانی کی مشک اور ایک پیالے پر مشتمل ہے۔ باقی جہاد کا سامان تھا یعنی ایک تلوار، ایک ڈھال اور سواری کی زین۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''آپ یہاں کے امیر ہیں۔ کچھ ضروری سامان تو رکھ لیتے۔''

وہ بولے: ''امیر المؤمنین! ہمارے گزارے کے لیے یہ کافی ہو جاتا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: ''آپ کا کھانا کہاں ہے؟''

انہوں نے کچھ پسے ہوئے جو لا کر سامنے رکھ دیے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا:

''ابوعبیدہ! تمہارے سوا ہم سب کو دنیا نے بدل دیا ہے۔''[1]

ان کی انہی خوبیوں کی وجہ سے عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

''میری تمنا صرف یہ ہے کہ کاش! ابوعبیدہ جیسے لوگوں سے میرا گھر بھرا ہوتا۔''[2]

آپ کا کلام مختصر مگر بڑا مؤثر ہوتا تھا۔ جنگ سے پہلے مسلمانوں کو جوش دلاتے، جہاد اور مرتبۂ شہادت کے ذریعے گناہوں سے معافی کی امید دلاتے۔ صفوں کے درمیان گھوم پھر کر کہتے:

''کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے کپڑے اجلے ہیں مگر ان کا دین میلا ہے۔ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو خود کو معزز بنانے کی کوشش میں اپنے آپ کو بے عزت کر رہے ہیں۔ لوگو! ماضی کے گناہوں کو اب حال کی نیکیوں سے دھو ڈالو۔''[3]

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نہایت متقی، خدا ترس اور رقیق القلب انسان تھے۔ اس قدر بلند رتبہ ہو کر بھی تواضع و انکسار اور فکرِ آخرت کی وجہ سے بسا اوقات کہا کرتے تھے: ''کاش! میں کوئی دنبہ ہوتا جسے لوگ ذبح کر کے گوشت کھا لیتے اور شوربا پی لیتے۔'' کبھی فرماتے: ''کاش! میں چولہے کی راکھ ہوتا جسے ہوائیں اڑا کر لے جاتیں۔''[4]

مطلب یہ کہ آخرت کے حساب سے بچنے کا کوئی بہانہ بن جاتا۔

۱۸ھ میں اُردن اور شام میں زبردست طاعون پھیلا جس میں ہزاروں افراد جاں بحق ہوئے۔ امین الامت بھی اس کی لپیٹ میں آ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی عمر ۵۸ برس تھی۔[5]

رضی اللہ تعالٰی عنہ وارضاہ

☆☆☆

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱/۷، ط الرسالۃ
② مستدرک حاکم، ح: ۵۱۴۴
③ المعرفۃ والتاریخ لابی یوسف یعقوب بن سفیان الفسوی: ۲/۴۲۷، ط مؤسسۃ الرسالۃ
④ سیر اعلام النبلاء: ۱/۱۸، ط الرسالۃ
⑤ سیر اعلام النبلاء: ۱/۲۳، ط الرسالۃ

جانثارِ بارگاہِ رسالت......زندہ شہید

الفیاض......ہم زلفِ پیغمبر......دامادِ صدیق اکبر

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سچے جانثاروں میں سے ایک ہیں جن کی شجاعت، قربانی اور حمیت دینی پر اسلامی تاریخ کو فخر ہے۔ ان کا نسبی تعلق قریش کی شاخ بنو تیم سے تھا۔ وہ السابقون الاوّلون اور عشرۂ مبشرہ میں شامل تھے۔ وہ ان پانچ حضرات میں سے ایک تھے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، وہ ان چھ حضرات میں شامل تھے جنھیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت سے پہلے خلافت کے لیے منتخب فرمایا تھا۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دامادی کا شرف بھی حاصل تھا۔ آپ کی والدہ کا نام صَعْبہ بنت عبداللہ الحضرمی تھا۔ وہ یمنی خاتون تھیں اور حضرت علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔ [1]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے جنگِ احد میں انھوں نے جس سرفروشی کا مظاہرہ کیا، اس کی روداد کا حرف حرف حدیث وسیرت کے اوراق میں درخشاں دکھائی دیتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر زخموں کی وجہ سے غشی طاری تھی۔ طلحہ رضی اللہ عنہ انہیں اپنی کمر پر لاد کر الٹے قدموں محفوظ مقام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مشرکین جب بھی قریب آتے، طلحہ رضی اللہ عنہ لڑ بھڑ کر انہیں مار بھگاتے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آگے لے کر جاتے۔ اس دوران قریش کے تیروں کو ہتھیلیوں پر روکتے روکتے عمر بھر کے لیے ایک ہاتھ سے محروم ہوگئے۔ سر پھٹ گیا۔ پورے جسم پر ۲۴ زخم لگے۔ اس حالت میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دیوار بنے کھڑے رہے۔ [2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جانبازی دیکھ کر فرمایا: اَوْجَبَ طَلْحَةُ. (طلحہ نے جنت واجب کر لی۔) [3]

اس دن حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زخمی ہاتھ کی تکلیف محسوس کرتے ہوئے "حس حس" کہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم حس حس کی بجائے بسم اللہ کہتے تو جنت میں بنا ہوا اپنا گھر یہاں دنیا میں رہتے ہوئے دیکھ لیتے۔" [4]

دشمنوں سے بچاؤ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب اُحد پہاڑ کی ایک چٹان پر چڑھنے لگے تو زرہوں کے وزن کی وجہ سے نہ چڑھ سکے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نیچے بیٹھ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان پر قدم مبارک رکھ کر چٹان پر چڑھے۔ [5]

---

① الاصابة: ۳/۴۳۰، ط العلمية

② سیر اعلام النبلاء: ۱/۳۲، ط الرسالة

③ سنن الترمذی، ح: ۳۷۳۹

④ الاصابة: ۳/۴۳۱

⑤ اسد الغابة: ۳/۸۴ ط العلمية

حضور ﷺ فرماتے تھے: ”طلحہ ان لوگوں میں سے ہیں جو قربانی کا حق ادا کر چکے ہیں۔“ [1]

یہ بھی فرمایا:

”مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَنْظُرَ اِلَى الشَّهِيْدِ يَمْشِيْ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ فَلْيَنْظُرْ اِلٰى طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ.“

(جو شخص زمین پر چلتے پھرتے زندہ شہید کو دیکھنا چاہے، وہ طلحہ بن عبید اللہ کو دیکھ لے۔) [2]

ایک حدیث میں ہے: ”جس نے دنیا میں چلتے پھرتے جنتی کو دیکھنا ہو، وہ طلحہ کو دیکھ لے۔“ [3]

عجیب بات یہ ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے چار شادیاں کیں اور ان کی ہر بیوی کی بہن آنحضرت ﷺ کی زوجہ مطہرہ تھیں۔ چنانچہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی ایک بیوی حضرت اُم کلثوم بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا ہیں جو اُم المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہن ہیں۔ دوسری بیوی حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا ہیں جو اُم المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی بہن ہیں۔ تیسری بیوی حضرت فارعہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا ہیں جو اُم المؤمنین حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا کی بہن ہیں، چوتھی بیوی حضرت رُقیّہ بنت ابی اُمیہ رضی اللہ عنہا ہیں جو اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی بہن ہیں۔ [4]

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ تجارت پیشہ اور نہایت مالدار آدمی تھے۔ کاروباری مصروفیات کے باوجود تمام غزوات میں شریک رہے، البتہ غزوۂ بدر کے موقع پر شام کے تجارتی سفر پر گئے ہوئے تھے، اس لیے شامل نہ ہو سکے۔ اس محرومی کا انہیں بہت قلق تھا۔ تاہم نبی اکرم ﷺ کو اپنے اس جانثار کا اس قدر خیال تھا کہ بدر کے مال غنیمت میں ان کا بھی حصہ رکھا اور انہیں غزوے کے اجر میں بھی شریک شمار کیا۔ [5]

فیاضی اور سخاوت کا یہ حال تھا کہ ہر مہم میں صحابہ اور ساتھیوں پر دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی وجہ سے دربارِ نبوت سے غزوۂ اُحد کے موقع پر ”طَلْحَةُ الْخَيْر“، غزوہ ذی العشیرہ میں ”طَلْحَةُ الْفَيَّاض“ اور غزوۂ خیبر میں ”طَلْحَةُ الْجُوْد“ کے خطابات ملے۔ [6]

ایک سفرِ جہاد میں آنحضرت ﷺ کا گزر ایک کنویں پر ہوا، آنحضرت ﷺ نے اس کے پانی کو پسند فرمایا، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے وہ کنواں خرید کر صدقہ کر دیا، اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

”مَا اَنْتَ يَا طَلْحَةُ اِلَّا فَيَّاض.“ (اے طلحہ! تم یقیناً بڑے سخی اور فیاض ہو۔) [7]

---

1. سنن الترمذی، ح: ۳۷۴۲
2. سنن الترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب طلحة رضی اللہ عنہ
3. مجمع الزوائد، ح: ۱۴۸۱۲
4. الاصابة: ۴۳۲/۳ ط العلمیة
5. سیر اعلام النبلاء: ۲۵/۱، ط الرسالة
6. المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۲/۱، ط مکتبة ابن تیمیة قاهرة
7. الاصابة: ۴۳۰/۳ ط العلمیة

ایک بار ''حضر موت'' کی تجارت سے سات لاکھ کی رقم نفع میں آئی۔ پوری رات کروٹیں بدلتے گزاری۔ اہلیہ اُم کلثوم بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا نے وجہ پوچھی تو فرمایا:

''جس شخص کے گھر میں اتنا پیسہ ہو، وہ اپنے رب سے کیا امید رکھ کر سوئے؟''

اہلیہ نے کہا: ''صبح ہوتے ہی برتن بھر بھر کے دوستوں میں تقسیم فرمادیں۔''

آپ نے کہا: ''واقعی تم نیک باپ کی نیک بیٹی ہو۔'' صبح ہوتے ہی مہاجرین وانصار میں وہ ساری رقم لٹادی۔ یہاں تک کے گھر کے اخراجات کے لیے سات لاکھ میں سے صرف ایک ہزار بچ پائے۔

ایک بار ایک دیہاتی نے رشتہ داری کا واسطہ دے کر امداد مانگی۔ آپ نے انہی دنوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے تین لاکھ درہم کی ایک زمین خریدی تھی۔ وہ بیچ کر ساری قیمت اس کے حوالے کردی۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت شروع ہوتے ہی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سابق خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے لیے متحرک ہوگئے جنہیں بے قصور مدینہ منورہ میں شہید کردیا گیا تھا۔ حالات اس حد تک ابتر تھے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہوکران کے بالمقابل آگئے۔ مسئلہ قصاص میں صحابہ کی ان دونوں جماعتوں کی رائے میں فقہی واجتہادی اختلاف بھی تھا۔ پھر بھی فریقین حتی الامکان لڑائی سے بچنا چاہتے تھے تاہم اسی دوران شر پسندوں کی ہنگامہ آرائی سے جنگِ جمل پیش آئی جس کی ابتداء ہی میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ ایک تیر لگنے سے شہید ہوگئے۔[2]

رضی اللّٰہ تعالٰی عنه وارضاہ

☆☆☆

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱/۳۱، ط الرسالة ...... آج کل کے لحاظ سے یہ کم وبیش ساڑھے سات کروڑ روپے بنیں گے۔

② تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۱۸۶، اس لڑائی کی تفصیل حصہ دوئم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت کے تحت آئے گی۔

حواریِ رسول ..... دامادِ صدیق اکبر

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد اور نہایت محبوب صحابی تھے۔ بچپن یتیمی میں گزرا۔ ان کی والدہ حضرت صَفِیّہ رضی اللہ عنہا خود نہایت دلیر تھیں۔ بیٹے کی تربیت بھی اس طرح کی کہ ڈر اور خوف کے الفاظ ان کے لیے بے معنی بنا دیے۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری یعنی محافظِ خاص تھے۔ آپ ان دس صحابہ کرام میں سے ایک ہیں جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی مجلس میں جنت کی بشارت دی تھی، آپ ان چھ حضرات میں بھی شامل تھے جنہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شہادت کے وقت خلافت کے لیے منتخب فرمایا تھا۔

زبیر رضی اللہ عنہ نے سولہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ اسلام لانے کی پاداش میں ان کے چچا ان پر سخت تشدد کرتے تھے، انہیں چٹائی میں لپیٹ کر دھونی دیتے تھے مگر ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ [1]

آپ اسلام قبول کرنے کے آغاز سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت تک جانثاری کا حق ادا کرتے رہے۔ ابھی لڑکے ہی تھے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قریش کے ہاتھوں گرفتاری کی افواہ پھیل گئی۔ یہ سنتے ہی تلوار اٹھائے دیوانہ وار نکل کھڑے ہوئے۔ جو دیکھتا حیران رہ جاتا کہ یہ لڑکا تلوار سونتے کہاں بھاگا جا رہا ہے۔ آخر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دکھائی دے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماجرا پوچھا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''مجھے خبر ملی تھی کہ آپ کو پکڑ لیا گیا ہے۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس والہانہ محبت پر خوش ہو کر دعائیں دیں۔ یہ پہلی تلوار تھی جو اسلام کے لیے بے نیام ہوئی۔ [2]

جوانی میں ایسے توانا اور دراز قامت ہوئے کہ گھوڑے پر سوار ہوتے تو پاؤں زمین پر لگتے تھے۔ [3]

بازوؤں میں طاقت کا یہ عالم تھا کہ غزوۂ خندق میں ایک زرہ پوش گھڑسوار مقابلے پر آیا، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اس کے سر پر اس شدت سے وار کیا کہ تلوار اس کے فولادی خود، زرہ اور جسم کی ہڈیوں کو کاٹتی ہوئی گھوڑے کی زین تک چلی گئی۔ [4]

آپ کو ہجرتِ حبشہ اور ہجرتِ مدینہ دونوں کی سعادت نصیب ہوئی۔

غزوۂ بدر میں لشکرِ اسلام میں صرف دو گھوڑے تھے۔ بائیں بازو کے واحد گھڑسوار مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ تھے اور دائیں بازو کے واحد گھڑسوار زبیر رضی اللہ عنہ تھے جو زرد عمامہ پہنے ہوئے تھے۔

---

1. الاصابة: ۴۵۹/۲، ط العلمية
2. مصنف ابن ابی شيبة، ح: ۱۹۵۲۰، ط الرشد
3. سير اعلام النبلاء: ۴۱/۱، ۴۲، ط الرسالة
4. سير اعلام النبلاء: ۵۱/۱، ط الرسالة

یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "إِنَّ الْمَلَائِكَةَ نَزَلَتْ عَلٰى سِيمَاءِ الزُّبَيْرِ"
"فرشتے بھی زبیر کے لباس میں نازل ہوئے ہیں۔"①

مدینہ ہجرت سے کچھ پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اسماء رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔ ہجرت کے بعد ان کے ہاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔ یہ مہاجرین میں پہلی نرینہ اولاد تھی جس کی بڑی خوشی منائی گئی۔②

غزوۂ خندق کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے بنوقریظہ کے یہودیوں کی سرگرمیوں سے مطلع رہنے کے لیے فرمایا: "بنوقریظہ کی خبر کون لائے گا؟" حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے فوراً خود کو پیش کر دیا، آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر فرمایا:

"إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيًّا وَ حَوَارِيَّ الزُّبَيْرُ" (ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے، میرا حواری زبیر ہے۔)③

اسی جنگ میں ایک موقع پر ان کی سرفروشی اور جانبازی دیکھ کر حضور ﷺ نے بے ساختہ فرمایا تھا:
"میرے ماں باپ تجھ پر قربان۔"④

غزوۂ خیبر میں یہودی پہلوان مَرحب قتل ہوا تو اس کے بعد اس کا بھائی یاسر مسلمانوں کو للکارنے لگا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اس سے لڑنے نکلے اور اسے جہنم واصل کر دیا۔⑤

فتح مکہ میں آپ حضور ﷺ کے خاص دستے کے علمبردار تھے۔⑥

ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو جنت کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا:
"اَلزُّبَيْرُ فِي الْجَنَّةِ." (زبیر جنتی ہیں۔)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایک بار حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:
"إِنَّهُ لَا خَيْرُهُمْ وَ أَحَبُّهُمْ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ."
(بے شک وہ لوگوں میں سب سے بہتر اور رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب تھے۔)⑦

ان کی ساری زندگی ایک مجاہد کی طرح گزری۔ ان کے بدن خاص کر سینے اور کاندھوں پر ان گہرے زخموں کے نشانات گڑھوں کی صورت میں باقی تھے جو جہاد میں انہیں لگتے رہے۔ حضور ﷺ نے انہیں کبھی کسی لشکر کا امیر بنایا نہ کوئی اور بڑا عہدہ سونپا۔ یہی طرزِ عمل ان کے ساتھ خلفائے راشدین کا رہا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اپنے مقام و مرتبے کے

---

① مسند البزار، ح: ۲۳۳۸؛ المعجم الكبير للطبراني: ۱/۱۲۰، ط مكتبة ابن تيميه قاهره
② سير اعلام النبلاء: ۳/۲۶۵، ط الرسالة
③ اسد الغابة: ۲/۳۰۷
④ مسند احمد، ح: ۱۴۰۹؛ سنن ابن ماجة، ح: ۱۲۳
⑤ سیرت ابن هشام: ۲/۳۳۴
⑥ صحيح البخاري، ح: ۴۲۸۰، كتاب المغازي، باب اين ركز النبي ﷺ الراية
⑦ سنن الترمذي، ح: ۳۷۴۱

باوجود ایک معمولی افسر کی طرح جہاد میں حصہ لیتے رہے جو ان کے اخلاصِ کامل کی واضح دلیل ہے۔ [1]

یرموک کی فتح میں ان کے والہانہ جذبۂ شہادت اور حیرت انگیز شجاعت و بسالت کا بہت بڑا دخل تھا۔ اس دن وہ رومیوں کی اڑھائی لاکھ فوج میں ایک سرے سے داخل ہوئے اور ان کو چیرتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے۔ پھر دوسری طرف سے صفوں کو الٹتے ہوئے اسی طرح واپس آگئے۔ اس دوران ایک جگہ رومیوں نے ان کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر گھیر لیا۔ ان کے حملے سے زبیر رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے مگر شیر کی طرح لڑتے ہوئے انہیں مار کاٹ کر نرغے سے نکل آئے۔ اس وقت تک ان کے کاندھے پر گردن کے پاس ایک بہت گہرا زخم لگ چکا تھا۔ بدر میں لگنے والے زخم کے بعد گردن کا یہ دوسرا زخم تھا جو کبھی نہ بھر سکا۔ ان کے چھوٹے بچے ان گڑھوں میں انگلیاں ڈال کر کھیلا کرتے تھے۔ ان کی تلوار کی دھار جنگوں میں بکثرت استعمال ہونے کی وجہ سے دانے دار ہوگئی تھی۔ [2]

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی تعریف میں فرماتے تھے:

اَقَامَ عَلٰی عَهْدِ النَّبِيِّ وَهَدْيِهٖ ۔۔۔ حَوَارِيُّهٗ وَالْقَوْلُ بِالْفِعْلِ يَعْدِلُ

''وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد اور سیرت پر قائم رہے، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری ہیں جن کا قول اور فعل یکساں ہے۔''

هُوَ الْفَارِسُ الْمَشْهُوْرُ وَالْبَطَلُ ۔۔۔ الَّذِيْ يَصُوْلُ اِلٰى مَا كَانَ يَوْمٌ مُحَجَّلُ

''وہ ایسے مشہور شہسوار اور بہادر ہیں کہ اس دن وہ حملہ کرتے تھے جب لوگ چھپتے پھرتے تھے۔''

اِذَا كَشَفَتْ عَنْ سَاقِهَا الْحَرْبُ حَشَّهَا ۔۔۔ بِاَبْيَضَ سَبَّاقٍ اِلَى الْمَوْتِ يَرْقُلُ

''جب لڑائی اپنی آگ روشن کرتی تھی تو وہ تلوار لے کر سب سے پہلے موت کی طرف دوڑتے تھے۔'' [3]

ہجرت کے بعد ابتدائی سال بہت غربت میں گزرے۔ غزوۂ بنو نضیر کے بعد تقسیم کی جانے والی زمینوں میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی ایک باغ عنایت کیا تھا جس سے ان کے حالات بہتر ہوگئے۔ [4]

اللہ نے فتوحات کے دور میں بڑی فراخی نصیب فرمادی تھی۔ ان کے ایک ہزار غلام تھے جو کمائی کر کے انہیں دیتے تھے لیکن حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اس قدر فیاض، سخی اور فراخ دل تھے کہ گھر میں غلاموں کی کمائی میں سے ایک پائی بھی نہیں لاتے تھے، تمام پیسے صدقہ کر دیتے تھے۔ [5]

دورِ فاروقی میں مصر کی فتح میں عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ہم رکاب رہے۔ فسطاط اور اسکندریہ کی فتح میں آپ کا بہت اہم کردار رہا۔ [6]

---

① صحیح البخاری، ح: ۳۱۲۹، کتاب فرض الخمس، باب برکة الغازی فی ماله حیا ومیتا

② صحیح البخاری، ح: ۳۹۷۵، کتاب المغازی، باب قتل ابی جهل

③ اسد الغابة: ۲/۳۰۷

④ صحیح البخاری، ح: ۳۱۵۱، کتاب فرض الخمس، باب ما کان النبی ﷺ یعطی المؤلفة

⑤ الاصابة: ۲/۴۶۰، ط العلمیة ⑥ فتوح البلدان، ص ۲۱۰، ط الهلال

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک بار سخت بیمار ہوئے، بار بار نکسیر پھوٹ رہی تھی۔ حج پر جانے سے بھی رہ گئے۔ حالت نازک ہوئی تو رفقاء کو اہم امور کی وصیتیں کر دیں مگر جانشین کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ تاہم لوگوں میں جانشینی کے متعلق بات چیت چل پڑی تھی۔ ان کے ایک نمائندے نے آکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا: ''آپ اپنا جانشین مقرر فرما دیں۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کیا لوگ ایسی باتیں کر رہے ہیں؟''

نمائندے نے عرض کیا: ''جی ہاں'' دریافت فرمایا: ''وہ کس کے متعلق کہہ رہے ہیں؟''

نمائندہ خاموش رہا۔ اب دوسرے نمائندے نے آکر یہی بات کہی اور مذکورہ سوال پر وہ بھی چپ ہو گیا۔

آپ رضی اللہ عنہ نے خود ہی اندازاً کہا: ''شاید وہ زبیر کے متعلق کہہ رہے ہوں گے؟'' جواب ملا: ''جی ہاں۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! وہ بہترین آدمی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ترین فرد ہیں۔''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں جنگ جمل پیش آئی جس میں مسلمان باہم برسرِ پیکار ہوئے۔ مگر زبیر رضی اللہ عنہ بروقت متنبہ ہو کر جنگ سے دامن بچاتے ہوئے ایک طرف نکل گئے۔ بصرہ سے ۲۱ میل دور ایک بدبخت عمرو بن جرموز نے اپنی ٹولی کے ساتھ تعاقب کر کے انہیں شہید کر ڈالا۔ ان کی عمر ۶۴ سال تھی۔ یہ جمادی الآخرۃ ۳۶ھ کا واقعہ ہے۔[2]

دنیا سے اس حال میں گئے کہ کوئی دینار و درہم پاس نہ تھا۔ ہاں زمینیں بہت تھیں۔ اپنے بیٹے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو وصیت کر گئے کہ جائیداد بیچ کر قرض ادا کر دینا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے قرض کا حساب لگایا تو وہ ۲۲ لاکھ تھا۔[3]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے اللہ پر اعتماد کا یہ حال تھا کہ بیٹے کو تاکید کی تھی: ''اگر قرض ادا نہ ہو رہا ہو تو میرے آقا و مولا سے مدد مانگ لینا۔'' عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نہ سمجھ سکے کہ آقا و مولا کا مطلب کیا ہے۔ پوچھ ہی لیا: ''آپ کے مولا کون؟'' فرمایا: ''اللہ''

---

① صحیح البخاری، ح: ۳۷۱۷، کتاب المناقب، باب مناقب الزبیر رضی اللہ عنہ ...... یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے سال ۲۴ ہجری کا واقعہ ہے۔ اس سال یہ مرض عام تھا اس لیے اسے سنۃ الرعاف یا عام الرعاف کہا جانے لگا۔ (تاریخ ابی زرعہ دمشقی، ص ۱۸۴، ط مجمع اللغۃ دمشق)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اس دور میں خلیفہ کی اہلیت کے لیے نیکی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تر ہونا اصولی چیز تھی۔ یہ اصول آج بھی اس شکل میں قابلِ عمل ہو سکتا ہے کہ ایسے شخص کو چنا جائے جس کی بارگاہِ رسالت میں قبولیت کا زیادہ امکان ہو جس کا معیار سنت کی زیادہ پابندی اور اسلام کے لیے زیادہ فکر مندی ہے۔

نوٹ: مذکورہ روایت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چوتھے خلیفہ راشد ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ فقط اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کچھ لوگ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اگلا خلیفہ دیکھنا پسند کرتے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے رجحان کا اندازہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جواب سے فقط یہ ثابت ہوتا ہے کہ زبیر رضی اللہ عنہ بھی بہت مناسب تھے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ افضل ترین تھے، یا حضرت علی رضی اللہ عنہ اہلیت میں ان سے کم تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل خلفائے ثلاثہ کے بعد سب سے زیادہ ہیں۔ ان کی خلافت پر مستقل دلائل ہیں جو کتبِ عقائد میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ حصہ دوم میں ہم بھی اس مسئلے کو ضروری وضاحت کے ساتھ پیش کریں گے۔

② الاستیعاب: ۵۱۵/۲؛ الاعلام للزرکلی: ۴۳/۳

③ صحیح بخاری میں فوجدته الفی الف و مائتی الف کے الفاظ ہیں۔ (ح: ۳۱۲۹، کتاب فرض الخمس، باب برکة الغازی فی ماله حیا و میتا) بعض حضرات نے اس کا ترجمہ دو کروڑ دو لاکھ کیا ہے۔ اسی طرح بعض حضرات نے البدایہ والنہایہ (تحت وفیات: ۳۶ ہجری) کے الفاظ جمیع ما ترکه من الدین والوصیة والمیراث تسعة وخمسین الف الف وثمان مائة الف میں رقم کا ترجمہ ۵۸ کروڑ ۸ لاکھ کیا ہے مگر یہ درست نہیں۔ الف الف کا مطلب ایک کروڑ نہیں، ایک ملین (دس لاکھ) ہے۔ (معجم اللغة العربیة المعاصرة: ۲۱۲۵/۳)

حضرت مولانا ظہور الباری اعظمی نے صحیح بخاری کے ترجمہ مع مختصر شرح میں، الف الف کو دس لاکھ ہی پر محمول کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفهیم البخاری: ۲۰۶/۲)

ان کی شہادت کے بعد حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو اس قرض کا قصہ معلوم ہوا تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

''بھتیجے! میرے بھائی پر کتنا قرض تھا؟''

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے پوری مقدار نہ بتائی بلکہ قرض کا کچھ ہی حصہ ظاہر کیا، اس پر بھی حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فکر مند ہو کر کہنے لگے: ''مجھے نہیں لگتا کہ تم یہ قرض ادا کر سکو گے۔ لہٰذا ضرورت پڑے تو میری مدد لے لینا۔''

لیکن خلاف توقع جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے قرضے ادا کرنے کے لیے زمینیں فروخت کرنا شروع کیں تو بہت اچھی قیمت لگ گئی۔ فقط غابہ کی اراضی جو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ایک لاکھ ستر ہزار کی خریدی تھی، سولہ لاکھ میں بکی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اعلان کر دیا کہ جس کا میرے والد پر قرض ہو، وہ وصول کر لے۔ جب قرضے چکا دیے تو خاندانی ورثاء نے اصرار کیا کہ اب میراث تقسیم کی جائے مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! چار سال تک حج کے موقع پر اعلان کراؤں گا کہ جس کا قرض ہو وہ آ کر وصول کر لے۔ اس کے بعد میراث تقسیم ہوگی۔''

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جب بھی قرض ادا کرنے سے عاجز ہوا، فوراً دعا کی:

''زبیر کے مولا یہ قرض ادا کر دے۔'' بس قرض کی ادائیگی کا انتظام ہو جاتا تھا۔

چار سال تک جب کسی طرف سے کوئی مطالبہ نہ بچا تب باقی جائیداد کو ورثاء میں تقسیم کیا گیا۔ اس میں اتنی برکت ہوئی کہ ہر اہلیہ کو بارہ لاکھ ملے۔ فروخت شدہ اور ورثاء میں تقسیم کی گئی جائیدادوں کی جملہ قیمت پانچ کروڑ دو لاکھ بنی۔[1]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے بہت گہرا تعلق تھا۔ دونوں قریشی تھے، دونوں عشرۂ مبشرہ میں تھے۔ عمر قریب قریب تھی، ایک ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئے، دونوں ہم زلف تھے یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے داماد تھے، غیرت و شجاعت، دلیری اور جانبازی کے لحاظ سے ہم مزاج تھے، دونوں تجارت پیشہ تھے۔ دونوں عمر بھر ساتھ رہے اور جنگ جمل میں شہید ہوئے۔ حدیث و سیر و تواریخ میں دونوں کا نام بھی ایک ساتھ لیا جاتا رہا اور آج تک یہ دونوں نام ایک ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ رضی اللّٰہ تعالٰی عنھما وارضاھما

☆☆☆

---

① صحیح البخاری، ح: ۳۱۲۹، کتاب فرض الخمس، باب برکۃ الغازی فی مالہ حیا ومیتا

نوٹ ❶: یہ رقم دراہم میں ہے۔ روپوں میں لگائیں تو رقم کم و بیش اڑھائی سو گنا بڑھ جائے گی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پر جو قرض تھا یعنی ۲۲ لاکھ درہم، وہ آج کل کے ۵۵ کروڑ روپے کے لگ بھگ ہوں گے۔ مگر ان حضرات کے ہاں دولت جس طرح بکثرت آتی تھی، اسی دریا دلی کے ساتھ راہ خدا میں خرچ بھی ہوتی تھی۔

نوٹ ❷: بخاری کی اس روایت میں قواعد میراث اور حسابی ضابطے سے کچھ اشکال ہے، اس لیے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت یوں کی ہے:

☆ ۲۲ لاکھ قرض ادا کیا گیا۔ (الفاالف ومائتا الف)

☆ بقیہ مال کا تہائی حصہ نکال کر حسب وصیت صرف کیا گیا۔ جو ایک کروڑ ۹۲ لاکھ تھا۔ (تسعۃ عشر الف الف ومائتی الف)

☆ بقیہ مال وارثوں پر تقسیم کیا گیا جو ۳ کروڑ ۸۴ لاکھ تھا۔ (ثمانیۃ وثلاثین الف الف واربع مائۃ الف)

☆ اس میں مرحوم کی چار ازواج میں سے ہر ایک کو بارہ بارہ لاکھ ملے۔ (الف الف ومائتا الف درھم)

☆ قرضے، وصیت اور میراث کا مجموعہ ۵ کروڑ ۹۸ لاکھ تھا۔ (تسعۃ وخمسین الف الف وثمان مائۃ الف) یعنی تقریباً چودہ ارب پچانوے کروڑ روپے۔

پہلی اسلامی ریاست کے معاشی ستون

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اسلام لانے والے ابتدائی آٹھ دس افراد اور بارگاہِ رسالت کے معتمدترین حضرات میں سے ایک تھے۔ آپ ان ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے اسلام کی نشرواشاعت کے لیے سب سے زیادہ مال خرچ کیا۔ صحابہ میں آپ سب سے بڑے تاجر شمار ہوتے تھے۔[1]

اسلام سے قبل آپ کا نام عبدِ عَمرو تھا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا نام عبدالرحمٰن رکھ دیا۔[2]

آپ کا تعلق بنوزُہرہ سے تھا۔ واقعہ فیل سے دس سال بعد پیدا ہوئے، والد کا نام عوف بن عبدعوف تھا اور والدہ کا نام صَفِیّہ۔ پاکبازی کا یہ حال تھا کہ دورِ جاہلیت میں بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

آپ ان دس بزرگوں میں سے ایک ہیں جنھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی مجلس میں جنت کی بشارت سنائی۔ ان چھ افراد میں سے ایک ہیں جنھیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد نئے خلیفہ کے انتخاب کے لئے منتخب کیا تھا نیز ان پانچ افراد میں سے ایک ہیں جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ طویل قامت، گورے چٹے اور خوبصورت تھے۔ آنکھیں موٹی اور پلکیں گھنی تھیں، سنت کے مطابق زلفیں رکھتے تھے۔[3]

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت کے وقت آپ کی عمر تقریباً تیس سال تھی۔ حبشہ کی پہلی ہجرت میں شامل ہوئے مگر جلد ہی واپس آگئے اور چند برس بعد باقی صحابہ کے ساتھ مدینہ منورہ ہجرت کی۔[4]

مدینہ منورہ خالی ہاتھ پہنچے تھے۔ وہاں حضرت سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ سے بھائی چارہ ہوا۔ انہوں نے نہ صرف اپنا آدھا مال ہدیے کے طور پر انہیں پیش کر دیا بلکہ یہاں تک کہا کہ میری دو بیویاں ہیں، جو پسند ہو، میں اسے طلاق دے دیتا ہوں۔ آپ عدت کے بعد نکاح کر لیں۔ مگر عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”اللہ تمہارے مال اور گھر بار میں برکت دے۔ بس مجھے بازار کا راستہ دکھا دو۔“

وہاں پہلے دن کچھ کھجوریں اور پنیر نفعے میں بچا کر لے آئے۔ کچھ ہی دنوں میں اتنی بچت ہوگئی کہ شادی کر لی اور مہر میں کھجور کی گٹھلی کے برابر سونے کی ڈلی دی۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح کا معلوم ہوا تو فرمایا:

”دعوتِ ولیمہ کرو، چاہے ایک بکری سے ہی سہی۔“[5]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱/۷۴، ۷۵، ط الرسالۃ

② معرفۃ الصحابہ لابی نُعَیم الاصبھانی: ح ۴۵۴، ۱/۱۱۷، ط دار الوطن

③ الاصابۃ: ۴/۲۹۲ ط العلمیۃ ؛ معرفۃ الصحابہ لابی نُعَیم الاصبھانی، ح: ۴۵۴

④ سیر اعلام النبلاء: ۱/۷۴، ۷۵، ط الرسالۃ

⑤ صحیح البخاری: ۵۱۶۷، کتاب النکاح، باب الولیمۃ ؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱/۲۵۲

تو کبھی انکار نہ کرتے۔ وہ اہلِ مدینہ کے معاشی سرپرست تھے۔ مدینہ کی تہائی آبادی کے قرضے ادا کرتے تھے، تہائی آبادی کو قرضے دیتے تھے اور باقی تہائی لوگوں سے صلہ رحمی کرتے تھے۔ ① غلاموں اور باندیوں کو خرید کر آزاد کرتے اور ان کی دعائیں لیتے۔ آپ نے اپنی زندگی میں تیس ہزار غلام گھرانوں کو اس طرح آزاد کیا تھا۔ ②

حضورِ اکرم ﷺ نے دُومۃ الجندل کی طرف سریّہ روانہ فرمایا تو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار بنایا اور سر پر خود اپنے دستِ مبارک سے دستار باندھی۔ ساتھ ہی اجازت مرحمت فرمادی کہ اگر تمہیں فتح نصیب ہو تو وہاں کے حاکم کی بیٹی سے نکاح کرسکتے ہو۔ فتح کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حاکم کی بیٹی "تماضر" سے شادی کی۔ ان کے صاحبزادے حضرت ابوسلمہ انہی کے بطن سے تھے۔ ③

حضورِ اکرم ﷺ کے دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اُمہات المؤمنین کے اخراجات کا خاص طور پر خیال رکھا۔ آپ ﷺ فرما گئے تھے:

"اَلَّذِیْ یُحَافِظُ عَلٰی اَزْوَاجِیْ مِنْ بَعْدِیْ ھُوَالصَّادِقُ الْبَارُّ ."

"میرے بعد میری ازواج مطہرات کی نگہداشت رکھنے والا سچا اور بہت نیک ہوگا۔" ④

امہات المؤمنین کی خدمت کا جو حق حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے ادا کیا وہ کسی کو نصیب نہ ہوا۔ ایک بار بہت بڑی جاگیر خریدی اور بنوزہرہ کے مفلسوں، مہاجرین اور امہات المؤمنین پر تقسیم فرمادی۔ اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ان کا حصہ پہنچا تو فرمایا: "اللہ ابن عوف کو جنت کے چشمے سلسبیل سے سیراب فرمائے۔ رسول اللہ ﷺ ہمیں فرماگئے تھے کہ نیک اور سچے لوگ تمہارا خیال رکھا کریں گے۔" ⑤

ایک بار چالیس ہزار کا ایک باغ اُمہات المؤمنین کے لیے وقف کردیا۔ ⑥

اس مالداری کے باوجود انہیں فقراء پر رشک آتا تھا۔ اگرچہ زبانِ نبوت سے جنت کی بشارت مل چکی تھی مگر اپنے انجام کا خوف رہتا تھا۔ ایک مرتبہ افطار کے لیے بیٹھے تو کہنے لگے:

"مُصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ شہید کردیے گئے اور وہ مجھ سے نیک تھے، (ان کو) انہیں کی چادر میں کفن دیا گیا (وہ چادر اس قدر چھوٹی تھی) کہ اگر ان کا سر ڈھانکا جاتا تھا تو پیر کھل جاتے تھے اگر پیر ڈھانکے جاتے تو سر کھل جاتا تھا۔"

پھر فرمایا: "حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ قتل ہوگئے اور وہ مجھ سے بہتر تھے، پھر دنیا ہمارے لئے کشادہ کردی گئی جس قدر کشادہ کی گئی۔ پس اندیشہ ہے کہ کہیں ہماری نیکیوں کا بدلہ ہمیں دنیا میں ہی نہ دے دیا گیا ہو۔"

---

① سیر اعلام النبلاء: ۸۸/۱
② حلیۃ الاولیاء: ۹۹/۱
③ اسد الغابۃ: ۴۷۵/۳
④ الاصابۃ: ۲۹۲/۳
⑤ مستدرک حاکم، ح: ۵۳۵۷ ⑥ سنن الترمذی: ح ۳۷۵۰، کتاب المناقب، مناقب عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ

یہ کہہ کر اتنا روئے کہ کھانا چھوٹ گیا۔ ①

ایک مرتبہ روٹی اور گوشت کا سالن سامنے آیا تو رو پڑے، پوچھا گیا کہ آپ کیوں روئے؟ فرمایا:

"مَاتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَلَمْ يَشْبَعْ هُوَ وَلَا أَهْلُهُ مِنْ خُبْزِ الشَّعِيْرِ."

(آنحضرت ﷺ نے وفات تک جو کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی اور نہ آپ کے گھر والوں نے۔) ②

ایک بار چالیس ہزار دینار کی کوئی زمین خریدی، ساتھ ہی دولت کی اس کثرت پر پریشان ہوئے اور اُمّ المومنین حضرت اُمِّ سَلَمہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا: "لگتا ہے میں ہلاک ہو جاؤں گا کہ قریش کا سب سے دولت مند شخص میں ہی ہوں۔" انہوں نے کہا: "اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔" ③

ایک بار خواب دیکھا کہ جنت میں گھسٹ کر داخل ہو رہا ہوں۔ بیدار ہوئے تو فرمایا:

"میرا خیال ہے جنت میں مفلس لوگ ہی جائیں گے۔" ④

بعض روایات میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ حساب کتاب کی وجہ سے اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ جائیں گے اور جنت میں گھسٹ کر داخل ہوں گے۔ مگر ان روایات کو دیکھ کر عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی شان و منزلت پر شک کرنا درست نہیں؛ کیوں کہ ایسی روایات سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں جبکہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا جنتی ہونا دوسری صحیح روایات سے ثابت ہے۔ ان ضعیف روایات کو لفظ بلفظ درست مان لیا جائے تو بھی ان کا ظاہری مطلب لینا غلط ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ ان روایات کی سند پر جرح کے بعد فرماتے ہیں:

"بہر حال حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا حساب کتاب کی وجہ سے اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ جانا اور جنت میں گھسٹ کر داخل ہونا استعارے اور محاورے کے طور پر ہے۔ ورنہ جنت میں ان کا مقام حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے نیچے نہیں۔" ⑤

دورِ صدیقی، فاروقی اور عثمانی میں آپ مدینہ ہی میں رہے اور مرکزی شوریٰ کی ذمہ داریاں انجام دیتے رہے۔ آپ کی سیاسی سوجھ بوجھ، آپ پر صحابہ کے اعتماد اور امت کے لیے آپ کی بے لوثی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خلیفہ کے چناؤ کے لیے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مرتب کردہ چھ رکنی شوریٰ میں آخر کار آپ ہی کو مجاز بنایا گیا۔

آپ چاہتے تو خلافت کو اپنے یا اپنے قریبی رشتہ دار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے نام کر دیتے مگر آپ نے پوری دیانت داری کے ساتھ اُمّتِ مُسلِمہ کے مفاد کو پیشِ نظر رکھا اور اپنے صوابدیدی اختیار کو علی الاطلاق نافذ کرنے کی بجائے عام استصوابِ رائے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس منصب کے لیے تجویز کیا۔

① اسد الغابة: ۳/۴۷۵

② الاصابة: ۴/۲۹۲

③ مسند احمد، ح: ۲۶۳۸۹

④ سیر اعلام النبلاء: ۱/۸۱، ط الرسالة، بسند حسن ⑤ سیر اعلام النبلاء: ۱/۷۷، ط الرسالة

وفات سے پہلے وصیت میں بھی بڑی سخاوت کا مظاہرہ کیا۔ ایک ہزار گھوڑے جہاد کے لیے وقف کرنے، پچاس ہزار دینار خیرات کرنے اور ہر بدری صحابی کو چار چار سو دینار ہدیہ کرنے کی وصیت کی۔ ①

آپ کی صحت آخر تک بہت اچھی رہی۔ آپ کو آخری عمر میں دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ رنگت میں سرخی جھلکتی تھی۔ سر اور داڑھی کے بالوں میں مہندی یا خضاب لگانے کی عادت نہیں تھی۔ ②

آپ ۳۲ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ایک روایت میں ہے کہ کسی شخص نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے بعد آپ کو خلیفہ مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ پر سخت گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ مسجد نبوی میں گئے اور ریاض الجنۃ میں کھڑے ہوکر دعا مانگی: ''الٰہی! ایسی نوبت آنے سے پہلے مجھے دنیا سے اٹھالے۔''
اس دعا کے چھ ماہ بعد آپ انتقال فرما گئے۔ آپ نے ۷۵ سال کی عمر پائی۔ نماز جنازہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ آپ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ ③

رضی اللہ تعالی عنه وارضاه

☆☆☆

① سیر اعلام النبلاء: ۱/۹۰، ط الرسالة
② معرفة الصحابة لابی نُعَیم الاصبهانی، ح: ۴۶۰
③ سیر اعلام النبلاء: ۱/۸۸، ط الرسالة

پیکرِ اخلاص......مجاہد فی سبیل اللہ......سراپا استغناء

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ بھی ان اوّلین مسلمانوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے مکہ میں صدائے توحید گونجتے ہی اس پر لبیک کہا۔ ان کا تعلق قریش کی شاخ بنوعدی سے تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی تھے۔ ان کے والد زید بن عَمرو بن نفیل زمانہ جاہلیت کے ان سلیم الفطرت لوگوں میں سے تھے جو خود کو ملتِ ابراہیمی کا پیروکار کہتے تھے، بتوں کی عبادت سے بےزار اور توحید پر کاربند تھے، بتوں کے نام کا ذبیحہ نہیں کھاتے تھے۔[1]

زید بن عَمرو اسلام کی روشنی پھیلنے سے پہلے وفات پا گئے مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نجات کی گواہی دی اور فرمایا:
''وہ قیامت کے دن تنہا ایک اُمت کے طور پر آئیں گے۔''[2]

سعید بن زید رضی اللہ عنہ اسلام قبول کرنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ رہے۔ طبیعت میں متانت، کم گوئی اور بےغرضی و بےلوثی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس لیے خود کو کبھی نمایاں نہ ہونے دیا۔ البتہ غزوات اور جہاد میں برابر حصہ لیتے رہے۔ ان کا دینی بھائی چارہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے تھا۔

تمام غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے۔ غزوۂ بدر سے پہلے قریشی قافلے کی جاسوسی پر مامور رہے۔ اگرچہ وہ جنگ میں شریک نہ ہو سکے تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بدری غازیوں کے برابر مالِ غنیمت سے حصہ عطا کیا۔

خلافتِ راشدہ کے دور میں شام کی فتوحات میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ہم رکاب رہے۔ خاص کر یرموک کی لڑائی اور فتح دِمشق میں اہم کردار ادا کیا۔[3] ہجرت کے بعد ان کی سکونت مدینہ میں ہی رہی۔ آمدن کا ذریعہ مقام عقیق کی ایک جاگیر تھی۔ بعد میں انہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عراق میں بھی ایک جاگیر دے دی تھی۔[4]

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں اروٰی نامی ایک خاتون نے جس کی زمین آپ رضی اللہ عنہ کی جاگیر سے متصل تھی، دعویٰ کر دیا کہ سعید رضی اللہ عنہ نے اس کی کچھ زمین دبالی ہے۔ مدینہ کے حاکم مروان نے تحقیقات شروع کرائیں تو حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے مروان سے کہا: ''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے اس عورت پر زیادتی کی ہے، حالانکہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ہے کہ جو کسی کی ایک بالشت زمین بھی غصب کرے گا، تو قیامت کے دن ایسی سات زمینیں اس کے گلے کا طوق ہوں گی۔''[5]

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱/۱۲۷، ط الرسالۃ
[2] مستدرک حاکم، ح: ۵۸۵۵
[3] اسد الغابۃ: ۲/۴۷۶
[4] مسنداحمد، ح: ۱۶۴۲
[5] صحیح البخاری، ح: ۳۱۹۸، کتاب بدء الخلق، باب فی سبع ارضین

ان کا مقام و مرتبہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ اُمّ المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے اپنی نمازِ جنازہ پڑھانے کی وصیت انہی کے لیے کی تھی۔[1] اسی طرح اُم المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے بھی یہی وصیت فرمائی تھی۔[2]

سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی زیادہ تر زندگی خاموشی اور عزلت نشینی میں گزری۔ جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عشرۂ مبشرہ میں سے ہوتے ہوئے بھی ان کے حالاتِ زندگی بہت کم محفوظ ہیں۔ ان سے مروی روایات بھی چند ہی ہیں۔

حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے ۵۶ھ میں مدینہ منورہ کے قریب عقیق میں انتقال فرمایا، آپ کی عمر ۷۳ برس تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو غسل دیا، خوشبو لگائی اور نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما آپ کی قبر میں اترے۔[3]

رضی اللہ تعالی عنه وارضاه

☆☆☆

---

① تاریخ الاوسط للبخاری: ۱/۱۱۲، ط دار الوعی

② مستدرک حاکم، ح: ۵۸۵۸۔
مگر اس کے بعد اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا مزید کئی برس تک حیات رہیں جبکہ سعید بن زید رضی اللہ عنہ ۵۱ ہجری میں فوت ہو گئے۔ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا ان کی وفات کے آٹھ برس بعد ۶۴ ہجری میں فوت ہوئیں۔ (الاصابۃ: ۸/۴۰۷)

③ طبقات ابن سعد: اصحاب بدر، ترجمۃ: سعید بن زید رضی اللہ عنہ۔ سیر اعلام النبلاء: ۱/۱۲۵ تا ۱۴۵، ط الرسالۃ

فاتح ایران......اسد العرب......خال رسول اللہ ﷺ

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مکہ میں توحید کی صدا گونجنے کے بعد سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے چند خوش قسمت ترین افراد میں سے ایک ہیں۔اس وقت آپ کی عمر سترہ برس تھی۔آپ کے والد ابو وقاص کا اصل نام مالک تھا۔اس لیے آپ کو سعد بن مالک بھی کہا جاتا ہے۔آپ کی والدہ کا نام حمنہ بنت سفیان تھا۔[1]

حضرت سعد رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ماموں کہلاتے تھے کیوں کہ ان کا تعلق قریش کی شاخ بنو زُہرہ سے تھا جو حضور اکرم ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کا خاندان تھا۔اہل عرب ماں کے خاندان والوں کو ماموں کہتے ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضرت آمنہ کے چچا کے پوتے تھے یعنی حضرت آمنہ، وَہب بن عبد مَناف کی بیٹی تھیں۔انہی وَہب کے ایک بھائی وُہَیب یا اُہیب تھے جو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے دادا تھے۔یوں حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ننھیال بنو زُہرہ سے تعلق رکھنے کے باعث رشتے میں آپ ﷺ کے ماموں لگتے تھے۔اس لیے ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں بڑے فخر سے فرمایا:

”هَذَا خَالِيْ فَلْيُرِنِيْ اِمْرَءٌ خَالَه !“ (یہ میرے ماموں ہیں، کسی کا ایسا ماموں ہو تو دکھائے..)[2]

آپ شروع سے اسلام کے لیے قربانیاں دیتے چلے آئے۔اسلام لائے تو والدہ نے کھانا پینا بات کرنا تک چھوڑ دیا کہ اگر اسلام ترک نہ کرو گے تو میں بھوکی پیاسی مرجاؤں گی۔ایک فرماں بردار اولاد ہونے کے ناطے آپ کے لیے یہ بہت سخت امتحان تھا مگر آپ ثابت قدم رہے جس پر آیتِ قرآنی نازل ہوئی:

﴿وَاِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾

”اگر وہ دونوں (ماں باپ) تجھے مجبور کریں کہ تو میرے ساتھ اسے شریک مان لے جس (کی شراکت داری) کی تیرے پاس کوئی دلیل نہیں،تو ان کا کہنا مت مان۔“[3]

آپ نہایت بہادر اور جنگ جو آدمی تھے۔اسلام کی خاطر سب سے پہلے کسی پر ہاتھ اٹھانے اور خون بہانے کا اعزاز بھی آپ کو ملا۔یہ مکہ مکرمہ میں اسلام کی دعوت کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔آپ کسی گھاٹی میں چھپ کر عبادت کر رہے تھے کہ کچھ مشرکین آ کر اسلام کا مذاق اڑانے لگے۔آپ برداشت نہ کر سکے اور کسی خطرے کی پروا کیے بغیر ایک ہڈی اٹھا کر اس شدت سے ماری کہ ایک مشرک کا سر پھٹ گیا۔[4]

---

[1] المنتظم لابن جوزی: ۲۸۱/۵
[2] سنن الترمذی، ح: ۳۷۵۲، کتاب المناقب
[3] تفسیر ابن کثیر، سورۃ العنکبوت، آیت: ۸
[4] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، فضائل سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

آپ کی جرأت اور قائدانہ صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ہجرت کے بعد جہاد کی بعض ابتدائی مہمات کی قیادت آپ کو سونپی گئی۔ ایسی ایک مہم میں آپ نے دشمن پر تیر چلایا۔ یہ اسلام کی تاریخ میں حریف پر پہلی تیراندازی تھی۔ ①

آپ عرب کے مانے ہوئے نشانہ باز تھے۔ غزوۂ اُحد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے ہوئے آپ نے ایسی ماہرانہ تیراندازی کی کہ خود سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تاریخی فقرہ کہہ کر داد دی:

”يَا سَعْدُ اِرْمِ فِدَاكَ اَبِيْ وَاُمِّيْ:“

”اے سعد! تیر چلاؤ۔ میرے ماں باپ تم پر قربان۔“ ②

آپ مستجاب الدعوات تھے، دعائیں فوراً قبول ہوتی تھیں۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا کرشمہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد رضی اللہ عنہ کو دعا دی تھی: ”اَللّٰهُمَّ اِسْتَجِبْ لِسَعْدٍ اِذَا دَعَاكَ ۔“

”اے اللہ! جب سعد آپ سے دعا کریں تو آپ قبول فرمالیا کریں۔“ ③

حجۃ الوداع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ مکہ پہنچ کر اتنے سخت بیمار ہوئے کہ بچنے کی امید نہ رہی اور سخت پریشانی لاحق ہوگئی کہ جس شہر سے اللہ کے لیے ہجرت کر چکا ہوں، وہیں مرگیا تو ہجرتؐ کا ثواب ضائع نہ ہو جائے۔ ساتھ ہی یہ ارادہ کرلیا تھا کہ سارا مال اللہ کے راستے میں دے دوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے لیے آئے اور سمجھایا کہ صرف تہائی مال کی وصیت کرنا کافی ہے۔ ساتھ ہی تسلی دی کہ ابھی زندہ رہوگے اور لوگوں کو فائدہ پہنچاؤ گے۔ ④

اس وقت حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی نرینہ اولاد کوئی نہ تھی۔ صرف ایک لڑکی تھی جس کے لیے آپ بہت فکرمند تھے۔ اسی بیماری کے عالم میں اللہ سے دعا کی: ”یا اللہ! میری عمر اولاد کے جوان ہونے تک طویل فرمادے۔“

یہ دعا ایسی قبول ہوئی کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جلد صحت یاب ہوگئے اور مزید ۴۵ سال بقیدِ حیات رہے۔ نرینہ اولاد بھی ہوئی جس کی جوانی آپ نے بچشم خود دیکھی۔ ⑤

آپ بہت کم بددعا دیتے تھے مگر جب کسی کو صحابہ کی توہین کرتا دیکھتے تو برداشت نہ کرپاتے۔ ایسے میں جب بھی زبان سے کوئی بددعا نکلی وہ اثر پذیر ہوکر رہی۔ ایک بار کسی شخص کو دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔ منع کرنے پر باز نہ آیا تو آپ نے ہلاکت کی بددعا دی۔ کچھ ہی دیر میں ایک اونٹ نے آکر اسے روند ڈالا۔

ایک بار آپ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کی مذمت کرتے دیکھا، منع کرنے پر بھی وہ نہ رکا تو آپ کے منہ سے بددعا نکل گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک پاگل اونٹ نے آکر اسے چیر دیا۔ ⑥

---

① طبقات ابن سعد: ۳/۱۴۰، ط دار صادر

② سنن الترمذی، ح: ۳۷۵۳، ابواب المناقب

③ سنن الترمذی، ح: ۳۷۵۱، ابواب المناقب

④ صحیح البخاری، ح: ۱۲۹۵، کتاب الجنائز، باب رثاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۱/۱۱۷، ط الرسالۃ ...... اولاد میں عمر بن سعد اور عمرو بن سعد مشہور ہیں۔ ⑥ سیر اعلام النبلاء: ۱/۱۱۶

ایک شخص نے مجمع عام میں آپ پر خیانت اور ناانصافی کے الزامات عائد کیے۔ آپ نے کہا: ''یا اللہ! اگر یہ جھوٹا ہے تو اسے اندھا کر دے، فقیر بنا دے اور اس کی عمر لمبی کر دے۔'' اس آدمی کا پھر یہی حال ہوا۔ ①

آپ گھٹے ہوئے مضبوط جسم کے آدمی تھے۔ رنگ گندمی اور بال گھنگریالے تھے۔ آپ عشرۂ مبشرہ، اصحاب بدر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تشکیل دی ہوئی چھ رکنی شوریٰ میں شامل تھے۔ آپ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں کسریٰ سے ٹکر لینے والے اسلامی لشکر کی قیادت کی، قادِسیّہ کے میدان میں ایرانیوں کو تاریخی شکست دے کر ساسانی اقتدار کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور دریائے دجلہ کو کراماتی انداز میں عبور کر کے کسریٰ کے پایۂ تخت مدائن پر قبضہ کیا۔ آپ نے عراق میں نیا شہر کوفہ آباد کیا اور وہاں کے گورنر بھی رہے۔ ②

آپ کی عظمت، شرافت، اسلام کے لیے قربانیاں اور قائدانہ خوبیاں اس قدر تھیں کہ آپ خلافت کے اعزاز کے مستحق ہو سکتے تھے۔ مگر آپ نے کبھی اس کی کوشش کی نہ تمنا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں آپ کو کوفہ کی گورنری سے معزول کیا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی مگر اس کے بعد زندگی بھر سیاسی معاملات سے الگ تھلگ رہے۔ جمل، صفین اور تحکیم سے آپ کا کوئی تعلق نہیں رہا۔

حسین بن خارجہ نامی ایک تابعی تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد رونما ہونے والے اختلاف کے دنوں میں بڑے متذبذب تھے کہ کس جماعت کا ساتھ دیں۔ آخر وہ یہ دعا کرتے ہوئے سو گئے کہ الٰہی! مجھے ایسی حق بات دکھا دے کہ میں اسے مضبوطی سے اپنا لوں۔ خواب میں دیکھا کہ دنیا اور آخرت کے درمیان ایک دیوار قائم ہے۔ یہ دیوار پھاند کر آگے گئے تو کچھ لوگ دکھائی دیے۔ پوچھا: ''آپ کون ہیں؟''

بولے: ''ہم فرشتے ہیں۔''

پوچھا: ''شہداء کہاں ہیں؟'' وہ بولے: ''اوپر جاؤ۔''

یہ سیڑھیوں سے اوپر گئے، دیکھا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہہ رہے ہیں: ''میری اُمّت کے لیے استغفار کریں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام فرما رہے ہیں: ''آپ کو معلوم نہیں انہوں نے آپ کے بعد کیا کچھ کیا۔ خون بہایا اور اپنے امام کو قتل کر دیا۔ ان لوگوں نے ایسا کیوں نہ کیا جیسا میرے دوست سعد نے کیا ہے۔''

حسین بن خارجہ بیدار ہوئے تو یہ خواب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو جا کر سنایا۔ وہ خوش ہو کر بولے:

''وہ شخص ناکام و نامراد ہے جو ابراہیم علیہ السلام کا دوست نہ ہو۔''

حسین بن خارجہ نے پوچھا: ''آپ کس جماعت میں شامل ہیں؟'' فرمایا: ''کسی میں نہیں۔''

---

① صحيح البخاري، ح: ۷۵۵ ،باب وجوب القراۃ للامام

② سیر اعلام النبلاء: ۹۳/۱، ط الرسالۃ ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۲۸۳/۱۱

حسین نے کہا: ''مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں؟''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''تمہارے پاس بکریاں ہیں؟'' بولے: ''جی نہیں۔''

فرمایا: ''بکریاں خرید کر اس وقت تک کسی جنگل میں بسیرا کر لو جب تک یہ فتنہ تھم نہ جائے۔''[1]

عالم اسلام میں آپ کے عقیدت مندوں کا بہت بڑا حلقہ تھا۔ بعض رفقاء نے آپ سے کہا کہ اگر آپ خلافت کے امیدوار بنیں تو ایک لاکھ تلواریں آپ کی حمایت میں بے نیام ہو سکتی ہیں۔ مگر آپ کا جواب تھا: ''مجھے ان ایک لاکھ تلواروں میں سے صرف ایک ایسی تلوار چاہیے جو کافر کو کاٹ کر رکھ دے مگر مؤمن پر اثر نہ کرے۔''[2]

آپ کی عمر کے آخری بیس سال عزلت نشینی میں گزرے۔ مدینہ منورہ سے سات میل (سوا گیارہ کلومیٹر) دور عقیق نامی مقام پر اپنی حویلی میں رہا کرتے تھے۔ اس دوران کتنے ہی انقلابات آئے مگر آپ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

آپ کے بیٹے عمر بن سعد نے ایک بار کہا:

''لوگ وہاں خلافت اور حکومت کے لیے چھینا جھپٹی کر رہے ہیں اور آپ یہاں الگ تھلگ بیٹھے ہیں۔''

آپ نے فرمایا: ''بیٹا! میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے بندے کو پسند کرتے ہیں جو دوسروں سے بے نیاز، گم نام اور پرہیز گار ہو۔''[3]

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اسی گوشہ نشینی کے عالم میں آخر کار ۵۵ھ میں وفات پائی۔ آپ عشرہ مبشرہ میں سے وفات پانے والے آخری فرد ہیں۔[4]

رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ

☆☆☆

---

① مستدرک حاکم، ح: ۶۱۲۶

② تاریخ دمشق لابن عساکر: ۲۸۷/۲۰

③ صحیح مسلم، ح: ۷۶۲۱، کتاب الزهد والرقائق، ط دار الجیل......

عمر بن سعد کا یہ تاثر درست نہیں مانا جا سکتا۔ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں سیاسی اختلاف چل رہا تھا۔ ان صحابہ کا اختلاف یقیناً اللہ کے لیے تھا نہ کہ مال و مناصب کی خاطر۔ ہاں ان کے گرد جمع ہونے والوں میں بعض شر پسند بھی تھے۔ عمر بن سعد کے قول کا اطلاق ان شر پسندوں پر تو درست ہو سکتا ہے، صحابہ پر ہرگز نہیں۔ یاد رہے کہ اسی عمر بن سعد نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف فوج کی کمان کی تھی اس لیے خود اس کا کردار ایسا نہ تھا کہ اس کے کسی بھی قول کو ہم من و عن حقیقت پر محمول کریں۔ باپ کو گوشہ نشینی پر ملامت کرنا بھی کردار کی کمزوری کا عکاس ہے۔ جبکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا جواب بڑا عارفانہ تھا۔

④ سیر اعلام النبلاء: ۱۱۹/۱، ط الرسالۃ

چند اکابر صحابہ کا تذکرہ

اب ہم عشرۂ مبشرہ کے علاوہ چند دیگر جلیل القدر صحابہ کے احوال پیش کر رہے ہیں جنہوں نے بالکل ابتدائی دور میں اسلام کے لیے عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ ایسے صحابہ کرام بکثرت ہیں مگر ہم بطور نمونہ یہاں فقط پانچ حضرات کے حالات ذکر کر رہے ہیں۔ ان شاء اللہ مزید کچھ صحابہ کرام کے حالات حصہ دوئم میں پیش کیے جائیں گے۔

☆☆☆

علم نبوی کے وارث...... مفسرِ قرآن..... فقیہ اُمّت

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مکہ کے بھیڑ بکریاں چرانے والے ایک لڑکے تھے جو کم عمری ہی میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ بابرکت سے انہوں نے بے بہا فیض حاصل کیا۔ اس وقت مکہ میں چند ہی لوگ مسلمان ہوئے تھے اور دعوتِ اسلام خفیہ طور پر دی جا رہی تھی۔ ①

ان کا نسبی تعلق بنوہذیل سے تھا۔ ان کی والدہ اُمّ عبد بھی مسلمان ہوئیں اور انہی کی طرف منسوب ہو کر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو صحابہ کے حلقے میں ''ابن اُمّ عبد'' کہا جاتا تھا۔

ان کی جرأتِ مؤمنانہ کا یہ حال تھا کہ قبولِ اسلام کے بعد ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود ایک دن مسجد الحرام میں جا کر تلاوتِ کلام اللہ شروع کر دی۔ مشرکین نے سنا تو برداشت نہ کر سکے اور اتنا مارا کہ لہولہان ہو گئے اور چہرہ تک سوج گیا۔ واپس گئے تو ساتھیوں نے رنج و افسوس ظاہر کیا مگر وہ بولے: ''اللہ کی قسم! یہ لوگ میری نگاہ میں آج جس قدر بے حیثیت ہوئے، پہلے کبھی نہ تھے۔ اگر کہو تو کل پھر جا کر ان کے سامنے اعلانِ توحید کروں۔''

ساتھیوں نے کہا: ''نہیں بس اتنا کافی ہے کہ تم ان کی ناگواری کے باوجود انہیں قرآن کی آواز سنا آئے۔'' ②

کفارِ مکہ کی ستم رانیوں سے تنگ آ کر حبشہ کی ہجرتِ ثانیہ میں شامل ہوئے۔ ③

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے ان کی بڑی گہری دوستی تھی۔ دونوں عمر میں بھی قریب قریب تھے۔ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بھائی چارہ زبیر رضی اللہ عنہ ہی سے کرایا تھا۔ ④

① سیر اعلام النبلاء: ۱/۴۶۴، ط الرسالۃ ② اسد الغابۃ، ترجمۃ: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

③ الطبقات الکبریٰ لابن سعد: ۳/۱۵۱. حبشہ کی ہجرت اولیٰ اور ثانیہ دونوں میں شرکت کا قول درست نہیں جیسا کہ متعلقہ باب میں بتایا جا چکا ہے۔

④ روی الحاکم: آخی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین الزبیر بن العوام وعبداللہ بن مسعود. (روایت نمبر: ۵۳۷۲، اسنادہ صحیح)

ایک قول کے مطابق مُعاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے بھی بھائی چارہ ہوا تھا۔ مدینہ ہجرت کر کے وہ شروع میں مُعاذ رضی اللہ عنہ ہی کے گھر میں ٹھہرے تھے۔[1] ہجرت کے بعد ایک قول کے مطابق سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ اور دوسرے قول کے مطابق اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھائی چارہ کرایا۔[2]

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جسمانی طور پر پستہ قد، دبلے پتلے اور کمزور تھے مگر علمی صلاحیت، ذہانت اور حافظے میں اپنی مثال آپ تھے۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر وہ (شاخیں یا پھل توڑنے) کسی درخت پر چڑھے تو نیچے کھڑے لوگ ان کی پتلی پتلی پنڈلیاں دیکھ کر ہنس دیے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم ایسے انسان پر کیوں کر ہنس رہے ہو جس کا وزن اللہ کی میزان میں کوہِ اُحد سے بھی زیادہ ہے۔''[3]

جسمانی کمزوری کے باوجود بہادری اور شجاعت کے پیکر تھے۔ جنگِ بدر سمیت اکثر غزوات میں شریک رہے۔ اسلام کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل جنگِ بدر میں انہی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اسے بعض انصاری نوجوانوں نے شدید زخمی کر کے تڑپتا چھوڑ دیا تھا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اسی کی تلاش میں نکلے۔ اسے دم توڑتے دیکھا تو اس کی داڑھی پکڑ لی اور کہا: ''تو ہی ہے ناں گمراہ بوڑھا ابوجہل؟''[4]

اس کے بعد اس کا سر کاٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔[5]

غزوۂ حنین میں جب مسلمان پسپا ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد پروانہ وار لڑنے والوں میں یہ بھی شامل تھے۔[6]

خلفائے راشدین کے بعد وہ اپنے زمانے میں قرآن مجید اور اس کی تفسیر کے سب سے بڑے عالم تھے۔ خود فرماتے تھے: ''میں قرآن مجید کا سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کہیں کسی کے پاس مزید علم ہے اور اونٹوں کے ذریعے وہاں پہنچنا ممکن ہے تو میں ضرور وہاں جاتا۔''[7]

ایک بار فرمایا: ''اس وقت صحابہ میں مجھ سے زیادہ قرآن مجید کا علم کسی کو نہیں۔ مگر میں سب سے افضل نہیں۔''[8]

یہ انہی کی رائے نہیں تھی بلکہ ابومسعود بدری رضی اللہ عنہ جیسے قدیم صحابی گواہی دیتے ہوئے کہتے تھے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان سے بڑا قرآن کا عالم کوئی اور نہیں۔''[9]

---

① الطبقات الکبریٰ لابن سعد: ۳/۱۵۱، ۱۵۲، ط صادر

② الاصابۃ: ۴/۲۰۰، ترجمۃ: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

ان اقوال میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ہجرت سے قبل حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے، ہجرت کے فوراً بعد حضرت مُعاذ رضی اللہ عنہ سے اور مدینہ میں قیام کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مواخاۃ ہوئی۔ اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مواخاۃ غزوۂ بنی قریظہ میں سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ہوئی۔ کیوں کہ ہجرت کے وقت اَنس رضی اللہ عنہ نابالغ تھے اور ایک نابالغ سے جوان شخص کی مواخاۃ کا امکان بہت کم ہے۔

③ مسند احمد، ح: ۹۲۰

④ مسند احمد، ح: ۱۳۴۷۷

⑤ دلائل النبوۃ للبیہقی: ۳/۸۶

⑥ اسد الغابۃ: ترجمۃ: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

⑦ صحیح مسلم، ح: ۲۴۸۶

⑧ سیر اعلام النبلاء: ۱/۴۷۵، ط الرسالۃ

⑨ صحیح مسلم، ح: ۲۴۸۴، کتاب فضائل الصحابۃ

خود رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے:

''جو قرآن مجید کو اس طرح پڑھنا چاہے جیسے کہ نازل ہوا تو وہ ابن اُمّ عبد کی طرح پڑھے۔''①

ان کی علمی صلاحیت دیکھ کر حضور ﷺ نے پہلے دن ہی فرما دیا تھا: اِنَّکَ غُلَیِّمٌ مُعَلَّمٌ ''تم سیکھے سکھائے بچے ہو۔''②

وہ ایسے ہی ثابت ہوئے۔ ستر سے زائد سورتوں کی تعلیم براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے حاصل کی۔ یہ ان کی ایسی خصوصیت ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں۔③

یہ پڑھنا صرف الفاظ ہی کی ادائیگی تک محدود نہ تھا بلکہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ خود فرماتے تھے کہ ہم دس آیات سیکھتے تو ان کے مطالب و معانی کو سمجھے بغیر اگلی دس آیات نہیں پڑھتے تھے۔④

رسول اللہ ﷺ کو ان کی قرأت اتنی پسند تھی کہ ایک بار خود فرمائش کی کہ مجھے کلام اللہ سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا:

''آپ کو کیا سناؤں آپ پر ہی تو نازل ہوا ہے۔''

فرمایا: ''میرا دل چاہتا ہے کہ کسی اور سے سنوں۔''

خادمِ بارگاہِ رسالت نے تلاوت شروع کی۔ اس آیت پر پہنچے:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا

''پھر وہ کیسا وقت ہوگا جب کہ ہم لائیں گے ہر اُمّت پر ایک گواہ اور (اے نبی ﷺ) ہم آپ کو لائیں گے ان کے اوپر گواہ۔''⑤

حضور ﷺ نے اشارہ کر کے روک دیا۔ دیکھا تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔⑥

بڑے خوش آواز تھے، قرآن مجید کو بہت ذوق وشوق اور خوش الحانی سے بکثرت پڑھا کرتے تھے۔ راتوں کو جب لوگ سو جاتے تو آپ نوافل میں کھڑے ہو جاتے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ہلکی آواز میں تلاوت کرتے چلے جاتے۔ دور سے لگتا جیسے شہد کی مکھی بھنبھنا رہی ہو۔⑦

حضور ﷺ کی خدمت سے وہ ایسے منسلک ہوئے کہ عمر بھر ہر وقت ساتھ ساتھ رہے۔ خانۂ اقدس میں انہیں ہر وقت آنے جانے کی اجازت تھی۔ اسی لیے مدینہ آنے والے نئے مہمان صحابہ شروع میں انہیں حضور ﷺ کے خاندان ہی کا ایک فرد سمجھتے تھے۔⑧ سفر میں حضور اکرم ﷺ کی ذاتی خدمات عموماً وہی انجام دیتے۔ بستر لگانا، مسواک،

---

① سنن ابن ماجة، ح: ۱۳۸
② مسند احمد، ح: ۳۵۹۸
③ سير اعلام النبلاء: ۱/۴۷۳
④ سير اعلام النبلاء: ۱/۴۹۰
⑤ سورة النساء: ۴۱
⑥ صحيح البخاري، ح: ۵۰۵۵، كتاب فضائل القرآن، باب البكاء عند قراءة القرآن
⑦ سير اعلام النبلاء: ۱/۴۹۴، ط الرسالة　⑧ صحيح مسلم، ح: ۲۴۶۰، فضائل الصحابة، باب فضائل عبدالله بن مسعود

طہارت اور وضو کا پانی پیش کرنا اور چپل سامنے رکھنا ان کے ذمہ ہوتا۔ ①

دینِ اسلام کا ایک بڑا حصہ خاص کر فقہی مسائل کا ایک بیش بہا ذخیرہ انہی سے اُمّتِ مُسلِمہ تک پہنچا ہے۔ فقہ حنفی کے مستدلات میں خلفائے راشدین کے بعد عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مرویات سب سے زیادہ ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد دورِ صدیقی میں وہ مدینہ ہی میں رہے۔ اس دوران ارتداد اور بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور مدینہ منورہ بھی خطرے میں تھا۔ مرتدین اور باغیوں کے خلاف مہمات کے دوران بعض مواقع پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مدینہ کی حفاظت کی ذمہ داری عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو سونپی۔ ② دورِ فاروقی میں شام کی فتوحات نے ان کے جذبۂ جہاد کو پھر برانگیختہ کیا اور وہ جنگ یرموک میں بڑے ولولے کے ساتھ شریک ہوئے۔

اس دوران حجاز میں ان گنت لوگ ان کے حلقۂ علم سے وابستہ ہو چکے تھے، جن میں عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم جیسے نوجوان صحابہ بھی تھے جو بعد میں آسمانِ شریعت کے درخشندہ ستارے بنے۔ ابو ہریرہ اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما جیسے کبار صحابہ نے بھی ان سے احادیث لی ہیں، اس لیے کہ یہ حضرات فتح خیبر کے بعد مدینہ آئے تھے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ان کی بہ نسبت بارگاہِ نبوت سے استفادے کا زیادہ موقع ملا تھا۔ ③

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔ بعض دوست ان کے پستہ قد ہونے سے لطف اندوز ہوتے مگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے: ''کُنَیْفٌ مُلِیَٔ عِلْمًا'' (یہ تو علم سے بھرا ہوا چھوٹا سا گودام ہے۔) ④

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سنجیدہ طبع تھے مگر جب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ملتے تو چہرہ کھل اٹھتا اور مسکرانے لگتے۔ ⑤

چونکہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی پنڈلیاں غیر معمولی طور پر پتلی تھیں، اس لیے تہبند کو ٹخنوں سے زیادہ اونچا نہ باندھتے تھے تاکہ دیکھنے میں کسی کو بری معلوم نہ ہوں۔ ایک دن آپ رضی اللہ عنہ نے کسی شخص کا تہہ بند نیچے دیکھا تو اسے اوپر کرنے کا کہا۔ اس نے جواب میں آپ ہی کو ہدفِ تنقید بنایا کہ آپ کا تہبند بھی اونچا ہونا چاہیے۔

آپ نے کہا: ''میں اس لیے نیچے رکھتا ہوں کہ نماز میں امامت کرتا ہوں اور میری پنڈلیاں بہت پتلی ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس شخص کے اعتراض کا پتا چلا تو درّہ لے کر اس کی خبر لی اور کہا: ''تم ابن مسعود کو ٹوکتے ہو۔'' ⑥

ان کے علمی مقام اور بصیرت و تدبر کے پیشِ نظر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ انہیں مدینہ میں اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے مگر جب عراق میں کوفہ آباد ہوا، اور وہاں مالی منتظمین، معلمین اور فقہاء کی ضرورت پڑی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے

---

① طبقات ابن سعد: ۱۵۳/۳، ط دار صادر
② تاریخ خلیفة: تحت ۱۱ ھجری
③ سیر اعلام النبلاء: ۴۶۱/۱، ط الرسالة
④ کتاب الآثار للقاضی ابی یوسف، ص ۱۳۳، ط العلمیة ؛ طبقات ابن سعد: ۱۵۶/۳، دار صادر
⑤ طبقات ابن سعد: ۱۵۶/۳
⑥ سیر اعلام النبلاء: ۴۹۲/۱، ط الرسالة

اہلِ کوفہ کے نام درج ذیل پیغام کے ساتھ انہیں وہاں بھیج دیا:

"میں عبداللہ بن مسعود کو تمہارا معلم اور وزیر بنا کر بھیج رہا ہوں۔ درحقیقت میں نے عبداللہ بن مسعود کے بارے میں خود پر تمہیں ترجیح دی ہے۔"①

کوفہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کم وبیش چودہ سال گزارے۔ یہ مشرقی صوبوں کا انتظامی مرکز تھا۔ تمام افسران، سپاہیوں، سرکاری ملازموں اور وظیفہ لینے والے لوگوں کا تمام تر حساب کتاب آپ کی نگرانی میں رہتا تھا۔ ریاضی اور معاشیات کی کسی درسگاہ میں بیٹھے بغیر ایک قاری وفقیہ کا اتنے بڑے انتظام کو اس خوبی سے انجام دیتے رہنا کہ چودہ سالوں میں ایک پیسے کا حساب آگے پیچھے ہونے کا الزام بھی نہ لگ سکا، ایک کرشمہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

کوفہ میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ تفسیرِ قرآنی اور فقہِ اسلامی کی اشاعت ہے جس کا موقع مسندِ قضا پر فائز ہونے کی وجہ سے آپ کو خوب میسر آیا۔ بڑے بڑے ذہین تابعین نے آپ سے استفادہ کیا جن میں علقمہ بن قیس، مسروق، الاسود، عبیدۃ السلمانی، قیس بن ابی حازم، زر بن حبیش اور طارق بن شہاب رحمہم اللہ بہت نامور ہوئے۔ انہی لوگوں سے آگے چل کر کوفہ میں علم تفسیر اور فقہ کی نشوونما ہوئی۔②

۲۴ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رحلت کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسندِ خلافت پر بیٹھے۔ اس اثناء میں عراق خصوصاً کوفہ میں متعدد عہدے دار تبدیل ہوئے مگر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ان کی کارکردگی کے پیشِ نظر برقرار رکھا گیا۔

آخر سن ۳۲ھ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے انہیں معزول کیا اور ساتھ ہی واپس مدینہ منورہ بلوا لیا۔ معزولی کا سبب بیان کرنے والی اکثر روایات میں ان کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سمیت بعض صحابہ سے رنجش کا ذکر ہے مگر یہ روایات ضعیف اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔ دراصل سرکاری افسران کا عزل ونصب ایک معمول کی بات تھی۔ ضروری نہیں کہ کسی ناراضی ہی کی بناء پر کسی کو معزول کیا جائے۔ ویسے بھی اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال ہو چکی تھی، اس لیے انہیں آرام کا موقع دینا معزول کیے جانے کی ایک معقول وجہ تھی۔

اتنا ضرور ہے کہ اہلِ کوفہ میں سے ان کے عقیدت مندوں نے جو ان کی برطرفی سے رنجیدہ تھے، اصرار کیا تھا کہ آپ مدینہ نہ جائیں مگر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نہیں چاہتے تھے کہ حکم کی تعمیل میں کوتاہی کر کے انتشار وافتراق کا سبب بنیں، اس لیے فرمایا: "اطاعت کرنا ہمارے ذمے ہے۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ میں فتنے کا دروازہ کھولوں۔"③

آپ عمرے کا احرام باندھ کر حجاز روانہ ہوئے، راستے میں ربذہ کے دیہات میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے جنازے میں شرکت کا موقع ملا۔ عمرے کے بعد مدینہ منورہ میں قیام کیا اور چند ماہ بعد وفات پا گئے۔④

① طبقات ابن سعد: ۳/۱۳، صادر
② سیر اعلام النبلاء: ۱/۴۶۱، ۴۶۲، ط الرسالة
③ الاصابة: ۴/۲۰۱، ط العلمية
④ سیر اعلام النبلاء: ۱/۴۹۸، ۲/۷۷، ط الرسالة

مشہور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دو سال ان کی تنخواہ بند رکھی تھی۔ مگر یہ روایت ضعیف اور دیگر روایات سے متعارض ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اصل بات واضح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور کئی صحابہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں فارغ البال ہو چکے تھے اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں انہوں نے سرکاری وظیفہ لینا از خود ترک کر دیا تھا۔ پس تنخواہ ضبط کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ [1]

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بھائی چارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے کرایا تھا۔ دونوں کا یہ تعلق سگے بھائیوں سے زیادہ مضبوط رہا۔ حتیٰ کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وفات کے وقت اپنی وصیتوں سمیت تمام مالی امور کا ذمہ دار اور اپنے اہل وعیال کا سرپرست انہی کو مقرر کر گئے۔ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ نے ان کی وفات کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو رائے دی کہ جو تنخواہیں انہوں نے از خود لینا ترک کر دی تھیں وہ جمع کر کے ان کے بیوی بچوں کو دے دی جائیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا اور وہ رقم جو پندرہ ہزار درہم (آج کل کے تقریباً ۳۵، ۴۰ لاکھ روپے) بنتی تھی، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ورثاء کے حوالے کر دی۔ [2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب کوفہ کو مرکز بنایا تو وہاں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ ان کے گرد جمع ہو گئے اور ان کے دریافت کرنے پر اپنے استاذ کی صفات سنائیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وہ ایسے ہی تھے بلکہ اس سے بھی بہتر۔ انہوں نے قرآن پڑھا، اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانا۔ وہ دین کے فقیہ اور سنت کے عالم تھے۔'' [3]

رضی اللہ عنہ وارضاہ

☆☆☆

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱/۴۹۷، ط الرسالۃ

② سیر اعلام النبلاء: ۱/۴۹۸

③ طبقات ابن سعد: ۳/۱۵۶، صادر

عاشقِ رسول......پیکرِ غیرت وحمیت

حضرت عثمان بن مَظعُون رضی اللہ عنہ

بالکل شروع میں مشرف بہ اسلام ہونے والے اور اسلام کی خاطر مصائب کے پہاڑ برداشت کرنے والے ایک جلیل القدر صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ تھے۔ کنیت ابو سائب تھی۔ والدہ کا نام سخیلہ بنت عنبس تھا۔ آپ اس وقت دامنِ اسلام سے وابستہ ہوئے جب صرف تیرہ افراد مسلمان تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آپ کے بہنوئی تھے یعنی آپ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت اُمّ المؤمنین حفصہ رضی اللہ عنہا کے سگے ماموں تھے۔ دورِ جاہلیت میں بھی مے نوشی سے گریزاں تھے۔ فرماتے تھے:

''ایسا کام کیوں کروں جس سے عقل متاثر ہو اور کم ظرف لوگ مجھ پر ہنسیں۔''[1]

زہد وعبادت میں نمایاں مقام رکھتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ترکِ دنیا اور قوتِ نکاح سے عاری ہونے کی اجازت مانگی تھی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہ دی[2] اور بکثرت روزے رکھنے کی تلقین کی۔[3]

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ اہلِ مکہ کے ظلم وستم سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہاں جب اطلاع ملی کہ قریشِ مکہ مشرف بہ اسلام ہوگئے ہیں تو یہ واپس آگئے۔ مکہ کے قریب پہنچ کر اصل صورتحال کا علم ہوا۔ دوبارہ حبشہ کی طرف سفر کرنا مشکل تھا اس لیے مشہور مشرک سردار ولید بن مغیرہ کی پناہ لے لی اور قریش کے مظالم سے محفوظ ہوگئے۔

ادھر مسلمانوں پر سختیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ برداشت نہ کرسکے کہ ان کے شب وروز سکون سے گزریں اور باقی مسلمان سراپا اذیت رہیں۔ کہنے لگے: ''میرے دوستوں کی زندگی مصائب وآلام میں گزر رہی ہے اور میں ایک کافر کی امان میں مزے سے گزر بسر کررہا ہوں، اللہ کی قسم میرے اندر ضرور کوئی نقص ہے۔''

یہ کہہ کر انہوں نے ولید کو اس کی امان واپس کردی۔ کچھ دنوں بعد عرب کے مشہور شاعر لبید بن ربیعہ نے جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے، اہلِ مکہ کی کسی محفل میں اشعار سناتے ہوئے کہا۔

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ (اللہ کے سوا سب چیزیں باطل ہیں۔)

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''سچ کہا''

لبید نے دوسرا مصرع پڑھا۔ ''وَکُلُّ نَعِیْمٍ لَا مَحَالَۃَ زَائِلٌ'' (ہر نعمت ضرور زوال پذیر ہوگی۔)

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے بے ساختہ آواز لگائی: ''غلط! جنت کی نعمتیں لازوال ہیں۔''

---

① اسد الغابۃ: ۳/۵۸۹

② صحیح البخاری، ح: ۵۰۷۳، کتاب النکاح، باب کراھیۃ التبتل ③ الزھد والرقائق لعبداللہ بن المبارک، ح: ۱۱۰۶

یہ سن کر لبید نے حاضرین سے کہا:

''اللہ کی قسم آپ کے اہلِ محفل ایسی ناگوار باتیں پہلے تو نہیں کیا کرتے تھے۔ یہ تبدیلی کب سے شروع ہوئی؟''

ایک شخص نے کہا: ''یہ نادان ہے، اس کے ساتھ ایسے کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ آپ خیال نہ کریں۔''

لبید نے دوبارہ وہی شعر پڑھا۔ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے پھر اسی طرح ٹوکا۔ بات بڑھ گئی۔ وہی شخص مشتعل ہو کر آگے بڑھا اور آپ کے چہرے پر اس زور کا طمانچہ مارا کہ آنکھ پھوٹنے کے قریب ہوگئی اور نشان پڑ گیا۔

کسی نے کہا: ''آپ ولید کی پناہ میں تھے تو آپ کی آنکھ محفوظ تھی، غلطی کی کہ اس کی امان سے نکل گئے۔''

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے بے ساختہ فرمایا: ''میں تو اپنی دوسری آنکھ بھی دین پر فدا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ میرے لیے زیادہ مضبوط ہے۔''[1]

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو ہجرت حبشہ کے بعد ہجرتِ مدینہ کا اعزاز بھی نصیب ہوا۔ غزوہ بدر میں شرکت کی سعادت ملی۔ اس کے بعد جلد ہی ۲ ھ میں انتقال ہوگیا۔ مہاجرین میں وہ پہلے آدمی تھے جن کا مدینہ میں انتقال ہوا اور جنہیں جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نعش کو تین بار بوسہ دیا جبکہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔[2]

پھر فرمایا: ''اے عثمان! تم دنیا سے اس حال میں گئے کہ دنیا کی کسی چیز سے آلودہ نہیں ہوئے۔''[3]

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نے ان کی وفات پر کہا۔

يَا عَيْنُ جُوْدِیْ بِدَمْعٍ غَيْرِ مَمْنُوْعٍ — عَلٰی رُزْيَةِ عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ

عَلٰی امْرَأٍ بَاتَ فِیْ رِضْوَانِ خَالِقِهٖ — طُوْبٰی لَهٗ مِنْ فَقِيْدِ الشَّخْصِ مَدْفُوْنٍ

''اے آنکھ! عثمان بن مظعون کے حادثہ پر مسلسل آنسو بہا، ایسے شخص پر جو اپنے خالق کی رضا کے لیے رات بسر کرتا تھا، خوش خبری ہے اس کے لیے جس کا جسدِ مبارک قبر کے حوالہ کر دیا گیا۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی قبر پر نشانی کے لیے ایک پتھر رکھوا دیا۔ آپ کبھی کبھی وہاں تشریف لے جاتے تھے۔

ایک صحابیہ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے لئے ایک نہر جاری ہے۔ رسول اللہ رضی اللہ عنہ نے سن کر فرمایا: ''یہ ان کے اعمال کا ثمرہ ہے۔''[4]

رضی اللّٰہ تعالٰی عنه وارضاه

☆☆☆

---

① حلية الاولياء: ١٠٣/١، ط السعادة؛ اسد الغابة: ٥٨٩/٣

② سنن الترمذی، کتاب الجنائز، باب تقبيل الميت؛ الاستيعاب: ١٠٥٤/٣

③ اسد الغابة: ٥٨٩/٣

④ اسد الغابة: ٥٨٩/٣

مہاجرِ اوّل...... معلّمِ انصار...... علمبردارِ پیغمبر

حضرت مُصعَب بن عمیر رضی اللہ عنہ

حضرت مُصعَب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ ان کا شمار السابقون الاوّلون میں ہوتا ہے۔ یہ مکّہ کے سب سے خوبصورت، اور ناز ونعمت میں رہنے والے نوجوان تھے۔ بیش قیمت لباس زیبِ تن رکھتے تھے۔[1]

یہ ان دنوں مشرف بہ اسلام ہوئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دارارقم کو تبلیغ کا مرکز بنایا ہوا تھا۔ یہ زمانہ اسلام کی خفیہ دعوت اور قبول کرنے والوں پر مظالم کا تھا۔ جب ان کے خاندان کو ان کے اسلام کا علم ہوا تو انہیں بیڑیاں لگا دیں۔ جس وقت مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کرنے لگے تو حضرت مُصعَب رضی اللہ عنہ بھی فرار ہو کر حبشہ کی طرف ہجرت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔[2]

کچھ مدت بعد واپس آگئے۔ مدینہ میں اسلام پھیلنے لگا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں انصار کی تعلیم اور نماز کی امامت کے لیے وہاں روانہ فرما دیا۔ ان کی تبلیغ سے وہاں گھر گھر اسلام کا چرچا ہو گیا۔ یہ سب سے پہلے مدینہ ہجرت کرنے والے خوش قسمت صحابی ہیں۔ مکّہ کے اس رئیس زادے نے وہاں بڑی تنگ دستی کی زندگی گزاری۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے کہ حضرت مُصعَب بن عمیر رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے، جسم پر ایک چھوٹی سی چادر تھی جس میں چمڑے کے ٹکڑے لگے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی گزشتہ حالت کو یاد کر کے اشک بار ہو گئے۔[3]

حضرت مُصعَب رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر میں دادِ شجاعت دی۔ پھر غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے۔ اس لڑائی میں پرچم نبوی انہی کے ہاتھ میں تھا، یہاں آپ رضی اللہ عنہ بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ آپ کی شہادت کی وجہ سے یہ افواہ پھیل گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں کیوں کہ آپ رضی اللہ عنہ شکل وصورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھے۔

شہادت کے وقت ان کی ملکیت میں صرف ایک چادر تھی، جب ان کے پاؤں کو اس سے ڈھانپا جاتا تو سر کھل جاتا اور اگر سر ڈھانپا جاتا تو پاؤں ظاہر ہو جاتے۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سر کو ڈھانپ دو اور پاؤں پر اذخر گھاس ڈال دو۔"[4]

رضی اللہ تعالٰی عنہ وارضاہ

☆☆☆

---

① الاصابۃ: ۹۸/۶، ط العلمیۃ
② الاستیعاب: ۱۴۷۴/۴
③ اسد الغابۃ: ۱۷۵/۵
④ الاصابۃ: ۹۸/۶، ط العلمیۃ

رئیسِ انصار، غیور و جانثار

حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ

حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ انصاری قبیلے اَوس کی شاخ عبدالاَشہل کے سردار تھے۔ سیاسی اثر و رسوخ کی وجہ سے زمانہ جاہلیت میں قریشِ مکّہ اور یہودی قبائل سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ ان کا شمار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب ترین انصاری صحابہ میں ہوتا ہے۔ قائدانہ صفات سے مالا مال اور پیکرِ غیرت و شجاعت تھے۔ جسمانی لحاظ سے لمبے چوڑے اور زور آور تھے۔ فصاحت و بلاغت اور زورِ خطابت میں مشہور تھے۔ مدینہ منورہ میں اسلام کی اشاعت میں ان کا کردار بہت نمایاں ہے۔ حضرت مُصعَب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام لائے اور اپنے قبیلے سے کہہ دیا:

"كَلَامُ رِجَالِكُمْ وَ نِسَائِكُمْ عَلَيَّ حَرَامٌ حَتّٰى تُسْلِمُوْا"

"تمہارے مردوں اور عورتوں کے ساتھ بات کرنا میرے لئے حرام ہے جب تک تم اسلام قبول نہ کرلو۔"

یہ سن کر تقریباً سارا قبیلہ اسی دن مشرف بہ اسلام ہوگیا۔[1]

ان کی صحابیت کا زمانہ بمشکل چھ سال ہے مگر ان کے کارنامے کتبِ سیرت و احادیث میں بہت نمایاں ہیں۔ غزوہ بدر، اُحد اور خندق میں وہ انصار کی قیادت کرتے رہے۔ بدر کی لڑائی سے پہلے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے؟ تو انہوں نے انصار کے سردار ہونے کی حیثیت سے پوری قوم کی ترجمانی کرتے ہوئے جو تقریر کی وہ تاریخ کے اوراق میں جگمگا رہی ہے۔ انہوں کہا تھا:

"لَئِنْ سِرْتَ حَتّٰى تَأْتِيَ بَرْكَ الْغِمَادِ لَنَسِيْرَنَّ مَعَكَ، وَلَا نَكُوْنُ كَالَّذِيْنَ قَالُوْا لِمُوْسٰى مِنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ: اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ. وَلٰكِنْ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا مَعَكُمَا مُتَّبِعُوْنَ ...... فَصِلْ حِبَالَ مَنْ شِئْتَ وَاقْطَعْ حِبَالَ مَنْ شِئْتَ وَسَالِمْ مَنْ شِئْتَ وَعَادِ مَنْ شِئْتَ وَخُذْ مِنْ اَمْوَالِنَا مَاشِئْتَ."

"اگر آپ برکِ غماد تک بھی جائیں تو ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: آپ اور آپ کا رب جا کر لڑیں، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ بلکہ ہم کہتے ہیں کہ آپ اور آپ کا رب جا کر لڑیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ جس سے چاہیں رشتہ جوڑیں، جس سے چاہیں رشتہ توڑیں۔ جس سے چاہیں صلح کریں، جس سے چاہے جنگ کریں، ہماری دولت میں سے جو چاہے لے لیں۔"[2]

اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر جب تہمت لگائی گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الزام تراشی کرنے والوں کو سزا

---

① الاصابۃ: ۳/۷۱

② مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۶۶۹۰ ط الرشد ؛ صحیح مسلم، ح: ۴۷۲۱، کتاب الجهاد، باب غزوة بدر

دینے کے متعلق صحابہ سے مشورہ طلب کیا تو سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے کھڑے ہو کر یہ غیرت مندانہ جواب دیا: ''میری رائے یہ ہے کہ آپ ایسے لوگوں کے سر قلم کرا دیں۔ اگر وہ قبیلہ اَوس کا ہے تو ہم اس کی گردن کاٹ دیں گے۔ اگر وہ ہمارے خزرجی بھائیوں میں سے کوئی ہے تو آپ جو حکم دیں گے ہم بجالائیں گے۔''①

غزوۂ خندق میں آپ کی کلائی میں ایک تیر لگا، جس نے شہ رگ کو کاٹ دیا۔ یہی زخم جان لیوا ثابت ہوا۔ ②

جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تیر لگا اور خون تھمنے کو نہیں آرہا تھا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دعا کی:

''اے اللہ تب تک میری روح نہ نکلے جب تک میں بنو قُریظہ کا انجام دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی نہ کرلوں۔''

دعا قبول ہوئی اور خون اسی وقت رک گیا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ سے اس قدر محبت تھی کہ ان کا زخم بہتا دیکھ کر انہیں اپنی گود میں لے لیا اور حکم دیا کہ انہیں مسجد کے ایک خیمہ میں ٹھہرایا جائے تاکہ قریب سے ان کی دیکھ بھال کی جا سکے۔ ③

بنو قُریظہ کے یہودیوں نے غزوۂ خندق میں مشرکین کا ساتھ دیا تھا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سزا دینے کے لئے ان کا محاصرہ کیا تو انہوں نے حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ سے زمانہ جاہلیت کی پرانی دوستی پر بھروسہ کر کے انہی کو ثالث تجویز کیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ زخمی حالت میں وہاں تشریف لائے اور فیصلہ فرمایا: ''ان کے مردوں کی گردنیں اڑا دی جائیں اور عورتوں، بچوں کو قیدی بنا لیا جائے۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے وہی فیصلہ کیا جو اللہ نے کیا ہے۔''④

اس فیصلے کے بعد خون پھر جاری ہو گیا اور مدینہ پہنچ کر غزوۂ خندق کے ایک ماہ بعد شہادت ہو گئی۔ اس موقع پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سعد رضی اللہ عنہ کے جنازہ میں شرکت کے لئے آسمان سے ستر ہزار ایسے فرشتے اترے جو اس سے پہلے زمین پر کبھی نہیں اترے تھے۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ طویل قد اور بھاری بدن تھے مگر ان کا جنازہ بہت ہلکا تھا، لوگوں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنازہ فرشتوں نے اٹھا رکھا ہے۔ ان کی وفات کے بعد جبریل علیہ السلام نے آ کر عرض کیا:

''یہ کون شخص ہیں جن کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے اور عرش جھوم اٹھا!!''

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمر بھر موقع بموقع اپنے اس جانثار کو یاد کرتے رہے۔ ایک موقع پر ریشم کا بہت ملائم کپڑا آیا، صحابہ کرام دیکھ کر حیرت کا اظہار کر رہے تھے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اس کپڑے پر تعجب کرتے ہو۔ سعد بن مُعاذ کے (جنتی) رومالوں میں سے ایک رومال بھی اس سے بہت زیادہ عمدہ اور نرم و ملائم ہے۔''⑤

رضی اللہ تعالٰی عنہ وارضاہ

---

① مسند ابی یعلی، ح: ۴۹۳۱، ط دار المامون؛ صحیح البخاری: ۲۶۶۲، کتاب الشهادات، باب تعدیل النساء

② الاستیعاب: ۲/۶۰۳ ③ اسد الغابة: ۲/۴۶۱

④ صحیح البخاری، ح: ۳۸۰۴، کتاب المناقب، باب مناقب سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ

⑤ صحیح مسلم، ح: ۶۵۰۲، کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ

اللہ کی تلوار......میدانِ جہاد کے شہسوار

سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دنیا کی تاریخ کا سب سے عظیم سپہ سالار مانا جاتا ہے۔ وہ اللہ کی ایک نشانی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ تھے۔ وہ تاریخ انسانی کے واحد جرنیل تھے جنہوں نے سینکڑوں معرکوں میں شرکت کی اور کبھی شکست نہیں کھائی۔ وہ قریش کی شاخ بنومخزوم کے سردار ولید بن مُغیرہ کے فرزند تھے۔ ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے۔ ۸ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور اسلام لائے۔ اس وقت ان کی عمر لگ بھگ پینتالیس سال تھی۔

قبولِ اسلام کے کچھ ہی عرصے بعد انہوں نے شام کے علاقے مُوتہ کے مقام پر ہونے والی جنگ میں اسلامی فوج کے تین قائدین کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی کمان کی اور رومیوں کے سوگنا بڑے لشکر کے مقابلے میں ثابت قدم رہے۔ وہ بذاتِ خود اس شدت سے لڑے کہ ان کے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹ ٹوٹ کر گریں۔[1]

آخر کار وہ کسی بڑے جانی نقصان کے بغیر رومیوں کو پسپا کر کے مجاہدین کو بحفاظت واپس لے آئے۔ اس کارنامے پر دربارِ رسالت سے انہیں "سیف اللہ" (اللہ کی تلوار) کا لقب عطا ہوا۔[2]

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ، غزوہ طائف، غزوۂ حنین اور غزوۂ تبوک میں اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں مرتدین اور منکرینِ ختم نبوت کی سرکوبی اور عراق کی فتوحات کے آغاز میں ان کا کردار سب سے نمایاں رہا۔ ان کی شجاعت وبسالت دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: "کوئی عورت خالد جیسا بیٹا پیدا نہیں کر سکتی۔"[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں شام کی فتوحات میں انہوں نے حریف پر اپنی جنگی مہارت کا سکہ اس طرح بٹھایا کہ دنیا انہیں ناقابلِ شکست تصور کرنے لگی۔ انہوں نے اپنی ٹوپی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند بال محفوظ کر رکھے تھے۔ اس کی برکات کو وہ اس طرح بیان فرماتے تھے:

"یہ ٹوپی پہن کر میں جس جنگ میں بھی شریک ہوا، اس میں فتح نصیب ہوئی۔"[4]

وہ ایک فصیح وبلیغ خطیب تھے۔ جہادی مہمات کے دوران ان کی تقاریر مجاہدین میں ایک نئی روح پھونک دیا کرتی

---

① صحیح البخاری، ح: ۴۲۶۵، کتاب المغازی، باب غزوۃ مؤتہ
② سنن الترمذی، ح: ۳۸۴۶؛ الاصابۃ: ۲/۲۱۶
③ الاعلام للزرکلی: ۲/۳۰۰
④ مستدرک حاکم، ح: ۵۲۹۹

تھیں اوران کے پُرشکوہ جملوں سے دشمن کانپ جاتا تھا۔اہلِ فارس سے سامنا ہوا تو اس شیرِ نر نے انہیں یہ پیغام بھیجا:

''میرے ساتھ ایسی قوم ہے جسے موت ویسی ہی پیاری ہے جیسی تمہیں شراب۔''[1]

جہاد کا ذوق وشوق ان کی روح میں رچ بس گیا تھا۔ان کا کرتا زِرہ پہننے کی وجہ سے زنگ آلود ہو جاتا تھا۔تلوار کمر سے بندھی رہتی تھی۔دشمن کو مرعوب کرنے کے لیے کبھی خون آلود تیر اپنے عمامے میں اڑس لیتے تھے۔[2]

فرماتے تھے: ''کسی نئی نویلی دلہن کے ساتھ رات گزارنے کے مقابلے میں مجھے یہ کہیں زیادہ پسند ہے کہ میں پوری رات مجاہدین کی جماعت کے ساتھ برف باری میں سفر کروں اور بوقتِ سحر دشمن سے جا بھڑوں۔''[3]

موت کا سامنا کرنا ان کے نزدیک ایک کھیل تھا۔شہادت ان کی دلی مراد اور سب سے بڑی آرزو تھی،اسی تمنا کے پورے ہونے کی خاطر کبھی میدانِ جنگ سے پیچھے نہیں ہٹے۔کہتے تھے:

''میں یہ سوچ کر کبھی فرار نہیں ہوا کہ یا تو اللہ مجھے شہادت کا رتبہ دے گا،یا فتح کی عزت۔''[4]

اللہ پر اعتماد کا یہ عالم تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے سامنے زہر لایا گیا۔آپ بسم اللہ پڑھ کر اسے بے خوف وخطر پی گئے اور ان کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ایسے مقبولِ دعا تھے کہ ایک بار کوئی شخص شراب کا مشکیزہ لایا۔آپ کو شہد کی طلب تھی،دعا کی،اللہ اسے شہد بنا دے۔آناً فاناً وہ شراب شہد میں تبدیل ہو گئی۔[5]

عمر بھر جہاد میں گزاری،یہی ان کی روح کی غذا تھی۔اسی کو وہ سرمایۂ آخرت اور اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے، فرماتے تھے: ''اللہ کی توحید کا اقرار کرنے کے بعد میرے نزدیک اس سے زیادہ امید والا عمل اور کوئی نہیں کہ میں نے ایک پوری رات اس طرح گزاری کہ آسمان سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔میں سر پر ڈھال تانے کھڑا تھا۔ہم سحر کا دھندلکا ہونے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ کفار پر حملہ کر دیں۔''[6]

وہ علم کے بڑے شائق تھے۔ان سے متعدد احادیث مروی ہیں۔مگر انہیں اس بات کا افسوس رہتا تھا کہ جہادی مصروفیات کی وجہ سے علوم سیکھنے کا زیادہ موقع نہ ملا۔فرماتے تھے: ''جہاد مجھے زیادہ پڑھنے سے مانع رہا۔''[7]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خدشے سے کہ مسلمانوں کا اعتماد اللہ کی بجائے اپنے سالار پر نہ ہو جائے،انہیں فوج کی سپہ سالاری سے معزول کر دیا مگر اس کے باوجود وہ محاذوں پر دادِ شجاعت دیتے رہے۔[8]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱/۳۷۴

② سیر اعلام النبلاء: ۱/۳۷۸ ، ط الرسالۃ

③ مجمع الزوائد للھیثمی رحمہ اللہ، ح: ۱۵۸۸۵، رجالہ رجال الصحیح

④ سیر اعلام النبلاء: ۱/۳۷۵

⑤ الاصابۃ: ۲/۲۱۸ بسند صحیح

⑥ سیر اعلام النبلاء: ۱/۳۸۱

⑦ مجمع الزوائد للھیثمی رحمہ اللہ، ح: ۱۵۸۸۶، رجالہ رجال الصحیح

⑧ البدایۃ والنھایۃ: ۱۰/۱۳۵ ط دار ھجر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی قابلیت کے قائل تھے، اس لیے کچھ عرصے بعد انہیں الجزیرہ کا حاکم بنا دیا مگر ایک سال بعد وہ مستعفی ہو کر چلے آئے۔ ۲۲ ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کا مزار شام کے شہر حمص میں ہے۔[1]

وفات کے وقت روئے دنیا کے اس دلیر ترین انسان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ فرما رہے تھے:

''میں موت کو ہر اس جگہ تلاش کرتا رہا جہاں وہ مل سکتی تھی۔ میں نے اتنی جنگیں لڑیں کہ جسم پر تھوڑی سی جگہ بھی ایسی نہیں جہاں تلوار، تیر یا نیزے کا زخم نہ ہو۔ مگر افسوس کہ اس کے باوجود بستر پر مر رہا ہوں۔''[2]

آپ رضی اللہ عنہ کی زندگی سادہ اور مجاہدانہ تھی۔ جو ہاتھ میں آتا وہ اللہ کے راستے میں دل کھول کر خرچ کرتے۔ وفات سے پہلے اپنا اسلحہ اور گھوڑا بھی اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے وقف کرنے کی وصیت فرما دی۔[3]

آپ کی وفات کی خبر پورے عالم اسلام میں نہایت صدمے کے ساتھ سنی گئی۔ مرد تو کیا عورتیں اور باندیاں تک اشک بار تھیں۔ مدینہ منورہ کی ایک باندی بے ساختہ یہ اشعار پڑھ رہی تھی:

اَنْــتَ خَیْــرٌ مِــنْ اَلْفِ اَلْفٍ مِــنَ الْ ‏ ‏ ‏ قَــوْمِ اِذَا مَــا کُبَّــتْ وُجُــوْهُ الـرِّجَـالِ

''اے خالد! جب مردوں کے چہروں کا رنگ بدل جاتا، تو آپ تنہا دس لاکھ سے زیادہ کارگر ثابت ہوتے تھے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ شعر سنا تو فرمایا: ''بالکل سچ کہا، وہ ایسے ہی تھے۔''[4]

رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ

☆☆☆

---

① مستدرک حاکم، ح: ۵۲۸۶
ایک روایت یہ ہے کہ ان کی وفات ۲۱ ہجری میں مدینہ میں ہوئی تھی۔ (مستدرک حاکم، ح: ۵۲۸۷)
تاہم حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے حمص میں وفات اور وہیں تدفین کے قول کو ترجیح دی ہے، جہاں ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱/۳۸۴ ط الرسالۃ)

② سیر اعلام النبلاء: ۱/۳۷۹، ط الرسالۃ

③ سیر اعلام النبلاء: ۱/۳۸۱

④ سیر اعلام النبلاء: ۱/۳۸۲

خطاب بہ نوجوانانِ اسلام

شاعرِ مشرق ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اِک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
تمدن آفریں، خلاقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتر بانوں کا گہوارا
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرانشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا
تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارا
گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پہ آسماں نے ہم کو دے مارا

☆☆☆

اہلِ نظر صحابہ

شاعر اسلام جناب اثر جونپوری

اہلِ ہنر صحابہ اہلِ نظر صحابہ
شب ہائے تیرگی میں نورِ سحر صحابہ

☆☆☆

اغیار کے مقابل سینہ سپر صحابہ
آپس میں رحمدل اور شیر و شکر صحابہ

☆☆☆

سائے میں جس کی اب تک بستے ہیں اہلِ ایماں
ہیں گلستانِ حق کا ایسا شجر صحابہ

☆☆☆

تب جا کے آج تک ہے بیدار نورِ سنت
مثلِ چراغ جلتے تھے عمر بھر صحابہ

☆☆☆

اے کاروانِ باطل تو کیوں بھٹک رہا ہے
ہیں آسمانِ حق پر روشن قمر صحابہ

☆☆☆

کتابیات

جلد اول تا جلد سوم

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	{حرف الف}	
1	آثار البلاد واخبار العباد	زکریا القزوینی
2	ابجد العلوم	صدیق حسن خان قنوجی
3	ابوالحسن الاشعری	حماد بن محمد الانصاری
4	ابوبکر الصدیق وبنوہ	محمود عبدالفتاح شرف الدین
5	ابوحنیفۃ حیاتہ وعصرہ	محمد ابوزہرۃ
6	اتحاف الخیرۃ المہرۃ بزوائد المسانید العشرۃ	شہاب الدین بوصیری الکنانی
7	اتحاف السائل بمانی الطحاویۃ من مسائل، شرح العقیدۃ الطحاویۃ	صالح بن عبدالعزیز آل شیخ
8	اتحاف المہرۃ بالفوائد المبتکرۃ مناطراف العشرۃ	ابن حجر عسقلانی
9	اتعاظ الحنفاء باخبار ائمۃ الفاطمیین الخلفاء	تقی الدین المقریزی
10	اجتماع الجیوش الاسلامیۃ	ابن قیم الجوزیۃ
11	احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم	ابوعبداللہ المقدسی البشاری
12	احسن الفتاویٰ	مفتی رشید احمد لدھیانوی
13	احکام القرآن	الجصاص الرازی
14	احیاء علوم الدین	ابوحامد الغزالی
15	اخبار ابی حفص عمر بن عبدالعزیز	ابوبکر محمد بن الحسین الآجری
16	اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ	الحسین بن علی الصیمری
17	اخبار العلماء باخبار الحکماء	ابوالحسن علی بن یوسف القفطی
18	اخبار المکیین من تاریخ ابن ابی خیثمۃ	ابوبکر ابن ابی خیثمۃ
19	اخبار الوافدات من النساء علیٰ معاویۃ بن ابی سفیان	عباس بن بکار
20	اخبار بن عبید وسیرتہم	محمد بن علی صنہاجی القلعی
21	اخبار الدولۃ العباسیۃ	مصنف: نامعلوم، محقق: عبدالعزیز الدوری
22	اخبار القضاۃ	ابوبکر وکیع بغدادی
23	اخبار مکۃ (تاریخ مکۃ)	ابوعبداللہ الفاکہی
24	اخبار مکۃ وما جاء فیہا من الآثار	ابوالولید الازرقی
25	اخلاق جلالی	جلال الدین دوانی
26	اردو دائرہ معارف اسلامیہ	جماعت مؤلفین
27	ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری	احمد بن محمد القسطلانی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
		حرف الف	
۶۸۲ھ	1	دار صادر، بیروت	مذکور نہیں
۱۳۰۷ھ	1	دار ابن حزم	۱۴۲۳ھ۔۲۰۰۲ء
۱۴۱۸ھ	1	الجامعۃ الاسلامیۃ، المدینۃ المنورۃ	۱۳۹۴ھ۔۱۹۷۴ء
معاصر	1	مکتبۃ الآداب، قاہرہ	مذکور نہیں
۱۳۹۴ھ۔۱۹۷۴ء	1	دار الفکر العربی	۱۹۴۷ء
۸۴۰ھ	8	دار الوطن، ریاض	۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء
معاصر	1	مکتبہ شاملہ	
۸۵۲ھ	19	مجمع الملک فہد: المدینۃ المنورہ	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۸۴۵ھ	3	لجنۃ احیاء التراث الاسلامی، مصر	مذکور نہیں
۷۵۱ھ	1	دار عالم الفوائد	۱۴۳۱ھ
۳۸۰ھ	1	دار صادر، بیروت	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۱ء
۱۴۲۲ھ	10	ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی	۱۴۲۵ھ
۳۷۰ھ	3	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۵۰۵ھ	4	دار المعرفۃ، بیروت	مذکور نہیں
۳۶۰ھ	1	مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۰۰ھ۔۱۹۸۰ء
۴۳۶ھ	1	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۵ھ۔۱۹۸۵ء
۶۴۶ھ	1	دار الکتب العلمیۃ	۲۰۰۵ء
۲۷۹ھ	1	دار الوطن	۱۹۹۷ء
۲۲۲ھ	1	مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۶۲۸ھ	1	دار الصحوۃ القاہرہ	مذکور نہیں
تیسری صدی ہجری	1	دار الطلیعۃ، بیروت	مذکور نہیں
۳۰۶ھ	3	عالم الکتب، بیروت	۱۳۶۶ھ۔۱۹۴۷ء
۲۷۲ھ	5	دار خضر، بیروت	۱۴۱۴ھ
۲۵۰ھ	2	دار الاندلس للنشر، بیروت	مذکور نہیں
۹۰۸ھ	1	شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہور	۱۳۰۲ھ
	24	دانش گاہ، پنجاب	۱۹۶۴ء تا ۱۹۹۳ء
۹۲۳ھ	10	المطبعۃ الکبریٰ الامیریہ، مصر	۱۳۲۳ھ

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
28	ارشاد القاصی والدانی الی تراجم الشیوخ الطبرانی	ابوالطیب نائف بن صلاح المنصوری
29	اسد الغابة	ابن اثیر الجزری
30	اسماء المدلسین	جلال الدین سیوطی
31	اصول السنة (السنة)	امام احمد بن حنبل
32	اصول مذهب الشیعة الامامیة الاثنی عشریة عرض ونقد	ڈاکٹر ناصر بن عبداللہ القفاری
33	اضواء علی الہند (تاریخ الاسلام فی الہند)	عبدالمنعم النمر
34	اعتقاد اہل السنة (شرح اصول اعتقاد اہل السنة والجماعة)	ہبة اللہ بن الحسن ابوالقاسم الطبری الرازی اللالکائی
35	اعتقادات فرق المسلمین والمشرکین	امام فخر الدین رازی
36	اعلام الموقعین عن رب العالمین	ابن القیم الجوزیة
37	اقاویل الثقات فی تاویل الاسماء والصفات	مرعی بن یوسف المقدسی الحنبلی
38	اقتضاء الصراط المستقیم	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیة الحرانی
39	اکمال المعلم بفوائد مسلم (شرح صحیح مسلم)	قاضی عیاض یحصبی السبتی
40	اکمال تہذیب الکمال	علاؤ الدین مغلطائی
41	الآحاد والمثانی	ابوبکر ابن ابی عاصم الشیبانی
42	الابانة عن شریعة الفرقة الناجیة	ابن بطة العکبری
43	الاحتجاج (احتجاج طبرسی)	ابومنصور الطبرسی
44	الاحکام السلطانیة	ابوالحسن الماوردی
45	الاحکام السلطانیة	ابویعلی الفراء
46	الاخبار الطوال	ابوحنیفة الدینوری
47	الاختیار لتعلیل المختار	عبداللہ بن محمود الموصلی، ابوالفضل الحنفی
48	الاخنائیة	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیة الحرانی
49	الادب المفرد	امام محمد بن اسماعیل البخاری
50	الارشاد فی معرفة علماء الحدیث	ابویعلی خلیلی القزوینی
51	الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصی	شہاب الدین الدرعی السلاوی
52	الاستیعاب فی معرفة الاصحاب	ابن عبدالبر قرطبی
53	الاسرار المرفوعة فی الاخبار الموضوعة	ملا علی قاری
54	الاشراف فی منازل الاشراف	ابن ابی الدنیا
55	الاصابة فی تمییز الصحابة	ابن حجر العسقلانی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
معاصر	1	دارالکیان، ریاض	مذکورنہیں
۶۳۰ھ	8	دارالکتب العلمیۃ، بیروت	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۹۱۱ھ	1	دارالجیل	مذکورنہیں
۲۴۱ھ	1	دارالمنار، سعودیہ	۱۴۱۱ھ
معاصر	3	دارالنشر	۱۴۱۴ھ
۱۹۹۱ء	1	دارالعہد الجدید، مصر	۱۹۶۰ء
۴۱۸ھ	4	دارطیبۃ، ریاض	۱۴۰۲ھ
۶۰۶ھ	1	دارالکتب العلمیۃ، بیروت	مذکورنہیں
۷۵۱ھ	4	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۱ء
۱۰۳۳ھ	1	موسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۰۶ھ
۷۲۸ھ	2	دارعالم الکتب، بیروت	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۹ء
۵۴۴ھ	8	دارالوفاء، مصر	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء
۷۶۲ھ	12	الفاروق الحدیثۃ	۱۴۲۲ھ۔۲۰۰۱ء
۲۸۷ھ	6	دارالرآیۃ، ریاض	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۱ء
۳۸۷ھ	3	دارالرآیۃ للنشر، سعودیہ	۱۴۱۸ھ
پانچویں صدی ہجری	2	مطابع النعمان النجف الاشرف	۱۳۸۶ھ۔۱۹۶۶ء
۴۵۰ھ	1	دارالحدیث، قاہرہ	
۴۵۸ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء
۲۸۲ھ	1	داراحیاء الکتب العربی	۱۹۶۰ء
۶۸۳ھ	5	مطبع حلبی، قاہرہ	۱۳۵۶ھ۔۱۹۳۷ء
۷۲۸ھ	1	دارالخراز، جدۃ	۱۴۲۰ھ۔۲۰۰۰ء
۲۵۶ھ	1	دارالبشائر الاسلامیۃ، بیروت	۱۴۰۹ھ۔۱۹۸۹ء
۴۴۶ھ	3	مکتبۃ الرشد، الریاض	۱۴۰۹ھ
۱۳۱۵ھ	3	دارالکتاب	مذکورنہیں
۴۶۳ھ	10	دارالجیل، بیروت	۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء
۱۰۱۴ھ	1	موسسۃ الرسالۃ	مذکورنہیں
۲۸۱ھ	1	مکتبۃ الرشد، الریاض	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۰ء
۸۵۲ھ	8	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۵ھ

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
56	الاصنام	ہشام بن محمد الکلبی
57	الاضداد	ابوبکر ابن الانباری
58	الاعتصام	ابراہیم بن موسیٰ الشاطبی
59	الاعتقاد والہدایۃ الیٰ سبیل الرشاد علیٰ مذہب السلف واصحاب الحدیث	ابوبکر بیہقی
60	الاعتماد فی الاعتقاد۔ شرح العمدۃ فی عقیدۃ اہل السنۃ والجماعۃ	ابوالبرکات النسفی
61	الاعلاق الخطیرۃ فی ذکر امراء الشام والجزیرۃ،	ابن شداد الحلبی
62	الاعلام	خیر الدین الزرکلی
63	الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ	شمس الدین السخاوی
64	الاغانی	ابوالفرج اصفہانی
65	الاکتفاء بما تضمنہ من مغازی رسول اللہ ﷺ والثلاثۃ الخلفاء	ابوالربیع الحمیری
66	الاکمال فی ذکر من لہ روایۃ فی مسند الامام احمد سوی من ذکر فی تہذیب الکمال	شمس الدین الحسینی الشافعی الدمشقی
67	الامّ (کتاب الام)	محمد بن ادریس الشافعی
68	الامام الشافعی	محمد ابوزہرہ
69	الامامۃ والسیاسۃ	ابن قتیبۃ الدینوری
70	الاموال	ابن زنجویہ
71	الانتصار للصحب والآل من افتراءات السماوی الضال	ابراہیم بن عامر الرحیلی
72	الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء	ابن عبدالبر المالکی
73	الانساب	عبدالکریم بن محمد السمعانی
74	الانصاف فیما یجب اعتقادہ ولا یجوز الجہل بہ	ابوبکر ابن الباقلانی
75	الانوار الکاشفۃ لما فی کتاب "اضواء علی السنۃ" من الزلل والتضلیل والمجازفۃ	عبدالرحمن بن یحییٰ الیمانی
76	الاوائل	ابوہلال العسکری
77	امالی القالی	ابوعلی القالی
78	امام ابوحنیفہ کی تدوینِ قانونِ اسلامی	ڈاکٹر حمید اللہ
79	امتاع الاسماع	تقی الدین مقریزی
80	امداد الفتاویٰ	مولانا اشرف علی تھانوی
81	انساب الاشراف	احمد بن یحییٰ البلاذری
82	انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
83	انوار النجوم (اردو ترجمہ مکتوبات قاسمی، از مولانا محمد قاسم نانوتوی)	مولانا انوار الحسن شیرکوٹی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۲۰۴ھ	1	مکتبہ شاملہ	
۳۲۸ھ	1	المکتبۃ العصریۃ، بیروت	۱۴۰۷ھ۔۱۹۸۷ء
۷۹۰ھ	1	دار ابن عفان، السعودیہ	۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء
۴۵۸ھ	1	دار الآفاق، بیروت	۱۴۰۱ھ
۷۱۰ھ	1	المکتبۃ الازہریۃ فی التراث، مصر	۱۴۳۳ھ۔۲۰۱۲ء
۶۸۴ھ	3	منشورات وزارۃ الثقافۃ، سوریا	۱۹۹۲ء
۱۳۹۶ھ	8	دار العلم للملایین	۲۰۰۲ء
۹۰۲ھ	1	دار الکتب العلمیہ، بیروت	مذکورنہیں
۳۵۶ھ	24	دار الفکر، بیروت	مذکورنہیں
۶۳۴ھ	2	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۰ھ
۷۶۵ھ	1	جامعۃ الدراسات الاسلامیۃ کراچی	مذکورنہیں
۲۰۴ھ	8	دار المعرفۃ، بیروت	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۱۳۹۴ھ۔۱۹۷۴ء	1	دار الفکر العربی	۱۹۷۸ء
۲۷۰ھ	1	مکتبۃ المنیل، مصر	۱۳۲۲ھ۔۱۹۰۴ء
۲۵۱ھ	1	مرکز الملک فیصل، سعودیہ	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
معاصر	1	مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ	۱۴۲۳ھ۔۲۰۰۳ء
۴۶۳ھ	1	دار الکتب العلمیۃ، بیروت	مذکورنہیں
۵۶۲ھ	13	دائرۃ المعارف العثمانیہ، دکن	۱۳۸۲ھ۔۱۹۶۲ء
۴۰۳ھ	1	المکتبۃ الازہریۃ	مذکورنہیں
۱۳۸۶ھ	1	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
۳۹۵ھ	1	دار البشیر	۱۴۰۸ھ
۳۵۶ھ	4	دار الکتب المصریۃ	۱۳۴۴ھ۔۱۹۲۶ء
۲۰۰۲ء	1	اردو اکیڈمی، سندھ	۱۹۸۳ء
۸۴۵ھ	15	دار الکتب العلمیہ، بیروت	۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء
۱۳۳۳ھ۔۱۹۴۳ء	6	مکتبہ دار العلوم کراچی	۱۴۳۱ھ۔۲۰۱۰ء
۲۷۹ھ	13	دار الفکر، دمشق	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۶ء
۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۹ء	1	مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی	مذکورنہیں
۱۳۹۶ھ۔۱۹۷۶ء		ناشرانِ قرآن لمیٹڈ، لاہور	مذکورنہیں

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
84	اہل سنت والجماعت	سید سلیمان ندوی
85	اوجز المسالک الی مؤطا امام مالک	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی
86	ایثار الحق علی الخلق	عز الدین الیمنی
87	ایضاح الدلیل فی قطع حجج اہل التعطیل	بدر الدین الکنانی الحموی الشافعی
88	ایضاح شواہد الایضاح	ابو علی القیسی
	﴿حرف ب﴾	
89	البحر الرائق شرح کنز الدقائق	ابن نجیم المصری
90	البحر المحیط فی التفسیر	ابو حیان اندلسی
91	البدء والتاریخ	المطہر بن الطاہر المقدسی
92	البلدان (کتاب البلدان)	احمد بن اسحاق یعقوبی
93	البنایۃ شرح الہدایۃ	بدر الدین عینی
94	البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب	ابن عذاری المراکشی
95	البیان فی مذہب الامام الشافعی	یحیٰی العمرانی الیمنی
96	بحوث فی تاریخ السنۃ المشرفۃ	اکرم ضیاء عمری
97	بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع	علاؤ الدین ابوبکر الکاسانی
98	بذل المجہود فی حل ابی داؤد	مولانا خلیل احمد سہارنپوری
99	بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب	کمال الدین ابن العدیم
	﴿حرف ت﴾	
100	الاجوبۃ الفاضلۃ لاسئلۃ العاشرۃ الکاملۃ (مع تعلیقات شیخ عبد الفتاح)	مولانا عبد الحیٔ لکھنوی
101	التاریخ الاسلامی	دکتور محمود شاکر
102	تحفۃ التحصیل فی ذکر رواۃ المراسیل	ابو زرعۃ ابن العراقی
103	تنویر الایمان اردو ترجمہ تطہیر الجنان	مولف۔ ابن حجر ہیثمی (مترجم: مولانا عبد الشکور)
104	التاریخ الاسلامی العام	علی ابراہیم حسن
105	التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی حتی سقوط غرناطہ	دکتور عبد الرحمن علی الحجی
106	التاریخ الاوسط	محمد بن اسماعیل البخاری
107	التاریخ الکبیر (مع حواشی محمود خلیل)	محمد بن اسماعیل البخاری
108	التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمۃ السفر الثالث	ابوبکر احمد ابن ابی خیثمۃ
109	التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمۃ السفر الثانی	ابوبکر احمد ابن ابی خیثمۃ

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۱۳۷۳ء	1	مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی	۱۹۹۷ء
۱۴۰۲ھ	17	دارالقلم، دمشق	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
۸۴۰ھ	1	دارالکتب العلمیہ	۱۹۸۷ء
۷۴۳ھ	1	دارالسلام للطباعۃ والنشر، مصر	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
قبل ۶۰۰ھ	1	دارالغرب الاسلامی	۱۴۰۸ھ۔۱۹۸۷ء
		حرف ب	
۹۷۰ھ	8	دارالکتاب الاسلامی	مذکورنہیں
۷۴۵ھ	10	دارالفکر بیروت	۱۴۲۰ھ
۳۵۵ھ	6	مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، مصر	مذکورنہیں
۲۹۲ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۲۲ھ
۸۵۵ھ	13	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۲۰ھ۔۲۰۰۰ء
۶۹۶ھ	2	دارالثقافۃ، بیروت	۱۹۸۳ء
۵۵۸ھ	13	دارالمنہاج، جدۃ	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء
معاصر	1	بساط، بیروت	۱۹۷۲ء
۵۸۷ھ	7	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
۱۳۴۶ھ	20	دارالکتب العلمیۃ	مذکورنہیں
۶۶۰ھ	12	دارالفکر	مذکورنہیں
		حرف ت	
	1	حلب	مذکورنہیں
۲۰۱۴ء	22	المکتب الاسلامی، بیروت	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۵ء
۸۲۶ھ		مکتبۃ الرشد، الریاض	مذکورنہیں
۹۷۴ھ	1	المکتبۃ العربیہ لاہور	مذکورنہیں
بیسوی صدی عیسوی		مکتبۃ النہضۃ المصریۃ	۱۹۶۳ء
معاصر	1	دارالقلم، دمشق	۱۴۰۲ھ۔۱۹۸۲ء
۲۵۶ھ	2	دارالوعی، دارالتراث، حلب، قاہرہ	۱۳۹۷ھ۔۱۹۷۷ء
۲۵۶ھ	8	مطبعۃ عثمانیہ، حیدرآباد دکن	مذکورنہیں
۲۷۹ھ	3	الفاروق الحدیثۃ، قاہرہ	۱۴۲۷ھ۔۲۰۰۶ء
۲۷۹ھ	2	الفاروق الحدیثۃ، قاہرہ	۱۴۲۷ھ۔۲۰۰۶ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
110	التبصیر فی الدین وتمیز الفرق الناجیۃ من الفرق الھالکین	طاہر بن محمد الاسفرائینی
111	التحریر والتنویر	شیخ محمد بن طاہر العاشور
112	التحفۃ المقدسیۃ فی مختصر تاریخ النصرانیۃ	ابو محمد عاصم المقدسی
113	التذکرۃ الحمدونیۃ	ابن حمدون بہاؤ الدین البغدادی
114	الترغیب والترہیب	عبد العظیم المنذری
115	التشریع الجنائی الاسلامی مقارنا بالقانون الوضعی	عبد القادر عودۃ
116	التعدیل والتجریح لمن خرج لہ البخاری فی الجامع الصحیح	ابو الولید الباجی
117	التفسیر الوسیط	وہبۃ الزحیلی
118	التقریب والتیسیر	یحیٰی بن شرف النووی
119	التقریر والتحبیر علی تحریر الکمال ابن الہمام	ابن امیر حاج ابن الموقت الحنفی
120	التقیید والایضاح شرح مقدمۃ ابن صلاح	زین الدین العراقی
121	التکمیل فی الجرح والتعدیل ومعرفۃ الثقات والضعفاء والمجاہیل	ابن کثیر دمشقی
122	التلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر	ابن حجر العسقلانی
123	التمہید لمافی المؤطا من المعانی والاسانید	ابن عبد البر القرطبی
124	التنبیہ والاشراف	ابو الحسن علی المسعودی
125	التنبیہ والرد علی اہل الاہواء والبدع	ابو الحسین الملطی العسقلانی
126	تاج العروس من جواہر القاموس	مرتضیٰ الزبیدی
127	تاریخ اسلام	شاہ معین الدین ندوی
128	تاریخ دمشق (۷۴ متن، ۶ فہارس)	حافظ ابن عساکر
129	تاریخ سندھ	عبد الحلیم شرر
130	تاریخ سندھ (تحقیق: ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتا)	میر معصوم شاہ بھکری
131	تاریخ ابن خلدون ومقدمہ	عبد الرحمن ابن خلدون
132	تاریخ ابن معین (روایۃ الدوری)	یحیٰی بن معین
133	تاریخ ابن یونس المصری	ابو سعید ابن یونس المصری
134	تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی	ابو زرعۃ الدمشقی
135	تاریخ اسلام	اکبر شاہ نجیب آبادی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۴۷۱ھ	1	عالم الکتب، لبنان	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
معاصر	30	تیونس	۱۹۹۷ء
معاصر	1	مکتبہ شاملہ	مذکور نہیں
۵۶۲ھ	30	دار صادر، بیروت	۱۴۱۷ھ
۶۵۶ھ	4	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ
۱۳۷۴ھ	2	دار الکتاب العربی، بیروت	مذکور نہیں
۴۷۴ھ	3	دار اللواء، الریاض	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
	1	دار الفکر	۱۴۲۲ھ
۶۷۶ھ	1	دار الکتاب العربی، بیروت	۱۴۰۵ھ۔۱۹۸۵ء
۸۷۹ھ	3	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۸۰۶ھ	1	مکتبۃ السلفیۃ، المدینۃ المنورۃ	۱۳۸۹ھ۔۱۹۶۹ء
۷۷۴ھ	4	مرکز النعمان، یمن	۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء
۸۵۲ھ	4	دار الکتب العلمیۃ، بیروت	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۹ء
۴۶۳ھ	24	وزارۃ عموم الاوقاف والشؤون الاسلامیۃ، المغرب	۱۳۸۷ھ
۳۴۶ھ	1	دار الصادی، قاہرہ	
۳۷۷ھ	1	المکتبۃ الازہریۃ، مصر	مذکور نہیں
۱۲۰۵ھ	40	دار الہدایۃ	مذکور نہیں
۱۹۷۴ء	2	دار الاشاعت	مذکور نہیں
۵۷۱ھ	80	دار الفکر	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۵ء
۱۹۲۶ء	1	دل گداز پریس، لکھنؤ	۱۹۱۷ء
۱۰۴۴ھ	1	مرکز تحقیقات، اصفہان	مذکور نہیں
۸۰۸ھ	8	دار الفکر بیروت	۱۴۰۸ھ۔۱۹۸۸ء
۲۳۳ھ	4	مرکز البحث العلمی، مکۃ المکرمۃ	۱۳۹۹ھ۔۱۹۷۹ء
۳۴۷ھ	2	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۱ھ
۲۸۱ھ	1	مجمع اللغۃ العربیۃ، دمشق	مذکور نہیں
بیسویں صدی عیسوی	3	نفیس اکیڈمی، کراچی	۱۹۷۷ء

مؤلف	نام کتاب	نمبر شمار
شمس الدین الذہبی	تاریخ الاسلام ووفیات المشاہیر والاعلام (تحقیق بشار) اکثر مقامات پر تاریخ الاسلام تدمری نسخہ استعمال کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر بشار نسخہ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ''ت تدمری'' اول الذکر کی اور ''ت بشار'' ثانی الذکر کی علامات ہیں۔	136
شمس الدین الذہبی	تاریخ الاسلام ووفیات المشاہیر والاعلام (تحقیق تدمری)	137
جلال الدین سیوطی	تاریخ الخلفاء	138
حسین بن محمد الدیار بکری	تاریخ الخمیس فی احوال انفس النفیس	139
ابن جریر الطبری	تاریخ الطبری (تاریخ الرسل والملوک)	140
دکتور خلیل ابراہیم السامرائی	تاریخ العرب وحضارتہم فی الاندلس	141
محمد ابراہیم الفیومی	تاریخ الفکر الدینی الجاہلی	142
عمر بن شبّۃ	تاریخ المدینۃ	143
مولانا ریاست علی ندوی	تاریخ اندلس	144
پروفیسر ایم اے جمیل	تاریخ برصغیر	145
خطیب ابوبکر البغدادی	تاریخ بغداد، وذیولہ	146
سید ابوالحسن علی ندوی	تاریخ دعوت وعزیمت	147
ابن القلانسی، حمزۃ بن اسد	تاریخ دمشق	148
محمد لطفی جمعہ	تاریخ فلاسفۃ الاسلام	149
ابن ضیاء المکی الحنفی	تاریخ مکۃ المشرفۃ والمسجد الحرام والمدینۃ الشریفۃ والقبر الشریف	150
ڈاکٹر مقصود چودھری	تاریخ ہند	151
احمد بن اسحاق یعقوبی	تاریخ یعقوبی	152
مولانا رشید احمد گنگوہی	تالیفاتِ رشیدیہ	153
جلال الدین السیوطی	تبییض الصحیفۃ بمناقب ابی حنیفۃ	154
ابن فندمہ	تتمۃ صوان الحکمۃ	155
ابن مسکویہ	تجارب الامم وتعاقب الہمم	156
عبداللہ بن یوسف الجدیع	تحریر علوم الحدیث	157
ابوبکر علاؤ الدین السمرقندی	تحفۃ الفقہاء	158
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ترجمہ مولانا خلیل الرحمن نعمانی المظاہری	تحفہ اثنا عشریۃ (اردو)	159

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۷۴۸ھ	15	دارالغرب الاسلامی	۲۰۰۳ء
۷۴۸ھ	52	دارالکتاب العربی، بیروت	۱۴۱۳ھ۔ ۱۹۹۳ء
۹۱۱ھ	1	مکتبہ نزار	۱۴۲۵ھ۔ ۲۰۰۴ء
۹۶۶ھ	2	دار صادر	مذکور نہیں
۳۱۰ھ	11	دارالمعارف مصر، دارالتراث بیروت	۱۳۸۷ھ
معاصر	1	دارالکتاب الجدیدة، بیروت	۲۰۰۰ء
۱۴۲۷ھ	1	دارالفکر العربی	۱۴۱۵ھ۔ ۱۹۹۴ء
۲۶۲ھ	4	سید حبیب جدة	۱۳۹۹ھ
بیسوی صدی عیسوی	1	مکی دارالکتب، لاہور	۲۰۰۳ء
۱۹۷۷ء	1	جمیل پبلیکیشنز، کراچی	۱۹۸۶ء
۴۶۳ھ	24	دارالکتب العلمیة	۱۴۱۷ھ
۱۴۱۹ھ	8	مجلس نشریات اسلام، کراچی	مذکور نہیں
۵۵۵ھ	1	داراحسان، دمشق	۱۴۰۳ھ۔ ۱۹۸۳ء
بیسوی صدی عیسوی	1	موسسة ہنداوی، مصر	۲۰۱۲ء
۸۵۴ھ	1	دارالکتب العلمیة	۱۴۲۴ھ۔ ۲۰۰۴ء
۱۹۸۶ء	1	مقصود اینڈ سنز، کراچی	۱۹۸۵
۳۹۲ھ	1	مکتبہ شاملہ	
۱۳۲۳ھ	1	ادارہ اسلامیات، لاہور	۱۴۱۲ھ۔ ۱۹۹۲ء
۹۱۱ھ	1	دارالکتب العلمیة	۱۴۱۰ھ۔ ۱۹۹۰ء
۵۶۵ھ	1	مکتبہ شاملہ	
۴۲۱ھ	7	سروش، تہران	۲۰۰۰ء
	2	موسسة الریان، بیروت	۱۴۲۴ھ۔ ۲۰۰۳ء
۵۴۰ھ	3	دارالکتب العلمیة	۱۴۱۴ھ۔ ۱۹۹۴ء
	1	عالمی مجلس تحفظ اسلام، پاکستان	مذکور نہیں

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
160	تحقیق منیف الرتبة لمن ثبت له شریف الصحبة	صلاح الدین علائی الدمشقی
161	تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی	جلال الدین سیوطی
162	تذکرۃ الحفاظ (طبقات الحفاظ)	حافظ ذہبی
163	ترتیب المدارک وتقریب المسالک	قاضی عیاض بن موسیٰ المالکی
164	ترجمان القرآن	مولانا ابوالکلام آزاد
165	تطہیر الاعتقاد	محمد بن اسماعیل الصنعانی امیر یمانی محمد بن علی الشوکانی
166	تعجیل المنفعة بزوائد رجال الائمة الاربعة	ابن حجر العسقلانی
167	تعظیم قدر الصلوٰۃ	محمد بن نصر المروزی
168	تفسیر ابن ابی حاتم	ابن ابی حاتم الرازی
169	تفسیر ابن کثیر	حافظ ابن کثیر دمشقی
170	تفسیر الآلوسی (تفسیر روح المعانی)	شہاب الدین محمود آلوسی
171	تفسیر الرازی (مفاتیح الغیب)	امام فخر الدین الرازی
172	تفسیر الطبری (جامع البیان)	ابن جریر الطبری
173	تفسیر القرطبی (الجامع لاحکام القرآن)	شمس الدین الانصاری القرطبی
174	تفسیر ثعلبی	ابواسحق الثعلبی
175	تفسیر عبدالرزاق	عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی
176	تفہیم البخاری	مولانا ظہور الباری الاعظمی
177	تقریب التہذیب	ابن حجر عسقلانی
178	تقریر بخاری شریف	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی
179	تقویم عہد نبوی	علی محمد خان
180	تقویم تاریخی	مولانا عبدالقدوس ہاشمی
181	تکملہ فتح الملہم	مفتی محمد تقی عثمانی
182	تلخیص المتشابہ فی الرسم	خطیب ابوبکر البغدادی
183	تلخیص کتاب الاستغاثة (الاستغاثة، الرد علی البکری لابن تیمیہ)	حافظ ابن کثیر الدمشقی
184	تلقیح فہوم الاثر فی عیون التاریخ والسیر	عبدالرحمن ابن الجوزی
185	تمہید الاوائل وتلخیص الدلائل	ابوبکر باقلانی
186	تہذیب الآثار	ابن جریر الطبری
187	تہذیب الاسماء واللغات	محی الدین شرف النووی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۷۶۱ھ		دار العاصمة، الرياض	۱۴۱۰ھ
۹۱۱ھ	2	دار طيبة	مذکور نہیں
۷۴۸ھ	4	دار الكتب العلمية	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء
۵۴۴ھ	8	مطبعة فضالة، المغرب	۱۹۸۳ء
	3	اسلامی اکادمی، لاہور	مذکور نہیں
۱۱۸۲ھ۔۱۲۵۰ھ	1	مطبعة سفير الرياض	۱۴۲۴ھ
۸۵۲ھ	2	دار البشائر، بیروت	۱۹۹۶ء
۲۹۴ھ	2	مكتبة الدار، المدينة المنورة	۱۴۰۶ھ
۳۲۷ھ	3	مكتبة نزار، سعودی عرب	۱۴۱۹ھ
۷۷۴ھ	9	دار الكتب العلمية	۱۴۱۹ھ
۱۲۷۰ھ	16	دار الكتب العلمية	مذکور نہیں
۶۰۶ھ	32	دار احياء التراث العربي، بیروت	۱۴۲۰ھ
۳۱۰ھ	24	دار ہجر	۱۴۲۲ھ
۶۷۱ھ	10	دار الكتب المصرية، قاہرہ	۱۳۸۴ھ۔۱۹۶۴ء
۴۲۷ھ	10	دار احياء التراث العربي	۱۴۲۲ھ۔۲۰۰۲ء
۲۱۱ھ	3	دار الكتب العلمية	۱۴۱۹ھ
معاصر	۳	دار الاشاعت، کراچی	مذکور نہیں
۸۵۲ھ	1	دار الرشيد، سوريا	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
۱۴۰۲ھ	4	مكتبة الشيخ، کراچی	مذکور نہیں
۱۹۹۷ء	1	ڈاکٹر نور محمد یوسف زئی، کراچی	۲۰۰۷ء
	1	ادارۃ تحقیقات اسلامیہ، اسلام آباد	۱۹۸۷ء
معاصر	2	مکتبہ دار العلوم کراچی	
۴۶۳ھ	1	طلاس للدراسات والنشر، دمشق	۱۹۸۵ء
۷۷۴ھ	1	مكتبة الغرباء الاثرية، المدينة المنورة	۱۴۱۷ھ
۵۹۷ھ	1	شركة دار الارقم، بیروت	۱۹۹۷ء
۴۰۳ھ	1	مؤسسة الكتب الثقافية، لبنان	۱۴۰۷ھ۔۱۹۸۷ء
۳۱۰ھ	3	مطبع المدنی، قاہرہ	مذکور نہیں
۶۷۶ھ	4	دار الكتب العلمية	مذکور نہیں

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
188	تہذیب التہذیب	ابن حجر عسقلانی
189	تہذیب الکمال	ابوالحجاج المزی
190	تہذیب اللغۃ	ابومنصور الازہری الہروی
191	توضیح الافکار لمعانی تنقیح الانظار	امیر عزالدین صنعانی
192	توضیح المشتبہ فی ضبط اسماء الرواۃ وانسابہم والقابہم وکناہم	ابوبکر ابن ناصر الدین
	حرف ث	
193	الثقات (معرفۃ الثقات من رجال اہل العلم والحدیث)	ابوالحسن احمد بن صالح العجلی الکوفی
194	الثقات لابن حبان	ابن حبان البستی
195	الثقات ممن لم یقع فی الکتب الستۃ	القاسم بن قطلو بغا
196	ثمار القلوب فی المضاف والمنسوب	ابومنصور الثعالبی
	حرف ج	
197	الجامع لابن وہب	عبداللہ ابن وہب
198	الجرح والتعدیل	ابن ابی حاتم الرازی
199	الجہاد	ابوبکر ابن ابی عاصم الشیبانی
200	الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
201	الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ	عبدالقادر محی الدین الحنفی
202	الجوہرۃ النیرۃ علی مختصر القدوری	ابوبکر بن علی الحدادی الزبیدی
203	الجوہرۃ فی نسب النبی واصحابہ العشرۃ	محمد بن ابی بکر البری التلمسانی
204	جامع الاحادیث	جلال الدین سیوطی
205	جامع الاصول فی احادیث الرسول	مجد الدین ابن اثیر الجزری
206	جامع المسانید والسنن	حافظ ابن کثیر
207	جامع المسائل	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
208	جامع بیان العلم وفضلہ	ابن عبدالبر
209	جذوۃ المقتبس فی ذکر ولاۃ الاندلس	ابوعبداللہ المیورقی
210	جمع القرآن حفظا وکتابۃ	دکتور علی بن سلیمان العبید
211	جمہرۃ انساب العرب	ابن حزم الظاہری
212	جوامع السیرۃ النبویۃ	ابن حزم ظاہری

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۸۵۲ھ	12	مطبعہ نظامیہ، حیدر آباد دکن	۱۳۲۶ھ
۷۴۲ھ	35	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۰ھ۔۱۹۸۰ء
۳۷۰ھ	8	دار احیاء التراث العربی	۲۰۰۱ء
۱۱۸۲ھ	۲	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۸۴۲ھ	10	مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۹۹۳ء
		حرف ث	
۲۶۱ھ	2	مکتبۃ الدار، المدینۃ المنورۃ	۱۴۰۵ھ۔۱۹۸۵ء
۳۵۴ھ	9	مطبعہ نظامیہ، دکن	۱۳۹۳ھ۔۱۹۷۳ء
۸۷۹ھ	8	مرکز النعمان، یمن	۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء
۴۲۹ھ	1	دار المعارف، قاہرہ	مذکور نہیں
		حرف ج	
۱۹۷ھ	1	دار الوفاء	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۵ء
۳۲۷ھ	9	دار احیاء التراث العربی	۱۹۵۲ء
۲۸۷ھ	2	مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ	۱۴۰۹ھ
۷۲۸ھ	6	دار العاصمۃ، ریاض	۱۴۱۴ھ
۷۷۵ھ	2	میر محمد کتب خانہ، کراچی	مذکور نہیں
۸۰۰ھ	2	المطبعۃ الخیریۃ	۱۳۰۰ھ
۶۴۵ھ		دار الرفاعی، ریاض	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۹۱۱ھ	13	دکتور حسن عباس ذکی	مکتبہ شاملہ
۶۰۶ھ	12	مکتبۃ دار البیان	۱۳۹۲ھ۔۱۹۷۲ء
۷۷۴ھ	10	دار خضر، بیروت	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء
۷۲۸ھ	6	دار عالم الفوائد	۱۴۲۲ھ
۴۶۳ھ	2	دار ابن الجوزی، السعودیۃ	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۴ء
۴۸۸ھ	1	الدار المصریۃ، قاہرہ	۱۹۹۶ء
	1	مجمع الملک فہد، المدینۃ المنورۃ	مذکور نہیں
۴۵۶ھ	1	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۴۵۶ھ	1	دار الکتب العلمیۃ	مذکور نہیں

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	﴿حرف ح﴾	
213	الحاوی الکبیر شرح مختصر المزنی	امام علی بن محمد الماوردی
214	الحجۃ علیٰ اہل المدینۃ	محمد بن الحسن الشیبانی
215	الحسنۃ والسیئۃ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
216	الحیوان (کتاب الحیوان)	عمرو بن بحر، ابوعثمان الجاحظ
217	حسن المحاضرۃ	جلال الدین سیوطی
218	حقیقۃ السنۃ والبدعۃ	جلال الدین السیوطی
219	حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء	ابونعیم اصبہانی
220	حیاۃ الصحابۃ (عربی)	مولانا محمد یوسف کاندھلوی
	﴿حرف خ﴾	
221	الخراج (کتاب الخراج)	قاضی ابویوسف
	﴿حرف د﴾	
222	دراسات تاریخیۃ	اکرم ضیاء عمری
223	دلائل النبوۃ	ابوبکر البیہقی
224	الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ	ابن حجر عسقلانی
225	دیوان الحماسۃ	ابوتمام
226	دول الاسلام	شمس الدین الذہبی
227	دولۃ الاسلام فی الاندلس	محمد عبداللہ عنان المصری
228	الدیباج المذہب فی معرفۃ اعیان علماء المذہب	ابن فرحون الیعمری
229	الدراری فی الذراری (تذکرۃ الآباء وتسلیۃ الابناء)	ابن عدیم الحلبی
230	الدیباج المذہب فی معرفۃ اعیان علماء المذہب	ابن فرحون الیعمری
231	الدولۃ الفاطمیۃ	محمد علی محمد الصلابی
	﴿حرف ذ﴾	
232	الذریۃ الطاہرۃ	ابوبشر الانصاری الدولابی
	﴿حرف ر﴾	
233	الرحلۃ فی طلب الحدیث	ابوبکر خطیب بغدادی
234	الرحیق المختوم	مولانا صفی الرحمن مبارک پوری
235	الرد علی من قال بفناء الجنۃ والنار	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
		حرف ح	
۴۵۰ھ	19	دارالکتب العلمیة	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۹ء
۱۸۹ھ	4	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۳ھ
۷۲۸ھ	1	دارالکتب العلمیة	مذکورنہیں
۲۵۵ھ	1	دارالکتب العلمیة، بیروت	۱۴۲۴ھ
۹۱۱ھ	2	داراحیاء الکتب العربیة	۱۳۸۷ھ۔۱۹۶۷ء
۹۱۱ھ	1	مطابع الرشید	۱۴۰۹ھ
۴۳۰ھ	12	السعادة	۱۳۹۴ھ۔۱۹۷۴ء
۱۳۸۴ھ	5	مؤسسة الرسالة	۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء
		حرف خ	
۱۸۲ھ	1	المکتبة الازہریة، مصر	
		حرف د	
معاصر	1	المجلس العلمی، المدینة المنورة	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۴۵۸ھ	7	دارالکتب العلمیة	۱۴۰۵ھ
۸۵۲ھ	2	دارالمعرفة، بیروت	مذکورنہیں
۲۲۱ھ	1	مکتبة البشریٰ	۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء
۷۴۸ھ	2	دارصادر، بیروت	۱۹۹۹ء
۱۴۰۶ھ	5	مکتبة الخانجی، قاہرہ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۷۹۹ھ	2	دارالتراث، قاہرہ	مذکورنہیں
۲۶۰ھ	1	دارالہدایة	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۷۹۹ھ	1	دارالکتب العلمیة، بیروت	مذکورنہیں
معاصر	1	مؤسس اقرأ، قاہرہ	۱۴۲۷ھ۔۲۰۰۶ء
		حرف ذ	
۳۱۰ھ	1	الدار السلفیة، کویت	۱۴۰۷ھ
		حرف ر	
۴۶۳ھ	1	دارالکتب العلمیة	۱۳۹۵ھ
۲۰۰۶ء	1	المکتبة السلفیة، لاہور	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء
۷۲۸ھ	1	داربلنسیة، الریاض	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۶ء

[illegible]	[illegible]	[illegible]
236	الرسائل	عمرو بن بحر، ابوعثمان الجاحظ
237	الرفع والتکمیل	مولانا عبدالحی لکھنوی
238	الروض الانف (تحقیق: عمر عبدالسلام سلامی)	ابوالقاسم السہیلی
239	الروض الباسم فی تراجم شیوخ الحاکم	نایف بن صلاح المنصوری
240	الروض المعطار فی خبر الاقطار	ابوعبداللہ محمد الحمیری
241	الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ	محب الدین الطبری
242	رأس الحسین	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
243	رجال الکشی (اختیار معرفۃ الرجال) جدید نسخہ	مؤلف: محمد بن عمر بن عبدالعزیز الکشی (م ۳۵۰ھ) ترتیب وتہذیب: ابوجعفر محمد بن الحسن الطوسی (م ۴۶۰ھ)
244	رجال الکشی (اختیار معرفۃ الرجال) قدیم نسخہ	مؤلف: محمد بن عمر بن عبدالعزیز الکشی (م ۳۵۰ھ) ترتیب وتہذیب: ابوجعفر محمد بن الحسن الطوسی (م ۴۶۰ھ)
245	رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم	قاضی سلمان منصور پوری
246	رد المحتار علی الدر المختار	محمد امین ابن عابدین الدمشقی
247	رسالۃ ابی داؤد الی اہل مکۃ	امام ابوداؤد سجستانی
248	رسالۃ طرق حدیث من کنت مولاہ	حافظ ذہبی
249	رفع الاستار	عزالدین محمد بن اسماعیل الصنعانی امیر یمانی
250	روضۃ الاخیار المنتخب من ربیع الابرار	محی الدین الخطیب ابوالقاسم
251	ریاض النفوس	ابوبکر عبداللہ المالکی
	حرف ز	
252	الزہد (کتاب الزہد)	احمد بن حنبل
253	الزہد الکبیر	ابوبکر بیہقی
254	الزہد والرقائق (کتاب الزہد)	عبداللہ بن مبارک
255	زاد المعاد فی ہدی خیر العباد	ابن قیم الجوزیہ
256	زہر الاکم فی الامثال والحکم	نورالدین الیوسی
	حرف س	
257	السنۃ	عبداللہ بن احمد بن حنبل

www.KitaboSunnat.com

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۲۵۵ھ	4	مکتبۃ خانجی، قاہرہ	۱۳۸۴ھ۔۱۹۶۴ء
۱۳۰۴ھ	1	مکتب المطبوعات الاسلامیہ، حلب	۱۴۰۷ھ
۵۸۱ھ	7	داراحیاء التراث العربی، بیروت	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء
معاصر	2	دارالعاصمہ للنشر، الریاض	۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء
۹۰۰ھ	1	مؤسسۃ ناصر للثقافۃ، بیروت	۱۹۸۰ء
۶۹۴ھ	4	دارالکتب العلمیۃ	مذکورنہیں
۷۲۸ھ	1		
	1	مؤسسۃ النشر الاسلامی۔قم، ایران	۱۴۲۷ھ
	1	دانش گاہ، مشہد	
۱۹۳۰ء	2	مرکز الحرمین الاسلامی، فیصل آباد	۲۰۰۷ء
۱۲۵۲ھ	6	دارالفکر، بیروت	۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء
۲۷۵ھ	1	دارالعربیۃ، بیروت	مذکورنہیں
۷۴۸ھ	1	مکتبہ شاملہ	
۱۱۸۲ھ	1	المکتب الاسلامی، بیروت	۱۴۰۵ھ
۹۴۰ھ	1	دارالقلم العربی، حلب	۱۴۲۳ھ
بعد ۴۶۰ھ	2	دارالغرب الاسلامی	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۲ء
		حرف ز	
۲۴۱ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء
۴۵۸ھ	1	مؤسسۃ الکتب الثقافیہ، بیروت	۱۹۹۶ء
۱۸۱ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	مذکورنہیں
۷۵۱ھ	5	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۱۵ھ ۱۹۹۴ء
۱۱۰۲ھ	3	الشرکۃ الجدیدۃ۔المغرب	۱۴۰۱ھ ۱۹۸۱ء
		حرف س	
۲۹۰ھ	2	دارابن القیم، دمام	۱۴۰۶ھ

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
258	السنن الکبریٰ للنسائی	احمد بن شعیب النسائی
259	السنن الصغیر	ابوبکر البیہقی
260	السنن الکبریٰ للبیہقی	ابوبکر البیہقی
261	السیرۃ الحلبیۃ	برہان الدین حلبی
262	السیرۃ النبویۃ	ابوالحسن علی الندوی
263	السیرۃ النبویۃ	ابن حبان البستی
264	السیرۃ النبویۃ	محمد علی محمد الصلابی
265	السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ محاولۃ لتطبیق قواعد المحدثین فی نقد روایات السیرۃ النبویۃ	دکتور اکرم ضیاء العمری
266	السیرۃ النبویۃ من البدایۃ والنہایۃ	حافظ ابن کثیر
267	السیرۃ والدعوۃ فی العہد المدنی	احمد غلوش
268	السیف المسلول علی من سب الرسول	تقی الدین بن عبدالکافی السبکی
269	سبل الہدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد	محمد بن یوسف الصالحی الشامی
270	سمط نجوم العوالی فی انباء الاوائل والتوالی	عبدالملک العصامی المکی
271	سنن ابن ماجہ	محمد ابن یزید، ابن ماجۃ قزوینی
272	سنن ابی داؤد	ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی
273	سنن الترمذی	محمد بن عیسیٰ الترمذی
274	سنن الدارقطنی	ابوالحسن الدارقطنی
275	سنن الدارمی	عبداللہ بن عبدالرحمن الدارمی
276	سنن سعید بن منصور	سعید بن منصور شعبۃ الخراسانی
277	سنن نسائی (المجتبیٰ)	احمد بن شعیب النسائی
278	سوالات الآجری لابی داؤد	ابوداؤد السجستانی
279	سیر اعلام النبلاء	شمس الدین الذہبی
280	سیرت ابن اسحٰق	محمد بن اسحٰق بن یسار المدنی
281	سیرت ابن ہشام	عبدالملک بن ہشام
282	سیرت النبی	علامہ شبلی نعمانی
283	سیرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم	مفتی محمد شفیع
284	سیرت خلفائے راشدین	مولانا عبدالشکور لکھنوی فاروقی
285	سیرت عمر بن عبدالعزیز	عبداللہ بن عبدالحکم المصری

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۳۰۳ھ	12	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۱ء
۴۵۸ھ	4	جامعۃ الدراسات الاسلامیہ، کراچی	۱۴۱۰ھ۔۱۹۸۹ء
۴۵۸ھ	10	دارالکتب العلمیہ	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
۱۰۴۴ھ	3	دارالکتب العلمیہ	۱۴۲۷ھ
۱۹۹۹ء	1	دوحہ، قطر	۱۴۰۰ھ
۳۵۴ھ	2	الکتب الثقافیہ، بیروت	۱۴۱۷ھ
معاصر	1	دارالمعرفۃ، بیروت	۱۴۲۹ھ۔۲۰۰۸ء
معاصر	2	مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۷۷۴ھ	4	دارالمعرفۃ، بیروت	۱۳۹۵ھ۔۱۹۷۶ء
معاصر	1	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۴ء
۷۵۶ھ	1	دارالفتح، عمان، اردن	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء
۹۴۲ھ	12	دارالکتب العلمیہ	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۳ء
۱۱۱۱ھ	4	دارالکتب العلمیہ، بیروت	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء
۲۷۳ھ	2	داراحیاء الکتب العربیہ	مذکور نہیں
۲۷۵ھ	4	المکتبۃ العصریہ، صیدا، بیروت	مذکور نہیں
۲۷۹ھ	5	مصطفی البابی الحلبی، قاہرہ	۱۹۷۵ء
۳۸۵ھ	5	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۴ء
۲۵۵ھ	4	دارالمغنی، السعودیۃ	۱۴۱۲ھ
۲۲۷ھ	2	دارالسلفیہ، ہند	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۲ء
۳۰۳ھ	8	مکتب المطبوعات الاسلامیہ، حلب	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
	1	الجامعۃ الاسلامیہ، المدینۃ المنورۃ	۱۳۹۹ھ۔۱۹۷۹ء
۷۴۸ھ	25	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۵ھ۔۱۹۸۵ء
۱۵۱ھ	1	دارالفکر، بیروت	۱۳۹۸ھ۔۱۹۷۸ء
۲۱۳ھ	2	مطبع مصطفی البابی الحلبی، قاہرہ	۱۳۷۵ھ۔۱۹۵۵ء
۱۹۱۴ء	7	دینی کتب خانہ، لاہور	۱۹۷۵ء
۱۳۹۶ھ۔۱۹۷۶ء	1	دارالاشاعت، کراچی	مذکور نہیں
۱۹۶۴ء	1	کتب خانہ مجیدیہ، ملتان	مذکور نہیں
۲۱۴ھ	1	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
286	سیرت ومناقب عمر بن عبد العزیز	ابن الجوزی
	حرف ش	
287	شذرات الذہب فی خبر من ذہب	ابن عماد الحنبلی
288	شریعت وطریقت کا تلازم	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی
289	الشذ الفیاح من علوم ابن الصلاح	لابی اسحق الابناسی
290	الشریعۃ	ابوبکر الآجری البغدادی
291	الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ	القاضی عیاض بن موسیٰ یحصبی
292	الشماریخ فی علم التاریخ	جلال الدین سیوطی
293	الشمائل المحمدیہ (شمائل الترمذی)	محمد بن عیسیٰ الترمذی
294	الشیعۃ والتشیع	احسان الٰہی ظہیر
295	شرح عقائد نسفی	سعد الدین تفتازانی
296	شرح الاربعین النوویۃ	محمد بن صالح العثیمین
297	شرح التبصرۃ والتذکرۃ، الفیۃ العراقی	الحافظ زین الدین العراقی
298	شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیۃ	ابوعبداللہ الزرقانی المالکی
299	شرح السنۃ	ابومحمد ابن الفراء البغوی
300	شرح السنۃ	اسماعیل بن یحییٰ المزنی
301	شرح صحیح مسلم (المنہاج)	امام شرف النووی
302	شرح عقود رسم المفتی	علامہ ابن عابدین شامی
303	شرح مشکل الآثار	ابوجعفر الطحاوی
304	شرح معانی الآثار	ابوجعفر الطحاوی
305	شرح نخبۃ الفکر	ملاعلی قاری
306	شرف المصطفیٰ	ابوسعد الخرکوشی
307	شعب الایمان	ابوبکر بیہقی
308	شہادت امام حسین وکردار یزید (اردو ترجمہ از مولانا انوار الحسن شیرکوٹی)	مولانا محمد قاسم نانوتوی
	حرف ص	
309	الصحاح تاج اللغۃ	ابونصر الجوہری الفارابی
310	الصواعق المحرقۃ علی اہل الرفض والضلال والزندقۃ	ابن حجر ہیثمی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۵۹۷ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۲۲ھ۔۲۰۰۱ء
		حرف ش	
۱۰۸۹ء	11	دارابن کثیر، دمشق	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
۱۴۰۲ھ۔۱۹۸۲ء	1	مکتبۃ الشیخ، کراچی	۱۹۹۳ء
۸۰۲ھ	2	مکتبۃ الرشد	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۸ء
۳۶۰ھ	5	دارالوطن سعودیہ	۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء
۵۴۴ھ	2	دارالفکر	۱۴۰۹ء۔۱۹۸۸ء
۹۱۱ھ	1	مکتبۃ الآداب	مذکورنہیں
۲۷۹ھ	1	داراحیاء التراث العربی	مذکورنہیں
۱۴۰۷ھ	1	ادارہ ترجمان السنۃ، لاہور	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۵ء
۷۹۲ھ	1	مکتبۃ البشریٰ، کراچی	۱۴۳۰ھ
۱۴۲۱ھ	1	دارالثریا للنشر	۱۳۹۶ھ۔۱۹۷۶ء
۸۰۶ھ	2	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۲۳ھ۔۲۰۰۲ء
۱۱۲۲ھ	12	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۶ء
۵۱۶ھ	13	المکتب الاسلامی، دمشق	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۲۶۴ھ	1	مکتبۃ الغرباء الاثریۃ، السعودیۃ	۱۴۱۵ھ۱۹۹۵ء
۶۷۶ھ	6	داراحیاء التراث العربی، بیروت	۱۳۹۲ھ
۱۲۵۷ھ	1	مکتبۃ البشریٰ	۱۴۳۰ھ
۳۲۱ھ	16	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۳۲۱ھ	5	عالم الکتب	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۴ء
۱۰۱۴ھ	1	دارالارقم، بیروت	مذکورنہیں
۴۰۷ھ	2	دارالبشائر الاسلامیہ، مکہ	۱۴۲۴ھ
۴۵۸ھ	14	مکتبۃ الرشد	۱۴۲۳ھ۔۲۰۰۳ء
۱۴۹۷ھ	1	تحریک خدام اہلِ سنت والجماعت، لاہور	مذکورنہیں
		حرف ص	
۳۹۳ھ	6	دارالعلم، بیروت	۱۴۰۷ھ۱۹۸۷ء
۷۶۴ھ	2	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۹۷ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
311	صب العذاب علیٰ من سب الاصحاب	علامہ محمود آلوسی
312	صحیح البخاری	محمد بن اسماعیل البخاری
313	صحیح مسلم	مسلم بن الحجاج القشیری
314	صفۃ الصفوۃ	عبدالرحمن ابن جوزی
315	صفۃ النفاق وذم المنافقین	ابوجعفر ابوبکر الفریابی
316	صفۃ جزیرۃ الاندلس	ابوعبداللہ الحمیری
	حرف ض	
317	الضعفاء الکبیر	ابوجعفر العقیلی المکی
318	الضعفاء والمتروکون	احمد بن شعیب النسائی
319	الضعفاء والمتروکون	عبدالرحمن ابن الجوزی
	حرف ط	
320	الطبقات السنیۃ فی تراجم الحنفیۃ	تقی الدین تمیمی
321	طبقات المحدثین باصبہان والواردین علیہا	ابی الشیخ الاصبہانی
322	طبقات ابن سعد (الطبقات الکبریٰ) جزء متمم الصحابۃ الطبقۃ الخامسۃ	محمد بن سعد
323	طبقات ابن سعد (الطبقات الکبریٰ) جزء متمم الصحابۃ الطبقۃ الرابعۃ	محمد بن سعد
324	طبقات ابن سعد (الطبقات الکبریٰ) نوٹ: اکثر مقامات پر طبقات ابن سعد دار صادر کا نسخہ استعمال کیا گیا ہے۔	محمد بن سعد
325	طبقات ابن سعد (الطبقات الکبریٰ)	محمد بن سعد
326	طبقات الاطباء	ابن ابی اُصَیبِعَہ
327	طبقات الامم	قاضی ابن ساعد الاندلسی
328	طبقات الاولیاء	ابن ملقن المصری
329	طبقات الحنابلۃ	ابوالحسین ابن ابی یعلیٰ
330	طبقات الصوفیۃ	عبدالرحمن السلمی نیشاپوری
331	طبقات الفقہاء	ابواسحٰق شیرازی
332	طبقات الفقہاء الشافعیۃ	ابن الصلاح
333	طبقات المدلسین (تعریف اہل التقدیس بمراتب الموصوفین بالتدلیس)	ابن حجر عسقلانی
334	طبقات المفسرین	جلال الدین سیوطی
335	طبقات المفسرین	احمد بن محمد الادنہوی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۱۳۴۲ھ	1	اضواء السلف، ریاض	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۲۵۶ھ	9	دار طوق النجاۃ	۱۴۲۲ھ
۲۶۱ھ	5	دار الجیل	۱۳۷۴ھ۔۱۹۵۴ء
۵۹۷ھ	2	دار الحدیث قاہرۃ، مصر	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء
۳۰۱ھ	1	دار الصحابۃ للتراث، مصر	۱۴۰۸ھ ۱۹۸۸ء
۹۰۰ھ	1	دار الجیل، بیروت	۱۴۰۸ھ۔۱۹۸۸ء
		﴿حرف ض﴾	
۳۲۲ھ	4	دار المکتبۃ العلمیۃ بیروت	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۳۰۳ھ	1	دار الوعی، حلب	۱۳۹۶ھ
۵۹۷ھ	3	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۰۶ھ
		﴿حرف ط﴾	
۱۰۱۰ھ	1	مکتبہ شاملہ	
۳۶۹ھ	4	موسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء
۲۳۰ھ	2	مکتبۃ الصدیق، طائف	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۳ء
۲۳۰ھ	1	مکتبۃ الصدیق، طائف	۱۴۱۶ھ
۲۳۰ھ	8	دار صادر	۱۹۶۸ء
۲۳۰ھ	8	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۲۶۸ھ	1	مکتبہ شاملہ	
۴۶۲ھ	1	بیروت	۱۹۱۲ء
۸۰۴ھ	1	مکتبۃ الخانجی، قاہرہ	۱۴۱۵ھ ۱۹۹۴ء
۵۲۶ھ	2	دار المعرفۃ، بیروت	مذکور نہیں
۴۱۲ھ	1	دار الکتب العلمیہ	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء
۴۷۶ھ	1	دار الرائد العربی، بیروت	۱۹۷۰ء
۶۴۳ھ	2	دار البشائر الاسلامیہ، بیروت	۱۹۹۲ء
۸۵۲ھ	1	مکتبۃ المنار	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۹۱۱ھ	1	مکتبۃ وہبہ قاہرہ	۱۳۹۶ھ
گیارہویں صدی ہجری	1	مکتبۃ العلوم والحکم، سعودیہ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	﴿حرف ع﴾	
336	العاشر من المشیخۃ البغدادیۃ	ابوطاہر السلفی
337	العبر فی خبر من غبر	حافظ شمس الدین الذہبی
338	العرش	حافظ ذہبی
339	العرف الشذی شرح سنن الترمذی	مولانا انور شاہ کشمیری
340	العقائد النسفیۃ	عمر بن محمد ابوحفص النسفی
341	العقد الفرید	ابوعمر ابن عبد ربہ
342	العقیدۃ الطحاویۃ (مع تعلیقات الالبانی)	ابوجعفر الطحاوی
343	العقیدۃ الواسطیۃ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
344	العقیدۃ الواسطیۃ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
345	العلل ومعرفۃ الرجال	احمد بن حنبل
346	العلو للعلی الغفار	حافظ ذہبی
347	العنایۃ شرح الہدایۃ	محمد بن محمد ابن الشیخ البابرتی
348	العواصم من القواصم	ابوبکر ابن العربی
349	العواصم والقواصم	ابن الوزیر القاسمی
350	العیون والحدائق فی اخبار الحقائق (جزء خلافۃ الولید بن عبدالملک) مع تجارب الامم وتعاقب الہمم لابن مسکویہ	نامعلوم
351	عارضۃ الاحوذی بشرح صحیح الترمذی	ابن العربی المالکی
352	عصر الخلافۃ الراشدۃ۔ محاولۃ لنقد الروایۃ التاریخیۃ وفق مناہج المحدثین	اکرم ضیاء عمری
353	عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب	ابن عنبہ جمال الدین الحسینی
354	عمدۃ القاری	بدرالدین عینی الحنفی
355	عمل الیوم واللیلۃ	ابراہیم بن بُرَیح، ابن السُّنی
356	عہد نبوی کے میدان جنگ	ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی
357	عون المعبود شرح سنن ابی داؤد	شرف الحق صدیقی عظیم آبادی
358	عیون الاخبار	ابن قتیبۃ الدینوری
359	عیون الانباء فی طبقات الاطباء	ابن ابی اصیبعۃ
360	عیون الرسائل والاجوبۃ عن المسائل	شیخ عبداللطیف بن عبدالرحمن آل شیخ

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
		﴿حرف ع﴾	
۵۷۶ھ	1	مکتبہ شاملہ	مذکور نہیں
۷۴۸ھ	4	دارالکتب العلمیہ	مذکور نہیں
۷۴۸ھ	1	عمادۃ البحث العلمی، الجامعۃ الاسلامیہ، المدینۃ المنورۃ	۱۴۲۴، ۲۰۰۳ھ
۱۳۵۳ھ	5	دارالتراث العربی	۱۴۲۵ھ ـ ۲۰۰۴ء
۵۳۷ھ	1	ضمیمہ شرح العقائد النسفیہ مطبوعۃ المکتبۃ البشریٰ	۱۴۳۰ھ ـ ۲۰۰۹ء
۳۲۸ھ	8	دارالکتب العلمیہ، بیروت	۱۴۰۴ھ
۳۲۱ھ	1	المکتب الاسلامی، بیروت	۱۴۱۴ھ
۷۲۸ھ	1	اضواء السلف، ریاض	۱۹۹۹ء
۷۲۸ھ	1	اضواء السلف	۱۴۲۰ھ ـ ۱۹۹۹ء
۲۴۱ھ	3	دارالثانی، ریاض	۱۴۲۲ھ
۷۴۸ھ	1	مکتبۃ اضواء السلف، ریاض	۱۴۱۶ھ ـ ۱۹۹۵ء
۷۸۶ھ	10	دارالفکر	مذکور نہیں
۵۴۳ھ	1	دارالجیل، بیروت	۱۴۰۷ھ ـ ۱۹۸۷ء
۸۴۰ھ	9	مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۱۵ھ ـ ۱۹۹۴ء
نامعلوم	1	لیڈن، ہالینڈ	۱۸۷۱ء
۵۴۳ھ	13	دارالکتب العلمیہ	مذکور نہیں
معاصر	1	مکتبۃ العبیکان	۱۴۳۰ھ ـ ۲۰۰۹ء
۸۲۸ھ	2	مطبعہ حیدریہ، نجف	۱۹۶۹ء
۸۵۵ھ	25	داراحیاء التراث العربی	مذکور نہیں
۳۶۴ھ	1	دارالقبلۃ للثقافۃ الاسلامیۃ بیروت	مذکور نہیں
۱۴۲۴ھ ـ ۲۰۰۲ء	1	ادارہ اسلامیات، لاہور	۱۹۸۲ء
۱۳۲۹ھ	14	دارالکتب العلمیہ	۱۴۱۵ھ
۲۷۶ھ	4	دارالکتب العلمیہ	۱۴۱۸ھ
٦٦٨ھ	1	دارمکتبۃ الحیاۃ، بیروت	مذکور نہیں
۱۲۹۳ھ	2	مکتبۃ الرشد، ریاض	مذکور نہیں

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	حرف غ	
361	الغایۃ فی شرح الہدایۃ فی علم الراویۃ	شمس الدین السخاوی
362	غایۃ المقصد فی زوائد المسند	نور الدین ہیثمی
	حرف ف	
363	الفاروق	علامہ شبلی نعمانی
364	الفتاوی الکبریٰ	احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
365	الفتاوی الہندیۃ (فتاوی عالمگیری)	لجنۃ الفقہاء من الہند
366	الفتنۃ ووقعۃ الجمل	سیف بن عمر تمیمی
367	الفخری فی الآداب السلطانیۃ والدول الاسلامیۃ	ابن الطقطقی، محمد بن علی ابن طباطبا
368	الفرق بین الفرق	ابو منصور عبد القاہر الاسفرائینی البغدادی
369	الفروق اللغویۃ	ابو ہلال العسکری
370	الفصل فی الملل والاہواء والنحل	ابن حزم الظاہری
371	الفصول فی الاصول	امام ابوبکر الجصاص الرازی
372	الفصول فی السیرۃ	حافظ ابن کثیر
373	الفقہ الابسط	امام ابوحنیفہ
374	الفقہ الاسلامی وادلتہ	وہبۃ الزحیلی
375	الفقہ الاکبر	امام ابوحنیفہ
376	الفقہ الاکبر	امام ابوحنیفۃ
377	الفقہ المیسر فی ضوء الکتاب والسنۃ	مجموعۃ من المؤلفین
378	الفقہ علی مذاہب الاربعۃ	عبد الرحمن الجزیری
379	الفہرست	ابن ندیم بغدادی
380	فتاوی ابن الصلاح	ابن الصلاح
381	فتاوی رشیدیہ	مولانا رشید احمد گنگوہی
382	فتاوی عثمانی	مفتی محمد تقی عثمانی
383	فتح الباری	حافظ ابن حجر عسقلانی
384	فتح الباری	ابن رجب حنبلی
385	فتح القدیر	کمال الدین ابن الہمام سیواسی
386	فتح القدیر	محمد بن علی الشوکانی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
		{حرف غ}	
۹۰۲ھ	1	مکتبۃ اولاد الشیخ للتراث	۲۰۰۱ء
۸۰۷ھ	4	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۱ھ/۲۰۰۱ء
		{حرف ف}	
۱۹۱۴ء	1	دار الاشاعت	۱۹۹۱ء
۷۲۸ھ	6	دار الکتب العلمیۃ، بیروت	۱۴۰۸ھ-۱۹۸۷ء
نحو ۱۱۰۰ھ	6	دار الفکر	۱۳۱۰ھ
۲۰۰ھ	1	دار النفائس	۱۴۱۳ھ-۱۹۹۳ء
۷۰۹ھ	1	دار القلم العربی، بیروت	۱۴۱۸ھ-۱۹۹۷ء
۴۲۹ھ	1	دار الآفاق الجدیدہ، بیروت	۱۹۷۷ء
۳۹۵ھ	1	دار العلم والثقافۃ، المصر	مذکور نہیں
۴۵۶ھ	5	مکتبۃ الخانجی، قاہرہ	مذکور نہیں
۳۷۰ھ	4	وزارۃ الاوقاف الکویتیۃ	۱۴۱۴ھ-۱۹۹۴ء
۷۷۴ھ	1	موسسۃ علوم القرآن	۱۴۰۳ھ
۱۵۰ھ	1	مکتبۃ الفرقان، الامارات العربیۃ	۱۴۱۹ھ-۱۹۹۹ء
۲۰۱۵ء	10	دار الفکر، دمشق	مذکور نہیں
۱۵۰ھ	1	مکتبۃ الفرقان، الامارات العربیۃ	۱۹۹۹ء
۱۵۰ھ	1	مکتبۃ الفرقان، الامارات العربیۃ	۱۴۱۹ھ-۱۹۹۹ء
معاصرین	1	مجمع الملک فہد	۱۴۲۴ھ
۱۳۶۰ھ	5	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۴ھ-۲۰۰۳ء
۴۳۸ھ	1	دار المعرفۃ، بیروت	۱۴۱۷ھ-۱۹۹۷ء
۶۴۳ھ	1	مکتبۃ العلوم والحکم	۱۴۰۷ھ
۱۳۲۳ھ	1	دار الاشاعت	۲۰۰۳ء
معاصر		مکتبۃ معارف القرآن، کراچی	۱۴۳۱ھ-۲۰۱۰ء
۸۵۲ھ	13	دار المعرفۃ، بیروت	۱۳۷۹ھ
۷۹۵ھ	9	دار الحرمین، قاہرہ	۱۴۱۷ھ-۱۹۹۶ء
۸۶۱ھ	10	دار الفکر	مذکور نہیں
۱۲۵۰ھ	6	دار ابن کثیر	۱۴۱۴ھ

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
387	فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث	شمس الدین السخاوی
388	فتح مصر	جمال عبدالہادی
389	فتح نامہ سندھ (چچ نامہ)	ابوحامد الکوفی
390	فتنۃ مقتل عثمان	محمد بن عبداللہ غبان الصحی
391	فتنۂ استشراق	علامہ شمس الحق افغانی
392	فتوح البلدان	احمد بن یحییٰ البلاذری
393	فتوح الشام الازدی	محمد بن عبداللہ الازدی
394	فتوح الشام للواقدی	محمد بن عمر الواقدی
395	فتوح مصر والمغرب	عبدالرحمن بن عبدالحکم ابوالقاسم المصری
396	فجر الاسلام	احمد امین
397	فرق الشیعہ	حسن بن موسیٰ النوبختی
398	فضائح الباطنیۃ	امام غزالی
399	فضائل الصحابۃ	امام احمد بن حنبل
	حرف ق	
400	القاموس الجدید (عربی سے اردو)	وحید الزمان کیرانوی
401	قاعدۃ فی المؤرخین	تاج الدین السبکی
402	قصۃ الحضارۃ	ولیم جیمس ڈیورآنٹ، تعریب: دکتور زکی نجیب
403	قصۃ العرب فی اسبانیا (دی اسٹوری آف مورس ان اسپین) تعریب: علی جازم بک	اسٹینلے۔ لین پول
404	قصص من التاریخ	علی الطنطاوی
405	قضایا المرأۃ فی المؤتمرات الدولیۃ	دکتور فؤاد بن عبدالکریم
406	قواعد فی علوم الحدیث (اعلاء السنن جزء:18)	مولانا ظفر احمد عثمانی
407	قوت القلوب	ابوطالب المکی
	حرف ک	
408	کیف نقرأ تاریخ الآل والاصحاب	عبدالکریم بن خالد الحربی
409	الکاشف فی معرفۃ من لہ روایۃ فی الکتب الستۃ	حافظ ذہبی
410	الکافی فی فقہ الامام احمد	ابن قدامۃ المقدسی
411	الکامل فی التاریخ	ابن اثیر الجزری
412	الکامل فی اللغۃ والادب	ابوالعباس المبرد

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۹۰۲ھ	4	مکتبۃ السنۃ، مصر	۱۴۲۴ھ_۲۰۰۳ء
معاصر	1	دار الوفاء	۱۹۹۹ء
۶۱۳ھ	1	مجلس مخطوطات فارسیہ، دکن	۱۹۳۹ء
معاصر	2	عمادۃ البحث العلمی، المدینۃ المنورۃ	۱۴۲۴ھ_۲۰۰۳ء
۱۴۰۳ھ	1	صدیقی ٹرسٹ، کراچی	
۲۷۹ھ	1	دار ومکتبۃ الہلال بیروت	۱۹۸۸ء
۱۶۵ھ	1	بپٹسٹ مشن، کلکتہ	۱۸۵۴ء
۲۰۷ھ	2	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ_۱۹۹۷ء
۲۵۷ھ	1	مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ	۱۴۱۵ھ
۱۳۷۳ھ	1	دار الکتاب العربی، بیروت	۱۹۳۳ء
تیسری صدی ہجری	1	مکتبہ حیدریہ، نجف	مذکور نہیں
۵۰۵ھ	1	مؤسسۃ دار الثقافۃ، کویت	مذکور نہیں
۲۴۱ھ	2	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۳ھ_۱۹۸۳ء
		﴿حرف ق﴾	
۱۹۹۵ء	1	ادارہ اسلامیات، لاہور	۱۴۱۱ھ_۱۹۹۰ء
۷۷۱ھ	1	دار البشائر، بیروت	۱۴۱۰ھ_۱۹۹۰ء
۱۹۸۱ء	42	دار الجیل، بیروت	۱۴۰۸ھ_۱۹۸۸ء
۱۹۳۱ء	1	کلمات عربیۃ، قاہرہ	۱۹۳۴ء
۱۴۲۰ھ	1	دار المنارۃ، سعودیہ	۱۴۲۷ھ
معاصر	1	مکتبہ شاملہ	
۱۳۹۴ھ	1	دار الفکر	۱۴۲۱ھ_۲۰۰۱ء
۳۸۶ھ	2	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۶ھ_۲۰۰۵ء
		﴿حرف ک﴾	
معاصر	1	دار الکتب المصریۃ	۱۴۲۷ھ_۲۰۰۶ء
۷۴۸ھ	2	دار القبلۃ، جدۃ	۱۴۱۳ھ_۱۹۹۲ء
۶۲۰ھ	4	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۴ھ_۱۹۹۴ء
۶۳۰ھ	10	دار الکتاب العربی، بیروت	۱۴۱۷ھ_۱۹۹۷ء
۲۸۵ھ	4	دار الفکر العربی، قاہرہ	۱۴۱۷ھ_۱۹۹۷ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
413	الکامل فی ضعفاء الرجال	ابو احمد ابن عدی
414	الکفایۃ فی علم الروایۃ	خطیب البغدادی
415	الکنی والاسماء	مسلم بن حجاج نیشاپوری
416	الکواکب الدراری فی شرح صحیح البخاری	شمس الدین الکرمانی
417	الکوثر الجاری الی ریاض احادیث البخاری	احمد بن اسماعیل الکورانی
418	کتاب الآثار	قاضی ابو یوسف
419	کتاب الاذکیاء	عبدالرحمن ابن الجوزی
420	کتاب الولاۃ وکتاب القضاۃ (کتاب ولاۃ مصر)	ابو عمر الکندی
421	کتاب سُلیم بن قیس الہلالی (تحقیق: باقر انصاری)	سُلیم بن قیس الہلالی
422	کشف اسرار الباطنیۃ واخبار القرامطۃ	محمد بن مالک یمانی
423	کشف الاستار عن زوائد البزار	نور الدین ہیثمی
424	کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون (مع ایضاح المکنون)	حاجی خلیفہ کاتب چلپی
425	کشف المشکل من حدیث الصحیحین	عبدالرحمن ابن الجوزی
426	کنز الدقائق	عبداللہ بن احمد حافظ الدین النسفی
427	کنز العمال	علامہ علی متقی برہان پوری
	﴿حرف ل﴾	
428	اللباب الانساب	ابن فندمہ البیہقی
429	لباب النقول فی اسباب النزول	جلال الدین سیوطی
430	لسان العرب	ابن منظور الافریقی
431	لسان المیزان	ابن حجر عسقلانی
432	لوامع الانوار البہیۃ	ابو العون السفارینی الحنبلی
	﴿حرف م﴾	
433	المامون	شبلی نعمانی
434	المبدع فی شرح المقنع	برہان الدین ابن مفلح
435	المبدع فی شرح المقنع	برہان الدین ابو اسحاق ابراہیم
436	المبسوط	محمد بن احمد ابو سہل السرخسی
437	المتفق والمفترق	خطیب بغدادی

سن اشاعت	ناشر	جلدیں	سن وفات
۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء	الکتب العلمیہ	9	۳۶۵ھ
مذکور نہیں	المکتبۃ العلمیہ، المدینۃ المنورہ	1	۴۶۳ھ
۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء	عمادۃ البحث العلمی الجامعۃ الاسلامیہ، المدینۃ المنورۃ	2	۲۶۱ھ
۱۴۰۱ھ۔۱۹۸۱ء	داراحیاء التراث العربی، بیروت	25	۷۸۶ھ
۱۴۲۹ھ۔۲۰۰۸ء	داراحیاء التراث العربی، بیروت	11	۸۹۳ھ
مذکور نہیں	دارالکتب العلمیہ	1	۱۸۲ھ
مذکور نہیں	مکتبۃ الغزالی	1	۵۹۷ھ
۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء	دارالکتب العلمیہ	1	۳۵۵ھ
۱۴۲۸ھ	انتشارات دلیل ما، تہران	1	نامعلوم
مذکور نہیں	مکتبۃ الساعی، ریاض	1	۴۷۰ھ
۱۳۹۹ھ۔۱۹۷۹ء	موسسۃ الرسالۃ	4	۸۰۷ھ
۱۹۴۱ء	دارالکتب العلمیہ	6	۱۰۶۷ھ
مذکور نہیں	دارالوطن، الریاض	4	۵۹۷ھ
۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء	دارالبشائر الاسلامیہ	1	۷۰۱ھ
۱۴۰۱ھ۔۱۹۸۱ء	موسسۃ الرسالۃ	16	۹۷۵ھ
	{حرف ل}		
مذکور نہیں	مکتبہ شاملہ	1	۵۶۵ھ
مذکور نہیں	دارالکتب العلمیہ بیروت	1	۹۱۱ھ
۱۴۱۴ھ	دارصادر، بیروت	15	۷۱۱ھ
۱۳۹۰ھ۔۱۹۷۱ء	مطبعہ نظامیہ، حیدرآباد دکن	7	۸۵۲ھ
۱۴۰۲ھ۔۱۹۸۲ء	موسسۃ الخافقین	1	۱۱۸۸ھ
	{حرف م}		
۱۸۸۹ء	دارالمصنفین اعظم گڑھ، یوپی	1	۱۹۱۴ء
۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء	دارالکتب العلمیہ	8	۸۸۴ھ
۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء	دارالکتب العلمیہ	8	۸۸۴ھ
۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۳ء	دارالمعرفۃ، بیروت	30	۴۸۳ھ
۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء	دارالقادری، دمشق	3	۴۶۳ھ

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
438	المجالسۃ وجواہر العلم	ابوبکر الدینوری المالکی
439	المجروحین من المحدثین والضعفاء والمتروکین	ابن حبان البستی
440	المجموع شرح المہذب	محی الدین شرف النووی
441	المحاسن والمساوی	ابراہیم بن محمد بیہقی
442	المحبر	محمد بن حبیب الہاشمی ابوجعفر البغدادی
443	المحتضرین	ابن ابی الدنیا
444	المحرر فی الفقہ علی مذہب الامام احمد بن حنبل	عبدالسلام ابن تیمیۃ الحرانی
445	المحن	ابوالعرب التمیمی
446	المختار من نوادر الاخبار	محمد بن احمد بن اسماعیل المقری الابیاری
447	المختصر الکبیر فی سیرۃ الرسول	عبدالعزیز ابن جماعۃ الکنانی
448	المختصر فی اخبار البشر	ابوالفداء
449	المختصر فی علم التاریخ	محی الدین الکافیجی
450	المراسیل	ابن ابی حاتم
451	المرقبۃ العلیا فیمن یستحق القضاء والفتیا (تاریخ قضاۃ الاندلس)	ابوالحسن المالقی
452	المزہر فی علوم اللغۃ وانواعہا	جلال الدین سیوطی
453	المسائل والاجوبۃ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
454	المستدرک علی الصحیحین	حاکم نیشاپوری
455	المسلمون وکتابۃ التاریخ	دکتور عبدالعلیم عبدالرحمن خضر
456	المصاحف	ابوبکر ابن ابی داؤد سجستانی
457	المصفی شرح المؤطا مع المسوی	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
458	المعارف	ابن قتیبۃ الدینوری
459	المعالم الاثیرۃ فی السنۃ والسیرۃ	محمد بن محمد حسن شراب
460	المعجم الاوسط	ابوالقاسم الطبرانی
461	المعجم الصغیر	ابوالقاسم الطبرانی
462	المعجم الکبیر	ابوالقاسم الطبرانی
463	المعجم الکبیر المجلدان: الثالث عشر والرابع عشر	ابوالقاسم الطبرانی
464	المعرفۃ والتاریخ	یعقوب بن سفیان الفسوی
465	المعین فی طبقات المحدثین	حافظ شمس الدین الذہبی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۳۳۳ھ	10	جمعیۃ التربیۃ الاسلامیۃ، بحرین	۱۴۱۹ھ
۳۵۴ھ	3	دار الوعی، حلب	۱۳۹۶ھ
۶۷۶ھ	1	دار الفکر	مذکور نہیں
۳۲۰ھ	1	مکتبہ شاملہ	مذکور نہیں
۲۳۵ھ	1	دار الآفاق، بیروت	مذکور نہیں
۲۸۱ھ	1	دار ابن حزم، بیروت	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۶۵۴ھ	2	مکتبۃ المعارف، ریاض	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۳۳۲ھ	1	دار العلوم، الریاض	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
ساتویں صدی ہجری	1	دار کنان، بغداد	۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء
۶۷۷ھ	1	دار البشیر، عمان	۱۹۹۳ء
۷۳۲ھ	4	المطبعۃ الحسینیۃ المصریۃ	مذکور نہیں
۸۷۹ھ	1	عالم الکتب	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۳۲۷ھ	1	مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۳۹۷ھ
۷۹۴ھ	1	دار الآفاق الجدیدۃ، بیروت	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۹۱۱ھ	2	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۸ء
۷۲۸ھ	1	الفاروق الحدیثۃ	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۴ء
۴۰۵ھ	4	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۰ء
معاصر	1	المعہد العالمی للفکر الاسلامی	۱۹۸۹ء
۳۱۶ھ	1	الفاروق الحدیثۃ، مصر	۱۴۲۳ھ۔۲۰۰۲ء
۱۱۷۶ھ	اوّل و دوم یکجا	مطبع فاروقی، دہلی	۱۲۹۳ھ
۲۷۶ھ	1	الہیئۃ المصریۃ العامۃ، قاہرہ	۱۹۹۲ء
معاصر	1	دار القلم، دمشق	۱۴۱۱ھ
۳۶۰ھ	10	دار الحرمین، قاہرہ	مذکور نہیں
۳۶۰ھ	2	دار عمار، بیروت	۱۴۰۵ھ۔۱۹۸۵ء
۳۶۰ھ	25	مکتبۃ ابن تیمیۃ	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۳۶۰ھ	2	دکتور سعد بن عبداللہ	مذکور نہیں
۲۷۷ھ	3	مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۰۱ھ۔۱۹۸۱ء
۷۴۸ھ	1	دار الفرقان، اردن	۱۴۰۴ھ

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
466	المغنی فی الضعفاء	شمس الدین الذہبی
467	المفصل فی تاریخ العرب	الدکتور جواد علی
468	المقالات والفرق	سعد بن عبداللہ الاشعری القمی
469	المقتبس من انباء الاندلس	ابن حیان القرطبی
470	المقصد العلی فی زوائد مسند ابی یعلی	نور الدین الہیثمی
471	المکتبۃ الاسلامیۃ	عماد علی جمعۃ
472	الملل والنحل	محمد بن عبدالکریم الشہرستانی
473	المنتخب من ذیل المذیل	محمد بن جریر الطبری
474	المنتخب من علل الخلال	ابن قدامہ المقدسی
475	المنتظم فی تاریخ الملوک والامم	عبدالرحمن ابن الجوزی
476	المنتقی شرح المؤطا	ابوالولید سلیمان بن خلف الباجی الاندلسی
477	المنتقی من السنن المسندۃ	ابن الجارود نیسابوری
478	المنتقی من منہاج الاعتدال	حافظ ذہبی
479	المنمق فی اخبار قریش	محمد بن حبیب الہاشمی ابوجعفر البغدادی
480	المواعظ والآثار بذکر الخطط والآثار (الخطط المقریزی)	تقی الدین المقریزی
481	الموسوعۃ المیسرۃ فی الادیان والمذاہب	جماعۃ من المؤلفین۔ تحقیق: مانع بن حماد الجہنی
482	الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ	لجنۃ من الفقہاء
483	الموسوعۃ الموجزۃ فی التاریخ الاسلامی	ابوسعید المصری
484	الموقظۃ فی علم مصطلح الحدیثین	حافظ ذہبی
485	مآثر الانافۃ فی معالم الخلافۃ	احمد بن علی القلقشندی
486	ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین	سید ابوالحسن علی ندوی
487	مجلۃ السیرۃ	مقالہ پروفیسر نثار احمد
488	مجمع الانہر فی شرح ملتقی الابحر	عبدالرحمن شیخی زادہ داماد آفندی
489	مجمع الزوائد ومنبع الفوائد	نور الدین ہیثمی
490	مجمل اصول اہل السنۃ	الشیخ ناصر عبدالکریم العلی
491	مجموع الفتاوی	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
492	محاضرات الادباء ومحاورات الشعراء والبلغاء	ابوالقاسم الراغب الاصفہانی
493	مختصر التحفۃ الاثنی عشریۃ (شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی)	لخصہ وہذبہ: علامۃ العراق محمود الآلوسی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۷۴۸ھ	2	مکتبہ شاملہ	
۱۴۰۸ھ	20	دارالساقی	۱۴۲۲ھ۔۲۰۰۱ء
۲۲۹ھ	1	مطبع حیدری، تہران	۱۳۴۱ھ
۴۶۹ھ	1	المجلس الاعلیٰ للشؤون الاسلامیہ، قاہرہ	۱۳۹۰ھ
۸۰۷ھ	4	دارالکتب العلمیہ	مذکورنہیں
معاصر	1	سلسلۃ التراث الاسلامی	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
۵۴۸ھ	3	مؤسسۃ الحلبی	مذکورنہیں
۳۱۰ھ	1	مؤسسۃ الاعلمی بیروت	۱۹۳۹ء
۶۲۰ھ	1	دارالرأیۃ	مذکورنہیں
۵۹۷ھ	19	دارالکتب العلمیہ	۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء
۴۷۴ھ	7	مطبعۃ السعادۃ، مصر	۱۳۳۲ھ
۳۰۷ھ	1	مؤسسۃ الکتب الثقافیہ بیروت	۱۴۰۸ھ۔۱۹۸۸ء
۷۴۸ھ	1	مکتبہ شاملہ	مذکورنہیں
۲۴۵ھ	1	عالم الکتب، بیروت	۱۹۸۵ء
۸۴۵ھ	4	دارالکتب العلمیہ، بیروت	۱۴۱۸ھ
معاصرین	2	دارالندوۃ العالمیہ	۱۴۲۰ھ
	45	وزارۃ اوقاف والشؤون الاسلامیہ، کویت	۱۴۲۷ھ
معاصر	16	مکتبہ شاملہ	
۷۴۸ھ	1	مکتبۃ المطبوعات الاسلامیہ، حلب	۱۴۱۲ھ
۸۲۱ھ	3	مطبعۃ حکومۃ الکویت	۱۹۸۵ء
۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء	1	مکتبۃ الایمان، قاہرہ	مذکورنہیں
معاصر	...	زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، کراچی	رمضان ۱۴۲۴ ہجری
۱۰۷۸ھ	2	داراحیاء التراث العربی	مذکورنہیں
۸۰۷ھ	10	مکتبۃ القدسی، قاہرہ	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۳ء
معاصر	1	مکتبہ شاملہ	
۷۲۸ھ	35	مجمع الملک فہد	۱۴۱۶ھ۔۱۹۹۵ء
۵۰۲ھ	2	شرکۃ دارالارقم، بیروت	۱۴۲۰ھ
۱۳۴۲ھ	1	المطبعۃ السلفیۃ، قاہرہ	۱۳۷۲ھ

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
494	مختصر تاریخ دمشق	ابن منظور الافریقی
495	مختصر سیرۃ الرسول	شیخ محمد بن عبدالوہاب
496	مختصر قیام اللیل	محمد بن نصر المروزی (اختصرہ المقریزی م ۸۴۵ھ)
497	مختصر المزنی	ابو ابراہیم المزنی
498	مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان	عبداللہ بن اسعد الیافعی
499	مرآۃ الزمان فی تواریخ الاعیان	سبط ابن الجوزی
500	مرآۃ الزمان فی تواریخ الاعیان	سبط ابن الجوزی
501	مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح	ملا علی قاری الہروی
502	مروج الذہب ومعادن الجوہر	علی بن الحسین المسعودی
503	مرویات غزوۃ خندق	دکتور ابراہیم بن محمد المدخلی
504	مسالک الابصار فی ممالک الامصار	شہاب الدین العدوی القرشی
505	مستخرج ابی عوانۃ	ابو عوانۃ یعقوب بن سفیان الاسفرائنی
506	مسند احمد	امام احمد بن حنبل
507	مسند ابن ابی شیبۃ	ابوبکر ابن ابی شیبۃ
508	مسند ابن الجعد	علی ابن الجعد الجوہری
509	مسند ابی داؤد طیالسی	ابوداؤد، سلیمان بن داؤد طیالسی
510	مسند ابی عوانۃ	ابو عوانۃ یعقوب بن اسحاق الاسفرائینی
511	مسند ابی یعلی	ابو یعلی تمیمی الموصلی
512	مسند البزار (البحر الذخار)	ابوبکر العتکی البزار
513	مسند الحارث (بغیۃ الباحث عن زوائد مسند الحارث)	الحارث ابن ابی اسامۃ ونور الدین ہیثمی
514	مسند الحمیدی	عبداللہ بن الزبیر الحمیدی
515	مسند الرویانی	ابوبکر محمد بن ہارون الرویانی
516	مسند الشامیین	ابوالقاسم الطبرانی
517	مسند الفاروق	حافظ ابن کثیر
518	مسند الشافعی	محمد بن ادریس الشافعی
519	مسند الشہاب	ابوعبداللہ ابن حکمون القضاعی
520	مشاہیر علماء الامصار	ابن حبان البستی
521	مصطلح الحدیث	محمد بن صالح العثیمین

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۷۱۱ھ	29	دار الفکر، دمشق	۱۴۰۲ھ۔۱۹۸۲ء
۱۲۰۶ھ	1	وزارۃ الشؤون الاسلامیہ سعودی عرب	۱۴۱۸ھ
۲۹۴ھ	1	حدیث اکادمی فیصل آباد	۱۴۰۸ھ۔۱۹۸۸ء
۲۶۴ھ	1	دار المعرفۃ، بیروت	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۷۶۸ھ	4	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۶۵۴ھ	23	الرسالۃ العالمیۃ، دمشق	۲۰۱۳ھ۔۱۴۳۴ھ
۶۵۴ھ	23	الرسالۃ العالمیۃ، دمشق	۱۴۳۴ھ۔۲۰۱۳ء
۱۰۱۴ھ	9	دار الفکر، بیروت	۱۴۲۲ھ۔۲۰۰۲ء
۳۴۶ھ	5	الجامعۃ اللبنانیۃ	۱۹۶۴ء
معاصر	1	عمادۃ البحث العلمی بجامعۃ الاسلامیۃ المدینۃ المنورۃ	۱۴۲۴ھ
۷۴۹ھ	27	المجمع الثقافی، ابوظبی	۱۴۲۳ھ
۳۱۶ھ	20	الجامعۃ الاسلامیۃ، السعودیۃ العربیۃ	۱۴۳۵ھ۔۲۰۱۴ء
۲۴۱ھ	45	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۱ء
۲۳۵ھ	2	دار الوطن، ریاض	۱۹۹۷ء
۲۳۰ھ	2	مؤسسۃ نادر، بیروت	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۲۰۴ھ	4	دار ہجر، مصر	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۹ء
۳۱۶ھ	5	دار المعرفۃ، بیروت	مذکور نہیں
۳۰۷ھ	13	دار المامون للتراث، دمشق	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۲۹۲ھ	18	مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ	۲۰۰۹ء
۲۸۲ھ۔و۸۰۷ھ	2	مرکز خدمۃ السنۃ، المدینۃ	۱۴۱۳ھ۔۱۹۹۲ء
۲۱۹ھ	2	دار السقا، سوریا	۱۹۹۶ء
۳۰۷ھ	2	مؤسسۃ القرطبۃ، القاہرۃ	۱۴۱۶ھ
۳۶۰ھ	4	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۵ھ۔۱۹۸۴ء
۷۷۴ھ	2	دار الوفاء، المنصورہ	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۱ء
۲۰۴ھ	1	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۰۰ھ
۲۵۴ھ	2	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۷ھ۔۱۹۸۶ء
۳۵۴ھ	1	دار الوفاء، المنصورہ	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۱ء
۱۴۲۱ھ	1	مکتبۃ العلم	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۵ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
522	مصطلح الحدیث	محمد بن صالح العثیمین
523	مصنف ابن ابی شیبہ نوٹ: مصنف ابن ابی شیبہ کا پرانا نسخہ ۱۵ جلدوں میں ہے اور اس میں احادیث نمبر بھی جدید نسخے سے الگ ہیں، یعنی مکتبۃ الرشد کے جدید نسخے میں کل احادیث نمبر ۳۷۹۴۳ ہیں جبکہ ۱۵ جلد والے نسخے میں کل حدیث نمبر ۳۹۰۹۸ ہیں۔	ابوبکر ابن ابی شیبہ
524	مصنف عبدالرزاق مع جامع معمر بن راشد	عبدالرزاق بن ہمام
525	مع الاثنی عشریۃ فی الاصول والفروع	دکتور علی بن حمید السالوس
526	معارف الحدیث	مولانا محمد منظور نعمانی
527	معارف القرآن	مفتی محمد شفیع
528	معاملۃ غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی	دکتور رادوار غالی الدہبی
529	معاویۃ بن ابی سفیان	محمد علی محمد الصلابی
530	معجم ابن الاعرابی	ابوسعید ابن الاعرابی
531	معجم الادباء (ارشاد الاریب الی معرفۃ اللبیب)	یاقوت الحموی
532	معجم الادباء (الارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب)	یاقوت الحموی
533	معجم البلدان	یاقوت الحموی
534	معجم الصحابہ	ابوالقاسم البغوی
535	معجم شیوخ الطبری	اکرم بن محمد الاثری
536	معجم ما استعجم من اسماء البلاد والمواضع	ابوعبید البکری الاندلسی
537	معرفۃ السنن والآثار	ابوبکر البیہقی
538	معرفۃ الصحابۃ	ابونعیم الاصبہانی
539	معرفۃ القرآء الکبار	حافظ ذہبی
540	مغازی	محمد بن عمر الواقدی
541	مفرج الکروب فی اخبار بنی ایوب	ابن واصل الحموی
542	مقاتل الطالبین	ابوالفرج الاصبہانی
543	مقالات الاسلامیین واختلاف المصلین	ابوالحسن الاشعری
544	مقام حسین ویزید	مولانا محمد حبیب اللہ علوی
545	مقام صحابہ	مفتی محمد شفیع عثمانی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۱۴۲۱ھ	1	مکتبۃ العلم، قاہرہ	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۲۳۵ھ	7	مکتبۃ الرشد، ریاض	۱۴۰۹ھ
۲۱۱ھ	11	المجلس العلمی، پاکستان	۱۴۰۳ھ
معاصر	1	دار الفضیلۃ، ریاض	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
۱۴۱۷ء۔۱۹۹۷ء		دار الاشاعت، کراچی	۲۰۰۷ء
۱۳۹۶ھ۔۱۹۷۶ء	8	ادارۃ المعارف، کراچی	مذکور نہیں
معاصر	1	مکتبۃ غریب	۱۹۹۳ء
معاصر	1	دار الاندلس، مصر	۱۴۲۹ھ۲۰۰۸ء
۳۴۰ھ	3	دار ابن الجوزی، السعودیۃ	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء
۶۲۶ھ	7	دار الغرب الاسلامی، بیروت	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۳ء
۶۲۶ھ	5	دار الغرب الاسلامی، بیروت	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۳ء
۶۲۶ھ	7	دار صادر، بیروت	۱۹۹۵ء
۳۱۷ھ	5	مکتبۃ دار البیان، کویت	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء
معاصر	1	الدار الاثریہ، اردن	۱۴۲۶ھ۔۲۰۰۵ء
۴۸۷ھ	4	عالم الکتب بیروت	۱۴۰۳ھ
۴۵۸ھ	15	دار الوفاء، قاہرۃ	۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء
۴۳۰ھ	7	دار الوطن للنشر، ریاض	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء
۷۴۸ھ	1	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۲۰۷ھ	3	دار الاعلمی	۱۴۰۹ھ۔۱۹۸۹ء
۶۹۷ھ	5	دار الکتب والوثائق القومیہ، قاہرہ	۱۳۷۷ھ۔۱۹۵۷ء
۳۵۶ھ	1	دار المعرفۃ، بیروت	مذکور نہیں
۳۲۴ھ	2	المکتبۃ العصریۃ	۱۴۲۶ھ۔۲۰۰۵ء
معاصر	1	مجلس دعوۃ الحق، پاکستان	مذکور نہیں
۱۳۹۶ھ۔۱۹۷۶ء	1	ادارۃ المعارف، کراچی	۲۰۰۵ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
546	مقدمۃ زہر الربیٰ علی السنن النسائی المجتبیٰ	جلال الدین سیوطی
547	مکتوبات مجدد الف ثانی (اردو ترجمہ: از مولانا سید زوار حسین شاہ)	شیخ احمد سرہندی
548	من کلام ابی زکریا یحییٰ بن معین بروایۃ طہمان	یحییٰ بن معین
549	مناقب ابی حنیفۃ وصاحبیہ	حافظ شمس الدین الذہبی
550	مناقب ابی حنیفہ کردری	محمد ابن شہاب الکردری
551	مناقب ابی حنیفہ مکی	موفق بن احمد المکی الخطیب خوارزم
552	منہاج السنۃ النبویۃ	احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام ابن تیمیۃ الحرانی
553	منہاج الطالبین وعمدۃ المفتین فی الفقہ	امام شرف النووی
554	منہاج المحدثین فی القرن الاوّل الہجری وحتی عصرنا الحاضر	علی عبدالباسط مزید
555	منہج السالکین وتوضیح الفقہ فی الدین	عبدالرحمن بن ناصر آل سعدی
556	مؤطا امام مالک	امام مالک بن انس
557	موجز التاریخ الاسلامی	احمد محمود العسیری
558	موسوعۃ اقوال احمد بن حنبل (جمعہ لجنۃ من المؤلفین)	احمد بن حنبل
559	موسوعۃ اقوال الدارقطنی فی رجال الحدیث وعللہ (جمعہ لجنۃ من المؤلفین)	ابوالحسن الدارقطنی
560	موسوعۃ مواقف السلف فی العقیدۃ والمنہج التربیۃ	ابو سہل محمد بن عبدالرحمن المغراوی
561	میزان الاعتدال فی نقد الرجال	شمس الدین الذہبی
	﴿حرف ن﴾	
562	النبراس علی شرح العقائد	عبدالعزیز فرہاری ملتانی
563	النجوم الزاہرۃ فی احوال ملوک مصر والقاہرۃ	یوسف بن تغری بردی
564	النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح	بدرالدین الزرکشی الشافعی
565	النکت علی کتاب ابن الصلاح	ابن حجر العسقلانی
566	ناصبیت تحقیق کے بھیس میں	مولانا عبدالرشید نعمانی
567	نبی رحمت ﷺ	سید ابوالحسن علی ندوی
568	نخبۃ الفکر	حافظ ابن حجر عسقلانی
569	نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق	الشریف الادریسی الطالبی
570	نسب قریش	مصعب بن عبداللہ الزبیری
571	نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب	شہاب الدین المقری
572	نقوش رسول نمبر جلد دوم مقالہ: سیرت النبی تو قیت کی روشنی میں	مولانا اسحاق النبی علوی (رام پور، بھارت)
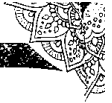
سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۹۱۱ھ	1	دارالمعرفۃ، بیروت	مذکور نہیں
۱۰۳۴ھ	3	ادارہ مجددیہ، کراچی	مذکور نہیں
۲۳۳ھ	1	دارالمامون، دمشق	مذکور نہیں
۷۴۸ھ	1	لجنۃ احیاء المعارف النعمانیۃ، دکن	۱۴۰۸ھ
۸۲۷ھ	2	مکتبۃ نظامیہ دکن	۱۳۲۱ھ
۵۶۸ھ	2	مکتبۃ نظامیہ دکن	۱۳۲۱ھ
۷۲۸ھ	9	جامعۃ الامام محمد بن سعود	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
۶۷۶ھ	1	دارالفکر	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۵ء
معاصر	1	مکتبۃ شاملہ	مذکور نہیں
۱۳۷۶ھ	1	دارالوطن	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۲ء
۱۷۹ھ	6	مؤسسۃ زاید بن سلطان الامارات	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۴ء
معاصر	1	مکتبۃ الملک فہد	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۶ء
۲۴۱ھ	4	دارالنشر، عالم الکتب	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۳۸۵ھ	2	عالم الکتب	۲۰۰۱ء
معاصر	10	المکتبۃ الاسلامیہ، قاہرہ	مذکور نہیں
۷۴۸ھ	4	دارالمعرفۃ، بیروت	۱۳۸۲ھ۔۱۹۶۳ء
		{حرف ن}	
بعد: ۱۲۳۹ھ	1	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ	مذکور نہیں
۸۷۴ھ	16	دارالکتب، قاہرہ	مذکور نہیں
۷۹۴ھ	3	اضواء السلف، الریاض	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء
۸۵۲ھ	2	عمادۃ البحث العلمی، السعودیۃ	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۱۴۲۰ھ۔۲۰۰۰ء	1	دارالتقویٰ، لاہور	
۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء	1	مجلس نشریات اسلام	مذکور نہیں
۸۵۴ھ	1	دارالحدیث، قاہرہ	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء
۵۶۰ھ	2	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۹ھ
۲۳۶ھ	1	دارالمعارف، قاہرہ	مذکور نہیں
۱۰۴۱ھ	8	دارصادر، بیروت	۱۹۹۷ء
	13	مدیر: محمد طفیل۔ ادارہ فروغ اردو، لاہور	دسمبر ۱۹۸۲ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
573	نہایۃ الارب فی فنون الادب	شہاب الدین النویری
574	نہایۃ الارب فی معرفۃ انساب العرب	احمد بن علی القلقشندی
575	نہایۃ المطلب فی درایۃ المذہب	ابوالمعالی امام الحرمین جوینی
576	نہج البلاغۃ	سید شریف رضی
577	نوادر الخلفاء (اعلام الناس بما وقع للبرامکۃ مع بنی عباس)	محمد دیاب الاتلیدی
578	نور البصر فی سیرۃ سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی
579	نیل الاوطار	محمد بن علی الشوکانی الیمنی
	{حرف و}	
580	الوافی بالوفیات	صلاح الدین الصفدی
581	الوسیط فی المذہب	ابوحامد الغزالی
582	الوفیات	ابن قنفذ
583	وسیلۃ الاسلام بالنبی علیہ الصلوٰۃ والسلام	ابن قنفذ القسنطینی
584	وصایا العلماء عند حضور الموت	ابن زبر الربعی
585	وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ	علی بن عبداللہ السمہودی
586	وفیات الاعیان	ابن خلکان
587	وقعۃ صفین	نصر بن مزاحم
	{حرف ہ}	
588	الہدایۃ فی شرح بدایۃ المبتدی	برہان الدین مرغینانی
589	ہدیۃ العارفین	اسماعیل بن میر سلیم البابانی البغدادی
	{حرف ی}	
590	الیہود فی العالم القدیم	دکتور مصطفیٰ کمال عبدالعلیم
591	الیواقیت والدرر شرح شرح نخبۃ الفکر	علامہ عبدالرؤف مناوی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۷۳۳ھ	33	دارالکتب والوثائق القومیۃ، قاہرہ	۱۴۲۳ھ
۸۲۱ھ	1	دارالکتاب اللبنانیین	۱۴۰۰ھ۔۱۹۸۰ء
۴۷۸ھ	20	دارالمنہاج	۱۴۲۸ھ۔۲۰۰۷ء
۴۳۶ھ	4	المطبعۃ الادبیۃ، بیروت	۱۸۸۵ء
چوتھی صدی ہجری	1	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۴ء
۱۹۶۲ء	1	معہد الخلیل الاسلامی	مذکور نہیں
۱۲۵۰ھ	8	دارالحدیث، مصر	۱۴۱۳ھ۔۱۹۹۳ء
حرف و			
۷۶۴ھ	29	داراحیاء التراث	۱۴۲۰ھ۔۲۰۰۰ء
۵۰۵ھ	7	دارالسلام، قاہرہ	۱۴۱۷ھ
۸۱۰ھ	1	دارالآفاق الجدیدۃ، بیروت	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۸۱۰ھ	1	دارالغرب الاسلامی، بیروت	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۳۷۹ھ	1	دارابن کثیر، دمشق	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
۹۱۱ھ	4	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۹ھ
۶۸۱ھ	7	دارصادر	۱۹۹۴ء
۲۱۲ھ	1	دارالجیل، بیروت	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
حرف ہ			
۵۹۳ھ	4	داراحیاء التراث العربی	مذکور نہیں
۱۳۹۹ھ	2	داراحیاء التراث العربی، بیروت	مذکور نہیں
حرف ی			
معاصر	1	دارالقلم، دمشق	۲۰۰۱ء
۱۰۳۱ھ	2	مکتبۃ الرشد، ریاض	۱۹۹۹ء

تاریخ اُمت مسلمہ کے چھ حصے ایک نظر میں

مبادیات تاریخ، انبیائے سابقین علیہم السلام اور ان کی معاصر سلطنتیں، ما قبل از اسلام دنیا کی حالت سیرت نبویہ ﷺ، عہد خلافت راشدہ، دور فتوحات (خلافت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تا خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ)، امہات المومنین، عشرہ مبشرہ اور اکابر صحابہ کا تعارف، اسباق تاریخ

تاریخ روایات کی تحقیق و تنقیح کے اصول، دورِ مشاجرات، خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ، جنگ جمل، جنگِ صفین، خلافت حضرت حسن رضی اللہ عنہ، خلافتِ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، عہد یزید، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی جدوجہد، سانحہ کربلا و سانحہ حرہ، خلافت و شہادت حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، دورِ فتن سے حاصل شدہ اسباق، پہلی صدی ہجری میں امت کی علمی و اخلاقی تربیت کرنے والے مشاہیر صحابہ و تابعین کا تعارف، اہم شبہات کے جوابات

خلافت بنو امیہ و بنو عباس، خلافت عباسیہ کی معاصر آزاد مسلم حکومتیں ائمہ اربعہ اور عظیم مجددین و مصلحین کے کارنامے، فرقوں کے آغاز اور ظہور کی تاریخ، باطل فرقوں کی حکومتیں، اہم شبہات کے جوابات

تاریخ صقلیہ، صلیبی جنگیں، یورشِ تاتار، دولتِ ایوبیہ، دولت ممالیک، تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام، تاریخ برصغیر، سلطنتِ عثمانیہ، دورِ تاسیس و استحکام، دولتِ اسلامیہ اندلس، دورِ تاسیس تا دورِ مرابطین و موحدین، امت مسلمہ کی فکری و نظریاتی رہنمائی کرنے والے ائمہ مجددین، فقہاء اور صوفیاء کی جدوجہد کا تذکرہ

زوال و سقوط دولت اسلامیہ اندلس سلطنت عثمانیہ دورِ عروج تا سقوط خلافت سلطنتِ مغلیہ ہندوستان، بابر تا بہادر شاہ ظفر

برطانوی استعمار کی حکومت، تحریکاتِ آزادی، تحریکِ پاکستان، عالم اسلام کے اہم ممالک کی مختصر تاریخ، غیر مسلم دنیا کے اہم ممالک کی مختصر تاریخ، مسلم تہذیب و تمدن اور مسلمانوں کے علمی وفنی کارناموں پر ایک نظر